وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين

استحکام پاکستان

اسرار احمد کی ایک نہایت

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

PEPSI

MIRINDA

جنوری : ۱۹۸۶

بمطابق

ربیع الثانی : ۱۴۰۶ھ

فی شمارہ ۳/ روپے

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

زیرِ نظر شمارہ شمسی تقویم کے اعتبار سے نئے سال کا پہلا شمارہ ہے اور اس سے 'میثاق' کی پینتیسویں (۳۵) جلد کا آغاز ہو رہا ہے۔ فللہ الحمد والمنّہ ـــــ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ نئے سال کو ہم سب کے لیے خیر و برکت، امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کا ذریعہ بنائے اور اس آنے والے سال میں ہمیں توفیق دے کہ ہم بیش از بیش دین کی خدمت کر سکیں ـــــ نئے سال کا آغاز جہاں ایک طرف ہمارے لیے مسرت و شادمانی کا موقع ہے وہیں ہمیں اس اہم حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہے کہ ہر گزرنے والا لمحہ دراصل ہماری مہلتِ عُمر میں کمی کا باعث بنتا ہے ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی گردوں نے گھڑی عُمر کی اک اور گھٹا دی

روزنامہ 'جنگ' میں 'استحکامِ پاکستان' کے عنوان سے والدِ محترم 'ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' کی جو مفصل تحریر تسلسل کے ساتھ بالاقساط شائع ہو رہی ہے، اُس کے ابتدائی دو حصّے اِس شمارے میں شاملِ اشاعت کیے گئے ہیں ـــــ پچھلے چند سالوں کے دوران والدِ محترم نے اِس مضمون کو بارہا اپنی تقاریر میں بیان فرمایا ہے، بالخصوص مختلف شہروں کی بار کونسلز میں جب بھی خطاب کا موقع ہوا، بالعموم اِستحکامِ پاکستان ہی کے موضوع پر گفتگو ہوئی ـــــ تاہم شدید خواہش کے باوجود اس موضوع پر قلم اٹھانے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اِس اہم مرحلے کا آغاز ہو چکا ہے اور اگرچہ سوا سو صفحات سے زائد مواد سپردِ قلم کیا جا چکا ہے لیکن غالباً ابھی تک اصل مضمون کا صرف نصف حصّہ مکمل ہو پایا ہے۔ بلاشبہ یہ مضمون نہایت اہم ہے۔ پاکستان کے عوام و خواص کی ایک عظیم اکثریت نظریۂ پاکستان اور اسلام کے حوالے سے جس بے یقینی اور الحاد کی کیفیت سے دوچار ہے، جس کے باعث ہر چہار طرف بے مقصدیت کی فضا نظر آتی ہے۔ اس فضا کو بہتر بنانے میں ہمیں قوی اُمید ہے کہ یہ مضمون بہت معاون ثابت ہوگا۔ جہاں یہ مضمون ذہنوں میں پھیلی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کے ازالے کا باعث بنے گا، وہیں ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ اس کے ذریعے

آئندہ کے لیے ایک معین لائحہ عمل سامنے آئے گا۔ قارئین میثاق سے التماس ہے کہ وہ والد محترم کے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ سے نوازے اور انہیں اس بات کی توفیق دے اور ان کے لیے حالات سازگار فرما دے کہ وہ اس مضمون کو مکمل شکل میں ضبطِ تحریر میں لا سکیں (آمین) ساتھ ہی قارئین سے یہ گزارش بھی ہے کہ خود اس مضمون کا بغور مطالعہ فرمائیں، اپنے حلقۂ احباب میں پھیلائیں بلکہ اسے اپنی گفتگو کا موضوع بنائیں تاکہ ایک اجتماعی سوچ پروان چڑھ سکے اور آئندہ کچھ کام کرنے کا عزم بیدار ہو۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بحیثیت قوم مزید مہلت عطا فرما دے اور ہماری ان مساعی کو شرفِ قبول عطا کرتے ہوئے پاکستان کو احیائے اسلام کے عمل کا ایک اہم ذریعہ بنا دے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز

قارئینِ میثاق کے علم میں ہے کہ گزشتہ لگ بھگ ۱۰ سالوں سے والد محترم کے بیرونِ ملک دوروں کا سلسلہ جاری ہے اور متواتر کئی سالوں سے یہ کیفیت تھی کہ سال میں کم از کم ایک یا پھر ایک سے زائد سفر بیرونی ممالک کے ہو جاتے تھے۔ لیکن اس بار ایسا ہوا کہ مسلسل ۱½ سال بیرونِ ملک کا کوئی سفر در پیش نہیں ہوا۔ پچھلے سال ماہِ مئی میں عمرہ کے لیے جانا ہوا تھا اور پھر اکتوبر میں دوبارہ عمرے ہی کی ادائیگی کے لیے شدّ رحال فرمایا۔ لیکن یہ ڈیڑھ سال کا تعطل آئندہ پے در پے متعدد بیرونی دوروں کی تمہید بن گیا۔ اب پچھلے تین ماہ سے کیفیت یہ ہے کہ والد محترم ایک سفر سے واپس پاکستان تشریف لاتے ہیں تو دوسرے کے لیے پابہ رکاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ۲۱ اکتوبر کو والد صاحب عمرہ کی سعادت سے فیض یاب ہونے کے بعد واپس تشریف لائے تو ۲۰ نومبر کو عازم بھارت ہو گئے۔ وہاں سے ۴ دسمبر کو واپسی ہوئی تو ۱۱ دسمبر کو ابوظہبی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا —— لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ ابوظہبی کے مختصر لیکن نہایت کامیاب اور بھرپور دورے کے بعد مستقبل قریب میں کوئی اور بیرونی سفر سردست در پیش نہیں ہے۔ تاہم اندرون ملک دوروں کا سلسلہ تا ہنوز جاری ہے چنانچہ ۲۰ دسمبر کو ابوظہبی سے مراجعت کے بعد ۲۳ تاریخ کو کراچی کے چار روزہ دورے کے لیے روانگی عمل میں آچکی ہے —— پچھلے سال کے اوائل میں بھارت کا جو دورہ ہوا تھا۔ اس میں راقم کے برادرِ بزرگ ڈاکٹر عارف رشید صاحب محترم والد صاحب کے ہمراہ تھے اور اس بار قرعہ فال راقم کے نام نکلا (اس دورے کی مفصل رپورٹ کا ایک حصہ اسی شمارے میں شامل ہے)۔ ابوظہبی کے دورے میں والد محترم کو ہمارے دو بزرگ ساتھیوں، شیخ جمیل الرحمٰن صاحب اور جناب مکرم سعید قریشی صاحب کی معیت حاصل تھی۔ یہ دونوں حضرات وہیں سے عمرہ کی ادائیگی کے لیے حجازِ مقدس روانہ

ہو گئے ہیں اور واپسی ۳۰ ردسمبر تک متوقع ہے۔ اس دورے کی مفصل رپورٹ تو شیخ جمیل الرحمن واپسی پر سپرد قلم فرمائیں گے جو ان شاء اللہ العزیز آئندہ شمارے میں شائع ہو گی تاہم ان کا ایک خط جو انہوں نے ابوظہبی سے ہمارے ایک معاونِ کار کو ارسال کیا ہے ہدیۂ ناظرین ہے۔

از ابوظہبی - ۱۸ دسمبر ۸۵ء

اخی المحترم شیخ رحیم الدین صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

الحمد للہ ثم الحمد للہ ابوظہبی کا پروگرام توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ کل شب تک آٹھ خطابات ہو چکے ہیں۔ ہر روز پہلے سے زیادہ حاضری ہوئی۔ جبکہ خیال یہ تھا کہ حاضری بتدریج کم ہو گی لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ ہر دن حاضری بڑھتی رہی۔ حال یہ تھا کہ ہال کے علاوہ جس میں سات سو 65×71 نشستوں کا انتظام ہے مختلف گیلریاں اور ہال سے باہر شامیانہ میں پانچ ٹی وی سیٹوں کا انتظام تھا کہ جس سے شرکاء ڈاکٹر صاحب کا خطاب سن بھی سکتے تھے اور دیکھ بھی سکتے تھے۔ ہر پروگرام کی دوسرے دن وڈیو کیسٹ قریباً ایک سو اور آڈیو کیسٹ دو سو ڈھائی سو کے درمیان نکل جاتے ہیں۔ جتنی کتابیں یہاں لائی گئی تھیں، وہ دوسرے ہی دن ختم ہو گئیں۔

کل یہاں ۲۴ حضرات نے امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ ان شاء اللہ زبانی رپورٹ لاہور آکر پیش کروں گا اور میثاق کے لیے تحریری رپورٹ بھی لکھ کر لانے کی کوشش کروں گا۔

اللہ نے چاہا تو میں ۸ر جنوری ۸۶ء کو تیز گام پر لاہور پہنچوں گا۔ نوٹ فرمالیں۔

کل میں بھائی قمر سعید صاحب کے ہمراہ عمرہ کے لیے جا رہا ہوں، وہاں سے میں تو ۲۴ دسمبر کو کراچی واپس پہنچ جاؤں گا، قمر صاحب ۲ر جنوری کو لاہور پہنچیں گے۔ خاکسار

جمیل الرحمن

آئندہ چار ماہ کے دوران تنظیم اسلامی کے متوقع اجتماعات کی تفصیلات اسی شمارے کے صفحہ ۵ پر درج ہیں جملہ رفقاء تنظیم سے گزارش ہے کہ وہ درج شدہ تاریخوں کے مطابق ابھی سے اپنا شیڈول مرتب کریں تا کہ ان اجتماعات میں شرکت ہو سکے ـــــ محترم مولانا سعید الرحمن علوی صاحب کے سلسلہ وار مضمون "دل ز لنگدیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا" کی قسط اس شمارے میں شامل نہیں کی جا سکی جس کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں، آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ وہ شامل اشاعت ہو گی ـــ

عاکف سعید عفی عنہ

۲ دسمبر ۸۵ء

أعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حَتّٰی

یہاں تک کہ

اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ

جب وہ اپنی پوری پختگی کو پہنچتا ہے

وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً

اور چالیس برس کا ہو جاتا ہے

قَالَ

تو کہتا ہے کہ

رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰى وَالِدَیَّ

اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں ان انعامات کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیے

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ

اور ایسے نیک اعمال کروں جو تجھے پسند ہوں

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ

اور میری اولاد کو میرے لیے بھلائی کا ذریعہ بنا

اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں — اور — میں فرمانبرداروں میں سے ہوں!

(سورۂ احقاف - آیت ۱۵)

بڑے بھائی کی خدمت میں — چالیسویں سالگرہ کے موقع پر

منجانب ——— خاکسار ابوالاعلیٰ عفی عنہ

زیرِ تالیف کتاب 'استحکامِ پاکستان' کا مقدمہ

پاکستان کی عمر کا چالیسواں (؟) سال

اور اُس کی دینی و تاریخی اہمیّت

ڈاکٹر اسرار احمد

چونکہ ہم بالعموم شمسی تقویم کے عادی ہیں لہٰذا عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۸۵ء کو پاکستان نے اپنا اُنتالیسواں یومِ استقلال منایا ہے۔ گویا اُس روز اُس نے اپنی عمر کے اڑتیس سال پورے کر کے انتالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ ہماری دینی تقویم قمری ہے۔ اُس کے حساب سے دیکھا جائے تو کسی قدر مختلف معاملہ سامنے آتا ہے۔ اِس لیے کہ پاکستان کا قیام ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو عمل میں آیا تھا۔ اس طرح ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ کو اُس کی عمر کے انتالیس سال پورے ہو گئے ہیں اور اُس نے چالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ (اور اِن سطور کی تحریر کے وقت اُس چالیسویں سال کے بھی چار ماہ سے زائد گذر چکے ہیں!)

انسان کی پختگی کی عمر: چالیس سال

یہ بات تو قرآنِ حکیم کا ہر طالب علم اور دینی مزاج کا حامل ہر شخص جانتا ہے، کہ انسانی زندگی میں چالیس سال کی عمر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور انسان کی پختگی کی عمر

چالیس برس ہے۔ چنانچہ سورۂ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ میں یہ الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں:

حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ	(ترجمہ) "یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری پختگی کو پہنچا اور چالیس برس (کی عمر) کو پہنچ گیا تو اس نے کہا. . . . "
(الآیہ)	

ظاہر ہے کہ اس سے مُراد جسمانی بلوغت نہیں ہے بلکہ شعوری اور نفسیاتی پختگی[1] ہے — چنانچہ اُس کے ضمن میں یہ آیۂ مبارکہ نص کا درجہ رکھتی ہے۔

آغازِ وحی کی عمر: چالیس سال

اِسی طرح اگر اس اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ "استثنآت کُلّیہ کو ثابت کرتے ہیں"[2] تو سب جانتے ہیں کہ قانونِ قدرت یا سنّت اللہ یہی رہی ہے کہ نبوّت کا ظہور[3] یعنی وحی کا آغاز چالیس برس کی عمر میں ہوتا رہا ہے۔ (اس قاعدہ کُلّیہ سے مستثنیٰ غالباً صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہیں، اور ہر شخص جانتا ہے کہ اُن کی تو پوری شخصیت ہی 'خرقِ عادت'[4] کی حیثیت رکھتی ہے۔) چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ:

عن ابنِ عباسؓ قال بُعِثَ رسول اللہِ صلّی اللہ علیہ وسلّم لِاَربعینَ سَنَةً فمکثَ بمکّةَ ثلٰثَ عَشَرَةَ سَنَةً یوحیٰ الیہِ ثُمَّ اُمِرَ بِالهجرةِ	(ترجمہ) "حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چالیس برس کی عمر میں مبعوث ہوئے۔ اس کے بعد تیرہ برس مکہ میں مقیم رہے۔

---

[1] 'Intellectual and Psychological Maturity'

[2] "EXCEPTIONS PROVE THE RULE"

[3] نہ کہ آغاز!!

[4] یعنی عام قوانینِ طبعیہ کے خلاف!

فھاجرَ عشرَ سِنِینَ ومات	اور آپ پر وحی نازل ہوتی رہی۔ پھر آپ کو
وھُوَ ابنُ ثلٰثٍ وّ سِتِّینَ	ہجرت کا حکم ہُوا تو آپ نے ہجرت فرمائی
سَنَۃً ۔	اور دس برس (مدینہ میں مقیم) رہے اور ترسیٹھ
(بخاریؒ و مسلمؒ)	برس کی عمر میں آپ نے وفات پائی ۔
	(اس کو روایت کیا امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے)

پس ثابت ہُوا کہ ازروئے قرآن وحدیث انسان کی عقلی و شعوری بلوغت اور جذباتی و نفسیاتی پختگی کی عمر چالیس سال ہے۔

بنی اسرائیل کی چالیس سالہ صحرانوردی

اور چالیس سال کے بعد انقلابِ حال

اب چونکہ افراد ہی سے اجتماعیت وجود میں آتی ہے اور بقول علامہ اقبال :۔

"افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر   ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا !"

لہٰذا قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ اجتماعیتِ انسانیہ میں بھی چالیس برس کی مدت کو اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔ اور قرآن حکیم میں بھی اس کی کم از کم ایک مثال تو نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ سورۃ مائدہ کے چوتھے رکوع میں تفصیلاً مذکور ہے کہ مصر سے خروج (EXODUS) کے کچھ عرصے کے بعد جب بنی اسرائیل کو قتال فی سبیل اللہ کا حکم ہُوا اور انہوں نے اس سے پہلوتہی اختیار کی اور اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبروں یعنی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیہما السلام اور اُن کے دو وفادار اور تقویٰ شعار ساتھیوں یعنی یوشع بن نُون اور کالب بن یفنا رحمہما اللہ کی کُل تشویق و ترغیب اور فرمائش و فہمائش کے جواب میں بالکل دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ :

"قَالُوْا یٰمُوْسٰی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَھَا   (ترجمہ) "انہوں نے کہا : "اے موسیٰ !

اَبَدًا مَّادَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (المائدہ : ۲۴)	ہرگز اس (سرزمین مقدس) میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ (یعنی عمالقہ) وہاں موجود ہیں۔ پس جاؤ تم اور تمہارا رب اور تم دونوں جنگ کرو، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے!"

تو اس پر ایک جانب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس درجہ بیزاری کی کیفیت طاری ہوئی کہ انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں اپنی بے بسی کے ذکر کے ساتھ اپنی اُمت سے قطع تعلق کی اجازت طلب کی:

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (المائدہ : ۲۵)	(ترجمہ) "موسیٰؑ نے عرض کیا: "اے رب میرے! مجھے تو سوائے اپنی جان اور اپنے بھائی کے (اور کسی پر) کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ پس علیحدگی فرما دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے مابین!"

اور دوسری جانب اللہ تعالیٰ نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ اگر یہ لوگ بزدلی نہ دکھاتے تو ہم ارضِ مقدس ابھی ان کو عطا فرما دیتے لیکن اُن کے قتال فی سبیل اللہ سے جان چُرانے کی بنا پر یہ ارضِ مقدس اُن پر چالیس برس تک حرام رہے گی اور اس عرصے کے دوران یہ اِسی صحرائے سینا میں بھٹکتے پھریں گے ــــ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ (المائدہ : ۲۶)	(ترجمہ) "اللہ نے فرمایا: اب یہ (ارضِ مقدس) ان پر چالیس برس تک حرام رہے گی (اور) یہ زمین میں بھٹکتے (ہی) رہیں گے!"

تاریخ بتاتی ہے کہ اسی چالیس سال کے عرصے کے دوران حضرتِ موسیٰؑ کا بھی انتقال ہو گیا اور حضرتِ ہارونؑ کا بھی، اور یہ دونوں جلیل القدر پیغمبر اللہ کے دین اور اپنی اُمت کے ارضِ مقدس پر غلبہ و تمکن کو اپنے جسدِ عنصری کی آنکھوں سے دیکھے بغیر دنیا سے رخصت

ہو گئے! لیکن چالیس برس کی مدت کی تکمیل کے بعد بنی اسرائیل کی اُس نئی نسل نے جو صحرا ہی میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی تھی حضرتِ یوشع بن نُون کی قیادت میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے مراحل طے کیے اور اس طرح بنی اسرائیل کی تاریخ کے عہدِ زرّین کے آغاز کی تمہید ہوئی۔

بنی اسرائیل اور اُمّتِ مُسلمہ کے حالات میں عمومی مُشابہت

واضح رہے کہ اگرچہ نظری طور پر تو یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جتنے رسول دنیا میں مبعوث ہوئے اُتنی ہی مسلمان اُمتیں بھی لازماً وجود میں آئی ہوں گی، خواہ بڑی خواہ چھوٹی، لیکن قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اہم ترین اور قابلِ لحاظ اور قابلِ ذکر اُمتیں دو ہی ہیں: پہلی اُمتِ موسیٰؑ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری اُمتِ محمدؐ یا موجودہ اُمتِ مُسلمہ!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں بڑی گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک[1] جانب خارج سے وارد و واقع ہونے والے حالات و واقعات کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظِ مبارکہ منقول ہیں:

«لَيَاتِيَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ كَمَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ» (ترمذیؒ عن عبد اللہ بن عمروؓ)	(ترجمہ) "میری اُمت پر بھی مصائب و حوادث اسی طرح واقع ہوں گے جیسے بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی

اور دوسری جانب اُمت کے داخلی احوال و کوائف[1] اور اعمال[2] و اشغال کے ضمن میں آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ:

---

[1] ان سطور کے راقم نے جب اِس حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں اُمتِ مُسلمہ کی تاریخ کا بنظرِ غائر جائزہ لیا تو اسے اُمت کی گذشتہ چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران دو بار

"لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلُوا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْهُمْ — قِيْلَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَلْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ: فَمَنْ؟"

(بخاریؒ و مسلمؒ عن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ)

(ترجمہ) "حضورؐ نے فرمایا: "تم لازماً ان لوگوں (کے طور طریقوں) کی پیروی کرو گے جو تم سے پہلے گذرے ہیں، بالشت کے ساتھ بالشت اور ہاتھ کے ساتھ ہاتھ (کے انداز میں) یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بِل میں گھسے تھے تو تم بھی ان کی پیروی کرو گے!" پوچھا گیا: "حضور! کیا یہود اور نصارٰی (مراد ہیں)؟" فرمایا: "تو اور کون؟"

(اِس حدیث کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا)

واقعہ یہ ہے کہ اِس حدیثِ مبارک کی عظمت اور صد فی صد حقانیت کا کسی قدر اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب انسان بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد شدہ اُس مفصّل فردِ جُرم کی روشنی میں اُمّتِ مسلمہ کی موجودہ دینی واخلاقی اور ایمانی و عملی حالت کا جائزہ لیتا ہے جو سورۂ بقرہ کے چھٹے رکوع سے شروع ہو کر پندھرویں رکوع کے آغاز تک پھیلی ہوئی ہے۔ اِس لیے کہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نظری و فکری، اعتقادی و ایمانی اور اخلاقی و عملی گمراہی ایسی نہیں ہے جو سابقہ اُمّت میں پیدا ہوئی ہو اور موجودہ اُمّتِ مسلمہ اس سے بچی رہ گئی ہو۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو بالکل ایسے لگتا ہے جیسے کہ یہ سارا خطاب "در حدیثِ دیگراں" کے انداز میں اصلاً اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے ہو رہا ہے!

(حاشیہ گذشتہ صفحے سے پیوستہ)
عروج اور دو ہی بار زوال کا بعینہٖ وہی نقشہ نظر آیا جو بنی اسرائیل کی تاریخ کے خلاصے کے ضمن میں سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اب سے ٹھیک گیارہ سال قبل راقم نے اپنے اسی مشاہدے اور غور و فکر کے نتیجے کو میثاق بابت اکتوبر، دسمبر ۱۹۷۰ء میں شائع کر دیا تھا اور اب وہ تحریر راقم کی تالیف "سرافگندیم" میں بطور مقدمہ شامل ہے اور برادرم ڈاکٹر ابصار احمد کے قلم سے اس کا انگریزی ترجمہ بھی "RISE AND DECLINE OF THE MUSLIM UMMAH" کے نام سے طبع ہو کر موجود ہے۔

برِصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ اور تاریخ بنی اسرائیل

کے ابتدائی دَور کے مابین حیرت انگیز مماثلت

متذکرہ بالاکُلّی مشابہت اور مماثلت کے ساتھ ساتھ بعض جزوی مشابہتوں کا معاملہ مزید حیران کُن ہے۔ بالخصوص برِصغیر پاک و ہند کی مسلمان قوم کی ماضیٔ قریب کی تاریخ اور ملتِ اسلامیہ پاکستان کے موجودہ احوال و کوائف اور تاریخ بنی اسرائیل کے اوّلین دَور کے حالات و واقعات کے مابین جو مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے اُس کی تو غالباً کوئی دوسری نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہ مل سکے!

بنی اسرائیل کی معجزانہ نجات

سب جانتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کے زمانے میں مصر میں آباد ہونے کے بعد کئی صدیوں تک بنی اسرائیل مصر میں نہایت عیش و آرام کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد تدریجاً حالات میں انقلاب آیا اور اُن پر شدائد و مصائب کے اُس دَور کا آغاز ہو گیا جو حضرتِ موسیٰ علیہ السّلام کی بعثت سے متصلاً قبل اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل اُس زمانے میں جن حالات سے دوچار تھے اُن کی تعبیر قرآنِ مجید کے متعدد مقامات پر قلیل فرق و تفاوت کے ساتھ ان الفاظ میں ہوئی ہے:

"يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ	(ترجمہ) "وہ چکھاتے تھے تمہیں بدترین عذاب
يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ	کا مزہ (یہاں تک کہ) ذبح کر ڈالتے تھے
وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ	تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تھے
وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ	تمہاری عورتوں کو اور اس میں یقیناً
رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ۝"	تمہارے لیے تمہارے ربّ کی جانب سے
(البقرہ: ۴۹)	بڑی آزمائش تھی۔"

—— (واضح رہے کہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۴۱ میں بھی یہ الفاظ مبارکہ جُوں کے تُوں وارد

ہوتے ہیں، صرف اس ایک فرق کے ساتھ کہ "یُذَبِّحُوْنَ" کی بجائے "یُقَتِّلُوْنَ" کا لفظ استعمال ہوا ہے) چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہی اللہ تعالیٰ کے اِس ارادے اور مشیت کے ساتھ ہوئی تھی کہ اُن کے ذریعے بنی اسرائیل کو اِس عذاب سے نجات دلائی جائے، چنانچہ سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ ۝" (القصص: ۵)

(ترجمہ) "اور ہم چاہتے تھے کہ احسان فرمائیں ان لوگوں پر جنہیں زمین میں دبا لیا گیا تھا اور بنا دیں ان ہی کو سربراہ اور بنا دیں ان ہی کو (زمین کا) وارث!"

اور اگرچہ آنجنابؑ کی بعثت کے مقاصد میں وہ جملہ اُمور بھی لازماً شامل تھے جن کے لیے تمام انبیاء و رسل مبعوث کیے گئے۔ یعنی دعوت الی اللہ اور شہادت علی الناس، تاہم آپؑ کی بعثت کا ایک خصوصی مقصد بنی اسرائیل کی نجات تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منصبِ رسالت پر فائز ہونے کے بعد فرعون سے اپنی پہلی ہی ملاقات میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے یہ مطالبہ پیش فرما دیا کہ:

"اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ" (طٰہٰ: ۴۷)

(ترجمہ) "ہم دونوں تمہاری جانب تمہارے رب کے پیغامبر ہیں۔ پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو اور اُن کو مت ستاؤ۔"

اِس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ، انذار و تبشیر اور فرمائش و فہمائش پر فرعون اور آلِ فرعون کی جانب سے کیا ردِ عمل ظاہر ہوا۔ اور کس طرح "تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ" (بنی اسرائیل: ۱۰۱) یعنی نو عظیم معجزات دیکھنے کے باوجود "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!" کے مصداق نہ صرف یہ کہ اُن کے کفر و اعراض اور تعلّی و استکبار میں اضافہ ہوتا چلا گیا بلکہ خود بنی اسرائیل پر اُن کے تشدد کی شدت

بڑھتی چلی گئی ـــــ بہر حال یہ طویل داستان جس نتیجے پر منتج ہوئی وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالےٰ نے پے بہ پے معجزات کے ذریعے نجات عطا فرمائی۔ چنانچہ ان کی نگاہوں کے سامنے حضرتِ موسیٰؑ کے عصا کی ایک ہی ضرب سے سمندر پھٹا جس سے اُن کے بیچ نکلنے کی سبیل پیدا ہوئی۔ پھر عین اُن کی نگاہوں کے سامنے اُن کا دشمن پورے لاؤ لشکر سمیت غرق ہُوا، پھر عصا کی ایک ہی ضرب سے ایک چٹان سے اُن کے لیے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، بے آب وگیاہ بیابان میں اُن کے لیے من و سلویٰ کی صورت میں غذا نازل فرمائی گئی، انہیں دھوپ کی شدت و تمازت سے بچانے کے لیے غَمام کا اہتمام کیا گیا۔ بعدازاں الواح کی صورت میں تورات عطا فرمائی گئی اور اُس کی پیروی اور شریعت کی پابندی کا عہد و میثاق لیتے ہوئے کوہِ طُور کو ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا۔

ابتدائی کم ہمتی اور بعد کی عزیمت کا سبب

موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے اصل غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ ہجرت سے قبل مصر میں آلِ فرعون کے ساتھ خود بھی "تِسۡعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ" کا مشاہدہ بچشمِ سر کر چکنے اور پھر سفرِ ہجرت کے دوران متذکرہ بالا جملہ آیات و معجزات کا مشاہدہ ہی نہیں تجربہ کر چکنے کے باوجود بنی اسرائیل نے اللہ کے جلیل القدر پیغمبرؑ اور اپنے عظیم نجات دہندہ کے ساتھ مسلسل نافرمانی اور اذیت رسانی کا وہ طرزِ عمل کیوں اختیار کیا جس پر رسولؑ کو یہ فریاد کرنی پڑی کہ:

"یٰقَوۡمِ لِمَ تُؤۡذُوۡنَنِیۡ وَقَدۡ تَّعۡلَمُوۡنَ اَنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ۔" (الصّف: ۵)

(ترجمہ) "اے میری قوم کے لوگو! مجھے کیوں اذیت پہنچا رہے ہو درآں حالیکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں!"

اس لیے کہ ان کے اسی طرزِ عمل کا نقطۂ عروج ہے وہ واقعہ جس کا آغاز میں ذکر ہو چکا ہے۔ یعنی حضرتِ موسیٰؑ کی تمام تر ترغیب و تحریض اور فرمائش و فہمائش کے باوجود قتال فی سبیل اللہ سے اعراض و انکار! ـــــ جس کی پاداش میں اُن پر چالیس سالہ صحرا نوردی مسلط کر دی گئی

چنانچہ وہ چالیس برس بیابان سینا ہی میں (IN THE WILDERNESS OF SINAI)
بھٹکتے رہے اور " يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ " کی مناسبت سے اُس کا نام ہی "صحرائے
تیہہ" پڑ گیا ـــــ پھر اسی مسئلے کا تتمہ یا تکملہ ہے یہ سوال کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اُسی قوم
کی اگلی نسل میں اتنی ہمت و عزیمت پیدا کر دی اور اُس کی اِس درجہ کایا پلٹ کر رکھ دی کہ اس
کے باوجود کہ وہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام ایسے جلیل القدر پیغمبروں کی صحبت و معیت
سے محروم ہو چکے تھے اور ان کی سربراہی و رہنمائی کے فرائض وہ شخص ادا کر رہا تھا، جس کی
نبوت اور رسالت کا کوئی صریح ثبوت کم از کم قرآنِ حکیم میں موجود نہیں ہے
ـــــ (یعنی حضرتِ یوشع بن نون) تاہم انہوں نے اس کی سرکردگی میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ
کے جملہ مراحل بحسن و خوبی طے کیے۔ چنانچہ وہ ارضِ مقدس جو چالیس برس تک کے لیے
ان پر حرام کر دی گئی تھی، ان کے ہاتھوں فتح ہوئی اور اُن کے دورِ غربت کا خاتمہ اور دورِ
عروج کا آغاز ہو گیا؟ ـــــ ؟؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ حضرت موسیٰؑ
کی معیت میں مصر سے نکلے تھے، وہ نسلاً بعد نسلٍ غلامی کی چکی میں پستے رہنے کے باعث
بزدل اور بودے ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک جانب اُن میں سے اکثر کی غیرت و حمیت کچلی
جا چکی تھی اور دوسری جانب وہ عزیمت و مقاومت سے عاری اور تہی دست ہو چکے تھے۔
اور ماضی قریب کی شدید ترین تعذیب (PERSECUTION) نے تو گویا اُن کے حوصلے
اور قوتِ ارادی کا جنازہ نکال دیا تھا، چنانچہ وہ مصر میں شدید ترین محنت و مشقت تو
کرتے تھے لیکن خود اپنے عزم و ارادے کی اساس پر نہیں بلکہ آلِ فرعون کے کوڑوں اور
ڈنڈوں کے خوف سے ـــــ اِس کے برعکس بنی اسرائیل کی جس نسل نے جہاد و قتال کی
پُرعزیمت راہ اختیار کی وہ وہ تھی جو آزادی کی فضا میں پیدا ہوئی اور اسی فضا میں پلی بڑھی
اور پروان چڑھی چنانچہ اُن میں غیرت و حمیت کے اوصاف بھی پیدا ہوئے اور عزتِ نفس
اور خودداری کے احساسات بھی! ـــــ اور اس سونے پر سہاگے کا کام کیا صحرا کی
پُرصعوبت زندگی نے جس سے اُن میں سخت کوشی اور جفاکشی کی عادت پیدا ہوئی اور بقوا

علامہ اقبال مرحوم سے

" فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی ۔۔۔ یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی "

مسلمانانِ ہند پر انگریز کی دو صد سالہ غلامی کے اثرات

ان حقائق کی روشنی میں

اب ذرا غور کیجئے مسلمانانِ ہند کی ماضیٔ قریب کی تاریخ اور ملّتِ اسلامیہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال پر!

صنم خانۂ ہند میں اسلام کا وُرودِ اوّل ۷۱۲ء میں ہُوا اور اس وقت سے لے کر ۱۷۵۷ء تک یعنی ایک ہزار سال سے زائد عرصہ برِّصغیر پر مسلمانوں نے جزوی یا کلّی طور پر حکومت کی! اس کے بعد لگ بھگ دو سو برس انگریز کی غلامی میں گذرے اور اس دو صد سالہ غلامی کے دوران برِّصغیر کے بعض علاقوں میں مسلمانوں کی کم و بیش آٹھ اور بعض علاقوں میں لگ بھگ چھ نسلیں بیت گئیں اور کیسے ممکن تھا کہ اس کے اثرات و نتائج کا ظہور نہ ہوتا!

یہ درست ہے کہ ان دو سو سالوں کے دوران انگریز کی جانب سے بڑے پیمانے پر ظلم و تشدّد، قتل و غارت اور لُوٹ مار کا معاملہ تو ایک ہی بار ہُوا یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد۔ اس سے قبل کے سو سالہ دَور میں یا میدانِ جنگ میں کھلے مقابلے کا معاملہ رہا یا میدانِ سیاست کے دجل و فریب، بدعہدی و بے وفائی اور مکّاری و سیہ کاری کا ۔۔۔ اور بعد کے نوّے سالوں کے دوران بھی اگرچہ دینی حمیت اور جذبۂ حُرّیت سے سرشار بے شمار مسلمان، بالخصوص علماءِ کرام، قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے، جیل خانوں میں تعذیب و تشدّد کا نشانہ بنتے، پھانسی کے پھندوں میں جھُولتے یا حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کی سزائیں پاتے نظر آتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اُن کی کُل تعداد ہندوستان کے مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے اعتبار سے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں بنتی! ۔۔۔ تاہم عہدِ حاضر کے اس بدترین استعمار نے ایک جانب مسلمانانِ برِّصغیر کی بحیثیتِ مجموعی غیرت و حمیت اور خودداری و عزّتِ نفس کو کچلنے کے لیے وہ تمام حربے استعمال کیے جو ہمیشہ سے استعماری

قوتوں کا معمول رہے ہیں ــــ یعنی :

" اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا	(ترجمہ) "یقیناً بادشاہ جب کسی بستی
قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا	(یا ملک) میں (فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں
اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً ج	تو اس میں فساد برپا کردیتے ہیں اور اُس
(النمل : ۳۴)	کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں !"

جس کی بہترین تعبیر کی ہے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ان اشعار میں : ؎

" آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ 'اِنَّ الْمُلُوْكَ' سلطنتِ اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری!
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکُن تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری"

نتیجتہً ان دو سالوں کے دوران ع " کہ غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے !" کے مصداق اسلامیانِ ہند کا جو فرد یا گروہ غیرت و حمیت اور عزتِ نفس کے اعتبار سے جتنا 'ہلکا' ہوتا چلا گیا اُتنا ہی اُوپر اُٹھتا اور سرکار دربار میں 'باعزت' بنتا چلا گیا اور جن کے قدموں میں غیرت و حمیت کی بیڑیاں پڑی رہ گئیں، وہ معاشی و معاشرتی اعتبار سے پست سے پست تر ہوتے چلے گئے ــــ اور دوسری جانب عہدِ حاضر کے اِس 'فرعونِ جدید' نے " يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ " کی ایک نئی اور بظاہر بڑی معصوم اور بے ضرر لیکن حقیقتاً حد درجہ مؤثر اور تیر بہدف صورت اختیار کی ــــ یعنی ایک نئے نظامِ تعلیم کے ذریعے انگریزی زبان اور مغربی تہذیب و تمدن کی ترویج اور اس 'ثقافتی انقلاب' کے ذریعے نئی نسلوں کا اپنے ماضی سے کامل انقطاع جو قومی و ملّی سطح پر قتلِ عام سے ہرگز کم نہیں اور گویا " يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ " کی جدید اور مہذب صورت ہے ــــ بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم ؎

" یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!"

قومی و اجتماعی سطح پر اِس 'کردار کشی' کا جو نتیجہ نکلا اُسے کسی صاحب ؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ :-

"میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں اُلجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے!
نئی تہذیب کی بے رُوح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے!"

اور اس جلتی آگ پر تیل کا کام کیا "آزادیٔ نسواں" کی اُس تحریک نے جس نے ہمارے عائلی سماجی نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا، خاندان کے مقدس ادارے کی چُولیں ہلادیں، شرم و حیا کا دیوالہ نکال دیا اور عصمت و عفت کے معیارات ختم کر دیے ـــــ اور اس طرح گویا "وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ" کی ایک جدید تفسیر عملاً پیش کر دی۔

پنجاب اور سرحد کا اضافی المیہ

اس اعتبار سے بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ وسطی پنجاب اور اس سے ملحقہ صوبۂ سرحد کے علاقے کے مسلمان ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہی بدقسمت اور مظلوم ثابت ہوئے اس لیے کہ اُن پر انگریزوں کی غلامی سے متصلاً قبل، اوّلاً سکھوں کی دہشت گردی، لُوٹ مار اور قتل و غارت گری اور بعد ازاں باضابطہ "سکھا شاہی" مسلط رہی جو یقیناً "یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ" کی بدترین صورت تھی۔ نتیجۃً ایک طرف تو اُن کی خودی اور عزتِ نفس زیادہ ہی پامال ہوئی، اور اُن کی غیرت و حمیت کچھ زیادہ ہی مجروح ہوئی اور دوسری طرف انہوں نے انگریز کی آمد کو غنیمت جانا اور اپنی نجات کا ذریعہ سمجھا اور اس طرح کہ ـــــ
"کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!" کی صورت پیدا ہو گئی! یہی وجہ ہے، کہ اس علاقے کے مسلمانوں نے اوّلاً ۱۸۵۷ء میں انگریز کی مدد کی اور ان ہی کی مدد سے انگریزوں نے دوبارہ دہلی کو فتح کیا اور ثانیاً انگریز کے "ثقافتی انقلاب" کا دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ ہی دلی آمادگی سے خیر مقدم کیا اور ان کے دلوں میں انگریز کے خلاف نفرت و بغاوت کے وہ جذبات کبھی پیدا نہ ہو سکے جو بقیہ ہندوستان کے اُن مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوئے جن سے انگریز نے براہِ راست حکومت چھینی تھی!

ہندوؤں کی جانب سے انتقامی طرزِ عمل کا اندیشہ

مزید غور کیا جائے تو نظر آتا ہے، کہ

ہندوستان کی مسلمان قوم کا المیہ دوہرا تھا: اس لیے کہ جہاں ایک جانب انگریز کی غلامی کے نتیجے میں اُن کی غیرت و حمیت، ہمت و عزیمت اور خودی و عزتِ نفس کے سوتے خشک ہو رہے تھے وہاں دوسری جانب اُن ابنائے وطن کے دِلوں میں اُن کے خلاف نفرت و انتقام اور بُغض و عداوت کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔ جن پر انہوں نے ہزار سال سے زائد عرصہ تک حکومت کی تھی۔ نفرت و انتقام کے اس جذبہ کو اوّلین سشہ تو اگرچہ بیرونی استعمار ہی سے ملی تھی لیکن بعدازاں یہ خود ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا تھا اور اس کی جڑیں زمین میں بہت گہری اُتر گئیں تھیں اور آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل تو یہ جذبہ نفرت و انتقام ایک خوفناک عفریت کی مانند چنگھاڑتا ہُوا بڑھتا نظر آ رہا تھا! —— اس سب پر مستزاد یہ کہ مسلمانانِ ہند اپنے ابناءِ وطن کے مقابلے میں تعداد کے اعتبار سے تو ایک چوتھائی تھے ہی، تعلیم و تنظیم اور سرمایہ و وسائل کے اعتبار سے بھی بہت پیچھے تھے —— نتیجتہً ایک شدید خوف اور سراسیمگی کی حالت اُن پر طاری ہو گئی تھی!

پاکستان کا معجزانہ قیام اور معجزے کا اصل سبب

ان حالات میں واقعہ یہ ہے کہ برِّ صغیر میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت کا بیک وقت انگریزوں کی بالفعل موجود اور ہندوؤں کی ممکنہ و قابلِ حذر غلامی سے نجات پا کر ایک آزاد اور خود مختار ملک کا مالک بن جانا اور دنیا کے نقشے پر وقت کی عظیم ترین مسلمان مملکت کا دفعتہً ظہور ہرگز ایک معجزے سے کم نہ تھا اور یہ معجزہ بھی، جیسے کہ ہم انشاء اللہ بعد میں تفصیلاً واضح کریں گے صرف ایک ہی واقعہ کے معجزانہ ظہور کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے متذکرہ بالا 'سلسلۂ معجزات' کے مانند متعدد معجزات کا مجموعہ ہے!

آگے بڑھنے سے پہلے اِس سوال کا جواب بھی سامنے آجانا چاہیئے کہ یہ معجزہ کیوں رونما ہُوا؟

جن لوگوں کی نگاہیں "یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (الروم: ۷)

کے مصداق صرف ظاہر تک ہی محدود رہتی ہیں اور جن کا غور و فکر حیاتِ دنیوی اور نظامِ کائنات گویا آفاق و انفس کے ضمن میں صرف مادی اسباب و علل اور ان کے نتائج و عواقب ہی تک محدود رہتا ہے انہیں تو شاید یہ بہت دُور کی کوڑی نظر آئے لیکن جو اِس نظامِ عالم کے "باطن" سے بھی کسی قدر شناسا ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ پورا سلسلۂ اسباب ایک مُسبب الاسباب تبارک و تعالیٰ کے ارادہ و مشیّت کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہے۔ وہ اگر قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات پر غور کریں تو اس حقیقت کو پالیں گے کہ یہ اللہ عزّ و جلّ کی سنّتِ ثابتہ رہی ہے کہ جب کوئی فرد اور بالخصوص کوئی قوم اللہ سے کوئی وعدہ کرتے ہوئے کسی چیز کا سوال کرتی ہے تو اللہ اُسے وہ چیز عطا فرما کر ایک موقع ضرور عنایت فرماتا ہے کہ وہ اپنے قول کی صداقت اور وعدے کی سچّائی ثابت کرسکے۔

قومی و اجتماعی سطح پر تو اِس سنّت اللہ کی جانب واضح اشارہ تاریخ بنی اسرائیل کے ضمن ہی میں موجود ہے۔ چنانچہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۲۹ میں حضرت موسیٰؑ کا یہ قول نقل ہُوا ہے:

"عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ	(ترجمہ) "قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو
عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ	ہلاک کردے اور تمہیں زمین میں خلافت
فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ	عطا فرما دے ــــ اور پھر دیکھے کہ تم کیا
تَعْمَلُوْنَ ۝"	روش اختیار کرتے ہو!"

اور شخصی و انفرادی سطح پر منافقین مدینہ کے ایک گروہ کے رویّے کے ضمن میں اِس سنّت اللہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کی آیات ۷۵، ۷۶، ۷۷ میں مذکور ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ	(ترجمہ) "اُن میں سے بعض وہ بھی ہیں
لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ	جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ
لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ	ہمیں اپنے فضل سے (دولت) عطا
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّا	فرمائے گا تو ہم خوب خیرات کریں گے

اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ‘‘

اور لازماً نیک لوگوں میں سے ہو جائیں گے
پھر جب اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے
نوازا تو انہوں نے اس میں بخل کیا اور رُخ
موڑ لیا پہلو تہی کرتے ہوئے!‘‘

خوب اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ قیامِ پاکستان کا معجزہ بھی اسی سُنّت اللہ کے تحت ظاہر ہُوا۔ اِس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے عوامی اور جذباتی دَور میں جو ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء دو سالوں پر مشتمل ہے پورا بّرِصغیر از درّہ خیبر تا راس کماری اور از مکران تا چاٹگام اِس نعرے سے گونج اٹھا تھا کہ ’’پاکستان کا مطلب کیا! لا الٰہ الّا اللہ!‘‘ اور تحریک کے زعماء و عمائد کے صریح اور ببانگِ دہل اعلانات و بیانات پر مستزاد جمعہ اور عیدین کے عظیم اجتماعات میں کروڑوں مسلمانوں نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں کیں تھی۔
اور عہد کیا تھا کہ اے اللہ! ہم اِس دوہری غلامی سے نجات پا کر صرف تیرے بندے بن کو رہیں گے اور تیرے اور تیرے نبی صلّی اللہ علیہ وسلم ہی کے دین پر عمل پیرا ہوں گے۔
واقعہ یہ ہے کہ یہ اسی عہد و میثاق کا نتیجہ تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے حالات کا رُخ بدل گیا، کایا پلٹ کر رہ گئی اور زنجیریں کٹتی چلی گئیں۔ بقول اقبالؔ :

’’غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!‘‘

قیامِ پاکستان کے بعد کا طرزِ عمل

ملّتِ اسلامیہ پاکستان کا آزادی کے بعد کا طرزِ عمل بھی حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں کے طرزِ عمل سے بہت مشابہ و مماثل ہے۔ نتیجتہً جس صورتِ حال سے وہ دوچار رہے اور جس کیفیت میں وہ تاحال مبتلا ہیں وہ بھی نہ صرف بنی اسرائیل کے مشابہ و مماثل بلکہ بعض اعتبارات سے اُن سے بھی بدتر اور مایوس کُن ہے!
موسےٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی آزمائش تو بڑی کڑی تھی اِس لیے کہ انہیں ملک

کے حصول کے لیے جنگ کی دعوت دی گئی تھی جس پر اُن کی کئی سو سالہ غلامی کے اثرات کا ظہور 'بزدلی' کی صورت میں ہُوا۔ یہاں بغیر جنگ و قتال دو وسیع و عریض خطّوں پر مشتمل ایک عظیم الشان مملکت عطا فرما دی گئی تھی اور اب صرف اپنے قول کی صداقت اور وعدہ کی سچائی ثابت کرنے کی ضرورت تھی لیکن افسوس کہ یہاں دو صد سالہ غلامی کے اثرات کا ظہور 'وعدہ خلافی' کی صورت میں ہُوا۔ اور ملّتِ اسلامیہ پاکستان بحیثیتِ مجموعی اپنی تمام دعاؤں اور التجاؤں اور درخواستوں اور عرضداشتوں کو بھُلا کر اور کُل عہد و میثاق اور قول و قرار کو فراموش کر کے آزادی کے مادی ثمرات اور دنیوی انعامات سمیٹنے کے ضمن میں تکاثر و تنافس اور مقابلہ و مسابقت کی دَوڑ میں مگن ہی نہیں گم ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ یہاں سزا بھی دوہری ملی:

ایک بے یقینی، اور بے مقصدیت کے

بے یقینی اور بے مقصدیت کا صحرائے تیہہ

'صحرائے تیہہ' میں سرگردانی کی کیفیت جس کی شدت میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا اور تاحال ہو رہا ہے — یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان دولخت ہُوا اور نہ صرف یہ کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیحدہ ہُوا بلکہ اُس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا اور اس طرح گویا اپنے تعارف و تشخص ہی کو بدل ڈالا اور اپنے ماضی سے کم از کم وقتی طور پر بالکل لاتعلقی اختیار کر لی۔ — اور یہ بھی اسی کا مظہر ہے کہ تاحال یہ دونوں خطّے ملکی، قومی اور سیاسی و دستوری سطح پر عدمِ توازن اور عدمِ استحکام کا شکار ہیں اور فانی کے اس شعر کا مصداق کامل بنے ہُوئے ہیں کہ: ؎ "ہم تو فانی جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن

غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا"

یا اس شعر کا کہ ؎ سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

جس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ: ؎

"نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم!"

چنانچہ ایک طرف اپنا حال یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے اغراض و مقاصد ہی بحث و نزاع

کا موضوع اور اختلاف و انتشار کا عنوان بنے ہوئے ہیں اور اس ضمن میں بزرگوں کے پیدا کردہ انتشارِ ذہنی کا نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل حیران و پریشان ہے کہ پاکستان کیوں معرضِ وجود میں آیا تھا؟ اور آیا اس قافلۂ ملی کی کوئی منزلِ مقصود تھی بھی یا نہیں جس نے پاکستان حاصل کیا؟ — بلکہ یہاں تک کہ آیا تقسیمِ ہند کا کوئی جواز تھا بھی کہ نہیں! — نتیجۃً ملی و قومی سطح پر ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں چنانچہ زعماء و قائدین اور اصحابِ فکر و دانش تک کی سعی و جہد اور تگ و تاز کا حال اس مصرع کا مصداق ہے کہ بقول "آہ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!" تو بے چارے عوام کا کیا قصور اگر وہ اس شعر کے مصداق کامل بن گئے ہوں کہ ؎

"چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں!"

اور اس صورت حال کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ ریاست کے دستورِ اساسی کے اعتبار سے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں بھی 'سلطنتِ خداداد پاکستان' "ہنوز روزِ اوّل است" کا نقشہ پیش کر رہی ہے اور اس شعر کی مصداقِ اتم ہے کہ ؎

"اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں اس فکر میں غنچے سوکھ گئے
آئینِ گلستاں کیا ہوگا؟ — دستورِ بہاراں کیا ہوگا؟"

اور دوسری طرف اغیار پھبتیاں چست کر رہے ہیں۔ چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان تا حال کسی تشخص کی تلاش میں ہے[1] اور کوئی فیصلہ صادر فرما دیتا ہے کہ پاکستان اپنا جواز کھو چکا ہے[2] اور کوئی اس سے بھی آگے بڑھ کر فیصلہ کن انداز میں پیشگوئی کر دیتا ہے کہ پاکستان ٹوٹنے ہی والا ہے اور اس کے حصے بخرے ہونے ہی والے ہیں۔[3]

نفاقِ عملی اور پستیٔ کردار

دوسری سزا جس سے ملتِ اسلامیہ پاکستان اس ذلت دوچار ہے وہ یہ کہ معدودے چند افراد کو

---

[1] "(PAKISTAN IS STILL IN SEARCH OF AN IDENTITY.)"

[2] "(PAKISTAN HAS LOST ITS RATIONALE)"

[3] PAKISTAN IS AT THE VERGE OF DISINTEGRATION OR

چھوڑ کر پوری قوم نفاقِ عملی کی اُس کیفیت میں مبتلا ہو چکی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیثِ مبارکہ میں سامنے آتا ہے:

۱۔ عن ابی ھریرۃ رضی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اٰیۃ المنافق ثلاث: زاد مسلم: وان صام وصلّی وزعم انہ مسلم، ثم اتفقا: اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا اؤتمن خان۔	(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "منافق کی نشانیاں تین ہیں" یہاں امام مسلم رح نے مزید الفاظ روایت فرمائے ہیں کہ "خواہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو" اس کے بعد بخاری رح اور مسلم رح کے متفق علیہ الفاظ ہیں کہ "جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے اور جب امانت کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب کرے۔" (بخاری رح و مسلم رح)
۲۔ وعن عبد اللہ ابن عمرو رضی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اربع من کن فیہ کان منافقا خالصا ومن کانت فیہ خصلۃ منھن کانت فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھا: اذا اؤتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر۔ (متفق علیہ)	(ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چار باتیں جس شخص میں موجود ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی اس میں اسی کی نسبت سے نفاق ہوگا۔ یہاں تک کہ اُسے چھوڑ دے: جب امانت کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب عہد کرے تو بے وفائی کرے اور

جب (کسی سے) جھگڑے تو آپے سے باہر ہو جائے۔"

چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ ہم قومی و ملی سطح پر اخلاق کا دیوالہ نکل جانے کی کیفیت (MORAL CRISIS) سے دوچار ہیں۔ آٹے میں نمک کی حیثیت کے حامل افراد کو علیحدہ رکھتے ہوئے واقعہ یہ ہے کہ قومی اور اجتماعی سطح پر صداقت و امانت اور شرافت و مروّت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اور ایفاء عہد اور پاسِ امانت کا دُور دُور تک نشان نہیں ملتا۔ انفرادی اعتبار سے خالص خود غرضی اور عریاں مفاد پرستی کا دور دورہ ہے اور قومی مصالح اور ملی مفادات سے کسی کو کوئی غرض نہیں رہی، معاملات میں بدعہدی اور بد دیانتی بلکہ باضابطہ مکاری اور چالبازی کی گرم بازاری ہے۔ تجارت اور لین دین میں دھوکے اور فریب سے بھی بڑھ کر کھانے پینے کی چیزوں حتّٰی کہ ادویات تک میں ملاوٹ گویا معمولی بات بن کر رہ گئی ہے۔ سرکاری محکموں اور دفتروں میں رشوت ستانی کا بازار تو گرم ہے ہی باضابطہ اذیت رسانی اور لوگوں کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا تفریح اور مشغلے کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور معاشرتی اور سماجی سطح پر سنگدلی اور سفاکی نے ڈیرے جما لیے ہیں تو سیاسی و حکومتی سطح پر بھی جھوٹ اور وعدہ خلافی نے 'ORDER OF THE DAY' کی صورت اختیار کر لی ہے اور ہر سوچنے سمجھنے والا اور حساس شخص حیران و پریشان ہے کہ:

" یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!"

نفاق عملی کا سبب اور اس کا قابلِ حذر انجام

"نفاقِ عملی" کی یہ کیفیت

جس کا ہلکا سا نقشہ سطور بالا میں کھینچا گیا ہے براہِ راست نتیجہ ہے اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی کا۔ چنانچہ اس سے قبل سورۂ توبہ کی آیات ۷۵، ۷۶، ۷۷ کے حوالے سے نفاق کی جس خاص قسم کا ذکر ہوا ہے اُس کے بارے میں آیت نمبر ۷۷ میں صراحت موجود ہے کہ یہ بدعہدی کی سزا کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

" فَاَعۡقَبَہُمۡ نِفَاقًا فِیۡ (ترجمہ)۔ تو اللہ نے سزا کے طور پر ان

قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَہٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰہَ مَا وَعَدُوْہُ وَ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ۔"

کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اُس دن تک کے لیے جب وہ اُس کے حضور حاضر ہوں گے بہ سبب اس کے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا، اس کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس جھوٹ کے جو وہ بولتے تھے! "

اس آیۂ مبارکہ میں ایک لرزہ طاری کر دینے والی وعید بھی ہے کہ "یہ نفاق اب اس دن تک قائم رہے گا جس دن یہ لوگ اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے" ــــ اس پر قیاس کرتے ہوئے ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں یاس اور ناامیدی کے گھٹاٹوپ اندھیرے لگا ہوں کے سامنے چھا جاتے ہیں ــــ اور اس ضمن میں اس سے بھی بڑھ کر لرزہ انگیز ہے اِسی سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۱۱۰ وَھِیَ ھٰذِہٖ :

" لَا یَزَالُ بُنْیَانُہُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَۃً فِیْ قُلُوْبِہِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُہُمْ "

(ترجمہ: (نفاق کی) جو عمارت ان لوگوں نے تعمیر کرلی ہے اب یہ ان کے دلوں میں شکوک و شبہات کی صورت میں ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اِلّا یہ کہ اُن کے دل (خود) ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں ۔"

اور اس سے ذہن بے اختیار منتقل ہو جاتا ہے اُن متذکرہ بالا پیشنگوئیوں کی طرف جو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں دنیا کے بہت سے سیاسی تجزیہ نگار کر رہے ہیں کہ یہ اپنی یک جہتی اور سالمیت کو برقرار نہیں رکھ سکے گا اور مستقبلِ قریب میں مزید حصّے بخرے ہونے کے عمل (BALKANISATION) سے دوچار ہو جائے گا۔

وَالْعِیَاذُ بِاللّٰہِ ۔ رَبَّنَا اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِكَ ! (اے اللہ ! اے ہمارے رب! ہمیں اس انجام سے بچا اور اپنی پناہ میں رکھ !)

الغرض! بے یقینی اور بے مقصدیت کے دھندلکوں پر انفرادی اور اجتماعی اخلاق

کے اس دیوالہ پن اور نفاقِ عملی کے گھٹاٹوپ اندھیروں نے بالکل "ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" ؂ کی کیفیت پیدا کردی ہے اور ملک و ملت کے مستقبل کو نہایت تاریک بنا کر رکھ دیا ہے اور حالات و واقعات کے اِس "صغریٰ" کو قوموں کے عروج و زوال کے ضمن میں قدرت کے اٹل اصولوں اور اسباب و علل اور عواقب و نتائج کے باہمی لزوم کے "کبریٰ" کے ساتھ جوڑ کر قیاس کیا جائے تو حاصل سوائے مایوسی اور نا اُمیدی کے اور کچھ نہیں بنتا ــــــ اور حساب کتاب کے کسی بھی قاعدے سے اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔

پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال

اور اُمید کی ایک کرن

یاس و نومیدی کی اِس شدت کے عالم میں، حال ہی میں، راقم الحروف کے شعورِ باطنی کے پردے پر، چالیس سال کی مدت کے حوالے سے اُمید کی ایک کرن جگمگائی ہے اور اس اچانک انتقالِ ذہنی نے کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان نے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھ دیا ہے۔ تاریخ بنی اسرائیل کے متذکرہ حوالے کے ناطے میرے نہاں خانۂ قلب میں اُمید کا ایک چراغ روشن کر دیا ہے۔ اور اس خیال نے زور باندھا ہے کہ ہماری بھی وہ نئی نسل جو قیامِ پاکستان کے بعد آزادی کی فضا میں پیدا ہوئی اور آزادی ہی کی فضا میں پروان چڑھی، تا آنکہ اب شعوری پختگی کی عمر کو پہنچ چکی ہے اور اگرچہ فی الوقت اپنے بزرگوں کے پیدا کردہ انتشارِ ذہنی و فکری کے باعث "زوالِ علم و عرفاں" سے بھی دوچار ہے اور بزرگوں ہی کی کوتاہیٔ عمل اور نقضِ میثاق سے پیدا شدہ صورتِ حال کی بنا پر اخلاقی اور عملی اعتبار سے

؂ سورۃ النور آیت نمبر ۴۰ ـ ترجمہ "اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر تہہ بر تہہ!"

بھی قابلِ رشک حالت میں نہیں ہے ــــ تاہم غلامی کے منحوس اثرات سے بہر حال محفوظ رہی ہے لہٰذا غیرت و حمیت اور جرأت و ہمت کے اعتبار سے یقیناً پچھلی نسل سے بہتر حالت میں ہے اور نہ "ندرتِ افکار" سے بالکل تہی دست ہے نہ "جرأتِ کردار" سے محرومِ محض ــــ اگر کسی طرح اُسے بھُولا ہُوا سبق یاد دلا دیا جائے اور اُس منزل کی از سرِ نو نشاندہی کر دی جائے جس کے حصول کے لیے آج سے نصف صدی قبل برِصغیر پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ نے سفر کا آغاز کیا تھا تو کیا عجیب کہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کی عمر کا یہ چالیسواں سال ایک فیصلہ کُن موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت حاصل کر لے اور ع "کبھی بھُولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو" کے مصداق بے یقینی اور بے مقصدیت کے 'صحرائے تیہہ' میں بھٹکنے والا یہ قافلہ بھی از سرِ نو مقصد و منزل کا سُراغ پا کر ایک عزمِ تازہ اور ولولۂ نو کے ساتھ ــــ ع "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا" کی شان سے سرگرمِ سفر ہو جائے! ــــ !!

میرے دل میں دفعۃً جگمگانے والی اُمید کی اِس روشنی کو بھی تقویت حاصل ہوئی ہے قرآنِ حکیم ہی کے ایک مقام سے جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہُوا ہے کہ لوگوں کے کان کھول دیں اور ڈنکے کی چوٹ فرما دیں کہ اگر تم اپنے اعراض و انکار کی موجودہ روش پر قائم رہے تو عذابِ الٰہی لازماً آ کر رہے گا۔ اگرچہ مَیں یہ نہیں جانتا کہ وہ گھڑی آیا ہی چاہتی ہے اور عذاب بالکل تمہارے سروں پر آ چکا ہے یا ابھی کچھ دُور ہے اور حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی میں ابھی تمہارے لیے کچھ مزید مہلت باقی ہے ــــ ارشاد ہوتا ہے:

"فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۝"	(ترجمہ) پھر اگر وہ روگردانی کریں تو آپ صاف کہہ دیں کہ مَیں نے تم سب کو برابر خبردار کر دیا ہے۔ اب مَیں نہیں جانتا کہ جس (عذابِ الٰہی) کا تم سے وعدہ کیا
الانبیاء : ۱۰۹	جا رہا ہے وہ بالکل قریب ہے یا دابھی

کسی قدر) دُور ہے۔"

اور ـــــ

"وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝" (ایضاً : ۱۱۱)

(ترجمہ) "اور میں نہیں جانتا شاید کہ یہ (مہلت) تمہارے لیے مزید ایک آزمائش ہے اور ایک وقت متعین تک مزید فائدہ اٹھا لینے کا موقع ہو!"۔

گویا ممکن ہے کہ اللہ تعالٰی ابھی ملتِ اسلامیہ پاکستان کو بھی مزید مہلت عطا کرے اور اصلاحِ احوال اور تلافیٔ مافات کا ایک اور موقع عنایت فرمائے تا آنکہ وہ صورت پیدا ہو جائے کہ:

"لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ" (الانفال : ۴۲)

(ترجمہ) "تاکہ جسے مرنا ہے وہ مرے (لیکن) قیامِ حجت کے بعد اور جسے جینا ہے وہ جیے (لیکن، حجت) اور بصیرت کے ساتھ!"

لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ حقائق کا جرأت کے ساتھ سامنا کیا جائے، ماضی کا بے لاگ جائزہ ہو اور گذشتہ ناکامیوں اور نامرادیوں کے اسباب وعلل کا بھرپور اور امکانی حد تک معروضی تجزیہ کیا جائے اور اس کے ضمن میں نہ کسی کے ادب واحترام کو حائل ہونے دیا جائے نہ کسی کی محبت اور عقیدت کو آڑے آنے دیا جائے، پھر حال کے عوارض وامراض کی صحیح اور گہری تشخیص کی جائے اور اس سارے مواد کو سامنے رکھ کر ایک حقیقت پسندانہ لائحہ عمل تیار کیا جائے! اور پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید کے بھروسے پر عمل جد وجہد کا آغاز کر دیا جائے!

چنانچہ اسی مقصد کے تحت راقم الحروف نے پیشِ نظر تحریر کو سپردِ قلم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور خاص اسی مقصد کے لیے اس نے حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا۔

اور اللہ کا شکر ہے کہ آج ۲، صفر المظفر سنہ ۱۴۰۶ھ کو بمقام طائف اس طویل تحریر کا (مقدمہ) مکمل ہوگیا۔

اللہ گواہ ہے کہ اِس سے نہ کسی کی دل شکنی و دل آزاری مقصود ہے نہ کسی کی توہین و تنقیص، اور نہ کسی گذری ہوئی شخصیت پر سبّ و شتم مطلوب ہے نہ کسی حاضر و موجود شخصیت کی کردار کشی! بلکہ مقصود صرف اور صرف اصلاح ہے، اپنی امکانی حد تک!

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ - (ہود : ۸۸)

(ترجمہ) میرا کوئی ارادہ نہیں ہے سوائے اصلاح کے، جس حد تک میرے امکان میں ہو، اور نہیں حاصل ہے مجھے کوئی توفیق مگر صرف اللہ ہی کے سہارے۔

تتمہ

دو باتیں اچانک یاد آئیں :

ایک یہ کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ و قدس سرہٗ العزیز کے بعد جن علمائے کرام کو پاک و ہند میں شہرت حاصل ہوئی، اُن میں سے جامع معقول و منقول واقفِ ظاہر و باطن اور جامع شریعت و طریقت ہونے کے اعتبار سے اہم ترین اور منفرد ہستی، یعنی مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ نے اپنی یگانۂ روزگار تالیف "النبی الخاتم" (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آنحضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں یومِ طائف کو "فیصلہ کن موڑ" (TURNING POINT) قرار دیا ہے۔ کیا عجب کہ اس تحریر کے اِس سرزمین پر سپردِ قلم کیے جانے کے پس پردہ بھی کوئی راز ہو!

"وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ -" (البقرہ : ۲۱۶)

(ترجمہ) "اور اللہ (ہر چیز) جانتا ہے جبکہ تم (کچھ بھی) نہیں جانتے!"

دوسری یہ کہ آج سے ٹھیک بیس سال قبل نومبر ۱۹۶۵ء میں والدِ مرحوم کے انتقال (بتاریخ ۱۱ر نومبر) سے پیدا شدہ رنج اور صدمے سے نڈھال ہو کر طبیعت کی بحالی کے لیے راقم نے وادیٔ کاغان کا سفر اختیار کیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر راقم ایبٹ آباد میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم تھا کہ اچانک خیال آیا کہ آج ۲۶ر نومبر ہے گویا بڑے بھائی صاحب کی اُنتالیسویں سالگرہ یا عمرِ فانی کے چالیسویں سال کا پہلا دن! اِس پر ذہن بے اختیار سورۂ احقاف کی محولہ بالا آیت نمبر ۱۵ کی جانب منتقل ہُوا اور مَیں نے بھائی جان کے نام وہیں سے ایک خط ارسال کیا جس میں اِس آیت مبارکہ کو 'ہدیۂ اخلاص' کے طور پر پیش کیا۔ (بعد ازاں مَیں نے اِس آیت مبارکہ کی خوبصورت کتابت کرائی اور 'میثاق' میں بھی ایک سے زائد بار شائع کیا اور بہت سے رفقاء و احباب کو بھی جو چالیس سال کی عمر کے لگ بھگ ہوتے تھے، ہدیۃً پیش کیا)

آج ٹھیک بیس سال بعد راقم اِس آیت مبارکہ کو ملّت اسلامیہ پاکستان کی خدمت میں اُس کی عمر کے چالیسویں سال کے آغاز کے موقع پر پیش کر رہا ہے ؎

"گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!"

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

طائف ۲۱ر صفر المظفر سنہ ۱۴۰۶ھ

چند ذاتی وضاحتیں

آگے بڑھنے سے قبل دو باتیں بطور تمہید عرض کرنی ہیں جن کی حیثیت "ذاتی وضاحتوں" (POINTS OF PERSONAL EXPLANATION) کی ہے:

پہلی یہ کہ میرے بارے میں یہ بات عام طور پر بھی مشہور ہے اور خود میں نے بھی اس کا بارہا اظہار کیا ہے کہ میں معروف معنی اور مروّجہ مفہوم کے اعتبار سے ہرگز ایک سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ چنانچہ میں نے جو دو تنظیمی ہیئتیں قائم کی ہیں اُن میں سے ایک یعنی انجمن خدام القرآن کے بارے میں بھی سب جانتے ہیں کہ وہ ایک خالص علمی و تعلیمی اور تدریسی و تربیتی ادارہ ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس تعلیم و تدریس اور نشر و اشاعت کے ضمن میں بھی اُس کا کُل مرکز و محور قرآن حکیم ہے۔ پھر اس کا نام خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ کوئی سیاسی جماعت تو کیا سرے سے جماعت ہی نہیں ہے بلکہ محض ایک انجمن (SOCIETY) ہے اور اس کی سرگرمیوں کا مظہر اُتم "قرآن اکیڈمی" ہے، جو معروف معنی میں صرف ایک "ادارہ" (INSTITUTION) ہے —— اسی طرح "تنظیم اسلامی" کے نام سے میں نے جو جماعت قائم کی ہے وہ اگرچہ محدود معنی میں انجمن یا ادارہ نہیں ہے بلکہ باضابطہ "جماعت" ہے لیکن اُس کا بھی یہ پختہ فیصلہ ہے کہ وہ کبھی ملکی انتخابات میں حصّہ نہیں لے گی۔ لہٰذا یہ بھی مروّجہ مفہوم کے اعتبار سے سیاسی جماعت نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ مارشل لاء کے ساڑھے آٹھ سالہ دور میں نہ اس پر کوئی پابندی لگی نہ اس کی سرگرمیوں پر کوئی روک ٹوک ہوئی۔

اس پس منظر میں جب پیشِ نظر تحریر میں بعض سیاسی امور پر تفصیلی گفتگو

لوگوں کے سامنے آئے گی تو اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو 'تضاد' —
(CONTRADICTION) کا احساس ہو۔

اس کا اصل سبب یہ ہے کہ 'سیاست' اگرچہ فی الاصل ایک نہایت وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے لیکن پوری دنیا میں بالعموم اور ہمارے یہاں بالخصوص اس کا ایک ہی محدود مفہوم رائج ہے۔ یعنی انتخابات میں حصّہ لے کر حکومت کے حصول یا اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ پوری دنیا میں یہ امر مسلّم ہے کہ صحافت سیاست کا اہم ترین شعبہ ہے۔ اس لیے کہ یہ رائے عامّہ کو ایک خاص رُخ پر ہموار کرتی ہے جس کا براہِ راست اثر انتخابات پر پڑتا ہے تاہم مروجہ معنی میں صحافیوں کو سیاسی آدمی کہیں بھی قرار نہیں دیا جاتا۔ اس اشکال کو اس طرح بآسانی حل کیا جا سکتا ہے کہ 'سیاست' کو دو شعبوں میں منقسم سمجھا جائے، ایک نظری یا بالواسطہ سیاست اور دوسرے عملی یا براہِ راست سیاست، ان میں سے جہاں تک مؤخر الذکر یعنی عملی سیاست کا تعلق ہے اس نے عہدِ حاضر اور بالخصوص مغربی ممالک میں ایک پیشہ (PROFESSION) کی حیثیت اختیار کر لی ہے لہٰذا یہ ہر شخص کے کرنے کا کام نہیں ہے بلکہ صرف پیشہ ور سیاستدانوں کی جولانگاہ ہے لیکن جہاں مقدم الذکر یعنی نظری سیاست کا تعلق ہے تو کم از کم نظری اعتبار سے یہ ہر باشعور انسان کے لیے لازمی ہے اس لیے کہ ملک اور قوم کے معاملات پر غور و فکر اور ان کو درپیش مسائل کے لیے سوچ بچار اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے دامے، درمے سخنے کوشش ہر باشعور شہری کا فرضِ عین ہے۔ اور اس سے اغماض و اعراض یقیناً ملک اور قوم سے بدعہدی اور بے وفائی کے مترادف ہے۔ یہ نظری یا بالواسطہ سیاست کس قدر اہم اور مؤثر بلکہ فیصلہ کن ہو سکتی ہے اُس کا اندازہ ماضی قریب میں یورپ کے ممالک اور زمانۂ حال میں امریکہ میں یہودیوں کے عمل دخل سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اپنی تعداد کی قلت کے باعث وہ براہِ راست عملی سیاست میں زیادہ حصہ نہیں لے سکے لیکن ذرائع ابلاغ پر اپنے قبضہ و تسلّط کے ذریعے وہ امریکہ جیسے

عظیم ملک کی سیاست کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بقول اقبال ؎

"فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!"

مزید غور کیا جائے تو عملی سیاست، کے بھی دو مختلف انداز ممکن ہیں، ایک کو 'انتخابی سیاست' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور دوسرے کو 'انقلابی سیاست' سے۔ ان دونوں کے مابین حدِ فاصل اس طرح قائم ہوتی ہے کہ اگر کسی انسان کے نزدیک اُس کے ملک میں قائم معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام (POLITICO-SOCIO-ECONOMIC SYSTEM) بحیثیتِ مجموعی اور اپنی جڑ بنیاد کے اعتبار سے صحیح ہے تو ملک اور قوم کی بہتری کے ضمن میں صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے کہ اُس نظام کو چلانے کے لیے بہتر سے بہتر ہاتھ فراہم کیے جائیں اور اس میں زیادہ سے زیادہ کچھ جزوی اور فروعی پالیسیوں کے ضمن میں اختلاف واقع ہو سکتا ہے، اس صورت میں ضرورت صرف اس کی ہو گی کہ 'انتخابی سیاست' میں حصّہ لے کر صرف 'حکومت' کی تبدیلی کی کوشش کی جائے ــــ اس کے برعکس اگر کسی کے نزدیک ملک میں بالفعل قائم و رائج نظام بحیثیتِ مجموعی غلط اور بلحاظ اساسِ نظری باطل (FALSE) اور باعتبار تشکیلِ عملی یا مبنی بر امتیازات (DISCRIMINATIVE) ہے، یا ظالمانہ اور متشددانہ (UNJUST AND SUPPRESSIVE) ہے یا استحصالی (EXPLOITATIVE) ہے، تو اس کے لیے مسئلہ صرف 'حکومت' کی تبدیلی کا نہیں ہو گا بلکہ پورے نظام کی تبدیلی کا ہو گا جس کے لیے انتخابی سیاست قطعاً غیر مفید اور بالکل لاحاصل ہے۔ اس کے لیے اصلاً ایک انقلابی عمل درکار ہو گا جسے ہم 'انقلابی سیاست' سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں!

الحمدللہ کہ گزشتہ نصف صدی کے دوران بہت سے اربابِ دانش اور اصحابِ قلم کی کاوش و محنت کے نتیجے میں یہ حقیقت تو کم از کم تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے بالکل نکھر کر آ چکی ہے کہ اسلام صرف ایک 'مذہب' نہیں بلکہ ایک کامل 'دین' ہے اور اس میں جہاں 'مذہب' کے جملہ معروف اجزاء یعنی عقائد، عبادات اور بعض معاشرتی رسومات موجود ہیں وہاں انسان کی اجتماعی زندگی کے وہ تینوں گوشے بھی شامل ہیں جن کو موجودہ دنیا میں عام طور پر

حیاتِ انسانی کے "لادینی میدان" (SECULAR FIELD) سے تعبیر کر دیا جاتا ہے
یعنی ایک مکمل اور متوازن معاشرتی نظام' ایک عادلانہ اور منصفانہ معاشی نظام اور ایک
مساویانہ اور حریت پرور سیاسی نظام ـــــ اب اگر واقعہ یہ ہے کہ سیاست
اسلام کا جزو ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی باشعور مسلمان' خالص "غیر سیاسی" ہو
علامہ اقبال مرحوم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ "جُدا ہو دیں
سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"، راقم کے نزدیک ان الفاظ میں بھی، غالباً وزن و بحر
کی مجبوریوں کے باعث، حقیقت کی تعبیر میں کسر رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ اس سے محسوس
یوں ہوتا ہے کہ جیسے سیاست کوئی بالاتر اور عظیم تر حقیقت ہے اور دین اُس کا ایک جزو'
جبکہ واقعہ یہ ہے کہ کم از کم اسلام کی حد تک اصل بالا و برتر اور جامع و غالب حقیقت' دین'
ہے اور "سیاست" محض اس کا ایک شعبہ اور جزو ہے جو تمام تر دین کے "تابع" ہے
ـــــ البتہ اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ شعبہ یا جزو بھی ہرگز نہ غیر اہم ہے نہ حقیر! اس لیے کہ
ایک حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے مطابق سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل
میں سیاست کی پوری ذمہ داری خود انبیاء کرام علیہم السلام کے کندھوں پر رہی۔
(کَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِیَاءُ" (رواہ مسلم) ـــــ
ـــــ اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے
میں مغربی مفکرین اور مصنفین میں سے بعض نے فی الواقع تحسین و ستائش کے انداز میں
اور بعض بد بختوں نے ہجو ملیح کے انداز میں تسلیم کیا ہے کہ آپؐ نہایت ماہر اور عظیم سیاستدان
(STATESMAN) تھے۔ چنانچہ عہدِ حاضر کے مشہور ترین عالمِ فلسفہ تاریخ
ٹائن بی (TYONBEE) نے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا سہرا ہی تمام تر
آپؐ کی "سیاستدانی" (STATESMANSHIP) کے سر باندھا ہے (ورنہ ـــــ
نقلِ کفر کفر نہ باشد ـــــ اُس کے نزدیک بحیثیت نبی تو آپؐ ناکام ہو گئے تھے ۔[1])

---

[1] ("Mohammad failed as a Prophet but succeeded as a Stateman!")

اسی طرح پروفیسر منٹگمری واٹ نے بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاستدانی، امورِ حکومت کی واقفیت و مہارت، معاملہ فہمی و موقع شناسی، دُور اندیشی و پیش بندی، انتظام و انصرام اور پیشگی اہتمام اور بروقت اقدام کو شاندار خراجِ تحسین ادا کیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اِس ضمن میں تحسین و ستائش کا کوئی لفظ اور اسلوب ایسا نہیں رہا جو اُس نے استعمال نہ کر لیا ہو۔ اگرچہ اُس نے بھی نہایت لطیف (SUBTLE) انداز میں 'مکّہ والے محمدؐ' ("MOHAMMAD AT MECCA") اور 'مدینہ والے محمدؐ' ("MOHAMMAD AT MADINA") کے مابین 'تضاد' (CONTRAST) پیدا کر کے ایک ہجوِ ملیح کی صورت پیدا کی ہے۔ اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ سچائی، اور راست بازی کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر جامع اور حقیقت سے نزدیک ترین انداز ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کا ہے جو انہوں نے اپنی تالیف "THE 100"[۸] میں اختیار کیا ہے۔ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نسلِ آدم کی عظیم ترین شخصیت قرار دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ آپؐ نسلِ انسانی کی واحد شخصیت ہیں جو بیک وقت مذہب اور سیاست کے دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب ہیں!* لے

بنا بریں محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی باشعور اُمتی، کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ خالص 'غیر سیاسی' انسان ہو۔ چنانچہ الحمدللہ کہ شعوری زندگی کے آغاز سے لے کر آج تک راقم کی زندگی میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں آیا جو خالص غیر سیاسی حالت میں گذرا ہو۔ ایک ہائی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے مَیں نے اپنی بساط کے مطابق تحریک پاکستان میں بھرپور حصّہ لیا، پھر ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء جماعت اسلامی کی تحریک سے عملاً منسلک رہا۔ جبکہ جماعت مروجہ معنی کے اعتبار سے بھی ایک سیاسی جماعت قرار

"My choice of Mohammad to lead the world's most influential persons may surprise some reader and may be questioned by others, but he was THE ONLY man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels".

('The 100' page 33.)

پا چکی تھی۔" اس سے علیٰحدگی اختیار کی تو اسی بنیاد پر کہ پاکستان میں اسلام "انتخابی سیاست"
کے ذریعے نہیں بلکہ صرف "انقلابی عمل" کے ذریعے قائم کیا جا سکتا ہے ــــ اور وہ دن اور
آج کا دن میری توانائیوں اور صلاحیتوں حتیٰ کہ میرے اوقات کا بھی بہتر اور بیشتر حصہ
"اسلامی انقلاب" کے اساسی لوازم (BASIC PREREQUISITES) ــــــــــ
کی تکمیل کی سعی و جہد میں صرف ہوا ہے ــــ اور اس دوران میں بھی مَیں نے کم از کم نظری
فکری سطح پر وقتی سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا ہے۔ چنانچہ تحریر اور تقریر دونوں
کے ذریعے امکانی حد تک قوم اور ملک کو درپیش مسائل کے ضمن میں اپنی رائے کے اظہار
میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

قصہ مختصر یہ کہ مَیں "خالص غیر سیاسی" آدمی کبھی بھی نہیں رہا ــــ اگرچہ مروجہ
انتخابی سیاست کے میدان سے ضرور کوسوں دور بھاگتا ہوں۔

دوسری تمہیدی وضاحت یہ کہ میرے بارے میں یہ بات بھی بالعموم معلوم و مشہور
ہے کہ ماضی میں میرا نہایت گہرا تعلق جماعتِ اسلامی کے ساتھ رہا ہے۔ چنانچہ خود
مَیں نے بھی نہ صرف یہ کہ کبھی اسے چھپایا نہیں بلکہ بارہا اس کا ڈنکے کی چوٹ اور علیٰ رؤس
الاشہاد اعتراف و اعلان کیا ہے کہ اگرچہ میرے شعور کی سب سے زیریں اور تحتانی سطح
پر تو نقش ہیں علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی ملّی شاعری کے اثرات تاہم میرے ذہن اور
فکر کی تفصیل تشکیل میں سب سے زیادہ دخل جماعت اسلامی کے دینی فکر اور مولانا مودودی
مرحوم و مغفور اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف کو حاصل ہے ــــ اُدھر جماعتِ
اسلامی کا تحریکِ پاکستان سے تعلق ایک اختلافی اور نزاعی مسئلہ ہے اور اگرچہ
جماعت کے زعماء و عمائدین بہت زور دے کر کہتے ہیں کہ جماعت کبھی پاکستان کی
مخالف نہیں رہی بلکہ بعض سادہ لوح بزرگ تو اس سے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کر گذرتے
ہیں کہ قیامِ پاکستان کے ضمن میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بعد سب سے بڑھ کر حصہ
مولانا مودودی کا ہے۔ لیکن عام طور پر یہ بات تسلیم نہیں کی جاتی اور ان دعووں کو
یا تو شدت کے ساتھ تردید کی جاتی ہے ــــ یا کم از کم انہیں مسکرا کر یا ہنس کر ٹال

دیا جاتا ہے۔

اِس ضمن میں فی الوقت مَیں اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ اصل معاملہ کیا ہے بلکہ صرف یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ تقسیمِ ہند سے قبل میرا جماعتِ اسلامی کے ساتھ کوئی عملی تعلق نہیں تھا بلکہ مَیں اپنی عمر اور بساط کے مطابق عملاً تحریکِ پاکستان ہی کا ایک ادنیٰ کارکن اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ورکر اور عہدیدار تھا۔ اور اگرچہ مَیں اُس وقت بھی اپنے محدود فہم کی حد تک جماعتِ اسلامی کی تحریک اور مولانا مودودی کے فکر سے متعارف ہو چکا تھا۔ اور مجھے اُس کے ساتھ ایک گونہ اتفاق اور کسی قدر ہمدردی بھی تھی۔ چنانچہ جب مسلم لیگ اور فیڈریشن کے حلقوں میں جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی پر تنقید ہوتی تھی تو مَیں اُن کی جانب سے اپنے اِمکان بھر مدافعت بھی کرتا تھا لیکن میرا عملی تعلق کُل کا کُل تحریکِ مسلم لیگ اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن ہی کے ساتھ تھا!۔

اِس سلسلے میں مَیں بعض واقعات کو ریکارڈ پر لے آنا مناسب سمجھتا ہوں۔ میرا بچپن مشرقی پنجاب (اور اب بھارت کے موجودہ صوبہ ہریانہ) کے ایک ضلع 'حصار' میں گذرا ہے۔ جو متحدہ پنجاب کے پسماندہ ترین اضلاع میں سے تھا۔ اور جس کا اکثر و بیشتر حصّہ کچھ عرصہ قبل دریائے گھگھر کے خشک ہو جانے کے بعد صحرا کی صورت اختیار کر چکا تھا اور میری یادداشت کے مطابق پورا ضلع اکثر قحط و خشک سالی کا شکار رہتا تھا اور اِس کی بنا پر آفت زدہ علاقہ (CALMITY STRICKEN AREA) قرار دیا جاتا تھا[1]

---

[1] ایک زمانے میں جب پاکستان میں پیپلز پارٹی اور دوسری سیاسی جماعتوں میں کشمکش عروج پر تھی بھٹو صاحب کے خاندانی حالات کے ضمن میں بھی یہ تحقیق سامنے آئی تھی کہ اُن کے آباء اجداد کا تعلق بھی ضلع حصار ہی سے تھا اور اُن کے خاندان نے سندھ کی جانب نقلِ مکانی دریائے گھگھر کے خشک ہو جانے پر جو صورتِ حال پیدا ہوئی اسی کی بنا پر کی تھی۔ خود مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حصار کے ضلعی صدر مقام یعنی حصار شہر اور اس کے ایک اہم تحصیل ہیڈ کوارٹر اور نہایت قدیمی قصبے سرسہ کے مابین میٹر گیج ریلوے لائن پر عین درمیان میں ایک اسٹیشن 'بھٹو' نامی آتا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ اس کا نام اب بھی وہی ہے۔ یا بدل دیا گیا ہے۔

چنانچہ حکومت کی طرف سے تقاوی قرضوں کی صورت میں کاشتکاروں کی مدد کا سلسلہ تقریباً ہمیشہ جاری رہتا تھا۔
تعلیمی اعتبار سے بھی پورے ضلع کی پسماندگی کا عالم یہ تھا کہ اس کے طول و عرض میں کالج صرف ایک تھا اور وہ بھی قصبہ بھواتی کے مالدار بنیوں کا قائم کردہ ہندو قومی کالج! پورے ضلع میں ہائی سکول بھی میرے اندازے کے مطابق آٹھ دس سے زیادہ نہیں ہوں گے جن میں دو تین ہندوؤں کے قومی اسکول تھے بقیہ سب گورنمنٹ اسکول تھے ۔۔۔ پورے ضلع میں اسلامیہ ہائی سکول نام کی کوئی شے موجود نہ تھی۔ چنانچہ حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن بھی کُل کی کُل ہائی سکول کے طلبہ پر مشتمل تھی اور میں نویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے اس کا جنرل سیکرٹری تھا، اور نہ صرف یہ کہ اپنے قصبے یعنی حصار میں اس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا بلکہ اکثر سرسہ اور ہانسی کے قصبات کے دوروں پر بھی جاتا رہتا تھا ۔۔۔ اس ضمن میں اہم ترین واقعہ یہ کہ ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جو تاریخی جلسہ منعقد ہوا تھا جس سے قائدِ اعظم مرحوم نے خطاب فرمایا تھا اس میں ضلع حصار کے دو مندوبین میں سے ایک میں تھا اور دوسرے دسویں جماعت کے طالب علم عبدالواحد تھے، جن کے بارے میں اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں! مجھے خوب یاد ہے کہ اس موقع پر ہمارے قیام کا انتظام میکلوڈ روڈ کے لکشمی چوک سے متصل ایک ہوٹل میں کیا گیا تھا جس کے اور میکلوڈ روڈ کے مابین ایک خالی پلاٹ تھا جس میں بانسوں کا بہت بڑا اسٹاک تھا ۔۔۔ اگر فیڈریشن کا اس دور کا ریکارڈ کہیں محفوظ ہو تو اس میں اس اجلاس کے ضلعی مندوبین کی حیثیت سے شرکت کرنے والے طلبہ کے پاسپورٹ سائز کے فوٹو جو پہلے ہی طلب کر لیے گئے تھے ضرور موجود ہوں گے اور ان میں ایک تصویر اس خاکسار کی بھی ہو گی!

قصہ مختصر یہ کہ قبل از آزادیٔ ہند جماعت اسلامی کا تحریکِ پاکستان کے ساتھ تعلق مثبت تھا یا منفی، اس سے قطع نظر راقم کو اس پر فخر ہے کہ تحریکِ پاکستان کے نغمے کا کنٹرول میں اس کا نام بھی شامل ہے اور یہ کیسے نہ ہوتا جبکہ راقم کے شعور کی سب سے زیریں اور تحتانی سطح پر، جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، سب سے گہرے اور دائمٹ نقوش ثبت

تھے۔ علامہ اقبال مرحوم کی ملّی شاعری کے۔
ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دوں کہ پاکستان میں آزادی کے بعد سے اب تک جو حالات رُونما ہوئے اُن کی بنا پر کبھی کبھی مایوسی کی شدت کے عالم میں دوسرے بہت سے لوگوں کے مانند میرے ذہن وشعور کے سامنے بھی یہ سوالیہ نشان اُبھرا کہ پاکستان کا قیام درست اقدام تھا بھی کہ نہیں؟ لیکن الحمدللہ کہ ہمیشہ صورت یہ رہی کہ جب بھی میں نے از سرِ نو صُغریٰ کُبریٰ جوڑ کر حساب لگایا۔ نتیجہ یہی برآمد ہُوا کہ پاکستان کا قیام صحیح اور درست تھا یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں ہم سے اجتماعی سطح پر کوتاہی کا صدور ہُوا جس کی سزا ہمیں پہلے بھی بھگتنی پڑی اور تا حال بھی بھگتنی پڑ رہی ہے!

اِس ضمن میں یادش بخیر، پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی مثال بہت اہم ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ علامہ اقبال کے مصاحبین اور تحریکِ پاکستان کے شعلہ بیان مقررین میں نہایت اہم مرتبہ و مقام کے حامل تھے۔ اور خود اُن کے قول کے مطابق قائدِ اعظم سے اُن کا قریبی تعلق تھا اور اُن کے اور متعدد مسلمان والیانِ ریاست کے مابین نجی پیغام رسانی اور چندوں کی رقوم کی ترسیل کا ذریعہ وہ تھے ۔۔۔ اِسی طرح از پشاور تا پونا جہاں بھی کبھی کوئی انتخابی معرکہ گرم ہوتا تھا اُن کو طلب کیا جاتا تھا۔ اُن کی لیگیت، کی شدت کا اندازہ اسی واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو خود انہوں نے بیان فرمایا کہ ایک موقع پر سیالکوٹ کے کسی دینی جلسے میں وہ بھی بحیثیت مقرر مدعو تھے اور مولانا سیّد حسین احمد مدنی رح بھی ۔۔۔ اور اتفاقاً دونوں کا قیام کسی ایک ہی مکان میں تھا۔ مولانا مدنی رح کو جب معلوم ہُوا کہ چشتی صاحب بھی وہیں پر مقیم ہیں تو انہوں نے چشتی صاحب کو پیغام بھجوایا کہ وہ ان سے ملاقات کے خواہشمند ہیں، لیکن اس پر چشتی صاحب کا جواب یہ تھا کہ میرے اور آپ کے راستے بالکل جُدا بلکہ متضاد سمت میں ہیں لہٰذا میں آپ سے ملاقات میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا ۔۔۔ لیکن یہی پروفیسر یوسف سلیم چشتی پاکستان میں پیش آمدہ حالات و واقعات سے اس درجہ مایوس اور دل گرفتہ ہوئے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد سے تو میں خود گواہ ہوں کہ اپنے انتقال کے وقت تک وہ برملا اِس رائے کا اظہار

کرتے رہے کہ ع "مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی!"، کے مصداق پاکستان کا قیام ہی غلط تھا ——— اور یہ کہ "ہم نے مسلم لیگ کا ساتھ دے کر جھک ماری اور بھاڑ جھونکا"۔ میرا کیونکہ پروفیسر صاحب مرحوم کے ساتھ بھی گہری نیازمندی کا تعلق رہا ہے بلکہ منظرِ عام سے ایک طویل عرصہ کی "غیبوبت" کے بعد پبلک پلیٹ فارم پر اُن کا ظہور میری ہی قائم کردہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی سالانہ کانفرنسوں کے ذریعے ہوا۔ اور مجھے اس اعتراف میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ میں نے ان کے علم و فضل اور خصوصاً اُن کے وسیع خزائۂ معلومات سے بہت استفادہ کیا اور اُن کے لیے میرے دل میں آج بھی ادب اور احترام بلکہ احسانمندی کے جذبات پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں ——— تاہم قیامِ پاکستان کے ضمن میں اُن کی رائے کی تبدیلی اور اُس میں اس قدر شدت میری رائے میں ہرگز درست نہیں تھی بلکہ اُن کے مزاج کی اسی جذباتیت اور حساسیت کا مظہر تھی جو بالعموم شدتِ اخلاص کا نتیجہ ہوتی ہے! ——— البتہ مولانا حسین احمد مدنی رح کی شان میں اپنے مزاج کی اسی جذباتیت کے باعث جن گستاخیوں کا ارتکاب اُن سے مسلم لیگ کے ساتھ عملی وابستگی کے دوران ہو گیا تھا اُن پر اُن کی پشیمانی اور توبہ و استغفار یقیناً درست تھا۔ اس لیے کہ محض سیاسی اختلاف پر کسی کے خلوص و اخلاص پر حملہ کرنا بالخصوص مولانا مدنی رح ایسی عظیم دینی و روحانی شخصیت کی شان میں گستاخی کا ارتکاب یقیناً بہت بڑی غلطی تھی ——— چنانچہ اس موضوع پر اُن کی ایک طویل تحریر جسے مولانا مدنی رح کے حلقۂ ارادت سے تعلق رکھنے والے جرائد بھی شائع کرنے میں متأمل و متردد تھے اوّلاً میں نے ہی 'میثاق' میں شائع کی تھی!

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب پر تو قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات و واقعات کی بنا پر ایک رد عمل کی کیفیت مستقل طور پر قائم ہو گئی تھی۔ تحریکِ پاکستان کے مخلص اور بے لوث کارکنوں میں ایسی اور بھی بہت سی مثالیں لازماً موجود ہوں گی۔ لیکن جہاں تک مختلف مواقع پر عارضی مایوسی اور بددلی کا تعلق ہے تو اس کی مثالیں تو بے شمار ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے پہلے اور آخری شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح

سے بھی بہت سے مایوسانہ اقوال منسوب کیے جاتے ہیں، اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم کے عہدِ حکومت میں فروری ۱۹۶۶ء میں عید کے چاند کے ضمن میں جو اختلاف اور اس سے پیدا شدہ ہنگامہ دار وگیر برپا ہوا تھا اُس کے موقع پر خود راقم نے مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم ایسے کٹر مسلم لیگی کی زبان سے یہ الفاظ جامعہ اشرفیہ لاہور کے ایک اجتماع میں سُنے تھے کہ "اب جو حالات پیش آرہے ہیں انہیں دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے کہ غالباً اُن علماءِ کرام کی رائے زیادہ درست اور صائب تھی جو قیامِ پاکستان کے خلاف تھے!"

اِس ضمن میں ہر اعتبار سے 'آخری' مثال پروفیسر مرزا محمد منور کی ہے جو از سرتا پیر از ظاہر تا باطن اور از اوّل تا آخر خالص مسلم لیگی اور پاکستانی ہیں ۱۹۶۹/۷۰ء میں جو حالات و واقعات پاکستان میں رونما ہوئے اُن سے وہ بھی اِس درجہ مایوس اور دلگیر ہوئے کہ انہوں نے ایک فارسی غزل لکھی جس کا عنوان ہی یہ تھا کہ، ع

"کر رہوارِ یقینِ ما بہ صحرائے گماں گم شد!"

اِس غزل کو راقم نے اوّلاً اگست ۱۹۷۰ء کے 'میثاق' میں شائع کیا تھا اور بطورِ قندِ مکرر دوبارہ ۱۹۸۲ء میں یعنی ٹھیک بارہ سال بعد شائع کیا۔ اپنی اس غزل پر ایک تعارفی نوٹ بھی مرزا صاحب نے خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا — ملاحظہ ہو:

"غزل کا پس منظر سیاسی ہے۔ برِصغیر تقسیم ہُوا۔ بڑی نیک خواہشات کے ساتھ مسلم قوم نے تقسیم کی تحریک کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ مگر بوجوہ نتائج حسبِ تمنا برآمد نہ ہوئے۔ جب بھی کوئی بہتری کی صورت پیدا ہوتی ساتھ ہی ساتھ کوئی خرابی بھی در آتی۔ اے کاش! قائدِ اعظم کی طرح کا کوئی "مردِ امین" پھر مل جاتا" — منور"

غزل خاصی طویل تھی لیکن اُس کا لبِ لباب اِن اشعار میں سامنے آجاتا ہے کہ:

"چہ دارد سعیِ ما سُود ے نمی یابیم مقصود ے
کہ برگ و خس بیاوردیم و شاخِ آشیاں گم شد!

خنک روزے بود یا بیم اگر خضرِ ہدایت را
کہ رہوارِ یقین ما بہ صحرائے گماں گم شد[1] !!"

الغرض! ملّتِ اسلامیہ پاکستان گذشتہ ۳۸، ۳۹ سالوں کے دوران "صحرائے تیہہ" میں بھٹکنے کی جس کیفیت سے دوچار رہی ہے اُسی کی بنا پر بہت سے مخلص لوگوں کے دلوں پر تو مایوسی کے شدید اندھیارے مستقل طور پر مسلّط ہو گئے جس کے نتیجے میں وہ شدید ردِّ عمل کا شکار ہو کر رہ گئے! اور بہت سے دوسرے لوگوں کے دلوں پر مختلف مواقع پر عارضی طور پر بددلی کی کیفیت طاری ہوتی رہی جس کے منحوس اثرات سے وہ اپنے آپ کو بدقّت تمام ہی بچا سکے؟ ـــــ اور ان مؤخر الذکر لوگوں میں ان سطور کا عاجز و حقیر راقم بھی شامل ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ کبھی تو ملّتِ اسلامیہ پاکستان ہی نہیں موجودہ پوری عالمی اُمّتِ مسلمہ کے مستقبل سے شدید مایوسی ہو جاتی ہے اور ایسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ شاید سات آٹھ صدیوں بعد تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے والی ہے اور ؎

"ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!"

کے مصداق قدرت ایک بار پھر پوری موجودہ اُمّتِ مسلمہ کو "رد" کر کے دین کا جھنڈا کسی نئی قوم کے ہاتھوں میں تھمانے والی ہے ـــ کبھی پھر اُمید کا دامن ہاتھ میں آ جاتا ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے بہتری کی توقع قائم ہو جاتی ہے! اب بھی حقیقت یہ ہے کہ جب بھی نگاہ حالات و واقعات کی جانب اُٹھتی ہے مایوسی اور نااُمیدی کی شدت کے باعث اُمید کا دامن ہاتھ سے بالکل ہی "کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!"

---

[1] ہماری سعی و کوشش کا کیا حاصل! کہ پوری کوشش کے باوجود ہم اپنے مقصود کو حاصل نہیں کر پاتے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہم آشیانہ بنانے کے لیے تنکے اور پتے جمع کرتے ہیں تو اس شاخ ہی کو گم پاتے ہیں جس پر آشیانہ تعمیر کرنا تھا۔
وہ دن کتنا دلفریب ہوگا جب ہمیں کوئی خضرِ ہدایت میسر آئے گا کیونکہ اب تو حال یہ ہو گیا ہے کہ ہمارے یقین کا رہوار صحرائے گماں میں گم ہو چکا ہے۔

لی سی کیفیت کے ساتھ چھوٹتا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب ذہن ارادہ و مشیت یزدی کے مظہر خرقِ عادت واقعات کی ایک مسلسل زنجیر کی جانب منتقل ہوتا ہے تو امید کے نئے چراغ دل میں روشن ہو جاتے ہیں اور محسوس ہونے لگتا ہے کہ پاکستان ظہورِ اسلام کے اُس عالمی غلبے کی خدائی تدبیر کے طویل سلسلے کی اہم کڑی ہے جس کی خبر جناب صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی!

گویا ـــــ اِن سطور کا ناچیز راقم اپنے شعور کے بالکل آغاز ہی سے 'پاکستانی' ہے ـــــ اور عارضی اور وقتی طور پر پے بہ پے مایوسیوں اور نا امیدیوں سے دوچار ہونے کے باوجود آج بھی پاکستان کے تابناک مستقبل اور شاندار تقدیر ـــــ (DESTINY) پر یقین رکھتا ہے! اگرچہ ـــــ ظاہر ہے کہ ـــــ اُس منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ملتِ اسلامیہ پاکستان اور بالخصوص اُس کی نوجوان نسل کو شدید محنت و مشقت اور پیہم جدّ و جہد کرنی ہوگی اور سخت ابتلا و امتحان اور ایثار و قربانی کے مراحل طے کرنے ہوں گے۔ بقولِ حضرتِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ؎

بقدر الكدّ تكتسبُ المعالی
ومن طلب العلیٰ سَہِرَ اللیالی
ومن طلب العلیٰ من غیر کدٍّ
اضاع العُمُرَ فی طلب المحالِ

(جاری ہے)

○○○

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
انا امرکم بخمسٍ	میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم
بالجماعة والسمع	دیتا ہوں التزام جماعت کا
والطاعة والھجرة	تو سننے اور اطاعت کرنے کا
والجھاد فی	تو اللہ کی راہ میں ہجرت
سبیل اللہ	[illegible]

آئندہ چار ماہ کے دوران

تنظیمِ اسلامی کے تحت اہم اجتماعات کی تفصیلات

(۱)

۱۵ روزہ تعلیمی و تربیتی پروگرام

تنظیمِ اسلامی کے سالانہ اجتماع ۸۶ء سے قبل قرآن اکیڈمی لاہور میں پندرہ پندرہ روز کے دو تربیتی پروگرام منعقد کئے جائیں گے (ان شاء اللہ)
تاریخوں کا تعین کیا جاچکا ہے جو حسب ذیل ہیں:

i - پہلا تربیتی پروگرام: ۷۔ فروری تا ۲۱۔ فروری ۸۶ء
ii - دوسرا تربیتی پروگرام: ۲۱۔ مارچ تا ۳۔ اپریل ۸۶ء

(۲)

پانچواں سہ روزہ علاقائی اجتماع تنظیمِ اسلامی

پچھلے سالانہ اجتماع کے بعد سے اب تک تنظیمِ اسلامی کے تحت چار علاقائی اجتماعات منعقد کئے جاچکے ہیں اور اب اس سلسلے کا پانچواں اجتماع
ملتان میں ، ۲۳۔ تا ۲۵۔ فروری ۸۶ء
منعقد ہوگا ۔ ان شاء اللہ

(۳)

سالانہ اجتماعِ تنظیمِ اسلامی

تنظیمِ اسلامی کے مرکزی سالانہ اجتماع کے لئے امسال
۴۔ اپریل ۸۶ء بروز جمعۃ المبارک تا ۶۔ اپریل ۸۶ء
کی تاریخوں کا تعین ہوا ہے۔ تنظیم کے تمام رفقاء نوٹ فرمالیں!

المعلن: چوہدری غلام محمد ، قیم تنظیمِ اسلامی

سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

(کے ٹیلیویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ)

(۱)

السلام علیکم ۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَشْتَہِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ۔ (آیات: ۳۰، ۳۱، ۳۲)

”یقیناً جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم گئے ۔ ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (اور وہ کہتے ہیں) کہ نہ خوف کھاؤ نہ غمگین

ہو۔ بلکہ خوش خبری حاصل کرو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا
گیا تھا۔ ہم ہیں تمہارے پشت پناہ ۔ دنیا کی زندگی میں بھی اور
آخرت میں بھی ۔ اور اس (جنت) میں تمہیں ملے گا جو کچھ چاہیں گے
تمہارے جی اور وہاں مہیا کر دیا جائے گا جس کی تم طلب کرو گے۔ یہ
مہمان نوازی ہو گی اُس ہستی کی طرف سے جو غفور بھی ہے رحیم بھی
ہے"۔ (سچ فرمایا اللہ بزرگ و برتر نے)

محترم ناظرین اور معزز سامعین ۔!

ان آیاتِ مبارکہ میں اوّلاً تو ایمان کا جو لبِ لباب ہے، جو اس کا اصل
حاصل ہے، اسے نہایت مختصر الفاظ میں بیان کر دیا گیا: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا
رَبُّنَا اللّٰہُ ۔ پھر اس ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے صرف ایک
لفظ لایا گیا استقامت ۔ جس پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس لفظِ
استقامت میں قیامت مضمر ہے ۔ یہ بات ان مجالس میں اس سے پہلے بھی
عرض کی جا چکی ہے کہ ایمان اگرچہ بہت سے امورِ غیبی کے ماننے کا نام ہے۔
اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کی توحید، ملائکہ، وحی، انبیاء، رسل، کتابیں،
بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب کتاب، وزنِ اعمال، جزا و سزا، جنت
و دوزخ ان تمام باتوں کو ماننے کا نام ایمان ہے ۔ ان ایمانیات کو ہم تین
بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتے ہیں ۔ ایمان باللہ یا توحید، ایمان بالمعاد یا
ایمان بالآخرہ اور ایمان بالرسالت ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایمان کی جڑ اور بنیاد
ایمان باللہ ہے ۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ ایمانِ مجمل میں صرف ایمان باللہ کا ذکر
ہے: "اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ
اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ ۔ پھر ایمان باللہ
کے بھی بہت سے پہلو ہیں ۔ ایک یہ کہ انسان مانے کہ اللہ کی ہستی ہے، اس
کا وجود ہے ۔ یعنی اثباتِ وجودِ باری تعالیٰ ۔ ایک یہ کہ اللہ عزّ و جلّ اپنی
ذات و صفات میں اکیلا ہے، تنہا ہے، واحد ہے، احد ہے ۔ ایک یہ کہ وہ
علیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر اور بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم ہے۔ اس کے اختیار و

حقوق میں کوئی شریک نہیں ہے — لیکن اصل حاصل اور اس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ربوبیتِ کاملہ پر انسان کا دل ٹُھک جائے، جم جائے ۔ ربوبیت کیا ہے ؟ ربّ کہتے ہیں پالنے والے کو، پروردگار، پالن ہار، پرورش کنندہ — اور ظاہر بات ہے کہ پھر وُہی مالک ہوگا لہٰذا اس لفظِ ربّ میں مالک ہونے کا مفہوم بھی موجود ہے لیکن اس کا بنیادی مفہوم ہے پالنے والا، روزی رساں، ضروریات بہم پہنچانے والا، ہماری احتیاج رفع کرنے والا، ہماری دُعائیں سننے والا، ہماری تکلیف دور فرمانے والا — یہ وہ امور ہیں کہ جن پر اگر غور کریں گے تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان ہی میں انسان کی کمزوری مضمر ہے ۔ انسان اپنی ضروریات اور احتیاجات ہی کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہے ۔ ان ہی کے لئے انسان کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے ۔ کسی کے سامنے اپنی گردن کو خم کرتا ہے، کسی کے سامنے عجز اور تذلّل اختیار کرتا ہے، کسی کے سامنے گڑگڑاتا ہے، کسی کے ساتھ اپنی عزتِ نفس کا سودا کرتا ہے — یہ ساری ذلتیں انسان گوارا کرتا ہے ۔ اپنی ضروریات و احتیاجات کے باعث —

ایمان کا اصل حاصل یہ ہے کہ ان تمام امور کے لئے انسان صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکت سے وابستہ ہو جائے ۔ اس کا دل اس پر ٹُھک جائے اور جم جائے کہ وُہ ہی میرا حقیقی پالن ہار ہے ۔ وہی میرا روزی رساں ہے — وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ — حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس طرح نمرود سے فرمایا تھا کہ "میرا رب ہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے" — وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ "جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے" — وہی تو تمام تکلیفوں کا دور کرنے والا ہے ۔ اگر انسان کا دل ان باتوں پر جم جائے، ٹُھک جائے تو حقیقی ایمان ہے ۔ میں یہ بار بار کیوں کہہ رہا ہوں — ! اس لئے کہ ان باتوں کو مان لینا اور ہے زبان سے اقرار کر لینا اور ہے لیکن ان باتوں پر انسان کے دل کا ٹُھک جانا اور جم جانا

بالکل دوسری بات ہے، ایمان کا اصل حاصل یہ ہے ایمان کا لُبّ لباب یہ ہے جسے یہ کیفیت میسر آگئی ہو یوں سمجھئے کہ ایمان کے حیثیّہ حقیقی سے وُہ واقعتاً بہرہ ور ہوگیا ہے۔ جیسے ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربًّا وَّبمحمد رّسولاً وبالاسلام دینًا۔ "ایمان کی لذّت حاصل ہوگئی اُس کو، ایمان کا مزا چکھ لیا اُس نے، ایمان کی حلاوت محسوس کرلی اُس نے، جو مطمئن ہوگیا اور راضی ہو گیا اس بات پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہے۔ محمدؐ ہی اس کے رسول ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور اسلام ہی اس کا دین ہے۔"

ایک اور حدیث میں یہ بات ایک دوسرے اسلوب سے آتی ہے کہ ایک شخص نے ایک مرتبہ نبی اکرمؐ سے سوال کیا کہ حضورؐ میں زیادہ لمبی چوڑی باتیں نہ سمجھ سکتا ہوں نہ یاد رکھ سکتا ہوں۔ مجھے تو کوئی ایک بات ایسی بتلایئے کہ میں اُسے حرزِ جان بنا لوں اور وہ میرے لئے کافی ہو جائے اب آپ خود سوچئے کہ کتنا مشکل سوال تھا۔ لیکن یہ سوال کیا گیا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ حضورؐ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ اوتیت جوامع الکلم "مجھے اللہ تعالےٰ کی طرف سے نہایت جامع کلمات عطا فرمائے گئے ہیں"۔ معانی ومفاہیم کے سمندر کو کوزے میں بند کردینا، یہ آپ کو نظر آئے گا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین، فرمودات وارشادات میں۔ حضورؐ نے اس شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا:

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ

"کہو میں نے مانا اللہ کو، میں ایمان لایا اللہ پر اور پھر اس پر جم جاؤ"

یہ اسی آیت کی شرح ہے کہ: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا

پس ایمان کا لُبّ لباب تو اس قول میں آگیا کہ میرا رب اللہ ہے،

میں راضی ہوگیا - اس پر کہ میرا پروردگار، میرا پالن ہار، میرا روزی رساں، میرا حاجت روا، میرا مشکل کشا، میری تکالیف رفع کرنے والا، مجھے بیماریوں سے شفا دینے والا اللہ ہے - اس کے بعد جو لفظ آیا ہے استقامت - اس کے بارے میں، میں نے آغاز میں عرض کیا تھا کہ اس لفظ میں قیامت مضمر ہے کہ اس قول پر جم گئے - حضور نے فرمایا (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ کہنے کو تو یہ بات بہتوں نے کہی: قَدْ قَالَهَا كَثِيرٌ - لیکن اس پر جمے نہ رہ سکے - لوگ اس سے پھر گئے - اس لئے کہ اس عالمِ اسباب میں رہتے ہوتے انسان حالات اور واقعات سے متاثر ہوتا ہے - ظاہری اسباب انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں - ہم دیکھتے ہیں کہ اس عالم میں سلسلۂ اسباب وعلل ہے - کچھ کاموں کے کچھ نتیجے نکلتے ہیں - کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں کچھ اختیارات ہیں اور وہ انکے ذریعوں سے کچھ لوگوں کے کام کر دیتے ہیں - یا وہ چاہیں تو کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں - جب ہم اس طریقہ سے نفع وضرر کو اسبابِ ظاہری کے ساتھ بندھے دیکھتے ہیں تو لامحالہ ہم پر ایک اثر مترتب ہوتا ہے - جس کے نتیجے میں ذاتِ باری تعالیٰ سے نگاہیں ہٹ کر ان ظاہری اسباب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں - یہی بات ہے کہ جس کی وجہ سے استقامت میں کمی آگئی - جمے نہ رہے - مستقیم نہ رہ سکے -

اس استقامت کو اگر میں تین اجزا میں تقسیم کر کے بیان کروں تو بات واضح ہو جائے گی - سب سے پہلے تو استقامتِ قلبی ہے کہ دل جما رہے، دل ٹکا رہے - یہ باطنی استقامت ایمان کا اصل جوہر ہے - اس قلبی استقامت کا پہلا نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ انسان محسوس کرے کہ اصل مؤثر اور اصل فاعل اللہ ہے۔ بظاہر اسباب ہیں - بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کے کچھ نتائج نکلتے ہوتے نظر آتے ہیں لیکن اس ظاہر سے دھوکہ نہ کھایئے - جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی ہیں، ان میں بڑے پیارے الفاظ آتے ہیں کہ "اے میرے بچے! اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ لا فاعل

فی الحقیقۃ ولا مؤثر الا اللہ ۔ وہ فاعلِ حقیقی اور مؤثر حقیقی اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ آگ جلاتی ہے لیکن بغیر اذن رب نہیں جلاتی۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہیں جلایا۔ سمندر غرق کر دیتا ہے لیکن بغیر اذنِ رب نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو غرق نہیں کیا۔ انہیں راستہ دیدیا۔ پس اسباب اللہ کے تابع ہیں۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ اللہ اسباب کے تابع نہیں ہے معاذ اللہ۔

اس قلبی استقامت کا دوسرا نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ انسان کی تمام اُمیدیں اور کُل خوف اللہ کی ذات پر مرتکز ہو جاتے۔ غیر سے نہ اُمید رہے نہ خوف رہے۔ جب کسی کے ہاتھ میں کچھ ہے ہی نہیں تو کسی سے کیا توقع! کیا اُمید باندھی جائے! جب کسی کے ہاتھ میں ہمیں ضرر پہنچانے کا اختیار ہے ہی نہیں تو کسی سے کس بات کا خوف! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما کو بڑے ہی شفقت اور محبت بھرے انداز میں چند نصیحتیں فرمائیں۔ امام ترمذیؒ اُسے اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ طویل حدیث ہے جو خود حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ حضورؐ نے انؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: یَا غُلَامُ اِنِّیْ اُعَلِّمُکَ کَلِمَاتٍ : "اے میرے بچے میں تجھے چند باتوں کی تعلیم دے رہا ہوں، تجھے تلقین کر رہا ہوں، انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو حرزِ جان کر لو"۔ ان نصیحتوں میں یہ کلمات بھی ہیں:

وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّۃَ لَوِاجْتَمَعَتْ عَلٰٓی اَنْ یَّنْفَعُوْکَ لَمْ یَنْفَعُوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَہُ اللّٰہُ لَکَ وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰٓی اَنْ یَّضُرُّوْکَ بِشَیْءٍ لَمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ کَتَبَہُ اللّٰہُ عَلَیْکَ

اور خوب جان لو کہ اگر تمام لوگ مل کر تمہیں کوئی نفع یا فائدہ پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر صرف اس قدر جتنا اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہو۔ اور اگر سب لوگ مل کر تمہیں کوئی گزند یا ضرر یا

نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے۔ مگر اُسی قدر جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہو۔"

یہ ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی شانِ مطلقہ ۔۔۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے۔

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اس شعر میں آپ تمام اسبابِ مادّی کو بتوں کی جگہ رکھ لیجئے، یہ فی الواقع بُت ہیں یہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ہمیں ڈراتے ہیں۔ اہلِ ایمان کا رویہ کیا ہوگا۔ جن کا قول یہاں نقل ہوا، اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ! وہ اُسی وقت سچے سمجھے جائیں گے جب ان کی تمام اُمیدیں اور تمام خوف صرف اللہ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔

اس قلبی و باطنی استقامت کا تیسرا نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ توکّل اُسی کی ذات پر ہو۔ اپنی سی کوشش، اپنی سی محنت انسان کرے لیکن یہ جان رکھے کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔ پھر انسان کے ساتھ جو کچھ پیش آئے اس پر راضی برضائے رب اور تسلیم و رضا کی کیفیت دل میں پیدا ہو۔

یہ تین نتائج اور کیفیاتِ باطنی اگر ہیں تو ایمان پر قلبی استقامت ہے اور اگر یہ نہیں ہیں تو دل کی استقامت موجود نہیں ہے۔ پھر تو یہ محض ایک قول ہے جو ہم اپنی زبان سے کہتے ہیں کہ رَبُّنَا اللّٰہُ۔ لیکن ہمارا دل اس پر ٹھکا ہوا نہیں ہے۔

اس سے آگے چلئے اب عملی استقامت درکار ہے ۔۔ آپ نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اب آپ کو اس کا ہر حکم ماننا ہوگا۔ اس کے ہر فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔ اور آپ کو معلوم ہے اللہ کی اطاعت رسول کی اطاعت کے واسطے سے ہوتی ہے: مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ۔

اسی عمل استقامت کی بلند ترین منزل وہ ہے جسے ہم نے پچھلی نشست میں اللہ کے لئے غیرت و حمیت سے تعبیر کیا تھا۔ اللہ کو اپنا رب مانیں اور دین کو پائمال دیکھیں پھر بھی پاؤں پھیلا کر سوئیں۔ آرام سے بال بچوں میں زندگی بسر کریں۔ اللہ کی شریعت کے بارے میں دیکھیں کہ اس کا استہزا ہو رہا ہے۔ اللہ کی حدود کے بارے میں دیکھیں کہ ان کو پاؤں تلے روندا اور کچلا جا رہا ہے اور ہماری حمیت وغیرت جوش نہ کھائے۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی استقامت چاہیئے ——— یہاں تک آیت مبارکہ کے اس حصے کی مختصراً تشریح و توضیح ہوئی کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ———

آگے فرمایا: تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا: "اُن لوگوں پر ——— (جو اللہ کو اپنا رب مان لیں اور اس پر جم جائیں) فرشتوں کا نزول ہوتا ہے (جو کہتے ہیں) کہ تم لوگ نہ خوف کھاؤ اور نہ غمگین ہو" ——— نزولِ ملائکہ کی کیا صورتیں ہیں جن کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے اس کے متعلق تو میں آگے کچھ عرض کروں گا۔ پہلے یہاں خوف اور حزن کی جو نفی ہو رہی ہے اس کے متعلق جان لیجئے کہ یہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کا منطقی نتیجہ ہے۔ جب ساری اُمیدیں اللہ کے ساتھ وابستہ ہوگئیں اور سارے کا سارا خوف صرف اللہ کا رہ گیا۔ ماسوا سے نہ اُمید رہی نہ اس کا خوف رہا۔ تو اب نہ خوف ہے نہ حزن۔ جو کچھ ہوا وہ اس لئے ہوا کہ ہمارے رب کو یہی منظور تھا۔ جو ہمارے رب کو منظور ہے اس پر ہمیں کسی شکوہ و شکایت کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہمارا رویّہ یہ ہونا چاہیئے کہ ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ اگر دل میں شکوہ و شکایت کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قلبی استقامت موجود نہیں ہے۔ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا تمہارے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ حزن ——— یہی مضمون قرآن مجید میں ایک دوسرے اسلوب سے آیا ہے کہ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

یہاں خوف اور حُزن کی جو نفی کی گئی ہے ۔ یہ آخرت کے بارے میں تو حتمی اور قطعی طور پر ہے ہی لیکن اگر واقعتاً اللہ سبحانہٗ کی ربوبیت پر دل ٹھک گیا ہو تو اس دُنیا میں بھی خوف اور حُزن سے رستگاری حاصل ہو جاتی ہے ۔

اللہ تعالےٰ ہمیں بھی ان کیفیاتِ ایمانی میں سے کچھ حصہ نصیب فرمائے۔

اب جو کچھ اس وقت میں نے عرض کیا ہے اس کے ضمن میں اگر آپ حضرات کو کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں ۔

سوال و جواب

سوال : ڈاکٹر صاحب! جس استقامت کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ اس دور میں دلوں میں کیسے پیدا کی جا سکتی ہے ۔

جواب : بڑا عملی سوال ہے ۔ ہمیں قرآن مجید کو پڑھتے ہوئے بھی اور اس کے بارے میں کچھ سنتے ہوئے بھی یہ چیز پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ جو عملی تقاضے ہمارے سامنے آرہے ہیں، ان کو ہم کیسے پورا کر سکتے ہیں ـــ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ استقامت براہ راست نتیجہ ہے ایمان اور یقین کا ـــ اگر واقعتاً دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کے نتیجہ میں انسان کے عمل میں استقامت آپ سے آپ پیدا ہو جائے گی ۔ لہٰذا اصل سوال یہ ہے کہ ایمان کیسے پیدا ہو! اس کے بارے میں اس سے قبل بھی ایک مرتبہ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک تو ہے عوام کا معاملہ، ان کے لئے ایمان حاصل کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ اصحابِ ایمان و یقین کی صحبت ہے ۔ ان کے پاس بیٹھیں گے ۔ ان کی صحبت اٹھائیں گے تو آپ سے آپ ان کے دلوں میں ایمان و یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے گی ۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اصحابِ ایمان و یقین کیسے وجود میں آئیں گے! تو جان لیجئے کہ ان کے لئے ایمان و یقین کا منبع اور سرچشمہ قرآن مجید ہے ۔ بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دوکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو قرآں کے سپاروں میں

قرآن مخزن ہے، یہ سرچشمہ ہے یہ منبع ہے ایمان و یقین کا ۔ اس کے ذریعہ سے دلوں میں ایمان و یقین پیدا ہوگا جس کے نتیجہ میں آپ سے آپ استقامت پیدا ہو جائے گی ۔

سوال : ڈاکٹر صاحب! خوف اور غم موجودہ دور کی دو نفسیاتی بیماریاں ہیں، قرآن مجید سے ان کے تدارک اور علاج کے متعلق کچھ وضاحت فرمائیں ۔ ؟

جواب : یہ بھی ہماری موجودہ صورتِ حال سے متعلق سوال ہے لیکن ہماری آج کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ خوف اور حزن دونوں کا سبب بے یقینی ہے ۔ وہی جواب جو میں نے پہلے سوال کا دیا تھا، اس سوال کا جواب بھی وہی ہو گا۔ بقول علامہ اقبال ؂

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

خوف اور حزن دونوں کا علاج اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر اللہ کی صفاتِ کمال پر یقین پیدا کرنے سے ہو گا ۔

حضرات! ان آیاتِ مبارکہ پر آج کی نشست میں ہم صرف غور کا آغاز کر پائے ہیں ۔ ابھی ہمیں چند اور نشستیں ان آیاتِ مبارکہ پر غور کرنے میں صرف کرنی ہوں گی ۔ یہ ہیں اصل مضامین قرآن حکیم کے ۔ یہ وہ بنیادیں ہیں کہ جن پر افکار کی تطہیر اور صحیح اسلامی سیرت و کردار کی تعمیر ممکن ہے لہٰذا انہیں بہت اچھی طرح سمجھ لینا بہت ضروری ہے ۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۶)

مسلح تصادم (غزوہ بدر سے صلح حدیبیہ تک)

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد، کا سلسلہ وار خطاب

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصاً علیٰ افضلھم خاتم النبیین محمد ن الامین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

خطبہ کے بعد امیر تنظیم نے سورہ صف کی آیت ۱۲ و آیات ۸ تا ۱۱ کی تلاوت فرمائی بعدہٗ ادعیہ مسنونہ و ماثورہ پڑھیں اور فرمایا:

حضرات! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ سے ایک انقلابی عمل کے جن مراحل، مدارج اور لوازم کا میں نے استنباط کیا ہے، ان کا بیان ان اجتماعاتِ جمعہ میں کافی دنوں سے چل رہا ہے۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ پانچ مراحل اب تک زیرِ گفتگو آ چکے ہیں جن میں سے چار وہ ہیں جن کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے مکی دور سے ہے۔ آغازِ وحی سے لے کر ہجرت تک کے قریباً ساڑھے بارہ سال میں یہ مراحل طے پائے ہیں۔ پانچواں مرحلہ وہ ہے جسے میں اقدام (ACTIVE RESISTANCE) سے تعبیر کیا کرتا ہوں اور جو ہجرت کے فوراً بعد سے شروع ہوا اور وہ غزوہ بدر تک چلا جس سے چھٹے مرحلہ یعنی مسلح تصادم (ARMED CONFLICT) کا آغاز ہوا۔ آگے بڑھنے سے قبل میں چاہوں گا کہ مضمون کا ربط برقرار رکھنے کے لئے سابقہ گفتگو کا ایک خلاصہ آپ کے گوش گزار کر دوں

سابقہ گفتگو کا خلاصہ مکی دور کے جو چار مراحل مکمل ہوئے ان میں سے تین مراحل کو میں نے ابتدائی و تمہیدی مراحل قرار دیا ہے۔ اور وہ ہیں دعوت، تنظیم، تربیت۔ ان کے ساتھ ہی صبر محض یعنی Passive Resistance کا دور بھی جو تقاضہ شروع ہو گیا تھا دعوت کے آغاز ہی سے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ذہنی اذیت، کوفت اور تمسخر و استہزاء

کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ سلسلہ تین سال تک پورے تشدد کے ساتھ چلا۔ اس عرصہ کے دوران جو سعید روحیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، ان پر ان ابتدائی تین سالوں میں کوئی تشدد اور جور و ستم نہیں ہوا۔ لیکن جب مشرکین و کفارِ مکہ استہزائی اور تمسخر کے ہتھکنڈوں میں ناکام رہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے ثبات و استقامت میں معمولی جنبش بھی پیدا نہ کر سکے اور دعوت بالخصوص نوجوانوں اور غلاموں کے طبقہ میں روز بروز نفوذ کرتی رہی تو اب مشرکین کا فیصلہ ہوا کہ اہلِ ایمان میں سے جس پر جس کا کوئی اختیار ہے یا جس پر بس چلے ان کو مار دو، جسمانی تکلیف پہنچاؤ، ان پر مصائب و تشدد کے پہاڑ توڑ دو۔ چنانچہ ساڑھے آٹھ برس تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حضرت سمیہ اور ان کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہما نہایت بہیمانہ اور سفاکانہ طور پر شہید کر دیئے گئے۔ حضرت خبابؓ اور حضرت بلالؓ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ قریش کے ایک اونچے گھرانے کے فرد تھے۔ دیت کی رقم کے تعین کا منصب آپ کے پاس تھا۔ مکہ کے نہایت باعزت تاجر تھے۔ ان کو اتنا مارا گیا، اتنا مارا گیا کہ یہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا کہ ان کی جان نکل چکی ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی دست درازیاں شروع ہو گئیں۔ حضورؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس طرح بل دیا گیا کہ آنکھیں اُبل پڑنے کو تھیں ـــــ ایک مرتبہ عین حالتِ سجدہ میں پشت مبارک پر اونٹ کی غلاظت بھری اوجھڑی لا کر رکھ دی گئی۔ حتیٰ کہ آپ کا اور پورے بنو ہاشم کا چاہے وہ ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں معاشرتی مقاطعہ کیا گیا۔ حضورؐ سمیت سب کو شعب بنو ہاشم میں محصور کر دیا گیا۔ قریش کے تمام گھرانوں کے مابین تحریری معاہدہ ہو گیا اور اسے کعبہ شریف کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا کہ جب تک یہ معاہدہ موجود ہے بنو ہاشم محصور رہیں گے اور ان کا معاشی مقاطعہ جاری رہے گا۔ تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب اس معاہدہ کو دیمک اندر سے چاٹ گئی اور اس طرح اس کا وجود ختم ہوا تب یہ محاصرہ بھی ختم ہوا۔ یہ سب حضورؐ کے ساتھ ہو رہا ہے تو "تا بہ دیگراں چہ رسد" والی بات ہے ـــــ اس پورے دور میں مسلمانوں کو حکم تھا کہ ان مصائب و شدائد پر صبر کریں، ان کو جھیلیں، برداشت کریں، لیکن ہاتھ نہ اٹھائیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ جور و تعدی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سمیت کوئی اہلِ ایمان بھی محفوظ نہیں رہا۔ ساتھ ہی یہ بھی تربیتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا کمال بلکہ معجزہ تھا کہ قریباً نو برس تک صحابہ کرامؓ نے یہ مظالم جھیلے لیکن کسی مسلمان کی طرف سے کسی تشدد پر کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ کسی نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ نہ کوئی اہلِ ایمان اپنے موقف سے ہٹا۔ تمام اہلِ ایمان نے صبر و ثبات اور صحیح و جامع کی وہ نظیر قائم کی جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ انسانی تا قیامت عاجز و قاصر رہے گی۔

مرحلہ میں Passive Resistance کے دو حصے تھے۔ پہلے تین سال خود داعیٔ اوّل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زبانی کلامی تمسخر، استہزاء و تضحیک کا ہدف بنا کر آپؐ کو ذہنی اذیت و کوفت پہنچانے کی آخری حد تک کوشش کی گئی لیکن جب حضورؐ عزم، صبر و ثبات اور استقامت کے کوہِ ہمالیہ ثابت ہوئے اور دعوت برابر نفوذ کرتی رہی تو آپ سمیت تمام اہلِ ایمان کو کسی نہ کسی طور پر قریباً ساڑھے آٹھ برس تک جسمانی تشدد (Physical Persecution) کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن دعوت و تبلیغ اور تربیت و تنظیم کے مراحل بھی ساتھ ساتھ طے پاتے رہے۔ اہلِ ایمان کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا رہا اور اس طرح چاروں مراحل مکی دور میں اس حد تک تکمیل پا گئے کہ جس کے بعد اقدام کا مرحلہ آ گیا۔ صرف دعوت و تبلیغ کا مرحلہ مدنی دور میں بھی جاری رہا۔ تنظیم و تربیت کا سلسلہ مدنی دور میں بھی چلتا رہا۔ پرانوں کی بھی تربیت جاری ہے اور جو نئے لوگ ایمان لا رہے ہیں ان کی بھی تربیت جاری ہے۔ کہیں بلکہ اس میں بعض جہات سے وسعت پیدا ہو گئی کہ اب عسکری تربیت اور دورِ جنگ کے عملی تجربات بھی شروع ہو گئے ـــــ وہ اقدام تھا جہاں مدینہ

میں مسجدِ نبوی تربیت گاہ بھی بن گئی اور دار الشوریٰ بھی۔ حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ اور تنظیم و تربیت کا عمل مدنی دور میں بھی جاری رہا۔ البتہ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ عمل مکی دور میں اس حد تک مکمل ہو چکا تھا کہ اب اگلے مرحلہ کی طرف پیشقدمی کر دی جائے یعنی اقدام کی طرف۔

یہ مرحلہ ہجرت کے فوراً بعد یا اس کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جب وہ آیت نازل ہوئی کہ: أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ○ جس کی دوسری قرأت ہے: أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ○ مفہوم دونوں کا ایک ہے کہ 'اے مسلمانو! اب تک تمہارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے' اب وہ کھول دیئے گئے ہیں۔ اور اب تمہیں بھی جوابی کارروائی کرنے کی اجازت ہے ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لاتے ہی جو اقدامات فرمائے اس پر میں قدرے تفصیل سے پچھلے جمعہ تقریر کر چکا ہوں[1]۔ پہلے چھ مہینے آپؐ نے داخلی استحکام پر صرف فرمائے اور اس سے فارغ ہو کر حضورؐ نے آٹھ مہمیں قریش کے تجارتی راستوں کو مخدوش کرنے اور اپنی موجودگی (Presence) ظاہر کرنے کے لئے بھیجیں جن میں سے چار میں آپؐ نے نفسِ نفیس شرکت فرمائی جو غزوات شمار ہوتی ہیں اور چار وہ ہیں کہ جس میں آپؐ خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ چار چھوٹے چھوٹے دستے کسی صحابیؓ کی سرکردگی میں بھیجے جو سرایا کہلاتے ہیں۔ دونوں میں کوئی انصاری صحابی شریک نہیں تھے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان مہمات کے تتبع میں پوری طاقت کے ساتھ قریش نے Retaliate کیا ہے اور ان کا یہ جوابی اقدام غزوۂ بدر پر منتج ہوا ہے ــــ میں پچھلی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ اگر حضورؐ کی طرف سے غزوۂ بدر سے قبل والی آٹھ مہمات نہ بھیجی گئی ہوتیں تو مکہ والے ایک ہزار کا لشکر لے کر ہرگز اقدام نہ کرتے اس لئے کہ مکہ میں جہاں Hawks (جنگ پسند) تھے۔ وہاں Doves (صلح جو) بھی تھے جو اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن شریف النفس لوگ تھے اور خونریزی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہی میں سے بعض لوگ بعد میں ایمان بھی لے آئے تھے۔ میں یہ احوال و کوائف گذشتہ تقریر میں قدرے تفصیل سے آپ کو سنا چکا ہوں۔

مشرکین میں سے ابوجہل اور نضر ابن حارث کی وہ دعائیں بھی میں آپ کو سنا چکا ہوں جو انہوں نے غزوۂ بدر کی رات کو اللہ سے کی تھیں۔ ابوجہل کی دعا کا ایک ایک لفظ ایک مخلص قوم پرست شخصیت کی غمازی کرتا ہے۔ اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے رحمی رشتے کٹوا دیئے ہیں۔ ہمیں پھاڑ دیا ہے۔ ہماری جمعیت کو پراگندہ کر دیا ہے۔ اس کا عملی نمونہ میدانِ بدر میں اس طور پر موجود تھا کہ حمزہؓ حضورؐ کے لشکر کے ساتھ تھے تو ان کے بھائی عباس مشرکین کے ساتھ جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے یا تو ایمان تو لے آئے تھے لیکن ابھی اسے چھپا رکھا تھا۔ باپ عتبہ ابن ربیعہ مشرکین کے لشکر کا سپہ سالار ہے، اس کا ایک بیٹا اور بھائی بھی اس کے ساتھ ہے تو اس کا ایک بیٹا حضرت ابوحذیفہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں میں شامل ہیں۔ یہی صورتِ حال حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن کی ہے کہ باپ حضورؐ کے معین ہیں اور بیٹا مشرکین و کفار کا ساتھی ہے۔ حضرت علیؓ حضورؐ کے ساتھ ہیں تو ان کے بھائی عقیل مشرکین کے ساتھ مقابلہ کے لئے آئے ہیں ــــ یہ تو چند مثالیں ہیں ورنہ قریشی مہاجرین میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا کوئی رشتہ دار مشرکین کے لشکر میں شامل نہ ہو ــــ نضر بن حارث کی دعا تھی: اللّٰهُمَّ انْصُرْ خَيْرَ الْحِزْبَيْنِ۔ وہ تو اپنی جماعت کو حق پر سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک تو معاذ اللہ

---

[1] شائع شدہ "میثاق" بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۰ء

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بے دین ہوگئے تھے تو اس نے یہی دعا کی دی تھی کہ ان مقابل دو جماعتوں میں سے جو بہتر ہے اے اللہ تو اس کی مدد فرما۔ اللہ نے اس کی دعا قبول فرمائی اور اغبا میری گذشتہ تقریر اسی جملہ پر ختم ہوئی تھی کہ ان دونوں جماعتوں میں سے جو خیر کی علم بردار تھی اسی کی اللہ نے مدد فرمائی اور غزوۂ بدر کو یوم فرقان قرار دیا

غزوۂ بدر سے متعلق ایک اہم واقعہ آگے بڑھنے سے قبل غزوہ بدر سے متعلق یہ اہم واقعہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ جب عتبہ ابن ربیعہ نے اس خبر کے بعد کہ ابوسفیان کا قافلہ محفوظ مکہ پہنچ گیا ہے، حکیم ابن حزام کی تجویز پر یہ کوشش کی تھی کہ جنگ ٹل جائے، اس پر ابوجہل نے اسے طعنہ دیا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بیٹا سامنے ہے اسی لئے تمہاری ہمت جواب دے رہی ہے اور محبت پدری کے باعث تم یہ تجویز لے کر آئے ہو کہ جنگ نہ ہو۔ پس یہ طعنہ تھا جو عتبہ کو کھا گیا۔ اور اس طرح صلح جو لوگوں (DOVES) کی جانب سے جنگ کو ٹالنے کی کوشش ناکام ہوگئی۔ چنانچہ اگلی صبح جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو لے کر نکلا اور مبارزت طلب کی۔ اہلِ ایمان کے لشکر سے تین انصاری صحابیؓ مقابلہ کے لئے نکلے۔ عتبہ نے چیخ کر پوچھا: مَنْ اَنْتُمْ ؟ مِنَ الْقَوْمِ ؟ ـــــ انہوں نے اپنے نام بتائے۔ عتبہ نے کہا کہ تم ہمارے برابر کے نہیں ہو، ہم تم سے لڑنے نہیں آئے۔ پھر چیخ کر پکارا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری توہین نہ کرو۔ ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ ہمارے مقابلے کے لئے انہیں بھیجو جو ہمارے برابر کے ہیں، جو ہمارے مدمقابل ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر باپ کے مقابلہ میں بیٹا یعنی عتبہ کے مقابلے میں حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکلنا چاہا۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روک دیا۔ پھر حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ ابن حارث ابن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تین صحابی مقابلہ کے لئے نکلے۔ حضرت حمزہؓ نے عتبہ کو اور حضرت علیؓ نے شیبہ کو جلد ہی واصلِ جہنم کر دیا لیکن حضرت عبیدہؓ کا ولید ابن عتبہ سے شدید مقابلہ ہوا۔ دونوں کا بیک وقت ایک دوسرے پر کاری وار ہوا۔ حضرت عبیدہ کی ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ گر پڑے تو حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ آگے بڑھے، ولید کو ختم کیا اور حضرت عبیدہ کو، جو جاں بلب تھے، اٹھا کر لے آئے۔ انہوںؓ نے کہا مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لے چلو۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے حضورؐ سے پوچھا کہ میرے متعلق فرمائیے تو حضورؐ نے فرمایا کہ "تمہیں یقیناً جنت ملے گی" تو ان کے چہرہ پر بشاشت آئی اور ان کی زبان سے

نکلا دمکاشش! آج ابوطالب زندہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ میں نے ان کی بات سچ کر دکھائی ہے کہ اپنی جان حضورؐ پر نچھاور کر دی ہے ۔ بات یہ تھی کہ جب مشرکین مکہ کا جناب ابوطالب پر شدید دباؤ پڑتا تھا کہ تم اور بنو ہاشم، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حمایت سے دستکش ہو جاؤ تاکہ ہم ان سے نمٹ لیں یعنی (نعوذ باللہ) آپ کو قتل کر دیں تو عام طور پر جناب ابوطالب اس وقت ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ:

"تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اس وقت تک قابو نہیں پا سکو گے جب تک ان کی حفاظت میں ہمارا بچہ بچہ کٹ کر مر نہ جائے گا۔"

حضرت عبیدہؓ کا انتقال میدان بدر میں نہیں ہوا بلکہ فتح کے بعد جب اسلامی لشکر مدینہ منورہ واپس جا رہا تھا تو راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ ان کی قبر میدان بدر سے آگے مدینہ منورہ کے راستے میں ہے۔

بہرحال ۱۷، رمضان المبارک سن دو ہجری میں میدانِ بدر میں باقاعدہ اور دو بدو جنگ کی صورت میں اندرونِ عرب انقلاب محمدیؐ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے چھٹے اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کا آغاز ہو گیا۔ اس غزوہ میں قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے ابوسفیان کے علاوہ اور ابولہب کے علاوہ باقی قریباً تمام ہی کھیت رہے۔ واضح رہے کہ ابوسفیان چونکہ تجارتی قافلے کے ہمراہ تھے، لہٰذا وہ اس جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی طرح ابولہب بھی جنگ میں شریک نہیں تھا اس نے اپنی جگہ کرائے کا فوجی بھیج دیا تھا۔ قریش کے کل ستر سربرآوردہ لوگ مقتول ہوئے۔ ابوجہل مارا گیا۔ عتبہ ابن ربیعہ، اس کا بھائی اور بیٹا قتل ہوئے۔ اسی طرح نضر ابن حارث، امیہ ابن خلف، عقبہ ابن ابی معیط جیسے مشرکین جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے کٹر دشمنوں میں سے تھے اور خون کے پیاسے تھے، گاجر مولی کی طرح قتل کر دیئے گئے۔

سنت اللہ کا ظہور اس کے وجہ بھی سمجھ لیجئے۔ اصل میں یہ عذاب الٰہی تھا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی تھی کہ جب وہ کسی قوم یا ملک کی طرف کسی رسول کو بھیجتا تھا ـــــ یہاں 'تھی' اور 'تھا' اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر نوع کی نبوت و رسالت کا دروازہ ہمیشہ ہمیش کے لئے بند ہو چکا ہے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر میں کوشش کرتا ہوں کہ لفظ 'ہے' میری زبان پر آئے ہی نہیں تاکہ کسی درجہ میں بھی نبوت و رسالت جاری رہنے کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہ ہو ـــــ تو اللہ جس قوم یا ملک کی طرف اپنے رسول کو بھیجتا تھا اور اگر وہ قوم انکار پر اس درجہ اڑ جاتی تھی کہ رسول کی جان لینے کے درپے ہو جائے یہاں تک کہ رسول کو وہاں سے ہجرت

کرنی پڑے تو رسول اور ان کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد اس قوم پر عذاب کا آنا لازم ہوتا تھا۔ رسول اور ان کے اصحاب کو بچا لیا جاتا تھا اور پوری قوم ہلاک کر دی جاتی تھی۔

البتہ عذاب الٰہی کی صورتیں اور نوعیتیں مختلف رہی ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ پوری قوم کو ایک عظیم طوفان باد و باراں کے ذریعہ غرق کر دیا گیا۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ معاملہ ہوا اور کہیں ایسا ہوا ہے کہ پوری کی پوری قوم کو ان کی بستیوں کے اندر ہی ختم کر دیا گیا۔ جیسے قوم لوط، قوم عاد اور قوم ثمود کی بستیاں، تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ اہل تمرد کو زمین میں دھنسا دیا جاتا ہے جیسے قارون کے ساتھ معاملہ ہوا اور کہیں ایسا ہوتا ہے کہ کفار و مکذبین کے سربرآوردہ اور چیدہ چیدہ لوگوں کو اپنی بستیوں سے باہر نکالا اور ان کو عذاب الٰہی نے ملیامیٹ کر دیا جیسے آل فرعون کو حضرت موسیٰ کے تعاقب میں نکالا اور ان کو سمندر میں غرق کر دیا گیا: سورۂ عنکبوت میں ان چاروں انواع کے عذاب کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا۔

آل فرعون کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس سے ملتا جلتا معاملہ قریش مکہ کے ساتھ کیا گیا۔ یہاں اسی سنۃ اللہ کا ظہور صرف اس فرق کے ساتھ ہمیں ملتا ہے کہ آل فرعون کو تو سمندر میں غرق کر دیا گیا لیکن قریش کے جو نامی گرامی سردار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے رہے تھے، جو حضورؐ کے خون کے پیاسے تھے جو توحید کی انقلابی دعوت کے شدید مخالف تھے، ان سب کو میدان بدر میں کھینچ بلایا۔ اور اہل ایمان کے ہاتھوں انہیں قتل کرا دیا۔ اسی سنۃ اللہ کی جانب اشارہ سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۱۷ کے آغاز میں ہے کہ: فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ۔ (اے مسلمانو! تم نے ان (مشرکین مکہ) کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے آپ کو ابھی بتایا تھا کہ ابولہب میدان میں نہیں آیا تھا وہ کینہ ہونے کے ساتھ بزدل بھی تھا۔ چنانچہ لڑنے والے کو بھیج دیا تھا۔ لیکن عذاب الٰہی سے وہ بھی نہ بچ سکا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے کچھ دنوں بعد وہ مکہ کے اندر ہی [illegible] پلیگ جیسی کسی بیماری میں مبتلا ہو کر نہایت عبرت ناک موت سے دوچار ہوا۔ اس کا تمام جسم سڑ گیا تھا اور اس میں شدید تعفن پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے اپنے قریبی رشتہ داروں نے بھی اس کو ہاتھ نہیں لگایا

اس کی نعش کو ٹکڑیوں سے دھکیل دھکیل کر ایک گڑھے میں دفن کر دیا۔ اس کا یہ حشر مکہ میں
ہوا تھا۔ چونکہ وہ بدر میں آیا ہی نہیں تھا۔

پس درحقیقت غزوۂ بدر میں صنادید مشرکین کی ہلاکت اس سُنّۃ اللّٰہ کے اور قانونِ الٰہی
کے مطابق دنیوی عذابِ الٰہی تھا جو اللہ نے رسولوں کی تکذیب اور ان کو دیس سے نکلنے پر مجبور
کرنے والے کفار و مکذبین کے لئے طے کر رکھا ہے ـــــ صحابہ کرامؓ میں سے تیرہ نے میدانِ بدر
میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ایک حضرت عبیدہؓ ہیں جو زخمی تھے۔ واپسی کے سفر میں اثنائے راہ
ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح گویا صحابہ کرامؓ کی طرف سے چودہ افراد نے جان کا نذرانہ اپنے رب کے
حضور پیش کر دیا اور کفار و مشرکین کے ستر صنادید خاک و خون میں مبتلا ہو کر واصل جہنم ہوئے۔
مزید یہ کہ ستر مشرکین کو اہلِ ایمان نے قید کر لیا۔

غزوۂ بدر کے اثرات

غزوۂ بدر کا جو نتیجہ نکلا اور اس کے جو اثرات مترتب ہوئے اب ان کو سمجھ لیجئے۔
سب سے پہلی اور واضح بات یہ کہ پورے عرب میں اہلِ ایمان کی دھاک بیٹھ
گئی۔ خاص طور پر بدر کے قریب کے علاقہ پر۔ اور اس طرح اس غزوہ میں فتح و کامرانی کی بدولت
دعوت و تحریک توحید کو اور اسلامی انقلابی جد و جہد کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ پورے عرب میں
جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ قریش کا کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا لشکر جناب محمد صلی اللہ علیہ
وسلم کے تین سو تیرہ قریباً نہتے اور بے سر و سامان صحابہؓ کرام سے شکست کھا گیا ـــ قریباً نہتے اور بے
سر و سامان میں اس لئے کہتا ہوں کہ یہ حضراتِ قدسی جنگ کے ارادے سے تو نکلے ہی نہیں تھے، وہ
تو صرف ابوسفیان کے قافلہ کا راستہ روکنے کے لئے نکلے تھے۔ مدینہ سے روانگی کے وقت تو ان
کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک ہزار کے لشکر سے مڈبھیڑ ہو جائے گی ـــــ میں آج صبح سیرت
محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر وہ کتاب پڑھ رہا تھا جو جناب محمد ابن عبدالوہاب نجدی رحمۃ
اللہ علیہ کے صاحبزادہ نے لکھی ہے۔ اس میں بڑی تفصیل سے یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت صرف اس قافلہ پر یورش کا ارادہ ظاہر
فرمایا تھا جو مالِ تجارت لے کر شام سے واپس آ رہا تھا۔ لہٰذا کوئی نفیرِ عام نہیں تھی۔ کوئی اعلانِ
جنگ نہیں تھا۔ قافلہ کے ساتھ محافظوں کی تعداد کا اندازہ کر کے حضورؐ مدینہ سے روانہ ہوئے تھے
یہ تو مدینہ سے باہر نکل کر حضورؐ کو خبر ملی ہے کہ مسلمانوں کی قافلہ پر یورش کے ارادہ کی خبر قریش کو مل چکی
ہے اور قریش کا کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کا لشکر مدینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

مشاورت کی فضا یہ خبر ملنے کے بعد حضورؐ نے مشورہ فرمایا ہے کہ کیا ارادہ ہے! قافلہ کی طرف چلیں یا لشکر کی طرف! ۔ اس مشاورت کا حال میں تفصیل سے آپ کو گذشتہ کئی تقاریر میں سنا چکا ہوں ۔ اس وقت مجھے اس ضمن میں جو اضافہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس موقع پر جن بعض صحابہ کرامؓ نے قافلہ کی طرف چلنے کا مشورہ دیا تھا تو اصل میں اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم جنگ کے لئے تو تیار ہو کر نکلے ہی نہیں ۔ نہ ہم نے اس اعتبار سے اپنی نفری بنائی ہے اور نہ ہی اس کے لئے ساز و سامان ساتھ لیا ہے ۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ غزوہ ذوالعشیرہ میں ڈیڑھ سو مہاجرینؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ۔ جبکہ غزوۂ بدر کے موقع پر صرف تریسٹھ یا تراسی۸۳ مہاجرینؓ حضورؐ کے ہمراہ تھے ۔ گویا مہاجرین کی نفری بھی پوری نہیں تھی ۔ لہٰذا یہ رائے نہ تو بزدلی کی بنیاد پر تھی اور نہ منافقت کی بنیاد پر بلکہ جو بھی احوال و اسباب تھے ان کی بنیاد پر یہ صحیح تھی کہ ہم اس ارادہ سے نہیں نکلے ۔ لہٰذا قافلہ کی طرف چلنا بہتر اور مناسب ہوگا ۔ لیکن حضورؐ کا منشا کچھ اور تھا ۔ حضورؐ اللہ کی مشیت کے مطابق چاہتے تھے کہ فیصلہ ہو جائے : لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۔ کہ "جو مرے وہ دلیل کے ساتھ مرے اور جو جئے وہ دلیل کے ساتھ جئے ۔"

بہرحال میں اس مشاورت کی روداد پہلے ہی بیان کر چکا ہوں ۔ اب عالم عرب میں جب یہ خبر پہنچی کہ قریش کی ایک ہزار کی جمعیت تین سو تیرہ مسلمانوں سے شکست کھا گئی ۔ ان کے بڑے بڑے ستون غزوۂ بدر میں کھیت رہے : فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ یعنی مشرکین مکہ میدان بدر میں ایسے پڑے ہوئے تھے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے ۔ ابوجہل میں ابھی جان تھی جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پاس آ کر اس کی گردن پر اپنا پاؤں مبارک رکھا اور فرمایا : هٰذَا فِرْعَوْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ ۔ "اس امت کا فرعون یہ شخص ہے" ۔ پس اس فتح سے اہل ایمان کو بڑی تقویت حاصل ہوئی ۔ ایک طرف ان کا حوصلہ (MORALE) بہت بلند ہوا ۔ دوسری طرف تمام عرب پر مسلمانوں کی ہیبت اور رعب پڑ گیا ۔ لہٰذا غزوہ بدر کے بعد تیرہ ماہ مسلمانوں کے شادمانی اور مسرت کے گزرے ، اسلام کی دعوت کے اثرات میں وسعت پیدا ہوئی لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اب کچھ کچے اور ضعف ارادہ کے حامل لوگ بھی آ کر شامل ہو گئے ۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے ۔ اس سے پہلے تک تو معاملہ یہ تھا کہ جو آتا تھا وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر آتا تھا ۔ وہ جانتا تھا کہ دعوتِ اسلام قبول کرنے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عاید ہو جائیں گی اور کن کن خطرات سے اسے دوچار ہونا پڑے گا ۔ جان ہر لحظہ ہتھیلی پہ رکھنی ہوگی ۔ اس راہ میں مشکلات کے پہاڑ آئیں گے ۔ مصائب

وشدائد سے سابقہ پیش آئے گا۔ لیکن بدر کی فتح سے جب صورتِ حال بدل گئی تو کچے لوگوں نے بھی پیشقدمی کی، وہ بھی آ گئے۔

غزوۂ اُحد

غزوۂ بدر رمضان المبارک ۲ھ میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ تیرہ ماہ بعد شوال ۳ھ میں مشرکینِ مکہ کا ایک لشکرِ جرار مدینہ پر چڑھ کر آ گیا جو جوشِ انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت ان کے سینوں میں انتقام کی جو آگ کھول رہی تھی اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ تو قبائلی زندگی کا جن کو کچھ تجربہ ہے اور جن کو عرب کے انتقامی جذبات و احساسات سے کچھ واقفیت ہو اور جنہوں نے ان کی اس دور کی شاعری اور خطبات پڑھے ہوں وہ کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طور پر اس وقت ان کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ مکہ والوں نے غزوۂ بدر کے بعد ایک دن بھی چین و آرام میں نہیں گزارا۔ انتقامی جذبات لاوے کی طرح ہر دل میں کھول رہے تھے۔ ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک مقتولینِ بدر کا انتقام نہیں لے لیا جائے گا نہ خوشبو لگاؤں گا نہ چارپائی پر سوؤں گا۔ اسی طرح اس ایک سال کے دوران ہندہ کا جو حال رہا ہے، آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ باپ مارا گیا، چچا مارا گیا، بھائی مقتول ہوا۔ یہ ہندہ ابوسفیان کی بیوی اور عتبہ کی بیٹی ہیں، حضرت ابوحذیفہؓ کی بہن ہیں جو سابقون الاوّلون میں سے ہیں۔ ہندہ بھی فتح مکہ کے موقع پر ایمان لے آئی تھیں اور مومنہ صادقہ ثابت ہوئیں۔

قریش کی پیش قدمی اور حضورؐ کی مشاورت۔

بہر حال اب جو لشکر چڑھ کر آیا وہ تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ قریش اپنی اور اپنے حلیفوں کی جو ممکنہ قوت اور طاقت لا سکتے تھے وہ لے کر میدان میں آ گئے۔ اس موقع پر بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ایک مشاورت منعقد فرمائی۔ میں یہ واقعات اس لئے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جماعتی زندگی اور انقلابی جدوجہد سے متعلق بعض اہم پہلو اس سے نمایاں ہوں گے۔ دعوت، تنظیم اور تربیت کے جن مراحل کا ہم جائزہ لے چکے ہیں۔ اب ان کے عملی مظاہرے اور انطباق کے مواقع آ رہے ہیں۔ وہی تیاری تھی جو اب یہاں استعمال ہو رہی ہے تو تنظیمی اعتبار سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اہم فیصلہ بھی یک طرفہ نہیں فرمایا بلکہ مشورے کے طور پر صحابہ کرامؓ کے سامنے معاملہ پیش فرمایا۔ مجلسِ مشاورت پھر منعقد ہو رہی ہے جیسے غزوۂ بدر سے پہلے ہوئی تھی۔ حضورؐ مشورہ طلب فرما رہے ہیں کہ بتاؤ کیا حکمتِ عملی اختیار کریں، تین ہزار کا لشکر مدینہ

پر چڑھائی کرنے آرہا ہے۔

حضورؐ کی ذاتی رائے بھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عجیب اتفاق ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی کی رائے بھی یہی تھی۔ آخر جھوٹا انسان ہر موقع پر تو جھوٹ نہیں بولتا۔ کبھی وہ سچ بھی بولتا ہے۔ عبداللہ ابن ابی مدینہ کا رہنے والا تھا لہٰذا وہ اپنے حالات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس طرح کی صورتِ حال میں مدینہ والے محصور ہو کر مدافعت کیا کرتے تھے تاکہ مرد گلیوں میں دو بدو لڑیں اور عورتیں اوپر سے دشمن پر پتھراؤ کریں۔ اس طرح گویا کہ ان کی دوہری طاقت روبکار آجاتی تھی۔ چنانچہ انہی مصلحتوں کے پیشِ نظر عبداللہ ابن ابی کی رائے بھی یہ تھی کہ ہمیں کھلے میدان میں جنگ کرنے کے بجائے محصور ہو کر اپنی مدافعت کرنی چاہیے۔ بعض قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان بھی یہی تھا۔

لیکن ایک تو اکابر صحابہ میں سے بعض حضرات کھلے میدان میں جنگ کرنے کے حامی تھے۔ ان میں حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی نام شامل ہے ـــــ اب یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے تھا کہ ابھی جبل اُحد کے دامن میں ان کی شہادت ہونی ہے۔ لہٰذا ان کا خصوصی جوش تھا کہ نہیں ہمیں مردانہ وار دو بدو جنگ کرنی ہے ہمیں تو شہادت درکار ہے ـــــ دوسرے یہ کہ نوجوانوں کی طرف سے بھی یہی مطالبہ تھا، خاص طور پر ان کی طرف سے جو غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ غزوہ بدر کے موقع پر نفیرِ عام تو تھی ہی نہیں۔ جنگ کے ارادے سے تو اس وقت نبی اکرمؐ اور چند صحابہؓ نکلے ہی نہیں تھے۔ تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس غزوہ میں شریک ہونے سے رہ گئے تھے ان کے سینوں میں کتنی حسرت ہو گی کہ کتنی بڑی سعادت سے ہم محروم رہ گئے۔ لہٰذا ان کا بھی جوش و خروش تھا کہ ہمیں کھلے میدان میں جا کر جنگ کرنی چاہیے۔ پھر اس تیرہ ماہ کے عرصہ میں جو لوگ ایمان لائے تھے، ان کے ذہنوں میں ہو سکتا ہے کہ یہ بات ہو کہ جب تین سو تیرہ نے بدر میں اتنی بڑی فتح حاصل کی ہے تو اللہ کی مدد آخر یہاں بھی تو ہمارے شاملِ حال ہوگی لہٰذا فتح تو ہمیں ہونی ہی ہونی ہے تو ہم اپنے دامن پہ یہ داغ کیوں گوارا کریں کہ ہم نے مردوں کی طرح کھلے میدان میں جا کر جنگ نہیں کی۔ پس یہ مختلف اسباب تھے جن کی وجہ سے محسوس ہوا کہ زیادہ لوگوں کی خواہش ہے کہ کھلے میدان میں جنگ ہو۔

پس نبی اکرمؐ نے اپنی رائے کو پیچھے رکھا اور اپنے ساتھیوں کی رائے کے مطابق فیصلہ فرما دیا کہ کھلے میدان ہی میں مقابلہ کیا جائے گا۔ اس طرح جماعتی زندگی کا ایک اہم اصول سامنے آ گیا۔ مشورہ

اور اس کی اہمیت سامنے آگئی۔ اگرچہ اسلامی نظم جماعت میں فیصلہ کا آخری اختیار امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ اکثریت کی رائے کا پابند نہیں ہوتا۔ لیکن تدبیر کے معاملہ میں اپنے ساتھیوں کی دلجوئی کے لئے اور ان کے اندر ایک باہمی اعتماد کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے امیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ کبھی اپنے ساتھیوں کا احترام کرتے ہوئے ان کی رائے کے مطابق فیصلہ دے۔ جیسا حضورؐ کے اسوہ حسنہ سے سامنے آتا ہے۔ البتہ یہ طرز عمل صرف تدبیر کے معاملہ میں اختیار کیا جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ نص میں، یعنی ایسے معاملے میں جہاں اللہ اور اس کے رسول کا امر صریح موجود ہو یہ طرز عمل ہرگز اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ تدبیر کے معاملہ میں بھی یہ بات ذہن نشین رہے گی کہ گو تدبیر ہماری ہے لیکن مآل کار تمام معاملات کا اختیار تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو وہ چاہے گا نتیجہ اس کے مطابق ظاہر ہوگا

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحابؓ کی اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے فیصلہ فرما دیا کہ کھلے میدان میں جنگ ہوگی۔ اس کے بعد غیر معمولی واقعہ یہ ہوا کہ نبی اکرمؐ اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے۔ جب برآمد ہوئے تو آپؐ نے زرہ زیب تن فرمائی ہوئی تھی۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ صحابہ کرامؓ کا ماتھا ٹھنکا ——— حضورؐ نے خواب بھی دیکھا تھا کہ ایک گائے ذبح ہوئی ہے اور بھی چند باتیں خواب میں ایسی دیکھی تھیں جس سے حضورؐ کو اندازہ تھا کہ میدان احد میں چند غیر معمولی اور ناخوشگوار واقعات ظہور پذیر ہوں گے ——— حضورؐ کو زرہ پہنے دیکھ کر لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں۔ آپؐ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ اور انتظام فرمائیں ——— اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں فیصلہ برقرار رہے گا۔ نبی کو یہ زیبا نہیں ہے کہ ہتھیار باندھنے کے بعد بغیر جنگ کئے انہیں اتار دے۔

قریباً یہی بات سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں فرمائی گئی ہے جو گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کی توثیق میں نازل ہوئی ہے ——— یہ بات متفق علیہ ہے کہ سورہ آل عمران کا بیشتر حصہ غزوہ احد کے بعد نازل ہوا ہے ——— محولہ بالا آیت میں بالکل وہی نقشہ ہے جس پر حضورؐ نے عمل فرمایا تھا۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ جو کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی اجتہاد سے کئے، بعد میں اللہ کی طرف سے قرآن مجید میں ان کی توثیق آگئی ——— بہرحال وہ آیت مبارکہ یہ ہے کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ "اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ اللہ تعالیٰ کا آپؐ پر بڑا فضل و کرم ہے اور اس کی آپؐ پر

بڑی رحمت ہے کہ آپؐ اپنے ان ساتھیوں کے حق میں بڑے نرم ہیں۔ ان کی دلجوئی فرماتے ہیں تاگر آپؐ کہیں سخت دل اور درشت خو ہوتے تو یہ لوگ منتشر ہو گئے ہوتے (آپ کے پاس سے چھٹ گئے ہوتے) اقبالؔ نے اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے ایک شعر میں سمو دیا ہے کہ

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے　　　کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

تو یہ خوئے دلنوازی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بکمال و تمام تھی۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس اسلوب سے فرمائی: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۚ آگے ارشاد ہوتا ہے: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ "پس ان کی خطاؤں سے درگذر کیجئے اور ان کے لئے استغفار بھی کرتے رہا کیجئے"۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ "اور ان سے معاملات میں مشورہ بھی لیجئے"

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ "جب آپ فیصلہ کریں تو پھر آپؐ اللہ پر توکل کیجئے" یعنی پھر فیصلوں کا بار بار بدلنا درست نہیں۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے ان عظیم ترین الفاظ مبارکہ پر: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ "بلا شبہ اللہ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے" جن کو اللہ محبوب قرار دے ان سے خوش بخت، خوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے!

اُحُد کی جانب کوچ اور منافقین کا طرزِ عمل: بہرحال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہزار کی نفری لے کر مدینہ سے جبل اُحُد کی جانب کوچ فرمایا لیکن راستے ہی میں عبد اللہ ابن ابی تین سو افراد کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے کر چلا گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا اور ہماری بات نہیں مانی جاتی تو ہم ساتھ کیوں دیں اور اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالیں! اب آپ اندازہ کیجئے کہ مدنی دور کے تقریباً ڈھائی سال کے اندر اندر جنگ کے قابل مسلمانوں کی کل نفری کا لگ بھگ ایک تہائی منافقین پر مشتمل ہو چکا تھا۔ معاملہ کی نزاکت کا آپ کو کوئی اندازہ ہوا! ــــ اس لئے کہ جو تین سو واپس چلے گئے ان کے منافق ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ کمزور اور ضعیف ایمان والے اور بھی تھے۔ یہ جو سات سو افراد رہ گئے تھے ان میں بھی تھے[1] چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ دامنِ احد میں پہنچ کر مدینہ کے دو خاندانوں کے افراد نے کم ہمتی کے باعث واپس لوٹنا چاہا۔ سورہ آل عمران میں اس کا ذکر بھی موجود ہے: اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَ

---

[1] آپ کو یاد ہو گا کہ میدان بدر سے بھی قریش کے دو گھرانے یہ خبر سن کر کہ قافلہ بحفاظت مکہ پہنچ گیا ہے واپس مکہ چلے گئے تھے۔

اللّٰہُ وَلِیُّھُمَا ط ۔ یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ ایسے تھے جو ڈھیلے پڑ گئے تھے (کمزوری دکھانے والے تھے) لیکن اللہ ان کا مددگار تھا، ان کا پشت پناہ تھا۔ اس نے ان کو سنبھال لیا اور وہ میدان میں ڈٹے رہے ـــ چنانچہ یہ دونوں گروہ بعد میں کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو 'مِنکُم' قرار دیا ہے۔ یعنی اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی میں شامل قرار دیا ہے اور اپنی ذات سبحانہ کو ہمارا ولی' دوست' پشت پناہ فرمایا ہے ـــ البتہ اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ ان دو گروہوں میں کمزوری پیدا ہوئی تھی' ان کی ہمت جواب دینے لگی تھی لیکن تھے وہ اصحابِ ایمان! جب ہی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سنبھال لیا۔ لیکن جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر راستہ ہی سے عبداللہ ابن اُبی کے ساتھ واپس مدینہ چلے گئے؛ ظاہر ہے ان کے نفاق میں کوئی شک نہیں ہو سکتا گویا ایک ہزار میں سے تین سو کی نفری کے متعلق یہاں ثابت ہو رہا ہے کہ وہ منافقین پر مشتمل تھی۔

فوری فتح

بہرحال جنگ شروع ہوئی اور پہلے ہی ہلے میں اللہ کی مدد و نصرت آئی اور بالکل بدر کا سا نقشہ سامنے آگیا۔ کہاں وہ تین ہزار کا لشکر اور کہاں یہ سات سو! قریش کے ساتھ دو سو گھوڑوں کا رسالا تھا۔ عرب کے اس دور کے حالات کے اعتبار سے یہ بہت بڑی بات تھی۔ میدانِ بدر میں ان کے پاس سو گھوڑے تھے اور اہلِ ایمان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک حضرت مقداد ابن الاسود اور ایک حضرت زبیر ابن العوام کے پاس۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ قریش کے ساتھ سات سو اونٹ تھے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ستر تھے۔ اسی کے متعلق حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کی ایک نظم 'بدر کی فریاد' میں بڑے پیارے انداز میں یہ نقشہ کھینچا ہے:

یہ ستر اونٹ دو گھوڑے یہاں سیراب ہو جاتے
مجاہد بھی وضو کرتے' نہاتے غسل فرماتے

(جاری ہے)

تاریخی گوشے

حکیم محمود احمد برکاتی

انتخابِ امامُ الہندؒ

جمعیۃ علماء ہند، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نسبت و حوالہ سے ایک اہم مسئلہ "نظم جماعت اور انتخابِ امام الہند" کا ہے، جس کی بہت سی تفصیلات قارئین، محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی متعدد تحریروں کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے مضامین میں بھی پڑھ چکے ہیں۔

خاص طور پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے تفصیلی مضامین میں اس مسئلہ پر بڑی شرح و بسط سے لکھا ہے اور یہ ثابت کیا کہ مختلف مراحل سے گذر کر یہ مسئلہ اس موڑ پر پہنچ چکا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی امامت پر شیخ الہندؒ سمیت اکثر و بیشتر حضرات متفق ہو چکے تھے بلکہ شیخ الہندؒ تو نہایت درجہ حساس تھے اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد یہ مسئلہ طے ہو اور وہ سب سے پہلے خود بیعت کرنے پر آمادہ تھے۔

جمعیت کا ۱۹۲۰ء کا اجلاس جو حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کا پہلا اور آخری اجلاس تھا (اس لئے کہ ۱۹۱۹ء کے اجلاس میں شیخ الہند جیل میں تھے اور ۱۹۲۰ء کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا) وہ اس لحاظ سے فیصلہ کن تھا اور عام طور پر امید ہو چلی تھی کہ یہ بات طے ہو جائے گی لیکن ہندوستان کی ایک ملی تحریک "خیر آباد" کے گل سرسبد علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری قدس سرہ کی مخالفت نے سارے منصوبے کو البیا التوا میں ڈال کر پھر اس سلسلہ میں کوئی مزید پیش رفت نہ ہو سکی۔ اس کے بعد جلد ہی حضرت شیخ الہندؒ انتقال کر گئے۔ ایک مضبوط اور موثر شخصیت کے اٹھ جانے کا اثر سبھی پر ہوا۔ خود مولانا آزاد کے جذبات بھی سرد پڑ گئے۔ اور ۱۹۲۱ء میں جب لاہور میں اجلاس ہوا تو بقول ملک نصر اللہ خان عزیز اور ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی توقع ہی نہیں یقین تھا کہ اب مزید کچھ ہو گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ جس کا راز بعد میں یہی کھلا کہ مولانا اجمیری

بنیادی طور پر اس معاملہ کے التواء کا باعث بنے تھے، البتہ بعد ازاں بعض دوسرے علماء بھی جن میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا نام نمایاں ہے، تجویز کے مخالف ہو گئے تھے اس ضمن میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے مولانا عبدالماجد بدایونی سے سنے ہوئے چند جملے نقل کئے تھے جو بیّنہ طور پر اس سلسلہ میں مولانا اجمیری نے مولانا آزاد سے مخاطب ہو کر کہے تھے جن میں یہ تیکھے الفاظ بھی شامل تھے کہ :

" ایاز قدرِ خود بشناس "

سلسلہ خیرآباد کے ایک فاضل حکیم محمود احمد برکاتی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ایک لمبی تحریر کے ذریعہ یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مولانا اجمیری نے یہ جملہ نہیں کہا تھا اور بعد میں ان کے مولانا آزاد سے تعلقات و مراسم بہت اچھے رہے ۔

ہمیں تعلقات و مراسم کی اچھائی کا انکار بالکل نہیں لیکن یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ برکاتی صاحب یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کے سلسلہ میں علماء بے حد حساس تھے ایسا کرنا چاہتے تھے لیکن ۱۹۲۰ء کے اجلاس میں ایسا نہ ہو سکا تو آخر کیوں ! اور پھر ۱۹۲۱ء کے اجلاس میں لوگوں کی توقع کے باوجود اس کا کسی نے ذکر تک نہ کیا تو اس کا سبب کیا ہے !

ہم ان کی بات تسلیم کر لیتے ہیں کہ مولانا آزاد اور علامہ اجمیری کے تعلقات بڑے خوشگوار رہے اور ایسا ہونا باعثِ تعجب اس لئے نہیں کہ شرفاء تعلقات کے معاملہ میں بڑے وضعدار ہوتے ہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مولانا اجمیری نے یہ جملہ نہیں کہا اور وہ اس کے معرضِ التواء میں ڈالنے کا سبب نہیں بنے ــــــ یہ جملہ نہ سہی تو اس کے قریب قریب کوئی جملہ کہا ہوگا ــــــ آخر اتنی اہم تجویز جس پر شیخ الہند جیسا انسان مصر ہے، اسے روکنے کی غرض سے کسی بھاری پتھر کی ضرورت تو رہتی ہی ہے اور وہ بھاری پتھر مولانا اجمیری کا یہ نہ سہی تو اس کے قریب قریب کوئی چبھتا ہوا جملہ ہوگا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضامین میں جو تفصیلات دی ہیں ان کی سچائی اپنی جگہ باقی رہتی ہے اور ان کا انکار ممکن نہیں ۔

بہر طور تاریخ کے اس پیچیدہ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر محترم برکاتی صاحب کا مضمون

پیشِ خدمت ہے۔ شاید کوئی "رجلِ رشید" ان کڑیوں کے سلسلہ میں مزید خانہ پُری کر سکے۔

ہمارے لئے سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ملت کی اصلاح و بقاء کی غرض سے ایک اہم منصوبہ ایسے معرضِ التوا کا شکار ہوا کہ پھر اس کی صدائے بازگشت مدّتوں نہ سنی گئی۔

"تنظیمِ اسلامی" کے نام سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حال ہی میں جس کوشش کا آغاز کیا ہے، وہ درحقیقت اسی منصوبہ کی صدائے بازگشت ہے — انہوں نے انہی اصولوں اور مقاصد کو سامنے رکھ کر ایک قافلہ کی ترتیب کی کوشش کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لوگ اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں، انہوں نے اس رخ پر سوچنا شروع کر دیا ہے اور اس کی اہمیت کا احساس بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ رب العزت ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء و شرکاء کو دولتِ خلوص و اخلاص سے نوازیں اور ان کی مساعی بارآور ہوں۔ یہ درخت ہرا بھرا ہو اور اس کے سایہ و ثمر سے اُمّتِ مسلمہ بھرپور فائدہ اٹھائے۔ ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!!

(ادارہ)

۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ میں مولانا معین الدین نے جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی اور اس اجلاس کی ایک نہایت اہم تجویز کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سلیمان ندوی اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری کئی سال سے برعظیم کے مسلمانوں کو ایک اہم دینی و ملی فریضے کی طرف اپنے خطبات و مقالات کے ذریعے دعوت دے رہے تھے۔ یہ حضرات مسلمانوں کو دعوت دے رہے تھے کہ نظم جماعت قائم کر کے نصب امامت کریں، مسلم حکومت کے زوال اور غیر مسلم حکومت کے استیلائی حالات میں مسلمانوں کے لئے شرعاً صرف دو ہی صورتیں جائز و باقی رہ جاتی ہیں یا وہ اس ملک سے ہجرت کر جائیں یا پھر نظم جماعت قائم کر کے اپنے لئے ایک امیر یا امام کا انتخاب اور نصب کر لیں، ورنہ ان کی زندگی غیر شرعی و جاہلی زندگی ہو گی۔

علماء ہند کی ایک تعداد مرتبۂ اجمال ہی اس تجویز پر تو متفق ہوگئی تھی مگر اس سوال پر گومگو اور کشمکش کا شکار تھی کہ منصبِ امامت کے لئے مختلف اعتبارات سے موزوں تر اور اہل تر فرد کون ہو سکتا ہے ؟ ایک حلقہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی (۱۹۲۶ء) اور ایک حلقہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی طرف رجحان رکھتا تھا اور ایک حلقہ مولانا ابوالکلام آزاد پر دل نہاد تھا، مولانا آزاد کے بعض رفقا نے ان کے انتخاب کے لئے خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعے راہ بھی ہموار کی تھی اور بالخصوص شیخ الہندؒ کو اپنا پرجوش ہم نوا بنا لیا تھا اور وہ کسی امام الہند سے بیعت کے لئے اپنی بے تابی کا اظہار کر چکے تھے اور مولانا آزاد سے بیعت سے متفق بلکہ مرید تھے۔ چنانچہ ۱۹/۲۰/۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو جمعیت کے دوسرے سالانہ اجلاس میں شیخ الہند کے حلقے کے علماؒ نے مولانا آزاد کو امام الہند منتخب کر لئے جانے کا منصوبہ بنا لیا تھا، اجلاس میں بقول بعض مفتی کفایت اللہ نے اور بقول بعض مولانا ابوالمحاسن نے تجویز پیش کی، شیخ الہند کی حمایت و تائید پہلے ہی معروف تھی آخر میں مولانا آزاد کھڑے ہوئے اور انہوں نے امارت شرعیہ کے قیام اور اس کے وجوب اور مصالح و منافع پر ایک نہایت مدلل و مفصل اور مرصع و موثر تقریر کی جس سے صرف شیخ الہند ہی کا حلقہ نہیں بلکہ حاضرینِ اجلاس کی اکثریت ایسی مسحور ہوئی کہ مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کے لئے آمادہ و مستعد ہو گئے، یہ لمحہ تھا جب مولانا معین الدین نے خطاب کی اجازت مانگی جو بمشکل ملی اور انہوں نے معشر علماء کو اپنے مختصر لیکن موثر خطاب میں اس طرف متوجہ کیا کہ۔

> قیام جماعت اور نصب امارت و امامت کے وجوب سے کسی کو انکار نہیں مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہم امام الہند کا انتخاب آج ہی کر گزریں اور مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت امامت کر لی جائے، یہ مسئلہ جتنا اہم ہے اتنے تدبر اور صبر و سکون سے فیصلے کا متقاضی ہے، عجلت اور جذباتی فضا میں فیصلہ کر ڈالنا مناسب نہیں ہے، ہم سب کو غور و فکر اور تبادلۂ خیال کا موقع ملنا چاہیئے۔ تاکہ کوئی صحیح فیصلہ کیا جا سکے اس لئے میری تجویز ہے کہ چند دن کے لئے یہ فیصلہ ملتوی کر دیا جائے" (او کما قال)

اس تقریر نے اجلاس کا رنگ بدل دیا، ایک طرف وہ جذباتی فضا چھٹ

گئی جو متعدد علما، خصوصاً مولانا ابو المحاسن اور مولانا آزاد کی پرجوش خطابت سے طاری ہوئی تھی دوسری طرف مولانا معین الدین کے بے باکانہ انداز بیان نے دوسرے شرکاء کو جرأت عطا کی چنانچہ ان کے بعد مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے التوا کی حمایت میں تقاریر کیں اور اب اجتماع کا رنگ یہ تھا کہ گویا یہی بہت سوں کے دل کی آواز ہے اور التوا ضروری ہے۔

چنانچہ بیعت کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔

۱۸/۱۷ ستمبر ۱۹۲۱ء جمعیت کی مجلس منتظمہ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا اس اجلاس کے ایجنڈے میں ایک فتوے کے علاوہ مسئلہ انتخاب امام ہند تھا، ان علمائے نے جو مولانا آزاد کو امام الہند ماننے کے لئے تیار نہیں تھے مولانا معین الدین کو اس اجلاس میں شرکت کا پابند کیا، یہ اجلاس ہوا لیکن اس میں بھی کوئی نہ ہوسکا۔

پھر نومبر ۱۹۲۱ء میں تیسرا سالانہ اجلاس ہوا، صدارت مولانا آزاد نے فرمائی لیکن اس اجلاس میں بھی صرف یہ ہوا کہ امیر شریعت (امام ہند) کے اختیارات و فرائض کے تعین کے لئے پندرہ علماء پر ایک کمیٹی بنادی گئی تاکہ وہ بدایوں میں ہونے والے اجلاس میں ان اختیاراتِ . فرائضِ امیرِ شریعت کا مسودہ پیش کرے۔

توضیحات

ہم نے غیر متعلق جزئیات کو نظر انداز کرکے اور مثبت انداز میں مولانا معین الدین کا کردار بیان کیا ہے، یہ معلومات بیشتر زبانی روایات پر مبنی ہیں رُواۃ ہیں مولانا کے برادر زادے مولانا حکیم نصیر الدین ندوی (نظامی دواخانہ کراچی) مولانا حکیم پیر ہاشم جان سرہندی مرحوم، مولانا سید حاتم علی رام پوری، مولانا سید منتخب الحق، مولانا عبدالشاہد شروانی مرحوم مولانا سید نجم الحسن خیرآبادی، حکیم مولوی پیر سلیم جان سرہندی (ماتلی) ان حضرات کے علاوہ مولانا معین الدین کا ایک مکتوب (بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی) بھی پیش نظر ہے، الگ ماہنامہ میثاق لاہور کا ایک شمارہ جنوری ۱۹۸۴ء کا پیش نظر ہے جس کے مطالعے کے بعد چند توضیحات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، میثاق کے مقالے سے جو سوالات سامنے آتے ہیں ان کے

جوابات عرض ہیں :-

پہلی بات یہ کہ مولانا کی یہ تقریر کس اجلاس میں ہوئی تھی ؟ یوسف سلیم چشتی مرحوم کا یہ بیان تو بالکل ہی بے اصل ہے کہ ۱۹۲۲ء کے اجلاس میں ہوئی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرور زمانہ اور بعض اور اسباب سے کئی حضرات کو اجلاس کا سال صحیح یاد نہیں رہا، مولانا غلام رسول مہر، ملک نصراللہ خاں عزیز کے بیانات میثاق میں نقل ہو چکے ہیں کہ وہ اجلاس جس میں بیعت ہونا تھی مگر مولانا معین الدین وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہو سکی ۱۹۲۱ء مولانا مودودی نے بھی میرے نام ایک مکتوب میں لکھا تھا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے یہ اجتماع لاہور میں ہوا تھا نہ کہ دہلی میں .... جمعیتہ علماء ہند کے اس اجلاس میں، میں شریک تھا، مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ امام الہند کے انتخاب میں بعض اکابر علماء مانع ہوتے تھے اور یہ انتخاب نہ ہو سکا تھا۔"

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ جمعیت کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی نومبر ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا، ہمارے سامنے خود مولانا معین الدین کا ایک مکتوب (ملک مولانا حکیم نصیرالدین ندوی) ہے جو ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کو لکھا گیا ہے۔ اور اس میں اس واقعہ کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ جب یہ تقریر ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء سے پہلے ہو چکی تھی تو مجلس منتظمہ کا اجلاس اور سالانہ اجلاس لاہور کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو بالترتیب ۱۷/۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء اور نومبر ۱۹۲۱ء کو ہوئے، مولانا لکھتے ہیں۔

"خا. الذین علماء ان (مولانا آزاد) کی تقریر سے متاثر ہوتے اور اگر من جانب فقیر اس (انتخاب امامت) کے التوا کے متعلق مختصر و جامع تقریر نہ ہوتی تو کچھ عجیب نہ تھا کہ حاضرین علماء اسی وقت اس مسئلے کو طے کر دیتے"

قصہ یہ ہے کہ قیام نظم جماعت اور نصب امام کی دعوت تو کئی سال[1] سے دی جا

---

[1] عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے محرک اول مولانا آزاد تھے مگر ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ محرک اول مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری تھے، مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد پہلے شخص تھے جنہوں نے اس بھولے ہوئے سبق کو

رہی تھی مگر شیخ الہند کی رہائی اور مراجعت ہند (جون ۱۹۲۰ء) کے بعد اس تحریک میں جان پڑ گئی تھی اور شیخ الہند، مولانا آزاد اور ان کے الہلال سے متاثر اور قدر شناس تھے اور اب ان کی نظر میں مولانا آزاد ہی اس منصب کے اہل تھے، شیخ الہند ہی کے اثر سے مفتی کفایت اور مولانا احمد سعید دھلوی نے تجویز و تائید میں حصہ لیا تھا مگر باقی تمام شرکاء اجلاس یا خالی الذہن اور لاعلم تھے یا جن کو اس کی سن گن لگ گئی تھی وہ مختلف جہات سے مولانا آزاد کی امامت سے خوش نہیں تھے بعض اختلاف مسلک فقہی کے زیر اثر، بعض مولانا آزاد کی بعض غیر ثقہ عادات (مثلاً تمباکو کشی) غیر عالمانہ سج دھج اور رئیسانہ طرز معاشرت * اور بعض مولانا کی کم عمری کے پیش نظر تذبذب اور متامل تھے، لیکن ہمت و جرأت نہ ہونے کی بناء پر دم بخود تھے اور جب مولانا معین الدین نے ان کے جذبات کو زبان دی اور انتخاب ملتوی کروا دیا تو پھر علماء کے مختلف گروہ بیدار و فعال ہو گئے اور تحریک پس منظر میں چلی گئی، مولانا آزاد اور

(حاشیہ متعلق صفحہ سابقہ)

یاد دلایا'' (ص ۹ ہندوستان اور مسئلہ امارت - از مولانا عبدالصمد رحمانی، ۱۹۶۹ء)

مولانا ابوالحسن علی لکھتے ہیں :

"اس سلسلے میں قیادت و رہنمائی اور سبقت و اولیت کی سعادت اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب بہاری کی قسمت میں لکھی تھی ..... امارت شرعیہ کے قیام کی تحریک اور اس کا علمی و فقہی دستوری خاکہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل دردمند اور فکر ارجمند کا نتیجہ ہے۔"

(ص ۲۲ امارت شرعیہ از مولانا محمد ظفر الدین مفتاحی ۱۹۷۴ء)

اسی طرح امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے ادبیات میں مولانا آزاد کا نام داعی اول کی حیثیت سے نہیں لیا گیا، لیکن خود مولانا آزاد کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالمحاسن کو مولانا آزاد نے ہی متوجہ کیا تھا، جب کہ مولانا کے عہد امارت میں رانچی (بہار) میں ان سے ملے تھے (خطبہ صدارت اجلاس لاہور) نیز وہ ان کی طرف سے اس کام پر مامور بھی تھے۔ ص ۶۲ تحریک نظم جماعت ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہانپوری)

ان کے ہم نوا اور معتقدین جاری رہیں اسی لئے ستمبر ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ کی مجلس منتظمہ کا اجلاس بلایا گیا مگر اب ناموافق اور خاموش و متذبذب گروہ فعال ہو چکا تھا۔ اس لئے اس گروہ نے مولانا معین الدین کو تنظیم کے اجلاس میں شرکت کو موکر کرنا چاہا۔

"علماء دہلی کا خیال ہے کہ فقیر خصوصیت سے اس جلسے میں شریک ہو"

(مکتوب)

مسیح الملک اجمل خاں کے متعلق ان کے فرزند حکیم جمیل خان نے سیرت اجمل میں لکھا ہے کہ وہ

"اس تجویز سے سخت مخالفت رکھتے تھے اور اسے خطرناک سمجھتے تھے"

(سیرت اجمل ص ۱۶۵ سنہ ۱۹۲۶ء)

بہر حال مجلس منتظمہ نے اس مسئلے کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس کا اندازہ آپ کو مولانا آزاد کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے:۔

"گزشتہ موسم گرما میں اس طرف سے مایوسی ہو گئی کہ تمام ملک کیلئے کوئی متفقہ و متحدہ نظم قائم ہو" (خطبہ صدارت)

اس کے فوراً بعد یہ طے کر لیا گیا کہ پہلے صوبوں میں امارتیں قائم کی جائیں کل ہند امارت کی جلد کوئی توقع نہیں رہی۔ چنانچہ بہار و اڑیسہ میں تو امارت شرعیہ قائم بھی کر دی گئی، جو پہلی بھی تھی اور افسوس کہ آخری بھی،

ضروری اور زیادہ اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ مولانا معین الدین نے اپنی تقریر میں مولانا آزاد کو ناموزوں قرار دیتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

"ایاز قدر خود بشناس! کہاں تم اور کہاں یہ رفیع و عالی منصب، تم ایسے نوعمر کو تو اکابر علماء کی موجودگی میں زبان کھولنا بھی مناسب نہیں ہے، رہا تمہارا علم و فضل تو اس کا بھانڈا ابھی پھوٹا جاتا ہے، ذرا منطق کی فلاں کتاب کی عبارت تو پڑھ کر سنا دو" (میثاق)

اور راوی ہیں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، تو جس طرح چشتی صاحب کے کبر سن کے حافظے نے ۱۹۲۰ء کو ۱۹۲۲ء بنا دیا تھا اسی طرح یہ تقریر بھی بے اصل و بے اساس ہے۔

اوّلاً اس لئے کہ ہم مولانا معین الدین کے اہل حلقہ نے اس واقعے کے سلسلے
یہی نہیں بلکہ اس ملتی جلتی بات بھی نہیں سنی ، تاں آنکہ مولانا کے متقدّ اصحاب
یہ واقعہ سنا ہے اور انہوں نے خود مولانا سے سنا تھا بلکہ شاید مولانا کے
زدر خورد مولانا غازی محی الدین تو اس اجلاس میں شریک بھی تھے۔
ثانیاً مولانا معین الدین کا یہ انداز گفتگو ہی نہیں تھا نہ ان جیسے عالی ظرف
ور شائستہ بزرگ کے شایان شان یہ زبان ہے۔
ثالثاً مولانا معین الدین اور مولانا آزاد کے روابط ہمیشہ مخلصانہ رہے اور
دونوں ایک دوسرے کے قدر شناس اور مدح سرا رہے ، محترم حکیم نصیر الدین ندوی
صاحب ان دونوں حضرات کی بہت سی ملاقاتوں ، طویل طویل نشستوں ، علمی مذاکرات
ور محافل خورد و نوش کے شاہد ہیں۔
رابعاً مولانا معین الدین خود اس وقت ۳۰ سال کے تھے اس لئے مولانا
آزاد پر نو عمری کا طعن تو ان پر سجتا بھی نہیں ، جو ۲۳ سال کے تھے۔
خامساً منطق کی کسی کتاب کی عبارت تو عبارت خوانی کے امتحان کے لئے
موزوں بھی نہیں ہوتی ، منطق و حکمت کی کتابوں کی عبارات کا مفہوم تو بے شک
عسیر الفہم اور عام علماء ہی نہیں خواص کی دسترس سے بھی بلند ہوتا ہے مگر عبارات
ں ذخیرہ الفاظ محدود اور زیادہ تر اصطلاحات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہاں ادب و تاریخ
کی کتابوں میں بے شک ذخیرہ الفاظ وافر و لامحدود ہوتا ہے عبارت آرائی
ہوتی ہے ، زور کلام ہوتا ہے ، غرائب اللغات ہوتے ہیں ، اس لے عبارت خوانی
کے امتحان میں وہ کارآمد اور صلاحیت آزما ہوتی ہیں۔
سادساً ، خود مولانا آزاد نے اپنے لئے دعوت کب دی تھی ، جو ان کی عمر اور
ان کے علم کو معرض نقد و انکار میں لایا جاتا۔
سابعاً ، التواء ، انتخاب و بیعت کے لئے یہ نکتہ کیا کم مؤثر تھا کہ اتنا اہم فیصلہ
عجلت میں مناسب نہیں امتحان لینے کی کیا ضرورت تھی ؟
واقعہ یہ ہے کہ غور و فکر کی مہلت طلبی کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ
مولانا آزاد کے حامیوں کو بھی اس کی معقولیت تسلیم کرنی پڑی اور مذبذبین و
منکرین کو بھی حیلہ ہاتھ آگیا اور انتخاب معرض التوا میں جا پڑا ، ٥٥٥

ایگل
ایک
عالمگیر
قلم!
EAGLE
ہر
جگہ
دستیاب
ہے
A PRODUCT OF
AZAD FRIENDS & CO. LTD

ہندوستان میں "مسلم پرسنل لاء" کے مسئلے پر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

کا خصوصی انٹرویو

گذشتہ "میثاق" میں ہندوستان میں "مسلم پرسنل لاء" کے سلسلہ میں ایک قیمتی اور اہم مضمون شامل کیا گیا تھا — اس مرتبہ اسی سلسلے میں ایک نہایت درجہ قیمتی اور فکر انگیز انٹرویو شامل کیا جا رہا ہے۔
یہ انٹرویو ہندی ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے محبوب رہنما اور مخلص قائد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ہے، جو صدر ہیں "آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ" کے اور جن سے انٹرویو لیا "ادارہ صحافت اسلامیہ" کے جناب نذر الحفیظ ندوی نے۔ ہندوستان میں بہت دنوں سے یہ مسئلہ پریس وغیرہ میں آ رہا تھا۔ حال ہی میں ہندی عدالت عالیہ نے شاہ بانو کیس میں جو فیصلہ دیا — اس کے بعد اس میں بہت شدت پیدا ہو گئی اور اس "شر" کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ہندی ملت مسلمہ کو بیداری باہمی اتحاد اور جہد و عمل کی دولت سے سرفراز فرما دیا، جس کے اثرات بحمد اللہ تعالیٰ وہاں مرتب ہو رہے ہیں۔

مولانا کے انٹرویو سے اس مسئلہ کی اہمیت اور مسلمانوں کی جد و جہد کے گوشے سامنے آئیں گے جن میں دنیا بھر کے مسلمانوں بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کے لیے ایک سبق و عبرت ہے۔ پاکستان جیسی نظریاتی مملکت میں ایوب خان مرحوم کے دور میں مسلم عائلی قوانین کا جھٹکا ہوا ایوب خان، یحییٰ خان اور بھٹو صاحب کے بعد اب جو بھی حکومت ہے جسے اسلامی خدمات کا بڑا دعویٰ ہے لیکن یہ قوانین جوں کے توں ہیں حتیٰ کہ "شرعی عدالت" میں انہیں چیلنج نہیں کیا جا سکتا —

یہ بات جہاں حکمرانوں کے لیے غور طلب ہے وہاں اس ملک کے علماء اہل دین اور دینی جماعتوں کے لیے بھی ایک تازیانہ ہے — دیکھیں تحفظ شریعت کا سہرا کس رجل رشید کے سر بندھتا ہے؟

(ادارہ)

سوال : آپ نے اپنے سیاسی خیالات، علمی و دینی مشاغل کی سرگذشت اور ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق بعض ایسے اہم انٹرویو دیے ہیں، جو اس ملک میں ملّی اور دعوتی جدوجہد کی تاریخ میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر قلم اٹھانے والا کوئی مؤرخ ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر فروری ۱۹۷۱ء میں "ندائے ملت" کے لیے آپ نے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، اس کے بعد تحریک "پیام انسانیت" کے متعلق تفصیلی انٹرویو دیے۔ جن سے بہت سے حقائق آشکارا ہوئے،
اب ہم پھر آنجناب کو ایک ایسے مسئلہ پر بعض وضاحتوں کی زحمت دینا چاہتے ہیں، جس نے کچھ عرصہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہماری مراد مسلم پرسنل لا سے ہے، لیکن مسلم پرسنل لا سے متعلق بعض اہم مسائل پر گفتگو سے قبل ہم اس بورڈ کی صدارت کے بارے میں سوال کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ آپ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت اپنے مخصوص مزاج اور غیر معمولی علمی و دعوتی مصروفیات، نیز سابقہ روایات کے خلاف کیوں قبول کی، جب کہ اس سے پہلے (جہاں تک ہمیں یاد ہے) مسلم مجلس مشاورت کی صدارت آپ نے ڈاکٹر سید محمود صاحب جیسی محترم شخصیت کے اصرار پر بھی نہیں فرمائی، آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟

جواب : آپ نے ایک اچھی تمہید کے بعد جس نے مجھے واقعات کی بعض بھولی ہوئی کڑیاں یاد دلا دیں اور ایک مناسب انداز کے ساتھ مجھ سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت قبول کرنے کے بارے میں سوال کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ میری اُفتادِ طبع، خاندانی روایات اور مشاغل کی نوعیت سے جو لوگ واقف ہیں، ان کو اس بارے میں ضرور ایک تضاد سا محسوس ہوتا ہے۔

جن لوگوں کو میرے مضامین و رسائل اور کم سے کم سرگذشتِ حیات "کاروانِ زندگی" پڑھنے کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اجتماعی اور تنظیمی کاموں میں سے دو کاموں کی سب سے زیادہ اہمیت محسوس کی ہے اور یہ ملتِ اسلامیہ کی روح، مزاج، اس کے مقصد و پیغام سے کسی حد تک واقفیت اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

(۱) ایک ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ نسل کے ایمان و عقیدہ کی حفاظت اور ان کے

معنوی اور روحانی تسلسل کو برقرار رکھنے اور نہ صرف ذہنی اور تہذیبی بلکہ (خاکم بدہن) اعتقادی ارتداد سے بچانے کے لیے مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام اور ان کی طرف اسلامی ورثہ کی منتقلی اور ان کو اس کا حامل و محافظ بنانے کی جدوجہد۔

(۲) دوسرے اس ملت کو ہندوستان جیسے ملک میں (جو مذاہب، تہذیبوں اور تومیتوں کا گہوارہ ہے) اپنے ملی تشخص کے ساتھ اور ایک ایسی صاحب شریعت ملت کی حیثیت سے باقی رکھنے کی جدوجہد، جس کا رشتہ آسمانی تعلیمات اور الٰہی قانون کے ساتھ استوار ہے، اور جس کے یہاں دین کا مفہوم عقائد و عبادات کے دائرہ میں محدود نہیں، پوری زندگی پر حاوی ہے، اور جو اپنا مستقل عائلی (خاندانی) نظام و قانون رکھتی ہے، جو اس کے دین کا جزء اور کتاب و سنت کے صریح احکام و ہدایات پر مبنی ہے اور ایک مسلمان کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اس احساس و شعور اور فکر و مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ جب ۱۹۵۹ء کی آخری اور ۱۹۶۰ء کی ابتدائی تاریخوں میں قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم کی دعوت پر بستی میں صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی اور اجلاس کی صدارت کا قرعۂ فال میرے نام نکلا تو میں نے بلا تکلف اس کو قبول کیا پھر جب اس کی مستقل صدارت کے لیے میرا انتخاب ہوا، تو میں نے ادائے فرض کے اس احساس سے اس ذمہ داری کو قبول کیا، اور ابھی تک ایک سعادت و عبادت سمجھ کر اور کم سے کم ہندوستان میں اس کو ایک اہم خدمت باور کر کے اس ذمہ داری کو نباہ رہا ہوں۔

یہی حال مسلم پرسنل لا بورڈ کے مسئلہ کا ہے، ملک کی آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک دوسرا خطرہ نمودار ہوا، وہ حکومت کا یہ رجحان اور پھر مسلمانوں کے ایک تجدد پسند اور آزاد خیال گروہ کا یہ مطالبہ تھا کہ ہندوستان میں سارے فرقوں کا ایک مشترک عائلی قانون (UNIFORM CIVIL CODE) ہو کہ اس کے بغیر قوم وحدت اور یک رنگی نہیں پیدا ہو سکتی، یہ خطرہ اندیشہ سے بڑھ کر واقعہ کی شکل میں سامنے آنے لگا، خود حکومت کے بعض محتاط لیکن معنی خیز بیانات وقتاً فوقتاً اس اندیشہ کو تقویت پہنچاتے تھے۔ خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو ایک مہم اور تحریک کی طرح اس کو چلا رہا تھا، یہ مسلمانوں کے تہذیبی اور معاشرتی ارتداد اور شریعت اسلامی

سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ "(اور جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں) کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا۔

اِس خطرہ کا احساس جن لوگوں کو ہُوا، واقعہ یہ ہے کہ ان میں مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ پیش پیش تھے، انہوں نے ہر وقت رہنمائی کی اور اس کے خلاف ایک منظم مہم اور تحریک چلانے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، طے ہُوا کہ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں مسلم پرسنل لاء کنونشن بلایا جائے میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی اس سال رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے (جو ماہ ذیقعدہ میں ہُوا کرتا تھا) حجاز مقدس گئے ہوئے تھے، اور قدرۃً حج سے فراغت کے بعد واپسی کا پروگرام تھا، لیکن مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم لوگوں نے ایسے وقت ہندوستان آنے کا فیصلہ کیا جب حج میں صرف پندرہ بیس دن باقی تھے، اور بمبئی کنونشن میں شرکت کی، یہاں اس ادارہ کے قیام کی تاریخ اور تفصیلات کا بیان کرنا مقصود نہیں، صرف دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے — ایک یہ کہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی ایسی مکمل نمائندگی اس سے پہلے کم دیکھنے میں آئی تھی جیسی اس کنونشن کے موقع پر نظر آئی، دوسرے یہ کہ اس اجلاس کے نتیجہ میں ایک آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ جس کے صدر بالاتفاق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم اور جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے۔

قاری صاحب مرحوم (جن کو اللہ تعالےٰ نے ایک دلآویز اور ہمہ گیر شخصیت عطا فرمائی تھی) کی صدارت کی موزونیت پر تقریباً سب کا اتفاق تھا، رانچی کے سالانہ اجلاس ۱۹۸۰ء کے موقع پر صدارت میں تبدیلی کا مسئلہ زور شور سے اُٹھا، بعض حلقوں کی طرف سے میرا نام پیش کیا گیا۔ لیکن میرے یہ کہنے پر سب خاموش ہوگئے کہ "طوفان میں کشتی نہیں بدلی جاتی۔" میرے لیے اِس کا ایک بڑا محرک یہ بات بھی تھی کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسا باوقار اور ہر دلعزیز صدر ملنا مشکل ہے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ جیسے مشترک ادارہ کی صدارت کے لیے وہی موزوں ہیں لیکن ۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اِس دارِ فانی سے رحلت کی اور ان کی جگہ خالی

ہوگئی۔ اس سال ۲۸، ۲۹ / دسمبر ۱۹۸۳ء میں مدراس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سالانہ اجلاس کا ہونا طے پایا۔ میں اپنے بعض بیرونی پروگراموں اور خرابیٔ صحت کی بنا پر اس سے پہلے کے عاملہ کے بعض اجلاسوں میں شرکت نہیں کرسکا تھا۔ اس اجلاس میں شرکت کا عزم مصمم تھا۔ اور سفر کے سب انتظامات کرلیے گئے تھے کہ عین موقع پر مجھ پر نقرس (GOVT) کی بیماری (جس کا میں پرانا مریض ہوں) کا شدید حملہ ہوا اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں ایسی شدید تکلیف میں مبتلا ہوا کہ چارپائی سے اترنا مشکل تھا۔ مجبوراً سفر کے التوا کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اجلاس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام صدر کی جگہ کے لیے پیش کیا گیا۔ جو لوگ میری طبیعت سے واقف ہیں، انہوں نے یہ کہا کہ وہ حضرت اس صورت میں منظور کرسکتے ہیں کہ متفقہ طور پر ان کا انتخاب عمل میں آئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ بغیر کسی اختلاف کے میرا نام منظور ہوا۔ جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو "سنگ آمد وسخت آمد" کا مضمون تھا۔ یہ فیصلہ میری افتادِ طبع، صحت جسمانی، عمر اور دوسری ذمہ داریوں اور مشغولیتوں سے میل نہیں رکھتا تھا۔ اگر یہ کسی بھی سیاسی، ملی تنظیم اور باعث افتخار و اعزاز منصب کے قبول کرنے کا معاملہ ہوتا تو میں بغیر کسی ادنیٰ تردد کے انکار کردیتا۔ لیکن ایک تو مسئلہ کی نوعیت و اہمیت کی وجہ سے جس کو میں اپنے عقیدہ کا جزو اور مسلمانوں کی ملی زندگی کے لیے شہ رگ کا درجہ دیتا ہوں۔ دوسرے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے احترام کی بنا پر جن کا بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمہ کے فرزند ہونے کی وجہ سے ہمیشہ لحاظ کرتا رہا ہوں، چاروناچار قبول کرنا پڑا۔ دوستوں کی اس بات کو بھی اس میں دخل تھا کہ اس وقت بورڈ کو اختلاف و انتشار سے بچانے کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہے، چنانچہ فارسی کے اس پرانے شعر پر عمل کرنا ہی پڑا ؂

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے صدارت قبول کرنے کے کچھ عرصہ بعد ہی نہ صرف بورڈ کی تاریخ میں بلکہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں ایسے سنگین مرحلے پیش آئیں گے:

جو شاید اس سے پہلے پیش نہیں آئے اور جن میں قیادت کے غیر معمولی حزم و عزم، ملت کے نظم و ضبط، علمائے دین و ماہرین قانون کے علم و مطالعہ، ذہانت اور تدبر اور

عوام کے انقیاد و اطاعت، صبر و تحمل، قائدین پر اعتماد اور تفویض و تسلیم کی غیر معمولی صلاحیت کے ثبوت دینے اور ملّی شعور کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ میرا اشارہ خاص طور پر نفقۂ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کے اس ہنگامہ خیز فیصلہ کی طرف ہے جو ۲۳ر اپریل ۱۹۸۵ء میں دیا گیا اور جس نے ملّت کو اپنے دین و شریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور غیرت و خودداری کے ایک فیصلہ کن مرحلے پر لاکھڑا کر دیا۔ تدبیرِ الٰہی کی کارفرمائی تھی (جس کی حکمتوں کو کوئی نہیں جانتا) کہ یہ نازک اور فیصلہ کن مرحلہ (جو اگر کامیابی کے ساتھ گذار دیا گیا اور ملّت نے اس میں فتح حاصل کر لی تو عرصۂ دراز تک کے لیے انشاء اللہ مسلمانوں کا عائلی قانون عدالتوں کا تختۂ مشق بننے سے بچ جائے گا) مجھ ناتواں کے دورِ صدارت میں پیش آیا۔ جو سخت جسمانی جدّ و جہد، قوتِ برداشت اور فرصت و فراغت کا طالب ہے، شاید یہ بات غیرتِ الٰہی اور رحمتِ الٰہی دونوں کو حرکت میں لانے کا باعث بن جائے جن کے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے قائدین اور اولوالعزم مصلحین بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ" (نصرت تو بس زبردست اور حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔)

سوال: کیا آپ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے بورڈ کی اب تک کی کارگزاری پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

جواب: آپ کو معلوم ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس اس سال اپریل ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں ہوا تھا۔ بورڈ کے اس جلسہ میں اس کی سابقہ روایات کے مطابق مسلمانوں کے مختلف حلقوں کی نمائندگی تھی اور تقریباً تمام مسلم جماعتیں اور تنظیمیں اور مکاتبِ فکر اور مذہبی فرقے شامل تھے۔ میرا خطبہ زبانی تھا جو اردو اور انگریزی میں چھپ گیا ہے اور جس میں مسئلہ کی اہمیت اور نوعیت پر اصولی اور علمی اور حقیقت پسندانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے آخری اجلاس شہید مینار چوک میں ہوا۔ جس میں محتاط اندازہ کے مطابق ۵ لاکھ انسان تھے۔ میں نے ضرورت سمجھی کہ اس میں خاص طور سے مسلمانوں کو مخاطب کیا جائے اور خود ان کا دینی اور عملی احتساب کیا جائے کہ وہ خود قانونِ خداوندی پر کتنا عمل کرتے ہیں۔ انہوں نے اس کے بارے میں جو رویّہ اختیار کر رکھا ہے، اس کا غیبی اور اخلاقی اثر کیا پڑ رہا ہے، یہ خطبہ بھی چھپ گیا ہے۔

اس کے بعد دہلی میں عاملہ کے دو اجلاس ہوئے، پہلا اجلاس ۱۴ رمئی اور دوسرا اجلاس ۱۰ رجولائی کو دہلی میں ہوا جس میں وزیر اعظم راجیو جی سے بورڈ کے ایک نمائندہ وفد کا ملنا طے ہوا......

۳۰ رجولائی ۱۹۸۵ء کو وفد نے وزیر اعظم کو یادداشت پیش کی اور اس کے بعد ایک مفصل نوٹ جو بہت غور و فکر اور مشورہ و تبادلۂ خیال کے بعد مرتب ہوا تھا، پیش کیا گیا جس میں ان کے لیے مسئلہ کو سمجھنے کے لیے پورا مواد اور ضروری معلومات فراہم کی گئی تھیں اور یہ کہ ان کے لیے اب مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے کون سا دستوری اور عملی آسان راستہ ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ابتداء یہ کہتا چلوں کہ میں نے بحیثیت صدر کے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ راجیو جی! میری عمر اب ۷۲/۷۳ سال کی ہو رہی ہے، میں نے آپ کے نانا موتی لال جی کو بھی دیکھا ہے اور ان کی تقریر امین آباد پارک لکھنؤ میں سنی ہے۔ اور جواہر لال نہرو اور اندرا جی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اور ان کا اچھا زمانہ پایا ہے۔ لکھنؤ میں رہنے اور خاص طرح کے خاندانی اور تعلیمی ماحول کی وجہ سے تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی سے لے کر ایسی کوئی تحریک نہیں تھی، جس کا میں نے قریب سے مطالعہ نہ کیا ہو۔ اور اس کے اثرات نہ دیکھے ہوں۔ میں اپنی اس طویل واقفیت کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کسی مسئلہ پر کم سے کم مسلمانوں کے ہر مکتبِ خیال سیاسی جماعتوں، پارٹیوں اور تنظیموں اور افراد کا ایسا مکمل اتحاد و اتفاق دیکھنے میں نہیں آیا، جیسا کہ مسلم پرسنل لاء کے تحفظ پر عمومیت کے ساتھ اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے خلاف خصوصیت کے ساتھ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ راجیو جی نے یہ باتیں غور سے سنیں، اور ان پر کوئی جرح نہیں کی، پھر دوسرے معزز ارکانِ وفد نے (جن میں جناب غلام محمود بنات والا، سید شہاب الدین اور الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ زیادہ نمایاں تھے) مسئلہ پر روشنی ڈالی اور پُر مغز طریقہ پر اس کی وکالت کی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے جب رمضان المبارک میں جمعۃ الوداع کو یوم تحفظ شریعت منانے کا فیصلہ کیا تو پورے ملک میں بڑے وقار و احترام اور کسی نعرہ بازی اور ہنگامے کے بغیر یہ دن منایا گیا، مساجد میں تقریریں کی گئیں، اور وزیر اعظم اور وزیر قانون کو احتجاجی ٹیلی گرام اس کثرت سے روانہ کیے گئے کہ اس سے پہلے شاید ایسا ہوا ہو، اسی طرح

جب تحفظ شریعت کا ہفتہ منانے کا فیصلہ کیا گیا تو مسلمانوں کے مختلف مسلک رکھنے والی جماعتوں اور مکاتب فکر نے تحفظ شریعت کا ہفتہ منانے میں کسی جماعتی عصبیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے اس موقع پر مکمل ہم آہنگی، اتحاد، جذبۂ تعاون اور ملی غیرت و حمیت کا ایسا ثبوت دیا ہے اور دے رہے ہیں، جس کی تمنا عرصہ سے تھی اور اگر یہ کہوں تو بے جا بات نہ ہوگی کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ نے مسلمانوں کے اندر اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کا ایسا کام کیا جو شاید بڑی جد و جہد کے بعد بھی اس طرح انجام نہ پا پایا ہوتا۔ تحفظ شریعت کا ہفتہ بہار و اڑیسہ اور یوپی میں منایا جا چکا، دوسری ریاستوں میں باقی ہے[1]، ہر جگہ جلسے غیر معمولی طور پر کامیاب رہے اور سالہا سال کے بعد مسلمانوں میں وہ جوش و خروش جلسوں میں حاضرین کی تعداد اور کام کرنے والوں میں ہم آہنگی دیکھنے میں آئی جس کا مشاہدہ برسوں سے نہیں ہوا۔ کانپور کے جلسہ میں لوگوں کا اندازہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک کے درمیان تھا، الٰہ آباد میں بھی ہزاروں کی تعداد تھی۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ اپنے مخصوص موضوع و مقصد (تحفظ شریعت) اور مشترک عائلی قانون کی مخالفت کے علاوہ مسلمانوں میں، عام بیداری کا جو سبب بن جائے گا اور ان کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کسی مسئلہ پر متفق ہو کر اپنی زندگی کا ثبوت دے کر کتنے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں اور کتنے بڑے خطرات سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔

سوال: مسئلہ کے اس روشن پہلو اور افادیت کے ساتھ جو ہر مسلمان بلکہ ہر محبِّ وطن کے لیے تسلی بخش ہے، آپ کو اس سلسلہ میں سب سے بڑا خطرہ کیا محسوس ہوتا ہے۔ آپ نے نہ صرف ہندوستان کی بلکہ امتِ اسلامیہ کی علمی، فکری، اصلاحی اور تجدیدی تاریخ لکھی ہے، اور آپ نے عالم اسلام کا رباط و مراکش سے لے کر سری لنکا و بنگلہ دیش تک کا سفر کیا ہے اور ان ملکوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ اور خطرات سے ہوشیار کیا ہے، ہم آپ سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ اس سفر میں (جو ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے) سب سے زیادہ دشوار گذار گھاٹی کون سی ہے، جس

---

[1] اس انٹرویو کے بعد کشمیر، پنجاب، آندھرا پردیش، تامل ناڈو اور کرناٹک میں بھی ہفتہ کا دورہ ہوا اور عظیم اجتماعات اور جلسے منعقد ہوئے۔

سے آپ سب سے زیادہ خطرہ محسوس کرتے ہوں۔

جواب: آپ نے یہ سوال کر کے میرے دل و دماغ کے داغ کہن تازہ کر دیئے اور "ناگفتنی" کو "گفتنی" بنادیا، مجھے یہ ناخوشگوار فرض انجام دینا ہی پڑے گا، بقول اقبال ؎

چمن میں تلخ نوائی میری گوارہ کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

مجھے سب سے بڑا خطرہ (جو اب خطرہ نہیں رہا بلکہ مشاہدہ بنتا جارہا ہے) مسلمانوں کی ان دو کمزوریوں یا بیماریوں سے ہے، جو دل پر پتھر رکھ کر کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حد تک ملی مزاج بنتا جارہا ہے، ایک عجلت و بے صبری، وہ یہ کہ مسئلہ کتنا ہی طویل المیعاد، صبر آزما اور پیچیدہ ہو، یہاں کے مسلمان ہتھیلی پر سرسوں اگانے کے قائل ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جو مہم صبح شروع ہوئی ہے، وہ سورج غروب ہونے سے پہلے کامیاب ہونی چاہیئے اور بیل منڈھے چڑھ جانی چاہیئے، مسائل کو کامیابی سے حل کرنے میں ایک بڑا فیکٹر (FACTOR) صبر و تحمل، قوت برداشت اور بلند حوصلگی ہے۔ مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں، تمام زندہ و فاتح قوموں کی تاریخ (خود سیرت نبوی سے بڑھ کر ہمارے لیے کوئی اسوہ و نمونہ نہیں) تلخ و شیریں، سرد و گرم، نشیب و فراز کے مناظر کا مجموعہ اور ایک طویل، آزما، زہرہ گداز جد و جہد کی روداد ہے، تحریکات اور مہمات کی تاریخ بھی ہمیں یہ سبق دیتی ہے۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کا مزاج اس کے برخلاف معرکہ کو چٹکیوں میں سر کر لینے کا قائل ہے۔

ابھی ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں مَیں بمبئی میں تھا، وہاں مہاراشٹر مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایکشن کمیٹی کا جلسہ تھا۔ مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا۔ سنجیدہ اور تعمیری انداز میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا اور ہفتۂ تحفظ شریعت منانے کے لیے ضروری اقدامات پر غور کیا جارہا تھا کہ اچانک ایک نوجوان کھڑے ہوئے اور انہوں نے ایک مضمون پڑھنا شروع کیا کہ زندہ قوموں اور ملکوں کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی جماعت کسی مسئلہ کے حل کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو پیچھے ہٹ جاتی ہے اور دوسروں کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے، اتنی طویل مدت ہوگئی اور مسلم پرسنل لا بورڈ مسئلہ کو حل نہیں کر سکا اس لیے اس کو اب اپنی ناکامی کا اقرار کر لینا چاہیئے اور دوسروں کو کام کا موقع دینا چاہیئے۔ یہ سُن کر

اپنی افتادِ مزاج کے برخلاف میرے اندر سخت تاثر پیدا ہوا اور میں نے کہا کہ یہ ایک مریضانہ ذہنیت کی علامت ہے۔ آپ نے برادرانِ وطن کے کردار کا بھی مطالعہ کیا ہے؟ انہوں نے تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں، نیز اپنے تعمیری منصوبوں کی تکمیل میں کتنے صبر و تحمل سے کام لیا اور اپنے رہنماؤں کو کام کرنے کا کتنا طویل موقع دیا، گاندھی جی ہوں یا مالوی جی یا دوسرے ہندو سیاسی لیڈر اور قومی معمار، انہوں نے کتنے سکون و اطمینانِ قلب کے ساتھ کام کیا۔ دو ہی دن بعد قوم نے ان کا دامن جھٹکنا اور گریبان پکڑنا نہیں شروع کیا۔ مسلمانوں کو تو صبر و تحمل کا زیادہ عادی ہونا چاہیئے کہ ان کا صحیفہ اور ان کے نبیؐ کا اسوہ اور خدا کی قدرتِ کاملہ پر یقین ان کو زیادہ وسیع القلب اور وسیع النظر بنا دیتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اُلٹا معاملہ ہے۔

مسلمانوں کی دوسری کمزوری جو اَب ایک نیشنل کیریکٹر کا رنگ اختیار کر گئی ہے، وہ ان کی اپنے قائدین کے بارے میں بد اعتقادی، بدگمانی، شدید احتساب، بے ضرورت تنقید اور کردارکشی ہے۔ پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ برادرانِ وطن کا اپنے سیاسی، تعلیمی، تعمیری رہنماؤں اور سماجی کام کرنے والوں کے بارے میں رویّہ بالکل مختلف ہے۔ اپنے رہنماؤں سے بلند اخلاقی معیار، ہر شک و شبہ سے بالاتر دیانت کی توقع، اسلامی تعلیمات اور اسلامی تصورات کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس میں اس حد تک افراط و غلو کہ ہر کام بدگمانی سے شروع کیا جائے اور ہر قائد و خادمِ ملّت کو بے اعتمادی اور بے توقیری کی نظر سے دیکھا جائے اور اس پر بڑے سے بڑا الزام لگانے میں پس و پیش نہ کیا جائے۔ اس کے بارے میں بعید از قیاس سے بعید از قیاس بات کو فوراً باور کر لیا جائے۔ افواہ پھیلانے اور ان کو مان لینے میں ذرا بھی احتیاط و تامّل سے کام نہ لیا جائے، ایک ایسی مہلک بیماری ہے جو پورے شیرازۂ ملّت کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی ہے اور بڑے سے بڑے شیر دل، کوہ وقار اور بے باک بازو یارِ خادمِ دین اور بڑے بڑے طوفانوں میں کشتیِ ملّت کے سرپھرے ملّاح کا دل توڑ دینے اور اس کی ہمت پست کر دینے کے لیے کافی ہے۔ وہ دشمنوں کی اذیتوں، قید و بند کی سزاؤں، بچوں اور افرادِ خاندان کے فاقے کو برداشت کر سکتا ہے اور اس کی پیشانی پر شکن نہیں آ سکتی ہے۔ لیکن اتہام اور الزام، کردارکشی اور ملّت کا غدار بنائے جانے

اُس کا دل چُور چُور ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے
کہ ایک بڑھیا کو حضرت عمرؓ کو ٹوکنے، ایک اعرابی کے سوال پوچھ لینے کی روایات کو ہمارے
ری جلسوں اور مجالس وعظ میں ایسے مبالغہ اور بے اعتدالی سے بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص
نے اس کی تقلید شروع کر دی ہے چاہے امیر المؤمنین فاروق اعظمؓ کے مقام کا آدمی نہ
ہو لیکن پوری قوم بڑھیا اور اعرابی کا کردار ادا کرنا چاہتی ہے۔ اکثریتی فرقے کا اپنے رہنماؤں
رکار کنوں کے بارے میں رویہ واضح طور پر اس کے برعکس ہے۔ اپنی دوسری کمزوریوں
کے باوجود وہ نمایاں طور پر اس سلسلہ میں محتاط، فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوئے ہیں
سوال: مسلمانوں میں سے بعض معروف" اشخاص نے "تجاہل عارفانہ" سے کام لیا
ہے اور سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے اس جزء کی حمایت کی ہے کہ مطلقہ کو سابق شوہر
کی طرف سے جب تک وہ شادی نہ کرلے، حین حیات گذارا دیا جائے تو اس میں کیا حرج
ہے، اور اگر حق شریعت میں نہیں ہے، تب بھی اس کو مان لیا جائے تو اس میں کیا
مضائقہ ہے، کہ قانون شریعت کوئی چھوئی موئی نہیں ہے کہ ایسی چیزوں سے ٹوٹ جائے
اور اگر اس میں تھوڑی سی ترمیم بھی ہو جاتی ہے تو بھی کوئی بڑی مصیبت نہیں آتی،
یہ ائمہ کے اجتہادات ہیں جو وہ ہر زمانہ میں کرتے آئے ہیں اور ائمہ کو بت نہیں بنانا
چاہیئے۔ نیز انہوں نے قرآن مجید میں "متاع" کے لفظ کی تشریح میں اور مطلقہ بائنہ کو
عدت کے بعد بھی گذارا دینے کو قرآنی سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا ہے،
ان کے بارے میں ہمارے علمائے دین اور خاص طور پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
کے مقتدر اراکین جو ہندوستان کے عظیم ترین اداروں کے سربراہ و ذمہ دار ہیں،
فتویٰ کی زبان کیوں نہیں استعمال کرتے اور ان پر فقہی حکم لگا کر مسلم معاشرہ سے خارج
کیوں نہیں کرتے تاکہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسی جرأت سے کام
نہ لیں۔

جواب: آپ نے ایک معقول بات پوچھی ہے، بورڈ کے دوسرے اہلِ علم ارکان اپنی
رائے کے اظہار میں آزاد ہیں لیکن میرا ذاتی رجحان اور مشورہ یہ ہے کہ ہمارے علماء
اور ہمارے مذہبی اداروں کو اس عہد اور ملک میں مسیحی یورپ کے قرون وسطی (جن کو قرون
مظلمہ (DARK AGES) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کی طرح اعتقادات کی تحقیق

کی عدالتوں (COURT OF INQUISATION) جن کو عربی کتابوں میں "محاکم التفتیش"
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کا کردار ادا کرنا مناسب نہیں جو اپنے نزدیک بد اعتقاد
عیسائیوں کو دائرۂ اعتقاد سے خارج کیا کرتی تھیں اور ان کو لرزہ خیز سزائیں دیتی تھیں
جس کی وجہ سے یورپ میں ایک طبقہ کلیسا سے بیزار اور عیسائیت سے متنفر ہو گیا ۔
میرے خیال میں اس کے مقابلہ میں ہمیں مسلم معاشرہ میں وہ دینی شعور پیدا کرنا چاہیئے
جو خود ان تجدد پسندوں یا بزعم خود غلط فقیہوں اور مفسروں کا محاسبہ کرے اور ان کو
محسوس کرائے کہ انہوں نے اپنے کو مسلم معاشرہ سے خود کو کاٹ لیا ہے، اور فتنہ کا
ایک بہت بڑا دروازہ کھول دیا ہے ۔ معاشرہ کا یہ طرزِ عمل ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے
اور اگر ان میں ذرا بھی دینی غیرت ہے تو) اپنی روش اور طرزِ عمل کی غلطی محسوس کرا دینے
کے لیے کافی ہے ۔ وہ یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اِس معاشرہ میں ایک فردِ معاشرہ کی طرح
رہنا اچھا ہوگا، جس کے ساتھ مرنا اور جینا ہے، اور جو دُکھ سکھ میں کام آتا ہے، یا
اس عارضی عزت، تعریف و تعارف کا خیال کرنا جو ڈھلتی چھاؤں اور بے وفا ساتھی ہے ۔
سوال : ایک آخری سوال کی اور اجازت چاہتا ہوں جو اپنی اہمیت وافادیت میں
پچھلے سوال سے کم نہیں اور میرے خیال میں بہت سے حساس اور حقیقت پسند مسلمانوں اور
دانشور طبقہ کے ذہن میں یہ سوال گردش کرتا ہے ۔
جواب : وہ سوال بھی ضرور کر لیجئے تاکہ مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے ۔
سوال : آپ کے نزدیک اس مسئلہ اور اس اہم دینی و ملی مہم کے سلسلہ میں اب کرنے
کے کیا کام ہیں اور آئندہ کا نظامِ عمل کیا ہوگا !
جواب : آپ نے بہت ضروری اور برمحل سوال کیا ۔ اس انٹرویو میں بہت کمی رہ
جاتی اگر یہ گوشہ سامنے نہ آتا ۔ میرے نزدیک اوّلین اور اہم کام خود مسلمانوں میں شرعی،
عائلی قانون پر عمل کرنے کی دعوت و تبلیغ ہے، جس کے اہم اور مرکزی اجزاء حقوق الزوجین
اسلامی تعلیمات اور اسوۂ نبوی کے مطابق ازدواجی زندگی گزارنا، شفقت و محبت اور
قرآنی الفاظ میں " وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً " کے اصول پر ایسی
ازدواجی و عائلی زندگی گذارنا جس میں محبت و مودت اور رحمت کا عنصر غالب ہو ۔
صلہ رحمی، ترکہ کی شرعی تقسیم، طلاق کے حق کا نہ صرف شرعی بلکہ مسنون طریقہ پر استعمال ،

ہو، اور " وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ " (اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی تقویٰ اختیار کرو) کی اس ہدایتِ قرآنی پر عمل جو تمام انسانی، اسلامی و اخلاقی پہلوؤں اور گوشوں پر حاوی ہے، اس کے لیے ایک طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے، جس کے اثر سے شہر تو شہر کوئی قصبہ اور گاؤں اور مسلمانوں کا کوئی محلہ اور خاندان بھی بے خبر اور بے اثر نہ رہے، اس کے لیے مساجد کے منبر و محراب، مجالس وعظ، اسلامی اجتماعات و تقریبات، اخبارات و رسائل اور ابلاغِ عامہ کے تمام ذرائع پوری سرگرمی سے استعمال ہونے چاہئیں۔ میرے نزدیک یہ بنیادی کام ہے اور اس میں ان مشکلات اور خرابیوں کا اصل علاج ہے، جنہوں نے اس وقت نازک مسئلہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ " (الانفال) (اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک فیصلہ کی چیز دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا) میں نے کلکتہ کے آخری اجلاس میں جس میں حاضرین کی تعداد کا اندازہ ۵ لاکھ کیا گیا ہے، صفائی سے اس معاملہ میں مسلمانوں کا احتساب کیا تھا، اور ان سے کہا تھا کہ وہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور اپنے گھروں کا جائزہ لیں کہ وہ اس شرعی قانون و تعلیم (جو دین کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہے) پر کس قدر عمل کرتے ہیں؛ ضرورت ہے کہ اس خطبہ و مقالہ کی اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔

۲۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ اور ملک کے دانشور اور حقیقت پسند غیر مسلموں کو اسلام کے عائلی نظام کی برتری، اس کے منصفانہ، عقلِ سلیم اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہونے کو (جو خدائے حکیم و دانا، رؤف و رحیم اور خالقِ کائنات اور مربیِّ نوعِ انسانی کا بنایا ہوا ہے) علمی انداز، ناقابلِ تردید دلائل اور مذاہب اور عائلی قوانین اور نظاموں کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ انگریزی، اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں پیش کیا جائے، یوں تو مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء (لکھنؤ)، مرکزی مکتبہ اسلامی پرسنل لا آفس (مونگیر) مکتبۂ جماعتِ اسلامی ہند (دہلی) اور بعض ... دار المصنفین

تحقیقی اداروں کی طرف سے متعدد وقیع چیزیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اس میں وسعت و ترقی اور اضافہ کی ضرورت ہے، اس موضوع پر صاحب نظر، صاحب ایمان ماہرین قانون اور اہل قلم سے کتابیں لکھوائی جائیں۔ سیمینار و سمپوزیم منعقد کیے جائیں، جن میں ممالک عربیہ کے چوٹی کے فضلاء و ماہرین فقہ اسلامی کو دعوت دی جا سکتی ہے اور میں بھی رابطہ عالم اسلامی کی بین الاقوامی المجمع الفقہی (مسائل و تحقیقات کی اکیڈمی) کا بنیادی رکن ہونے کی بناء پر اس کی ذمہ داری لے سکتا ہوں کہ وہ اس دعوت کو لبیک کہیں گے اور شوق سے شرکت کریں گے۔ اس سلسلہ میں اس موضوع پر نیز دوسرے ملی مسائل پر ڈائیلاگ (DIALOGUE) کا انتظام کرنا بھی مفید ہوگا اور بعض اہلِ علم اس پر سنجیدگی سے غور بھی کر رہے ہیں۔

۳۔ تیسری اور ایک بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ اگرچہ باشندہ کو عدت کے بعد سابق شوہر سے قانونی طور پر مستقل گذارا دینا جس کو (MAINTENANCE) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، شرعاً عقلاً کسی طرح درست نہیں، شرعاً تو اس لیے نہیں کہ قرآنی نصوص و احکام اور امت کے تعامل کے مطابق اس کی گنجائش نہیں، انتظاماً اس لیے کہ پھر اس کے بعد مسلم معاشرہ میں بھی سفاکی اور بے دردی کے وہ واقعات رونما ہوں گے جو ملک کے ایک وسیع معاشرہ میں پیش آرہے ہیں اور نئی بیاہی ہوئی عورتیں مطلوبہ جہیز نہ لانے پر جلائی جا رہی ہیں اور ان سے کسی طرح پیچھا چھڑایا جا رہا ہے میں نے وزیر اعظم صاحب سے اپنی ایک نجی گفتگو میں صفائی سے کہا تھا کہ راجیو جی! اگر یہ قانون بن گیا تو یہ لکھ رکھیے کہ بجائے طلاق کے ذریعہ پیچھا چھڑانے کے ایسی ناپسندیدہ رفیقۂ حیات کو زہر دے کر یا جلا کر ختم کیا جائے گا، جیسا کہ آج ہمارے ملک میں بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

نفقۂ مطلقہ کی اس مستقل قانونی شکل (گذارے کو چھوڑ کر) شریعت کے بتائے ہوئے ان متبادل انتظامات کو زندہ اور قائم کرنا پڑے گا جن کی شریعت نے ترغیب دی ہے اور جو شریعت اسلامی کے برکات میں سے ہیں۔ مثلاً عورت کو والدین اور دوسرے مورثین کے ترکہ میں سے شرعی حصہ دلانا، جو بعض شکلوں میں واجب ہے اور بہت سے خاندانوں اور معاشروں میں عرصہ سے متروک ہے۔ مطلقہ کے قریبی رشتہ دار دل

(ذوی الارحام) اولاد، بھائیوں اور اگر والدین زندہ ہوں تو ان کو اس کے ساتھ اعانت و مواسات (ہمدردی و غمخواری) اور صلہ رحمی کی ترغیب دینا، اس کی کفالت کا مناسب بندوبست کروانا، اگر نکاح ثانی کی عمر اور حالات ہیں تو اس کی ترغیب و تحریض، نیز اسلامی بیت المال کا قیام جس سے نادار اور ضرورت مند افراد کو ضروریاتِ زندگی اور قوتِ لا یموت فراہم کیا جائے۔

اس سے بڑھ کر پورے مسلم معاشرہ میں ہمدردی، سلوک، ایثار و فیاضی کا جذبہ پیدا کرنا، جو ہزاروں بیماریوں کا علاج ہے، اور ہزار مشکلات و مسائل کا حل، اور جو مسلم معاشرہ کو وضعی قوانین سے مستغنی کرتا ہے، اور صدرِ اول اور اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اس کی تابناک مثالیں ہیں اور اس کا زندہ ثبوت ملتا ہے، یہ ہیں کرنے کے وہ کام جن کو جلد سے جلد شروع ہو جانا چاہیئے اور جو اسلام کی روح، مزاج اور شریعتِ الٰہی اور تعلیماتِ آسمانی سے پوری مطابقت رکھتے ہیں اور انہیں میں شریعت کا اصل تحفظ اور اس عہد میں مسلمانوں کے ایک صاحبِ شریعت، صاحبِ کردار اور صاحبِ مقام مستحکم و باعزت، خود دار اور غیور ملت کی حیثیت سے باقی رکھنے کی ضمانت ہے۔

00000000000

رفتارِ کار

رپورتاژ

ہندوستان میں پندرہ دِن

از قلم: عاکف سعید

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ گزشتہ سال کے اوائل میں والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حیدرآباد دکن کے [illegible] احباب کی دعوت پر بھارت تشریف لے گئے تھے اور اس دورے کی مفصل رپورٹ جون ۸۸ء کے [illegible] میں شائع ہوئی تھی ——— حیدرآباد دکن میں والد محترم اور ان کی تحریک 'دعوت رجوع الی القرآن' [illegible] تعارف کی داستان بھی خاصی دلچسپ ہے — ہوا یوں کہ پچھلے چند سالوں کے دوران امریکہ کے [illegible] میں والد محترم کا تعارف بہت سے ایسے حیدرآبادی مسلمانوں سے ہوا جو دین کے کاموں میں پیش پیش [illegible] ۔ انہی میں سے بعض احباب نے [1] محترم والد صاحب کے دروسِ قرآن اور تقاریر کے کیسٹ بڑی [illegible] میں حیدرآباد میں پہنچائے اور انہیں وسیع پیمانے پر پھیلا دیا۔ حیدرآباد کے مسلمانوں میں دین و مذہب سے [illegible] اور علمی و عملی وابستگی کی جڑیں ہند و پاک کے بقیہ مسلمانوں کی نسبت زیادہ گہری ہیں۔ چنانچہ یہ کیسٹ [illegible] ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور اُن کے ذریعے سے تحریک دعوت رجوع الی القرآن کا ایک وسیع حلقے [illegible] تعارف محترم والد صاحب کے حیدرآباد وارد ہونے سے قبل ہی ہو گیا تھا۔ نتیجۃً تقاضے آنے شروع ہوئے [illegible] وقت نکال کر حیدرآباد تشریف لائیں ——— گویا حیدرآباد میں والد محترم کا تعارف [illegible] کیسٹ اور بالواسطہ امریکہ ہوا۔

بہرکیف ۱۹۸۸ء میں حیدرآباد کا دورہ ہوا جو نہایت کامیاب رہا۔ دروسِ قرآن کی مجالس میں [illegible] ہزاروں کی تعداد میں لوگ ذوق و شوق سے شریک ہوتے رہے۔ اُس موقع پر وہاں کی معروف [illegible] ملی آرگنائزیشن 'کل ہند مجلس تعمیرِ ملت' کی جانب سے تقاضا آیا کہ والد صاحب ماہ ربیع الاوّل [illegible] کے سالانہ جلسہ یوم رحمۃ للعالمین میں مہمان مقرر کی حیثیت سے شرکت فرمائیں —— وہاں احباب [illegible]

---

[1] ان احباب میں جناب حیدر محی الدین غوری صاحب کا نام سرِفہرست ہے جن سے امریکہ میں [illegible] تھا اور اب امریکہ کو خیرباد کہہ کر انہوں نے مستقل طور پر حیدرآباد میں سکونت اختیار کر لی ہے۔

رفقاء کے ذریعے معلوم ہوا کہ مجلس تعمیر ملت کے زیرِ اہتمام ۱۲ ربیع الاول کا سالانہ جلسہ عام حیدر آباد شہر کا مرکزی اجتماع ہوتا ہے اور اس پہلو سے منفرد شان کا حامل ہوتا ہے کہ اس میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ احباب کے اصرار اور جلسے کی اہمیت کے پیشِ نظر والد محترم نے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے شرکت کا وعدہ کر لیا۔ پروگرام کے مطابق والد محترم کو پچھلے سال نومبر میں دوبارہ حیدر آباد[1] تشریف لے جانا تھا لیکن پچھلے سال بعض وجوہات کی بنا پر بھارت کا پروگرام نہ بن سکا۔ ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انہی دنوں حیدر آباد میں مسلم ہندو فسادات عروج پر تھے۔ چنانچہ پاکستان میں رہتے ہوئے ہم نے گمان کیا کہ ان حالات میں حیدر آباد جانا شاید ممکن نہیں ہو سکے گا۔ بہرکیف پروگرام نہ بن سکا۔ لیکن بعد میں وہاں سے والد محترم کے نام شکوے کے انداز میں خطوط آئے کہ ہم تو آپ کے منتظر تھے اور توقع کر رہے تھے کہ آپ حسبِ پروگرام تشریف لائیں گے۔ انہی خطوط کے ذریعے معلوم ہوا کہ اُن فسادات کے باوصف جلسہ بہرحال اسی روایتی شان کے ساتھ منعقد کیا گیا۔ والد صاحب نے مجلس تعمیرِ ملت کے سرکردہ افراد سے اپنی عدمِ شرکت پر معذرت کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا کہ وہ اگلے سال ضرور حیدر آباد کا پروگرام بنائیں گے، اور جلسے میں شرکت کریں گے۔ چنانچہ اس سال یہی وعدہ سفرِ بھارت کی تقریب بنا۔ اگرچہ حالات اس سال بھی کچھ زیادہ سازگار نہیں تھے۔ ایک طرف والد محترم کی اندرونِ ملک دعوتی و تحریکی مصروفیات اپنے عروج پر تھیں، تو دوسری جانب وسط اکتوبر میں عمرے کا پروگرام بن گیا۔ شیڈول کے مطابق ۱۸ نومبر کو دہلی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۳ نومبر تک صورتِ حال غیر یقینی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پاسپورٹ پر انڈیا کی ENDORSEMENT کے سلسلے میں جو درخواست دی تھی۔ اس کا جواب آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارا کیس دو وزارتوں (MINISTRIES) کے سپرد کیا گیا اور وہاں سے CLEARANCE میں دیر ہونا بالکل قرینِ قیاس تھا۔ بالآخر ۱۳ نومبر کو یہ مرحلہ طے پایا اور پھر ہنگامی طور پر ویزے کے حصول کی کوشش کی گئی۔ وہاں بھی یہ دقت پیش آئی کہ ہم نے چار شہروں کے ویزے کی درخواست دی تھی جن میں دہلی اور حیدر آباد کے علاوہ لکھنؤ اور احمد آباد کے شہر بھی شامل تھے۔ لیکن انڈین ایمبیسی نے لکھنؤ اور احمد آباد کا ویزہ دینے سے صاف انکار کر دیا اور اس طرح ہمیں صرف دہلی اور حیدر آباد کا ویزا مل سکا۔ والد صاحب کو لکھنؤ کا ویزا نہ ملنے کا افسوس تھا اس لیے کہ اُن کی خواہش تھی کہ اس مرتبہ لکھنؤ میں کچھ وقت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی معیت میں بسر کیا جائے۔

---

[1] پچھلے سال انڈیا کے دورے میں بڑے بھائی ڈاکٹر عارف رشید محترم والد صاحب کے ہمراہ تھے یہ سب بار فرصتِ قال دائم کے نظم

ن سے استفادہ کیا جائے۔ بہر حال اس کشاکش کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں ۱۸ نومبر کی فلائٹ میں
سیٹ نہ مل سکی تاہم بیس تاریخ کی انڈین ائر لائن کی فلائٹ میں ہماری سیٹیں بک ہو گئیں۔
حسب پروگرام ۲۰ نومبر کی صبح ائر انڈیا کی فلائٹ سے ہم دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ لاہور سے دہلی کا
ائی سفر کل ۴۵ منٹ کی اڑان پر مشتمل ہے۔ چنانچہ صبح ۸ بجے ہم نے لاہور ائرپورٹ سے اپنے سفر کا آغاز
یا اور ٹھیک ۴۵ منٹ بعد ہمارا جہاز دہلی ائرپورٹ کو چھو رہا تھا۔ ائرپورٹ پر ضروری کاغذی کارروائی اور
سٹم وغیرہ کی چیکنگ سے فراغت میں ہمیں قطعی دقت پیش نہیں آئی۔ دہلی روانگی سے دو دن قبل ہم نے
لی میں مولانا وحید الدین خان کو اپنی آمد کی اطلاع بذریعہ تار دے دی تھی اور ہمیں توقع تھی کہ مولانا کے فرزند
اکٹر ثانی اثنین ائرپورٹ سے باہر ہمارے منتظر ہوں گے۔ چنانچہ انہیں موجود نہ پا کر مجھے کسی قدر پریشانی
ئی۔ لیکن جب والد صاحب کے چہرے پر کسی قسم کی تشویش کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو مجھے بھی حوصلہ
ا۔ دراصل میرے لئے یہ انڈیا کے سفر کا پہلا موقع تھا۔ مجھے یہاں کے حالات کا قطعاً کوئی اندازہ
نہیں تھا۔ والد صاحب نے ایک ٹیکسی والے کو ہاتھ دے کر روکا اور اسے نظام الدین ویسٹ چلنے کا
ہا۔ ائرپورٹ سے بستی نظام الدین کا فاصلہ لگ بھگ دس میل کا ہے۔ پچھلے سال بھی چونکہ والد محترم نے
نڈیا کا دورہ کیا تھا اور دہلی میں مولانا وحید الدین خان صاحب کے یہاں 'المرکز الاسلامی' ہی میں
یام کیا تھا۔ لہٰذا انہیں جگہ کا کچھ اندازہ تھا۔ چنانچہ بستی نظام الدین پہنچ کر اسی اندازے سے کام
لیتے ہوئے انہوں نے ٹیکسی والے کو گائیڈ کرتے ہوئے دو ایک موڑ مڑنے کو کہا اور ہم ٹھیک 'المرکز
اسلامی' کے گیٹ تک پہنچ گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ مولانا وحید الدین خان صاحب اور ان کے صاحبزادے
کٹر ثانی اثنین دونوں ہی دہلی سے باہر کسی سفر پر ہیں۔ مرکز اسلامی کے دفتر میں اور کسی کارکن کے
میں یہ نہیں تھا کہ مولانا کہاں تشریف لے گئے ہیں اور کب واپسی متوقع ہے! اسی عمارت میں
پر کی منزل میں مولانا موصوف کی رہائش ہے۔ مولانا کے اہل خانہ کو جب ہماری آمد کا علم ہوا
انہوں نے کہلا بھیجا کہ مولانا دو تین روز میں واپس تشریف لے آئیں گے۔ لیکن ساتھ ہی تاکید
کہ ہم یہیں قیام کریں۔ چنانچہ نیچے دفتر میں ہمارے قیام کا انتظام کر دیا گیا۔ یہاں سے چائے پی کر ہم نے
مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ سے ملاقات کے لئے جامعہ رحیمیہ کا قصد کیا۔ بہت سے رکشا ڈرائیوروں
سے کہا کہ بھائی ہمیں خواجہ میر درد روڈ لے چلو! جہاں قبرستان مہندیاں سے ملحق جامعہ رحیمیہ واقع ہے
لیکن سب نے اس مقام کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ بہرحال یہاں بھی والد صاحب کا خداداد حافظہ
کام آیا۔ اور وہ خود رکشا والے کو راستہ کہتے ہوئے جامعہ رحیمیہ تک لے گئے۔ مولانا اخلاق حسین

صاحب قاسمی مدظلہ جو اس مدرسے کے مہتمم ہیں[1] جامعہ میں موجود تھے نہایت تپاک سے ملے، متولی صاحب جناب علی محمد نیر میوات بھی موجود تھے، بہت محبت سے ملے۔ وہیں صدر مدرس مولانا محمد نعیم صاحب مدظلہ سے ملاقات ہوئی جو دارالعلوم دیوبند میں ایک عرصے تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے تھے اور اب حال ہی میں وہاں کے پریشان کن حالات کے باعث دیوبند کو خیرباد کہہ کر مدرسہ رحیمیہ سے منسلک ہوگئے تھے۔ مولانا نہایت جید عالم لیکن انتہائی سادہ اور منکسر المزاج طبیعت کے مالک ہیں۔ نہایت شائستہ سے گفتگو کرتے ہیں جس میں علمی وقار جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ مولانا کے بارے میں معلوم ہوا کہ آپ مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب کے والد ہیں، جن سے ہماری شکاگو میں بڑی تفصیلی ملاقات رہی تھی۔

جامعہ رحیمیہ کی تاریخ بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس مدرسے کو سترھویں صدی عیسوی میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے شہر دہلی کی جنوبی سمت میں فصیل سے متصلاً باہر قائم کیا تھا۔ اور اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کے نام کی نسبت سے مدرسے کا نام "جامعہ رحیمیہ" رکھا تھا۔ شاہ صاحب ہی کے دور میں یہ مدرسہ شہر کے اندر منتقل ہوگیا تھا ___ لیکن شاہ صاحب کا پورا خاندان یہیں قبرستانِ مہندیاں میں مدفون ہے اور اس جگہ کو ایک طرح سے شاہ صاحب کے خاندانی قبرستان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ادھر کچھ عرصہ سے جب دہلی کی توسیع شروع ہوئی تو اس جگہ کی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں کو یہ نظر آنے لگا کہ دیگر مقامات کی طرح یہ جگہ بھی اب مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی اور کچھ بعید نہیں کہ حکومت اس قبرستان کو مسمار کرکے یہاں کوئی کمرشل بلڈنگ کھڑی کر دے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایک مردِ مومن "علی محمد" کے دل میں یہ بات ڈالی کہ انہوں نے قبرستانِ مہندیاں میں جا ڈیرہ لگایا۔ اور حکومت کے ناپاک عزائم کے مقابلے میں سینہ سپر ہوگئے۔ انہوں نے کمال فراست سے وہاں

---

[1] مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کی ذات قارئین میثاق کے لئے محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ انجمن خدام القرآن کے زیرِاہتمام محاضراتِ قرآنی میں متعدد بار شرکت فرما چکے ہیں اور آپ کے مقالات اور مراسلات "حکمتِ قرآن" اور "میثاق" کی زینت بنتے رہے ہیں۔ مولانا قاسمی مدظلہ کا شمار دہلی کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے۔ آپ دہلی کی تاریخی اہمیت کی مسجد حسین بخش میں خطیب ہیں، اور اپنے علمی و ذہنی توسع کے باعث ہر طبقہ فکر کے مسلمانوں میں یکساں طور پر عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دین کے لئے کام کرنے کی لگن اور ذہن و قلب کی یہی وسعت دراصل والد محترم اور مولانا کے مابین قرب کا باعث بنی ہے۔

اُس پاس کے ہندؤں سے ایسے عمدہ روابط قائم کئے اور شاہ صاحب اور ان کے اہل خاندان کی عظمت کا نقش اور رعب کچھ اس طور سے ہندؤں پر بٹھایا کہ حکومت کے مقابلے میں خود وہاں کے ہندو ان کے سب سے بڑے معاون بن گئے' اللہ تعالیٰ نے علی محمد صاحب کے اندر کچھ ایسے اوصاف جمع فرما دیئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے گویا انہیں اسی کام کے لئے بنایا گیا تھا۔ ان کی شخصیت میں دلآویزی اور موسا نہ رعب نیخ ہیں اور اس پر مستزاد ہے ان کی بے مثال جرأتِ رندانہ اور ہمت مردانہ! 'شیر میوات' دراصل ان کا خطاب ہے جو آنجہانی گاندھی نے ان کی جرأت و ہمت سے متاثر ہوکر انہیں دیا تھا۔ اور اب تو وہ اسی لقب یا خطاب کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں ——

قبرستان مہندیاں کی مستقل حفاظت کے خیال سے جناب علی محمد صاحب شیر میوات نے بعض اکابر علماء کے مشورے اور تعاون سے ٹھیک اسی مقام پر جامعہ رحیمیہ کا اجراء کیا جہاں آج سے تین سو سال قبل حضرت امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے مدرسہ قائم فرمایا تھا۔ وسائل نہایت محدود تھے لیکن اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا۔ چنانچہ اس صاحب عزم و ارادہ کی عزیمت رنگ لائی اور اب وہاں ایک بھرپور مدرسہ قائم ہے جس میں دو سو کے لگ بھگ طلبہ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں نہایت قابل اساتذہ اس مدرسہ سے وابستہ ہیں اور مدرسے کی عمارت 'دمادم صدائے کن فیکون' کی سی شان کے ساتھ پیہم توسیع پذیر ہے۔

مدرسے کے قابل احترام اساتذہ سے ملاقات کے بعد ہم نے قبرستان میں حاضری دی۔ والد صاحب نے بڑی تفصیل سے مجھے اس مختصر سے قبرستان میں حضرت شاہ صاحب اور ان کے اہل خاندان کی قبور کے بارے میں بتایا اور ایک ایک قبر کی نشاندہی کی۔ اور انکشاف کیا کہ اسی قبرستان میں ہمارے بعض ایسے عزیز بھی مدفون ہیں جن کا تعلق ہماری مادری جانب کے خاندان سے ہے۔ انہی میں مولانا محمد حسین فقیر ہیں جن کا شمار دہلی کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے اور جو دہلی کی ایک اہم مسجد 'حسین بخش' میں ایک عرصہ خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ یہ وہی مسجد ہے جس میں سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید بطور خطیب مقیم رہے اور اب مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی مدظلہٗ اسی مسجد میں جمعہ کی خطابت فرماتے ہیں —— دوپہر کا کھانا وہیں مدرسے میں کھایا۔ شیر میوات ہمارے میزبان تھے دستر خوان پر ان کے کچھ اور مزہ بھی کھلے کہ انہیں کھانا کھلانے کی بھی خصوصی مہارت اور سلیقہ حاصل ہے کھانے میں حسینی روٹی' خاص دہلوی انداز میں پکا ہوا چٹ پٹا سالن' مکھن اور بہت سے دوسرے لوازمات کے

۱؎ اقبال کا شعر ہے:

"یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون"

ساتھ ان کا خلوص! یہ سب کچھ اس تناسب کے ساتھ جمع ہو گئے تھے کہ اس کھانے کی لذت شاید کبھی نہ بھلائی جاسکے۔ اس موقع پر والد صاحب کو ہمارے بزرگ شیخ جمیل الرحمٰن صاحب بہت یاد آ رہے تھے۔ جو خود بھی دہلوی ہیں اور دہلوی کھانوں کا خاص ذوق رکھتے ہیں کہ وہ اگر ساتھ ہوتے تو اپنے ذوق کی تسکین کا بہترین سامان یہاں پاتے ــــــ قیام دہلی کے دوران بعد میں بھی کئی مواقع پر ہمیں جناب شیر میوات کے کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ پُرتکلف بھی اور سادہ بھی! لیکن ہر بار یہی احساس ہوا کہ کسی بڑی سے بڑی پُرتکلف دعوت کا بھی وہ لطف نہیں ہوتا جو جناب شیر میوات کے یہاں کھانے کا ہوتا ہے۔ کچھ عجیب کشش تھی ان کے کھلانے میں اور کھلانے کے انداز میں! ــــــ انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ تحریک آزادیٔ ہند کے دور میں ہندوستان کے سیاسی و دینی زعماء میں سے کوئی قابل ذکر رہنما ایسا نہیں ہے جس کی میزبانی کا شرف جناب شیر میوات کو حاصل نہ ہوا ہو اور سب ہی سے انہوں نے اس معاملے میں داد وصول کی ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے پولیس اسٹیشن کا قصد کیا تاکہ اپنی آمد کا اندراج کرائیں۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مولوی عطاء الرحمٰن صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ یہ مولوی عطاء الرحمٰن اسی مدرسے کے نوجوان اساتذہ میں سے ہیں، بہت جلد گھل مل جانے والے، خوش مزاج ساتھی ہیں مولانا اخلاق حسین صاحب نے کمال عنایت سے انہیں مستقل طور پر ہمارے ساتھ پابند کر دیا تھا تاکہ دہلی میں ہمیں گھومنے پھرنے میں دقت نہ ہو۔ چنانچہ ان کی رفاقت ہمیں پورے قیام دہلی کے دوران حاصل رہی ــــ

پولیس اسٹیشن نزدیک ہی تھا یعنی لگ بھگ نصف میل کے فاصلے پر، پیدل ہی وہاں تک پہنچے ضروری کاغذی کارروائی سے فراغت کے بعد یہ پروگرام بنا کر پہلے چل کر جامع مسجد دہلی دیکھی جائے۔ وہاں سے جماعتِ اسلامی کا مرکزی دفتر قریب ہی ہے۔ جہاں جماعت کے اکابرین سے ملاقات کرنے کے بعد حیدر آباد دکن کے لئے ائر انڈیا کی سیٹیں کنفرم کراتے ہوئے واپس نظام الدین آجائیں گے ــــ چنانچہ ٹیکسی پکڑی اور سب جامع مسجد کے لئے روانہ ہوتے ــــ نئی دہلی شہر بہت خوبصورت انداز میں تعمیر کیا گیا ہے۔ کشادہ سڑکیں، بلند و بالا عمارات اور پھر سرسبزی و شادابی (Greenery)! نے شہر کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ میرا تاثر یہ تھا کہ یہ شہر سڑکوں اور عمارات کے طرزِ تعمیر کے اعتبار سے کراچی سے مشابہ ہے لیکن سرسبزی و شادابی میں لاہور سے زیادہ مشابہ ہے۔

قدیم شہر میں داخل ہوتے ہی، فضا یک دم بدل گئی۔ ہجوم کے باعث اچھی خاصی کشادہ سڑک تنگ گلی میں تبدیل ہو گئی۔ ٹیکسی کے آگے پیچھے دائیں بائیں سائیکل رکشاؤں کا اژدہام تھا۔ سائیکل

نماؤں کو دیکھ کر ابتداءً طبیعت سخت مکدر ہوئی۔ اس لئے کہ ان کو کھینچنے والوں میں سے اکثر و بیشتر
جسم انتہائی لاغر تھے اور وہ شدید مشقت جھیل رہے تھے۔ ہجوم کے باعث جامع مسجد سے آدھ میل ادھر
ٹیکسی کو چھوڑنا پڑا، یہ فاصلہ پیدل طے کیا۔ مولانا اخلاق صاحب سے والد صاحب نے گزارش کی۔ کہ
ہماری وجہ سے مشقت میں نہ پڑیں اور کچھ وقت کے لئے اپنے گھر میں جا کر آرام فرمائیں۔ اس لئے کہ مولانا
رات بعد عشا کسی مسجد میں سیرۃ النبیؐ کے موضوع پر خطاب فرمانا تھا۔ مولانا نے کچھ جھجکتے ہوئے اس
ش کو قبول فرمایا اور ہم سے جدا ہو گئے، مولوی عطاء الرحمٰن بدستور ہمارے ساتھ تھے۔

لاہور کی بادشاہی مسجد کے برخلاف جو پرانے شہر کے ایک کنارے پر واقع ہے، دہلی کی جامع مسجد
شہر کے ٹھیک بیچ وسط میں واقع ہوئی ہے۔ اور اس کی "کرسی" بھی نسبتاً زیادہ بلند ہے۔ یہ غالباً
ایک وسط میں ایک ٹیلہ تھا جسے مسجد کے لئے منتخب کیا گیا ۔ گو باہر سے مسجد کی شان و شوکت پوری
طرح قائم ہے لیکن اندر سے مسجد دیکھنے پر احساس ہوا گویا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ دیکھیں اس
طور پر کھنڈر بننے میں کتنا عرصہ لگتا ہے! جامع مسجد کے آس پاس کا پورا علاقہ مسلمان آبادی پر مشتمل
ہے، یہ علاقہ بہت بڑا کاروباری مرکز ہے اور یہاں ہر قسم کا بازار ہے۔ دہلی کا مشہور چاندنی چوک جامع مسجد
سے متصل آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم نے مسجد میں دو رکعت نماز تحیۃ المسجد ادا کئے اور اس کی حالتِ زار
پر حسرت آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے باہر نکل آئے۔ دہلی کا لال قلعہ مسجد کے مشرقی جانب ہے اور جامع مسجد
سے صاف دکھائی دیتا ہے۔ اسی جانب سے مسجد سے متصلاً باہر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا مزار ہے
یہاں بھی وہی ویرانی اور بے رونقی نظر آئی جس کا مشاہدہ مسجد میں ہوا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد اور مزار
ابوالکلام آزاد مرحوم میں محل و توقع کے اعتبار سے تقریباً وہی نسبت ہے جو لاہور کی بادشاہی مسجد اور
مزار اقبال مرحوم میں ہے۔

حسبِ پروگرام یہاں سے فارغ ہو کر ہم مولوی عطاء الرحمٰن کی رہنمائی میں جماعت اسلامی کے
مرکزی دفتر پہنچے یہ دفتر دہلی کے بالکل قلب میں محلہ چتلی قبر میں واقع ہے۔ آبادی بہت گنجان ہے لیکن دفتر
کا احاطہ کشادہ ہے۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث صاحب موجود نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ
کسی کام سے دہلی سے باہر تشریف لے گئے ہیں۔ تاہم قیم جماعت جناب افضل حسین صاحب موجود تھے۔
انہوں نے خندہ روئی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور بہت تکریم کی۔ کرناٹک کے امیر جماعت بھی موجود
تھے، بہت محبت سے ملے۔ مزید برآں مدیر "معارف" جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب
سے بھی ملاقات ہوئی جو دارالمصنفین اعظم گڑھ سے تشریف لائے تھے اور حکومت پاکستان کی
دعوت پر پاکستان تشریف لے جا رہے تھے۔ جہاں انہیں اسلام آباد میں سیرت کانفرنس میں شرکت کرنا

تھی۔ وہیں مراد آباد کے جناب اقبال جعفری صاحب سے ملاقات ہوئی جن کے ذریعے والد صاحب نے مولانا افتخار فریدی صاحب مدظلہ کو پیغام بھجوایا کہ اگر ممکن ہو سکے تو ملاقات کے لئے دہلی تشریف لے آئیں۔ چائے پر یہ تمام اصحاب جمع تھے اور خوش گوار ماحول میں بے تکلفانہ انداز میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ نمازِ عصر کے بعد ہم نے قیم جماعت سے اجازت لی اور انہیں بتایا کہ ہمیں سیٹ کنفرم کرانے کے لئے ائیر انڈیا کے دفتر میں جانا ہے۔ انہوں نے کمال لطف و کرم سے کام لیتے اپنے دفتر کے ایک مستعد کارکن 'یونس' کو ہمارے ساتھ کر دیا۔ یونس صاحب بڑے اچھے رہنما ثابت ہوئے۔ انہیں غالباً اس قسم کے کاموں کا خصوصی تجربہ تھا۔ چنانچہ اس مرحلہ کو سر کرنے کے لئے ہمیں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ دقت ضرور ہوئی کہ وقت بہت صرف ہوا اور اس کا سبب یہ تھا کہ ائیر انڈیا کے آفس کے اکثر کمپیوٹر اس وقت خراب تھے اور تمام لوڈ ایک ہی کمپیوٹر پر تھا جس کی وجہ سے اپنی باری کے لئے خاصا انتظار کرنا پڑا ——— بہرحال اس طرح ایک نہایت مصروف دن گذار کر ہم رات ۷ بجے واپس نظام الدین اپنے مستقر پر پہنچے۔ نمازِ عشاء کے لئے بستی نظام الدین میں تبلیغی جماعت کے مرکز جا پہنچے وہاں حسبِ معمول 'بیان' ہو رہا تھا اور "خوب" رونق تھی جو ہمارے مستقر سے صرف ۵ منٹ کی پیدل مسافت پر تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ عشاء بہت تاخیر سے ادا کی جاتی ہے چنانچہ نزدیک ہی ایک اور مسجد میں نماز ادا کی۔

رات کے کھانے کے بعد مولانا وحید الدین خاں صاحب کے بڑے صاحبزادے جناب ظفر الاسلام صاحب 'اوکھلا'[1] سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ ظفر الاسلام صاحب ایک طویل عرصے انڈیا سے باہر رہنے کے بعد حال ہی میں غالباً ایک سال قبل، واپس انڈیا تشریف لائے ہیں اور اب مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ آپ نے قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ نہایت سنجیدہ اور قابل آدمی ہیں اور تعلیم و تعلّم کے کاموں سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ والد محترم ان سے دینی تحریکات کے موضوع پر خاصی دیر تک تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ انہوں نے ہمیں والد صاحب کی بعض تصانیف میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

(جاری ہے)

[1] 'اوکھلا' دراصل ایک آبادی کا نام ہے جو دہلی کے مضافات میں ہے اور بستی نظام الدین سے [illegible] کرنا [illegible] ہے۔

پاکستان کا عدم استحکام حقیقی ...
پاکستان کی اصل اساس اور استحکام پاکستان

میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی
۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

جلد ۳۵
شمارہ ۲
فروری ۱۹۸۶
مطابق
جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ
زرِ سالانہ ۳۰ روپے
فی شمارہ ۳/- روپے

مدیر مسئول

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۱

مشمولات

سالانہ اجتماع تنظیمِ اسلامی

تنظیمِ اسلامی کے مرکزی سالانہ اجتماع کے لئے امسال ۴ - اپریل ۱۹۸۶ء بروز جمعۃ المبارک تا ۶ - اپریل ۱۹۸۶ء تاریخوں کا تعین ہوا ہے۔ تنظیم کے تمام رفقاء نوٹ فرمالیں!
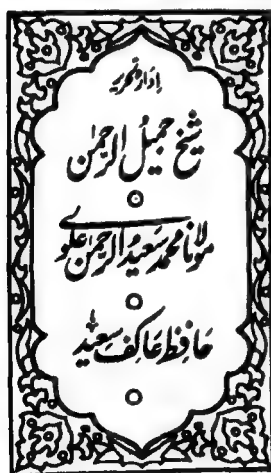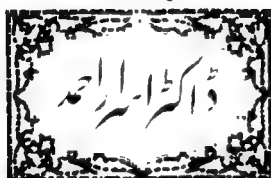
المعلن: چوہدری غلام محمد۔ قیّم تنظیمِ اسلامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

—— اسرار احمد ——

قارئینِ 'میثاق' کی خدمت میں راقم الحروف کی حاضری لگ بھگ پانچ ماہ بعد ہو رہی ہے اِس لیے کہ اگرچہ اکتوبر ۱۹۸۵ء کے پرچے میں بھی مختصر سا 'تذکرہ و تبصرہ' میرا ہی تھا لیکن تفصیلی گفتگو ستمبر ہی کے شمارے میں ہوئی تھی۔

اکتوبر کے شمارے میں راقم نے تحریر کیا تھا :

> "استحکامِ پاکستان" کے موضوع پر راقم الحروف کی جن تقاریر کا ذکر گزشتہ شمارے میں آیا تھا ان پر محترم اقبال احمد صدیقی صاحب نے بہت محنت کی ہے اور انہیں ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا کام تقریباً مکمل کر لیا ہے، لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر خود ان کا اور بعض دوسرے رفقاء کا اصرار ہے کہ ان پر میں بھی ایک نظر ڈال دوں اور ہو سکے تو انہیں خود اَز سرِ نو مرتب کر دوں۔ چنانچہ خود میرا ارادہ بھی اب یہی بن گیا ہے، لیکن اس کی تکمیل ظاہر ہے کہ سراسر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اسی کی تائید و توفیق پر منحصر ہے : بقول غالب " ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے !" کے مصداق میرے دل میں تو یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اگر اللہ حالات سازگار فرما دے تو ماہِ اکتوبر ہی میں عمرہ کے لیے سفر کروں اور اس کے دوران حرم کے کسی گوشے ہی میں بیٹھ کر اس تقریر کو مرتب کر دوں۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!!
>
> اس اثنا میں لاہور کی 'شامِ الہندی' والی تقریر کو ویڈیو کیسٹ کے ذریعے جن حضرات نے دیکھا اور سُنا ہے ان میں سے علماءِ ہند کے خیرآبادی سلسلے کی ایک عظیم شخصیت مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی کے پوتے حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کا جو تأثر موصول ہوا ہے وہ بدیۂ قارئین ہے۔

اِس وقت یہ عرض کرتے ہوئے حجاب محسوس ہو رہا ہے لیکن واقعہ یہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بے پایاں فضل و کرم ہے کہ وہ کبھی کبھی وہ اپنے عامی و عاصی بلکہ عاجز و ناچیز بندوں کے ساتھ بھی وہ معاملہ فرما لیتا ہے جو اُس کے 'خاص' بندوں کے لیے مخصوص ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے جس طرح میری اس خواہش کو پورا فرمایا اُس کا ذکر لفوائے امرِ ربانی "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" ! سپردِ قلم کر رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ میرے قلم سے ماہ ستمبر کی کسی تاریخ کو نکلے ہوں گے۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اُن ہی دنوں حجازِ مقدس سے رفیق مکرم ڈاکٹر شجاعت علی برنی تشریف لے آئے —— انہوں نے جو میری صحت کی

کیفیت دیکھی تو نہایت اصرار کے ساتھ فرمایا کہ کم از کم ایک ماہ 'آرام' کے لیے اُن کے پاس طائف میں میں قیام کروں۔ میری طبیعت میں مزید آمادگی پیدا کرنے کے لیے یہ بھی بتایا کہ وہاں آج کل میرا مکان بالکل خالی ہے اِس لیے کہ میں نے اپنے بچوں کو تعلیم وغیرہ کے لیے اسلام آباد میں SETTLE کر دیا ہے — میں نے اُن سے وعدہ کر لیا کہ ایک ماہ تو ناممکن ہے لیکن میں پندرہ روز کی کوشش کروں گا۔ میرے دل میں حجاز کے سفر کی خواہش تو پہلے سے تھی ہی۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں چونکہ قیام کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے — اور ہوٹل وغیرہ کا معاملہ بہت مہنگا ہے — دوسرے وہاں قیام کی صورت میں احباب رفقاء کی 'دستبرد' سے حفاظت بھی بہت مشکل ہے! لہٰذا خیال آیا کہ یہ صورت جو سامنے آئی ہے یقیناً 'من جانب اللہ' ہے، کہ حرمین کا قرب بھی رہے گا — اور تنہائی اور سکون بھی میسر رہے گا — مزید برآں طائف کی صحت افزا آب و ہوا سے بحالیٔ صحت میں بھی مدد ملے گی! گویا 'ہم خرما و ہم ثواب!' کا معاملہ ہو جائے گا!

لیکن اِس کے لیے ضرورت تھی 'وزٹ ویزا' (VISIT VISA) کے حصول کی جو خاصہ مشکل اور وقت طلب ہوتا ہے۔ پھر میرے پاس مہینہ بھی صرف اکتوبر کا تھا، نومبر میں میرا حیدرآباد (دکن) کے سفر کا پختہ وعدہ تھا جس میں ایک سال کی تاخیر میرے لیے پہلے ہی شرمندگی کی موجب ہو چکی تھی۔

بہرحال برادرِ عزیز اقتدار احمد جو میرے لیے پہلے بھی اپنے ایک سعودی دوست اور سابق کاروباری شریک کے ذریعہ میرے لیے وزٹ ویزا منگوا چکے تھے، اب پھر اُن ہی سے کہا کہ ؎ :
"خدا را آن کرم بار دگر کُن!" — انہوں نے حامی تو بھر لی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اِس میں کم از کم ایک ماہ تو لگ ہی جائے گا۔ یہ بات میرے لیے مایوس کُن تھی اِس لیے کہ میرے پاس تو کُل ہی ایک ماہ انتظار اور سفر دونوں کے لیے تھا — بہرحال اُن سے یہ کہا کہ کوشش تو کرو۔ پھر جو اللہ کو منظور!!

اب ذرا خدا کا کرنا دیکھئے!

یہ اواخر ستمبر کی بات ہے کہ ۳۰ ستمبر کو کراچی کی 'شامِ الہدیٰ' کی تقریب منعقد ہونی تھی پی آئی اے سے اس کے لیے کراچی کی بکنگ کرانے کے لیے راقم جب برادرم عبدالرزاق صاحب سے کہہ رہا تھا تو معلوم کیسے دل میں خیال آیا کہ ساتھ ہی روانگی میں جدہ کے لیے بھی ۱۱ اکتوبر کی تاریخ میں بکنگ کرانے کے لیے کہہ دیا! برادرم اقتدار احمد بھی اُس وقت اتفاقاً موجود تھے۔ انہوں نے فوراً کہا 'آپ کس خیال میں ہیں؟ ابھی تو ویزا کے بارے میں کوئی اطلاع تک نہیں ہے اور اطلاع آنے کے

بعد بھی سعودی سفارت خانے والے کم از کم دو ہفتے لگا دیتے ہیں!، جس پر میں نے کہا "بھائی میرے پاس صرف ۱۱ تا ۲۵ اکتوبر کے دو ہفتے ہیں، اللہ کو منظور ہوا تو ان ہی ایام میں جانا ہو جائے گا، ورنہ ہم بھی اُسی کی رضا پر راضی ہیں!" — ۳۰ ستمبر کو میں ساڑھے گیارہ بجے کی فلائٹ سے کراچی جانے کے لیے اپنے کاغذات وغیرہ درست کر رہا تھا کہ ایسے ہی خیال آیا کہ برادرم اقتدار احمد سے ویزا کے ضمن میں کسی "اطلاع" کے بارے میں پوچھوں۔ فون کیا تو انہوں نے کہا ابھی چند منٹ میں جن لوگوں کے ذریعے TELEX دیا تھا اُن سے معلوم کر کے بتاتا ہوں، واقعتہً چند ہی منٹ میں اُن کا جواب آ گیا کہ کراچی کے سعودی ایئر لائنز کے دفتر کو آپ کے ویزا کے بارے میں "ہدایت" جاری ہو چکی ہے، وہاں فلاں صاحب سے ملاقات کر لیں! گویا "ارادۂ خداوندی" صاف ظاہر ہو گیا تھا! — اِدھر میری اہلیہ کا پاسپورٹ کسی کام سے پاسپورٹ آفس میں جمع تھا فوراً آدمی بھیج کر اُسے منگوایا اور دونوں پاسپورٹ جیب میں ڈال کر میں کراچی پہنچ گیا۔ وہاں سعودی عرب کے "معاملات" سے ادنیٰ سی واقفیت رکھنے والا ہر شخص گواہی دے گا کہ یہ "معجزہ" رونما ہوا کہ یکم کی صبح کو پاسپورٹ سعودی ایئر لائنز کے دفتر میں جمع کرائے اور ۲ کو ویزا مل گیا!! — درآں حالیکہ راقم نے سعودی قونصل خانہ کی شکل تک نہ دیکھی!

بلکہ اِس سے قبل ہو ہی چکی تھی! — چنانچہ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ ٹھیک ۱۱ اکتوبر ہی کو جدہ روانگی ہو گئی۔ ایئرپورٹ پر جدہ کے رفقاء کے علاوہ ڈاکٹر شجاعت علی برنی بھی موجود تھے اور اگرچہ میں "بظاہر" اُن ہی کی "دعوت" پر پہنچا تھا لیکن وہ خود بھی حیران تھے کہ ایسے چٹ پٹ یہ معاملہ ہو کیسے گیا! — اُن کی محبت اور تعلق خاطر کا مزید انکشاف اِس طرح ہوا کہ وہ اس روز "ڈیوٹی" پر تھے اور صرف ایئرپورٹ پر خوش آمدید کہنے کے لیے جدہ آئے تھے چنانچہ وہ تو فوراً ہی واپس طائف چلے گئے۔ ہم نے جمعہ کی نماز جدہ میں ادا کی اور عصر کے بعد برادرم فیض اللہ خاں کی معیت میں مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے — عشاء کے وقت تک عمرہ سے فارغ ہو گئے۔ عشاء میں ڈاکٹر برنی طائف سے پھر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ چنانچہ اُن کے ساتھ طائف روانگی ہو گئی!

طائف میں ہفتہ ۱۲ اکتوبر تا جمعرات ۱۷ اکتوبر، چھ دن میری زندگی میں بہت طویل عرصے کے بعد نہایت آرام، اطمینان اور سکون کے ساتھ گذرے، چنانچہ ان کے دوران شام کے اوقات میں بھی درس یا خطاب کی صرف ایک دو نشستیں ہی ہوئیں اور ملاقاتیوں کی آمد بھی بہت

کم رہی۔ باقی سارا دن کامل تنہائی ہوتی تھی! — جمعرات کی شام کو ڈاکٹر صاحب کی معیت میں پھر مکہ مکرمہ کا سفر ہُوا — شب جمعہ میں دوسرا عمرہ بھی نصیب ہُوا، اور حرم کی رات کے پچھلے پہر کی حاضری بھی! — برنی صاحب کی نائٹ ڈیوٹی تھی لہٰذا وہ ہمیں مکہ مکرمہ چھوڑ کر واپس طائف چلے گئے تھے لیکن جمعہ کی نماز میں پھر تشریف لے آئے اور شام کو اُن کی معیت میں واپسی ہوگئی اور مزید چار دن طائف میں گزرے، لیکن ان ایام میں بھی ملاقاتوں اور دعوتوں کا چکر بھی زور دار چل نکلا — اور دروس و خطابات بھی تقریباً روزانہ جاری رہے —

بہر حال اللہ تعالیٰ نے وہ ارادہ پورا کرا دیا جس کے لیے اس سفر کی خواہش پیدا ہوئی تھی — اور 'استحکام پاکستان' کے ضمن میں مقدمہ اور 'چند ذاتی وضاحتیں' کے علاوہ ابتدائی تین ابواب بھی ضبطِ تحریر میں آ گئے، فلہ الحمد والمنۃ!

ان میں سے مقدمہ بعنوان "پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال، اور اس کی دینی و تاریخی اہمیت" اور "چند ذاتی وضاحتیں" گذشتہ شمارے میں قارئین کی نگاہ سے گذر چکی ہیں — تین ابواب پیشِ نظر شمارے میں شامل ہیں!

سعودی عرب سے بجائے ۵ کے ۳۱ اکتوبر کو واپسی ہوئی تھی۔ نومبر کی ابتدائی تاریخوں میں تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت کا سہ ماہی اجلاس منعقد ہُوا تھا، اُس میں طے ہُوا کہ ان مضامین کو 'میثاق' میں یا کتابی صورت میں شائع کرنے سے قبل ہی ملک کے کسی کثیر الاشاعت روزنامے کے ذریعے عوام الناس کے سامنے لایا جائے۔ چنانچہ روزنامہ جنگ سے بات ہوئی اور الحمد للہ ۲۹ر نومبر ۸۵ء سے پاکستان کے اس کثیر الاشاعت روزنامے کے بیک وقت کراچی، لاہور، راولپنڈی اور کوئٹہ کے جمعہ ایڈیشن میں ان مضامین کی قسط وار اشاعت کا آغاز ہوگیا — اس سے جہاں یہ مقصد حاصل ہوگیا کہ ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوگئی وہاں ایک اضافی 'حکمت' جو بعد میں ظاہر ہوئی وہ یہ کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید میری اُن شدید مصروفیات کی بنا پر جن کا زور دار چکر سعودی عرب سے واپسی کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا۔ بقیہ کتاب کی تحریر کا کام کھٹائی میں پڑ جاتا۔ لیکن اب چونکہ اخبار میں اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے تو پابندی کرنی پڑ رہی ہے۔ (ورنہ واقعہ یہ ہے کہ "نثر کجا و من کجا!" کے مصداق کہاں میں اور کہاں پابندی کے ساتھ لکھنا! !!) چنانچہ ماہ جنوری میں الحمد للہ کہ کتاب کے تین مزید ابواب ضبطِ تحریر میں آ چکے ہیں! — اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان مضامین کو ملک و ملت کے

مستقبل کے لیے مفید، اور میرے لیے توشۂ آخرت بنا دے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ
اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ !

جن حضرات کو ان مضامین میں افادیت کا کوئی پہلو نظر آئے یہ اُن کی ذمہ داری ہے کہ اُن کی زیادہ سے زیادہ وسیع حلقے میں اشاعت کے لیے کوشاں ہوں۔ اِس ضمن میں اُن کی توجہ کے لیے دو باتیں عرض ہیں (۱) اپنے احباب اور جاننے والوں کے حلقے میں سے زیادہ سے زیادہ حضرات کو جنوری ۱۹۸۶ء کی اشاعت سے 'میثاق' کے سالانہ خریدار بنوائیں۔ اسی غرض سے جنوری کی اشاعت بھی معمول سے قدرے زائد تعداد میں طبع کرائی گئی تھی اور پیشِ نظر شمارہ کے ضمن میں بھی یہ اہتمام ہو جائے گا۔
(۲) "پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال" ایک پمفلٹ کی صورت میں علیحدہ بھی طبع کرا لیا گیا ہے۔ کتاب کے موضوع سے متعارف کرانے کے لیے اِس کی وسیع حلقے میں اشاعت مفید ہو گی۔ یہ کتابچہ دفتر 'میثاق' سے پچاس روپے سینکڑہ کے حساب سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

اِس ضمن میں یہ اطلاع بھی مناسب ہے کہ اِس کتاب کا مکمل نام:

"استحکامِ پاکستان کا واحد ذریعہ: اسلامی انقلاب!"

ہو گا، راقم جملہ قارئین 'میثاق' سے استدعا کرتا ہے کہ وہ اس کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں۔

سعودی عرب کے سفر کی چونکہ کوئی روداد شائع نہیں ہو سکی، لہٰذا صرف ان امور کا ذکر انشاء اللہ دلچسپی کا موجب ہو گا کہ منگل ۲۲ر اکتوبر کو طائف ہی سے بذریعہ ہوائی جہاز مدینہ منورہ حاضری ہوئی تھی۔ اور روضۂ مطہرہ پر حاضری کے ساتھ ساتھ ایک جمعہ بھی مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں نصیب ہو گیا تھا۔ وہاں سے جمعہ ۲۵ر اکتوبر کو نمازِ جمعہ کے فوراً بعد برادرم محمد حنیف اختر صاحب کے ساتھ بذریعہ کار بھاگم بھاگ، جدہ واپسی ہوئی، جہاں اسی رات کو بعد نمازِ عشاء جامع مسجد عمر ابن الخطاب رضہ واقع شارع ستین (نزد مطارِ قدیم) میں ایک باقاعدہ "جلسۂ عام" میں خطاب ہوا جس کی حاضری سعودی عرب کے حالات کے پیشِ نظر نہایت غیر متوقع (سات آٹھ سو کے لگ بھگ) تھی۔ مسجد کے خطیب ایک مصری عالم ہیں اور متولی ایک نہایت نیک دل عرب سعودی شیخ، تقریر اردو میں تھی اور اس کا عنوان بھی "پاکستان میں اسلامی انقلاب، کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟" تھا۔ لیکن چونکہ کثرت سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کا حوالہ تھا لہٰذا اندازہ یہ ہوا کہ تقریر کے پورے مضمون کو ان حضرات نے خوب سمجھا۔ خطیب صاحب

نے تو بعد میں صدارتی خطبہ کے انداز میں نہایت سادہ و سلیس لیکن صد درجہ فصیح و بلیغ عربی میں جو کچھ فرمایا اُس کا تذکرہ اِس لیے مناسب نہیں کہ میرے قلم سے وہ 'مدح خود' کا مصداق بن جائے گا۔ شہے متولی صاحب تو ان کے احساسات و جذبات اُن کی پُر تکلف دعوت طعام اور اُس کے دوران اُن کے ہر بُنِ مُو سے پھوٹنے والی محبت سے ظاہر ہو گئے تھے !!

سعودی عرب میں مقیم پاکستانی اور ہندی مسلمانوں کے حلقے میں ایک نئی تبدیلی کی خبر گذشتہ سال رمضان المبارک کے فوراً بعد برادرم ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا دے چکے تھے کہ جب وہ عشرۂ اخیرہ میں عمرے کے لیے گئے تو بقول اُن کے "اِس بار وہاں ایک نئی بات یہ شدت کے ساتھ محسوس ہوئی کہ بہت زیادہ تعداد میں لوگوں نے آپ کی صحت و عافیت اور تنظیم اسلامی کے کام کے بارے میں دریافت کیا!" میں نے اِسے اتفاقی سی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا لیکن اِس سفر کے دوران اِس کا خود مجھے شدت کے احساس ہُوا۔ اور اس کی توجیہہ یہ سمجھ میں آئی کہ ایک تو سعودی عرب کی حکومت نے بھی کچھ اپنی پالیسی بدل لی ہے۔ اور غیر سعودی لوگوں کے اجتماعات وغیرہ کے ضمن میں زیادہ تشویش کا اظہار نہیں کرتی (البتہ اُن میں سعودی شہریوں کی شرکت پر بہت چوکنی ہو جاتی ہے!) لہٰذا اب دینی و مذہبی اجتماعات اور تقریبات زیادہ آزادی سے منعقد ہو رہی ہیں، اسی بنا پر یہ چرچا اور دلچسپی ہے — دوسرے یہ کہ اب اکثر لوگ جان گئے ہیں کہ عنقریب یہاں سے کوچ اور وطن واپسی ہوگی۔ لہٰذا پاکستان کے حالات کے بارے میں لوگ پہلے سے زیادہ غور و فکر کر رہے ہیں — واللہ اعلم! بہرحال اِس مرتبہ جتنی تعداد میں لوگ جدہ، طائف اور ریاض میں تنظیم میں شامل ہوئے، اس سے بھی رندھاوا صاحب کے رمضان مبارک والے 'مشاہدے' اور میرے متذکرہ بالا 'تجزیے' کی تائید ہوتی ہے!

بہرحال! جدہ میں ایک بھرپور نشست سوال و جواب کی بھی ہوئی اور اتوار ۲۷ اکتوبر کو وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے الریاض جانا ہُوا۔ جہاں ڈھائی دن نہایت شدید مصروفیت میں گذرے مردوں کے دو بھرپور اجتماعات کے ساتھ ساتھ ایک اجتماع خواتین کا بھی منعقد ہُوا حسبِ معمول ایک پُر تکلف دعوت طعام ڈاکٹر محمد عمر چھاپڑہ صاحب کے مکان پر ہوئی۔ پروفیسر جلیل الدین اور دوسرے دوسرے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات سے تفصیلی گفتگوئیں ہوئیں اور متعدد ہندی او پاکستانی حضرات نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی! — وہاں سے ۳۰ اکتوبر کو علی الصبح رفیق محترم عطاء الرحمٰن صاحب کی کار میں ان کی اور برادرم عظیم الدین خاں کی معیت میں دمام اور الخبر جانا

ہُوا۔ جہاں محترم ملک عباس نے اپنے سکول میں دعوتِ طعام کے ساتھ کافی بڑا استقبالیہ ترتیب دیا ہُوا تھا۔ وہیں رات کو بعد نمازِ عشاء پبلک جلسہ بھی ہوا۔ یہاں پچھلے سال بھی ایک بڑا جلسہ ہُوا تھا جس میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر خطاب ہُوا تھا۔ اس بار وہاں بھی براہِ راست پاکستان کے قومی اور ملی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اس جلسے کی جو رپورٹ اور تقریر کا جو خلاصہ روزنامہ نوائے وقت کے نمائندے طارق نسیم صاحب نے اپنے روزنامے کو ارسال کیا اور جو نوائے وقت کراچی کی اشاعت بابت ۱۹ نومبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا وہ حیرت انگیز حد تک صحیح ہے۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے شرکاء کی تعداد "ہزاروں" بیان کی ہے جبکہ میرے اندازے میں وہ ایک ہزار سے کچھ ہی زائد ہوں گے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ تعداد بھی وہاں کے اعتبار سے واقعتاً بہت غیر معمولی ہے! ملاحظہ فرمائیے

ڈاکٹر اسرار احمد کے سعودی عرب کے تبلیغی دورے کی رپورٹ

پاکستان کے ممتاز مفکر و عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد نے اسلامی انقلاب کو ملکی سالمیت و بقا کے لئے لازم قرار دیتے ہوئے نوجوانوں کو تلقین کی ہے کہ اسلام کے سیاسی و اقتصادی انصاف پر مبنی نظام کے لئے راہ ہموار کریں اور اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔ وہ گزشتہ دنوں الخبر سعودی عرب میں پاکستانی کمیونٹی ہائی سکول و کالج کے کمیونٹی سینٹر میں اسلام اور پاکستان کے موضوع پر لیکچر دے رہے تھے۔ طلبہ، والدین اور مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں پاکستانیوں نے اس لیکچر میں شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے پاکستان کے سیاسی و جغرافیائی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ چند برسوں میں اسلامی انقلاب برپا نہ ہوا تو خدانخواستہ ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا اور مشرقی پاکستان جیسے المیے کے بعد مغربی پاکستان کے بھی ٹکڑے ہونے کا احتمال ہے۔ انہوں نے اسلامی انقلاب کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ انقلابی عمل میں اسلامی انقلابی نظریات کی اشاعت، اس کی دعوت قبول کرنے پر تنظیم، بعد ازاں انہی خطوط پر تربیت اور پھر عدم تشدد کے ذریعے فرسودہ نظام کے خلاف مزاحمت تاکہ مطلوبہ قوت کی فراہمی تک اس کے خلاف نفسیاتی و ذہنی جنگ کے بعد آخری مرحلے یعنی چیلنج کے لئے تیاری کی جائے جہاں اس نظام کی دکھتی رگ پر نشتر لگا کر واضح برتری کے ساتھ کامیابی حاصل کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ عالمی تجزیہ نگاروں کی رائے میں پاکستان آج بھی اپنے تشخص کی تلاش میں ہے کیونکہ پاکستان صرف اسلام کے نام پر قائم کیا گیا تھا جس سے اب تک عوام کو محروم رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ماضی کی غلطیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم وطن "قومیت" کا اساس اور دین کے طور پر اسلام کو منتخب کرتے تو ہمارا ملک بھی مضبوط ہوتا، قوم بھی سربلند ہوتی اور دین میں بھی بہار آتی۔ انہوں نے قومیت کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان نسلی، لسانی یا علاقائی بنیاد پر قائم نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی اساس صرف اسلام تھا۔ انہوں نے دیگر ممالک کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان نسلوں کی چوں چوں کا مربہ ہے، عربوں کے نیشنلزم کی بنیاد لسان عربی ہے جبکہ پاکستان میں لسانی قوم پرستی وجود میں نہیں آ سکتی اور نہ ہی وطنی قومیت کے تصور کو نافذ کیا جا سکتا ہے کیونکہ وطن سے مراد عام طور پر علاقہ لیا جاتا ہے جبکہ مسلمان وطن کی سرحد کا قیدی نہیں ہوتا، اس کے تحت الشعور میں ضمیر کا تقدس برقرار رہتا ہے اور وہ وطن کو دیوتا ماننے کے تصور سے دور رہتا ہے۔ بقول اقبال

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس طرح ہمارا وطن آفاقی ہے اور ہر مسلمان آفاقیت کا قائل ہے جس کی سب سے بڑی مثال تحریک خلافت ہے جس کی حمایت سب سے پہلے اور سب سے زیادہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے کی تھی حتیٰ کہ سیاسی موت سے بچنے کے لئے گاندھی کو بھی اس تحریک کی حمایت کا اعلان کرنا پڑا۔ اس طرح نسلی، لسانی، قومی و وطنیت کا تصور مسلمان کے لئے غلط ہے۔ اگر پاکستان میں زمین کے تصور پر قومیت کا دارومدار ہوتا تو سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی قومیں زیادہ قوت سے ابھر کر سامنے آتیں کیونکہ ان کے لئے لسانی، ثقافتی و معاشرتی مددگار عوامل موجود ہیں۔ بھارت میں بھی صرف علاقائی نیشنلزم ہے لیکن ان کے سیاسی ادارے مستحکم ہیں جن کی بنیاد سیکولرازم پر ہے یہی وجہ ہے کہ ہندو پاک تازہ ہو تو علاقائی سیاستدانوں کی دلی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہوتی ہیں کیونکہ مسلمان بنیادی طور پر آفاقیت کا قائل ہے۔ علاقائی و لسانی تعصب کی نفی پر ہم نے پاکستان بنایا تھا کیونکہ لسانی قومیت، نسلی قومیت اور وطنی قومیت کے تصورات ہمارے مزاج کی ساخت سے مطابقت نہیں رکھتے جبکہ یہ تقسیم در تقسیم کا تقاضا

دینے والے عوامل ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس وطنی سلسلہ نہیں جبکہ دیگر مسلم اقوام بالخصوص ترک اور عرب وغیرہ کے لئے تاریخ اسلام کے حوالے سے حب الوطنی کے لئے علاقائیت بھی معاون رہی ہے۔ اس لئے ہمیں حقائق کا تجزیہ منطقی انداز میں درست طور پر کرنا چاہئے تب ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مسلمان میں آج جو چیز شعلہ، شعار، ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے وہ قومی نہیں حقیقی اسلام ہے جسے ہر شخص دل کی گہرائیوں سے محسوس کرے اور اس جذبے کو حاصل کر لینے سے کوئی طاقت پاکستان کو آنچ نہیں پہنچا سکتی ہے یہ جذبہ لسانی، نسلی یا وطنی قومیت کی بنیاد پر پیدا نہیں ہو گا بلکہ حقیقی اور عملی جذبے کی بنیاد پر ہو گا جس کی صداقت کی گواہی ضمیر کی آواز دے کیونکہ محض مسلمان ہونا کافی نہیں "اسلام کی حقیقی روح کے ساتھ اسے قبول کرنا لازم ہے۔"

ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستان کی سالمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام ہی اس ملک کی بقاء، عزت اور وقار دوام کی ضمانت دے سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انتخابات سے ابھی تک اسلام نہیں لایا جا سکا اور نہ ہی مارشل لاء اس مسئلے کا حل ہے۔ انتخابات کو انہوں نے ملک کو زندہ رکھنے کے لئے لازمی قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ سیاسی عمل کا ایک حصہ ہیں لیکن اسلام کا نعرہ لگا کر ووٹ دینے سے فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ انہوں نے متعدد سیاسی رہنماؤں [illegible] اسلام سے [illegible] ہیں لیکن انہوں نے اس امر سے اختلاف کیا کہ انتخابات سے مطلوبہ ہدف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے انتخابات کو [illegible] بنیادوں کو [illegible] کرتے ہیں تو انہیں کرنے سے تعبیر کرتے ہوئے قرآن عظیم کی سورۃ انعام آیت نمبر ۱۱۶ کا حوالہ دیا کہ اگر تم زمین پر بسنے والوں کی اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں گمراہ کر کے چھوڑیں گے۔ انہوں نے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ انتخابات میں اسلام کا نعرہ لگانے سے مختلف مذہبی جماعتوں کی جانب سے فروعی اختلافات کو ہوا دی گئی کیونکہ ہر جماعت اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے اڑی رہی۔ اس لئے ملک کو زندہ رکھنے کے لئے الیکشن کی ضرورت ہے جبکہ مسلمان بننے کے لئے ایمان چاہئے اور یہ ایمان انقلابی عمل سے آ سکتا ہے۔ انہوں نے اسلامی انقلاب کے بعد سو فیصد اسلامک نظام متعارف کرانے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس نظام کے تحت ملک میں سماجی انصاف ہو گا جس میں اونچ نیچ کی بنیاد صرف تقویٰ ہو۔ قرآن کے مطابق معاشی عدل ہو جس کے تحت حکومت کفالت اور ذمہ داری قبول کرے اور یہی نظام حکومت عوام کے لئے رسول کریم ﷺ نے تجویز کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لیکچر کے اختتام پر حاضرین کو سوالات کے جوابات بھی دیئے۔

پاکستانی کمیونٹی کے روح رواں عباس حسین ملک نے لیکچر سے قبل ڈاکٹر اسرار احمد کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں ممتاز پاکستانیوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر نمائندہ نوائے وقت سے انٹرویو میں ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی تنظیم اسلامی کے بارے میں پروگرام کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ گزشتہ ۱۰ برس کی کوشش سے ایک ہزار افراد نے رکنیت حاصل کی ہے جس میں زیادہ تر نوجوان طبقہ ہے جبکہ سرکاری ملازمین بھی پروگرام سے متعلق ہیں البتہ تاجر برادری معاشی عدل و انصاف کے پروگرام سے خائف ہے۔ فروعی اختلافات ختم کرنے کے بارے میں کوششوں سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ فرقوں کی رجسٹریشن کر کے ان کی مساجد مخصوص کر دی جانی چاہئیں جن میں دوسرے فرقے مداخلت نہ کریں اور کسی کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہ کریں۔ جمہوریت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں محدود جمہوریت کے قائل ہیں۔ خواتین کے لئے پابندیوں سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ خواتین کی ملازمت کے خلاف نہیں بلکہ پابندی [illegible] علیحدہ ماحول پر ہونی چاہئے۔ عورتوں کو علیحدہ کالج اور سکولز میں ایسی ملازمتیں مہیا کی جائیں جن میں صرف خواتین ہی ہر شعبے میں کام کریں اسی طرح فضائی سروس اور ہسپتالوں میں سے خواتین کو ہٹایا جائے۔ خواتین نرسز کو صرف نسوانی ہسپتالوں میں متعین کیا جائے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ پاکستان میں خواتین زیادہ اسلام پسند ہیں اور اس امر پر ریفرنڈم کرایا جا سکتا ہے چند مغرب زدہ خواتین کے مطالبوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خواتین کی کھیلوں کے بھی خلاف نہیں لیکن یہ کھیلیں صرف انہی اداروں میں ہونی چاہئیں جس میں بے پردگی نہ ہو۔ کرکٹ پر پابندی کے بارے میں ان کے سابقہ مطالبہ کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ طویل المدت کھیلوں سے عوام کے وقت کا ضیاع ہوتا ہے اس لئے قوم ایسی عیاشی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ سعودی عرب میں تارکین وطن کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ انہیں کیمپوں میں ہندوؤں کے ساتھ یا ہندو باورچیوں کا تیار کردہ کھانا برداشت کرنا پڑتا ہے جس پر متعدد بار پاکستانیوں کو ناگوار حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ غیر اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کی ممانعت ہے اس لئے مسلمانوں کو احتیاط کرنی چاہئے۔

تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستانی کمیونٹی کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے جدہ، ریاض، دمام اور الخبر میں تارکین وطن کو مختلف موضوعات پر لیکچر دیئے تھے۔ افتتاحی تقریب میں انہوں نے پاکستانی سکول کے چیئرمین ملک عباس حسین کے جذبہ اسلامی کو سراہا اور مہمان نوازی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

الغرض! —— ارضِ مقدس کا یہ پورے بیس روز کا دورہ بفضلہٖ تعالیٰ ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا 'الخبر' کے کمیونٹی سنٹر سے فارغ ہوتے ہی ظہران ایئرپورٹ کے لیے روانگی ہوئی جہاں سے رات کے ایک بجے کے لگ بھگ روانہ ہو کر جمعرات ۳۱ اکتوبر کو علی الصبح براہِ راست لاہور واپسی ہو گئی ——

بسم اللہ ولجنا وعلیہ ربنا توکلنا !!

نومبر اور دسمبر ۱۹۸۵ء کے دو مہینے پھر شدید ترین مصروفیت میں گذرے۔ ملاحظہ فرمائیں!
یکم نومبر کو جمعہ تھا ــــ مسجد دارالسلام میں خطابِ جمعہ بھی ہوا، اور شام کو حسبِ معمول واپڈا آڈیٹوریم
ہور میں "شامِ الہدیٰ" کی ماہانہ نشست بھی!

۲ و ۳ نومبر: اجلاس مرکزی مجلسِ مشاورت تنظیمِ اسلامی

۴ نومبر: درسِ قرآن، کمیونٹی سنٹر، اسلام آباد

۵ نومبر: تقریر گورنمنٹ کالج، رحیم یار خاں

۶ نومبر: خطاب تقریبِ نکاح (خواہرزادی خود) صادق آباد

۶ و ۷ نومبر: کی درمیانی شب، رحیم آباد برائے ملاقات سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری مدظلہ

۷ نومبر: تقریر بر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ــــ سیرت کانفرنس سکھر۔ زیرِ اہتمام تنظیم فکر و نظر سندھ (اور جلسے سے براہِ راست بھاگ دوڑ کر کے رات کے بارہ بجے روہڑی سٹیشن سے خیبر میل میں سوار)

۸ تا ۱۰ نومبر: علاقائی اجتماع حیدر آباد سندھ

۱۱ نومبر: "شامِ الہدیٰ" تاج محل ہوٹل کراچی

۱۴ نومبر: تقریر سول سروس اکیڈمی لاہور

۱۵ نومبر: خطابِ جمعہ ــــ و خطابِ عام جامع مسجد باغ والی، بیرون شاہ عالمی دروازہ لاہور۔

۲۰ تا ۲۵ نومبر: دہلی

۲۶ نومبر تا یکم دسمبر: حیدر آباد (دکن)

یکم تا ۳ دسمبر: ــــ پھر دہلی،

۴ دسمبر: دہلی سے واپسی،

۵ دسمبر: تقریر نیشنل ڈیفنس کالج، راولپنڈی،

۶ دسمبر: خطابِ جمعہ و "شامِ الہدیٰ" لاہور

۹ تا ۱۹ دسمبر: ابوظہبی۔

۲۰ دسمبر: جمعہ، صبح کی فلائٹ سے کراچی سے لاہور، خطابِ جمعہ مسجد دارالسلام

۲۲ دسمبر: واپس کراچی، رات کو تقریر بر سیرت النبیؐ، لانڈھی

۲۳ دسمبر: "شامِ الہدیٰ" کراچی

۲۴ دسمبر: تقریر "پاکستان میں اسلامی انقلاب، کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟" کورنگی کراچی۔

۲۵؍ دسمبر: مفصّل نشست سوال و جواب، اکرنگی

اِس کے بعد سے آج کی تاریخ (۲۳؍ جنوری ۱۹۸۶ء) تک بس صرف ۶؍ جنوری کو اسلام آباد کے ماہانہ پروگرام کے لیے جانا ہُوا جہاں سے ۷؍ ہی کو واپسی ہو گئی تھی۔ اِس عرصے میں کچھ تو گزشتہ تین مہینوں کی شدید ترین مصروفیت کی تکان اُتری ـــ اور کچھ الحمد للہ کہ 'استحکامِ پاکستان' کے تین ابواب ضبطِ تحریر میں آ گئے! ـــ جن میں سے ایک جمعہ ۱۷؍ جنوری کے 'جنگ' میں شائع ہو چکا ہے، دوسرا اِن شاء اللہ کل ۲۴؍ جنوری کو شائع ہو جائے گا اور تیسرا دو اقساط میں آئندہ شائع ہوگا! ـــ!!

اب ۲۶؍ کو کراچی اور حیدر آباد کے پانچ روزہ دورے کے لیے روانہ ہونا ہے۔ پھر ۲؍ فروری کو پشاور اور ۳؍ کو اسلام آباد کا پروگرام ہے ـــ لیکن تحت الشعور میں سخت تشویش ہے کہ محاورے کے مطابق "جمعہ جمعہ آٹھ دن" ہوتے ہیں، لیکن مجھے آج کل ایسے لگ رہا ہے کہ جیسے روز ہی جمعہ آ جاتا ہے اور اگلی قسط کی تلوار سر پر لٹکنی شروع ہو جاتی ہے ـــ بہرحال سہارا اسی بات کا ہے کہ اب تک یہ سارا کام اُسی نے کرایا ہے ـــ آئندہ بھی وہی کرائے گا!

بیرونی دوروں میں سے سفرِ ہند کی روداد عزیزم عاکف سعید لکھ ہی رہے ہیں، ابوظہبی کی روداد اِن شاء اللہ رفیقِ مکرم جمیل الرحمٰن صاحب لکھیں گے، لہٰذا اِس کے ضمن میں بھی کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں! سوائے اپنے اِس تاثر کے کہ ابوظہبی میں مجھے ایک نہایت خوشگوار حیرت کا سامنا ہُوا ـ اِس لیے کہ میرے آج تک کے بیرونِ پاکستان کے تمام دوروں کے دوران جن کا آغاز ۱۹۷۹ء کے سفرِ امریکہ سے ہُوا تھا آج تک کہیں کوئی پروگرام اس قدر بھرپور، اتنا پیشگی مرتب شدہ (PRE-PLANNED) اتنا منظم (WELL-ORGANISED) اتنی خوبصورتی اور باقاعدگی کے ساتھ چلایا جانے والا (WELL-CONDUCTED) اور اِن سب باتوں کے نتیجے میں اتنا کامیاب اور نتیجہ خیز ـــ (PRODUCTIVE) نہیں رہا جتنا ابوظبی کا یہ دس روزہ پروگرام! (اِس کے آس پاس اگر کوئی پروگرام آتا ہے تو وہ صرف ۱۹۸۵ء کا ٹورنٹو (کینیڈا) کا پروگرام تھا۔ لیکن وہ بھی بہرحال نمبر ۲ پر ہے!) اِس کی وجہ چند نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہمارے موجودہ معیارات کے اعتبار سے 'طبقۂ اعلیٰ' سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی 'اجتماعی محنت' (TEAM WORK) ہے، ـــ اللہ تعالیٰ اُن کی اِس محنت کو حسنِ قبول سے سرفراز فرمائے! آمین یا ربّ العٰلمین!

حُسنِ اتفاق سے میرا مفصل "تذکرہ و تبصرہ" بھی ستمبر ۸۵ء کی اشاعت کے بعد اب شائع ہو رہا ہے اور عزیز مکرم مولانا سعید الرحمٰن علوی صاحب کے "دل انگندیم" کا آغاز بھی ستمبر ۸۵ء سے ہُوا تھا اور پیشِ نظر شمارے میں اس کی تکمیل ہو رہی ہے!

اِس عرصہ میں اُن کی جو طویل تحریر پانچ اقساط میں 'میثاق' میں شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ جو دوسرے مضامین 'میثاق' اور 'حکمتِ قرآن' میں شائع ہوئے —— اور اُن پر مستزاد اُن کی بعض دوسری تحریریں جو ملک کے دوسرے جرائد میں شائع ہوئیں اُن سب کے ضمن میں کچھ سوالات، کچھ اعتراضات کچھ تنقیدیں اور کچھ تردیدیں راقم الحروف تک تحریراً یا زبانی پہنچتی رہیں۔ —— ان سب کے جواب میں راقم نے مسلسل چھ ماہ تحریراً تو مکمل سکوت اختیار کیے رکھا اور زبانی صرف یہ عرض کرنے پر اکتفا کی کہ نہ یہ لازم ہے کہ وہ میری صد فی صد باتوں سے متفق ہوں، نہ ہی یہ ضروری ہے کہ مجھے اُن کے جملہ خیالات و آراء سے کامل اتفاق ہو۔ اِس وقت اِس مسئلے پر کچھ وضاحتیں پیش کرنے کے ارادے سے خود اپنی اگست ۸۵ء کی تحریر (شائع شدہ 'میثاق' ستمبر ۸۵ء) پر نظر ڈالی تو بے اختیار قلب کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کے شکر کے جذبات و احساسات اُبھرے کہ اُس نے راقم کے قلم سے اُسی وقت نہایت جامع بات نکلوا دی تھی۔ کاش کہ تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن میں شامل میرے جملہ رفقاء و احباب، اور میرے اور تنظیم کے ناقدین و معترضین کے علاوہ دین کے جملہ خادمین و مخلصین ان گذارشات پر کماحقہٗ توجہ فرمائیں، طوالت کے خوف کے باوصف یہ طویل اقتباس فوری مراجعت کے لیے حاضر ہے:

> سعید الرحمٰن علوی صاحب کے معاملے کو راقم نے خصوصی اہمیت اس لئے دی ہے کہ تعلیمی، دینی اور سیاسی پس منظر کے اعتبار سے میرے اور اُن کے مابین بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف جانب اسکول و کالج کی تعلیم اور دُوسری جانب حفظِ قرآن اور درسِ نظامی کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی کہاں اوّلاً تحریکِ پاکستان اور ثانیاً جماعتِ اسلامی سے ذہنی اور قلبی بلکہ فعال عملی تعلق اور کہاں ابتداءً مجلسِ احرارِ اسلام اور بعد ازاں جمعیت علماء اسلام سے والہانہ وابستگی —— اسی طرح کہاں اُن کا بقول خود "متعصب حنفی" ہونے کا معاملہ اور کہاں راقم کا یہ موقف کہ نہ وہ سکہ بند حنفی ہے نہ عرفِ عام کے مطابق اہلحدیث بلکہ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی مسلک ولی اللّٰہی سے منسلک ہے! گویا اسے ہر اعتبار سے اجتماعِ ضدین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن راقم کے نزدیک یہ ایک نہایت نیک فال اور اعلیٰ مثال ہے جو لِلّٰہ شاء اللہ العزیز "قرانُ السعدین" کی تمہید بنے گی۔ اس لئے کہ اگر احیاء و اقامتِ دین کے بلند و بالا اور اعلیٰ و ارفع نصب العین کے لئے مختلف فقہی مسالک اور رُوحانی سلاسل سے منسلک اور ماضی کی شخصیات اور تحریکات کے

جن میں کسی قدر مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے لوگ اُس شان کے ساتھ جمع ہوں جس کا نقشہ قرآنِ حکیم کے حسبِ ذیل الفاظ میں سامنے آتا ہے :-

"تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ"

تو امید کی جا سکتی ہے کہ مختلف مسالک اور مکتبہ ہائے فکر و نظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مابین فاصلوں میں کمی آئے گی اور ذہنی و قلبی قرب پیدا ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں اجنبیت کے حجابات اور فکری و جذباتی بُعد اور "من دیگرم تو دیگری" کی کیفیت کے تشویشناک اور مایوس کن حد تک بڑھ جانے کا اصل سبب یہ ہے کہ ہر گروہ اور ہر طبقہ "اپنے ہی حُسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں" کے مصداق اپنے ہی حلقے کے بزرگوں کی محبت و عقیدت سے سرشار، اپنے ہی مسلک کی مطبوعات و جرائد کے پڑھنے پڑھانے اور اپنے ہی مخصوص فکر کے تانے بانے میں ایسا گم رہتا ہے کہ دوسروں سے تعارف اور واقفیت کی نوبت ہی کبھی نہیں آتی۔ نتیجۃً "كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ" کی کیفیت کی شدت اور اس کی گہرائی و گیرائی ہی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے! اسی صورتِ حال میں تبدیلی کی ایک کوشش تھی جو راقم الحروف گذشتہ تیرہ سالوں سے کرتا چلا آرہا ہے یعنی قرآن کانفرنسوں اور قرآنی محاضرات کے پلیٹ فارم پر مختلف مسالک اور مکاتبِ فکر کے اصحابِ علم و فضل کو جمع کیا جائے تاکہ ذہنی اور قلبی فاصلے کم ہوں اور ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے اور سننے کے مواقع میسر ہوں ——— اور راقم کو اللہ کے اُس خصوصی فضل و کرم سے امید واثق ہے جو اس کے اس حقیر اور عاجز و ناتواں بندے کے شاملِ حال ہے کہ ان شاء اللہ العزیز اس کی قائم کردہ تنظیم کے ذریعے مختلف ذہنی و فکری پس منظر کے حامل، مختلف مسالکِ فقہیہ سے وابستہ اور ماضی کی مختلف سیاسی تنظیموں اور تحریکوں سے تعلق رکھنے والے لیکن دین کا درد رکھنے اور اُس کی غربت پر کڑھنے والے اور اُس کی نصرت و اقامت کے لئے تن من دھن لگا دینے کا عزم رکھنے والے لوگ ایک مضبوط تنظیمی سلسلے اور محکم جماعتی رشتے کے "بنیانِ مرصوص" میں منسلک ہو کر "حزبُ اللہ" کی صورت اختیار کر لیں گے! وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ!!

یہاں ضمنی طور پر یہ بھی وضاحت ہو جائے تو مناسب ہے کہ اس کا امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس صورت میں کہ تنظیم کی اساس شخصی بیعت پر ہو نہ کہ کسی دستوری یا جمہوری ڈھانچے پر ——— اس لئے کہ موخر الذکر صورت میں تنظیمی فیصلوں اور مناصب کی تفویض کے جملہ معاملات "ووٹوں کی گنتی" کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں لہٰذا منطقی طور پر لازمی ہے کہ "ووٹ" کا حق صرف اُن لوگوں کے پاس ہو جن کے کسی خاص مکتبۂ فکر اور نقطۂ نظر سے کامل ہم آہنگی اور اصول اور

کلیات ہی نہیں فروعات اور جزئیات تک کے بارے میں ذہن و مزاج کے ایک مخصوص رُخ پہ ڈھل چکنے اور ایک خاص رنگ میں رنگے جانے کے بارے میں پورا اطمینان حاصل کرلیا گیا ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فکر و نظر میں کسی وسعت کے پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا بلکہ اُس خاص ذہن و مزاج ہی کے پختہ سے پختہ تر اور شدید سے شدید تر ہونے کا عمل جاری رہتا ہے جس سے لامحالہ تنگ نظری، گروہ پرستی اور تحزب و تعصب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے ——— جبکہ شخصی بیعت کی بنیاد پر قائم ہونے والی تنظیم میں باہمی مشاورت کی فضا تو بتمام و کمال برقرار رہتی ہے یا رہ سکتی ہے لیکن فیصلوں کا دارومدار بجائے "بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!" اور بجائے "کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید!" کے مصداق ووٹوں کی گنتی پر نہیں بلکہ 'صاحبِ امر' کی صوابدید پر ہوتا ہے! بنا بریں مختلفُ المزاج، مختلفُ المسلک، مختلفُ المشرب اور مختلفُ الرائے لوگوں کے جمع ہونے میں قطعاً کوئی قباحت نہیں ہے! ——— اس لئے کہ یہاں تنظیم میں شمولیت کا فیصلہ صرف اس ایک امر پر مبنی ہوتا ہے کہ آیا کسی کو ایک شخصِ معیّن کے افکار و نظریات سے بحیثیت مجموعی اتفاق اور اُس کے خلوص و اخلاص پر فی الجملہ اعتماد ہے یا نہیں! اگر ہے تو اس سے بیعتِ جہاد و سمع و طاعت فی المعروف کے رشتے میں منسلک ہو جائے۔ پھر "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا" کے مطابق کھلے کانوں اور کھلی آنکھوں کے ساتھ اور عقل و فہم کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اُس کا ساتھ دے۔ کوئی غلطی نظر آئے تو تنقید کرے، غلط روی نظر آئیں تو پیشگی متنبہ کرے، کسی معاملے میں رائے کا اختلاف ہو تو برملا اظہار کرے اور اس میں کسی کی شخصی عقیدت، یا اُس کے ذاتی رُعب یا ملامت کے خوف کو آڑے نہ آنے دے لیکن جب تک وہ "بحیثیت مجموعی اتفاق" اور "فی الجملہ اعتماد" کی کیفیت برقرار رہے 'اطاعت فی المعروف' کے دائرے سے باہر نہ نکلے ——— البتہ جب اُن دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی برقرار نہ رہے تو بیعت فسخ کرنے کا اعلان کرے اور علیحدگی اختیار کرلے ——! اور "هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ" کی قسم کے قضیئے کھڑے کر کے نہ اپنا وقت ضائع کرے نہ دوسروں کا!

اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ اُس حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ و السّلام کے الفاظ مبارکہ کی عظمت، جامعیت، ہیبت و جلالت اور محکمیت و شدیدیت کا جو انکشاف راقم الحروف کے شعور و ادراک پر ہوا ہے اور جو نقش اُس کے قلب پر قائم ہوا ہے اُسے بیان سے وہ از بس قاصر ہے اس لئے کہ اس ایک مختصر حدیث میں 'اسلامی انقلابی پارٹی' یا "حزب اللہ" کا پورا

دستور موجود ہے یہ حدیث بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے جس میں انہوں نے بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے الفاظ نقل فرمائے ہیں (حدیث میں الفاظ کی نسبت حضرت عبادہ ابن صامتؓ کی جانب ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تلقین خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمائی ہوگی!)

"بایعنا رسول اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسرِ والیسرِ وَالمنشطِ والمکرہ وعلیٰ اثرۃ علینا وَعلیٰ ان لا ننازع الامرَ اھلہٗ وعلیٰ ان نقول بالحق اینما کُنّا لانخاف فی اللہ لومۃ لائم"

(ترجمہ:- "ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی کہ آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور اسکی اطاعت کریں گے خواہ ہم پر تنگی ہو خواہ آسانی - اور خواہ ہمارے دل آمادہ ہوں خواہ اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے اور خواہ دوسروں کو (مناصب اور ذمہ داریوں وغیرہ کی تفویض میں) ہم پر ترجیح دی جائے اور یہ کہ ہم امراء سے نظم کے معاملے میں رسّہ کشی نہیں کریں گے — البتہ ہم حق بات ضرور کہیں گے خواہ کہیں بھی موقع پیش آئے اور اللہ (اور اس کے دین) کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔)

اس وقت ظاہر ہے کہ راقم کو نہ 'بیعت' کے مسئلے پر مفصل گفتگو کرنی ہے نہ خود اس حدیث کی تفصیلی تشریح بلکہ یہ بات صرف برسبیل تذکرہ قلم پر آ گئی کہ یہی وہ واحد نظام ہے جس میں 'بحمد ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!' کی کیفیت کے حامل لوگ جمع ہو سکتے ہیں اور راقم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے اس کی اس جانب رہنمائی فرمائی اور ایک سُنّت کو زندہ کرنے کی سعادت بخشی' — اور وہ اپنے اس صدمہ اور رنج و غم کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہاں ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کا حال یہ ہے کہ ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر | تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض | اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے

— وہاں 'حامیانِ دین' اور 'خادمانِ شرعِ متین' کی بھی اکثریت کا یہ حال ہے کہ اپنی اپنی تنظیموں اور جماعتوں کو اس 'بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف' کی اساس پر استوار کرنے کی بجائے مغرب سے درآمد شدہ طریقوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں چنانچہ تشتت وانتشار اور تفریق در تقسیم کا جو عمل عام غیر مذہبی سیاسی جماعتوں میں نظر آتا ہے بعینہٖ وہی ان کے یہاں بھی موجود ہے - فاعتبروا یا اولی الابصار!! -

اس اصولی وضاحت کے ساتھ، ___ اور سردست بہت سے معاملات پر تفصیلی گفتگو سے معذرت کے ساتھ ___ راقم چند ضمنی وضاحتیں پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہے:

(۱) گذشتہ سال کے محاضراتِ قرآنی کے ضمن میں محترم مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے بارے میں میرے بعض الفاظ سے بھی محض میرے عجزِ بیان کی بنا پر مولانا کو سوءِ ظن لاحق ہو گیا تھا اور علوی صاحب کے قلم نے تو واقعتہً ان کے تذکرے میں رواروی میں کچھ نامناسب انداز اختیار کر لیا تھا۔ جس پر مولانا کا ایک بہت تند و تلخ خط موصول ہوا تھا اس کے جواب میں میں نے اپنے الفاظ کی بھی تاویل پیش کی اور مولانا کو ان کے اندازِ تحریر کی جانب بھی توجہ دلائی تو الحمد للہ کہ انہوں نے میری تاویل کو بھی قبول فرما لیا اور اپنی غلطی کو بھی تسلیم کر لیا۔ البتہ علوی صاحب کے بارے میں اپنا احتجاج برقرار رکھا جس کے ضمن میں ایک ملاقات میں میں نے ان سے علوی صاحب کی جانب سے معذرت کر لی تھی لیکن چونکہ اس کے بعد قلم میرے ہاتھ میں آیا ہی نہیں لہٰذا "علیٰ رؤس الاشہاد" اعتراف و اعتذار کی نوبت نہ آسکی۔ آج پہلی بار تذکرہ و تبصرہ رقم کر رہا ہوں تو یہ قرض مزید معذرت کے 'سود' کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔

اس اثنا میں علوی صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے ناقدین پر برہمی کے اظہار کے ضمن میں بعض دوسری شخصیات کے ساتھ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم و مغفور کو بھی لپیٹ میں لے لیا اور اُن کے ضمن میں بھی اُن کے اندازِ تحریر میں وہی رنگ آگیا ___ ادھر شیخ جمیل الرحمٰن کے قلم سے بعض مذہبی جرائد کے راقم الحروف اور تنظیم اسلامی کے ساتھ معاندانہ رویے پر کچھ دردمندانہ الفاظ نکل گئے۔ اُن کو بنیاد بنا کر مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے پھر ایک عتاب نامہ شیخ صاحب کے نام لکھا ہے جو پہلے خط کے مقابلے میں تو اگرچہ بہت نرم ہے تاہم پھر بھی اُن کی عمر اور علمی مرتبے کے شایانِ شان نہیں ہے اور اگرچہ انہوں نے نہایت تحدیانہ انداز میں اس کی اشاعت کا مطالبہ کیا ہے تاہم راقم الحروف اس معاملے میں بھی فی الحال علی الاعلان معذرت پر اکتفا کرنے ہی کو مناسب سمجھتا ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ: (۱) اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم حضرت شیخ الہند رحمہ کے نہایت قریبی اور حد درجہ معتمد علیہ ساتھی تھے تاہم ان کے آخری دَور کے نظریات کے ضمن میں متضاد روایات کی بنا پر مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ نہایت لطیف انداز میں بعض باتیں مولانا حسین احمد مدنی رحمہ سے بھی منقول ہیں اور مجھ تک ایک خالص ذاتی اور نہایت قریبی روایت مولانا احمد علی لاہوری کی بھی پہنچی ہے لیکن خود راقم تاحال اس ضمن میں نہ کوئی حتمی رائے قائم کر سکا ہے اور نہ ہی اس نے

س کی کوئی شدید ضرورت محسوس کی ہے، اِس لیے کہ اب مولانا سندھی تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ، کے زمرے میں شامل ہو چکے ہیں، ہمیں اب مل فکر اپنی، اور حال، کی کرنی چاہیئے۔ تاہم اِس ضمن میں علمی تحقیق اور سنجیدہ گفتگو میں قطعاً کوئی نع نہیں ہے! ــــ (۱) مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی زیارت ان گنہگار آنکھوں نے بھی کی ہے۔ ور راقم اپنے امکانی علم کی حد تک نہ صرف اُن کے پیکرِ خلوص و اخلاص اور مجسمۂ تقویٰ و للّٰہیت ہونے ی گواہی دیتا ہے بلکہ اُن کے معدود بہ معتدل مزاج ہونے کا بھی دل سے معترف ہے۔ خصوصاً ان کا یہ طرزِ عمل کہ مولانا مودودی مرحوم سے بعض معاملات میں شدید اختلاف کے باوصف اقامتِ دین ی جدّوجہد میں آخر دم تک اُن کے رفیق کار رہے اور اپنی شدید ترین علالت کے باوجود انہوں نے پنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا ایک ایک قطرہ خدمتِ دین کے لیے نچوڑ دیا! ہم ایسے لوگوں کے لیے بہت ہی رشک آور، جذبہ پرور اور ولولہ انگیز ہے! ــــ واضح رہے کہ مولانا 'وہابی' مزاج کے انسان تھے اور اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ مولانا مودودی مرحوم سے کسی اندھی عقیدت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہوں) ــــ بلکہ مولانا پر اُن کی بعض ذاتی نوعیت کی شدید تنقیدیں بھی راقم کے علم میں ہیں، اِس کے باوجود اگر وہ آخری سانس تک جماعتِ اسلامی میں رہے تو یہ صرف اور صرف 'احساسِ فرض' کی اساس پر تھا! ویسے یہ واضح رہے کہ اُن کا انتقال ۱۹۵۷ء کے ہنگامۂ ماچھی گوٹھ سے قبل ہو گیا تھا ورنہ اُس مرحلے پر وہ بھی لازماً جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہوتے، واللہ اعلم!!

بہرحال اِن گذارشات کے ساتھ مولانا عبدالغفار حسن صاحب کی خدمت میں راقم کی درخواست یہ ہے کہ وہ اپنے خط کی اشاعت پر اصرار نہ فرمائیں ورنہ اُس کی اشاعت کے بعد اُس کا لفظ بہ لفظ جواب بھی لازمی ہو جائے گا اور چونکہ اس معاملے میں اصل فریق مولانا علوی ہیں لہٰذا جواب کا حق بھی اُن ہی کو حاصل ہوگا ــــ اور اس طرح خواہ مخواہ ایک لمبی بحث چھڑ جائے گی!

(۲) اِسی طرح خدمتِ دین کے میدان کے نمایاں رجالِ کار اور اصحابِ دعوت و عزیمت کی جو فہرست علوی صاحب نے مرتب فرمائی ہے (جس کا ایک تکملہ بھی اُن کے مضمون کی آخری قسط کے ساتھ اس پرچے میں شائع ہو رہا ہے) اُس میں مولانا مودودی مرحوم کے نام کے نمایاں طور پر غائب ہونے پر بھی خاصی چہ میگوئی بلکہ لے دے ہوئی ہے۔ چنانچہ تنظیم اسلامی کے ایک رفیق عبدالوہاب صاحب نے تو ایک نہایت مفصّل اور خلوص و اخلاص سے مملو خط میرے نام لکھا۔ وہ میں نے علوی صاحب کو پڑھوایا تو

انہوں نے بھی ایک نہایت مفصل اور دو ٹوک خط جواباً تحریر فرما دیا۔ یہ دونوں خطوط دلچسپ ہیں — آج کل 'استحکامِ پاکستان' کی سلسلہ وار اشاعت کی بنا پر 'میثاق' کا دامن تنگ پڑ گیا ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ کبھی یہ دونوں خطوط قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کر دیئے جائیں گے۔

راقم کو اس کا شدت کے ساتھ احساس ہے کہ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے ساتھ اپنے تعلق اور اُن کے بارے میں اپنی آخری اور حتمی رائے کو جچے تلے الفاظ میں وضاحت کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لے آنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اسی خیال سے راقم نے چند سال قبل 'مولانا مودودی اور میں' کے عنوان سے ایک مضمون لکھنا شروع بھی کیا تھا لیکن اُس کی صرف ابتدائی اقساط ہی سپردِ قلم ہو سکیں تھیں۔ بہرحال "کُلُّ اَمرٍ مُستَقِر" کے مطابق مناسب تفصیل کے ساتھ تو یہ کام اپنے وقتِ متعین پر ہی ہو گا۔ سرِدست صرف اس قدر عرض ہے کہ مولانا مودودی سے شدید ترین نوعیت کے اختلافات کے باوجود، جن کا تعلق علمی اور نظریاتی سطح سے بھی ہے اور عمل اور پالیسی کی سطح سے بھی، راقم الحروف کے نزدیک چودہویں صدی ہجری کے 'داعیانِ اسلام' اور 'خادمانِ کتابِ مبین و دینِ متین' کی فہرست میں اُن کا نام بھی نمایاں مرتبہ و مقام کا حامل ہے! — اور خود راقم الحروف تو اُن کا صد درجہ ممنونِ احسان ہے کہ جہاں اُسے بچپن ہی میں 'جذبۂ ملی' سے سرشار کرنے والے اصلاً علامہ اقبال مرحوم اور ثانوی درجے میں حفیظ جالندھری مرحوم تھے وہاں عنفوانِ شباب میں دین اور خدمتِ دین کی جانب عملاً کھینچنے والے ہیں مولانا مودودی مرحوم و مغفور! اگر میں اُن کی تحریروں کے ذریعے اسلام کے حرکی تصور سے 'متعارف' نہ ہو جاتا تو نہ مولانا اصلاحی صاحب سے واقف ہو سکتا نہ مولانا فراہی سے، اور نہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے حواشی پڑھنے کی نوبت آتی نہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے تعارف حاصل ہوتا! لہٰذا مولانا مودودی کے بعض علمی نظریات (بالخصوص 'خلافت و ملوکیت' نامی تصنیف) اور اُن کے بعض عملی اقدامات پر گہرے حسرت بھرے تاسف کے باوصف میرے دل میں ذاتی طور پر مولانا مودودی کا بھی اتنا ہی ادب و احترام ہے جتنا اپنے والدِ مرحوم کا! اللہ تعالیٰ اُن دونوں کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے! آمین۔

جب معذرتوں کا دفتر کھل ہی گیا ہے تو ایک قرض اور ہے، لگے ہاتھوں اس سے بھی سبکدوشی ہو جائے تو اچھا ہے۔

راقم نے کسی موقع پر علماء کرام کے بارے میں اپنے رویّے کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت

مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا تھا کہ سردار محمد اجمل خان صاحب لغاری کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ لاہور تشریف لائے، اُس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ انہوں نے خاص میری ملاقات کے لیے ہی یہ پورا شدِ رحال فرمایا تھا۔ اور فی الواقع اُس وقت اسی انداز سے یہ بات میرے علم میں آئی تھی۔ بعد میں سردار صاحب نے اپنے ایک خط میں ایک تو اس کی تصحیح فرمائی تھی کہ اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے کسی پروگرام سے اسلام آباد جانے والے تھے، میرے کہنے پر انہوں نے لاہور میں مختصر قیام اسی مقصد سے کر لیا تھا۔ دوسرے کوئی معاملہ اُس وقت کی گفتگو کے بارے میں بھی تھا۔ اس پر میں نے انہیں تحریر کیا تھا کہ آپ پوری بات تحریر فرما کر ارسال فرمادیں۔ میں 'میثاق' میں شائع کر دوں گا — لیکن جب ۶ اور ۷ دسمبر ۱۹۸۵ء کی درمیانی شب میں نے اُن کے یہاں گذاری تو انہوں نے فرمایا کہ تم خود ہی وضاحت کر دو، اب جیسے کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اس کے بعد میرے ہاتھ میں قلم اب ہی آیا ہے۔ لہٰذا تاخیر کی مزید معذرت کے ساتھ مقصدِ سفر کے ضمن میں وضاحت تو حاضر ہے۔ رہی گفتگو کی تفصیل تو وہ میری یادداشت میں محفوظ نہیں رہی۔ سردار صاحب یا حضرت مفتی صاحب اگر ضروری خیال فرمائیں تو اُن سے درخواست ہے کہ خود تحریر فرمادیں، 'میثاق' میں ان شاء اللہ اُن کی تحریر من و عن شائع ہو جائے گی!

جب ۳ جنوری ۱۹۸۶ء کو راقم الحروف بفضلہٖ تعالیٰ اپنی سب سے چھوٹی بچی کے عقدِ نکاح کی ذمہ داری سے بااحسن وجوہ سبکدوش ہو گیا۔ اس کی جو رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی وہ ۴ جنوری کے روزنامہ 'امروز' لاہور کے حوالے سے ہدیۂ قارئین ہے:

"ڈاکٹر اسرار احمد کی صاحبزادی کی شادی
بچی کو بغیر جہیز مسجد ہی سے رخصت کر دیا گیا

لاہور ۳ جنوری۔ معروف دینی مفکر، بانی صدر انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے آج جامع مسجد دارالسلام باغِ جناح لاہور میں نمازِ جمعہ کے فوراً بعد اپنی پانچویں اور سب سے چھوٹی بچی آنسہ عفت الہادی کا نکاح اشفاق احمد کے ساتھ پڑھایا۔ اور مسجد ہی سے بچشمِ تر رخصت کر دیا۔ بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب —

—— بچی کو ایک دھیلے کا جہیز" نہیں دیا گیا لیکن امت الہادی اپنے والدین، تایا، چچا، ماموں، بڑی بہنوں، بڑے اور چھوٹے بھائیوں اور ڈاکٹر صاحب کے ہزار ہا معتقدوں اور عقیدتمندوں کی دعاؤں اور مستقبل کے لیے نیک تمناؤں کا انمول تحفہ لے کر سسرال سدھار گئیں۔ یہ شادی اس اعتبار سے منفرد تھی کہ نہ ڈاکٹر اسرار احمد کی رہائش گاہ پر شادی بیاہ کی کوئی گہما گہمی نظر آئی، نہ لڑکی دلہن بننے کے لیے بیوٹی پارلر گئی، نہ شہنائی بجی، نہ ڈھول ڈھمکے اور نہ باجے گاجے کے ساتھ بارات کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ دولہا، ان کے والد، اعزاء و اقرباء اور ان کے دوست اور احباب خطبۂ جمعہ سے قبل دوسرے نمازیوں کی طرح مسجد میں داخل ہوئے اور جسے جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ حسبِ اعلان ڈاکٹر صاحب نے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے سورۃ الحجرات کا درس شروع کیا اور ساڑھے بارہ بجے جمعہ کی پہلی اذان ہوئی۔ جس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیا۔ اس تبصرے کے اختتام سے قبل ڈاکٹر اسرار احمد نے سامعین کو گزشتہ جمعہ کا اعلان یاد دلایا اور کہا کہ آج نمازِ جمعہ کے بعد میری پانچویں اور سب سے چھوٹی بچی کا نکاح ہوگا آپ حضرات اس میں شرکت فرمائیں"۔ الحمد للہ کہ میرے داماد اشتیاق احمد، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تو تھے ہی اب قرآن اکیڈمی کے دو سالہ کورس میں بھی شریک ہیں، —— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نہایت پختہ دینی مزاج رکھتے ہیں۔ جملہ رفقاء و احباب اور قارئینِ 'میثاق' سے استدعا ہے کہ اُن کے اور میری بچی کے لیے "فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً" کی دعا فرمائیں!

اِس عقدِ نکاح کے موقع پر خطبۂ نکاح کے ضمن میں راقم نے جہاں معمول کے مطابق شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں اصلاح کی اہمیت پر گفتگو کی وہاں پورے مجمع کو گواہ بنا کر اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کا اعتراف و اعلان اور اس پر اپنے شکر و امتنان کا اظہار کیا کہ میں نے آج سے لگ بھگ بارہ برس قبل ارضِ لاہور میں جس اصلاحی تحریک کا آغاز کیا تھا اُس کا جو اُخروی اجر و ثواب اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا (ان شاء اللہ) وہ تو اصل مطلوب و مقصود ہے ہی اُس کے علاوہ اِس دنیا میں بھی مجھے اُس کی نقد اُجرت، اِس طرح مل گئی ہے کہ اپنی پانچ بچیوں کی شادی سے میں جس سہولت اور آرام کے ساتھ فارغ ہوا ہوں اُس کا بحالاتِ موجودہ

کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا! اس سہولت کے لیے میرے ذہن میں بے اختیار جو مثال آئی ہے وہ وہ ہے جو ایک حدیثِ نبویؐ میں بندۂ مومن کی رُوح کے جسدِ خاکی سے علیحدگی کے لیے وارد ہوئی ہے یعنی ایسے جیسے کسی مشکیزے کے بند منہ سے پانی کا ایک قطرہ ٹپک جائے، اللہ تعالیٰ کے اس انعام و احسان کے اعتراف اور اس پر تشکّر و امتنان پر میں جملہ قارئینِ 'میثاق' کو بھی گواہ بناتا ہوں!! وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا -!!

اس ضمن میں راقم کا ارادہ ہے کہ ایک مفصل مضمون تحریر کرے جس سے ایک جانب " وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" کا حق پورے طور پر ادا ہو سکے — اور دوسری طرف دوسروں کا بھی حوصلہ بڑھے اور " فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى " اور " فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ " کے عملی مظاہر کے ذکر سے ایمان و یقین اور اللہ تعالیٰ پر توکّل و اعتماد میں اضافہ ہو! — لیکن یہ ارادہ کب پورا ہو سکے گا یہ صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔

اس 'اصلاحی تحریک' کے ضمن میں محترم مفتی جمیل احمد تھانوی نے جو مخالفانہ مہم شروع کی ہوئی ہے اس پر کسی صاحب کا ایک مضمون " حساس " کے قلمی نام سے ہفت روزہ 'حرمت' راولپنڈی میں شائع ہوا تھا جو 'میثاق' میں بھی نقل کر دیا گیا۔ اس میں صاحبِ مضمون کے قلم سے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شان میں ایک نامناسب جملہ نکل گیا تھا اس پر ایک مفصل مضمون مولانا شمس الحسن تھانوی خطیب جامع مسجد خضراء کراچی کا موصول ہوا۔ مولانا موصوف ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں اور غالباً 'میثاق' التزاماً دیکھتے ہیں اس لیے کہ اس سے قبل بھی ہمیں اُن کی جانب سے متعدد مواقع پر مفید مشورے ملتے رہے ہیں۔ اس بار راقم کو افسوس ہوا کہ مولانا نے مضمون کے ساتھ جو رقعہ ارسال فرمایا اُس میں درج تھا کہ اگر یہ مضمون 'میثاق' میں شائع نہ ہو سکتا ہو تو واپس کر دیا جائے جس کے لیے ایک لفافہ جس پر ڈاک کے ٹکٹ چسپاں تھے مضمون کے ساتھ ملفوف تھا۔ اس میں راقم کو کسی قدر خفگی اور سُوءِ ظن کی جھلک نظر آئی، بہرحال راقم نے اُسی وقت طے کر لیا تھا کہ کراچی تو آنا جانا ہوتا ہی رہتا ہے مولانا کی خدمت میں خود حاضر ہو کر نیاز بھی حاصل کروں گا — اور وہ لفافہ بھی خود واپس کروں گا — اللہ کا شکر ہے کہ اس کا موقع گزشتہ سفرِ کراچی کے موقع پر مل گیا۔ راقم نے مولانا سے 'شکوہ' بھی کیا، اُن کا مرسلہ لفافہ بھی واپس کیا، مضمون کی اشاعت کا وعدہ بھی کیا — اور ایک بات مزید یہ عرض کی کہ "حضرت! آپ نے مولانا تھانوی رحؒ کی سیرت و شخصیت پر نہایت شاندار تحریر بھی عطا فرمادی، اور معترض کے جواب کا حق بھی ادا فرما دیا — لیکن اصل مسئلہ یعنی شادی بیاہ کی تقریبات کی اصلاح

کے ضمن میں میری گزارش اور اس کے ضمن میں مفتی جمیل احمد صاحب کی جرح و تنقید کے بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں فرمائی، حالانکہ یہ تو دراصل آپ حضرات ہی کے گھر کی چیز ہے! اس لیے کہ ــــ 'اصلاح الرسوم' تو حضرت تھانوی رح کا خاص موضوع تھا! " اس پر مولانا نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد ایک نہایت جامع اور معنی خیز جملہ ارشاد فرمایا جو میں فی الحال نقل نہیں کر رہا اور وعدہ فرمایا کہ اچھا! میں اس موضوع پر لکھوں گا!" ــــ

مولانا کا متذکرہ مضمون ــــ میرے لیے بہت حیرت ناک ہے اس لیے کہ اس میں جس قدر صاف اور ستھری زبان اور انشاء کا نہایت منجھا ہوا اسلوب استعمال ہوا ہے وہ اکثر لوگوں کو طویل مشق کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا جبکہ مولانا کے بارے میں راقم کے علم میں بالکل نہیں ہے کہ اُن کا تحریر سے زیادہ شغف یا شغل ہے! اس کے علاوہ حضرت مولانا تھانوی رح کا جو کامیاب دفاع مولانا نے فرمایا ہے وہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مَیں نے مولانا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مضمون فروری کے 'میثاق' میں شائع ہو جائے گا۔ اور اس کے لیے اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی لیکن عین وقت پر 'تنگیٔ داماں' کی بنا پر اُسے روکنا پڑا۔ اس پر راقم مولانا سے معذرت خواہ ہے، ان شاء اللہ آئندہ ماہ یہ ضرور شائع ہو جائے گا، ــــ اللہ سے دعا اور مولانا سے استدعا ہے کہ اس دوران میں وہ موعودہ تحریر بھی عطا فرما دیں تو دونوں چیزیں بیک وقت ہدیۂ قارئین کر دی جائیں ــــ (راقم مولانا کا وہ فصیح و بلیغ جملہ اس لیے نقل نہیں کر رہا کہ قارئینِ 'میثاق' کا اشتیاق تفصیلی تحریر کے لیے برقرار رہے۔!!)

" لَا يَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا " ــــ کا حوالہ اِس صدی میں سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ۱۹۱۲ء میں 'الہلال' میں امام مالک رح کے قول کی حیثیت سے دیا تھا۔ مولانا مرحوم کو اس مقولے سے کس درجہ محبت و النیت تھی، اس کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے تقریباً ۱۰ سال بعد نومبر ۱۹۲۱ء میں لاہور میں منعقدہ جمعیت العلماء ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس میں اپنے تحریری خطبۂ صدارت میں پھر اس کا حوالہ دیا (جمعیت العلماء ہند مرتبہ پروین روزینہ صاحبہ جلد اوّل، صفحہ ۱۱۱) اور اس بار بھی اُسے امام مالک رح ہی کے قول کی حیثیت سے نقل کیا ــــ راقم نے بحمداللہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے گزشتہ بیس سال کے دوران اسے بہت عام کیا ہے ــــ اسی دوران میں ایک بار پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور نے فرمایا تھا کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق کا قول ہے چنانچہ

میں نے بعض مواقع پر اس کی یہ نسبت بھی بیان کی، لیکن چونکہ نہ چشتی صاحب ہی اس کا حوالہ دے سکے نہ میں خود تلاش کر پایا لہٰذا میں نے دوبارہ اسے امام مالکؒ ہی کی جانب منسوب کرنا شروع کر دیا ــــ راقم بے حد ممنون و مشکور ہے ادارۂ فیوضاتِ مجددیہ، شیر گڑھ، تحصیل و ضلع مانسہرہ کے جناب شمس مجددی کا کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی تحقیق کا حق ادا کر دیا ــــ بلکہ اس کے جزوِ ثانی کی صورت میں علم و حکمت کا ایک اور گراں بہا موتی بھی عنایت فرما دیا۔ فَجَزَاہُ اللّٰہُ عنّا خیر الجزاء ــــ ہم اُن کے شکریے کے ساتھ اُن کا خط ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں :

اِسی ضمن میں محترم مکتوب نگار نے جس اہم امر کی جانب راقم کی توجہ منعطف کرائی ہے ،
اِس پر اُن کے خصوصی شکریے کے ساتھ عرض ہے کہ بحمد اللہ نہ یہ امر راقم پر مخفی ہے نہ یہ حقیقت کہ خود راقم میں یہ صلاحیتیں مطلوبہ معیار کے کسی ہزارویں درجے میں بھی موجود نہیں ہیں! البتہ اِس سلسلے میں ایک تیسری حقیقت بھی ہے جو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے اور وہ یہ کہ اگرچہ یہ کام بالفعل تو اُسی شخص کے ذریعے ہو گا جس کی نشاندہی جنابِ صدیقِ اکبرؓ نے کی ہے لیکن اِس کے لیے امکانی کوشش ہر صاحبِ ایمان کا فرض ہے ، بالکل ایسے جیسے کسی فردِ واحد کی زندگی میں دعوت و تنظیم، تربیت و تزکیہ اور جہاد و قتال کے جملہ مراحل کا اِس حد تک طے پا جانا کہ اللہ کی زمین کے کسی قطعہ پر اُس تم کا دین بالفعل غالب و قائم ہو جائے، تاریخ میں صرف ایک ہی بار ہوا ہے یعنی سیّد الاوّلین والآخرین اور امام الانبیاء والمرسلین صلّی اللہ علیہ وسلّم فداہ آباؤنا و امہاتنا کے دستِ مبارک سے، تاہم اس کے لیے کوشش اور جد و جہد جملہ انبیاء و رُسل نے کی ــــ لہٰذا اگر آج کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی یہ زعم ہو جائے کہ یہ مہم اس کے ذریعے لازماً سر ہو جائے گی تو یہ بہت بڑا دعویٰ اور سراسر مغالطہ ہو گا رہا خود اِن سطور کا عاجز و ناچیز راقم یا اُس جیسے اور لوگ، تو اگر ہم اِس 'خبط' میں مبتلا ہو جائیں تو اسے خللِ دماغی کے اور کسی چیز سے موسوم نہیں کیا جا سکتا! ہماری تو بڑی سے بڑی آرزو یہ ہو سکتی ہے کہ بقول "کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا" کے مصداق ہمارا شمار اِن لاکھوں کروڑوں ستاروں میں ہو جائے جو خورشید کے طلوع ہونے سے قبل اپنی ہستی کو فنا کر لیتے ہیں! ــــ گویا ہم حضرتِ یحییٰ علیہ السّلام کے الفاظ کے مطابق آنحضورؐ "انّ افضلکم مقدرۃً واملکھم لنفسہ" کے لیے "راستہ صاف کرنے والے" بن جائیں تو یہی عین سعادت ہو گی! رزقنا اللّٰہ ذٰلک!!

افکار و آراء

ایک نہایت اہم خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ فیوضاتِ مجددیہ

خانقاہ فضلیہ شیر گڑھ، تحصیل و ضلع مانسہرہ

محترم جناب ڈاکٹر صاحب : السلام علیکم و رحمۃ اللہ

مدت سے خیال تھا کہ جناب کی توجہ عربی عبارت کے ایک مقولہ "لا یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا" کی طرف مبذول کراؤں، جسے آپ امام مالکؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ آپ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ آپ بغیر کسی دلیل کے ایسی بات کہہ دیں۔ مگر میرا خلجان اس وجہ سے بھی تھا کہ مرشدی حضرت قاضی محمد حمید فضلی دام برکاتہم نے اسی جملہ کو بعینہٖ حضورؐ کی حدیث کے طور پر اپنے کسی مضمون میں تحریر کیا تھا۔ چنانچہ اپنے کتب خانہ میں دستیاب کتابوں میں یہ جملہ حدیث تو نہ ثابت ہو سکا اور نہ ہی ان میں حضرت امام مالکؒ کا مقولہ —— البتہ حضرت امام شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصنیف "طبقات کبریٰ" صفحہ ۱۵ ج ۱ پر حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ترجمہ (سوانحی تذکرہ) میں ان کی طرف یہ الفاظ منسوب ہیں۔

ان ھذا الامر لا یصلح بہ آخرہ الا بما صلح بہ اولہ ولا یحتملہ الا افضلکم مقدرۃ و املکھم لنفسہ :

بالفرض اگر امام مالکؒ کی طرف کسی کتاب میں منسوب آپ کی نظر سے گذرا ہو تو شاید یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کے اتباع و روشنی میں ان کا قول ہو گا۔ جس کی ابتدائی اور بنیادی نسبت حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہونی چاہیئے۔ اس مقولہ کے آخری دو جملے بھی آپ کے غور و فکر کے لئے پیش ہیں۔ تاکہ اصلاحِ امت میں حضرتؓ کی فرمودہ اہلیت —— احتمال اصلاح یعنی اصلاح امت کا بیڑہ بھی وہی اٹھا سکتا ہے —— جو طاقت و مقدرت کے لحاظ سے افضل ہو —— دنیاوی اعتبار سے —— اور روحی و قلبی اعتبار سے املکھم لنفسہ —— یعنی ضبطِ نفس کا حامل ہو اور ساتھ ساتھ اس کی خباثتوں پر بھی کنٹرول کر سکنے کی ہمت رکھتا ہو۔ امید کہ جناب ایک دور افتادہ پسماندہ علاقہ کے ایک بھائی کی سچی بات کو قبول کرنے میں بخل نہ برتیں گے۔

والسلام : شمس مجددی

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

حدیث نبوی "بدأ الاسلام غریبا وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء" کے مصداق کامل

حاجی عبدالواحدؒ کا انتقال

یہ دنیا دارِ فانی ہے اور یہاں جو بھی آیا ہے اُسے جلد یا بدیر یہاں سے جانا ہے، فرق صرف پہلے اور بعد اور آگے اور پیچھے کا ہے۔ چنانچہ زیارتِ قبور کے سلسلے میں ماثورہ الفاظ یہ ہیں :۔ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُوْرِ! يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ أَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْأَثَرِ" — یعنی "اے قبروں والو تم پر سلامتی ہو، اللہ ہماری بھی مغفرت فرمائے اور تمہاری بھی، تم ہم سے پہلے گذر گئے ہو لیکن ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے آ ہی رہے ہیں!" — لیکن ظاہر ہے کہ جبکہ یہاں آنے والے، سوائے رنگ و شکل کے ظاہری و معمولی فرق کے، سب ایک سے ہوتے ہیں جانے والے ایک سے نہیں ہوتے! چنانچہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جاتے ہی 'نَسْيًا مَّنْسِيًّا' ہو جاتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے پیچھے طویل اور تادیر باقی رہنے والی یادیں چھوڑ جاتے ہیں!

ایسی ہی ایک شخصیت ہفتہ ۱۱ر جنوری ۱۹۸۶ء کو دن کے لگ بھگ گیارہ بجے نہایت خاموشی سے دنیا سے رخصت ہو گئی — ہماری مراد حاجی عبدالواحد صاحب سے ہے جو شمسی حساب سے پچاسی برس اور ۲۸ دن اس دارِ فانی میں گذار کر متذکرہ بالا تاریخ کو راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ! اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَأَدْخِلْهُ فِيْ رَحْمَتِكَ وَحَاسِبْهُ حِسَابًا يَّسِيْرًا! آمین یا ربّ العٰلمین

حاجی صاحب چونکہ گذشتہ بیس برس سے بھی زائد عرصہ سے علیل تھے اور ان کی پبلک لائف اب سے تقریباً ربع صدی قبل ختم ہو چکی تھی لہٰذا پاکستان کی نئی نسل تو ان سے واقف ہی نہیں ہے۔ تاہم چونکہ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۰ء تک اُن کا راقم الحروف کے ساتھ بڑا گہرا ربط رہا۔ لہٰذا 'تنظیم اسلامی' کے سینئر لوگ اُن سے خوب واقف ہیں البتہ گذشتہ پانچ سال سے چونکہ معالج

صاحبِ فراش ہو چکے تھے، لہٰذا تنظیم کے بھی اکثر نئے رفقا کو اُن سے واقفیت نہیں ہے۔

راقم الحروف کو اُن کی نمازِ جنازہ پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی تو اُس موقع پر جو چند جملے اُس نے کہے، اُن میں یہ بھی تھا کہ "انسان کا باطن تو اللہ ہی کے حوالے ہے، جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے کم از کم مَیں نے اپنی زندگی میں حاجی صاحب جیسا پابندِ شریعت، انسان کوئی اور نہیں دیکھا!" چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ "مکمل شرعی پردہ" بھی راقم نے زندگی میں پہلی بار حاجی صاحب مرحوم کے یہاں دیکھا! ——— اور وعدہ کی پابندی بھی جتنی راقم نے اُن میں دیکھی اور کہیں نہیں دیکھی!

حاجی صاحب کی زندگی کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اِس صدی کی کوئی قابلِ ذکر دینی و مذہبی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں حاجی صاحب نے حصّہ نہ لیا ہو۔ اگرچہ اکثر و بیشتر تحریکوں اور جماعتوں کے ساتھ معاملہ یہ ہُوا کہ یا وہ حاجی صاحب کی صاف گوئی کو برداشت نہ کر سکیں یا حاجی صاحب کی سیماب وش طبیعت اُن سے تادیر مطمئن نہ رہ سکی اور "ع" کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے!" اور "ع" ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!" کے مصداق خود انہوں نے نئی منزلوں کی جانب رُخ کر لیا!!

حاجی صاحب کے مختصر سوانحِ حیات حسبِ ذیل ہیں: (واضح رہے کہ یہ جملہ واقعات ویسے تو خود مَیں نے بھی حاجی صاحب سے سُنے ہیں لیکن تاریخوں اور سنوں کے لیے مَیں نے اُن کے صاحبزادے حافظ قاسم رضوان کو تکلیف دی تھی۔ چنانچہ ان کی ذمہ داری اُن ہی پر ہے)

- ولادت : ۲۴ دسمبر ۱۹۰۰ء بمقام اجنالہ (ضلع امرتسر)
- ۱۹۱۷ء : گورنمنٹ ہائی سکول کوئٹہ سے (جہاں اُن کے والد مولوی محمد حسن صاحب ہیڈ ماسٹر تھے) میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ جہاں قریب ہی حضرت شیخ الہند کے شاگرد خواجہ عبدالحئی فاروقی رحؒ درسِ قرآن دیا کرتے تھے، یہیں سے دین کی آگ دل میں بھڑکی
- ۱۹۲۰ء : اسلامیہ کالج لاہور کو چھوڑ کر "جامعہ ملّیہ" علی گڑھ میں جا داخلہ لیا جس کا سنگِ بنیاد حضرت شیخ الہندؒ نے رکھا تھا! اسی دوران میں تحریکِ ہجرت سے متاثر ہو کر، ہجرت کے ارادے سے راولپنڈی پہنچ گئے لیکن ساتھیوں کے بروقت نہ پہنچ سکنے کے باعث آگے نہ جا سکے! ——— ابھی علی گڑھ پہنچے ہی تھے کہ والد صاحب کے انتقال کی اطلاع آ گئی، لہٰذا تعلیم درمیان میں چھوڑ کر کوئٹہ واپس آ گئے اور گورنمنٹ ہائی سکول ہی میں ملازمت اختیار کر لی۔
- ۱۹۲۰ء : پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ بی اے پاس کیا۔ انگریزی میں یونیورسٹی

میں اوّل آئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔

• سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء : ملازمت سے رخصت حاصل کرکے، گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوکر انگریزی میں ایم اے کیا۔

• ۲۳-۱۹۲۲ء : مزید رخصت حاصل کرکے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مقیم رہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ سے عربی کی تحصیل کی ــ مولانا علی میاں حاجی صاحب سے انگریزی پڑھتے رہے! اسی زمانہ میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے بھی تعلق قائم ہوا جو تازیست قائم رہا۔

• سنہ ۱۹۳۵ء : حضرت مولانا احمد علی لاہوری رح سے بیعتِ سلوک! (حاجی صاحب کو حضرت لاہوری رح سے خلافت بھی حاصل تھی!)

• سنہ ۱۹۳۶ء : پہلا حج بیت اللہ اور اس کے دوران مولانا عبیداللہ سندھی رحم سے تعارف اور مراسم!

• سنہ ۱۹۳۷ء : شادیٔ خانہ آبادی۔

• سنہ ۱۹۳۸ء : مولانا لاہوری رح کی خدمت میں دورۂ تفسیر کی تکمیل۔

• سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء : حضرت لاہوری رح کے ارشاد پر خانقاہ رائے پور میں شاہ عبدالقادر رح کی خدمت میں حاضری اور استفادہ، اسی دوران میں حضرت مولانا محمد الیاس رح سے تعارف ہوا اور اِن کے پاس بھی طویل قیام رہا! اِس کے بعد تبلیغی جماعت کے ساتھ کافی طویل سفر کیے اور تمام اکابر سے رابطہ رہا۔

• سنہ ۱۹۴۲ء : اپنی بقیہ زندگی کو دین کی خدمت کے لیے وقف کرنے کی نیت سے ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔

• سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء : جماعتِ اسلامی کے مرکز واقع دارالاسلام، پٹھانکوٹ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے پاس قیام، ــــ لیکن جلد ہی بدول ہوکر مولانا محمد منظور نعمانی کے ساتھ ہی کنارہ کشی!

• سنہ ۴۷-۱۹۴۳ء : اپنے آبائی قصبہ انبالہ ہی میں قیام اور درسِ قرآن کی تحریک کا آغاز ــ ابتداء میں حوصلہ افزائی، بعد میں مقامی علماء کی شدید مخالفت!

• سنہ ۱۹۴۷ء کے اوائل ہی میں لاہور منتقل ہوگئے اور بعض دوسرے دینی بھائیوں کے ساتھ مل کر کرشن نگر میں ہندوؤں سے کچھ جائیداد خرید کی!

• ۱۹۴۸ء : حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی خدمت میں چھ ماہ مسلسل قیام اور سلوک کی تکمیل!

• ۱۹۵۱-۵۲ء : تبلیغی جماعت کے ساتھ دورۂ حجاز - ایک سال ارضِ مقدس ہی میں قیام - اس دوران میں مولانا سعید احمد خاں اور مولانا عبید اللہ بلیاوی سے خصوصی تعلقات و روابط!

• ۱۹۵۲-۵۳ء : ایک مثالی اسلامی بستی کے قیام کے لیے انجمن رضوان کے نام سے ایک کوآپریٹو سوسائٹی کا قیام - اور اس کے لیے دیوانہ وار کام!

• ۱۹۵۵ء : ادارہ اصلاح و تبلیغ (آسٹریلیا بلڈنگ، میکلوڈ روڈ، لاہور) کے زیرِ اہتمام قرآن مجید کی ایک آسان اور عام فہم تفسیر بعنوان "درسِ قرآن" لکھنے کے لیے علما کا ایک بورڈ قائم ہوا جس کے حاجی صاحب بھی رکن بنائے گئے ... اور تفسیر کے کام کے اختتام تک بورڈ کے رکن رہے!

• ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کا زمانہ حاجی صاحب کی زندگی میں بہت سی ناکامیوں اور مایوسیوں کا دور تھا۔ اس عرصہ کے دوران ایک طرف تبلیغی جماعت کے بعض اہم اور ذمہ دار حضرات سے شدید اختلاف کی بنا پر حاجی صاحب کا رابطہ اس "حلقے" سے بالکل ٹوٹ گیا۔ دوسری طرف انجمن رضوان، جسے حاجی صاحب نے اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھایا تھا، اور جس کے صدر اور مؤسس سب کچھ حاجی صاحب تھے، اس سے انہیں اس طرح نکال باہر کیا گیا جیسے دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے! ـــــ ان دو شدید ترین صدموں کے باعث حاجی صاحب کی صحت ایک دم جواب دے گئی!

• راقم الحروف سے حاجی صاحب کا ربط ۱۹۷۱ء میں قائم ہوا۔ راقم کے چند دروس و خطابات ہی سے انہیں راقم سے بہت اُنس ہو گیا۔ اور ایک طویل عرصے تک حاجی صاحب اپنی علالت اور ضعیفی کے باوصف لاہور میں میری ہر تقریر اور درس میں شرکت فرماتے رہے ہ۔

• ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کا مرحلہ آیا تو میرے اس خیال کی حاجی صاحب نے اپنے تلخ تجربے کی بنا پر شدت کے ساتھ تائید کی کہ اس کا ڈھانچہ مروجہ جمہوری روایات کے مطابق نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس میں صدر مؤسس کی تاحیات صدارت بھی طے ہونی چاہیے۔ اور اس پورے عرصے کے دوران اُسے مجلس منتظمہ میں ویٹو کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے ـــــ اس ضمن میں انہوں نے میرے منع کرنے کے باوجود مولانا امین احسن اصلاحی اور شیخ سلطان احمد صاحب سے بھی گفتگو کی، اگرچہ ان حضرات نے اُن کی بات پر توجہ نہ فرمائی!

• ۱۹۷۰ء-۱۹۷۲ء کے دوران کسی موقع پر حاجی صاحب نے زبردستی راقم کا ہاتھ کھینچ کر اپنے آپ کو راقم کے ساتھ 'بیعت جہاد' کے رشتے میں منسلک کر لیا۔ اس وقت تک خود راقم نے اِس کے بارے میں سوچا تک نہ تھا (اگرچہ اصولی طور پر راقم کا یہ ذہن ۱۹۵۸ء میں بن چکا تھا کہ 'اقامتِ دین' کے لیے قائم ہونے والی جماعت کی اَساس 'بیعتِ جہاد' ہی پر ہونی چاہیئے!)

• ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی تو حاجی صاحب اُس کے تاسیسی ارکان میں شامل ہو گئے ہو گئے۔ ۱۹۷۶ء میں حاجی صاحب نے علالت اور پیرانہ سالی کے باوجود راقم اور تنظیم اسلامی لاہور کے دیگر ساٹھ ستّر رفقاء کی معیت میں کوئٹہ کا سفر کیا۔ اور قرآنی تربیت گاہ میں شرکت فرمائی!

• ۱۹۸۰ء تک راقم اور تنظیم اسلامی کے ساتھ حاجی صاحب کا تعلق نہایت پُرجوش اور فعال طرز کا رہا۔ چنانچہ اسی دوران میں حاجی صاحب نے راقم کو اپنی جائداد میں سے دو کنال کے رقبے پر مشتمل ایک کوٹھی ہبہ کی جس کے ایک چوتھائی کے بارے میں اُن کے اور تبلیغی جماعت کے ایک معروف بزرگ حاجی عبدالحمید صاحب کے مابین تنازعہ بھی چل رہا تھا (جو تا حال جاری ہے) الحمدللہ اسی کوٹھی کے تین چوتھائی پر وہ عمارت تعمیر ہو رہی ہے جس میں تنظیم اسلامی کا مرکزی دفتر منتقل ہو رہا ہے۔

• ۱۹۸۰ء کے بعد سے حاجی صاحب تقریباً صاحبِ فراش ہو گئے اور کہیں آنا جانا بالکل موقوف ہو گیا۔ اور اِس عرصے کے دوران... اُن کے مزاج میں کچھ تلخی اور چڑچڑاپن بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان ہی ایام میں ایک مرتبہ جب مولانا علی میاں مدظلّہٗ کا لاہور آنا ہوا اور وہ حاجی صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے، تو حاجی صاحب اُن سے بھی نہایت درشتی کے ساتھ پیش آئے! اگرچہ مولانا نے اس کا قطعاً بُرا نہ منایا ـــــ اور راقم کی اُن سے جب بھی ملاقات ہوئی مولانا نے حاجی صاحب کی صحت و عافیت کے بارے میں ضرور دریافت فرمایا ـــــ اور سلام کہلوایا! چنانچہ مَیں نے بھی مولانا کو حاجی صاحب کے انتقال کی اطلاع بذریعہ تار دی اور اُن کا بھی دعائے مغفرت کا! تعزیت کا پیغام بذریعہ تار ہی ملا! اِدھر میری مصروفیات بھی ایک دم بہت بڑھ گئیں اور حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری کے مواقع کم ہو گئے ـــــ چنانچہ ع "عشق است و ہزار بدگمانی!" کے مصداق حاجی صاحب کو راقم سے بھی کچھ گلے شکوے پیدا ہوئے ـــــ لیکن یہ اُن کی شرافت اور مروّت تھی کہ انہوں نے انہیں اپنے تک ہی رکھا اور کبھی کسی کے سامنے زبان نہ کھولی!

• اُن کی نقاہت کے بارے میں تو راقم کو علم تھا کہ تدریجاً بڑھ رہی ہے لیکن انتقال سے قبل

کوئی ایسی خاص علالت ہوئی ہی نہیں جسے "مرضِ وفات" کا نام دیا جا سکے لہٰذا اُن کے انتقال کی اطلاع بالکل اچانک ملی۔ صبح تک کوئی آثار موت کے نہ تھے، چنانچہ ان کے داماد برادرم محمد حنیف رک جو اُن کے ساتھ ہی رہتے ہیں، معمول کے مطابق ڈیوٹی پر کالج گئے ہوئے تھے اور صاحبزادے حافظ قاسم رضوان بھی اتفاقاً ہی گھر پر تھے۔ بڑے صاحبزادے محمد حسن بھی اپنے کاروبار پر باہر تھے۔۔۔ کہ اچانک ۱۱ جنوری ۱۹۹۶ء کو ۱۱ بجے دن کے لگ بھگ حاجی صاحب انتہائی خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے! گویا اُن کی بے چین روح کو جگر کے اِس مصرعے کے مطابق ط "عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا" ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سکون حاصل ہو گیا!

ط "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!"

• راقم جب اُسی روز بعد نماز مغرب ان کی نماز جنازہ ادا کر رہا تھا تو دل میں عجیب سی حسرت کا احساس پیدا ہوا کہ کاش گزشتہ چند دنوں کے دوران حاجی صاحب سے ایک ملاقات ہو جاتی تو راقم اپنے ایک اقدام کی وضاحت کر سکتا جس سے انہیں شکایت پیدا ہوئی تھی۔ اِس لیے کہ گزشتہ پندرہ سال کے دوران راقم کو متعدد بار تجربہ ہو چکا تھا کہ حاجی صاحب کو کوئی شکایت پیدا ہوئی اور جیسے ہی مَیں حاضر ہوا ساری شکایت کافور ہو گئی۔

— بلکہ بعض اوقات تو محسوس ہوا کہ حاجی صاحب خفگی کا اظہار کرتے ہی اِس لیے ہیں کہ مَیں اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر اُن کی خدمت میں حاضری دے سکوں! — وہ ہر اعتبار سے میرے "بزرگ" تھے (عمر میں تو میرے والد صاحب مرحوم سے بھی چار سال بڑے تھے!) لیکن وہ جس ادب و احترام ہی نہیں "تعظیم" کے ساتھ مجھ سے پیش آتے تھے اُس سے بہت شرمندگی ہوتی تھی اور بعض اوقات اِسی کا احساس اُن کی خدمت میں حاضری سے مانع ہو جاتا تھا۔ —— بہرحال ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف ہم سب کو لوٹ جانا ہے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت اور فضل و کرم کے سائے میں جگہ دے — اور "وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ" کا مصداق بنا دے — اَللّٰهُمَّ آمِیْن!!

ان شاء اللہ العزیز ــــ دوران سال ۸۶ - ۱۹۸۵ء

تنظیمِ اسلامی پاکستان کا

پانچواں علاقائی اجتماع بمقام ملتان

۲۲ تا ۲۵ فروری ۸۶ء منعقد ہو گا

جس میں ۲۲ اور ۲۳ کی رات کو بعد نماز عشاء امیر تنظیم کا خطاب عام بعنوان:

"پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟"

ہو گا اور ۲۴ کی رات کو اس موضوع پر سوالات کے جوابات دیئے جائیں گے، نیز ۲۳ تا ۲۵ روزانہ ۸ بجے صبح تا ایک بجے دوپہر تربیتی دروس و خطابات ہوں گے۔

★ اس اجتماع میں جنوبی پنجاب کے اضلاع لاڑکانہ، ساہیوال، وہاڑی، ملتان، فیصل آباد، جھنگ، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں، بہاول نگر، بہاولپور اور رحیم یار خاں، کی مقامی تنظیموں کے متعلق اور منفرد رفقاء کی شرکت لازمی ہے۔

★ کوئٹہ کے رفقاء کیلئے یہی اجتماع سالانہ اجتماع کے قائم مقام ہوگا لہذا وہاں کے جملہ رفقاء کی شرکت بھی لازمی ہے۔

★ جو رفقاء تنظیم کسی سبب سے اس سال کسی بھی علاقائی اجتماع میں شرکت نہ کر سکے ہوں انکے لئے بھی اس اجتماع میں شرکت لازمی ہے بصورت دیگر انکے تنظیم سے اخراج کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے!

★ گذشتہ سالانہ اجتماع میں امیر تنظیم نے ہدایت فرمائی تھی کہ ہر رفیق اس سال کے دوران کم از کم دو علاقائی اجتماعات میں ضرور شرکت کرے لہذا جن حضرات نے تا حال صرف ایک اجتماع میں شرکت کی ہو وہ بھی اس میں شرکت کی کوشش کریں۔

★ رفقاء ۲۲ فروری کو مغرب سے قبل ضرور بہ پتہ درج ذیل پر پہنچ جائیں۔ ۲۵ کو دوپہر کے وقت اجتماع کی کاروائی ختم ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ

کرنل (ریٹائرڈ)، ڈاکٹر حافظ غلام حیدر خان ترین۔ امیر تنظیم اسلامی، ملتان

۲۵ - آفیسرز کالونی نزد لاسال ہائی اسکول، ملتان فون: (۳۰۴۵۱)

مقدمہ

[illegible]

پاکستان کا مقصد استحکام

پاکستان کی اصل اساس

استحکام پاکستان کی مضبوط بنیاد

نزلہ، کھانسی اور زکام
سردی کے موسم میں عام
مناسب احتیاط برتیے - بروقت سعالین لیجیے
سردیوں میں اگر آپ کو نزلہ، زکام، کھانسی یا گلے میں خراش کی شکایت ہو جائے تو فوراً سعالین کا باقاعدہ استعمال شروع کر دیجیے۔ اور اگر خدانخواستہ تکلیف بڑھ جائے تو ایک پیالی تیز گرم پانی میں سعالین کی چار ٹکیاں حل کر کے جوشاندے کے طور پر صبح و شام پیجیے۔
سعالین آپ کو ان بیماریوں سے محفوظ بھی رکھتی ہے اور نجات بھی دلاتی ہے۔
SUALIN
ADARTS SUA 3 86

باب اوّل

پاکستان کا عدمِ استحکام

حقیقی و واقعی یا وہمی و خیالی؟

عالمی سطح پر پاکستان کا شمار بالعموم غیر مستحکم یا بالقوّہ مائل بہ انتشار خطوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر زائرنگ جو طویل عرصے تک پاکستان میں مقیم رہے اور پاکستان کے اعلیٰ ترین سرکاری تربیتی ادارے (اسٹاف کالج لاہور) سے وابستہ رہے، اُن کا ایک مضمون غیر ملکی جرائد کے حوالے سے پاکستان کے اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے برملا اور واشگاف الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان تاحال اپنے جداگانہ تشخص کا جواز ثابت نہیں کر سکا ہے لہٰذا عنقریب مزید حصے بخرے ہونے کے عمل سے دوچار ہو جائے گا!۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک!!

اِدھر داخلی طور پر ایک جانب تو بانیٔ پاکستان کا یہ جملہ تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلسل نشر ہوتا ہے کہ "پاکستان ہمیشہ قائم رہنے کے لیے بنا ہے!" اور دوسری طرف صورتِ واقعی یہ ہے کہ ذرا ہوا تیز چلتی ہے تو پاکستان کی کشتی ہچکولے کھانے لگتی ہے اور سیاسی حالات میں ذرا مد و جزر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو خواص و عوام سب کے ذہن ہی نہیں زبان تک پر یہ سوال آ جاتا ہے کہ "پاکستان باقی بھی رہے گا یا نہیں؟"

لہٰذا اس امر کا پوری حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ آیا پاکستان کا مبینہ عدمِ استحکام حقیقی اور واقعی ہے یا "یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی!" کے مصداق محض دشمنوں کی اس سازش کا مظہر ہے کہ اس طرح پاکستان کی مسلمان قوم کے دلوں میں بے یقینی کی کیفیت پیدا کر کے اجتماعی قوتِ ارادی (COLLECTIVE WILL) کو مضمحل کیا جائے!

راقم کے تجزیے کے مطابق پاکستان کا عدمِ استحکام وہمی و خیالی نہیں حقیقی و واقعی ہے اور

اس کے دلائل اور شواہد ہمارے ماضی اور حال دونوں میں جا بجا موجود ہیں۔ اور جہاں تک " پاکستان ہمیشہ قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے " یا اس قسم کے دوسرے اقوال کا تعلق ہے تو یہ اگرچہ ع "نری آواز کُنے اور مدینے" کے مصداق نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کے ایک ایک مسلمان کے دل کی تمنا اور آرزو ہے لیکن اس معاملے میں حقائق کا انداز بالکل قرآن حکیم کے الفاظ مبارکہ " تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ " کا سا ہے! (سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۱ : " یہ اُن کی خواہشات ہیں۔ کہیے پیش کرو اپنی دلیل اگر تم سچے ہو! "

تو آیئے کہ ذرا اُن حقائق کا جائزہ لیں!

۱۔ سانحۂ مشرقی پاکستان

سب سے پہلی تلخ حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ وہ پاکستان جو ۱۹۴۷ء میں عالم وجود میں آیا تھا اب کہاں ہے؟ اس نے تو چودہ سال قبل داستانِ پارینہ کی صورت اختیار کر لی تھی اور اب اُسے "PAKISTAN THAT WAS" کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو اس "جو تھا نہیں ہے" پر "جو ہے نہ ہوگا!" کو کس دلیل سے بعید از قیاس قرار دیا جا سکتا ہے؟[1]

یاد کیجئے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحہ پر صرف ملّتِ اسلامیہ پاکستان ہی نہیں پورا عالمِ اسلام ہِل کر رہ گیا تھا۔ اور جہاں پوری اُمتِ مسلمہ پر سکتہ ساطاری ہو گیا تھا وہاں لاکھوں انسان دھاڑیں مار مار کر روئے تھے۔ یہاں تک کہ حرمین شریفین کی فضا لوگوں کی آہ و بکا اور نالہ و شیون سے گونج اٹھی تھی۔ اس لیے کہ اُس موقع پر صرف یہی نہیں ہوا تھا کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو گیا تھا، اگر بات صرف اتنی ہوتی تو اتنا عظیم صدمہ نہ ہوتا۔ بلکہ اس علیحدگی کے جلو میں اُس بدترین شکست کا کلنک کا ٹیکہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کی پیشانی پر لگا تھا جسے تاریخِ عالم کی عظیم ترین ہزیمتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے، خلافت کی منسوخی اور عالمِ عرب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اغیار کے غلبہ و تسلط میں جکڑے جانے کے جو کچوکے اُمتِ مرحومہ کو لگے تھے، اُس کے درد و الم میں صدی کے وسطی حصے میں مختلف ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کی کامیابی سے کچھ کمی آئی ہی تھی اور زخم کچھ مندمل ہوئے ہی تھے کہ ۱۹۶۷ء میں دُولِ عرب کی شرمناک

---

[1] ع "جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ" اقبالؔ

اور ذلت آمیز شکست اور پھر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں دُنیا کی عظیم ترین مسلمان مملکت کی رُسواکن ہزیمت نے زخموں کو از سرِ نو تازہ ہی نہیں مزید گہرا کر دیا۔ اور ان زخموں پر نمک چھڑکنے کی خدمت ہمارے اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے اس طرح سر انجام دی کہ اپنا نام ہی بدل ڈالا اور 'پاکستان' کے لیبل کو اپنی پیشانی سے اُتار کر خلیج بنگال میں پھینک دیا اور اس طرح اپنی کم از کم گذشتہ پینسٹھ سال کی تاریخ سے اعلان برأت کر دیا (واضح رہے کہ مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ ہی میں عمل میں آیا تھا) اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ 'بنگلہ دیش' کے پہلے وزیرِ خارجہ ڈاکٹر کمال حسین نے اعلان کیا کہ "اگرچہ آبادی کے لحاظ سے اس وقت دُنیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد بنگلہ دیش میں ہے لیکن ہم بنگلہ دیش کو ایک 'مسلمان ملک' کہلوانا پسند نہیں کریں گے" اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ! گویا کم از کم وقتی طور پر تو پاکستان ہی سے نہیں اسلامی تشخص سے بھی بیزاری پیدا ہو گئی تھی!

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی بقا اور تسلسل کے لیے ذہنِ انسانی میں نسیان اور بھول کا حفاظتی آلہ (SAFETY VALVE) لگا رکھا ہے۔ ورنہ ع "یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا!" کے مصداق زندگی اجیرن ہو جاتی، اس لیے کہ اب بھی جب کبھی خیال آ جاتا ہے کہ ہمارے ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل جوان اُن ہندوؤں کے قیدی بن گئے تھے جن پر ہم نے تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی تھی تو دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اور خصوصاً جب وہ نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ پاکستان کی فوج اور دیگر سروسز کے جوانوں اور افسروں کو بالکل بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ٹرکوں پر لاد کر مشرقی پاکستان سے وسطی ہند (مدھیہ پردیش) کے نظربندی کے باڑوں (CONCENTRATION CAMPS) تک لے جایا گیا تھا تو دِل خون کے آنسو روتا ہے اور رنج والم کی کوئی حد نہیں رہتی ——— ایک مختصر سی جنگ کے نتیجے میں اتنی بڑی شکست اور خصوصاً اتنی ذلت و رُسوائی کی تاریخ انسانی میں کم از کم راقم کی معلومات کی حد تک تو صرف ایک ہی مثال ملتی ہے اور وہ ہے چھٹی صدی قبل مسیح میں بخت نصر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی اور اُس کے بعد چھ لاکھ یہودیوں کا بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کے مانند ہانک کر بابل لے جایا جانا! راقم کے نزدیک ہمارا المیہ اُس سے ہرگز کم نہیں اس لیے کہ اُن چھ لاکھ میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے

اور بوڑھے بھی تھے اور جنگ کے قابل مردوں کی تعداد ہرگز ایک لاکھ سے متجاوز نہیں ہوسکتی!

بہرحال سقوطِ مشرقی پاکستان کا حادثہ فاجعہ پاکستان کے عدمِ استحکام کا منہ بولتا ثبوت ہے اور آئندہ کے لیے ایک تازیانۂ عبرت کے طور پر مناسب ہے کہ اس کی یاد کبھی کبھی تازہ کرلی جاتے ؎

"تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را — گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!"

۲۔ سرزمینِ بے آئین

پاکستان کے عدمِ استحکام کا دوسرا جیتا جاگتا ثبوت یہ ہے کہ قمری تقویم کی رُو سے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھ چکنے کے باوجود یہ ملک تاحال سرزمینِ بے آئین کی حیثیت رکھتا ہے اور ع "خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری!" کے مصداق بے آئینی ہی اس کا آئین اور بے دستوری ہی اس کا دستور ہے!

راقم الحروف اپنے زمانۂ طالب علمی میں جبکہ وہ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا ناظمِ اعلیٰ تھا عزم کے نام سے جمعیت کے سرکاری جریدے (ORGAN) کی ادارت کا ذمہ دار تھا۔ اس میں ایک صفحہ مستقل طور پر پاکستان کے زیرِ تدوین دستور کے بارے میں لکھے جانے والے مضامین اور خطوط کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور اس کا عنوان اس شعر کو بنایا گیا تھا کہ ؎

"اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں اس فکر میں غنچے سوکھ گئے
آئینِ گلستاں کیا ہوگا، دستورِ بہاراں کیسا ہوگا"

ذرا تصور کیجئے کہ یہ ۵۳-۱۹۵۲ء کی بات ہے گویا اس پر پوری ثلث صدی بیت چکی ہے لیکن آج بھی صورتِ حال جوں کی توں ہے اور اس میں ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد خان لیاقت علی خان مرحوم کی بی پی سی رپورٹ (BASIC PRINCIPLES COMMITTEE REPORT) کے رد ہو جانے کے بعد دستور سازی میں جو کئی سال کا وقفہ اور خلا رہا تھا وہ خدا خدا کر کے ۱۹۵۶ء میں ختم ہوا تھا لیکن ۱۹۵۶ء کے دستور کو واقعتہً دن کی روشنی دیکھنی نصیب ہی نہیں ہوئی۔ پھر ۱۹۶۲ء کا دستور آیا اور صرف چند سال قائم رہ کر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں مسٹر بھٹو نے واقعتہً ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا کہ دن رات محنت کر کے اس پارلیمنٹ کا اتفاق رائے (CONSENSUS) حاصل کرلیا تھا جس کی نمائندہ حیثیت غیر متنازعہ تھی، یہاں تک کہ آج تک بھی اُس کے بارے میں اس پہلو سے کسی نے حرف زنی نہیں کی کہ جن انتخابات کے ذریعے وہ وجود میں آئی تھی وہ قابلِ اعتماد

نہ تھے! لیکن افسوس کہ اولاً خود انہوں نے اس میں پے بہ پے ترامیم کرکے اس کا حلیہ بگاڑ دیا اور اُس کی غیر متنازعہ حیثیت کو بھی مجروح کر دیا۔ اور اس سلسلے میں وہ اپنی مجرد عددی قوت (BRUTE MAJORITY) کو جس بھونڈے طور پر بروئے کار لائے اُس نے واقعہ یہ ہے کہ اُن کی اپنی حیثیت کو شدید نقصان پہنچایا۔ اور پھر ۱۹۷۷ء کے مارشل لا نے اسے اولاً ساڑھے آٹھ سال تک معطل رکھا اور پھر ترمیم کے ذریعے اُس کے پورے نقشے ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ اور اگرچہ حال ہی میں اُس پر طویل بحث و مباحثہ اور گفت و شنید اور "کچھ لو اور کچھ دو" (GIVE AND TAKE) کے اصول پر سمجھوتے کے بعد پارلیمنٹ سے مہر تصدیق ثبت کرا لی ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ اس پارلیمنٹ کی حیثیت ہرگز غیر متنازعہ نہیں ہے اور مارشل لا اُٹھنے کی دیر ہے کہ اس کے ضمن میں پورا بکسِ اختلاف و انتشار (PANDORA'S BOX) ایک دم کھل جائے گا اور آزادانہ تصادم و کشمکش (FREE FOR ALL) کی وہ کیفیت دوبارہ پیدا ہو جائے گی جو ۱۹۶۹ء میں پیدا ہو چکی ہے اور پھر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس صورتِ حال کا نتیجہ کیا برآمد ہو گا! اس لیے کہ اتنی بات تو ریکارڈ پر موجود ہے اور سب ہی کو معلوم ہے کہ ملک کی متعدد سیاسی جماعتوں اور اہم سیاسی شخصیتوں نے بارہا کہا ہے کہ اگر ایک بار ۱۹۷۳ء کا دستور ختم ہو گیا تو پھر دوبارہ پاکستان کا دستور کبھی نہ بن سکے گا۔ واللہ اعلم!!۔ واعاذنا اللہ من ذلک!!!

۳۔ کنفیڈریشن کا شوشہ

عدم استحکام کا ایک تیسرا مظہر، اور مسلسل بے دستوری اور بے آئینی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اب ملک کے متعدد اور مسلّم سیاسی اہمیت کے حامل رہنما برملا کنفیڈریشن کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس کے لیے ایک باضابطہ 'اتحاد' "سندھی، بلوچی، پختون فرنٹ" کے نام سے وجود میں آ چکا ہے۔ اور یہ فرنٹ تو ملک سے باہر بنا ہے اور اس میں شریک زعماء اس وقت خود اختیار کردہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن عین 'باب الاسلام' یعنی سندھ کے قلب میں بیٹھ کر ایک شخص اس سے بھی آگے بڑھ کر برملا کہہ رہا ہے کہ "اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کو توڑ دیا جائے!" اور کنفیڈریشن کے نعرے پر طنزیہ تبصرہ کرتا ہے: "ہمیں کنفیڈریشن ضرور مطلوب ہے، لیکن پاکستان کے اندر نہیں بلکہ اس سے باہر!!" اور اس سے بھی ایک قدم مزید آگے بڑھا کر ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ: "ہم مارشل لا کی تائید اسی لیے کرتے ہیں کہ اصل میں پاکستان اسی کے ذریعے ٹوٹے گا! اور ہم ایم آر ڈی کی تائید اس لیے نہیں کرتے کہ وہ جمہوریت کی علمبردار ہے اور جمہوریت پاکستان کے

بقا کا ذریعہ بن جائے گی !۔ واضح رہے کہ مجھے اس وقت اُن صاحب کے کسی قول کی صحت یا عدم صحت سے کوئی بحث نہیں ہے بلکہ یہ تذکرہ صرف ع "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!" کے قبیل سے ہے!

۴۔ بھارت کا استحکام

عربی مقولے "تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا" (چیزوں کی حقیقی معرفت اُن کی مخالف اور متضاد اشیاء کے حوالے سے حاصل ہوتی ہے!) کے مطابق اپنی اس حالت کا موازنہ کیجیے بھارت کے ساتھ، جو پاکستان کا پیدائشی دشمن ہے۔ اس لیے کہ اُس نے ذہناً اور قلباً پاکستان کو ایک دن کے لیے بھی قبول نہیں کیا۔ کون نہیں جانتا کہ ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے بھارت کی موجودہ تقسیم عارضی ہے اور اُن کے دلوں میں اس اُمید کے چراغ روشن ہیں کہ وہ دن زیادہ دُور نہیں جب بھارت پھر 'اکھنڈ' ہو جائے گا۔ اُن کے صحافی اور دانشور پاکستان آکر برملا کہتے ہیں کہ "ہم نے پاکستان کو تو ضرور تسلیم کیا ہے، لیکن نظریۂ پاکستان کو ہرگز تسلیم نہیں کیا!" یہ گویا نہایت لطیف اور ڈپلومیٹک انداز ہے یہ کہنے کا کہ ہم پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے۔

غور طلب امر ہے کہ بھارت بھی ہمارے ہی ساتھ ——— بلکہ ہم سے ایک دن بعد۔ آزاد ہوا تھا لیکن اُس نے جھٹ پٹ دستور بنایا اور اس کی گاڑی ایمرجنسی کے ایک مختصر سے وقفے کے سوا چالیس سال ہونے کو آئے کہ کبھی اُس دستور کی پٹڑی سے نہیں اُتری۔ حالانکہ وہ اگر ہم سے دس گنا بڑا ہے تو اُس کے مسائل ہم سے پچاس گنا زیادہ پیچیدہ اور گمبھیر ہیں۔ چنانچہ نسلی و لسانی اور تہذیبی و ثقافتی تقسیم تو وہاں پاکستان کے مقابلے میں کم از کم دس گنا زیادہ ہے ہی، اس پر مستزاد ہے وہ مذہبی تقسیم جس نے وہاں کے مسائل کو مزید کئی گنا زیادہ کر دیا ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں کم از کم اِس 'بچے کھچے پاکستان' (WHAT REMAINS OF PAKISTAN) میں یہ عامل نہ ہونے کے برابر ہے۔!! ——— الغرض معاملہ وہی ہے کہ ؎

> دیکھو کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ!
> بتکدے میں برہمن کی پختہ زُناری بھی دیکھو!

آئینی اور دستوری سطح پر بھارت کی اِس 'پختہ زناری' کے ساتھ ساتھ ایک نظر ڈالیے اُس کی صنعتی اور عسکری ترقی پر جس نے اُسے اِس علاقے کی چھوٹی 'سُپر پاور' کا درجہ دے دیا ہے اور غور کیجیے اس واقعی صورتِ حال پر کہ دونوں عالمی طاقتیں اُس کی خوشنودی کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہیں۔ چنانچہ جناب آغا شاہی جو غالباً پاکستان کی تاریخ میں

طویل ترین عرصے تک پاکستان کے وزیر خارجہ رہے ہیں اپنی ایک تحریر میں صاف لکھ چکے ہیں کہ راجیو گاندھی کے دورۂ امریکہ کے موقع پر یہ طے پا گیا ہے کہ امریکہ بھارت کو جنوبی ایشیا کی منی سپر پاور (MINI SUPER POWER) تسلیم کرتا ہے اور اُس کی اِس حیثیت کو کسی بھی اعتبار سے نہ چیلنج کرے گا نہ مجروح کرنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ وہ وقت قریب ہے کہ امریکہ پاکستان کو مجبور کریگا کہ وہ بھارت کے ساتھ اُس کی شرائط پر صلح کرے! الغرض! بھارت کا یہ استحکام بھی پاکستان کے عدمِ استحکام کے ضمن میں ایک تقویتی عامل کی حیثیت رکھتا ہے!

عدمِ استحکام کا سبب

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ع "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!" کے مصداق اِس عدمِ استحکام کا سبب کیا ہے؟ میرے نزدیک اس کا ایک سبب اصلی اور بنیادی ہے اور ثانوی درجے میں اِس اساسی سبب کے کچھ ثمرات و نتائج ہیں جنہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے!

اِس کا اصل سبب یہ ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے عالمِ وجود میں آیا تھا لیکن افسوس کہ اس میں بسنے والوں نے اس کے وجود میں آنے کے فوراً بعد اُس نظریئے ہی کو فراموش کر دیا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ کسی درخت کی جڑ سُوکھ جائے اور اُسے پانی نہ دیا جائے! اس کے نتیجے میں وہ لازماً مرجھا جائے گا! اُس کے پتے جھڑ جائیں گے، شاخیں سُوکھ جائیں گی اور کچھ عرصے بعد اُس میں سے ایک سُوکھے تنے کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا! چنانچہ بعینہٖ یہی صورتِ حال پاکستان کو درپیش ہے۔

اِس سے بھی آگے بڑھ کر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا حصول برِّصغیر کی ملّتِ اسلامیہ کے قافلۂ ملّی کی اصلی اور آخری منزل نہیں بلکہ صرف پہلا "پڑاؤ" تھا! اور اِس امر کی شدید ضرورت تھی کہ اس کے قافلہ سالار اپنے شرکاءِ سفر کو پوری شدّت سے یاد دلاتے رہتے کہ ع "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!"۔ لیکن افسوس کہ اِس بدنصیب قافلے کے رہنماؤں کی اکثریت نے خود ہی پہلے پڑاؤ پر پہنچ کر اصل منزل کو فراموش کر دیا۔ چنانچہ جب خود رہنما ہی اُس پڑاؤ کو اصل منزل قرار دے کر محوِ استراحت ہو گئے تو عوام کا تو کہنا ہی کیا؟ اُن کی اکثریت نے بھی اگر ع "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ

نیست !کی عامیانہ شرح کو طرزِ زندگی بنا لیا تو اُن سے کیا گلہ ہ اور کیسا شکوہ !!

اِس اصل اور اساسی سبب کے نتیجے میں جب ذہنی و فکری انتشار، اخلاقی و عملی اختلال اور سیاسی و انتظامی بحران پیدا ہوا تو اوّلاً کچھ ہوشیار اور چالاک سرکاری ملازمین (CIVIL SERVANTS) نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور جب اُسکے نتیجے میں ع "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی" کے مصداق انتشار و اختلال مزید بڑھ گیا تو آخر کار ملک کے منظم ترین ادارے یعنی فوج نے عوام کو سیاسی اعتبار سے نابالغ اور سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کو بدقماش اور آوارہ قرار دے کر ملک و ملت کی سرپرستی (GUARDIANSHIP) کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اِس سے بھی صورتحال میں کوئی بہتری تو نہ پیدا ہو سکتی تھی نہ ہوئی !!۔ لیکن اس کی کوکھ سے مزید پیچیدگیوں اور خرابیوں نے جنم لے لیا۔ جن میں سے سب سے بڑی اور خوفناک پیچیدگی یہ ہے کہ چونکہ پاکستان کی مسلح افواج کی ایک عظیم اکثریت ایک خاص علاقے سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا دوسرے علاقے کے لوگوں میں یہ احساس کچھ از خود ابھرا اور کچھ ملک و ملت کے دشمنوں نے ابھارا کہ ایک علاقے کے لوگ پُورے پاکستان پر حکومت کر رہے ہیں! چنانچہ اوّلاً یہ احساس پُوری شدّت کے ساتھ مشرقی پاکستان میں پیدا ہوا اور اُس کے نتیجے میں ملک دولخت ہو گیا! بعد ازاں یہی احساس ہے جس کی کوکھ سے اِس بچے کھچے پاکستان میں سندھی، بلوچی، پختون فرنٹ نے جنم لیا ہے اور اگر خدانخواستہ ان ثانوی اثرات و نتائج سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کے ساتھ ساتھ جلد از جلد پاکستان میں ایک زوردار تحریک ایسی نہ اُبھری جو ع

"سُوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را !"

کے انداز میں اِس بھولے اور بھٹکے ہوئے قافلے کو اپنی اصل منزل دوبارہ یاد دلا دے اور ع

"ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا !"

کی شان کے ساتھ ایک "ولولۂ تازہ" اور "عزمِ نو" کے ساتھ دوبارہ سرگرمِ سفر کر دے تو اندیشہ ہے کہ کہیں بدخواہوں کی پیشین گوئیاں صحیح ثابت نہ ہو جائیں اور دشمنوں کے گھروں میں واقعۃً گھی کے چراغ نہ جلنے لگیں!

تو آیئے کہ غور کریں کہ:۔

پاکستان کی اصل جڑ اور بنیاد کیا ہے ہ اور اِس کے استحکام کی بنیاد کون سی چیز بن سکتی ہے؟!

باب دوم

پاکستان کی اصل اساس

عالمی سطح پر بھی عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا ہے (بلکہ اس ضمن میں بالکل غلط طور پر اسرائیل کا نام بھی پاکستان کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا ہے) اور اندرونِ ملک بھی یہ بات اتنے زور شور، اِس قدر شدّ و مد اور اِس درجہ تکرار و اعادہ کے ساتھ کہی گئی ہے کہ اب عام طور پر تو اس جانب دھیان ہی نہیں دیا جاتا اور بہت سے لوگوں کو اس سے متلی کی سی کیفیت (NAUSEA) کا احساس ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ منبر و محراب سے تو یہ صدا تقریباً مسلسل ہی بلند ہوتی رہی ہے اور سیاست کے میدان کے بھی نیم سیاسی اور نیم مذہبی کھلاڑیوں نے اکثر و بیشتر اسی نعرے کا سہارا لیا ہے۔ لیکن گزشتہ آٹھ برسوں کے دوران خود ایوانِ حکومت سے یہ راگ جس تسلسل اور بلند آوازی کے ساتھ الاپا گیا ہے اُس نے غالباً سب کو مات دے دی ہے! ——— (اگرچہ اکثر سیاسی مبصرین کی رائے یہ ہے کہ اب یہ نعرہ اپنی معنویت اور تاثیر کھو چکا ہے)

دوسری جانب گاہے گاہے کچھ دوسری باتیں بھی سننے میں آتی رہتی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان ہرگز مذہب کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا۔ اس کے وجود میں آنے کے اصل اسباب خالص سیاسی تھے یا خالص معاشی!

جہاں تک یادداشت ساتھ دیتی ہے اِس بات کو برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہنے والی پہلی سیاسی شخصیت جناب حسین شہید سہروردی کی تھی، جنہوں نے اِس رائے کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان خالص معاشی اسباب کی بنا پر قائم ہوا ہے۔ تاہم اُن کی بات کو زیادہ اہمیت اِس لیے نہیں دی گئی تھی کہ وہ بذاتِ خود ایک متنازعہ شخصیت تھے اور قیامِ پاکستان کے تقریباً فوراً بعد ہی انہوں نے مسلم لیگ سے کٹ کر اپنی

علیحدہ سیاسی جماعت قائم کرلی تھی۔ لیکن کچھ عرصے بعد جب جناب نورالامین نے بھی ماہنامہ 'اُردو ڈائجسٹ' میں شائع شدہ ایک طویل انٹرویو میں اِسی رائے کا اظہار کیا تو اِس کا وزن محسوس کیا گیا اور سوچنے سمجھنے والوں نے کم از کم یہ ضرور محسوس کیا کہ بات غور و فکر کے قابل ہے۔

ان دونوں حضرات کی یہ "متفق گردید رائے بوعلی باراے مَن" کے مصداق متفق علیہ بات اس لیے بھی اہمیت اختیار کر گئی کہ ان دونوں کا تعلق متحدہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے سے تھا، مزید برآں اُسی کے صدر مقام ڈھاکہ کو مسلم لیگ کے 'مولد' (جائے ولادت) کی حیثیت حاصل تھی اور وہیں مسلم لیگ نے نہ صرف یہ کہ ابتدائی نشوونما پائی تھی بلکہ طویل عرصے تک حکومت بھی کی تھی۔ مزید برآں یہ صوبہ وہ تھا جو تقسیم ہند سے بہت قبل ایک بار صوبائی تقسیم کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔ الغرض اُن دونوں حضرات کی بات ہرگز ایسی نہ تھی کہ نظرانداز کر دی جاتی۔ چنانچہ پاکستان کی نئی نسل نے بلاشبہ ان حضرات کی بات کا اثر قبول کیا۔

یہ دونوں بزرگ تو عرصہ ہوا اِس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ بدقسمتی سے گزشتہ دو تین برسوں کے دَوران دو اور بزرگ شخصیتوں کی جانب سے بھی اِس سے ملتی جلتی رائے سامنے آئی ہے۔ اگرچہ اِس بار جو لفظ اِستعمال ہُوا وہ 'معاشی' نہیں 'سیاسی' ہے۔ چنانچہ پہلے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ تحریکِ پاکستان ہرگز ایک مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ خالص سیاسی تحریک تھی، اور جب اُن پر لے دے ہُوئی تو انہوں نے جو وضاحتیں اور معذرتیں پیش کیں وہ بالکل "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کا مصداق تھیں۔ نتیجۃً جس قدر وہ وضاحتیں پیش کرتے گئے اتنے ہی دلدل میں مزید پھنستے چلے گئے۔ بعدازاں جناب سردار شوکت حیات خاں صاحب سامنے آئے اور انہوں نے یہ فرما کر کہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا اِلٰہ اِلّا اللہ" ہرگز کوئی سنجیدہ اور سوچی سمجھی بات نہیں تھی بلکہ یہ نعرہ تو چند چھوکروں نے ایجاد کیا تھا! گویا بات ہی ختم کر دی!

کسی کو ان دونوں حضرات کی رائے خواہ کتنی ہی غلط نظر آئے، اِس حقیقت کو کسی صورت نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں تحریکِ پاکستان کے کارکنوں اور قائدِ اعظم کے نوجوان ساتھیوں میں شامل تھے اور فی الوقت دونوں ہی کا شمار موجودہ بچے کھچے پاکستان کے بزرگ ترین سیاستدانوں میں ہوتا ہے۔ مزید برآں دونوں کا تعلق اُس صوبے سے ہے جو موجودہ پاکستان میں ہر اعتبار سے عظیم ترین ہے!

اِس صورتِ حال کا خوفناک ترین نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ع "شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا!"
کے مصداق پاکستان کی نئی نسل شدید ذہنی و فکری انتشار (CONFUSION) کا شکار ہے اور
اُسے نہ اپنے تشخص کا شعور حاصل ہو سکا ہے نہ کسی مقصد یا منزل ہی کا سراغ مل سکا ہے' اور اس کی
حالت کم و بیش اُس مسافر کی سی ہے جو گھر سے تو کسی معین کام کے لیے کسی شہر کے سفر کے لیے چل
پڑا ہو لیکن اثنائے سفر میں کسی حادثے کے باعث اُس کی یادداشت زائل ہو جائے اور اب اُسے
نہ یہ یاد ہے کہ میرا گھر کہاں ہے اور میں نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا ، اور نہ یہ یاد رہے کہ میں جا
کہاں رہا ہوں اور وہاں مجھے کام کیا کرنا ہے ؛

لہٰذا اِس امر کی شدید ضرورت ہے کہ پوری سنجیدگی اور زیادہ سے زیادہ حقیقت و واقعیت پسندانہ
(REALISTIC) اور ممکنہ حد تک معروضانہ (OBJECTIVE) انداز میں غور کیا جائے کہ قیامِ
پاکستان کا اصل سبب کیا تھا ، تحریکِ پاکستان کے اصل محرکات کیا تھے ، اور وطنِ عزیز کی کوئی حقیقی
اور واقعی جڑ بنیاد ہے بھی یا نہیں ؛

اور اِس جائزے اور تجزیے کے دوران ضرورت ہو گی کہ نہ حقائق کو مسخ کیا جائے ، نہ کسی
'آرزو مندانہ اندازِ فکر' (WISHFUL THINKING) کو دخل انداز ہونے کا موقع دیا جائے ، نہ
کسی شخصیت کی عظمت اور محبت و عقیدت کو حائل ہونے دیا جائے اور نہ کسی کی ناراضگی یا رضامندی
کا لحاظ کیا جائے بلکہ اصل حقائق کو جرأت و ہمت کے ساتھ خود بھی قبول کیا جائے اور پوری جرأت رندانہ
کے ساتھ اُن کا ڈنکے کی چوٹ اظہار و اعلان بھی کیا جائے !

اِس نہایت پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسئلے کے حل کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ پہلے اِس کی تین
جداگانہ سطحوں (LEVELS) کا شعور حاصل کر لیا جائے اور پھر ہر سطح پر حقیقت کے جزوی ادراک کے بعد
حقیقتِ کُلی کی جانب پیشقدمی کی جائے !

اِس مسئلے کی تین جداگانہ سطحوں کے لیے بہترین تمثیل زمین پر پانی کی تین مختلف سطحوں کی صورت میں
موجود ہے۔ چنانچہ ایک پانی وہ ہے جو سطحِ زمین پر دریاؤں اور ندی نالوں کی صورت میں بہہ رہا ہے۔
سب جانتے ہیں کہ وہ ظاہر و باہر پانی جو ہر انسان کو بچشمِ سر نظر آتا ہے یہی ہے ; پانی کی دوسری سطح وہ

ہے جہاں سے اُسے کنوؤں اور ہینڈ پمپوں وغیرہ کے ذریعے نکالا جاتا ہے اور اس کے سوتے کہیں تیس چالیس فٹ گہرائی پر چل رہے ہوتے ہیں کہیں ستر اسی فٹ کی گہرائی پر اور کہیں اس سے بھی نیچے، اور از منۂ قدیم سے ماضی قریب تک دریاؤں اور ندیوں سے بُعد اور فاصلے پر انہی زیرِ زمین سوتوں کا پانی بقائے حیات کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ جبکہ پانی کی تیسری سطح وہ ہے جو سطحِ زمین سے کئی سو فٹ نیچے ہے اور جہاں سے زمانۂ حال میں پینے کے لیے صاف و شفاف پانی ٹیوب ویلوں کے ذریعے نکالا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح پاکستان کی 'ایجاد' یا 'تکوین' (GENESIS) کے اسباب یا محرکات کو بھی بالکل تین علیحدہ سطحوں (LEVELS) پر سمجھا جا سکتا ہے:

اس کی پہلی اور نمایاں ترین سطح یہ ہے کہ 'پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا!' چنانچہ یہ ظاہر و باہر حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں، بجز اس کے کہ کوئی سخت ڈھٹائی ہی پر اُتر آئے۔ اور حقیقتِ واقعی کے انکار پر کمر کس لے۔ اس کی حیثیت اس نوشتۂ دیوار (WRITING ON THE WALL) کی ہے جو ہر شخص کے سامنے رہتی ہو اور جس سے صرفِ نظر ممکن نہ ہو! یہی وجہ ہے کہ یہ بات پوری دنیا میں تسلیم کی جاتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی کو پسند ہو یا ناپسند!

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کو از درۂ خیبر تا راس کماری اور از مکران تا چٹا گانگ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے والا نعرہ بہر صورت "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" ہی تھا اور اس سے ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ اس کے الفاظ بزرگوں نے متعین کیے تھے یا نوجوانوں نے ترتیب دے لیے تھے۔

پھر بات صرف ایک نعرے کی نہیں ہے بلکہ اُن واضح و غیر مبہم اور واشگاف و برملا بیانات و اعلانات کی ہے جن کے ذریعے پاکستان کے بانی و مؤسس اور تحریکِ پاکستان کے 'قائدِ اعظم' نے مسلمانوں کی قومیت کی اساس 'مذہب' کو، پاکستان کی منزل 'اسلام' کو اور پاکستان کا دستور 'قرآن' کو قرار دیا تھا اور قیامِ پاکستان کا مقصد یہ بیان کیا تھا کہ ہم پاکستان کے ذریعے عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت، مساوات اور اخوت کی جدید تفسیر اور عملی نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں!۔ اس حقیقت سے انکار کوئی نہایت ڈھیٹ شخص ہی کر سکتا ہے کہ ان اعلانات کے بغیر نہ مسلم لیگ ایک عوامی جماعت بن سکتی تھی نہ برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں بسنے والے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے تھے۔ یہ حقیقت اتنی

ظاہر و باہر اور سطحِ زمین پر بہنے والے دریاؤں اور ندیوں کے پانی کے مانند اتنی عیاں ہے کہ اس پر قلم و قرطاس کا مزید صرف تحصیلِ حاصل کے ذیل میں آئے گا۔

تو اب آیئے دوسری سطح کی جانب جس کا صحیح تعین ایک سوال کی صورت میں کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ "تحریکِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ کیا تھا؟" ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ یہ سوال نہایت گہرا ہے اور اس کا جواب دینا آسان کام نہیں ہے!۔ مزید برآں یہ کہ اس سوال کے جواب میں پوری دیانت اور خلوص و اخلاص کے باوجود اختلاف کی بڑی گنجائش موجود ہے۔!

ان سطور کے عاجز و حقیر راقم کے نزدیک اس سوال کا ایک منفی جواب تو بادنیٰ تامل سامنے آسکتا ہے اور اس پر اتفاق (CONSENSUS) بھی زیادہ مشکل نہیں ہے البتہ تحریکِ پاکستان کے اصل محرک کی مثبت تعیین واقعۃً آسان نہیں!

شاید بہت سے قارئین اس پر چونک جائیں اور حیران ہوں کہ راقم بھی اُن لوگوں کی رائے کو درست سمجھتا ہے جن کے نزدیک تحریکِ پاکستان کا اصل عامل اور جذبۂ محرکہ 'مذہبی' نہیں کچھ اور تھا۔ اس 'کچھ اور' پر تو گفتگو بعد میں ہوگی سرِ دست راقم اپنے آپ کو اس دیانت دارانہ رائے کے اظہار پر مجبور پاتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ مذہبی نہیں تھا اور اُس کے نزدیک اس کا بالکل بیّن اور ناقابلِ تردید ثبوت یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی اصل قیادت عُلما ہرگز "مذہبی لوگوں" پر مشتمل نہیں تھی اور اس قاعدہ کلیہ سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کسی تحریک کا اصل جذبۂ محرکہ سب سے زیادہ نمایاں اور بکار حسی صورت میں اُس کی قیادت میں نظر آنا لازم ہے۔!

یہ حقیقت اگرچہ کسی قدر تلخ ہے اور اس کا اظہار غالباً بہت سے لوگوں کو ناگوار بھی محسوس ہوگا لیکن ہمیں اپنی قومی زندگی کے چالیسویں برس میں تو اتنا 'بالغ' ہو جانا چاہیے کہ تلخ حقائق کا اعتراف ہی نہیں اعلان بھی کر سکیں۔

اس مرحلہ پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ شرافت و مروت اور صداقت و دیانت جُداگانہ حقیقتیں ہیں اور 'مذہبیت' ایک جُداگانہ حقیقت ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال 'ابوطالب' سے قطع نظر کر اُن کا معاملہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے مابین مختلف فیہ ہے، مطعم بن عدی کی ہے جس نے سفرِ طائف سے واپسی پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر اپنی امان کے اعلان اور اپنے چھ بیٹوں

سمیت ہتھیار بند ہو کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بحفاظت مکہّ میں داخلے کا اہتمام کیا تھا! اگرچہ وہ خود آخری وقت تک ایمان نہیں لایا اور اُس کی موت کفر و شرک ہی پر واقع ہوئی۔

اسی طرح یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اِس وقت ہم ایک عوامی تحریک کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں زیر بحث 'مذہبیت' کا بھی وہ معیار اور تصور قابلِ لحاظ ہو گا جو عام مسلمانوں میں معروف و مشہور ہو نہ کہ کسی خاص دانشور کا اپنے ذہن و فکر سے تراشیدہ اور خود اختیار کردہ معیار و تصوّر۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو غالباً کوئی ایک شخص بھی اِس حقیقت سے انکار نہیں کر سکے گا کہ تحریکِ پاکستان کی اصل قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی وہ نہ صرف یہ کہ اس وقت عوامی سطح پر مروّجہ تصوّرات کے مطابق 'مذہبی' لوگ نہ تھے بلکہ اُن کی اکثریت جدید دَور کی مروجہ اصطلاح کے مطابق "PRACTISING MUSLIMS" پر بھی مشتمل نہ تھی!

اِس ضمن میں ایک فیصلہ کن مثال تو اُس واقعے کی صُورت میں سامنے آتی ہے جو راقم کو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے سنایا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں جالندھر میں مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ کا جو اجلاس سکھوں کے ساتھ گفت و شنید کے اصُول طے کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا اور جس میں مسلم لیگ کے ۲۲ اعلیٰ ترین قائدین شریک تھے (چشتی صاحب نے بہت سے حضرات کے نام بھی تعین کے ساتھ لیے تھے جو میری نوٹ بک میں درج ہیں لیکن اس وقت اُن کا ذکر مناسب نہیں سمجھتا!) اُس میں جب مغرب کی نماز کا وقت آیا تو نماز کے لیے جو لوگ اُٹھے وہ کُل دو تھے، ایک بیگم مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مغفور جو برقع پوشی کی حالت میں شریکِ اجلاس تھیں اور دوسرے خود پروفیسر یوسف سلیم چشتی جو اپنی ذاتی حیثیت میں نہیں بلکہ نواب سَر شاہنواز ممدوٹ کی علالت کے باعث اُن کے نمائندے کی حیثیت سے شریکِ اجلاس تھے! میں چشتی صاحب کی اس روایت کو قبول کرنے میں شاید کچھ تامل کرتا لیکن جب مجھے یاد آیا کہ بالکل یہی کیفیت ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کے دن لاہور میں منعقد ہونے والی 'عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس' کے موقع پر پیش آئی کہ مغرب کی نماز کے وقت بھی اجلاس ایسے جاری رہا تھا جیسے کسی کو احساس ہی نہ ہو کہ کون سا وقت آیا اور گذر گیا۔ (اُس وقت غالباً واحد مستثنیٰ ذات شاہ فیصل شہید کی تھی جو مغرب کی نماز ادا کر کے تاخیر ہی سے مجلس میں شریک ہوئے تھے) تو اِس واقعے کی صحت تسلیم کرنے میں بھی کوئی دقت پیش نہ آئی۔

دوسری نہایت پیاری بات وہ ہے جو پیر سید جماعت علی شاہؒ سے منسوب کی جاتی ہے کہ جب اُن پر کسی نے اعتراض کیا کہ آپ اتنی عظیم دینی و روحانی شخصیت کے حامل بلکہ لاکھوں کے دینی و روحانی مقتدا اور رہنما ہو کر ایک داڑھی منڈے شخص (مراد تھے قائد اعظم مرحوم!) کے پیچھے کیسے لگ گئے اور آپ نے کیسے اُسے اپنا رہنما تسلیم کر لیا؟" تو انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا کہ "بھائی! مَیں نے محمد علی جناح کو اپنا دینی یا روحانی پیشوا نہیں مانا بلکہ صرف اپنے قومی مقدمے کے لیے ایک قابل و ماہر اور شریف و دیانتدار وکیل کے طور پر قبول کیا ہے!" اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قائد اعظم یقیناً ایک نہایت قابل و ماہر وکیل بھی تھے اور اُن کی دیانت اور امانت پر بھی کوئی حرف اُنکا بدترین دشمن بھی نہیں رکھ سکا۔ اِس کے باوجود نہ وہ واقعۃً 'مذہبی' انسان تھے نہ ہی انہوں نے کبھی اپنے آپ کو تکلّفاً یا تصنّعاً اس رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

رہے وہ علماء و مشائخ جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تو خواہ وہ اپنے اپنے مقام پر کسی بھی مرتبے اور حیثیت کے مالک رہے ہوں واقعہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان کی قیادت کے ضمن میں اُن کا مقام اوّلین صف میں نہیں بلکہ ثانوی درجے میں تھا۔ اور اُن کی اصل حیثیت 'قائدین' کی نہیں بلکہ 'معاونین' کی تھی!!!

بہرحال زیر بحث سوال کے اس منفی جواب کے بعد آئیے کہ اِس کا مثبت جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں:

ہمارے نزدیک اِس ضمن میں پُوری حقیقت کی جامع تعبیر نہ 'معاشی' کے لفظ سے ہو سکتی ہے نہ 'سیاسی' سے' بلکہ اس کی صحیح اور جامع تعبیر کے لیے موزوں ترین لفظ وہی ہے جو پیر سید جماعت علی شاہؒ کے محولہ بالا قول میں استعمال ہوا ہے یعنی ۔ 'قومی'!

تحریک پاکستان اصلاً ایک قومی تحریک تھی اور اُس کا اصل جذبۂ محرکہ ایک چھوٹی قوم کا یہ 'خوف' اور 'خدشہ' تھا کہ اُس سے کئی گنا زیادہ بڑی قوم اُس کے ساتھ برابری اور انصاف کا معاملہ نہیں کرے گی بلکہ سیاسی اعتبار سے اُسے 'محکوم' بنانے کی کوشش کرے گی' معاشی سطح پر اُس کا اِستحصال کرے گی اور سماجی و معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے اُس کے تشخص کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور اسی پر بس نہیں کرے گی بلکہ ہر ممکنہ ذریعے سے اپنی گذشتہ محکومی کا بدلہ لینے اور حساب چکانے کی کوشش

کرے گی یعنی اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لے گی! ۔ اور چونکہ یہ 'خوف' اور 'اندیشہ' نہ فرضی تھا نہ خیالی و وہمی بلکہ حقیقی اور واقعی تھا جس کا ادراک و احساس مسلمانانِ ہند کے ہر طبقے اور ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہو رہا تھا لہٰذا اس تحریک نے جنگل کی آگ کی طرح وسعت اختیار کر لی اور اپنے جداگانہ تشخص کی ضمانت اور اپنے سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت کے لیے برصغیر کی پوری مسلمان قوم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی! ۔ اور اس نعرے سے برصغیر کا طول و عرض گونج اٹھا کہ 'مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'!

گویا تحریکِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ نہ مذہبی تھا۔ نہ محدود معنی میں معاشی یا سیاسی بلکہ وہ ایک قومی تھا جس نے جملہ تہذیبی و ثقافتی، سماجی و معاشرتی اور سیاسی تحریکات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا!!!

مسئلہ زیرِ بحث کی تیسری اور سب سے گہری سطح کا تعین اس سوال کی صورت میں ہوتا ہے کہ "اس چھوٹی قوم کی قومیت کی بنیاد کیا تھی؟" جس کے جواب میں ہم لامحالہ وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے اس لیے کہ یہاں پھر ایک ناقابلِ تردید حقیقت کا سامنا ہے اور وہ یہ کہ برصغیر کے مسلمان نہ کسی نسل کی بنیاد پر ایک قوم تھے، نہ زبان کی بنیاد پر، پھر نہ ان کا لباس ایک تھا نہ اکل و شرب کے ذوق اور طور طریقے ایک تھے، بلکہ ان کو ایک قوم بنانے والی کوئی قدرِ مشترک تھی تو صرف ایک یعنی مذہب! یہی وجہ ہے کہ اگرچہ تحریکِ مسلم لیگ اصلاً ایک مذہبی تحریک نہ تھی، نہ ہی اس کی اصل قیادت مذہبی لوگوں پر مشتمل تھی لیکن اسے مسلمانانِ ہند میں ایک قومی وحدت کے شعور کو بیدار اور اجاگر کرنے کے لیے سب سے زیادہ انحصار مذہبی جذبے پر کرنا پڑا اور برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے ع "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" کے مصداق مذہبی نعرہ لگانا پڑا یعنی "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ"!

ہمیں اس بحث میں جانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اس نعرے میں وہ قیادت مخلص تھی یا غیر مخلص، اس لیے بھی کہ نیتوں کا حال صرف اللہ کے علم میں ہے اور ہمیں لوگوں کی نیتوں کو زیرِ بحث لائے بغیر ساری گفتگو حقائق و واقعات ہی کے حوالے سے کرنی چاہیئے، اور اس لیے بھی کہ کسی عوامی تحریک کے ضمن میں اصل فیصلہ کسی خاص یا چند اشخاص کے خیالات و نظریات کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اس اساس پر ہوتا ہے کہ اس میں عوام نے شمولیت کس بنا پر اور کس تصور کے تحت کی!

بنا بریں۔ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اور کسی شبہ کی گنجائش نہیں

ہے کہ پاکستان کی اصل اساس سوائے دین و مذہب کے اور کوئی نہیں ہے۔ اور پاکستان کی واحد جڑ بنیاد صرف اور صرف اسلام ہے! اور جس طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ جب اُن سے نام دریافت کیا جاتا تھا تو وہ صرف ایک لفظی جواب دیتے "سلمان"! اور اگر عرب کی روایت کے مطابق مزید پوچھا جاتا تھا کہ "سلمان ابن؟ . . . . تو جواباً ارشاد فرمایا کرتے تھے؛ سلمان ابن اسلام"! یعنی میری ولدیت اسلام ہے اسی طرح پاکستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کی 'ولدیت' اسلام ہے!!

باب سوم

استحکامِ پاکستان کی ٹھوس بُنیاد

تحریکِ پاکستان کے محرکات و عوامل، قیامِ پاکستان کے اسباب و وجوہات اور پاکستان کی اصل جڑ بنیاد کا مسئلہ فی نفسہٖ نہایت اہم ہے اور پاکستان کے کُل زوال و اضمحلال اور انتشارِ فکر و عمل کا اصل سبب یہی ہے کہ قومی سطح پر یہ بنیادی مسئلہ ہی متنازعہ اور مختلف فیہ ہو گیا ہے۔ تاہم چلیے، تھوڑی دیر کے لیے فرض کیے لیتے ہیں کہ اصل اہمیت اس کی نہیں اس لیے کہ اس کا تعلق ماضی سے ہے اور ماضی تاریخ کے دھندلکوں میں غائب ہو چکا ہے اور ہمیں ماضی کے معاملے کو مستقبل کے مؤرخ کے حوالے کر کے اپنی ساری توجہات کو حال کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر پر مرکوز کر دینا چاہیے!

اس صورت میں بھی ہمارے غور و فکر کا اصل مرکز و محور یہ سوال ہو گا کہ پاکستان کے استحکام کے لیے حقیقتہً اور واقعتہً ٹھوس بنیاد کون سی ہے جسے مضبوط کرنے سے پاکستان مستحکم ہو جائے اور اپنے وجود اور سالمیت کے خلاف جملہ داخلی اور خارجی حملوں کے مقابلے میں اپنا مؤثر دفاع کر سکے! یہ سوال ظاہر ہے کہ صرف دینی اور مذہبی نقطہ نگاہ ہی سے اہم نہیں ہے بلکہ خالص مادّی اور دنیوی اعتبار سے بھی نہایت اہم ہے۔ اس لیے کہ یہ ہمارا وطن ہے اور نہ صرف یہ کہ اس وقت ہم اس میں آباد ہیں بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کا مستقبل بھی اسی سے وابستہ ہے۔ یہ باعزت ہے تو ہم بھی باعزت ہیں اور خدانخواستہ یہ ذلیل ہو جائے تو اصل ذلت ہماری ہو گی۔ یہ آزاد ہے تو ہم آزاد ہیں، یہ غلام ہو گیا تو اصل غلام ہم ہوں گے۔ یہ خوشحال ہو گا تو ہم خوشحال ہوں گے اور اس پر تنگی آئی تو اس تنگی کا شکار ہم ہوں گے۔ گویا یہ کشتی تیرتی ہے تو ہم تیرتے ہیں اور یہ ڈوب گئی تو ہم غرق ہو جائیں گے! لہٰذا ہر پاکستانی کے لیے لازم ہے کہ وہ پاکستان کے باعزت

بقاء اور اس کے استحکام کے مسئلے پر پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچ بچار کرے!

تو آیئے کہ سب سے پہلے اس بات پر غور کریں کہ بالعموم ملکوں کو کن کن جہتوں سے تقویت ملتی ہے اور کن کن عوامل کی بنا پر استحکام حاصل ہوتا ہے اور ان میں سے کون کون سے عوامل ہمیں پاکستان کے استحکام کے لیے دستیاب ہیں جنہیں مزید تقویت دے کر ہم پاکستان کو مستحکم کر سکتے ہیں۔

۱۔ تاریخی عامل

ان میں سے اوّلین عامل کو 'تاریخی عامل' (HISTORICAL FACTOR) کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی ملک عرصۂ دراز سے ایک ہی نام اور ایک ہی سے حدودِ اربعہ کے ساتھ قائم ہو تو اُس نام اور اُن حدود کو ایک گونہ 'تاریخی تقدس' (HISTORICAL SANCTITY) حاصل ہو جاتا ہے اور یہ اُس کی تقویت کا موجب اور اُس کے استحکام کا سبب بن جاتا ہے، اور اگر کبھی اِس پر بحیثیتِ مجموعی یا اُس کے کسی علاقے پر جزوی طور پر کوئی دوسرا ملک قبضہ کر لیتا ہے تب بھی نہ اُس کا نام بدلتا ہے نہ دنیا یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ علاقہ اب اُس ملک کا حصّہ نہیں رہا بلکہ قابض ملک کا جزو بن گیا ہے ــــ مثال کے طور پر جب سے دنیا کی تاریخ انسان کے علم میں ہے اُسی وقت سے چین نامی ملک بھی دنیا میں موجود ہے اور اُس کا نام بھی ہمیشہ سے یہی چلا آ رہا ہے اور اُس کی حدود بھی ہمیشہ تقریباً یہی رہی ہیں ــــ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ جاپان نے چین کے بہت بڑے رقبے پر طویل عرصے تک قبضہ کیے رکھا لیکن یہ نہیں ہُوا کہ وہ علاقہ 'چین' نہ رہا ہو بلکہ 'جاپان' بن گیا ہو۔ بلکہ چین چین ہی رہا اور جاپان جاپان رہا اور کہنے میں یہی آتا رہا کہ چین کے اِتنے رقبے پر جاپان قابض ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تاریخی عامل اور یہ تاریخی تقدس پاکستان کو حاصل نہیں ہے۔ اور اِس نام اور اِن حدُود کے ساتھ تاریخِ انسانی میں کبھی کوئی مُلک موجود نہیں رہا۔ بلکہ پاکستان کا تو لفظ آج سے پچاس سال قبل تک دنیا کی کسی لُغت میں موجود ہی نہیں

تھا۔ ذرا غور کیا جائے تو یہ اِسی کا مظہر تھا کہ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے پاکستان کے نام کی قیمت ٹکا بھر بھی نہ سمجھی اور مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوتے ہی اِس نام کے لیبل کو اپنی پیشانی سے اُتار کر خلیج بنگال میں غرق کر دیا! ـــــ ورنہ غور کا مقام ہے کہ کیا اِس وقت دنیا میں دو جرمنی، دو یمن اور دو کوریا موجود نہیں ہیں؟ اور کیا ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے نام کو چھوڑنا گوارا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں! یہ اِس لیے کہ ان ناموں کی تاریخی حیثیت ہے جس کی بنا پر انہیں ایک شہرت اور نیک نامی (GOOD WILL) حاصل ہے جسے کوئی بھی ہاتھ سے دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ جبکہ 'پاکستان' ایک جدید اور 'حادث' نام ہے جس کی کوئی خاص قدر و قیمت ابھی قائم نہیں ہوئی!

واقعہ یہ ہے کہ راقم کے نزدیک اگر مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو جاتا لیکن اپنے نام کو برقرار رکھتا تو صدمہ تو اِس صورت میں بھی ہوتا لیکن اکہرا ـــــ اور جب اُس نے اپنا نام تک بدل ڈالا تو یہ دوہرے صدمے والی بات ہوئی۔ اِس لیے کہ اِس طرح ہمارے بنگالی بھائیوں نے نہ صرف خود اپنی پینسٹھ سالہ تاریخ سے اعلانِ برأت کیا بلکہ پورے برِ صغیر پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ کی توہین کی جس کی مشترکہ متحدہ جدّوجہد سے پاکستان قائم ہُوا تھا! یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اِس پورے معاملے میں اصل مورد الزام ہمارے بنگالی بھائی ہیں یا ہم یا پوری سابقہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان! ـــ اسی طرح ؎

"اور بھی دَورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے"

کے مصداق یہ بھی لازمی نہیں کہ مشرقی پاکستان کی یہ قلبِ ماہیت مستقل اور دائمی ہو۔ اِس ضمن میں بنگلہ دیش کے قیام سے لے کر اب تک بھارت کا جو سلوک اُس کے ساتھ رہا ہے اُس کے ردِّعمل کے طور پر الحمد للہ وہاں 'پاکستانیت' کا احیاء اس حد تک ہو چکا ہے کہ مولوی فرید احمد مرحوم کے صاحبزادے کا یہ بیان سامنے آ چکا ہے کہ ہم وہاں

آئندہ الیکشن "مشرقی پاکستان" کے نام پر لڑیں گے۔
بہرحال بہ رنج اور صدمے والی بات بھی اپنی جگہ اور اِسی طرح آئندہ کے امکانات سے بھی قطعِ نظر اِس وقت کی بحث کے اعتبار سے اصل اہمیت اِس حقیقت کی ہے کہ پاکستان کی تقویت کے لیے "تاریخی تقدس" کی قسم کا کوئی عامل موجود نہیں ہے! اِس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا وہ قول بیک وقت دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی جو حال ہی میں پاکستان کے بزرگ صحافی میاں محمد شفیع نے ایک روزنامے کے کالموں میں نقل کیا ہے یعنی یہ کہ "پاکستان کے معاملے کو ہندوستان پر قیاس نہ کیا جائے، ہندوستان ایک "ملک" ہے اِس کے حالات کتنے بھی خراب ہو جائیں بہرحال یہ موجود رہے گا جبکہ پاکستان ایک "تجربہ" ہے جو اگر ناکام ہو گیا تو پاکستان کا نام و نشان مٹ جائے گا!" ــــ میرے نزدیک اگر یہ روایت درست ہے تو مولانا مرحوم نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جس فرق کی نشاندہی کی ہے وہ اِسی "تاریخی عامل" پر مبنی ہے!!

۲ - جغرافیائی عامل

کسی ملک کو تقویت دینے والا دوسرا عامل جغرافیائی ہے ـ سب جانتے ہیں کہ اگر کسی ملک کی سرحدیں فطری جغرافیائی حدود (NATURAL GEOGRAPHICAL BOUNDRIES) کی صورت میں ہوں تو اِس سے بھی اُس ملک کو ایک گونہ حفاظت حاصل ہوتی ہے جو کہ تقویت کی موجب اور اُس کے دفاع میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ کلامِ اقبال کے پہلے اُردو مجموعے کی پہلی نظم کے پہلے شعر میں یہ حقیقت بڑی خوبصورتی کے ساتھ سامنے آتی ہے، یعنی ؎

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چُومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

چنانچہ واقعہ ہے کہ موجودہ ساری سائنسی اور ٹیکنیکل ترقی کے باوجود کوہِ ہمالیہ کی حیثیت بھارت کے شمال میں ایک فصیل کی سی ہے اور اگرچہ تقسیمِ ہند کے بعد ہمالیہ

کے انتہائی مشرقی حصے میں چین اور بھارت کے مابین ایک نو نو جھڑپ ہو چکی ہے جو نتائج کے اعتبار سے بھارت کے لیے نہایت ذلت آمیز اور رسوا کن ثابت ہوئی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کی پوری تاریخ ایسے کسی واقعے سے بالکل خالی ہے۔ اور اب بھی بھارت کو اس جانب سے اندیشہ بہت کم ہے۔

اسی طرح ۱۹۶۵ء کی جنگ کے ضمن میں ہمیں خود یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ کس طرح ایک وقتی سے جوش اور جذبے کے تحت وجود میں آنے والی بی آر بی کینال بھارت کے بھرپور حملے کے مقابلے میں لاہور کی حفاظت کا ذریعہ بن گئی تھی۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو ۱۹۴۷ء میں قائم ہونے والا اصل پاکستان تو واقعۃً تاریخ کا ایک انوکھا تجربہ نظر آتا ہے، اِس لیے کہ وہ ایسے دو ٹکڑوں پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع تھے اور اُن کے درمیان سمندر نہیں تھا بلکہ وہ ملک تھا جس کی مستقل حیثیت دشمن کے علاقے (HOSTILE TERRITORY) کی تھی۔ اور غریب مشرقی پاکستان تو تین اطراف سے اُس دشمن کے علاقے میں اِس طرح گھرا ہوا تھا کہ کسی جانب بھی کسی فطری و طبعی آڑ (NATURAL BARRIER) کا وجود نہ تھا۔

مشرقی پاکستان کے مسئلے کو علیحدہ رکھتے ہوئے، موجودہ پاکستان کا حال بھی یہ ہے کہ اِسے کسی طبعی اور فطری سرحدوں کا تحفظ کسی درجے میں حاصل ہے بھی تو وہ شمال، جنوب اور مغرب میں ہے۔ یعنی شمال میں وہی کوہِ ہمالیہ اور کوہِ قراقرم، جنوب میں سمندر، اور مغرب میں کوہِ سلیمان کا پہاڑی سلسلہ، جہاں تک اِس کی طویل ترین مشرقی سرحد کا تعلق ہے، جدھر سے اسے سب سے زیادہ تحفظ کی ضرورت ہے اُدھر کسی فطری و طبعی سرحد کا نشان تک موجود نہیں، چنانچہ پنجاب کا میدان اِس طرح کاٹا گیا ہے جیسے کیک کاٹا جاتا ہے، اور اگر خاردار تاروں کی کوئی باڑ موجود نہ ہو تو معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ کہاں ایک ملک ختم ہو گیا اور دوسرا شروع ہو گیا! رہا سابق ریاست بہاولپور اور پھر سندھ کے ریگزار اور صحرا کا تعلق تو اُس کے ٹیلے

: خود ہی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے رہتے ہیں، وہ کیا نشان بنیں گے اور کیا حفاظت کریں گے!! ع " او خویشتن گم است کرا رہبری کند! "

الغرض! جغرافیہ بھی ہمارا پشت پناہ نہیں ہے بلکہ ہمارے خلاف ہے!

۳- اِنسانی جذبہ

ملکوں کو مستحکم کرنے والے تیسرے عامل کو 'انسانی جذبہ' کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اگر کسی ملک یا خطۂ ارضی کے رہنے والے انسانوں میں کوئی حقیقی اور واقعی جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ تاریخ کو بھی شکست دے سکتا ہے اور جغرافیے سے بھی لڑ سکتا ہے، اِس لیے کہ انسان واقعۃً اشرف المخلوقات ہے اور قدرت نے اِس میں بے پناہ قوتیں اور توانائیاں ودیعت کر رکھی ہیں! اور واقعہ یہ ہے جب کسی قوم اور بالخصوص اُس کے جوانوں میں کوئی جذبہ حقیقۃً اور واقعۃً پیدا ہو جائے تو اُس کا رُخ سوائے مشیّتِ ایزدی اور قدرتِ خداوندی کے دنیا کی کوئی اور طاقت نہیں پھیر سکتی ــــ بقول اقبالؔ ــــ

" عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں !"

اب اگر ذرا دِقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو انسانی جذبے کی دو ہی قسمیں نظر آئیں گی: ایک، قوم پرستانہ جذبہ اور دوسرے، مذہبی جذبہ ــــ ان میں سے بھی اگرچہ تاریخ انسانی کے عظیم ترین معجزے تو مذہبی جذبے ہی کے تحت رونما ہوئے ہیں تاہم کچھ اِس بنا پر کہ موجودہ دنیا میں یہ جذبہ بالعموم کمزور ہی نہیں معدوم کے درجے میں آگیا ہے ــــ اور کچھ موجودہ بحث کی منطقی ترتیب کے تقاضے کے طور پر پہلے ہم 'قوم پرستانہ جذبہ' کا جائزہ لیتے ہیں کہ آیا اس کی کوئی قسم یا نوع ہمارے پاس بالفعل موجود یا ہمارے لیے ممکن الحصول ہے یا نہیں؟

قوم پرستی کی اِقسام

۱۔ نسلی قوم پرستی

قوم پرستی (NATIONALISM) کی اقسام کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے یہ حیران کُن حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ دنیا میں تمام تر علمی و سائنسی ترقی اور ذہنی و فکری ترفع کے باوجود نسل پرستانہ قومیت (RACIAL NATIONALISM) کا جذبہ سب سے زیادہ طاقتور اور مؤثر ہے۔ عہدِ حاضر میں اس کی دو نمایاں ترین مثالیں جرمن نیشنلزم اور یہودی نسل پرستی کی صورت میں موجود ہیں۔ جرمن قوم میں اپنے بارے میں ایک اعلیٰ اور برتر نسل (A SUPERIOR RACE) ہونے کے احساس نے اتنا جذبۂ عمل اور قوتِ مقاومت پیدا کر دی ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے بیسویں صدی عیسوی کے دوران جرمنی دو بار شدید ترین تباہی سے دوچار ہُوا لیکن دونوں مرتبہ چند ہی سال کے اندر اندر پھر نہ صرف یہ کہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا بلکہ دوسری ہمعصر اقوام اور آس پاس کے ممالک کا ہر اعتبار سے ہمسر ہو گیا بلکہ بعض اعتبارات سے اُن سے بھی بازی لے گیا۔ اسی طرح یہودی قوم میں بنی اسرائیل کے 'خدا کی منتخب اور پسندیدہ قوم' (CHOSEN PEOPLE OF THE LORD) ہونے کے احساس نے مقاومت اور مدافعت کی اتنی صلاحیت اور اپنی برتری کے بالفعل اظہار (ASSERTION) کے لیے بے پناہ محنت اور جدّوجہد کا جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ تاریخ انسانی کے دوران بارہا انہیں شدید ترین جبر و تشدد (PERSECUTION) کا سامنا کرنا پڑا۔ اور بعض مواقع پر تو اِن کے 'استیصال' (ANNIHILATION) اور کلّی اور مجموعی خاتمے (MASS EXTERMINATION) کی ایسی سر توڑ کوششیں ہوئیں کہ جن کی کوئی

دوسری مثال تاریخِ انسانی میں بمشکل ہی مل سکے گی۔ اِس سب کے باوجود وہ آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور ع "اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے" کے مصداق اگر کسی ایک خطے یا ملک سے اُنہیں دیس نکالا مل جاتا ہے تو کچھ ہی عرصے کے بعد نظر آتا ہے کہ انہوں نے کسی اور ملک میں قدم جما لیے ہیں۔ چنانچہ اِس صدی کے آغاز میں علامہ اقبال نے ان کی جس کیفیت کا مشاہدہ بچشمِ سر یورپ میں کیا تھا جس کی تعبیر انہوں نے ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ ع " فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!" اُس کے بعد بالخصوص جرمنی میں ہٹلر کے ہاتھوں اِن کا جو حشر ہُوا اور وقتی طور پر اُنہیں جو نقصان پہنچا اُس کے چند سالوں کے اندر اندر انہوں نے بعینہٖ وہی حیثیت امریکہ میں حاصل کر لی۔ چنانچہ آج اسرائیل کی چھوٹی سی مملکت امریکہ ہی کی امداد اور سرپرستی کے بَل پر نہ صرف پورے عالمِ عرب بلکہ پورے عالمِ اسلام کو ناک چنے چبوا رہی ہے ـــ اور اِسی پر بس نہیں دُور بیٹھے پاکستان تک کو دھمکیاں دے رہی ہے۔

اِس سلسلے میں ضمنی طور پر یہ بات بھی سامنے آ جائے تو اچھا ہے کہ یہ بات جو دنیا میں بالعموم کہی جاتی ہے کہ موجودہ دنیا کے دو ملک مذہب کی بنیاد پر قائم ہوئے ہیں، ایک پاکستان اور دوسرا اسرائیل، تو یہ درحقیقت اسرائیل کی نسل پرستی کو چھپانے کا نہایت شاطرانہ انداز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالص مذہب کی بنیاد پر دنیا میں صرف ایک ہی ملک قائم ہُوا ہے اور وہ ہے پاکستان، اسرائیل کی اساس مذہب پر نہیں نسل پرستی پر ہے۔ درحقیقت صیہونیت (ZIONISM) اصلاً ایک دینی اور مذہبی تحریک نہیں بلکہ نسل پرستانہ تحریک ہے (RACIAL MOVEMENT) اور اسرائیل خالص نسل پرستانہ (RACIST) ملک ہے۔

بہرحال ہماری اِس وقت کی گفتگو کے اعتبار سے اہم نکتہ یہ ہے کہ نظری طور پر نسل پرستی کی بنیاد پر بھی ایک نہایت طاقتور جذبہ وجود میں آ سکتا ہے ـــ لیکن (الحمدُ للہ کہ) پاکستان میں نسلی قومیت کے لیے کوئی اساس موجود نہیں ہے۔ اِس لیے کہ برِّصغیر پاک و ہند نسلی اعتبار سے غالباً پوری دنیا میں سب سے بڑی کھچڑی (بلکہ حلیم!) کی حیثیت

رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ اُسی کا ایک خلاصہ اِس وقت پاکستان میں موجود ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں دڑاوڑی لوگ بھی موجود ہیں (جیسے بلوچستان کے براہوی قبائل) اور آریائی نسل سے تعلق رکھنے والے بھی موجود ہیں، اِسی طرح منگول بھی ہیں اور سامی النسل بھی، بلوچ بھی ہیں اور افغان بھی، حتّٰی کہ شمالی علاقہ جات میں فینین بھی ہیں اور ریلتی بھی! الغرض یہاں کسی ایک نسل کے لوگ ایسی غالب اکثریت میں موجود نہیں ہیں کہ نسلی قوم پرستی کی بنیاد پر ملک کے استحکام کی توقع کی جا سکے!

۲- لسانی قوم پرستی

نسلی قوم پرستی کے بعد موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور قومی جذبہ (POTENT NATIONALISM) لسانی قوم پرستی (LINGUISTIC NATIONALISM) کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کی بھی دو مثالیں قابلِ توجہ ہیں، ایک عرب نیشنلزم اور دوسرے بنگلا نیشنلزم!

عرب نیشنلزم جو ماضی قریب میں عالمِ عرب میں ایک زبردست قوت کی حیثیت سے موجود رہا ہے اصلاً ایک لسانی نیشنلزم ہے۔ اِس لیے کہ اس کی اساس نہ مذہب پر ہے نہ نسل پر۔ بلکہ صرف اور صرف زبان پر ہے۔ چنانچہ اس کے حلقہ گوشش اور علمبردار صرف مسلمان ہی نہیں رہے ہیں بلکہ دانشوروں کی سطح پر اس میں زیادہ بھاری پلڑا عیسائیوں کا رہا ہے — حتّٰی کہ یہودی بھی اس میں شریک رہے ہیں، پھر اس میں نسل کی بھی کوئی تخصیص نہیں ہے اِس لیے کہ شمالی افریقہ کے باشندوں میں جہاں عرب آباد کاروں کی اولاد شامل ہے وہاں قدیم قبطی اور بربر نسل کے لوگ بھی موجود ہیں لیکن اس سب کے باوجود محض زبان کے اشتراک نے اِن سب میں مشترک قومیت کا احساس پیدا کیا اور خواہ اُس کے اساسی فلسفے سے ہمیں کتنا ہی اختلاف ہو بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عالمِ عرب نے یورپی استعمار کے خلاف جو جدّوجہد کی اور جس کے بل پر اِس استعمار کا جُوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا اُس کی اصل اساس اِسی

لسانی قوم پرستانہ جذبہ پر مبنی تھی!

اِسی طرح پاکستان کے دولخت ہونے میں جہاں منفی طور پر اوّلاً بے مقصدیت اور بے یقینی کے خلاء اور بعد ازاں مارشل لاء کے ردِّ عمل کو دخل حاصل ہے وہاں مثبت طور پر جو ہتھیار سب سے زیادہ کارگر اور جو وار سب سے بڑھ کر کاری ثابت ہُوا وہ بنگلہ نیشنلزم کا تھا جس کی اساس بنگلہ زبان پر قائم کی گئی تھی!

یاد ہوگا کہ حصولِ پاکستان کی تحریک کے دوران تو چونکہ مقابلہ ہندو قوم اور ہندی زبان سے تھا لہٰذا مسلم قومیت اور اردو زبان تقریباً لازم و ملزوم بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تقریباً مترادف اور ہم معنی ہو گئے تھے لیکن قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان اُردو کے مدِّ مقابل کی حیثیت سے سامنے آگئی تھی۔ اور خود قائدِ اعظم کی زندگی کے دوران اِس مسئلے نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ اُنہیں اپنی تمام تر علالت اور نقاہت کے باوجود مشرقی پاکستان کا سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔ اِسی زمانے کا واقعہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی رح کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے نہایت توہین آمیز رویہ محض اس بات پر اختیار کیا تھا کہ انہوں نے خالص علمی انداز میں وہاں یہ فرما دیا تھا کہ کچھ عرصہ قبل بنگلہ زبان کا رسم الخط (SCRIPT) بھی وہی تھا جو عربی، فارسی، اُردو، حتیٰ کہ سندھی، بلوچی اور پشتو کا ہے اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ دوبارہ بنگلہ زبان کا رسم الخط اُردو والا ہی اختیار کر لیا جائے تو لسانی بُعد و فصل میں کمی آجائے گی جس سے قومی یک جہتی کو فروغ حاصل ہوگا!۔۔۔ بہرحال پاکستان کی زندگی کے پہلے پچیس ۲۵ سالوں کے دوران (واضح رہے کہ اگست ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک شمسی حساب سے تقریباً سوا چوبیس سال بنتے ہیں۔ لیکن قمری حساب سے پچیس سال سے بھی کسی قدر زائد!) جہاں ایک جانب بے یقینی اور بے مقصدیت کا خلا مہیب سے مہیب تر ہوتا چلا گیا اور قومی و ملی سطح پر ضعف بڑھتا چلا گیا وہاں مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان، بنگلہ ادب، بنگلہ تہذیب اور بنگلہ ثقافت کے حوالے سے بنگلہ نیشنلزم قدم جماتا چلا گیا۔۔۔ اور بالآخر اسی کے

منطقی نتیجے کے طور پر "بنگلہ دیش" وجود میں آگیا۔ اور مشرقی پاکستان کا نام بھی دنیا کے نقشے سے غائب ہوگیا!

ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ زبان کا اشتراک لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ان میں یگانگت پیدا کرنے میں نسلی اشتراک سے بھی زیادہ مؤثر اور سریع الاثر ہے۔ اِس لیے کہ نسلی اشتراک کا تعلق اصلاً ماضی اور اُس کی روایات سے ہوتا ہے جبکہ لسانی اشتراک فی الفور محسوس و مشہود ہوتا ہے اور اپنی مادری زبان میں انسان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار جس بے تکلفی سے اور جس بھرپور انداز میں کرسکتا ہے کسی دوسری زبان کو خواہ وہ کتنا ہی سیکھ لے اور اُس میں کتنی ہی مہارت حاصل کرلے اُس میں جذبات کے اظہار کی وہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ بنا بریں اشتراکِ لسانی اجتماعیاتِ انسانیہ میں عصبیتؔ پیدا کرنے میں بہت دخیل اور مؤثر ہے۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو اگرچہ باقی ماندہ پاکستان میں وہ واحد زبان جو اِس کے ہر حصّے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے صرف اور صرف اُردو ہے، تاہم اِس کا عمل دخل اتنا بہرحال نہیں ہے کہ اُسے ایک لسانی قومیت کی بنیاد بنایا جاسکے۔ اور بنگلہ زبان کا مسئلہ ختم ہوجانے کے بعد موجودہ پاکستان میں کم از کم ایک زبان ایسی موجود ہے جو کسی بھی طور سے اُردو کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں! ہماری مُراد سندھی زبان سے ہے۔ جس کی اساس پر "سندھی نیشنلزم" ہو بہو "بنگلہ نیشنلزم" کے خطوط پر پروان چڑھ رہا ہے — بلکہ واقعۃً ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرچکا ہے — حتّٰی کہ "بچے کھچے پاکستان" کو سب سے بڑا داخلی خطرہ اِسی سے لاحق ہے۔

یہ اِسی کا مظہر تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے تقریباً فوراً بعد لسانی فسادات کا لاوا سندھ میں پھٹ پڑا تھا جس سے مغربی پاکستان کی سالمیت کی چُولیں ہل کر رہ گئی تھیں — اور سقوطِ مشرقی پاکستان پر بھارت کی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی نے

جہاں یہ الفاظ کہے تھے کہ "ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے لیا ہے!"
(WE HAVE AVENGED ONE THOUSAND YEAR'S DEFEAT) جس سے
پنڈت موتی لال نہرو ایسے بظاہر وسیع المشرب انسان کی پوتی اور پنڈت جواہر لال نہرو ایسے لامذہبیت سے دُور اور سوشلزم کے پرستار کی بیٹی کی بھی خالص 'ہندوانہ ذہنیت'، کا بھانڈا پھُوٹ گیا تھا۔ وہاں ساتھ ہی اپنی قوم سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ: میں عنقریب ایک بہت بڑی خوشخبری اور سنانے والی ہوں!" جس سے یہ بات الم نشرح ہوگئی تھی کہ بقیہ پاکستان کی سالمیت بھی ہندو ذہن اور مزاج کے لیے کس درجہ ناقابلِ برداشت شے ہے! اِس لیے کہ اُس کے اِس وعدے کا مصداقِ خارجی ظاہر ہے کہ سندھ کے لسانی فسادات کے سِوا اور کوئی چیز قرار نہیں دی جا سکتی! —

قِصّہ مختصر یہ کہ ہمارے پاس آل پاکستان اساس پر کسی لِسانی قومیت سے پیدا شدہ جذبۂ عمل تو درکنار، تاحال 'قومی زبان'، کے مسئلے کا حل بھی موجود نہیں ہے۔

۳ - وطنی قومیّت

وطن کی اساس پر قومیّت کی تشکیل کا تصوّر زیادہ پُرانا نہیں ہے اور اِسے عہدِ جدید کی پیداوار قرار دینا غلط نہ ہوگا تاہم اِس وقت عالمی سطح پر کم از کم نظری اور دستوری و قانونی اعتبار سے سب سے زیادہ چرچا اور سب سے بڑھ کر رواج اِسی کا ہے۔

منطقی اعتبار سے یہ بات بڑی وزنی (SOUND) نظر آتی ہے کہ اگر کسی مُلک کے رہنے والوں میں اپنے وطن سے قلبی محبّت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ اُن کے احساسات و جذبات میں یک رنگی و ہم آہنگی اور فکر و عمل میں اتحاد اور یک جہتی کی بُنیاد بن جائے گا اور اُنہیں ایک "بنیانِ مرصوص" کی صورت عطا کر دے گا — اور اِس کے زیرِ اثر رنگ و نسل، عقیدہ و مذہب اور زبان و ثقافت کا فرق و امتیاز جو ملکوں اور قوموں

کی کمزوری کا باعث بنتا ہے اگر بالکل ختم نہیں ہوگا تو کم از کم غیر اہم ضرور ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ حاضر میں قومیت کے تعین کے ضمن میں وطن ہی کو تقریباً متفقہ طور پر اساس تسلیم کر لیا گیا ہے (چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ ایک موقع پر مولانا حسین احمد مدنی رح کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ "آج کل قومیں وطن کی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں" جس پر نہایت سخت اور تیز و تُند تنقید کی تھی مفکر و مصورِ پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے، جس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا!) تاہم بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تا حال 'وطنی قومیت' کی جڑیں لوگوں کے احساسات و جذبات میں گہری اُتری ہوئی نہیں ہیں اور جذبات کی دنیا میں اصل راج رنگ و نسل، عقیدہ و مذہب اور زبان و ثقافت ہی کا ہے، اور بالفعل 'وطنی قومیت' صرف 'ملکی دستور میں شہریت (CITIZENSHIP) کی اساس اور پاسپورٹوں پر قومیت (NATIONALITY) کے اندراج کے طور پر کام آتی ہے اور اس نے کسی مؤثر 'قوم پرستی' (NATIONALISM) کی صورت کہیں بھی اختیار نہیں کی۔

اس کے باوجود چونکہ پاکستان میں کسی قوم پرستانہ جذبہ کی پیدائش اور نشو و نما کے لیے نہ اشتراکِ نسل کی بنیاد موجود ہے نہ اشتراکِ زبان کی، لہٰذا اس کے ضمن میں کم از کم نظری طور پر کسی قوم پرستانہ جذبے کے لیے واحد دستیاب اساس (THE ONLY AVAILABLE BASIS) یہی رہ جاتی ہے اور غالباً اسی درجہ بدرجہ نفی کے عمل (PROCESS OF ELIMINATION) کا نتیجہ تھا کہ بانی و مؤسسِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں اپنی تقریر کے دوران یہ جملہ کہہ دیا تھا کہ: "عنقریب پاکستان میں نہ مسلمان مسلمان رہیں گے نہ ہندو ہندو رہیں گے، مذہبی اعتبار سے نہیں، اس لیے کہ مذہب تو اشخاص کا انفرادی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی مفہوم کے اعتبار سے!" —— قائدِ اعظم مرحوم کے ان الفاظ کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ —— اور آیا ان الفاظ کو اُن کے سابقہ بیانات اور اعلانات کی نفی اور اپنے سابقہ

مُوقف سے انحراف کا مظہر قرار دیا جائے یا اُن کے اعصاب پر اُس وقت کے حالات کی پیچیدگیوں اور سنگینیوں سے پیدا شدہ شدید دباؤ کا اثر سمجھا جائے! جیسا کہ غلام احمد پرویز نے بالفعل کیا ہے ، اِس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں ہے اور اگرچہ اس کے ضمن میں راقم الحروف کی ایک سوچی سمجھی رائے ہے جسے اِن شاء اللہ بعد میں بیان بھی کیا جائے گا تاہم موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے فی الوقت عرض یہ کرنا ہے کہ خواہ کوئی شخص اِس نتیجے پر، کہ پاکستان کے مسائل کا حل ایک وطنی نیشنلزم میں ہے، مجبوراً متذکرہ بالا 'PROCESS OF ELIMINATION' سے پہنچا ہو خواہ وہ مثبت طور پر اسی نظریے کا ذہناً و قلباً قائل ہو حقیقتِ واقعی یہ ہے کہ 'پاکستانی نیشنلزم' نام کی کوئی شے نہ تا حال وجود میں آئی ہے نہ تا قیامت آ سکتی ہے! — !!

پہلی وجہ : دو قومی نظریہ

اِس کی اوّلین اور اہم ترین وجہ یہ ہے کہ پاکستان دو قومی نظریہ کی اساس پر وجود میں آیا تھا جو وطنی قومیت کے نظریئے کی کامل نفی کی حیثیت رکھتا ہے — تو کیسے ممکن ہے کہ کوئی ملک قائم تو ہو کسی نظریئے کی کامل نفی کی اساس پر اور پھر اُس کے استحکام کے لیے وہی نظریہ جڑ بنیاد کا کام دے سکے!

یاد کیجئے! کہ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مابین اختلاف و نزاع کی اصل بنیاد کیا تھی؟ کانگریس کے نزدیک مذہب و ملت کا معاملہ علیحدہ تھا اور قومیت کا علیحدہ، چنانچہ ہندوستان میں مذاہب بہت سے تھے لیکن اُن سب کے پیروؤں پر مشتمل قوم ایک ہی تھی یعنی انڈین نیشن یا ہندی قوم، جبکہ مسلم لیگ کا مؤقف یہ تھا کہ یہ صورت دوسرے جملہ مذاہب کے پیروؤں کے نزدیک قابلِ قبول ہو تو ہو کم از کم مسلمانانِ ہند کے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں، اِس لیے کہ اُن کی قومیت کی اساس مذہب پر ہے، لہٰذا وہ ایک علیحدہ قوم ہیں اور اپنے جداگانہ قومی تشخص کے بقاء کی ضمانت کے طور پر علیحدہ ملک کے حق دار ہیں!

اِس موضوع پر خود قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بے شمار بیانات اور اعلانات مشہور و معروف ہیں جن کا دوہرانا محض تحصیلِ حاصل کا مصداق اور وقت اور قلم و قرطاس کے لاحاصل صَرف کا باعث ہوگا۔ البتہ اصولی اور اساسی اعتبار سے' وطنی قومیت' کے نظریئے پر جو کاری ضرب مفکرّ و مصوّرِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے لگائی تھی وہ یقیناً اِس قابل ہے کہ اُسے ذہنوں میں تازہ کیا جائے۔ اِس لیے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کے صرف تہذیبی، تمدّنی اور ثقافتی شواہد ہی پیش نہیں کیے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک ضربِ ابراہیمی سے اِس باطل نظریئے کے بُت ہی کو پاش پاش کر دیا تھا کہ ملکی سرحدیں مستقل قومیتوں کی تشکیل کی بنیاد بن سکتی ہیں اور انسان محض زمینی تعلق کی بنا پر ایک دوسرے سے کٹ سکتا ہے: چنانچہ " وطنیت (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے)" کے عنوان سے فرماتے ہیں ؎

"اِس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور!
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے!
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے!
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تُو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفوی! خاک میں اِس بُت کو مِلا دے!"

ذرا الفاظ کی گہرائی میں اُتر کر مفکرّ و مصوّرِ پاکستان کے اس موضوع پر احساس

کی شدت کا اندازہ لگایا جائے تو بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے کہ

"عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا!"

اِسی طرح مولانا سیّد حسین احمد مدنی رح کے متذکرہ بالا جملے پر جو تلخ اور تیز و تُند لیکن شعریت اور فصاحت و بلاغت کی معراج کے مظہر اشعار کہے تھے علّامہ سر محمد اقبال مرحوم نے وہ یہ تھے:

"عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
زِ دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست!
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است!
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!"

یہ دوسری بات ہے کہ جب مولانا مدنی رح نے یہ وضاحت فرمائی کہ: اوّلاً — اُنھوں نے لفظِ قوم کا استعمال کیا تھا ملّت کا نہیں! اور ثانیاً: اُنہوں نے صرف موجودہ دور کی عام روِش کا ذکر کیا تھا، نہ اُس کی وکالت کی تھی نہ ہی مسلمانوں کو اِس کے قبول کرنے کی تلقین کی تھی تو علامہ مرحوم نے فوراً اعتراف کیا کہ اِس پر اعتراض کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے اور اپنے اشعار سے بھی رجوع کر لیا۔ اگرچہ اُن کے کلام کے ایک جزو کی حیثیت سے یہ اشعار اَب بھی شائع ہو رہے ہیں! (کاش کہ اِن اشعار کے ساتھ کلامِ اقبال کے طابع و ناشر متذکرہ بالا حقائق پر مشتمل ایک فٹ نوٹ بھی شائع کر دیا کریں)

قصّہ مختصر — وطنی قومیت کا نظریہ تحریکِ پاکستان کی نفی ہے اور اس کے فروغ سے پاکستان کی جڑیں مزید کھوکھلی تو ہو سکتی ہیں مضبوط نہیں ہو سکتیں!

دُوسری وجہ : مسلمانوں کی طبعی ساخت

دوسری نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ وہ باعمل (PRACTISING) ہو، خواہ بے عمل (NON-PRACTISING) ، بہرحال اُس کے مزاج کی ایک مستقل ساخت ہے اور اُس کی طبیعت کی ایک خاص اُفتاد ہے جس میں زمین کی پرستش اور وطن کے تقدس کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ گویا اُس کی شخصیت کا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے، اُس میں 'حبِ وطن' کا مادّہ تو ہو سکتا ہے 'وطن پرستی' کا امکان نہیں ہے! پروفیسر مرزا محمد منور اِس حقیقت کو اِن خوبصورت الفاظ سے تعبیر کیا کرتے ہیں کہ ہندو کلچر زمین میں گڑا ہُوا اور زمین سے بندھا ہُوا (EARTH ROOTED AND EARTH BOUND) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں زمین "دھرتی ماتا" کی حیثیت رکھتی ہے اور "بھارت کی جے" کے نعرے سے اُن کے جذبات میں اُبھار اور احساسات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے جبکہ مسلمان کے دل میں زمین کے مقدس یا دیوتا ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے بلکہ اُس کا مزاج 'آفاقی' ہے اور اُس کے جذبات میں گرمی اور احساسات میں ہلچل 'اللہ اکبر' کے نعرے سے ہوتی ہے! علامہ اقبال نے اپنی اُس نظم میں جس کے چند اشعار اُوپر نقل ہو چکے ہیں اِس 'قیدِ زمینی' کے تصور پر بھی نہایت زوردار تیشہ چلایا ہے ؎

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی\
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی\
ہے ترکِ وطن سُنّتِ محبوبِ الٰہیؐ\
دے تو بھی نبوّت کی صداقت کی گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے\
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے! ؎

برِ صغیر کے مسلمانوں کی خصُوصیت

اِس معاملے میں، واقعہ یہ ہے کہ، برِ صغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو زیادہ ہی خصوصیت حاصل ہے اور ان کا مزاج کچھ زیادہ ہی 'آفاقی' ہے۔ اِس کا ایک ممکنہ سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہاں کوئی دُوسری نسلی یا لسانی عصبیت ایسی موجود نہیں تھی جو اُنہیں ایک دوسرے سے باندھ سکتی لہٰذا اپنی شیرازہ بندی کے لیے انہیں مذہب کی قوتِ ماسکہ (BINDING FORCE) پر دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہی انحصار کرنا پڑا اور چونکہ اسلام ایک علاقائی مذہب نہیں بلکہ آفاقی اور عالمی مذہب ہے۔ لہٰذا اُن میں 'آفاقیت' دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہی سرایت کر گئی! اور "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست!" اُن کے قلوب و اذہان میں خوب رچ بس گیا اور اُن کے قومی شعور کا جزوِ لاینفک بن گیا!

چنانچہ بیسویں صدی عیسوی میں مغربی استعمار کے ہاتھوں عالمی ملتِ اسلامیہ کو جو چرکے لگے اور صدمے سہنے پڑے اور جن مظالم کا نشانہ بننا پڑا اُن پر سب سے زیادہ دردانگیز نالے اور رقت آمیز مرثیے ہندوستان کے مسلمانوں نے کہے اور اور اگرچہ وہ خود تو اُن مظالم و مصائب سے گذشتہ صدی کے دوران دوچار ہو چکے تھے اور اب نسبتاً پُرامن ماحول اور قانونی و دستوری نظام میں زندگی گزار رہے تھے لیکن جب بھی دنیا کے کسی بھی کونے سے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی خبر آتی تھی ہندوستان کا مسلمان بالکل اُسی شان کے ساتھ تڑپ اُٹھتا تھا جس کا نقشہ اِس شعر میں سامنے آتا ہے کہ ؂

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!"

اور جذبہ پرور قلم سے اور شائع ہوئے 'الہلال' اور 'البلاغ' میں (از ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء)

پھر کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی عظمت و سطوتِ گذشتہ کے ضمن میں اِس صدی کا سب سے بڑا نوحہ خوان، اُمتِ مسلمہ کو دنیا کے کسی بھی کونے میں پہنچنے والے دُکھ

اور درد پر سب سے بڑھ کر درد انگیز نالے بلند کرنے والا اور آہ و فغاں کرنے والا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین وملت کی نشأۃِ ثانیہ کے ضمن میں سب سے بڑا حُدی خواں بھی اسی صنم خانۂ ہند سے تعلق رکھنے والا "برہمن زادہ" اور "کافر ہندی" تھا۔ بقول خود اُس کے ۔

"کافرِ ہندی ہوں مَیں دیکھ مرا ذوق وشوق
لب پہ صلوٰۃ و درود، دل میں صلوٰۃ و درود!"

اور یہ کہ "برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است!"

چنانچہ وہ کبھی جزیرۂ صقلیہ کو دیکھ کر خون کے آنسو رویا۔

"رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار | وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی | بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی!
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے | بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

غلغلوں سے جن کے لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے!"

کبھی ہسپانیہ سے مخاطب ہو کر نوحہ کناں ہُوا ۔

"ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے | مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں | خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا وہ تب وتاب نہیں اس کے شرر میں!"

کبھی مسجد قرطبہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے باطنی سوز وگداز اور ذوق وشوق کا اظہار کرتا ہُوا نظر آتا ہے ۔

"اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود | عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز | تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبیں | تجھ سے حرم مرتبت اُندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حُسن کی تیرے نظیر | قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!

دیدۂ انجم میں ہے تری زمیں آسماں — آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے — عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!"

اور ساتھ ہی ملّتِ اسلامیہ کی نشاطِ ثانیہ کی نویدِ جاں فزا دیتا دکھائی دیتا ہے ۔

"آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اُس کی سحر بے حجاب!
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
رُوحِ اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب!"

اور کبھی طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہونے والی فاطمہ بنت عبداللہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے جذباتِ ملّی کا اظہار کرتا ہے ۔

"فاطمہ! تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے — ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی — غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اِس گلستانِ خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے — نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے — ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اِس آغوش میں"

تو کبھی ترکوں کے رنج و الم میں شریک ہو کر اور اُن کے مصائب پر اپنے کرب کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل قریب میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی خوشخبری بھی سُناتا ہے ۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی — اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے — شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
سرِ شکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اور اِس کے لیے مسلمانوں کو جو پیغامِ عمل دیتا ہے اُس کا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ ؎

"تُو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا!
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا!
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تُو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا!
غُبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تُو اے مُرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پُرفشاں ہو جا!"

الغرض مسلمانانِ برِّ صغیر پاک و ہند کا مزاج ویسے تو ابتداء ہی سے آفاقی رہا ہے لیکن اِس صدی میں تو یہ کیفیت اپنے عروج کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اِس مزاج اور اُفتادِ طبع اور اِس اندازِ فکر و نظر کے وارثِ کامل اور حاملِ اتم مسلمانانِ پاکستان کے قلب و نظر کی ایسی قلبِ ماہیت کیسے ممکن ہے کہ زمینی تعلق اتنا مضبوط اور وطن کی پرستش اتنی گہری ہو جائے کہ ایک وطنی نیشنلزم ——— (TERRITORIAL NATIONALISM) اِس کے استحکام کی اصل اساس بن جائے!

اِس ضمن میں اِس تاریخی مجوبے پر بھی نگاہ رہے تو مناسب ہوگا کہ اس صدی کے اوائل میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے پر ایک زبردست عوامی تحریک چلی صرف اور صرف چنانچہ طرابلس میں مسلمانوں کے جھنڈے سرنگوں ہوئے تو عربی زبان میں دردانگیز مرثیہ کہا اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک اصلاً ہندی اور نسلاً راجپوت مسلمان عالم و عارفِ کتابِ الٰہی مولانا حمید الدّین فراہی رحمہ اللہ نے ؎

"کَیْفَ الْقَرَارُ وَ قَدْ نُکِسَ — اَعْلَامُنَا بِطَرَابُلُس!!"

(ترجمہ) "قرار کیسے نصیب ہو جبکہ ہمارے جھنڈے طرابلس میں سرنگوں کر دیئے گئے!"
اور اسی طرح کے کتنے ہی درد بھرے مرثیے لکھے اُن کے بزرگ اور رشتے کے بھائی علامہ شبلی نعمانی رح نے (علامہ شبلی اور مولانا فراہی آپس میں ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائی تھے!) ـــــ پھر پوری اُمّتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر خون کے آنسو روئے مولانا حالی جنہوں نے اُمت کے درد اور اصلاحِ احوال کی بے پناہ آرزو کے تحت اپنی شہرۂ آفاق 'مسدّس' لکھ ڈالی۔ جس کے سرنامے کے یہ دو اشعار تو ابدی اور غیر فانی ہیں کہ ؎

"پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!"

اور اسی طرح آخر میں 'مناجات بحضور سرورِ کونین' کے یہ دو اشعار بھی نہایت دردانگیز اور رقت آمیز ہیں: "اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!"

پھر ذرا تصور کیجئے اُن جرأت مندانہ اور ولولہ انگیز مضامین و مقالات کا جو پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکوں کی حمایت میں نکلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے سحر آفریں 'الہلال' میں! ـــــ اور اس تحریک کی تیزی اور تُندی کا عالم یہ تھا کہ نہ صرف یہ کہ پورے برِّصغیر کی فضا اس شعر کی صدائے بازگشت سے گونج اُٹھی تھی کہ:

؎ "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو!"

بلکہ ہندوؤں تک کو اِس تحریک میں شمولیت اختیار کرنی پڑی تھی۔ اِس لیے کہ آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے شدت کے ساتھ محسوس کر لیا تھا کہ اگر اس وقت اِس تحریک کا ساتھ نہ دیا تو پورا پولیٹیکل کیریئر ختم ہو کر رہ جائے گا!

تیسرا سبب : تقسیم در تقسیم کا اندیشہ

اِس ضمن میں تیسری اور آخری لیکن نہایت اہم بات یہ ہے کہ اگر زمینی تعلق ہی کو قومی جذبہ کی بنیاد بنانے پر زور دیا جائے تو اِس سے اتحاد نہیں، انتشار وجود میں آئے گا۔ اِس لیے کہ یہ نظریہ ایک ایسے حیوان کے مانند ہے جو اپنے دشمن کو خود اپنے ہی دودھ سے پالتا ہے۔ چنانچہ 'وطنی قومیت' ہی کے بطن سے علاقائی قومیتیں جنم لیتی ہیں اور اُسی کی چھاتیوں سے دودھ پی کر پروان چڑھتی ہیں!

اِس ضمن میں بھارت کا معاملہ اگرچہ پاکستان سے قدرے مختلف ہے کہ لفظ بھارت بھی کئی ہزار سال پُرانا ہے اور 'مہا بھارت' کا تصور بھی نہایت قدیم ہے جبکہ، جیسا کہ اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، پاکستان کا تو نام ہی حادثِ محض ہے، اِس کے باوجود 'وطنی قومیت' کے نظریے میں تقسیم در تقسیم کے جو بیج بالقوہ — (POTENTIALLY) موجود ہوتے ہیں اُس کا نقشہ وہاں بھی نظر آ رہا ہے اور علاقائی قومیتیں اور مقامی عصبیتیں نسلی اور لسانی عوامل سے مزید تقویت پا کر نہایت تیزی اور تندی کے ساتھ سر اُٹھا رہی ہیں اور بھارتی قیادت کو اپنی مُلکی وحدت و سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم و مسلسل اور شدید و جاں گُسل محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ اِس پس منظر میں دیکھا جائے تو پاکستان کا معاملہ بے حد نازک اور کمزور ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کا تو تصور بھی پچاس سال سے زیادہ کی تاریخ نہیں رکھتا۔ اور کم از کم اس نام کے ساتھ کسی سیاسی وحدت اور اُس کی عظمت و سطوت کی کوئی تاریخ موجود نہیں لہٰذا اگر اِس کی اساس پر وطنی قومیت کا راگ الاپا گیا تو اصل تقویت سندھی، بلوچی، پختون اور پنجابی قومیتوں کو حاصل ہوگی۔ اِس لیے کہ اگر فی الواقع زمینی رشتہ ہی مقدس ہے تو ایک سندھی کے لیے سندھ کے وطن ہونے کا تصور زیادہ قریبی بھی ہے اور قدیمی بھی! پھر اِس کو تقویت دینے کے لیے خاص طور پر لسانی عامل موجود ہے جو نہایت قوت کا حامل ہے! اور ظاہر ہے کہ پاکستان کا لفظ بھی نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں،

اور اِس کی حدود بھی ہرگز نہ کتاب و سُنّت سے ماخوذ ہیں نہ اُن پر مبنی، تو پھر اگر وطن ہی کو پُوجنا ہے تو سرزمینِ سندھ کو کیوں نہ پُوجا جائے! وَقِسْ عَلیٰ ذٰلِکَ! بقول غالب "وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو"

اِس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان کے استحکام کے لیے نہ تاریخی تقدس کا عامل موجود ہے نہ ہی 'جغرافیائی عوامل' اِس کے پشت پناہ ہیں، پھر کوئی نسلی، لسانی یا وطنی قومیت کا جذبہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو اِس کے استحکام کے لیے پختہ اساس اور سنگین بنیاد کا کام دے سکے ـــــ لہٰذا اِس کے اِستحکام کا کُل دارومدار صرف ایک چیز پر ہے اور وہ وہی ہے جس نے اِسے جنم دیا تھا ـــ یعنی 'مذہبی جذبہ'!! ـــ!! گویا پاکستان کا معاملہ بالکل ع "کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو!" والا ہے کہ اگر اسے اپنی بقا مطلوب ہے اور یہ کسی دوسری طاقت کا طفیلی یا زیر دست بن کر نہیں بلکہ باوقار اور باعزّت اور حقیقتاً آزاد اور خود مختار ہو کر باقی رہنا چاہتا ہے تو اِس کے لیے کوئی اور چارۂ کار سِرے سے موجود ہی نہیں ہے سوائے اِس کے کہ یہ اِسلام کا دامن تھامے اور اُسی کا سہارا لے۔

یہ بات ہر اُس شخص کے لیے اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے جو کسی بھی وجہ سے پاکستان کے بقاء و استحکام کا طالب اور خواہشمند ہو۔ اِس لیے کہ اگر کوئی بدبخت کسی سبب سے اپنے ذہن و قلب سے پاکستان کو بالفعل 'محو' (WRITE – OFF) کر ہی چکا ہو تو بات دوسری ہے، اُس کے لیے تو ہماری یہ پوری بحث ہی غیر متعلق بھی ہے اور لایعنی بھی، لیکن جو شخص بھی دل سے پاکستان کا بقاء و استحکام چاہتا ہو اُس کے لیے انشاء اللہ العزیز ہمارا یہ تجزیہ فیصلہ کُن ثابت ہوگا اور وہ اِس حقیقت کو جان لے گا کہ اگرچہ عوام کی فلاح و بہبود، انتظامی مشینری کی اصلاح و تطہیر اور مختلف علاقوں کے رہنے والوں اور مختلف

طبقات سے تعلق رکھنے والوں کا اعتماد و اطمینان بھی نہایت اہم امور ہیں اور ان کے بغیر بھی یقیناً پاکستان مستحکم نہیں ہو سکتا — اور خاص طور پر موجودہ حالت میں تو ان کی اہمیت بہت ہی زیادہ بڑھ گئی ہے اور ان امورِ ثلاثہ کے ضمن میں جو شدید کوتاہی مسلسل ہو رہی ہے اگر جلد از جلد اُس کی تلافی کی صورت پیدا نہ ہوئی تو شدید اندیشہ ہے کہ یہ بچا کھچا پاکستان بھی ع "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!" کا مصداق بن جائے — تاہم پاکستان کے دوام و استحکام کی اصل اساس یہ چیزیں نہیں بلکہ صرف اور صرف اسلامی جذبہ ہے اور اگر وہ جلد از جلد بھرپور انداز میں بروئے کار نہ آیا تو باقی تمام چیزوں کی اصلاح کے باوجود پاکستان یا تو اپنی سالمیت ہی کو برقرار نہیں رکھ سکے گا اور اس کے حصے بخرے ہو جائیں گے یا اگر باقی رہے گا بھی تو کسی دوسری بڑی طاقت کا طفیلی یا زیر دست ہو کر!!! —

اب اس سے قبل کہ ہم آگے بڑھیں اور تفصیل کے ساتھ عرض کریں کہ وہ مذہبی جذبہ جو اَب پاکستان کے استحکام کی حقیقی اور واقعی — اور مضبوط اور پائدار بنیاد بن سکتا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے قطعاً مختلف ہے اُس 'مذہبی جذبے' سے جس نے پاکستان کو جنم دیا تھا اور جو آج سے تقریباً نصف صدی قبل تحریکِ پاکستان کی روحِ رواں بنا تھا — راقم قائدِ اعظم مرحوم کے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے جملے کے بارے میں اپنی توجیہہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

راقم کے نزدیک قائدِ اعظم کا وہ قول نہ تو اُن کے سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر تھا — اِس لیے کہ قائدِ اعظم مرحوم خواہ ایک 'مذہبی شخصیت' نہ تھے تاہم ہرگز دنیا کے عام سیاستدانوں کے مانند جھوٹے اور فریبی نہیں تھے اور اُن کے کردار کی مضبوطی، سیرت کی پختگی، ظاہر و باطن کی یکسانیت اور صداقت و امانت کا لوہا اُن کے بدترین دشمن بھی مانتے ہیں — اِسی طرح اُن کا وہ متنازعہ جملہ حالات کے وقتی دباؤ کے تحت اعصاب کے متأثر ہو جانے کا بھی مظہر نہیں تھا' اِس لیے کہ قائدِ اعظم کے اعصاب ہرگز اتنے کمزور نہ تھے بلکہ وہ واقعۃً فولادی اعصاب کے مالک تھے اور بُرے سے بُرے حالات

میں بھی اُن پر کبھی گھبراہٹ یا سراسیمگی کے طاری ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی ـــــ راقم کے نزدیک اُن کے اِس قول کی اصل توجیہہ اور اُن کے سابق مؤقف کے ساتھ اُس کی مطابقت و موافقت کی صورت یہ ہے کہ پیشِ نظر اوّلاً برِ صغیر پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کے دین و مذہب، تہذیب و ثقافت اور سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت و مدافعت تھی جو قیامِ پاکستان کی صورت میں بتمام و کمال حاصل ہو گئی اور اِن چیزوں کے ضمن میں ہندوؤں کے نامنصفانہ بلکہ متعصبانہ رویّے سے پیدا شدہ خطرات کا سدِّباب ہو گیا، ثانیاً پاکستان میں واقعتہً اسلامی نظام کے بالفعل قیام کے ضمن میں اُن کے پیشِ نظر ایک خالص جمہوری طریقہ تھا۔ یعنی یہ کہ اگر پاکستان کے مسلمانوں میں جو ایک غالب اور فیصلہ کُن اکثریت میں ہیں، واقعتہً اسلام کے ساتھ حقیقی اور واقعی لگاؤ پیدا ہو جائے اور وہ حقیقتہً اور واقعتہً اسلامی تہذیب و تمدّن کے فروغ اور اسلامی قانون و شریعت کے نفاذ و اجراء کے خواہاں بن جائیں تو خالص سیکولر جمہوری نظام بھی اُن کے راستے میں ہرگز رکاوٹ نہیں بن سکتا اور اُن کے "اجتماعی ارادے" (COLLECTIVE WILL) کے بروئے کار آنے میں ہرگز کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی، لہٰذا فوری طور پر دستوری اور قانونی سطح پر مذہبیت کا راگ الاپنے اور پوری دنیا کو خبردار اور چوکنّا کر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک جمہوری نظام میں قانون سازی کا سارا دار و مدار کثرتِ رائے پر ہوتا ہے لہٰذا اگر بالفرض پاکستان میں ایک سیکولر لیکن حقیقتہً جمہوری نظام قائم ہو جائے تو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو دین و مذہب کی جانب پیش قدمی سے کوئی چیز روک نہیں سکتی!

اب یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو قائدِ اعظم کی اِس رائے سے اختلاف ہو اور وہ اِس طریقِ کار کو اسلامی نظام کے قیام اور قانونِ اسلامی کے نفاذ و ترویج کے لیے درست اور مؤثر نہ سمجھے لیکن اِس توجیہہ سے وہ سارے اِشکال حل ہو جاتے ہیں جو اِس جملے کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ کسی انحراف کا کوئی سوال باقی رہتا ہے نہ کسی وقتی اور فوری سراسیمگی کا ـــــ هٰذَا مَا عِنْدِی وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ!

ـــــــــــــــ

پس نوشت

پیش نظر مضامین اس مقام تک وسط اکتوبر ۱۹۸۵ء میں بمقام طائف ضبطِ تحریر میں آگئے تھے، بقیہ حصے واپسی پر سپردِ قلم ہوئے۔ اِس اثنا میں تحریکِ پاکستان کی تاریخ سے متعلق بعض کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے راقم کی نگاہ سے علامہ اقبال مرحوم کی ایک تحریر کا اقتباس گذرا جس سے ایک تو مزید انشراح حاصل ہوا کہ قائدِ اعظم کے متنازعہ الفاظ کی جو توجیہہ مَیں نے کی ہے وہ بالکل درست ہے، دوسرے اِس احساس کو تقویت حاصل ہوئی ہے کہ مصورِ پاکستان اور معمارِ پاکستان دونوں کے ذہن وفکر میں غایت درجہ ہم آہنگی اور یکسانیت تھی، علامہ مرحوم نے 'قادیانیت' کے موضوع پر پنڈت نہرو سے مراسلت کے دوران میں کسی موقعہ پر لکھا :

" قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کے مغربی تصور کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری حاصل کی جائے حق بجانب ہوگی ...."

('پاکستان کی نظریاتی بنیادیں' مؤلفہ ڈاکٹر وحید قریشی ص ۸۵-۸۴ بحوالہ 'حرفِ اقبال' ص ۱۷۳)

مردانہ منتخب

دِل افگندیم

(آخری قسط)

بسم اللہ مجرٖھا و مُرسٰھا

مولانا سید الرحمٰن علوی

نظم جماعت اور بیعت کی بنیاد پر انقلابی جماعت کی تشکیل کی فکر

اس دور میں حضرت شیخ الہندؒ کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے جس کی پشت پر حضرت الامام الشاہ ولی اللہؒ کی فکر اور حضرت الامیر السید احمد بریلویؒ کا طریق کار تھا یعنی ایک انقلابی جماعت کی تشکیل، جو بیعت کی بنیاد پر تیار ہوا۔

اسلام آباد کے ایک نیم حکومتی ادارہ "تحقیق تاریخ و ثقافت" کے اہتمام میں "جمعیۃ علماء ہند" نامی دو ضخیم مجلدات پر مشتمل کتاب اور محترم ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کی کتاب "نظم جماعت" مطبوعہ لاہور (سنی پبلیکیشنز اردو بازار) کا اس سلسلہ میں مطالعہ بڑا مفید ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد خلد آشیانی کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے دین اسلام کے چشمہ ہائے صافی اور تاریخ کے مستند حوالوں سے اہل علم و عرفان کو اس طرف متوجہ کیا اور حضرت شیخ الہندؒ جیسے عظیم المرتبت انسان نے اس "چھوٹے" کی بات کا وزن محسوس کر کے اس کا اعتراف فرمایا کہ

"اس نوجوان نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔"

گویا تاریخ کی گنتی کی شخصیات میں سے ایک یعنی شیخ الہندؒ نے اپنی عظمت کا ثبوت اس طرح دیا کہ بقول کسے ایک "رند قدح خوار" کو جوہر قابل سمجھ کر اسے اس مقصد کے لئے نہایت درجہ موزوں انسان قرار دیا اور اس کی خواہش ظاہر کی کہ وہ آگے بڑھے۔

مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی قدس سرہٗ کے حوالہ سے یہ روایت چھپ چکی ہے کہ ایک موقعہ پر جب مدرسہ دیوبند کے اہل حل و عقد نے بوجوہ مولانا آزاد کی مدرسہ میں آمد پر پابندی لگائی تو شیخ الہندؒ بھی مدرسہ نہ گئے اور بعض حضرات کے سوال پر فرمایا:

"کام اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی   کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے"

المیہ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ جن کی ذات گرامی پر اس سلسلہ میں بریلی کے ایک گھرانے کے علاوہ (جن کی اس زمانہ میں خاص اہمیت نہ تھی) پورا برِاعظم متفق تھا، ان کی زندگی ٹمٹماتا چراغ تھی تو شیخ الہندؒ جسے موزوں سمجھتے تھے (مولانا آزاد) ان پر اس وقت بوجوہ اتفاق نہ ہو سکا (جس کی تفصیل ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مضامین میں آچکی ہے) وقتی طور پر عدم اتفاق کا یہ سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ دوبارہ اس کی پھر نوبت ہی نہ آئی (انفرادی اور صوبائی سطح کی مثالیں مستثنیٰ ہیں) اگر یہ کام اس وقت ہو جاتا تو ملت کی تاریخ مختلف انداز سے مرتب ہوئی۔ لیکن " وکان امر اللہ قدراً مقدوراً۔"

جمعیۃ علماءِ ہند کا کردار

جمعیۃ علماءِ ہند، جو گویا شیخ الہندؒ کے فکر کی حامل جماعت تھی، اور جسے حضرت اس انداز سے منظم کرنا چاہتے تھے کہ تحریک شہیدین کا رنگ اس میں پیدا ہو جائے۔ وہ اپنے عظیم رہنما کے انتقال کے بعد اس طرح نہ سہی، لیکن پوری سرگرمی سے مصروف کار رہی، اس کے پیش نظر ملک کی آزادی بھی تھی اور امت مسلمہ کی بہبود، اس کے مفادات کا تحفظ اور اس کی اقدار کی حفاظت بھی!

جمعیۃ علماء کے معاملے میں میرے جذبات و احساسات کی کیفیت سے ہر وہ شخص واقف ہے جس کا مجھ سے کسی بھی دائرہ میں تعلق رہا۔ اس جماعت اور اس کے اکابر سے متعلق میری واضح رائے تھی اور ہے کہ یہ حضرات سب سے زیادہ آزادی خواہ تھے ان کی قربانیاں سب سے زیادہ ہیں اور انہوں نے ہمیشہ قائدانہ حیثیت سے اپنا رول ادا کیا۔ جمعیۃ کی تاریخ کا یہ اعزاز اس سے کوئی نہیں چھین سکتا کہ اس نے مسلم لیگ چھوڑ کانگریس سے بھی پہلے مکمل آزادی کے پروگرام کا اعلان کیا۔ اس کے علاوہ کانگریس سے معاہدہ کیا یا کسی موقع پر مسلم لیگ سے، ہر جگہ اس کے پیش نظر محض اسلام اور مسلمانوں کی روایات تھیں۔ اگر کسی "معاہد" نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی تو اس سے کھلا اختلاف کیا اور کسی بھی شکل میں اپنی روایات کو ترک نہیں کیا۔ (اس سلسلہ میں توفیق الٰہی سے ایک الگ مضمون کی کوشش کروں گا، والامر بید اللہ تعالیٰ)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس جماعت کے لئے "ضمیمہ" کا لفظ استعمال کیا تو اس سے جہاں ان حضرات کو صدمہ پہنچا وہاں مجھے بھی بے حد کوفت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بعد میں تقریراً و تحریراً اپنی بات کی وضاحت کردی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ہے دانستہ کسی کے تابع ہو جانا اور جان بوجھ کر کسی کے نقش پا پر چلنا۔ جمعیۃ کے اکابر اس سے بہت بلند تھے، ایک شکل یہ ہے کہ کسی کے عمل سے

کوئی دوسرا ایسا نتیجہ اخذ کرلے' اس کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے ۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کے بعد تقسیم کے سوال پر کانگریس و مسلم لیگ کے کیمپ لوگوں کی نظر میں مستقل قرار پائے تو جمعیۃ سمیت باقی سب جماعتوں کو لوگوں نے ان سے جوڑ دیا' ایسی سوچ بہرحال لوگوں میں تھی' جس سے اس قسم کا نتیجہ نکالا گیا لیکن ضروری نہیں کہ یہ نتیجہ اور یہ سوچ صحیح ہو اور میری نہایت نپی تلی رائے یہ ہے کہ جمعیۃ کا انفرادی مزاج' اس کی خصوصیات بالکل برقرار رہیں ۔

تاریخ کی مظلوم شخصیت' مولانا آزاد

رہ گیا معاملہ مولانا ابوالکلام آزاد کا' تو وہ تاریخ کی مظلوم ترین شخصیات میں سے ایک ہیں' بیگانوں سے کیا گلہ' انہوں نے بھی ان سے انصاف نہیں کیا۔ دنیا کا کون سا الزام ہے جو ان پر نہیں لگایا گیا' حتیٰ کہ اس کی دشمنی میں' اس کی قید کے زمانہ میں اس کی عفیفہ بیوی کے جنازہ پر خشت باری کی گئی اور یہ کام انہوں نے کیا اور کرایا جو مستقبل میں اسلام کے دعویدار بن کر سامنے آ رہے تھے ۔ حضرت امیر شریعت السید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اسی جنازہ کے ساتھ اس بدسلوکی پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تقریر میں جو کچھ کہا تھا' وہ پورا ہوا اور تقسیم کے ہنگاموں میں' عزتیں' جانیں اور مال اس طرح برباد ہوئے کہ الاماں! خیر ہم تلخی سے الگ رہ کر اپنے محترم قارئین کو توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ حالات کی رفتار ہمیشہ یکساں نہیں رہتی ۔ زمانہ تغیر پذیر ہے' اس کے تقاضے مختلف ہوتے رہتے ہیں اور ایک دیدہ ور قائد و رہنما حالات کی مناسبت سے بنیادی اصولوں پر قائم رہ کر منصوبہ بندی کرتا ہے' اس سلسلہ میں حضرت خاتم النبیین والمعصومین محمد عربی علیہ السلام کا اسوہ ہمارے لئے سب سے بڑی دلیل ہے' آپ کو کہیں "کُفُّوا اَیدِیَکُمْ" کا حکم ہے تو کہیں "اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا" کا مرحلہ نظر آتا ہے ۔

برصغیر پاک و ہند جس کے حوالہ سے گفتگو ہو رہی ہے' اس میں حالات کی رفتار جس انداز سے سامنے آتی ہے' اسی انداز سے مسلم رہنما سرگرم عمل نظر آتے ہیں" الف ثانی" کے بعد جب اس خطہ کو "مرکز تجدید" بننے کا شرف حاصل ہوا تو" باب تجدید" کے " فاتح" حضرت الامام مجدد سرہندی قدس سرہ اہل اقتدار سے روابط قائم کر کے ان کی اصلاح میں کوشاں نظر آتے ہیں ۔حضرت الامام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ ایک مرحلہ پر نواب نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی سے روابط قائم کر کے " اصلاح احوال" کے لئے فکرمند ہیں تو وہی" امام زماں" پھر تعلیم' تدریس' تصنیف اور تزکیہ کے ہو کر رہ جاتے ہیں ـــــ ہم نے پہلے اشارہ کیا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ فکری تطہیر و تزکیہ کے بعد "مخلصین" کی جماعت تیار ہو گی تو بات بنے گی ۔ ان کے خلف عزیز شاہ عبدالعزیزؒ نے جب محسوس کیا

کہ اب تطہیرِ فکر کا کام ہو گیا، اور اب "اقدام" ممکن ہے تو انہوں نے حضرت الامیر السید بریلوی کو اس مہم پر لگا دیا۔ سید صاحب قبلہ نے اقدام کے ساتھ حکمرانوں سے روابط کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا (جیسا کہ ان کے مکتوبات سے ظاہر ہے) اس طرح اس خطہ میں ۱۸۵۷ء تک اقدامی حالات کی کیفیت غالب رہی اور ۱۸۵۷ء کے بعد اسی قافلہ کے باقی حضرات نے حالات کے پیشِ نظر نئی منصوبہ بندی کی جس پر حضرت شیخ الہندؒ کے دور تک کام ہوتا رہا، حتیٰ کہ شیخ الہندؒ نے پھر اقدام کا فیصلہ کیا لیکن اہلِ نظر واقف ہیں کہ آپ کی اسارت کے باعث (جس کے اسباب و وجوہات کی داستان کا موقعہ نہیں) اقدام کا موقعہ ہی نہیں آیا۔

اس پورے پس منظر اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ہی ابوالکلام جیسے "نابغہ" کے کردار کا جائزہ لینا ہوگا۔ مولانا قرآنی فکر اور جہاد کے ذریعہ جس انقلاب کی خاطر اٹھنے کا عزم رکھتے تھے اور جس کیلئے انہوں نے اپنی بساط کے مطابق ۱۹۱۳ء ہی میں بیعت کی اساس پر "حزب اللہ" قائم کر دی تھی ظاہر ہے کہ اس کی مؤثر عملی صورت اسی جماعت سے بنتی جو شیخ الہندؒ بنانا چاہتے تھے۔ جن کے ہاتھ پر خود انہوں نے ۱۹۱۵ء میں بیعت کر لی تھی۔ لیکن جب وہ نہ بن سکی تو "ابوالکلام" نے اپنی عظمت و مقام کے پاسِ خاطر سے پھر کبھی اس کا نام تک نہ لیا، البتہ وہ قرآنی فکر کی طرف برابر لوگوں کو توجہ دلاتے رہے۔ جب وہ بھرپور سیاسی جنگ لڑ رہے تھے اور قومی آزادی میں سرگرم عمل تھے، اس وقت بھی یہ نغمہ ان کی زبان پر تھا۔ جس کا ثبوت رام گڑھ اجلاس کانگریس کا خطبۂ صدارت ہے، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ملکی حالات ایسے گھمبیر ہوتے چلے گئے کہ مولانا اور ان کے رفقاء اس انداز سے نظم جماعت کا کام نہ کر سکے لیکن قرآنی بصیرت کی طرف لوگوں کو بلانا اور اس روشنی کی دعوت دینا برابر جاری رہا، اسی حقیقت کی طرف محترم ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہ جہان پوری نے چند سال قبل انجمن خدام القرآن کے محاضرات میں توجہ دلائی ان کا مقالہ "حکمت قرآن" میں شائع شدہ موجود ہے اور اسی انداز کا ان کا ایک مقالہ اس دور میں احقر نے "ہفت روزہ خدام الدین لاہور" میں چھاپا (جب میں اس کا مدیر تھا) —— مقصد اس سے یہی تھا کہ لوگوں کی توجہ قرآن کی طرف ہو، وہ اس کتاب ہدیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس کی روشنی میں اپنا نظم بنائیں —— افسوس اس خطہ کے رنگا رنگ سیاسی حالات نے انہیں اس کا موقع فراہم نہ کیا، حتیٰ کہ ملک تقسیم ہو گیا اور اب ایک نئی صورت پیدا ہو گئی۔ مولانا اس کیمپ میں سے تھے جو تقسیم کا حامی نہ تھا بلکہ اس قافلہ کے سرخیل، جس خطہ میں وہ رہ گئے اس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم اور خوف کی تلوار ہر وقت ان پر مسلط، ابوالکلام نے اس دور میں اپنی وفات تک اس خوف و ہراس کو

دور کرنے کی فکر کی مسلمانوں کو عقیدہ و عمل کے اعتبار سے مخلص مسلمان بننے کی تلقین کی اور برابر وہ نغمہ الاپتے رہے جس کے سبب ان کی روح ہمیشہ بیقرار رہی۔

جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی مولانا آزاد کے بعد "تجدید و احیائے دین" کے لیے انقلابی انداز کی حامل جماعت کے قیام کی کوشش مولانا مودودی نے کی تو اس کے لیے انہوں نے مولانا آزاد ہی کے فکر سے اقتباس کرتے ہوئے قرآن و جہاد کو اساس بنایا اور اگر انہوں نے مولانا آزاد سے اپنے اس فکری تعلق کے اعتراف میں تامل کیا تو اس کے چند در چند اسباب تھے جن کی تفصیل کا موقعہ نہیں۔

بہر حال ان کی دعوت و پکار میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے اساطین علم ادھر متوجہ ہوئے بلکہ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا صبغۃ اللہ بختیاری مدراسی (حال سربراہ تحریک احسانی) جیسے حضرات تو اتنے شدید درجہ کے وکیل بنے کہ نہ صرف دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور بلکہ آستانہ عالیہ تھانہ بھون تک دعوت لے کر گئے۔ لیکن افسوس یہ ہوا کہ یہ قافلہ اتنی جلدی منتشر ہونا شروع ہوا کہ اس کا کسی کو احساس تک نہ تھا۔ چنانچہ اوّلاً مولانا نعمانی اور مولانا علی میاں ایسے حضرات نے اس وقت کی کل ممبر شپ کی تقریباً ایک تہائی تعداد کے ساتھ علیحدگی اختیار کی اور تقسیم کے بعد تو محفل اس طرح اجڑی کہ وہ پھر رنگ کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی ایسے بزرگ مصنف و عالم سے لے کر ڈاکٹر اسرار احمد ایسے نوجوان اور باہمت کارکن تک بڑی تعداد قافلہ سے جدا ہو گئی۔ بنا بریں آج جماعت قیادت کے شدید بحران سے دوچار ہے۔

تقسیم سے قبل کی علیحدگی اور تقسیم کے بعد کے بحران کے اسباب ڈھکے چھپے بھی نہیں۔ لیکن اس وقت کی گفتگو کے دائرہ سے باہر ضرور ہیں۔

اس کوشش کی ناکامی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ مولانا مودودی علوم عالیہ قرآن و سنت کے سلسلہ میں استناد سے محروم تھے۔ علماء کے ایک طبقہ نے اس سے خطرات محسوس کئے اور ایک موقع پر تحریک تحفظ ختم نبوت کے نامور رہنما، بیدار مغز عالم، امام العصر سید محمد انور شاہ کاشمیری قدس سرہ کے مخصوص شاگرد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے رفیق و جلیس مولانا محمد علی جالندھری اور مشہور محدث و فقیہ مدبر سیاستدان اور مفکر مولانا مفتی محمود رحمہما اللہ تعالیٰ جیسے مخلص حضرات نے انہیں توجہ بھی دلائی اور خاص طور پر تفسیر قرآن اور فقہی معاملات میں احتیاط کا مشورہ

دیا تاکہ باقی دائروں میں ان کی صلاحیتوں سے ملک فائدہ اٹھا سکے لیکن افسوس کہ اس مشورہ کی پذیرائی نہ ہوئی۔

تقسیم کے بعد ملک کے دونوں حصوں کی نہایت ذمہ دار اور مخلص علمی و فقہی شخصیات نے ان کے فکر و علم کی غلطیوں کو میزان میں تولنا ضروری سمجھا اور مسئولیتِ آخرت کے احساس کے سبب انہیں بسا اوقات شدید قسم کی زبان، فتویٰ تک استعمال کرنا پڑی۔ شیخ الاسلام حضرت الامام السید حسین احمد مدنی، شیخ التفسیر حضرت الامام مولانا احمد علی لاہوری سے لے کر بوذرِ عصر مجاہد گرامی مولانا غلام غوث ہزاروی (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے بہت سے لوگ بوجوہ الرجک ہو سکتے تھے (گو یا ان کی الرجی کی بنیاد بھی صحیح نہیں) لیکن تاریخ میں ایسا موڑ بھی آیا بلکہ کئی موڑ کہ حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی، فقیہہ ہند مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، محدث کبیر، مہاجر مدینہ مولانا محمد زکریا سہارنپوری، امیر المومنین فی الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی اور مفتی اعظم مولانا محمد شفیع دیوبندی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے حضرات بھی فکر و علم کی غلطیوں پر خاموش نہ رہ سکے۔

مثال کے طور پر مولانا محمد شفیع صاحب کی ایک تحریر ملاحظہ فرمائیں جو ان کی مختلف فقہی تحریرات کے نہایت درجہ قابلِ قدر مجموعہ "جواہر الفقہ" (۲ جلد) کی پہلی جلد کے صہ ۱۶۱ پر ہے۔ فرماتے ہیں:

"احقر کے نزدیک مودودی صاحب کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ عقائد اور احکام میں ذاتی اجتہاد کی پیروی کرتے ہیں، خواہ ان کا اجتہاد جمہور سلف کے خلاف ہو۔ حالانکہ احقر کے نزدیک منصبِ اجتہاد کے شرائط ان میں موجود نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی تحریروں میں علماء سلف یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر تنقید کا جو رویّہ اختیار کیا ہے وہ انتہائی غلط ہے۔ خاص طور سے خلافت و ملوکیت میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو جس طرح ہدفِ تنقید ہی نہیں بلکہ ملامت کا ہدف بھی بنایا گیا ہے وہ جمہور علماء اہلسنت کے طرز سے بالکل خلاف ہے۔ نیز ان کے لٹریچر کا مجموعی اثر بھی اس کے پڑھنے والوں پر بہ کثرت یہ محسوس ہوتا ہے کہ سلف صالحین پر مطلوب اعتماد نہیں رہتا اور ہمارے نزدیک یہ اعتماد ہی دین کی حفاظت کا بڑا انحصار ہے۔ اس سے نکل جانے کے بعد پوری نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ بھی انسان نہایت غلط اور گمراہ کن راستوں پر پڑ سکتا ہے۔"

اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی جیسا فرشتہ سیرت انسان، باوجود سابقہ تعلق اور باوجود اس کے کہ بعد میں بھی مولانا سے ان کا مخلصانہ رشتہ استوار رہا، "چار بنیادی اصطلاحات" پر قلم اٹھانے پر

مجبور ہو گیا، اور اسی پر بس نہیں مصر کے "الاخوان" کے مرشد ثانی الشیخ حسن الھضیبی مرحوم نے اپنی کتاب "دعاۃ لا قضاۃ" میں اس فکر پر تنقید کی۔ معاملہ قرآن وجہاد اور اس کے حوالہ سے نظم جماعت تک رہتا تو تاریخ کے دھارے کی کیفیت اور ہوتی، لیکن اشہب قلم کی برق رفتاری جب خرمن اسلاف کو لپیٹ میں لینے لگی تو پھر کون تھا جو نہ بدکتا۔۔۔ مولانا سید علی میاں نے اپنی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح" میں مولانا مودودی کے دور حیدر آباد کے مضامین ورسائل اور اسی طرح جماعت کی تشکیل کے بعد بالکل ابتدائی دَور کی خدمات کو سراہنے کے بعد جو بات لکھی، وہ ہمارے دل کی آواز ہے:

> اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خوش قسمتی ہوتی اگر وہ اسی کام کو اپنی خداداد صلاحیتوں کے اظہار کا میدان اور اپنی زندگی کا مقصد وموضوع بنا لیتے، لیکن انہوں نے اس کے ساتھ فکر اسلامی کی تشکیل جدید یا "الٰہیات اسلامیہ" کی تشکیل جدید کے طرز کا کام شروع کیا۔۔۔۔ الخ (صفحہ ۲۳، طبع سوم مطبوعہ کراچی)

بقول مولانا علی میاں اس معاملہ میں انہوں نے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" نامی اپنی تحریر کو بنیاد بنایا اور ثابت کرنا چاہا کہ ایک محدود مدت کو چھوڑ کر بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان الفاظ کے اصلی معانی ہی بدل گئے اور ایسا یہ وہ پڑا کہ قرآن کی تین چوتھائی سے زائد تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی (مفہوم مولانا علی میاں صفحہ ۱۰۲)

اے کاش مولانا مودودی، مخلص اہل تنقید کی بات کا وزن محسوس کرتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی اور علی میاں کے بقول اپنی تحریروں سے ایک طبقہ کو اسلام کے معاملہ میں جو شعور بخشا تھا وہ طبقہ ملت کے اعلیٰ مقاصد کے کام آتا لیکن فیا حسرتا ۔۔۔۔ ایسا نہ ہو سکا، حتیٰ کہ جماعت میں بدقسمتی سے ایک عنصر ایسا بھی پیدا ہو گیا جو ہر کسی کو مستحق تنقید سمجھتا ہے۔ نہیں سمجھتا تو مولانا کی ذات کو، اس کے باوجود ایسے لوگوں کی بالخصوص نوجوانوں کی کمی نہیں، جنہیں حکمت وتبلیغ اور احسن انداز سے اب بھی عظیم مقاصد کے لئے ساتھ لیا جا سکتا ہے، محبت وخلوص بڑا قیمتی سرمایہ ہے، اس سرمایہ کا استعمال مفید نتائج پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اب جبکہ مولانا مودودی اس دنیا میں نہیں، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہوئے ان کے اخلاف واعوان سے یہ درخواست بےجا نہ ہوگی کہ وہ حزبی اور گروہی فکر کے دائرہ سے نکل کر اسلام اور ملت کے وسیع تر مفاد میں سوچنے کی فکر کریں، اور یہی درخواست ہر اس باشعور شہری سے ہے جو اس وقت وطن عزیز ہی نہیں، پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی کا خواہاں ہے۔ لیکن سوچ لیں کہ اس کا انحصار وسعت ذہنی وفکری خلوص ومحبت اور جہد مسلسل پر ہے: اپنے اپنے

حزب اور فکر میں محصور رہ کر ہر شخص اپنی عقیدت کا چراغ تو جلا سکتا ہے، ملت و امت کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔

مولانا مودودی سے متعلق ایک اہم سوال

اس مرحلہ پر ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر مولانا مودودی نے واقعتہً طریق سلف پر تنظیم کے ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو جوڑنے کی کوشش کی تھی تو انہوں نے اپنی جماعت کی اساس بیعت پر کیوں نہ رکھی؟ یہ سوال بہر حال اہم ہے لیکن ظاہر ہے کہ کم از کم میرے پاس اس کا کوئی واضح اور مفصل جواب نہیں۔ اس کا جواب یا مولانا خود دے سکتے تھے یا ان کی فکر کے حامل حضرات دے سکتے ہیں، میں تو صرف اسی قدر عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ دنیا سے جانے والے جا چکے۔ ان کا نامۂ عمل لپیٹ دیا گیا۔ اب زندوں کا معاملہ ہے۔ ان سے ان کے افکار و اعمال حیات کا حساب ہونا ہے۔ ان پر لازم ہے کہ "وہ خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے" (یہ الفاظ مولانا ہی سے مستعار لئے گئے ہیں) اپنا بوجھ کسی پہ نہ ڈالیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی عقل اور فہم سے اپنی آخرت کی فکر کریں۔

رب العزت انہیں، ہمیں اور سبھی کو راہ حق کا مردکار بنائے اور آخرت کی رسوائی سے محفوظ رکھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیم اسلامی

مولانا مودودی کے بعد اب قرآن اور جہاد ہی کی اساس پر ایک انقلابی طرز کی نئی دینی جماعت کے قیام کا بیڑا اٹھایا ہے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اور انہوں نے تنظیم اسلامی کی بنیاد رکھی ہے بیعت پر۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی داستان حیات ان کے بہت سے مضامین کے ذریعے سامنے آ چکی ہے "سرافگندیم" نامی کتابچہ بھی اسی سلسلہ میں موجود ہے کہ وہ کن کن مراحل سے گذر کر یہاں تک پہنچے اور اپنا موجودہ کام شروع کیا۔ احقر سے ان کے ربط و ضبط کی داستان اس مضمون کی پہلی قسط میں تفصیل کے ساتھ آ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن حکیم سے گہرا قلبی تعلق اور غیر معمولی ذہنی مناسبت عطا فرمائی ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کے معانی و مضامین کے بیان اور خصوصاً اس کی دعوت کی اشاعت کی نمایاں صلاحیت بھی عطا فرمائی ہے اور اگرچہ ان کے حالیہ دورۂ ہند کے موقع پر جامعہ رحیمیہ، درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مہتمم مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ نے ان کے علم و فہم دینی اور وسعت مطالعہ و معلومات کے پیش نظر انہیں دستار فضیلت بھی عطا فرما دی ہے تاہم انہیں قطعاً یہ دعویٰ نہیں کہ وہ مستند عالم ہیں بلکہ وہ میڈیکل کی تعلیم سے قبل اس دوران اور بعد میں اہل علم سے استفادہ کرتے رہے۔ اسی کا وہ اظہار کرتے ہیں اور اس معاملہ میں مولانا امین احسن اصلاحی کے سب سے زیادہ ممنون احسان ہیں اور اس کا انہیں اعتراف ہے۔

میرے علم کے مطابق انہوں نے بہت سے لوگوں کی خواہش کے باوجود قرآن عزیز کے جدید ترجمہ

یا تفسیر کی ترتیب کی حامی نہیں بھری، وہ اسلاف کی خدمات کے اس سلسلہ میں زبردست معترف ہیں اور خاص طور پر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ اور مولانا عثمانی قدس سرہٗ کے تفسیری نوٹس کو عزیزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔ بہرحال اس لاہور میں انہوں نے "رجوع الی القرآن" کے ذریعہ کام شروع کیا اور جب اس کے نتیجے میں احباب و رفقاء اور اعوان و انصار کا ایک حلقہ وجود میں آگیا تو "قیام جماعت" کی سعی و تدبیر کی اور اپنی ہمت و بساط کے مطابق ایک ڈھانچہ کھڑا کر دیا اور اب اسی کے لئے زندگی کھپانے کا عزم رکھتے ہیں ——— مجھے اسی چیز نے اپیل کی اور میں نے "مقصد کی راہ" میں شرکت و تعاون کا فیصلہ کیا۔

ہر ہر جزو میں کسی کا کسی سے متفق ہونا نہ ضروری ہے نہ ممکن، تاہم مقاصد کی راہ ایسی ہوتی ہے جس کے لئے جزوی اختلافات رکاوٹ نہیں بنتے۔ قرآن عزیز کا اصول معاونت "تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" ہے اور اسی کو میں نے سامنے رکھا۔

علمی مسائل و افکار میں مسلسل باہم گفتگوئیں ہوتی رہتی ہیں، میں خود ناقص العلم ہوں بلکہ بالکل تہی دامن لیکن اساتذہ کے حسنِ تربیت کے نتیجہ میں جو روشنی میسر آئی ہے۔ وہ بحمد اللہ میری رفیقِ راہ ہے۔ اس کے نتیجہ میں یا کسی مخلص خادم دین کے کسی مخلصانہ مشورہ کے نتیجہ میں کوئی بات میرے سامنے آئی تو اس کی روشنی میں موصوف سے گفتگو کرنا اور اس کے بعد صحیح فیصلہ پر پہنچنا میری زندگی کا حصّہ رہے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)۔ اللہ نہ کرے کسی وقت ایسا محسوس ہوا کہ افکار کی دنیا میں ایسا بعد پیدا ہو گیا ہے جو باہمی معاونت میں رکاوٹ ہے تو "باخیر شما بسلامت" کہہ کر اس کوچہ سے علیحدگی میں دیر نہ لگے گی۔

فی الوقت میری جو دیانت دارانہ رائے تھی میں نے اس کا لحاظ کر کے "تنظیم اسلامی" کو اپنایا ہے، رب العزت اپنے کرم بے پایاں سے ڈاکٹر صاحب کو مجھے، جملہ رفقاءِ تنظیم بلکہ ہر کلمہ گو کو اپنے فرائض کے صحیح احساس اور انکی ادائیگی کے لئے مخلصانہ جہد و سعی کی توفیق سے نوازیں، دلوں کے زیغ و ضلال سے حفاظت فرمائیں اور حسنِ خاتمہ کی نعمت سے سرفراز فرمائیں۔ ع

"ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد !!

رہا مسئلہ بیعت تو اگرچہ اس کے ضمن میں اب سے بہت پہلے مولانا سید حامد میاں خلیفہ مجاز حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ "قولِ فیصل" ارشاد فرما چکے ہیں جو "میثاق" میں شائع ہو چکا ہے۔ تاہم اس اجمال کی کسی قدر تفصیل خصوصاً ماضی قریب کی تاریخ کے حوالے سے ان شاء اللہ مفید ہوگی۔

ایک اصولی بحث بسلسلہ امارت و بیعت } (تتمۂ مکتوب)

پچھلی مفصل تحریر میں ہم نے کوشش کی کہ ہم حدیث پاک کی روشنی میں اس امر کو واضح کر سکیں کہ اس امت کا معاملہ دوسری امتوں سے مختلف ہے۔

اس کے آقا اور ہادی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ونبی تھے، ان کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد بھی اس پیغام کو دنیا میں باقی رہنا تھا جسے لے کر وہ آئے تھے ــــــ اسی حقیقت کی طرف سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں توجہ دلائی، جو انہوں نے اس وقت ارشاد فرمایا جب اللہ تعالیٰ کے نبی دنیا سے رخصت ہوئے۔ (ترجمہ ملاحظہ فرمائیں)

> اگر تو لوگ حضرت محمد علیہ السلام کی پرستش کرتے تھے تو بے شک وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے تو بے شک وہ زندہ ہے کبھی نہ مرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وما محمد الا رسول ..... الخ

چنانچہ ہم نے کوشش کی کہ اس سلسلہ کی روایات ان کے الفاظ میں جو اختلاف ہے، اور ذمہ دار شخصیات کے حوالہ سے اسکا مفہوم واضح ہو جائے۔ ساتھ ہی تاریخی طور پر اپنی سمجھ میں جو کچھ آیا، یا جو ہمارا تھوڑا بہت تاریخی مطالعہ ہے اس کی روشنی میں ضروری گذارشات پیش کر دیں۔ ہماری گفتگو کا سلسلہ بہت طویل ہو گیا لیکن بہر حال یہ حالات کا تقاضا تھا، خاص طور پر برعظیم پاک وہند کے حوالہ سے حضرت الامام مجدد الف ثانی اور حضرت الامام الشاہ ولی اللہ قدس سرھما اور ان کی تحریک سے متعلق بہت سی باتیں نوک قلم پر آگئیں اور یہ سلسلہ بڑھتا اور پھیلتا ہوا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا جو گذشتہ صدی کے رجال دین میں سے ایک اہم شخصیت اور مقام تجدید پر فائز ہونے والے باکمال انسان تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے فکر وفلسفہ کی بنیاد پر اور اسلام کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں برعظیم میں "نظم جماعت" کا اہتمام حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کیا کہ منصب امارت وامامت کے لئے حضرت سید احمد بریلوی کو موزوں قرار دے کر پورے حلقہ کو ان سے وابستہ کر دیا اس کے بعد ہی جھلک ۱۸۵۷ء کے دوران نظر آتی ہے۔ جب حضرت الامیر حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کر کے اہل علم ومردان احرار کا ایک قافلہ ترتیب پا یا رہا۔ حضرت سید صاحب کی طرح حضرت حاجی صاحب کا ظاہری علم کے اعتبار سے معاملہ قریب قریب برابر تھا۔ لیکن ایک "طریق خیر" کے احیاء کی غرض سے بڑے بڑے اہل علم ان سے وابستہ ہوئے ــــــ سید صاحب سے وابستہ ہونے والے بعض حضرات کا تذکرہ اپنی جگہ آچکا ہے۔ حاجی صاحب سے وابستہ ہونے والے حضرات میں دو اہم ایسے ہیں جو اس دور کے ہندوستان کے جملہ اہل علم پر بھاری تھے یعنی قاسم العلوم والخیرات مولانا

محمد قاسم نانوتوی اور فقیہ عصر، محدث کبیر مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہما، حاجی صاحب کی قیادت میں ان دو حضرات نے باقاعدہ جنگ کی طرح ڈالی جس میں حاجی صاحب کے پیر بھائی حضرت حافظ ضامن رحمہ اللہ تعالیٰ شاملی کے میدان میں شہید ہوئے۔ اس "اقدام" کے سلسلہ میں اہل علم میں علمی اختلاف رونما ہوا۔ بحث ہوئی۔ لیکن اقدام کے حامی غالب قرار پائے۔ جن کی ترجمانی مولانا نانوتوی کر رہے تھے۔

اس کے بعد اسی انداز و فکر سے "نظم جماعت" کا مرحلہ شیخ الہند قدس سرہ کی حیات مبارکہ میں پیش آیا۔ جس سے قارئین میثاق بہت حد تک واقف ہیں۔ نظم جماعت، بیعت کی بنیاد پر اور امارت کے مسئلہ کو بہت الجھایا جاتا ہے۔ حالانکہ بات مختصراً یہ ہے کہ اسلام اور دین فطرت کے لئے ارباب عزیمت ایک قافلہ ترتیب دے کر رخت سفر باندھنے کی فکر کرتے ہیں اور ایک شخص ان کی قیادت و رہنمائی کا فرض سرانجام دیتا ہے اور بس! ـــــ اور اس سے بہت پہلے تاتاریوں کے دور فتن میں حضرت الامام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ، اسی انداز کی جماعتی زندگی سے متعلق اہل علم اور مسلمانوں کو توجہ دلاتے نظر آتے ہیں، اس سلسلہ کی تفصیلات محترم ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہ جہان پوری نے "تحریک نظم جماعت" نامی کتاب میں جمع کر دی ہیں اور ساتھ ہی شیخ الہند اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اس سلسلہ کے افکار اور کاوشیں اس کتاب کا حصہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا آزاد کو اس دور میں اس معاملہ میں پہل کرنے کی سعادت و شرف حاصل ہے اور مولانا محمود حسن جو اس وقت پوری ملت ہی نہیں بلکہ برادران وطن کے یہاں بھی، قابل احترام اور مرکزی شخصیت تھے، انہوں نے مولانا آزاد کی اس صدا کو دل کی آواز قرار دے کر اسے سراہا۔ شیخ الہند حرمین اور استنبول کے سفر پر نہ جاتے، جس کے نتیجہ میں آپ کی اسارت مالٹا کا مرحلہ پیش آیا، تو اسی وقت اس جماعتی نظم کا اہتمام ہو جاتا لیکن تقدیر الٰہی غالب آکر رہی۔ پھر جمعیۃ علماء ہند ان کی موجودگی کے بغیر قائم ہوئی تو اس میں اس انداز کا خیال نہ رکھا گیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی پہلے اجلاس (امرتسر) کے صدر تھے دوسرا اجلاس شیخ الہند کی صدارت میں دہلی میں ہوا اور اسی وقت اس حوالہ سے گفتگو ہی نہیں ہوئی بلکہ ایک کمیٹی قائم ہو گئی جس نے "امارت شرعیہ" کا مسودہ تیار کیا، جس کی تفصیل "جمعیۃ علماء ہند" نامی کتاب میں موجود ہے۔ شیخ الہندؒ کی اس حیثیت کو مولانا احمد رضا خان کے گھرانے کے علاوہ ہندوستان کی ہر علمی تحریک و شخصیت تسلیم کرتی تھی۔ لیکن ان کی صحت کا حال پتلا تھا تو مولانا ابوالکلام، جنہیں شیخ الہند چاہتے تھے وہ "معاصرت" کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اور ملک گیر سطح پر یہ منصوبہ پروان نہ چڑھ سکا۔ تاہم صوبہ بہار" اس معاملہ میں خوش قسمت ہے کہ اس نے دولت کا شرف حاصل کیا اور صوبائی سطح پر ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء میں نظم قائم ہوا جس کے

روحِ رواں مولانا ابوالمحاسن سجاد رحمہ اللہ تعالیٰ تھے جو کچھ عرصہ مرکزی طور پر جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ بھی رہے ۔ بہار کی امارتِ شرعیہ کا سلسلہ اب تک قائم ہے بلکہ روز بروز بڑھ رہا ہے ۔ اور اس سے ملت اسلامیہ کو بے پناہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے آج کل اس کے "امیر شریعت" ہمارے فاضلِ گرامی مولانا منت اللہ ہیں جو خلف الرشید ہیں مولانا محمد علی مونگیری رحمہ اللہ تعالیٰ کے، جو بانی ہیں ندوۃ العلماء کے اور جن کی روحانی نسبت اویسی زمانہ مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ سے تھی ۔ "امارت" کا ترجمان ہفت روزہ "نقیب" جو پھلواری شریف سے نکلتا ہے ۔ مولانا منت اللہ کے کرم سے برابر موصول ہو رہا ہے جس سے اس کے پھیلتے ہوئے سلسلہ کا علم ہوتا ہے اور اب پورے ہندوستان میں ایک احساس ہے کہ اس کا دائرہ پورے ملک پر پھیلایا جائے ۔ مسلمانوں کے عائلی مسائل اور ایسی بہت سی چیزیں امارت سے متعلق ہیں ۔ جس دور میں صوبائی سطح پر بہار میں امارت کا سلسلہ قائم ہوا اسی دور میں پنجاب میں بھی اس کا اہتمام ہوا ۔ مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ جو براہِ راست شیخ الہند کے فیض یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ، شیخ الہند کے خصوصی معتمد مولانا سندھی کے عزیز و خادم تھے، ان کی انجمن خدام الدین کے اجتماع ۱۹۲۶ء میں اس کا اہتمام ہوا ۔ روحِ رواں شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ تھے تو امیر شریعت بنایا گیا ۔ السید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے خطیب العصر، نابغہ اور عبقری انسان کو ۔ لاہور کی فضائیں اس واقعہ کو کیسے بھولیں گے کہ دیوبند کا محدث کبیر پانچ سو علماء کی موجودگی میں السید بخاری کے ہاتھ پر امیر شریعت کی بیعت کر رہا ہے اور پھر اس کی قیادت میں پانچ صد علماء بھی بیعت کرتے ہیں جن میں پانچواں نمبر مولانا سید محمد یوسف بنوری کا تھا ۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا لاہوری بھی شامل تھے ۔

یہ امارت کا قیام اور بیعت کا اہتمام محض کوئی حادثہ نہ تھا؛ بالکل نہیں ۔ یہ اسی سلسلہ کی صدائے بازگشت تھی لیکن پنجاب کے مخصوص سیاسی حالات اور امیر شریعت کی ہنگامہ خیز زندگی نے بہار کی طرح اس سلسلہ کو یہاں منظم نہ ہونے دیا تاہم شاہ جی نے ایک قافلہ ترتیب دے کر پنجاب کی سیاست کا رخ بدلا ۔ قادیانیت اور اس قسم کے ناسور ختم کرنے کی سعی کی اور سب سے بڑھ کر پنجاب کے پس ماندہ علاقوں میں اصلاح عقائد و معاشرت کے ساتھ ساتھ لوگوں میں خودداری اور حریت کی روح پھونکی ۔

اس نظام کے احیاء کی ایک اور کوشش جمعیۃ علماء اسلام کے اندر ہوئی لیکن یہ ایسا واقعہ ہے جس کا کوئی ذکر تذکرہ نہیں ملتا ۔ جمعیۃ علماء اسلام سے متعلق ہم اپنے سلسلہ مضامین میں اپنے احساسات و تاثرات اور اس جماعت کی نسبت سے اپنی حقیر خدمات کا ذکر کر چکے ہیں ۔

واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد مولانا محمد صادق مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی، مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی، مولانا گل بادشاہ طور و مردان اور مولانا عبد الواحد خطیب گوجرانوالہ رحمہم اللہ تعالیٰ، جمعیتہ علماء ہند کی طرز پر جمعیتہ علماء پاکستان کی تشکیل چاہتے تھے۔ یہ سب حضرات قافلہ شیخ الہند کے رفیق و ہم سفر اور مضبوط کردار و سوچ کے مالک تھے۔ لیکن مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی خواہش تھی کہ دیوبند کی علمی تحریک کی دوسری شاخ "جمعیتہ علماء اسلام" سے ہی مل کر کام کیا جائے تاکہ اس ملک کا مقصد وجود آسانی سے پورا ہو سکے۔ اسی لیے باہم تعاون کا سلسلہ ہوا۔ لیکن ۱۹۵۶ء تک کے حالات کو دیکھ کر مجبوراً جمعیتہ کی نشاۃ ثانیہ کا اہتمام کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء تک جتنا پانی سروں سے گذر چکا تھا۔ اس کا اندازہ ہر باشعور انسان کو ہے، اس لئے علماء کو حالات کی اصلاح اور گاڑی کے رُخ کو موڑنے کے لئے شدید جد و جہد کرنا پڑی اور معاملہ جوں کا توں ہے۔

۱۹۵۸ء میں دوسری مرتبہ ملک میں مارشل لاء لگا۔ پہلا مارشل ۱۹۵۳ء کا تھا۔ جب قادیانیوں کو تحفظ دینے کے لیے مسلم لیگ کے اہل سیاست نے، سیاسی اور سول حکومت کے باوصف جزوی طور پر مارشل لاء کا سہارا لے کر فدائین ختم نبوت کو خاک و خون میں تڑپایا۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے دوران ہی مولانا لاہوری دنیا سے رخصت ہو گئے تو حافظ الحدیث مولانا عبد اللہ درخواستی کا ایسے وقت میں ان کے جانشین کے طور پر اعلان کیا گیا جب وہ حرمین شریفین میں تھے۔ اس مردِ درویش اور قلندر انسان کی خدمات ملی کی تفصیل کا یہ وقت نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی ذات اب بھی نقطۂ اتحاد بن سکتی ہے بشرطیکہ حادثات کی پیداوار لوگ ضد و تعصب کا رویہ چھوڑ دیں ـــــ ہمیں یاد ہے اور جمعیتہ کے ذمہ دار لوگ یقیناً اس کی تائید کریں گے کہ مولانا عبد الواحد جیسے منجھے ہوئے مخلص عالم نے ایک نہایت ہی نازک موقع پر جماعت کو اس طرف توجہ دلائی کہ وہ ماضی کی طرف پلٹے، مغربی اندازِ سیاست سے بالاتر ہو کر امارت اور بیعت کا طریقہ اپنائے۔ اور مولانا درخواستی جو جماعت کے امیر ہیں، چونکہ وہ ہر اعتبار سے اہل ہیں اس لیے ان کے ہاتھ پر بیعت کا سلسلہ اپنا کر اس جد و جہد کو وہ رُخ دیا جائے جس کے نتیجہ میں اصلاح کا کام آسان ہو سکے ـــــ مولانا کے بقول یہ راہ کٹھن تھی لیکن مردانِ حُر کا ایک قافلہ ان اصولوں پر مرتب ہو جائے تو پھر خطرات کی برداشت آسان ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ مولانا کی بات نہ چل سکی اور ملک کے مخصوص حالات نے اہل دین و اہل علم کو بھی مغربی اندازِ سیاست اور طریقِ تنظیم کا رسیا بنا کر رکھ دیا۔

اب یقین ہو جانا چاہیے کہ اگر اصلاح کی شکل ممکن ہے تو اسلام کے انقلابی انداز و طریق پر ورنہ مغربی اندازِ فکر کے برگ و بار بتا رہے ہیں کہ کل کلاں یہاں اسلام کا نام کوئی نہ لے گا ـــــ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس انداز کو اپنانے کے لئے فکر مند ہیں اور اس رُخ پہ آغاز کار کر چکے ہیں تو اس پہ "لعنت"

کے حوالے سے یا ان کے مستند عالم نہ ہونے کے حوالے سے بحث و جرح کے بجائے اس انداز کی گلی افادیت اور تاریخی حیثیت کا لحاظ ضروری ہے اور امید ہے کہ اہلِ علم اپنی صفوں کو اس انداز سے مرتب کریں گے ——— ہماری دلچسپی اگر ہے تو بس یہی، واللہ علیٰ ما اقول وکیل ۔

ہماری ذمّہ داریاں

اب جو کہنا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں نہ تو خلافت کا ادارہ قائم ہے نہ وہ قد آور شخصیات ہیں جو جو اپنی ذات میں انجمن ہوا کرتی تھیں اور بقول مولانا شبلی جہاں بیٹھ جائیں، انجمن فراہم کر لیتیں۔ برِّ عظیم کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں مسلمان کبھی بھی اکثریت میں نہ تھے، ہمیشہ ان کا معاملہ "اقلیت" کا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء تک بہر حال وہ برسرِ اقتدار رہے، اس طویل دور میں اگر ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں تو بھلائی اور خوبی کے کام بھی بہت ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد نقشہ پلٹا، کل کے حاکم، محکوم اور مقہور بن گئے، ان پر جو ظلم ہوئے ان کا ٹھکانہ ہے نہ حد، حتیٰ کہ جدید سیاسی نظریات کے حوالے سے انہیں وسیع دھرتی کے بجائے سکڑنا اور سمٹنا پڑا، متحدہ ہندوستان ——— اور تقسیم ہندوستان کے دو موقف تھے، کس کا غلط تھا کس کا صحیح، اس تلخ بحث کی ضرورت نہیں۔ تاریخ اس کا خود فیصلہ کر دے گی۔ اس کا انتظار کرنا چاہیئے۔ لیکن تقسیم کے بعد جو خطہ ہمیں ملا اور جن عزائم اور معاہدے کے تحت ملا، اس کے حوالے سے اور اللہ تعالیٰ کے دین کے حوالے سے ہماری جو ذمّہ داریاں ہیں، ان کا احساس ضروری ہے۔ آدھا ملک جا چکا، باقی جس صورتِ حال کا شکار ہے وہ آپ گذشتہ ماہ کے میثاق میں ڈاکٹر صاحب کی بعض تحریرات کے حوالے سے دیکھ لیں۔ گو کہ ان میں اکثر تحریرات پرانی ہیں لیکن آج کے حالات پر اسی طرح فٹ بیٹھتی ہیں۔ ان حالات سے نکلنے کی سبیل اور شکل ایک ہی ہے کہ "ایفائے عہد" کی فکر کی جائے ——— وہ عہد جو اللہ تعالیٰ سے کیا تھا اور جو اس کی مخلوق سے کیا تھا ——— میرے یا کسی کے لیے یہ فیصلہ آسان نہیں کہ وہ کہے کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط، ہاں یہ تو ممکن ہے کہ آدمی دیانت داری سے جو سچ اور صحیح سمجھے اس کے لیے فکر کرے۔ اہلِ دین کی یہی بنیادی ذمّہ داری ہے۔

دوسرے اداروں اور تحریکات کے بارے میں طرزِ عمل کیا ہو؟

مولانا علی میاں کا ایک مضمون "الفرقان" کے اسی شمارے میں جس کا حوالہ پہلے آیا، چھپا، عنوان ہے: "دوسرے دینی اداروں اور تحریکوں کے بارے میں ہمارا طرزِ عمل"۔ اس سے خوب رہنمائی ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے:

دین کا جو حصہ ہم تک پہنچا اس کی دو قسمیں ممکن ہیں۔ خاص ہیئت و شکل کے ساتھ پہنچنے والا حصہ اور وہ حصہ جس میں نفسِ شئ تو مطلوب ہے لیکن اس کی خاص شکل متعین نہیں۔

پہلے حصّہ کی مثال نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں تو دوسرے کی مثال جہاد فی سبیل اللہ، دعوت الی اللہ وغیرہ.......... لہٰذا دعوت دین کا کام کرنے والے ہر فرد یا جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لئے جو طریقہ دعوت صحیح جانے وہ مقرر کرے اور اپنی تحریک کا جو طرز کار مناسب سمجھے وہ اختیار کرے، اسمیں کسی کو جائز یا ناجائز کہنے یا کوئی روک ٹوک لگانے کا حق حاصل نہیں۔

اس وقت عام طور پر دین کے ان دونوں حصوں کو خلط ملط کیا جاتا ہے۔ منصوص کو غیر منصوص کا درجہ دیدیا جاتا ہے۔ اور غیر منصوص کو منصوص کے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مشکلات پیدا ہوگئی ہیں اور مختلف اداروں اور تحریکوں میں اکثر تنازعہ کی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ اگر ہم ان دونوں چیزوں میں فرق سمجھ لیں تو بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی، سینکڑوں تنازعوں کا سدّباب ہو جائے گا اور بہت سی ذہنی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔ (صفحہ ۱۱۸-۱۲۰)

اہلِ دین کے راستے کے پتھر!! مادہ پرستی، آخرت کی بے وقعتی، مصروفیت کا عذر، اہل دین کی کمزوری، دینی تحریکوں کی ناکامی اور داعیوں کے تلخ تجربات، مسلمانوں کا من حیث القوم افسردہ خاطر اور شکستہ دل ہونا اور عقائد کا اختلاف اور بدگمانیاں یہی وہ اسباب و موانع جو اس وقت دعوت و اصلاح و تبلیغ کے راستے میں سنگ گراں ہیں، ان بھاری پتھروں کے ہوتے ہوئے اہل دین و اصلاح اگر آپس میں الجھیں گے اور بھڑیں گے تو نتیجہ معلوم ——! اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے اندر سب سے پہلے روحانیت اس طرح پیدا ہو کہ مادیت دب کر رہ جائے۔ یہ دونوں معاملات یعنی مادیت کا دب جانا اور آخرت کی وقعت پیدا ہو جانا لازم و ملزوم ہیں۔ جب یہ ہو جائے گا تو مصروفیت کا عذر خود بخود ختم ہو کر رہ جائے گا، آج یہ عذر اس لئے ہے کہ دین اور اس کی قدریں ثانوی درجہ رکھتی ہیں۔ جب ان کا درجہ اوّلین ہو جائے گا اور آخرت کا احساس پیدا ہو جائے گا تو پھر اس عذر سے کوئی کام نہ لے گا۔ اور اسی سے رفتہ رفتہ سب اسباب دور ہو جائیں گے۔

حرف آخر سب سے اہم بات جس کی طرف اس وقت توجہ دلانا مقصود ہے وہ ہے بدگمانیوں کا معاملہ۔ آج اہلِ دین، اس نوع کی جماعتوں اور تحریکوں میں یہ مرض سب سے زیادہ ہے۔ حالانکہ اسلام اس مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینا چاہتا ہے۔ وہ بدگمانی کو حرام قرار دیتا ہے، وہ بلا تحقیق کسی بات کا شیوع ناجائز کہتا ہے، وہ ہر بات کی تصدیق پر زور دیتا ہے اور بغیر تصدیق بات کہنے والے کو جھوٹا کہتا ہے۔ اس لئے اگر ایک کی بات دوسرے کی سمجھ میں آجائے تو

بسم اللہ۔۔: آئیے تو اپنے اپنے راستہ پر کام کرتے چلے جائیں۔

غلطیوں اور گناہوں سے کوئی پاک نہیں۔ نبوّت کے ساتھ عصمت کا معاملہ بھی رسول کریم علیہ السلام پر ختم ہوگیا۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان کی جماعت معصوم نہ تھی محفوظ ضرور تھی۔ ان کے بعد کسی کے لئے ایسا معاملہ بھی نہیں، اس لئے حزم، احتیاط اور تقویٰ کی صفات کے ساتھ سفرِ حیات جاری رکھنے کی ضرورت ہے ورنہ بدگمانیوں کی فصل کے سبب انسان کے مفلس و قلاش ہونے کا خطرہ ہے۔ جس کا مفہوم حدیث میں یہ ہے کہ ایک آدمی نماز روزہ وغیرہ تو بہت لے کر صبح قیامت میں حاضر ہوگا لیکن لوگوں کے بے حد تقاضوں کے سبب اس کی نیکیاں تو انہیں تقسیم ہو جائیں گی اور پھر جو بوجھ باقی رہے گا وہ ان کے گناہوں کو اس پر لاد کر دور کیا جائے گا اور پھر اس کا نتیجہ ـــــ؟ تصور سے آدمی کانپ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ہیں جو اس برے انجام سے بچانے والے ہیں۔

امید کہ بالتمکین قارئین، میرے مخلص کرم فرما، بزرگ، احباب اور دوست ٹھنڈے دل سے میری گذارشات کو پڑھ کر اپنی مناسب رائے سے آگاہ فرمائیں گے۔ تاکہ میں اپنی غلطیوں کی اصلاح کرسکوں۔ ہاں اگر کسی کو خیر کا پہلو نظر آئے تو اس سے ہاتھ بٹانے کی درخواست ہے۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔ (آمین)

استدراک

اس مضمون میں چودہ صدیوں کے "رجالِ دین" کی جو مختصر فہرست چھپی ظاہر ہے وہ نامکمل ہے، میں نے اس کے متعلق خود تصریح کردی تھی۔ اسکے باوجود بعض احباب نے بعض ایسے حضرات کے اسمائے گرامی کی طرف توجہ دلائی جو اس فہرست میں شامل ہونے ضروری تھے۔ اس سلسلہ میں محترم ڈاکٹر انوار احمد صاحب عباسی کلینک لاہور کا بے حد شکر گذار ہوں کہ انہوں نے "صاحب کشف المحجوب" حضرت الشیخ السید علی ہجویری لاہوری، مولانا محمد الیاس کاندھلوی بانی جماعت و تحریک تبلیغ، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی وبلکہ ان کا پورا خاندان، جس نے انگریز کے خلاف نہ صرف باقاعدہ جہاد کیا بلکہ علمی میدان میں وسیع خدمت سرانجام دیں، رحمہم اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی کی طرف توجہ دلائی۔ ایسے اہم حضرات کے ناموں کا رہ جانا خود میرے لئے افسوس کا باعث ہے۔ اس فروگذاشت پر اللہ تعالیٰ سے معافی کا طالب ہوں۔

رپورتاژ

ہندوستان میں پندرہ دن

عاکف سعید

دوسرے دن یعنی ۱۲ نومبر کو صبح نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ایک چکر لگایا۔ اولیاء کرام میں حضرت خواجہ نظام الدینؒ کا جو مرتبہ و مقام ہے وہ کسی بھی دینی ذوق رکھنے والے شخص سے پوشیدہ نہیں، لیکن دیگر مزاروں کی طرح وہاں بھی جہلاء کے غلط طرزِ عمل کے باعث شرک و بدعت کے گہرے سائے نظر آئے جس سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوئے عجلت میں وہاں سے نکلے، واپس آئے تو مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کو حالتِ انتظار میں موجود پایا۔ مولانا موصوف کے ایک داماد اسی بستی میں اقامت پذیر ہیں۔ مولانا نے بتایا کہ ہمیں ناشتہ کے لئے انکے ہاں جانا ہے۔ تعمیلِ حکم میں مولانا کے ساتھ چل پڑے اور ان کے ساتھ ناشتہ کیا۔

آگے بڑھنے سے قبل یہ وضاحت کرتا چلوں کہ ابتداءً دہلی میں زیادہ دیر قیام کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ والد صاحب نے بھارت کے سفر کا جو شیڈول مرتب کیا تھا اس کے مطابق ہمیں ۱۸ نومبر کو دہلی پہنچ کر صرف دو دن کے بعد لکھنؤ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ اور وہاں مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی صحبت میں چند دن گذار کر ۲۵ کو حیدرآباد پہنچنا تھا۔ جہاں ۲۶ اور ۲۷ کو یوم رحمۃ للعالمینؐ اور یوم صحابہؓ کے اجتماعات سے والد محترم کو خطاب کرنا تھا — لیکن عین وقت پر ویزا نہ ملنے کے باعث لکھنؤ کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ نتیجتہً دہلی میں قیام کے لئے ہمیں خاصا وقت مل گیا — محترم والد صاحب کا خیال تھا کہ اس وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دہلی میں موجود علماء سے رابطہ قائم کیا جائے اور کچھ گھوم پھر کر دلی شہر خصوصاً پرانی دلّی اور اس کے قدیم دروازوں کے محل وقوع کا اندازہ قائم کیا جائے —

چنانچہ ناشتہ کے بعد مولانا اخلاق حسین صاحب مدظلہٗ کے ساتھ یہ پروگرام طے پایا کہ ہم دن کے ۱۱ بجے تک جامعہ رحیمیہ پہنچ جائیں گے۔ باقی دن کا پروگرام وہیں طے ہوگا — حسب پروگرام مدرسے پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا ناسازیٔ طبع کے باعث تشریف لے جا چکے ہیں — دوپہر کے کھانے کے لئے جناب شبیر میواتی نے روک لیا۔ نماز ظہر کے بعد ہم مدرسے سے نکلے اور شہر کا قصد کیا۔

مولانا عطاء الرحمٰن ہمراہ تھے۔ سب سے پہلے ہم جمعیت تبلیغ جماعت کے مرکزی دفتر میں پہنچے۔ امیرِ جماعت کے سوا جماعت کے دیگر سرکردہ افراد موجود تھے۔ والدِ محترم وہیں مرکز میں ٹھہر گئے جبکہ میں مولوی عطاء الرحمٰن شہر گھومنے کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے۔ طے یہ پایا کہ آج دہلی کا لال قلعہ دیکھا جائے۔ یہ قلعہ مخصوص مغلیہ طرز کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اور لاہور کے شاہی قلعے کے مقابلے میں زیادہ کشادہ اور نسبتاً بہتر حالت میں ہے۔ میرا گمان ہے کہ شہر لاہور کی مغلیہ دور کی یادگار عمارات کو سکھا شاہی دور میں جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا دہلی کی عمارات اس قسم کے نقصان سے محفوظ رہنے کے باعث مجموعی طور پر بہتر حالت میں ہیں۔ مغرب کے بعد ہم نے قلعہ میں Light and Sound (روشنیوں اور آوازوں کا پروگرام) بھی دیکھا جس کے ذریعے لال قلعے کی ماضی قریب تک کی تاریخ کا ایک بھرپور خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ اس پروگرام کو آپ کسی تاریخی کہانی پر مبنی ایک ریڈیو ڈرامے سے مشابہ قرار دے سکتے ہیں۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہ ڈرامہ شاہی قلعے کے مرکزی لان میں بیٹھ کر سنا جاتا ہے اور مزید رنگ آمیزی کے لیے کرداروں کی آوازوں کے ساتھ قلعے کا متعلقہ حصہ روشنی سے منور کر دیا جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک مفید پروگرام تھا اور میرا احساس ہے کہ کہیں بھی کسی تاریخی حقیقت کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تاہم تعصب کی جھلک کہیں کہیں محسوس ہوئی۔

رات کے کھانے کے لیے ہم مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب مدظلہ کے بڑے صاحبزادے کے ہاں مدعو تھے۔ موصوف دہلی یونیورسٹی میں فارسی کے استاد (پروفیسر) ہیں، نہایت قابل آدمی ہیں۔ تاریخ اور ادب سے خصوصی شغف ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں یہی دو عنوانات زیادہ تر گفتگو کا موضوع رہے۔ دسترخوان پر دہلی کی مسلمان ثقافت اور روایتی مہمان نوازی کے متعدد مظاہر دیکھنے میں آئے۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ نظام الدین واپسی ہوئی۔

اگلے دن یعنی ۲۲ نومبر کو جمعہ سے قبل کا کوئی پروگرام طے نہیں تھا۔ تاہم خطابِ جمعہ کے لیے مولانا اخلاق حسین صاحب نے پہلے ہی سے محترم والد صاحب کو پابند کر لیا تھا جس کے لیے دوپہر ایک بجے تک ہمیں دہلی کی مشہور تاریخی مسجد "حسین بخش" پہنچنا تھا۔[2] چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق محترم ظفر الاسلام

---

[1] واضح رہے کہ لاہور کی بادشاہی مسجد اس وقت جس حالت میں ہے وہ ایک بھرپور مرمت کے عمل (Renovation) کا نتیجہ ہے۔ ورنہ سکھوں نے اسے جس حالت میں پہنچا دیا تھا اس کا اندازہ اس دور کی بعض تصاویر سے بخوبی ہو جاتا ہے جو ابھی تک محفوظ ہیں۔ اور بادشاہی مسجد کے مرکزی دروازے کے اندر آویزاں ہیں۔

[2] پچھلی قسط میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ یہ وہی مسجد ہے جس میں سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب ایک عرصہ خطبہ دیتے رہے۔ جو اپنی سحر آفرین خطابت کے باعث بہت بلند نام رکھتے تھے۔ آج کل یہاں مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی خطابت کے فرائض سر انجام دیتے ہیں۔

صاحب ۱۱ بجے ہمیں لینے کے لیے تشریف لے آئے ترکمان گیٹ پر انہوں نے گاڑی پارک کی اور وہاں سے مسجد حسین بخش تک رسائی کے لیے سائیکل رکشہ کو ذریعہ بنانا پڑا۔ محترم والد صاحب نے سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات کو خطبے کا موضوع بنایا اور ماہِ ربیع الاوّل سے ربط قائم کرتے ہوئے ان تین آیات کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے تین ادوار کا بڑے عمدہ انداز میں تذکرہ فرمایا چالیس منٹ کا یہ خطاب نہایت جامع اور مؤثر رہا۔

نمازِ جمعہ کے بعد مولانا قاسمی مدظلہ ہمیں صحنِ مسجد سے ملحق ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے جہاں معززین اہلِ محلہ جمع تھے۔ اندازہ ہوا کہ جمعہ کے بعد تھوڑی دیر کے لیے یہاں ٹھہرنا مولانا کے معمولات میں شامل ہے۔ مولانا نے حاضرین کا تعارف کرایا اور چائے کے ایک دور کے بعد یہ روایتی مجلس برخاست ہوئی۔ واپسی پر مولانا عطاء الرحمٰن ہمارے ساتھ ہو لیے ۔۔۔۔ دہلی میں قیام کے دوران دیگر تاریخی عمارات دیکھتے ہوئے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ بھارت آنا ہی ہوا ہے تو تاج محل بھی دیکھنا چاہیے چنانچہ محترم والد صاحب کی اجازت اور مولانا اخلاق حسین صاحب کے مشورے سے میں نے مولوی عطاء الرحمٰن کے ہمراہ آگرہ جانے کا پروگرام بنالیا تھا اور اس کے لیے ۲۳ تاریخ کی صبح کے لیے تاج ایکسپریس میں دو سیٹیں بھی ریزرو کرا لی تھیں ۔۔۔۔ بستی نظام الدین یعنی ہماری قیام گاہ سے نیو دہلی ریلوے اسٹیشن کا فاصلہ بہت زیادہ تھا جبکہ جامعہ رحیمیہ اسٹیشن کے بالکل پڑوس میں واقع ہوا تھا۔ اور ٹرین کی روانگی کا وقت صبح ۷ بجے کا تھا۔ لہٰذا ہم نے مناسب یہی خیال کیا کہ رات جامعہ رحیمیہ میں گذاری جائے تاکہ صبح سٹیشن پہنچنے میں سہولت ہو۔ چنانچہ جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب میں نے مولوی عطاء الرحمٰن صاحب کے ہمراہ جامعہ میں بسر کی۔

اگلی صبح ہم بروقت اسٹیشن پہنچ گئے۔ نیو دہلی ریلوے اسٹیشن غالباً انڈیا کے انتہائی مصروف اور وسیع ترین اسٹیشنوں میں سے ہے۔ پیشگی ریزرویشن کے باعث سیٹیں حاصل کرنے میں قطعاً دقت پیش نہیں آئی۔ دہلی سے آگرہ ۲۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ٹھیک سات بجے ٹرین روانہ ہوئی اور تین گھنٹے میں یعنی ۱۰ بجے ہم آگرہ پہنچ گئے۔ آگرہ اور اس کے مضافات میں یوں تو متعدد تاریخی مقامات قابلِ دید ہیں لیکن ہمارا ارادہ صرف تاج محل اور آگرہ کا قلعہ دیکھنے کا تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ ہم شام تک واپس دہلی پہنچ جائیں۔ اسٹیشن سے ہم نے آٹو رکشا حاصل کیا اور پہلے شاہی قلعے پہنچے۔ یہ قلعہ دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔ گو اس کا رقبہ دہلی کے لال قلعہ کے مقابلے میں کچھ کم ہے۔ لیکن بلند و بالا عظیم الشان عمارتوں کی بہتات کے باعث اسے اگر لال قلعہ دہلی سے برتر اور بہتر قرار دیا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ مغل بادشاہ

شاہجہاں کی مستقل سکونت یہیں پر تھی اور تعمیراتی معاملے میں شاہجہاں کا ذوق کسی سے ڈھکا چھپا نہیں چنانچہ یہاں کی عمارتوں میں شاہجہاں کا مخصوص تعمیراتی ذوق بصراحت نمایاں نظر آتا ہے شاہجہاں کی نظر بندی کے ایام بھی اسی قلعے میں گزرے اور یہیں اس کی وفات ہوئی تھی۔ مقامی گائڈوں نے ہمیں وہ سرنگ بھی دکھائی جس کے ذریعے سے شاہجہاں کی لاش کو قلعے سے تاج محل تک لے جایا گیا اور ممتاز محل کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ قلعے کا ایک حصہ جو شاید فوج کے رہنے کے لئے مخصوص تھا بالکل کھنڈر بن چکا تھا۔ اور وہاں اب آمد و رفت نہ ہونے کے باعث بندروں نے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ بہرحال جہاں ان عمارات کو دیکھ کر ایک جانب مغلیہ دور کی عظمت و سطوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہیں دوسری جانب عبرت بھی ہوتی ہے کہ انسان اپنی چند سالہ زندگی اور اپنے جھوٹے وقار کے لئے کیا کچھ کر گزرتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس دنیاوی زندگی کے لئے بقا نہیں ہے بلکہ فنا ہی اس کا مقدر ہے۔ چنانچہ لَا یُرٰی اِلَّا مَسَاکِنُھُمْ کے مصداق یہ بلند و بالا اور مضبوط عمارات بھی اپنے مکینوں سے خالی نظر آئیں۔

دریائے جمنا قلعے کے مشرقی جانب بہتا ہے اور دریا ہی کے کنارے پر قلعے سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر وہ عظیم الشان عمارت ہے جو بلاشبہ فن تعمیر کا ایک لازوال اور لاثانی شاہکار ہے یعنی تاج محل: چنانچہ قلعے کی مشرقی جانب سے تاج محل کا منظر بہت خوبصورت ہے۔ قلعے میں غیر ملکی سیاحوں کی کثرت تھی۔ اور وہ سب مختلف زاویوں سے تاج محل کے اس دیدنی منظر کو اپنے کیمروں میں محفوظ کرنے کی فکر میں تھے ـــــ قلعے کی بھرپور سیر سے فارغ ہو کر ہم تاج محل پہنچے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تعریف میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگرچہ تاج محل کی تصاویر بارہا نگاہ سے گذری تھیں لیکن قریب سے دیکھنے پر اسے تخیل سے زیادہ حسین پایا۔ وہ عمارت بلاشبہ حسن و جمال کا ایک نادر مرقع ہے۔ سرتاپا سنگ سفید، جو غالباً سنگ مرمر کی کوئی خاص قسم ہے سے تعمیر شدہ اس عمارت پر جب سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی نہایت خوبصورت ہیرا جگمگا رہا ہے تاج محل کا ماحول بھی بہت خوبصورت ہے اور اگرچہ اس کی تعمیر کو لگ بھگ چار صدیاں بیت چکی ہیں اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اتنے عرصے میں تو کوئی دریا متعدد بار اپنا راستہ (BED) تبدیل کر چکا ہوتا ہے لیکن شاید دریائے جمنا بھی اس کی خوشگوار قربت سے محروم نہیں ہونا چاہتا اور بدستور اس کے پہلو میں بہہ رہا ہے ـــــ شام کو ہم نے واپسی کا قصد کیا۔ واپسی کے لئے اگرچہ ریزرویشن نہیں تھا تاہم جھیلم ایکسپریس میں جگہ مل گئی۔ دہلی پہنچ کر مولوی عطاء الرحمٰن تو جامعہ رحیمیہ روانہ ہو گئے اور میں نے "المرکز الاسلامی" کا رخ کیا۔ وہاں مولانا وحید الدین خاں صاحب اور ان کے صاحبزادے

ڈاکٹر ثانی اشنین سے ملاقات ہوئی۔ جو اس اثناء میں اپنے سفر سے واپس تشریف لا چکے تھے۔

اتوار ۱۲ نومبر کے اہم پروگراموں میں جامعہ رحیمیہ میں والد صاحب کا درس قرآن شامل تھا جس کے لئے تین بجے بعد دوپہر کا وقت طے کیا گیا تھا ۔۔۔ صبح کا وقت ہمارے پاس فارغ تھا۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے سوچا کہ آج جامع مسجد کے سامنے بازار میں دینی کتب و رسائل کی دکانوں کا دورہ کیا جائے۔ اس لئے کہ ہمیں بعض ایسی کتابوں کی تلاش تھی جن کی فرمائش ہمارے بعض احباب نے کی تھی ۔۔۔ ہم دلی کے مشہور بازار "چاندنی چوک" کی طرف سے شہر کے اندر داخل ہوئے۔ میرے لئے اس طرف آنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ چاندنی چوک کو اگر لاہور کی انار کلی قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اتوار کی عام تعطیل کے باعث بازار بند تھے تاہم تہہ بازاری جوبن پر تھی اور خوب گہما گہمی تھی۔ چاندنی چوک کے علاقے سے گذر کر آگے بڑھے تو تقریباً وسطِ شہر میں فتح پوری مسجد کو اپنے سامنے پایا۔ یہ وسیع و عریض تاریخی مسجد مغلیہ دور کی یادگار ہے اور پرانے شہر کے قلب میں واقع ہے۔ اسی مسجد میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی پر قاتلانہ حملے کی ناکام سازش ہوئی تھی۔ مسجد کی اندرونی دیواریں فارسی اشعار سے مزین تھیں۔ انہی اشعار کے ذریعے یہ اندازہ ہوا کہ لگ بھگ سو سال قبل یہ مسجد بھرپور مرمت (Renovation) کے عمل سے گذاری گئی ہے۔ تاہم یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اولاً اس کی تعمیر کب ہوئی تھی! ۔۔۔ وہاں سے بذریعہ سائیکل رکشہ پل بنگش کی طرف گئے۔ جہاں ایک گلی میں محترم والد صاحب نے مجھے اپنے ماموں جی کا وہ مکان دکھایا جہاں تقسیم ہند سے قبل انہیں متعدد بار ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا ۔۔۔ ہماری اگلی منزل جامع مسجد تھی۔ جہاں ہمیں کتابوں کی مارکیٹ میں کچھ وقت گذارنا تھا۔ لیکن وہاں پہنچے تو مارکیٹ کو بند پایا۔ تاہم اس دوران قدیم دہلی کے ان گلی کوچوں کو دیکھنے کا بھرپور موقع مل گیا جن کے بارے میں کبھی غالب نے کہا تھا ؎

دلی کے نہ کوچے تھے اوراقِ مصوّر تھے

جو چیز نظر آئی ، تصویر نظر آئی

اور ذوقؔ نے اپنے تأثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا ؎

"کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر!"

بہرحال دلی کے وہ گلی کوچے جو کبھی ایک عظیم تہذیب و تمدن اور ثقافت کا گہوارہ تھے، اس وقت بہت مختلف حالت میں نظر آئے ۔ اب ہر گلی کوچہ بلکہ ہر ہر گھر کاٹیج انڈسٹری کا یونٹ بن چکا ہے۔ کہیں پریس لگا ہوا ہے تو کہیں خرادی مشین ہے اور کہیں خام چاندی کو زیورات کی شکل میں ڈھالا جا رہا ہے تو کہیں بیکری کا سامان تیار ہو رہا ہے وقس علیٰ ذالک ۔۔۔ نماز ظہر ہم نے جامعہ

رحیمیہ پہنچ کر ادا کی جسب اعلان تین بجے پروگرام کا آغاز ہوا۔ مدرسہ کے طلبہ اور معزز اساتذہ کے علاوہ شہر سے بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد درس قرآن سننے کے لئے جمع تھی۔ محترم والد صاحب کے خطاب سے قبل صدر مدرس مولانا محمد نعیم صاحب مدظلہٗ نے نہایت جامع طور پر مدرسہ کا تعارف کرایا۔ محترم والد صاحب کا تعارف کراتے ہوئے موصوف نے فرمایا "اگرچہ ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف پرانا نہیں ہے تاہم ان کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ نہایت سلجھے ہوئے انسان ہیں اور دین کے معاملے میں وسیع القلب ہیں اور یہی وسیع القلبی دراصل خانوادۂ ولی اللّٰہی کا طرۂ امتیاز ہے!"

محترم والد صاحب نے درس کے لئے سورۃ الصف کی مرکزی آیت: "هُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُولَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝" کا انتخاب کیا۔ اور اس کے حوالے سے تکمیل رسالت کے مختلف پہلوؤں پر وضاحت سے روشنی ڈالی۔ دورانِ درس والد صاحب نے بتایا کہ وہ اس مقام پر (یعنی جامعہ رحیمیہ میں) سورۃ الصف کی اس مرکزی آیت کا درس دیتے ہوئے خصوصی مسرت اور انشراح صدر محسوس کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اسی مدرسہ کے احاطے میں مسجد سے بالکل ملحق حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مرقد ہے اور شاہ صاحبؒ ہی نے اس آیۂ مبارکہ کی خصوصی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے پورے قرآن کا 'عمود' قرار دیا تھا ــــــ درس ڈیڑھ گھنٹے جاری رہا ــــ درس کے بعد مدرسے کے مہتمم مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ نے والد محترم کو جامعہ کی دستارِ فضیلت عطا کی۔ یہ گویا اعزازی سند فراغت تھی جو والدِ محترم کو ان کی دینی خدمات کے اعتراف کے طور پر اور قرآن مجید سے خصوصی شغف رکھنے کی بنا پر عطا کی گئی ــــــ نماز عصر کے بعد شہر سے آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ چائے کا دور چلا۔ اور بعد نماز مغرب ہم بستی نظام الدین واپس آگئے۔ اپنے مستقر یعنی 'المرکز الاسلامی' پہنچے تو وہاں مولانا وحید الدین خاں صاحب اپنے ماہانہ درس قرآن کی نشست میں اپنے حالیہ بیرونی سفر کے تاثرات بیان فرما رہے تھے۔ اس طرح مولانا کے درس میں شمولیت کا موقع بھی مل گیا۔ اپنی گفتگو کے اختتام پر مولانا نے فرمایا کہ دعوت کے میدان میں مسلمانوں کا انداز بہت غلط رہا ہے۔ داعی کو صلح و آشتی کا علمبردار ہونا چاہیے نہ کہ تصادم کا۔ مولانا نے اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ دین کا غلبہ صرف صلح ہی کے راستے سے ممکن ہو سکتا ہے۔ تصادم کی پالیسی غلبۂ دین کے راستے کی بڑی رکاوٹ ہے! مولانا نے اپنے موقف کی تائید میں صلح حدیبیہ کے واقعے کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے یہ بتایا کہ صلح ہی فتح کا پیش خیمہ بنی۔ مدینہ میں کفار سے تصادم شروع ہوا جو چھ برس جاری رہا۔ لیکن حضورؐ نے یہ اندازہ فرماتے ہوئے کہ اس

راستے سے ہم اپنے مقصود کو حاصل نہیں کر سکیں گے۔ صلح کا راستہ اختیار فرمایا جو فتح مکہ پر منتج ہوا۔
مولانا نے اپنی گفتگو مکمل کرنے کے بعد محترم والد صاحب کو دعوت خطاب دی۔ والد صاحب نے معمولی پس و پیش کے بعد اسے قبول کر لیا اور سورۃ صف کی اسی آیت کو اپنی گفتگو کا عنوان بنایا جس کا درس جامعہ رحیمیہ میں دیا تھا۔ تکمیلِ رسالت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی فرمانے کے بعد والد صاحب نے مولانا وحید الدین خاں صاحب کے فکر پر واشگاف الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے یہ بتایا کہ غلبۂ دین کے کام کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ 'دعوت' کا ہے اور دوسرا 'اقامت' کا ہے۔ دعوت کے مرحلے کی حد تک مولانا کا موقف صد فی صد درست ہے اور داعی کا جو کردار مولانا نے متعین فرمایا ہے وہ واقعتہً اس مرحلے کے تقاضوں سے کامل ہم آہنگی رکھتا ہے۔ لیکن 'اقامتِ دین' کے مرحلے کے تقاضے بالکل جدا ہیں۔ یہاں نظام کو بدلنا پیشِ نظر ہوتا ہے۔ لہٰذا تصادم ناگزیر ہوتا ہے۔ والد صاحب نے واضح الفاظ میں یہ کہا کہ جس شخص کا بھی یہ خیال ہے کہ غلبۂ دین کا کام تصادم کے بغیر ممکن ہے وہ شدید غلط فہمی کا شکار ہے اس لئے کہ اگر اس کا کوئی امکان ہوتا تو کم از کم سیرتِ مطہرہ میں اس کی نوبت نہ آتی۔ لیکن وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ رحمۃ للعالمینؐ کو کفار سے پے بہ پے کئی جنگیں لڑنی پڑیں۔ صلح حدیبیہ کے واقعہ کی وضاحت کرتے ہوئے محترم والد صاحب نے فرمایا کہ صلح ہمیشہ ایسے دو فریقوں کے مابین ہوتی ہے جو قوت و طاقت میں ہم پلہ ہوں۔ اور اگر متعدد غزوات کے ذریعے مسلمانوں نے اپنی طاقت منوا نہ لی ہوتی تو مشرکین مکہ ہرگز صلح پر آمادہ نہ ہوتے اور صلح کوئی مقصود بالذات شے نہیں تھی بلکہ وقتی مصلحت کے پیشِ نظر حضورؐ نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو سال بعد جب ایک موقع پر کفار نے صلح کو منسوخ کر دیا۔ اور پھر جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے چاہا کہ صلح کی تجدید ہو جائے اور ابو سفیانؓ[1] نے جو اس وقت قریش مکہ کے سردار تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تجدیدِ صلح پر آمادہ کرنے کے لئے ہر ممکن جتن کئے لیکن حضورؐ نے صلح کی تجدید نہیں کی اور ابو سفیانؓ کو ناکام لوٹنا پڑا۔ اس لئے کہ حضورؐ یہ اندازہ فرما چکے تھے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کفار میں اب دم خم باقی نہیں ہے چنانچہ اس موقع پر صلح کی تجدید کا مطلب کفار کو مہلتِ تازہ (Fresh Lease of Existance) دینا تھا۔۔۔ اور حضورؐ کے پیشِ نظر غلبۂ دین کا جو کام تھا اس کے اعتبار سے کفار کو بلاوجہ مہلت دینے کا کوئی جواز

---

[1] حضرت ابو سفیانؓ اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے

نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے نہ صرف یہ کہ تجدید صلح سے انکار کیا بلکہ آگے بڑھ کر آپؐ نے اقدام فرمایا اور دس ہزار کا لشکر لے کر مکے کی جانب کوچ فرمایا جس کے نتیجے میں مکہ فتح ہوا۔ حاضرین مجلس نے جو تعداد میں بیس سے زائد نہ تھے پوری توجہ اور دلچسپی سے دونوں نقطہ ہائے نظر کو سنا اور نماز عشاء پر یہ محفل برخاست ہوئی۔

اگلے دن یعنی ۲۵ نومبر کی شام کو حیدر آباد دکن کے لئے روانگی تھی۔ دن کے اوقات میں ہمارے ساتھی اقبال پٹیل صاحب نے بعض احباب کے اصرار پر SIM (اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ) کے مرکز میں ایک پروگرام ترتیب دیا تھا جس میں والد صاحب کو طلبہ کے سوالات کے جوابات دینے تھے۔ اقبال پٹیل صاحب تنظیم میں شامل ہوتے تھے۔ آپ کا تعلق احمد آباد (انڈیا) سے ہے۔ نہایت سرگرم دینی کارکن ہیں۔ والد صاحب کی انڈیا آمد کی جب انہیں اطلاع ملی تو ملاقات کے لئے دہلی آ گئے اور کئی دن ہمارے ساتھ رہے ——— پروگرام کے مطابق ہم صبح ساڑھے دس بجے اوکھلا میں SIM کے مرکز پہنچے۔ یہ دراصل اسلامی جمعیت طلبہ کے طرز پر ایک طلبہ آرگنائزیشن ہے جو کبھی جماعت اسلامی ہند سے منسلک تھی لیکن اب یہ جماعت سے کٹ چکی ہے۔ اور بالکل آزاد تنظیم ہے۔ SIM کے سرکردہ افراد کے علاوہ 'انصار'[1] کی اچھی خاصی تعداد خاصی تعداد مرکز میں جمع تھی۔ ۲ گھنٹے تک بھرپور نشست رہی جس میں ابتداءً والد صاحب نے اسلام کے ہمہ گیر احیائی عمل کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا اور پھر حاضرین کے سوالات کے تسلی بخش جوابات دیئے۔ البتہ اس سوال کے جواب میں کہ "ہندوستان میں دین کا کام کرنے کے لئے آپ ہمیں کیا مشورہ دیں گے؟" والد صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے چونکہ یہاں کے حالات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہے۔ لہٰذا میں اس سلسلے میں سردست آپ کو کوئی مشورہ دینے سے قاصر ہوں۔" یہاں سے فارغ ہو کر ہم پولیس اسٹیشن سے ہوتے ہوئے، جہاں ہم نے اپنی روانگی کا اندراج کرایا، جامعہ رحیمیہ پہنچے اور کچھ دیر یہاں ٹھہرنے کے بعد ائرپورٹ کا رُخ کیا جہاں سے ہمیں حیدر آباد دکن کے لئے فلائٹ پکڑنی تھی۔

شیڈول کے مطابق ہمیں ۸ بجے شب حیدر آباد پہنچنا تھا لیکن فلائٹ میں تاخیر کے باعث ہم ۹ بجے حیدر آباد پہنچ سکے۔ ائرپورٹ پر مجلس تعمیر ملت کے سرکردہ افراد اور قرآن اکیڈمی حیدر آباد

---

[1] SIM کے ارکان کے لئے 'انصار' کی اصطلاح وضع کی گئی!

سے وابستہ حضرات کی ایک بڑی تعداد نے نہایت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا[1] ہمارے محترم دوست اور رفیق جناب حیدر محی الدین غوری صاحب حیدرآباد میں ہمارے قیام کے انچارج تھے۔ غوری صاحب نے اپنے چچازاد بھائی کے نئے تعمیر شدہ مکان میں ہمارے قیام کا اہتمام کیا تھا اور وہ خود بھی ہمہ وقت ہمارے ساتھ مقیم تھے۔ مولانا قاری عبدالعلیم صاحب کی جائے رہائش بھی ہماری قیام گاہ سے نزدیک تھی چنانچہ ان کی بھرپور معیت بھی ہمیں پورے قیام حیدرآباد کے دوران حاصل رہی۔

اگلے روز یعنی ۱۲ ربیع الاول (۲۶ نومبر) کو وہ مرکزی اجتماع تھا جس کے لئے یہ تمام سفر اختیار کیا گیا تھا۔ کل ہند مجلس تعمیرِ ملت کے زیرِ اہتمام یوم رحمتہ للعالمینؐ کا یہ اجتماع بلاشبہ شرکاء کے ذوق و شوق اور تعدادِ حاضرین کے اعتبار سے ایک منفرد شان کا حامل ہوتا ہے اور غالباً پورے عالم اسلام میں سیرت کے موضوع پر اتنے عظیم الشان اجتماع کی کوئی اور نظیر موجود نہیں ہے۔ یہ اجتماع صبح ۹ بجے سے نمازِ ظہر تک جاری رہتا ہے اور ظہر بالعموم تاخیر سے پڑھی جاتی ہے۔ محترم والد صاحب کو چونکہ مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا تھا اور آپ کا خطاب ہی اس اجتماع کا مرکزی خطاب تھا۔ لہٰذا ½ ۱۲ بجے کا وقت آپ کے خطاب کے لئے معین کیا گیا۔ پروگرام کے مطابق ہم ½ ۱۱ بجے جلسہ گاہ میں پہنچے۔ مدرسۂ اعزہ کے وسیع و عریض گراؤنڈ میں پنڈال سجایا گیا تھا۔ انتظامات قابلِ رشک تھے۔ جلسہ گاہ تک پہنچنے والی تمام سڑکیں گویا مسلمانوں کی تحویل میں تھیں۔ پورا پنڈال حدِّ نگاہ تک حاضرین سے پُر تھا۔ سٹیج سے کچھ دور دائیں جانب خواتین کے لئے اہتمام تھا اور قناتوں کا ایک طویل سلسلہ مردوں اور خواتین کے مابین حائل تھا۔ گو جلسہ گاہ میں اب مزید گنجائش باقی نہیں رہی تھی لیکن جلسہ گاہ کے انتہائی کناروں پر مسلسل حرکت کی کیفیت اس بات کی غماز تھی کہ شائقین کی آمد ہنوز جاری ہے۔ چنانچہ بعد میں معلوم ہوا کہ آس پاس کی گلیاں بھی شرکاء کی کثرت کے باعث جلسہ گاہ کا حصہ بن چکی تھیں۔ محترم والد صاحب کے خطاب سے قبل کئی مقررین کے نام لسٹ میں شامل تھے۔ سب سے پہلے جناب

---

[1] استقبال کرنے والوں میں نواب شاہ عالم خاں صاحب (صدر مجلس استقبالیہ مجلس تعمیر ملت)، سلیمان سکندر صاحب (کارگذار صدر مجلس تعمیر ملت)، رحیم قریشی صاحب (جنرل سیکرٹری)، لائق علی صاحب (نائب سیکرٹری)، کے علاوہ قاری عبدالعلیم صاحب (صدر قرآن اکیڈمی حیدرآباد) اور سید قطب الدین علی چشتی صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

باقر آغا صاحب نے خطاب کیا۔ موصوف کا تعلق اہلِ تشیع سے تھا۔ موصوف کی تقریر پر مخصوص کلامی رنگ غالب تھا جس میں بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ اصطلاحات کا کثرت سے استعمال اور الٹ پھیر تو واضح تھا لیکن صورتِ واقعہ اس مصرعہ کے مصداق تھی کہ ع "معاعنقا ہے اپنے عالم تقریر کا" ان کے بعد حافظ قاری تقی الدین صاحب کا عالمانہ خطاب ہوا۔ آپ کا موضوع تھا "شریعت کا مقام" جس کے حوالے سے آپ نے مسلم پرسنل لاء کے مسئلے پر مفصل بحث کی۔ بعد ازاں پی ایل او کے نمائندے جناب خالد الحسین نے خطاب فرمایا اور منتظمینِ جلسہ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان کے بعد جناب نظام الدین مغربی صاحب کو دعوتِ خطاب دی گئی، موصوف حیدر آباد کے معروف دینی سکالر ہیں، لیکن مغربی صاحب نے کمال ایثار سے کام لیتے ہوئے اور وقت کی کمی کے پیش نظر خطاب سے گریز کیا اور سٹیج پر آ کر صرف اتنا کہا کہ میں اپنا وقت یہاں مقرر کو دیتا ہوں! اس پر لوگوں نے اس درجہ مسرت کا اظہار کیا کہ جلسے کے مزاج کے برخلاف تالیاں تک بجا دی گئیں۔ محترم والد صاحب کے خطاب سے قبل جناب رحیم قریشی صاحب سیکرٹری مجلسِ تعمیرِ ملت نے جناب خلیل اللہ حسینی صاحب کا پیغام پڑھ کر سنایا جو مجلس تعمیرِ ملت کے صدر اور بانی ہیں اور کسی بیرونی سفر کے باعث اجتماع میں شریک نہ تھے ـــــ محترم والد صاحب کا خطاب ایک بجے کے بعد شروع ہو سکا۔ آپ نے سب سے پہلے حیدر آباد کے مسلمانوں کو اس عظیم الشان جلسے کے انعقاد پر مسلمانانِ پاکستان کی جانب سے ہدیۂ سلام اور ہدیۂ تبریک پیش کیا اور مسلمانانِ حیدر آباد کی غیرت و حمیتِ دینی کو خراجِ تحسین پیش کیا پھر آپ نے "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اس نکتے کو وضاحت سے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقع تمام جہانوں کے لئے رحمت بن کر آئے تھے اور یہ آپؐ کی رحمت ہی کا مظہر ہے کہ آپ نے نوعِ انسانی کو وہ تین تحفے دیئے ہیں جو ویسے تو ہر دور میں انسان کی ضرورت رہے ہیں لیکن خصوصاً اس دور میں نوعِ انسانی ان کی احتیاج کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ ان میں سے پہلی ضرورت کا عنوان ہے "علمِ حقیقت یا حقیقت کی تلاش" جو ہمیشہ سے فلسفے کا موضوع رہا ہے کہ اس کائنات اور خود انسان کی اصل حقیقت کیا ہے؟ زندگی اور موت کی حقیقت کیا ہے؟ خیر کیا ہے شر کسے کہتے ہیں؟ وغیرہ! اس پہلو سے جو تحفہ حضور اکرمؐ نے نوعِ انسانی کو دیا ہے وہ ہے "الھدٰی" یعنی قرآن حکیم! ؎

نوعِ انسان را پیامِ آخریں　　　حاملِ اُو رحمۃٌ للعالمین"

دوسری ضرورت جو نوعِ انسانی کو درپیش ہے 'اجتماعی اخلاق' کی ہے۔ اور

حضورؐ کی شان یہ تھی کہ "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ" کہ میں تو مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ انفرادی طور پر اخلاق کے بڑے بڑے کوہ ہمالہ تو پہلے بھی موجود رہے ہیں لیکن حضورؐ کی ذات میں تمام محاسن و اوصاف نہایت حسین توازن کے ساتھ جمع ہو گئے تھے اور اس ضمن میں نوعِ انسانی کے لئے آپ کا اصل تحفہ 'اجتماعی اخلاق' ہے۔ تیسری چیز جس کی ضرورت اس دور میں شدت سے محسوس کر رہی ہے وہ ہے ایک ایسا اجتماعی نظام جس میں ہر سطح پر عدل و انصاف ہو۔ چنانچہ تیسرا تحفہ جو آپ نے نوعِ انسانی کو عطا کیا وہ ہے 'دینِ حق' یا 'نظامِ عدلِ اجتماعی'! یہ تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پر محیط تھی جسے سامعین نے پوری توجہ اور دلچسپی سے سنا۔ تین بجے یہ جلسہ برخاست ہوا۔ ——

اختتام پر سٹیج سیکرٹری نے آج کے جلسے کو نہایت کامیاب قرار دیتے ہوئے بتایا کہ اس بار حاضری معمول سے زیادہ تھی اور محتاط اندازے کے مطابق شرکاء کی کم از کم تعداد کا اندازہ دو لاکھ کا ہے جس میں ⅓ حصہ یعنی لگ بھگ پچاس ہزار کی تعداد خواتین پر مشتمل ہے اور واقعتہً یہ ایک غیر معمولی بات تھی[1] ——

شام کو ہم مجلس تعمیرِ ملت کے صدر استقبالیہ جناب نواب شاہ عالم خاں صاحب کے ہاں عشائیہ پر مدعو تھے۔ اس عشائیے میں مقررینِ جلسہ اور مجلس تعمیرِ ملت کے تمام سرکردہ افراد کے ساتھ ساتھ معززینِ شہر کی بھی ایک بڑی تعداد کو مدعو کیا گیا تھا۔ بلاشبہ یہ ضیافت حیدر آبادی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور ان کے ذوقِ اکل و شرب کا ایک نفیس مرقع تھی۔

اگلے دن یعنی ۲۸ نومبر کو نمازِ فجر کے بعد قاری عبد العلیم صاحب ہمیں اپنے دولت کدے پر لے گئے۔ معلوم ہوا انہوں نے اچھے خاصے ناشتے کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ ان کی محبت اور خلوص کے سامنے انکار کی جراَت کیسے ہو سکتی تھی! —— صبح ۹ بجے کا وقت ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی صاحب سے ملاقات کے لئے طے تھا۔ قاری صاحب حیدر آباد کی ایک بزرگ علمی شخصیت ہیں خصوصاً حیدر آباد میں فنِ قراَت کے فروغ میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ آج کل آپ ضعیف العمری کے باعث گوشہ نشین ہیں۔ محترم والد صاحب کے دروسِ قرآن کے کیسٹ سنے تو ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ والد صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے خود قاری کلیم اللہ حسینی سے ملاقات کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۹ بجے ہم قاری صاحب کے یہاں پہنچے تو وہ نہایت محبت سے ملے اور اپنی کئی تصانیف محترم والد صاحب کو عنایت فرمائیں! ——

---

[1] ۲۷ نومبر کے اخبارات میں جلسے کی جو رپورٹنگ ہوئی اس میں شرکاء کی تعداد چار لاکھ بتائی گئی۔ تاہم محتاط ترین اندازے کے مطابق کم از کم تعداد بھی ۲ لاکھ سے زائد تھی ہے۔

قبل از ظہر کُل ہند مجلس تعمیرِ ملت کے کارگذار صدر جناب سلیمان سکندر صاحب، جنرل سکریٹری جناب رحیم قریشی صاحب اور جائنٹ جنرل سکریٹری جناب میر لائق علی صاحب محترم والد صاحب سے ملاقات کیلئے ہمارے مستقر یعنی محترم حفیظ نوری صاحب کے مکان پر تشریف لائے۔ ہمیں گذشتہ روز کے جلسے سے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ تینوں حضرات مجلس تعمیرِ ملت کے اہم عہدیدار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت سرگرم کارکن بھی ہیں اور واقعتہً پوری لگن اور خلوص سے مسلمانانِ ہند کی بھلائی کے لئے کوشاں ہیں ۔

یہ حضرات بہت دیر تک محترم والد صاحب کے ساتھ مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے رہے ۔ اس نشست میں تفصیل سے امتِ مسلمہ کی مجموعی صورت حال، دینی جماعتوں کے طریق کار، اسلامی انقلاب کا صحیح نہج اور بھارت میں دین کا کام کرنے کے امکانات جیسے اہم موضوعات پر گفتگو ہوئی ۔

آج شام بھی مجلس تعمیرِ ملت کے زیرِ اہتمام ایک اہم جلسہ تھا۔ گذشتہ روز یعنی ۱۲ ربیع الاوّل کے جلسے کا عنوان تھا "یوم رحمۃ للعالمین" اور آج یعنی ۱۳ ربیع الاوّل کے جلسے کو "یوم صحابہؓ" کا عنوان دیا گیا تھا۔ مجلس کے صدر جناب سلیمان سکندر صاحب نے بتایا کہ مؤخر الذکر جلسے کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے ۔ پہلے صرف ۱۲ ربیع الاوّل کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ البتہ گذشتہ تین چار سال سے 'یوم صحابہؓ' کے جلسے کا انعقاد بھی کیا جا رہا ہے ۔ اور اس میں بھی بالعموم ۵۰ ہزار سے زائد افراد شریک ہوتے ہیں ۔ اس سال یوم صحابہؓ کے جلسے کے مرکزی مقرر بھی محترم والد صاحب تھے ۔ ہم رات نماز عشاء کے بعد جلسہ گاہ پہنچے تو حاضری کا نقشہ لگ بھگ وہی پایا جس کا مشاہدہ ایک دن قبل ہوا تھا[1]۔ وہی مدرسہ اعزہ کا وسیع و عریض گراؤنڈ، وہی عظیم الشان پنڈال اور وہی تا حدِ نگاہ ہجومِ شائقین! محترم والد صاحب کی تقریر سے قبل مولانا عبد الحی راشد منوری، جناب اعظم علی صوفی صاحب نے خطاب کیا اور مزید برآں علی گڑھ یونیورسٹی کے قاضی عبد الستار صاحب نے حضرت خالد ابن ولیدؓ کی سیرت اور کارناموں پر ایک نہایت محققانہ مقالہ پیش کیا۔ محترم والد صاحب نے اپنے خطاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر انقلابی جدوجہد میں صحابہ کرامؓ کے انتہائی جاں نثارانہ کردار پر نہایت مؤثر انداز میں روشنی ڈالی ۔ تقریر رات کے ۱ بجے شروع ہوئی تھی، ماحول بھی پُرسکون تھا اور محترم والد صاحب کا جوشِ خطابت بھی اپنے عروج پر تھا ۔ واقعتہً ایک سماں بندھ گیا تھا۔ ۱½ گھنٹہ پر محیط اس خطاب نے مجمع کو اس طور سے اپنے اندر جذب کیا ہوا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا گویا لوگ سانس

۱۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس مرتبہ 'یوم صحابہؓ' کے جلسے کی حاضری بھی ۱½ لاکھ سے متجاوز تھی اور یہ غیر معمولی بات تھی اس لئے کہ عموماً 'یوم صحابہؓ' کے جلسہ میں پہلے دن کے مقابلے میں نصف حاضری ہوا کرتی ہے یعنی لگ بھگ پچاس ہزار ۔

رہ کے یہ خطاب سن رہے ہیں ـــــ آخری تقریر مولانا حمید الدین عاقل حسامی کی تھی۔ مولانا موصوف حیدرآباد کے معروف علماء میں سے ہیں اور اپنی خوش گفتاری کے باعث نہایت مقبول ہیں۔ چنانچہ مولانا کی زبان کی مٹھاس اور بھر دوران تقریر برجستہ چٹکلوں سے لطف اندوز ہونے کا ہمیں بھی موقعہ ملا ـــــ کل کی طرح آج بھی جلسہ کے اختتام پر مجمع محترم والد صاحب سے مصافحہ کے لئے امڈ پڑا۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ بہرحال حیدرآباد میں ہمارے میزبان محترم حفیظ غوری صاحب نے پہلے ہی اہتمام کرلیا تھا کہ اپنی گاڑی کو سٹیج کے عقب میں بالکل نزدیک لے آئے اور اس طرح ان کی فراست نے ہمارے لئے جلسہ گاہ سے نکلنا ممکن بنادیا۔

۲۸ نومبر کو دن کا زیادہ حصہ ہم نے آرام کیا۔ دوپہر کے کھانے کے لئے ہم محترم احمد اللہ صاحب (آئی اے ایس ریٹائرڈ) کے یہاں مدعو تھے۔ بعد نماز عشاء جامع مسجد معظم پورہ (ملے پلی) میں محترم والد صاحب نے حسب اعلان درس قرآن دیا اور سورۃ حم السجدہ کی چند آیات کے حوالے سے 'دعوت الی اللہ' کے موضوع پر اس طور روشنی ڈالی کہ موضوع سے متعلق تمام گوشے روشن ہوگئے۔ لگ بھگ ۱/۲ گھنٹوں پر محیط اس درس کو مسجد میں موجود تقریباً ایک ہزار سامعین نے نہایت توجہ اور دلجمعی سے سنا۔

۲۹ نومبر کو جمعہ کا دن تھا۔ ناشتہ کے لئے حیدر محی الدین غوری صاحب نے اپنے گھر پر مخصوص اہتمام کیا تھا۔ قبل جمعہ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت مجلس تعمیرِ ملت کے صدر اور بانی جناب خلیل اللہ حسینی صاحب سے ملاقات کے لئے طے تھا۔ ملاقات کے وقت کارگذار صدر جناب سلمان سکندر صاحب بھی ہمارے تھے۔ حسینی صاحب سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ۱۲ ربیع الاوّل کے موقع پر حسینی صاحب اپنی ضعیف العمری اور علالت کے باوصف اورنگ آباد میں ایک جلسے میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔ دورانِ گفتگو یہ اندازہ ہوا کہ مجلس تعمیرِ ملت کے زیرِ اہتمام یہ تمام سرگرمی درحقیقت ان ہی کے "نفسِ گرم" کی بدولت ہے۔ گو فالج کے حملے کے باعث انہیں بولنے میں دشواری پیش آرہی تھی اور الفاظ بھی صاف نہ تھے تاہم ان کے قریبی لوگ بات سمجھ لیتے تھے اور اس طرح communication ممکن تھی۔ حسینی صاحب کا شمار بلاشبہ ان معدودے چند لوگوں میں ہوتا ہے جو قوم وملت کے درد میں اس طرح بے چین رہتے ہیں کہ پھر تعمیرِ ملت ہی ان کی زندگی کا مشن بن جاتی ہے اور اس راہ کی کوئی رکاوٹ انہیں اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی سے نہیں روک سکتی ـــــ دورانِ ملاقات یہ احساس بھی ہوا کہ فکری سطح پر ان کے اور والد صاحب کے درمیان گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ موجودہ دینی جماعتوں کے بارے میں ان کی سوچ اور والد صاحب کی فکر میں کامل مطابقت محسوس ہوئی۔ اسی طرح صدر ضیاء اور پاکستان میں اسلامائزیشن کے معاملے میں خلافِ توقع ان کی رائے والد صاحب کے تجزیے سے کامل ہم آہنگ تھی۔

ـــــ (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

جمعہ کا خطاب جامعہ مسجد معظم پورہ میں تھا جس میں محترم والد صاحب نے سورۃ الجمعہ کی آیت ۲ کو موضوع بناتے ہوئے یہ واضح کیا کہ دعوت دین کا مرکز و محور دراصل قرآن مجید ہی ہے۔ یہ خطاب بھی نہایت مؤثر اور مدلل تھا۔ مغرب سے کچھ پہلے ہم "مسقط ہوٹل" کے ارادے سے نکلے جس کی افتتاحی تقریب کے لئے محترم والد صاحب کو بطور مہمان خصوصی دعوت دی گئی تھی۔ یہ ہوٹل دراصل حیدرآباد میں ہمارے ایک کرم فرما جناب ابراہیم بن عبداللہ مسقطی (ایم ایل اے) کی ملکیت ہے جو وہاں ایک معروف شخصیت ہیں اور خوش مزاج طبیعت کے مالک ہیں۔ محترم والد صاحب نے انہیں خصوصی محبت ہے جس کا اظہار انہوں نے اس بار اس شکل میں کیا کہ اپنے نئے ہوٹل کا افتتاح محترم والد صاحب سے کرایا! ——— نمازِ عشاء معظم پورہ کی مسجد میں پڑھی اور نماز کے بعد حسب پروگرام والد صاحب نے درس قرآن دیا۔ آج کا موضوع تھا "اقامتِ دین"، سورۃ الشوریٰ کی تین آیات کی روشنی میں اس موضوع پر مکمل گفتگو ہوئی۔ مسلسل مصروفیت کے باعث آغاز میں طبیعت پر اضمحلال نمایاں تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ طبیعت کھلی اور ڈیڑھ گھنٹے یوں گذر گئے کہ احساس تک نہ ہوا۔ غایت درجہ انہماک کے باعث پوری تقریر کے دوران مجمع پر بھرپور سکوت طاری رہا۔

اگلی صبح ۳۰ نومبر کو محترم جناب قطب الدین علی چشتی صاحب کی دعوت پر ان کے مدرسہ 'انوار الہدیٰ' جانا ہوا۔ محترم چشتی صاحب نے نہایت پُرتکلف ناشتہ کرایا۔ وہیں سے ہم نے غوری برادران کی معیت میں zoo کا ایک ہلکا پھلکا چکر لگایا جو مدرسہ سے بہت قریب تھا ——— پروگرام کے مطابق نمازِ ظہر میں ہمیں مولانا حمید الدین عاقل صاحب کی دعوت پر ان کے مدرسہ "دار العلوم" میں پہنچنا تھا۔ اگرچہ وہاں پہلے سے خطاب کا کوئی پروگرام طے نہیں تھا لیکن وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کے چار سو طلبہ اور دیگر مہمان محترم والد صاحب کو سننے کے لئے انتظار میں ہیں۔ چنانچہ نمازِ ظہر کے بعد والد صاحب نے اپنے خطاب میں امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے حوالے سے امت کے فرضِ منصبی پر روشنی ڈالی۔ مختصر سے وقت میں یہ مدلل خطاب نہایت جامع اور مؤثر رہا۔ بعد ازاں مولانا عاقل نے ہمیں اپنے مدرسے کی نئی عمارت کا دیدار کرایا۔ جہاں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔

مغرب کے بعد "مدینہ پبلک اسکول" کے ہال میں محترم والد صاحب کی تقریر کا پروگرام تھا۔ بعض احباب کی خواہش پر محترم والد صاحب نے "ختم نبوّت اور تکمیلِ رسالت" کے موضوع کو اپنی

* ہندوستان کے مسلمان عام طور پر پاکستان کے صدر جناب ضیاء الحق صاحب کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید صدر ضیاء کی کوششوں سے پاکستان میں واقعتہً اسلام کا نفاذ ہو گیا ہے۔ اور یہ غلط فہمی دراصل دونوں ملکوں کے مابین ذرائع ابلاغ (communication) کے فقدان کے باعث ہے

تقریر کا عنوان بنایا اور اس ضمن میں سورۃ الصف کی آیت ۹ کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ اور واقعۃً موضوع کا حق ادا کر دیا۔ آج کے اجتماع میں حیدر آباد شہر کے اعلیٰ تعلیمیافتہ حضرات کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ کثرتِ حاضرین کے باعث ہال کی تنگ دامانی عیاں تھی۔ تقریر کے خاتمے پر ایک صاحب نے کھڑے ہو کر صدرِ مجلس سے یہ مطالبہ کیا کہ آج کی تقریر کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے جس کی تائید تمام حاضرین نے کی۔

یکم دسمبر ہمارا حیدر آباد میں آخری دن تھا۔ یہ دن بھی نہایت معروف گذرا۔ فجر کے بعد جناب حفیظ غوری صاحب کے مکان پر تنظیم اسلامی کے رفقاء کا اجتماع ہوا ۔۔۔ دس بجے محترم والد صاحب نے قرآن اکیڈمی حیدر آباد کے نئے دفتر[1] کا افتتاح کیا اور وہیں سوال و جواب کی ایک نشست ہوئی جس میں ۲۰-۲۲ افراد نے شرکت کی۔ اس موقع پر یہ فیصلہ ہوا کہ ہمارے حیدر آباد کے ساتھی آئندہ سے قرآن اکیڈمی کی بجائے "انجمن خدام القرآن" کے نام سے ادارہ چلائیں گے۔ ۔۔۔۔۔ آج دن میں محترم والد صاحب کی ملاقات مولانا صبغت اللہ بختیاری صاحب سے بھی ہوئی جن کا شمار حیدر آباد کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے۔ رات بعد نماز عشاء سکندر آباد کی جامع مسجد میں خطاب ہوا۔ جہاں لگ بھگ دو ہزار افراد کے مجمع کے سامنے والدِ محترم نے سیرت النبیؐ کی روشنی میں انقلاب کے مختلف مراحل کو وضاحت سے بیان فرمایا۔ اس طرح حیدر آباد میں ہمارا پروگرام مکمل ہوا۔[2]

ناانصافی ہوگی اگر ان حضرات کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنہوں نے قیام حیدر آباد کے دوران ہمیں آرام پہنچانے کے لئے اپنا دن رات ایک کر دیا تھا۔ ان میں سر فہرست ہیں جناب حیدر محی الدین غوری صاحب جو اس پورے عرصے کے دوران سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہے اور ہماری ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا بھی بدرجۂ آخر خیال رکھا۔ محی الدین غوری صاحب اگرچہ عمر میں میرے والد کے برابر ہیں لیکن وہ مجھ سے اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے ہم عمر دوست! انہوں نے ہمیں اتنی محبت اور خلوص دیا کہ میں اپنے قیام حیدر آباد کو ان کی خوشگوار رفاقت کے باعث اپنی زندگی کے یادگار دنوں میں شمار کرتا ہوں۔ انہی کے نام کے ساتھ آتا ہے جناب حفیظ غوری صاحب کا جو حیدر محی الدین غوری صاحب کے چچازاد

---

[1] ہمارے محترم رفیق جناب حیدر محی الدین غوری صاحب نے اپنی دکان "غوری آپٹیکل کمپنی" کی اوپر کی منزل میں یہ دفتر بنایا ہے اور اس بلڈنگ کی ایک پوری منزل اسی مقصد کے لیے وقف کر دی ہے۔

[2] یہ رپورتاژ اس اعتبار سے تشنہ ہے کہ اس میں حیدر آباد شہر کے بارے میں کوئی تعارفی بات نہیں آسکی۔ دراصل 'میثاق' کے صفحات اس رپورٹ کی طوالت کے متحمل نہیں ہو رہے تھے۔ لہٰذا اختصار سے کام لینا پڑا۔ (مرتب)

بھائی ہیں اور پلاسٹک کے سامان کا بزنس کرتے ہیں ۔ حیدر آباد میں ہمارا قیام انہی کے مکان پر تھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا ۔ ان کی کار مسلسل ہمارے استعمال میں رہی اور ان کا پورا وقت بھی گویا ہمارے dispose پر تھا ۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں بھائیوں کو بہترین جزا عطا فرمائے ــــــ مزید برآں قاری عبدالعلیم صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی میں فرض ہی سمجھتا ہوں کہ ان کی مشفقانہ معیت بھی ہمیں مسلسل حاصل رہی جس کے باعث حیدر آباد میں قیام کا لطف دوبالا ہو گیا ــــــ اسی طرح قرآن اکیڈمی اور تنظیم اسلامی سے متعلق تمام حضرات نے ہمارے قیام حیدر آباد کے دوران نہایت سرگرمی اور خلوص سے کام کیا جس پر ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا ہے۔[1]

۲، دسمبر کی صبح کو ہم قیام حیدر آباد کی بہت سی خوش گوار یادوں کو سمیٹتے ہوئے دہلی واپس آگئے حسب توقع مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے دہلی تشریف لائے ہوئے تھے ۔ والد صاحب کو مولانا سے ملاقات کا بہت اشتیاق تھا ۔ چنانچہ اس طرح ملاقات ممکن ہو جانے پر انہیں بہت مسرت ہوئی ۔ دہلی میں دوران قیام والد محترم کی مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے ملاقات کی دو نشستیں ہوئیں ۔ ایک ۲ دسمبر کو بعد نماز مغرب اور دوسری ۴ دسمبر بعد نماز فجر ۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس کی برکت سے ایسے متعدد دیگر اکابرین سے ملاقات کا موقع بھی مل گیا جن سے ملاقات کی والد محترم شدید خواہش رکھتے تھے ۔ میری مراد مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا افتخار فریدی اور ڈاکٹر اشتیاق احمد سے ہے جو سب اس موقع پر دہلی میں موجود تھے ۔ اور ہمیں ان سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی ۔

۴ دسمبر کی رات کو مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی مدظلہ نے بعض مقامی دوستوں کے اصرار پر پہاڑی بھوجلہ کے علاقہ میں والد محترم کا ایک پروگرام طے کیا تھا جس میں سیرت النبیؐ کے موضوع پر والد صاحب کو خطاب کرنا تھا ۔ یہ قیام ہندوستان کے دوران ہمارا آخری پروگرام تھا ــــــ اگلی صبح یعنی ۵ دسمبر کو علی الصبح ۹ بجے کی فلائٹ سے ہم بخیر و عافیت لاہور واپس آگئے ۔

آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ!

✤

---

[1] ان میں محترم حیدر محی الدین غوری صاحب کے بڑے فرزند جناب شاہد صاحب کا نام قابل ذکر ہے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ اجتماعات سے متعلق انتظامی امور میں بھرپور حصہ لیا بلکہ مجھے اپنی موٹر سائیکل پر حیدر آباد شہر کی سیر بھی خوب کرائی ۔

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

بیوریجز کمپنی لمیٹڈ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۲ / ۲۲۹۳۱

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

ان شاء اللہ العزیز — وبفضلہ تعالیٰ وعونہٖ

تنظیمِ اسلامی پاکستان

کے زیرِ اہتمام

خصوصی تربیت گاہ اور گیارہواں سالانہ اجتماع

جمعہ ۲۱ مارچ تا اتوار ۶ اپریل ۸۶ء

قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور

میں منعقد ہوں گے — اور اسی موقع پر

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے سالانہ محاضراتِ قرآنی اور سالانہ اجلاسِ عام بھی منعقد ہوں گے

تفصیلات پُشت پر ملاحظہ فرمائیں

— شرکت کی عام دعوت ہے! —

تفصیلی پروگرام

❖ جمعہ ۲۱ مارچ کو ڈاکٹر اسرار احمد حسبِ معمول ساڑھے گیارہ بجے دن مسجد دارالسلام باغ جناح میں خطبہ دیں گے اور شام کو بعد نمازِ مغرب قرآن اکیڈمی میں خطابِ عام فرمائیں گے۔

❖ ہفتہ ۲۲ مارچ تا جمعرات ۳ اپریل صبح کے اوقات میں (ماسوائے یوم جمعہ) قرآن اکیڈمی میں تنظیم اسلامی کی خصوصی تربیت گاہ کا پروگرام جاری رہے گا جس میں روزانہ:

- بعد نمازِ فجر ڈاکٹر صاحب کا درسِ قرآن ہوگا ——— اور
- ۹ بجے صبح تا ایک بجے دوپہر مطالعہ و مذاکرہ جاری رہے گا!

❖ ان ہی ایام میں روزانہ بعد نمازِ مغرب اجتماعاتِ عام منعقد ہوں گے جو چار دن (بشرطِ دستیابی) جناح (ٹاؤن) ہال لاہور میں منعقد ہوں گے اور بقیہ ایام میں قرآن اکیڈمی ہی میں ہوں گے۔ ان میں:

- چھ دن 'استحکامِ پاکستان' کے موضوع پر مذاکرہ ہوگا جس میں ڈاکٹر اسرار احمد کے اس موضوع پر روزنامہ 'جنگ' اور ماہنامہ 'میثاق' میں شائع شدہ مضامین کو تنقید کے لیے پیش کیا جائے گا!
- ایک شام 'خیر آبادی مکتبِ فکر' کے لیے وقف رہے گی جس میں مولانا فضل حق خیر آبادی رح اور اُن کے اولاد و احفاد اور تلامذہ کی علمی خدمات اور خصوصی فلسفیانہ نظریات پر مقالات پڑھے جائیں گے ——— اور
- دو شامیں ان بزرگ علماء کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے لیے وقف رہیں گی جو مختلف علوم دینیہ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور اُمّت کے حق میں ان کا دم غنیمت ہے۔ مثلاً

❖ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ (بشرطِ صحت و تشریف آوری)
❖ مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب رکن عالمی فقہ کونسل، مکہ مکرمہ۔
❖ مولانا محمد طاسین صاحب، ناظم مجلس علمی کراچی

- چار شامیں انجمن خدام القرآن کے سالانہ محاضراتِ قرآنی کے لیے خاص رہیں گی۔ (یہ محاضرات ان شاء اللہ جناح ہال میں ہوں گے)

❖ جمعہ ۴ اپریل تا اتوار ۶ اپریل تنظیم اسلامی پاکستان کا سالانہ اجتماع منعقد ہوگا۔
❖ اتوار ۶ اپریل کو بعد نمازِ عصر قرآن اکیڈمی میں انجمن کا سالانہ اجلاس عام ہوگا۔

——— ——— ——— ان شاء اللہ العزیز ———

تذکرہ و تبصرہ

اسرار احمد

تنظیمِ اسلامی کے رفقاء کی خدمت میں!

اَحمدہٗ واصلّی علیٰ رسُولہِ الکریم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم رفقاءِ تنظیمِ اسلامی!

وَفّقنا اللہُ وَاِیّاکُم لِمَا یُحِبُّ وَیَرضیٰ[1]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

سب سے پہلے تو میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے ہمیں خلعتِ وجود سے نوازا اور شرفِ انسانیت سے سرفراز فرمایا پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام میں پیدا فرمایا اور اس طرح ہمارے لئے نورِ ہدایت اور راہِ سعادت تک بسہولت رسائی کی صورت پیدا فرما دی

پھر میں مزید شکریہ ادا کرتا ہوں اس کے ان عظیم احسانات کا جو خاص طور پر اس عبدِ ضعیف پر اوائلِ عمر ہی سے ہوئے جن کے ذریعے اولاً میرے اندر ملّتِ اسلامی کا درد پیدا ہوا پھر خصوصاً قرآنِ حکیم سے محبت و مناسبت پیدا ہوئی اور جوانی کے آغاز ہی سے یہ عزمِ مصمّم بھی پیدا ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توانائیوں اور صلاحیتوں کے بہتر و بیشتر کا ہدف اسیؐ کے پیغام کی نشر و اشاعت اور اسیؐ کے دین کے غلبہ و اقامت کی جد و جہد ہو گا۔

پھر یہ بھی سراسر اسیؐ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس فیصلے پر استقامت عطا فرمائے رکھی اور نہ صرف یہ کہ حیاتِ دنیوی کے نشیب و فراز میں گم ہونے سے بچائے رکھا بلکہ خود اقامتِ دین کی راہ

---

[1] اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان کاموں کی (بیش از بیش) توفیق عطا فرمائے جو اسے پسند ہیں اور جن سے وہ راضی ہوتا ہے۔

کے متعدد اہم موڑوں پر دستگیری فرمائی اور ہر مایوسی اور دل شکستگی کے بعد ایک عزمِ تازہ سے سرفراز فرمایا اور اپنے خصوصی فضل و کرم سے یہ "بڑھتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور!" کی کیفیت تاحال برقرار رکھی : فَلِلّٰہِ الحمدُ والمنّۃ

اس کے بعد بموجب فرمانِ نبویؐ "مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ" میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ سب کا کہ آپ نے دین کی راہ میں میرے رفیق و ہمسفر اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں میرے دست و بازو اور اعوان و انصار بننا قبول کیا۔ جس کے نتیجے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ :

ع گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اور ع میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر — راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

فَجَزَاکُمُ اللّٰہُ عَنِّیْ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ

گذشتہ سالانہ اجتماع پر تنظیم اسلامی نے اپنی زندگی کے دس سال پورے کر لئے تھے اور یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت و رحمت کا مظہر ہے کہ ہم نے اس موقع پر محاضراتِ قرآنی کا عنوان "تصورِ فرائضِ دینی" کو بنایا اور اس موضوع پر میں نے اپنے مطالعہ و فکر کا لُبِّ لباب تحریری صورت میں پیش کیا اور اس پر ملک کے نامور علماءِ کرام کو بلاتفریقِ مسلک و مشرب اظہارِ رائے کی دعوت دی۔

ان چھ روزہ محاضرات میں شرکت کرنے والے ہر شخص کو معلوم ہے کہ خود میں ان محاضرات کے دوران محض 'سامع' رہا اور اللہ گواہ ہے کہ یہ سماعت نہ معاندانہ تھی نہ لاابالیانہ بلکہ "اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ" کی امکانی حد تک تعمیل کے ساتھ تھی! پھر یہ بھی ہم سب پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کا مظہر تھا کہ اس کے باوجود کہ بعض حضرات نے نہ صرف یہ کہ ہمارے موقف پر شدید تنقید کی بلکہ استہزائیہ انداز تک اختیار کیا لیکن ہم نے اپنے مہمانوں کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا اور سب کچھ صبر سے سنا چنانچہ الحمدللہ کہ دورانِ محاضرات کسی تلخی کا شائبہ تک پیدا نہ ہوا۔

ان محاضرات میں ہمیں بعض بزرگ اور معروف علماء کرام کی جانب سے مکمل تائید و توثیق ملی بعض حضرات نے بعض اجزاء سے اختلاف کا اظہار فرمایا۔ بعض نے محض کچھ احتیاطوں کی نصیحت فرمائی اور بعض حضرات نے میری رواروی میں سپردِ قلم ہونے والی تحریر کی بعض لفظی فروگذاشتوں

کو تنقید کا موضوع بنایا۔ لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ ان امور کی وضاحت میں محاضرات سے قبل والے جمعہ میں مسجد دارالسلام میں کرچکا تھا تو الحمد للہ کہ انہوں نے اطمینان کا اظہار فرمایا۔ اس کی نمایاں ترین مثال مولانا الطاف الرحمٰن بنوی ہیں جنہوں نے محاضرات میں جو مقالہ پڑھا تھا وہ خاصہ 'تیکھا' تھا۔ لیکن بعد میں ان کی جو تحریر موصول ہوئی وہ ہمارے موقف کی مکمل تائید کی حامل ہے (یہ تحریر گذشتہ ماہ کے 'حکمت قرآن' میں شائع ہو چکی ہے)

بہر حال میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ ان محاضرات کے نتیجے میں مجھے اپنے بنیادی تصورِ دین اور تصورِ فرائضِ دینی پر مزید اطمینانِ قلب اور انشراحِ صدر نصیب ہوا۔ چنانچہ میں نے اس سال کے دوران پہلے سے بھی زیادہ اعتماد کے ساتھ اللہ کے ماننے والوں کو اس کے دین کے ان تقاضوں کو ادا کرنے کی مقدور بھر دعوت دی۔

ہمارے لئے حرکت و عمل کا اصل جذبۂ محرکہ تو یہی ہے کہ ہم اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے ضمن میں خود امکان بھر بندگیٔ رب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اللہ کے دین کی دعوت و شہادت کے ساتھ ساتھ اس کے غلبہ و اقامت کے لئے مقدور بھر سعی کرتے رہیں اور اس ضمن میں امکانی حد تک تحقیق و تفتیش سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ و طریق کا فہم و شعور حاصل کریں اور حتی المقدور اسی کی پیروی کی کوشش کریں! ـــــ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ ہمارے دین میں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد تو ہیں ہی، ان تمام بیجان اشیاء کے حقوق بھی ہیں جن سے ہم انتفاع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جس راستے پر انسان چلتا ہے۔ اس کا بھی اس پر حق قائم ہو جاتا ہے ـــــ!

یہ بات ادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہمارے لئے ایسی تمام اشیاء میں سرِ فہرست بلکہ صحیح تر الفاظ میں ان سب کا جامع مظہر وطن عزیز پاکستان ہے، جس میں ہم آباد ہیں جس کی زمین سے ہمیں غذا حاصل ہو رہی ہے اور جس کی فضا میں ہم سانس لے رہے ہیں لہٰذا اس کے بقاء و استحکام کی جدوجہد بھی ہمارا فرض ہے اور اس کی عزت و آبرو اور آزادی و خود اختیاری کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دینا ہماری ذمہ داری ہے!

ہم پر اللہ کا احسان یہ ہے کہ ہمارے لئے دین اور وطن کے تقاضے مختلف یا متضاد نہیں ہیں بلکہ کمالِ وحدت کا مظہر ہیں۔ اس لئے کہ ہمارا وطن وہ ہے جو قائم ہی اسلام کی اساس پر ہوا

ہے اور اس کے بقا و استحکام کا کل دار و مدار اقامتِ دین یا غلبۂ اسلام پر ہے۔

جہاں تک ہمارے دینی فرائض کا تعلق ہے انہیں میں نے اپنی امکانی حد تک تحریروں اور تقریروں اور بالخصوص مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے دروس کے ذریعے بفضلِ اللہ تعالیٰ و بتوفیقہٖ اب سے بہت پہلے اس حد تک واضح کر دیا تھا کہ کسی نیک نیت انسان کو ان کے بارے میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہ سکتا۔ البتہ جہاں تک ملک و وطن کے مسائل کا تعلق ہے تو اگرچہ گاہے گاہے یہ امور بھی میری تحریر و تقریر کا موضوع بنے تاہم ان پر سیر حاصل گفتگو ابھی باقی تھی۔ اور میں اسے اللہ تعالیٰ کی مشیتِ خصوصی کا مظہر سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر ایک باضابطہ تالیف کی صورت پیدا ہو گئی جس کے نصف اوّل کا حاصل صرف یہ ایک جملہ ہے کہ:

'پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے!!!'

کتاب کا یہ حصہ روزنامہ 'جنگ' میں ان شاء اللہ جمعہ ۲۸ فروری تک اور 'میثاق' میں اپریل کے شمارے تک شائع ہو جائے گا! ——— کتاب کا نصف ثانی اسلامی انقلاب کے طریق و منہاج کی تفصیل پر مشتمل ہو گا جس کا واحد ماخذ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ مضمون 'میثاق' میں شائع شدہ تقاریر کے ذریعے بہت حد تک سامنے آ چکا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے ازسرِ نو اپنے قلم سے مرتب کر دوں تاکہ یہ بھی روزنامہ 'جنگ' کے ذریعے وسیع پیمانے پر لوگوں کے سامنے آ جائے۔

بہر حال اس کے بغیر بھی کم از کم آپ حضرات (رفقاءِ تنظیمِ اسلامی) کی حد تک بات پورے طور پر سامنے آ چکی ہے! اور کم از کم آپ لوگوں پر میری جانب سے اس ضمن میں بھی حجت قائم ہو چکی ہے!

اب سوال عمل کا ہے ——— بقول اقبال:

"یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے"

اور اس کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون یہ ہے کہ کسی انسان پر حقیقت کا انکشاف جس قدر زیادہ ہو جائے اسی قدر زیادہ وہ مسئول اور ذمہ دار ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں اگرچہ مجھے اقبال کی یہ نصیحت بھی خوب اچھی طرح یاد ہے کہ:

"نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ!
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی!"

لیکن اس کے باوصف اب ؎ "زین ہمرہانِ سست عناصر دِلم گرفت" کی کیفیت اتنی شدید ہو گئی ہے کہ ؎ "نوا را تلخ ترمی زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی" کے مصداق اپنے آپ کو کسی قدر "تلخ نوائی" پر مجبور پاتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اسے "گوارا" فرمائیں گے!

ہم نے تنظیم اسلامی کی اساس ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ اور سمع و طاعت فی المعروف کی ماثور و مسنون بیعت پر قائم کی ہے۔ جس کی بے شمار برکات میں سے بعض کا ذکر میں نے ستمبر ۸۵ء کے شمارے میں کیا تھا۔ (جس کا اقتباس فروری ۱۹۸۶ء میں دوبارہ سامنے آچکا ہے)۔ اس طریق تنظیم کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جس وقت کوئی شخص کہے کہ اس نے اس بیعت کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اور وہ پورے فہم و شعور کے ساتھ بیعت کرنا چاہتا ہے میں اس کی بیعت قبول کر لیتا ہوں۔ لیکن تجربے سے اندازہ ہوا کہ بہت سے حضرات اس بیعت کی ذمہ داریوں کا پورا احساس و ادراک نہیں رکھتے اور اسے صرف ایک ذہنی سہارا بنا لیتے ہیں جیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول مبارک کے مطابق بعض لوگ قرآن مجید کو بس ایک "تکیہ" بنا لیتے ہیں ("یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ" بیہقی عن عبیدہ ملیکیؓ) ایسے تمام حضرات کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے کہ اس صورت میں اندیشہ ہے کہ کہیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس لئے کہ اسلام میں تو عام وعدہ و عہد کی بھی بہت اہمیت ہے، بمصداق الفاظ قرآنی "اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا" (بنی اسرائیل: ۳۴) اور "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" (مائدہ: ۱) ـــــ تو ہجرت و جہاد اور سمع و طاعت کی بیعت تو بہت بڑا عہد ہے اور اس کی ذمہ داری بہت بھاری ہے۔ چنانچہ اس عہد کی خلاف ورزی کا ذکر سورۂ فتح کی آیت ۱۰ میں بڑی شدید وعید کے انداز میں آیا ہے۔ یعنی "فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ" یعنی جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ اس کا سارا وبال اپنے ہی اوپر لے گا۔ بنابریں ایسے تمام حضرات سے جنہوں نے کسی وقتی اور جذباتی تحریک سے بیعت کر لی تھی لیکن بعد میں یا پورے طور سے مطمئن نہ رہے یا اپنی ہمت و عزیمت کو مجتمع نہ کر پائے میری درخواست یہ ہے کہ از خود اپنی بیعت کو فسخ کر کے مجھے مطلع فرما دیں۔ اس لئے کہ اگرچہ اس بیعت کا معاملہ یک طرفہ ہے اور ساری ذمہ داری

بیعت کرنے والا قبول کرتا ہے تاہم مجھے ایسے حضرات کے طرزِ عمل سے جو کوفت ہوتی ہے اس طرح کم از کم اس سے نجات حاصل ہو جائے گی! ——— اور اگر معاملہ محض تساہل کا ہے تو چاہیئے کہ از سرِ نو عزمِ مصمم کے ساتھ کمر ہمت کسی جائے اور پوری طرح آمادۂ عمل اور پابند نظم بن جایا جائے۔

اسی طرح بعض حضرات کے بارے میں یہ گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے تنظیم اسلامی کو بھی عام معنی میں کوئی تبلیغی ادارہ یا اصلاحی انجمن سمجھ لیا ہے اور فریضہ اقامت دین کے انقلابی تقاضے تاحال ان پر واضح نہیں ہیں۔ ایسے حضرات سے بھی یہ درخواست بے محل نہ ہوگی کہ وہ تنظیم کی دعوت اور اس کے اصول و مبادی اور کل صغریٰ کبریٰ پر اچھی طرح نظر ثانی فرمالیں اور اگر ان کا مزاج اس کے انقلابی منہاج سے ہم آہنگی نہ رکھتا ہو بلکہ وہ صرف کسی علمی و تعلیمی یا اصلاحی و تبلیغی کام ہی کی جانب رجحان رکھتے ہوں تو اپنے وقت اور صلاحیت کا مصرف کسی اور ادارے یا انجمن کو بنائیں۔

اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ تنظیم کے اکثر رفقاء نے تاحال اقامت دین کی جدّ و جہد کو اپنی زندگی میں 'اولیت' نہیں دی بلکہ صرف ثانوی اور اضافی حیثیت دی ہوئی ہے۔ کہ اگر دنیا کے دوسرے کاموں سے فرصت مل جائے تو کچھ کام ادھر کا بھی ہو جائے ورنہ 'عذرِ معروفیت' ان کے اطمینان کے لئے کفایت کرتا ہے! جبکہ واقعہ یہ ہے کہ اس راہ میں کوئی پیشقدمی ممکن ہی نہیں ہے جب تک ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ مہیا نہ ہو جائیں جو تقریباً 'ہمہ تن' اور 'ہمہ وقت' اس کام میں لگ جائیں اور حیاتِ دنیوی اور اس کے جملہ متعلقات کے ساتھ ان کا تعلق صرف ثانوی اور ضمنی بن کے رہ جائے۔

مجھے شدت کے ساتھ احساس ہے کہ ہماری دعوت اور تنظیم اب اس مرحلے پر آگئی ہے کہ اسے ایک معتدبہ تعداد میں ایسے 'ہمہ تن' اور 'ہمہ وقت' لوگ فوری طور پر میسر نہ آئے تو اب تک کا کیا کرایا بھی ضائع جائے گا۔ اور قدم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی جانب ہٹنے لگیں گے۔ چنانچہ تحریر ہٰذا کے ذریعے میں ایسے ہی ساتھیوں کو ندا دے رہا ہوں کہ:

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ!

اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ یہ کوئی بامعاوضہ "ہمہ وقتی کارکنوں" کے لیے "ضرورت ہے" کی قسم کا اشتہار ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ کوئی بھی عوامی تحریک ہمہ وقتی کارکنوں کے بغیر نہیں چل سکتی اور ان میں سے جن کے پاس کوئی مستقل ذرائع آمدن نہ ہوں ان کے لئے کوئی

'معاوضہ' یا 'اعزازیہ' قبول کرنا ایک 'ناگزیر برائی' ہے ___ تاہم صحیح بات یہی ہے کہ با معاوضہ خدمات کا معاملہ تعلیم و تدریس اور دفتری و انتظامی قسم کی ذمّہ داریوں کے ضمن میں تو درست ہے لیکن کسی دینی تحریک کے اصل 'مردانِ کار' اور تنظیم کی مختلف سطحوں (LEVELS) پر قیادت اور سربراہی کے فرائض سرانجام دینے والوں کے لئے ہرگز مناسب نہیں! اس سطح پر تو اصل مناسبت صرف ذاتی عزیمت اور اللہ پر توکّل کو ہے۔ اور فی الوقت میری 'ندا' ایسے ہی اصحاب ہمّت کے لئے ہے جو مختلف مقامات پر تحریک کی ذمّہ داریوں کا اصل بوجھ اٹھا سکیں۔

اس ضمن میں مَیں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فی الواقع اگر کوئی انسان شعوری طور پر پورے خلوص کے ساتھ فیصلہ کرلے کہ وہ 'ہمہ تن' اور 'ہمہ وقت' دین کی خدمت میں لگ جائے گا تو اللہ تعالیٰ ابتداءً اس کے عزم اور خلوص کو آزماتا تو ضرور ہے اور اسے امتحان کی کچھ نہ کچھ بھٹیوں میں سے لازماً گذرنا پڑتا ہے تاہم اس آزمائش میں پورا اترنے کی توفیق بھی اللہ خود ہی دیتا ہے اور بالآخر اس کی کفالت کا انتظام کسی جماعت سے تنخواہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ " مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ "[1] قسم کے ذرائع سے فرما دیتا ہے۔ گویا اُسے خود اپنی جانب سے 'فارغ' کر دیتا ہے

؎ سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے!

لہٰذا جو رفقاءِ تنظیم اس کا اپنے دل میں پختہ عہد کرلیں' قطع نظر اس سے کہ فی الوقت ان کے سامنے کوئی محسوس و معلوم مالی ذرائع ہیں یا نہیں اور بلا لحاظ اس کے کہ وہ عمر اور صحت کے اعتبار سے کس کیفیت میں ہیں۔ وہ میری پکار پر 'لَبَّيْكَ' کہنے میں جھجک محسوس نہ کریں اور ایسے تمام رفقاء سے میری پہلی گذارش یہ ہے کہ وہ ۱۲ مارچ تا ۶ اپریل ۸۶ء (کُل سترہ دن) ہر حال میں اور ہر قیمت (RISK) پر فارغ کرلیں اور جمعہ ۱۲ مارچ کو نمازِ جمعہ سے قبل لاہور (قرآن اکیڈمی یا مسجد دارالسلام) پہنچ جائیں۔ اسی کے لئے مناسب مدّتِ مہلت (NOTICE) دینے کے لئے 'میثاق' کا یہ شمارہ راقم نے معمول سے پہلے تیار کرایا ہے تاکہ رفقاء کو سفر کی تیاری کے لئے مناسب وقت مل جائے! ایسے رفقاء سے ایک اضافی گذارش یہ ہے کہ میری اس پکار پر 'لَبَّيْكَ' کی اطلاع فوری طور پر ارسال کر دیں۔

۲۱ مارچ کی شام سے ۳ اپریل کی شام تک اس سال کی چوتھی تربیت گاہ کا پروگرام پہلے سے طے شدہ ہے' لیکن اب یہ تربیت گاہ سابقہ تین تربیت گاہوں کے نہج پر نہیں ہوگی بلکہ

---

[1] سورۂ طلاق: ۳ ترجمہ: "جہاں سے اُسے سان گمان بھی نہ ہو۔"

تنظیم کے مذکورہ بالا قسم کے 'ہمہ وقت کارکنوں' کے خصوصی اجتماع کی نوعیت کی ہوگی جس میں زیادہ تر وقت مشورہ، مذاکرہ اور تبادلہ خیالات میں صرف ہوگا تاکہ آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں تنظیم کے اس سطح کے کارکنوں کے ذہنوں میں کوئی اشکال یا اشتباہ باقی نہ رہے اور ہماری تحریک پوری یکسوئی اور ہمواری کے ساتھ آگے بڑھ سکے! اس لئے کہ آئندہ ان شاء اللہ العزیز یہی رفقاء تنظیم کی اصل ریڑھ کی ہڈی کا کام دیں گے، اور اول تو ان میں سے اکثر کو مرکز ہی میں جمع کرنے کی کوشش کی جائے گی جہاں سے انہیں مختلف مقامات پر بھیجا جا سکے ورنہ وہ اپنے اپنے مقامات پر کام کرتے ہوئے ہر دم تیار رہیں گے کہ جہاں ضرورت ہو ان کو بھیج دیا جائے۔ اس طرح وہ جدید بینکنگ کی اصطلاح میں تنظیم کا "DEPOSIT AT CALL" ہوں گے!

ان حضرات سے ایک مزید گذارش یہ ہے کہ تنظیم کے بنیادی لٹریچر کو بھی از سر نو نگاہوں سے گذار کر تشریف لائیں اور میرے 'استحکام پاکستان' والے حالیہ مضامین کا بھی مطالعہ کر کے آئیں۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ اگر کچھ نئے رفقاء نے اس تربیت گاہ میں شمولیت کا فیصلہ کیا ہوا تھا تو وہ تشریف نہ لائیں، ان شاء اللہ ایسا اہتمام کر لیا جائے گا کہ کچھ پروگرام مشترک نوعیت کے ہوں اور کچھ نئے رفقاء کی خصوصی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے علیحدہ ترتیب دے لئے جائیں۔

اس کے بعد جمعہ ۴ تا اتوار ۶ اپریل ۸۶ء تنظیم کا معمول کے مطابق سالانہ اجتماع ہوگا۔ جس میں جملہ رفقاء تنظیم کی شرکت لازمی ہے اور جس شخص نے مجھ سے بیعت کی ہوئی ہے اسے یہ جان لینا چاہئے کہ اگر اس کے علم میں میری یہ ہدایت آجائے اور کوئی شدید عذر بھی مانع نہ ہو تو اس کی اجتماع سے غیر حاضری بیعت کے منافی ہوگی۔

چونکہ تنظیم کے بہت سے رفقاء مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے رکن بھی ہیں لہٰذا وہ یہ بھی نوٹ فرمالیں کہ ۶ اپریل کی شام کو ان شاء اللہ انجمن کا سالانہ اجلاس بھی قرآن اکیڈمی ہی میں منعقد ہونا طے پایا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی اپنی ذمہ داریوں کو پورے احساس مسئولیت کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ فقط والسلام!

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنظیمِ اسلامی

نہ معروف معنی میں سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ

بلکہ
ایک **انقلابی اسلامی پارٹی** ہے جو

پہلے **پاکستان** اور بالآخر پورے **کرۂ ارضی** پر

دینِ حق

یعنی **اسلام کے کامل نظامِ عدل و قسط** کو

غالب و قائم کرنا چاہتی ہے

جس کے نتیجے میں ———— اِن شاء اللہ العزیز

سماجی سطح پر

(۱) کامل انسانی مساوات اور گہری اسلامی اخوت قائم ہوگی اور نسل، رنگ، زبان، پیشے اور جنس کی بنیاد پر نہ کوئی اونچا رہے گا نہ نیچا ـــــ بلکہ عزت و شرافت کا معیار صرف تقویٰ اور خدا ترسی ہونگے:

کلُّ مومن اخوۃٌ ـ اندر دِلش — حُریت سرمایۂ آب و گِلش[۱]

ناشکیب امتیازات آمدہ!! — در نہادِ او مساوات آمدہ[۲]

(۲) پردہ یعنی ستر اور حجاب کے شرعی احکام کے نفاذ سے خواتین کی نسوانیت اور عزت و وقار کو کامل تحفظ حاصل ہوگا اور اسلام کے "حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں"[۳] خاندانی نظام کے تحت خواتین کو معاشی کفالت کی پوری ضمانت حاصل ہوگی تاکہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ آئندہ نسل کی تربیت کے فرائض بہترین طریقے پر سرانجام دے سکیں:

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر — کہ در آغوش شبیرؑ بگیری![۴]

البتہ ان کے حقوقِ ملکیت و وراثت کو مکمل تحفظ حاصل ہوگا۔

اور تعلیم، صحت اور گھریلو صنعتوں کے میدان میں ان کی قوتیں اور صلاحیتیں قومی سطح پر بھرپور انداز میں بروئے کار آئیں گی۔

(۳) اسلامی حدود اور تعزیرات کے نفاذ سے بدامنی کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور قتل، چوری اور ڈاکے کے علاوہ زنا اور تہمت زنا کی بھی بیخ کنی ہو جائے گی!

(۴) سماجی برائیوں جیسے رشوت، بے جا اسراف، نمود و نمائش پر دولت کا ضیاع اور شادی بیاہ کی ہندوانہ رسومات کا استیصال ہو جائے گا!

(۵) مفت اور جلد از جلد انصاف مہیا ہوگا اور جھوٹی گواہی کا خاتمہ ہو جائے گا!

(۶) تعلیم کے ضمن میں جدید اور قدیم، دینی اور دنیوی اور امراء و غرباء کی تقسیم ختم ہو جائے گی۔ سب کے لئے ایک ہی نظام تعلیم ہوگا جو کم از کم میٹرک تک مفت ہوگا!

---

[۱] مسلمان کے دل میں یہ بات نقش ہوتی ہے کہ سب مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور آزادی کا جذبہ اس کی سرشت میں داخل ہے!

[۲] بندۂ مومن (رنگ، نسل، زبان وغیرہ) کے امتیازات سے ناآشنا ہوتا ہے اور مساواتِ انسانی کا تصور اس کے وجود کا جزو لا

[۳] "عورت کے ناموس کی حفاظت کرنے والا اور مرد کو ذمہ داری اور مردانگی کے اوصاف عطا کرنے والا"

[۴] (اے مسلمان خاتون) حضرت فاطمہؓ کے نقش قدم پر اور چل تہذیبِ حاضر سے کنارہ کشی کر تاکہ تیری گود میں حضرت حسینؓ جیسے فرزند ہوا

معاشی سطح پر

(۱) ریاست ہر شہری کی ناگزیر بنیادی ضروریات (غذا، لباس، رہائش، تعلیم اور علاج) کی کفالت کی ذمہ دار ہوگی اور اس کے لئے مسلمانوں سے زکوٰۃ اور غیر مسلموں سے جزیئے کی وصولی کا نظام پورے طور پر نافذ ہوگا:

کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس ۔۔۔ نکتۂ شرعِ مبین این است و بس!![1]

(۲) مزید برآں صدقاتِ نافلہ، انفاق فی سبیل اللہ اور قرضِ حسنہ کا جذبہ پروان چڑھے گا۔

جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک! ۔۔۔ اِس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

(۳) سود کی لعنت کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور، جوئے، سٹے، لاٹری، دو طرفہ آڑھت اور خرید و فروخت کی جملہ حرام صورتوں کے کلی انسداد سے "سرمایہ داری" کی جڑ کٹ جائے گی!

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ! ۔۔۔ آدمی درندہ بے دندان و چنگ ——![2]

(۴) شریعتِ اسلامی کی حدود کے اندر اندر انفرادی ملکیت اور آزاد معاشی جدوجہد کی فضا برقرار رہے گی اور اس ضمن میں صحتمند مقابلہ سے صنعت و تجارت کو فروغ اور پیداوار میں اضافہ ہوگا

(۵) اجیر و مستاجر یعنی مزدور اور کارخانہ دار کے درمیان اسلامی اخوت اور عدل و انصاف کے علاوہ "باہمی سوداکاری" میں مزدور کو ریاست کی جانب سے کفالت کی ضمانت کا سہارا حاصل ہوگا۔

(۶) جاگیرداری کی لعنت کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا خواہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے اس متفقہ فتوٰی پر عمل کے ذریعے کہ مزارعت حرام ہے خواہ حضرت عمرؓ کے اجتہاد پر مبنی فقہ حنفی کے اس فتوٰی پر عمل کے ذریعے کہ جو علاقے کسی بھی وقت بزورِ شمشیر فتح ہوئے تھے ان کی اراضی انفرادی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ اسلامی ریاست کے بیت المال کی ملکیت ہوتی ہیں زمینداری کی جملہ خرابیاں ختم ہو جائیں گی!

خدا آں ملتے را سروری داد ۔۔۔ کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت[3]

بآں قومے سروکارے نہ دارد ۔۔۔ کہ دہقانش برائے دیگراں کشت[4]

---

[1] شریعتِ اسلامی کا اہم ترین نکتہ یہی ہے کہ ایسا اجتماعی نظام قائم ہو کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا انفرادی سطح پر محتاج نہ رہے!

[2] سود خوری سے انسان کا باطن تاریک اور دل پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے اور انسان بغیر (درندوں والے) پنجوں اور دانتوں کے درندہ بن جاتا ہے

[3] اللہ اسی قوم کو دنیا میں سربلندی عطا فرماتا ہے جس کے افراد اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر لکھتے ہیں (یعنی خود محنت کر کے کماتے ہیں)

[4] اللہ اس قوم سے کوئی سروکار نہیں رکھتا جس کے کاشتکاروں کی خون پسینے کی کمائی کوئی اور (زمیندار و جاگیردار) ہڑپ کر جاتے ہیں!

سیاسی سطح پر

(۱) حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کی ہوگی، چنانچہ کوئی قانون سازی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے منافی نہیں کی جا سکے اور اعلیٰ عدالتوں کو پورا اختیار ہوگا کہ کتاب و سنت کے منافی ہر قانون کو بلا استثناء کالعدم قرار دے دیں۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری!

(۲) ریاست کے کامل شہری صرف مسلمان ہوں گے اور اُن کے حقوق شہریت بالکل مساوی ہوں گے اور وہ اسلام کے اصولِ مشاورت کے مطابق باہمی مشورے سے ملک کے نظام کو چلائیں گے۔

(۳) قانون کی نگاہ میں سب برابر ہوں گے اور کوئی شخص حتیٰ کہ صدرِ ریاست بھی قانون سے بالاتر نہ ہوگا۔

(۴) غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا پورا ذمہ لیا جائے گا اور انہیں کامل معاشی اور مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ چنانچہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کی اپنے مذہب کے مطابق تعلیم و تربیت کے حق دار ہوں گے۔ البتہ انہیں مسلمانوں میں تبلیغ کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

(۵) وحدانی یا فیڈرل یا کنفیڈرل نظامِ ریاست —— اور اسی طرح صدارتی یا پارلیمانی طرزِ حکومت میں سے کسے اختیار کیا جائے اس کا فیصلہ عوام کی کھلی رضامندی پر منحصر ہوگا اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی نہ دینی اعتبار سے لازمی ہے نہ حرام یا ناجائز!

(۶) علاقائی یا نسلی و قبائلی روایات میں سے جو شریعتِ اسلامی سے متصادم نہ ہوں انہیں پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ اسی طرح علاقائی زبانوں کے حقوق کی حفاظت ہوگی البتہ سب سے زیادہ زور عربی پر دیا جائے گا۔

الغرض! پاکستان دورِ جدید کی بہترین اسلامی، جمہوری اور فلاحی ریاست بن جائے گا!!

اللہ تعالیٰ ہمیں اس عظیم مقصد کیلئے تن من دھن لگا دینے کا عزمِ مصمم کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

نوٹ: ان صفحات میں اسلام کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کے جو اہم خدوخال درج کئے گئے ہیں وہ سب کتاب و سنت کی محکم اساسات پر مبنی ہیں لیکن آیات و احادیث کا حوالہ جگہ کی کمی کے باعث بھی نہیں دیا جا سکتا اور آیات و احادیث اس لئے بھی درج نہیں کی گئیں کہ اسے بڑے پیمانے پر پھیلانا ہے جس سے مقدس عبارات کی بے حرمتی کا اندیشہ ہے! علامہ اقبال مرحوم کے اشعار بھی اس لئے نہیں درج کئے گئے کہ وہ بجائے خود دلیل ہیں بلکہ محض اس لئے کہ وہ کتاب و سنت کی تعلیمات کی اختصار اور جامعیت کے ساتھ دلنشیں پیرائے میں ترجمانی کرتے ہیں!

اسلامی انقلاب

کے لئے تنظیم اسلامی کے پیش نظر

طریقِ کار

یہ ہے کہ ——————— جو لوگ،

اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح

کے حصول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہوں، وہ ———————

(۱) سب سے پہلے خود پوری طرح مسلمان اور حقیقی معنی میں اللہ کے بندے بنیں اور اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار میں شریعتِ اسلامی کو نافذ کریں! اور اس کے لئے اپنے نفس کے خلاف بھی جہاد کریں اور بگڑے ہوئے ماحول سے بھی مردانہ وار کشمکش کریں :- اور مقدور بھر اسی کی دعوت دوسروں کو بھی دیں

نفسِ ما ہم کم تر از فرعون نیست — لیکن او را عون ایں را عون نیست[1]

اور بقول

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز![2]

(۲) باہم دینی اخوت اور ایمانی محبت کے رشتوں میں بندھ کر آپس میں نہایت رحیم و شفیق اور دین کے باغیوں اور مخالفوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

---

[1] میرا نفس بھی (اللہ کے خلاف بغاوت اور سرکشی میں) فرعون سے کم تر نہیں لیکن اس کے پاس لاؤ لشکر تھا لہٰذا اس نے زبان سے بھی خدائی کا دعویٰ کر دیا) جو میرے نفس کے پاس نہیں ہے! (لہٰذا میں زبان سے کچھ نہیں کہتا) (رومی)

[2] اگر زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہ کرے تو بجائے اس کے کہ تم اس سے شکست مان لو) اس سے لڑو!

(۳) کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر جس کے عزم و ارادہ، اصابتِ رائے اور خلوص و اخلاص پر دل و دماغ گواہی دیں ہجرت و جہاد اور سمع و طاعت فی المعروف کی بیعت کر کے ایک جماعتی نظم میں منسلک ہو جائیں۔

اور اس طرح جو اجتماعی قوت وجود میں آئے وہ :—

(ا) جب تک یہ قوت مناسب مقدار میں جمع نہ ہو جائے تن من دھن کے ساتھ : ———

(۱) اسی دعوت و تربیت اور تنظیم کی توسیع و استحکام کی جدوجہد میں منہمک رہیں! اور سب سے زیادہ توجہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اصلاح اور تزکیہ پر مرکوز رکھیں

(۲) اس دوران میں 'زبان' یعنی تحریر و تقریر کے ذریعے 'نہی عن المنکر' یعنی برائیوں اور خلافِ شریعت کاموں پر تنقید اور ملامت کا فریضہ پوری قوت سے سرانجام دیں لیکن ملکی انتخابات میں حصہ لیں نہ ہی کسی دوسرے سیاسی ہنگامے میں فریق بنیں۔

(۳) اس پورے عرصے کے دوران نہ کسی طنز و تضحیک اور تمسخر و استہزاء سے بددل ہوں نہ کسی جبر و تشدد اور ایذاء و ابتلاء سے ہراساں ہوں بلکہ کامل صبر و تحمل سے کام لیں اور ہرگز کوئی جوابی کارروائی نہ کریں۔

(ب) اور جب مناسب قوت فراہم ہو جائے تو راست اقدام کے طور پر : ———

(۱) 'نہی عن المنکر بالید' یعنی قوت سے منکرات کے استیصال کے لئے کمر کس لیں۔

(۲) اس کے لئے جلسوں، جلوسوں، مظاہروں اور ناکہ بندیوں (پکٹنگ) کی شکل میں اجتماعی قوت و ارادہ کے اظہار کے تمام جدید ذرائع استعمال کریں ——— اس شرط کے ساتھ کہ یہ سب کچھ بالکل پرامن ہو اور اس میں ان کی جانب سے کوئی تشدد نہ ہو!

(۳) اور اگر ان پر تشدد کیا جائے تو پورے صبر و مصابرت اور ثبات و استقلال کا مظاہرہ کریں حتی کہ اس راہ میں جان دینے کو سب سے بڑی کامیابی سمجھیں۔

تا آنکہ "نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا"[1] کے مصداق

یا حق کا بول بالا ہو جائے یا شہادت کی موت نصیب ہو جائے

---

[1] صحیح بخاری کی رُو سے یہ شعر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ احزاب میں خندق کھودتے وقت آواز میں آواز ملا کر پڑھتے تھے۔
ترجمہ: "ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آخری دم تک جہاد جاری رکھنے کی بیعت کی ہے۔"

ہجرت: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی رُو سے ہجرت کا آغاز ترکِ معاصی سے ہو جاتا ہے، البتہ دل میں نیت رکھنی ضروری ہے کہ اگر کبھی غلبۂ دینِ حق کی جدّ و جہد میں ضرورت ہو تو اہل و عیال، گھر بار اور ملک و وطن سے بھی ہجرت اختیار کر لوں گا۔

جہاد: اسی طرح آنحضورؐ کے فرمان کے مطابق اصل جہاد تو اپنے نفس سے کرنا ہوتا ہے، تاہم دین کی دعوت و تبلیغ اور غلبہ و اقامت کی جدّ و جہد میں جان اور مال کھپانے کی جملہ صورتیں جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہیں۔ البتہ دل میں یہ آرزو رکھنی ضروری ہے کہ کبھی خالص اللہ کے دین کے لئے قتال کی نوبت آئے تو اس میں حصّہ لوں اور اللہ کی راہ میں گردن کٹا کر شہادت کا رتبہ حاصل کر لوں۔

سمع و طاعت: سے مراد ہے حکم سننا اور اس پہ بے چون و چرا عمل کرنا، یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے تو غیر مشروط ہے لیکن آپؐ کے بعد کسی بھی انسان کے لئے 'فی المعروف' کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی یہ کہ اس کا حکم اللہؐ اور اس کے رسولؐ کے کسی واضح اور صریح حکم کے خلاف نہ ہو، البتہ اس سے باہمی مشاورت کی نفی نہیں ہوتی جو نہایت ضروری اور لازمی ہے۔

بیعت: ایک معاہدہ ہے جس کی بہت سی قسمیں نبی اکرمؐ اور سلف صالحین سے منقول و ماثور ہیں۔ اس 'بیعتِ جہاد' سے بیعتِ ارشاد و سلوک کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ دونوں بیعتیں جُدا جُدا بھی ہو سکتی ہیں اور یکجا بھی۔

ڈاکٹر صاحب مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

کے صدر مؤسّس بھی ہیں اور اُن کی رہائش انجمن کی قائم کردہ

قرآن اکیڈمی، ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ ۱۴

میں ہے جہاں انجمن کے مرکزی دفاتر بھی واقع ہیں۔

ٹیلیفون: ــــــــــــــــــــ ۸۵۲۶۱۱ ــ ۱۵۲۶۸۳

مرکزی دفتر تنظیمِ اسلامی پاکستان

۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ۔ گڑھی شاہو۔ لاہور

(یہاں ابھی ٹیلیفون نہیں ہے۔ فی الحال ٹیلیفونی رابطہ کیلئے انجمن خدام القرآن کے فون استعمال کئے جاسکتے ہیں)

مقامی دفاتر :

- ۱۱۔ داؤد منزل، شاہراہ لیاقت، نزد آرام باغ، کراچی (فون: ۲۱۶۵۸۶)
- ۲۸۔۲۷، سید بلڈنگ، بالمقابل پبلک سیکرٹریٹ اسکول، جناح روڈ، کوئٹہ (فون: ۷۸۸۱۹)
- ۲۵۔ آفیسرز کالونی، نزد لاسال ہائی اسکول، ملتان (فون: ۳۰۴۵۱)
- کمرہ نمبر ۴، لاثانی مارکیٹ، گول چنیوٹ بازار، فیصل آباد (فون: ۳۲۲۲۴-۴۲۰۵۰)
- مکان نمبر ۴۲ گلی نمبر ۳۲، سیکٹر F-6/1، اسلام آباد (فون: ۸۲۴۸۳۶)
- باڑا بازار، غلہ منڈی، پشاور صدر (فون: ۴۱۸۶۱)

تنظیم کی دعوت کو تفصیلاً سمجھنے کے لئے:

تنظیم کے لٹریچر اور امیر تنظیم کے دروس قرآن اور تقاریر کے کیسٹ اور تنظیم کے ترجمان ماہنامہ "میثاق" کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اس کا پتہ: ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
نیز مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا ماہانہ مجلہ "حکمت قرآن" بھی وہیں سے شائع ہوتا ہے۔

تنظیمِ اسلامی میں شمولیت

کے لئے کسی بھی مسلمان (مرد یا عورت) کو امیر تنظیم سے بیعت کرتے ہوئے خلوصِ دل کے ساتھ صرف یہ عہد کرنا ہوگا کہ وہ تنظیم کے نظم کی پابندی کرے گا اور تنظیم کے طریق کار کے مطابق دین کی دعوت و اشاعت اور غلبہ و اقامت کے لئے حسب استطاعت تن من دھن صرف کریگا۔ اور اپنی زندگی میں مطلوبہ تبدیلی لانے کا عمل اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید کے بھروسے پر بلا تاخیر شروع کر دے گا!

ناشر : چوہدری غلام محمد، قیم تنظیم اسلامی ۔ مطبع : مکتبہ جدید پریس، لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد کی زیرِ تالیف تصنیف

استحکامِ پاکستان

شائع شدہ

۱۔ پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال

۲۔ چند ذاتی وضاحتیں

باب اوّل

پاکستان کا عدم استحکام:

حقیقی و واقعی یا وہمی و خیالی؟

باب دوم

پاکستان کی اصل اساس

باب سوم

استحکامِ پاکستان کی ٹھوس بنیاد

زیرِ طبع

باب چہارم

کون سا اسلام؟

باب پنجم

موجودہ مسلمان معاشرے کا اسلام کے ساتھ عملی تعلق

باب چہارم

"کون سا اِسلام؟"

گذشتہ مباحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ پاکستان پوری دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کی 'ولدیت' صرف اور صرف اسلام ہے۔ چنانچہ یہ قائم بھی دین و مذہب کے نام پر ہوا اور اس کے بقاء و دوام اور ترقی و استحکام کے لیے بھی نہ تاریخی تقدس کا عامل موجود ہے، نہ فطری جغرافیائی حدود کا حفاظتی ذریعہ اور نہ ہی دنیا کے معروف اور مروجہ معیارات کے مطابق کوئی قوم پرستانہ جذبہ —— بلکہ اُسے مضبوط اور مستحکم اور ناقابلِ تسخیر بنا سکتا ہے تو صرف اور صرف مذہبی جذبہ! تو آیئے کہ اب ہم اس مذہبی جذبے کی نوعیت اور خدوخال معین کرنے کی کوشش کریں جو پاکستان کے بقاء و استحکام کی مضبوط اور پائدار اساس بن سکتا ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلام کی کونسی تعبیر اُس مذہبی جذبے کی پیدائش و افزائش کا ذریعہ بن سکتی ہے!

۱۔ قومی و نسلی نہیں بلکہ حقیقی اور عملی!

اس ضمن میں اوّلین اور اہم ترین حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ وہ مذہبی جذبہ جو پاکستان کے بقاء و استحکام کا ضامن بن سکتا ہے بنیادی طور پر مختلف ہے اُس مذہبی جذبے سے جو اس کے وجود میں آنے کا سبب بنا تھا! اس لیے کہ اُس وقت مقابلہ غیر مسلموں سے تھا۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا اور مسلمانوں کا سا نام رکھتا تھا، قومی تحریک میں نہ صرف شامل اور شریک ہو سکتا تھا،

بلکہ اُس کے قائدین تک کی صفوں میں بار پاسکتا تھا، قطع نظر اِس سے کہ اُس کے واقعی نظریات کیا تھے؟ اُس کے اخلاق اور کردار کا عالم کیا تھا اور وہ اسلام کے بنیادی احکام تک پر عمل پیرا تھا یا نہیں؟ حتیٰ کہ ارکانِ اسلام تک کا بھی پابند تھا یا نہیں۔؟ —— چنانچہ اُس وقت "پاکستان کا مطلب کیا؟ لاالٰہ الاّ اللہ" کے بعد سب سے زیادہ مقبول نعرہ یہی تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!"

واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت کی کشمکش میں ہمارے اندر اپنے مسلمان ہونے کا احساس زیادہ شدت کے ساتھ خود ہندوؤں کے طرزِ عمل اور رویّے کے باعث پیدا ہو رہا تھا۔ کہ جہاں کسی مسلمان کا ہاتھ اُن کے برتن کو چھو گیا وہ "بھرشٹ" یعنی ناپاک ہوگیا خواہ وہ مسلمان کتنا ہی صاف ستھرا اور نہایا دھویا کیوں نہ ہو اور وہ ہندو خود کتنے ہی گندے اور میلے کچیلے کیوں نہ ہوں! چنانچہ ہر ریلوے سٹیشن پر پینے کا پانی بھی اِس شان سے جُدا تھا کہ اگر "مسلمان پانی" پلیٹ فارم کے ایک سِرے پر ہوتا تھا تو "ہندو پانی" اُس کے بالکل بالمقابل دوسرے سِرے پر! —— پھر خاص طور پر معاشی اور اقتصادی میدان میں ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں، اُن کی چبھن اور کسک کو ہر مسلمان تاجر یہاں تک کہ کھوکھے والے اور خوانچہ فروش تک اور جملہ سرکاری ملازم یہاں تک کہ چوکیدار اور چپڑاسی تک محسوس کر رہے تھے۔ گویا کہ اُس وقت کے مسلم نیشنلزم میں جہاں مثبت اور حقیقی عوامل بھی کارفرما تھے وہاں ایک اہم اور مؤثر عنصر ابنائے وطن کے رویّے کا ردِّ عمل (REACTION) بھی تھا۔

اِس ضمن میں نومبر ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ علماءِ ہند کے دوسرے کُل ہند اجلاس کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں جو کچھ فرمایا تھا مولانا حسین احمد مدنی رح کے استاذ اور مربّی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحؒ نے اُس کا مطالعہ بہت مفید اور بہت سوں کے لیے "انکشافِ حقیقت" کا ذریعہ بنے گا۔ حضرت شیخ الہند رحؒ نے فرمایا تھا:

" ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت

اور آشتی کو اگر آپ پائدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اُن کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشین کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں اُن سے کوئی رخنہ نہ پڑے، جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی طریقہ ایسا نہ اختیار کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اِس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت سے لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ مَیں اِس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیوشنوں کی تعداد سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور اِن کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے!"

(بحوالہ 'بیس بڑے مسلمان' تالیف مولانا عبدالرشید ارشد، صفحہ ۲۹۱)

ذرا اندازہ فرمایئے حضرت شیخ الہندؒ کی دُور اندیشی اور ژرف نگاہی کا کہ یہ ۱۹۲۰ء کا دَور ہے۔ جبکہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان بظاہر شیر و شکر ہیں اور تحریکِ آزادی میں قدم بہ قدم اور شانہ بشانہ شریک ہیں اور خود محمد علی جناح جو اُس وقت تک "قائدِ اعظم" نہیں بنے تھے ہندو مسلم اتحاد کے سفیر اور محبت و یگانگت کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار ہیں لیکن وہ مردِ درویش اُس ظاہری رواداری کے پردے میں ہندو کی اصل ذہنیت کا اندازہ کر چکا ہے اور واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تنبیہ کر رہا ہے کہ اگر برادرانِ وطن کا رویّہ یہی رہا تو ہمیں بھی اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔

اِس کے بعد فوراً بعد آتا ہے تحریکِ خلافت کا طوفانی اور ہیجانی دَور جس میں ہندوؤں کو مسلمانوں کا حاشیہ بردار اور تابع (CAMP FOLLOWER) بننے ہی میں

عافیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اُس جذباتی اور ہنگامی دَور میں تو مسلمان اور ہندو واقعتہً شیر و شکر نظر آتے ہیں ـــــ لیکن جب تحریکِ خلافت دفعتاً بالکل اُسی انداز میں ختم ہو جاتی ہے جیسے تیز بخار پسینہ آنے سے یکدم اُتر جاتا ہے تو صورتِ حال میں ایک فوری تبدیلی آتی ہے ـــــ کہ ایک جانب مسلمانوں میں شدید دل شکستگی کی کیفیت پیدا ہوئی، اُن کے ولولے سَرد پڑے اور ایک عام بددلی اور مایوسی کی فضا طاری ہو گئی اور دُوسری جانب (غالباً مسلمانوں کی اِسی عمومی کیفیت ہی سے حوصلہ پا کر) ہندو ذہنیت کھُل کر سامنے آئی۔ چنانچہ کہیں اُس نے 'شُدھی اور سنگھٹن' کا رُوپ دھارا تو کہیں 'واردھا اسکیم' کی صورت اختیار کی، اور کہیں 'ہندو مہاسبھا' کی شکل میں ظہور کیا تو کہیں 'راشٹریہ سیوک سنگھ' کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ـــــ نتیجتہً ہندوستان میں ہندو مسلم کشمکش کے شدید ترین دَور کا آغاز ہو گیا اور مسلم قوم پرست تحریک اپنے نقطۂ عروج کی جانب تیزی کے ساتھ منزلیں طے کرتے ہوئے بڑھنے لگی۔ اِس طرح کم از کم مسلمانانِ ہند کے ضمن میں ہندو کی تنگ نظری اور استحصالی ذہنیت کے بارے میں وہ بات کمالِ صداقت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے جو علامہ اقبال نے یورپی استعمار کے بارے میں کہی تھی:

ع "مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے!"

اور قیامِ پاکستان کے ضمن میں ہندوؤں کے اِس طرزِ عمل پر بجا طور پر اُن کا شکریہ ادا کیا جا سکتا ہے کہ ؎

"تُو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لیے!"

بہرحال اِس گھمسان کے رَن میں ظاہر ہے کس کے پاس فرصت تھی اور کسے ہوش تھا کہ یہ دیکھے کہ کون اسلام پر واقعتہً عمل پیرا ہے اور کون اُس کے کم از کم لوازم و شرائط پر بھی پُورا نہیں اُترتا۔ اُس وقت تو واحد امتیاز کلمۂ شہادت کا تھا کہ کون کلمہ گو ہے اور کون نہیں! چنانچہ تحریکِ پاکستان کی اساس مسلم قومیت قرار پائی نہ کہ اسلام کے

ساتھ واقعی اور عملی تعلق! اور یہ ہتھیار واقعتہً اُس وقت بہت کارگر اور مُوثر ثابت ہُوا۔ چنانچہ اُسی کی اساس پر تحریک نے عوامیت اختیار کی اور کامیابی حاصل کر لی اور قیامِ پاکستان کا 'معجزہ' ظہور میں آ گیا۔

تقسیم کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ مغربی پاکستان میں ہندو نہ ہونے کے برابر رہ گئے اور جو رہ گئے انہوں نے بھی کم از کم وقتی طور پر گویا دم سادھ لیا۔ چنانچہ ہندو مسلم کشمکش مغربی پاکستان کی حد تک بالکل ختم ہو گئی۔ رہے بھارت کے حالات تو وہ بین الاقوامی سرحدوں کے پردوں میں چھپ کر "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل" کے مصداق بن گئے۔ نتیجۃً جب تک تقسیم کے وقت کے زخموں میں ٹیسیں اٹھتی رہیں اور کسک باقی رہی سابقہ کشمکش کی یاد بھی برقرار رہی لیکن وقت گذرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ اُس کے اثرات بھی زائل ہو گئے اور یاد بھی باقی نہ رہی —— رہا مشرقی پاکستان تو وہاں اگرچہ ایک فعال اور مُوثر ہندو اقلیت قابلِ لحاظ تعداد میں موجود تھی لیکن اُس نے کمال ہوشیاری اور چابکدستی سے کام لے کر وہاں کی مسلم اکثریت کے مسابقت اور مقابلے کے جذبے کا رُخ اپنی جانب سے پھیر کر مغربی پاکستان کی طرف کر دیا اور خود خاموشی کے ساتھ ایک بغلی دشمن کے انداز میں ایک لسانی اور ثقافتی قومیت کے تصور کو اُبھارنے اور اُجاگر کرنے میں لگ گئے۔ جس کا نتیجہ پچیس سال کے اندر اندر پاکستان کی شکست اور بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں ظاہر ہُوا جس پر پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے دشمنوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلے اور اُنہیں یہ کہنے کا موقع ملا کہ 'دو قومی نظریہ باطل (FALSE) ثابت ہو گیا ہے!' —— اور اس کے بعد یہی طریق کار (STRATEGY) 'بچے کھچے پاکستان' میں چھوٹے صوبوں، بالخصوص سندھ کی ہندو اقلیت اپنائے ہوئے ہے۔ چنانچہ اُس نے بھی سندھ کی قدیم مسلمان آبادی کی اکثریت کی مخالفت اور نفرت کا رُخ پنجاب کی جانب موڑ کر خود ایک لسانی اور ثقافتی قومیت کے دامن میں پناہ لی ہوئی ہے اور بظاہر احوال تو یہی نظر آتا ہے کہ 'سندھو دیش' کی تحریک بھی سندھ کی نوجوان نسل کے

معتد بہ حصے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ واللہ اعلم!

بنابریں اب وہ مسلم قوم پرستی جس کے شعور کی گیرائی و گہرائی میں ایک فیصلہ کن حصہ برِ صغیر کی ہندو مسلم کشمکش کی شدت کا تھا ایک مؤثر اور قابلِ لحاظ عامل کی حیثیت سے موجود ہی نہیں ہے۔ گویا مذہبی جذبے کی وہ قسم جو پاکستان کے قیام کا ذریعہ بنی تھی اب نہ صرف یہ کہ غیر مؤثر اور دُور از کار (OBSOLETE) ہو چکی ہے بلکہ فی الواقع موجود ہی نہیں ہے۔ اِس لیے کہ پاکستان کی نئی نسل کو نہ صرف یہ کہ ہندو ذہنیت کا کوئی تجربہ نہیں ہُوا بلکہ اِس کے برعکس اُسے تو آئے دن محبت کے اُن زمزموں سے سابقہ پیش آتا ہے جو سرحد پار سے ہَوا کے دوش پر ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے پہنچتے رہتے ہیں یا جن کی یلغار مسلسل دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں اور صحافیوں ـــ اور سب سے بڑھ کر ثقافتی طائفوں کے ذریعے ہوتی رہتی ہے! ـــ

صرف یہی نہیں، بلکہ اِس سے بڑھ کر یہ کہ اب پاکستان میں عمودی (VERTICAL) اور اُفقی (HORIZONTAL) تقسیم اور محاذ آرائی (POLARISATION) نے خود پاکستانی مسلمانوں کو باہم منقسم اور ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک جانب علاقائی، لسانی اور ثقافتی تقسیم کی گہرائی اور گیرائی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری جانب طبقاتی تقسیم کا شعور بھی رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا اب پاکستان کے مسلمانوں میں مقاصد کی یک جہتی اور ہم آہنگی صرف مسلم وطنیت کے تصور اور محض قوم پرستانہ جذبے کی بنیاد پر پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ اب انہیں کوئی شے "بنیان مرصوص" (سورۃ صف آیت ۴ : سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بنا سکتی ہے تو صرف وہ مذہبی جذبہ ہو سکتا ہے جو اُس اسلام کے ساتھ حقیقی تعلق اور کردار و عمل کے واقعی رشتے سے پیدا ہو اور اُسی سے غذا حاصل کرے اور نشو و نما پائے!!

یہی بات راقم نے ایک ملاقات میں پاکستان کے بزرگ صحافی جناب

زیڈ اے سلہری سے عرض کی تھی کہ آپ کا تقریباً ہر مضمون "دو قومی نظریئے" (TWO NATION THEORY) پر مبنی ہوتا ہے اور آپ کی ہر تحریر کی تان لازماً مسلم قومیت (MUSLIM NATIONHOOD) ہی پر ٹوٹتی ہے ـــــ تو جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ پاکستان اسی کی بنیاد پر قائم ہُوا تھا تو میرے خیال میں کوئی نہایت ہی ڈھیٹ قسم کا انسان ہی ہو گا جو اِس سے انکار کی جرأت کرے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس انداز سے آپ اس کی تکرار کر رہے ہیں اور ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں اُس سے تو اُلٹا اِس شک کے پیدا ہونے کا امکان ہے کہ پاکستان کی "ایجاد و تکوین" (GENESIS) کے ضمن میں شاید کوئی اور دوسرا قومی نظریہ بھی موجود ہے جس کی اِس تکرار اور اعادے اور شدومد کے ساتھ نفی اور تردید کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے ـــ اصل قابلِ غور اور اہمیت کی حامل حقیقت یہ ہے کہ محض مسلم قومیت اَب پاکستان کے بقاء و استحکام کی ضامن نہیں بن سکتی جب تک اُس میں حقیقت اور واقعیت کا رنگ نمایاں طور پر نظر نہ آئے اور فعل و عمل کی رُوح واضح طور پر جاری و ساری محسوس نہ ہو!!

۲- جدید دانشورانہ اسلام نہیں بلکہ عُلماء کا مصدّقہ اِسلام!

دُوسری اہم اور بنیادی بات جو اُس مذہبی جذبے کے بارے میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے جو پاکستان کے بقاء و استحکام کے لیے ٹھوس بنیاد بن سکے یہ ہے کہ وہ اسلام کی کسی جدید دانشورانہ تعبیر کے ذریعے پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ اُس کے لیے اسلام کی صرف وہی تعبیر مؤثر اور کارگر ہو گی جو صدیوں کے تعامل اور روایت کی بنا پر مسلمانوں کے "اجتماعی شعور" (COLLECTIVE CONSCIOUNESS) کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے ـ اور جسے علماءِ کرام کی تصدیق حاصل ہے جن پر

دین و مذہب کے معاملے میں مسلمان عوام کی عظیم اکثریت اعتماد کرتی ہے۔ اِس لیے کہ موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے ہم ایک ایسے جذبے کی بات کر رہے ہیں جو عوام میں ذہنی، فکری اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرے اور اُن کو محنت و مشقت اور ایثار و قربانی پر آمادہ (MOTIVATE) کر سکے اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد کسی جدید تعبیر کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لیے کہ جدید تعبیرات اور دانشورانہ تصوّرات تو زیادہ سے زیادہ ذہین اقلیت (INTELLECTUAL MINORITY) بلکہ اُس کے بھی ایک حصّے ہی کو متاثر کر سکتے ہیں، عوام کے قلوب و اذہان کو بڑے پیمانے پر مسخر نہیں کر سکتے ــــ اور جب تک جذبہ و امنگ کا عوامی سطح پر ظہور نہ ہو ہمارا مقصود یعنی پاکستان کے مسلمانوں کا ایک بنیانِ مرصوص بن کر ناقابلِ تسخیر قوت کی صورت اختیار کر لینا حاصل نہیں ہو سکتا۔

اِس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ بہت سے بدنما داغوں اور دھبّوں کے باوجود بالکل 'تاریک' نہیں ہے اور اِس کے دوران سیاسی مدّ و جذر اور حکومتی سطح پر ردّ و بدل، توڑ پھوڑ اور آمد و رفت کے باوصف ایک تہذیبی اور ثقافتی تسلسل موجود رہا ہے جس میں اصل عمل دخل دو طبقوں کے اثر و نفوذ کو حاصل رہا ہے: ایک علماء کرام اور دوسرے صوفیائے عظام۔ اور خواہ مسلمانوں کے جسموں پر حکومت امراء و سلاطین کی رہی ہو اُن کے قلوب و اذہان اور احساسات و جذبات پر علماء اور صوفیاء ہی کی سیادت و قیادت کا سکّہ چلتا رہا ہے اور اجتماعات و عمرانیات پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کیفیت پورے عالمِ اسلام کی بہ نسبت مسلمانانِ برِّصغیر میں شدید ترین صورت میں موجود ہے۔ اور یہاں کا مسلمان خواہ کسی خارجی جبر کے باعث یا نفسِ امّارہ کے داخلی دباؤ کے تحت خود اس اسلام پر پوری طرح عمل پیرا اور کاربند نہ ہو جو علماءِ کرام پیش کرتے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں سے قائل اُسی کا ہے۔ اور یہ صرف چودھویں صدی ہجری کے نصف کے بعد ہُوا کہ

مسلمانوں کی عوامی سیاست کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو دین و مذہب سے کوئی گہرا عملی لگاؤ نہیں رکھتے تھے، تاہم اِس سلسلے میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ اِس قیادت کو عملاً عوامی پذیرائی اُس وقت حاصل ہوئی جب اُسے مسلّم حیثیت کے حامل مشائخ اور علماء کی معتد بہ تعداد کی تصدیق اور سند حاصل ہوگئی ــــ بنابریں وہ مذہبی جذبہ جو پاکستان کے بقا و دوام اور ترقی و استحکام کا ضامن بن سکتا ہے نہ دین و مذہب کی کسی جدید تعبیر کی بنیاد پر پیدا ہوسکتا ہے نہ کسی نئے دانشورانہ تصور کی اساس پر۔ بلکہ اس کی پیدائش و افزائش کا کوئی امکان اگر ہے تو دین و مذہب کے صرف اور صرف اُن تصورات اور تعبیرات کی بنا پر ہے جن کی 'اسلامیت' نہ صرف یہ کہ مسلمان عوام کے اجتماعی شعور کے نزدیک مسلّم اور قابلِ قبول ہو بلکہ اُن کے تحت الشعور میں رچی بسی ہو حتّٰی کہ اُن کے لاشعور تک میں نفوذ کیے ہوئے ہو۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ تعبیرات اور تصورات وہی ہوسکتے ہیں جنہیں علماء کی تصدیق حاصل ہو۔

اِس سلسلے میں اِس خیال کو بھی دل سے نکال دیا جائے کہ علماء تو خود آپس میں دست و گریباں ہیں اور اُن کے درمیان اتنے شدید اختلافات موجود ہیں کہ خود جمع نہیں ہوسکتے تو اُن کے معتقد تصورات قوم کو کیسے جمع کر دیں گے؟۔ اِس لیے کہ اگرچہ اِس حقیقت سے تو کلّی انکار ممکن نہیں ہے کہ ہمارے یہاں جہاں علمائے حق معتد بہ تعداد میں موجود ہیں وہاں ایسے 'علماءِ سُوء' کی بھی یقیناً کمی نہیں ہے جو خالصتاً "بَغْیًا بَیْنَھُمْ" کی بنا پر (یہ الفاظ قرآنِ حکیم میں چار مقامات پر باہمی جنگ و جدال اور تشتّت و انتشار کے اصل سبب کی تعیین کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں۔ دیکھیے سورۃ بقرہ آیت ۲۱۳، سورہ آل عمران، آیت ۱۹، سورۃ شوریٰ آیت ۱۴، اور سورۃ جاثیہ آیت ۱۷) یعنی آپس کی ضدم ضدا اور ایک دوسرے پر برتری اور فوقیت کے حصول کے لیے مسلمانوں

کے فروعی اختلافات کو اُبھارتے ہیں اور انہیں آپس میں لڑا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں، تاہم پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ کے دوران بحیثیتِ مجموعی علماء کرام کا کردار مثبت اور منفی دونوں اعتبارات سے یعنی مثبت طور پر پاکستان میں اسلامی دستور و قانون کے نفاذ و اجرا اور منفی اعتبار سے اسلام کے مسلّمہ اعتقادات و تعلیمات کے خلاف اُٹھنے والے فتنوں کے سدِّ باب دونوں پہلوؤں سے ہرگز مایوس کن نہیں بلکہ بحمد اللہ نہایت روشن اور تابناک رہا ہے۔ چنانچہ ایک جانب جب دستور سازی کے ضمن میں ایوانِ اقتدار سے یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ پاکستان میں کس کا اسلام نافذ کیا جائے! شیعہ کا یا سُنّی کا؟ اہلحدیث کا یا حنفی کا؟ اور بریلوی کا یا دیوبندی کا؟ تو اس چیلنج کے جواب میں جملہ مکاتبِ فکر کے ۳۱ سربرآوردہ علماءِ کرام نے کامل اتفاقِ رائے کے ساتھ ۲۲ نکاتی فارمولا پیش کر کے وہ حجّتِ قاطع قائم کر دی تھی جو اب تک قائم ہے اور جس کا جواب بعد میں کسی سے بھی بن نہیں آیا! — اسی طرح عقیدۂ ختمِ نبوت کی فصیل میں نقب لگانے والوں کے خلاف ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء میں دو بار جملہ مسلکوں اور فرقوں کے علماءِ کرام نے جس اتحاد و اتفاق کا ثبوت دیا وہ بھی ہماری تاریخ کا نہایت تابندہ و درخشندہ باب ہے!! اور اللہ کا شکر ہے کہ بالکل یہی کیفیت ہمارے یہاں فتنۂ انکارِ حدیث کے ضمن میں بھی پائی جاتی ہے! (ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اِن دونوں فتنوں کے ڈانڈے باہم ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ اِس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک پر نبوت و رسالت کا خاتمہ و تکمیل اور اُس کے لازمی منطقی نتیجے کے طور پر اب ابد الآباد تک آپؐ کی سُنّت کی حجیت اور آپؐ کے اتباع کا لزوم ہی تجدّد پسندی اور مغرب پرستی کی راہ کے اصل پتھر ہیں اور یہ دونوں فتنے درحقیقت اِن ہی سے گلو خلاصی کی دو بظاہر قدرے مختلف صورتیں ہیں!) — اِس پر مستزاد ہیں یہ دو مثالیں کہ اوّلاً آج سے تین چار سال قبل جب راقم کے ایک اخباری انٹرویو میں سترِ حجاب سے متعلق

اسلام کے احکام بیان ہوئے اور اُس پر ملک بھر میں اباحیت پسند اور مغرب زدہ خواتین و حضرات نے طوفان بر پا کر دیا تو بلالحاظِ مسلک و مشرب پاکستان کی ہر مسجد کے محراب و منبر سے میری تائید میں آواز بلند ہوئی اور اگرچہ جدید دانشور حضرات و خواتین نے میرے خلاف مضامین کا طومار باندھ دیا جو قومی اخبارات کے رنگین صفحات میں جلی سرخیوں اور دیدہ زیب حاشیوں کے ساتھ شائع ہوئے۔ لیکن بالآخر خود اسی حلقے کے ایک نمایاں دانشور اور صحافی (جناب صفدر میر) کو یہ ماننا پڑا کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار نے حصولِ مقبولیت کے فن پر بہت کتابیں پڑھی ہیں تو اِس سے قطع نظر کہ راقم نے زندگی بھر اِس موضوع پر کوئی کتاب پڑھنا تو کجا دیکھی بھی نہیں ۔ ـــــ اُن کے یہ الفاظ درحقیقت مظہر ہیں اُن کے اِس اعتراف کا کہ پاکستان کے مسلمان عوام خواہ خود اُس پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہوں لیکن بہرحال قائل اُسی اسلام کے ہیں جسے علماءِ کرام کی تائید و توثیق حاصل ہے ـــــ ثانیاً جب ملک میں قانونِ شہادت اور قانونِ قصاص و دیت کی بحث چھڑی تو اُس کے ضمن میں پھر یہ بات الم نشرح ہو گئی کہ علماءِ کرام اپنے تمام تر اختلافات کے علی الرغم اسلامی قانون اور اُس کی فروعات تک کے ضمن میں بالکل متحد و متفق ہیں۔ حتیٰ کہ ایک خاص مکتبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے ایک ایسے جدید دانشور کی تردید و تغلیط میں بھی کوئی تامل نہیں کیا جو اپنے آپ کو خود اُنہی کی جانب منسوب کرتے ہیں! قصہ مختصر یہ کہ پاکستان کے مسلمان عوام کی عظیم اکثریت کو آمادۂ عمل (MOTIVATE) کر کے اُنہیں ایک بنیانِ مرصوص اور ناقابلِ تسخیر قوت بنا دینے کی صلاحیت و استعداد صرف اُس مذہبی جذبہ میں ہے جو اسلام کے اُس تصور کی بنیاد پر اُبھرے جسے علماءِ کرام کی تصدیق و تصویب حاصل ہو!

۳۔ جامد مذہبیّت نہیں بلکہ انقلابی دینی جذبہ

اُس مذہبی جذبے کی عرضِ ثالث (THIRD DIMENSION) جو پاکستان کے دوام و استحکام کی موثر و محکم بنیاد بن سکتا ہے یہ ہے کہ اِس میں 'جمود' کی بجائے 'حرکت' اور اجتماعی نظام کو جُوں کا تُوں رکھنے یعنی (STATUS QUO) کو MAINTAIN کرنے کی بجائے تبدیلی اور انقلاب کی رُوح کارفرما ہو۔ اِس لیے کہ پاکستان کا داخلی انتشار اور اس کی یک جہتی و سالمیت اور باوقار و باعزت آزادی و خود اختیاری کے خلاف خارجی یلغار دونوں کی نوعیت ایک سیلاب کی سی ہے اور ظاہر ہے کہ سیلاب کا مقابلہ جمود کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اِس کے لیے ایک والہانہ جذبے کی ضرورت ہے جو جوابی سیلاب کی صورت اختیار کر لے۔ بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎ :

"عشق خود اِک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام!"

اور الحمد للہ کہ ہمیں اِس کے لیے ہرگز نہ کسی تکلّف یا تصنّع کی ضرورت ہے نہ کسی جدید نظریے اور نظام کے دَر پر مرعوبانہ اور مقلّدانہ دریوزہ گری کی احتیاج! اِس لیے کہ: اوّلاً اسلام اپنی اصل کے اعتبار سے ہے ہی ایک انقلابی تحریک؛ اور یہ اِس بنا پر کہ اسلام صرف 'مذہب' نہیں کامل 'دین' ہے جو صرف عقائد و عبادات اور چند معاشرتی و سماجی رسومات سے عبارت نہیں ہے بلکہ ان سب پر مستزاد ایک کامل و اکمل، متوازن و معتدل اور عادلانہ و منصفانہ معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام پر مشتمل ہے اور از روئے قرآنِ حکیم بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کا مقصد ہی اِس نظامِ حق کا پورے نظامِ زندگی پر غلبہ ہے۔ بمصداقِ الفاظِ قرآنی: "هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ" سورۃ توبہ آیت ۳۳، سورۃ فتح آیت ۲۸، اور سورۃ صف آیت ۹) یعنی "وہی ہے

(اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر!" اور اسی مقصد کے حصول و تکمیل کے لیے جدّ و جہد اور اس کے ضمن میں بذلِ نفس اور انفاقِ مال کی پُر زور دعوت دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم ایمان کے تمام دعویداروں کو "جہاد فی سبیل اللہ" کی فرضیت کے عنوان سے بایں الفاظِ قرآنی، (ترجمہ) "اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلادے؟ ایمان (پختہ) رکھو اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ!" (سورۃ صف آیات ۱۰-۱۱) اور اِس جہاد فی سبیل اللہ کو شرطِ لازم اور رُکن رکین قرار دیتا ہے ایمانِ حقیقی کا، سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کی رُو سے (ترجمہ) "مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر، پھر ہرگز شک میں مبتلا نہیں ہوئے اور جہاد کیا انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ، صرف یہی لوگ (دعویٔ ایمان میں) سچے ہیں!" گویا ؎

"مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اِسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی!"

کے مصداق پورے نظامِ زندگی پر اللہ کے عطا کردہ کامل سماجی و معاشی و سیاسی نظام (SOCIO-POLITICO ECONOMIC SYSTEM) کا غلبہ ہر بندۂ مومن کی زندگی کا اصل مقصد اور اُس "جہادِ زندگانی" کا اصل ہدف ہے جس کے لوازم و شرائط اور ا وزار و ہتھیار ہیں: ایمان و یقین کی دولت، پیہم سعی و جہد کا مادہ اور محبت اور اخوت کی قوتِ تسخیر، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

"یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں"

ثانیاً: ہم پر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم یہ ہے کہ وطنِ عزیز پاکستان

قائم ہی دین کے اِس حرکی تصور (DYNAMIC CONCEPT) پر ہُوا تھا۔ چنانچہ ایک طرف جانب پاکستان کے بانی و مؤسس قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم نے واضح طور پر یہ بھی فرمایا تھا کہ "ہم پاکستان اِس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اِس کے ذریعے عہدِ حاضر میں اسلام کے ابدی او زرّین اصولِ حریت و اخوت و مساواتِ انسانی (HUMAN FREEDOM, FRATERNITY & EQUALITY) کا عملی نمونہ پیش کریں۔" (روایت بالمعنیٰ) اور ایک موقع پر پاکستان کے دستور کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں بھی ارشاد فرمایا تھا کہ "ہمارا دستور آج سے چودہ سو سال قبل قرآن کی شکل میں مدون ہوگیا تھا!" (روایت بالمعنیٰ) اور دوسری جانب مفکر و مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام کی الہامی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس کی زبانی ابلیسی قوتوں کو لاحق ہونے والے سب سے بڑے خطرے اور اندیشے کی نشاندہی کی تھی یعنی سے " عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں! "

تو اِس کے ضمن میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے پورے سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام کے بنیادی اصولوں کو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں بیان کر دیا تھا بلکہ دراصل تحریکِ پاکستان کا پورا منشور (MANIFESTO) پیش کر دیا تھا سے

" الحذر! آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر!
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اِس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں! "

نہ صرف یہ بلکہ علامہ اقبال نے تو خاص طور پر موجودہ ظالمانہ اور استحصالی معاشی نظام کے استیصال اور بیخ کنی کے لیے باضابطہ 'انقلاب' کا نعرہ بھی بلند کر دیا تھا ۔" خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب

از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب ـــ اے ـــ انقلاب

اس ضمن میں کسی کو یہ مغالطہ یا اندیشہ لاحق نہ ہو کہ اگر سرمایہ داری اور زمینداری کے خلاف انقلابی نعرہ لگا دیا گیا تو یہ اسلام کی بجائے کسی اور 'ازم' کی جانب رجوع و التفات ہو گا اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ شخصی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے ان دونوں کی جڑیں جس طرح اسلام کاٹتا ہے اور کوئی نظام نہیں کاٹ سکتا ۔ چنانچہ 'ربوا' کی قطعی اور موکد ترین حرمت کے ذریعے 'سرمایہ داری' کی بیخ کنی ہو جاتی ہے، اگرچہ 'سرمایہ کاری' کے لیے صحت مند فضا، یہاں تک کہ اُس کے ضمن میں مقابلہ و مسابقت تک کا میدان برقرار رہتا ہے ۔ اسی طرح خواہ امام اعظم امام ابو حنیفہ رح اور امام دار الہجرت امام مالک رض کے متفقہ فتوٰی کو اختیار کر لیا جائے کہ مزارعت (ABSENTEE LANDLORDISM) کی ہر صورت حرام مطلق ہے خواہ فقہ حنفی کے اِس فتوے پر عمل کر لیا جائے کہ مفتوحہ ممالک کی اراضی کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ اسلامی ریاست کی اجتماعی ملکیت ہوتی ہیں دونوں صورتوں میں جاگیرداری اور مروجہ زمینداری کا قلع قمع ہو جاتا ہے ۔ (اپنے حالیہ سفر ابوظبی کے موقع پر ایک اہم اور قابلِ اعتماد شخصیت کے ذریعے معلوم ہوا کہ ملکِ شام کے بعثی انقلاب سے پہلے کے دور کے ایک صدر نے جو آج کل ابوظبی میں جلا وطنی کی زندگی گذار رہے ہیں انہیں یہ بتایا کہ شام میں ۱۹۴۵ء تک سابقہ خلافتِ عثمانیہ ہی کا بندوبستِ اراضی چل رہا تھا اور اس کی رُو سے کُل اراضی

بیت المال کی ملکیت تھیں۔ آئندہ وہاں جانا ہُوا تو ان شاء اللہ اُن صاحب سے خود ملاقات کر کے توثیق حاصل کروں گا!)

الغرض پاکستان کے بقا و دوام اور اُس کی ترقی و استحکام کی واحد ممکنہ اساس وہ مذہبی جذبہ بن سکتا ہے جو قومی و نسلی نہیں بلکہ حقیقی و عملی اسلام ـــ اور اُس کی بھی کسی متجددانہ اور دانشورانہ تعبیر نہیں بلکہ علماءِ کرام کے مصدقہ تصورات پر مبنی ہو اور نری جامد مذہبیت نہیں بلکہ ایک متحرک انقلابیت کی صورت اختیار کرے!!!

اور یہ چیز خود اسلام کے اعتبار سے بھی 'تجدّد' نہیں بلکہ صرف 'تجدید' کا مظہر ہوگی اور پاکستان کے نقطۂ نگاہ سے بھی کسی نئی منزل کی جانب رُخ موڑنے کی نہیں بلکہ ع "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!" کے مصداق اپنے تاسیسی نظریہ و مقصد کی جانب رجوع کے مترادف ہوگی! (ان شاء اللہ)

باب پنجم

موجُودہ مُسلمان معاشرہ کا اِسلام کے ساتھ عملی تعلّق

گذشتہ مباحث سے یہ حقیقت بالکل دو اور دو چار کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ: (۱) پاکستان کی اصل اساس صرف اور صرف اسلام ہے۔

(۲) اِس کا دوام و استحکام صرف ایک ایسے جاندار مذہبی جذبے کے ذریعہ ممکن ہے جو عوامی سطح پر اسلام کے ساتھ حقیقی و عملی تعلق کی بنیاد پر اُبھرے اور ایک انقلابی تحریک کی صورت اختیار کر لے!

تو آئیے اب ذرا اِس امر کا جائزہ لیں کہ مجموعی اعتبار سے ہمارے موجودہ معاشرے کے اسلام کے ساتھ حقیقی لگاؤ اور عملی تعلق کا کیا حال ہے؟ اور ہماری قومی اور ملّی وجود کی اِس واحد اساس کے ساتھ ہمارا بالفعل تعلق کس درجہ کا ہے؟!

ایک ضروری وضاحت

اِس مرحلہ پر ایک اہم وضاحت بہت ضروری ہے — ہمارے سابقہ مباحث سے بھی کچھ لوگوں نے لازماً مایوسی اور بددلی کا تاثر قبول کیا ہوگا اور اِس کا اندیشہ ہے کہ پیشِ نظر جائزے اور تجزیے سے اِس کیفیت میں مزید شدت پیدا ہو جائے، لہٰذا مناسب ہے کہ یہاں یہ ذکر کر دیا جائے کہ جس تصویر کا تاریک رُخ مسلسل سامنے آرہا ہے اُس کا ایک نہایت روشن اور تابناک رُخ بھی ہے جو اِن شاء اللہ ذرا اور آگے چل کر سامنے آئے گا — سرِدست جس ترتیب

سے بحث آگے بڑھ رہی ہے اُس کا تقاضہ ہے کہ ہم ناخوشگوار حقائق کو اُن کی واقعی صورت میں دیکھنے کی ہمت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مشاہدے اور جائزہ و تجزیئے کو امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ معروضی (OBJECTIVELY) رکھیں۔ تاکہ ہمارے سامنے مسئلہ کی نزاکت اور صورتِ حال کی سنگینی پوری طرح واضح ہو اور ہم اُس کے تدارک کے ضمن میں نہ سطحی انداز اختیار کریں نہ محض دفع الوقتی کی تدابیر میں اُلجھ کر رہ جائیں بلکہ پوری سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں اور فیصلہ کُن انداز میں بھرپور اقدامات کا فیصلہ کر سکیں۔

پندرہ سال قبل اور آج

اتفاق کی بات ہے کہ راقم اپنے پیشِ نظر سلسلۂ مضامین کے ضمن میں جب اُس مقام پر پہنچا تو اچانک ذہن منتقل ہُوا کہ اِسی موضوع پر راقم نے آج سے لگ بھگ پندرہ سال قبل پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کی لاہور برانچ کی ایک تقریب میں تقریر کے دوران اپنا جائزہ اور تجزیہ ایک تمثیل کے پیرائے میں پیش کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ تقریر کا وہ حِصّہ ماہنامہ میثاق لاہور میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ اِس موقعے پر اُس پر نظر ڈالنے سے ایک تو یہ احساس ہُوا کہ اِس تمثیل کے ذریعے ہمارے معاشرے کی اسلام کے ساتھ عملی تعلق کی نہایت صحیح تصویر پوری وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے اور دوسرے یہ حیرتناک اور افسوسناک انکشاف بھی ہُوا کہ اِس کے باوجود کہ ہمارے معاشرہ میں متعدد دینی جماعتیں اور تحریکیں اپنے اپنے انداز میں کام کر رہی ہیں اور ہماری آبادی کے طبقۂ متوسط (MIDDLE CLASS) کا خاصا قابلِ لحاظ حِصّہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے تاہم پندرہ سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود بحیثیتِ مجموعی ہمارے موجودہ مسلمان معاشرہ کے اسلام کے ساتھ عملی تعلق میں نہ کوئی نوعیت و کیفیت کے اعتبار سے (QUALITATIVELY) کوئی تبدیلی واقع

ہوئی ہے نہ ہی تناسب اور کمیت کے اعتبار سے (QUANTITATIVELY) کوئی فرق پیدا ہوا ہے۔ اس لیے کہ جہاں ہماری قوم کے درمیانی طبقے میں مختلف دینی و مذہبی تحریکوں کے زیرِ اثر دین و مذہب کے ساتھ عملی لگاؤ کے تناسب میں کسی قدر اضافہ ہوا ہے وہاں عوام کے طبقۂ زیریں (LOWER CLASS) میں اُس کیفیت کے بالکل برعکس جو علامہ اقبال نے اب سے پون صدی قبل اِس شعر میں بیان کی تھی کہ ؎

"آ کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
پردہ رکھتے ہیں اگر کوئی تمہارا تو غریب!"

نہ صرف یہ کہ دین و مذہب کے ساتھ عملی لگاؤ میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے، بلکہ لادینی طرزِ فکر (SECULAR THINKING) اور مادہ پرستانہ اقدار (MATERIALISTIC VALUES) کا تناسب بہت بڑھ گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ملحدانہ افکار و نظریات اور مادہ پرستانہ طرزِ عمل کے اثرات جو پہلے صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات (EDUCATED ELITE) تک محدود تھے، گزشتہ پندرہ سالوں میں اوّلاً ٹرانسسٹر اور بعد ازاں ٹیلی ویژن ایسے مؤثر اور طاقتور ذرائع ابلاغ (MEDIA) کے ذریعے ہمارے معاشرہ کی سب سے تحتانی سطح یعنی ——— (GRASS ROOT LEVEL) تک پہنچ گئے ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ طبقۂ متوسط میں دین و مذہب کا اثر و نفوذ غیر مؤثر (NEUTRALISE) ہو گیا ہے — بلکہ نسبت و تناسب کے پلڑے کا جھکاؤ مزید فیصلہ کن انداز میں لادینیت کی جانب ہو گیا ہے — واللہ اعلم!!

چار اہم مرکز دائرے

بہرحال، راقم کے مشاہدے کے مطابق دین و مذہب کے ساتھ حقیقی اور واقعی لگاؤ اور عملی تعلق کے اعتبار سے پاکستان کا موجودہ مسلمان معاشرہ چار ایسے

ہم مرکز دائروں (CONCENTRIC CIRCLES) پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے نمایاں طور پر متمائز (DISTINCT) ہیں۔ چنانچہ ایک نہایت چھوٹا سا دائرہ مرکز سے بالکل متصل ہے جس میں میرے اندازے کے مطابق ہماری کُل آبادی کا مشکل ایک فی صد بلکہ اِس سے بھی بہت کم شامل ہے۔ اِس کے باہر ایک ذرا بڑا دائرہ ہے جس میں کُل آبادی کے دو یا زیادہ سے زیادہ تین فی صد لوگ شمار کیے جاسکتے ہیں۔ پھر ایک اور بڑا دائرہ ہے جس میں لگ بھگ پانچ چھ فی صد لوگ شامل ہوں گے۔ اور پھر ایک بہت بڑا دائرہ ہے جو بقیہ نوّے بانوے فی صد آبادی پر مشتمل ہے۔

ہماری ایک عظیم اکثریت کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی عملی تعلق نہیں ہے

ان میں سب سے بڑا دائرہ جس کی خارجی حدود پورے معاشرے کو محیط ہیں، اُن لوگوں پر مشتمل ہے جن کا دین و مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی عملی تعلق باقی نہیں رہا۔ ماسوائے اُن چند ناگزیر تمدّنی اور سماجی اُمور کے جن میں دین و مذہب کے خلاف کسی روش کا اختیار کرنا مذہب سے علی الاعلان قطع تعلق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ یعنی شادی بیاہ کا معاملہ، میّت کی تکفین و تدفین سے متعلق رسومات اور کچھ مذہبی تہوار وغیرہ۔

اِس سلسلے میں، مَیں جب زور دے کر کہتا ہوں کہ ہماری عظیم اکثریت کا مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے تو اُس سے میرے احساس کی شدّت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور مَیں ہر شخص کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ دین و مذہب کے ساتھ عملی تعلق کا چاہے کوئی معیار (CRITERION) متعیّن کرلے، جب وہ اِس پر اپنے موجودہ معاشرے کو پرکھے گا تو اِس کے سامنے

بعینہٖ وہی نتیجہ آئے گا جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثریت کا اِس کے سوا کہ جب اِن کے یہاں شادی ہوتی ہے تو پھیرے نہیں پڑتے بلکہ کوئی مولوی صاحب نکاح ہی کی رسم ادا کرتے ہیں۔ یا کوئی مرجاتا ہے تو اُسے جلایا نہیں جاتا بہرحال نمازِ جنازہ ہی ادا کی جاتی ہے اور تکفین و تدفین ہی کا معاملہ ہوتا ہے ــــ یا یہ کہ ہولی یا دیوالی یا کرسمس نہیں منائے جاتے، عید و بقر عید ہی کے تہوار منائے جاتے ہیں، دین و مذہب کے ساتھ کوئی اور عملی تعلق موجود نہیں ہے ــــ اسلام کے اوامر و نواہی کی مفصّل فہرست اور حلال و حرام کا تفصیلی خاکہ تو دُور کی بات ہے، نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نمازِ پنجگانہ کو کفر اور اسلام کے مابین حدِّ فاصل قرار دیا ہے، خواہ اِس معیار کو سامنے رکھ لیا جائے یا اِس سے بھی آگے بڑھ کر بلا عذرِ شرعی مسلسل تین جمعوں کی غیر حاضری پر تو صاف وعید سنادی گئی ہے کہ اللہ کو ایسے شخص کے بارے میں کوئی پرواہ نہیں ہے کہ وہ نصرانی ہو کر مرے یا یہودی ہو کر، تو خواہ اِس پیمانے سے ناپ لیا جائے۔ بہرحال آپ جس پیمانے سے بھی ناپیں گے نتیجہ ایک ہی نکلے گا اور وہ یہ کہ ہماری قوم کی ایک عظیم اکثریت کا دین و مذہب سے کوئی واقعی اور عملی تعلق موجود نہیں ہے۔

پھر ایسا نہیں ہے کہ یہ صورتِ حال معاشرے کے کسی خاص طبقہ کی ہو ـــ ایک عام مغالطہ پیدا ہو گیا ہے یا پیدا کر دیا گیا ہے کہ یہ معاملہ صرف امراء یا اعلیٰ طبقہ کا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حال ہماری پوری سوسائٹی کا بحیثیتِ مجموعی ہے۔ چنانچہ امراء کی اکثریت بھی اسی حال میں ہے اور غربا کی بھی۔ کارخانہ داروں کی اکثریت کا حال بھی یہی ہے اور مزدوروں کا بھی۔ زمینداروں کی اکثریت بھی دین سے اتنی ہی دُور ہے اور کاشتکاروں کی بھی۔ گلبرگ اور کلفٹن کے باسی بھی اکثر و بیشتر اسی حال میں ہیں اور جھونپڑیوں کے مکین بھی ـــ الغرض ہماری پوری سوسائٹی کا جاہے جس زاویہ سے (CROSS SECTION) لے لیا جائے، صورتِ معاملہ واحد ہے۔ صرف اسی ایک فرق کے ساتھ کہ امراء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات کے ایک معتد بہ اور غالب حصّے

میں اِس عملی روش کی پشت پر ایک فکری الحاد اور ذہنی ارتداد بھی موجود ہے۔ جبکہ عوام الناس کے اذہان میں کوئی واضح چیز موجود نہیں۔ وہ صرف ایک رَو میں بہے چلے جا رہے ہیں جو اکثر و بیشتر انہی اعلیٰ طبقات کے زیرِ اثر چل رہی ہے ——— الغرض یہ ہے ہماری قوم کی غالب اکثریت کا حال!

مذہب کے متوسّلین کی اکثریت کا تصوّرِ دین محدُود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی!

اِس بڑے دائرے کے اندر ایک نسبتاً چھوٹا دائرہ ہے جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دین و مذہب سے عملی دلچسپی لیتے ہیں۔ چنانچہ انہی کے دم سے مساجد تعمیر ہوتی ہیں اور آباد رہتی ہیں۔ مدارس و مکاتب اور دارالعلوم قائم ہوتے ہیں، اور جاری رہتے ہیں۔ جمعہ و جماعت کا نظام قائم ہے۔ ماہِ صیام کی رونق اور گہما گہمی ہے۔ حج اور عمرہ کے لیے آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے ——— الغرض مذہب کا پورا ڈھانچہ قائم ہے۔

لیکن ذرا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس طبقے کی ایک عظیم اکثریت کا تصورِ دین نہ صرف یہ کہ نہایت محدود (LIMITED) ہے بلکہ اکثر و بیشتر حالتوں میں سخت مسخ شدہ (PERVERTED) بھی ہے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک مذہب صرف بعض علامات (SYMBOLS) اور رسومات (RITUALS) کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور اُس کا کوئی تعلق نہ انسان کی انفرادی سیرت و کردار سے رہ گیا ہے نہ قومی و ملی امور اور اجتماعی معاملات سے۔ نتیجتہً وہ دین جو اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے پوری انسانی زندگی پر حکمرانی چاہتا ہے اُن کے یہاں زندگی کے بہت ہی چھوٹے سے گوشے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے وسیع تر تقاضوں کا انہیں سرے سے کوئی احساس ہی نہیں رہا۔

یہی وجہ ہے کہ اِس حلقے کی ایک غالب اکثریت کا حال یہ ہے کہ دینداری کے جملہ مظاہر یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج حتیٰ کہ پوری شرعی وضع قطع کے ساتھ ساتھ بلیک مارکیٹنگ بھی چلتی ہے اور ذخیرہ اندوزی بھی، اسمگلنگ بھی جاری رہتی ہے اور کرنسی کا غیر قانونی لین دین بھی۔ اشیاءِ خوردو نوش ہی نہیں ادویات تک ان کے ہاتھوں ملاوٹ ایسے حد درجہ مکروہ حرکت سے محفوظ نہیں رہتیں۔ انکم ٹیکس اور کسٹم یا ڈیوٹی کی چوری کو مباح کا مقام دینے میں اِنہیں ذرا باک نہیں۔ رشوت دی بھی جاتی ہے اور لی بھی۔ سودی رقوم سے کاروبار کو وسیع تر کرنا اور مکان تعمیر کرنا تو شیرِ مادر ہے ہی، جہاں موقع ملے سٹے وغیرہ سے بھی اجتناب نہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اِلّا ماشاء اللہ اِس حلقے کی اکثریت ذاتی اخلاق اور بین الانسانی معاملات کے دائرے میں بالعموم بہت پستی کردار کا مظاہرہ کرتی ہے خشونت، درشتی اور سنگ دلی ان طبیعتِ ثانیہ بن گئے ہیں اور ہمدردی اور دل کی نرمی سے انہیں دُور کا بھی واسطہ نہیں اِلّا ماشاء اللہ۔ اِن تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل اِن لوگوں سے متنفر ہو کر سِرے سے دین و مذہب ہی سے بدظن ہوتی چلی جا رہی ہے۔

تصورِ مذہب کی اِسی محدودیت کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مذہب کے نام پر نِت نئی رسومات ایجاد ہو رہی ہیں اور بدعات و رسومات کا بازار ہے کہ گرم سے گرم تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اسلام جو انتہائی سادہ دینِ فطرت ہے، روز بروز اوہام کے پلندے اور بدعات و رسومات کے طومار کی شکل اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ اِس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ یعنی یہ کہ وہ دینی و مذہبی جذبہ جسے انسان کی پوری زندگی میں سرایت کر جانا چاہیئے تھا، جب سمٹ کر صرف ایک گوشے میں مقید ہو گیا اور اُسے اپنی تسکین صرف اِسی چھوٹے سے گوشہ ہی سے حاصل کرنی پڑی تو اس نے زور لگا کر اسی گوشہ میں غیر متناسب (OUT OF PROPORTION) بڑھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک طرف میت کی رسومات کا سلسلہ

ہے کہ ربڑ کی طرح کھنچتا چلا جا رہا ہے اور دوسری طرف تہواروں کا معاملہ ہے کہ ان کی فہرست بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وقِس علیٰ ہٰذا۔!

مختصر یہ کہ دین و مذہب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی ایک غالب اکثریت کا تصوّرِ مذہب نہایت محدود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی!

وسیع تر تصوّر کے حامل لوگوں کی اکثریت خود کچھ کرنے کو تیار نہیں!!

اِس دوسرے دائرے کے اندر ایک تیسرا چھوٹا دائرہ ہے جو اُن لوگوں پر مشتمل ہے جن کا تصوّرِ دین و مذہب خاصا وسیع ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اسلام صرف چند عقائد اور رسومات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کی بنیاد کائنات، انسان اور حیاتِ انسانی کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر پر قائم ہے اور وہ انسان کی پوری زندگی کو اپنے احاطہ میں لینا چاہتا ہے اور حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں پر تسلط اور حکمرانی کا طالب ہے۔ برِّصغیر میں یہ فکر ماضی قریب میں اوّلاً علامہ اقبال مرحوم کے اشعار سے پروان چڑھا اور ان کے بعد مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دوسرے اصحابِ علم کی تحریروں نے اِسے مزید واضح بھی کیا اور زیادہ بڑے حلقہ میں عام بھی کیا۔ چنانچہ اب یہ ایک واقعہ ہے کہ برِّصغیر کے مسلمانوں کی موجودہ نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصّہ اِس فکر سے متاثر ہے اور اس کے دل میں احیائے اسلام کی آرزو اور اقامتِ دین کی تمنا بھی موجود ہے ـــ اور اسلام کی عظمتِ گذشتہ اور مسلمانوں کی سطوتِ پارینہ کی بازیافت کی خواہش بھی ـــ لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اِس طبقہ کی ایک بڑی اکثریت محض حسین تمناؤں اور عمدہ آرزوؤں کے سہارے جی رہی ہے، خود کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ اِن کی خواہش غالباً یہ ہے کہ یہ سارے کام کوئی ادارہ کر دے

اور وہ خود اپنی اپنی دلچسپیوں اور پیشہ ورانہ مصروفیتوں میں مگن رہیں ، خود انہیں نہ کوئی ایثار کرنا پڑے نہ قربانی دینی پڑے ، نہ کوئی تکلیف برداشت کرنی ہو اور نہ کسی محنت و مشقت کا سامنا ہو۔ وہ بہت زور لگائیں گے تو کسی جماعت کے لیے تائید و تحسین کے چند جملے زبان سے ادا کر دیں گے یا اُسے کوئی مالی امداد بہم پہنچا دیں گے اور وہ بھی اپنی آمدنیوں کے اعتبار سے آٹے میں نمک کے برابر اللہ اللہ خیر سلا ــــ اس سے آگے بڑھ کر نہ اُن کی زندگیوں کا رُخ تبدیل ہوگا نہ دلچسپیوں میں کمی آئے گی اور نہ ہی شب و روز کے مشاغل میں کوئی فرق واقع ہوگا ــــ

الغرض ــــ یہ ہے میرے تجربہ کے مطابق ہماری موجودہ سوسائٹی کا دائرہ ثالث جو دین و مذہب کے لیے زبانی جمع خرچ (LIP SERVICE) میں تو بہت آگے ہے لیکن اس کے لیے کسی عملی جدّ و جہد میں شرکت کے لیے قطعاً آمادہ نہیں۔ حالانکہ میرے نزدیک اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا کٹھن مرحلہ اگر سر ہو سکتا ہے تو اسی حلقہ کی محنت و مشقت اور ایثار و قربانی سے ــــ اور اگر اس طبقہ کو آمادۂ عمل (ACTIVATE) نہ کیا جا سکا تو میرے نزدیک اس منزل کی طرف قدم اُٹھنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ یہ دائرہ پہلے دونوں دائروں سے تو بہت چھوٹا ہے لیکن ہے نہایت اہم ــ !

فعّال دینی جماعتیں اور جمعیتیں

ان تینوں دائروں کے اندر ایک نہایت چھوٹا سا دائرہ ہے جسے ہم مذہب کے لیے سرگرم کارکنوں (RELIGIOUS ACTIVISTS) کا حلقہ کہہ سکتے ہیں جس میں ہماری کُل آبادی کی بمشکل ایک فی صد بلکہ اُس سے بھی بہت کم تعداد شامل ہے۔ یہ حلقہ بہت سی خالص مذہبی یا نیم دینی و نیم سیاسی جماعتوں پر مشتمل ہے۔ جن کی جڑیں دوسرے اور تیسرے دائروں میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں جن سے انہیں اخلاقی تائید اور مالی تعاون کی صورت میں غذائیت حاصل

ہوتی رہتی ہے ـــ اِن میں سے دو تو "جماعتیں" ہیں اور کم و بیش نصف درجن "جمعیتیں" ـــ جماعتوں میں سے ایک تبلیغی جماعت ہے جو خالص مذہبی اور بالکل غیر سیاسی خطوط پر کام کر رہی ہے اور دوسری جماعتِ اسلامی ہے جو اس کے برعکس سیاست کے میدان میں بہت آگے نکل گئی ہے اور اس خارزار میں کچھ زیادہ اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ اِس بُعد المشرقین کے ساتھ ساتھ ان میں دو باتیں مشترک بھی ہیں۔ ایک یہ کہ اِن دونوں ہی کی تاریخ تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اِن دونوں کو اصل تائید و تقویت دائرہ ثالث سے مِل رہی ہے اور اِن کی جڑیں زیادہ تر اسی حلقہ میں قائم ہیں ـــ ان کے بالمقابل اہلحدیث، دیوبندی اور بریلوی علماء پر مشتمل "جمعیتیں" ہیں جن کی مزید تقسیم اور تسمیے کا سلسلہ کچھ ایسا پیچ در پیچ ہے کہ عام آدمی کی سمجھ میں آنے والا نہیں، بہرحال ان میں بھی دو امور مشترک ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے تقریباً ہر ایک اپنی پُشت پر لگ بھگ پوری صدی کی تاریخ رکھتی ہے اور دوسرے یہ کہ ان کی اصل جڑیں دائرہ دوم میں قائم ہیں اور وہیں سے ان کے تغذیہ و تقویت کا سامان فراہم ہوتا ہے۔

مذہب کی نام لیوا، بلکہ علمبردار جماعتوں اور جمعیتوں کے بارے میں سب سے زیادہ نمایاں المیہ ان کا باہمی اختلاف بلکہ مخالفت ہے جو حد درجہ مکروہ الزام تراشی بلکہ دشنام طرازی کی حد تک پہنچ جاتی ہے ـــ اور اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں اب ان سب کے مجموعی اثرات بھی کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں تاہم جس مایوس کُن شکست کا سامنا مذہب کے نام لیواؤں کو ملک کے عام انتخابات میں کرنا پڑتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس میں بہت حد تک دخل اس باہمی تفرقہ بازی اور سر پھٹول کو حاصل ہے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کے اُن طبقات کو جو دین و مذہب کے مستقبل سے کسی قدر دلچسپی رکھتے ہیں، اِس صورتِ حال سے فی الواقع بہت صدمہ پہنچتا ہے، جس کی ٹیسیں اکثر لوگوں کو شدت کے ساتھ محسوس ہوتی رہتی ہیں اور ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے دلوں میں یہ حسرت بھری تمنا موجود ہے کہ کسی طرح مختلف فرقوں اور گروہوں کے علماء و زعماء اور مختلف مذہبی جماعتیں متحد ہو کر کسی ایک

پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں یا کم از کم یہ جماعتیں اور جمعیتیں اپنے اپنے طریقہ ہائے کار میں اعتدال کی روش اختیار کر لیں۔ چنانچہ اِس ذیل میں بہت سے لوگ انھیں مخلصانہ مشوروں سے نوازتے بھی رہتے ہیں۔

میری حقیر رائے میں اِن نیک تمناؤں کا بر آنا آسان نہیں ہے۔ اِس لیے کہ نہ یہ جماعتیں اور جمعیتیں کوئی آج قائم ہوئی ہیں اور نہ ہی ان کے طریقہ ہائے کار اتنے 'حادث' ہیں بلکہ جیسا کہ اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کی پُشت پر پوری پوری صدی یا کم از کم نصف صدی کی تاریخ ہے اور اِس طویل عرصہ کے دوران میں ان کے مخصوص نقطہ ہائے نظر، طریق ہائے کار اور مزاج و افتادِ طبع پختہ ہوتے چلے گئے ہیں ـــ اور اب اِن میں کسر و انکسار اور ترمیم و تغیر ناممکن نہ سہی نہایت مشکل ضرور ہے! تاہم مُلک و ملّت کے خیر خواہوں کو اِس کے ضمن میں پوری ہمت و عزیمت کو بروئے کار لانا چاہیئے۔ اِس لیے کہ کسی بھی مؤثر اور نتیجہ خیز تعمیری کوشش کے آغاز کے لیے اِس کٹھن منزل کا سر کرنا ناگزیر ہے!!

حاصلِ کلام: عقدۂ لاینحل؟

اب تک کی کُل بحث کے نتیجے میں ہم بظاہر ایک نہایت شدید قسم کی منطقی پیچیدگی یا عقدۂ لاینحل (DILEMMA) سے دوچار ہو گئے ہیں۔ یعنی ہمارے تجزیہ کے مطابق ایک جانب پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کی واحد اساس اسلام ہے اور اِس کے بقاء و استحکام کا واحد ذریعہ صرف ایک ایسا زور دار اور متحرک مذہبی جذبہ بن سکتا ہے جس کی جڑیں عوامی سطح پر اسلام کے ساتھ واقعی اور عملی تعلق میں گہری اُتری ہوئی ہوں اور دوسری جانب بحیثیت مجموعی پاکستان کے موجودہ مسلم معاشرے کا دین و مذہب کے ساتھ حقیقی و عملی تعلق نہ ہونے کے برابر ہے! ـــ اِس پر فطری طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ؎ "چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟"

لیکن اِس سے قبل کہ ہم اُس عملی تدبیر پر غور کریں، ہمارے قومی و ملّی وجود کی تصویر کا دوسرا رُخ جو نہایت روشن اور تابناک ہے سامنے آ جانا چاہیئے۔ لہٰذا آئندہ اسی موضوع پر گفتگو ہوگی۔ ـــــــ (جاری ہے)

اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۶)

مسلح تصادم : غزوۂ بدر سے صلح حدیبیہ تک (۲)

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد، کا سلسلہ وار خطاب

(سلسلے کے لیے جنوری ۱۹۸۶ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں)

نبی اکرمؐ کی جنگی حکمتِ عملی

اُحد میں قریش کی جو فوج آئی تھی تو ان کے ساتھ دو سو گھڑسواروں کا دستہ تھا اور ان پر سپہ سالار کون ہیں! خالد ابن ولید ابن مغیرہ — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھا اس کے دامن میں صفیں بنوائیں۔ سامنے مشرکین ہیں۔ جبل احد کے ساتھ ایک درّہ ایسا تھا کہ اُحد کے پیچھے سے چکر لگا کر اس درہ سے گزر کر مسلمانوں کے لشکر پر حملہ ہو سکتا تھا۔ نبی اکرمؐ نے اسی اندیشہ کے پیشِ نظر کہ کہیں ادھر سے حملہ نہ ہو جائے اور کہیں ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپے جانے والا معاملہ نہ ہو جائے۔ پچاس تیراندازوں کو اس درّہ پر حضرت عبد اللہ ابن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں تعیّنات فرمایا۔ حضوؐر نے نہایت تاکیدی اسلوب سے فرمایا کہ "تم لوگوں کو یہاں سے نہیں ہلنا۔ اگر ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم یہ دیکھو کہ ہماری بوٹیاں نوچ نوچ کر پرندے کھا رہے ہیں تب بھی تم لوگ یہاں سے نہ ہٹنا"۔ آپؐ اس تاکید کا، اس زور کا، اس شدّت کا، اس Emphasis کا اندازہ کیجیے جو اس حکم میں نظر آتا ہے۔

ایک خوفناک غلطی

بہرحال جنگ ہوئی اور جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ پہلے حملے میں مشرکین کے قدم اکھڑ گئے اور مسلمانوں نے پیچھا شروع کیا۔ چند کفّار کا تعاقب کر رہے تھے اور چند مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے تھے۔ ادھر جو صحابہ کرامؓ درہ پر تعیّنات تھے، ان میں اختلافِ رائے ہو گیا۔ ان پچاس تیراندازوں میں سے اکثر نے کہا کہ چلو ہم بھی چلیں، مالِ غنیمت جمع کریں۔ اب تو فتح ہو گئی ہے۔ ان کے کمانڈر حضرت عبد اللہ ابن جبیرؓ نے فرمایا "ہرگز نہیں حضوؐر نے فرمایا تھا کہ یہاں سے نہ ہلنا۔ میں کسی کو اجازت نہیں دیتا" لیکن ہوا یہ کہ اکثر نے اپنے کمانڈر کی بات نہ مانی اور اس درّے کو چھوڑ کر مالِ غنیمت کے حصول میں مصروف ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسی غلطی کے باعث فتح شکست میں بدل گئی۔ تفصیل سے بعد میں عرض کروں گا۔ یہاں فی الحال یہ سمجھیے کہ اس غلطی کی نوعیت کیا تھی؟

— میری رائے یہ ہے کہ ان حضرات نے جو درّے کو چھوڑ گئے اپنے نزدیک یہ تاویل کی ہو گی کہ حضورؐ نے تو شکست کی صورت میں اتنا زور دیا تھا کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے مت ہٹنا۔ اب تو فتح ہو گئی ہے۔ لہٰذا اب یہاں سے ہلنے میں کیا حرج ہے۔ امیں یہ تعبیر اس لئے کر رہا ہوں کہ ان میں منافق کوئی نہیں تھا سب کے سب مومنین صادقین تھے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ غلطی خلوص سے بھی ہو جاتی ہے، نیک نیتی سے بھی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا میری تعبیر یہ ہے کہ ان سے تاویل سے میں غلطی ہوئی ہو گی۔

نظم کی اہمیت

لیکن یہاں نوٹ کیجئے کہ اصل بات کیا تھی! وہ یہ تھی کہ جو اس دستہ کا امیر ہے وہ تو اجازت نہیں دے رہا۔ چلئے انہوں نے نبی اکرمؐ کے حکم کی تاویل کر لی۔ لیکن یہاں ان کے اور حضورؐ کے مابین ایک لوکل کمانڈر موجود ہے۔ جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر مقرر فرمایا ہے — اس امیر کی تو نافرمانی ہو گئی کہ نہیں ہو گئی! اس کے حکم کی خلاف ورزی ہو گئی کہ نہیں! ڈسپلن (Discipline) تو بہرحال ٹوٹ گیا! وہ بیعت عقبہ ثانی کے الفاظ یاد کیجئے جو حضرت عبادہ ابن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں جو بارہا میں نے آپ کو سنائے ہیں اور ان کے متعلق عرض کیا ہے کہ اس ایک حدیث کے اندر پورا نظام جماعت موجود ہے۔ اور حدیث بھی کس پائے کی ہے اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ اس کو امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ اپنی اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ سند کے اعتبار سے حدیث کے صحیح ہونے کا اس سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے حدیث ایک بار پھر سن لیجئے!

عَنْ عِبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِؓ قَالَ بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ۔

"حضرت عبادہ ابن صامت سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی کہ ہم حکم سنیں گے اور مانیں گے خواہ مشکل ہو خواہ آسان، خواہ ہماری طبیعت کو خوش گوار لگے خواہ ناگوار ہو، خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے اور جس کو بھی ہم پر امیر بنا دیا جائے گا ہم اس سے جھگڑیں گے نہیں اور ہم حق کہتے رہیں گے جہاں بھی ہوں اور اللہ کے معاملہ میں (حق کہنے سے) ہم ہرگز نہیں ڈریں گے کسی ملامت گر کی ملامت سے۔"

ظاہر بات ہے کہ ہر جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تو موجود نہیں ہو سکتے تھے۔ آپؐ کسی مہم پر کسی لشکر کو بھیجتے تھے تو اس کا ایک کمانڈر یا امیر مقرر فرما دیتے۔ اب وہ امیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام ہے، اب معروف میں سمع وطاعت کے اعتبار سے اس کا حکم بالکل اسی طرح مانا جائے گا۔ جیسے نبی اکرمؐ کا حکم مانا جائے گا۔ یہی ڈسپلن ہے جس کو میں بار بار Army Discipline سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ اس کے لیے حضورؐ کی ہدایت موجود ہے: مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ۔ اور بعض احادیث میں اَمِیْرِیْ نہیں ہے بلکہ اَلْاَمِیْرُ ہے یعنی: مَنْ اَطَاعَ الْاَمِیْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصَی الْاَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ۔ "جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے میرے معیّن کردہ امیر کا کہنا مانا، اس نے میرا کہا مانا اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی!"

اسلام کا نظمِ جماعت

یہ ہے اسلامی جماعت کا نظم۔ اب آپ ذرا نوٹ کیجیے کہ پچاس کی نفری میں سے نہ تو کمانڈر اپنی جگہ سے ہلا اور چودہ حضرات اور بھی تھے۔ انہوں نے اپنے کمانڈر کے حکم کے مطابق جگہ نہیں چھوڑی پینتیس۳۵ چلے گئے۔ سات سو کی نفری میں پینتیس۔ پانچ فی صد ہوئے۔ پانچ فی صد اشخاص کی یہ غلطی جس کو آپ Indiscipline کہیں گے۔ یعنی نظم کو توڑا گیا ہے۔ اس کی کتنی بڑی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اس سے نظم کی اہمیت کا اندازہ ہوگا وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ یہ امّت ناقۂ بے زمام بن گئی ہے۔ سمع وطاعت کا نظام کہیں قائم نہیں ہے۔ اور جب نظام ہی نہ ہو تو امّت سمع وطاعت اور نظم کی خوگر بنے تو کیسے بنے! ہر شخص انانیت کا شکار ہے، کوئی دوسرے کو امیر مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرے! یہ جذبہ سرد پڑ چکا ہے۔ آج ہماری امّت مسلمہ میں انتشار کی جو انتہا ہے ذرا اس کو سامنے رکھیے اور یہ واقعہ نوٹ کیجیے۔ کیا معاذ اللہ حضورؐ کی کوئی غلطی تھی! اس واقعہ میں آپؐ کی تو کوئی خطا نہیں تھی۔ صرف پینتیس۳۵ صحابہ کرامؓ نے ایک غلط تاویل کر لی تھی لیکن اپنے کمانڈر کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے یقیناً ڈسپلن توڑ دیا تھا۔ نظم کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور موجود الوقت امیر کی نافرمانی کی تھی ــــ اس کی سزا کیا ملی! یہ کہ خالد بن ولید جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے ان کی عقابی نگاہ نے تاڑ لیا کہ وہ درّہ خالی ہے۔ اصل جنگ تو ہو تی تھی پیدل فوج (Infantry) کی۔ وہ مار کھا چکی تھی۔ بھگدڑ مچ چکی تھی۔ اب انہوں نے اُحد کی پشت کا چکر کاٹا اور دو سو گھڑ سواروں کا دستہ لے کر اس درّہ سے مسلمانوں کی پیٹھ سے جو حملہ آور ہوئے تو یکلخت جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔

درّہ پر پندرہ تیر انداز رہ گئے تھے۔ ان کے لئے دو سو گھڑ سواروں کو اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے یا تلواروں سے روکنا ممکن نہیں تھا۔ پچاس کی نفری ہوتی تو خالد ابن ولید کا اپنے دستہ کے ساتھ درّہ کو کراس کرنے کا سوال نہیں تھا۔ یہاں پندرہ کے پندرہ اصحاب رسولؐ نے جام شہادت نوش فرمایا۔

صورتِ حال بدل گئی خالد بن ولید کے اس عقبی حملہ نے مسلمانوں کو سراسیمہ کر دیا۔ ان کی صفیں تو پہلے ہی درہم برہم تھیں۔ کچھ لوگ کفار کا پیچھا کر رہے تھے اور اکثر مال غنیمت اکٹھا کر رہے تھے۔ بھاگنے والے کفار نے جب خالد ابن ولید اور ان کے دستہ کے لوگوں کے نعرے سنے تو انہوں نے پلٹ کر زور دار حملہ کر دیا۔ اب مسلمان چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان آگئے۔ اب فتح شکست سے بدل گئی۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۵۲ میں اس صورت حال پر تبصرہ موجود ہے۔ گھر جا کر کسی مستند تفسیر سے اس کا مطالعہ کریجئے گا۔ آیت طویل ہے، میں صرف متعلقہ آیت اور اس کی مختصر تشریح کر دیتا ہوں۔ فرمایا: وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ـــ مسلمانو! تم اللہ کو کوئی دوش نہیں دے سکتے۔ اللہ نے تو یقیناً اپنا وعدہ پورا اور سچا کر دکھایا تھا۔ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ "جب کہ تم اللہ کے حکم سے اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے: اللہ نے فتح دے دی تھی لیکن حَتّٰٓی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ـــ "جب تم ڈھیلے پڑے"۔ یہ ڈھیلا پن وہی ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ نظم ڈھیلا ہے۔ ایک Loose Organisation ہے۔ ماننے کو جی چاہا تو مان لیا۔ جی نہ چاہا تو نہیں مانا۔ طبیعت حاضر ہے تو آگئے۔ اگر ذرا سا بھی کسل ہے تو نہیں پہنچ رہے۔ یہ اعصاب کا ڈھیلا پن ہے۔ یہی ضعف ارادہ ہے، فشل کا یہ مفہوم ہے ـــ اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ "جب تم نے ڈھیلا پن اختیار کیا اور تم نے معاملہ میں تنازعہ کیا، جھگڑا کیا"۔ تمہارے امیر عبداللہ ابن جبیرؓ کہہ رہے تھے کہ یہاں سے مت ہلو لیکن تم نے ان سے بحث و تمحیص کی، جھگڑا کیا۔ وَعَصَيْتُمْ ـ "اور تم نے نافرمانی کی"۔ یہ نافرمانی اصل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ چونکہ عبداللہ ابن جبیرؓ کو حضورؐ نے پچاس تیر اندازوں کے دستہ پر امیر اور کمانڈر مقرر کیا تھا۔ لہٰذا نظم کے اعتبار سے کمانڈر کی نافرمانی خود حضورؐ کی نافرمانی ہوگئی۔ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ـ "پیچھے اس کے کہ دکھایا تم کو جو چاہتے تھے تم"۔ آیت کے اس حصہ کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے 'مَا تُحِبُّوْنَ' سے مراد مالِ غنیمت کی چاہت لی ہے اور بعض نے سورۂ صف کی آیت نمبر ۱۳ کے اس حصہ سے کہ: وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۔ استدلال کرتے ہوئے وہ فتح مراد لی ہے جو پہلے ہلّے میں اہلِ ایمان کے لشکر کو حاصل

ہو گئی تھی۔ میں اس آخر الذکر رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔

حکم عدولی کی سزا غزوہ احد کی فتح کا شکست میں بدلنا درحقیقت فشل، تنازع فی الامر اور معصیت امیر کے جرم کی پاداش میں اللہ کی طرف سے سزا تھی۔ تصور کیجئے کہ سزا کتنی کڑی تھی! ستر صحابہ کرامؓ شہید ہوئے۔ سات سو کل تھے۔ دس فیصد نفری شہید ہو گئی۔ حالانکہ خطا صرف پانچ فی صد کی تھی۔ پھر شہدا ء میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسے کیسے جان نثار اور کیسے کیسے ہیرے اور موتی تھے جو کیسی کیسی محنت سے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کئے تھے۔ ان ہی میں اسد اللہ و اسد رسولہ حمزہؓ ابن عبد المطلب ہیں' ان ہی میں المقری یعنی مصعبؓ ابن عمیرؓ ہیں کہ جن کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم قرآنی سے مدینہ منورہ میں اسلامی انقلاب آیا اور اوس و خزرج کے قبیلوں کے اکثر لوگ دولت ایمان سے مشرف ہوئے۔ ۶۸ دوسرے مہاجرین و انصار کے مجاہدین فی سبیل اللہ اور جان نثار محمد صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جام شہادت نوش کیا۔ حضورؐ خود بھی مجروح ہوئے، دندان مبارک شہید ہوئے۔ خود کی دو کڑیاں حضورؐ کے رخسار مبارک میں ایسی گھسی ہیں کہ نکالنے کیلئے زور لگایا نہیں نکلی ہیں۔ پھر دوسرے اصحابؓ نے بمشکل ان کو نکالا ہے۔ حضورؐ پر غشی بھی طاری ہوئی ہے۔ کفار نے ایک موقع پر حضورؐ کا نرغہ کر لیا ہے اور تیروں کی بارش برسائی ہے۔ جان نثاروں نے اپنے جسموں کو حضورؐ کے لئے ڈھال بنایا کہ جو تیر آئیں وہ ہمارے سینوں میں ترازو ہوں محمد کے سینہ مبارک تک نہ پہنچیں صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ بڑے قادر تیر انداز تھے۔ حضورؐ ان کو تیر دیتے اور فرماتے جاتے "سعد تم پر میرے ماں باپ قربان، تیر چلاتے جاؤ"۔۔۔ صرف حضرت سعدؓ وہ خوش بخت صحابی ہیں جن کے لئے حضورؐ نے یہ محبت بھرا کلمہ ارشاد فرمایا۔

الغرض مسلمانوں کو بڑی کھلی شکست ہوئی۔ افراتفری پھیلی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی افواہ بھی پھیل گئی۔ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ بہرحال ان حالات میں سیرت نگاروں کے سامنے ایک عجیب سا سوال اور مسئلہ آتا ہے کہ قریش واپس کیوں چلے گئے! اس کا میرے پاس بلا تشبیہ جواب یہ ہے کہ ایک حدیث شریف کے مطابق انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے مابین ہوتا ہے۔ وہ جس طرف چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔ اس نے قریش کے دل پھیر دیئے۔ ورنہ وہ اس پوزیشن میں آ گئے تھے کہ احد میں موجود تمام مسلمانوں کا صفایا کر دیتے۔ بہرحال بعض ذرائع سے اس کی یہ توجیہہ ہے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے تھے۔ یہ بھی ایک طرح کی پسپائی (Retreat) ہے۔ اب جبکہ حضورؐ اپنے اصحاب کے ساتھ پہاڑ پر چڑھ گئے

تھے تو اس وقت بھی اگرچہ خالد ابن ولید رئیس لشکر ابوسفیان سے اصرار کر رہے تھے کہ ہمیں پہاڑ پر چڑھ کر اس معاملہ کو ختم کر دینا چاہیئے، اس قضیہ کو ہمیشہ کے لئے چکا دینا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ ابوسفیان بڑے حقیقت پسند، زیرک اور حالات کا بہت صحیح صحیح جائزہ لینے اور ان پر نظر رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ نہیں۔ اس لئے کہ مسلمان بلندی پر ہیں، وہاں سے تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ ہوگی تو ہمارا بہت جانی نقصان ہونے کا اندیشہ ہے ۔ بہرحال ہم نے بدلہ لیا ہے۔ یہی بہت ہے ۔

نعروں کا تبادلہ! پھر انہوں نے دامن کوہ سے نعرہ لگایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زندہ ہیں یا فوت ہو گئے! حضورؐ خاموش رہے ۔ ادھر سے تین بار اسی نعرے کی تکرار ہوئی. تیسرے نعرے پر حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا۔ انہوں نے نعرہ کا جواب نعرہ سے دیا کہ "اے دشمن خدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ پھر ابوسفیان نے کہا "دیکھو یہ یوم بدر کا بدلہ ہے جو آج ہم نے چکا لیا۔ حضرت عمرؓ نے جواباً کہا "تمہارے مقتول جہنم میں ہیں جبکہ ہمارے شہدا جنت میں ہیں"۔ ابوسفیان نے پھر نعرہ لگایا "اعلی ھُبل"۔ یہاں ہمیں یہ ملتا ہے کہ مشرکین نے کسی بت کا نعرہ لگایا۔ یہ دراصل خوشی کا موقع تھا ۔ ورنہ جب مشکل کا وقت ہوتا تھا تو مشرکین بھی صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے۔ یہاں تو انہیں فتح ہو گئی تھی اس لئے ابوسفیان نے نعرہ لگایا "اعلیٰ ھُبل"۔ حضورؐ نے فرمایا جواب دو. " اَللّٰہُ اَعَزُّ وَاَجَلُّ " مسلمانوں نے ادھر سے یہ نعرہ بلند کیا۔ اُدھر سے ابوسفیان پھر پکارا "لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ" "ہمارے لئے تو عزّیٰ دیوی ہے جس کا سایہ ہمارے سروں پر ہے۔ تمہارے لئے کوئی دیوی نہیں ہے" حضورؐ نے فرمایا جواب دو "اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ" "اللہ ہمارا مولا ہے، ہمارا پشت پناہ اور مددگار ہے ، تمہارا کوئی مولا نہیں ہے" پھر ابوسفیان یہ کہہ کر اپنے پورے لشکر کو ساتھ لے کر واپس ہو گیا کہ "اگلے سال یہیں پھر مقابلہ کے لئے ملاقات ہوگی" ۔

غزوۂ اُحُد کی شکست کے اثرات بہرحال غزوۂ احد کے بعد کے دو سال نبی اکرمؐ اور اہل ایمان کے لئے نہایت پریشان کن اور تکلیف دہ رہے ہیں۔ اس لئے کہ اہل عرب پر مسلمانوں کے رعب، ہیبت اور دھاک کی جو فضا بن گئی تھی وہ بہت حد تک ختم ہو گئی۔ چنانچہ قرآن مجید میں مسلمانوں کی تسلی کے لئے فرمایا گیا کہ: "وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ"۔ اسی طرح مدینہ کے قریب آکر قریش جو اتنا بڑا چرکہ لگا گئے تو ایک تو مسلمانوں

کے دل زخمی ہیں۔ ان کا حوصلہ (Morale) اب اتنا اونچا نہیں رہا جتنا غزوۂ بدر کے بعد ہو گیا تھا۔ دوسرے گرد و پیش کے مشرکین کے قبائل پر جو دھاک بیٹھ گئی تھی وہ باقی نہیں رہی۔ وہ اسلامی انقلاب کی دعوت و تحریک کے مقابلہ میں دلیر ہو گئے۔ ان کی طرف سے مخالفت و مزاحمت کے اندیشے پیدا ہو گئے۔

اللہ کی طرف سے تسلّی و تشفّی

ان تمام ناموافق و ناسازگار حالات میں تسلّی کے لئے فرمایا گیا:

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ

مسلمانو! کیوں دل شکستہ ہوتے ہو، اگر تمہیں چرکہ اور زخم لگا ہے تو تمہارے دشمنوں کو بھی ایسا ہی چرکہ اور زخم لگ چکا ہے۔ انہوں نے تو ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ میدانِ بدر میں اپنے ستر مقتول چھوڑ گئے تھے ۔ اور ستر قیدی ــــ اس کے باوجود وہ تین ہزار کی نفری لے کر مدینہ پر چڑھائی کے لئے آ گئے۔ تم کیوں ہمت ہار رہے ہو؟ کیوں تنگ دل ہو رہے ہو۔ گھبراؤ نہیں: وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ــ یہ تو تمہاری غلطی تھی، تمہاری خطا تھی جس پر غزوۂ اُحُد میں تمہیں شکست کی صورت میں سزا دے کر ہم نے تمہیں سبق پڑھایا ہے۔ ورنہ یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری پشت پر نہیں ہے، تمہارا مددگار اور حامی نہیں ہے۔ یہ تو ابھی اندرونِ عرب کا معاملہ ہے، تمہیں تو ابھی قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو تہ و بالا کرنا ہے۔ اگر آج تمہارا نظم اور ڈسپلن ڈھیلا رہا تو آئندہ کیا ہوگا۔ لہٰذا سبق سکھانا ضروری تھا۔ تمہارے اندر اس کے بغیر نظم کی اہمیت کا احساس کہاں سے آتا! اگر اللہ چاہتا تو اسے معاف کر دیتا اور نظر انداز (Condone) کر دیتا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ تمہاری اس خطا کے باوجود فتح دے دیتا۔ لیکن اس طرح تمہاری اس موقع کی کمزوری اور غلطی کی اصلاح نہ ہوتی۔ بلکہ اس میں اور اضافہ ہوتا۔ لہٰذا ایک وقتی سی شکست کی صورت میں ہم نے تمہیں متنبہ کر دیا کہ اپنی صفوں (Ranks) کا جائزہ لے لو، جہاں جہاں کمزوریاں ہیں انہیں دور کرنے کی فکر کرو۔ اپنی جمعیت کو اور مضبوط کرو۔ جو نئے نئے لوگ مشرف بایمان ہوئے ہیں، ان کی تربیت کی کمی کو دور کرو تاکہ یہ بھی اسی طرح کندن بن جائیں جیسے کہ مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین اور السابقون الاولون انصار ــــ تمام اہلِ ایمان کو نظم کی پابندی کا خوگر بناؤ۔ تم یہ سب کچھ کر لو تو تم سے استخلاف اور تمکن فی الارض کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پختہ وعدہ ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ ــــ

غزوۂ احزاب

بہرحال غزوۂ احد کے بعد کے دو سالوں کے عرصہ میں تشویش اور خوف کی حالت رہی پھر یہ حالت اپنے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچی ہے دو سال بعد غزوۂ خندق کے موقع پر۔ ــــ رمضان المبارک ۲ھ میں غزوہ بدر ہوا۔ پھر شوال ۳ھ میں معرکۂ احد پیش آیا۔ ذیقعدہ ۵ھ میں یعنی دو سال اور ایک ماہ بعد اب قریش اور دیگر قبائل جن میں یہود بھی شامل تھے۔ متحد ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ عرب میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا لشکر جمع ہوا ہی نہیں تھا۔ بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لئے جمع ہو گیا۔ جنوب سے قریش آ گئے۔ مشرقی جانب سے کئی قبائل آ گئے جن میں بنو فزارہ اور بنو غطفان بھی ہیں جو نجد کے علاقے کے بڑے جنگ جو اور بڑے خونخوار قبیلے تھے۔ شمال سے حملہ آور ہوئے یہودی قبائل جو خیبر میں آباد تھے۔ اس طرح ان قبائل نے مدینہ کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کا نقشہ سورۂ احزاب میں کھینچا گیا ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں غزوۂ احزاب پر پورے دو رکوع ہیں۔

یلغار کا نقشہ

کفار و مشرکین کی ہمہ جہت یلغار اور کمزور ایمان والوں اور منافقین کے خوف و بے اطمینانی کا نقشہ کھینچا جاتا ہے بایں الفاظ: اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ "یاد کرو جب لشکر آ گئے تھے تم پر اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی" ــــ چونکہ مدینہ سے مشرق کی طرف اونچائی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے اس علاقہ کو نجد کہتے ہیں جس کے معنی ہیں اونچائی والا علاقہ۔ لہٰذا جو مشرق سے آئے ان کے لئے فَوْقِكُمْ کے الفاظ آئے۔ اور مغربی ساحل کی طرف ڈھلان اور اترائی ہے۔ چنانچہ قریش اور ان کے حلیف مغرب یعنی نیچائی اور اتار کے راستہ سے آئے۔ لہٰذا ان کے لئے "وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ" فرمایا گیا۔ مزید برآں مدینہ کے شمال مغرب کی جانب سے یہودی قبائل جمع ہو کر آ گئے تھے ــــ اس کٹھن موقع پر منافقین اور کمزور ایمان والوں کی کیفیت اسی آیت میں آگے ان الفاظ مبارکہ میں بیان کی گئی ہے کہ: وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا "اور یاد کرو جب آنکھیں دہشت و حیرت سے پھرنے لگیں اور خوف و ہراس سے دلوں کا یہ حال تھا کہ وہ گویا گلوں میں آ اٹکے ہیں اور تم اللہ کے بارے میں اٹکلیں لگانے اور بدگمانیوں میں مبتلا ہونے لگے" ــــ یہ تبصرہ ہے اللہ کی طرف سے اس امتحان پر جو غزوۂ احزاب کی صورت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا ــــ سیرت مطہرہ کا میرا جو حقیر سا معروضی مطالعہ ہے اس کی بنا پر میری رائے ہے کہ ذاتی طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے سخت وقت

"یوم طائف" گزرا ہے۔ اور مسلمانوں پر بحیثیت جماعت سب سے سخت اور شدید ایام غزوۂ احزاب کے گذرے ہیں۔ جو قریباً ایک ماہ محیط رہا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ غزوہ احد کے موقع پر تین سو افراد تو بطور منافقین منظر عام پر آ چکے تھے۔ اب غزوہ احزاب تک ان کی تعداد کتنی ہو گی! ـــ واللہ اعلم۔ بہرحال قرآن مجید سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی معتدبہ تعداد غزوۂ احزاب کے موقع پر موجود تھی۔ ان کے دل ہمارے محاورہ کے مطابق بلّیوں اچھل رہے ہیں اور ان کو ہر چہار طرف موت نظر آ رہی تھی۔ اور بظاہر احوال بچنے کی کوئی شکل سامنے نہیں تھی۔

غزوۂ احزاب کا میں جب بھی ذکر کرتا ہوں، مجھے جناب نعیم صدیقی صاحب کا یہ شعر اس موقع پر بے ساختہ یاد آ جایا کرتا ہے ؎

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم

ہدایت کا ایک چراغ تھا جو مدینہ میں روشن تھا اور اس کو بجھانے کے لئے اتنی بڑی بڑی آندھیاں آ رہی ہیں کہ الامان والحفیظ!

منافقین کی کیفیت

امتحان یقیناً شدید تھا۔ نتیجتہً منافقین کے دلوں میں جو خبث تھا۔ ان کے دلوں میں جو نجاست تھی اور گندگی تھی۔ وہ اس ابتلاء و آزمائش کو ابھر کر زبان پر آ گئی : وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ "اور جب کہنے لگے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سب فریب تھا"۔ ہم کو دھوکا دے کر مروا دیا۔ ہم سے تو کہا گیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی اور ہو یہ رہا ہے کہ ہم تو رفع حاجت کے لئے بھی باہر نہیں جا سکتے۔ کھانے کو کچھ نہیں۔ ہمارے باغات حملہ آوروں نے اجاڑ دیئے۔ چاروں طرف سے محاصرہ ہے، اندر کوئی چیز نہیں ہے۔ فاقہ پہ فاقے آ رہے ہیں۔ غضب کی سردی نے الگ زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ منافقین کی یہ وہ باتیں ہیں جو ان کے دلوں سے اچھل کر زبانوں پر آ گئی ہیں۔ ان باتوں کا تذکرہ سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور کتب احادیث میں ملتا ہے۔

اہل ایمان کی کیفیات

ادھر مومنین صادقین کی کیفیت کیا تھی؟ ملاحظہ ہو۔ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ

اللّٰہ وَرَسُوْلُہٗ " اور حقیقی مومنین کا اس وقت حال یہ تھا ــ ــ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہی وہ بات ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا ۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی " یہ کون سا وعدہ ہے جس کی طرف یہ صادق القول مومنین اشارہ کر رہے ہیں! قرآن مجید میں متعدد مقامات پہ اللہ کی طرف سے ، آزمائش وامتحان اور ابتلا کے وعدوں کا ذکر آیا ہے ۔ مثلاً سورۃ العنکبوت کی آیات ۲-۳ میں فرمایا

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ ۝

" کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائینگے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا، حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں؟ "

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۵۵ میں فرمایا :

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ

" اور ہم البتہ تم کو خوف وخطر اور بھوک اور مال وجان اور فصلوں کی تباہی میں مبتلا کر کے تمہارا امتحان لیں گے ، تمہیں آزمائیں گے۔ جو ان حالات میں صبر کریں تو ان کو (اے نبیؐ) بشارت دے دیجئے "

چنانچہ غزوۂ احزاب کے مصائب کو دیکھ کر مومنین صادقین کے ذہن ان پیشگی تنبیہات کی طرف منتقل ہو گئے اور ان کی زبانوں پر فی الفور آگیا :

" ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ ۔ "

ایک عجیب نقشہ

بہر حال اس غزوہ احزاب میں کفار ومشرکین کے لشکروں کا محاصرہ خاصا طول پکڑ گیا ۔ اس دوران حالات بڑے ہی سخت قسم کے پیش آئے ہیں۔ اس غزوہ کا وہ نقشہ بھی ہیں آپ کے سامنے لاؤں کہ جب خندق کھودی جارہی تھی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کام میں بنفس نفیس شریک تھے۔ پتھر اٹھا اٹھا کر خندق سے باہر پھینک رہے تھے ۔ چونکہ ان دنوں شدید قحط کا عالم تھا ۔ لہٰذا اصحابہ کرامؓ نے اپنے پیٹوں پر چادروں کے ساتھ کس کر پتھر باندھے

ہوتے ہیں تاکہ کمریں دوہری نہ ہوجائیں۔ اس لئے کہ شدید بھوک کی وجہ سے معدہ تشنج میں آتا ہے تو دراصل یہ اس معدے کو بہلانے کی ایک شکل ہے کہ اگر اس پر بھاری بوجھ باندھ دیا جائے تو اس کو وہ بھوک کا تشنج (Hunger Pain) نہیں ہوگا۔ بعض صحابہ کرامؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہوں نے اپنے کرتے اٹھا کر پتھر دکھائے اور عرض کیا کہ حضورؐ اب فاقہ ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے' ہم نے اسی لئے پتھر باندھ رکھے ہیں۔ نبی اکرمؐ اپنا کرتہ اٹھا کر دکھاتے ہیں' وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

یہ دراصل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا کہ خندق کھودی جائے۔ عرب تو جانتے ہی نہیں تھے کہ خندق کس بلا کا نام ہے۔ پرانی جنگوں کے لئے جو طریقے اختیار (Develop) ہوئے تھے تو ان میں شہر پناہ کے گرداگرد خندق کھودنے کا رواج بھی تھا۔ اہلِ ایران دفاع کے اس طریقہ سے بخوبی واقف تھے۔ ایران اور روم کی تو کئی سو سال سے جنگ چل رہی تھی۔ تاریخ دونوں کے بین جھولا جھول رہی تھی۔ کبھی رومی ایران کے دارالسلطنت مدائن تک چڑھ دوڑتے تھے۔ بھی ایرانی ان کو ایشیائے کوچک میں دھکیل دیتے تھے۔ تو جب مدینہ میں خبر پہنچی کہ تین اطراف سے ار دس مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لئے چلا آرہا ہے تو حضرت سلمان فارسیؓ نے شورہ دیا کہ مدینہ کو پشت پر رکھتے ہوئے خندق کھودی جائے تاکہ خندق کی وجہ سے دشمن براہِ راست ینہ پر یورش نہ کرسکیں۔ چنانچہ خندق کھودنے کا کام تیزی سے شروع ہوگیا۔ یہ سخت سردی کا موسم تھا۔

اشعار

روایات میں خندق کی کھدائی کے وقت دو اشعار کا ذکر ملتا ہے۔ محبت الٰہی میں سرشار صحابہ کرامؓ اور ان کے سالارِ اعظم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نگلاخ زمین کی کھدائی پر جرأتِ مومنانہ اور ہمت مردانہ کے ساتھ کدالیں چلا رہے تھے اور صحابہ امؓ ضرب لگاتے ہوئے کورس کے انداز میں کہتے جاتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃ ط

رحضورؐ جواب دے رہے تھے۔

فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ ط

صحابہ کرامؓ کے قول کا مطلب کیا ہے؟ "اے اللہ آخرت کی زندگی اصل زندگی ہے' آخرت یش اصل عیش ہے۔" گویا ان کے نزدیک اس وقت کی کلفتیں' تکالیف اور مصیبتیں ہیچ ہیں یں تو آخرت کی فوز و فلاح چاہیئے۔ اور حضورؐ کا جواب ہوتا تھا۔ "اے اللہ! بس معاف فرما دے ش فرمادے ان انصار و مہاجرین کی جماعت کی"۔ دوسرا شعر جس کا تذکرہ روایات میں ملتا ہے

وہ نظم جماعت کی اساس و بنیاد بیعت کے ضمن میں بہت اہم ہے۔ صحابہ کرامؓ ترانہ کے انداز میں کدالوں کی ضرب کے ساتھ اس شعر کو پڑھا کرتے تھے:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا!

"ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جہاد کی بیعت کی ہے۔ اب یہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جس وقت تک جان میں جان ہے"۔

جسم و جان کا تعلق منقطع ہو جاتے تو بات دوسری ہے۔ جب تک یہ تعلق باقی ہے جہاد جاری رہے گا۔ یہ ہے صحابہ کرامؓ کی جماعت کی وہ شان جس کی بنیاد بیعت ہے۔

نصرتِ الٰہی بہرحال اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد اور نصرت و تائید سے اہل ایمان کو اس نرغہ اور محاصرہ سے نجات دلائی جو بیس دن تک جاری رہا تھا۔ ایک شب بہت زبردست آندھی آئی جس سے ان کے لشکر تلپٹ ہو گئے۔ اکثر خیمے اکھڑ کر آندھی کے ساتھ تتر بتر ہو گئے۔ بڑے بڑے چولہوں پر جو بڑی بڑی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں، وہ اُلٹ گئیں۔ ان چولہوں کی وجہ سے ان کے خیموں میں آگ لگ گئی۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک غیبی تدبیر تھی جس سے ان کے حوصلے اس درجہ پست ہو گئے کہ صبح تک تمام لشکر منتشر ہو چکا تھا۔ تمام قبائل اپنے اپنے مستقروں کی طرف کوچ کر گئے۔ اسی کا ذکر ہے سورۃ احزاب کی آیت ۹ میں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۔

"اے اہل ایمان! اللہ کا احسان یاد کرو جو تم پر ہوا۔ جب چڑھ آئیں تم پر فوجیں پھر ہم نے ان پر بھیجی ہوا (آندھی) اور (فرشتوں کی) وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں۔ اور اللہ تمہارے تمام اعمال کو دیکھنے والا ہے"۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند تدابیر اور بھی اختیار فرمائی تھیں، لیکن ان کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس غزوۂ احزاب کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان کا امتحان لینا تھا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا مقصود تھا۔ نظر آجائے کہ کون کتنے پانی میں ہے! سب جان لیں کہ کون ان میں سے منافق ہیں اور کون وہ ہیں جو کڑی سے کڑی آزمائش اور سخت سے سخت امتحان میں ثابت قدم رہ سکتے ہیں! ـــــ امتحان ہو گیا

تو ایک آندھی اور فرشتوں کا ایک لشکر کافی تھا۔ کفار و مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر اللہ کی قدرت
کے مقابلہ میں تو پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ بارہ ہزار نہیں بارہ لاکھ کا بھی لشکر ہوتا تو اس
کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایک آندھی نے معاملہ تلپٹ اور تتر بتر کر دیا اور کفار و مشرکین جو ایک
زبردست جمعیت کی شکل میں اور بڑے بڑے ارمانوں اور بڑی بڑی تیاریوں کے ساتھ دور دراز کا
کا سفر کر کے ہدایت کے چراغ کو بجھانے آئے تھے ایک رات ہی میں منتشر ہو گئے۔ معاملہ ختم ہو گیا۔
صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح مسلمانوں نے دیکھا تو میدان خالی تھا

نبی اکرمؐ کا تاریخی ارشاد

اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے
وہ بھی سن لیجئے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ
کو کتنی دوررس نگاہ، کتنی بصیرت و فراست عطا فرمائی تھی۔ کسی انقلابی رہنما کے لئے یہ وصف
(Quality) اشد ضروری اور لازمی (Essential) ہے کہ وہ حالات پر صحیح،
صحیح نگاہ رکھے ـــــ چند اصولوں کو جان لینا اور ان کو بیان کرتے چلے جانا ہی سب کچھ
نہیں، ٹھیک ہے یہ بھی ایک کام ہے اور اس میں کوئی بہت زیادہ مشکل درپیش بھی نہیں آتی۔
اس کے ساتھ ساتھ ایسی صلاحیت اور نگاہ دوررس کی بھی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ حالات
کی نبض پر بھی ٹھیک ہاتھ ہو۔ صحیح اندازہ ہو کہ حالات کا رخ کیا ہے! وہ کدھر جا رہے
ہیں! صحیح صحیح تشخیص (Assessment) ہو کہ ہم کتنے پانی میں ہیں! ہمارا دشمن کتنے پانی میں ہے!
اس کی طاقت کیا ہے! اس کے اور ہمارے اثرات کا تناسب کیا ہے! ظاہر بات ہے کہ ایک انقلابی
عمل میں ان سب امور پر گہری نگاہ رکھنی اشد ضروری ہے اور ناگزیر ہے۔ لیکن اگر صرف ایک خانقاہ ہے،
اس میں لوگوں کی تربیت کرنی ہے، اس کے لئے بھی ایک خاص صلاحیت درکار ہے۔ لیکن اس میں ان
چیزوں پر نگاہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ایک دارالعلوم ہے، درس دینا ہے، قرآن پڑھانا
ہے۔ حدیث و فقہ پڑھانی ہے، ان کاموں کے لئے بھی ایک خاص صلاحیت کی ضرورت ہے۔ وہاں
بھی ان امور پر نظر ہونی ضروری نہیں ہے ــ لیکن یہاں اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اس امر پر
نگاہ ہو کہ انقلابی دعوت اور تحریک کو مختلف مراحل میں گزار کر اور نکال کر اسے کامیابی تک کیسے پہنچا
دیا جائے!۔ یہ شئے دیگر ہے۔ اس کے لئے اور قسم کی صلاحیتیں چاہئیں۔ اس کی ایک عظیم مثال
ہے۔ جو غزوۂ احزاب کے متصلاً بعد سیرت مطہرہ میں نظر آتی ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر
جس کا دوسرا نام غزوہ خندق بھی ہے، اگرچہ قریش بارہ ہزار کا لشکر لے آئے تھے! جس کے متعلق

آپ کو بتا چکا ہوں کہ عرب کی حد تک اس وقت تک کی تاریخ میں اتنا بڑا لشکر پہلی بار جمع ہوا تھا۔ اب جو یہ قافلہ منتشر ہوا اور یہ ٹڈی چھٹی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا۔ صحابہ کرامؓ کو خوش خبری سنادی کہ:

لَنْ تَغْزُوْکُمْ قُرَیْشٌ بَعْدَ عَامِکُمْ ھٰذَا وَلٰکِنَّکُمْ تَغْزُوْنَھُمْ

"اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکتے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے"

میرے نزدیک سورہ صف بھی اسی موقع پر نازل ہوئی ہے جس میں یہ آیت مبارکہ موجود ہے:

وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ○

"اور اے مسلمانو! ایک دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے یعنی اللہ کی مدد ـ تو وہ آیا ہی چاہتی ہے اور اب فتح دور نہیں ہے (تمہارے قدموں کو چومنے والی ہے) اور اے نبیؐ! اہل ایمان کو بشارت سنا دیجئے"

ــــــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ فرمائے ہیں کہ: لَنْ تَغْزُوْکُمْ قُرَیْشٌ بَعْدَ عَامِکُمْ ھٰذَا وَلٰکِنَّکُمْ تَغْزُوْنَھُمْ ــ تو میرے نزدیک یہ الفاظ حضورؐ نے سورہ صف کے اس حکم وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ کے امتثالِ امر میں فرمائے ہیں۔ واللہ اعلم

نبی اکرمؐ کی نگاہِ دوررس

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخوبی اندازہ تھا کہ کتنی محنتوں اور کوششوں سے قریش نے اپنے لشکر کی تیاری کی ہوگی اور اپنے حلیف قبائل کو اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کیا ہوگا۔ بنو غطفان، بنو فزارہ اور خیبر کے یہود کے قبائل کو آمادہ کرنے کے لئے کتنی سفارتیں بھیجی ہوں گی، کتنی خط و کتابت کی ہوگی اور اس کام کے لئے پیام کے سلسلہ میں کتنے سوار دوڑائے گئے ہوں گے ـــ یہ سارے پاپڑ بیل کر قریش نے جو اتنی طاقت جمع کی تھی اور اسے لے کر وہ مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے لیکن نتیجہ کیا نکلا! یہ کہ بے نیل مرام واپس آنا پڑا۔ ساری محنتیں اور کوششیں اکارت گئیں۔ اتنی بڑی جمعیت! لیکن قدرتِ الٰہی کے سامنے اس کی حیثیت کیا تھی! اللہ تعالیٰ نے ایک آندھی بھیج دی اور ان کے تمام ارمان ملیامیٹ ہو گئے۔ حضورؐ کو اندازہ تھا کہ اس ہزیمت سے قریش کے حوصلے جو پست ہو گئے ہیں تو اب قریش یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ مدینہ پہ دوبارہ حملہ کرنے کے متعلق سوچیں لہٰذا حضورؐ نے اہل ایمان کو بشارت سنادی کہ اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ نہیں کر سکتے بلکہ اب تم چڑھائی کر کے جاؤ گے۔ اب پیشقدمی تمہاری طرف سے ہوگی۔ اب جنگ کے لئے جو اقدام ہماری طرف سے ہوگا جو اب تک قریش کے ہاتھ میں تھا۔

حضورؐ کا اہم اقدام

چنانچہ اگلے ہی سال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے لئے مکّہ کے سفر کا قصد فرماتے ہیں۔ دیکھئے یہ بالکل Assessment کا معاملہ ہے۔ حضورؐ کتنا بڑا خطرہ (Risk) مول لے رہے ہیں! حضورؐ خواب دیکھتے ہیں کہ میں عمرہ کر رہا ہوں ـــــ چنانچہ اعلان فرما دیتے ہیں اور تیاری بھی شروع فرما دیتے ہیں۔ لیکن ان حالات میں مکّہ جانا! کتنا دلیرانہ (Bold) قدم اٹھانے کا حضورؐ فیصلہ فرما رہے ہیں۔ مکّہ والے برداشت کریں گے کہ اہلِ ایمان کو مکّہ میں داخل ہونے کی اجازت دیں! اپنے گھر میں تو بلّی بھی شیر ہوتی ہے۔ قریش کیسے گوارا کریں گے کہ مسلمان مکّہ میں داخل ہوں! چاہے عمرہ ہی کے لئے آئے ہوں ـــــ

عمرہ کی تیاری

یہ بات نہیں تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اندازہ نہیں تھا کہ مکّہ والوں کی طرف سے کتنی شدید مزاحمتیں ہوں گی۔ لیکن نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس اشارۂ غیبی کی بنیاد پر حضورؐ نے عمرہ کے قصد کا فیصلہ فرما لیا۔ یہ خبر مدینہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ چودہ سو جان نثار ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئے ـــــ اس موقع پر آپ حضرات یہ بات جان لیجئے کہ جو صحابہ کرامؓ اس وقت حضورؐ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے، وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ گویا موت کے منہ میں جا رہے ہیں ٹھیک ہے عمرہ کی نیت سے جا رہے ہیں، لیکن قریش کے نزدیک تو یہ ایک نوع کی چڑھائی تھی۔ وہ عمرہ کے لئے اہلِ ایمان کو مکّہ میں داخل ہونے دیں تو گویا یہ ان کے لئے اپنی رہی سہی ساکھ اور بچا کھچا وقار بھی ہمیشہ کے لئے خود اپنے ہاتھوں خاک میں ملانے کے مترادف تھا۔ یہ تو ان کے لئے ایک نوع کی شکست تھی کہ وہ مسلمانوں کو عمرہ کرنے دیتے۔ اس کے بعد تو عرب میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔

مکّہ کی طرف کوچ

لہٰذا اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ بہت بڑا اور اہم اقدام ہے۔ جان جوکھوں میں ڈالنے والا قدم تھا۔ چودہ سو صحابہ کرامؓ حضورؐ کے ہمراہ ہیں۔ احرام باندھے ہوئے ہیں۔ ھَدیٰ کے جانور ساتھ ہیں۔ صرف تلواریں پاس ہیں لیکن وہ بھی نیام میں ـــــ یہ ہے وہ اقدام جس کی تفصیلات میں ان شاء اللہ آئندہ جمعہ کو بیان کروں گا۔ جو صلح حدیبیہ پر منتج ہوا۔ جس کو قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا ہے۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا۔ یہ صلح حدیبیہ جو ذوالقعدہ ۶ھ میں منعقد ہوئی ہے۔ وہ سیرتِ مطہرہ کے اس چھٹے مرحلہ میں ایک اہم موڑ (Turning Point) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ کی جد وجہد کے دو حصے ہو جائیں گے۔ یوں سمجھئے کہ ایک حصہ وہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل ہونے والی ہے۔ فتح مکّہ قریب ہو گئی ہے۔

لیکن صلح حدیبیہ کے متصلاً بعد ہی انقلاب محمدی علیٰ صاحب الصلوٰۃ والسلام کا بین الاقوامی سطح پر بھی آغاز ہوگیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان امور پر اگلی مرتبہ گفتگو ہوگی۔ مجھے توقع ہے کہ آئندہ جمعہ کو سیرت النبیؐ کے آئینہ میں انقلابی عمل کا جو بیان ہے ان شاء اللہ اس کی تکمیل ہو جائے گی اور اس سے اگلے جمعہ کو اللہ نے چاہا تو ہم تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کریں گے کہ اس دور میں ہم سیرت مطہرہ کے انقلابی عمل سے کیا کیا چیزیں مستنبط کریں گے۔ کون کون سی چیزیں ہیں جوں کی توں یعنی ہوں گی اور کن کن امور میں ہمیں دو وجوہ کی بنا پر فرق ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ معاملہ ہے۔ کفار و مشرکین کے ساتھ نہیں۔ اور دوسری وجہ یہ کہ حالات کی تبدیلی کے باعث عوام نہتے ہیں جبکہ حکومتوں کے پاس بہت بڑی طاقت ہے۔ ان دو وجوہ کی بنا پر حکمت عملی میں کیا کیا تغیر و تبدل کرنا ہوگا۔ اس پر ان شاء اللہ بعد میں گفتگو ہوگی۔

بَارَکَ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ فِی الْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ وَنَفَعَنِیْ وَاِیَّاکُمْ بِالْاٰیٰتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ ــــ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(جاری ہے)

بقیہ : الہدیٰ

کے ساتھ نبی اکرمؐ کا یہ قول موجود ہے کہ یہ نووارد حضرت جبرئیلؑ تھے جو انسانی شکل میں آئے تھے اور سوال و جواب کے ذریعہ صحابہ کرامؓ کو دین کے مہتم بالشان امور کی تعلیم و تبیین ان کے پیشِ نظر تھی۔

حضرات: سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۲ پر ہم نے دو نشستوں میں کسی قدر غور و تأمل کیا ہے۔ اگرچہ مجھے شدت کے ساتھ یہ احساس ہے کہ جو اہم اور عظیم مضامین ان تین آیات میں وارد ہوئے ہیں ان کا کسی درجہ میں بھی حق ادا نہیں ہو سکا۔ تاہم ان آیات کے ذریعے جو بھی علم صحیح ہمارے سامنے آیا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس علم سے صحیح طور پر مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ ان شاء اللہ آئندہ نشستوں میں ہم آیات ۳۴ تا ۳۶ کا مطالعہ کریں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

اَلْهُدٰی

(نشست ۳۰)

(مباحثِ ایمان)

سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں

حظِّ عظیم

ڈاکٹر اسرار احمد

(کے ٹیلیویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ)

— (۲) —

سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ اما بعد،
اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ
نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا
تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ۔ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ

(آیات ۳۰ تا ۳۲)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

"یقیناً جن لوگوں نے کہا، ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر اس پر جم گئے، اُن پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (اور وہ کہتے ہیں)، کہ نہ خوف کھاؤ، نہ غمگین ہو بلکہ خوشخبری حاصل کرو اس جنّت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ہیں تمہارے پشت پناہ دُنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور

اس جنت میں تمہیں ملے گا جو کچھ چاہیں گے تمہارے جی اور وہاں مہیا کر دیا جائے گا جس کی تم طلب کرو گے۔ یہ مہمان نوازی ہو گی اُس ہستی کی طرف سے جو غفور بھی ہے، رحیم بھی ہے"

سچ فرمایا اللہ بزرگ و برتر نے!

محترم ناظرین اور معزز سامعین!

ان آیات مبارکہ کے ایک حصہ پر ہم سابقہ نشست میں کسی قدر غور کر چکے ہیں یعنی یہ کہ ایمان کا لب لباب ہے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر انسان کے دل کا جم جانا، ٹھک جانا اور اس کا نتیجہ ہے خوف اور غم سے نجات پا جانا ــــ ان آیات میں جو دوسرے مضامین آئے ہیں، اب ہم اُن کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ ملائکہ کا جو نزول ان آیات میں مذکور ہوا ہے، اس کے بارے میں ایک بات تو بالکل متفق علیہ ہے کہ اہل ایمان پر موت کے وقت، موت سے متصلاً قبل فرشتوں کا نزول ہوتا ہے ــــ پھر عالم برزخ اور عالم آخرت میں ملائکہ سے اہل ایمان کی ملاقات اظہر من الشمس ہے ہی ــــ اس حیات دنیوی میں فرشتوں کے نزول کے متعلق یہ بات بہت سے لوگوں کے تجربات سے بھی ثابت ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کے بارے میں ایسے متعدد واقعات ملتے ہیں کہ جب اُن کی موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے آس پاس بیٹھے لوگوں سے کہا کہ ہٹ جاؤ ــــ جیسے کچھ غیر مرئی ہستیوں کی آمد ہو رہی تھی اور مرنے والوں نے ان کے لئے راستہ صاف کرنے کے لئے کہا ہے۔ یہ بات بالکل سمجھ میں آتی ہے کہ جب کوئی صاحب ایمان شخص، اس عالم سے عالم برزخ یا عالم آخرۃ کی طرف منتقل ہو رہا ہو تو اُس عالم کے جو کارندے ہیں وہ اس صاحب ایمان کی روح کے استقبال کے لئے آتے ہیں اور اسے خوشخبری دیتے ہیں جیسے سورۂ فجر میں خود اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نقل ہوا ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝

اے نفس مطمئنہ، اے وہ انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت جو پورے اطمینان و سکون اور

ل جمعی کے ساتھ اللہ کی اطاعت، اللہ کی بندگی اور اللہ کی محبت میں مگن رہا ہو اور
ی حال میں اُس نے اپنی پوری زندگی بسر کی ہو اُس سے کہا جائے گا کہ اب لوٹ جا
پنے پروردگار کی طرف، اِس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی!

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ اب داخل ہو جا میرے
محبوب بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اپنے نیک بندوں کی ارواح کیلئے استقبالیہ
کلمات ہیں۔ لہٰذا موت کے وقت ایک بندۂ مومن کی روح کے استقبال کے لئے
ملائکہ کا نزول بالکل قرینِ قیاس ہے ــــ البتہ یہ بات سمجھنی ہوگی کہ اہلِ ایمان پر
حیاتِ دنیوی کے دوران بھی ملائکہ کا نزول ہوتا ہے یا نہیں! اِس کو سمجھنے کے لئے،
یہ بات جان لینی چاہیئے کہ خیر و شر کی کچھ تو وہ قوتیں ہیں جو ہمارے باطن میں ہیں۔ ہمارا
نفسِ امارہ ہے، إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ جو ہمیں برائی کا حکم دیتا ہے جو ہمیں بُرے
کاموں کی طرف للچاتا ہے۔ جو ہمیں بدی و برائی کے لئے اکساتا ہے جو ہمارے اندر تکبّر
پیدا کرتا ہے۔ عُجب پیدا کرتا ہے۔ مال کی محبت پیدا کرتا ہے۔ حسد پیدا کرتا ہے شہوت
اور نفسانی خواہشات کو ابھارتا ہے۔ جائز و ناجائز کی تمیز و امتیاز کے بغیر اپنی مرضیات
کو پُورا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ دنیا کی محبت کو ہمارے دلوں میں راسخ کرتا ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَ ہرگز نہیں اصل بات یہ ہے کہ
تَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝ تم جلدی حاصل ہونے والی چیز
یعنی دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

لیکن دوسری طرف خود ہمارے باطن میں نفسِ لوامہ بھی ہے جسے ہم ضمیر سے
تعبیر کرتے ہیں۔ ہمارے نفس میں قلب و رُوح کی وہ باطنی قوتیں بھی موجود ہیں جو خیر
کی طرف، نیکی کی طرف، بھلائی کی طرف بلانے والی ہیں۔ ہر انسان خیر و شر کی اِس
کشمکش کو اپنے باطن میں محسوس کرتا ہے۔ خارج میں بھی خیر کی دعوت دینے والے
موجود ہیں اور شر کی طرف بلانے والے بھی ــــ انسانوں میں انبیائے کرام علیہم

الصلوٰۃ والسلام خیر کی طرف دعوت دینے والے تھے۔ اولیاء اللہ خیر کی طرف بلانے والے تھے۔ صلحاء، واتقیاء بھلائی کی تلقین کرنے والے بھی ہر دَور میں موجود رہے تھے اور اَب بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اشرار اور فساق و فجار بھی ہر دَور میں رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو برائی اور بدی کو نہائیت خوشنما اور دل فریب بنا کر لوگوں کو اس راستے کی طرف کھینچنے اور اُن کو اپنے رنگ میں رنگنے کی بڑی منظم کوششیں کرتے ہیں ـــــ پھر شر کی طرف بلانے والی غیر مرئی قوتیں بھی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں، شیاطین جن ہیں جو ہمیں برائی، بدی اور شر کی ترغیب دیتے ہیں جو ہمیں نیکیوں سے روکنے کی کوششیں کرتے ہیں اگرچہ وہ ہمیں نظر نہیں آتے، لیکن اُن کا وجود ہے۔ لہٰذا جان لیجئے کہ اسی طریقہ سے ملائکہ ہیں جو خیر کو تقویت دیتے ہیں۔ جو اہلِ ایمان کی تثبیتِ قلبی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ خیر و شر کی کشمکش اور معرکہ میں اُن کے قدم جماتے ہیں۔ اُن کے دلوں کے اندر سکینت و ثبات، ٹھہراؤ اور جماؤ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ بات قرآنِ مجید سے ثابت ہے اور احادیث صحیحہ سے بھی ثابت ہے۔ غزوۂ بدر میں فرشتوں کا نزول ہوا۔ سورۂ انفال کی آیت نمبر ۹ میں فرمایا:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ﴿﴾	"یاد کرو وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، اس نے تمہاری فریاد قبول کرلی اور

اس نے جواب میں کہا کہ مَیں تمہاری مدد کے لئے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔"

اسی سُورۃ کی آیت نمبر ۱۲ میں فرمایا:

اِذْ يُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	"اے نبیؐ، یاد کرو وہ وقت جب آپ کا رب فرشتوں کو وحی کر

رہا تھا کہ مَیں تمہارے ساتھ ہُوں، تم اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو!"

ایسی ہی آیات کے مطالعہ سے متاثر ہو کر ہی حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم

نے کہا تھا ؎
فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

ایک حدیث صحیح میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔

مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِّنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ ، وَ یَتَدَارَسُوْنَهٗ بَیْنَهُمْ اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْهِمُ السَّکِیْنَةُ وَغَشِیَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَذَکَرَهُمُ اللّٰہُ فِیْ مَنْ عِنْدَهٗ۔

" جب کبھی لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں اللہ کی کتاب پڑھنے کے لئے اور باہم درس و تدریس کے لئے تو ان پر سکینت کا نزول ہوتا ہے۔ دل کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ ان پر رحمتِ خداوندی اپنا سایہ کر لیتی ہے اور فرشتے اُن کے گرد گھیرا ڈال دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کا ذکر فرماتا ہے ملائکہ مقربین کی محفل میں ۔"

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اس حیاتِ دنیوی میں بھی ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔

آیات زیرِ درس میں آگے آنے والے جو الفاظ ہیں اُن میں آپ دیکھیں گے کہ ایک تو ہیں ؛ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۔ خوشخبری حاصل کرو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اِن الفاظ کی مناسبت ہے موت کے قریب نزولِ ملائکہ سے ــــــ جب ایک صاحب ایمان شخص اس دنیا کو چھوڑ کر دوسرے عالم کی طرف جا رہا ہوتا ہے اُس وقت وہاں کے جو کارندے استقبال کے لئے آتے ہیں وہ انہیں بشارتیں دیتے ہیں کہ تمہاری کلفت کا وقت ختم ہوا۔ تمہاری محنت و مشقت کا وقت تمام ہوا۔ اب تمہارے لئے کسی خوف اور رنج کسی کلفت و محنت کی کوئی ضرورت نہیں ہے ــــ اب خوشخبری حاصل کرو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ــــــ یہ انداز اور یہ الفاظ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، اِس موقع سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں جب ایک بندۂ مومن کی اِس عالمِ فانی سے اُس عالمِ جاودانی کی طرف منتقلی ہو رہی ہوتی ہے جہاں مومنین صادقین کے لئے

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ وَّ جَنَّةُ نَعِيْمٍ کا بندوبست فرمایا ہوا ہے۔
اگلی آیت میں الفاظ آتے ہیں نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ،
"ہم ہیں تمہارے ساتھی اور دوست دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں"۔ یہ الفاظ
اس کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتے ہیں کہ یہ حیاتِ دنیوی کے دوران کہے جائیں
کہ انسان خیر و شر کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ اس وقت اس کو اس بات کی ضرورت
ہے کہ خیر کے لئے کوئی اس کی ہمت بندھانے والا ہو۔ کوئی اس کے دل کو نیکی پر جماؤ
عطا کرنے والا ہو کہ تم نیکی اور بھلائی پر مستقیم رہو۔ خیر کی راہ پر استقلال کے ساتھ
گامزن رہو۔ ہم ہیں تمہارے مددگار، ہم ہیں تمہارے پشت پناہ ——— پس میرے
نزدیک۔۔۔ ان الفاظ کی کہ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ زیادہ مناسبت
اس سے ہے کہ یہ حیاتِ دنیوی کے دوران کہے جائیں اور ان کا تعلق دورانِ حیاتِ دنیوی
میں ملائکہ کے نزول سے ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ وہ آخرت کیا ہے؟ اس میں تمہارے
یہاں جنت کی نعمتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مقام بہت اہم
ہے ——— ایک تو اس جنت میں وہ سب کچھ فراہم کر دیا گیا ہے جس کی خواہش تمہارے
نفس میں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارا فاطر فطرت ہے۔ وہ جانتا ہے تمہاری مرغوبات کیا ہیں!
تمہیں کیا کیا چیزیں پسند ہیں۔ تمہارے نفس کے اندر کس کس چیز کی چاہت پائی
جاتی ہے ——— غور کیجئے! چونکہ یہ بڑی عقلی اور منطقی بات ہے کہ بندۂ مومن اس دنیا
میں اپنے نفس کی مرضیات، خواہشات اور مرغوبات پر قدغنیں لگاتا ہے، پابندیاں
عائد کرتا ہے۔ نفس کے منہ زور گھوڑے کی لگام کھینچ کر رکھتا ہے۔ وہ آخرت میں
اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے لئے کھڑے ہونے سے لرزاں و ترساں رہتا ہے

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۔ "وہ شخص جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اور
اس نے اپنی خواہشاتِ نفس کی باگیں تھام کر رکھیں۔ ان سے خود کو روکے رکھا"
تو ایسے شخص کو منطقی اور عقلی طور پر اس کا صلہ یہ ملنا چاہئے کہ جن چیزوں سے اس نے

اللہ کی رضا کے لئے اپنے آپ کو روکے اور تھامے رکھا، باز رکھا۔ اسے اِن خواہشات کی بھرپور تسکین عطا کی جائے۔ چنانچہ جنت میں ابتدائی سامان تو وہ ہے وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ جو اشتہا، اور جس چیز کی بھی خواہش تمہارے نفس میں ہے اُن سب کا فراوانی کے ساتھ جنت میں تمہارے لئے اہتمام کر دیا گیا ہے۔

اَب اِس سے آگے بڑھ کر ایک درجہ ہے، وہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز فراہم کر دی جائے گی جو تم طلب کرو گے: وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۔ یہاں یہ بات جان لیجئے کہ طلب کے درجے میں سب لوگ برابر نہیں ہیں۔ ہر ایک کی اپنے اپنے شعور اور آگہی کی سطح ہے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا (Level of Consciousness) ہے۔ اسی کے اعتبار سے ہر آدمی مانگے گا اور طلب کرے گا۔ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو عقل و شعور کے لحاظ سے زیادہ بلند نہ ہوں۔ انہیں وہی کچھ کافی ہو جائے جو اُن کے مرغوباتِ نفس کے مطابق وہاں فراوانی کے ساتھ مہیا کر دیا گیا ہو، وہی ان کے لئے کفایت کر جائے لیکن ایسے بھی اللہ کے بندے لازماً ہوں گے جن کو کوئی چیز تسکین نہ بخش سکے سوائے دیدارِ الٰہی کے ـــــ وہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے روتے انور کے دیدار کے طالب ہوں۔ اس سے کمتر کوئی چیز بھی اُن کے لئے تسکین بخش نہ بن سکتی ہو۔ یہاں سے وہاں تک نہ معلوم کتنے درجات ہوں گے۔ لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ تم کیا چاہتے ہو تو ہر شخص اپنی ذہنی سطح کے مطابق جواب دے گا ـــــ حال ہی میں میرے ایک دوست امریکہ جا رہے تھے، انہوں نے اپنی بچی سے سوال کیا، بیٹی میں تمہارے لئے وہاں سے کیا لاؤں؟ اُس نے کہا، میرے لئے ایک اچھی سی پنسل لے کر آئیے یہ اُس کے ذہن کی اپنی سطح ہے۔ اس کے ذہن کی محدود دنیا میں ابھی اِس سے اعلیٰ تر کسی چیز کا تصور موجود نہیں ہے۔ اس نے وہی کچھ مانگا جو اُس کے محدود فہم کے مطابق اعلیٰ درجہ کی چیز تھی۔ پس جنت میں اپنے شعور اور آگہی کے اعتبار سے جو شخص بھی جو کچھ چاہے گا وہ اس کے لئے فراہم کر دیا جائے گا۔ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۔ یہ ہے اس جنت کی کیفیت ـ ـ ـــ

آگے چلیئے! ایک اور درجہ بندی بھی ہے۔ یہ سب کچھ 'نزل' کے درجے میں ہوگا۔ عربی زبان میں نُزل اس میزبانی کو کہتے ہیں جو مہمان کی آمد پر فوری طور پر کی جائے کوئی شخص جب کسی کے یہاں بطور مہمان آیا، سواری سے اترا ــــ نزیل کہتے ہیں مہمان کو جو نازل ہوا ہے ــــ تو اس کے نزول کے فوری وقت موسم کے اعتبار سے اس کی تواضع کے لیے جو ٹھنڈا گرم مشروب یا کوئی پھل اسے پیش کیا جاتا ہے تو یہ 'نزل' ہے۔ اس کے بعد پھر ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔ مہمان کی حیثیت اور اپنے معیار کے مطابق ضیافت کا بندوبست ہوتا ہے۔ تو ایک نزل ہے، ایک ضیافت ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ یہاں فرمایا یہ سب کچھ بھی نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ یہ بھی اس غفور رحیم کی طرف سے نزل کے درجے میں ہوگا باقی رہی ضیافت وہ اِس نزل سے علیحدہ ہے اور وہ تمہارے تصور سے خارج اور ماوراء ہے۔

جنت میں اللہ عزوجل نے اپنے بندوں کے لیے جو کچھ فراہم کیا ہے اُن تک اُن کا ذہن منتقل بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جنت کی نعمتوں کے بارے میں ایک حدیث میں بڑے پیارے الفاظ آئے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مالاعَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَمَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ۔

"جنت کی نعمتیں وہ ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا۔ نہ کسی کان نے سُنا، نہ کبھی کسی انسان کے دل پر اس کا کوئی خیال و تصور وارد ہوا۔"

یہ ہے اصل ضیافت۔ یہ ہے وہ چیز جس کے فہم سے اور جس کے ادراک سے ہم بالکل قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ جنت میں اپنے نیکوکار بندوں کے لیے فراہم کیا ہے اُن بندوں کے لیے جنہوں نے کہا کہ یقیناً اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر وہ اس پر جم گئے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ ایسے بندوں کے لئے جنت میں پہلی چیز مہیا کی گئی ہے: وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ ــــ دوسری چیز: وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ــــ پھر یہ دونوں چیزیں مل کر بھی نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ہے۔ یہ ابھی نُزُل ہے۔ یہ ابھی ابتدائی میزبانی ہے۔

یہاں آخر میں اللہ تعالیٰ کی نہایت پیاری دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ اِن دونوں کا اِس مضمون اور موضوع سے بڑا گہرا ربط و تعلق ہے جو اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ سے شروع ہوتا ہے۔ اِس دنیا میں بڑے سے بڑا انسان بھی خطا اور نسیان سے بری نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی بھول چوک ہو جاتی ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے:
اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِّنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْیَانِ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی صفاتِ مغفرت و رحمت کا ذکر فرمایا: نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ۔ وہ اللہ جس کو تم نے حقیقی معنوں میں اپنا رب مانا ہے اور اِس ماننے پر تم جمے رہو تو وہ اللہ تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمانے والا ہے۔ وہ تمہاری غلطیوں سے چشم پوشی فرمائے گا۔ تم کو اپنی رحمت کی چادر سے ڈھانپ لے گا۔ عربی زبان میں غفر کا لفظ کسی چیز کو ڈھانپ لینے کیلئے آتا ہے۔ مغفر کہتے ہیں خود کو جو لڑائی کے وقت سر پر پہن لیا جاتا ہے۔ وہ سر کو چھپا لیتا ہے اور تلوار کے وار سے سر کو بچاتا ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے Helmet کہا جاتا ہے۔ یہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی چادر تمہاری لغزشوں اور خطاؤں کو ڈھانپ لے گی اور تم کو نہایت اچھا بدلہ ملے گا۔ اَحْسَنَ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ تم نے جو اچھے اور عمدہ کام کئے ہیں ان کے اعتبار سے تمہیں بدلہ ملے گا اور تمہارے درجات کا تعین اس سے ہوگا اور اللہ کی طرف سے تمہاری میزبانی اُن کے پیشِ نظر کی جائے گی۔ رہا لغزشوں خطاؤں اور بھول چوک کا معاملہ تو اللہ غفور بھی ہے رحیم بھی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی جنت کی نعمت عطا فرمائے۔ اپنی شانِ غفاری اور رحیمی سے ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے اور ہمیں بھی جنت کی نعمتوں میں سے کچھ حصہ عطا فرمائے ——— اب اگر آج کی گفتگو سے متعلق کوئی وضاحت مطلوب ہو پیش فرمائیں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا مادی اور روحانی ترقی ایک ساتھ ممکن ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب : اِن دونوں میں کوئی تضاد ایسا موجود نہیں ہے کہ یہ دونوں بیک وقت ممکن نہ ہوں۔ اِس لئے کہ مادہ بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے اور روح بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے اِن دونوں میں کوئی تضاد یا تناقض نہیں ہے۔ اگرچہ وقتی طور پر دنیا میں ان کے تقاضے ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن کمالِ آدمیت اسی کا نام ہے کہ دنیا میں مادی اور روحانی دونوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور انسان دونوں میں ایک ساتھ آگے بڑھے۔ مادے کی تسخیر کا مضمون قرآن حکیم کے جو اہم اور بنیادی مضامین ہیں ان میں واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ ساری کائنات انسان کی تسخیر کے دائرہ میں ہے۔ جیسے سورۂ جاثیہ میں فرمایا : وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ یہاں سَخَّرَ کے معنی یہ بھی ہیں کہ کائنات کی ہر چیز انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے اور اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے تسخیر کے دائرے کے اندر ہے۔ اِس پہلو سے مادی ترقی کا روحانی ترقی سے کوئی تضاد نہیں ہے

سوال : ڈاکٹر صاحب : خیر و شر کی کشمکش میں انسانی شکل میں کیا فرشتوں کا نزول ممکن ہے ؟ اگر ہے تو کوئی مثال بیان فرمائیے ؟

جواب ، قومِ لوط کی تباہی کے لئے جن فرشتوں کو بھیجا گیا تھا وہ انسانی شکل میں تھے پھر جہاں وہ قومِ لوط کی تباہی کے لئے بھیجے گئے تھے وہاں وہ حضرت لوط علیہ السلام کی نصرت کے لئے بھی بھیجے گئے تھے۔ اُن کی حفاظت بھی ان فرشتوں کے فرائض میں شامل تھی پھر یہی فرشتے انسانی شکل میں قوم لوط کی طرف جانے سے قبل انسانی شکل ہی میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمان بھی رہے تھے۔ یہ پورا واقعہ قرآن میں بیان ہوا ہے پھر احادیث سے بھی ثابت ہے کہ فرشتے انسانی شکل میں نازل ہوتے ہیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام انسانی صورت میں متعدد بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے تھے۔ حدیثِ جبرئیل کو ام السنۃ کہا جاتا ہے۔ جیسے سورۂ فاتحہ کو ام القرآن، اس حدیث میں ایک نو وارد کا آں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر۔ اسلام، ایمان، احسان اور قیامت، کے بارے میں سوالات کا جو ذکر ہے تو اسی حدیث میں صراحت

(باقی صہ ۶۴ پر)

مولانا اشرف علی تھانویؒ

پر تنقید کا جائزہ

از قلم مولانا سید شمس الحسن تھانوی
خطیب مسجد خضراء کراچی

شادی بیاہ کے ضمن میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک اصلاحی تحریک پر مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی کی گرفت حد درجہ افسوسناک تھی کیونکہ حضرت مفتی صاحب نے محض مفروضات کی بنا پر ان پر نقد و جرح کی تھی۔ ان کی تنقید پر ایک تنقیدی مضمون راولپنڈی کے معروف ہفت روزہ "حرمت" میں شائع ہوا جس کے لکھنے والے "محتسب" کے قلم سے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ اور ان کے حلقہ سے متعلق علماء کرام کے سلسلہ میں ایک آدھ جملہ ایسا نکل گیا جسے شدت جذبات کا شاخسانہ کہنا چاہیے۔ وہ مضمون "میثاق" کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۵ء میں جوں کا توں نقل کر دیا گیا جس پر ہمارے محترم کرم فرما مولانا شمس الحسن تھانوی خطیب مسجد خضراء کراچی نے تأسف ہی نہیں غصہ کا بھی اظہار فرمایا ہے اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ اور ان کے حلقہ کے علماء کرام سے متعلق ایک تاریخی نوعیت کا دلچسپ مضمون ارسال کیا ہے، جسے ہم بصد شکریہ شائع کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ ہمارے دل میں حضرات علماء کرام سے متعلق بڑی عقیدت ہے، ہم انہیں دین کا خادم سمجھتے اور ان کا احترام کرتے ہیں اور ان سے یہ خواہش و توقع رکھتے ہیں کہ وہ جذبہ نصح و خیر خواہی کے تحت ہماری غلطیوں کے سلسلہ میں ہمیں توجہ دلائیں جس پر ہم ان کے شکر گزار ہوں گے ــــــ لیکن حضرت مفتی جمیل احمد صاحب کی طرح مفروضات پر کوئی عمارت کھڑی کرنا کسی طرح مناسب نہیں اور یہ بات علم و تقویٰ کے معیار سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔

مولانا شمس الحسن اگر اپنے اس دلچسپ اور معلومات افزا مضمون میں متعلقہ مسئلہ "شادی بیاہ کی اصلاحی تحریک" سے متعلق بھی چند سطور سپرد قلم فرما دیتے تو خوب ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا ــــ اس کے باوجود یہ مضمون لائق مطالعہ ہے۔ اس لیے ہمارا دیگر اس کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے۔

وضاحت: یہ اداریہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے گذشتہ ماہ کے "تذکرہ و تبصرہ" کی تحریر سے قبل لکھا گیا تھا۔ (ادارہ)

تخریبِ محبت آساں ہے تعمیرِ محبت مشکل ہے
تم آگ لگانا سیکھ گئے تم آگ بجھانا کیا جانو

میثاق میں ستمبر ۸۵ء کے شمارہ میں ایک تنقیدی مضمون حسّاس کے قلم سے نکلا ہے جو صفحہ ۹۵ سے صفحہ ۱۰۷ تک تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مضمون میں جناب مفتی جمیل احمد صاحب کے ایک تنقیدی مضمون پر تنقید کی گئی ہے۔ جہاں تک نفسِ مضمون یا نفسِ تنقید کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے لیکن قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ اس مضمون میں انہوں نے ضمناً غیر ضروری طور پر حضرت تھانوی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے چھوٹا منہ بڑی بات۔ یہی وہ بات ہے جس کا نوٹس ہم اس تحریر میں لے رہے ہیں۔ وہ اقتباس یہ ہے:

"دیوبندی تعلیمی اسکول میں مولانا اشرف علی ایک ایسے بزرگ تھے جو تحریکاتِ ملّیہ سے نہ صرف الگ تھلگ رہے اور محتاط روش اختیار کی بلکہ انہوں نے بسا اوقات تلخی کا مظاہرہ کیا اور اتفاق یہ ہے کہ ان کے متعلقین کا قریب قریب ہمیشہ یہ رویّہ رہا۔ ان کے خدام میں مولانا خیر محمد جالندھری البتہ ایسے بزرگ تھے جنہوں نے جالندھر میں مدرسہ خیر المدارس کی داغ بیل ڈالی ان کے رویہ میں کمال درجہ توازن و اعتدال تھا۔ وہ واقعتہً ایسے بزرگ تھے جنہوں نے ہمیشہ جوڑنے کی فکر کی حتّٰی کہ اسی فکر میں وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔"

ناظرین آپ نے دیکھا کہ اس اقتباس میں نہ صرف حضرت مولانا تھانوی بلکہ ان کی پوری جماعت اور حلقۂ احباب حسّاس کی تنقید کا ہدف بنا ہوا نظر آ رہا ہے ؎

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

حیرت ہے حسّاس کا تنقیدی مضمون حضرت تھانوی اور ان کی جماعت سے تعرض کئے بغیر بھی پورا ہو رہا تھا پھر نہ معلوم مفتی صاحب پر تنقید کے ضمن میں پوری جماعت کو کوسنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔

ہم حسّاس سے پوچھتے ہیں کہ اگر حسّاس کو کسی مسئلہ میں ایک رائے رکھنے کا حق ہے اور وہ اسے تلخی کا مظاہرہ کرنا نہیں سمجھتے تو حضرت مولانا کے اختلافِ رائے کو وہ تلخی کا مظاہرہ کرنے سے تعبیر کرنے میں کیونکر حق بجانب ہیں۔ کیا وہ تلخی کی آڑ میں حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کے بنیادی حق کو سلب کرنا چاہتے ہیں۔

دراصل حسّاس صاحب نے اختلافِ رائے اور تلخی کا مظاہرہ کرنے کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔

اختلافِ رائے اگر حدودِ شریعت کے اندر ہو اور نیک نیتی سے ہو تو وہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن اور بعض اوقات واجب ہے۔ اسی واسطے فرمایا گیا: اختلاف امتی رحمۃ

اختلافِ رائے سے علم کی راہیں کھلتی ہیں عمل میں وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ فکر و نظر کی تربیت ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہی اختلافِ رائے خلافِ شریعت ہو یا ذاتی مفاد اور خود غرضی اور تعلّی اور تفاخر وغیرہ کی بنا پر ہو تو اختلافِ رائے مذموم ہے

اور اسی کے بارے میں کہا جائے گا کہ فلاں شخص نے تلخی کا مظاہرہ کیا۔ فقہی افکار و آراء میں فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک کلیتہً منع ہے۔ پھر جس دن امام صاحب کا انتقال ہوا اسی دن امام شافعی کا یوم ولادت ہے اور آگے چل کر وہ مجتہد ہوئے اور انہوں نے فاتحہ خلف الامام کے وجوب کا فتویٰ دیا۔

تو کیا اس کو اور اس جیسے دوسرے فقہی اختلافات کو کوئی شخص یہ کہے گا کہ امام شافعی نے بسا اوقات تلخی کا مظاہرہ کیا؟

تلخی کا مظاہرہ کیا یا اختلاف امتی رحمۃ کا مظاہرہ کیا۔

رہا یہ کہ حضرت تھانویؒ کا اختلاف رائے کس زمرے میں آتا ہے تو اس کے فیصلہ کے لئے حسّاس صاحب کی رائے کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے لئے ان اعاظم روزگار کی طرف رجوع کیا جائے گا جو حضرت تھانویؒ کے معاصرین ہیں جن کے قلوب و اذہان کو اللہ تعالیٰ نے مخصوص نور بصیرت سے نوازا تھا جو صحیح معنی میں "اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ" کے مصداق تھے۔

حضرتِ تھانوی کا اختلاف رائے کہیں قبرستان میں یا کسی سنسان جنگل میں نہیں تھا بلکہ وہ تمام واقعات علی رؤس الاشہاد ان اکابر رجال کی موجودگی میں ہوئے تھے کہ ان جیسے اقران و امثال چشم فلک نے کم دیکھے ہوں گے۔ پھر اس طرح کی تنقید ان حضرات کے ریکارڈ میں کہیں کیوں نہیں ملتی۔

کیا وہ حضرات حق کے معاملہ میں کسی رو رعایت کے قائل تھے۔ کیا دین کے معاملہ میں انہوں نے کبھی مداہنت برتی تھی۔ کیا وہ کسی سے ڈرنے والے تھے۔ جن اعاظم رجال نے انگریز کی جابر و قاہر سلطنت کو پرِ کاہ کے برابر نہ سمجھا اور بالآخر اس کے پرخچے اڑا کر رکھ دئے۔ کیا ان کو دنیا کی کوئی ترغیبی یا ترہیبی طاقت اظہارِ حق سے روک سکتی تھی؟

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم　　　سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

حضرت تھانوی کے طرز عمل کا جو تجزیہ حسّاس صاحب آج نصف صدی گزر جانے کے بعد کر رہے ہیں یہ تجزیہ سو وقت بھی کوئی نہ کر سکا۔ جبکہ دیوبند میں آفتاب علم نصف النہار پہ تھا۔ وہ روشن گہر حضرت شیخ الہند جن کے نورِ بصیرت کے آگے آفتاب کی روشنی ماند ہے۔ وہ شیخ الاسلام حضرت حسین احمد جن کے آگے علم پانی بھرتا ہے۔ وہ جبالِ علم حضرت خلیل احمد شارح ابو داؤد اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد شارح بخاری و مسلم جن پر دانائی و زیرکی لوناز تھا اور فقیہہ عصر حضرت مفتی کفایت اللہ مفتی اعظم ہند اور دیگر اکابر و اعاظم رجال جو اپنی خداداد مومنانہ فراست سے ایک نظر میں اسرار درون پردہ کو بھانپ جانے والے تھے۔

اک نظر میں طائرِ گم گشتہ کو　　　بھانپ لیں ہم ہیئت پرواز سے

لیکن حضرت تھانوی کی سیاسی زندگی کی تو تشریح حسّاس صاحب نے کی وہ نہ شارح ابو داؤد کر سکے نہ شارح بخاری و مسلم۔

کیا حساس صاحب کے احساسات ان حضرات کے تقویٰ و ادراکات سے بھی زیادہ عمیق اور دور رس ہیں۔ کہ سارا نور فراست حساس ہی کی چشم بصیرت میں سما گیا ہے۔

افسوس ہے حساس صاحب کے احساسات بزعم خویش جتنا حضرت تھانویؒ کا مقام معلوم کرنے میں تیز نکلے اتنی تہ ہاں کی حس خود اپنا مقام معلوم کرنے میں کند رہی۔ ہر شخص کا یہ منصب نہیں کہ ہر شخص پر تنقید کرے۔ ایاز قدر خود بشناز

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی!

اصاغر کی عقل و فہم کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اپنی رائے پر اعتماد کرنے سے پہلے اکابر کی رائے پر اعتماد کرنا سیکھیں۔ عقلاء نے کہا ہے الصب اخذ القلب۔ وقال تعالیٰ واتبع سبیل من اناب الی

جس شخص کو امت حکیم الامت کے لقب سے یاد کرتی ہو جس کو ملت اسلامیہ نے مجدد الملۃ کا خطاب دیا ہو اس پر حضرت حساس کے یہ ریمارکس فیاللعجب!

کاش حساس صاحب نے حضرت تھانوی کے بارے میں قطب وقت حضرت مولانا حضرت خیر محمد صاحب ہی کی رائے کو مقدم سمجھا ہوتا جن کا وہ بڑا احترام کرتے ہیں اور بجا طور پر ان کی مدح میں رطب اللسان ہیں

بظاہر یہ معمولی سی بات نظر آتی ہے لیکن اس کے عواقب اور خواص پر اگر غور کیا جائے تو اس کے نتائج دور رس ہو سکتے ہیں۔

کاش حساس صاحب یہ سوچتے کہ یہ ریمارکس اگر مخالف معاند کے ہاتھ لگ گئے تو وہ ان کا کتنا غلط استعمال کریگا۔

؎ پھرتا ہے تیرے خط کو لئے یوں کہ اگر کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

ان معمولی معمولی باتوں سے اگر صرف نظر کیا جائے تو یہی چھوٹی چھوٹی چنگاریاں آگے چل کر شعلۂ جوالہ بن جاتی ہیں۔

یہ بات محتاج دلیل نہیں کہ حضرت تھانوی اور علمائے دیوبند دو متحارب گروپ نہیں ہیں بلکہ متجانس عناصر اور ایک جان دو قالب ہیں۔ کسی ایک کے متعلق بدظنی کا مواد فراہم کرنا پوری جماعت سے بدظنی پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ آنے والی نسلوں کا اگر علمائے دیوبند کے اوپر سے اعتماد اٹھ گیا تو اس کے بعد سوائے بدعات قبیحہ اور رسومات شرکیہ کے اور باقی کیا رہ جاتا ہے۔

اس قسم کی غیر واقعی باتیں جب تاریخ میں ثبت ہو جاتی ہیں تو تاریخ مسخ ہو جاتی ہے اور آنے والی نسلوں کیلئے وہ ایک مسئلہ بن جاتا ہے اور صحیح فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ اصل صورت حال کیا تھی۔ مثلاً حساس صاحب کی تعبیر و تشریح سے معاندین یہ پروپیگنڈہ کر سکتے ہیں کہ تعمیر پاکستان میں علمائے دیوبند کا کردار منفی رہا ہے چنانچہ حضرت تھانوی جو علمائے دیوبند میں ایک سربرآوردہ شخص ہیں وہ تو تحریکات ملیہ سے الگ تھلگ رہتے تھے اور ان کو اگر اصلی روپ میں دیکھنا ہو تو حساس کے آئینے میں دیکھو کہ تمیز کسی غیر کا نہیں ان ہی کا خود ساختہ ہے۔

لیکن بعض آئینے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں صورت الٹی نظر آتی ہے۔ بہر حال افسوس سے

؎ آنچہ تو با خویشتن کردی کس نہ کرد

اسی طرح کی غیر محتاط رائے زنی جب تاریخ اسلام میں درج ہوگئی تو وہ تاریخ کا ایک جزو بن گئی اور اس سے غلط قسم کی نئی نئی فرقہ بندیوں نے جنم لیا اور اسی نوع کے بے سروپا پارکس کے سہارے آج یزید "حضرت یزید" اور "رحمۃ اللہ علیہ" بنا ہوا ہے۔

لطیفہ

ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ مثنوی میں جو قصہ پیر چنگی کا بیان ہوا ہے اس کی توجیہہ یہ ہے کہ جہاں تک اس کا گانے بجانے کا شغل تھا وہ تو تھا غیر مشروع لیکن اس کے ساتھ ہی فضائل اخلاق میں سے وہ اخلاص کی فضیلت سے بھی بہرہ مند تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اخلاص کے توسل سے اس کے اس نامشروع عمل کو معاف کر دیا۔

اس پر حضرت مولانا نیر محمد صاحب نے سوال کیا کہ حضرت اس طرح تو پھر ساری بدعات جائز ہو جاتی ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا کہ یہ فتویٰ بیان نہیں ہو رہا ہے بلکہ حق تعالیٰ کا برتاؤ جو اس کے ساتھ ہوا اس کا بیان ہو رہا ہے۔ یہ اسرار ہیں ضبط تحریر میں نہ لائے جائیں کہیں اشرار تک نہ پہنچ جائیں۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو "اسرار" حضرت تھانوی کے متعلق حسّاس صاحب پر منکشف ہوئے ان کا اسرار ہی مصلحت تھا کہ وہ اسرار کہیں اشرار تک نہ پہنچ جائیں اور وہ اس سے غلط فائدہ اٹھائیں اور پھر اسی پر اصرار کریں۔

پھر اگر یہ انکشاف کچھ حقیقت ہوتا تو ہمیں کچھ اعتراض نہ ہوتا ہم سمجھتے کہ حسّاس نے ایک حقیقت کو آشکارا کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

رہا یہ سوال کہ میثاق کے ابھی حال کے کسی شمارہ میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا انتقال سے کچھ پہلے جو انٹرویو آیا ہے اس میں انہوں نے کہا ہے کہ مولانا تھانوی بھی بعض علماء کے نزدیک مشتبہ تھے۔

تو اگر آپ ان کے اس مقولہ کو سیاق و سباق میں دیکھیں تو ان کے کہنے کا مطلب صاف ہے کہ جس طرح بعض لوگوں کا مولانا تھانوی کی شخصیت کو مشتبہ قرار دینا کوئی وزن نہیں رکھتا اسی طرح یہ بات کہ ڈاکٹر اسرار احمد کی شخصیت مشتبہ ہے" ناقابلِ التفات ہے۔

حسّاس صاحب نے ایک بات اور فرمائی کہ مولانا تھانوی تحریکاتِ ملیہ سے الگ تھلگ رہے۔

؎ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

اگر ہم ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک نوّے سالہ انگریز کے دورِ حکومت کا جائزہ لیں تو اس پوری نوّے سالہ

تاریخ کو دو لفظوں میں سمیٹا جا سکتا ہے (۱) آزادئ وطن (۲) تعمیر پاکستان ـــ اور یہ دونوں لفظ دو
جمعیتوں کا ہدف ہیں (۱) جمعیۃ علمائے ہند (۲) جمعیۃ علمائے اسلام جہاں تک آزادی وطن کا تعلق ہے یہ
کام سرانجام دیا جمعیت علمائے ہند نے بشمول کانگریس ۔ چنانچہ دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع پر اندرا نے بھی
اعتراف کیا کہ تحریک آزادی میں علمائے دیوبند کا بڑا حصہ ہے ۔

والفضل ما شہدت بہ الاعداء

اور جہاں تک تعمیر پاکستان کا تعلق ہے یہ کام سرانجام دیا جمعیت علمائے اسلام نے بشمول مسلم لیگ ـــ
ہیں دونوں طرف علماء دیوبند ۔ فرق یہ ہے کہ جمعیت علماء ہند گروپ ہے حضرت شیخ الہند کا اور جمعیت علمائے
اسلام یہ گویا تھانوی گروپ ہے ۔

اور جہاں تک مولانا ابو الکلام آزاد کا تعلق ہے تو ان کا شمار بھی تحریک آزادی میں علماء کے اول الذکر
گروپ کے ساتھ ہو گا ـ

ہم مشرب و ہم مسلک و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

اگر انگریز ملک سے نہ نکلتا تو پاکستان بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ انگریز نکلا تو پاکستان کا
تصور بھی عملی صورت میں نمودار ہوا ۔ تو گویا انگریز کا نکلنا پاکستان کے لئے بمنزلہ بنیاد کے ہے ۔ اس
کے معنی یہ ہوئے کہ پاکستان کی بنیاد تو جمعیت علمائے ہند کے ہاتھوں فراہم ہوئی اور اس بنیاد پر جو عمارت
بنی یعنی پاکستان تو اس کا معمار جمعیت علماء اسلام ہے ۔

اگر آپ کہیں کہ پاکستان تو قائد اعظم نے بنایا تو مجھے کب اس سے انکار ہے ۔ مگر قائد اعظم اس کام
کو پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا سکتے تھے اگر جمعیت علماء اسلام اس میں ان کی ممد و معاون نہ بنتی ۔ اور یہ ایک ایسی
واضح حقیقت ہے کہ اس کا انکار صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو انتہا درجہ کا ضدی اور ہٹ دھرم ہو ۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مسلم لیگ نوابوں ، جاگیرداروں اور ٹوڈیوں کی جماعت تھی اور یہی وجہ ہے کہ عوام
ں جماعت کو نہایت شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ قائد اعظم کو صرف علی گڑھ طبقہ کی حمایت حاصل تھی عوام
رجحان جمعیت علمائے ہند کی طرف تھا تا آنکہ حضرت تھانوی کا فتویٰ شائع ہوا جس میں حضرت نے تحریر کیا
ں کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کو دینا مہلک سمجھتا ہوں اور متعدد ہدایات کے ساتھ مسلمانوں کو مسلم لیگ
ں شمولیت کا مشورہ دیا ۔

ناظرین آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس فتویٰ سے ملک کے کروڑوں افراد کی رائے بدل گئی اور حضرت مولانا
بیر احمد جو ہنوز در طۂ غور و فکر میں تھے ان کی رائے بھی یقین محکم میں بدل گئی
(شاید حساس صاحب اسی کو کہتے ہوں کہ بسا اوقات تلخی کا مظاہرہ کیا)

معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب حضرت تھانوی ؒ سے بیعت تھے لیکن تحریک خلافت کے زمانہ میں اس میں رخنہ پڑ گیا تھا لیکن بعد میں مذکورہ فتوے کے شائع ہونے سے قبل ہی سے تعلقات استوار ہو گئے تھے اور پہلے کی طرح عقیدت اور اخلاص پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب طویل سیاسی خموشی کے بعد آندھی اور طوفان بن کر اٹھے اور پاکستان کی حمایت میں ان کی جادو بھری تقریروں نے ملک میں ہلچل مچادی۔ صوبہ سرحد میں دیوبند کے بڑے بڑے کانگریس کے حامی علماء گوشہ نشین ہو گئے لوگوں نے پوچھا کہ حضرت کیوں خاموشی اختیار کرلی۔ جواب دیا کہ اب استاد میدان میں نکل آیا ہے۔

لاہور کے اسلامیہ کالج کے میدان میں پاکستان کی حمایت میں حضرت مولانا شبیر احمد کی تقریر ہو رہی ہے رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ خضر حیات کی حکومت کا دور ہے میدان سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے — تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ خطرات سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ دوران تقریر خطرات کو چیلنج کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا اگر مجھ کو گدھے پر الٹا سوار کیا جائے اور میرا منہ کالا کیا جائے اور اسی حالت میں شہر میں گشت کرایا جائے اور لڑکوں کی فوج پیچھے پیچھے تالیاں بجاتی چلے تو میں اس کو اللہ کے راستہ میں ایک معمولی قربانی تصور کروں گا۔

ایسا ہوا جیسے مجمع میں آگ لگ گئی ہو، آنکھیں اشکبار تھیں اور دل بے قابو ہو رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی مولانا کی تقریر اتنی مبرہن اور مدلل تھی کہ حریف کے لئے جواب کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ بعد میں بڑے بڑے علوم جدیدہ کے ماہرین کو یہ کہتے سنا گیا کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ علماء میں بھی ایسے بالغ نظر لوگ موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مولانا شبیر احمد صاحب کی سیاست تحریک آزادی میں حضرت شیخ الہند کی سیاست کے تابع رہی تو تعمیر پاکستان کے وقت ان کی سیاست حضرت تھانوی کی سیاست کے تابع تھی۔ سرحد کے ریفرنڈم میں کامیابی آپ ہی کی مساعی جمیلہ کی مرہون منت ہے۔ جسطرح سلہٹ ریفرنڈم کی کامیابی مولانا ظفر احمد عثمانی کی جدوجہد اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اگر قائد اعظم کو بروقت علماء کی یہ تائید و حمایت حاصل نہ ہوئی ہوتی تو میں پوچھتا ہوں مسلم لیگ کبھی کامیاب ہو سکتی تھی اور پاکستان دنیا کے نقشہ پر کبھی ابھر سکتا تھا؟

حضرت تھانوی کے حکم سے زعمائے لیگ کا ایک جلسہ خاص تھانہ بھون میں کرایا گیا جس کا تمام انتظام حضرت نے جناب مولانا شبیر احمد صاحب کے سپرد کر رکھا تھا اس میں گو حضرت نے خود شرکت نہیں کی مگر وہ جلسہ حضرت کے حکم اور ایماء کے بموجب ہوا اور اس میں حضرت کی تحریر کردہ ہدایات کو پڑھکر سنایا گیا۔

اصل میں لیگ کی تائید و حمایت اور اصلاح کا کام حضرت نے ایک جماعت کے سپرد کر رکھا تھا جن میں سے چند حضرات کے نام یہ ہیں مولانا ظفر احمد عثمانی۔ مولانا شبیر احمد صاحب۔ مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی وغیرہ۔

متعدد بار حضرت تھانوی کی مراسلت اور مکاتبت ہوئی ہے قائد اعظم مرحوم سے انہی حضرات کے توسط سے۔

اور اسی کی بدولت قائد اعظم اس درجہ حضرت تھانوی سے متاثر ہو گئے تھے کہ جب ایک موقع پر کسی وفد نے قائد اعظم سے ملاقات کی اور علماء کا ذکر آیا تو قائد اعظم نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے اس وقت ملک میں سب سے بڑا عالم کون ہے! اور یہ کہہ کر تھانوی صاحب میں سے ایک خط نکال کر ان کو دکھایا۔ اور یہ خط تھا حضرت تھانوی کا۔

دہلی میں جب مسلم لیگ نے اجلاس عام منعقد کیا تو اس میں حضرت تھانوی کو بھی دعوت شرکت دی گئی۔ لیکن حضرت تھانوی اس سے کافی عرصہ پہلے سے بوجہ آلام و آزار جسمانی سفر سے معذوری کا اعلان کر چکے تھے یہاں تک کہ تبلیغی دورے بھی ترک کر دیئے تھے۔ اس لئے خود تو شرکت نہیں کر سکے لیکن اس قسم کے اجتماعات میں آپ برابر اپنی ہدایات اور تعلیمات کے ساتھ سفارتیں بھیجتے رہے۔

مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ سیشن میں مولانا ظفر احمد تھانوی نے حضرت تھانوی کا تاریخی پیغام پڑھ کر سنایا۔ لیکن حساس صاحب کا تجزیہ یہ ہے کہ تحریکات ملیہ سے الگ تھلگ رہے۔

منصفی دنیا سے ساری اٹھ گئی — اے بتو! ایمانداری اٹھ گئی

ملک کی کون سی دینی سیاسی تحریک ایسی ہے جس میں حضرت تھانوی سیاسی بے بصیرتی کی بنا پر الگ تھلگ رہے ہوں۔ اس کی نشاندہی تو کی جائے۔ خود حضرت فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اس کے نتائج کا تصور اگر کھانے سے پہلے آجاتا ہے تو بھوک اڑ جاتی ہے اور سونے سے پہلے آجاتا ہے تو نیند اڑ جاتی ہے۔"

اے فاختہ پرواز کناں بر سر سروے
درد دل مرغان گرفتار چہ دانی!

ہم حساس صاحب سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کون سی تحریکات ملیہ ہیں جن میں حضرت تھانوی نے بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ نہ لیا۔

شارداایکٹ آیا تو حضرت تھانوی نے شاردا ایکٹ کے نام سے اس کی تردید شائع کی۔ ملک میں پردہ کا مسئلہ اٹھا تو حضرت تھانوی نے القول الصواب فی مسئلۃ الحجاب لکھ کر ملک و قوم کی شرعی رہنمائی کا فرض ادا کیا اور صرف حضرت تھانوی ہی نہیں بلکہ حضرت کی جماعت نے بھی ہر تحریک ملی کے موقع پر کارہائے نمایاں انجام دیئے خود اسی پردہ کے مسئلہ پر حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوریؒ نے نمکدان ظرافت کے نام سے تقریباً پونے چار سو اشعار ایک ہی قافیہ اور ردیف میں کہہ کر حریف کا ناطقہ تنگ کر دیا۔ انہی خواجہ صاحب نے مسلم لیگ کی حمایت میں مسلم خوابیدہ اٹھ گرم تماشا تو بھی ہو" مسدس کا پورا کتابچہ منظوم کیا۔ اسی طرح اپنے منظوم کلام کے ذریعہ سیدھے سادے سادہ لوح مسلمانوں کو متعصب ہندؤوں کے تعصب سے آگاہ کیا۔

مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم نے بائیس دستوری نکات پر ہر مکتب فکر کے اہم علماء کو جمع کر کے

ہمیشہ کے لئے ان لوگوں کا منہ بند کردیا جو یہ کہتے تھے کہ علماء کسی مسئلہ پر متفق ہو ہی نہیں سکتے۔

ایوب کے وقت میں جب چاند کے مسئلہ یعنی مسئلہ شرعی کو مسخ کرنے کا حکومت نے فیصلہ کیا تھا تو اس وقت جو سب سے آگے سینہ سپر تھا وہ کس جماعت کا آدمی تھا۔

تعجب ہے حساس صاحب نے اس قسم کے تمام واقعات و حقائق سے کیوں اغماض برتا۔

شاید حساس صاحب کہیں کہ حضرت تھانویؒ تحریک خلافت کے زمانہ میں الگ تھلگ رہے۔ تو اگر واقعی حساس صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے تو ہم جواب میں عرض کریں گے کہ یہاں بھی حساس صاحب کے قلم کو وہی لغزش ہوئی ہے جس کا ذکر ابھی کچھ پہلے ہو چکا ہے۔

کسی تحریک سے الگ تھلگ رہنا دو وجہ سے ہو سکتا ہے۔ اگر وہ الگ تھلگ رہنا عافیت کوشی اور راحت طلبی یا سیاسی بے بصیرتی کی بنا پر ہو تو واقعی مذموم ہے لیکن اگر مجتہد بربنائے اجتہاد اور غور و فکر الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ الگ تھلگ رہنا مذموم نہیں ہے بلکہ یہ اس کی اجتہادی رائے ہے اور اس کو مقام مذمت میں ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے حساس صاحب نے اس علمی فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔

یہ بالکل علیحدہ بات ہے کہ کس کی رائے صحیح تھی اور کس کی رائے غلط تھی اور نہ یہ چیز اس وقت زیر بحث ہے لیکن اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ اگر کسی کی رائے غلط بھی تھی تو اس کے لئے بھی عند اللہ ایک اجر ہے۔

حدیث ترمذی ہے: المجتهد قد يخطی وقد يصيب فان اصاب فله اجران وان اخطأ فله اجر واحد (او كما قال)

پھر جب اس کے لئے ایک اجر کا وعدہ ہے تو اس کو مقام مذمت میں ذکر کرنے کے کیا معنی!

تحریک خلافت کے زمانہ میں حضرت مفتی کفایت اللہ اور حضرت تھانوی کا ایک مکالمہ نقل کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت تھانوی کی تحریک خلافت سے علیحدگی غفلت اور بغیر شعور کے طور پر نہ تھی بلکہ وہ حضرت کی اجتہادی رائے تھی۔

مفتی صاحب: حضرت اگر آپ اٹھ کھڑے ہوں تو سب اٹھ کھڑے ہوں

حضرت تھانوی: مفتی صاحب آپ نے یہ بات سوچ کر کہی ہے یا بغیر سوچے کہدی؟

مفتی صاحب: حضرت سوچ کر کہی ہے۔

حضرت تھانوی: اچھا ایک بار اور سوچ لیجئے!

تھوڑی دیر خاموشی رہی اس کے بعد حضرت نے فرمایا:

حضرت تھانوی: مفتی صاحب آپ نے سوچا۔ اب آپ کی کیا رائے ہے!

مفتی صاحب: حضرت میری وہی رائے ہے۔

حضرت تھانوی: مفتی صاحب آپ ایک بار اور غور کرلیں

مفتی صاحب نے تیسری بار بھی وہی بات دہرائی کہ حضرت اگر آپ اٹھ کھڑے ہوں تو سب اٹھ کھڑے ہوں۔
حضرت تھانوی نے فرمایا کہ مفتی صاحب آپ یہ بتائیے کہ اگر واقعی مجھے عوام میں اتنا قبول عام حاصل ہے کہ اگر میں اٹھ کھڑا ہوں تو سب اٹھ کھڑے ہوں تو یہ بتائیے کہ اب جو میں بیٹھا ہوں تو سب کیوں نہیں بیٹھ جاتے۔
اس کے بعد حضرت نے فرمایا: مفتی صاحب بات یہ ہے کہ عوام علماء کا اتباع کرنا نہیں چاہتے بلکہ علماء سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں۔ اگر میں بھی ادھر ہی کو چلوں جدھر کو سب چل رہے ہیں تو میں مقبول و ممدوح ہوں ورنہ مطرود و مطعون۔
اس مکالمہ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ حضرت کی علیحدگی سیاسی بے بصیرتی کی بنا پر نہیں تھی بلکہ وہ اجتہادی فیصلہ تھا۔
حسّاس صاحب نے ایک بات یہ فرمائی کہ حضرت تھانوی نے محتاط روش اختیار کی'
اگر اس سے ان کا اشارہ اس طرف ہے کہ یہ جیل نہیں گئے تو جیل تو قائد اعظم اور علامہ اقبال بھی نہیں گئے اور اگر اس سے مراد ان کی یہ ہے کہ عافیت کوشی ملحوظ نظر تھا تو شاید حسّاس صاحب کو معلوم نہیں کہ تحریک خلافت کے زمانے میں صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف حضرت شیخ الہند اور ان کے چند رفقاء انگریز کے جبر و تشدد اور مظالم کا شکار تھے اور دوسری طرف تمام عوام حضرت تھانوی کا دشمن جان بنا ہوا تھا۔ تو عافیت تو نہ ادھر تھی نہ ادھر۔ یہ بالکل ممکن تھا کہ اس زمانہ میں حضرت تھانوی بھی وہی طرز عمل اختیار کر لیتے جو اس زمانہ میں عام طور سے علماء کا تھا کہ وہ نہ انگریز کے جبر و تشدد کا نشانہ بنے اور نہ عوام کے معتوب ہوئے۔
اور یقیناً یہ رخصت کا مقام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز نے تمام علماء پر ہاتھ نہیں ڈالا اس کا ہدف وہی تھا جو مقام عزیمت پر قائم تھے۔ ایک طرف حضرت شیخ الہند اور ان کے چند رفقاء جیسا کہ کربلا میں حضرت حسینؓ اور اہل بیت رسولؐ اور چند رفقاء سے

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

اور دوسری طرف حضرت تھانوی جو عوام کی مخالفت کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ اطراف و اکناف ملک سے گمنام تہدید آمیز خطوط موصول ہو رہے تھے اور قتل کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔
چنانچہ عوام سے جو اندیشے اس وقت لاحق تھے اس کے پیش نظر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری نے ازراہ غایت شفقت و عنایت حضرت تھانوی کو مشورہ دیا کہ اختلاف رائے اپنی جگہ ہے لیکن خوف و خطر میں شرعاً گنجائش ہے کہ اختلاف رائے سے مجتنب رہیں۔
حضرت تھانوی نے جواب میں عرض کیا کہ اگر خوف خلائق ہی کو خاطر میں لایا جائے تو حکومت سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے بمقابلہ عوام کے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس درجہ عوام سے خطرات لاحق

تھے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ جیسی شخصیت کو مشورہ دینا پڑا۔ اگر عافیت کوشی مطلوب و مقصود ہوتی تو اس سے بہتر موقع مشورہ کو قبول کرنے کا اور کون سا ہو سکتا تھا۔

بہر حال یہ بات بالکل واضح ہے کہ خلافت کمیٹی کے زمانہ میں حضرت تھانوی کا الگ تھلگ رہنا نہ تو سیاسی بے بصیرتی کی بنا پر تھا نہ عافیت کوشی مطمح نظر تھا۔

حساس صاحب نے ایک اور بات مزے کی فرمائی۔ فرماتے ہیں کہ حضرت کے خدام میں ایک بزرگ مولانا خیر محمد ایسے تھے جنہوں نے ہمیشہ جوڑنے کی فکر کی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ تھانوی جماعت میں مولانا خیر محمد صاحبؒ کے علاوہ جتنے ہیں سب کے سب بجائے جوڑنے کے توڑنے میں لگے رہے۔ انا للہ۔

ذیل میں ہم چند واقعات ذکر کرتے ہیں:

(۱) ۱۳۴۳ھ کے لگ بھگ ایک بار حضرت مولانا حسین احمدؒ تھانہ بھون تشریف لائے۔ عصر کے وقت جب حضرت تھانوی نماز عصر کے لئے اٹھے تو دیکھا حضرت مولانا حسین احمدؒ وضو کر رہے ہیں بس وہیں رک گئے اور انتظار کرتے رہے۔ جب حضرت مولانا وضو کر چکے تب حضرت مصلے کی طرف بڑھے۔

یہ واقعہ کم از کم میرے لئے اس لئے اہم ہے کہ میں نے اپنے دس پندرہ سالہ زمانۂ قیام تھانہ بھون میں اس طرح کسی کا انتظار کرتے حضرت کو کبھی نہیں دیکھا۔

اس سلسلہ میں دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو ایسی کیا پڑی تھی کہ اپنی بے پناہ تدریسی مشغولیتوں اور بلاخیز سیاسی مصروفیتوں کے باوجود تھانہ بھون جیسے دور افتادہ قصبہ کے لئے زحمت سفر اٹھا کر پہنچے اور پھر حضرت کا ان کے ساتھ یہ خصوصی احترام ؎

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

(۲) دوسرا واقعہ سنئے۔ حضرت عبدالماجد دریا آبادی ہمیشہ حضرت تھانوی سے بیعت ہونے کی درخواست کرتے رہے اور حضرت کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا کہ آپ کو مولانا حسین احمد صاحب سے مناسبت ہے۔ آپ وہاں بیعت ہوں۔

حد ہو گئی کہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے خود حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ سے سفارش کرائی اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا کہ میں ان کی تربیت کی اہلیت نہیں رکھتا۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ تو محض تواضع ہے حقیقت یہ ہے کہ ان کی تربیت و تکمیل کے لئے میں بھی اور آپ بھی دونوں ہی کافی ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان کو آپ سے مناسبت ہے اس لئے آپ سے ہی بیعت ہونا ان کے حق میں مفید ہے۔

(۳) حضرت کے ملفوظات میں ہے کہ مولانا حسین احمد نہایت شریف طبیعت کے انسان ہیں۔ باوجود سیاسی اختلاف کے کبھی ان کی طرف سے کوئی دل آزاری کا کلمہ سننے میں نہیں آیا

(۴) لاؤڈ اسپیکر کے مسئلہ میں حضرت تھانوی نے حضرت مولانا حسین احمدؒ کا نام لے کر ان کے فتوٰی سے اتفاق کیا۔ ملاحظہ ہو امداد الفتاوٰی۔

(۵) ڈاڑھی کے مسئلہ پر حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا جو مضمون "فلسفۂ ڈاڑھی" کے نام سے ہے اس کو خاص طور سے حضرت تھانوی نے امداد الفتاوٰی میں نقل کرایا۔

(۶) ایک مرتبہ سہارنپور میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تقریر کر رہے تھے۔ دوران تقریر تحدیث بالنعمۃ کے طور پر ذکر کر رہے تھے کہ میرے ساتھ بزرگوں نے ہمیشہ شفقت کا معاملہ کیا۔ اسی میں ایک جملہ یہ بھی کہا کہ

"تھانہ بھون گیا تو تھانوی نے سینے سے لگالیا"

حساس صاحب بتائیں کہ یہ سب باتیں جوڑنے کی ہیں یا توڑنے کی۔

حضرت نے جب مفقود الخبر کے مسئلہ میں مالکی مذہب کو اختیار کیا تو جب تک اس پر تمام علماء کے دستخط نہیں کرائے اس وقت تک اس کو شائع نہیں کیا۔

یہ چند مثالیں مشتے از نمونہ خروارے کے طور پر عرض کی گئیں

حرفِ آخر

اب آخری بات اس سلسلہ میں غور کرنے کی یہ ہے کہ فسادِ باطن کے ساتھ علوم ظاہری میں تو آدمی کمال حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن روحانی ارتقاء ممکن نہیں ہے۔

مولانا تھانوی کی صورت حال یہ ہے کہ علوم ظاہرہ کے ساتھ ساتھ روحانی علوم میں بھی حضرت تھانوی علمائے دیوبند کی روحانی توجہات کا مرکز رہے ہیں۔

پھر اگر حضرت تھانوی کی اخلاقی کیفیات وہی ہیں جس کی نقشہ کشی حساس صاحب کر رہے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے روحانیات میں حضرت تھانوی کو وہ مقام کیوں کر ممکن ہوا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے بھی بعض دقیق روحانی مسائل میں حضرت تھانوی سے مشورہ کیا۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کون شخص ہیں؟

جو ان کو جانتا ہے وہ تو جانتا ہی ہے لیکن آج کا نوجوان جو ان کو نہیں جانتا ہوگا اس کے تعارف کے لئے عرض ہے کہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی رقم طراز ہیں کہ:-

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ پانچویں حج میں جب طواف قدوم کے لئے حرم شریف میں داخل ہوئے تو مولانا محب اللہ خلیفہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ دیکھو کون آیا کہ پورا حرم منور ہو گیا ؎

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لَو شمع محفل کی   پتنگوں کے عوض اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

پھر طواف قدوم کے بعد جب حضرتؒ نے مولانا محب اللہ صاحب سے ملاقات کی تو انہوں نے فرمایا کہ اچھا آپ ہی تھے جس کی وجہ سے پورا حرم منور تھا۔"

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حرم تو پہلے ہی منور ہے ان کے آنے سے منور ہونے کے کیا معنی!
تو بات یہ ہے کہ حرم انوارِ الوہیت سے معمور ہے اور یہ انوارِ عبدیت تھے اور دونوں کا رنگ الگ الگ ہے اور اربابِ معرفت کو یہ امتیاز خوب ہوتا ہے۔
حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان کی تحریر و تقریر میں کہیں انگلی رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے حرف پہ میرے کوئی انگشت

حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ جب تعزیت کے لئے تھانہ بھون تشریف لائے تو آنکھیں اشکبار تھیں اور یہ فرمایا کہ اگر کوئی شبہ پیش آتا تھا تو یہ تسلی رہتی تھی کہ تھانہ بھون جائیں گے تو حضرت سے یہ شبہ حل ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے جو حضرت تھانوی کا جو مرثیہ لکھا اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

جائیں کہاں ازالۂ شبہات کے لئے
اب ایسا اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا

یہ چند سطور اس لئے لکھی گئیں تاکہ ریکارڈ درست رہے لیکن اس کے باوجود اگر کسی کو اپنے مخصوص خیالات پہ اصرار ہے تو ظاہر ہے کسی کے خیالات کو بجبر نہیں بدلا جا سکتا:

فان یکفر بها هؤلاء فقد وکلنا بها قوما لیسوا بها بکفرین
(سورۂ انعام آیت ۸۹)

رفتارِ کار

کراچی میں امیرِ تنظیم کی مصروفیات

اور

سہ روزہ قرآنی تربیت گاہ

اللہ کے فضل و کرم سے ۱۰ نومبر ۸۵ء کو تنظیم اسلامی کا چوتھائی علاقائی اجتماع حیدرآباد میں اختتام پذیر ہوا۔ اس اجتماع کو حیدرآباد کے رفقاء نے انتھک جدوجہد سے کامیاب بنایا اور میزبانی بھی خوب کی لیکن وہ انتظامی مصروفیات کی وجہ سے خود زیادہ استفادہ نہیں کر سکے تھے۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ کراچی میں ایک سہ روزہ قرآنی تربیت گاہ کا اہتمام کیا جائے جس میں خصوصی طور پر حیدرآباد کے رفقاء اور ایسے رفقاء جو کسی مجبوری کے تحت علاقائی اجتماعات میں شریک نہ ہو سکے ہوں اس تربیت گاہ میں شرکت کر سکیں۔ اللہ کا خصوصی فضل و کرم ہوا کہ کراچی کو ایسے باصلاحیت تجربہ کار ناظمِ تربیت گاہ بھی مل گئے جن کے خلوص و عزم و اللہ کی تائید سے یہ تربیت گاہ بحمد اللہ کامیاب رہی۔ راقم کی مراد جناب مختار حسین صاحب فاروقی سے ہے جو تنظیم اسلامی کراچی شرقی کے حیدرآباد کے اجتماع کے موقع پر ہی امیر مقرر کئے گئے۔ ان کی اور ان کے رفقاء کی دن رات کی محنت نے اس پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

تربیتی پروگرام کا آغاز ۲۴ دسمبر کی شام سے ہوا۔ امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بعد نماز عشاء تربیت گاہ یعنی کے ایم سی اسپورٹس کمپلکس کورنگی نمبر ۲½ کے وسیع و عریض ہال میں خطاب فرمایا۔ موضوع تھا "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا! کیوں! اور کیسے!"۔ ہال میں فرشی انتظام کیا گیا تھا۔ اور باہر برآمدوں میں اور میدان میں کرسیوں کا انتظام تھا۔ ہال کے باہر کلوز سرکٹ پر چار عدد ٹی وی رکھے گئے تھے تاکہ باہر بیٹھنے والے اصحاب مقرر کو دیکھ سکیں۔ کلوز سرکٹ کے انتظام میں کچھ تاخیر ہوئی جس کی وجہ سے کافی حضرات جگہ نہ ملنے کی وجہ سے واپس ہو گئے۔ بہرحال جب انتظام ٹھیک ہو گیا تو باہر بھی لوگ اطمینان سے امیرِ محترم کا خطاب سنتے اور دیکھتے رہے۔

۲۵ دسمبر کو بعد نماز فجر راقم نے درس حدیث دیا۔ ناشتہ کے وقفہ کے بعد شمالی تنظیم کراچی کے امیرِ محترم سراج الحق سید صاحب نے خطاب فرمایا۔ آپ نے تربیت گاہ میں نظم و ضبط اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی شرکاء کو نصیحتیں کیں۔ دوسری گفتگو وسطی تنظیم کراچی کے امیر واحد علی رضوی صاحب نے کی۔

آپ نے دینی فرائض کا جامع تصور کے بنیادی نکات کی یاددہانی کروائی۔ اس کے بعد امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے جو دو گھنٹہ تک جاری رہے۔ اس کے بعد وقفہ ہوا۔ اور چوہدری غلام محمد صاحب قیم تنظیم اسلامی پاکستان نے منتخب نصاب نمبر ۲ کا درس نمبر ۲ دیا۔ عصر کے بعد رفقاء کا باہمی تعارف ہوا۔ اس کے بعد حافظ عرفان احمد صاحب نے خطاب فرمایا۔ حافظ صاحب عرصہ تیس سال سے ابوظہبی میں رہتے ہیں اور آپ دس ۲۰ سال سے درس قرآن حکیم دے رہے ہیں۔ آپ کو عربی و انگریزی پر عبور حاصل ہے۔ امیرِ محترم کے حالیہ دورہ ابوظہبی میں آپ نے امیرِ محترم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ بعد نماز مغرب محترم اسد الرحمٰن صاحب فاروقی نے امیرِ محترم کی تحریر "دعوت رجوع الی القرآن" کا مطالعہ شروع کروادیا۔ بعد نماز عشاء جناب مختار حسین صاحب فاروقی امیر شرقی تنظیم کراچی نے امیرِ محترم کی کتاب "سرافگندیم" میں سے ایک باب بعنوان امتِ مسلمہ کا عروج و زوال کا مطالعہ شروع کروادیا۔ یہ سلسلہ ۱۰ بجے رات تک جاری رہا۔ ۲۶ کو بعد نماز فجر ہمارے بزرگ رفیق محترم عبدالخالق صاحب نے اذکار مسنونہ سے متعلق خطاب فرمایا۔ ناشتہ کے بعد محترم اسد الرحمٰن فاروقی صاحب نے "دعوت رجوع الی القرآن" کا مطالعہ جاری رکھا جس میں برصغیر پاک و ہند میں اسلام کا ورود اوّل سندھ میں اور ورودِ ثانی شمال مغرب سے اور ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج اور ساتھ ہی اسلام کے زوال کی انتہا۔ الف ثانی (یعنی دوسرے ہزار سال) کے تجدیدی کارناموں جیسے موضوعات زیر بحث آئے۔

۹ بج کر ۲۰ منٹ پر چوہدری غلام محمد صاحب نے منتخب نصاب نمبر ۲ کا تیسرا درس دیا۔ درمیان میں چائے کے لئے وقفہ ہوا۔ اس کے بعد چوہدری صاحب نے درس نمبر ۴ اور ۵ کو ایک ہی نشست میں مکمل کیا۔ ۱۲ بجکر ۱۵ منٹ پر اسد الرحمٰن فاروقی صاحب نے چھٹا درس شروع کیا اور تقریباً ۴۵ منٹ میں نہایت جامعیت کے ساتھ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کی ہیئت ترکیبی اور تنظیمی اساس کو قرآن حکیم کی آیات بینات کی روشنی میں بیان کیا۔

نمازِ عصر کے بعد مختار حسین فاروقی صاحب نے حسب معمول "سرافگندیم" کتاب کا مطالعہ کروایا۔ یہ سلسلہ نمازِ مغرب کے بعد بھی جاری رہا۔ اس طرح "امتِ مسلمہ کے عروج و زوال" کا مضمون مکمل ہوا۔ تقریباً ساڑھے سات بجے سے ۹ بجے تک سیرت صحابہؓ کے ذیل میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی مثالی سیرت کا مطالعہ ہوا۔ ۹ بجے بھائی عبدالخالق صاحب نے اذکار مسنونہ پر گفتگو کی۔

رات ۹ بج کر ۱۵ منٹ پر مختار حسین فاروقی صاحب نے "سرافگندیم" کتاب کے دوسرے باب کا مطالعہ کروایا۔ اس باب میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی وہ تاریخی تحریر ہے جو آپ نے جولائی ۱۹۷۵ء میں ۲۱ روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر کی تھی جس میں تنظیم اسلامی کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا۔ ۱۰ بجے شب یہ نشست اختتام کو پہنچی۔

۲۷ دسمبر کو نمازِ فجر کے بعد راقم کا بیان تھا۔ ناشتہ وغیرہ سے فراغت کے بعد ½ ۸ بجے فضل خالق صاحب کی تلاوت کلامِ پاک سے آخری نشست کا آغاز ہوا۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے خوش الحانی کی نعمت سے نوازا ہے۔ آپ نے سورۂ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۱۰ کی تلاوت کی اس دوران مسنون "محفلِ سماع" کا سماں تھا۔ فجزاہ اللہ لذلک

۸ بج کر ۵۴ منٹ پر چوہدری غلام محمد صاحب نے منتخب نصاب نمبر ۲ کے درس نمبر ۷، ۸ اور ۹ کا خلاصہ بیان کیا۔ یوں مذکورہ منتخب نصاب کی تکمیل ہوگئی۔ اس کے بعد اسعد الرحمٰن فاروقی صاحب نے تحریک رجوع الی القرآن کے مطالعہ کے ضمن میں ایک چارٹ کی مدد سے تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ بعد ازاں ناظم تربیت گاہ جناب محمد حسین فاروقی صاحب نے تربیت گاہ کے اختتام کا اعلان کیا۔

مذکورہ بالا تربیت گاہ سے متصلاً قبل امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۲۲ دسمبر کو پاکستان مشین ٹول فیکٹری کالونی میں بعد نمازِ عشاء جلسہ عام سے خطاب فرمایا۔ آپ سے قبل اسعد الرحمٰن فاروقی صاحب نے بھی خطاب کیا۔ ۲۳ دسمبر کو حسبِ معمول تاج محل ہوٹل میں شام الہدیٰ کی نشست منعقد ہوئی۔ اس دفعہ امیر محترم نے سورہ شوریٰ آیات ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ کی روشنی میں فریضہ اقامت دین اور اس کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کے کارکنوں کے اوصاف بیان کئے۔ قارئین آگاہ ہوں گے کہ یہ نشست پاکستان ٹیلی ویژن کے انتہائی مقبول پروگرام "الہدیٰ" کا تسلسل ہے۔ "الہدیٰ" تقریباً تین سال قبل ایک سازش کے تحت چند مغرب زدہ خواتین کے احتجاج کی آڑ میں بند کر دیا گیا تھا لیکن ہدایتِ ربانی کا سلسلہ بند نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ کراچی اور لاہور میں "شام الہدیٰ" کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جہاں بالحمدللہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ترتیب سے بیان ہو رہا ہے۔ شام الہدیٰ تک کے سارے پروگراموں کے وڈیو کیسٹ بنا لئے گئے ہیں۔ جو دفتر تنظیم اسلامی کراچی سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

۲۴ دسمبر کو امیر محترم نے PECSIR کے افسران اور عملے کے دیگر افراد سے خطاب فرمایا۔ اللہ کا احسان ہے کہ تین ایام میں امیر محترم نے قرآن حکیم کی انقلابی دعوت کو دلنشین اور مؤثر پیرائے میں بیان فرمایا۔ قارئین سے درخواست ہے کہ امیر محترم کی صحت کے لئے دعا فرمائیں۔

مرتب: ضمیر الاختر خان، رفیق تنظیم اسلامی، کراچی

اعتذار: "استحکامِ پاکستان" کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر بعض مضامین کی شمولیت رہ گئی پڑی جن میں "دورۂ ابوظہبی کی روداد" بھی شامل ہے۔

تنظیم اسلامی کے امیر
ڈاکٹر اسرار احمد سے
ایک فکر انگیز انٹرویو

گفتگو : محمد صلاح الدین ، ثروت جمال اصمعی

اسلام انتخابی سیاست کے ذریعے نہیں آسکتا
اس کے لیے انقلابی طریقِ کار ناگزیر ہے

قرآنی تعلیمات پر مبنی اپنے ٹی وی پروگرام الہدیٰ کے حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد پاکستان کے عوام اور خواص دونوں حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کا قیام زمانۂ طالب علمی ہی سے ان کی زندگی کا نصب العین ہے اور اس کی خاطر وہ اپنے انداز میں مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے ابتدائی برسوں میں اس کے ناظم اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ پھر جماعت اسلامی میں شامل ہوئے اور مرکزی شوریٰ کے رکن رہے۔ لیکن بعض اختلافات کی بنا پر ۱۹۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی گئی۔ برس بعد تنظیم اسلامی کے نام سے اپنی ایک الگ جماعت بنائی۔ جس کا مقصد انتخابی عمل کے بجائے انقلابی طریقۂ کار اختیار کر کے اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اسلامی انقلاب کا کیا نقشہ ہے اور وہ اس کے لیے کس طور پر کام کر رہے ہیں لوگ عموماً اس سے بہت کم واقف ہیں۔ اپنے قارئین کو اس بارے میں آگاہ کرنے کے لئے "تکبیر" نے چند روز پہلے کراچی میں ڈاکٹر صاحب سے ایک انٹرویو کا اہتمام کیا جس کی تفصیلات آپ کے سامنے ہیں۔

س ۱۔ آپ اسلامی انقلاب کے داعی ہیں اور اس کے لئے آپ نے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی ہے۔ براہ کرم تفصیل سے بتائیے کہ اس انقلاب کو برپا کرنے کا کیا نقشہ آپ کے ذہن میں ہے؟

ج۔ مجھے یہ کہنے میں دقت ہو رہی ہے کہ یہ بات شروع ہی میں کہہ دوں کہ اصل میں جب میں اسلامی انقلاب کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو سب سے پہلے مجھے یہ واضح کر دینا چاہیے کہ اس سے میری مراد کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ کچھ تعزیرات اور کچھ قوانین کی تنفیذ ہو جائے تو گویا اسلام کو قائم کرنے کا تقاضا اس سے پورا ہو جاتا ہے جبکہ میرے نزدیک اقامتِ دین یا نفاذِ دین سے مراد یہ ہے کہ پورا کا پورا سوشیو اکنامک سسٹم تبدیل ہو۔ زندگی کا پورا نظام ایک کل کی حیثیت سے اگر نہیں بدلتا تو محض جزوی اصلاحات اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ تو بن سکتی ہے لیکن اسلام کی کوئی مفید خدمت اس طرح انجام نہیں دی جا سکتی۔ اب ظاہر بات ہے کہ جب بھی پورے نظام کو بدلنے کے لئے کوئی جدوجہد کی جاتی ہے کسی بھی معاشرے میں جو بااثر طبقہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ جو نظام قائم ہے اسی کو برقرار رکھے، یعنی اسٹیٹس کو کو قائم رکھا جائے۔ اس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ اگر سماجی سطح پر کچھ لوگوں کو نسلی اعتبار سے برتری حاصل ہے، سید ہیں، پیرزادے ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ انہیں دوسروں کے مقابلے میں ایک بلند مقام حاصل ہے تو وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ مروجہ نظام جس سے ان کے مفادات وابستہ ہیں، تبدیل ہو۔ اسی طرح اگر سرمایہ دار کو کچھ خصوصی مراعات حاصل ہیں اور معاشرے کا ڈھانچہ ایسا بنا ہوا ہے تو وہ کبھی اس نظام کو بدلنا نہیں چاہے گا۔ جاگیردار، زمیندار بدلنا نہیں چاہے گا۔

اب جہاں تک معاملہ ہے سیاسی اور انقلابی عمل کا تو درحقیقت یہ جدا جدا کام ہے۔ میرے نزدیک اس کے کچھ مثبت پہلو بھی ہیں اور اس کی کچھ تحدیدات LIMITATIONS بھی ہیں۔ مثبت پہلو تو یہ ہے کہ کسی ملک میں جو نظام قائم ہے، اگر سیاسی عمل جاری رہے، الیکشن ہوتے رہیں تو بے چینی نہیں ہوگی اور مختلف طبقات میں یا مختلف علاقوں کے لوگوں میں کوئی احساسِ محرومی پیدا نہیں ہوگا اور یہ کہ جو کچھ بہتر تھا اس نظام کو چلانے کے لئے ملتے رہیں گے لیکن اس نظام کو اس طریقے سے بنیادی طور پر کبھی بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بااثر گروہ ہے، ووٹ کے ذریعے اسی کی نمائندگی ہوگی اور جو لوگ اس بااثر گروہ میں سے ووٹ لے کر بیٹھیں گے وہ کبھی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کو تیار نہیں ہوں گے۔

لہٰذا تشخیص میں یہ کرنی ہوگی کہ کیا یہ نظام بنیادی طور پر غلط ہے یا اس میں صرف ثانوی اعتبار سے خرابیاں ہیں۔

میری تشخیص یہ ہے کہ یہ نظام اسلام کی رو سے بنیادی طور پر غلط ہے اس لئے میں اس کی تبدیلی کے لئے محض سیاسی عمل کو مفید نہیں سمجھتا۔ میں قائل ہوں کہ سیاسی عمل ملک میں جاری رہنا چاہیے تاکہ بے چینیاں، بے اطمینانیاں، علاقائیت پرستی، علیحدگی پسندانہ رجحانات وغیرہ ختم ہوں لیکن نفاذِ اسلام کے لئے انقلابی عمل ناگزیر ہے۔

اب سمجھنا یہ ہوگا کہ انقلابی عمل کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کے چھ مراحل ہیں جن میں سے گنتی کے اعتبار سے تو تین پہلے ہیں اور تین بعد میں، لیکن حقیقت میں وہ شروع ساتھ ہی ساتھ ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اوور لیپ کرتے ہیں یعنی پہلے مرحلے کے ساتھ ہی دوسرا بھی شروع ہو جاتا ہے لیکن بیان کرنے میں وہ علیحدہ علیحدہ آئیں گے۔

کسی بھی انقلابی عمل کے لئے پہلے ایک انقلابی نظریہ ضروری ہے۔ اس نظریہ کی نشر و اشاعت بھرپور طریقے پر جو بھی وسائل میسر ہوں اختیار کر کے، ان سب کو بروئے کار لا کر۔ یہ اس کام کا پہلا مرحلہ ہے۔

پھر جو لوگ اس نظریے کو قبول کر لیں انہیں باضابطہ طور پر ان کو منظم کیا جائے یعنی دوسرا مرحلہ تنظیم ہے۔

تیسرا مرحلہ ان لوگوں کی تربیت کا ہے اور اس تربیت کی مناسبت ہونی چاہیے اس نظام سے جو آپ لانا چاہتے ہیں۔

یہ تین ابتدائی مراحل ہیں۔ ان مراحل کے نتیجے میں ایک منظم پارٹی وجود میں آ جاتی ہے۔ اس انقلابی پارٹی کے لئے پھر یہ ایک ضروری ہے کہ جب تک وہ اپنی تعداد اور تنظیم و تربیت کے لحاظ سے اتنی مضبوط نہ ہو جائے کہ خود اپنے انقلاب کے مطابق اپنے آپ کو کسی ڈائریکٹ ایکشن کے قابل محسوس کرنے لگے، اس وقت تک اس کے لئے لازم ہے کہ صرف یہی تین کام کرتی رہے چوتھا کوئی کام نہ کرے۔ اس مرحلے کا کسی بھی وقتی سیاسی مصروفیت میں یا شو

میں اپنے آپ کو اُسی اسلامی تحریک کا جزو سمجھتا ہوں جو مولانا مودودیؒ نے برپا کی۔

ونگ یا ایسی ہی کسی اور کام میں وہ لگ جائے تو یہ اس کی قوت کا ضیاع ہوگا۔ لہٰذا اس کو ان ہی تین کاموں پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنی چاہیئے حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھے کہ اب ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم مروجہ نظام کے خلاف کوئی راست اقدام کر سکتے ہیں۔

ان تین کاموں کے دوران جو چوتھا کام خود بخود ہوگا وہ یہ ہے کہ جیسے ہی آپ اپنا انقلابی نظریہ لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو نظام رائج ہے آپ اس کی نفی کر رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ظالمانہ ہے یا باطل ہے یا غلط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے اس نظام کے خلاف جارحیت کی ہے۔ نتیجتاً اس کی طرف سے ردِّ عمل ہوگا۔ یہ ردِّ عمل شروع میں زبانی کلامی ہوتا ہے۔ انقلاب کے علمبرداروں کو دیوانے، مجنوں وغیرہ کے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ پھر ذرا آگے بڑھ کر مروجہ نظام کے کرتا دھرتا یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ آواز محض مجذوب کی بڑ نہیں ہے بلکہ معاملہ سنجیدہ ہے اور سنجیدگی سے اس کا نوٹس لیا جانا چاہیئے۔ یہ محض مشتِ غبار نہیں بلکہ آندھی بن سکتا ہے۔ اس مرحلے پر تشدد شروع ہوتا ہے۔ ماردھاڑ، اذیت رسانی، گھروں سے نکالا جانا خصوصاً نوجوانوں کو، کیونکہ وہی کسی بھی انقلابی تحریک کا ہراول دستہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سوسائٹی کا ہر طبقہ کسی اعتبار سے دباؤ ڈالتا ہے۔ خاص طور پر اس چیز کو کہا جاتا ہے۔ اس پورے مرحلے میں PASSIVE RESISTANCE کی ضرورت ہوتی ہے۔ عدم تشدد یعنی تمام مظالم کا جوانمردی سے مقابلہ، لیکن جواباً کسی پُرتشدد کارروائی سے گریز کرتے ہوئے۔

جب تک یہ انقلابی پارٹی خود کسی اقدام کی پوزیشن میں نہ آجائے اس وقت تک اس کی جانب سے PASSIVE RESISTANCE لازم ہے۔ یہ دراصل چوتھا مرحلہ ہے جو پہلے مرحلے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔

پانچواں مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب بیانئے جمع کر چکا ہے پاس طاقت ہے اور اب ہم کوئی راست اقدام کر سکتے ہیں۔ اس کو میں ACTIVE RESISTANCE کہتا ہوں۔ یہ کام کس طرح ہوگا اس کا فیصلہ درپیش حالات کی روشنی میں کیا جائے گا۔ میں اس کو یوں تعبیر کرتا ہوں کہ اس نظام کی کوئی دکھتی رگ چھیڑی جائے کیونکہ اب اقدام کرنا آپ کا کام ہے اور جس طرح پورا انسانی جسم ایک حیاتیاتی اکائی ہے اور کسی بھی عضو کو تکلیف پہنچے تو پورا جسم اسے محسوس کرتا ہے، اسی طرح پورا معاشرہ بھی ایک اکائی ہے۔ اس کی کسی بھی دکھتی رگ کو چھیڑنے کا مطلب پورے معاشرے کو چیلنج کرنا اور اس کی جانب سے ردِّ عمل کو دعوت دینا ہے۔ اس وقت دیکھنا یہ ہوگا کہ کون سے ایشو کو لے کر میدان میں آیا جائے اور اس پر مزاحمت شروع کی جائے۔ اس طرح کی مزاحمت کے جو طریقے بھی اس دور میں تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں وہ ہیں ڈیمانسٹریشن، ایجی ٹیشن، پکٹنگ وغیرہ۔ یہ سارے طریقے جو تمدن کے ارتقاء نے فراہم کئے ہیں سب اس مرحلے میں اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

جب تک یہ دور نہیں آیا تھا اس وقت تک ریاست اور حکومت کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص حکومت کو بدلنے کے لئے اٹھتا تھا تو باغی قرار پاتا تھا اور باغی واجب القتل تھا۔ اب ہم اس دور میں آچکے ہیں جس میں ریاست ایک علیحدہ حقیقت ہے اور حکومت ایک علیحدہ حقیقت۔ حکومت دراصل ریاست کا ایک انتظامی ادارہ ہے جسے بدلنے کا حق عوام کو حاصل ہے۔ اس اصول سے ہمیں ایک سہولت حاصل ہو گئی ہے کہ کوئی شخص اگر اس مقصد کے لئے اٹھتا ہے تو وہ باغی قرار نہیں پاتا۔ اور چونکہ مسلح کشمکش والی بات بھی اب ایک حد تک بعید از امکان ہو گئی ہے یعنی اس کا امکان اگرچہ بالکل ختم نہیں ہوا مگر بہت کم ہو گیا ہے۔ اس لئے اس کا بدل یہ ہے کہ کسی بھی ایشو پر میدان میں آکر مقابلہ کیا جائے۔

انقلاب کا یہ پورا خاکہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے اخذ کیا ہے۔ اگرچہ یہ گفتگو کسی حوالے کے بغیر ہو رہی ہے مگر ان سطور آپ محسوس کر رہے ہوں گے کہ یہ پورا فکر وہیں سے ماخوذ ہے۔ اس کی خصوصیت

مولانا مودودیؒ بھی نظامِ بیعت کے حامی تھے لیکن بعض علماء کی جانب سے

اختلاف کے اندیشے کی وجہ سے انہوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا

بہت سی دوسری قوتوں کے کود پڑنے کا امکان پایا جاتا
ہے۔ اس وقت آپ کس طرح اس بات کا اہتمام کریں گے کہ
آپ کی تحریک آپ ہی کے ہدف کی طرف چلتی رہے اور
دوسرے آپ کے کام کو غیر موثر بنا کر نہ رکھ دیں؟

ج:۔ اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اس مرحلے کا
آغاز اسی وقت کریں گے جب ہمیں اطمینان ہو جائے کہ اب
ہم اسے سنبھال سکتے ہیں۔ پھر بھی کوئی اتفاقی حادثہ ہو سکتا
ہے اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات
یہ ہے کہ اس پروسس کے دوران یقیناً ایک پولرائزیشن ہو گی
اس وقت جو پولرائزیشن ہو رہی ہے اس میں بنیادی
ایشو نہیں ہے۔ دینی قوتیں اطراف میں ہیں۔ لیکن یہ تحریک
جاری رہی تو پھر دین کی بنیاد پر پولرائزیشن ہو گی مگر جہاں تک
دعوت کی بات ہے جلدی بھی نہ ہو کہ دینی جماعتوں سے لوگوں کو
کھینچ کر لا سکے تب تو کسی کامیابی کی توقع ہی فضول ہے۔
لیکن اگر دعوت واقعی جاندار ہے تو لوگ آئیں گے۔ دینی
جماعتوں کی قیادتوں سے تو کوئی خاص توقع نہیں کی جا سکتی
کیونکہ ان کی چودھراہٹوں کا معاملہ ہے مگر کارکنوں میں
سے لوگ ضرور ملیں گے۔ اور انقلاب اسی وقت آئے گا
جب ایک قیادت ابھر کر سامنے آئے اور دوسری قیادتیں
یا تو ختم ہو جائیں یا اس کے تابع ہو جائیں۔ جب ایسا ہو جائے
گا تو وہ حضرات باقی نہیں رہیں گے جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔

س:۔ پاکستان کے موجودہ حالات میں آپ اس کے
امکانات کس حد تک محسوس کرتے ہیں؟

ج:۔ بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ لیکن ہم قدرتِ
خداوندی اور نصرتِ خداوندی کے بھروسے پر کام کر رہے
ہیں۔ اللہ کی مشیت سے حالات میں اچانک کوئی ایسا موڑ
آ سکتا ہے جو ہمارے سان گمان میں بھی نہ ہو۔ سیرتِ نبویؐ
میں یہ موڑ ہمیں دورِ نبوی میں، ہجرت سے تین سال پہلے نظر
آتا ہے۔ مکے میں دس برس تک دعوت دینے کے باوجود
حضورؐ کے کام کے نتائج نہایت حوصلہ شکن ہیں۔ آپؐ کے
قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ آپ نے مرکز کی تلاش میں طائف
تشریف لے جاتے ہیں۔ وہاں ایک دن میں وہ کچھ ہو جاتا ہے
جو مکے میں دس برس میں ذاتی طور پر آپؐ کے ساتھ نہیں
ہوا تھا۔ واپس آتے ہیں تو مکے میں داخلے کے لئے ایک
کافر مطعم بن عدی کی پناہ طلب کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے چھ
بیٹوں کے ساتھ مسلح ہو کر آپؐ کو اپنی پناہ میں لے کر مکے
میں داخل ہوتا ہے۔ بتلایئے ان حالات میں کہیں کوئی امید
نظر آتی ہے۔

لیکن چھ مہینے بعد مدینے کے ۶ افراد ایمان لے
آتے ہیں۔ اگلے سال ۱۲ ہو جاتے ہیں۔ اس کے اگلے سال
۷۲ ہو جاتے ہیں اور بالآخر مدینے میں اسلامی ریاست
کے قیام کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ
اللہ کی مشیت جب چاہے حالات کا رخ موڑ سکتی ہے،
ہمارا کام کوشش کرتے رہنا ہے۔

س:۔ آپ نے جو مثال دی ہے اس میں بس ایک ہی طاقت
ہے کہ وہاں تو بس دو ہی متحارب گروہ تھے مزید سیاسی
گروہ بندیاں نہیں ملتیں جبکہ موجودہ صورتحال اس سے
بہت مختلف ہے؟

ج:۔ میں نے یہ مثال تو دراصل مایوسی کے حوالے
سے دی ہے کہ تاریک سے تاریک حالات میں بھی اللہ کی
مشیت امید کی روشنی اور کامیابی کی شکل پیدا کر سکتی ہے۔
ورنہ جہاں تک اس دور میں دیگر سیاسی گروہوں اور متحارب
طاقتوں کا تعلق ہے تو ایسا نہیں ہے کہ وہ بس دو تک ہی
محدود ہوں۔ مدینے پہنچ کر حضورؐ کو کم سے کم تین محاذوں
پر مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف یہود اور ان کی ریشہ دوانیاں
تھیں۔ وہ کھلم کھلا دشمن نہیں تھے۔ انہوں نے کبھی کھل کر
آپ کا مقابلہ نہیں کیا۔ اسے کہ یہ کبھی آپ سے کھلے
میدانوں میں مقابلہ نہیں کریں گے۔ دوسرے مدینہ سے خود
ایک ففتھ کالمسٹ عنصر پیدا ہو چکا تھا یعنی منافقین اور تیسرے
باہر کے کھلے دشمن تھے۔ یعنی مشرکین کے مقابلے میں ایک
نہیں تین گروہ تھے قریش، یہود اور منافق۔ اس لئے یہ
کہنا درست نہیں کہ اس دور میں رسول اللہؐ کو بس ایک
ہی محاذ کا سامنا تھا اور کشمکش دو ہی طاقتوں کے درمیان تھی۔

س:۔ ہمارے سوالات کی ترتیب تو کچھ مختلف تھی،

لیکن اب چونکہ امت میں انتشار کا موضوع چھڑ گیا ہے۔ اس لیے اسی حوالے سے ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے ہمیں ایک ہی امت قرار دیا ہے۔ بلکہ قرآن تو تمام ہی نسلوں کو ایک امت بتاتا ہے کہ ان ہذہٖ امتکم امۃ واحدۃ۔ اسی طرح اللہ نے ہر دور میں ایک ہی دین اپنے نبیوں کے ذریعے بھیجا اور اس کے ماننے والوں کا نام کسی تفریق کے بغیر مسلم قرار دیا۔ قرآن کے الفاظ میں ھو سمّٰکم المسلمین من قبل و فی ھذا۔ لیکن جو کچھ ہمیں اپنی تاریخ میں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ جو جماعت بھی امت میں لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانے کے لئے اٹھی، بالآخر نتیجہ نکلا کہ اس کے وابستگان اپنے داعی کی شخصیت سے عقیدت کے غلو میں مبتلا ہو گئے اور اس جماعت نے آخرکار ایک علیحدہ گروہ اور فرقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح امت میں اتحاد کے بجائے مستقل نوعیت کی ایک نئی تقسیم وجود میں آئی۔ مختصر

کہ اب نہ کوئی شخص آگے بڑھ کر اس کام کا آغاز کرے گا اسی طرح اس سے بھی کوئی مفر نہیں ہے کہ جو لوگ اس کے دست و بازو بنیں گے وہ اس کی شخصیت کی کشش اور اس سے محبت و تعلق کی ہی بنیاد پر اس کے گرد جمع ہوں گے۔ کام کے کاز سے وابستگی کے ساتھ ساتھ خود اس کی ذات سے یہ تعلق خاطر اس مقصد کے لیے بالکل ضروری ہے۔ یہ دونوں محبتیں کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے لازم ہیں اور اس میں واقعتاً یہ خطرہ موجود ہے کہ فوری طور پر، یا کچھ عرصے کے بعد، وہ علیحدہ گروہ شخص کے ساتھ ایک الگ فرقے یا جماعت کی شکل اختیار کر لے۔ یہ خطرہ بلاشبہ موجود ہے اور میں اس کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن آج تک کسی مجدد امت نے اور کسی دینی خادم نے اس خطرے کی وجہ سے کام کرنا نہیں چھوڑا۔ حالانکہ جو مشاہدہ آج ہمیں ہو رہا ہے، ممکن ہے وہ ابتدائی ایک دو صدیوں کے لوگوں کو نہ ہوا ہو لیکن ان کے بعد ان تحریکوں کا

ایسی اسلامی تحریک جس میں آزادیٔ فکر وا [illegible] پر کوئی قدغن نہ ہو، بیعت کے نظام کے تحت ھی [illegible]م ھو سکتی ہے۔

کی ایک نئی شکل پیدا ہو گئی۔ جبکہ انبیاء کا طریق یہ رہا ہے کہ انہوں نے کبھی اللہ کے دین کو اپنی ذات سے منسوب نہیں کیا۔ یہودی اور عیسائی سب بعد کی پیداوار ہیں۔ لیکن ہمارے اس زمانے میں بھی لوگ اس کام کے لیے کھڑے ہوتے ہیں ان کے معتقدین عموماً ان کی زندگیوں ہی میں شخصیت پرستی کے رنگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کے دور میں ہی جتنی دینی جماعتیں ہیں، اس سے پہلے جتنی جماعتیں وجود میں آئیں، جتنے مسلک بنے، سب اسی طرح سے بنے۔ آپ بھی جو کام کر رہے ہیں اس میں بھی اس بات کا پورا امکان پایا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتحال سے کس طرح نجات مل سکتی ہے اور مزید گروہ بندی میں تقسیم کے بجائے واعتصموا بحبل اللہ کی کیفیت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟

غامدی۔ انتشار امت کے معاملے میں آپ کا مشاہدہ بالکل صحیح ہے۔ جو بھی اصلاحی تحریک اٹھی ظاہر ہے وہ کسی نہ کسی فرد کی کوشش سے شروع ہوئی کیونکہ افراد کے ہاتھوں بنا ہے اقوام کی تقدیر۔ اس سے کوئی مفر نہیں ہے کہ جہاں

جو نتیجہ اس شکل میں نکلا وہ سب کے سامنے تھا۔ یعنی خالص خیر کے لیے بننے والی جماعتوں سے بھی فرقے وجود میں آگئے۔ اس صورتحال میں، میں سمجھتا ہوں کہ اس خطرے کی موجودگی کے باوجود اصلاحی تحریکوں کا برپا کیا جانا ضروری ہے اور اس خطرے سے ان کی ضرورت کی نفی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اس کام میں خیر کا پہلو خطرے کی نسبت سے زیادہ ہے۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ اس خطرے سے بچنے کی کیا احتیاطی تدابیر ہو سکتی ہیں جنہیں اختیار کیا جانا چاہیے۔ اس مقصد کے لئے سب سے پہلی بات جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ شخصیتوں کو ابھارنے کے لیے کسی مصنوعی عنصر کا استعمال نہ کیا جائے۔ اگر کسی شخص میں واقعی اتنی صلاحیت ہے اور حقیقتاً وہ اتنا عظیم ہے تو آپ اسے کب تک چھپائیں گے سورج کو کب تک غلافوں میں لپیٹ کر رکھا جا سکے گا لیکن اس میں کوئی مصنوعی عنصر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ پہلی احتیاط ہے دوسری تدبیر یہ ہے کہ اپنی حد تک وہ شخص اپنی

کو محسوس کرے کہ اس کی ذات سے عقیدت میں غلو اس کی
کے ساتھیوں اور متبعین میں پیدا نہ ہونے پائے۔ مثال کے
طور پر حضورؐ کے سامنے ایک صحابی نے کہہ دیا کہ "ما شاء اللہ
و ما شئت" یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں۔ آپ نے
اس بات پر فوراً ٹوک دیا اور فرمایا "کیا تم نے مجھے اللہ کا
مد مقابل سمجھ لیا ہے؟" یعنی مشیت صرف اللہ کی ہے۔ حضورؐ
کی زندگی میں یہ احتیاط برابر کار فرما نظر آتی ہے۔ اکڑوں
بیٹھ کر کھانا کھاتے اور فرماتے بندہ ہوں، بندے کی طرح کھاتا
ہوں۔ قرآن بھی وضاحت کرتا ہے کہ نبی بھی تمہارے ہی جیسا
بشر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔

ان دو احتیاطوں کے علاوہ تیسری چیز اس بات
کی کوشش ہے کہ اس جماعت کے اندر ایک سیکنڈ لائن ایسے
افراد کی ابھر کر سامنے آئے جن کی وفاداری و وابستگی تحریک
کے نقطے سے شخصی وابستگی و تعلق کے مقابلے میں بالا و
برتر ہو۔ عوام کے اندر تو یہ نہیں ہوتا۔ عوام کی صفوں سے آپ
کو کارکن چاہیئں۔ ان کے لئے اگر آپ یہ قدغن لگا دیں گے تو
آپ کی رفتار سست ہو جائے گی لیکن پارٹی کے اندر قیادت
کی صفوں میں اس کا اہتمام کیا جانا چاہیئے۔

ان تین احتیاطی تدابیر کے ساتھ کام کو چلانا چاہیئے
کیونکہ یہ کام بہر حال فرض ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح
قرآن میں شراب اور جوئے کے بارے میں آیا ہے کہ اس
میں لوگوں کے فائدے کی نسبت نقصان زیادہ ہے اس لئے
یہ حرام ہے۔ اسی طرح اس زیر بحث مسئلہ میں اگرچہ
مضرت کا پہلو بھی ہے لیکن اس کی افادیت مضرت کی
نسبت زیادہ ہے اس لئے یہ کام کیا جانا چاہیئے۔

س ۵- قرآن نے تفرقے کا جو سبب بتایا ہے اس کے
لئے "بغیاً بینهم" کے الفاظ استعمال کئے ہیں یعنی لوگوں
میں تفرقہ ہمیشہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے اور اپنی برتری
قائم کرنے کے جذبے کی وجہ سے رونما ہوا۔ اب سوال یہ
ہے کہ اس امت میں جو تفرقے ہوئے یا آج ہیں یا آئندہ ہوں
گے کیا ان کا سبب بھی یہی نہیں ہے؟

ج ۵- یہ اصل میں دو الگ الگ باتیں ہیں۔ ایک ہے
تفرقہ اور اس کے اسباب اور ایک ہے شخصیت پرستی کا
معاملہ۔ میں نے اپنی گفتگو صرف شخصیت پرستی کے موضوع تک
رکھی ہے کہ اس کا راستہ کس طرح روکا جا سکتا ہے۔

جہاں تک تفرقہ کا تعلق ہے تو آپ نے بالکل
صحیح فرمایا ہے کہ متعدد مقامات پر قرآن نے تفرقے کا سبب
یہی "بغیاً بینهم" بتایا ہے۔ تفرقہ جب بھی ہوا ہے اسی
بنا پر ہوا ہے۔ جدید سائیکالوجی کی ایک اصطلاح اس
"بغیاً بینهم" کے بہت قریب پہنچ گئی ہے اور وہ ہے
THE URGE TO DOMINATE ایڈلر کے
فلسفے میں انسان کا بنیادی داعیہ اسی کو بتایا گیا ہے۔ اگرچہ ہمیں
اس سے اتفاق نہیں ہے تاہم جس طرح فرائڈ کے ہاں جنس
ہے، مارکس کے ہاں معاش ہے اسی طرح ایڈلر کے ہاں
URGE TO DOMINATE ہے تو اس میں کوئی شک نہیں
کہ تفرقے کا سبب یہی جذبہ بنتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ
تفرقہ کیا ہوتا ہے۔

تفرقہ یہ ہے کہ آپ ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود
قبول نہ کریں۔ تفرقے کی جڑ یہ ہے اصل میں۔ البتہ اگر آپ
کسی مغالطے اور غلط فہمی کی وجہ سے کسی چیز کی مخالفت
اسے غلط سمجھ کر کر رہے ہیں خواہ اصلاً وہ حق ہی ہو،
تب یہ تفرقہ شمار نہیں ہوگا۔ تفرقے کا آغاز یہاں سے ہوتا
ہے کہ کسی چیز کی صداقت پر آپ کا دل مطمئن ہو اور گواہی
دے۔ لیکن آپ صرف اپنی انانیت کی وجہ سے اسے تسلیم نہ
کریں۔ اس کی سب سے بڑی مثال قرآن مجید میں یہود کی
دی گئی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ
کے نبی ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ میں "یعرفونه کما
یعرفون ابناءھم" وہ نبی کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے
اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے
سب سے بڑھ کر مخالفت کی۔

بہر حال برتری قائم کرنے اور رکھنے کا یہ جذبہ
شخصیت پرستی کے ساتھ مل کر فرقہ بندی کا سبب بن جاتا
ہے۔ یہ دو چیزیں جو الگ الگ ہیں ایک دوسرے کو سہارا
دیتی ہیں۔ یعنی جن لوگوں کو اپنی انانیت کی وجہ سے تفرقہ میں
مبتلا ہونا ہی ہے وہ کسی شخصیت کی آڑ لے کر اور اسے
بلڈ اپ کرکے ایک فرقے کی شکل دے دیتے ہیں۔

س ۶- اس میں کچھ ذرا سا فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہ
مثلاً نبی جو بات کہتا ہے وہ تو وحی کے ذریعے آتی ہے وہ
اسی حوالے سے اسے پیش کرتا ہے اس لئے وہاں تو اختلاف
کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اس سے ہٹ کر جتنے بھی
[illegible]

ٹی وی پروگرام "الہدیٰ" پر پابندی

کیوں لگی؟ کس نے لگوائی؟

س:- ٹیلی ویژن پر آپ کے پروگرام "الہدیٰ" سے ایک ایسا طبقہ مستفید ہو رہا تھا جن تک عام طور پر قرآن کا پیغام نہیں پہنچ پاتا ہے۔ یہ سلسلہ کیوں اور کس طرح بند ہوا اور اس کی ذمہ داری خود آپ پر کس حد تک عائد ہوتی ہے؟

ج:- مجھے آج کی تاریخ تک یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ اس بندش کا سبب کیا ہے۔ کس وجہ سے پروگرام بند کیا گیا۔ کس نے بند کیا، کس سطح پر یہ فیصلہ ہوا۔ یہ چونکہ میرے علم میں نہیں ہے، اس لیے میں اس سوال کا کوئی واضح جواب آپ کو نہیں دے سکتا۔ البتہ یہ احساس مجھے ضرور ہے کہ اس ذریعے سے قرآن سے جو دلچسپی اور لگاؤ عام ہو رہا تھا کوئی اور اتنا مؤثر ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے جس سے یہ کام لیا جا سکے۔ جہاں تک یہ تاثر ہے کہ اس کی بندش میں میرا بھی حصہ ہے تو ایسی کوئی بات نہیں۔ میری طرف سے تو پیشکش تھی کہ میں اس پروگرام کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لینا چاہتا لیکن انہوں نے کہا کہ یہ ہماری قانونی ضرورت ہے، اس کے بغیر پروگرام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد میں نے ضیاء صاحب کو خط بھی لکھا تھا کہ میں اس کا کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتا۔ اگر آپ اس کا وقت نہیں بڑھا سکتے تو ہفتے میں دو مرتبہ کر دیجئے۔ بہرحال اس کے بند ہونے سے جو نقصان ہوا اسے میں محسوس کرتا ہوں اور جس کی وجہ سے بھی بند ہوا اللہ کے ہاں اس سلسلے میں اس پر بھاری ذمہ داری عائد ہوگی، اور اسے اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان سے اختلاف کرتے ہوئے ایک صورت یہ بھی بن سکتی ہے کہ جیسے ایک آدمی حق سمجھ رہا ہے اسے دوسرا آدمی حق نہ سمجھ رہا ہو، اور اس کا سبب دونوں کے فہم و شعور کا اختلاف ہو۔ تو اس صورت میں تو وہ مشکل پیدا نہیں ہوتی جو کسی نبی سے اختلاف کی صورت میں ہوتی ہے۔ کیونکہ نبی تو مامور من اللہ ہوتا ہے اس کے بعد لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں تو اتمام حجت ہو جاتا ہے۔ لیکن عام حالات میں اگر ایک آدمی دوسرے کے دلائل سے مطمئن نہیں ہوتا اور شرح صدر کے ساتھ سمجھتا ہے کہ اس کی بات درست نہیں ہے تو اس سے اختلاف کی ایک دوسری صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج:- اس میں دو مراحل ہیں۔ ایک تو یہ کہ نبوت تھی ہدایت کے لئے۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن ہدایت کا کوئی نہ کوئی سلسلہ قائم ہے۔ اس کے لئے آپ کی بیان کردہ دونوں صورتوں میں بنیادی فرق نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ جو بھی انتظام کرے اس کے تحت لوگوں کے اوپر ایک دفعہ انکشاف حق کرتا ہے تب حجت قائم ہوتی ہے۔ آخری شکل قیام حجت کا ذریعہ نبوت تھی۔ لیکن اب بھی اگر آپ انفرادی سطح پر اس معاملے کو لیں تو صورت یہی ہوتی کہ ایک شے کی حقانیت آدمی کو ایک جھلک دکھا دیتی ہے۔ اس کے بعد آدمی کے اخلاص کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ صداقت کو ماننا چاہتا ہے یا نہیں۔ لہٰذا اس دور میں بھی کوئی دعوت حق اٹھے گی تو جلد یا بدیر مختلف لوگوں کے اوپر وہ مرحلے آئیں گے کہ حقیقت انہیں اپنی جھلک دکھلائے گی۔ یہ میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں اصولی بات ہو رہی ہے کہ طریق نبوی کے مطابق کوئی بھی دعوت حق بپا ہو تو اس کے ذریعے لوگوں پر حق کی حجت بہرحال تمام ہوگی۔

دوسری بات یہ کہ جب ایک دعوت شروع ہوتی ہے تو وہ چونکہ ایک متحرک چیز ہے اس لیے وہ رفتہ رفتہ اپنا اثر قائم کرے گی اور جس طرح ہم نے پہلے عرض کیا کہ پھر معاشرے میں پولرائزیشن کا عمل ہوگا۔ جن جن پر حق کا انکشاف ہوتا جائے گا وہ اس دعوت کے ساتھ شامل ہوتے چلے جائیں گے اور جن کے دلوں میں کجی ہوگی وہ [illegible] چلے جائیں گے اور بالآخر وہ اس دعوت کے مقابلے میں آ جائیں گے۔ یہ عمل ایک وقت لے گا لیکن اس مرحلے میں حق سے تعلق، ہمدردی اور وابستگی رکھنے والے ایک مرکز پر جمع ہوتے جائیں گے، اور ہر طرف سے کٹ کٹ کر اس دعوت سے جڑتے جائیں گے جس کے نتیجے میں بالآخر حق و باطل کی دو واضح طاقتیں خواہ وہ چھوٹی چھوٹی طاقتوں کے اشتراک سے ہی

جن ہوں، وجود میں آجائیں گی اور پھر ان کا دوبدو مقابلہ ہوگا جب تک یہ نہ ہو انقلاب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

س :۔ ڈاکٹر صاحب۔ اس معاملے میں الجھن یہ ہے کہ پوائنٹ آف ریفرنس تو مشترک ہے، مثلاً آپ کا پوائنٹ آف ریفرنس وہی ہے جو مولانا مودودیؒ کا ہے یا جو مولانا امین احسن اصلاحی یا مولانا وحید الدین خاں کا ہے۔ پہلا اختلاف اس دین کے حوالے کی وجہ سے آپ پر بھی ہے اور ان دوسرے حضرات پر بھی۔ لیکن یہ تمام حضرات بعض مسائل کے بارے میں جو نتائج اخذ کرتے ہیں وہ مختلف ہوتے ہیں۔ اب ایک الجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایک ہی حوالے سے آنے والی ان مختلف تعبیرات کی صورت میں آدمی کہاں جائے جبکہ اس کے نزدیک یہ سارے ہی لوگ اپنی دیانت، اخلاص، اور کردار کی بناء پر اس کے نزدیک یکساں طور پر محترم اور قابلِ اعتماد ہیں، اس دشواری کا کیا حل ہے؟

ج :۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ نے اس سوال کو بہت محدود کر دیا ہے۔ آپ جن حلقوں کو لے رہے ہیں وہ دراصل ایک ہی حلقہ ہے ورنہ یہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ گھمبیر ہے مجھ سے ایک مرتبہ لاہور میں ایک طالب علم نے سوال کیا کہ ایک درس قرآن آپ دیتے ہیں، ایک مولانا مودودیؒ دیتے ہیں، ایک پرویز صاحب دیتے ہیں، ایک فلاں مولوی صاحب دیتے ہیں تو اب آخر کس کی بات کو درست مانیں۔ تو معاملہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ درحقیقت بہت وسیع ہے۔ یہاں صوفیاء کے مختلف طبقے ہیں۔ تبلیغی جماعت ہے۔ علماء کی مختلف تنظیمیں ہیں۔ مختلف دینی مدارس کے لوگ ہیں اور ایک شخص کو ان سب کے افکار سے سابقہ پیش آتا ہے۔

بہر حال اس طالب علم کو میں نے اس وقت جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا کہ بھائی اگر قرآن یا دین کوئی سربستہ علم ہوتا کوئی کسی کتاب نہ ہوتی، کوئی کھلا دین نہ ہوتا یا عربی کوئی مردہ زبان ہوتی جسے سیکھنے کے لئے کہیں سات سمندر پار جانا ضروری ہوتا اور جان جوکھوں میں ڈالنی پڑتی، تب تو آپ کا سوال درست ہوتا اور آپ کی مشکل حقیقی مشکل ہوتی۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا ہے نہیں۔ عربی زندہ زبان ہے قرآن عربی مبین میں ہمارے سامنے موجود ہے اس لئے قرآن و سنت کا خود مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ کس کی بات کس معاملے میں کہاں تک اس معیار کے مطابق ہے اور کہاں تک نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگ اپنی آنکھیں بند رکھنے اور اندھے کی طرح اپنی لاٹھی دوسرے کے ہاتھ میں دینے کے بجائے لنگر لنگوٹ کس کر خود میدان میں اتریں، دین کا علم حاصل کریں اور پھر دیکھیں کہ کس معاملے میں کس کی دلیل مضبوط اور کس کا موقف قرآن و

> اسلامی تحریک تبلیغ تنظیم اور تربیت
> کے مراحل سے گزر کر جب تک نظامِ باطل
> سے دوبدو مقابلہ کی پوزیشن میں [illegible]
> اس وقت تک اسلامی انقلاب کا
> [illegible] رونما نہیں ہوتا۔

سنت کے مطابق ہے۔ پھر جس کی بات درست نظر آئے اسے فوراً قبول کریں اور اس کے دست و بازو بنیں۔ کیونکہ دعوتِ دین کی جدوجہد سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھنے کے لئے یہ دلیل ہرگز درست نہیں ہے کہ اس کے علمبردار مختلف مکاتب فکر میں بٹے ہوئے ہیں۔ آج آپ کو جس کی بات اپیل کر رہی ہے آج اس کا ساتھ دیجئے کل کی تاریخ میں اس سے علیحدہ ہونا جائز نہیں ہے۔ البتہ آنکھیں کھلی رکھیئے، کان کھلے رکھیئے، دیکھتے رہیئے، سوچتے رہیئے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہیئے۔ جب کوئی اس سے بہتر نظر آئے تو اس کا ساتھ دیجئے۔

س :۔ اس میں ایک اور دشواری یہ ہے کہ آدمی کے لئے کلی اتباع کی صورت نہیں بنتی۔ مثلاً ایک شخص کو اپنے حد تک مطالعے اور تلاش و تحقیق کے بعد ایک معاملے میں آپ کی رائے صحیح نظر آتی ہے اور اس میں وہ آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہے۔ دوسرے معاملے میں کسی دوسرے صاحب علم کی رائے اس شخص کو اپنے فہم و شعور اور مطالعہ کی روشنی میں زیادہ صائب اور قابلِ ترجیح نظر آتی ہے اور کسی تیسرے معاملے میں کسی اور کی رائے اسے صحیح تر معلوم ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟ کلی اتباع تو نبی ہی کی ممکن ہے جو اپنی تعلیم وحی الٰہی کی سند کے ساتھ پیش کرتا ہے لیکن نبی کے بعد ایک شخص کو جو یہ دشواری پیش آتی ہے

اس کا حل کیا ہے؟

ج :- بات بہت اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہے اور انشاء اللہ اس کے نتیجے میں بہت سی الجھنیں صاف ہوں گی۔

اس میں اصل مغالطہ یہ ہے کہ وہ مختلف مسئلوں کو یکساں اہمیت دے دیتا ہے جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ جہاں تک علمی اختلافات کا تعلق ہے تو اس بات میں ہرگز کوئی حرج نہیں کہ ایک شخص اپنی تلاش و تحقیق کی روشنی میں کسی معاملے میں ایک فریق کی رائے کو بہتر سمجھے اور اس کی پیروی کرے اور کسی دوسرے معاملے میں کسی دوسرے فریق کی رائے کو ترجیح دے۔ اس علمی اختلاف کو کسی تحریک کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہونا چاہیئے۔

فیصلہ جس بات میں کیا جانا ہے وہ یہ ہے کہ دعوت کس کی صحیح ہے۔ کس کا طریق کار بنیادی طور پر درست ہے۔ اس میں بھی سو فیصد اتفاق ضروری نہیں ہے۔ آنکھیں اور کان اور دل و دماغ کے دروازے اس میں بھی کھلے رکھنے ضروری ہیں۔ اندھی تقلید تو دراصل تحریک کو اپنے ہی ہاتھوں دفن کر دینے کے مترادف ہے۔ فیصلہ صرف یہ کرنا ہوگا کہ کس کی دعوت کا اساسی نقطہ درست ہے۔ طریق کار کے بنیادی اصول صحیح ہیں اور تیسرے یہ کہ کس کی شخصیت پر اپنی امکانی حد تک تحقیق کے بعد سب سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس حد تک اتفاق ہو تو پھر ایسے شخص کا ساتھ دینا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ علمی مسائل میں بالکل آزادی کے ساتھ غور و فکر اور تحقیق و جستجو کا عمل جاری رکھتے ہوئے جس کی رائے بہتر نظر آئے اسے اختیار کرنا چاہیئے۔

میں یہاں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں دراصل تنظیم اسی نہج کی بنانا چاہتا ہوں جس میں آزادی خیال پر کوئی قدغن اور کوئی جبر نہ ہو۔ مگر ایک شخص کو میرے ساتھ کئے ہوئے بنیادی اصولوں سے اس حد تک اتفاق ہو کہ وہ میرے ہاتھ پر بیعت کر لے تو پھر وہ میرا ساتھی ہے۔ اس کے بعد میں اس کے کانوں پہ، اس کی آنکھوں پر کوئی مہر نہیں لگانا چاہتا۔ البتہ جیسا اسے مجھ سے اختلاف کا حق ہے ویسا ہی مجھے بھی ہے۔ اس کی ایک مثال سعید الرحمٰن علوی صاحب کا وہ مضمون ہے جو وہ گزشتہ چند ماہ سے میثاق میں لکھ رہے تھے۔ اس میں انہوں نے مولانا مودودیؒ کے بارے میں بھی بہت سی ایسی باتیں لکھیں جن سے مجھے اختلاف تھا۔ لیکن میں نے انہیں اس کا پورا موقع دیا۔ لیکن اب تازہ میثاق میں اسی موضوع پر میرا مضمون آ رہا ہے جس میں میں نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے نزدیک مولانا مودودیؒ چودھویں صدی کی عظیم اسلامی شخصیات میں شامل ہیں۔ ان کا بڑا بلند مقام ہے۔ ذاتی طور پر میں ان کا بہت ہی ممنون احسان ہوں یہ سب میں نے کھل کر لکھا ہے اور میثاق کے آئندہ شمارے میں انشاء اللہ آ جائے گا۔

میں نے اصل میں کانگریس میں تنظیم کا طریق کار دیکھا کہ اس میں کھلے اختلاف کی گنجائش ہے۔ یہاں تک کہ گروپ بھی بنے ہوئے ہیں۔ الگ الگ بلاک بنے ہوئے ہیں۔ مسائل پر کھل کر گفتگو پر کہیں کوئی قدغن نہیں ہے۔ البتہ جب پارٹی کا ایک فیصلہ ہو جائے تو اس کے مطابق معاملات چلتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ غلبۂ اسلام کی تحریک میں بھی فکر و خیال کی یہی آزادی ہونی چاہیئے۔ اس میں صرف ایک مسئلہ قیادت کی بار بار تبدیلی کا پیدا ہوتا ہے کہ لوگ کبھی کسی کو لیڈر چن لیں گے اور کبھی کسی کو۔ اسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے میں نے بیعت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس میں یہ مطالبہ کہیں نہیں ہے کہ آپ اندھے بہرے اور گونگے ہو کر ہر معاملے میں اس کی تقلید کریں۔ صرف دعوت کے بنیادی اصولوں، طریق کار اور داعی کی شخصیت پر اعتماد ضروری ہے۔ اس کے بعد مسائل پر اظہار خیال کی مکمل آزادی ہے جس کے نتیجے میں مسائل کے مختلف رخ سامنے آئیں گے۔ ذہن بنیں گے۔ رفتہ رفتہ مختلف ایشوز پر اتفاق رائے کی شکل بھی نکلے گی اور اس طرح خوب سے خوب تر کی طرف سفر جاری رہے گا۔

س :- ڈاکٹر صاحب بیعت کا مطلب مکمل اتباع کا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص آپ سے بیعت ہونے کے بعد علمی معاملات میں اختلاف کر سکے؟

ج :- بیعت کا تصور کلی اتباع کا قطعی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بار بار میں جو حدیث بیان کرتا ہوں اس کا مفہوم یہ ہے کہ: "جہاں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے، کسی ملامت کرنے والے کے ڈر سے اپنی زبانوں پر تالے نہیں ڈالیں گے" ــــــ لیکن جو صاحب امر ہے گا اس کا فیصلہ شریعت

کے مطابق ہوتا رہا ہوگا۔

میرے نزدیک درحقیقت اس نوع کی جماعت جس کا ذکر ہو رہا ہے، صرف بیعت ہی سے بن سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو بلکہ قیادت کے لئے انتخابی نظام رائج ہو تو پھر ووٹ فیصلہ کن حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر نوبت یہاں تک آتی ہے کہ جن لوگوں کو ووٹ دینے کا اختیار ملتا ہے، انہیں یہ اختیار دیئے جانے سے پہلے مہینوں اور برسوں تک ایک خاص پروسس سے گزار کر ایک مخصوص طرز میں ڈھال دیا جائے، اور نظم کو اُس پر پورا اعتماد ہو جائے تب ان کے ہاتھ میں ایک ووٹ دینے کا خطرہ مول لیا جائے گا۔ اس طرح سے ایک خاص طرز کی جماعت وجود میں آتی ہے جس میں سارا زور ممبرشپ پر آ جاتا ہے۔ جبکہ بیعت کے اس نظام میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جو میرا ساتھ دیتا ہے حتیٰ کہ میرے لئے محض دعا ہی کرتا ہے وہ میرا ساتھی ہے۔ بیعت کرنے والا صرف ایک نظم کی پابندی کا معاہدہ کرتا ہے۔ ورنہ میرے کاز کا ہر خیر خواہ میرا ساتھی ہے۔ اس نظام میں قیادت کی تبدیلی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بیعت کرنے والا یہ بھی عہد کرتا ہے کہ آپ جسے امیر بنا دیں گے ہم اس کا حکم بھی اگر

ظاہری حالات بہت مایوس کن ہیں لیکن ہم ادائیگیٔ فرض کی خاطر اور اللہ کی قدرت و نصرت کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں

شریعت کے دائرے میں ہوا تو اسی طرح مانیں گے جس طرح آپ کا مانتے ہیں۔ اس طریقے سے نہ تو اوپر کا اسٹرکچر ڈسٹرب ہونے کا کوئی اندیشہ ہوتا ہے، قیادت کا تسلسل برقرار رہتا ہے، انتخابی طریقے میں جو حفاظتی اقدامات کرنے پڑتے ہیں وہ یہاں خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور عام بیعت والی تحریک میں کسی درجہ بندی کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ فلاں کو ووٹ کا حق حاصل ہے اور فلاں کو نہیں ہے، کیونکہ اصل فیصلہ کن شخصیت یعنی داعیٔ تحریک اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ اس نظام میں کھلی گفتگو اور آزادیٔ فکر کی انتہائی گنجائش موجود ہوتی ہے اور اس میں کسی انتشار کا خدشہ نہیں ہوتا۔ یہ ماحول ایسی ہی جماعت میں ممکن ہے، دوسری جماعتوں میں ایک بند قسم کا نظام وضع یا پیدا کرنا پڑتا ہے۔

س:- لیکن اس نظام میں ایک قباحت تو ہے اور وہ یہ کہ سارا نظام اس شخص کی زندگی کے ساتھ تو چل سکتا ہے، اس کے بعد قیادت کا تسلسل اور وہ اپنا اثر جو اس نے قائم کیا تھا کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟

ج:- اس نظام میں قیادت کا تسلسل قائم رکھنے کی کئی شکلیں ہیں اور وہ سب کی سب ہمارے قرنِ اوّل میں ہمارے سامنے آ چکی ہیں۔ نظیریں قائم ہو چکی ہیں۔ اگر تحریک داعیٔ اوّل کی زندگی میں کامیاب ہو کر اسٹیٹ کے درجے تک پہنچ جائے، تب تو ریاست کا شورائی نظام اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ قیادت کس طرح چلے اور سربراہِ مملکت کون ہو۔ اور یہ کام بہرحال الیکشن سے ہوگا۔ وہ جمہوری پروسس جو آج کا ہے اور جو تدریجی ارتقاء کے نتیجے میں آج اس مرحلے تک اسی طرح پہنچا ہے جیسے تلوار سے توپ تک ارتقاء ہوا ہے، اس مرحلے میں عمل میں آئے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سے کوئی چیز حرام نہیں ہے سب مباحات کے درجے میں ہے اور اسلام کے ساتھ اسے شامل کیا جا سکتا ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ یہ کام کسی ایک جنریشن کے اندر نہ ہو جیسا کہ حالات بتاتے ہیں۔ تاریخ میں ایک ہی بار یہ کارنامہ نبی اکرمؐ کی قیادت میں ایک ہی نسل کے ہاتھوں انجام پایا ہے۔ اور بظاہر یہ بہت دشوار ہے کہ پھر کبھی ایسا ہو سکے۔ ایسی صورت میں تحریک کی قیادت کا تسلسل کس طرح برقرار رکھا جائے گا، اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ اگر داعی کو اپنے ساتھیوں پر پورا اعتماد ہو کہ وہ صحیح آدمی کو منتخب کر لیں گے تو فیصلہ ان ہی پر چھوڑا جا سکتا ہے جیسا خود حضورِ اکرمؐ نے کیا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین نامزد کرے جیسا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا اور تیسری شکل یہ ہے کہ معاملہ کسی کمیٹی کے حوالے کر جائے، جس کی مثال خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے قائم کی۔

البتہ بیعتِ ریاست اور بیعتِ جماعت میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ بیعتِ ریاست جب ہو جائے تو وہ ہر شخص کو ماننی پڑے گی کیونکہ اس کا دائرۂ کار ٹیریٹوریل ہوتا ہے جبکہ بیعتِ جماعت کی کوئی ٹیریٹوریل جیورس ڈکشن نہیں

ہے۔ اس لئے اس میں وہ لوگ جنہیں قائد کی شخصیت پر اعتماد
نہ ہو، اپنی بیعت فسخ کر سکتے ہیں۔ یہ معاملہ جانشینی ہی کے
ساتھ نہیں ہے، داعی اوّل کے معاملے میں بھی یہ ہو سکتا ہے
کہ ایک شخص کا خیال اس کے بارے میں بدل جائے، اس کے
فہم و شعور یا کردار پر اعتبار باقی نہ رہے، ایسی صورت میں
بیعت جماعت فسخ کر دینا قطعاً کوئی غلط حرکت نہیں ہے۔
اگر دل میں کسی کھوٹ کی وجہ سے ایسا کیا گیا تو اس کی جواب دہی
اللہ کے ہاں ہو گی لیکن قانونی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

س:۔ آپ نے ابھی داعی اوّل کی اصطلاح استعمال
کی ہے، کیا حضور اکرمؐ کے بعد امت مسلمہ کی کسی تحریک کے
داعی کے لئے اس اصطلاح کا استعمال درست ہے؟
دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ریاست پاکستان ہمارا سرحدی
ریاست جہاد کا اعلان کرے لیکن داعی تحریک اسے جہاد
قرار نہ دے تو ان لوگوں کو جو اس سے بیعت بھی ہیں اور ریاست
کے شہری بھی ہیں کیا کرنا چاہیئے؟

ج:۔ آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ سمجھنا
درست نہیں ہے کہ داعی اوّل صرف حضورؐ ہیں اور کوئی
نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز کی ایک میکینکس ہے اور تحریکوں کی میکینکس
یہ ہے کہ ایک داعی کے بغیر کوئی تحریک شروع نہیں ہو سکتی اس
لئے ہر دور میں جس شخص نے امت کے اندر کوئی تحریک برپا
کی وہ اس تحریک کا داعی اوّل ہے۔ مثلاً سید احمد شہیدؒ اپنی
تحریک کے داعی اوّل ہیں۔ مولانا مودودیؒ داعی اوّل تھے
اس تحریک کے، اگرچہ مجھے اس میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔
میں اس دور کی اسلامی تحریک کا داعی اوّل مولانا ابوالکلام
آزاد کو سمجھتا ہوں اور داعی ثانی مولانا مودودیؒ کو۔ البتہ
جماعت اسلامی کے داعی اوّل مولانا مودودیؒ ہی ہیں۔
جہاں تک حضور اکرمؐ کے مقام کا تعلق ہے تو آپ کی حیثیت
داعی کی نہیں رسولؐ کی ہے۔

اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ داعی اوّل عام
لوگوں سے ممتاز کس بات میں ہوتا ہے تو ایسا نہیں کہ وہ
یہ دعویٰ لے کر اٹھتا ہو کہ مجھ سے بڑھ کر متقی اور دیندار
کوئی اور نہیں ہے۔ اصل میں جو چیز اسے دوسروں سے
ممتاز کرتی ہے وہ دعوت سے عشق کو اپنی زندگی کا واحد
نصب العین بنا لینا اور اسی کی خاطر جینا اور مرنا ہے۔ اسی
بنا پر لوگ اس کے گرد جمع ہوتے ہیں اور تحریک وجود
میں آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دعوت کے تقاضوں اور
تحریک کو لے کر چلنے کے تقاضوں کو نبھانے کے معاملے میں وہ
بحیثیت مجموعی دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اپنی دعوت
کی میکینکس کی باریکیوں کو وہی سب سے بہتر سمجھ سکتا ہے اور
اسی وجہ سے اُسے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنی زندگی میں
وہی اپنی تحریک کی قیادت کرتا رہے۔

جماعتِ اسلامی میں بھی قیادت کے معاملے میں
مولانا مودودیؒ کی فکر بالکل یہی تھی۔ جو آج میں پیش کر
رہا ہوں۔ میں یہ بات وثوق سے کہتا ہوں۔ انہوں نے
بیعتِ داعی کا تصور پیش کیا ہے پھر یہ کہ قیام جماعت سے
چھ ماہ پہلے کا خط میں ریکارڈ پر لے آیا ہوں، جس میں مولانا
نے خود بیعت کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ مارچ ۱۹۴۱ء کا
خط ہے، جو حیدر آباد کے محمد یونس صاحب کو لکھا گیا تھا،
اس خط میں مولانا نے بیعت کی تین قسمیں بیان کی ہیں جس
میں سے ایک بیعت وہ ہے جو جماعت اسلامی کے امیر کے
ہاتھ پر کی جاتی ہے۔ اس خط میں انہوں نے ایک حدیث
کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ بیعت ہے جس کے
بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جو کوئی اس حال میں مرا
کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں وہ جاہلیت
کی موت مرا۔

اب سوال یہ ہے کہ تشکیل جماعت سے صرف

دورِ حاضر کی اسلامی تحریکوں نے مغرب کی مرعوبیت کو ختم کرنے اور اسلام پر مسلمانوں کا اعتماد بحال کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے اب ایمان و یقین کی کیفیت کو مستحکم کرنے کے لیے کام کی ضرورت ہے۔

چھ ماہ پہلے مولانا نے جو بات کہی تھی، جماعت اس اصطلاح
کیوں نہیں بنائی۔ اس بارے میں میرا اندازہ یہ ہے کہ جماعت
کی تشکیل کے مرحلے پر کچھ ایسے علماء مثلاً منظور نعمانی، مرغوب الحق

احسن اصلاحی وغیرہ وہاں جمع ہو گئے تھے جن کے سامنے مولانا نے یہ بات کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور اس کے بجائے یہ کہا کہ میرا کام آپ لوگوں کو جمع کر دینا تھا، اب آپ لوگ جسے مناسب سمجھیں اپنا امیر منتخب کر لیں۔ لیکن میرے خیال میں مولانا کا یہ فیصلہ درست نہیں تھا۔ کیونکہ جس نے جمع کیا تھا چلانا بھی اسی کی ذمہ داری ہوتی ہے اس لئے انہیں کسی تکلف کے بغیر امامت سنبھالنی چاہیئے تھی کیونکہ فطری داعی وہی تھے، اور بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ ان کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہی۔

اب رہا آپ کے سوال کا دوسرا حصہ کہ اگر ریاست جہاد کا اعلان کر دے اور کسی دینی تحریک کی قیادت اس سے اتفاق نہ کرے تو اس کے وابستگان کو کیا کرنا چاہیے۔

اس معاملے میں بات یہ ہے کہ آدمی کسی تحریک سے وابستہ ہو یا نہ ہو۔ بہر حال حکومت کے فیصلے سے اسے اختلاف ہو سکتا ہے۔ محمد علی باکسر نے ویت نام کی لڑائی میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر حکومت سے لڑائی مول لے لی۔ اس لئے انفرادی سطح پر یہ تنازع ہمیشہ ہو سکتا ہے جماعت کی صورت میں یہ ہوگا کہ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہم خود کس مرحلے میں ہیں، اور مسئلہ کی نوعیت کیا ہے۔ اگر ہم PASSIVE RESISTANCE کے مرحلے سے بڑھ کر ACTIVE RESISTANCE میں داخل ہونے والے ہیں، تب تو اختلاف کی صورت میں ہمیں ایک ایسا مرحلہ کا جس پر ہم منظم ہو کر میدان میں نکل کر حکومت کو چیلنج کر سکیں گے کہ اس کی بات درست نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم ابھی اس مرحلے کے قریب نہیں پہنچے تو جس طرح دوسری منکرات برداشت کی جا رہی ہیں اسے بھی برداشت کرنا ہوگا۔ جس طرح ایک وقت تھا کہ مشرکین کعبہ کا طواف اس حالت میں کرتے تھے کہ اس میں بت رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت تحمل کرنے کا کام اختیار کیا گیا۔ لیکن فتح مکہ کے بعد ایک ایک بت توڑ کر کعبہ کو پاک کر دیا گیا۔

س ۶:۔ مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ اگر ریاست پر کوئی بیرونی طاقت حملہ کرتی ہے، یا اندرون ملک کوئی طاقت حکومت کے خلاف بغاوت کر دیتی ہے اور اس کے خلاف جہاد کا اعلان ریاست کی طرف سے ہو جاتا ہے، اس صورت میں ایک ایسے فرد کے لئے جو آپ سے بیعت ہے یہ دشواری پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف ریاست کا شہری ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت کا پابند ہے اور دوسری طرف آپ سے معاہدہ کر کے آپ کی اطاعت قبول کر چکا ہے۔ اب اگر ریاست اور آپ کے فیصلے میں اختلاف ہو تو اسے کیا کرنا چاہیئے؟

ج ۶:۔ اس معاملے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر ریاست پر کوئی بیرونی جارحیت ہو تو اس کا مقابلہ کرنا عین جہاد ہے، اس میں کوئی اختلاف ہی نہیں، وہ ہر حال میں ایک جائز جنگ ہے، اس میں جان دینا شہادت ہے، حدیث ہے کہ جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ بھی شہید ہے۔ اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ اگر ملک کے اندر سے کوئی گروہ کھڑا ہو جاتا ہے، جیسے سعودی عرب میں ہو چکا ہے، تو اس وقت کیا کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں فیصلہ صورتحال کے مطابق ہوگا، اور امیر باہمی مشاورت سے کسی نتیجے پر پہنچے گا۔ اب اگر کسی فرد کو جماعت کے فیصلے سے اختلاف ہو تو اسے یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اسے اپنی جماعت کی قیادت کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دینا چاہیئے۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے تو اس کے لئے بیعت فسخ کر لینے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر وہ معاملے کو اتنا اہم نہیں سمجھتا تو پھر اسے جماعت کی ہدایت کو قبول کر لینا چاہیئے۔

یہ صورت حال صرف اعلان جہاد ہی کی شکل میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ کسی بھی مسئلے پر اختلاف کی شکل میں فرد اس دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہی مسئلہ حضرت حسینؓ کا تھا۔ ان کے نزدیک یزید کی جانشینی اتنی بڑی خرابی تھی کہ اسے چیلنج کرنا ضروری تھا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے نزدیک یہ اتنی بڑی خرابی نہیں تھی۔ وہ اسے اس درجے کی خرابی نہیں سمجھتے تھے جسے چیلنج کرنا ضروری ہو۔

س ۷:۔ انبیاء کسی غیر اسلامی معاشرے سے، کسی کافرانہ معاشرے سے یا بگڑے ہوئے مسلمانوں کے معاشرے سے بھی جہاں ان کو مبعوث کیا گیا ہو، اپنی دعوتی جدوجہد پر معاشرے سے کسی اجر کے طالب نہیں ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ یہ بات ان کی بے لوثی کی دلیل ہوتی تھی اور لوگوں کی جانب سے ان پر مفاد طلبی کا کوئی الزام لگانا ممکن نہ ہوتا تھا۔ لیکن ہمارے زمانے میں جو مذہبی جماعتیں اپنے دعوتی کام کے ساتھ مختلف لوگوں سے کسی نہ

کسی صورت میں صلے کی طالب ہوتی ہیں، ووٹ کی شکل میں، اقتدار کی شکل میں، کیا اس عمل سے لوگوں کی نظر میں ان کی بے لوثی مشتبہ نہیں ہو جاتی، اور قطعی بے غرضی کے ساتھ کام کے نتیجے میں انہیں معاشرے کا جو اعتماد حاصل ہو سکتا ہے کیا وہ اس سے محروم نہیں ہو جاتیں؟

ج:- میں سمجھتا ہوں کہ انتخابی عمل میں یہ قباحت موجود ہے، دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہو سکتا ہے کہ یہ ووٹ کی بھیک مانگنے آ گئے، تو یہ چیز بے لوثی کو مشتبہ تو ضرور بنا دیتی ہیں جبکہ انقلابی عمل میں ایسی کوئی مشکل نہیں ہوتی۔

س:- لیکن اگر سب سے پہلے لوگ اسی بے لوثی کے مظاہرے کی خاطر انتخابی سیاست سے جو بہرحال جاری ہے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائیں تو کیا غلط کار لوگوں کو کھل کھیلنے کے لیے کھلا میدان نہیں مل جائے گا؟ آپ کی جانب سے انتخابی سیاست کی ضرورت کے اظہار کے باوجود جو لاتعلقی کی پالیسی اختیار کر رکھی گئی ہے، اگر دوسری دینی جماعتیں بھی یہی طریقہ اختیار کر لیں تو کیا نتیجہ یہی نہیں ہو گا کہ لادینی قوتیں بلا شرکت غیرے تمام اختیارات کی مالک بن جائیں گی؟

ج:- غلط کار لوگوں کی معاونت ہماری جانب سے اسی صورت میں سمجھی جا سکتی ہے جب ہم انتخابی عمل پر کسی بھی صورت میں اثر انداز نہ ہو رہے ہوں۔ لیکن دو چیزیں ہیں جو اس سوال کی زد سے ہمیں الگ کر دیتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہم PASSIVE لوگ نہیں ہیں، ہم اسلام کے [illegible] سرگرم عمل ہیں، سیاست کے میدان میں اسلامی قوتیں ہیں ہم انہیں بالواسطہ تقویت پہنچا رہے ہیں، اور غیر اسلامی قوتوں کے خلاف زمین ہموار کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک بات ہے خود جا کر ووٹ مانگنا، ہم نے صرف اس کی نفی کی ہے، ووٹ دینے کی نفی نہیں کی ہے، ووٹ نہ صرف ہم خود دیں گے بلکہ لوگوں سے بھی کہیں گے کہ معیاری دو شرطیں اپنے سامنے رکھو۔ ایک تو یہ کہ جسے ووٹ دو یہ دیکھ کر دو اور اخلاقی حد تک چھان پھٹک کر دو کہ وہ اسلام کا پابند ہو، نماز پڑھتا ہو، شرابی نہ ہو، کھرے کردار کا مالک ہو، اور دوسرے یہ کہ کسی ایسی پارٹی سے وابستہ نہ ہو جس کے منشور میں کوئی نکتہ اسلام کے خلاف ہو۔ اس اقتباس سے آپ کا اعتراض ہم پر وارد نہیں ہوتا۔

س:- آپ کے خیال میں اسلامی تحریک کے لیے تیز رفتار صورت، انقلابی عمل کی ہے۔ اب اگر ساری دینی جماعتیں انتخابی طریقے کو چھوڑ کر آپ کا طریقہ اختیار کر لیں تو پھر آخر انتخابات میں وہ امیدوار کہاں سے آئیں گے جنہیں اسلامی ذہن رکھنے والا ایک ووٹر ووٹ دے سکے؟

ج:- اگر ساری دینی جماعتیں ہماری دعوت سے اتنی متاثر ہو جائیں کہ اپنا طریق کار ترک کر کے ہمارا طریقہ اختیار کر لیں تب تو کام بہت ہی آسان ہو جائے گا، برسوں کی مسافت دنوں میں طے ہو جائے گی اور اسلامی انقلاب برپا ہو جائے گا، لیکن بظاہر یہ بہت بعید از امکان بات ہے جو کچھ متوقع ہے وہ یہی ہے کہ مختلف طرح کی جماعتیں اپنے اپنے طور پر دین کا کام کرتی رہیں گی اور ہماری جانب سے انتخابی طریقے پر کاربند دینی جماعتوں سے بالواسطہ تعاون کا سلسلہ برقرار رہے گا۔

س:- آپ نے اپنے طریق کار میں ہجرت اور جہاد کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ جہاد کی انتہائی شکل قتال ہے کیا ACTIVE RESISTANCE کے مرحلے میں اس بات کا امکان ہے کہ نوبت قتال تک جا پہنچے، کیا مسلمانوں کے درمیان قتال خونریزی کرنا یا اس کے اسباب فراہم کرنا جائز ہے؟

ج:- غلبہ دین کی اس جدوجہد میں اگرچہ قتال

خواتین اور ڈاکٹر اسرار احمد

س:- عام تاثر ہے کہ خواتین آپ سے بہت برہم ہیں، اس کا کیا سبب ہے؟

ج:- میرے نزدیک یہ بہت بڑا مغالطہ ہے، میری ہم خیال خواتین کی تعداد مجھ سے اختلاف رکھنے والی بیگمات سے کہیں زیادہ ہے لیکن چونکہ ذرائع ابلاغ انہیں پروجیکٹ کرتے ہیں، ان کی خبریں حاشیوں اور سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتی ہیں اس لیے تاثر یہی بنتا ہے کہ خواتین میں میری مخالفت بہت زیادہ ہے۔

شخصیت پرستی کا روگ مسلمانوں میں فرقہ بندی کا ایک اہم سبب ہے

ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے، لیکن خروج حرام مطلق بھی نہیں ہے، البتہ اس کی شرائط بہت سخت ہیں۔ ہمارے پروگرام میں جو کچھ شامل ہے وہ منکرات کے خلاف پرامن احتجاج کی مختلف شکلیں ہیں، جس کے نتیجے میں ہم پر تشدد متوقع ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تشدد ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا جس کے بعد ان شاء اللہ حالات میں تبدیلی رونما ہوگی اور اسلامی انقلاب برپا ہو جائے گا۔

س:۔ آپ کے خیال میں مسلم معاشرے میں بگاڑ کی وہ کون سی بنیادی صورتیں ہیں جو اسلامی انقلاب کی راہ میں حائل ہیں؟

ج:۔ سب سے بڑی رکاوٹ بے یقینی و ایمان کا اضمحلال، اس ایمان کو زندہ کرنے کا ذریعہ قرآن ہے اور میں ۲۰ برس سے اسی جدوجہد میں مصروف ہوں کہ لوگوں میں قرآن سے لگاؤ اور قرآنی شعور پیدا ہو۔

س:۔ آپ کی اس جدوجہد کے نتائج کیا رہے ہیں؟ اور انہیں آپ کس حد تک حوصلہ افزا سمجھتے ہیں؟

ج:۔ بہت کم حوصلہ افزا، اگر ظاہری نتائج کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرتا ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ صورت حال مایوس کن رہی ہے اور اس کی بناء پر مجھے اعتراف شکست کر کے بیٹھ جانا چاہیے، لیکن میری جدوجہد کا مقصد تو اپنے فرض کی ادائیگی ہے، نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تنظیم کے بارے میں بھی میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے کوئی تنظیم قائم کر لی ہے، صرف یہ کہتا ہوں کہ اس بات کی کوشش کر رہا ہوں۔

س:۔ اب تک آپ کے وابستگان کی تعداد کتنی ہے؟

ج:۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار حضرات ہیں جنہوں نے مجھ سے بیعت کی ہے، لیکن ان میں جنہیں میں واقعتاً پوری طرح سنجیدہ سمجھتا ہوں وہ پانچ سو سے زائد نہیں۔

س:۔ آپ کے نزدیک غیر مسلم قوتوں خصوصاً بڑی طاقتوں نے اسلامی انقلاب کی راہ روکنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی ہیں، گزشتہ نصف صدی سے مسلم دنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد جاری ہے مگر کامیابی اب تک نہیں ہوئی، اس کے اہم خارجی اسباب کیا ہیں؟

ج:۔ میرے نزدیک اصل اہمیت خارجی اسباب کی ہے ہی نہیں۔ اصل مسئلہ داخلی ہے، اپنے ایمان اور کمٹ منٹ کی کمزوری ہے۔ یہ اضمحلال صدیوں کا ہے۔ اس کیفیت کو بدلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس میں وقت لگے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر آج کی دنیا میں کسی ایک ملک میں بھی اگر واقعتاً اسلامی انقلاب جڑیں جما چکا ہو تو اسے نہ روس روک سکتا ہے نہ امریکہ بلکہ ان دونوں کے درمیان طاقت کا جو توازن ہے وہ کسی خطے میں پروان چڑھتے ہوئے اسلامی انقلاب کے لیے تحفظ کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اب اندرونی رکاوٹوں میں ایمان و یقین کی کمزوری کے علاوہ دوسری

> اسلامی نظام کے قیام کے بجائے محض جزوی اصلاح کی کوششیں اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ تو بن سکتی ہیں مگر دین کی کوئی مفید خدمت اس سے انجام نہیں دی جا سکتی۔

چیز تفرقہ ہے۔ کسی بھی انقلابی تحریک کے لیے ضروری ہے کہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ علماء کی حمایت اور اعتماد حاصل کرنے کا کام کرے۔ یہ دشوار کام ہے، وقت لگے گا۔ لیکن ایک دن آئے گا کہ ان میں سے بھی

خاصی تعداد اس کام کے لیے نکلے گی۔ تعمیر کا یہ کام ہمارا زوال اتنا طویل اور اتنا گہرا تھا کہ ابھرنے کا عمل بھی وقت لے گا۔ درجہ بدرجہ آگے بڑھے گا اور ہو سکتا ہے کئی نسلوں کے بعد مکمل کامیابی کی منزل آئے۔ جن میں سے دو یا تین نسلیں گزر چکی ہیں۔ اس احیائی عمل کا پہلا مرحلہ مغربی استعمار کی براہِ راست غلامی سے نجات کا تھا۔ پوری تیسری دنیا اس دور میں غلامی سے آزاد ہوئی۔ اس عمل میں اسلام کہیں بھی قوت محرکہ نہیں تھا۔ پاکستان میں صرف اسلام کا نام لیا گیا اور کسی مسلم ملک میں نام بھی نہیں لیا گیا۔ اس کے باوجود میرے نزدیک احیائے اسلام کا یہ بھی ایک مرحلہ ہے۔

دوسرا مرحلہ دینی تحریکوں کا تھا جن میں الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ برصغیر میں اسلامی تحریک کے پہلے داعی میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد ہیں لیکن وہ بہت جلد علماء کے رد عمل سے بددل ہو کر دوسرے راستے پر نکل گئے۔ ان کے بعد مولانا مودودیؒ نے اس کام کو سنبھالا۔ انہوں نے اپنی محنت، لگن اور جدوجہد سے بہرحال ایک عمارت کھڑی کی اور علماء کی مخالفتوں کے باوجود یہ کام کر کے دکھا دیا لیکن پاکستان بننے کے بعد میرے خیال میں ان کی ایک غلطی کی وجہ سے ان کی تحریک کو نقصان پہنچ گیا۔ اگرچہ تحریک چل رہی ہے اور میں اپنے آپ کو اسی تحریک کا ایک جزو سمجھتا ہوں۔ بہرحال دینی تحریکوں کے اس مرحلے میں اسلامی طاقتوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ مغرب کی مرعوبیت ختم ہوئی ہے۔ نوجوانوں میں اسلام پر اعتماد، اس سے لگاؤ اور دینی شعور پیدا ہوا ہے اور بحیثیت مجموعی پوری امت میں خود اعتمادی ان تحریکوں کے ذریعے پیدا ہوئی ہے۔ اسلام ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا ہے۔ لیکن ان تحریکوں کے ذریعے وہ اصل کام جو ایمان کی جڑوں کو مضبوط کرنے کا تھا وہ نہیں ہو پایا ہے۔ اب اگر تیسرے مرحلے میں یہ کام ہو جائے تو یہ سب چیزیں مل کر ان شاء اللہ ایک بہت بڑا نتیجہ پیدا کریں گی۔

بشکریہ ہفت روزہ تکبیر کراچی

ڈاکٹر صاحب جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے کبھی رکن نہیں رہے
اس معاملہ میں تسامح ہوا ہے البتہ ۵۵ء کے سالانہ اجتماع کے موقع پر
دستورِ جماعت اسلامی کی تدوین نو کیلئے جو مجلس دستور ساز منتخب ہوئی تھی
اس کے رکن منتخب ہوئے تھے۔

(ادارہ میثاق)

سلسلۂ استحکامِ پاکستان (۳)

اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور پاکستان

وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ

27 MAR 1986

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیرِ مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون ۸۵۲۶۹۳

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۶

مشمولات

تنظیمِ اسلامی کے گیارہویں سالانہ اجتماع

جمعہ ۴ر تا اتوار ۶ر اپریل ۱۹۸۶ء

بمقام: ۳۶- کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

کے ضمن میں قیّم تنظیمِ اسلامی چوہدری غلام محمد صاحب کا

رفقاءِ تنظیم کے نام پیغام:

اِس اجتماع میں تمام رفقائے تنظیمِ اسلامی کی ہمہ وقت شرکت لازمی ہے۔ لہٰذا آپ بھی اِس کا اہتمام فرمائیں۔ اور اگر آپ کسی شدید عذر کی بناء پر شرکت سے معذور ہوں تو تفصیلی معذرت ارسال فرمائیں۔

پہلی باقاعدہ نشست اگرچہ ۴ر اپریل بروز جمعۃ المبارک بعد نمازِ مغرب شروع ہوگی تاہم رفقاء کے لیے ضروری ہے کہ وہ قبل از نمازِ جمعہ قرآن اکیڈمی پہنچ جائیں یا نمازِ جمعہ مسجد دارالسلام باغِ جناح لاہور میں ادا کریں۔ سالانہ اجتماع کی آخری نشست ۶ر اپریل بروز اتوار قبل از نمازِ ظہر اختتام پذیر ہوگی تاہم شام کو انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ اجلاس میں رفقاء کی شرکت پسندیدہ ہوگی۔ اجتماع کے دوران تمام رفقاء کی رہائش قرآن اکیڈمی میں ہوگی۔ اس کے لیے حتی الوسع ضروری انتظامات کیے جائیں گے تاہم موسم کے مطابق بستر اور ذاتی استعمال کے برتن آپ ساتھ لائیں۔ جمعہ ۴ر اپریل کو صبح سات بجے سے دوپہر بارہ بجے تک لاہور ریلوے سٹیشن پر تنظیم کی جانب سے استقبالیہ کیمپ لگا ہوگا اور اس عرصے کے دوران وہاں پہنچ جانے والے حضرات کو ماڈل ٹاؤن پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر ہوگی۔ بعد میں تشریف لانے والے حضرات کو مقامِ اجتماع پر خود ہی پہنچنا ہوگا۔

(احقر غلام محمد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ دینی جماعتوں کا سیاسی اتحاد ۔ یا

ایک متحدہ مذہبی محاذ کا قیام

جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے لاہور کے ۶ مارچ کے جلسۂ عام میں مذہبی مزاج کی حامل جملہ سیاسی جماعتوں کو اتحاد اور اشتراکِ عمل کی دعوت دی ہے۔ جو بظاہر تو نہایت مبارک اور خوش آئند ہے لیکن اوّل تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کام فی نفسہٖ بہت مشکل ہے۔ دوسرے خود میاں صاحب نے اس ضمن میں "جماعتِ اسلامی کے ساتھ مل کر کام کریں" کے الفاظ کے ذریعہ جماعت اسلامی کی اوّلیت اور بقیہ سب کی ثانویت کو نمایاں کر کے گویا اس دعوت پر لبیک کہنے کے دروازے خود بند کر دیئے ہیں۔ چنانچہ مولانا فضل الرحمٰن کی جانب سے تو بالواسطہ طور پر انکار فوری طور پر یعنی اگلے ہی روز ۷ مارچ کے پشاور کے جلسۂ عام میں آ گیا ہے۔

میاں صاحب کی حالیہ دعوتِ اتحاد کی مخاطب تو صرف وہ جماعتیں یا جمعیتیں ہیں جو سیاسی اہمیت کی حامل بھی ہیں اور انتخابات میں حصہ لینے کی پالیسی پر عامل بھی، مزید برآں انہوں نے ان کے نام بھی معیّن کر دیئے ہیں۔ لہٰذا اس دعوت کے ضمن میں تو راقم الحروف اور تنظیم اسلامی خارج از بحث ہیں تاہم اب سے لگ بھگ چار سال قبل جناح ہال لاہور میں منعقدہ "تعلیم القرآن کانفرنس" میں میاں صاحب نے جو دعوتِ عام دی تھی کہ "ہمیں چاہیے کہ قرآن کی اساس پر جمع ہو جائیں!" تو اس کے ضمن میں راقم نے میاں صاحب سے دریافت کیا تھا کہ:

> "...... آپ کے پاس اس اتحاد کے لئے تفصیلی پروگرام کیا ہے؟ اور آیا اس سے مراد بالعدم جماعت اسلامی میں شمولیت کی دعوت ہے یا یہ کسی وسیع تر دینی اتحاد کی پیشکش ہے؟ اور اگر یہ وسیع تر دینی اتحاد کی دعوت ہے تو بالفرض اگر میں آپ کی اس پکار پر لبیک کہوں تو ایک طرف مجھے کیا تقاضے پورے کرنے ہوں گے اور آپ کی مجھ سے توقعات کیا ہوں گی!

اور دوسری طرف اس مجوزہ 'تعاون علی البرّ والتقویٰ' کے ضمن میں اشتراکِ عمل کے لئے کونسا میدانِ کار آپ کے سامنے ہے؟"

اس کے بعد راقم الحروف نے جماعتِ اسلامی کے موجودہ طریقِ کار سے اپنے اختلاف کو تفصیلاً معیّن کرتے ہوئے لکھا تھا:

"تاہم اس سب کے باوجود ــــ اگر کسی وسیع تر دینی اتحاد و اشتراکِ عمل کا کوئی واضح پروگرام آپ کے سامنے ہو تو ان شاء اللہ العزیز آپ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس ضمن میں 'انا اوّل المسلمین' کی سی شان کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے پائیں گے۔" (شائع شدہ 'میثاق' جولائی ۱۹۸۲)

اس کا جو جواب میاں صاحب کی جانب سے موصول ہوا تھا اس کے آخری الفاظ، گویا لبّ لباب یہ تھا کہ:-

"...... جب تک طریقِ کار اور حکمتِ عملی پر اتفاق نہ ہو جائے دین کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے اپنے طریقِ کار اور پالیسی کے مطابق اقامتِ دین کا مثبت کام کیا جائے۔ اور کسی دوسرے کے کام کو پبلک پلیٹ فارم پر یا پریس میں ہدفِ ملامت و نکتہ چینی نہ بنایا جائے۔"

بنابریں حالیہ 'دعوتِ اتحاد' کے ضمن میں میاں صاحب سے مخاطب ہونے کی جرأت میرے لئے نہ ضروری ہے نہ مناسب،

تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک "الدّینُ النّصیحۃ" پر عمل کرتے ہوئے حسبِ ذیل گذارشات میاں صاحب سمیت جملہ خادمانِ دین اور اکابرِ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کی خدمت میں پیش ہیں:

۱۔ فیڈریشن یا کنفیڈریشن یعنی مرکز اور صوبوں کے مابین ذمّہ داریوں اور اختیارات کی تقسیم کا معاملہ ہو یا صوبوں کی ازسرِنو تشکیل یا تقسیم کا معاملہ ــــ اسی طرح خواہ علاقائی قومیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہو خواہ علاقائی زبانوں کے تحفظ کا معاملہ ــــ یہ جملہ امور خالص سیاسی ہیں اور ان کا دین کے ساتھ تعلق صرف بالواسطہ اور ثانوی ہے، براہِ راست نہیں، لہٰذا ان کی اساس پر کسی سیاسی اتحاد کی بات تو ہو سکتی ہے لیکن انہیں کسی دینی اتحاد کی اساس بنانا خود دین و مذہب کی مصلحت کی رُو سے درست نہیں ہے۔

۲۔ البتہ اسلامی نظام کے قیام یا نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ اور شریعتِ اسلامی کی کلی اور ہمہ گیر تنفیذ کو ایک دینی اتحاد کی مثبت اساس بنایا جائے تو یہ نہایت مستحسن اقدام ہوگا۔ اور اس میں کم از کم اُن جملہ جماعتوں کی شرکت و شمولیت معقول بھی ہوگی اور مطلوب بھی جو اس مقصد کے حصول کے لئے جمہوری اور انتخابی طریق کو درست اور مناسب سمجھتی ہیں ـــــــ اور اگرچہ خود راقم الحروف اور اس کی قائم کردہ 'تنظیمِ اسلامی' کی حتمی رائے یہ ہے کہ یہ مقصد انتخابات کے راستے سے نہیں بلکہ صرف 'انقلاب' کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے ـــــــ تاہم اگر ایسا کوئی اتحاد ممکن العمل ہو تو اس کے ضمن میں ہم نہ صرف دعا گو رہیں گے بلکہ بالواسطہ طور پر اسے ہر ممکن طریقے سے تقویت بھی پہنچائیں گے ـــــــ البتہ راقم کے نزدیک ان جماعتوں کا اس قسم کے رشتۂ اتحاد میں منسلک ہو جانا جو انتخابات کے میدان میں خود ایک دوسرے کی حریف ہوں تقریباً ناممکن ہے۔

۳۔ البتہ ایک دوسری سطح پر کوئی 'متحدہ مذہبی محاذ' یا 'تحفظِ شریعت محاذ' قابلِ عمل بھی ہے اور وقت کی اہم ضرورت بھی ـــــــ بلکہ اگر یہ عرض کیا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اگر وہ وجود میں نہ آیا تو یہ ایک اجتماعی جرم ہوگا جس کی ذمہ داری سے پوری موجودہ ملتِ اسلامیہ پاکستان اور بالخصوص اس کے دینی اکابر کبھی بَری نہ ہو سکیں گے ـــــــ اس ممکن العمل اتحاد کا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اسلامی نظام کے قیام یا نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ کے طریقِ کار کے علاوہ خود اس نظام کی بعض تفصیلات و ترجیحات کے ضمن میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے، مدافعانہ انداز میں شریعتِ اسلامی کی متفق علیہ تعلیمات اور اسلام کے مجمع علیہ شعائر کے تحفظ کے لئے جملہ دینی و مذہبی جماعتیں، جمعیتیں اور تنظیمیں ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں، قطع نظر اس سے کہ وہ سیاسی میدان میں بھی برسرِکار ہوں یا خالص مذہبی و سماجی اور تبلیغی و تدریسی خدمات سرانجام دے رہی ہیں اور عام اس سے کہ ریاست اور حکومت کی سطح پر بھی تبدیلی کی خواہاں جماعتیں انتخابی طریق پر عمل پیرا ہوں یا بزعمِ خویش، انقلابی طریق کو اختیار کئے ہوئے ہوں۔

ہر صاحبِ درد مسلمان تسلیم کرے گا کہ ایسے متحدہ محاذ کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں اب تک ہوا یہ ہے کہ جملہ دینی جماعتیں تو اپنے اپنے طریقِ کار کے مطابق کُل دینِ حق کی اقامت یا کامل نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ کے لئے کوشاں رہیں اور اس ضمن میں اپنے اپنے طریقِ کار پر عمل پیرا رہیں اور اپنے خیال کے مطابق آگے ہی کی جانب دیکھتی رہیں۔

لیکن اس اثنا میں الحاد اور اباحیت نے ہمارے معاشرے میں بھرپور نقب لگالی۔ نتیجۃً احوال اجتماعیہ میں تو شریعت کے کلی نفاذ کے ضمن میں کوئی پیش قدمی نہ ہوئی تھی نہ ہوئی، اُلٹا لینے کے دینے پڑ گئے اور الحاد و اباحیت نے انکارِ حدیث اور استخفافِ سُنّت کی راہ سے احوالِ شخصیہ تک میں اثر و نفوذ حاصل کرلیا۔ چنانچہ آج ہمارے سامنے ایک عجیب متضاد صورتحال ہے کہ بھارت میں تو مسلمانوں کے عائلی قوانین کے ضمن میں آج تک کسی مضبوط سے مضبوط حکومت کو بھی دخل اندازی کی جرأت نہ ہوئی اور حال ہی میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے ایک فیصلے کے خلاف مسلمانانِ بھارت کا ردِّ عمل اس شدت سے ظاہر ہوا کہ راجیو گورنمنٹ کو گھٹنے ٹیکتے ہی بنی اور ادھر پاکستان میں وہ عائلی قوانین جنہیں ۱۹۶۱ء میں شیعہ اور سُنّی، اہل حدیث اور حنفی، اور دیوبندی اور بریلوی بجملہ مکاتبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے خلافِ شریعت قرار دیا تھا[1] وہ پورے پچیس برس سے باضابطہ نافذ ہیں اور سیکولر نقطۂ نظر کی حامل سیاسی جماعتوں پر مستزاد بے پردہ اور مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین و بیگمات اور ان کے ہم خیال اور سرپرست مفکرین و دانشور اسلام کی سماجی قدروں کو تہ و بالا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

بنا بریں میری ناچیز رائے میں ایک ایسے متحدہ مذہبی محاذ کا فوری قیام نہایت ضروری ہے جس کا انداز مدافعانہ ہو اور جس کا دائرہ عمل صرف چند متعین اور متفق علیہ امور تک محدود رہے۔ اور بالکل ایسے جیسے ایم آر ڈی (MRD) چند متعین اور متفقہ سیاسی مقاصد کے لئے قائم ہوئی تھی مجوزہ مذہبی محاذ (MMM) بھی اپنے دائرہ کار کو چند معین امور تک محدود رکھے اور اس کے ضمن میں جملہ فیصلے بھی کثرتِ رائے سے نہیں بلکہ اتفاقِ رائے (Consensus) سے کئے جائیں اور بقیہ جملہ معاملات میں اس اتحاد یا محاذ میں شامل جماعتیں اور تنظیمیں "Agree To Differ" کے انداز میں آزادانہ موقف اور طرزِ عمل اور طریق کار اختیار کرسکیں۔

راقم نے اس متحدہ محاذ کے قیام کی یہ تجویز بعض اکابر کے سامنے رکھی تو انہوں نے اُسے سراہا، میری خواہش تھی کہ اسے منظرِ عام پر میں خود نہ لاؤں بلکہ اکابر ہی میں سے کوئی اہم شخصیت

---

[1] ان جملہ مکاتبِ فکر کے چودہ چوٹی کے علماء کا متفقہ بیان ماہنامہ حکمتِ قرآن کی اسی ماہ کی اشاعت میں ہے۔ جو یقیناً ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کو لے کر اٹھے۔ لیکن افسوس ہے کہ وقت نکلا جا رہا ہے اور اس کی جانب پوری توجہ نہیں دی جا رہی۔ لہٰذا اپنی اس تحریک کے ذریعے اس تجویز کو منظرِ عام پر لا کر میں اپنے آپ کو عند اللہ بَری سمجھوں گا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دین کا درد رکھنے والی اور اس کے ساتھ نصح و اخلاص کا تعلق رکھنے والی تمام سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کے سرکردہ حضرات کو اس تجویز کو روبعمل لانے کی جانب متوجہ فرما دے۔

آخر میں صرف اتنی گذارش اور ہے کہ اگر یہ تجویز اکابر کو قابلِ قبول ہو تو یہ عاجز و احقر اور اس کے تمام ساتھی ان شاء اللہ العزیز ایسے کسی متحدہ مذہبی محاذ کے ضمن میں چپراسیوں اور چوکیداروں کی خدمات سرانجام دینے کو بھی موجبِ سعادت سمجھیں گے۔

راقم الحروف نے اس تجویز پر مشتمل ایک مختصر بیان بعض اخبارات کو جاری کیا تھا۔ اردو اخبارات کے ساتھ ساتھ انگریزی اخبارات نے بھی اسے نمایاں طور پر شائع کیا۔ روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور کی گیارہ مارچ کی اشاعت میں شائع شدہ خبر کا عکس شاملِ اشاعت ہے۔ اور روزنامہ ڈان، کراچی کی خبر حکمتِ قرآن میں ملاحظہ فرمائیں۔

The Pakistan Times, Tuesday, March 11, 1986.

'United religious front' to provide basis for alliance —DR. ISRAR

BY A STAFF REPORTER

Dr. Israr Ahmad, Ameer Tanzim-i-Islam, has underscored the need for forging United Religious Front (Mutthida Mazhabi Mahaz).

In a statement issued in Lahore on Monday, Dr. Israr Ahmad stressed that the proposed Mahaz should confine its activities to certain specified and agreed religious issues and suggested that all decisions be taken with a consensus as far as possible. He hoped that such a 'Mahaz' could form the basis of a bigger alliance of the religious parties in the future and might be an instrument in removing the misunderstandings which came to surface occasionally because of lack of communication among the leaders. He assured that he and his supporters would not seek any office and would deem it an honour and a privilege to offer any services asked for, if a 'Muttahida Mazhabi Mahaz' was formed.

Calling upon all the politico-religious, non-politico-religious and solely religious organi-

sations of Pakistan to wage a concerted struggle for safeguarding at least the "agreed religious issues and the basic tenets of Islam" the Ameer, Tanzim-i-Islami said: "experience so far has shown that it is not possible for rival political parties to unite on a positive political programme which may result in the victory of Islam-loving forces in elections and then enforce Islam in the country. This is the only reason why a significant progress could not be made towards the enforcement of Islam in Pakistan." Dr. Israr Ahmad added "Taking advantage of this sorry state of affairs, the modern educated persons, who were by and large deeply influenced by the Western ideologies, civilisation and culture, used rather, mis-used the name of Islam and deprived the Muslims of Pakistan even of the personal religious freedom which they had enjoyed under the British regime."

Dr. Israr Ahmad said that it would augur well and would be very encouraging if the politico-religious parties make a positive response to the unity call of Mian Tufail Muhammad for the sake of enforcing Islam in the country. "At the moment unity among the various parties, based on religion, for the safe guard of the Muslim Personal Law and Tenets of Islam is a must and the dire need of the time". Dr. Israr Ahmad said if this is ignored, the responsibility of the serious consequences will rest on the leaders of the religious parties.

Citing the example of the Indian Muslims, against whose united protest India's powerful Government had to yield and accept their religious demands, inspite of Indian Supreme Court Judgement, Dr. Israr Ahmad emphasised on the formation of a "Muttahida Mazhabi Mahaz."

۲- پاکستان کی اراضی اور انفرادی ملکیت

روزنامہ 'نوائے وقت' کے 'فقیر سرراہے' محترم وقار انبالوی مدظلہ' نے ۳ مارچ ۸۶ء کی اشاعت میں ملکیت زمین سے متعلق راقم الحروف سے منسوب رائے پر چند اشکالات بشکل سوال پیش فرمائے ہیں۔ تو اگرچہ 'سرراہے' ایک فکاہی کالم سمجھا جاتا ہے اور فکاہی کالموں کی باتوں کو بالعموم سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا ـــــ تاہم اوّلاً اس بنا پر کہ 'فقیر سرراہے' میرے علم کی حد تک پاکستان کے معمر ترین صحافی ہیں اور اس اعتبار سے ادب و احترام کے مستحق ہیں اور راقم نہ صرف ان کی ہفت زبانی کا دل سے معترف ہے بلکہ ان کی یہ بات تو بہت ہی قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے زمانے کے عمومی

رنگ بدل جانے کے باوجود اپنے کالم کو تا حال ابتذال سے بچایا ہوا ہے اور مولانا چراغ حسن حسرت اور ملک نصر اللہ خاں عزیز کے ذوق و معیار کو برقرار رکھا ہوا ہے ـــــ ثانیاً اس بنا پر کہ انہوں نے کبھی نہ صرف اس کالم میں بلکہ پہلے بھی ہمیشہ میرے ذکر کے ضمن میں میری انتہائی بے بضاعتی کے علی الرغم ' پوری سنجیدگی اور ' وقار ' کو ملحوظ رکھا ہے اور ـ ثالثاً اس وجہ سے کہ جو سوالات انہوں نے اٹھائے ہیں وہ فی نفسہٖ بہت اہم ہیں اور ایک ایسے مسئلے سے متعلق ہیں جس کے ضمن میں عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں اشکالات موجود ہیں ـــ میں اپنی رائے قدرے وضاحت سے پیش کر رہا ہوں ـــــ اگرچہ اندیشہ ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا مقالہ بن جائیگا۔

چونکہ ۲ ، مارچ کو ہفتہ عشرہ گذر چکا ہے ' لہٰذا مناسب ہے کہ جواب سے قبل ' صاحب سرراہے ' کی پوری عبارت درج کر دی جائے تاکہ سوالات سامنے آ جائیں !

" امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بالقابہ نے اپنے ایک تازہ ارشاد میں فرمایا ہے کہ اسلامی نظام میں جملہ اراضی ریاست (حکومت) کی ملکیت ہوگی اپنی تنظیم کے منشور کے سلسلے میں فرمایا کہ شرعی حدود کے اندر انفرادی ملکیت اور آزاد معاشی جدوجہد کی فضا برقرار رہے گی ' یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انفرادی ملکیت کی شرعی حدود میں کیا اراضی نہیں آئے گی ؟ اگر نہیں آئے گی تو مالکانہ اراضی کی محرومی کا نعم البدل کیا ہوگا ؟ ڈاکٹر صاحب کو اس مسئلے میں ذرا وضاحت فرمانی چاہیئے کہ اشتباہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہو . پاکستان میں اراضی کی ملکیت کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اسے حل کرنے کے لئے بڑی دماغ سوزی کی ضرورت ہے ۔ اس لئے نہیں کہ مالکان اراضی ملکیت پر حریص ہیں ۔ بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ریاست یا بالفاظ دیگر حکومت کن افراد پر مشتمل ہوگی جو اس پیچیدہ مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کی خواہش اور سکت رکھتے ہوں ۔

اس سلسلے میں میری معروضات حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ اخلاقی اور ایمانی تعلیمات کی سطح پر اسلام میں انفرادی اور قومی سے قطع نظر سرے سے ' انسانی ملکیت ' ہی کا تصور موجود نہیں ہے ۔ بلکہ کل کائنات کا بلا شرکت غیرے واحد مالک صرف اللہ عزوجل ہے جو ہر شئے اور کُل موجودات کا خالق اور رب بھی ہے اور مالک اور مَلِک (بادشاہ) بھی ۔ چنانچہ انسان خود مملوک ہے اور اپنے جسم اور اعضاء و جوارح تک کا مالک نہیں ہے تو اپنے وجود سے خارج کسی چیز کا مالک کیسے ہو سکتا ہے ۔ اس کے پاس جو کچھ ہے خواہ اس کے اعضاء و جوارح ہوں

خواہ مال و دولت کی مختلف صورتیں سب اللہ کی ملکیت اور انسان کے پاس 'امانت' ہیں بقول شیخ سعدیؒ ؎

ایں امانت چند روزہ نزد ماست — در حقیقت مالکِ ہر شے خداست

۲۔ البتہ قانونی اور فقہی سطح پر اسلام انسانی ہی نہیں، انفرادی ملکیت کو بھی تسلیم کرتا ہے جو اصلاً 'حقِ ملکیت' نہیں بلکہ صرف 'حقِ تصرف' ہے تاہم مجازاً حقِ ملکیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حقِ ملکیت کے ضمن میں دو باتیں اہم ہیں:۔

(ا) یہ حقِ ملکیت نہ صرف اشیاءِ صرف (Articles of use) کے ضمن میں ثابت ہے بلکہ 'ذرائع پیداوار' (Means of Production) کے ضمن میں بھی مسلّم ہے۔ گویا نقد کی جملہ صورتیں، منقولہ و غیر منقولہ اموال کی تمام قسمیں، دکانیں، کارخانے اور زرعی و سکنی جملہ اقسام کی اراضی سب انسان کی ذاتی ملکیت میں ہو سکتی ہیں۔

(ب) مزید برآں، کم از کم میرے علم و فہم کی حد تک، اس حقِ ملکیت یا حقِ تصرف پر اسلام نے کوئی حد (Limit) مقرر نہیں کی ہے اور اپنی ضروریات سے زائد چیزوں کو اللہ کی رضا کے لئے دوسروں کو دے ڈالنے کی ترغیب و تشویق اخلاقی و روحانی سطح پر ہے، قانونی اور فقہی سطح پر نہیں۔

۳۔ رہا زمین کا معاملہ تو اس کے ضمن میں اہم ترین بات یہ ہے کہ اسلامی فقہ کی رُو سے اراضی کی دو بڑی بڑی قسمیں ہیں: ایک عُشری اور دوسری خراجی ـــــ عُشری اراضی افراد کی ملکیت ہوتی ہیں اور ان کی پیداوار سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے جو بارانی یا قدرتی ذرائع سے سیراب ہونے والی زمینوں کی صورت میں کُل پیداوار کا عُشر یعنی دسواں حصہ ہوتا ہے اور نہری یا چاہی یعنی انسانی کوشش و محنت سے سیراب ہونے والی زمینوں کی کُل پیداوار کا نصفِ عُشر یعنی بیسواں حصہ ہوتا ہے ـــــ جبکہ خراجی زمینیں انفرادی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ اسلامی ریاست کے بیت المال کی ملکیت ہوتی ہیں۔ گویا جدید اصطلاح میں 'قومی ملکیت' ہوتی ہیں اور ان کے کاشت کار ریاست کے مزارع ہوتے ہیں جن سے 'خراج' وصول کیا جاتا ہے جو براہِ راست بیت المال میں جمع ہوتا ہے۔ زمینوں کی یہ تقسیم حضرت عمر فاروقؓ کے اجتہاد پر مبنی ہے جس پر 'اجماع' ہو گیا تھا۔

عُشری زمینیں وہ ہوتی ہیں جن کے مالک بغیر لڑے بھڑے برضا و رغبت ایمان لائے تھے اور خراجی زمینیں وہ ہوتی ہیں جو ظہورِ اسلام کے بعد سے آج تک کسی بھی مرحلے پر

مسلمانوں نے بزورِ شمشیر فتح کی ہوں۔ ایسی زمینیں ہمیشہ خراجی رہیں گی خواہ بعد میں کسی مرحلے پروہ پھر کفار کے قبضے میں چلی گئی ہوں اور پھر کسی موقع پر ان کے مالکان برضا و رغبت ایمان لے آئے ہوں۔ ایسی زمینوں کے سابق مالکان اسلامی ریاست کے 'مزارعین' کے درجے میں ہوں گے اور ان کے ساتھ 'خراجِ مقاسمت' یعنی پیداوار کے ایک معین حصے (بٹائی) کا معاملہ بالاجماع جائز ہے۔

۴۔ رہا عشری اراضی یعنی انفرادی ملکیت میں داخل زمینوں کے ضمن میں مزارعت کا معاملہ تو اس کے ضمن میں سلف سے ایک اختلاف چلا آرہا ہے۔ یعنی اس پر تو 'اجماع' ہے کہ بہترین صورت اور اسلام کی اخلاقی اور ایمانی تعلیمات کا تقاضہ تو یہی ہے کہ انسان یا تو اپنی زمین پر خود کاشت کرے یا اسے اپنی کسی بھائی کو دیدے۔ اس صورت میں اعلیٰ ترین شکل تو یہ ہے ہبہ یا ہدیہ کردے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دینا صرف عاریتہً ہو۔ گویا ملکیت اصل مالک کی برقرار رہے۔ البتہ فصل پوری کی پوری کاشت کرنے والے کی ہوگی، اس کا کوئی حصہ مالک کا نہیں ہوگا۔ اس سے نیچے اتر کر مزارعت یا بٹائی کا معاملہ مختلف فیہ ہے۔ چنانچہ

(ا) امام اعظم امام ابو حنیفہؒ اور امام دارالہجرت امام مالکؒ دونوں کے نزدیک مزارعت قطعاً حرام ہے اور اس کی کوئی بھی صورت قطعاً جائز نہیں!

(ب) البتہ امام ابو حنیفہؒ کے دو جلیل القدر شاگردوں یعنی امام محمدؒ اور قاضی ابو یوسفؒ نے بعض اضافی شرائط عائد کرکے مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور اب فقہِ حنفی کا مفتی بہ قول یہی ہے ـــــ متأخرین میں سے امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ وغیرہم کی رائے بھی مزارعت کے جواز کی ہے!

(ج) امام شافعیؒ کا موقف ان دونوں کے بین بین ہے ـــــ یعنی وہ باغ کے تابع کھیتی میں مزارعت کے جواز کے قائل ہیں لیکن کھلے کھیت میں جائز نہیں سمجھتے۔

۵۔ رہا متعین طور پر پاکستان کی اراضی کا معاملہ تو یہ مسئلہ اجتماعی سطح پر تحقیق کا بھی طالب ہے اور فیصلے کا بھی، انفرادی سطح پر اس کے ضمن میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جو دو ماہ کے لگ بھگ عرصہ مرحوم فیڈرل کونسل عرف 'مجلسِ شوریٰ' میں گزارا تھا اس کے دوران ایک تقریر میں تجویز پیش کی تھی کہ زمین کے مسئلے کے فیصلے کے لیے ایک اعلیٰ سطحی کمیشن مقرر کیا جائے جس میں جید علماء کرام اور ماہرین فقہ اسلامی بھی ہوں اور جدید بندوبست اراضی

کے ماہر اور Experts بھی ــــــ اور یہ کمیشن ایک جانب شریعت کے احکام اور دوسری جانب وقت کے تقاضوں اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر پاکستان کے لئے ایک نیا بندوبست اراضی تجویز کرے۔ چنانچہ اولاً یہ طے کرنا ہوگا کہ پاکستان کے کن علاقوں کی زمینیں عشری ہیں اور کن کی خراجی، پھر جو علاقے عشری قرار پائیں اس کے بھی مالکانِ اراضی کی ملکیت کی نوعیت پر غور ہوگا کہ آیا وہ ان کی موروثی زمینیں ہیں یا ایک کافر حکومت کی وفاداری اور خیر خواہی کے صلے میں عطا شدہ جاگیریں، اس کے بعد یہ معاملہ غور طلب ہوگا کہ آیا جائز (GENUINE) عشری اراضی پر بھی مزارعت کے جواز کا اطلاق ہو یا امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے فتویٰ کا! ــــــ اور آخر میں (Last But Not The Least) یہ طے کرنا ہوگا کہ نیا بندوبست اراضی بطریقِ احسن کس طور و طریق اور کس ترتیب و تدریج سے نافذ کیا جائے۔

۶ البتہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ پاکستان میں کسی جمہوری یا انتخابی عمل کے ذریعے یہ انقلابی اقدام ممکن نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ یہاں انتخابات کتنے ہی منصفانہ اور غیر جانب دارانہ کیوں نہ ہوں ان میں کامیاب ہونے والوں کی عظیم اکثریت جاگیرداروں، وڈیروں اور بڑے زمینداروں ہی پر مشتمل ہوگی اور ان سے یہ توقع بالکل عبث اور خالص طفلانہ ہوگی کہ وہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا پسند کریں گے۔ گویا یہ تبدیلی صرف 'انقلاب' کے راستے سے آسکتی ہے ــــــ اور یہ انقلاب وقت کا وہ اٹل تقاضہ ہے جو بہر صورت آکر رہے گا اور اگر خدانخواستہ 'اسلامی انقلاب' کی صورت میں نہ آیا تو لامحالہ 'اشتراکی انقلاب' کی صورت میں آئے گا۔ جس میں نہ عشری اور خراجی کا فرق زیر بحث آئے گا ــــ نہ ہی مزارعت کے جواز یا عدم جواز پر غور ہوگا بلکہ تمام اراضی بالجبر قومیا لی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ تنظیم اسلامی نے انتخاب کے بجائے انقلاب کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور جو منشور شائع کیا ہے وہ اس کا انتخابی منشور نہیں بلکہ 'اسلام کا انقلابی منشور' ہے۔ جس میں زمین سے متعلق پوری دفعہ یہ ہے:

- جاگیرداری کی لعنت کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور خواہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے اس متفقہ فتویٰ پر عمل کے ذریعے سے کہ مزارعت حرام ہے خواہ حضرت عمرؓ کے اجتہاد پر مبنی فقہ حنفی کے اس فتویٰ پر عمل کے ذریعے کہ جو علاقے کسی بھی وقت بزورِ شمشیر فتح ہوئے تھے ان کی اراضی انفرادی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ اسلامی ریاست کے بیت المال

کی ملکیت ہوتی ہیں۔ زمینداری کی جملہ خرابیاں ختم ہو جائیں گی۔

خدا آں ملتے را سروری داد کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت!

بآں قومے سروکارے ندارد کہ دہقانش برائے دیگراں کشت!

(علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ خدا اس قوم کو قیادت اور رہنمائی عطا کرتا ہے جو اپنی تقدیر اپنے ہاتھ سے لکھتی ہے۔ اسے اس قوم سے کوئی سروکار نہیں جس کے کسان دوسروں کے لئے کاشت کرتے ہیں)۔

۷۔ بالفرض، اگر پاکستان کی جملہ اراضی 'خراجی' بھی قرار پائیں تب بھی انفرادی ملکیت صرف زمین کی حد تک خارج از بحث ہوگی۔ بقیہ چیزوں میں اس کا نفاذ و اجرا جاری رہے گا۔ مثلاً ایک شخص خراجی زمین کاشت کرتے ہوئے جو کچھ حاصل کرتا ہے اس میں سے اپنے اخراجات کے بعد جو کچھ بچالے اسے کسی کاروبار میں لگا سکتا ہے اور یہ پورا سلسلہ اس کی انفرادی ملکیت ہوگا جس سے قانوناً فرض زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ اگرچہ اخلاقی اور روحانی سطح پر اسے تلقین کی جائے گی کہ اسے اپنی ملکیت نہ سمجھے بلکہ اپنی ضرورت سے زائد جو کچھ ہے اسے ناداروں اور محتاجوں کا حق سمجھ کر "حق بحق دار رسید" والا معاملہ کر کے سرخرو ہو جائے۔ تاہم اگر وہ اس بلندی کی گانٹھ پر حقِ ملکیت جما کر بیٹھ رہتا ہے تو قانونِ اسلامی اس کے آڑے نہیں آئے گا بلکہ اس کی وفات پر اس کے ترکے میں قانونِ وراثت کا اجرا ہوگا۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ!

۳۔ ایک ناخوشگوار وضاحت

راقم الحروف نے اپنی تقاریر اور دروس میں بارہا وضاحت کی ہے کہ اگرچہ میں اصولاً تصوف کا مخالف نہیں ہوں بلکہ قرآن حکیم اور حدیثِ رسولؐ میں مذکورہ 'احسان' کو تو میں دین کی اصل جان سمجھتا ہوں۔ تاہم میں تصوف کے مروجہ سلاسل میں سے کسی سلسلے سے منسلک نہیں ہوں۔ اور اس کے باوجود کہ میں متعدد معروف بزرگانِ طریقت کی خدمت میں حاضر ہوا، آج تک کسی پر میرا دل اس درجہ نہیں ٹھکا کہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتا ــــ چنانچہ عملاً میرا معاملہ وہی ہے

جو شیخ علی ہجویریؒ نے "کشف المحجوب" میں تحریر فرمایا ہے کہ جس شخص کو کوئی مرشد نہ مل سکے اس کا مرشد قرآن ہے! چنانچہ میری اصل بیعت تو قرآن مجید سے ہے ——— ثانیاً میں اپنے طور پر اُس سلسلہ محمدیہ علی صاحبہا الصلٰوۃ والسّلام کے مطابق عمل پیرا ہوں جس کی بیعت مجاہد کبیر سیّد احمد بریلویؒ لیا کرتے تھے۔

لیکن گذشتہ دنوں اپنے ماہانہ درسِ قرآن کے لئے اسلام آباد جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے میرا موہڑی (ضلع گجرات) جانا ہوا۔ جسے اخبارات میں بہت غلط رنگ میں پیش کیا گیا ——— بنابریں یہ ناخوشگوار وضاحت ضروری ہے!

دسمبر ۸۵ء میں جب میں ابوظہبی میں مقیم تھا مجھے ایک پیغام ملا کہ خواجہ محمد معصوم "پیر صاحب موہڑی شریف" بھی یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں اور آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ میں نے ان کا نام تو بارہا سنا اور پڑھا تھا لیکن ان سے واقفیت بالکل نہ تھی۔ تاہم ایک معروف شخصیت ملاقات کی دعوت دے تو اس سے انکار کسی طور سے درست نہیں ہے۔ لہٰذا میں اپنے بعض رفقاء کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت چونکہ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ لہٰذا بہت مختصر ملاقات ہو سکی۔ تاہم میں نے وعدہ کر لیا کہ ان شاء اللہ پاکستان میں آپ کی خانقاہ میں حاضر ہو کر کچھ عرض کروں گا!

فروری کی ۸ تا ۹ تاریخ کو خواجہ صاحب کا دو مرتبہ فیصل آباد سے فون آیا اور انہوں نے وعدہ کے ایفاء پر زور دیا۔ چنانچہ میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ ۲ مارچ کو حاضر ہوں گا۔ بعد میں میں نے پیغام بھیج کر ۳ مارچ کی حاضری کی اطلاع دے دی۔ چنانچہ اپنے پانچ چھ رفقاء کی معیت میں میں وہاں گیا ——— لیکن توقع کے بالکل خلاف وہاں میں نے 'خانقاہ' تو کوئی نہ پائی صرف ایک بزرگ کا نہایت شاندار اور زرِ کثیر سے تعمیر شدہ 'مزار' پایا جسے عرفِ عام میں 'دربار' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان بزرگ کی قبر کی بھی میں نے خالص مسنون طریقے پر زیارت کی ——— بعد ازاں ملحقہ مسجد میں ایک مختصر نشست ہوئی جس میں اولاً قرآن پاک کی چند آیات تلاوت کی گئیں۔ بعد ازاں ایک صاحب نے نعت پڑھی۔ اور اس پر تو خوشی ہوئی کہ نعت پڑھنے والے صاحب بھی پابندِ شرع تھے ——— اور نعت کے مضامین بھی پاکیزہ اور شریعت کی حدود کے اندر اندر تھے ——— لیکن جس انداز میں حاضرین نے 'نذرانے' پیش کئے وہ ہم سب کے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ (واضح رہے کہ ہم میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا)۔ (باقی صفحہ ۸۰ پر)

اِن شاء اللہ العزیز ———— اِس سال

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے زیرِ اہتمام سالانہ محاضرات میں، جو

۲۸ مارچ تا ۳ اپریل ۸۶ء - جناح (ٹاؤن) ہال لاہور

میں روزانہ نماز مغرب کے فوراً بعد منعقد ہوں گے

استحکام پاکستان

کے موضوع پر مذاکرہ ہوگا، جس میں

جیّد علماء کرام، قومی و سیاسی رہنما اور نامور دانشور

حصّہ لیں گے، اور اس میں انجمن کے صدر مؤسّس

ڈاکٹر اسرار احمد

کی اِس موضوع پر تالیف، جو پہلے روزنامہ جنگ اور بعد ازاں ماہنامہ میثاق، میں بالاقساط شائع ہو چکی ہے اور اِن شاء اللہ اُس وقت تک کتابی صورت میں بھی آجائیگی۔

تنقید و تبصرہ

کے لیے پیش ہوگی ———— شرکت کی دعوت عام ہے!

باب ششم

پاکستان کا معجزانہ قیام

ہمارے قومی و ملّی وجود کی تصویر کا روشن اور تابناک رُخ بالکلیہ ارادہ و مشیّتِ ایزدی اور تائید و نصرتِ الٰہی کا مظہر ہے، جس کے نتیجے میں پاکستان کا عالمِ وجود میں ظہور بھی ایک خالص 'معجزہ' کی حیثیت سے ہُوا تھا اور اُس کا اب تک قائم رہنا بھی 'معجزات' ہی کے تسلسل کا مرہونِ منت ہے!

یہ اُمور اگرچہ اصلاً "رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں!" کے ذیل میں آتے ہیں اور اِس قبیل کے اکّا دُکّا واقعات کو تو پہچاننا بھی صرف اُن لوگوں کا کام ہے جن کا باطن منوّر ہو اور جو "نگاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود!" کی کیفیت کے ضمن میں رُسوخِ تام حاصل کر چکے ہوں —— تاہم جب ان معجزات کا تسلسل ہو اور خرقِ عادت واقعات پے در پے ظہور پذیر ہو رہے ہوں تو ایک عامی انسان بھی ان کا ادراک کر سکتا ہے بشرطیکہ اُسے ایک ایسے قادرِ مطلق اور فاعلِ حقیقی خدا پر کسی درجے میں ایمان حاصل ہو جو اِس کائنات کا خالق، باری اور مصوّر ہی نہیں، مالک، حاکم اور مدبّر بھی ہے۔ چنانچہ کُل سلسلۂ اسباب و علل اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور نتائج و عواقب کا ظہور بالکلیہ اُسی کے اذن و مشیّت کے تابع ہے، یہاں تک کہ ایک پتّہ بھی اُس کے علم و اذن کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا اور ایک حدیث نبویؐ کے مطابق "تمام انسانوں کے دِل اُس کی دو اُنگلیوں کے مابین ہیں، اُنہیں جدھر چاہے پھیر دیتا ہے!"

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے قیام و بقا کے ضمن میں 'معجزانہ' نوعیت کے واقعات کا ظہور اِس تسلسل کے ساتھ ہُوا ہے کہ کوئی بالکل ہی کور باطن ہو تو اور بات ہے ورنہ ہر صاحبِ دیدۂ بینا کو صاف نظر آتا ہے کہ پاکستان کا قیام ارادہ و مشیّتِ خداوندی کے

ایک خصوصی ظہور کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا وجود یقیناً تدبیرِ الٰہی کے کسی طویل المیعاد منصوبے کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے!

آگے بڑھنے سے پہلے معجزات اور خارقِ عادت واقعات کے بارے میں بعض اہم اُمور کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

اوّلاً یہ کہ اُن مخلوقات کے ضمن میں جو نہ صاحبِ ارادہ و شعور ہوں، نہ سزاوارِ جزا و سزا، 'معجزات' طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کو علانیہ توڑ اور پھاڑ' کر ظاہر ہوتے رہے ہیں، جیسے کبھی ایک چٹان سے حاملہ اُونٹنی برآمد ہو گئی، کبھی آگ ابراہیمؑ کے لیے گل و گلزار بن گئی، کبھی موسٰیؑ کے عصا نے زندہ اور متحرک اژدہے کی صورت اختیار کر لی اور کبھی اُس کی ایک ہی ضرب سے سمندر پھٹ گیا' وغیر ذالک!

لیکن انسان چونکہ ایک مکلّف اور مستحقِ جزا و سزا وجود کا حامل ہے جس کے لیے ارادہ و اختیار کی آزادی لازمی و لابدی ہے۔ لہٰذا انسانی معاملات میں اللہ تعالےٰ کے خصوصی ارادہ و مشیّت کا ظہور کبھی اِس طور سے نہیں ہوتا کہ انسان کے ارادہ و اختیار کی آزادی سلب ہو جائے بلکہ قدرت و حکمتِ خداوندی کا کمال یہ ہے کہ ارادہ و اختیار کی جیسی اور جتنی کچھ آزادی انسانوں کو عطا ہوئی ہے وہ بھی برقرار رہتی ہے اور اِس کے باوصف تدبیرِ امر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا خصوصی تصرّف بھی بروئے کار آتا رہتا ہے اور اِس طرح قدرت کے ارادے اور منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچتے رہتے ہیں چنانچہ کبھی کسی دشمن کی لات کسی کُبڑے کے جسمانی عیب کے ازالے کا سبب بن جاتی ہے اور کبھی برادرانِ یوسفؑ کا یوسفؑ کو حسد سے مغلوب ہو کر چاہِ کنعان میں پھینک دینا' "تدبیر کُند بندہ تقدیر کند خندہ" کے مصداق یوسفؑ کے دُنیوی عروج کا زینہ اور تمکن فی الارض کا ذریعہ بن جاتا ہے، و قِس علیٰ ذالک!

دوسری اہم حقیقت جو پیشِ نظر رہنی چاہیئے یہ ہے کہ جبکہ انسان ہر حال میں اللہ تعالےٰ کے قانونِ تشریعی کا پابند ہے جس کے ضمن میں مسلم اور غیر مسلم کی تقسیم تو

بہت ہی اہم ہے کہ اسی پر اسلامی تمدن و معاشرت کے پورے نظام کی اساس اور
اسلامی ریاست و حکومت کے پورے ڈھانچے کی بنیاد قائم ہوتی ہے! اسی طرح محسن و
متقی اور فاسق و فاجر کا فرق بھی بہت اہم ہے جو اُخروی انجام پر اثر انداز ہوتا ہے
لیکن امورِ تکوینیہ کے ضمن میں قدرتِ خداوندی اِن حدود و قیود کی پابند نہیں ہے بلکہ اِن
سے بالکلیہ آزاد اور بلند و بالا سطح پر تدبیر امر کرتی ہے ـــــ چنانچہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ جب ارادۂ خداوندی کسی قانونی و فقہی اعتبار سے مسلمان لیکن اعمال و اخلاق کے
اعتبار سے فاسق و فاجر قوم کی تنبیہہ اور سرزنش کے لیے حرکت میں آتا ہے تو کوئی کافر و منکر
اور باغی و مشرک قوم "دستِ قضا" میں شمشیر کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جیسے سابقہ
اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ضمن میں کبھی بخت نصر اور ٹائٹس رومی اور موجودہ اُمتِ
مسلمہ کے لیے کبھی چنگیز و ہلاکو اور کبھی ہنود و یہود! ـــــ اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا
ہے کہ قدرتِ خداوندی کسی مسلمان قوم کی فلاح و بہبود حتیٰ کہ اپنے دین کی حفاظت و
مدافعت کے لیے کسی عامی و عاصی مسلمان سے کوئی خدمت لے لیتی ہے، جیسے
حدیث نبویؐ میں وارد ہوا ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِر"
(صحیح مسلم: کتاب الایمان ترجمہ: "اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت و نصرت فاسق و فاجر
انسان کے ذریعے بھی کرتا ہے") جس کی نمایاں ترین مثال بھٹو صاحب کے ہاتھوں قادیانیوں
کا غیر مسلم قرار دیا جانا ہے ـــــ! بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر قدرتِ خداوندی
کبھی اسلام کی کوئی جزوی خدمت کسی غیر مسلم یا انتہائی بدخود غلط اور حد درجہ
ضال اور مُضل انسان سے بھی لے لیتی ہے، جیسے برِصغیر پاک و ہند میں انگریزی دَور
کے آغاز میں اسلام پر عیسائی پادریوں کی جارحانہ پیش قدمی کی روک تھام کے ضمن
میں راجہ رام موہن رائے کی تالیف "تحفۃ الموحدین" اور بعد میں آریہ سماجیوں کے
حملے سے مدافعت کے ضمن میں آنجہانی غلام احمد قادیانی کی تصنیف "سُرمۂ چشم آریہ"

یہ حقیقت کہ پاکستان کا قیام ایک "معجزہ" تھا پورے طور پر تو اُسی وقت سمجھ
میں آسکتی ہے جب برِصغیر پاک و ہند میں ہندو مسلم مسئلے کے پورے تاریخی پس
[illegible]

ادراک حاصل کیا جائے جن کا اضافہ اِس انتہائی اہم اور نازک مسئلے میں انگریزوں کے لگ بھگ دو صد سالہ دورِ اقتدار میں ہُوا تھا جن کے نتیجے میں صورتِ حال بالکل برعکس ہو گئی تھی اور شدید اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ مستقبل میں ماضی کے حاکم، محکوم اور محکوم حاکم بن جائیں گے! اِس لیے کہ اسی طرح یہ حقیقت پورے طور پر منکشف ہو سکتی ہے کہ پاکستان کا قیام اُسی ارادۂ خداوندی کا ظہور تھا جو لگ بھگ سوا تین ہزار سال قبل مصر میں ظاہر ہُوا تھا جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں سورۃ قصص کی آیت ۵ میں ان الفاظ میں ہُوا ہے: (ترجمہ) "اور ہم چاہتے تھے کہ اُن لوگوں پر احسان فرمائیں جو مُلک میں دبا لیے گئے تھے ۔۔۔" لیکن ظاہر ہے کہ یہ بحث بہت طویل ہے اور موجودہ تحریر کی تنگ دامانی اِس کی متحمل نہیں ہو سکتی —— تاہم ان شاء اللہ العزیز ایک صاحبِ عقل و بصیرت انسان کے لیے برِصغیر کے ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء کے حالات و واقعات کا سرسری جائزہ بھی اِس حقیقت کی وضاحت کے لیے کافی ہو گا کہ پاکستان کا قیام ایک 'معجزہ' اور مشیّتِ ایزدی و قدرتِ خداوندی کے خصوصی ظہور کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۳، مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے 'تاریخی اجلاس میں' قراردادِ پاکستان' منظور ہو جانے کے بعد برِصغیر کے میدانِ سیاست میں متحارب و متقابل قوتوں کے جائزے کا لبّ لباب یہ بنتا ہے کہ:

ایک جانب پوری ہندو قوم تھی جو 'اکھنڈ بھارت' کو اپنے دھرم یعنی 'دین و ایمان' کا مسئلہ بنائے ہوئے تھی اور اُس کے نزدیک بھارت کی تقسیم 'گؤ ماتا' کے ٹکڑے کر دینے کے مترادف تھی اور یہ معاملہ اُن کے نزدیک کس قدر جذباتی نوعیت کا تھا اِس کا اندازہ گاندھی جی کے اُس تاریخی جملے سے لگایا جا سکتا ہے جو تقسیمِ ہند کے آخری فیصلے سے کچھ ہی دن پہلے اُن کی زبان سے نکلا تھا یعنی "پاکستان صرف میری لاش پر بن سکتا ہے" (مولانا ابو الکلام آزاد' انڈیا ونز فریڈم - صفحہ ۱۶۷)۔
یہاں یہ واضح رہے کہ گاندھی جی کوئی عام اور غیر اہم انسان نہیں تھے بلکہ جدید ہند کے بہت بڑے سیاسی لیڈر اور ہندوؤں کے لیے تو ایک عظیم رہنما ہی نہیں مہاتما

تھے! اور انہیں عام طور پر جذباتی اور مشتعل مزاج انسان نہیں سمجھا جاتا!!

'اکھنڈ بھارت' کے اِس قدر جذباتی اور پُرجوش حامی تو اگرچہ صرف ہندو ہی تھے۔ لیکن انہیں اس معاملے میں بھرپور تائید حاصل تھی ہندوستان کی جملہ غیر مسلم اقوام کی ــــ جیسے سکھ، پارسی اور عیسائی!! ــــ اور اس پر مستزاد یہ کہ خود مسلمانوں کے بعض فعال عناصر تقسیمِ ہند کے خلاف تھے جن میں اہم ترین معاملہ تو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی زیرِ قیادت کانگریسی مسلمانوں اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیرِ سرکردگی جمعیت علمائے ہند اور اُن کے متوسلین اور معتقدین کا تھا! پھر پنجاب میں مجلسِ احرارِ اسلام ایسی زوردار عوامی خطباء و مقررین پر مشتمل جماعت تھی اور سرحد میں خدائی خدمت گاروں جیسا پُرجوش عوامی کارکنوں کا گروہ تھا!

اِدھر ہندو خود بھی مسلمانوں کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ تعداد کے اعتبار سے لگ بھگ تین گنا تھے، بلکہ دولت و سرمایہ اور تجارت و صنعت پر تو تقریباً بلا شرکتِ غیرے قابض تھے اور تعلیم، قومی بیداری اور سیاسی تنظیم کے اعتبار سے بھی بہت آگے تھے ــــ اور 'اکھنڈ بھارت' کے پلڑے میں اضافی وزن پڑ رہا تھا دیگر غیر مسلم اقوام اور نیشنلسٹ مسلمانوں کا ــــ اور ان سب کے مقابلے میں تھی مسلمان عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے والی صرف مسلم لیگ! گویا معاملہ بالکل وہی تھا کہ ؎

"لڑا دے ممولے کو شہباز سے!" یا ؎ "اُلجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے!!"

چنانچہ اعداد و شمار، حالات و واقعات اور اجتماعیات و عمرانیات کے کسی بھی اصول اور قاعدہ کی رُو سے 'مطالبۂ پاکستان' ایک دیوانے کے خواب اور مجذوب کی بڑ یا زیادہ سے زیادہ سودے بازی کے حربے سے بڑھ کر نظر نہ آتا تھا۔

اِس پر مزید اضافہ کیجیے اِس کا کہ برطانیہ میں اُس وقت لیبر پارٹی کی حکومت تھی جس کی ہمدردیاں واضح طور پر کانگریس کے ساتھ تھیں اور ہندوستان کی وحدت و سالمیت برقرار رکھنے کو اُس نے اپنی پالیسی کا سنگ بنیاد (CORNER STONE)

بنا لیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب اِس حکومت کے فرستادہ وزارتی مشن نے اپنا منصوبہ پیش کیا تو اُس کی تمہید کے طور پر واضح الفاظ میں ہندوستان کی تقسیم کو غیر معقول اور ناقابلِ عمل قرار دے کر رد کر دیا تھا ــــ مزید برآں اُس وقت تو یہ حقائق صرف اہلِ نظر کی نگاہ اور واقفِ حال لوگوں کے علم میں ہوں گے لیکن اب تو یہ تمام راز طشت از بام ہو چکے ہیں کہ شخصی اعتبار سے برطانوی وزیرِ اعظم اٹیلے کو مسلم لیگ اور قائدِ اعظم سے ذاتی بغض تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جس کے ہاتھوں قدرت نے ہندوستان کو بالفعل تقسیم کرایا ایک طرف خود گاندھی کا چیلا تھا تو دوسری طرف پنڈت نہرو کی دوستی صرف اُس ہی سے نہیں اس کے پورے 'خاندان' سے تھی۔ جبکہ قائدِ اعظم سے اُسے ذاتی پرخاش اور نفرت تھی !!

اُدھر وہ مسلم قوم جس نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا جس اِنتشارِ ذہن و فکر اور پراگندگیٔ عمل کا شکار اور ہمت و جرات کے زوال سے دوچار تھی، اُس کا اندازہ اِس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ چند ہی سال قبل مستقبل کے قائدِ اعظم اور معمارِ پاکستان نے قوم سے بددل اور مایوس ہو کر وطنِ عزیز سے باضابطہ 'ہجرت' کر لی تھی اور مستقل طور پر انگلستان میں جا ڈیرا لگایا تھا اور ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں یہ الفاظ کہے تھے:

"ہندو کوتاہ اندیش ہیں اور میرے خیال میں ناقابلِ اصلاح !
اور مسلمانوں کی صفیں ایسے کم ہمت لوگوں سے بھری پڑی ہیں جو میرے
ساتھ بات کرنے کے بعد ڈپٹی کمشنر سے پوچھیں گے کہ کیا کرنا چاہیئے!
ان دو گروہوں کے مابین مجھ جیسے آدمی کی جگہ کہاں ہے ؟"

(شیخ محمد اکرام : ماڈرن مسلم انڈیا)

مزید برآں خود اُس جماعت اور اُس کے وابستگان کا عالم کیا تھا جس نے حصولِ پاکستان کے لیے کمر کسی تھی، اِس کا اندازہ کرنے کے لیے قائدِ اعظم کے اُس مشہور جملے کو ذہن میں تازہ کر لینا کافی ہے کہ "میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔"!

اِن حالات و واقعات کے مدِّ نظر کون کہہ سکتا ہے کہ برِّ صغیر کی تقسیم اور پاکستان کا قیام کسی 'معجزہ' سے کم تھا!!

—— اور اگر کسی کو اِس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامّل ہو اور شک و شبہ کی گنجائش نظر آئے تو اِس ضمن میں آخری فیصلہ کن معاملہ 'کیبنٹ مشن پلان' کا ہے جس کے بعد اِس امر میں کسی شک کا شائبہ بھی باقی نہیں رہ جاتا کہ پاکستان کا قیام مشیّتِ قدرتِ خداوندی کے خصوصی ظہور کی حیثیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس پلان کے مصنفین نے ہندوستان کی تقسیم کو نا مناسب ہی نہیں بلکہ ناممکن العمل قرار دے کر گویا بزعمِ خویش آزاد و خود مختار پاکستان کے مطالبے کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی اور اُس کے بجائے ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت کے تحت تین خطّوں (ZONES) پر مشتمل وفاق کا نقشہ پیش کیا تھا!

ہندوستان کے ماضیٔ قریب کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہ قائدِ اعظم مرحوم کی سیاسی زندگی کا نازک ترین مرحلہ اور اُن کے تدبّر و تحمّل اور دُور اندیشی و معاملہ فہمی کا سخت ترین امتحان تھا! —— اُنہیں ایک طرف صاف نظر آ رہا تھا کہ برطانوی حکومت مختلف داخلی و خارجی عوامل کے تحت ہندوستان سے بوریا بستر لپیٹنے پر تُلی ہوئی ہے اور اگر اِس مرحلے پر مسلم لیگ کی جانب سے ذرا بھی ضد اور ہٹ کا مظاہرہ ہُوا تو لیبر پارٹی کی "ہز میجسٹیز گورنمنٹ" ہندوستان کی حکومت یک طرفہ طور پر کانگریس کے حوالے کر دے گی۔ اور پھر ہندوؤں کے چنگل سے رہائی پانا شاید لاکھوں نہیں کروڑوں جانوں کی قربانی ہی سے ممکن ہو سکے! دوسری طرف یہ بات بھی واضح تھی کہ اِس منصوبہ کو تسلیم کرنے کے معنی یہ تھے کہ مسلم لیگ نے ہار مان لی اور کم از کم وقتی طور پر آزاد اور خود مختار پاکستان کے مطالبے سے دستبرداری اختیار کر لی اور گذشتہ چند برسوں کے دوران جو نفسیاتی اور جذباتی فضا ہندوستان کی مسلم قوم میں پیدا ہو چکی تھی اُس کے پیشِ نظر شدید اندیشہ تھا کہ اِس کے نتیجے میں یا مسلمان مشتعل ہو کر قابو سے باہر ہو جائیں گے یا اُن کے حوصلے اور ولولے ہمیشہ کے لیے سرد ہو جائیں گے یا

کم از کم مسلم لیگ اور خود قائدِاعظم کی سیاسی موت واقع ہو جائے گی! گویا قائدِاعظم اور مسلم لیگ دونوں کو اُس وقت ایک جانب کنواں اور دوسری جانب کھائی' والی صورتِ حال سے سابقہ تھا۔ البتہ کیبنٹ مشن پلان میں دو باتیں "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کا مصداق تھیں ــــ ایک یہ کہ اُس میں یہ تین خطوں (ZONES) کی صورت میں پاکستان کے نقشے کی دُھندلی سی تصویر موجود تھی اور دوسرے یہ کہ دس سال کے بعد ہر خطے کے لیے مرکزی حکومت کے ساتھ اپنے تعلق پر نظرِ ثانی کرنے کی گنجائش موجود تھی! ــــ اِس طرح اُس وقت نہیں تو دس سال بعد آزاد پاکستان کے قیام کا امکان کم از کم نظری طور پر موجود تھا۔ اگرچہ یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ ایک بار مرکزی حکومت کے قیام کے بعد اِس کا بالفعل امکان بہت کم تھا۔ میرے نزدیک یہ قائدِاعظم کے سیاسی تدبر (STATESMANSHIP) اور واقعیت پسندی (REALISM) کا شاہکار تھا کہ انہوں نے ۶، جون ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لیا۔ اگرچہ اِس پر نہ صرف یہ کہ ہندو پریس نے خوب بغلیں بجائیں، تمسخر اُڑایا، کارٹون شائع کیے اور اسے 'پاکستان' کے تصور کی آخری اور حتمی تدفین قرار دیا بلکہ خود برطانوی حکومت نے بھی اِسے مسلم لیگ کی کمزوری پر محمول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کیبنٹ مشن پلان کے تحت بننے والی مرکزی حکومت کی تشکیل کے ضمن میں اپنے ایک صریح وعدے کی خلاف ورزی اور واضح اعلان سے انحراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی!

اِس موقع پر مشیتِ ایزدی اور قدرتِ خداوندی کا خصوصی ظہور اُس حدیثِ نبویؐ کے مطابق جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے کہ "تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو اُنگلیوں کے مابین ہیں، وہ انہیں جدھر چاہے پھیر دیتا ہے!" پنڈت نہرو کے اُن بیانات کی صورت میں ہوا جو انہوں نے فتح کے نشے میں بدمست ہو کر دیئے ــ جن کے نتیجے میں کانگریس کی جانب سے پلان کی منظوری کی بالفعل نفی ہو گئی اور ہندو ذہنیت پوری طرح بے نقاب ہی نہیں بالکل عریاں ہو کر سامنے آگئی ــــ اِس

بع کی ایک حرکت پلان کے سامنے آتے ہی فوری طور پر خود مسٹر گاندھی سے بھی سرزد ہو گئی تھی لیکن ایک تو وہ کانگریس کے عہدیدار نہ تھے، دوسرے انہوں نے مشن کی جانب سے اُن کی غلط توجیہات کی تردید کے بعد مصلحتاً زبان کو بند رکھا۔ جبکہ پنڈت نہرو کا معاملہ دوسرا تھا، ایک تو وہ اُس وقت کانگریس کے صدر تھے، دوسرے ان کے "ہٹ کے پکے" ہونے کا وصف مشہور و معروف تھا۔ لہٰذا اُن کے بیانات کے نتیجے میں مسلم لیگ کے لیے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری واپس لینے کا معقول جواز پیدا ہو گیا اور اگرچہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے بیچ در بیچ ریزولیوشن کے ذریعے پنڈت نہرو کے بیانات کی تلافی کی کوشش کی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور قائدِ اعظم ایسی عقابی نگاہ رکھنے والی شخصیت اِس موقع کو ہاتھ سے جانے دینے والی نہیں تھی! چنانچہ ۲۷ جولائی ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری واپس لینے کا اعلان کر دیا اور اِس طرح ایک آزاد اور خود مختار پاکستان کے قیام کا مسئلہ جو نظری طور پر کم از کم دس سال کے لیے اور حقیقتاً ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا تھا، از سرِ نو زندہ ہو گیا!!

اب ذرا بتائیے کہ اِس "اعجازِ مسیحائی" کا سہرا بظاہر احوال اور اِس عالمِ اسباب و علل کی حد تک سوائے پنڈت نہرو کے اور کس کے سر باندھا جا سکتا ہے!

—— یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب (انڈیا ونز فریڈم) میں اپنے پورے سیاسی کیریئر کی صرف ایک ہی غلطی تسلیم کی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے ۱۹۴۶ء میں کانگریس کا صدر بننا قبول نہ کیا۔ اور اِس طرح اُس وقت پنڈت نہرو کی صدارت کی صورت پیدا ہوئی اور اُن کی اِس عہدیدارانہ حیثیت ہی کی بنا پر اُن کے "فرمودات" کو وہ اہمیت حاصل ہوئی کہ کانگریس کے نقطۂ نگاہ سے مسلم لیگ کے دام میں آ جانے کے بعد بچ نکلنے کی صورت پیدا ہوئی۔
—— ویسے غور کیا جائے تو پنڈت جی نے اپنی سادہ لوحی کی بنا پر یا فخر کی "مستی" میں جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست تھا اور واقعتاً صورت یہی تھی کہ اگر ایک بار

اُس پلان کے تحت انڈین یونین گورنمنٹ وجود میں آجاتی تو پھر کسی خطے (ZONE) کے علیٰحدہ ہونے کا بالفعل کوئی امکان نہ رہتا — لیکن اُس وقت اِس "سچی بات" کا زبان سے نکال دینا ہی اکھنڈ بھارت کے نقطۂ نظر سے سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اُن کی صاحبزادی مسز اندرا گاندھی نے اپنے پتاجی کے بارے میں کہا تھا کہ "ہمارے بابا تو صوفی تھے اُنہیں سیاست نہیں آتی تھی!" — اور شاید پنڈت جی کی ایسی ہی باتیں تھیں جن کی بنا پر چوہدری خلیق الزمان مرحوم نے کہا تھا کہ "پنڈت نہرو سے زیادہ سیاست تو میرا سائیس جانتا ہے!" (مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب کے صفحات ۱۴۳ تا ۱۴۵ پر پنڈت جی کی ۱۹۳۶ء کی ایک ایسی ہی کوہ ہمالہ جتنی بڑی غلطی کا ذکر کیا ہے جس کا براہِ راست تعلق چوہدری صاحب کی ذات سے تھا جس کی بنا پر مولانا آزاد کے نزدیک یوپی میں مسلم لیگ کی تحریک کو عروج حاصل ہُوا!)

ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی تصرف کا مظہر تھا اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے گویا مسلمانانِ ہند پر یہ حجت قائم فرمائی تھی کہ تم تو ایک کلیتہً آزاد و خود مختار پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے تھے، ہم نے اپنی خصوصی مشیت و قدرت کو بروئے کار لا کر تمہیں ایک کاملتہً آزاد و خود مختار پاکستان عطا فرمایا — "تاکہ دیکھیں کہ اب تم کیا کرتے ہو!" (سورۃ یونس آیت ۱۴: لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ) — چنانچہ یہ روایت مولانا حسین احمد مدنی رح کے معتقدین کے حلقے میں تواتر کے ساتھ بیان ہوتی ہے کہ مولانا نے ۱۹۴۶ء کے رمضان المبارک میں سلہٹ میں جہاں وہ عموماً ماہِ رمضان گزارا کرتے تھے فرما دیا تھا کہ "ملاءِ اعلیٰ میں پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو گیا ہے!" اور اس پر جب اُن کے کسی عقیدت مند نے سوال کیا کہ "پھر ہم کیا کر رہے ہیں؟" تو مولانا نے جواب دیا کہ "اِس معاملے کا تعلق امورِ تکوینیہ سے ہے جن کی پابندی ہمارے لیے ضروری نہیں!" او کما قال، واللہ اعلم!!

باب ھفتم

قائدِ اعظم مرحوم کی غیر معمولی شخصیّت

قیامِ پاکستان کے ضمن میں مشیّت و قدرتِ خداوندی کا دوسرا نمایاں ظہور قائدِ اعظم مرحوم کی قیادت کی صورت میں ہوا تھا ـــ اور اِس کے بعد سے اب تک یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت و حفاظت ہی کے ذریعے قائم ہے!

قائدِ اعظم کی قیادت

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد برِ صغیر کے حالات میں جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی اُس کے لازمی اور منطقی نتیجے کے طور پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ اب کم از کم مستقبل قریب میں انگریز کی غلامی سے نجات کا حصول کسی عسکری جد و جہد کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ اور اِس کے لیے نہ کوئی داخلی بغاوت مفید ہو سکتی ہے نہ خارجی مداخلت بلکہ آزادی کی کوئی جد و جہد اگر ممکن ہے تو صرف قانونی اور آئینی ذرائع سے! ان حالات میں مسلمانوں کو ایک ایسے قائد کی ضرورت تھی جو انگریزوں کی اجتماعی نفسیات سے بھی کماحقُّہٗ واقف ہو اور اُن سے اُن کی زبان اور محاورے میں گفتگو کر سکے، برطانوی پارلیمانی سیاست کے پیچ و خم اور اَسرار و رموز سے بھی پوری طرح آگاہ ہو اور آئینی و قانونی جنگ لڑنے کی صلاحیت و مہارت سے تو بدرجۂ اتم مسلح ہو ـــ

مسلمانانِ ہند کے قائدِ وقت کے لیے دوسرا لازمی وصف یہ درکار تھا کہ وہ ہندوؤں کی ذہنیت کو اچھی طرح جانتا ہو اور اُن کے احساسات و جذبات اور مقاصد

عزائم کا علم اُسے بالواسطہ نہیں بلا واسطہ ذاتی تجربہ کی بنا پر حاصل ہوا ہو نیز وہ ان کے مخصوص "طریقہ ہائے واردات" سے بھی پوری طرح واقف ہو اور اُن کے رُموز و اشارات کو بھی خوب سمجھتا ہو!

ان دونوں اوصاف کے مطلوبہ حد تک حصول اور ان دونوں "گھروں" کے بھیدی ہونے کے لیے لازمی تھا کہ وہ کافی مدت تک "کہ مَیں اِس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل" کے انداز میں ان دونوں کے "اندر" رہا ہو اور اُس کی ذہنی و فکری اُٹھان اور سیاسی و عملی تربیت بلا تشبیہ حضرتِ موسیٰؑ کی طرح، جن کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی تھی، اِن دونوں "دشمنوں" کے گھروں میں ہوئی ہو!

کون نہیں جانتا کہ اِن دونوں شرائط پر بتمام و کمال پورا اُترنے والا شخص محمد علی جناح کے سوا کوئی نہیں تھا جس نے انگلستان میں قانون کی تعلیم حاصل کی، اور وہاں قیام کے دوران انگریزوں کی نفسیات کا بھی گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا اور پارلیمانی طور طریقوں کو بھی خوب سمجھا اور اِس طرح گویا انگریزوں سے اُن ہی کے ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم حاصل کی، پھر تیس برس کی عمر (۱۹۰۶ء) سے جو انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تو یہ تعلق پورے چودہ سال تو بھرپور انداز میں جاری رہا (قائدِ اعظم نے کانگریس سے علیحدگی ۱۹۲۰ء کے ناگپور سیشن کے دوران اختیار کی تھی!) اِس کے بعد بھی لگ بھگ آٹھ برس وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اصلاً اسی عرصہ کے دوران اُن پر ہندو ذہنیت کا انکشاف ہوا!

ظاہر بین لوگوں کے لیے یہ جملہ اُمور محض اتفاقیہ ہو سکتے ہیں لیکن ؏
"جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے!" کے مصداق جن لوگوں پر باطنِ ایام بھی روشن ہوتا ہے اور جو جانتے ہیں کہ اِس کائنات میں کوئی واقعہ بھی خالص "اتفاقی" طور پر ظہور میں نہیں آتا انہیں اِن "اتفاقات" میں بلاشبہ حکمت و قدرتِ خداوندی کا ظہور نظر آئے گا!

بے پناہ مقبولیّت

مزید انشراحِ صدر کے لیے ذرا ان اضافی دلائل کو بھی ذہن کے سامنے لے آیئے
کہ اُس وقت تک مسلمانوں کی قیادت دو ہی طبقات کے ہاتھوں میں رہی تھی۔
— ایک نوابوں، جاگیرداروں اور وڈیروں کا طبقہ اور دوسرا علماءِ کرام کا طبقہ۔
قائدِ اعظم کا تعلق ان دونوں میں سے کسی سے نہ تھا۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے
ایک ایسے تجارت پیشہ خاندان میں آنکھ کھولی تھی جو طبقۂ متوسط ہی نہیں اِس کے
بھی زیریں حِصّے سے تعلق رکھتا تھا۔ لہٰذا دُنیوی اعتبار سے وہ جو کچھ بھی تھے بالکلیہ
"خود ساختہ" (SELF-MADE) تھے۔ دوسری طرف اُن کے والدین کا مذہب
"امامیہ اسماعیلیہ" تھا اور اگرچہ وہ خود اوائل ہی میں اِن فرقہ وارانہ تقسیموں سے
بلند ہو گئے تھے اور اپنے آپ کو صرف مسلمان کہلوانا پسند فرماتے تھے لیکن جیسا کہ
اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے نہ وہ واقعتہً "مذہبی" آدمی تھے نہ انہوں نے کبھی
تکلفاً یا تصنعاً اپنے آپ کو اِس رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ حال ہی میں
ایک واقعہ یہ بھی پڑھنے میں آیا ہے کہ ایک ملاقات کے دوران جب گاندھی جی نے
ذرا دل لگی کے انداز (LIGHT VEIN) میں اُن سے کہا کہ "آپ مسلمانوں میں اِس
لیے مقبول ہو رہے ہیں کہ آپ مذہب کا نام لیتے ہیں!" — تو قائدِ اعظم نے اُن
کی تردید میں بطورِ دلیل اپنا طرزِ عمل پیش کیا کہ دیکھ لیجیے! یہ رمضان کا مہینہ ہے
اور مَیں آپ کے سامنے سگریٹ پی رہا ہوں!" — تیسری طرف اِس پر غور کیجیے کہ
اُنہیں اُردو بس واجبی ہی سی آتی تھی اور وہ اِس میں تحریر و تقریر پر قادر نہ تھے۔
جبکہ کسی عوامی رہنما کے لیے عوام کی زبان میں اظہارِ خیال پر کماحقہٗ قدرت نہایت
اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔

اِس سب کے باوجود وہ اگر برِّ صغیر پاک و ہند کی دس کروڑ
افراد پر مشتمل قوم کی اکثریت کے محبوب ترین رہنما بن گئے تو

کیا یہ خارقِ عادت، واقعہ نہیں ہے؟ اور کیا اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ یہ سب کچھ مِن جانب اللہ، تھا اور اِس لیے تھا کہ اُن کے ذریعے اللہ کو اپنی ایک خصوصی مشیت کی تکمیل کرنی تھی؟

غیر معمولی شخصیت

قائدِ اعظم کی صلاحیتوں کے وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہونے کے علاوہ اُن کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی معجز نما، تھا اور وہ یہ کہ سیرت و کردار اور شخصی اوصاف کے اعتبار سے وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں بالکل ہی نادر المثال اور عجوبۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے اور، علماء و مشائخ سے قطع نظر، جملہ ہمعصر سیاستدانوں میں کوئی ایک شخص بھی اُن کا ہمسر و ہم پلّہ تو دُور کی بات ہے، آس پاس بھی نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اُن کے بد ترین دُشمنوں نے بھی اُنہیں ضدی اور ہٹ کا پکّا (STUBBORN & OBSINATE)، اِنتہائی سَرد اور جذبات سے عاری خالص حسابی کتابی انسان (COLD & CALCULATING) یہاں تک کہ مغرور اور خود پسند (PROUD & HAUGHTY) تو کہا — لیکن کسی نے نہ کبھی اُن کی صداقت اور راست گوئی پر حرف رکھا، نہ دیانت اور امانت پر اور نہ کسی وعدہ خلافی کا الزام لگایا نہ فریب دہی کا بلکہ سب اُن کی صاف گوئی اور راست معاملگی (STRAIGHT DEALING) کا برملا اعتراف کرتے رہے اور یہ بات ہمیشہ مسلّم سمجھی جاتی رہی کہ جو کچھ اُن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے وہی اُن کی مراد ہوتی ہے اور نہ کبھی وہ عام سیاستدانوں کے مانند "گجامی نمائی گجامی زنی!" کا معاملہ کرتے ہیں نہ جھوٹ، دھوکہ، فریب اور وعدہ خلافی سے کام لیتے ہیں، نہ اُن کے یہاں دروغِ مصلحت آمیز کا وجود ہے، نہ مصنوعی تواضع و مدارات کا

اور نہ ریاکارانہ انکساری موجود ہے نہ چاپلوسانہ خوشامد!

قائدِ اعظم کی اسی غیر معمولی شخصیت اور موجود الوقت ظروف و احوال کے اعتبار سے بالکل اجنبی اور انوکھی سیرت کا نتیجہ ہے کہ آزادیٔ ہند اور تقسیمِ برِ صغیر کے جملہ مؤرخین و مصنفین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عالمِ اسباب میں قیامِ پاکستان کا واحد سبب صرف ایک انسان ہے —— اور وہ ہے محمد علی جناح! یہاں تک کہ "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" (FREEDOM AT MIDNIGHT) کے مصنفوں نے تو، اِس کے باوجود کہ قائدِ اعظم سے اُن کا بُغض و عناد کتاب کے بہت سے مقامات پر بالکل عریاں طور پر نظر آتا ہے، واضح طور پر حسرت بھرے انداز میں لکھا ہے کہ اگر وہ راز جو بمبئے کے ڈاکٹر پٹیل کی دراز میں مقفل تھا کسی طرح فاش ہو جاتا تو برِ صغیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی اور ہندوستان ہرگز تقسیم نہ ہوتا اِس لیے کہ وہ راز دراصل قائدِ اعظم کا وہ ایکسرے تھا جس سے اُن کے پھیپھڑوں کا ٹی بی سے متاثر ہونا ظاہر ہوتا تھا۔ اِن مصنفوں کی رائے میں اگر اُس وقت اِس کا علم حکومتِ برطانیہ یا کانگریس کی لیڈرشپ کو ہو جاتا تو وہ آزادیٔ ہند کو مؤخر کر دیتے اور قائدِ اعظم کے انتقال کا انتظار کر لیتے، اِس لیے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ مسلمانانِ ہند کے پاس کوئی دوسرا 'قائد' ایسا موجود نہ تھا جسے نہ دھوکہ! فریب دیا جا سکتا ہو، نہ مرعوب و متأثر کیا جا سکتا ہو اور نہ ہی خریدا جا سکتا ہو!

اب اگر یہ بات درست ہے اور عربی مقولہ "اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ" کے مطابق اسے تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں تو ظاہر ہے کہ موجود الوقت معیارات اور ظروف و احوال کی نسبت سے اِتنی غیر معمولی اور اپنے ہمعصر لوگوں سے اِس درجہ مختلف شخصیت اللہ تعالےٰ کے کسی ارادۂ خصوصی ہی کا مظہر ہو سکتی ہے!!

باب ہشتم

نصرت و حفاظتِ خداوندی

قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک کے لگ بھگ انتالیس[۳۹] سالوں کے دوران بھی متعدد مواقع پر پاکستان کی حفاظت و صیانت جس طرح ایک نادیدہ مگر قوی ہاتھ نے بالکل اِس انداز میں کی کہ: "دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر است!" تو یہ بھی ایک واضح اور بیّن ثبوت ہے اِس کا کہ قدرت کو پاکستان کی بقا اپنے کسی منصوبے کی تکمیل کے لیے مطلوب ہے!

اِس ضمن میں اوّلاً قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کی پہاڑ ایسی مشکلات اور حد درجہ پیچیدہ مسائل کا تصور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ قطعاً بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان نے اُن کا مقابلہ و مواجہہ جس کامیابی کے ساتھ کیا اُس کا اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید و نصرت کے بغیر قطعاً کوئی امکان نہ تھا!

مشترکہ دفاع کی پیشکش

خاص طور پر ۱۹۶۲ء کی چین بھارت جنگ کے فوراً بعد جبکہ بھارت انتہائی ذِلّت و خِفّت کے ساتھ اپنے زخم چاٹ رہا تھا، سابق صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان کی جانب سے بھارت کو 'مشترکہ دفاع' کی پیشکش کے معاملے پر غور کیا جائے تو ایک بار پھر کیبنٹ مشن پلان والا معاملہ نظر آتا ہے ـــ پاکستان پر اُس وقت تک ایوب خان کی گرفت بہت مضبوط تھی اور کم از کم بظاہر احوال اندرونِ ملک اِس تجویز پر کسی شدید ردِ عمل کا کوئی اندیشہ نہ تھا اور اِس تجویز پر عمل درآمد کے معنی قطعی طور پر یہ تھے کہ گویا ہم ایک بار پھر آزاد و خود مختار پاکستان سے از خود دستبردار ہو کر سجدۂ سہو ادا کرتے ہوئے کیبنٹ مشن پلان ہی کی جانب رجوع

کر رہے ہیں اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی وہ بات درست تھی جو میاں محمد شفیع (م۔ش) کی روایت کے مطابق مولانا نے کچھ بھارتی ہندوؤں سے تسلی آمیز انداز میں کہی تھی کہ "پاکستان کے قیام کو 'گئو ماتا' کے ٹکڑے ہونے کے مترادف نہ سمجھو بلکہ یوں سمجھو کہ بھارت کی گئو ماتا نے ایک بچہ دیا ہے جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے بالکل اُسی طرح چلے گا، جیسے بچھڑا گائے کے پیچھے پھرتا ہے!"

اِس ضمن میں کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ پیش کش تو صرف 'مشترکہ دفاع' کی تھی اس سے کیبنٹ مشن پلان کی طرف رجوع کیسے ثابت ہو گیا جس میں پورے ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت تجویز کی گئی تھی — اِس لیے کہ مشترکہ دفاع کے مضمرات اور مقدرات کا جائزہ لیا جائے تو اوّلاً — اِس کا لازمی مطلب مشترک خارجہ پالیسی ہے — اور ثانیاً چونکہ قومی بجٹ کا سب سے بڑا حصہ دفاع سے متعلق ہوتا ہے لہٰذا مشترک دفاع کا لازمی نتیجہ مشترک بجٹ بھی ہے۔ اِس طرح مشترکہ دفاع میں وہ جملہ اُمور مضمر تھے جو کیبنٹ مشن کی تجویز کے مطابق 'انڈین یونین' کو تفویض ہونے تھے سوائے مواصلات کے جو بہر صورت دفاع اور خارجہ اُمور کے مقابلے میں بہت ہی 'معصوم' سا معاملہ ہے — مزید برآں جنگ کی صورت میں چونکہ ذرائع رسل و رسائل اور وسائلِ حمل و نقل بھی لازماً دفاعی مشینری کا جزو لاینفک بن جاتے ہیں لہٰذا وہ بھی مشترکہ دفاع کی تجویز میں از خود شامل ہیں۔ گویا اگر بھارت اِس تجویز کو قبول کر لیتا تو بالکل کیبنٹ مشن پلان والی صورت بن جاتی اور پاکستان کا آزاد و خود مختار وجود باقی نہ رہتا! —

اِس مرحلہ پر پھر مشیت و قدرتِ خداوندی کا خصوصی ظہور پنڈت نہرو ہی کے ذریعے ہوا جنہوں نے نہایت رعونت کے ساتھ: "COMMON DEFENCE AGAINST WHOME?" کہتے ہوئے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا — اور اِس طرح پاکستان کی آزادی و خود مختاری کی ناؤ بھنور سے نکل آئی اور بالکل ڈوبتے ڈوبتے بچی!

۱۹۶۵ء میں دشمنوں کی مرعوبیت

پاکستان کے ایسے ہی 'معجزانہ' تحفظ کا نظارہ پوری دنیا نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر بچشم سر کر لیا تھا۔ بھارت نے جس تیاری اور منصوبہ بندی کے ساتھ حملہ کیا تھا اُس کے پیشِ نظر بھارت کی فتح اور پاکستان کی شکست نہ صرف بھارت بلکہ اُس کے سرپرستوں کے نزدیک بھی اتنی قطعی اور یقینی تھی کہ بی بی سی نے نہ صرف یہ کہ سقوطِ لاہور کی خبر نشر کر دی تھی بلکہ اُس کا 'منظر' بھی دنیا کو ٹی وی پر دکھا دیا تھا! ـــــ اِدھر تقدیرِ الٰہی خندہ کناں تھی اور سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ » (سورۃ انفال آیت ۱۲) "میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب پیدا کر دوں گا!" کا بھرپور اعادہ ہو گیا تھا اور دشمن کی افواج مزاحمت کی غیر متوقع حد تک کمی کی بنا پر اِس اندیشے اور خوف ہی میں مبتلا ہو کر ٹھٹک کر رُک رہ گئی تھیں کہ کہیں ہمیں کسی خوفناک نرغے میں نہ لیا جا رہا ہو!!

۱۹۷۱ء میں مغربی پاکستان کی حفاظت

یہ درست ہے کہ ۱۹۷۱ء میں ہمیں قیامِ پاکستان کے اصل مقصد سے انحراف اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کی سزا بھی بھرپور ملی۔ اور بھارت کے ہاتھوں ایک ذلت آمیز شکست کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے مشرقی بازو کی علیحدگی کا صدمہ بھی جھیلنا پڑا لیکن اِس موقع پر بھی مغربی پاکستان کا بچ جانا خالص آسمانی تدبیر کے ذریعے ہُوا ـــــ ورنہ جائزہ لیجیے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد بھارت کا مورال (MORALE) کس طرح ایک دم آسمان پر پہنچ گیا تھا، جبکہ ہمارا مورال 'اسفل سافلین' کے مصداق پاتال میں پہنچ گیا تھا ہمارے ایک لاکھ کے لگ بھگ جوان اور آفیسر بھارت کے اسیر ہو چکے تھے اور ہمارا کثیر تعداد میں اسلحہ اور دوسرا جنگی ساز و سامان بھارت کے قبضے میں آ گیا تھا ـــــ اور اب بھارت مشرقی محاذ سے فارغ ہو کر اپنی پوری عسکری قوت کو کامل یکسوئی کے ساتھ مغربی محاذ

پر مھونک سکتا تھا — اِدھر ہمارا حال یہ تھا کہ ایئر فورس تقریباً مفلوج ہو چکی تھی، نیوی، لنگر انداز، تھی اور کیماڑی کی بندر گاہ تک دشمن کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہی تھی — رہے میدانی محاذ! تو دو محاذوں پر بھارت کی پیش قدمی جاری تھی یعنی راجستھان میں بھی اور سیالکوٹ کی جانب بھی، — لے دے کر صرف ایک سلیمانکی سیکٹر تھا جس میں ہماری 'ٹاسک فورس' برقرار (INTACT) تھی! ان حالات میں محتاط ترین اندازے کے مطابق مغربی پاکستان بھارت کے لیے زیادہ سے زیادہ چھ دن کی بات تھی!

اِس مرحلے پر پھر اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت کا ظہور ہُوا اور امریکی صدر نکسن نے ہاٹ لائن پر روسی لیڈروں کو وارننگ دی اور اُن کے 'حکم' پر اندرا گاندھی نے "یک طرفہ جنگ بندی" کا اعلان کر دیا! — اور حال ہی کی بات ہے کہ صدر نکسن نے انکشاف کیا ہے کہ اُس موقع پر ہم ایٹمی قوت تک کے استعمال کے بارے میں سوچ رہے تھے! — کم از کم راقم الحروف کو تو شدید احساس ہے کہ اُس موقع پر پڑ، بچا کھچا، پاکستان بھی بالکل اُس طور پر بچا تھا جس طرح کبھی کسی انسان کے بالکل برابر سے کوئی تیز کار یا ٹرک زنّاٹے کے ساتھ اِس طرح گذر جائے کہ موت اور زندگی میں بال بھر کا فاصلہ رہ جائے اور انسان یہ محسوس کرے کہ جیسے فی الواقع اُسے کسی نادیدہ ہاتھ نے ایک طرف کو دھکیل کر بچایا ہے!!

۱۹۸۳ء کے اندرونِ سندھ کے ہنگامے

پنڈت نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی نے اگرچہ اپنے والد کو تو 'صوفی' ہونے کا لوٹا دیا تھا لیکن خود اُس کی دستبُرد سے اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو اُس ہی کی 'چُوک' کے ذریعہ جس طرح بچایا! اُس کا تلخ مزا اُس کے ذائقے میں دیر تک برقرار رہا ہوگا! ... ۱۹۸۳ء کے دوران اندرونِ سندھ کے ہنگامے اپنی وسعت و شدت اور تیزی و تندی ہر اعتبار سے اکثر لوگوں کے نزدیک حیران کُن اور تعجب خیز تھے۔ اُس وقت اگر براہِ راست مداخلت نہ سہی ذرا سی مدد بھی بھارت کی جانب سے

ہنگامہ کرنے والوں کو مل جاتی تو پاکستان کا وجود شدید خطرے میں پڑ جاتا! ـــــ
اِس لیے کہ پاکستان کا وہ علاقہ جو ہنگاموں سے متاثر تھا، بالخصوص میر پور ماتھیلو سے خیبر پور میرس تک کی پٹی پاکستان کے جسم کے نرم و نازک 'پیٹ'
(SOFT UNDERBELLY) کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس علاقے میں اگر دو چار جگہوں پر ریلوے لائن اور ہائی وے کو کاٹ دیا جاتا تو گویا پاکستان کی شہ رگ (LIFE LINE) کٹ کر رہ جاتی۔ چنانچہ اُن ہنگاموں کے دوران اِس کی خبریں تو متعدد بار آئیں کہ گھوٹکی ریلوے اسٹیشن کو جلانے کے علاوہ متعدد مقامات پر ریل کی پٹڑیوں کو اکھاڑنے اور سلیپروں کو جلانے کی کوشش کی گئی لیکن کہیں سے اِس کی اطلاع نہیں ملی کہ ریلوے لائن کو ڈائنا مائٹ سے اُڑانے کی سعی کی گئی ہو۔ گویا وہاں جو کچھ ہُوا خالص دیسی یا 'خانہ زاد' (INDIGENOUS) وسائل سے ہُوا، بیرونی مداخلت یا امداد قطعاً موجود نہیں تھی ـــــ گویا مسز اندرا گاندھی صرف یہ انتظار ہی کرتی رہ گئیں کہ ہنگامے ذرا اور پھیل جائیں اور مداخلت کا واضح جواز پیدا ہو جائے تو اِقدام کیا جائے ـــــ اور اِدھر پاکستان کی فوج اور دوسرے دفاعی و حفاظتی اداروں نے ہنگاموں پر قابو پالیا ـــــ بعد میں وہ ابھی اپنی اِس 'چوک' کی تلافی کے لیے کسی بھرپور اقدام کی اسکیم بنا ہی رہی تھیں کہ خود اُن کی زندگی کا چراغ گُل ہو گیا ـــــ

الغرض! ـــــ نہ پاکستان کا قیام حالات و واقعات کی معمول (ROUTINE) کے مطابق پیش رفت کا نتیجہ تھا نہ اِس نیچے کھچے پاکستان کا اب تک قائم رہنا کسی عام حساب کتاب کے مطابق ہے بلکہ اصل پاکستان کا ظہور و قیام بھی ایک 'معجزہ' تھا اور موجودہ پاکستان کی تاحال حفاظت و صیانت بھی اسباب و علل کے عام سلسلے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی خصوصی تدبیر و تصرف ہی کی مرہونِ منت ہے ـــــ

"جن کے رُتبے ہیں سوا...."

رہا یہ سوال کہ پاکستان کے قیام اور بقا سے تدبیرِ الٰہی کا کون سا طویل المیعاد منصوبہ متعلق ہے تو اِس کے بارے میں تو گفتگو ان شاء اللہ آئندہ ہوگی ــــ موجودہ بحث کے تکملہ کے طور پر اِس حقیقت کی جانب توجہ دلانی ضروری ہے کہ اِس عام قاعدۂ کلیہ کے مطابق کہ "جن کے رُتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے!" اور اللہ تعالیٰ کی اُس مستقل سُنّت کی رُو سے کہ "اگر تم ہمارے (انعامات پر) قدر شناسی اور احسان مندی کی روِش اختیار کرو گے تو ہم تمہیں مزید نوازیں گے، اور اگر تم نے ناقدری اور کفرانِ نعمت کا رویّہ اختیار کیا تو (جان لو کہ) ہماری سزا بھی بہت سخت ہوتی ہے!" (سورۃ ابراہیم آیت ۷) مسلمانانِ پاکستان بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بڑے سخت امتحان اور کڑی آزمائش سے دوچار ہیں اور ہر حساب و کتاب سے ماوراء اور بڑی سے بڑی توقعات سے بھی بڑھ کر جو احسانِ عظیم قدرت نے کیا تھا اُس کی ناقدری و ناشکری اور صریح وعدہ خلافی پر سزا کا ایک بہت سخت کوڑا مشرقی پاکستان کے سقوط اور وہاں انتہائی ذلّت آمیز شکست کی صورت میں ہماری پیٹھ پر پڑ چکا ہے ــــ تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اُس قانون کا مظہر ہے کہ "ہم اُنہیں (آخری اور) بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے، شاید کہ یہ (اپنی روش سے) باز آجائیں!" (سورۃ سجدہ آیت ۲۱) کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی آخری سزا نہیں دی اور تلافیٔ مافات کی مہلت عطا کی ہوئی ہے۔ اِس لیے کہ یہ بچا کھچا پاکستان بھی ہرگز کوئی حقیر شے نہیں ہے بلکہ وسائل اور امکانات کے اعتبار سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ ابھی مشرقی پاکستان بھی نام کی تبدیلی کے باوجود ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے اُن ہی حدود کے ساتھ دنیا کے نقشے پر قائم ہے جن کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں اُس کا ظہور ہُوا تھا ــــ گویا ابھی موقع ہے کہ اگر جگرؔ کے اِس شعر کے مطابق کہ :؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی !
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

—— ہم اپنی روشش کو اُس آسمانی منصوبے کے مطابق اور موافق بنالیں جس کی ایک کڑی پاکستان کا قیام ہے تو کوئی عجب نہیں کہ برِ صغیر کے اُس گوشے میں اِسلام کا از سرِ نو تمکن و استحکام، جہاں آج سے تیرہ سو سال قبل صنم خانۂ ہند کا اوّلین ' دار الاسلام ' قائم ہوا تھا اُس کے کسی نئے عروج کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ ؎

" رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں ! "

بصورتِ دیگر ہمارا حشر اُس شخص کا سا ہوگا جس کا ذکر سورۂ اعراف کی آیات ۱۷۵، ۱۷۶ میں آیا ہے۔ " جسے ہم نے اپنی (خاص) نشانیاں عطا کی تھیں مگر وہ ان سے بھاگ نکلا، تو پیچھے لگ گیا اُس کے شیطان اور شامل ہو کر رہا وہ سخت گمراہوں میں۔ اور اگر ہم چاہتے تو اُسے اپنی نشانیوں کے طفیل رفعتوں کا مکین بنادیتے مگر وہ (بدبخت) تو زمین ہی کی جانب جھکتا چلا گیا ! " —— گویا اِس صورت میں اندیشہ ہے کہ ؎

" ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں ! "

عیاذاً باللہ —!!

بقیہ : از صفحہ ۵۴

ذریعہ قرآنِ حکیم کی جانب از سرِ نو رجوع و التفات کے سوا اور کوئی نہیں، اور دوسرے یہ کہ گذشتہ چار صدیوں کے دوران جملہ تجدیدی مساعی کا اصل مرکز و معہد برِ صغیر پاک و ہند رہا ہے ! —— البتہ یہ بات صرف گمانِ غالب کے درجے میں ہے کہ اب اِس سلسلے کے تکمیلی اقدام کے لیے مشیّتِ ایزدی نے ارضِ پاک کو چُن لیا ہے ! —— لیکن یہ بات چونکہ تفصیل طلب ہے لہٰذا اس پر ہمیں مفصل گفتگو کرنا ہوگی !

باب نہم

اسلام کا عالمی غلبہ
اور پاکستان —

پاکستان کا ' معجزانہ قیام ' — قائدِ اعظم کی غیر معمولی قیادت اور پاکستان کی تاحال خصوصی حفاظت وصیانت کی صرف ایک توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ پاکستان اسلام کے عالمی غلبے کی خدائی تدبیر کے سلسلے کی اہم کڑی ہے۔!

اِس ' قضیے ' (PROPOSITION) یا نظریئے (THEORUM) کے دو اجزاء ہیں، ایک یہ کہ بالآخر اسلام پوری دنیا پر غالب آکر رہے گا اور پورے کرۂ ارضی پر اسلام کی حکمرانی قائم ہو کر رہے گی! — اور دوسرا یہ کہ اسلام کے اِس عالمی غلبے (GLOBAL DOMINATION) میں ایک اہم اور فیصلہ کن کردار (CRUCIAL ROLE) پاکستان کو ادا کرنا ہے اور یہ گویا پاکستان کی تقدیر (DESTINY) ہے!

اِن میں سے جہاں تک پہلے جزو کا تعلق ہے، وہ بالکل یقینی اور اٹل ہے اِس لیے کہ وہ قرآنِ حکیم سے بھی دلالۃً (BY INFERENCE) ثابت ہے اور متعدد احادیثِ صحیحہ میں تو صراحتہً مذکور ہے اور اِس کے ضمن میں گمان اور قیاس کا معاملہ صرف اِس مسئلے تک محدود ہے کہ ایسا کب ہوگا؟ — البتہ جہاں تک دوسرے جزو کا تعلق ہے تو وہ سراسر یا قیاس و گمان کا معاملہ ہے یا ذوق و وجدان کا۔ چنانچہ اِس کے ضمن میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ تاہم اِن سطور کے عاجز و ناچیز راقم کا گمانِ غالب یہی ہے کہ اسلام کے عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز یہی سرزمین بنے گی جس کا نام 'پاکستان' ہے۔ گویا راقم کو علامہ اقبال کے اِس شعر سے اتفاق ہے کہ :-

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے : میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

واللہ اعلم! —

اسلام کے عالمی غلبے کی پیشین گوئی

اسلام کے عالمی غلبے کے ضمن میں قرآنِ حکیم میں وارد شدہ 'صغریٰ' اور 'کبریٰ' (PREMISES) سے جو لازمی اور منطقی نتیجہ حاصل ہوتا ہے اُسی کی صریح اور واضح خبر پیشنگوئیوں کی صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوئی ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل آپؐ کے اِس فرضِ منصبی کا مظہر ہے کہ آپؐ قرآنِ حکیم کے مضمرات اور اشارات کو کھول کر بیان فرمائیں۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (سورۃ النحل آیت ۴۴)

(اے محمدؐ) ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپؐ کی جانب اِس لیے نازل فرمایا ہے کہ آپؐ وضاحت فرمائیں لوگوں کے لیے اُس چیز کی جو اُن کی جانب نازل کی گئی ہے!

بعثتِ محمدیؐ کا لازمی نتیجہ: دینِ حق کا غلبہ

اسلام کے عالمی غلبے کے ضمن میں قرآنِ حکیم کا 'صُغریٰ' اور 'کُبریٰ' یہ ہے:

(۱) قرآنِ حکیم میں مندرجہ ذیل الفاظ تین مقامات پر بغیر ایک شوشے کے فرق کے وارد ہوئے ہیں:

"هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ"
(سورۃ توبہ آیت ۳۳، سورۂ فتح آیت ۲۸ سورۂ صف آیت ۹)

(ترجمہ) "وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآنِ حکیم) اور دینِ حق (اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کردے اُسے کل کے کل دین (یا تمام ادیان) پر!"

— گویا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد غلبۂ اسلام ہے، خواہ یوں کہہ لیا جائے کہ آپؐ کو اللہ تعالےٰ نے اِس اٹل فیصلے کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کہ آپؐ کے ذریعے دینِ حق یعنی اسلام کی صرف تبلیغ و دعوت ہی نہیں ہوگی بلکہ اسلام کو بالفعل [illegible]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اسلام کا بالفعل غلبہ قرآن حکیم کی نص قطعی سے صراحتہً ثابت ہے!

(۲) دوسری طرف قرآن مجید نے "اِک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں!" کے مصداق مختلف اسالیب سے اِس حقیقت کو مبرہن اور واشگاف کر دیا ہے کہ نبی اکرمؐ کی بعثت کسی خاص قوم یا علاقے کی طرف نہیں بلکہ عالمی اور آفاقی ہے۔ اور پوری نسلِ انسانی آپؐ کی اُمّتِ دعوت میں شامل ہے۔ چنانچہ کہیں اِس حقیقت کو اِس طور سے بیان فرمایا کہ :

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ (سورۃ انبیاء آیت)	"ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام جہانوں (یا تمام جہان والوں) کے لیے رحمت بنا کر!"

(واضح رہے کہ "عالمین" کا ترجمہ 'تمام جہانوں' کے علاوہ عربی گرامر کے اس اصول کے مطابق کہ کبھی ظرف کی جمع سے مراد مظروف کی جمع ہوتی ہے 'تمام جہانوں والے' بھی ممکن ہے!) کہیں یہ بات اِس انداز میں بیان ہوئی کہ آپؐ اگرچہ خود "اُمّیّین" یعنی بنی اسمٰعیلؑ میں سے ہیں لیکن آپؐ کی بعثت صرف اُن کی جانب ہی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ ساتھ "اٰخرین" یعنی دوسروں کی طرف بھی ہے!

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝	"وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول اُنہی میں کا پڑھ کر سناتا ہے اُن کو اُس کی آیتیں اور اُن کو سنوارتا ہے اور سکھلاتا ہے اُن کو کتاب اور عقلمندی اور اِس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں اور اُٹھایا اُس رسول کو ایک دوسرے لوگوں کے واسطے بھی اُنہی میں سے جو ابھی نہیں ملے اُن میں اور وہی

ہے زبردست حکمت والا!" (سورہ جمعہ آیات ۲/۴)

—— اور کہیں بالکل صاف اور صریح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ:

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

(ترجمہ) "ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!" (سورۂ سبا آیت ۲۸)

قرآنِ حکیم کے اِس صغریٰ و کبریٰ کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا غلبہ پورے عالمِ انسانی اور کُل کرۂ ارضی پر ہو کر رہے گا اور یہ وہ تقدیرِ مُبرم ہے جو کسی صورت ٹل نہیں سکتی، بقول اقبالؔ ؎

تقدیر تو مُبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ یہ ٹل جائے!

البتہ چونکہ قرآنِ حکیم کے اِس اٹل فیصلے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انسان کو کسی قدر منطق اور استدلال سے کام لینا پڑتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے اس مستقل فرمان کے مطابق جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اِس کی صریح اور واضح الفاظ میں خبر دی ہے جناب صادق و مصدوق صلّی اللہ علیہ وسلّم نے!

احادیثِ صحیحہ میں غلبۂ اسلام کی پیشینگوئیاں

(۱) امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مُسند میں حضرت مقداد بن الاسودؓ سے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا کہ:
"رُوئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر رہ جائے گا نہ اُونٹ کے بالوں کے کمبلوں سے بنا خیمہ جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے! خواہ کسی سعادت مند کو عزت دے کر خواہ کسی بدبخت کی مغلوبیت کے ذریعے یعنی یا تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو عزت عطا فرما دے گا اور انہیں کلمۂ اسلام کا قائل و حامل بنا دے گا یا انہیں مغلوب فرما دے گا کہ اسلام کے محکوم بن جائیں!" حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ آنحضورؐ کے اِس قولِ مبارک پر میں نے اپنے دل میں کہا،

"پھر تو وہ فتنہ دین کل کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے گا!" (واضح رہے کہ حضرت مقداد رض کے ان الفاظ میں اشارہ ہے سورۂ انفال کی آیت ۳۹ میں وارد شدہ ان الفاظِ مبارکہ کی جانب کہ (ترجمہ) "اور جنگ کرتے رہو ان سے یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے!") [1]

(۲) امام مسلم رح نے حضرت ثوبان رض سے روایت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے لیے کل زمین کو لپیٹ دیا گیا چنانچہ میں نے اس کے تمام مشارق و مغارب کو دیکھ لیا — اور یقیناً میری امت کی حکومت اس پوری زمین پر قائم ہو کر رہے گی جو میرے لیے لپیٹ گئی!"

راقم الحروف کے نزدیک قرآنِ حکیم کے ان واضح اشارات اور نبی اکرم ص کی ان صریح پیشینگوئیوں کے بعد بھی اگر کسی کے دل میں اسلام کے عالمی غلبے کے بارے میں کوئی شک یا شبہ باقی رہے تو یہ ایمان کے فقدان یا کم از کم شدید ضعف کی علامت ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصریح

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف 'ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء' میں وجوبِ قیامِ خلافت پر بحث کرتے ہوئے جہاں بعض دوسری آیات کا بھی حوالہ دیا ہے وہاں سورۂ توبہ، سورۂ فتح، اور سورۂ صف کی محولہ بالا آیت پر تفصیلاً بحث کی ہے — اور اس کے اصل مفہوم کو متذکرہ بالا احادیث کی روشنی میں واضح کیا ہے جس سے یہ بات دو اور دو چار کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ بالآخر پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا غلبہ اسی طرح ہو کر رہے گا جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جزیرہ نمائے عرب پر ہو گیا تھا!

---

[1] وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ

مفکّر و مصوّرِ پاکستان کی پیش بینی

اور یقیناً علامہ اقبال مرحوم نے بھی ـــ "آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی۔ دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!" کے مصداق باطن کی آنکھ سے اُسی" آنے والے دَور کی دھندلی سی اِک تصویر" دیکھ لی تھی جب یہ فرمایا تھا کہ: ـــ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے !
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے !!

تاریخ کا رُخ

علامہ اقبال نے" ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس کی زبانی ایک عظیم حقیقت کی نشاندہی فرمائی ہے ـــ یعنی ـــ

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

اِس لیے کہ ہر وہ شخص جو" آفاق میں گم" ہو جانے کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو اور ذاتی مسائل و معاملات سے قدرے بلند تر سطح پر تاریخ انسانی کے بہاؤ کے رُخ کا مشاہدہ کر سکتا ہو بادنیٰ تأمل دیکھ سکتا ہے کہ واقعتہً تاریخ کا رُخ اسلام کے عالمی غلبے ہی کی جانب ہے اور قافلۂ انسانی اسی سمت میں رواں دواں ہے!! ـــ

اس لیے کہ ایک طرف طبیعاتی علوم (PHYSICAL SCIENCES) ہیں جو درجہ بدرجہ

کثرت سے وحدت، گویا شرک سے توحید کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں، دوسری طرف عمرانیات (SOCIAL SCIENCES) ہیں جن کی تحقیق و جستجو چار و ناچار اُسی رُخ پر آگے بڑھ رہی ہے کہ ابلیس کو اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ: ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

گویا قافلۂ انسانیت کشاں کشاں "بمصطفےٰ برساں خویش" پر عمل پیرا ہے اور اجتماعیات انسانیہ کے ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ: ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
زاں کہ از خاکش بروید آرزُو!
یا ز نورِ مصطفےٰ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است!

تیسری طرف اُمّتِ مُسلمہ دوؔ بار عروج اور دوؔ بار زوال سے دوچار ہونے کے بعد اب ایک تیسرے عروج کی جانب پرواز کے لیے پَر تول رہی ہے! جس کے اندیشے ابلیسی تہذیب کے جملہ مراکز میں شدت کے ساتھ محسوس ہو رہے ہیں۔ چنانچہ کہیں "اسلامی بنیاد پرستی" (ISLAMIC FUNDAMENTALISM) کو گالیاں دی جا رہی ہیں تو کہیں "جارحیت پسندانہ اسلام کی پیش قدمی!" (MILITANT ISLAM ON THE MARCH") کی دُہائی دی جا رہی ہے!

ہماری اِس وقت کی بحث کے اعتبار سے اِس آخری نکتے کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے اور اِس سلسلے میں ایک حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں چند آیاتِ قرآنیہ پر تدبّر نہایت مفید ہوگا! جس سے اِن شاء اللہ نہ صرف اِس حقیقت پر یقین و اعتماد میں اضافہ ہوگا کہ ؎

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

بلکہ اضافی طور پر علم و حکمتِ قرآنی کا ایک اور گراں بہا موتی ہاتھ آئے گا! اور غلبۂ

اسلام اور اُمتِ مُسلمہ کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے عملی اقدام کی جانب اہم رہنمائی ملے گی!

تاریخ بنی اسرائیل کے چار اَدوار

اِس کتاب کے مقدمے میں اُس حدیثِ نبویؐ کا ذکر آ چکا ہے جسے امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضؓ سے روایت کیا ہے اور جس کی رُو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "میری اُمت پر بھی وہ تمام احوال لازماً وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے!" اِس حدیث مبارکہ کی روشنی میں غور فرمائیے سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۴ تا ۹ پر جن کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

وَقَضَيْنَآ إِلٰى بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ	"اور ہم نے بنی اسرائیل کو (اپنی)
فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي	کتاب میں (پہلے ہی) متنبہ کر دیا تھا
الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ	کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد برپا
عُلُوًّا كَبِيرًا ۝ فَإِذَا	کرو گے اور بڑی سرکشی کا مظاہرہ
جَآءَ وَعْدُ أُولٰىهُمَا	کرو گے! تو جب آن پہنچا اُن دو
بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ	مواقع میں سے پہلے کا وقت تو مسلّط
أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ	کر دیئے ہم نے تم پر اپنے نہایت جنگجو
فَجَاسُوا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۚ	بندے جو گھس گئے ہر جانب تمہاری
وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝	آبادیوں میں اِس طرح وہ اٹل وعدہ پورا
ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ	ہو کر رہا۔ پھر ہم نے لوٹا دی تمہاری باری
عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنٰكُم	اُن پر اور مدد کی تمہاری اموال و اولاد
بِأَمْوٰلٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنٰكُمْ	سے اور کر دی تمہاری تعداد بہت کثیر
أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝ إِنْ	اگر تم نے بھلا کیا تو اپنے ہی لیے کیا اور
أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ	اگر بُرا کیا تو بھی اپنے ہی لیے! پھر جب
وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ	آن پہنچا دوسرے وعدہ کا وقت (تو

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ
لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا
الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ
أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا
عَلَوْا تَتْبِيرًا ۝ عَسَىٰ
رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ ۚ
وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا
جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ۝
إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ
يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ
وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ
الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ
أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ۝
وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ
بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ
عَذَابًا أَلِيمًا ۝

(ہم نے پھر کسی قوم کو تم پر مسلط کیا)
تاکہ وہ بگاڑ دیں تمہارے حلیے اور
گھس جائیں مسجد (ہیکل سلیمانی) میں
جیسے گھسے تھے پہلی بار، اور تہس نہس
کر ڈالیں ہر اُس چیز کو جس پر اُن کو
قابو حاصل ہو جائے — (اب بھی)
بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے
لیکن اگر تم پھر وہی روش اختیار کرو گے
تو ہم بھی دوبارہ پہلی سی سزا دیں گے،
(رہی آخرت تو اُس میں تو) ہم نے جہنم
کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا ہی ہوا
ہے، یقیناً یہ قرآن رہنمائی فرماتا ہے
سب سے سیدھی راہ کی جانب اور بشارت
دیتا ہے اُن ایمان لانے والوں کو
جو نیک اعمال (بھی) کریں کہ
اُن کے لیے ہے بہت بڑا
اجر و ثواب!"

ان آیاتِ مبارکہ سے تاریخ بنی اسرائیل کے ضمن میں حسبِ ذیل حقائق واضح ہوتے ہیں:

۱۔ قرآنِ حکیم کے نزول کے زمانے تک بنی اسرائیل پر چار دَور گذر چکے تھے: دو دَورِ عروج کے جن کے دوران اُن کا طرزِ عمل بھی دینی و اخلاقی اعتبار سے درست رہا اور اُنہیں دنیا میں عزت و سربلندی بھی حاصل رہی اور وہ کثرتِ اموال و اولاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے بھی بہرہ ور رہے — اور دو دَور زوال کے جن کے دوران انہوں نے نفس پرستی اور بغاوت کی روش اختیار کی:

نتیجتہً اُن پر اللہ کا غضب نازل ہُوا اور غیر اقوام کے ہاتھوں وہ خود بھی ذلیل و خوار اور مفتوح و مغلوب ہوئے اور اُن کے دینی و رُوحانی مرکز یعنی ہیکل سلیمانی کی حُرمت بھی پامال ہوئی۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن حکیم کے نزول کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے ایک تیسرے عروج کا موقع عنایت فرمایا کہ ان کا دامن تھام کر اللہ کی رحمت کے سائے میں آجائیں، ساتھ ہی یہ وعید بھی سُنادی گئی کہ اگر اس سے اعراض و انکار کی روش اختیار کریں گے تو عذابِ الٰہی کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔!

قرآنِ حکیم کے اِن اشارات کی روشنی میں تاریخ بنی اسرائیل کا جائزہ لیا جائے تو حسب ذیل چار ادوار اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں:

۱۔ اُن کے پہلے دورِ عروج کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ اوّل حضرت یُوشع بن نُون کی قیادت میں فلسطین کی فتح سے ہُوا اور تقریباً تین سو سال تک نشیب و فراز کے مراحل طے کرتا ہُوا یہ دورِ سعادت حضرتِ داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عہدِ حکومت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا جو تاریخ بنی اسرائیل کے عہدِ زرّیں کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے ساتھ ہی اُن کے پہلے دورِ زوال کا آغاز ہوگیا اس لیے کہ فوراً ہی اُن کی سلطنت دو حصّوں میں منقسم ہوگئی۔ بہرحال تقریباً تین سو سال ہی میں یہ عہدِ زوال بھی اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچا۔ چنانچہ اس کے دوران اوّلاً شمال سے آشوریوں نے شمالی سلطنتِ اسرائیل کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر ۵۸۷ء قبل مسیحؑ میں مشرق (عراق) سے آنے والے بُوکد نضر کے حملے نے نہ صرف یہ کہ پوری جنوبی سلطنتِ 'یہودیہ' کو تہس نہس کر کے رکھ دیا بلکہ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لاکھوں افراد کو قتل کیا چھ لاکھ یہودی مردوں، عورتوں اور بچّوں کو بھیڑوں اور بکریوں کے گلّوں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا ـــــ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہیکلِ سلیمانی کو کلیتہً مسمار کردیا

حتیٰ کہ اُس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں! ــــ بابل کی لگ بھگ سو سالہ اسیری (CAPTIVITY) کا دَور بنی اسرائیل کی ذلت و رسوائی کا شدید ترین زمانہ ہے!

۳۔ بنی اسرائیل کے دوسرے دورِ عروج کا آغاز بابل کی اسیری سے شہنشاہِ فارس سائرس یا کیخورس یا ذوالقرنین کے ہاتھوں نجات کے بعد حضرتِ مسیح ؑ سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل حضرتِ عُزیر علیہ السلام کی تجدیدی و اصلاحی مساعی سے ہوا اور دوسری خوشحالی یا سربلندی کا یہ دَور بھی لگ بھگ تین سو سال جاری رہا اور اس کا مظہرِ اعظم وہ مکابی سلطنت تھی، جو تقریباً ۱۶۰ قم سے ۶۰ قم تک نہایت دبدبہ اور شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی اور جس نے ایک بار پھر حضرت داؤد ؑ اور حضرت سلیمان ؑ کے دَور کی یاد تازہ کر دی!

۴۔ بنی اسرائیل کا دوسرا دورِ زوال ۶۳ قم میں رومی فاتح پومپی کے ہاتھوں یروشلم کی فتح سے شروع ہوا اور تاحال جاری ہے۔ اِس کے دوران اولاً حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت سے اعراض و انکار اور اُن کی شدید دشمنی اور مخالفت کی سزا ۷۰ء میں رومی جرنیل ٹائیٹس کے ذریعے ملی جس نے دوبارہ یروشلم کے شہر اور ہیکل سلیمانی کو مسمار کیا اور ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودیوں کو تہہ تیغ کیا اور ۶۷ ہزار کو غلام بنالیا ــــ اِس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اُن پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برستے رہے جن میں تازہ ترین جرمنی میں ہٹلر کے ہاتھوں اُن کا قتلِ عام ہے جس کی یاد وہ 'HOLOCAUST' نامی بکھیڑے کے ذریعے وقتاً فوقتاً تازہ کرتے رہتے ہیں

۵۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ یہود کے طرزِ عمل کی بنا پر جو مستقل ذلت و مسکنت اُن پر مسلط کر دی گئی تھی اُس سے رستگاری حاصل کرنے کا جو موقع اُنہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں "اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ" کے مطابق جناب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دامانِ رحمت کے سائے میں آجانے اور رحمان کی رحمانیت کے مظہرِ اتم اور حبل اللہ المتین کے مصداقِ کامل قرآن کو مضبوطی

سے تمام لینے کی صورت میں لاتھا اُسے تو انہوں نے اپنے تکبّر و غرور کی بنا پر ٹھکرا دیا تھا — اب بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں "حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" کے مطابق مغربی سامراج کے سہارے اُن کی جو سلطنت قائم ہوئی ہے، قرآنِ حکیم کے اشارات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح پیشینگوئیوں پر یقین رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اُس کی اصل حیثیت گُل ہونے والے شعلے کی آخری بھڑک اور قریب المرگ مریض کے آخری سنبھالے کے سوا کچھ نہیں اور قدرتِ خداوندی نے موجودہ سلطنتِ اسرائیل کے ذریعے تمام یہودیوں کو رُوئے ارضی کے کونے کونے سے کھینچ کر ارضِ فلسطین میں جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے تاکہ اُن کا آخری استیصال (FINAL EXTERMINATION) اور اجتماعی تدفین (MASS BURRIAL) ایک ہی مقام پر بسہولت ہو جائے۔

گذشتہ چودہ سو سال
اور اُمتِ مسلمہ کے بھی دو عروج اور دو زوال

مذکرہ بالا حدیثِ نبوی ؐ آیاتِ قرآنیہ اور تاریخِ بنی اسرائیل کی روشنی میں جب ہم اُمتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو فرمانِ رسول ؐ کی معجزانہ صداقت کا ایک عجیب نقش دل پر قائم ہوتا ہے کہ اِس کے دوران میں بھی ہو بہو وہی دو بار عروج اور دو مرتبہ زوال کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ (سورۃ آل عمران، آیت ۱۱۲)	"جمادی گئی اُن پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جاویں گے مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعے سے جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعے سے جو آدمیوں کی طرف سے ہے اور مستحق ہو گئے غضبِ الٰہی کے اور جمادی گئی اُن پر پستی!"

۱۔ اُمتِ مسلمہ کا پہلا دورِ عروج "اُمیین" کی زیرِ سرکردگی لگ بھگ تین ہی صدیوں پر پھیلا ہُوا تھا۔ اِس لیے کہ اگرچہ ویسے تو دورِ خلافتِ راشدہ، دورِ بنی اُمیہ اور دورِ بنی عباس کی مجموعی مدت ساڑھے چھ سو سال بنتی ہے لیکن اِس میں سے اصل دبدبہ، مرکزیت اور خالص عربی شوکت وسطوت کا دور تین سو سال ہی کو محیط ہے۔

۲۔ اُس کے بعد کے چار سو سال زوال کے دورِ اوّل پر مشتمل ہیں۔ عجیب حیرتناک مشابہت ہے کہ اِس کے نقطۂ عروج پر بھی بالکل وہی صورت نظر آتی ہے کہ اوّلاً شمال سے صلیبیوں کا سیلاب آیا، جس نے شام کے ساحلی علاقوں کو تاخت وتاراج کیا اور ۱۰۹۹ء میں یروشلم کو فتح کر کے مسجدِ اقصےٰ کی حُرمت بھی پامال کی اور لاکھوں مسلمانوں کو بھی تہہِ تیغ کیا۔ اور پھر مشرق سے تاتاریوں کا سیلاب آیا جس کے دوران نہ صرف یہ کہ لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمان قتل ہوئے، بلکہ ۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی کے ساتھ خلافتِ عباسیہ کا چراغ بھی ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا۔

۳۔ اِس کے بعد پھر ایک دورِ عروج آیا۔ لیکن "اُمیین" یعنی عربوں کی زیرِ قیادت نہیں بلکہ "آخرین" یعنی غیر عرب اقوام میں سے ایک نہایت قوی اور توانا قوم کی زیرِ قیادت جسے اللہ نے سورۂ محمدؐ کی آخری آیت میں وارد شدہ الفاظ یعنی (ترجمہ) "اگر تم پیٹھ دکھا دو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا!" کے مطابق پسند فرمایا۔ چنانچہ اللہ نے پہلے اُنہیں مسلمانوں کی پیٹھ پر عذاب کے کوڑے کے طور پر استعمال فرمایا اور بعد ازاں اُنہی کو نہ صرف یہ کہ اسلام کی توفیق دے دی بلکہ عالمِ اسلام کی قیادت بھی اُنہی کے حوالے کر دی تھی۔ بقول اقبال ؂

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

چنانچہ اوّلاً ترکانِ سلجوقی میدان میں آئے، پھر ترکانِ صفوی، ترکانِ تیموری اور ترکانِ عثمانی جن کے ہاتھوں عظیم سلطنتوں کی بنیاد پڑی ـــ اور ترکانِ عثمانی کی

سعادت کا تو کہنا ہی کیا کہ نہ صرف یہ کہ پورے جنوبی ایشیا، شمالی افریقہ اور مشرقی یورپ پر اُن کی شوکت و سطوت کا سِکّہ جما بلکہ خلافتِ اسلامی کا عَلَم بھی کئی صدیوں تک اُن کے ہاتھوں میں رہا!

۴۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح بنی اسرائیل کا دوسرا دورِ زوال دو یورپی قوموں یونانیوں اور رُومیوں کے ہاتھوں آیا تھا، اُمّتِ مسلمہ کا دوسرا دورِ زوال بھی یورپی استعمار کے سیلاب کے نتیجے میں ظاہر ہُوا۔ چنانچہ ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے علم و حکمت اور فلسفہ و سائنس کی قوّتوں سے مسلّح ہو کر یورپی اقوام جب بیدار ہوئیں تو ایک عربی محاورے "سَمِّنْ کَلْبَکَ یَاکُلُکَ" یعنی اپنے کتّے کو کھلا پلا کر موٹا کرو گے تو ایک دن تم ہی کو کاٹے گا! کے مطابق انہوں نے اوّلاً دولتِ ہسپانیہ ہی کو ہڑپ کیا اور پھر ۱۴۹۸ء میں راس اُمید کے راستے کی دریافت کے بعد مغربی استعمار کا سیلاب اِس طویل بحری راستے کے ذریعے عالمِ اسلام کے دائیں بازو پر حملہ آور ہُوا ـــــ اور یہ عمل موجودہ صدی کے آغاز میں پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر تکمیل کو پہنچا جب عظیم سلطنتِ عثمانیہ کا نام و نشان مِٹ گیا اور صرف ایک چھوٹا سا ملک ترکی باقی رہ گیا، خلافتِ اسلامیہ کا چراغ گُل ہو گیا ـــ اور پورا عالمِ اسلام یورپی اقوام کی براہِ راست یا بالواسطہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا ـــــ عجیب حیرت انگیز مماثلت ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کے اِس دوسرے دورِ زوال کے نتیجے کے طور پر ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں کے عہدِ تولیّت کے دوران بھی دوسری بار مسجدِ اقصیٰ کی حُرمت پامال ہوئی اور گزشتہ اٹھارہ برس سے مسلمانوں کا یہ قبلۂ اوّل ایک مغضوب و ملعون قوم کے قبضہ و تسلط میں ہے!

۵۔ جس طرح ایک انسانی زندگی کے مختلف ادوار کا معاملہ ہے کہ جوانی کی قوّت و شدّت کی بنیادیں بچپن اور لڑکپن ہی میں پڑنی شروع ہو جاتی ہیں اور بڑھاپے کے ضعف اور ناتوانی کی جڑیں عین جوانی کے عروج کے وقت جسمِ انسانی میں جمنی شروع ہو جاتی ہیں بالکل اسی طرح قوموں اور اُمّتوں کا معاملہ ہے کہ اُن کے بھی عین عروج کے وقت زوال کے عمل کا آغاز ہو چکا ہوتا ہے اور زوال کی

انتہا کے ساتھ ہی عروج کی جانب حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب سے لگ بھگ پون صدی قبل جب ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا ایک دردمند فرزند الطاف حسین حالیؔ اُمتِ مُسلمہ کی پستی کی انتہا پر نالہ کناں تھا کہ ؎

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے | اِسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مَد ہے ہر جزر کے بعد | دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!

اور ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے | اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
وہ دین جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے | پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

عین اُسی وقت ایک دوسرا مردِ قلندر ملتِ اسلامی اور اُمتِ مسلمہ کے عروجِ تازہ کے خواب دیکھ رہا تھا اور پورے یقین و اعتماد کے ساتھ پیشین گوئی کر رہا تھا کہ ؎

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پہ کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اب سے لگ بھگ نصف صدی قبل تاریخِ انسانی اُمتِ مُسلمہ کے ایک تیسرے دَورِ عروج کی جانب سفر کا آغاز کر چکی ہے جس کے نتیجے میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا وہ عمل جو الفِ ثانی کے تجدیدی کارنامے سے شروع ہوا تھا ان شاء اللہ اسلام کے غلبے پر منتج ہوگا ـــــ اور اس کے ضمن میں دو اُمور تو بالکل قطعی اور حتمی ہیں، یعنی ایک یہ کہ سُورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۹ کی رُو سے اِس کا فیصلہ کن

(باقی ص ۳۹ پر)

باب دھم

"الفِ ثانی" کی تجدیدی مساعی

اور برِّصغیر پاک و ھند

اُمتِ مسلمہ اپنی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران جس طرح دو بار عروج سے ہمکنار ہو چکی ہے اور دو ہی بار زوال سے دوچار ہو چکی ہے اُس کا ذکر ۔

"خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں!"

کے مصداق سابقہ اُمت کی تاریخ کے حوالے سے نہایت وضاحت کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اب اس سے قبل کہ ہم اُس تیسرے عروج کی جانب پیش قدمی کا جائزہ لیں جس کا آغاز ہمارے مشاہدے کے مطابق تقریباً نصف صدی قبل ہو گیا تھا، آیئے کہ ایک طائرانہ نگاہ اسلام میں کارِ تجدید کی اہمیت و نوعیت اور خاص طور پر اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کے دوسرے ہزار سالہ دور (الفِ ثانی) میں تجدید و احیاء کے اس عمل کے بالکلیہ برِّصغیر پاک و ہند میں اِرتکاز پر ڈال لیں تاکہ اس تاریخی تناظر میں پاکستان کے کردار (ROLE) کی اہمیت پورے طور پر واضح ہو جائے!

ختمِ نبوّت سے پیدا شدہ خلا اور اُس کی تلافی کا اہتمام

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر نبوّت و رسالت کے درجۂ کمال کو پہنچ کر اختتام پذیر ہو جانے سے جو خلا پیدا ہوا اُسے حکمتِ خداوندی نے اِس طرح پُر فرمایا کہ:

اوّلاً — 'الہدیٰ' یعنی قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کو

کامل فرما دیا، یا یوں کہہ لیں کہ: "وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ" (سورۂ صف: آیت نمبر ۸) ترجمہ "اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا" کے مصداق نورِ ہدایت کا اتمام فرما دیا اور پھر اُس کی حفاظت کا ذمّہ بھی خود لے لیا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (ترجمہ) "ہم نے ہی اِس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم خود ہی اس کے محافظ ہیں!" (سورہ حجر آیت نمبر ۹)

— گویا اب کسی نئی وحی یا نئے نبی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں رہی، بلکہ صرف اُس "نوعِ انسان را پیامِ آخریں!" یعنی قرآنِ حکیم کی دعوت و اشاعت اور تبلیغ و تعلیم کا کام رہ گیا جس کی ذمّہ داری تا قیامِ قیامت امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دی گئی۔ چنانچہ اِس کے لیے آنحضورؐ کی ترغیب و تشویق کی انتہا کا مظہر تو آپؐ کا یہ قولِ مبارک ہے کہ:

"خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں"![1]

— اور تاکید کی انتہا آپؐ کے اِس فرمان سے ظاہر ہے کہ: "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً" "(ترجمہ) پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت!"[2]

ثانیاً — مگر ہمیں ایک ایک صدی کے وقفہ سے ایسے عظیم مجدّدین کا سلسلہ جاری فرما دیا جو درمیانی وقفے کے دوران پیدا شدہ من گھڑت خیالات و عقائد اور نئی ایجاد شدہ بدعات و رسومات کا قلع قمع کر کے دینِ حق کی اصل تعلیمات کو از سرِ نو نکھار کر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے لاتے رہیں تاکہ ہدایتِ ربانی کے رُوئے انور پر جمع ہو جانے والا گرد و غبار وقتاً فوقتاً صاف ہوتا رہے اور وہ خلقِ خدا کے سامنے اپنی اصل شان کے ساتھ جلوہ آرا ہوتا رہے اور اِس طرح ہدایت کے طالب اور حق کے متلاشی لوگوں کو دین کی حقیقی تعلیمات اور فلاح و سعادتِ دارین سے ہمکنار کرنے والے "صراطِ مستقیم" تک رسائی میں دقّت نہ ہو —!

---

[1] رواہ البخاری رح عن عثمان رض ابنِ عفان

[2] رواہ البخاری رح عن عبداللہ رض ابنِ عمر رض

اِسی کے ذیل میں ایک اضافی ضمانت اِس امر کی بھی دے دی گئی کہ دنیا اہلِ حق سے کبھی بالکل خالی نہ ہو گی اور اُمّتِ محمدؐ میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ یا جماعت لازماً حق پر قائم رہے گی۔ ان دونوں کے باہمی ربط سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہو گا کہ ہر دور کی تجدیدی و اصلاحی مساعی سے ایک جماعت اہلِ حق کی وجود میں آتی رہے گی جو لگ بھگ ایک صدی تک خلقِ خدا کی صحیح راستے کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی — تاآنکہ اِس عرصے میں وہ خود زوال سے دوچار ہو کر ایک 'فرقہ' بن جائے اور پھر اللہ کسی اور صاحبِ دعوت و عزیمت کو اِصلاح و تجدید کی توفیق عطا فرما کر کھڑا کر دے۔ واللہ اعلم!

کارِ تجدید اور سلسلۂ مجدّدین کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو الفاظِ مبارکہ سُننِ ابی داؤد رح میں حضرت ابوہریرہ رض سے مروی ہیں وہ یہ ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃِ عَامٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا "	اللہ تعالیٰ اِس اُمّت میں ہر صدی کے سِرے پر ایسے لوگوں کو اُٹھاتا رہے گا جو اُس کے لیے اُس کے دین کو از سرِ نو تازہ کرتے رہیں گے! "

اِس حدیث کی شرح و تفسیر میں دو اُمور پر علمائے اُمّت کا تقریباً اجماع ہے، ایک یہ کہ سو سال سے مراد لازماً یہی مدّت نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ صرف 'وقتاً فوقتاً' کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بطور محاورہ استعمال ہوئے ہیں، اور دوسرے یہ کہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک صدی میں کوئی ایک ہی مجدّد ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی وقت میں متعدد اصحابِ ہمّت و عزیمت اِس کام کے کرنے والے موجود ہوں — بایں ہمہ حدیثِ نبویؐ کے ظاہری الفاظ کی رعایت سے ہر صدی ہجری کے ضمن میں کسی ایسی اہم ترین اور عظیم ترین شخصیت کی تعیین کی کوششیں بھی عموماً ہوتی رہی ہیں جسے اُس صدی کا مجدّد قرار دیا جا سکے!

'الفِ ثانی' کی تجدیدی مساعی

اِس تحریر میں ہمیں نہ اُمتِ مُسلمہ کی تاریخ کے پہلے ایک ہزار سال کے دوران کے مجدّدین و مصلحین کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے، نہ 'الفِ ثانی' کے مجدّدینِ اُمت کی اصلاحی مساعی یا تجدیدی کارناموں کی تفصیل پیش کرنی ہے بلکہ مقصود صرف اِس حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرانا ہے کہ گیارھویں صدی ہجری سے یہ کارِ تجدید و اصلاح بالکلیہ برِصغیر پاک و ہند میں مرتکز ہو گیا ہے!

اِس کی ایک ظاہری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ صورت بھی صرف اِس صنم خانۂ ہند ہی میں پیش آئی تھی کہ ؎

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق!"

کے مصداق 'مغلِ اعظم' شہنشاہ جلال الدین اکبر علیہ ما علیہ نے کچھ اپنی سیاسی اور حکومتی مصلحتوں کی بنا پر اور کچھ سرکاری علماء اور درباری دانشوروں کے سکھانے پڑھانے پر یہ دعویٰ کر دیا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین صرف ایک ہزار سال کے لیے تھا۔ لہٰذا اب اُس کی مدت ختم ہو چکی ہے اور 'الفِ ثانی' یعنی دوسرے ہزار سال کے لیے ایک نیا دین درکار ہے۔ چنانچہ اُس نے 'دینِ الٰہی' کے نام سے وہ نیا مذہب ایجاد بھی کر لیا اور اُسے حکومت کی قوت و اختیار کے بل پر پھیلانا اور رائج کرنا بھی شروع کر دیا۔ اِس پر "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا!" کے عام قاعدۂ کلیہ کے تحت رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور ؎

"خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری"

کے مصداق جلالِ فاروقی رضؓ شیخ احمد سرہندی رحؒ کی صورت میں ظاہر ہُوا (واضح رہے کہ حضرتِ مجدّد رحؒ حضرت عمر رضؓ کی اولاد سے تھے!) جنہوں نے 'دینِ الٰہی' کے فتنے کا قلع قمع کر دیا اور اصل دینِ محمدی ﷺ کی از سرِ نو تجدید کا کارنامہ سرانجام دیا چنانچہ پورے عالمِ اسلام میں وہ معروف ہی اپنے اصل نام سے زیادہ 'امام ربانی مجدّد الفِ ثانی' کے لقب سے ہو گئے! —— بالکل اُسی طرح جس طرح غزوۂ بدر کے

لیے ابوجہل کے پیشگی طور پر استعمال کیے ہوئے لفظ 'یوم الفرقان' کو وحی ربانی نے اُسی کے منہ پر دے مارا تھا اور "یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ" کو واقعۃً یَوْمَ الْفُرْقَانِ ہی بنا دیا تھا (سورۃ انفال، آیت ۴۱) چنانچہ اب قیامت تک یوم بدر یوم فرقان ہی کے نام سے موسوم رہے گا!

گیارہویں صدی ہجری میں حضرت مجدد الف ثانی رح کے ساتھ ساتھ ایک دوسری اہم صاحبِ ہمت و عزیمت شخصیت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ہے ـــ اور اس صدی کے دوران پورے عالم اسلام میں ان دونوں کی ٹکر کی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔

بارہویں صدی میں البتہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے ساتھ ساتھ شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدی رح کی شخصیت بھی نظر آتی ہے اور انہیں اِس بنا پر شہرت بھی زیادہ حاصل ہوئی کہ اُن کی تائید اور تعاون سے آلِ سعود نے نجد میں ایک مضبوط حکومت قائم کی جس کا حیطۂ اقتدار جزیرہ نمائے عرب میں وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ حجازِ مقدس بھی اُن کے زیرِ تسلط آ گیا تاہم واقعہ یہ ہے کہ کارِ تجدید کی وسعت اور گہرائی دونوں کے اعتبار سے شاہ ولی اللہ دہلوی کا پلڑا اُن کے مقابلے میں بہت بھاری ہے۔ اِس لیے کہ اگرچہ شیخ محمد ابن عبدالوہاب نے مشرکانہ اوہام کا ازالہ اور بدعات و رسومات کا قلع قمع تو خوب کیا اور دین کو اس کے ظاہری پہلوؤں کے اعتبار سے یقیناً جملہ آلائشوں سے پاک کر کے بالکل خالص کر دیا لیکن چونکہ انہیں منطق اور فلسفے سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی لہٰذا دین کے حکمت و معرفت کے غامض اور عمیق پہلو خود اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے ـــ اُن کے مقابلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رح نہایت جامع شخصیت کے حامل تھے چنانچہ تفسیر و حدیث اور اصولِ فقہ کے ساتھ ساتھ تاریخ و ادب، منطق و فلسفہ اور تصوف و سلوک میں بھی درکِ کامل رکھتے تھے۔ اور راقم الحروف اپنے اِس احساس کے بیان میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا کہ قرونِ اولیٰ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں اُن کی سی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی اور شخصیت

نظر نہیں آتی ـــــ ان سب پر مستزاد یہ کہ شاہ صاحبؒ کو جدید عمرانیات کا مُوجد اوّل قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے ضمن میں انہوں نے علامہ ابنِ خلدون کے برعکس جنہوں نے سیاست اور حکومت کے معاملات و مسائل کو زیادہ پیشِ نظر رکھا تھا عہدِ حاضر کے تقاضوں کی مناسبت سے اصل توجہ 'فلسفۂ ارتفاقات' کے عنوان کے تحت معاشیات و اقتصادیات پر مرتکز کی ہے! ـــــ بہرحال کم از کم ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کے نزدیک اِس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ بارھویں صدی ہجری کے مجدّد اور دَورِ جدید کے 'فاتح' (افتتاح کرنے والے) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔ (اور عجب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ ہندی نژاد بھی فاروقی اللقب تھا!)

تیرھویں صدی ہجری میں صنم خانۂ ہند سے پھر ایک ایسی عظیم شخصیت اُبھری جس کی کوئی نظیر دَورِ صحابہ رضؓ کے بعد نہیں ملتی۔ ہماری مراد ہے مجاہدِ کبیر اور شہیدِ عظیم سید احمد بریلوی رحؒ سے جنہوں نے سرزمینِ ہند میں پہلی بار خالص نبویؐ نہج پر تحریکِ جہاد برپا کی اور ایک بار دیکھنے والی نگاہوں کے سامنے دَورِ صحابہ رضؓ کا عکس پیش کر دیا۔ کارِ تجدید کے منطقی تسلسل کے مظہر کے طور پر انہیں تمام تر تعاون اور سرپرستی خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی سے حاصل ہوئی، چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحؒ کے دو فرزندانِ گرامی شاہ عبدالعزیز رحؒ اور شاہ عبدالقادر رحؒ نے اُن کی 'حنا بندی' کی اور شاہ صاحب کے پوتے شاہ اسماعیل رحؒ شہید نے اپنی تمام تر خاندانی وجاہت اور مسلّمہ علمی برتری کے باوجود اُن کے رفیقِ کار اور دستِ راست بننے کی سعادت حاصل کی اور آخر دم تک اُن کا ساتھ بلاتشبیہ اسی شان سے دیا جس شان سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا۔

چودھویں صدی ہجری میں بھی واقعہ یہ ہے کہ جتنے عظیم اربابِ ہمت و عزیمت اور شہسوارانِ میدانِ تجدید و اصلاح برِّصغیر پاک و ہند میں پیدا ہوئے اُن کی مثال پورا عالمِ اسلام نہ کمیت (QUANTITY) کے اعتبار سے دے سکتا ہے نہ

کیفیت (QUALITY) کے اعتبار سے!

اِس صدی کے دوران چونکہ عالمِ اسلام میں مغربی سامراج کے باعث تعلیم و تربیت کے دو مستقل دھارے جُدا جُدا بہہ نکلے تھے لہٰذا ان دونوں نے اپنا اپنا حق علیحدہ علیحدہ ادا کیا۔ چنانچہ دینی تعلیم و تربیت کے قدیم نظام سے فیض یاب ہونے والوں میں سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح ایسی عظیم اور جامع شخصیت بھی یہیں پیدا ہوئی اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے جدید نظامِ تعلیم سے مستفید ہونے والوں میں سے علامہ اقبال مرحوم جیسا نابغۂ وقت اور رُومیٔ ثانی بھی اِسی خاک سے اُٹھا!

اِس پر مستزاد یہ کہ علماء کے حلقے سے ایک عظیم حرکت 'تبلیغ' کے عنوان سے اِسی خاکِ ہند سے ایسی اُٹھی جس نے اس وقت پورے عالمِ اسلام ہی نہیں، الحمد للہ کہ بہت سے دیارِ کفر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور دُوسری جانب زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے حلقے سے قوت پاکر اُبھری ایک دوسری عظیم تحریک — تحریکِ جماعتِ اسلامی — جس نے پورے عالمِ اسلام پر اثر ڈالا، یہاں تک کہ عالمِ عرب کی عظیم تحریک 'اخوان المسلمون' کو بھی فکری غذا فراہم کی اور اس وقت اِس تحریک کے زیرِ اثر متحرک اور فعّال لوگوں کی ایک کثیر تعداد پورے عالمِ ارضی میں پھیلی ہوئی ہے!

غور کا مقام ہے کہ کیا یہ سب کچھ محض اتفاقات کا کرشمہ ہے
یا اِس سے فطرت کی کوئی مشیّت اور قدرت کا کوئی ارادہ
ظاہر ہو رہا ہے؟؟

کیا 'الفِ ثانی' کے مجدّدِ اوّل شیخ احمد سرہندی رح کا سرزمینِ ہند سے متعلق ہونا ایک بالکل اتفاقی امر ہے جن کے سلسلۂ نقشبندیہ مجدّدیہ کا جال نہ صرف پورے برِّصغیر بلکہ افغانستان اور ترکی تک پھیلا ہُوا ہے اور جس کے زیرِ اثر خود رُوس کے زیرِ تسلّط مسلم علاقوں میں بھی " ہر قبا ہونے کو ہے اُس کے بنوں سے تار تار!"

کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے؟ اسی طرح کیا جملہ علوم اسلامی کے مجددِ اعظم اور تمدنِ انسانی کے دورِ جدید کے فاتح شاہ ولی اللہ دہلوی رح کا ہندی نژاد ہونا بھی بالکل اتفاقی امر ہے؟ اور کیا اُن کی عظیم تصانیف کے ذریعے ہونے والی 'تجدیدِ علومِ اسلامی' کے وہ وسیع اور ہمہ گیر اثرات جو پورے برِصغیر کے طول و عرض میں مختلف سلاسل اور مسالک سے منسلک علماء کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں رائیگاں جانے والے ہیں؟ اسی طرح کیا تحریکِ شہیدین رح سے وابستہ سینکڑوں مجاہدوں کے مقدس خون کا ارضِ پاکستان میں جذب ہونا بالکل بے نتیجہ رہے گا؟ پھر کیا جماعتِ شیخ الہند رح کی سو سالہ خدمات کوئی عظیم اور پائیدار نتیجہ پیدا نہ کر سکیں گی؟ اسی طرح کیا اُس حکیم الاُمت، ترجمان القرآن اور مصورِ پاکستان کا سرزمینِ لاہور میں طویل قیام اور ابدی استراحت بالکل بے معنی ہے جس نے "کافرِ ہندی" اور "برہمن زادہ" ہونے کے باوجود 'فلسفۂ خودی' کے عنوان سے 'رُوحِ ایمان' کی بھی از سرِ نو صحیح ترین تعبیر کی اور معاشرت و معیشت اور سیاست و ریاست کے ضمن میں اسلام کی ہدایات اور تعلیمات کو وقت کے تقاضوں کے مطابق صحیح ترین انداز میں پیش کیا؟ پھر کیا اُسی مردِ قلندر کا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو جنوبی ہند سے شمالی ہند کو 'ہجرت' اور یہاں سے اپنی دعوت کے آغاز پر آمادہ کرنا کوئی لا اُبالیانہ معاملہ تھا؟

ہمارے نزدیک یہ تمام واقعات اور اُن کا حیرتناک تسلسل ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہا ہے اور وہ یہ کہ مشیتِ ایزدی نے اسلام کے عالمی غلبے کے نقطۂ آغاز کے طور پر سرزمینِ پاکستان کو منتخب فرما لیا ہے! اور اگر ہمارا گمان صحیح ہے تو ع "یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!!"

دعوتِ رجوع الی القرآن

اِس سے قبل سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۹ کے حوالے سے یہ بات

سامنے آچکی ہے کہ دینِ حق کی تجدید، اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور اُمتِ مُسلمہ کے عالمی غلبے کی عملی جدّوجہد کا مرکز و محور قرآنِ حکیم ہے، اِس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان کے مطابق قرآن ہی ایک جانب ذکرِ حکیم ہے تو دوسری جانب صراطِ مستقیم ہے اور تیسری جانب حبل اللہ المتین (اللہ کی مضبوط رسّی) ہے[1] اور آپؐ کے ایک دوسرے فرمانِ مبارک کی رُو سے یقیناً اللہ تعالیٰ اسی کتاب کی بدولت قوموں کو عروج عطا فرمائے گا اور اسی کے سبب سے ذلیل و خوار کر دے گا۔[2] چنانچہ اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے علّامہ اقبال مرحوم نے کہ ؎

" خوار از مہجوریٔ قرآں شُدی | شکوہ سنج گردشِ دوراں شُدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ | در بغل داری کتابِ زندۂ "

اِس پس منظر میں غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ "رجوع الی القرآن" کی تحریک بھی جس شدّت و قوّت اور جس گہرائی و گیرائی اور جس وُسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ گذشتہ دو سو سال سے برِّصغیر پاک و ہند میں چل رہی ہے اُس کی بھی کوئی نظیر پورے عالمِ اسلام میں نہیں ملتی!

واضح رہے کہ یہ تحریک اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں شاہ ولی اللہؒ کی الفوز الکبیر اور فارسی ترجمۂ قرآن اور اُن کے صاحبزادوں شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے اُردو تراجم سے شروع ہوئی تھی، انیسویں صدی کے اواخر میں سرسیّد احمد خاں مرحوم اور آنجہانی غلام احمد قادیانی کی غلط اور گمراہ کُن تاویلات کے مخالفانہ ردِّ عمل (ANTI THESIS) سے ؎

" تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے! "

---

[1] .... وَهُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ ... (رواہ الترمذی و الدارمی عن علی ابن ابی طالبؓ)

[2] " إِنَّ اللهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ أَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ

نے مصداق مزید جذبہ اور اضافی قوت حاصل کر کے بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے ایک 'دھماکہ' کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اور اِس کے بعد اِس نے ایک جانب مولانا اشرف علی تھانویؒ کی 'بیان القرآن'، اور حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ اور حواشی اور بعد ازاں دیوبندی بریلوی اور اہلحدیث مکاتبِ فکر کے بیسیوں علماء کے تراجم و تفاسیر کی صورت میں پیش قدمی کی تو دوسری جانب یہ علامہ اقبال مرحوم ایسے 'سعدیٔ ثانی' کے کلام میں نہایت پُرشکوہ اور دلآویز انداز اور جدید تعبیرات کے لباس میں جلوہ گر ہوئی ـــــ اور اِن دو انتہاؤں کے بین بین اس نے ایک جانب مولانا آزاد مرحوم کے معنوی جانشین مولانا مودودی مرحوم کی 'تفہیم القرآن' کی صورت میں ظہور کیا جس نے بے شمار اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو غلبۂ اسلام کی عملی جدّوجہد کے لیے آمادۂ عمل (MOTIVATE) کیا تو دوسری طرف امام حمید الدین فراہیؒ کے جانشین مولانا امین احسن اصلاحی کی 'تدبّرِ قرآن' کی صورت میں بہت سے تشنگانِ علمِ قرآن کی آسودگی کا سامان فراہم کیا!

واضح رہے کہ یہاں برِصغیر پاک و ہند میں گذشتہ ایک سو سال کے دوران پیدا ہونے والے تفسیری لٹریچر کی تفصیل نہ مطلوب ہے نہ ممکن، بلکہ وضاحت صرف اِس امر کی درکار ہے کہ اِس عرصہ میں دعوت الی القرآن اور تفسیرِ قرآن کا کام جس وسعت اور شدّت کے ساتھ یہاں ہوا ہے اور کہیں نہیں ہوا، چنانچہ کم از کم اِس دَور کی حد تک وہ بات جو عام طور پر صرف ایک دلچسپ مقولے کی حیثیت سے بیان ہوتی ہے غلط نہیں ہے کہ "قرآن نازل حجاز میں ہوا لیکن اِس کی قرأت کا حق ادا کیا اہلِ مصر نے، اور اِس کی کتابت میں کمال دکھایا ترکوں نے اور اِسے سمجھنے کا حق ادا کیا ہندیوں نے" ـــــ علامہ اقبال مرحوم نے بھی کچھ اسی انداز میں فرمایا ہے کہ:

" عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی! "

بہر حال، برِ صغیر کے طول و عرض میں رجوع الی القرآن کی اِس تحریک نے جو اثرات پیدا کیے، ہر شخص جانتا ہے کہ اب حالات نے اُن کو سمیٹ کر ارضِ پاکستان میں مرکوز کر دیا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے ساتھ ذوق و شوق اور شغل و شغف کے علاوہ 'دعوتِ رجوع الی القرآن' کا جو ہمہمہ اور غلغلہ اِس وقت سرزمین پاکستان میں ہے وہ اور کہیں موجود نہیں ہے!

> یہاں ایک بار پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ بھی محض اتفاق کا کرشمہ ہے؟ یا کیا قرآنِ حکیم ایسی ہی غیر مؤثر شے ہے کہ رجوعِ الی القرآن کی یہ عظیم مساعی بے نتیجہ اور لاحاصل رہیں؟؟؟!!

اِن سوالات کا جو جواب ہر صاحبِ ایمان کے قلب کی گہرائیوں سے بلا اختیار نکلے گا وہ یہ کہ ہرگز نہیں! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عظیم ترین معجزہ تو عصائے موسیٰؑ سے کہیں اعلیٰ وارفع اور زیادہ کارگر اور مؤثر ہے۔ چنانچہ جملہ باطل عقائد و خیالات اور گمراہ کن فلسفوں اور نظریوں کو یہ بالکل اُسی طرح ختم کر سکتا ہے جیسے عصاءِ موسیٰؑ نے ساحرانِ مصر کے سانپوں اور اژدہوں کو ہڑپ کر لیا تھا اور اُمتِ مسلمہ کے لیے یہ ہر دور اور ہر زمانے میں، مشکل ترین حالات اور ناموافق ترین کیفیات میں ویسے ہی راستہ بنا سکتا ہے جیسے عصاءِ موسیٰؑ نے سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کے لیے بنایا تھا! چنانچہ یہ ایک اضافی شہادت ہے اِس امر کی کہ ارضِ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بڑے منصوبے کی تکمیل کے لیے چُن لیا ہے!

تحریکِ آزادی میں مذہبی جذبے کی آمیزش

اُمتِ مسلمہ کی اپنے دوسرے دورِ زوال سے نکل کر اُس تیسرے اور آخری عروج کی جانب پیش قدمی کا پہلا مرحلہ، جو ان شاء اللہ العزیز اسلام کے عالمی غلبے پر منتج ہوگی، آزادی کی اُن تحریکوں پر مشتمل ہے جو تقریباً تمام

مسلمان ممالک میں بیسویں صدی عیسوی کے ثلثِ اوّل کے بعد سے چلنی شروع ہوئیں اور صدی کے وسط کے لگ بھگ یکے بعد دیگرے کامیابی سے ہمکنار ہوتی چلی گئیں! تا آنکہ اب روئے ارضی پر مسلم اکثریت کے علاقوں میں سے صرف چند ہی ایسے رہ گئے ہیں جو اغیار کے براہِ راست عسکری تسلط میں ہوں (اگرچہ مغرب کی ذہنی و فکری، علمی و فنی، معاشی و اقتصادی اور تہذیبی و ثقافتی غلامی تاحال برقرار ہے!)

حصولِ آزادی کی اِن تحریکوں کے بارے میں ایک بات تو یہ اظہر من الشمس ہے کہ اپنی بنیادی نوعیت کے اعتبار سے یہ نہ دینی و مذہبی تھیں نہ اصلاحی و تجدیدی بلکہ خالص قومی اور سیاسی تھیں اور ان سب کا تعلق اصلاً 'تیسری دنیا' کے ایک مشترک معاملے (THIRD WORLD PHENOMENON) سے ہے، جس کا مذہب سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے ——— تاہم اِن کے ذریعے احیاءِ اسلام کی تمنا اور غلبۂ دین کی آرزو کو یقیناً تقویت حاصل ہوئی ہے اور اِن کے ذریعے حاصل شدہ آزادی اِن شاء اللہ العزیز اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا پیش خیمہ اور اسلام کے عالمی غلبے کا مقدمہ ثابت ہوگی۔

دوسری اور موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے اہم تر بات یہ ہے کہ ان تحریکوں میں کہیں بھی نہ اسلام کا نعرہ لگا نہ ہی مذہبی جذبے کو اُبھارنے (یعنی INVOKE کرنے) کی کوئی کوشش ہوئی بلکہ اکثر و بیشتر یا تو صرف جذبۂ حُرّیت کو للکارا گیا یا کسی نسلی یا لسانی عصبیت کا سہارا لیا گیا، سوائے تحریکِ پاکستان کے کہ یہاں اصل نعرہ ہی یہ تھا کہ:

"پاکستان کا مطلب کیا؟ لا اِلٰہ اِلّا اللہ !!"

یہی وجہ ہے کہ علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد نے اس میں بھرپور حصّہ لیا اور وقتی طور پر پورا مسلم انڈیا مذہبی جذبے سے سرشار ہوگیا — اور جیسا کہ ہم اِس سے قبل تفصیل سے عرض کر چکے ہیں، یہ اِسی کا نتیجہ تھا کہ قیامِ پاکستان کا 'معجزہ' صادر ہوگیا۔

علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تاریخ ساز اور ولولہ انگیز انقلاب کے بارے میں کسی نظم میں یہ اشعار کہے ہیں : ؎

"یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے کھیلنے جاتے تھے ایوانِ گہِ کسریٰ میں شکار

اور ؎ یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن فاش کرنے لگے جبریلِ امیںؑ کے اسرار"

بالکل اسی طرح یہ بھی تحریکِ پاکستان میں اسی زوردار مذہبی جذبہ کی آمیزش کا کرشمہ تھا کہ بیسویں صدی کے عین وسط میں جبکہ پورے کرۂ ارضی پر الحاد اور مادہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے اور دین و مذہب کی بنیادیں تک منہدم ہو چکی تھیں دس کروڑ سے زائد افراد کی ایک قوم نے دستوری اور قانونی سطح پر اپنی قومی و اجتماعی زبان یعنی دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ کلمۂ شہادت ادا کیا اور "قراردادِ مقاصد" کے ذریعے حقِ حاکمیت کو بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے اپنے جملہ اختیارات کو اُسی ہی کی معیّن کردہ حدود کے اندر اندر استعمال کرنے کا عہد کیا! چنانچہ اِس سے جہاں ع " نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد!" کی کیفیت پیدا ہوئی وہاں (بادنیٰ تصرّف) ع " کفر لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد!" کا نقشہ بھی سامنے آیا۔ چنانچہ اسی اسمبلی کے کچھ اراکین نے ؎ " رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جاجا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں!"

کے مصداق برملا کہا کہ آج یہاں جو قرارداد پاس ہوئی ہے اِس کی وجہ سے ہم شرم کے مارے دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے!"

اور یہ بھی اِسی کا کرشمہ ہے کہ پاکستان میں آج تک جتنے دستوری مسودے مرتب ہوئے اُن سب میں بلا استثناء وہ دفعہ موجود رہی ہے جو سورۂ حجرات کی پہلی آیت کی دستورِ ملکی کی سطح پر بہترین اور صحیح ترین ترجمانی کرتی ہے اور اسلامی ریاست میں قانون سازی کی گنجائش (SCOPE) کی بھرپور تعیین کرتی ہے یعنی یہ کہ "یہاں کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کی جاسکے گی!" یہ دوسری بات ہے کہ ہم آج تک اِس دفعہ کو پوری طرح نافذ العمل

نہیں کر سکے ا ؎ (FULLY OPRATIVE)
بہرحال! ایک تیسری مرتبہ پھر اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ کیا دِل مانتا ہے کہ یہ سب کچھ کارِ عبث اور دفترِ بے معنیٰ (EXERCISE IN FUTILITY) ہے؟ اور کیا ہمارا حال اور مستقبل اتنے طویل ماضی سے بالکل منقطع ہو جائے گا؟

جہاں تک ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کا تعلق ہے، اُس کے نزدیک اس معاملے میں تاخیر اور تعویق تو ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہی نہیں عین متوقع ہے کہ اِس راہ میں ہماری طویل کوتاہیوں اور موجودہ خامیوں کے باعث کچھ نقصانات (SET BACKS) اور وقتی ناکامیوں (FAILURES) اور عارضی شکستوں (TEMPORARY REVERSALS) کا سامنا ہو، لیکن پاکستان کا اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا گہوارہ اور اسلام کے عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز بننا وہ تقدیرِ مُبرم ہے جو کسی طرح ٹالی نہیں جا سکتی — اور یہی ہے ہمارے قومی و ملّی وجود کی تصویر کا واحد روشن رُخ جو کبھی، جب توجہ اسی پر مرتکز ہو جاتی ہے تو میرے اُفقِ ذہن و قلب پر مہرِ درخشاں کے مانند چمکنے لگتا ہے اور کبھی جب توجہ زیادہ تر پاکستان کے موجود الوقت دینی، اخلاقی اور سیاسی حالات پر مرکوز ہو جاتی ہے تو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی صرف ایک مختصر اور لرزتی ہوئی کرن کا رُوپ دھار لیتا ہے — چنانچہ اِسی اُمید و بیم کی کیفیت میں جو کچھ بن آتا ہے کیے جا رہا ہوں اور غالباً ایک حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں وارد شدہ الفاظ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ کا تقاضا بھی یہی ہے۔ واللہ اعلم

ا ؎ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت اور اس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

اے اہلِ ایمان! مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے، اور اللہ کا تقویٰ اختیار کئے رکھو (اسلئے کہ) یقیناً اللہ سب کچھ سننے اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے!

باب یازدہم — خلاصۂ مباحث

ایک فیصلہ کُن دوراہا

اِن سطور کی تحریر کے وقت قمری حساب سے پاکستان کی عمر کے چالیسویں سال کے مکمل ہونے میں چار ماہ سے بھی کم عرصہ باقی رہ گیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ داخلی اور خارجی، اور دینی اور دنیوی جملہ اعتبارات سے پاکستان اِس وقت ایک نہایت اہم اور فیصلہ کُن دوراہے پر کھڑا ہے۔

دینی اعتبار سے اِس دوراہے کی اہمیت اور نزاکت قرآنِ حکیم کے دو مقامات کی روشنی میں سمجھ میں آسکتی ہے :

(۱) سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸ میں وارد شدہ حسب ذیل الفاظ کی روشنی میں کہ :

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ

(ترجمہ) "قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحمت نازل فرمائے، لیکن اگر تم نے پھر وہی کچھ کیا (جو پہلے کرتے رہے ہو) تو پھر ہم بھی دوبارہ وہی کچھ کریں گے۔ (جو پہلے کر چکے ہیں)"

اِس ضمن میں ایک عام کہاوت کہ "زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو" کے مطابق اور اُس اصول کے تحت جو ہم اِس سے قبل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ کبھی کبھی مشیتِ ایزدی کفّار اور ملحدین کے ذریعے بھی پوری ہوتی ہے، روسی قائدین کے اُس قول کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جو اُنہوں نے اب سے لگ بھگ پندرہ سال قبل سقوطِ ڈھاکہ کے حادثۂ فاجعہ کے بعد ہمارے اُس وقت کے سربراہِ حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے دَورۂ روس کے موقع پر ماسکو میں منعقدہ ایک سرکاری استقبالیہ میں نہ صرف سفارتی آداب اور رکھ رکھاؤ بلکہ میزبانی کے عام دستور اور قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہی تھی کہ :

"ہم نے جو کچھ مشرقی پاکستان کے معاملے میں کیا، ہمیں اُس پر ہرگز کوئی پشیمانی یا ندامت نہیں ہے بلکہ ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر برِّصغیر میں دوبارہ اُسی قسم کے حالات پیدا ہوئے تو ہم پھر وہی کچھ کریں گے جو ہم نے اِس موقع پر کیا ہے !"

(۲) سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آخری آیت کے اِن الفاظ کی روشنی میں کہ :

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ۔

(ترجمہ) اگر تم پیٹھ موڑ لوگے تو اللہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور قوم کو قبول فرمائے گا!

گویا مشیت ایزدی نے توطنِ اسلامیہ پاکستان کو اسلام کے عالمی غلبہ کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت حاصل کرنے کا بھرپور موقع عنایت فرمادیا ہے۔ اب یہ مسلمانانِ پاکستان کی سعادت یا شقاوت، اُن کے فکر و تخیل کی بلند پروازی یا پستی، اُن کی عالی حوصلگی یا کم ہمتی اور فی الجملہ اُن کی عزیمت یا سہل انگاری پر منحصر ہے کہ وہ "وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا" کی عملی تصویر بنتے ہیں یا "وَلٰکِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ" کی مجسم تصویر بن کر "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"! کا مصداق بن جاتے ہیں اور اسلام کے عالمی غلبے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو پسند فرمالیتا ہے![1]

عجیب اتفاق ہے کہ عین اُس وقت جب راقم کے قلم سے مندرجہ بالا مصرعہ تحریر میں آیا روزنامہ جنگ لاہور کا ۱۷ فروری ۸۶ء کا شمارہ آن پہنچا جس کی رُو سے برِصغیر پاک و ہند کے "باب الاسلام" (یعنی سندھ) کے ایک اتنے معتبر سیاستدان نے کہ اُنہیں بقول خود اُن کے سابق وزیراعظم بھٹو مرحوم کے ختنہ کی تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا، کہا ہے کہ:

"میں مطمئن ہوں کہ پاکستان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا کیونکہ یہ نفرت کا گہوارہ بن چکا ہے"!

چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ اِس وقت ہم ایک نہایت فیصلہ کُن دوراہے کے عین سرے پر کھڑے ہیں۔ اور ہر صاحب بصیرت کو بچشم سر نظر آرہا ہے کہ:

ایک جانب ہمارے قومی و ملی وجود کا موجودہ دینی و مذہبی، دستوری و سیاسی اور اخلاقی و عملی 'منظر' اور اُس کا چالیس سالہ 'پس منظر' ہے جو بظاہر شیکسپیئر کے الفاظ "TO BE OR NOT TO BE ______ IS THE QUESTION" کے سوالیہ نشان کے ساتھ ایک عقدۂ لاینحل کی صورت اختیار کر چکا ہے نتیجۃً ملک و ملت بالکل اُس کیفیت میں نظر آرہے ہیں۔ جس کا نقشہ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ میں اِن الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ (ترجمہ) "تم لوگ آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر تھے"! اور بظاہر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ خاکم

---

[1] قرآنی آیت کے حوالے کے لیے دیکھئے سورۃ اعراف آیت ۱۷۶

بدین، مکمل تباہی ہمارا مقدر بن چکی ہے!

دوسری جانب اُمّتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کا طویل پس منظر اور اِس کا بالخصوص گزشتہ چار سو سال کا معاملہ ہے جس کے حوالے سے دل کی آنکھوں کے سامنے ایک نہایت روشن اور تابناک رُخ سامنے آتا ہے اور باطن کے کانوں سے نہ صرف "اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے بہت قریب ہے"[1] کا مژدہ سنائی دیتا ہے بلکہ "اللہ کی جانب سے مدد اور فتح قریب ہی ہے"[2] کی نوید جانفزا بھی سنائی دیتی ہے۔

تاہم یہ واضح رہنا چاہیے کہ جبکہ متذکرہ بالا تاریک رُخ کے منفی نتائج اپنی منطقی انتہا کو پہنچ چکے ہیں جو ٹھوس واقعات کی صورت میں بالفعل موجود ہیں، روشن رخ کی حیثیت صرف ایک 'موقع' کی ہے جو اگر گنوا دیا گیا تو "اَلْوَقْتُ سَيْفٌ قَاطِعٌ" (وقت ایک تیز دھار تلوار ہے) کے مطابق پھر کبھی ہاتھ نہ آسکے گا اور ملّتِ اسلامیہ پاکستان "وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝" یعنی 'تیزی سے گزرنے والا زمانہ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے اور خسارے میں ہے' کی مجسّم تفسیر بن کر رہ جائے گی۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک!

اساسی عقدہ اور اُس کے منفی نتائج

جیسے کہ ہم اِس سے قبل واضح کر چکے ہیں، ہمارے قومی اور ملّی وجود کا اساسی عقدہ (DI LEMMA) تو یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کی صورت میں ایک ایسا ملک قائم کیا ہے جس کی اساس واحد بلکہ واحد منطقی جواز صرف اور صرف 'اسلام' ہے، چنانچہ ایک عوامی اسلامی جذبے کے سوا اِس کے استحکام کی کوئی دوسری ٹھوس اساس موجود نہیں ہے لیکن اسلام کے ساتھ بحیثیتِ مجموعی ہمارے واقعی اور عملی تعلق کا حال حد درجہ مایوس کن بلکہ "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!" کا مصداقِ کامل ہے! —— تاہم اِس ایک جملے (STATEMENT) سے نہ صورتِ حال کی پوری نزاکت اور 'گھمبیرتا' کا احساس ہوتا ہے نہ اُن منفی اثرات کا پورا اندازہ ہوتا ہے جو اِس اساسی عقدے کے منطقی نتائج کے طور پر ہمارے قومی و ملّی وجود پر

---

[1] اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (سورۃ الاعراف: آیت ۵۶)

[2] نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ۔ (سورۃ الصف: آیت ۱۳)

دینی و مذہبی، اخلاقی و عملی، دستوری و ریاستی اور سیاسی و انتظامی ہر اعتبار سے مرتب ہوتے ہیں، ان میں سے بعض پر اس سلسلۂ مضامین میں اس سے قبل تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے، بعض کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ زیر بحث موضوع کے دائرے سے براہِ راست متعلق نہ تھے۔ ذیل میں ان سب کا ایک مختصر خاکہ دیا جا رہا ہے:

(۱) ریاست کی سطح پر ہمارا حال یہ ہے کہ تاحال کوئی متفق علیہ دستور موجود نہیں ہے۔ آج سے دو اڑھائی سال قبل تک ملک کے اکثر سیاسی حلقے ۱۹۷۳ء کے دستور پر اتفاق کا اظہار کر رہے تھے لیکن اولاً مارشل لاء کی طوالت اور پھر ایک فردِ واحد کے آمرانہ اقدامات نے، جن کی ابتدا 'ریفرنڈم' نامی ڈھونگ سے ہوئی تھی، شدید ردِ عمل پیدا کر دیا ہے اور اب متعدد طاقتور اور مؤثر حلقے ایک نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب اور نئے دستور کی تدوین کے مطالبے یا براہِ راست کنفیڈریشن کے نعرے کے ساتھ میدان میں اتر چکے ہیں!

(۲) سیاسی سطح پر فوج کی مسلسل 'سرپرستانہ نگرانی' نے قوم کو بحیثیتِ مجموعی تاحال 'نابالغ' بنایا ہوا ہے چنانچہ عوامی سطح پر سیاسی شعور کا خوفناک حد تک فقدان ہے جس کے نتیجے میں ملک بھر میں کوئی ایک بھی ایسی قومی سیاسی جماعت موجود نہیں ہے جو ایک طرف خود منظم بھی ہو اور ملک گیر بھی، دوسری طرف قومی نقطۂ نظر بھی رکھتی ہو اور واضح نظریاتی اساس بھی، تیسری طرف ایک مضبوط اور باصلاحیت قیادت بھی رکھتی ہو اور مخلص اور بے نفس کارکنوں کی معتدبہ تعداد بھی، اور چوتھی جانب عوام میں قابلِ لحاظ حد تک پذیرائی بھی رکھتی ہو اور اثر و نفوذ بھی!!

(۳) معاشی سطح پر شدید افراطِ زر اور اس سے پیدا شدہ ہولناک گرانی کا سامنا ہے۔ اور بہ "چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام ۔ یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات!" کے مصداق جو مصنوعی خوشحالی نظر آتی ہے وہ یا غیر ملکی قرضوں کے حالہ ایسے پہاڑ کی 'کرامت' ہے جو سیاسی اور معاشی اعتبار سے انتہائی تباہ کن ہے یا ملک سے باہر کام کرنے والوں کی خون پسینے کی کمائی کی فوری اور عارضی 'برکت' ہے جو مآلِ کار کے اعتبار سے اخلاقی اور سماجی سطح پر سخت مضر اور نقصان دہ ہے! پھر وہ عارضی برکت بھی اب ختم ہوا چاہتی ہے جس سے فوری معاشی بحران کا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے!!

(۴) قومی سطح پر ہمارا شیرازہ سخت پراگندگی کے عالم میں ہے اور مختلف النوع نسلی (ETHNIC) لسانی (LINGUISTIC) ——— اور علاقائی (REGIONAL) عصبیتوں کے فروغ نے قومی یکجہتی کو شدید ضعف سے دوچار کر دیا ہے!

(۵) نظریاتی سطح پر قوم کے ذہین عناصر اور تعلیم یافتہ طبقات میں مغربی افکار و نظریات سے پیدا شدہ مادہ پرستانہ اور ملحدانہ اندازِ فکر اور جدید تہذیب و ثقافت کا پروردہ اباحیت پسندانہ نقطۂ نظر تو پہلے ہی سے موجود تھا، اب اُس کی منطقی انتہا یعنی مارکسزم اور کمیونزم نے بھی ہماری نوجوان نسل کے ایک خاصے بڑے حلقے میں قدم جما لیے ہیں!

(۶) اخلاقی سطح پر قوم کا دیوالہ نکلا ہوا ہے اور اخلاقیات کی اسلامی اور ایمانی سطح تو در کنار عام انسانی سطح پر بھی ہم اخلاق کے بحران (MORAL CRISIS) سے دوچار ہیں۔ اور جیسے کہ اس سے قبل تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے، دراصل ہم بحیثیتِ قوم اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی سزا اور پاداش کے طور پر 'نفاقِ عملی' میں مبتلا ہو چکے ہیں!

(۷) دینی سطح پر اسلام کے ساتھ عملی تعلق کے اعتبار سے ہم جس ع "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!" کی کیفیت سے دوچار ہو چکے ہیں اُس کی تفصیل تو پہلے آ چکی ہے، 'ایمان' کے اعتبار سے بھی حالت انتہائی دگرگوں ہے۔ اِس لیے کہ عوام کی سطح پر تو 'ایمان' بالعموم ایک عقیدہ (DOGMA) کی ایسی پوٹلی کے مشابہ ہے جو ذہن کے کسی ایک کونے میں رکھی ہوئی ہو اور جس سے انسان کے اخلاقی رویے اور عملی اقدار (VALUE STRUCTURE) کا تعلق نہ ہو، اور خواص میں سے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت یا باضابطہ الحاد (ATHEISM) کی شکار ہے یا کم از کم تشکک (SCEPTICISM) اور لا ادریت (AGNOSTICISM) سے دوچار ہے اور علماءِ دین کے حلقے میں ایک کثیر تعداد اُن علماءِ سُوء کی موجود ہے جن کی عملی روش سے ہویدا حُبِّ دنیا، حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ اُن کے 'ایمان' کی ناگفتہ بہ حالت کی غمازی کر رہی ہے! مزید برآں اُن کی پیدا کردہ فرقہ واریت کی ہولناکی روز بروز بڑھ رہی ہے اور قومی سطح پر تشتت و انتشار (CHAOS) میں ایک مزید اور حد درجہ تشویشناک سمت (DIMENSION) کا اضافہ کر رہی ہے!

(۸) داخلی احوال و کوائف کی اِن تہہ بر تہہ تاریکیوں (" ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ " سورۂ نور آیت ۴۰) پر مستزاد ہیں بین الاقوامی سیاست، خارجی تعلقات اور خاص طور پر ارد گرد کے حالات اور اِس خطے کی علاقائی سیاست (GEO-POLITICS) کی شدید تشویشناک کیفیات جن کی بناء پر جو شدید خطرہ (CHALLENGE) پاکستان کے وجود کو اِس وقت لاحق ہے وہ اس سے قبل کبھی

نہ ہوا تھا۔ اِس لیے کہ اصلاً اپنی داخلی کمزوریوں کے باعث اور ثانیاً بھارت کی پیدائشی دشمنی کی بنا پر ہم ایک سُپر پاور کا سہارا لینے پر تو ہمیشہ ہی مجبور رہے ہیں۔ جس کے عین وقت پر دھوکہ دینے کا نہایت تلخ تجربہ ہمیں ۱۹۶۵ء اور تا ۱۹۷۱ء ہو چکا ہے، تاہم ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلے کے بعد سے اُس نے ایک بار پھر ہمیں 'محاذ پر سینہ سپر ریاست' (FRON LINE STATE) ——— کی حیثیت سے اہمیت دینی شروع کر دی تھی اور اِس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ ایک مرتبہ پھر امریکہ کے سابق سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر ڈلس کے نام سے معنون دَور (DULLES ERA) ——— کی یاد تازہ کر دی تھی۔ لیکن اب وہ صورتِ حال تبدیل ہو رہی ہے اور ایک جانب افغانستان کے مسئلے پر امریکہ اور رُوس کے مابین مفاہمت کے اندیشے نے ہمارے پاؤں تلے کی زمین کو سرکانا اور کھسکانا شروع کر دیا ہے تو دوسری جانب راجیو گاندھی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سے امریکہ نے بھارت کی خوشنودی حاصل کرنے کی جو سر توڑ کوشش شروع کی ہے اُس کی بنا پر ہمیں فی الواقع دن میں تارے نظر آنے لگے ہیں اور بھارت کے سفارتی عہدیداروں اور سیکرٹریوں کے اندازِ تخاطب میں بھی "ایاز قدرِ خود بشناس!" کا سا انداز پیدا ہو چکا ہے

الغرض! "مین پیری میں ہلال آسا کمر خم کھا گئی!" کے مصداق عین اُس وقت جبکہ خارجی حالات کے پیشِ نظر ہمیں کامل قومی یکجہتی و ہم آہنگی، بلند حوصلگی اور عالی ہمتی اور قوتِ عزیمت و مقاومت کی شدید ضرورت ہے ملک و ملّت کا داخلی منظر "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!" کا نقشہ پیش کر رہا ہے اور شدید اندیشہ ہے کہ مارشل لا کے 'خاتمے' (یا 'نیم خاتمے') پر جو سیاسی سرگرمی شروع ہوئی ہے وہ ایک دو ماہ تک گھمسان کے رَن کی صورت اختیار کرے گی اور اِس کے نتیجے میں ملک یا خانہ جنگی اور سِول وار سے دو چار ہو جائے گا یا پھر تھا مارشل لا نافذ ہو جائے گا اور یہ دونوں ہی صورتیں ملک و قوم کے مستقبل کے اعتبار سے سخت خوفناک اور صد درجہ تباہ کن ہوں گی۔ اعاذنا اللّٰہ مِنْ ذالِکَ!

پاکستان کے بقاء و استحکام کے لوازم

اِس پس منظر میں ہر صاحبِ فہم و شعور انسان لامحالہ اِسی نتیجے تک پہنچے گا کہ ملک و ملّت کے استحکام ہی نہیں بقا تک کے لیے حسبِ ذیل چیزیں ناگزیر اور لازمی ہیں:

(۱) ایک ایسا طاقتور انسانی جذبہ جو جبلہ حیوانی جبلتوں پر غالب آجائے اور قوم کے افراد میں کسی مقصد کے لیے تن من دھن لگا دینے حتیٰ کہ جان تک قربان کر دینے کا مضبوط ارادہ اور قوی داعیہ پیدا کردے!

(۲) ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ جو افرادِ قوم کو ایک ایسے مضبوط ذہنی و فکری رشتے میں منسلک کر کے بنیانِ مرصوص بنا دے جو رنگ، نسل، زبان اور زمین کے تمام رشتوں پر حاوی ہو جائے اور اس طرح قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن جائے!

(۳) عام انسانی سطح پر اخلاق کی تعمیرِ نو جو صداقت، امانت، دیانت اور ایفاءِ عہد کی اساسات کو از سرِ نو مضبوط کر دے اور قومی و ملی زندگی کو رشوت، خیانت، ملاوٹ، جھوٹ، فریب، ناانصافی، جانبداری، ناجائز اقربا پروری اور وعدہ خلافی ایسی تباہ کن برائیوں سے پاک کر دے۔

(۴) ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی (SYSTEM OF SOCIAL JUSTICE) جو مرد اور عورت، فرد اور ریاست، اور سرمایہ اور محنت کے مابین عدل و اعتدال اور قسط و انصاف، اور فی الجملہ حقوق و فرائض کا صحیح و حسین توازن پیدا کر دے!

(۵) ایک ایسی مخلص قیادت جس کے اپنے قول و فعل میں تضاد نظر نہ آئے اور جس کے خلوص و اخلاص پر عوام اعتماد کر سکیں!

تحریکِ پاکستان کے تاریخی اور واقعاتی پس منظر، اور پاکستان میں بسنے والوں کی عظیم اکثریت کی فکری و جذباتی ساخت، دونوں کے اعتبار سے یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس ملک میں یہ تمام تقاضے صرف اور صرف دین و مذہب کے ذریعے اور اسلام کے حوالے اور ناتے سے پورے کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ، جیسے کہ ہم ناقابلِ تردید دلائل اور شواہد سے ثابت کر چکے ہیں علامہ اقبال مرحوم کے حسبِ ذیل اشعار خواہ اس وقت دنیا کی کسی دوسری مسلمان قوم پر پورے طور پر صادق نہ آتے ہوں، ملتِ اسلامیہ پاکستان کے ضمن میں صد فی صد درست اور کمالِ صداقت و حقانیت کے مظہر ہیں کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں؟ — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

پاکستان کی سالمیت کے خواہشمند لوگوں کو

دعوتِ فکر

مرزا غالب کے اس شعر کے مصداق کہ ؎ "تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم۔ میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے!" ہمیں اِس مرحلے پر اُن لوگوں سے تو کچھ نہیں کہنا جو یا کسی حقیقی وواقعی یا مزعومہ و موہوم ظلم اور زیادتی کے ردِ عمل کے طور پر پاکستان کو توڑنے کے درپئے ہو گئے ہوں یا کسی سبب سے اس نتیجے پر پہنچ چکے ہوں کہ ؏ "مری تعمیر میں مضمر تھی اِک صورت خرابی کی!" کے مصداق پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا ہی غلط تھا۔ لہٰذا اِسے بالفعل یا بالقوہ معدوم کر دینا ہی مناسب ہے۔ ایسے لوگوں سے گفتگو کا صُغریٰ کبریٰ ظاہر ہے کہ مختلف ہوگا۔ سر دست اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم اُن تمام لوگوں کو جو پاکستان کی بقا اور سالمیت کے دل سے خواہشمند ہوں دعوت دیتے ہیں کہ پوری دیانت داری کے ساتھ اِمکانی حد تک غور کریں کہ آیا متذکرہ بالا پانچ اُمور پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لوازم ہیں یا نہیں ؟۔ اور آیا اُن میں سے کوئی ایک تقاضا بھی اسلام کے سوا کسی اور نظریے یا نظام کے حوالے سے پورا ہونے کا کوئی امکان ہے ؟؟

اِس ضمن میں حسبِ ذیل حقائق روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں :

(۱) تحریکِ پاکستان سے قطع نظر کہ اُس کا تو نعرہ ہی یہ تھا کہ "پاکستان کا مطلب کیا ؟ لا اِلٰہ اِلّا اللہ" پاکستان کی لگ بھگ چالیس سالہ تاریخ کے دَوران میں بھی واقعہ یہ ہے کہ جو بھی عوامی تحریک اُٹھی صرف اور صرف دین و مذہب کے حوالے سے اُٹھی! ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کی ختمِ نبوت کی تحریکیں تو اِس کی 'خالص' مثالیں ہیں ہی، ۷۱-۱۹۷۰ء کی بھٹو صاحب کی عوامی تحریک کو بھی فی الواقع 'عوامی' بننے کے لیے سوشلزم کو 'مشرف بہ اسلام' کرنا پڑا تھا اور خالص مساوات کی بجائے "مساواتِ محمدیؐ" کی اصطلاح استعمال کرنی پڑی تھی، جس کا شکوہ اب اُن کے بعض سابق رفقاءِ کار کر رہے ہیں پھر ۱۹۷۷ء کی 'پاکستان قومی اتحاد' (P.N.A) کی تحریک بھی جو ابتداءً خالص سیاسی اور جمہوری تھی 'عوامی' تب ہی بنی تھی جب اُس نے "تحریکِ نظامِ مصطفےٰؐ" کا عنوان اختیار کر لیا تھا۔

اس ضمن میں اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گزشتہ (یا حالیہ؟) مارشل لا نے اپنے ساڑھے آٹھ سالہ دور میں اس جذبے کو مضمحل کرنے اور اس تلوار کو کند کرنے یا عوامی زبان میں اس غبارے کی ہوا نکالنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے لیکن اب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ پاکستان میں کوئی منفی اور "یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ"[1] کے مصداق تخریبی تحریک تو کسی دوسری اساس پر اٹھ سکتی ہے لیکن پاکستان کی سالمیت کو بطور اصولِ موضوعہ تسلیم کرنے والی مثبت تعمیری تحریک سوائے مذہبی جذبے کے اور کسی بنیاد پر نہیں اٹھ سکتی!

(۲) یہی معاملہ 'نظریۂ جامعہ' کا ہے کہ پاکستان میں بسنے والوں کی عظیم اکثریت کو ایک بنیانِ مرصوص بنانے کی صلاحیت رکھنے والا 'نظریہ' صرف اور صرف 'ایمان' ہے اس لیے کہ ایک رشتۂ اخوتِ ایمانی ہی ہے جو رنگ' نسل' زبان اور زمین کے تمام رشتوں سے بالاتر ہو کر پاکستان کے مسلمانوں کو ایک 'قوم' ہی نہیں ایک اُمّت بلکہ ایک 'حزب' (پارٹی) بنا سکتا ہے اور پاکستان میں قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن سکتا ہے۔ یہ بات اس سلسلۂ مضامین میں تفصیل کے ساتھ عرض کی جا چکی ہے کہ یہاں کوئی نسلی یا لسانی عصبیت ایسی موجود ہی نہیں ہے جو کُل پاکستان سطح پر بروئے کار آسکے۔

یہاں یہ وضاحت بھی نامناسب نہ ہوگی کہ الحمد للہ کہ پاکستانی قوم عمل کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی تہی دامن اور کوتاہ دست کیوں نہ ہو، اسی طرح فقہ کی جزئیات میں اُن کے مابین خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو جہاں تک اساسی نظریے یعنی ایمان کا تعلق ہے اُس کے ضمن میں اختلاف بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور خصوصاً اُس کے منبع و سرچشمہ یعنی قرآن حکیم کے متن کے ضمن میں تو سرے سے کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ جس کا حوالہ اسی باب میں پہلے بھی آچکا ہے 'مسلمانوں کو "حبل اللہ" یعنی اللہ کی رسی کو تھامنے کی تاکید کرتی ہے'[2] اُس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث مبارکہ میں صراحت فرمادی ہے کہ وہ قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ؎

---

[1] سورۂ حشر آیت نمبر ۲ ترجمہ "اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھاتے ہوئے"۔

[2] وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔

ترجمہ: سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں مبتلا مت ہو۔

"از یک آئینی مسلماں زندہ است | پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است!
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست | اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست"[1]

(۳) اسی طرح مسلمانوں کے بارے میں یہ حقیقت بالکل قطعی اور حتمی ہے کہ اخلاقیات کے ضمن میں اُن کے یہاں علم وظائف الاعضاء (PHYSIOLOGY) کا "سب کچھ یا کچھ نہیں والا قانون" (ALL OR NONE ALAW) کارفرما ہے یعنی یہاں کسی قوم پرستانہ (NATIONALISTIC) یا مصلحت پرستانہ (UTILITARIAN) یا مسرت پسندانہ (HEDONISTIC) اساس پر بنیادی انسانی اخلاقیات کی تعمیر بھی بالفعل ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں اخلاق کی واحد ممکن اساس 'ایمان' ہے۔ وہ اگر بالفعل موجود ہوگا تو عام انسانی ہی نہیں اسلامی اور ایمانی اخلاقِ عالیہ بھی وجود میں آ جائیں گے بلکہ روحانیت کی بلند ترین منزلیں بھی تعمیر ہو جائیں گی اور اگر وہ موجود نہیں ہوگا یا نہایت کمزور اور ضعیف ہوگا تو کسی دوسری اساس پر بنیادی انسانی اخلاق بھی وجود میں نہ آ سکیں گے!

(۴) یہ بات البتہ تفصیل طلب ہے کہ وہ واحد نظامِ زندگی جو ایک جانب افراد کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے مناسب فضا فراہم کر سکتا ہو اور دوسری طرف فرد بمقابلہ معاشرہ و ریاست، مرد بمقابلہ عورت، اور سرمایہ بمقابلہ محنت ہر سطح پر اور جہت سے عدل و قسط پر مبنی ہو اور سب کے مابین حقوق و فرائض کے عادلانہ توازن کا ضامن بن سکتا ہو اللہ کے عطا کردہ 'دینِ حق' کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور اگرچہ اس دعویٰ کی حقانیت کے تفصیلی دلائل و شواہد اس تحریر کے دائرۂ بحث سے خارج ہیں تاہم موضوع زیرِ بحث کے اعتبار سے یہ حقیقت اہمیت کی حامل ہے کہ پاکستان کی مسلمان قوم کے طبقۂ متوسط میں، جو کسی قوم کی اصل ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، ایسے لوگوں کی تعداد بحمد اللہ بہت کثیر ہے جو دل و دماغ کے متفقہ فیصلے کے ساتھ اس کے شدت کے ساتھ قائل ہیں اور یہ چیز کسی اسلامی انقلابی جدوجہد کے آغاز کے لیے یقیناً ابتدائی سرمایہ (INITIAL CAPITAL) کی حیثیت رکھتی ہے!

---

[1] یعنی مسلمانوں کی حیاتِ ملی کا راز یہی ہے کہ وہ ایک آئین پر متفق ہیں، گویا پیکرِ ملت کے لیے روحِ حیات قرآن حکیم ہے۔ ہم تمام مسلمان تو دراصل پیکرِ خاکی کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں دھڑکنے والے دل کی حیثیت قرآن کی ہے۔ لہٰذا اے مسلمان! اسے مضبوطی سے تھام لے اس لیے کہ حبل اللہ یعنی اللہ کی مضبوط رسی وہی ہے۔ (اس ضمن میں قائداعظم مرحوم کے یہ الفاظ بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ "ہمارا آئین چودہ سو سال قبل طے ہو گیا تھا")

(۵) گویا ع "کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو!" کے مصداق ہمارے قومی و ملی وجود کے جملہ عوارض و امراض کے ازالے اور معالجے، اور پاکستان کے بقاء و استحکام کے لیے جو امور لازمی اور ناگزیر ہیں وہ سب کے سب ایک ہی سمت میں اشارہ کر رہے ہیں اور وہ ہے 'اسلامی انقلاب' کی سمت۔!
البتہ ایک قیادت کا مسئلہ ایسا ہے جو بظاہر 'ٹیڑھی کھیر' بھی نظر آتا ہے اور بلّی کی گردن میں گھنٹی باندھنے کے مترادف بھی محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اسلامی انقلاب کے لیے لامحالہ ایک ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو ایک جانب مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماءِ حق کا اعتماد حاصل کر سکے، دوسری جانب جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی مطمئن کر سکے اور تیسری جانب عوام میں بھی مقبولیت حاصل کر سکے۔! اور فی الوقت بظاہر احوال جو کچھ نظر آ رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ع "نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو۔ ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے!" کے مصداق شاید اُمّتِ مسلمہ کی کوکھ ایسے سپوتوں کے اعتبار سے بانجھ ہو گئی ہے تاہم نویدِ قرآنی "اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (ترجمہ) "جان لو کہ اللہ زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے" (سورۃ حدید: آیت ۱۷) کی رُو سے اُمید رکھنی چاہیے کہ اُمّت کی سوکھی کوکھ بھی از سرِ نو ہری ہو سکتی ہے۔ بہر حال اس ضمن میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ایسی قیادت نہ آسمان سے نازل ہو گی نہ کہیں سے 'درآمد' کی جا سکتی ہے بلکہ اس کے وجود میں آنے کی واحد صورت یہی ہے کہ اللہ کے بھروسے پر ایک اسلامی انقلابی جدوجہد کا آغاز کر دیا جائے اگر اللہ کو منظور ہوا تو اسی جدوجہد کے دوران وہ قیادت بھی اُبھر کر سامنے آ جائے گی اور اُسے عوام و خواص سب کا اعتماد بھی حاصل ہو جائے گا!

کامیابی کی اصل ضمانت

اس جدوجہد کی کامیابی کی اصل ضمانت وہ حقیقت ہے جو ہم "تصویر کا روشن رُخ" اور بالخصوص "اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور پاکستان" کے عنوان کے تحت عرض کر چکے ہیں یعنی یہ کہ پاکستان میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد ارادۂ خداوندی کے ساتھ ہم آہنگی، 'تدبیرِ الٰہی' کے ساتھ سازگاری اور بقول علامہ اقبال مرحوم "فطرت کے مقاصد کی نگہبانی" کے مترادف ہو گی۔ اس صورت میں مندرجہ ذیل حدیثِ قدسی کے مطابق اُس جدوجہد کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید لازماً حاصل ہو گی اور وہ کیفیت پیدا ہو کر رہے گی کہ

ع۔ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ!:

"میرا بندہ مجھ سے نوافل کے ذریعے قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔" (بخاری عن ابی ہریرہؓ)

تاہم اس جدوجہد میں اپنے آپ کو کھپانے کا عزم رکھنے والوں کو کامیابی کی اصل ضمانت صرف اپنے خلوص و اخلاص اور اس جدوجہد میں اپنی استقامت کو سمجھنا چاہیئے اس لیے کہ اسلامی انقلابی جدوجہد وہ واحد جدوجہد ہے جس میں شریک افراد کے لیے ناکامی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ بالفرض اجتماعی سطح پر اس تحریک کی کامیابی سردست اللہ کی حکمت میں نہ ہو تب بھی ؏ "شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن۔ نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی!" کے مصداق ان کا اصل مقصود تو شہادت علی الناس کے فریضے کی ادائیگی اور شہادت کی موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

اگلا سوال: ہماری اب تک کی کُل گزارشات کا لُبِّ لباب اور حاصل کلام صرف یہ ایک جملہ ہے کہ:

"پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے!"

اور اسی پر ہم اس کتاب کو ختم کر رہے ہیں۔

اس مرحلے پر ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کیسے آئے گا؟ اُس کے اساسی لوازم کیا ہیں؟ بنیادی طریق کار کیا ہے؟ ابتدائی مراحل کیا ہیں؟ اور تکمیلی اقدامات کیا ہونگے؟ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان امور کی بھی تفصیلی وضاحت کی ضرورت ہے کہ اسلامی انقلاب سے مراد کیا ہے؟ اور اس کے نتیجے میں جو سماجی، معاشی اور سیاسی نظام وجود میں آئیگا اس کے اہم خدوخال کیا ہوں گے؟

چنانچہ "پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا اور کیسے؟" کے موضوع پر راقم الحروف ان شاء اللہ جلد ہی اپنی دوسری تالیف کا آغاز کر دے گا۔ وما توفیقی الّا باللہ العلی العظیم!!

لاہور: ۱۷ر فروری ۸۶ء — اسرار احمد عفی عنہ

واللہ متمّ نورہٖ ولو کرہ الکافرون

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی!

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!!

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

"یعنی ویکون الدین کلہ للہ"

آیۂ اظہارِ دین

کے ضمن میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصریحات

(ماخوذ از "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء")

ترجمہ: مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی رح

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

چونکہ دینِ حق کا غلبہ تمام دینوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حاصل نہیں ہوا کیونکہ نصاریٰ و مجوس اس وقت تک اپنے طریق پر قائم تھے۔ لہٰذا اکثر مفسرین اس آیت کی تفسیر میں عاجز ہو گئے ہیں۔ ضحاک رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت ہوگی۔ حسن بن فضل رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ غلبہ سے مراد حجت و برہان کا غلبہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان سب سے زیادہ مضبوط بات بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمام دینوں پر غالب کر دیا (اس طرح) کہ جن لوگوں نے آپ کا کلام سنا ان پر واضح کر دیا کہ یہی حق ہے اور جس قدر دین اس کے خلاف ہیں باطل ہیں اور نیز آپ کو اس طرح غالب کر دیا کہ گروہ اہلِ شرک میں دو دین تھے۔ ایک دین اہلِ کتاب کا دوسرا دین امیوں کا[1] تو امیوں کو تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مغلوب کر لیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے اور اہلِ کتاب کی یہ حالت ہوئی کہ ان میں سے بعض نے ذلت کے ساتھ جزیہ دینا منظور کیا اور آپ کا حکم ان پر جاری ہو گیا۔ یہی مطلب آپ کے دین کا تمام دینوں پر غالب آجانے کا ہے۔

---

[1] عرب کے لوگ زمانۂ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تین مذہب رکھتے تھے۔ بعض مشرک تھے بعض نصرانی بعض یہودی۔ نصرانی اور یہودی اہلِ کتاب کہے جاتے ہیں اور مشرکین امی بوجہ اس کے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ جب کسی آیت کے معنی میں کچھ مشکل پیش آجائے تو وہاں دو باتوں کی ضرورت ہے اوّل یہ کہ ہم الفاظِ قرآنی کو لوگوں کے بیان کئے ہوئے معنے کے ساتھ عقل خالص کی ترازو میں (جو اوہام کی آفت سے محفوظ ہو) تولیں اگر دونوں میں موافقت ظاہر ہو تو فبہا ورنہ اس معنے کو ہم چھوڑ دیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث کو ہم اپنا پیشوا بنالیں کیونکہ آپؐ قرآن کے حقیقی اور اصلی مفسّر ہیں ۔ (اس قاعدہ کے موافق) جب ہم (لوگوں کے بیان کئے ہوئے معنے یعنی) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے غلبہ کو جو (مقام) نجران کے نصرانیوں اور ہجر کے مجوسیوں اور خیبر کے یہودیوں پر آپؐ کو حاصل ہوا اور آپ نے ان سے جزیہ اور خراج لیا (عقل خالص کی ترازو کے) ایک پلڑہ میں رکھتے ہیں اور (الفاظِ قرآنی یعنی) لیظھرہٗ علی الدین کلّہٖ کو دوسرے پلڑہ میں رکھتے ہیں تو دونوں میں باہم میں کچھ مناسبت نہیں پاتے ایک تھوڑے سے ٹکڑے پر غالب آجانا تمام دینوں پر غلبہ نہیں ہو سکتا۔ تمام دینوں پر غلبہ کے معنی تو یہ ہیں کہ تمام دینوں کی جڑ کھد جائے اور ان کے حامی درہم برہم ہو جائیں اور کوئی شخص ان دینوں کی طرف بلانے والے نہ رہے اور ان دینوں کی عزت و بزرگی بالکل زائل ہو جائے (لہٰذا ہم نے ان تمام معانی کو چھوڑ دیا) باقی رہی حدیث نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی (تو وہ حسب ذیل ہے)[1]

"مسلم نے حضرت ثوبانؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اللہ نے میرے لئے زمین کو لپیٹ دیا اور میں نے اس کی مشرق و مغرب سب دیکھ لیں اور بیشک میری امّت کی سلطنت اس حصّۂ زمین تک پہنچیگی جو میرے لئے لپیٹا گیا اور (فرمایا کہ) مجھے سرخ و سفید دونوں قسم[2] کے خزانے دیئے گئے۔"

امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا کہ آپ فرماتے تھے روئے زمین پر کوئی گھر اور کوئی خیمہ باقی نہ رہے گا جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کرے کسی سعادت مند کو عزت دے کر یا کسی بد نصیب کو ذلت دے کر عزت دینے کی صورت یہ ہے کہ اللہ ان کو اہل اسلام میں سے کردے اور ذلت

---

[1] حضرت مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر کچھ احادیث نبویہ درج فرمائی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ہم یہاں ان میں سے صرف دو احادیث نقل کر رہے ہیں (ادارہ)

[2] دونوں قسم سے مراد سرخ و سفید یعنی سونا اور چاندی۔

دینے کی صورت یہ ہے کہ وہ اسلام کے محکوم بن جائیں۔ حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ اس وقت ہر جگہ دین اللہ کا ہوگا۔ ان احادیث صحیحہ کا مقتضا یہ ہے کہ پورا غلبہ دین کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوگا لہٰذا انہی احادیث کو ہم نے پیشوا بنایا اور آیت کریمہ کو آپ کے زمانۂ حیات سے متعلق نہ رکھا۔ الفاظِ قرآنی بھی اس کو نہیں چاہتے کہ حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات ہی میں دینِ حق کو غلبۂ کامل ہو جائے چنانچہ اگر لیظہرہ کی ضمیر (منصوب متصل) ھدی اور دین حق کی طرف پھیریں تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول کا ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجنا سبب ہو جائے گا اس ہدایت اور دینِ حق کے تمام دینوں پر غالب ہونے کا۔ اس صورت میں کچھ ضروری نہیں کہ وہ غلبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہو جائے آپؐ کا مبعوث ہو جانا غلبہ کا سبب ہو گیا گو تتمہ اس غلبہ کا آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبوں کے ہاتھ پر ہوا اور اگر یہ ضمیر رسول کی طرف پھیری جائے تب بھی کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ دینِ حق کا غلبہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبوں کے ہاتھ سے ہوا بلاشبہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا غالب ہونا ہے۔

اگر تم سن سکتے ہو تو ایک باریک نکتہ سنو!

خدا تعالیٰ جب کسی پیغمبر کو اصلاحِ عالم کے لئے اور بنی آدم کو نیکیوں سے نزدیک کرنے اور بدیوں سے دور کرنے کے لئے مبعوث فرماتا ہے اور غیب الغیب میں کوئی خاص صورت اس اصلاح کی مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اصلاح اسی صورت میں ظاہر ہو تو لامحالہ وہ صورت خاص اس پیغمبر کی بعثت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر جب حکمتِ الٰہی اس پیغمبر کو عالم ادنیٰ سے رفیقِ اعلیٰ کی طرف قبل اس صورت کی تکمیل کے لیجانا چاہتی ہے تو لامحالہ وہ پیغمبر ان مقاصد کے پورا کرنے کے لئے جو اس کی بعثت میں مندرج ہیں اپنی امت میں سے کسی شخص کو اپنا آلہ بناتا ہے اور اس کو تربیت کرتا ہے تاکہ اس کا دل الہام خداوندی کے نزول کے قابل ہو جائے اور پھر اس شخص کو ان مقاصد کی وصیت کر دیتا ہے اور ان کی ترغیب دیتا ہے اور ان مقاصد کے پورے ہونے کی دعا مانگتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص بدنی قوت نہ رکھتا ہو کہ حج کا ارادہ کر سکے مگر مالی طاقت رکھتا ہو تو اس پر ضروری ہے کہ فریضۂ حج کے پورا کرنے کے لئے دوسرے سے حج کرائے اور اس کے نامۂ اعمال میں دوسرے کا حج لکھا جائے اور یہ شخص بوجہ سبب ہونے کے حکم الٰہی کا مطیع ہو اور ثواب حج کا پورا حصہ حاصل کرے۔ اس قسم کا خلیفہ بنانا ہر دین میں ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں

کو اپنا خلیفہ بنایا تھا (حضرت عیسٰی علیہ السلام کے خلیفہ بنانے کا ایک عجیب طریقہ تھا) انجیل میں مذکور ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے ایک روٹی اپنے ہاتھ میں لی اور فرمایا کہ یہ عیسٰی کا گوشت پوست ہے پھر وہ روٹی آپ نے حواریوں میں تقسیم کر دی۔ جب انہوں نے اس روٹی کو کھا لیا تو حضرت عیسٰی علیہ السلام مناجات کرنے لگے اور فرمایا کہ (یا اللہ) جس طرح انہوں نے یہ روٹی کھالی اور وہ ان کے بدن میں حلول کر گئی اسی طرح عیسٰی ان کے بدن میں حلول کر جائے۔ اے خداوند! جو نظرِ رحمت تو میری طرف رکھتا ہے وہی ان پر مبذول فرما تاکہ یہ لوگ تیرے بندوں کو تیری طرف بلائیں۔ اسی قاعدہ کے موافق جب عالم میں جناب الوہیت کے متعلق برے اعتقاد پھیل گئے اور عقیدہ[1] ارجا کا رواج ہوگیا یعنی اعمال کو ساقط از درجۂ اعتبار سمجھنا اور (برے) کاموں کے (بد) انجام سے خوف نہ کرنا جو تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کے خلاف ہے تو غضب الٰہی جوش میں آیا۔ اور ارادۂ انتقام (عالم) ملکوت میں پیدا ہوا۔ پھر ان لوگوں کے ہلاک و برباد کرنے کا ایک وقت مقرر ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ (ترجمہ[2]) ہر گروہ کے لئے ایک وقت ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو ایک ساعت کے لئے بھی وہ گروہ نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے نہ آگے! چنانچہ جب وہ وقت آگیا تو حق تعالیٰ نے افضل افرادِ بشر یعنی ذاتِ مقدس ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور اپنی وحی آپ پر نازل فرمائی اور آنجناب نے اپنی انتہائی کوشش کے ساتھ اس ہدایت اور دین حق کی طرف لوگوں کو بلایا۔ قابلیت رکھنے والے سعادت اندوز ہوئے اور بدبخت لوگ ملعون ابدی بن گئے۔ اسی بعثت کے ضمن میں وہ ارادۂ انتقام ان لوگوں میں سے جو جناب الوہیت کے متعلق برے اعتقادات رکھتے تھے قائم کیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم (باوجود سراپا رحمت ہونے کے) اس انتقام میں بمنزلۂ جارحہ (الٰہی) کے ہو گئے جس طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام (باوجود سراپا رحمت ہونے کے) صیحۂ[3] ثمود کے وقت

---

[1] مشرکین کا حال تو ظاہر ہے کہ وہ جزا و سزا ہی کے قائل نہ تھے اعمال کا کیا اعتبار کرتے! رہ گئے یہود و نصاریٰ ان کا یہ خیال تھا کہ ہم برے اعمال کریں گے تب بھی جنت ہماری ہے کیونکہ ہم خدا کے دوست ہیں۔

[2] سورۂ الاعراف آیت ۳۴

[3] صیحہ بلند آواز کو کہتے ہیں قوم ثمود اسی آواز سے ہلاک کی گئی تھی۔ ثمود وہی قوم ہے جس کی طرف حضرت صالح علیہ السلام پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے جب قوم نے اونٹنی کے پیر کاٹے جو معجزہ سے پیدا ہوئی تھی تو یہ عذاب نازل ہوا۔

(جارحۂ الٰہی بنے تھے) اسی وجہ سے جو لڑائیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے واقع ہوئیں.
وہ ان لڑائیوں میں شریک ہونے والوں کے لئے موجب نزولِ برکاتِ عظیمہ بنے اور ان لڑائیوں
میں ایک ساعت کی شرکت صدسالہ عبادت کے برابر تہذیب باطن میں کارگر ہوئی اسی وجہ سے
ہماری شریعت میں جہاد کا ثواب تمام عبادات کے ثواب سے بالاتر ہے اور اہل بدر و اہلِ
احد و اہلِ حدیبیہ کی فضیلت مانی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ (اس آخری زمانہ میں) اصلاحِ عالم کی اور دشمنانِ خدا سے انتقام
لینے کی ایک خاص صورت مقرر ہوگئی تھی اور وہ صورت یہ نہ تھی کہ وہ (مثل قومِ قارون کے) زمین
میں دھنسا دیئے جائیں یا (مثل قوم ہود وغیرہ کے) ان پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں یا (مثل قومِ
ثمود کے) صیحہ سے ہلاک کئے جائیں۔ اس خاص صورت کی تعیین کسی ایسی حکمت کے سبب سے
ہوئی جس کو سوا اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور وہ خاص صورت یہ تھی کہ ادیانِ (باطلہ) کے حامیوں
اور دعوت دینے والوں کو بذریعہ قتل و گرفتاری و تاراج و بندش و خراج و جزیہ سرنگوں کرکے
اور ان کی دولت و شوکت کو پامال اور بے حقیقت کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے
اصحاب علیہم الرضوان کے دین کو غلبہ دیا جائے اور یہ صورتِ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
بعثت کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور آنجناب صلعم کی بعثت اس خاص صورت پر متضمن تھی۔ یہی مطلب
اس آیت کا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ اس لئے بھیجا تاکہ اس دین
کو تمام دینوں پر غالب کردے۔

اور چونکہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان روحانی نعمتوں کو جو بغیر رفیقِ
اعلیٰ سے ملے ہوئے حاصل نہیں ہوسکتیں پسند فرمایا اس لئے ضروری ہوا کہ دینِ حق کے غلبہ کو
کامل کرنے اور دشمنانِ خدا کی سرنگونی کو پورا کرنے کے واسطے آپ کسی کو خلیفہ بنائیں تاکہ یہ سب
باتیں آپ کے صحیفۂ اعمال میں درج ہوجائیں اور وہ ارادۂ انتقام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی بعثت کے ضمن میں لپٹا ہوا تھا اپنا کام پورا کرے اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی خاص اور مقرب
ملازم کسی بادشاہ کا (ترقی پاکر) صحبت کی مجالس اور مقدس محافل میں بادشاہ کا ہم نشین ہوجائے
اور بعض قلعوں کا فتح کرنا جن کے لئے بادشاہ نے بہت کچھ تاکید کی ہے۔ اپنے کسی اچھے کارگزار
کے متعلق کردے اور جب وہ قلعہ (اس کارگزار کے ہاتھ پر) فتح ہوجائیں تو اس ملازم کی
عزت بڑھ جائے اور خلعتیں اور بخشش اس کو ملیں جب یہ سب باتیں بیان ہوچکیں تو اب سمجھ

لینا چاہیئے کہ صحیح مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ جس قدر غلبہ دین حق کو حاصل ہو وہ سب لیظہرہٗ میں داخل ہے اور اس غلبہ کے تمام اقسام میں اعلیٰ درجہ کی قسم یعنی دولت کسریٰ و قیصر کا درہم برہم کرنا بدرجۂ اولیٰ داخل ہوگا۔ اور اس قسم اعلیٰ کے حاصل کرنیوالے خلفاء رضی اللہ عنہم تھے۔ انہی بزرگواروں کی کوششیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے سے (حق تعالیٰ کو) مقصود تھیں اور ان کی کوششیں آپ کی بعثت کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں اور یہ بزرگوار تدبیر غیبی کے لئے اس کے ظہور کے آلات تھے ؎ خلافتِ خاصہ کے یہی معنی ہیں ؎ ::

ؔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء تالیف فخر الہند حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ مع ترجمہ کشف الغطاء عن التشبۃ البیضاء از حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد عبد الشکور لکھنوی فاروقی مجددی قدس سرہٗ مطبوعہ کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی از ص۱۹۲ تا ص۱۶۵ (تلخیص)

بقیہ : تذکرہ و تبصرہ

اس کے بعد مجھ سے کچھ کہنے کی فرمائش کی گئی تو میں نے وہی باتیں جو اوپر درج کر آیا ہوں قدرے وضاحت سے بیان کر دیں ــــــ

میرے بعد مرحوم مولانا محمد شفیع اوکاڑوی ثم کراچوی کے صاحبزادے مولانا کوکب نورانی نے تصوف کی اہمیت پر ایک مؤثر تقریر کی۔

آخر میں خواجہ صاحب نے دعا فرمائی اور اس پر مجلس ختم ہوگئی!

اس کے بعد ہم لوگوں نے کھانا کھایا ــــ اور آخر میں خواجہ صاحب سے چند منٹ کی گفتگو علیحدگی میں ہوئی جس میں میں نے عرض کیا کہ میں تو آپ سے تفصیلی گفتگو کے لئے حاضر ہوا تھا لیکن آپ نے سارا وقت تکلفات اور تقریبات میں صرف کرا دیا ــــ اب ان شاء اللہ پھر کبھی موقع ہوا تو گفتگو ہوگی۔

اس کے بعد ہم نے رخصت چاہی ــــ اور خواجہ صاحب نے مع جمیع حاضرین ہمیں از راہ کرم بڑے دروازے تک آکر اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت فرمایا۔

اس کے سوا نہ وہاں کوئی محفل میلاد منعقد ہوئی ــــ! نہ میں یا میرا کوئی ساتھی 'داخلِ سلسلہ' ہوا ــــ!!

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بیش از بیش ہدایت اور استقامت عطا فرمائے۔

شہد کا ہر قطرہ
صحت و توانائی کا سرچشمہ
HONEY
لاتعداد شاداب پھولوں کے
جوہر سے شہد کا قطرہ قطرہ حاصل کرنا
نظامِ قدرت کا کمال ہے۔
ہمدرد خالص شہد انسان کے لیے
آبِ حیات ہے۔
یہ صحت قائم رکھتا ہے، طاقت بحال کرتا ہے
اور توانائی میں اضافہ کرتا ہے۔
قدرت کا صحت و شفا بخش عطیہ
ہمدرد شہد
قدرتی گلوکوز
ٹیوب میں دستیاب ہے
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
HMD/HNY-1/85 ADARTS

حضرت شیخ الہند کی عظمت کے عناصرِ ترکیبی پر

ایک معروضی نظر!

گذشتہ دنوں جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام دہلی میں منعقد شیخ الہند سیمینار میں پیش ہونے والا ایک مقالہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

تاریخ عالم میں بہت سی ایسی شخصیتیں گزری ہیں جنہیں بڑا کہا جاتا ہے۔ یہ شخصیتیں علم و عمل کے مختلف میدانوں میں اپنے خصائص و خدمات کی بنا پر بڑی کہلاتی ہیں۔ ملت اسلامیہ پاک و ہند کی تاریخ بھی بڑے بڑے علمائے دین، صوفیاء کرام، مشائخ عظام اور ادیبوں، مصنفوں، مدبروں، مفکروں اور قومی خدمت گزاروں کے ذکر سے خالی نہیں۔ ان کے نام ہماری زبان پر اور ان کے تراجم و تذکار زیر تحریر و مطالعہ آتے ہیں تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

یہ صورت تو اس وقت ہوتی ہے جب ہمارے ہاتھ میں ایک حقیقت پسند اور مؤرخ کا قلم ہوتا ہے اور ہمارا ذہن تعصب سے اور زبان مبالغہ سے قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں۔ مجرد و منفرد عظمتوں کا بھی ذکر جب نیاز مند زبان پر آتا ہے تو قلب عقیدت سے جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ اگر درد مندی پہلو میں ہو اور ارادت سے قلم کا سر جھک جائے تو ممدوح کے محاسن کی ایک ایک خوبی کو سو سو انداز سے بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ اس عہد کی ایک عظیم اور نادرِ روزگار شخصیت اور مذہب و سیاست میں سلطانِ وقت و سکندرِ اعظم تھے تو یہ ایک روا دار قلم کی تحریر اور عقیدت مند قلب کا فیصلہ نہیں ہوتا، یہ بات تحریر کرتے ہوئے ان کی کوئی مجرّد خوبی ذہن میں آتی ہے۔ اگر کسی مجرّد خوبی ہی کی بنا پر کوئی شخص عظمت کے تاج کا مستحق قرار پائے تو یقین کرنا چاہیئے کہ تاریخ ملت اسلامیہ پاک و ہند میں ایسے بے شمار علماء کے نام ملتے ہیں جن کے علمی و تصنیفی کارنامے بے حد و حساب ہیں، ایسے صوفیاء و مشائخ ہیں جن

کے مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے، شعلہ بیان و آتش نوا خطیبوں کی بھی تاریخ میں کمی نہیں فلسفہ و کلام کے ایسے ماہر ہیں جن کی نکتہ آفرینیوں کا کوئی جواب نہیں، ایسے حکما و عقلا ہیں جن کی حکمت و دانائی نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے، بے مثال شاعر، لاجواب ادیب اور ایسے صاحب طرز انشا پرداز ہیں جن کے کلام و انشا کی دل ربائیوں نے لاکھوں قارئین ادب کے الگ الگ حلقے اور مستقل مکاتب فکر و فن پیدا کر دیئے ہیں، کتنے ہی مدبر اور مفکر ہیں جن کے افکار نے زندگی کی تعمیر میں حصہ لیا ہے، مختلف علوم و فنون کی تاریخ میں ان کے نام عزت و احترام سے جگہ پانے کے مستحق ہیں، لیکن علم و فکر اور فلسفہ و عمل کے تمام اعتراف کے باوجود یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ "شیخ الہند" ان میں کوئی نہیں۔

اگر ہم انسانی عظمت کے بجائے علم و عمل کی کسی ایک خوبی اور فکر و سیرت کے کسی خاص حسن کے شیدائی ہوتے تو ہمارا مرجع اور مرکز عقیدت کوئی اور شخصیت بھی ہو سکتی تھی اور تعجب نہ ہوتا کہ ہم حضرت ہی کے حلقے کے کسی صاحب علم و فن کو اپنی نیازمندی کے اظہار کے لیے منتخب کر لیتے کہ اس حلقے میں بے مثال ادیب و خطیب، محدث و مفسر، شیخ و صوفی، مدرس و معلم اور صحافی و مبلغ سے لے کر حکیم الامت تک موجود تھے۔ یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں ان خصائص و محاسن کا منکر ہوں لیکن مجھے ایک جامع الصفات عظیم انسان کی تلاش ہے۔ کسی ایسی عمارت کی ضرورت نہیں جو اپنی تاریخ رکھتی ہو لیکن فیضانِ الٰہی کی بخششوں سے مالامال نہ ہو اور اپنے حسنِ تعمیر میں آگرے کے تاج اور نظارۂ جمال میں لاہور کے شالامار کی طرح کسی آمر کے حکم اور کسی سرمایہ دار کی دولت کی رہین منت ہو۔ میں کسی ایسی عورت کے حسن کا متلاشی نہیں جسے قیمتی پتھروں کے استعمال سے رنگین و سنگین بنایا گیا ہو۔ میں ایک ایسی انسانی سیرت کا جویا ہوں جسے فکر و عمل کے حسن و توازن اور جامعیت نے عظیم بنایا ہو۔ جس کا تعلق اسی عہد سے ہو اور جس کا نام ہماری سماعت اور فہم کے لئے مانوس ہو۔ جس کا فکر بلند، قلب فراخ اور نظر وسیع ہو، جو اپنے مذہبی عقائد میں محکم اور سیرت اسلامی میں پختہ ہو، جو مسلمانوں کے لئے ایک آبرو مندانہ زندگی کا خواہاں ہو۔ لیکن جس کی نظر میں تمام خلق انسانی خدا کا گھرانہ ہو اور وہ اس پورے گھرانے کی فلاح و بہبود کے لئے فکر مند ہو۔ جس کی ملت پروری کا یہ عالم ہو کہ بلقان کی جنگ اور سمرنا، تھریس اور طرابلس کے میدانوں میں کسی مسلمان کے پیر میں کانٹا چبھے تو وہ دیوبند کی مسندِ رشد و ہدایت پر اور مجلس درس و تدریس میں تڑپ اٹھے لیکن اس کی انسانی ہمدردی و غم گساری کا یہ عالم ہو کہ اپنے غلام ملک میں ایک ایک برادرِ وطن کی آزادی کے لئے اپنی زندگی کی راحتوں کو قربان کر دے، جس نے میدانِ جنگ میں خدا اور اس کی بخشی ہوئی آزادی کے دشمنوں سے نفرت کرنا سیکھا ہو۔ لیکن جو مخلوق خدا سے محبت کرنے اور

انہیں ان کی چھینی ہوئی آزادی دلانے کے لئے پیدا ہوا ہو۔ مجھے ایک ایسے وجود گرامی کی تلاش ہے جس کا تعلق خواہ سہارنپور کے کسی قریے سے ہو لیکن وہ پورے ملک کا افتخار ہو، اس کے نام کے ساتھ خواہ دیوبندی لکھا جاتا ہو لیکن اس کی سیرت تمام مکاتب فکر کے لئے محمود ہو، اس کا تعلق اگرچہ برصغیر پاک و ہند سے ہو لیکن اس کا قلب پورے ایشیا میں استعمار کے استحصال پر خون کے آنسو روتا ہو اور اگرچہ وہ خود ایشیائی ہو لیکن اس کی نظر میں تمام روئے زمین پر بسنے والے انسان آزادی وامن میں برابر ہوں اور دنیا کا ہر مظلوم خواہ اس کا تعلق کسی ملک اور کسی قوم و طبقہ سے ہو، وہ یکساں ہمدردی و حمایت کا مستحق ہو۔

دنیا میں بہت سے خصائص و فضائل کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس میں طاقت و قوت، مال و دولت، حسن و جمال، حکومت و اقتدار بھی شامل ہیں۔ پس اگر کوئی شخص انہیں چیزوں کا پرستار ہے تو اسے کون روک سکتا ہے، وہ اپنے معبود کے حضور اپنی جبین عجز و نیاز جھکا دے۔ دنیا کی تاریخ عبودیت و نیاز کے حسین مناظر اور حیرت زا نظارہ ہائے جمال سے بھری پڑی ہے۔ آپ کے گردوپیش کی دنیا میں نہ طاقت و قوت کے معبودانِ باطل کی کمی ہے جو انا ربکم الاعلیٰ کے نعرہ زن ہیں، نہ مال و دولت کے ایسے حسین مناظر کی جن کی دلفریبیوں نے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور نہ حکومت و اقتدار کے ایسے ساحروں کی جو درحقیقت خود مسحور ہیں لیکن ان کے اقتدار کی بجلیوں کی چمک اور حکم و صدائے انا و لا غیری کی کڑک نے عقلوں کو ماؤف اور ذہنوں کو مسحور کر رکھا ہے۔ ان کے علاوہ دنیا میں مٹ جانے والی قوت و طاقت، متزلزل ہو جانے والے اقتدار اور فانی حسن و جمال کے آگے جھکے ہوئے سروں کی بھی کمی نہیں۔ خدا کی پھیلی ہوئی زمین پر کسی بھی ملک میں انسانی شرف کی پامالی کا یہ اندوہ ناک نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن آپ مجھے کسی ایسی شخصیت کا پتہ اور ایسی عظمت کا نشان بتائیں جو خصائص سیرت و فضائل علمی کی جامع ہو، جس کے افکار کی روشنی نے غلامی کی ذلت و نکبت سے آزادی کی عزت اور آبرومندانہ زندگی کی طرف رہنمائی کی ہو، جس کے پاس حکومت کا اقتدار نہ ہو لیکن وہ دلوں پر حکمران ہو۔ اس کے پاس مال و دولت نہ ہو لیکن اس کے سرمایۂ ذوقِ عمل سے ایک دنیا اس کی گرویدہ ہو گئی ہو۔ وہ حسن و جمالِ ظاہری کا مالک نہ ہو لیکن وقت کے تمام سلاطینِ عشق اور شیفتگانِ حریت اس کی زلف کے اسیر ہوں اور اس کے ایک ادنیٰ اشارہ و ایماء پر وطن میں اپنی زندگی کی راحتوں کو تج کر غربت او رجلاوطنی کی زندگی کی صعوبتوں کو اپنے لئے سرمایۂ راحتِ جاں سمجھ کر اپنے سینے سے لگا لیں اور اس

کے عشق میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں کے لئے زنجیر کی کڑیاں ڈھالنے کا کام انجام دیں، وہ اپنی صلیب خود اپنے کندھے پر اٹھالیں اور آزاد زندگی کی سیر و گردش کی جگہ اسارت کے حبس اور زنداں کے سیہ خانہ و قید کو قبول کرلیں، جس نے زبان سے کبھی حکم نہ چلایا ہو لیکن دنیا نے اس کے نطق و بیان کے موتی چن لینے کے لئے اپنے دامن پھیلا دیئے ہوں، جس نے دنیا کو اپنی پرستش کے لئے نہ پکارا ہو کہ اس کے عقیدے میں یہ کفر تھا کہ انسانی شرف کو پامال کیا جائے لیکن دنیا نے عقیدت دنیا کا سر اس کے سامنے جھکا دیا ہو۔

حضرات! میرا ذوق ایک ایسی سیرت کے پاک باز حامل کے نظارۂ جمال ہی سے تسکین پا سکتا ہے۔ جو اپنی زندگی کے تمام اعمال، روز و شب کے معمولات، اپنی شکل و صورت اور وضع قطع میں ایک مذہبی زندگی اور شخصیت کی مثال ہو لیکن وہ ملکی زندگی کے تقاضوں کو بھی سمجھتا ہو اور قومی فرائض کی بجا آوری میں وہ کسی قوم پرست سے پیچھے نہ ہو اور ایک مذہبی عالم ہونے کے ساتھ ساتھ کر دہی اسلامی زندگی میں رہنمائی کا سب سے زیادہ مستحق ہو سکتا ہے، وقت کی سیاست اور اس کی رفتار کار کا اندازہ شناس بھی ہو۔ مذہب و سیاست کے بام ۔ نماں پر جس کی گرفت سخت ہو اور دونوں کو باہم آمیز کرکے ان کے دائرہ و حدود کی نزاکت پر نظر رکھ سکے اور شریعت کے خصائص کو عشق کے مطالبوں اور تقاضوں سے پامال نہ ہونے دے اور جس کی سیرت کی یہ خوبی ہو کہ سیاست کے دریا میں اپنی کشتی کی تختہ بندی کرلے اور دریا کے چھینٹوں سے اپنی زندگی کے دامن کو تر بھی نہ ہونے دے۔

حضرات! اس تمہید لطیف کو کہاں تک طویل اور اس حکایت لذیذ کو کب تک دراز کیا جائے میرے لئے اس حکایت میں خواہ کتنی ہی دل فریبی کا سرو سامان ہو لیکن یہ بات کسی طرح مناسب نہیں کہ آپ کی طلب کو اپنے ذوق بیان و داستان سرائی کا پابند کردوں۔ میں صاف الفاظ میں اپنے اس عقیدے کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ان تمام فضائل و محامد علم و عمل اور خصائص و محاسن فکر و سیرت اور ایثار وقت و جان اور جہاد ملی و قومی کی جامع کوئی شخصیت اگر ہے تو وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی ہے۔

حضرت کی زندگی پر نظر ڈالنے اور آپ کے افکار و خدمات کے بیان و تجزیہ کے کئی انداز ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک انداز یہ ہوگا —— اور عام طور پر اہل قلم اور اصحاب نظر اسی کو اختیار فرمائیں گے کہ علم و عمل کے مختلف میدانوں میں آپ کے افکار و خدمات کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن ان معنوں میں آپ کی ذات گرامی ایک ذات تھی کہاں ؟ آپ کا وجود مقدس و گرامی مرتبت علم و ادب، فکر و نظر، مذہب

وسیاست، ایثار وعمل، اخلاق وسیرت اور مذہبی علوم فنون کے مختلف دبستانوں کا ایک دبستان اور سینکڑوں انجمنوں کی ایک انجمن تھا۔ آپ کے وجود مقدس سے فیضان الٰہی کے سینکڑوں چشمے پھوٹے تھے۔ آپ کی ذاتِ گرامی کا ایک خاص دور ہیں ایک محور ضرور تھا۔ لیکن اپنے دور میں آپ خود ایک نظام رشد و ہدایت اور مذہب سیاست کے مرکز و محور تھے۔ آپ کی خدمات کا جائزہ اس طرح بھی لیا جاسکتا ہے کہ آپ کی دعوت جو تعمیر نو سے لے کر انقلاب تک، مسندِ درس و تعلیم اور ذوقِ عمل کی تربیت سے لے کر میدانِ جہاد و عمل تک، تالیف و تدوین افکار سے لے کر جہاد لسانی کے ملّی و قومی میدانوں تک، مسلمانوں کی عام اجتماعی زندگی سے لے کر بین الملّی سطح تک اور مسلمانوں سے لے کر برادران وطن تک، ملکی حالات سے لے کر بین الاقوامی مسائل تک اور اسلامی دینی دائرے سے لے کر قومی سیاست کے تمام گوشوں تک پھیلی ہوئی ہے اس پر بھی من حیث القوم نظر ڈالی جائے۔ دینی و ملّی، ملکی و قومی اور بین الاقوامی سیاست میں دارالعلوم کی مسندِ درس و تدریس، اصحابِ عمل اور مردانِ کار کی تعلیم و تربیت، جمعیۃ الانصار اور نظارۃ المعارف القرآنیہ کا قیام ترکی کے لئے ایثارِ وقت و مال، مولانا عبید اللہ سندھی کا سفر کابل، خود حضرت کا سفر حجاز و اسارتِ مالٹا، ریشمی رومال کی تحریک، خلافت کی تحریک اور ترکِ موالات، ہندو مسلم اتحاد، دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علیگڑھ کا ربط و اتصال، حضرت کی دعوت و رہنمائی کے خاص عنوانات ہیں۔

حضرات! فرصت کے ان چند لمحوں میں ان تمام دائروں میں حضرت علیہ الرحمہ کی رہنمائی اور سیرت و افکار کے خصائص کا ذکر اجمال سے بھی ممکن نہیں۔ اب اس صحبت کو ختم کرتا ہوں اور صرف اتنا عرض کروں گا کہ:

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے خانوادہ ولی اللّٰہی میں شاہ اسمٰعیل شہید کو خود شاہ صاحب سے بھی اونچا مقام عطا کیا تھا اور یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگر ان کے عہد میں شاہ صاحب بھی ہوتے تو انہی کے جھنڈے کے نیچے ہوتے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ پورے علمی خانوادہ قاسمی میں جو برصغیر کی تاریخ میں ڈیڑھ سو سال پر پھیلا ہوا ہے حضرت شیخ الہند کا وہی مقام ہے جو اس تحریک کے دورِ ثانی میں شاہ اسمٰعیل شہید کا تھا۔ حضرت شیخ الہند نے اپنی زندگی میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ اگر اس دور میں حضرت قاسم العلوم نانوتوی علیہ الرحمہ ہوتے تو وہ بھی اسی سلطانِ وقت و سکندرِ عزم کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا یہ عہد سعادت اور دورِ علوم و افکار اسی ذاتِ گرامی اور فضیلت مآب کا عہد ہے جسے تاریخ اسلامیانِ پاک و بھارت میں محمود حسن کے نام، دیوبندی کی نسبت اور شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرات! اس صحبت و فرصت کے لمحات اختتام کو پہنچے۔ رخصت چاہتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین، والسلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ!

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا
ممتاز ادارہ
ایچ نظام دین
اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت

کے ضمن میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے پر ادارہ 'تکبیر' کراچی کا محاکمہ اور ڈاکٹر صاحب کی وضاحت

۱۔ ہفت روزہ تکبیر، کراچی بابت ۲۱ تا ۲۷ فروری ۸۶ء کے ادارتی نوٹ کا عکس

طریقۂ بیعت، ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مودودیؒ

بانیٔ جماعتِ اسلامی کا اصل موقف ان کے مکاتیب کی روشنی میں

تکبیر کے گزشتہ شمارے میں تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا تھا، جس میں ڈاکٹر صاحب نے بیعت سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ مولانا مودودی بھی نظام بیعت کے حامی تھے اور اس معاملہ میں ان کی فکر بالکل وہی تھی جو آج میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تشکیل جماعت سے ۴ ماہ قبل مولانا کی جانب سے حیدرآباد دکن کے محمد یونس صاحب کے نام مارچ ۱۹۴۱ء میں لکھے جانے والے ایک خط کا حوالہ دیا تھا۔ اس خط کے مکمل متن کا جائزہ لیا گیا تو ریکارڈ پر تشکیل جماعت سے ٹھیک ۱۰ ماہ بعد ۲۷ جون ۱۹۴۲ء کو انہی محمد یونس صاحب کے نام مسئلہ بیعت ہی پر مولانا محترم کا ایک دوسرا خط بھی موجود پایا گیا جس میں انہوں نے اپنا نقطۂ نظر پوری وضاحت اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب شخصی بیعت کے داعی ہیں جبکہ مولانا مودودیؒ کا موقف یہ ہے کہ "بیعت کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو بلکہ اسلام کی طرف منسوب ہو تاکہ شخص خاص سے وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ جائے۔" ان کے نزدیک "اطاعت نظم کی ہونی چاہیے نہ کہ کسی شخص خاص کی۔"

ہم قارئین کی رہنمائی اور دلچسپی کے لئے مولانا مودودیؒ کے ان دونوں خطوط کا متن شائع کر رہے ہیں تاکہ بیعت کے مسئلہ پر مولانا مودودیؒ کے نقطۂ نظر سے پوری طرح باخبر ہو سکیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور مولانا مودودیؒ کے موقف کا فرق اتنا واضح ہے کہ اس سلسلہ میں کسی غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ہے

۲- مولانا مودودی مرحوم کے خطوط (غیر متعلق حصے حذف کر دیئے گئے ہیں)

لاہور

مارچ ۱۹۳۱ء

محترمی و مکرمی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاحاً بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

۱- وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص مقصد کے لئے ہوتی ہو۔ جیسے بیعت رضوان تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ سن کر حضورؐ نے اہل مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہ کرامؓ سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ علیحدہ اس مہم میں آپ کے ساتھ جان فروشی کریں گے۔

۲- دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیت سے ایک مرشد و معلم سے اس شخص سے لیا ہے جو ان کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت تھی جو بالعموم اس شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبی کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبی کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقۂ نبوی کا صحیح علم بھی رکھتا ہو، اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً کوئی دوسری نیت نہ رکھتا ہو۔

۳- تیسری بیعت وہ ہے جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطیع ہے، اس وقت تک جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ "من مات و ليس في عنقه بيعة" اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے وہ یہی تیسری بیعت ہے کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہو جانے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار آپ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

صوفیائے کرام میں جو بیعت رائج رہی ہے وہ دوسری قسم کی ہے اور وہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص دین کا علم حاصل کرے اور احکام کو سمجھ کر ان کی پیروی کرنے کی کوشش کرے بغیر اس کے کہ کسی روحانی مربی کی بیعت اس کی گردن میں ہو، تو وہ نہ کوئی گناہ کرتا ہے نہ آخرت میں اس سے کوئی باز پرس اس امر کی ہوگی کہ اس نے کسی پیر کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑا۔ البتہ اگر کوئی دیندار، متبع شریعت، صاحبِ اخلاقِ فاضلہ شخص اس کو مل جائے جس کی زندگی کو دیکھ کر اسے یقین ہو جائے کہ فی الواقع وہ جانشینِ پیغمبر ہونے کا شرف رکھتا ہے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لینا فائدہ سے خالی نہیں ہے بشرطیکہ بیعت کرنے والا خود بھی دین کا علم رکھتا ہو اور اپنے شیخ کا اندھا مقلد نہ ہو اور شیخ سے بشریت کی کمزوری کی بناء پر اگر شریعت کے خلاف کچھ باتیں سرزد ہو جائیں تو مرید عقیدت مندی میں ان غلط باتوں میں بھی شیخ کی پیروی کرتا نہ چلا جائے۔ رہی موجودہ زمانہ کی پیری مریدی جس میں اصلاح و ارشاد کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا بلکہ بندگوں کی گدیوں پر بیٹھ کر ان کے نالائق، بے علم، بد اعمال جانشین اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ بناتے ہیں اور لوگوں کو اس دھوکہ میں ڈالتے ہیں کہ بس ہمارا ہاتھ پکڑ لینے کے بعد تمہارے لئے جنت واجب ہو جائے گی اور مرید اسے اس طرح ذریعہ وصول کرتے ہیں کہ گویا کہ وہ زمیندار ہیں اور اپنی اسامیوں سے لگان وصول کر رہے ہیں تو ایسی پیری مریدی کا واجب ہونا تو درکنار یہ جائز بھی نہیں ہے۔ یہ تو ایک معصیت

ہے۔ بلکہ میرے نزدیک اس کا شمار کبائر میں ہے۔ میں ان پیروں کو بدترین مجرم اور ان کے مریدوں کو سخت گمراہ سمجھتا ہوں۔ اگر میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی تو میں بجبر اس گمراہی کو روک دیتا۔

اعتقاد اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ غیر منفک تعلق رکھتی ہیں۔ اعتقاد نام ہے اس رائے یا خیال کا جس پر آدمی پختگی کے ساتھ قائم ہو۔ اور اس رائے یا خیال کے مطابق کام کرنے کا نام عمل ہے۔ ان دونوں کو ایک نہیں کہا جاسکتا، لیکن یہ دونوں مل کر ایک زندگی بناتے ہیں اور صحیح اعتقاد اور عمل میں مطابقت کا نام ہی اسلامی زندگی ہے۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

لاہور

۲۸ جون ۱۹۴۶ء

محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عنایت نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ کی غلط فہمی کسی حد تک رفع ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ ایک چیز تو طریقۂ بیعت و ارشاد کی روح ہے اور دوسری چیز وہ خالص ہیئت و شکل ہے جس میں یہ طریقہ صدیوں سے متوارث چلا آرہا ہے۔ جہاں تک اس کی اصلی روح کا تعلق ہے وہ بالکل برحق صحیح اور پاک ہے مگر جہاں تک اس کی ہیئت و شکل کا تعلق ہے وہ گمراہ کرنے والے پیروں اور جاہل مریدوں کے غلط طرز عمل کی وجہ سے اس قدر انحطاط کی شکار ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ کچھ دوسرے خراب لوازم اس قدر خلط ملط ہو گئے ہیں کہ اصل روح نہ صرف یہ کہ اس کے اندر باقی نہیں رہی بلکہ جہاں نیک نیت لوگ اس ہیئت و شکل میں کوئی صحیح خدمت بھی کرتے ہیں وہاں بھی بہت جلد ہی اس کے خراب لوازم عود کر آتے ہیں۔ اس بنا پر میری یہ رائے ہے کہ پیری مریدی کی وہ خاص شکل بدل دی جائے اور اس کے بجائے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں سلسلہ بیعت و ارشاد کی اصل روح تو موجود ہو مگر وہ خراب لوازم اور التباسات نہ ہوں۔ میں نے بہت غور و خوض کے بعد جو صورت تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اولاً ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت نہ لی جائے۔ بلکہ صرف زبانی عہد لیا جائے۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے لیا کرتے تھے۔ ثانیاً سلسلہ کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو۔ بلکہ "اسلام" کی طرف منسوب ہو تاکہ شخص خاص کی وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ سکے۔ ثالثاً تزکیۂ نفس اور اجرائے احکام اور اقامتِ نظم و انضباط وغیرہ کا کام جس شخص کے ہاتھ میں ہو وہ اس کی ذاتی حیثیت میں نہ ہو بلکہ جماعت کا سردار ہونے کی حیثیت میں ہو۔ حتیٰ کہ جب ایک شخص سردار نہ رہے اور دوسرا شخص اس کی جگہ آئے تو لوگوں کی اطاعت و وابستگی بھی پہلے شخص سے ہٹ کر دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو جائے۔ نہ یہ کہ لوگ اسی شخصِ خاص کے گرویدہ رہیں جس کے امر پر ابتدا میں انہوں نے عہد کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں خلفائے راشدین کے دور کی تنظیم سے میں نے اخذ کی ہیں۔ ان کے مبارک دور میں اسلامی جماعت اسلام کی طرف منسوب تھی نہ کہ صدیق رضی یا فاروق رضی یا عثمان رضی یا علی رضی اللہ عنہم کی طرف۔ اسی طرح لوگوں کی وابستگی شخص صدیق رضی یا شخص فاروق رضی سے نہ تھی بلکہ امیر المومنین سے تھی جو بھی وقت کا امیر ہو۔ اور اطاعت نظام کی تھی نہ کہ شخص خاص کی۔

آپ نے جماعت اسلامی میں اپنے آپ کو میرے رہبر کی ممبری کے لیے پیش کیا ہے اللہ آپ کو درجہ دوم بلکہ درجہ اول تک ترقی کرنے کی توفیق بخشے ....

خاکسار

ابوالاعلیٰ مودودی

(۱) مولانا مرحوم کا ۵ مارچ ۱۹۴۱ء والا خط نہایت واضح ہے — اس میں انہوں نے بیعت کی لفظاً تو تین لیکن حقیقتاً چار اقسام بیان کی ہیں ۔ ایک خاص مواقع پر خاص کاموں کے لئے کی جانے والی بیعت (۲) بیعتِ ارشاد و سلوک اور (۳) بیعتِ نظمِ جماعت ۔ اس آخری بیعت کے ضمن میں دو بار مولانا نے "امیر یا امام" کے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے (جیسا کہ بعض دیگر مواد سے ثابت ہوگا جس کا ذکر بعد میں آئے گا) اس کی دو قسمیں بنتی ہیں یعنی ایک یہ کہ اگر صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کے سربراہ سے بیعت اور دوسری اس صورت میں کہ صحیح اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو اس کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر سے بیعت!

(۲) اس کے بعد مولانا نے دوسری قسم کی بیعت یعنی بیعتِ ارشاد و سلوک کے بارے میں یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ وہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے — اور پھر اس میں دورِ حاضر میں جو خرابیاں در آئی ہیں اُن پر شدید تنقید بھی کی ہے — لیکن اس وقت اس سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہے کہ مولانا کی یہ آراء کس حد تک صحیح ہیں اور کس حد تک غلط — یا کس حد تک واقعیت پسندی پر مبنی ہیں اور کس حد تک انتہا پسندی کی مظہر! — اس لئے کہ میری ساری گفتگو مولانا کی بیان کردہ تیسری قسم کی بیعت سے ہے جسے میں نے مزید دو اقسام میں منقسم قرار دیا ہے۔

(۳) اب آئیے مولانا مرحوم کے ۱۸ جون ۱۹۴۲ء کے خط کی جانب تو اس میں اوّلاً مولانا نے پیری مریدی والی بیعت پر دورِ حاضر میں اسی انداز کی بھرپور تنقید کی ہے — اور ثانیاً اس پر بعض اصلاحات تجویز کی ہیں لیکن اُن کے ضمن میں جو مثالیں دی ہیں وہ کُل کی کُل خلافتِ راشدہ سے متعلق ہیں۔ گویا حکومت والی بیعت کا ذکر تو موجود ہے لیکن جماعت والی بیعت کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا — ثالثاً — خلافتِ راشدہ کی بیعت کے ضمن میں بھی اس حقیقت اور واقعے سے صرفِ نظر کرنا مناسب سمجھا ہے کہ وہاں ہر آنے والے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوتی تھی اور سابق خلیفہ کی بیعت از خود نئے خلیفہ کو منتقل نہیں ہو جاتی تھی۔ رابعاً — اس ضمن میں ہاتھ میں ہاتھ دے لینے کے سلسلے میں خواتین کی بیعت کا ذکر کیا ہے لیکن مصافحہ کی حد تک جانے بغیر دونوں طرف سے ہاتھ بڑھا لئے — یا ایک برتن میں پانی ڈال کر اس میں ایک جانب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے دستِ مبارک کو ڈالنا اور دوسری طرف جانب بیعت کرنے والی خاتون یا خواتین کے ہاتھ ڈالنے کا تذکرہ تک نہیں کیا — (حالانکہ تفہیم القرآن جلد پنجم میں سورۂ ممتحنہ کے ذیل میں یہ ساری باتیں بیان ہوئی ہیں!)

(۴) اِن دونوں خطوط کے مابین جو فرق و تفاوت ہے اس کی حقیقت تک رسائی کے لئے اس واقعہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس عرصے کے دوران میں جماعتِ اسلامی بالفعل قائم ہو چکی تھی اور مولانا مودودی اس کے امیر قرار پا چکے تھے۔ — لیکن اس کی تنظیم دستور میں "بیعت" کی کسی قسم کا ذکر — یا اس کی کسی اصلاح یافتہ شکل کا حوالہ تو در کنار سرے سے "بیعت" کا لفظ ہی کہیں استعمال نہیں ہوا — سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ — راقم کا قیاس یہ ہے کہ ایسا اس لئے ہوا کہ کسی سبب سے مولانا قیامِ جماعت کے وقت نظمِ جماعت کے ضمن میں اپنے اصل ذہن اور فکر کو بروئے کار نہیں لا سکے! — چنانچہ ان کی یہی ذہنی الجھن اس غلط نسبت کا باعث بنی ہے جو جون ۴۲ء والے خط میں نظر آتا ہے!

(۵) رہا یہ سوال کہ وہ سبب کیا تھا جس کے باعث مولانا مرحوم اپنے اصل ذہن و فکر کو بروئے کار نہیں لا سکے تو اس کا جواب اس حقیقت کے حوالے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ مولانا محترم اس کے قائل تھے کہ جماعتِ اسلامی کے امیر کو ویٹو کا اختیار حاصل ہونا چاہئے۔ چنانچہ ۴۲ء کے اجتماعِ الٰہ آباد کے موقع پر اس مسئلے پر شدید بحث ہوئی اور اس مسئلے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی مخالفت کے باعث اس درجہ تلخی پیدا ہوگئی کہ اندیشہ ہوگیا تھا کہ یہ اکٹھ قائم نہیں رہ سکے گا اور جماعت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ بعض حضرات پر (بشمول مولانا مسعود عالم ندوی) گریہ بھی طاری ہوگیا تھا — بہرحال اس وقت مولانا نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ جماعت کو ٹوٹنے کے خطرہ سے محفوظ کیا جائے اور کوئی صورت مصالحت کی نکال لی جائے۔ اس لئے کہ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا علی میاں سمیت بہت سے علماء تو جماعت سے پہلے ہی علیحدہ ہو چکے تھے اب مولانا اصلاحی اور بعض دوسرے علماء

کی ملوکیت سے جماعت کی دینی حیثیت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا — چنانچہ ایک نہایت پیچ در پیچ فارمولا وضع کیا گیا۔ جس کی حیثیت خالص لفظی ہی — اِس طرح وہ بحران تو ٹل گیا لیکن چونکہ اِس طرح اِنسان کا ذہن اور مزاج تو نہیں بدل سکتا لہٰذا مولانا کا طرز عمل مسلسل یہ رہا کہ وہ جب بھی کوئی بڑا قدم اُٹھانا چاہتے تھے اپنی صوابدید کے مطابق اُس کا آغاز کسی جلسہ عام سے کر دیتے تھے اور بعد میں مجلس شوریٰ اِس مخمصے میں گرفتار ہو کر رہ جاتی تھی کہ اب امیر جماعت کے اعلان سے برأت کیسے کرے! — تا آنکہ ۵۶-۱۹۵۵ء کا بحران آیا اور اُس موقع پر مولانا نے ماچھی گوٹھ میں منعقدہ اجتماع ارکان میں فرمایا کہ میری راہ کی بعض مشکلات ایسی ہیں جن کی بنا پر میں امارت کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ اگر اُنہیں دور کر دیا جائے تو البتہ میں یہ ذمہ داری سنبھال سکتا ہوں۔ اور وہ وجوہات ایسی ہیں کہ میں اُنہیں تمام ارکان کے سامنے نہیں رکھ سکتا لہٰذا ہر حلقے سے دو دو افراد کا اِنتخاب عمل میں لایا جائے تاکہ میں ان کے سامنے اپنی مشکل بیان کر سکوں — اُس اِجتماع نمائندگان کے سامنے مولانا نے اُس دستوری پیچیدگی کو بیان کیا اور دستور جماعت میں ترامیم کرالیں — مولانا امین احسن اصلاحی اُن منتخب حضرات میں شامل نہیں تھے البتہ مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہو گئے تھے چنانچہ اُن کے سامنے یہ معاملہ پہلی بار کوٹ شیر سنگھ میں منعقدہ اِجتماع مجلس شوریٰ میں آیا — چنانچہ وہ اُسی وقت اُٹھ کر روانہ ہو گئے اور بالآخر بذریعہ ٹیلیگرام جماعت کی رکنیت سے استعفاء دے دیا — اور بعد میں جو طویل خط و کتابت مولانا مرحوم اور مولانا اصلاحی کے مابین ہوئی اُس میں اُنہوں نے یہ الفاظ بھی لکھے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ میں بلی کو مار چکا ہوں مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے آپ نے تھیلے میں چھپا لیا ہے — اور اب آپ نے 'خلوتیانِ راز' کے سامنے اُسے تھیلے سے نکال باہر کیا ہے! — کوٹ شیر سنگھ کے اِجتماع میں مولانا مودودی مرحوم نے جو تقریر کی تھی اُس کا لبِ لباب یہ تھا کہ جمہوریت یا شورائیت کے تقاضے حکومت اور ریاست کی سطح پر کچھ اور ہوتے ہیں اور تحریک اور جماعت کی سطح پر کچھ اور! مولانا کے ۱۹۵۶ء کے اِن الفاظ کا تعلق مارچ ۱۹۴۲ء کے حاشیہ میں مستعمل الفاظ "امیر یا امام" سے جڑتا ہے — اور یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے — کہ مولانا کا ذہن اصلاً یہ تھا کہ جماعت اسلامی کے امیر کے پاس ویٹو کا حق ہونا چاہئے — اور اُس کے ساتھیوں کو اُس سے 'سمع و طاعت فی المعروف' کے تعلق میں منسلک ہونا چاہئے — اور مشورہ و مشاورت کو اصلاً ساتھیوں کا 'حق' نہیں بلکہ امیر کی ضرورت اور ساتھیوں کا 'فرض' قرار دیا جانا چاہئے — البتہ معروف کے دائرے کے اندر اندر کسی بھی مشورے کو قبول یا رد کر دینے کا اختیار 'امیر' کے پاس ہونا چاہئے —

میں اِس موقف کو بہ طرف کتاب و سنت کے نصوص اور اُمت کے مسلسل تعامل بلکہ اقامت دین کی انقلابی جدوجہد کے تنظیمی تقاضوں کی مصلحتوں کے اعتبار سے بھی صد فی صد درست سمجھتا ہوں — اور اِس کا اعلان بھی میں نے تحریری صورت میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کے موقع پر جولائی ۱۹۷۲ء میں کر دیا تھا — دس سال بعد ۱۹۸۲ء میں جب مولانا کا مارچ ۱۹۴۲ء والا حاشیہ پڑھنے میں آیا تو اُس سے راقم کو یقین ہو گیا کہ مولانا مرحوم کا ذہن بھی یہی تھا جسے وہ اپنے بعض با اثر ساتھیوں کی مخالفت کی بنا پر پوری طرح بروئے کار نہ لا سکے — بہر حال کسی کو اِس اندازِ فکر سے اِتفاق ہو یا اِختلاف — ہمارا اخلاقی فرض یہ ہے کہ حقائق و واقعات کو اُن کے اصل تناظر میں رکھ کر اُن کا حتی الامکان معروضی مطالعہ کریں — اور کسی کو بھلا لگے یا بُرا' جو حقائق بھی سامنے آئیں اُن کے علی الاعلان اِظہار سے دریغ نہ کریں —

لاہور: ۲۰ مارچ ۸۶ء — خادم القرآن' خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

●●●●●●●●●●●●●

یہ تحریر 'تکبیر' کو برائے اشاعت ارسال کی گئی تھی۔ اِس کا تازہ پرچہ اگرچہ ابھی ہم تک نہیں پہنچا لیکن بذریعہ فون معلوم ہوا ہے کہ اسے اُس میں قطع و برید کے ساتھ جزوی طور پر شائع کیا گیا ہے۔ اس پر ہمیں ادارۂ تکبیر سے گلہ بھی ہے اور احتجاج بھی اِس لیے کہ یہ شناعت کسی اور مضمون نگار کی رائے کے ضمن میں نہ تھی بلکہ خود ادارۂ تکبیر کے ادارتی نوٹ کے ضمن میں تھی!

مدحِ عمرؓ بزبانِ صدیق اکبرؓ

محترم جناب ڈاکٹر صاحب ! زید معالیکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

میثاق فروری ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں افکار و آراء کے ذیل میں عزیزی شمس مجددی صاحب کے مکتوب سے خوشی ہوئی کہ انہوں نے آپ کے خطاب میں بالواسطہ اس عاجز کو بھی اپنے ایک مقالہ میں " لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا " کو حضور علیہ السّلام کی طرف منسوب کرنے پر متنبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں اس سہو کو معاف فرمائے۔ یہ عاجز جب ماہنامہ " فیض " کے " عشاق رسول ﷺ نمبر " کے سلسلہ میں سرخیل محبّین حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات کے تفحص کے لیے متعلقہ کتب کی طرف متوجہ ہوا تو یہ کلمات آپ کے ایام مرضِ موت کے آخری خطبہ میں ملے جو آپ نے حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرنے (پر) بعض صحابہ کی طرف سے ان کی شدّتِ طبع پر تشویش کے اظہار کے جواب میں دیا تھا، جیسے " کنز العمال " ص۱۴۷ ج ۳ اور اسی طرح " کنز العمال " کے حوالہ سے " حیات الصحابہ " عربی ص۲۴، ۲۵، ج ۲ (ہمارے پاس " حیات الصحابہ " کا جو ایڈیشن موجود ہے، وہ دہلی کا مطبوعہ ہے۔ اس میں یہ خطبہ ص۲۷، ۲۸ ج ۲ پر ہے —) میں حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی (امیر تبلیغی جماعت، رحمہ اللہ تعالیٰ) نے بھی " من یحتمل الخلافۃ " کے عنوان سے ذکر فرمایا: جو یہ ہے !

يَا أَيُّهَا النَّاسُ، احْذَرُوا الدُّنْيَا وَلَا تَثِقُوا بِهَا، (فَإِنَّهَا) غَرَّارَةٌ وَآثِرُوا الْآخِرَةَ عَلَى الدُّنْيَا فَأَحِبُّوهَا فَبِحُبِّ كُلٍّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا تُبْغَضُ الْأُخْرَىٰ، وَإِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ الَّذِي هُوَ أَمْلَكُ بِنَا لَا يَصْلُحُ آخِرُهُ إِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهِ أَوَّلُهُ فَلَا يَحْمِلُهُ إِلَّا أَفْضَلُكُمْ مَقْدِرَةً وَأَمْلَكُكُمْ لِنَفْسِهِ أَشَدُّكُمْ فِي حَالِ الشِّدَّةِ وَأَسْلَسُكُمْ فِي حَالِ الشِّدَّةِ وَأَعْلَمُكُمْ بِرَأْيِ ذَوِي الرَّأْيِ، لَا يَتَشَاغَلُ بِمَا لَا يَعْنِيهِ وَلَا يَحْزَنُ بِمَا لَا يَنْزِلُ بِهِ وَلَا يَسْتَحْيِي مِنَ التَّعَلُّمِ

وَلَا يَتَحَيَّرُ عِنْدَ الْبَدِيهَةِ، قَوِيٌّ عَلَى الْأَحْوَالِ، وَلَا يَخُونُ بِشَيْءٍ مِنْهَا حِدَّةً لِعُدْوَانٍ وَلَا تَقْصِيرٍ، وَيَرْصُدُ بِمَا هُوَ آتٍ عَتَادَهُ مِنَ الْحَذَرِ وَالطَّاعَةِ وَهُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ

"اے لوگو! دنیا سے ڈرو اور اس پر بھروسہ مت کرو، یہ دھوکہ باز ہے، آخرت کو دنیا پر ترجیح دو اور اُسے پسند کرو کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی محبت دوسری سے نفرت کا باعث ہوتی ہے، یہ معاملہ جو اس وقت ہمارے لئے انتہائی اہم ہے۔ اس کا آخر اس چیز سے اصلاح پذیر ہو سکتا ہے جس سے اس کے اوّل نے اصلاح پائی اور اس کی برداشت اور اس ذمہ داری کو وہی شخص نباہ سکتا ہے جو تم میں قوت و مقدرت کے لحاظ سے بہتر ہو، جو ضبط نفس کے لحاظ سے پختہ تر ہو اور کسی بھی سختی کے وقت تاثر نہ لینے میں وہ سخت ہو یعنی اعصابی لحاظ سے مضبوط ہو اور نرمی کے زمانہ میں وہ خوش مزاج ہو، مردم شناس ہو، اپنے ارد گرد خوشامدی ٹولے سے زیادہ عقل مندوں کو ترجیح دیتا ہو۔ جس کے اوقات تعمیری ہوں اور جو اندیشہ ہائے فردا سے غم حال کی تعمیر میں منہمک ہو، اور جو کسی سے حصول علم میں حیا نہ محسوس کرتا ہو۔ جو اچانک حادثات میں ڈانوا ڈول نہ ہوتا ہو جو معاشی استحکام کا ذہن رکھتا ہو۔ اپنے غصہ کی سرکشی و ظلم میں قومی دولت کی خیانت و تقصیر کا مرتکب نہ ہوتا ہو۔ اس کے ذہن میں سفر آخرت کی تیاری کے سامان کا خیال رہتا ہو — جو اللہ کا ڈر اور اس کی اطاعت ہے — ان صفات کا حامل عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے"

یہ عاجز مناسب موقع پر تلاش میں تھا کہ اپنی اس غلط نسبت کے تدارک میں کچھ لکھے اور احباب سے اپنی غلطی کا برملا اعتراف کرے۔

میری خوش قسمتی ہوئی کہ مجھے بھی موقع مل گیا کہ میں اپنی غلطی کی تلافی کر سکوں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک کہ عزیز کے مکتوب کے سلسلہ میں مناسبت جو ذاتی وضاحت فرمائی، آج کے اس ماحول میں بقول حضرت مجدد علیہ الرحمۃ، جو اپنے مکتوب میں فرماتے ہیں

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمی آید، سواراں را چہ شد

ہرچند سلامتی در زاویہ است اما دولت عز و شہادت در معرکہ است، کنج در زاویہ اہل سرو ضعف مناسب است۔ در حدیث آمدہ: اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ - کار مردان اقویا مبارزت و معرکہ کبریٰ است۔
قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا
(مکتوب ۵۶ دفتر سوم ص۱۲۸)
ہم زاویہ نشینان، ضعیفان بجز دعا اور کیا کر سکتے ہیں۔ اللہ جو دلوں کا حال جانتا ہے اپنے دین کو سربلند فرمائے (آمین)

والسلام
عاجز حمید فضلی

لہ (ترجمہ) توفیق و سعادت کی گیند درمیان میں انہوں نے پھینک دی ہے۔ لیکن میدان میں کوئی نہیں آتا، سواروں کو کیا ہوگیا!
باوجودیکہ سلامتی دامن خانقاہ کی تنہائی میں ہے لیکن عزت آخروی اور شہادت کی دولت معرکۂ کارزار میں ہے۔ خانقاہ اور تنہائی کمزور لوگوں کے لئے توشاید مناسب ہو (لیکن مردانِ حُر کے لئے مناسب نہیں) حدیث میں آیا ہے کہ "قوی مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے" (اس لئے) قوی مردوں کا کام باطل کو للکارنا اور میدان کارزار میں خم ٹھونک کر آنا ہے (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے)
"اے نبیؐ فرمادیں کہ ہر شخص کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ اور طریقے پر، (لیکن) تیرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک راستہ کی رہنمائی کس کو میسر آئی ہے! (بنی اسرائیل آیت ۸۴)

الامام المهدی

مولانا اختر کاشمیری کی زیرِ طبع کتاب پر تقریظ

از قلم : اسرار احمد

جس طرح "شرک فی الصفات" کے ضمن میں مغالطے کا اصل سبب لفظی اشتراک ہے۔ یعنی یہ کہ صفات باری تعالیٰ کے لئے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہی مخلوق کے لئے بھی مستعمل ہیں، جیسے اللہ تعالےٰ عالم وعلیم ہے اور انسان بھی نہ صرف عالم وعلیم بلکہ علامہ تک ہوتے ہیں، اب اگر یہ حقیقت پیش نظر نہ رہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا وجود ذاتی ہے نہ کہ عطائی، قدیم ہے نہ کہ حادث اور لامحدود ولامتناہی ہے نہ کہ محدود ومقید، اسی طرح اس کی جملہ صفات بھی ذاتی، قدیم اور مطلق ہیں جبکہ مخلوقات کا وجود اور ان کی جملہ صفات بھی عطائی ہیں نہ کہ ذاتی، حادث ہیں نہ کہ قدیم اور محدود ہیں نہ کہ مطلق، تو انسان نادانستہ مغالطہ کا شکار ہو سکتا ہے۔

اسی طرح چند عظیم شخصیتوں کے ضمن میں بھی نام کا اشتراک کچھ غیر شعوری طور پر مغالطوں کا سبب بنا ہے۔ اور کچھ لوگوں نے اسے دانستہ طور پر گمراہی پھیلانے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جُنوں کے انداز
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں!!

مثلاً عیسیٰ ابن مریم نام کی دو شخصیتیں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں یعنی ایک وہ یسوع مسیح جن کو عیسائی مانتے ہیں جو یا تو خدا کا اوتار (GOD - INCARNATE) ہیں یا کم از کم الوہیت کی اقانیم ثلاثہ میں سے ایک مزور ہیں جنہوں نے اپنے ماننے والوں کے جملہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے سولی پر تڑپ تڑپ کر اور نالہ و شیون کے ساتھ جان دی اور پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے اور اب ان کا نزول صرف اپنی ذاتی شان وشوکت اور اپنے مقام ومرتبہ کے اظہار کے لئے قیامت کے موقع پر ہوگا۔

جبکہ دوسرے عیسیٰ وہ ہیں جنہیں ہم مسلمان مانتے ہیں۔ جو اگرچہ پیدا تو بن باپ ہی کے ہوئے تھے لیکن نہ خدا کا اوتار ہیں نہ الوہیت میں کسی حصے کے حامل بلکہ خدا کے بندے اور بنی اسرائیل کی جانب اس کے رسول ہیں جو نہ مغلوب ہوئے نہ مصلوب بلکہ زندہ ہی آسمان پر اٹھا لئے گئے ــــــ اور قیامت کے قریب آسمان سے اس وقت نازل ہوں گے جبکہ مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین

ایک فیصلہ کن معرکہ گرم ہوگا جس میں وہ مسلمانوں کی مدد کریں گے اور یہودیوں کا قلع قمع کریں گے اور یہودیوں کے لیڈر دجّال اکبر کو قتل کریں گے اور مسلمانوں کے اس وقت کے قائد و سپہ سالار کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے اور پھر ان کی طبعی موت واقع ہو گی۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہی نہیں متضاد ہیں اور ان میں ایک نام کے سوا صرف بن باپ کی ولادت اور زندہ آسمان پر اٹھایا جانا مشترک ہیں باقی جملہ اوصاف میں وہ ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔

یہی معاملہ علیؓ بن ابی طالب کا ہے ــــ چنانچہ علیؓ وہ ہیں جنہیں اہلِ تشیع مانتے ہیں جو ایک جانب الوہیت کا مظہرِ اتم ہیں دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور خلیفہ بلافصل ہیں اور تیسری جانب امام معصوم ہیں، جن کا قرآن امت کے متفق علیہ قرآن سے جدا ہے، جنہوں نے خلفائے ثلاثہؓ کی خلافت کو محض بربنائے تقیہ قبول اور برداشت کیا۔ درحقیقت وہ انہیں غاصب اور منافق سمجھتے تھے ــــ وغیر ذالک من الخرافات!

اور دوسرے علیؓ وہ ہیں جنہیں اہلِ سنت والجماعت مانتے ہیں جو نہ الوہیت کا مظہر ہیں نہ وصیٔ رسولؐ اور نہ امام معصوم، بلکہ صرف جلیل القدر صحابی ہیں۔ البتہ جملہ صحابہ میں صرف تین کے سوا سب سے افضل ہیں، اسی طرح وہ خلیفۂ راشد ہیں اور تینوں سابق خلفائے راشدین کے بعد خلیفۂ رابع!

ان کے بارے میں یہ تصور ہی ناقابلِ قبول ہے کہ وہ کسی طرح خوف یا مصلحت کی بنا پر منافقوں اور غاصبوں کے ساتھ مصالحت بلکہ تعاون کر سکتے تھے۔

الغرض یہ دونوں شخصیتیں بھی ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہیں اور ان کے نام اور ولدیت اور نبی اکرم علیہ السلام کے داماد ہونے، حضرت فاطمہؓ کے شوہر اور حضرات حسنینؓ کے والد ماجد ہونے کے سوا ان میں کوئی اور وصف مشترک نہیں ہے۔

یہی معاملہ مہدیؑ کا ہے ــــ کہ ایک ہیں اہلِ تشیع کے "الامام المہدی" جو بارہویں امام معصوم ہیں۔ چنانچہ ۲۵۶ھ میں گیارہویں امام معصوم حضرت حسن عسکری کے یہاں پیدا ہوئے اور بچپن میں ہی روپوش ہو گئے یا کر دیئے گئے۔ ابتداءً ان کی غیوبت صغریٰ تھی جس کے دوران ان سے کچھ لوگ ہدایات حاصل کرتے رہے اور بعد ازاں وہ غیوبت کبریٰ میں داخل ہو گئے اور باہر کی دنیا سے ان کا تعلق بالکل منقطع ہو گیا۔ چنانچہ اب ان کا انتظار ہے ــــ وہ قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے اور پوری دنیا پر اسلام غالب کریں گے۔ جبکہ اہلِ سنت بعض احادیثِ نبویہ کی رُو سے جن مہدی کے قائل ہیں وہ نہ امام معصوم ہیں نہ ۲۵۶ھ سے تاحال روپوش و غائب ہیں بلکہ قیامت

کے قریب کے زمانے میں عام مسلمانوں کی طرح پیدا ہوں گے۔ اگرچہ وہ ہوں گے سیدہ فاطمہؓ ہی کی نسل سے، اور ان کا اپنا نام آنحضور کے نام پر اور ان کے والدین کا نام آپؐ کے والدین کے نام پر ہوگا۔ قیامت کے قریب کے زمانے میں یہی مسلمانوں کے قائد و سپہ سالار ہوں گے۔ ان کی سرکردگی میں ہی یہود سے معرکہ برپا ہوگا۔ جب حضرت مسیحؑ کا نزول ہوگا جوان ہی کی امامت میں نماز ادا فرمائیں گے۔ اور ان کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے کفار یہود کا قلع قمع اور ان کے لیڈر دجال اکبر کو واصلِ جہنم کریں گے۔

لیکن جس طرح ناواقف مسلمان عوام میں اپنی تبلیغ کے ضمن میں مسیحی مبشرین نے عیسیٰؑ کے نام کے اشتراک سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بہت سوں کو گمراہ کر دیا اسی طرح روافض نے بھی ناموں کے اشتراک سے غلط فائدہ اٹھایا اور اہلِ سنت کے غافل عوام کو مغالطوں میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ ایک جانب حضرت علیؓ سے ان کی طبعی اور دینی محبت و عقیدت کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کیا تو دوسری جانب مہدی کی شخصیت کے بارے میں اہلِ سنت کے ذخیرہ احادیث میں وارد شدہ روایات کی بناء پر اپنے مزعومہ امام غائب کے وجود کو منوانے کی کوشش کی

اس کا ایک علاج تو وہی ہے جو اہلِ سنت کے جمہور علماء تا حال کرتے آ رہے ہیں یعنی یہ کہ ناموں کے اشتراک کے مغالطے کو رفع کر کے حقیقتِ حال کو واضح کرنے کی دیانت دارانہ امکانی کوشش، بلالحاظ اس کے کہ جڑ کٹتی ہے یا نہیں اور مغالطے رفع ہوتے ہیں یا نہیں ؟

اور ایک راہ وہ ہے جس کی نشاندہی پیشِ نظر تالیف میں کی ہے ایک نوجوان صحافی اور عالم دین جناب اختر کاشمیری نے۔ اس پر اہلِ تشیع کا ردِ عمل تو خارج از بحث ہے۔ اس لئے کہ وہ کتاب کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ البتہ اہلِ سنت کے علماء کا ردِ عمل بھی ناقابلِ فہم نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایک تو بات نئی ہے جس پر غور کرنے کے لئے آمادگی پیدا ہوتے ہوتے ہی ہوتی ہے اور دوسرے اختر صاحب کا اندازِ تحریر بھی نہ صرف یہ کہ ان کی نوجوانی کی بھرپور غمازی کر رہا ہے بلکہ ان کے صحافیانہ مشاغل کی بھی کامل عکاسی کرتا ہے۔ لہٰذا علماء کرام کا توحش فطری ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک اس معاملہ میں ایک اصولی بات ان کی جانب سے ایسی آئی ہے جس پر علماء اہلِ سنت کو ان کے اندازِ تحریر کے تیکھے پن کو نظر انداز کرتے ہوئے پوری توجہ کرنی چاہئے۔ اور وہ ہے یہ اصول کہ اس نوع کی احادیث کے سلسلہ روایت میں اگر کوئی رافضی یا شیعہ راوی بھی آتا ہو تو اس کے ردّ و قبول کے معاملے پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں یہ دلیل کہ اگر ہمارے اسلاف نے بعض روافض کے رفض کے علم کے باوجود

ان کی سیرت و کردار کے دوسرے پہلوؤں کے قابلِ اعتماد ہونے کی بنا پر ان کی روایت قبول کی ہے تو ہم اس میں کیسے ترمیم کر سکتے ہیں، بظاہر بہت قوی ہے لیکن اس کے مقابلے میں اتنی ہی قابلِ لحاظ دلیل یہ بھی ہے کہ جیسے ماضی قریب میں مولانا عبدالشکور لکھنوی اور حال میں مولانا محمد منظور نعمانی نے نے واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ ہمارے اسلاف تک روافض کی جملہ کتابیں نہیں پہنچ پائیں. اور اس بنا پر ان کا رویہ ان کے حق میں نرم رہا۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ روافض کے اصولِ تقیہ پر بھی کماحقہٗ مطلع نہ ہو پائے ہوں ـــ اور اسی بنا پر ان کی روایات کو قبول کر لیا گیا ہو!

بہرحال اس مسئلے میں از سرِ نو تحقیق کا حق ادا کیا جانا ضروری ہے اور اہلِ علم سے درخواست ہے کہ وہ مؤلف کے اندازِ بیان سے صرفِ نظر تو نہیں "غضِ بصر" کرتے ہوئے ان کے دلائل پر غور فرمائیں اور اس ضمن میں خالص علمی انداز میں مسئلے کی از سرِ نو تحقیق کرتے ہوئے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ سرانجام دیں۔

بقیہ : ایک اہم خط

تمام خواص و عوام مطلع رہیں کہ میں آئندہ اس حدیث شریف پر عمل کی کوشش کروں گا۔ کسی ایسی مجلس تقریب اور دعوت میں شریک نہ ہوں گا جس میں کوئی ایک شخص بھی منکرِ شرعی کا مرتکب ہو۔ نیز لڑکیوں کی دعوت نکاح اور ایسی دعوتِ ولیمہ جس میں مطبوعہ مزخرفہ مروجہ دعوت نامے بھیجے گئے ہوں شریک نہ ہوں گا۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان
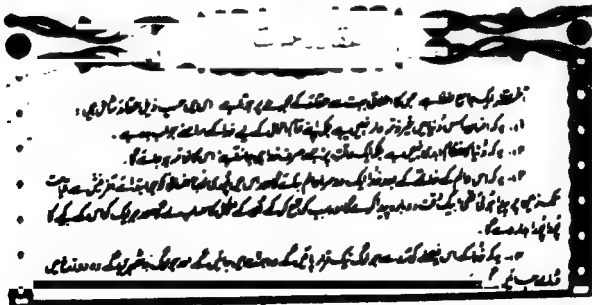
ایک اہم خط اور تعلیم نبوی کا اہم موتی

مرسلہ : مولانا محی الدین لکھوی (دیپالپور)

۲۶ رجمادی الثانی ۱۴۰۶ھ

من محی الدین اللکھوی

الی الاخ العزیز امیر تنظیم اسلامی دکتور اسرار احمد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ - اما بعد :-

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "الدین النصیحۃ"

قیل "لمن یارسول اللہ ؟ " قال "للہ و الکتابہ والرسولہ

ولائمۃ المسلمین وعامتہم "

نصف سال سے زیادہ عرصہ ہوا جبکہ راقم نے ایک حدیث شریف زیر عنوان "دعوتِ عمل" فوٹو سیٹ کروائی تھی لیکن وہ میری طبعی پریشانی اور نسیان کا شکار رہی - آج توفیق شاملِ حال ہوئی تو وہ ارسالِ خدمت کر رہا ہوں - آپ مناسب سمجھیں تو میثاق یا حکمت میں شائع کروادیں -

میری بیعت والد رحمۃ اللہ علیہ سے تھی اور اُن کی امیر مجاہدین فضل الٰہی رح سے نیز والد صاحب کا مجھے حکم تھا کہ عوام کی بیعت کرو - چنانچہ تحصیلِ علم کے بعد سے ہی سلسلۂ بیعت شروع ہوا جو اب تک جاری ہے - گویا میں بھی ایک بے نام کی گمنام جماعت کا امیر ہوں - میرا بھی کتاب وسنت کی روشنی میں طریق کار ہے جو میرے ساتھی جانتے ہیں - رات دن کی مصروفیت ہے - صحافت میں آج تک معتدبہ حصہ نہیں لیا - تاہم اپنی مصروفیت کی وجہ سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوسکی - تاہم آپ یہ نوٹ فرمالیں کہ سو فیصد آپ کی تحریک سے متفق ہوں -

بلسمی ھھنا قلبی لدیکم

راقم نے ایک عرصہ سے سفر قطعاً بند کردیا ہے - گذشتہ عمر سفر ہی میں بسر ہوگئی

اب خیال ہے کہ اشد ضرورت کے علاوہ عام سفر ترک کروں اور گھر پر مقیم رہ کر خدمت دین کروں۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کی اصلاح فرمائے اور صراطِ مستقیم پر چلائے۔ (آمین)
تمام ساتھیوں کی خدمت میں سلام عرض کریں۔

حدیثِ نبویؐ

سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تنبیہہ،
مشکوٰۃ شریف باب الامر بالمعروف ص۴۳۸ پر بروایت ترمذی وابوداؤد مرفوع حدیث ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو اُن کے علماء نے انہیں روکا لیکن وہ باز نہ آئے۔ پھر وہی علماء اُن کی مجالس میں بیٹھنے لگے اور اُن سے مِل جُل کر کھاتے پیتے رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل آپس میں مِلا دیئے، پھر اُن پر لعنت کردی۔ (داؤد و عیسےٰ بن مریم کی زبان پر (علی نبیّنا وعلیہما السلام) ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (یہ لعنت اُن کی نافرمانی اور زیادتی کی وجہ سے ہوئی) راوی نے کہا کہ حضورؐ تکیہ لگائے ہوئے تھے پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا "قسم اِس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ امر بالمعروف کرو یہاں تک کہ انہیں حق کی جانب موڑ دو" اور ایک روایت میں ہے۔ ہرگز نہیں! اللہ کی قسم تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو، اور ظالم کے ہاتھ پکڑ لو اور حق قبول کرنے پر انہیں مجبور کردو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دل ایک جیسے کردے گا پھر تم پر لعنت کردے گا جس طرح اُن پر لعنت کی۔
شارح لکھتا ہے اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئیں تو تم اُن کے ساتھ میل جول گفتگو۔ کھانا پینا اور مجلس ترک کرو۔

اِس حدیث شریف کی رو سے ہر مسلمان یگانہ و بے گانہ صاحبِ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ کسی بھی گناہ کے مرتکب کے ساتھ اگر وہ باز نہ آئے میل جول نہ رکھے ورنہ عین ممکن ہے کہ اِس کا دل بھی متاثر ہو اور آہستہ آہستہ دل سے گناہ کی نفرت نکل جائے۔ جو بالآخر اللہ تعالیٰ کی لعنت کا موجب ہوگی۔ معاذ اللہ۔
(باقی ص۱۶۱ پر)

کا ایک اہم خطاب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے
جس میں موصوف نے اس محیر العقل واقعہ کو قرآن مجید اور
احادیث شریف نیز عقلی استدلال سے واضح و مبرہن کیا ہے

عمدہ آفسٹ پیپر ۔ اعلیٰ طباعت ۔ صفحات ۴۰
قیمت ___ فی نسخہ تین روپے ___ (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن - ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴
(۲) مکتبہ تنظیم اسلامی ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ کراچی

اس شمارے کا اہم مضمون

فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ

از: ڈاکٹر اسرار احمد

میثاق

لاہور

نجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۱ / ۲۳۹۳۱

جلد ۳۵

شمارہ ۵

مئی ۱۹۸۶ء

بمطابق

رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

زرِ سالانہ ۴۰/- روپے

فی شمارہ ۴/- روپے

مدیر مسئول

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون ۲۱۹۵۸۲

مشمولات

الحمد للہ کہ ماہِ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح کے ساتھ

دورۂ ترجمۂ قرآن مجید

کا رُوح پرور پروگرام

جو گذشتہ دو سال صرف جامع القرآن، قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن لاہور میں جاری رہا

اِس سال — اِن شاء اللہ

کراچی اور لاہور میں تین مقامات پر منعقد ہوگا :

(۱)

جامع القرآن، قرآن اکیڈمی، لاہور میں

پروفیسر حافظ احمد یار صاحب

ترجمہ بیان فرمائیں گے، اور

(۲)

مرکزی دفتر، تنظیم اسلامی پاکستان :

۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور میں

یہ ذمہ داری **ڈاکٹر عبد الخالق صاحب** ادا کریں گے!

لاہور کے احباب سے استدعا ہے کہ حسبِ سابق ذوق و شوق سے شرکت فرمائیں

منوٹ

دونوں مقامات پر خواتین کے لیے بھی اہتمام ہوگا

جامع مسجد، بلاک ۵، ناظم آباد، کراچی میں

نماز تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

بیان کریں گے ـــ جس کے ضمن میں حسبِ ذیل امور لائق توجہ ہیں :

(۱) یہ مسجد ناظم آباد اور شمالی ناظم آباد کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کے لیے ایک راستہ ریل کے پل سے قبل ناظم آباد بلاک ۵ سے ہو کر جاتا ہے ــ اور دوسرا اور آسان تر راستہ پل سے نارتھ ناظم آباد کی جانب اترتے ہی بائیں ہاتھ پر واقع جناح کالج کے ساتھ جاتا ہے چنانچہ جناح کالج کے دونوں جانب کی سڑکیں سیدھی اس مسجد تک جاتی ہیں۔

(۲) اس مسجد میں دورۂ ترجمہ ان شاء اللہ، ۱۰ اور ۱۱ مئی کی درمیانی شب سے شروع ہوگا (خواہ وہ رمضان المبارک کی پہلی شب ہو خواہ دوسری!)

(۳) ۹ اور ۱۰ مئی کی درمیانی شب کو اگر چاند نہ ہوا تو بعد نماز عشاء اور اگر چاند ہو گیا تو بعد نماز تراویح (جو اس رات بغیر ترجمہ کے ہوگی) ڈاکٹر صاحب ان شاء اللہ

عظمتِ رمضان و صوم و قرآن

کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے ــ شرکت کی عام دعوت ہے

نوٹ : جملہ پروگراموں میں خواتین کی شرکت کے لیے اہتمام ہوگا۔

اس پروگرام کے ضمن میں کراچی کے صاحبِ ذوق احباب کی خدمت میں صرف یہ عرض ہے کہ

؎ لذتِ ایں بادہ نہ دانی، بخدا تا نہ چشی !

تنظیم اسلامی کی شمالی امریکہ کی دو شاخوں

ٹورنٹو اور شکاگو

کے احباب کے پُرزور اصرار پر

اِن شاء اللہ العزیز — اس سال — امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

۱۵ر جولائی تا ۱۰ر اگست ۸۶ء امریکہ کا دورہ فرمائیں گے

مجوزہ پروگرام — اِن شاء اللہ العزیز — حسب ذیل ہوگا:

— ★ ورود نیو یارک (JFK) منگل، ۱۵ر جولائی، سہ پہر بذریعہ پی آئی اے، فلائٹ پی کے ۷۰۳

— ★ قیام نیو یارک .... ۱۶ر، ۱۷ر جولائی

برمکان رفیق مکرم الطاف احمد صاحب

84-85 STREET 162, JAMICA HILLS,
N.Y. 11432 (Ph. 212-297-0927)

— ★ سفر نیو یارک تا ٹورنٹو — جمعہ ۱۸ر جولائی علی الصبح

— ★ قیام ٹورنٹو، ۱۸ر تا ۲۰ر جولائی ۸۶ء

اس دوران میں نماز جمعہ اور جمعہ کی شام، ہفتہ صبح و شام اور اتوار کی صبح دروس و خطابات بوسٹیڈ ایونیو کی جامع مسجد میں ہونگے

— ★ تربیتی کیمپ ۲۱ر تا ۲۵ر جولائی۔ ٹورنٹو کے قریب ایک پارک میں

— ★ ہفتہ ۲۶ر و اتوار ۲۷ر جولائی مانٹریال میں پروگرام ہوں گے۔

(نوٹ: کینیڈا کے پروگراموں کے سلسلے میں معلومات کے لیے رفیقِ مکرم
ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب سے حسبِ ذیل پتہ پر رجوع کیا جا سکتا ہے:

417, WARRINGTON DRIVE,
WATERLOO ONT. N2L2P7
(Ph. 519-886-5463)

— ★ مانٹریال تا شکاگو — اتوار ۲۷ر جولائی شام
— ★ ۲۸ر تا ۳۱ر جولائی آرام شکاگو یا سفر سان فرانسسکو
— ★ یکم تا ۷ر اگست ۸۶ء انڈیانا پولس میں واقع اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا (ISNA) کے مرکز میں ایک دعوتی کیمپ منعقد ہوگا!
— ★ جمعہ ۸ر کی شام اور ہفتہ ۹ر کی صبح شکاگو میں خطاب ہوں گے
(نوٹ: متذکرہ بالا جملہ پروگراموں کے ضمن میں رفیق مکرم
ڈاکٹر خورشید احمد ملک سے حسبِ ذیل پتے پر تفصیلات معلوم کی جا سکتی ہیں

810, St. No. 73
DOWNERS GROVE ILL. 60516
(Ph. 312-969-6755)

— ★ شکاگو تا نیویارک — ہفتہ ۹ر اگست، سہ پہر
— ★ واپسی از نیویارک اسی روز بذریعہ پی آئی اے فلائٹ پی کے ۷۱۲ ساڑھے دس بجے شب۔

اگر اللہ کو منظور ہوا، اور ویزا کے حصول میں رکاوٹ نہ ہوئی تو اتوار ۱۰ر اگست کو قاہرہ سے رُخ جانبِ حرمین شریفین مُڑ جائے گا اور حج بیت اللہ اور زیارت مسجد نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام سے مشرف ہو کر جمعہ ۲۲ر اگست کو علی الصبح لاہور واپسی ہوگی۔
(نوٹ: اس پورے سفر میں ان شاء اللہ العزیز عزیزم عاکف سعید مستقلاً بھی ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ ہوگا

المعلن: قمر سعید قریشی، قیم تنظیم اسلامی، بیرون پاکستان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

جلیل الرحمٰن

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

جس وقت میثاق کا شمارہ بابت مئی ۸۶ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ قارئین کرام کے ہاتھوں میں پہنچے گا تو اس وقت تک رمضان کا وہ مہینہ سایہ فگن ہو چکا ہو گا یا ہونے والا ہو گا جس کی خبر الصادق والمصدوق جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے مہینہ کے آخری دن ایک خطبہ میں دی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: "لوگو! تم پر ایک عظمت و برکت والا مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے۔

اس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے اس کے روزے فرض ہیں رات کا قیام نفل ہے۔ اس مہینہ کے نوافل پر دوسرے مہینوں کے فرض کے برابر اور فرائض پر ستر فرضوں کے برابر ثواب ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے۔ صبر کا بدلہ جنّت ہے۔ یہ ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ ہے اس مہینہ کے پہلے عشرے میں رحمت ہے، دوسرے عشرے میں مغفرت ہے اور آخری عشرے میں دوزخ سے چھٹکارا ہے۔"

یہ برکاتِ الٰہی کا مہینہ ہے۔ قرآن مجید نے اس مہینہ کی خصوصیت "تقویٰ" قرار دی ہے۔ یعنی اس ماہ کے روزوں سے ایک مسلمان میں ضبطِ نفس کی خو پروان چڑھتی ہے اور معصیتوں سے بچنے کے لیے اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہوتی ہے۔ مزید برآں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے کہ جس کسی نے رمضان کے روزے ایمان و احتساب کے ساتھ رکھے، اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے، اور جس نے رمضان کی راتوں میں قیام کیا، ایمان و احتساب کے ساتھ۔ اس کے تمام سابقہ گناہ بخش دیے گئے ۔۔۔۔ ایمان و احتساب روزے کے لیے لازمی شرائط ہیں۔ در اصل یہ تقویٰ ہی کی شرح ہے۔ تقویٰ مستلزم ہے ایمان و احتساب ۔ جب یہ یقین ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو اپنی ذاتِ اقدس اور

صفاتِ کمال میں یکتا اور تنہا ہے۔ اور وہ اکیلا اس کائنات کا قیوم و مدبر ہے اور آخرت میں ہر ذی نفس کو اس کے حضور میں محاسبہ کے لیے لازماً کھڑا ہونا ہے، تو اس کے دل میں اللہ کی نافرمانیوں سے بچنے، اس کے احکام کو ماننے اور اس کے اوامر پر عمل پیرا ہونے کے لیے ایک زبردست قوتِ ارادی رمضان کے روزوں کے ذریعہ پروان چڑھتی ہے نشو ونما پاتی ہے۔ جس کے سہارے وہ آنے والے گیارہ مہینوں میں نفس کے منہ زور گھوڑے کو لگام دینے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس میں تقویٰ کی صلاحیت و اہلیت راسخ ہو جاتی ہے۔ الغرض رمضان کے ایمان و احتساب کے ساتھ روزے ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور تقویٰ کی مشق کراتے ہیں جو سیرت و کردار کی صحیح و سالم تعمیر کے لیے از حد ضروری ہے۔ رمضان المبارک کے دن کے روزوں اور رات کے قیام میں افادیت کا عظیم ترین پہلو یہ ہے کہ ان سے رب اور بندے کے درمیان ایک خاص نوع کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا ہوں" اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو رمضان المبارک کی برکات سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے اذہان و قلوب کو تقویٰ اختیار کرنے کا عادی و خوگر بنائے۔

قارئینِ میثاق کی یادداشت میں یقیناً یہ بات محفوظ ہو گی کہ جہاں پورے عالمِ اسلام میں رمضان کے بابرکت مہینہ کی آمد کی بہار سے بھی زیادہ پذیرائی ہوتی ہے۔ تمام مساجد کی رونقیں عروج پر ہوتی ہیں۔ بالخصوص عشاء کے بعد مساجد میں تراویح میں حفاظ کرام قرآن مجید سناتے ہیں وہاں قرآن اکیڈمی میں بھی اس بابرکت ماہ کی خوب پذیرائی اور علم و عرفان کی بارش ہوتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب سے قرآن اکیڈمی کی مسجد جامع القرآن میں نماز تراویح شروع ہوئی ہے تب سے امیرِ محترم کا ۱۹۸۳ء تک یہ معمول رہا ہے کہ ہر ترویحہ میں موصوف تلاوت کردہ حصے کے اہم مطالب و مفاہیم بیان فرمایا کرتے تھے لیکن ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء کے رمضان المبارک میں ہر ترویحہ (چار رکعات کے درمیان وقفہ) میں امیرِ محترم نے دورۂ ترجمۂ قرآن کے طور پر تلاوت کردہ حصہ کا ترجمہ بھی بیان فرمایا اور

اہم ترین آیات کی مختصر تشریح بھی۔ اس طرح ہر دو سالوں میں روزانہ تراویح اور ترجمہ و
تشریح قریباً ساڑھے تین گھنٹے میں ختم ہوتی تھی۔ مئی اور جون کے شدید ترین گرم موسم کے
باوجود توقع کے خلاف دونوں سالوں کے یہ پروگرام انتہائی کامیاب رہے۔ دونوں
سالوں کے ان پروگراموں میں بحمداللہ شرکاء کی تعداد اوسطاً ساڑھے تین سو کے لگ بھگ
رہی۔ دونوں سال اس دورۂ ترجمۂ قرآن کو ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ بفضلہٖ تعالیٰ ان
کے کیسٹس پاکستان اور بیرونی ممالک میں خاصی تعداد میں پھیلے ہیں۔ سعودی عرب
میں ایک ممتاز تاجر کو جو اصلاً تو برِصغیر کے باشندے ہیں لیکن طویل عرصہ سے وہاں
مقیم ہیں اور انہیں وہاں کی مستقل شہریت بھی حاصل ہے، کیسٹس سے اس دورۂ
ترجمۂ قرآن کے سننے کا اتفاق ہوا۔ وہ اس سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ٹیلکس کے ذریعہ
امیرِ محترم سے ملاقات کا وقت مانگا اور موصوف کا جواب ملتے ہی دوسرے دن ۸ مارچ
کو لاہور تشریف لے آئے اور امیرِ محترم سے ان کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ پندرہ روزہ
تربیت گاہ جو ۱۴ مارچ سے شروع ہوئی تھی، اس کی اور "استحکام پاکستان" کے مذاکرے
کی بعض نشستوں میں اور ۲۸ مارچ اور ۴ اپریل کو امیرِ محترم کے خطاباتِ جمعہ میں
بھی انہوں نے شرکت کی۔ موصوف امیرِ محترم کے دونوں سالوں کے دورہ ترجمۂ قرآن اور
اور دوسرے بہت سے دروس و خطابات کے کیسٹس نیز امیرِ محترم کے جملہ
دروس و خطابات کے ویڈیو کیسٹس سعودی عرب لے گئے ہیں کہ وہ وہاں
اردو دان حلقے میں خالصتاً فی اللہ پھیلائیں ______ موصوف محض
اسی کام کے لیے لاہور تشریف لائے تھے۔ اس مقصد کے سوا کوئی دوسری غرض ان
کے پیشِ نظر نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو استقامت عطا فرمائے، ان کی مساعی کو دین و
دنیا میں مشکور فرمائے۔

کراچی میں بعض احباب کی خواہش تھی کہ اس سال رمضان المبارک میں
تراویح میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا یہ اہم اور مفید کام کراچی میں سرانجام دیا جائے۔
اللہ جلّ شانہٗ نے اس خواہش کی تکمیل کی احسن صورت پیدا فرما دی ہے۔ اس کا مفصل
اعلان شاملِ اشاعت ہے۔ توقع ہے کہ اہلِ کراچی، دورۂ ترجمۂ قرآن کے اس پروگرام
سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے۔

غیر جماعتی بنیادوں پر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات، وزیرِ اعظم اور صوبائی وزرائے اعلیٰ کی "نامزدگیوں" اور مرکزی اور صوبائی کابیناؤں کی تشکیل کے بعد ان اسمبلیوں میں اکثریت نے ایک "سیاسی جماعت" کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ جو اپنی رُوح کے اعتبار سے "غیر جماعتی انتخاب" کے منافی ہے۔ پھر وزرا حضرات نے "اس سیاسی جماعت" کے زعماء کی حیثیت سے ملک کے مختلف قابلِ لحاظ شہروں کے دورے اور وہاں عوامی سطح پر عوامی جلسوں کے انعقاد کا لامتناہی سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ جس میں ہماری معلومات کی حد تک حکومت کے مالی ذرائع اور اثر و رسوخ استعمال ہو رہے ہیں۔ نیز ریاست کے ذرائع ابلاغ ریڈیو اور ٹیلی ویژن ان جلسوں کو نمایاں COVERAGE دے رہے ہیں اور دیگر سیاسی پارٹیوں کے جلسے جلوسوں کو یہ ذرائع ابلاغ بالکل نظر انداز کر رہے ہیں۔ یہ عمل ملک میں صحت مندانہ سیاسی ماحول پیدا کرنے کے ضمن میں انتہائی غیر مفید بلکہ مضر ہے۔ اِس طرزِ عمل سے دوسری پارٹیوں کا جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہونا بالکل فطری بات ہے۔ کاش سیاسیات کے یہ معروف اصول و مبادی ہمارے نام نہاد اربابِ اقتدار کو پیشِ نظر رکھنے کی توفیق مل سکے۔

پچھلے دو ماہ سے ملک بھر میں سیاسی جماعتوں کے جلسے اور جلوسوں کا زبردست طوفان آیا ہے۔ اِس طوفان کا نقطۂ عروج مس بے نظیر بھٹو کا پُرجوش استقبال اور ان کے جلسے جلوس قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان جلسوں جلوسوں کی تعداد کو مستقبل کے لیے کوئی فیصلہ کن عامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اصل میں موجودہ کیفیت کو اس بات سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ جب کہیں بہت سا پانی جمع ہو جس کو ایک بند نے روک رکھا ہو تو بند ٹوٹتے ہی پانی نہایت زور شور سے بہتا ہے۔ آٹھ سال تک سیاسی سرگرمیوں پر جو ناروا پابندیاں رہی ہیں یہ جوش و خروش اُسی کے ردِ عمل کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ البتہ اس سے پیش منظر کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔

جنرل یحییٰ کے دور میں ۱۹۷۰ء میں جو الیکشن ہوئے تھے ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ حکومت کی سطح پر اس سے زیادہ منصفانہ الیکشن نہ اس سے قبل

ہوئے تھے اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کی امید کی جا سکتی ہے۔ ۷۰ء کے الیکشن کے نتیجہ میں یہ المناک صورتِ حال سامنے آئی تھی کہ ملک کی دینی جماعتیں تقسیم تھیں اور علیحدہ علیحدہ الیکشن میں حصّہ لے رہی تھیں اور "اسلام" کے نام پر ووٹ مانگ رہی تھیں۔ اِس طرزِ عمل سے ایک عامی مسلمان اِس تذبذب میں مبتلا تھا کہ وہ کس دینی جماعت کے "اسلام" کو حقیقی و واقعی اسلام سمجھے اور کس کو ووٹ دے! نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی نظام کے خواہش مندوں کے ووٹ تقسیم ہو گئے اور "روٹی، کپڑا اور مکان" کا نعرہ لے کر اُٹھنے والی پارٹی ڈالے ہوئے صرف ۳۲½ فیصد ووٹوں سے مغربی پاکستان کی سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت حاصل کر گئی۔ دوسری جماعتوں کو ڈالے ہوئے ووٹ اگرچہ ۶۲½ فیصد تھے لیکن کوئی جماعت بھی نہ قومی اسمبلی میں اور نہ صوبائی اسمبلیوں میں کوئی مؤثر تعداد حاصل کر سکی۔ ان کی نشستوں کی مجموعی تعداد بھی بمشکل تمام تیس فیصد تھی بلکہ شاید اس سے بھی کم۔

اِس وقت بھی ۷۰ء جیسا نقشہ سامنے آ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی دینی جماعتیں اُس شکستِ فاش اور ہزیمت سے کوئی سبق لینے اور عبرت پکڑنے کے لیے قطعی آمادہ نہیں ہیں۔ ہر جماعت اپنے طور پر انتخابات کے دنگل میں لنگر لنگوٹ کسنے اور اپنی طاقت کے مظاہرہ میں مصروف ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ وہی نکلے گا جو ۷۰ء میں برآمد ہو چکا ہے۔ اگر "اسلام" کے نام پر ووٹ مانگنے والی بہت سی دینی جماعتیں ایک دوسرے کے مدِ مقابل الیکشن کے اکھاڑے میں اُتریں، چاہے وہ مڈٹرم الیکشن ہو چاہے موجودہ اسمبلیوں کی مدت پوری ہونے کے بعد ہوں تو جتنی جماعتیں ہوں گی، عام آدمی ہی نہیں بلکہ نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اذہان میں یہ خلجان پیدا ہونا قدرتی ہے کہ آخر کتنے "اسلام" ہیں اور اس صورتِ حال پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی نے ۱۱ اپریل ۸۶ء میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے دینی جماعتوں خاص طور پر جماعتِ اسلامی، جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام سے یہ دردمندانہ اپیل کی ہے کہ گو موصوف کے نزدیک حقیقی اسلامی نظام الیکشن کے ذریعہ نہیں آ سکتا، صرف انقلابی طریق کار سے آ سکتا ہے۔ تاہم پاکستان کی سالمیت اور اس کے استحکام نیز اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لیے نہایت ضروری

ہے کہ یہ دینی جماعتیں متحد ہو کر سیکولرازم کی دلدادہ اور علاقائیت پرستی کی علمبردار جماعتوں کے مقابلہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں ــــ اگر ایسا نہیں ہوا تو تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور سنہ کی طرح ان دینی جماعتوں کو اب بھی ناک شکست سے سابقہ پیش آئے گا۔ امیرِ محترم نے یہ بھی فرمایا کہ اگر اتحاد ممکن نہ ہو تو جس دینی جماعت کو اسلام سے جتنی زیادہ محبت ہے اور سلطنتِ خداداد پاکستان کا مستقبل جتنا زیادہ عزیز ہے اُسے ایثار سے کام لے کر انتخاب کے میدان سے ہٹ جانا چاہیئے تاکہ دینی جماعتوں کے ووٹ تقسیم ہونے کی صورت میں کمی واقع ہو سکے۔ امیرِ محترم کے اس خطاب کا خلاصہ جناب مقبول الرحیم مفتی صاحب نے کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے جو اسی شمارہ میں قارئین کرام کی نگاہ سے گزرے گا۔ مفتی صاحب ایک کہنہ مشق صحافی ہیں اور فی الوقت قرآن اکیڈمی کے شعبہ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہیں۔

امیرِ محترم نے خطاب کے دوران جہاں دینی جماعتوں سے اتحاد کی اپیل کی وہاں یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر اتحاد ممکن نہ ہو تو جس جماعت کو اسلام اور پاکستان زیادہ عزیز ہیں وہ ایثار سے کام لے کر انتخابی معرکہ آرائی کے میدان سے ہٹ جائے۔

اس موقع پر راقم کا ذہن اِس حدیث کی طرف منتقل ہوا جس میں دو عورتیں ایک بچے کی ماں ہونے کی دعویدار تھیں اور کوئی بھی اس سے دستبردار ہونے پر تیار نہ تھی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ چھری سے اس بچے کے دو ٹکڑے کر کے دونوں دعویدار عورتوں میں تقسیم کر دیئے جائیں اس پر بچہ کی سلامتی کی خاطر بچے کی حقیقی ماں اپنے دعوے سے دستبردار ہو گئی۔ راقم نے یہ حدیث نقل کرائی جو ہدیہ قارئین ہے۔ اِس حدیث میں ملک کی دینی جماعتوں کے لیے ایک عظیم رہنمائی موجود ہے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال
کانت امرأتان معھما ابناھما جاء الذئب فذھب
بابن احدھما فقالت صاحبتھا انما ذھب بابنک
وقالت الاخری انما ذھب بابنک فتحاکمتا الی

داؤد فقضٰی بہ الکبریٰ فخرجتا علیٰ سلیمان بن داؤد فاخبرتاہ فقال ائتونی بالسکین اشقہ بینکما فقالت الصغریٰ لاتفعل یرحمک اللہ ھو ابنھا فقضٰی بہ للصغریٰ (متفق علیہ، مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضؓ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے "دو عورتیں تھیں اور ان کے ساتھ ان کا ایک ایک بچّہ بھی تھا کہ ایک بھیڑیا آیا اور ایک بچے کو اُچک کر لے گیا۔ وہ دونوں عورتیں آپس میں جھگڑنے لگیں کہ بھیڑیا تمہارے بچّے کو لے گیا ہے جبکہ دوسری عورت یہ کہنے لگی کہ تمہارے بچّے کو بھیڑیا لے گیا ہے۔ وہ یہ مسئلہ لے کر حضرت داؤد ؑ کے پاس حاضر ہوئیں۔ آپؑ نے دونوں کی باتیں سن کر بڑی عورت کے حق میں فیصلہ دیا۔ وہ دونوں وہاں سے حضرت سلیمان ؑ کے پاس آئیں۔ انہوں نے ان دونوں کی باتیں سن کر فرمایا کہ ایک چھری لاؤ میں اس کو دو حصّوں میں کر کے تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا ہوں۔ یہ فیصلہ سُن کر چھوٹی عورت سہم گئی اور اس نے فوراً کہا کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے بچّہ آپ اس عورت ہی کو دے دیجئے۔ یہ بات سُن کر حضرت سلیمان ؑ نے بچّہ چھوٹی عورت کو دے دیا۔"

۱۴ اپریل کو امریکی سامراج نے مسلم برادر ملک لیبیا پر شدید بمباری کی جس کے نتیجہ میں لیبیائیں کا جانی و مالی نقصان ہوا۔ اِس حملہ میں بے شمار بے گناہوں کے ساتھ لیبیا کے سربراہ کرنل معمر قذافی کی لے پالک بیٹی بھی شہید ہوئی اور ان کے دو چھوٹے بچّے بھی شدید زخمی ہوئے۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک ارشادِ گرامی کا مفہوم یہ ہے کہ "مومن ایک بل سے دو بار ڈسا نہیں جاتا"۔ لیکن عالمِ اسلام کی حالت یہ ہے کہ بعض ممالک امریکہ کی اور بعض روس کی دوستی پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔ ان دونوں سپر پاورز کی اسلام دشمنی اظہر من الشمس ہے۔ "اسرائیل" کا قیام انہی کی سازش کا نتیجہ ہے۔ پھر ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے شام، اردن اور لبنان کے جن علاقوں پر قبضہ

کیا تھا، ان پر یہ قبضہ انہی طاقتوں کے گٹھ جوڑ کے باعث تاحال برقرار ہے۔ اُدھر لبنان میں امریکہ کی شہ پر اسرائیل اور عیسائی ملیشیا نے مسلمانوں پر جو ستم کے پہاڑ توڑے اور آگ و خون کی ہولی کھیلی ہے اور اِدھر افغانستان میں روسی افواج کے ہاتھوں افغان مسلمانوں کے خون کی جو ندیاں بہہ رہی ہیں، وہ روزِ روشن کی طرح ظاہر و عیاں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اکثر مسلم ممالک کا حالِ زار یہ ہے کہ انہی دشمنانِ اسلام میں سے کسی نہ کسی سے اپنے مستقبل کو وابستہ اور ان کی دوستی پر بھروسہ کر رکھا ہے۔ لیبیا پر ننگی جارحیت پر امیرِ محترم نے ۱۶ اپریل ۸۶ء کو جو اخباری بیان جاری کیا تھا وہ چونکہ صرف لاہور کے اخبارات میں شائع ہوا۔ اور اکثر و بیشتر اس میں قطع و برید کی گئی اس لیے بیان کا مکمل متن قارئینِ میثاق کے مطالعہ کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔

"تنظیمِ اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے لیبیا پر امریکہ کی ننگی جارحیت کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ مسلمانوں اور اسلام کا کھلا دشمن ہے۔ مسلم ممالک سے اس کی دوستی صرف اُسی حد تک ہے، جہاں تک اُس سے کمیونزم کی روک تھام میں مدد مل سکے۔ انہوں نے کہا کہ ہر نازک موقعے پر امریکہ نے عالمِ اسلام کو زک پہنچائی ہے۔ مسجدِ اقصیٰ میں یہودیوں کے ناپاک قدم محض امریکہ اور برطانیہ کی ریشہ دوانیوں اور پشت پناہی کی وجہ سے پہنچے ہیں۔ تنظیمِ اسلامی کے امیر نے کہا کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان تو امریکہ کی بے وفائیوں سے براہِ راست آشنا ہے۔ جب بھی بھارت نے پاکستان کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا، خواہ ستمبر ۶۵ء کی جنگ کا موقع تھا یا سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ، امریکہ نے ہمیشہ پشت سے چھرا گھونپنے والے دوست کا کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے کہا اگر ہمارے حکمران خود مختار ہیں اور اُن کی سلطنت کا تخت امریکہ کی پشت پناہی پر کھڑا ہوا نہیں ہے تو وہ ہر قومی اور بین الاقوامی فورم پر امریکہ کے خلاف اپنے عوام کے جذبات کی ترجمانی کریں۔ تنظیمِ اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ یہ موقع اُن لوگوں کے لیے بھی غور و فکر کا مواد

(باقی صفحہ ۸۹ پر)

تذکرہ و تبصرہ

موجودہ سیاسی حالات میں
سیاسی و دینی جماعتوں کے لیے راہِ عمل

ــــــــــ

جمعہ گیارہ اپریل کو امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے جامع مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں خطاب جمعہ کے دوران ملک میں شروع ہونے والے سیاسی عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے سیاسی و دینی جماعتوں کے لئے ایک قابلِ عمل راستہ تجویز کیا ہے۔ اگر جماعتوں کے قائدین اور علمائے کرام "الدین النصیحہ" کے طور پر کہی گئی ان باتوں پر غور فرمائیں تو وطن عزیز میں استحکام مملکت اسلامی انقلاب اور غلبہ دینِ حق کی منزل بہت قریب آسکتی ہے۔

ترتیب و تلخیص : مقبول الرحیم مفتی

خطبۂ مسنونہ کے بعد

حضرات گذشتہ سترہ اٹھارہ دن مجھ پر اور تنظیم اسلامی کے رفقاء پر ایک طوفانی کیفیت طاری رہی - ۲۱ مارچ سے ۳ اپریل ۱۹۸۶ء تک قرآن اکیڈمی میں تنظیم کے رفقاء کے لئے تربیت گاہ جاری رہی - اس تربیتی پروگرام کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے دوران شرکاء کو ان یگانۂ روزگار علمائے حق کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع بھی ملا جنہوں نے اپنی زندگیاں دین کے چمن کی نگہداشت اور آبیاری کے لئے وقف کئے رکھیں اور اب جن کے نفوس قدسیہ "چراغِ آخر شب" کی طرح ہمارے معاشرے کے تاریک ماحول کو علم و عرفان اور ایمان و عمل کی روشنی عطا کر رہے ہیں - تربیت گاہ کے آخری سات دنوں میں روزانہ شام کو نمازِ مغرب کے بعد جناح ہال لاہور میں میری تازہ تالیف "استحکام پاکستان" کے حوالے سے انجمن خدام القرآن کے سالانہ محاضرات کا سلسلہ بھی جاری رہا - جن میں ہر طبقہ خیال کے نامور دانشوروں، اساتذہ کرام علماء کرام

اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے اصحاب فکر و نظر نے اظہار خیال کیا۔ ۴، اپریل سے ۶ راپریل تک تنظیم کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا اور پھر اجتماع کے آخری دن انجمن خدام القرآن کے سالانہ اجلاس کے ساتھ یہ سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

مَیں اپنی اور اپنے رفقاء کی اس طوفانی کیفیت کا موازنہ اُس طوفان سے کرتا ہوں جو کل ہی اس لاہور میں بے نظیر کے استقبال اور جلسے کی صورت میں آ کو گزر گیا۔ اس طوفان کی وسعت اور اثر پذیری اور اُس کا عوامی رنگ بہت زیادہ ہے۔ جبکہ دوسرا طوفان وہ ہے جو صرف چند سو افراد کی زندگیوں میں آیا۔ لیکن اگر اللہ نے چاہا تو اُس کی شدت اور گیرائی پہلے طوفان کی نسبت بہت دُور رس ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں طوفان اس ملک کے مستقبل کے لئے خوش آئند ہیں۔ گذشتہ دس برس سے تنظیم اسلامی کے نام سے اور پندرہ برس سے انجمن خدام القرآن کے نام سے میں اور میرے رفقاء جو کام کر رہے ہیں وہ اس اعتبار سے بہت اُمید افزا ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے اب یہ دونوں قافلے چلتے ہوئے قافلے بن چکے ہیں۔ دونوں کا ایک وسیع حلقہ تعارف اور ایک محدود حلقہ اثر وجود میں آ چکا ہے ایسے مخلص افراد کی اچھی خاصی تعداد تیار ہو گئی ہے جنہوں نے اپنا جینا مرنا اس کام سے وابستہ کر لیا ہے۔ تاریخ انسانی کے بڑے بڑے واقعات کی ابتداء عموماً بہت معمولی اور غیر اہم انداز میں ہوتی ہے۔ میرے نزدیک یہ معاملہ بھی کم اہم نہیں ہے ہم نے جو بھی محنت کی ہے اُس کا ایک نتیجہ اللہ نے ہمیں دکھا دیا ہے جس کی وجہ سے اطمینان ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر توفیق دے گا اور اسی طور سے ہمارا کام آگے بڑھتا رہا تو ہماری یہ انقلابی جدوجہد اور یہ خدمت قرآنی اب بڑے وسیع پیمانے پر آگے بڑھے گی۔ جہاں تک دوسرے طوفان کا تعلق ہے اُسے بھی میں اس ملک کے مستقبل کے لئے بہت خوش آئند قرار دے رہا ہوں۔ مس بے نظیر کا پاکستان آنا اور ان کا یہ استقبال ایک بہت بڑا واقعہ ہے ہزاروں لاکھوں افراد بڑے طویل سفر کر کے ان کے استقبال کے لئے آئے۔ پاکستان کی تاریخ میں بے نظیر کے استقبال کا یہ دن ایک سنگ میل کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔ پھر یہ کہ اُس روز جمعیت علمائے پاکستان کا

ایک جلسہ اسی شہر لاہور میں ہوا۔ یہ بات بھی بہت خوش آئند ہے کہ ایک ہی شہر میں دو جماعتوں کے دو جلسے ایک ہی دن اور ایک ہی وقت ہوئے لیکن کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا کوئی سٹریٹ لائٹ نہیں ٹوٹی۔ کسی قسم کی سرکاری غیر سرکاری املاک کو نقصان نہیں پہنچا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے امید پیدا ہوئی ہے کہ غالباً اللہ تعالیٰ اس ملک کے بارے میں کچھ وخیر، ہی کا ارادہ فرماتے ہوتے ہے اور انشاء اللہ بہتری کی صورت نکل آئے گی۔

گذشتہ نصف صدی میں برصغیر کے مسلمانوں کی سیاست جس میں پاکستان کے چالیس سالہ (قمری) دور کی سیاست بھی شامل ہے۔۔۔ نے اکثر و بیشتر تحریکوں کی شکل اختیار کی ہے لیکن اس سے منظم جماعتیں ابھر کر سامنے نہیں آئیں۔ بدقسمتی سے ایسی کوئی جماعت پیدا نہیں ہو سکی جس کے متعین نظریات ہوں، جس کی صفوں میں متوسلین جماعت کی فطری درجہ بندی (PARTY CADRE) ہو۔ اس معیار کے مطابق مسلم لیگ ایک جماعت نہیں بن سکی۔ مسلم لیگ بھی ایک تحریک تھی۔ ایک جذبہ ایک قائد۔ فوری طور مسلمانوں کی بقا کا مسئلہ سامنے آیا تھا۔ پوری مسلم قوم یہ سمجھ رہی تھی کہ ہندو ہمارے ساتھ انصاف نہیں کرے گا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد کانگرس کو مسلمانوں کے دل جیتنے کا ایک موقع ملا تھا لیکن انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے طرز عمل سے مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا کہ جب بھی ہندو اپنی اکثریت کے بل پر ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم کرے گا تو اس میں مسلمان کا بھلا نہیں ہو گا۔ اس احساس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ مگر حالات نے تحریک کے قائد بانی پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کو اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ کو بھی ٹھوس بنیادوں پر منظم کرتے۔ ایک طوفانی تحریک کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے پاکستان تو عطا کر دیا۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں باگ ڈور آئی اُن میں اکثریت اُن لوگوں کی تھی جو بالکل آخری وقت میں ہوا کا رُخ بدلنے کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ تحریک میں انہوں نے کوئی قربانی نہیں دی تھی جماعت کے ساتھ اُنکی وفاداریوں کا امتحان بھی نہیں ہوا تھا۔ ورنہ ایک مسلم لیگی رہنما کے بقول سے

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیئے   منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

تحریک قیام پاکستان کے دوران مسلمان کمیونسٹوں یعنی روسی لابی کی ایک اچھی خاصی تعداد بھی مسلم لیگ میں شامل ہوگئی تھی۔ اس ساری صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ پتاشے کی طرح گھل گئی اُس کے اکثر و بیشتر مخلص کارکن قیادت کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر مایوس ہوگئے۔ غریب کارکنوں کو محسوس ہوا کہ جس کے پاس دولت نہیں مسلم لیگ کی صفوں میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ سارا کمبل اب زمینداروں جاگیرداروں اور نودولتیوں کا رہ گیا ہے۔ پھر جوتیوں میں جو دال بٹی وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ لیکن صرف جوتیوں میں دال بٹتی تب بھی غنیمت تھی۔ انہوں نے جوتی کو ہی پھاڑ کر دم لیا بلکہ اُس کے ٹکڑے اڑا دیئے پہلے جناح لیگ برآمد ہوئی پھر عوامی لیگ نکل پھر دونوں کے گٹھ جوڑ سے جناح عوامی لیگ بنی۔ پھر بنتے بگڑتے وہی لوگ کبھی ری پبلکن پارٹی کے روپ میں سامنے آئے پھر وہی چہرے جنرل ایوب کے دور حکومت میں کنونشن لیگ کی زینت بنے اور پھر پیپلز پارٹی بھی انہی کی پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ کوئی تبدیلی ہوئی تو یہ کہ باپ کی جگہ بیٹے نے اور بھائی جگہ بھائی نے لے لی۔ پھر فوج نے بار بار مداخلت کرکے سیاسی عمل ہی روک دیا اور یہ بھی ایک طرح سے سیاستدانوں کی ہی ناکامی تھی ورنہ سیاستدانوں اگر با اصول با کردار اور جاندار ہوتے تو کسی فوجی کو مارشل لا لگانے کی ہمت نہ ہوتی۔

پھر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی قیادت میں عوامی دور آیا۔ انہوں نے سیاست کو جاگیرداروں کے ڈرائنگ روموں سے نکال کر عوام تک پہنچا دیا۔ بھٹو مرحوم ایک لحاظ سے پاکستان کی عزت اور پاکستان کے استقلال اور پاکستان کے وقار کا نشان بن کر سیاست کے افق پر اُبھرے اور چھا گئے۔ بھٹو نے وہ طوفان پیدا کیا کہ سیاست کے بڑے بڑے ستون گر گئے۔ اُن کا دوسرا بڑا کام یہ تھا کہ انہوں نے کسانوں اور مزدوروں کو عزت نفس دی انہیں یہ احساس دیا کہ ہم بھی انسان ہیں ہمارے بھی حقوق ہیں۔ سیاسی پہلو سے ہٹ کر ان کا تیسرا بڑا کارنامہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انہوں نے یہ کام مجبوراً کیا تھا تب بھی اس بات کا کریڈٹ تو انہیں جاتا ہے کہ انہوں نے عوامی دباؤ کو محسوس کیا اور اُس کے مطابق فیصلہ کرادیا ورنہ تین چار ہزار آدمیوں کو مروانے کے بعد بھی وہ یہ کام کر سکتے تھے۔ لیکن یہ کام انہوں نے

ایسے جمہوری اور قانونی طریقے سے کیا کہ اُس میں کوئی خلاء باقی نہیں رہا کسی کے لئے یہ کہنے کا موقع باقی نہیں چھوڑا گیا کہ اُس کا موقف سنے بغیر یکطرفہ فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ (یہ بات الگ ہے کہ جھوٹے نبی کی جھوٹی اُمت اپنی فطرت کے مطابق اب بھی یہ پروپیگنڈا کر رہی ہے کہ یہ فیصلہ ہمیں سنے بغیر کیا گیا ہے) لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ بھٹو صاحب اپنے ہی پیدا کئے ہوئے طوفان کو سنبھال نہ سکے۔ لہٰذا نتیجۃً اُس کے منفی اثرات برآمد ہوئے۔ حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ اُن میں طوفان کی قوت کو منظم کرنے اور اُسے مثبت کام میں صرف کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ چنانچہ مزدور اور کسان نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اور سیاست کی باگ ڈور خاص طور پر پنجاب میں جاگیرداروں کے ہاتھ سے نکل کر غنڈوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ان منفی نتائج کے ساتھ ساتھ بھٹو صاحب منظم جماعت تشکیل دینے میں ناکام رہے۔ بھٹو ازم آج بھی ایک نعرے اور تحریک کی شکل میں تو موجود ہے لیکن پیپلز پارٹی کا جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اُس کی کوکھ سے بھی مسلم لیگ کی طرح کنفیڈریشن والوں کا فرنٹ، مساوات پارٹی، پروگریسو پیپلز پارٹی، عوامی جمہوری محاذ، اور عوامی جمہوری پارٹی جنم لے چکی ہیں۔ خود پیپلز پارٹی کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔ مس بے نظیر بھٹو سے کھر صاحب اور جتوئی صاحب کے اختلافات اخبارات کے ذریعے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں اب ضرورت اس امر کی ہے کہ سیاست آئے اور شرافت آئے۔ اگر مس بے نظیر یہ کام کر سکیں تو بہت بڑا کام ہوگا۔ سیاست کا مزاج تو عوامی ہی ہونا چاہیے لیکن وہ سیاست چند اخلاقی اصولوں اور ضابطوں کے تابع ہو۔ سیاسی جماعتیں منظم ہوں لوگوں کی تربیت ہو، کارکن باہم مربوط ہوں، ہر جماعت کا مضبوط حلقہ اثر ہو، قیادت کے اندر فطری درجہ بندی ہو، اوپر آنے اور آگے بڑھنے کے لئے ایک دوسرے کی ٹانگیں نہ کھینچی جائیں، جماعت میں ایک اجتماعی قیادت موجود ہو۔ یہاں یہ فرق پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ تحریک کیلئے تو شخصی قیادت بہت ضروری ہوتی ہے لیکن سیاسی جماعتوں کو چلانے کے لئے اجتماعی قیادت درکار ہوتی ہے۔ قائد اعظم تحریک پاکستان کے قائد تھے اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آمرانہ مزاج رکھتے تھے لیکن یہ حقیقت نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیئے کہ اگر وہ محض جمہوری اصولوں کی پیروی کرتے تو تحریک نہیں چل سکتی تھی۔ لیکن سیاسی جماعتوں کے لیے ہر شعبہ زندگی سے اُبھر کر آنے والی اجتماعی قیادت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ سیاسی عمل جتنا تیزی سے آگے بڑھے گا۔ اجتماعی قیادت اتنی ہی تیزی سے اُبھر کر سامنے آئے گی۔ پیپلز

پارٹی کے اندر گروہ بندیاں اور گروپوں کا ٹکراؤ اسی سیاسی عمل کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ پیپلز پارٹی کی جڑیں عوام میں سب جماعتوں سے زیادہ ہیں اُس کا عوامی بیس (BASE) سب سے وسیع ہے اس لئے اس میں قیادت کے لئے رسہ کشی کا عمل بھی سب سے زیادہ اور سب سے پہلے سامنے آرہا ہے۔ پھر سیاسی عمل کی رفتار کے ساتھ ساتھ مختلف جماعتوں کے درمیان محاذ آرائی کا عمل بھی آگے بڑھے گا۔ نظریاتی بنیادوں پر، لسانی بنیادوں پر، علاقائی بنیادوں پر اور قومی بنیادوں پر جماعتوں کے اندر اور جماعتوں کے باہر اور جماعتوں کے درمیان رسہ کشی اور گروہ بندیاں ہوں گی۔ ایک پاکستان پر یقین رکھنے والی دائیں بازو کی جماعتیں ایک طرف ہو جائیں گی۔ علاقائی سوچ اور سوشلسٹ نظریات کی حامل جماعتیں دوسری طرف جمع ہو جائیں گی۔ لیکن اس عمل کے لئے کچھ وقت درکار ہوگا اور اس کی رفتار کا انحصار بہرحال سیاسی عمل کی رفتار اور پیش رفت کے ساتھ منسلک ہے۔ اس پہلو سے سیاسی عمل کا آغاز اور اس میں پیپلز پارٹی اور بے نظیر کو اپنا کردار ادا کرنے کی آزادی بہت حوصلہ افزاء اور خوش آئند ہیں۔

اس سے پہلے ریفرنڈم اور غیر جماعتی انتخابات کی صورت میں جو سیاسی عمل ہوا تھا اُس کے بارے میں میری رائے کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ صدر ضیاء الحق کا ریفرنڈم تو سو فیصد ایک فراڈ اور ایک دھوکا تھا۔ اُس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ۱۹۸۵ء کا الیکشن جس کے نتیجے میں موجودہ اسمبلی اور سول حکومت وجود میں آئی ہے وہ بھی دو اعتبار سے محل نظر ہے۔ اول تو یہ کہ اس میں ملک کے با اثر سیاسی حلقے شریک نہیں تھے جس کی وجہ سے اُن کے نتائج سے عوام کی صحیح نمائندگی اور رائے سامنے نہیں آئی۔ دوسرے خود صدر مملکت نے اپنے ہی نافذ کئے ہوئے انتخابی قوانین کے باوجود یہ کہہ کر کہ جس نے جتنا روپیہ خرچ کیا ہے اُس کا کسی سے حساب نہیں لیا جائے گا اُنکی اخلاقی حیثیت کو بھی مجروح کر دیا ہے۔ اس طرح گویا صدر صاحب نے اس بات کو جائز قرار دے دیا کہ لوگوں کے ایمان خریدے جائیں۔ میرے نزدیک ایمان اور ووٹ میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے "کہ جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہے"۔ اور امانت کا تعلق ایمان سے ہے جیسا کہ اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہے کہ "جو امانتدار نہیں اُس کا ایمان نہیں" اور "جس میں ایفائے عہد نہیں اُس کا دین نہیں" اس اعتبار سے ووٹ کا تعلق دین سے ہے۔ اب اگر ووٹ کھینچنے کے لئے دولت صرف کی جاتی

ہے تو یہ اصل میں لوگوں کے ایمان خریدنے والا معاملہ ہے۔ اس مکروہ فعل کو بھی قانونی حیثیت دے دی گئی تو سیاسی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے اِن انتخابات کا دیوالیہ نکل گیا۔ صرف ایک مثبت پہلو رہ جاتا ہے اور وہ صرف یہ کہ الیکشن کے وقت حکومت غیر جانبدار رہی۔ جو لوگ منتخب ہوئے اُن میں وہ بھی تھے جنہوں نے کروڑوں روپے خرچ کئے تھے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے ووٹ حاصل کئے تھے اس لئے میں نے اُس وقت اِس خیال کا اظہار کیا تھا کہ یہ لوگ ربڑ سٹمپ تو ثابت نہیں ہوں گے۔ کچھ نہ کچھ وہ موجودہ مارشل لا سے اور حکومت سے اختیارات کی کھینچ تان کریں گے کچھ یہ کہ جن لوگوں نے الیکشن میں حصّہ نہیں لیا وہ باہر سے زور لگائیں گے اس طریقے سے اُمید کی جا سکتی ہے اسمبلی کے اندر اور باہر دو طرفہ کوشش اور جدوجہد کے نتیجے میں سیاست کی گاڑی ایک تدریجی انداز سے اپنی پٹڑی پر واپس آ جائے اور اگر کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا نہ ہو تو ہم کسی دھماکہ خیز عمل سے بچ جائیں کیونکہ سیاسی عمل کے صحیح نہج پر نہ چلنے کے باعث حالات مخدوش رہتے ہیں اور ان حالات میں کوئی بات یقینی نہیں ہوتی اچھا نتیجہ بھی نکل سکتا ہے اور بُرا بھی۔ باہر سے مداخلت بھی ہو سکتی ہے اور ملک کسی نئے جرنیل کی مہم جوئی کا نشانہ بھی بن سکتا ہے۔

مِس بے نظیر کے پاکستان آنے سے آٹھ دس روز پہلے کے بیانات سے اور کل اُن کے استقبالی جلوس سے یہ اشارہ تو مل رہا ہے کہ فوری طور کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا یا حکومت کے لئے امن وامان کا مسئلہ پیدا کرنا ان کے پیش نظر نہیں ہے۔ اندازہ یہی ہے کہ سُپر پاورز سے بھی ان کی یہی مفاہمت ہوئی ہے کہ انہیں سیاست کرنے کا بھرپور موقعہ دیا جائے پھر عوام جس کے حق میں فیصلہ دیں اُسے حکومت کرنے کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ اور اگر یہ اندازہ درست ہے تو ملک و قوم کے حق میں بہت اچھا ہے۔ اگر دونوں سپر پاورز سے لائن کلیئر کا سگنل ملا ہے تب بھی بہت بہتر ہے۔ ایران کا بھی بالکل یہی معاملہ ہے دونوں بڑی طاقتوں کی کشمکش نے اُسے پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے۔ دونوں طاقتوں کے درمیان کش کش اور توازن نے ایرانیوں کو موقع دیا ہے کہ وہ کچھ کر کے دکھائیں۔ وہ کیا کر رہے ہیں یہ اس وقت ہمارا موضوع بحث نہیں۔

اسی طریقے سے اگر دونوں سپر پاورز کی کشمکش مس بے نظیر کو موقع دیتی ہے تو وہ صورتحال بھی پیش آ سکتی ہے جو غلیا ئن میں پیش آئی تھی لیکن ابھی معاملات کو واضح

ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ اصل میں مس بے نظیر کے سامنے اور پیپلز پارٹی کے تمام لیڈروں کے سامنے یہ چیلنج ہے کہ وہ ایک سیاسی جماعت وجود میں لا سکتے ہیں یا نہیں۔ جلسہ اور جلوس کی شکل میں اتنا بڑا! مظاہرہ کرنا فیصلہ کن بات نہیں۔ فیصلہ کن بات یہ ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو ایک منظم اور با اصول سیاسی جماعت بنا کر دکھائیں اور یہ بات صرف ایک جماعت کے لئے نہیں سب جماعتوں کے لئے ہے۔ اگر سیاسی عمل ان صحت مند خطوط پر قائم ہوتا ہے چلتا ہے تو یہ ملک کے لئے اور قوم کے لئے فال نیک ہے۔ میں ۸۲ء سے مسلسل کہہ رہا ہوں۔ اور میں نے صدر ضیاء صاحب کو اپنے خط میں بھی یہی بات لکھی تھی کہ سیاسی عمل کی گاڑی کو روکنا بہت خوفناک کام ہے۔ آپ نے اسلام کے نام پر اس کو روک رکھا ہے اور اسلام کا ذرہ برابر کام آپ نہیں کر رہے اسلام کا کام کرتے تو اُس کی برکات ظاہر ہوتیں۔ لیکن بدنصیبی قوم کی بھی اور صدر ضیاء الحق کی بھی کہ اللہ نے اُنہیں موقعہ دیا تھا، وہ عمر بن عبدالعزیز بھی بن سکتے تھے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل کر تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف سے لکھوا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ موقع ضائع کر دیا۔ آٹھ برس اُنہوں نے اسلام کی جڑیں کھودی ہیں اسلام کو کوئی تقویت نہیں پہنچائی۔ اب تو تاریخ میں اُن کا نام ایک بدنصیب اور ناکام حکمران کے طور پر لکھا جائے گا۔ اب تو اس ملک کی بقاء کا چیلنج سیاستدانوں کے سامنے ہے اگر وہ وقتی ہنگامہ آرائیوں سے دامن بچا کر اپنی جماعتوں کو جمہوری عمل کے لئے تیار کرتے ہیں عوام کی سیاسی تربیت کرتے ہیں اُن کے مسائل کا مطالعہ کر کے اپنے منشور پیش کرتے ہیں انتخابات منعقد ہوتے ہیں اور اقتدار عوام کے نمائندوں کو ملتا ہے تو قوم ایک فوری بحران سے بچ سکتی ہے۔ اسلام کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے۔ اگرچہ بدرجہ آخر اس ملک کی بقاء تو اسلام سے ہی وابستہ ہے لیکن فوری طور اس ملک کی بقاء کا تقاضا ہے کہ سیاسی بے اطمینانی کو ختم کیا جائے۔ ہمارے دشمنوں نے مشرقی پاکستان میں پائی جانے والی سیاسی بے اطمینانی کو استعمال کر کے ہی تو ملک توڑا تھا۔ اب پھر اُسی طرح کے احساسات چھوٹے صوبوں میں اور بالخصوص سندھ میں پلتے جاتے ہیں اور سندھ پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ ہے جس طرح بیمار کو جب شدید بخار ہو جائے تو طبیب بخار کے اصل اسباب کا علاج کرنے سے پہلے مریض کے درجہ حرارت کو معمول پر لانے کی کوشش کرتا ہے بالکل اسی طرح اب

سیاسی محرومیوں نے جو سرسامی کیفیت پیدا کر دی ہے اوّلاً اُس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ دیگر اسباب کا دیرپا علاج بعد میں ہوتا رہے گا۔ ایک بھرپور سیاسی عمل دراصل اس سرسامی کیفیت کا واحد علاج ہے۔ ورنہ اب بھی اس غیر یقینی کی صورتحال کو اپنے ناپاک عزائم کے لئے استعمال کرنے والے ملک کے اندر اور باہر موجود ہیں۔

اگرچہ جمعیت علمائے پاکستان کا موچی دروازے کا جلسہ بھی اپنی جگہ ایک کامیاب جلسہ تھا۔ جماعت اسلامی ملک بھر میں اسی قسم کے کامیاب جلسے کر رہی ہے پشاور میں جمعیت علمائے اسلام نے بہت بڑا جلسہ کیا ہے لیکن ایک بات سب کو سمجھ لینی چاہیئے کہ وہ تمام دینی جماعتیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ الیکشن کے ذریعے اسلام کے حق میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے تو انہیں متحد ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ ملک کے حالات میں اور ملک کے سیاسی اور قانونی ڈھانچے میں کوئی ایسی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی جسے اسلام کے حق میں مفید کہا جا سکے۔ لہٰذا اب بھی اگر انہوں نے پہلے کی طرح یہ سمجھا کہ وہ علیحدہ علیحدہ رہ کر کچھ حاصل کر لیں گے۔ تو ۷۰ء کے الیکشن کی طرح نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلے گا کہ مذہب کے نام پر ملنے والے ووٹوں کو تقسیم کر کے سیکولر جماعتوں کو فائدہ پہنچائیں۔

آثار بتا رہے ہیں کہ ۷۷ء میں الیکشن ہونگے۔ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ جو لوگ اسلام کو اور اس ملک کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں یا یہ کہ مسلمان ہونے کے حوالے سے اقامت دین کو ایمان کا تقاضا سمجھتے ہیں اور وہ انتخابی راستے کی افادیت کے قائل ہیں (میں نے بھی کبھی اُسے حرام نہیں کہا میں اس کو صرف تدبیر کے طور پر غلط سمجھتا ہوں) اُنہیں بہر صورت متحد ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ پہلے جو شکست ہوئی تھی اُس کے اثرات سے تو ہم کسی حد تک بچ گئے تھے لیکن اب سیکولرزم کے علمبرداروں کو فتح حاصل ہوئی تو اُس کے نتیجے میں اس ملک میں سیکولرزم کے لئے ایک نظام کی حیثیت میں مستحکم بنیادوں پر استوار ہونے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ جس کے نتیجے میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کو بحیثیتِ مجموعی ایک بڑا دھچکا لگنے کا اندیشہ ہے۔ اگر پیش آمدہ انتخابی معرکے میں تمام دینی قوتیں ایک سیاسی جماعت کے طور پر سامنے آئیں تو ان کی کامیابی کے امکانات روشن ہیں۔ پیپلز پارٹی سیکولر جماعت ہے۔ تحریک استقلال سیکولر جماعت ہے اور میں جناب اصغر خان کی صاف گوئی کا معترف

ہوں کہ انہوں نے اپنی سوچ کو کبھی چھپا کر نہیں رکھا۔ اُن کا موقف واضح ہے کہ یہ ملک اسلام کے لیئے نہیں مسلمانوں کے لئے بنا تھا اور یہ کہ سیاست سے مذہب کا کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ سیکولر جماعتیں ملکر یا ان میں سے کوئی بڑی جماعت انتخابات کے نتیجے میں ایک مستحکم سیاسی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر اسلامی تحریک کا کام بہت مشکل ہو جائے گا اور ان کی جدوجہد کا راستہ بہت طویل اور کٹھن ہو جائے گا۔

اس وقت دو ہی راستے ہیں پہلا راستہ یہ ہے کہ تمام اسلامی قوتیں انتخابی میدان کو چھوڑ کر ایک موثر پریشر گروپ کی صورت میں اکٹھی ہو جائیں اور بیٹھے کہ ہمیں حکومت نہیں مانگتی بلکہ ہر حکومت سے اسلام مانگنا ہے۔ لیکن یہ بات صرف میری خواہش کی حد تک ہے اس کے روبہ عمل آنے کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ دینی جماعتیں خاص طور پر جمعیت علمائے پاکستان جمعیت علمائے اسلام اور جماعتِ اسلامی جیسی بڑی جماعتیں اپنا سیاسی اتحاد بنا کر الیکشن لڑیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر پروفیسر مرزا منور صاحب کی بات سو فیصد درست ثابت ہوگی کہ " آئندہ الیکشن میں اسلام والوں کی شکست کا منظر دیدنی ہوگا۔" اس لئے میں بار بار پوری دلسوزی اور نصح و خیر خواہیوں سے یہی اپیل کرتا ہوں کہ خدا کے واسطے متحد ہو جاؤ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو اسلام کے لئے زیادہ مخلص ہے وہ پیچھے ہٹ جائے تاکہ کم از کم دیندار طبقے کے ووٹوں کی تقسیم کا عمل تو کم سے کم ہو جائے۔

لیکن جن لوگوں کی رائے یہ ہو کہ الیکشن کے راستے سے اسلام نہیں آسکتا اور یہ گاڑی جس راستے پر چل رہی ہے اُسے چلنے دیا جائے ہم تو انقلابی طریقے سے کام کریں گے۔ یعنی انقلابی جماعت ابتداء میں پریشر گروپ کی حیثیت سے کام کرے اور پھر جب اللہ تعالےٰ قوت دے تو منکرات کو اور تمام خلاف اسلام چیزوں یعنی سود کو سرمایہ داری کو جاگیرداری کو فحاشی کو چیلنج کرے کہ ہم اب اس صورت حال کو نہ گوارا کریں گے اور نہ کہیں چلنے دیں گے۔ یہ ملک اسلام کے لئے بنا تھا یہاں کے بسنے والے مسلمان ہیں اس لئے یہاں پر اُن کا دین اسلام ہی چلے گا اور پھر یہ کہ یہ ملک کیا یہ ساری زمین ہی اللہ کی ہے اس پر اللہ کا حکم جاری کرنا اللہ کے بندوں کا فرض ہے۔ لیکن اس کے

ئے پہلے انقلابی تیاری کی ضرورت ہے ۔ افراد کو تیار کرنے کی ضرورت ہے
ریکی انداز کی انقلابی جماعت تیار کرنے کی ضرورت ہے ۔ جو لوگ اس ضرورت کا شعور
اور ادراک رکھتے ہیں۔ ان کو میں دعوت دیتا ہوں کہ وہ تنظیم اسلامی میں آئیں ۔ میں
زشتہ بیس برس سے یہ کام کر رہا ہوں ۔ ۱۹۶۲ء میں میں نے انجمن خدام القرآن قائم
کی تھی جس کا مقصد قوم کے ذہین افراد میں سوچنے سمجھنے والے طبقے میں قرآنی فکر کو
بیدار کرنا تھا ۔ ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم کی جس کا مقصد عوام الناس میں بیداری
یمان اور توبہ کی ایک عمومی تحریک برپا کرنا ہے ۔ اس کے نتیجے میں انشاء اللہ
ہ انقلابی جماعت وجود میں آئیگی ۔ جو تمام گمراہیوں کو جڑ سے اکھاڑ کر اللہ کے دین کو
جاری کرے گی ۔ یہ کام آسان نہیں ہے ایک جمے جمائے تہذیبی ڈھانچے کو جس کی پشت
پر ایک پورا فکری سرمایہ ہے اکھاڑ کر پھینکنا ہے ۔ اس راہ میں مشکلات ہیں مصائب
ہیں خاقتے ہیں مگر کرنے کا کام یہی ہے ۔ اپنے دلوں کو ٹٹولیے اپنے سینوں کا جائزہ لیجیے ۔
مہلت عمر بہت کم ہے ۔ قدم آگے بڑھائیے ۔ جوانمردوں کے لئے میدان خالی ہے پھر
یہ کہ خالص رضائے الٰہی کے حصول کے لئے تن من دھن لگانے ہی میں فوز و فلاح ہے ۔
بالفرض دنیا میں عارضی ناکامی بھی ہوئی تو بھی انشاء اللہ آخرت میں ایسے لوگ سرخرو
ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سزاوار قرار پائیں گے ۔

۸۰ سال سے بے مثال
مشروب مشرق روح افزا
ہمدرد پاکستان
ADARTS-HRA-3/86

ع بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش!

فکرِ اقبال

کی روشنی میں

حالاتِ حاضرہ

اور

ہماری قومی ذمہ داریاں

خطاب بہ مجلسِ اقبال

الحمرا آڈیٹوریم —— ۲۱، اپریل ۸۶ء

از

اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

احمدہٗ و اصلی علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ٭ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رب اشرح لی صدری ○ و یسر لی امری ○ و احلل عقدۃ من لسانی ○

یفقھوا قولی ○

محترم و مکرّم صدرِ مجلس !

محترم اراکین و کارکنان مرکزیہ مجلسِ اقبال لاہور،

اور معزز خواتین و حضرات !

اگرچہ اس سے قبل بھی متعدد بار ع " بیا بہ مجلسِ اقبال دیک دو ساغر کش ! " کے مصداق مجلسِ اقبال میں شرکت و شمولیت کی سعادت حاصل ہو چکی ہے لیکن اس بار جس انداز میں اس بندۂ ناچیز کا اعزاز و اکرام فرمایا گیا ہے اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مناسب الفاظ واقعۃً میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا مجبوراً ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم کے الفاظ مستعار لے رہا ہوں کہ ع " ایک بندۂ عاصی کی ——— اور اتنی مدارتیں ! "

مجھے آج صبح ہی کی فلائٹ سے " شامِ الہدیٰ " کے مستقل پروگرام کے سلسلے کراچی روانہ ہو جانا تھا لیکن مجلس اقبال میں شرکت کی سعادت کے لئے یہ ادنیٰ سا تردد تو ہرگز کوئی قربانی نہیں کہ یہاں سے سیدھا ائیر پورٹ اور ائیر پورٹ سے سیدھا تاج محل ہوٹل کراچی پہنچوں ——— البتہ منتظمین مجلس کا یہ احسان عمر بھر یاد رہے گا کہ انہوں نے خاص طور پر میری شمولیت کے لئے مجلس کا آغاز اپنے طے شدہ پروگرام سے ایک گھنٹہ پہلے کیا ——— اس کے ساتھ ہی اپنی اس محرومی کا احساس بھی شدّت سے ہے کہ آج سے ڈیڑھ سال قبل کی ایک مجلس کی طرح آج بھی مجھے اپنی گفتگو ختم کرتے ہی آدابِ مجلس کے خلاف فوراً روانہ ہو جانا ہوگا اور اس طرح میں اپنے سے بدرجہا اعلم و افضل اصحابِ علم و فضل کے افکار و خیالات سے مستفید نہ ہو سکوں گا۔ بہر حال " مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ " کے مصداق جو میسر آگیا ہے غنیمت ہے !

بہت سے حضرات یقیناً اس پر حیران ہوں گے کہ " میں اپنی روایت کے یکسر خلاف، آج اپنے خیالات تحریری صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام معمول سے ہٹ کر اس بار " مجلسِ اقبال " کے لئے بھی ایک موضوع تجویز کر دیا گیا ہے یعنی " فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریاں " اور یہ موضوع اولاً خطیبانہ جوش سے زیادہ سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے ____ ثانیاً اس کا اندیشہ ہے کہ زبانی گفتگو کی رو داروی میں اس کا کوئی اہم گوشہ تشنہ رہ جائے! ____ پھر ایک خواہش یہ بھی ہے کہ یہ باتیں جلد از جلد وسیع پیمانے پر لوگوں کے سامنے لائی جائیں اور من و عن شائع ہوں لہٰذا " نۤ والقلم وما یسطرون ۔ " کے مطابق ذہن و لسان کے مابین قلم کو خیالات کی شیرازہ بندی کے ذریعے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

عنوان میں اختیار کردہ ترتیب سے ذرا سا ہٹ کر میں پہلے " حالاتِ حاضرہ " کے ضمن میں اپنا مشاہدہ اور تجزیہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

آج ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ ہم نے معمارِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کے اس اندیشے کے عین مطابق جو آن کے اس تاریخی جملے میں سامنے آتا ہے کہ :-

"GOD HAS GIVEN US A GOLDEN OPPORTUNITY TO PROVE OUR WORTH AS ARCHITECTS OF A NEW NATION AND LET IT NOT BE SAID THAT WE DIDN'T PROVE EQUAL TO THE TASK."

اپنی نااہلی اور عدم قابلیت کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے اُن کے قائم کردہ پاکستان کو تو آج سے لگ بھگ ساڑھے چودہ سال قبل دو لخت کرا لیا تھا ____ اب اندیشہ یہ ہے کہ مفکر و مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں جس پاکستان کا خواب "AN INDEPENDENT MUSLIM STATE" AT LEAST IN THE NORTH-WEST OF INDIA" کی صورت میں دیکھا تھا کہیں ہم اُسے بھی اپنی نااہلیوں کی بھینٹ نہ چڑھا دیں! اور اس طرح برصغیر پاک و ہند کی مسلم قوم کی نصف صدی سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی مساعی جمیلہ

اعمال کے حسرتناک انجام سے دوچار نہ ہو جائیں! ـــــــ اس لئے کہ ایک طرف ؎ " خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری! " کے مصداق تاحال " بے آئینی " ہی سرزمین پاکستان کا " آئین " ہے ۔ گویا قمری حساب سے اپنی قومی زندگی کے چالیسؔ سال پورے کر چکنے کے باوجود (واضح رہے کہ آنے والے ماہِ رمضان مبارک کی ستائیسویں کو بیالیسؔ سال پورے ہو جائیں گے!) ہم ؎

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت

کے مصداق سیاسی و دستوری اعتبار سے ہنوز " نابالغ " ہیں! ـــــــ تو دوسری طرف ـــــــ صاف نظر آتا ہے کہ ؎ " آہ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف " ـــــــ اور ؎ " چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ ۔ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں! "

کے مصداق اس قافلے کی کوئی منزل معین ہے ہی نہیں! اور یہ ' ہجوم مومنین ' بے مقصدیت کے صحرائے تیہ میں بالکل اس شان سے بھٹک رہا ہے کہ ؎ کس طرف جاؤں، کدھر دیکھوں، کسے آواز دوں ـــــ اے ہجومِ ناامیدی دل بہت گھبرائے ہے!

چنانچہ اغیار طعنے دے رہے ہیں اور پھبتیاں چُست کر رہے ہیں، مبصرین اور تجزیہ نگار انتشار (DISINTEGRATION) اور حصے بخرے ہو جانے (BALKANISATION) کی پیشگوئیاں کر رہے ہیں اور دشمن گھات میں ہیں کہ کب آخری ضرب لگانے کا بہترین موقع ہاتھ آئے اور ؎ " خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود " کے مصداق عصرِ حاضر کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ختم کر دیا جائے!

گویا ' نظر بظاہر ' یوں محسوس ہوتا ہے کہ ؎

اسکی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز ـــــ جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

پاکستان کی فضا پر متذکرہ بالا عمومی تشویش اور بددلی و مایوسی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں ان کے درمیان سے جھانک کر واقعات کی دُنیا میں " حالاتِ حاضرہ " کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا مشاہدہ کیا جائے تو صورتِ حال کچھ یوں نظر آتی ہے کہ: ایک جانب سیاچین گلیشیر ہمارے ہاتھ سے جا چکا ہے، اور کشمیر کی کنٹرول لائن

اُسے دن کی بھارتی جارحیت سے خون آلودہ ہوتی رہتی ہے ۔ پھر کشمیر کے علاوہ ہماری حساس ترین سرحد سے ملحق بھارتی پنجاب شدید خلفشار اور عدم استحکام کا شکار ہے اور اس کے ضمن میں کوئی دن نہیں جاتا جب بھارتی زعماء میں سے کوئی نہ کوئی ہمیں موردِ الزام نہ ٹھہراتا ہو۔ نتیجتاً پاکستان سے بھارت کی پیدائشی دشمنی اور مستقل نفسیاتی اور واقعاتی آویزش پر مستزاد یہ فوری اور شدید اندیشہ سر پر منڈلا رہا ہے کہ کسی بھی وقت اپنے اندرونی خلفشار کے باعث جھنجھلا کر بھارت کسی بڑی جارحیت کا ارتکاب نہ کر گذرے!

دوسری جانب افغانستان کی صورتِ حال اور اُس کے داخلی نظریاتی تصادم پر مستزاد روس کی ننگی اور براہ راست مداخلت اور امریکہ کی قدرے ڈھکی چھپی اور بالواسطہ دخل اندازی نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے لئے شدید مسائل اور خطرات پیدا کر رکھے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان، افغانستان اور رُوسی ترکستان کے پورے علاقے کی قسمت کو گویا ایک معلق ترازو سے وابستہ کر دیا ہے ۔ چنانچہ جہاں اس کی بھی اُمید ہے کہ ایک مردِ درویش کے لگ بھگ پون صدی قبل کے الفاظ کہ ؎

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو ۔۔۔ لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند!

حقیقت و واقعیت کا روپ دھارلیں اور یہ خطہ ایک وحدت کی صورت اختیار کر کے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز بن جائے، وہاں یہ خطرہ بھی حقیقی اور واقعی ہے کہ سائبیریا کا برفانی ریچھ بحیرۂ عرب کے گرم پانی میں غوطہ لگانے کے لئے آخری دوڑ کا آغاز کر دے اور 'خاکم بدہن' پاکستان بھی اُس کی عریاں جارحیت کا نشانہ بن جائے!

داخلی محاذ پر ـــــــ پاکستان کی ماں اور معمارِ پاکستان اور مصورِ و مفکرِ پاکستان دونوں کی مشترک وراثت مسلم لیگ جوان دونوں کے منظرِ عام پر آنے سے قبل واقعتہً صرف نوابوں اور نواب زادوں' اور وڈیروں اور جاگیرداروں کی جماعت تھی البتہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر گئی تھی عرصہ ہوا کہ "ع ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے!" کی مصداقِ کامل بن چکی ہے ۔ اور حال ہی میں سرکاری و درباری ذرائع سے اُس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کی جو کوشش ہوئی ہے بعد غیر جماعتی انتخابات میں

اپنے ذاتی وسائل اور محض زمینداری یا سرمایہ داری کے بل پر کامیاب ہونے والوں کی پیشانی پر اس کا لیبل چسپاں کر کے ایک نام سے فائدہ اٹھانے کی جو کوشش کی گئی ہے کون نہیں جانتا کہ اُس کا حاصل کچھ نہیں اور کم از کم عوام کی سطح پہ اُس کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ حیثیت۔

اس طرح بظاہر موجود لیکن حقیقتاً کالعدم مسلم لیگ، سے قطع نظر ——— قومی سیاست کے میدان میں انتہائی بائیں جانب ہیں وہ اشخاص اور گروہ جن کی پاکستان کو توڑ دینے کی خواہش اب ڈھکی چھپی نہیں رہی بلکہ ببانگ دہل سامنے آچکی ہے۔ ان میں شخصیات کی سطح پر تو اہم نام صرف خان عبدالغفار خاں اور جناب جی ایم سید کے ہیں البتہ چھوٹی بڑی جماعتیں یا گروہ نصف درجن بلکہ اس سے بھی زائد ہیں جن میں اہم ترنام این ڈی پی' پی این پی' اور سندھی بلوچی پختون متحدہ محاذ کے ہیں! ——— تاہم غنیمت ہے کہ ابھی ان سب کا دائرہ اثر صرف چھوٹے صوبوں تک محدود ہے اور پنجاب کی حد تک اس کی صرف ایک خفیف سی صدائے بازگشت جناب حنیف رامے کی صورت میں سامنے آئی ہے!

دوسری انتہا پر ہیں بعض نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتیں، جن کی اکثریت واضح طور پر دائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں بھی قابل ذکر تو تین ہی ہیں یعنی جے یو آئی' جے یو پی اور جماعتِ اسلامی تاہم دوسری نسبتاً چھوٹی جماعتوں اور بڑی جماعتوں کے متحارب دھڑوں کو بھی شمار کیا جائے تو تقریباً وہی بائیں بازو والی تعداد بن جاتی ہے ——— یہ جماعتیں اگرچہ پاکستان کے بقا و استحکام کی بھی دل سے خواہش مند ہیں اور اس میں اسلام کے نفاذ کی بھی داعی ہیں لیکن اوّلاً اس بنا پر کہ ان کا دائرہ اثر بہت محدود بھی ہے اور ملک کے طول و عرض میں مختصر ٹکڑوں ——— (SMALL POCKETS) کی صورت میں منتشر بھی' اور ثانیاً اس بنا پر کہ پاکستان اور اسلام دونوں کی محبت اور وفاداری کی عظیم قدر مشترک کے باوجود اُن کی باہمی آویزش بلکہ چپقلش ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئی ہے' وہ کوئی فیصلہ کن

کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نظر نہیں آتیں!

ان دو انتہاؤں کے مابین واقعہ یہ ہے کہ قومی اور عوامی سیاست کا اصل دھارا سیکولر ڈیماکریسی یا سوشل ڈیماکریسی کے رُخ پر بہہ رہا ہے جس میں یوں تو جماعتی اور تنظیمی سطح پر دو نام سامنے آتے ہیں یعنی ایک پاکستان پیپلز پارٹی کا اور دوسرا تحریک استقلال کا ــــ لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ عظیم دھارا اصلاً کچھ چھوٹی اور بڑی، اور نئی اور پرانی شخصیتوں اور ان کے مداحوں اور حامیوں، اور عاشقوں اور جان نثاروں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی سر توڑ کوششوں میں معروف ہیں اور سر دست یہ کہنا مشکل ہے کہ اس عظیم لہر پر سواری کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے ــــ گویا

دیکھئے! اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

اسی درمیانی دھارے میں ایک طوفانی لہر حال ہی میں آنسہ بے نظیر بھٹو کی اپنی اختیاری جلا وطنی کو ختم کر کے پاکستان واپسی ــــ اور شہرا قبال لاہور میں ورود ــــ اور اس موقع پر ان کے بے مثال اور صد درجہ والہانہ استقبال، اور پھر پاکستان کے دلِ پنجاب، اور اس کے بھی اصل قلب یعنی لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور فیصل آباد وغیرہ کے اضلاع میں اُن کے شاندار اور والہانہ خیر مقدم اور عظیم الشان جلسوں اور جلوسوں کی صورت میں اٹھی ہے جس نے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے کسی بھی درجہ میں بہرہ ور ہر پاکستانی مسلمان کو نہ صرف یہ کہ ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے بلکہ ملک و ملت کے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور غالباً یہ بھی اسی کا شاخسانہ ہے کہ 'مجلس اقبال' بھی جو ایک خالص روایتی اور ثقافتی ادارہ بن چکی تھی دو فکر اقبال کی روشنی میں حالات حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریوں کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔

ہماری قومی اور عوامی سیاست کے اصل اور عظیم تر درمیانی دھارے میں جو طوفانی

بہر حال یہ بھی میں مانتا ہوں کہ اس کے ضمن میں یہ بات بھی بالکل غلط نہیں ہے کہ یہ کسی حد تک آٹھ نو سال کے سیاسی حبس کا ردِ عمل ہے۔ اور اس بات میں بھی یقیناً کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے کہ حالیہ طوفانی کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی، گویا ع "چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائے گی!" —— لیکن اس قسم کے جملہ عوامل کا حصّہ منہا کرنے کے بعد بھی اس کیفیت (PHENOMENON) کی اہمیت ہرگز کم نہیں ہوتی اور اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے کہ اس کے اصل عوامل کیا ہیں، اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اس کے ضمن میں ملک و ملّت کے مخلصوں اور بہی خواہوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے —— اس لئے کہ جہاں یہ اندیشہ موجود ہے کہ اس طوفانی لہر کے جوش کو ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر اس پر سوار قائدین بے قابو ہو جائیں اور جھنجلاہٹ میں کوئی غلط اقدام کر بیٹھیں، وہاں اس کے سرکاری یا غیر سرکاری مخالفین کا غلط طرزِ عمل اور MIS HANDLING بھی نہایت خوفناک نتائج پیدا کر سکتی ہے —— جس کا ایک تجربہ ہم پندرہ سال قبل مشرقی پاکستان کے معاملے میں کر چکے ہیں!

میں جب علامہ اقبال کے فکر کی روشنی میں عوامی سیاست کے اس درمیانی دھارے اور اس کی موجودہ طوفانی لہر کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے بعینہٖ وہی صورت نظر آتی ہے جو حضرت علامہ نے اُس تہذیبِ حاضر کے تجزیے کے ضمن میں پیش فرمائی ہے جو اپنے آغاز کے اعتبار سے تو یقیناً مغربی اور یورپی تھی لیکن اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے دیکھتے ہی دیکھتے عالمی اور آفاقی بن گئی تھی اور اس وقت پورے کرۂ ارضی کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے —— اور جس کی خودکشی کی خبر بھی علامہ مرحوم نے اب سے لگ بھگ پون صدی قبل دی تھی کہ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ حضرت علامہ کے نزدیک اس تہذیب کے اصل اجزائے ترکیبی

دو ہیں: ایک اس کی اصل ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی صلابت اس کے قیام و بقا کی اصل اساس ہے، خطبات میں حضرت علامہ نے اسے 'INNER CORE' سے تعبیر فرمایا ہے ـــــ اور اسے خالص قرآنی الاصل گویا صدفی صد اسلامی قرار دیا ہے ۔ یعنی الفاظِ قرآنی: " وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۚ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا " (بنی اسرائیل: ۳۶) کے مطابق یہ طرز اور روش کہ اپنے موقف کی بنیاد نہ توہمات پر قائم کی جائے نہ نرے ہوائی تخیلات پہ بلکہ مشاہدات و تجربات اور ان پر مبنی ٹھوس استدلال پر قائم کی جائے ۔ حضرت علامہ کی یہ رائے نہایت صائب اور بدرجہ اہم ہے اس لئے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہی قرآنی ہدایت و رہنمائی تھی جس نے ایک جانب مظاہر قدرت کو آیاتِ الٰہیہ کا تقدس عطا فرمایا[1] اور انسان کو کتابِ فطرت کے سائنٹیفک مطالعے اور مشاہدے کی جانب متوجہ کیا[2] اور دوسری جانب منطق کو استخراج کی تنگنائیوں سے نکال کر استقراء کی وسعتوں اور پہنائیوں سے روشناس کرایا ـــــ اور اس طرح جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے لئے میدان ہموار کیا ۔ چنانچہ یہی چیز یورپ میں تحریک احیاء علوم کی بنیاد بنی جس کے نتیجے میں یورپی اقوام اوجِ ثریا پر پہنچیں اور یہ صورت پیدا ہوئی کہ: ـ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ۔۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

حضرت علامہ کی یہ ژرف نگاہی بجائے خود جس عظمت کی مظہر ہے اُس سے قطع نظر میرے لئے اس کی قدر و قیمت کا ایک اضافی پہلو یہ ہے کہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اہم قول کی عظمت و صداقت مبرہن ہوتی ہے جو صحیح مسلمؒ میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ " اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ " "اللہ تعالےٰ اسی کتاب (قرآن) کے ذریعے قوموں کو ابھارے گا اور اسی کے اثر کرنے کے، باعث قوموں کو گرائے گا! " گویا مغربی تہذیب بھی جو اُبھری تو یقیناً قرآن ہی کی ہدایت و رہنمائی کے ایک اہم جزو کے سہارے ابھری! اور مسلمان گرے تو اسی سبب سے گرے

---

[1] سورۃ بقرہ: آیت ۱۶۴ [2] سورۃ غاشیہ آیات ۱۷ تا ۲۰

کہ انہوں نے قرآن کی اس ہدایت سے یورپ کو روشناس کرانے کے بعد خود اُسے ترک کر دیا گویا ۔ وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اور خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

اے چوں شبنم بر زمین افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ

۲۔ تہذیبِ حاضر کا دوسرا جزو اُس کے کچھ خارجی مظاہر ہیں جنہیں خطبات میں تو حضرت علامہ نے صرف ایک لفظ ——— 'DAZZLING EXTERIOR'، سے تعبیر فرمایا ہے لیکن اشعارِ اقبالؔ کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مظاہر خارجی کے بھی دو رُخ ہیں جنہیں کہیں تو حضرتِ علامہ " چہرہ روشن ، اندروں چنگیز سے تاریک تر " کے الفاظ سے تعبیر فرماتے ہیں ، کہیں ان کی نشاندہی بحر " طبِ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آوری " الفاظ کے ذریعے کرتے ہیں ——— اور اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ بھرپور انداز یہ ہے کہ ؎

" نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

تہذیبِ حاضر کے ان بظاہر حسین و خوشنما اور دلکش و مرعوب کُن مظاہر خارجی میں سے مثلاً ایک حریتِ فکر ہے جس کے پردے میں یا بالفاظِ دیگر الحاد ہے یا لاادریت وارتیابیت' ——— اور ان دونوں کا حاصل ہے یا عریاں لامذہبیت یا کم از کم محدود مذہبیت کے پردے میں لپٹی ہوئی لادینیت ! ——— گویا ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ !

دوسرے حریتِ عمل ہے جس کی شکر والی تہہ کے نیچے مضمر ہے اباحیت اور آوارگی کا زہر ، جس نے اخلاق و کردار اور شرافت و انسانیت کا دیوالہ نکال دیا ہے ، تیسرے نمبر پر ہے حریتِ نسواں اور نظریۂ مساواتِ مرد و زن جس نے مرد کو 'نامرد' اور زن کو 'نازن' بنا کر رکھ دیا اور دونوں کو تماشائی و ہرجائی بنا کر خاندان کے مقدس ادارے کی چولیں ہلا کر رکھ دیں ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

" فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

الامان ! کیا یہی ہے معاشرت کا کمال ؟ مرد بے کار و زن تہی آغوش !

اسی طرح سے "خشت اوّل چوں نہد معمار کج - تا ثریا می رود دیوار کج"
کے مصداق اجتماعیات انسانیہ کے ضمن میں تہذیب مغرب نے سیاسی و معاشی مساوات
کے حسین عنوانوں سے انسان کو اوّلاً لادینی جمہوریت (SECULAR DEMOCRACY)
کا تحفہ دیا جو "چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر" کا مصداقِ کامل ہے۔ اسلئے
کہ اس کے ذریعے حقیقتاً سرمایہ داروں کی بدترین آمریت عوام پر مسلط ہو گئی ہے

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب - تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اور اس کے بعد اِس نہلے پر دہلا بے خدا اشتراکیت کا مارا جس نے انسان سے اُسکی
آزادی کو کلیتہً سلب کر کے اُسے ایک مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دیا - فاعتبروا

آگے بڑھنے سے قبل، اس مقام پر دو امور کی وضاحت مناسب ہے :

ایکؔ یہ کہ تہذیب جدید کے اس المیّے کا اصل سبب سورۂ بقرہ کے چوتھے رکوع کی
روشنی میں ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اُس "عِلمُ الاَسماء"
پر تو پوری توجہ صرف کی جو ابتدائے آفرینش ہی میں حضرت آدم کی سرشت میں ودیعت
کر دیا گیا تھا اور جس نے تاریخ انسانی کے دوران مسلسل بروز و ظہور اور صعود و
ارتقار کے ذریعے "علم الاشیار" اور "علم الخواص" کے راستے سے سائنس اور
ٹیکنالوجی کی صورت اختیار کی ——— لیکن اُس علم وحی سے یکسر منہ موڑ لیا جسے قرآن
"ھدایت" فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ہ سے تعبیر کرتا ہے ۔ نتیجۃً اس نے اُس "دجّال"
کی صورت اختیار کر لی جس کی ایک آنکھ بند ہے اور جس کی پیشانی پر جلی حروف میں
"ک ف ر" لکھا ہوا ہے - چنانچہ اب یہ یک چشم عفریت نوع انسانی ہی نہیں
ہر قسم کی حیاتِ ارضی کی کلّی تباہی پر تُلا کھڑا ہے - !

دوسرؔے یہ کہ عالم اسلام میں اس تہذیب کے ضمن میں یہ متوازن نقطۂ نظر،
میری محدود معلومات کی حد تک سوائے علامہ اقبال مرحوم کے اور کسی کے یہاں نظر
نہیں آتا، اور اُن کے بعد اُن کی شمع سے اپنے چراغ روشن کرنے والوں میں بھی کم از کم

اپنی محدود بصارت و بصیرت کی حد تک مجھے صرف ایک شخصیت ایسی نظر آتی ہے جس کے فکر میں اس توازن کا عکس کامل موجود ہے اور وہ ہیں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم و مغفور! —— ورنہ اکثر و بیشتر افراد و اشخاص کی حد تک بھی یا حیرانی و سرگردانی نظر آتی ہے، یا انتہا پسندی اور یک رُخا پن! —— اور بحیثیت مجموعی بھی ملت کے دو اہم طبقات نے متضاد طرزِ عمل اختیار کیا۔ چنانچہ ایک طرف علماء کرام کی اکثریت نے اس تہذیب کو بالکلیہ رد کر دیا۔ نتیجۃً اس کے اُس 'INNER CORE' سے بھی محرومی اختیار کر لی جو اصلاً خالص قرآنی اور اسلامی تھا۔ اور وہ صرف آسمانی ہدایت کے امین بن کر قال اللہ اور قال الرسولؐ کے حصار میں محصور ہو کر رہ گئے! —— اور دوسری جانب قوم کی عظیم اکثریت نے تہذیبِ مغرب کو مِن وعن قبول کر لیا۔ نتیجۃً اس کے 'INNER CORE' کے ساتھ ساتھ اُس کی چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے پیدا شدہ "صناعی" کو بھی ایک شکست خوردہ اور مرعوب ذہنیت کے ساتھ جوں کا توں قبول کر لیا۔ نتیجہ وہ نکلا جسے کسی صاحبِ درد نے یوں بیان کیا کہ ؎

یُں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے
نئی تہذیب کی بے رُوح بہاروں کے عوض اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے!

اور اس ضمن میں بھی اللہ رحمتیں نازل فرمائے اپنے اس بندۂ قلندر پر جس نے کمالِ فن کا ثبوت دیا جب ملت کے ان دو اہم طبقات کے تضادِ عمل کو یوں واضح کیا کہ ؎

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون؟

فکرِ اقبال کی اس روشنی میں پاکستان کی عوامی سیاست کے بڑے اور درمیانے دھارے اور اُس کی حالیہ "مہیب" لہر کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے بھی دو جزو سامنے آتے ہیں، چنانچہ اس کا بھی ایک "INNER CORE" ہے جو نہ غیر اسلامی ہے نہ غیر قرآنی، اور نہ افکار و نظریاتِ اقبال کے منافی ہے، نہ تصوراتِ

قائد اعظم کی تنقیص بلکہ عین قرآنی اور اسلامی بھی ہے اور پاکستان کے مصوّر و مفکر اور مؤسّس و معمار دونوں کے خیالات کے مطابق بھی اور اسی میں اس دھارے کی مقبولیت اور اس کی قوت و شوکت کا راز مضمر ہے۔ البتہ دوسرا جزو جو بجائے خود نہایت اہم ہے بے خدا بھی ہے اور بے دین بھی اور خالص مُشرکانہ بھی ہے اور ملحدانہ بھی! اور یہ نہایت اہم اور لازمی ہے کہ ان دونوں اجزاء کو علٰحدہ علٰحدہ پہچان لیا جائے اور دونوں کے ساتھ ایک طرزِ عمل اختیار کرنے کی بجائے علٰحدہ علٰحدہ رویّہ اختیار کیا جائے!

اس دھارے اور لہر کی "INNER CORE" کے اجزاءِ ترکیبی میں سے اوّلین جزو ہے "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ ... الآیہ" کے مطابق انسان کا محض انسان ہونے کے ناطے اعزاز و اکرام اور تشریف و تکریم، اور رنگ و نسل، مال و منال، اور عہدے، پیشے یا جنس کی بنیاد پر انسانوں کے مابین اعلیٰ و ادنیٰ، شریف و رذیل، اور اونچ اور نیچ کے جملہ امتیازات کا مکمل خاتمہ اور انسانوں کے مابین اس سماجی و معاشرتی سطح پر کامل مساوات! بفحوائے الفاظ قرآنی:

"یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکرٍ وَّ انثٰی وجعلنٰکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ط ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم" (الحجرات: ۱۳) اور بقول اقبالؔ

کُلُّ مومن اخوۃٌ اندر دلش | حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ! | در نہادِ او مساوات آمدہ!

ان امتیازات کا کلّی خاتمہ اور کامل انسانی مساوات کا بالفعل قیام رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طرّہ امتیاز ہے جس کے سامنے ایچ جی ویلز جیسے دشمنِ اسلام اور شاتمِ رسولؐ بھی اپنے آپ کو سر جھکانے پر مجبور پاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہی وہ چیز ہے جو موجودہ نام نہاد مسلمان معاشرے میں ناپید ہو چکی ہے، اس ضمن میں علامہ اقبالؔ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ ؎ "یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو، ۔ تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!" ۔۔۔۔ میں اُن کی رُوح سے معذرت کے ساتھ اس میں یہ اضافہ کر دوں گا کہ ؏ "تم سبھی کچھ ہو مگر سوچو کہ 'انسان' بھی ہو!"

اس 'INNER CORE' کا دوسرا اہم جزو ہے انسان کے بنیادی عمرانی حقوق یعنی ——— CIVIL RIGHTS) اور ان کے ضمن میں کامل سیاسی و قانونی مساوات (جس سے "تمیز بندہ و آقا" کا مکمل خاتمہ ہو جائے اور نہ کوئی قوم کسی دوسری قوم پر حکمران ہو، نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقے پر برتری کا حامل ہو اور نہ ہی کوئی علاقہ دوسرے علاقے پر بالادستی کا حق جتائے! بلکہ نوع انسانی "وکونوا عبادَاللهِ اخواناً" (الحدیث، پر عمل پیرا ہو جائے (ترجمہ): تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ!) ——— حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتِ اقدس اور جسمِ اطہر کو بھی قصاص کے لئے پیش فرما کر، حضرت عمرؓ نے بھرے مجمع میں احتساب پر برافروختہ نہ ہو کر بلکہ بالفعل جوابدہی فرما کر اور حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں عدالت میں ایک عام مدعی کی حیثیت سے پیش ہو کر اور اپنے دعوے کے اخراج پر کبیدہ خاطر نہ ہو کر جو اعلیٰ و روشن اور سابدی و لازوال مثالیں قائم کیں تھی وہ آج متفق علیہ اقدار کی حیثیت سے انسان کے اجتماعی ضمیر کا جزو لاینفک بن چکی ہیں اور عہد حاضر کا انسان ان کو ACHIEVE اور REALISE کرنے کے لئے علامہ اقبال کے ان پرشکوہ الفاظ کے مطابق ہاتھ پاؤں مار رہا ہے کہ

ہر کجا بینی جہان رنگ و بو ——— زانکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست ——— یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است!

لیکن چونکہ وہ نور نبوت سے براہ راست استفادہ کرنے پر آمادہ نہیں لہٰذا افراط و تفریط کے دھکوں کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ——— تاہم کون نہیں جانتا کہ آج ان اقدار عالیہ سے سب سے بڑھ کر محروم اور سب سے زیادہ تہی دست و تہی دامن وہ ہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں ——— اور اسی کا ردعمل ہے جو ہماری سیاست کے موجودہ ابھار کی اساس بنا ہے!

اس 'INNER CORE' کا تیسرا لیکن اہم ترین جزو ہے معاشی عدل و انصاف اور کم از کم مواقع کی حد تک کامل مساوات اور ہر نوع کے اقتصادی استحصال

اور "سرمایہ داری" کی لعنت کا مکمل خاتمہ اور ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا ذمّہ! —— یہ تمام باتیں وہ ہیں جو تمام جہانوں کے پروردگار نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمائیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے حواریین و خلفاءِ راشدین رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین نے بالفعل کر کے دکھائیں۔ چنانچہ "کَیْلَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ" کے مطابق دولت کی منصفانہ تقسیم اسلام کے معاشی نظام کا اصل الاصول ہے اور "وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا" کے مطابق حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ: اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کُتّا بھی پیاسا مر جائے تو اس کے لئے اللہ کے یہاں عمرؓ ذمّہ دار ہوگا!" اسلام کے اقتصادی مقاصد کے ضمن میں POLICY STATEMENT کی حیثیت رکھتا ہے جسے اقبالؔ نے یوں تعبیر فرمایا کہ:-

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس ؎ نقطۂ شرعِ مبیں این است و بس!

اور ؎ آب و نانِ ماست از یک مائدہ دُودۂ آدم "کنفسٍ واحدۃٍ"

لیکن افسوس کہ جب مسلمانوں کے دورِ زوال میں اس پر ملوکیت کے ساتھ ساتھ جاگیرداری اور سرمایہ داری کی چھاپ پڑ گئی تو اسلام اور قرآن کے رُخِ روشن کی یہ جہاں تابیاں نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں وہ صورت بن گئی جس کا نقشہ حضرت علامہ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

نتیجۃً —— قوم کی عظیم اکثریت تو اقبال کے اس شعر کا مصداق کامل بن ہی چکی ہے کہ ؎

ہیچ خیر از مردک زر کش مجو "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا"

"خود مذہبیت" کی بھی اکثر و بیشتر صرف یہ مسخ شدہ صورت (PERVERTED FORM) باقی رہ گئی ہے کہ ہر قسم کے حرام و حلال ذرائع سے دولت سمیٹو البتہ کچھ صدقہ و خیرات لے لُٹاتے بھی جاری رکھو۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے سُود دے کر اس میں سے زکوٰۃ وصول کر لینے کا تماشا تو حال ہی میں ہوا ہے:- "سُود لو اور اس میں سے زکوٰۃ دے دو"

پر تو ہمارے مذہبی مزاج کے سرمایہ دار بزرگ بہت پہلے سے عمل پیرا ہیں۔
اس سلسلے میں نقد کے ضمن میں ربا النسیئہ' اور ربا الفضل' کی جو بے شمار صورتیں سرکاری و غیر سرکاری سطح پر ہماری پوری تجارت و صنعت اور ریاست کی سطح پر دفاع و ترقی کی جملہ سکیموں میں رچی بسی ہوئی ہیں اُن کا ذکر تو تحصیلِ حاصل ہے، اگر چہ حضرتِ علامہ کے یہ دو اشعار نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ

از ربا آخر چہ می زاید ؟ فتن ! کس نداند لذتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ ، دل چوں خشت و سنگ آدمی درندہ بے دندان و چنگ !

تاہم زمین کے سُود' کا ذکر ضروری ہے۔ اس لیے کہ اُس کے ضمن میں مذہبی سطح پر تو مغالطے موجود ہیں ہی شیدائیانِ اقبال کا ذہن بھی صاف نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ان اشعار کو تو لہک لہک کر پڑھتے ہیں کہ:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا، فکر و عمل کا انقلاب بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اور ــ دِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

اور ــ رزق خود را از زمیں بردن رواست ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خدا است!

لیکن غالباً انہوں نے قرآن کی اس تعلیم اور اقبال کی اس تبیین کو صرف اخلاقی وعظ کے خانے میں رکھا ہوا ہے' اور یہ نہیں جانتے کہ زمین کے سلسلے میں یہ اسلام کے قانونی و فقہی نظام کی اہم اساس ہے! چنانچہ امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام دار الہجرت مالکؒ دونوں کا متفقہ فتویٰ ہے کہ مزارعت مطلقاً حرام ہے اور اقبال کا یہ فرمانا محض شاعری[1] نہیں ہے کہ (مرا یاراں غزل خوانے شمردند)

خدا آں ملتے را سروری داد کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت
بہ آں قومے سروکارے ندارد کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

چنانچہ سماجی، سیاسی اور معاشی جملہ سطحوں پر تمام ناانصافیوں اور ناہمواریوں کا خاتمہ کر کے دینِ حق کے کامل نظامِ عدل و قسط کو بالفعل نافذ و قائم

---

[1] بقول " مرا یاراں غزل خوانے شمردند "

کرنے کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے خاتم النبیین اور سید المرسلین محمد ن الامین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ۔۔۔ (بعنوانئے الفاظِ قرآنی "وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ" (الشوریٰ: ۱۵) اور "لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" (الحدید: ۲۵)) اور ع "خدایا آں کرم بارِ دگر کن!" کے مصداق اسی کا پیغام دیا تھا حکیم الامت اور مصورِ پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے کہ ؎

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔۔۔ اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!

چنانچہ اقبال سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جہاں شعریت اور جذباتی سوز و ساز کے اعتبار سے کلامِ اقبال کے نقطۂ عروج کا مظہر اُن کی دوسری نظمیں (خصوصاً ذوق و شوق) ہیں وہاں اُمتِ مسلمہ کے نام اُن کے پیغام کا مظہرِ اتم و اکمل ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" اور خصوصاً اس کے یہ آخری اشعار: ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ۔۔۔ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!
الحذر! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر ۔۔۔ حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف ۔۔۔ منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب ۔۔۔ پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب ۔۔۔ یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

چنانچہ اُس مردِ قلندر نے تو نہ صرف یہ کہ ع "جوہرِ دریائے قرآں سُفتہ ام" کے مصداق قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف کی دلنشیں پیرائے اور شعری اسلوب میں تعبیر و تعلیم میں اپنی توانائیاں کھپا دیں بلکہ ساتھ ہی "انقلاب" کا نعرہ بھی بلند کر دیا تھا ۔۔۔ کہ

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب ۔۔۔ از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے نام لیواؤں اور شیدائیوں نے اُن کے ساتھ وہ معاملہ کیا کہ ؎ ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من ۔۔۔ وز درونِ من نہ جُست اسرارِ من

مزید براں ۔۔۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے تعبیر فرمایا تھا بابائے قوم اور بانیٔ پاکستان

قائدِ اعظم محمد علی جناح نے کبھی ان الفاظ سے کہ "ہم پاکستان کی صورت میں ایک ایسے خطۂ ارضی کے خواہاں ہیں جس میں اسلام کے اصول حریت واخوت ومساوات کا عہدِ حاضر میں عملی اور مثالی نمونہ پیش کر سکیں۔" اور کبھی یہ فرما کر کہ "اسلام ایک سوشل ڈیماکریسی ہے!" (روایات بالمعنیٰ!)

لیکن افسوس کہ علامہ اقبال تو خالص "مسنون عمر" میں پاکستان کے قیام سے لگ بھگ دس سال قبل ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، قائدِ اعظم مرحوم بھی قیامِ پاکستان کے بعد کُل ایک سال زندہ رہے ـــــ اور اُن کے بعد اُن کی عوامی تحریک کا ثمرہ اچک لیا، اولاً نوابوں اور نوابزادوں اور زمینداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں نے، اور بعد ازاں اس میں مستقل حصہ دار تو بن گئے کچھ نئے اور پرانے سرمایہ دار اور باری باری حصہ بٹاتے رہے اعلیٰ سول اور فوجی عہدیدار، جس کے نتیجے میں قانون قدرت کے عین مطابق عوامی سطح پر ایک شدید احساسِ محرومی پیدا ہوا جو اندر ہی اندر سلگنے والی آگ کے مانند بڑھتا چلا گیا۔ ـــــ اور ـــــ اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ اسی احساسِ محرومی کی پُرزور ترجمانی کی تھی ذوالفقار علی بھٹو نے جس نے پاکستان کی سیاست کے اُس نئے اور زوردار عوامی دھارے کو جنم دیا تھا جس کی ایک طوفانی لہر پر سوار ہو کر وہ اب سے پندرہ سال قبل خود ایوانِ اقتدار تک پہنچے تھے!

واضح رہے کہ اس وقت مجھے نہ بھٹو صاحب کی ذات اور شخصیت سے کوئی بحث ہے نہ اُن کی سیرت و کردار سے، اور نہ اُن کے خلوص یا عدمِ اخلاص کے بارے میں کوئی گفتگو کرنی ہے، نہ اُن کی اہلیت یا نااہلیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا ہے بلکہ فی الوقت میری گفتگو صرف اور صرف پاکستان کی عوامی سیاست کے درمیانی معاملے کے اُس 'INNER CORE' کی تعیین و تشخیص سے متعلق ہے جس نے اس میں وہ قوت و مقاومت پیدا کر دی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین مارشل لاء سے بھی اُس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی۔ چنانچہ مارشل لاء کے ذرا پس منظر میں جاتے ہی اُس کی طوفانی لہر سامنے آ گئی ـــــ اگرچہ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ اس بار

اس پر سواری بھٹو مرحوم کی صاحبزادی مس بے نظیر کرتی ہیں یا اُن کے سابق رفیقِ کار مسٹر جتوئی، یا اُن کی ایک نظر بندی کے دوران اُن کے خلاف کورٹ کرنے والے ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان ــــ یا کوئی اور!!

بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ اس دھارے کے بہاؤ کو روکنا نہ کسی چوتھے مارشل لاء کے لیے ممکن ہے نہ پانچویں کے، اور اس کے آگے نہ علماءِ کرام کوئی بند باندھ سکتے ہیں نہ مشائخِ عظام، نہ پشتینی رئیس اس کی راہ میں مزاحم ہو سکتے ہیں نہ نودولتیئے سرمایہ دار، نہ سردار اور وڈیرے اِس کا راستہ روک سکتے ہیں نہ زمیندار و جاگیردار ــــ اور نہ کوئی میر اس کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے نہ کوئی پیر ــــ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اِس کے رُخ کو موڑنے کی کوشش کی جائے!

اِس لیے کہ مغرب کی اندھی تقلید میں ہمارا یہ "ڈالا" بھی خالص مادّیت ہی کے رُخ پر بہہ رہا ہے۔ اور اس کے 'INNER CORE' کا سارا خارجی لبادہ یورپ سے مستعار لیا ہوا ہے ــ چنانچہ اس کا کوئی براہِ راست سروکار نہ اللہ سے ہے نہ رسول ؐ سے اور اس میں نہ ہدایتِ آسمانی سے کوئی اعتنا ہے نہ آخرت کی جوابدہی کا کوئی ذکر، لہٰذا عدلِ اجتماعی کے جملہ تصورات و معیارات بھی مغرب ہی سے ماخوذ ہیں اور اُن کے ضمن میں افراط و تفریط کی انتہاؤں کے مابین بھٹکنے کی کیفیت بھی لامحالہ وہیں کا چربہ ہے ــــ مزید برآں اِن کے جلو میں بے پردگی بھی ہے اور عریانی بھی، اباحیت (PERMISSIVENESS) بھی ہے اور آوارگی بھی، لاف زنی بھی ہے اور رنگ رلیاں بھی، ہنگڑ بھی ہے اور 'ہے جمالو' بھی ــــ اور اِن سے بھی بڑھ کر عبادات سے بے اعتنائی ہی نہیں، اُن کا استہزاء و تمسخر ہے شریعت سے بے پروائی ہی نہیں اس کے خلاف نشوز اور بغاوت ہے اور شعائرِ اسلامی کا عدمِ احترام ہی نہیں اُن کی باقاعدہ توہین و تذلیل ہے ــــ وقِس علیٰ ذالک!

فکرِ اقبال کی روشنی میں اس صورتِ حال کا علاج بھی اس کی کُلّی نفی (TOTAL NEGATION) اور بحیثیت مجموعی ردّ کر دینے (TOTAL REJECTION) میں نہیں بلکہ اس کے صحیح جزو کو قبول کرتے ہوئے غلط جزو کی اصلاح میں مضمر ہے! بالکل ایسے جیسے حضرتِ علامہ نے موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو ایک ایسے نیام سے تشبیہ دی ہے جس میں سے ایمان باللہ کی تلوار نکال لی گئی ہو ؎

عشق کی تیغِ جگردار اڑا لی کس نے؟ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

گویا نیام تو اپنی جگہ درست اور کار آمد ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس میں تلوار داخل کی جائے اسی طرح علم جدید میں فی نفسہٖ کوئی شے غلط نہیں ہے اور کائنات کے بارے میں معلومات کا جو عظیم خزانہ اس نے جمع کیا ہے وہ اپنی جگہ متاعِ بے بہا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس میں خالقِ کائنات کی معرفت و محبت کی چاشنی گھول دی جائے!

یہی وجہ ہے کہ حضرتِ علامہ نے اپنے اُس مشہور اور متنازعہ فارمولے میں کہ:

"MARXISM + GOD = ISLAM"

مغرب کے مادّی فکر کی منطقی انتہا یعنی جدلی مادیّت اور اس کے بھی نقطۂ عروج یعنی مارکسزم تک کو بالکلیہ ردّ نہیں کیا بلکہ صرف اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ اس میں ایمان باللہ کا تریاق شامل کر دیا جائے تو اس کی سمیّت اور زہرناکی ختم ہو جائیگی اور یہ اسلام کے بہت قریب آ جائے گا!

بنابریں فکرِ اقبال کی روشنی میں اس وقت کرنے کا اصل کام، یہ ہے کہ پاکستان کی عوامی سیاست کے عظیم دھارے کے آگے بند باندھنے کی لاحاصل ہی نہیں حد درجہ مضر اور خطرناک کوشش کی بجائے اس میں ایمان و یقین کی چاشنی اور حکمت و معرفت کی روشنی شامل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح فی الجملہ اس کے رُخ کو آسمانی ہدایت کی جانب موڑ دیا جائے!

اور یہ کام، ظاہر ہے کہ، ہرگز آسان نہیں بلکہ نہایت مشکل اور مشقت طلب ہے البتہ

اس کے ضمن میں ایک بہت اہم اور مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں وہ لوگ جو اقبالؔ کے مداح و شیدائی اور اُن کے فکر و فلسفہ اور حکمت و بصیرت سے فیض حاصل کرنے والے اور خود کو اُن کی جانب منسوب کرنے والے ہیں — اس لئے کہ اقبالؔ کے متذکرہ بالا فارمولے کے مانند ایک بظاہر نہایت سادہ لیکن بباطن حد درجہ محکم فارمولا یہ بھی ہے کہ:

• پاکستان کا بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے اور احیاءِ اسلام کا واحد ذریعہ ہے تجدیدِ ایمان' اور ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ ہے قرآن حکیم اور دورِ حاضر میں احیاءِ قرآن کا ایک نہایت اہم اور مؤثر ذریعہ ہے فکر و کلامِ اقبال!•

اس لئے کہ جیسے کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے اور علیٰ وجہ البصیرت کہا ہے اور آج پھر کہہ رہا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہوں کہ عہدِ حاضر کے ذہنی و فکری ظروف و احوال میں قرآن حکیم کی عظمت کا جسقدر انکشاف اقبالؔ پر ہوا، اور کسی پر نہیں ہوا — اور موجودہ دور کی اعلیٰ ترین علمی و فکری سطح پر قرآن کے علم و حکمت اور ہدایت و معرفت کی تعبیر و تبیین اور تشریح و توضیح کی ہے صرف — اور صرف اقبال نے!

لیکن اس کے لئے اقبالؔ کے مداحوں اور شیدائیوں کو ع "پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے!" کے مصداق کردار اور عمل کے میدان میں اترنا ہوگا' اور حلقۂ اقبال کو محض ایک روایتی اور ثقافتی طائفے کی صورت اختیار کرنے بلکہ' شدّتِ احساس کے لئے معذرت خواہ ہوں' مزارِ اقبالؔ کے مجاوروں کی حیثیت اختیار کرنے کی بجائے خود اقبالؔ کی "خانقاہ" سے بھی باہر نکل کر "رسمِ شبیری" ادا کرنی ہوگی! اور اس کے لئے انہیں اُس ہمّت و جرأت' محنت و مشقت' ایثار و قربانی اور بے نفسی و بے غرضی کے علاوہ' جو کسی بھی عظیم مقصد کے لئے لازمی ولابدی ہیں' حسبِ ذیل عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔

۱۔ جس دین و شریعت کے نام لیوا اور علمبردار ہیں اس پر خود عمل پیرا ہونا'

اور اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کرونگا کہ اقبال کے مداحوں اور شیدائیوں کیلئے سب سے مشکل اور کٹھن مرحلہ یہی ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے خود اقبال کی 'بے عملی' کو 'سند' کا درجہ دے دیا ہے۔ حالانکہ قطع نظر اس سے کہ خود حضرتِ علامہ نے اپنی بے عملی اور 'تن آسانی' کا ہمیشہ ایک کمی کی حیثیت سے برملا اعتراف کیا اور اسے کبھی سند کی حیثیت سے پیش نہیں فرمایا، اُن کے فکر کے علو و عظمت کے پیشِ نظر اُن کی 'بے عملی' کی کوئی اہمیت نہیں رہتی بلکہ بلامبالغہ مجھ ایسے لاکھوں 'الناقوں' کا 'عمل' اُن کی 'بے عملی' پر نچھاور کیا جا سکتا ہے ——— لیکن دوسرا کون ہے جو اس کا مدعی بن کر سامنے آسکے؟ مولانا مودودی مرحوم نے تو حضرت علامہ کو صُوفیا کے 'ملامتیہ' گروہ سے متعلق قرار دیا ہے جو اپنے 'عمل' کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپانے کے لئے 'بے عملی' کا مظاہرہ کرتے ہیں، میں یہاں تک بھی نہیں جاتا بلکہ اسے اُس قاعدہ کلیہ کے ذیل میں شمار کرتا ہوں کہ نابغہ لوگوں کا عمل بالعموم اُن کے فکر کا ساتھ نہیں دے سکتا، تاہم اصل بات یہ ہے کہ حضرت علامہ جیں وہ فکر دے گئے جو اس دَور کے لاکھوں نہیں کروڑوں 'باعمل' لوگ بھی نہیں دے سکتے تھے لیکن اب اس فکر کو عملاً بروئے کار لانے کا اوّلین تقاضا بع "دو شرط اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی!" کے مصداق اُس اسلام پر بالفعل عمل پیرا ہونا ہے جس کی تعبیر حضرت علامہ نے یوں فرمائی کہ بع "عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار!"

اس ضمن میں اس مغالطے پر مستزاد جس تضاد کا مظاہرہ علامہ مرحوم کے حلقہ بگوشوں میں نظر آتا ہے اُس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ بالفرض وہ داڑھی اس لئے نہیں رکھتے کہ علامہ نے نہیں رکھی تو اسی دلیل کے تحت اپنے گھروں میں پردہ کیوں رائج نہیں کرتے حالانکہ اس موضوع پر حضرت علامہ کے افکار و آراء بھی نہایت واضح اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں اور اُن کا عمل تو اُس سے بھی کہیں زیادہ روشن و تابناک ہے! اس ضمن میں اس وقت مزید کچھ عرض کرنے سے اس لئے گریز کرتا ہوں کہ اس دور میں حضرتِ علامہ کے اس شعر کا مصداق کامل میں ہوں کہ :

ے کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند!

تاہم یہ صرف ایک مثال ہے — بقولے "قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا!"

۲۔ اس عظیم مقصد کیلئے علماء کرام کا تعاون حاصل کیا جائے

اور اس ضمن میں حضرتِ علامہ کی اُن تنقیدوں اور لطیف اور مزاحیہ انداز کی اُن پھبتیوں کے ساتھ ساتھ جو انہوں نے روایتی مُلّا پر چُست کی ہیں اُن کے اس طرزِ عمل کو نگاہ میں رکھا جائے کہ انہوں نے ہمیشہ علماء حق کا احترام کیا۔ یہاں تک کہ اپنے تمام تر مرتبۂ علمی و فکری کے باوجود بالغ نظر اور وسیع الذہن علماء سے خالص طالبعلمانہ انداز میں کسبِ فیض میں کبھی اپنی توہین یا سُبکی محسوس نہیں کی۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی رح کے ساتھ اُن کی خط و کتابت اس پر شاہد عادل ہے۔

خصوصاً فقہ و قانونِ اسلامی کے ضمن میں اِس دَور میں اجتہاد کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار ہونے کے باوجود، انہوں نے خود اپنے آپ کو کبھی مجتہدِ مطلق نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کے باوجود کہ عربی زبان پر انہیں عبور حاصل تھا۔ قرآن اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا اور خود وہ تمام عمر قرآن میں غوطہ زنی کرتے رہے تھے، حکمتِ دین اُن کے ذہن و فکر کی جزوِ لاینفک تھی اور تفقہ فی الدین اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا — قانونِ اسلامی کی تدوینِ نو کے ضمن میں انہیں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا کہ وہ تن تنہا اس کے اہل ہیں بلکہ کسے معلوم نہیں کہ وہ اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایّام تک بیک وقت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رح سے درخواست فرماتے رہے کہ وہ کسی طرح لاہور منتقل ہو جائیں تو دونوں مل کر وقت کی اس اہم ترین ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں۔

اِس ضمن میں قدیم اور جدید کے امتزاج کی جس قدر فکر اور خواہش حضرت علامہ کرتے تھے اُسی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی تحریروں میں اس امتزاج کی جھلک دیکھ کر حضرت علامہ نے انہیں دکن کی سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب آنے کی دعوت دی اور اپنے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی مرحوم

کے ذریعے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اُن کے 'تمکن' کی سبیل پیدا فرمائی۔ یہ مجھے حضرت علامہ کے اِس اقدام کا پس منظر نظر آتا ہے اُن کے اس قطعے میں جو آج بھی اُن کے مرقد کی زینت بنا ہوا ہے کہ ؎

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم ۔۔۔ قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر ۔۔۔ دلے در سینۂ مُلّا گدازیم

لیکن افسوس کہ مولانا مرحوم نے برِصغیر کے مسلمانوں کی قومی جدوجہد کے نقطۂ عروج کے آغاز پر تو یہ کہہ کر قومی سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ 'میں مسلمانوں کا نہیں صرف اسلام کا کام کرنا چاہتا ہوں' — لیکن قیامِ پاکستان کے بعد 'اسلام کے کام' کے لیے قومی ہی نہیں خالص سیاسی راستہ اختیار کر لیا اس پر تو اس وقت میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ - کاش کہ ایسا نہ ہوتا! اور مولانا مرحوم قیامِ پاکستان کے بعد بھی اپنے سابق انقلابی طریق کار ہی پر عمل پیرا رہتے۔ تاہم فکرِ اقبال کے شیدائیوں کی توجہ اس جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس چیز کی اہمیت حضرت علامہ کو اس وقت محسوس ہوئی تھی وہ آج بھی نہایت اہم ہے! اور قدیم و جدید کے محکم امتزاج اور علماءِ حق کے تعاون و اشتراک کے بغیر پاکستان کی قومی سیاست کے دھارے کے رُخ کو اسلام کی جانب موڑنا ناممکن ہے۔

آخر میں جملہ شرکاءِ مجلس سے طویل سمع خراشی کے لیے معذرت خواہی کے ساتھ ساتھ ارکانِ مرکزیہ مجلسِ اقبال کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے مجلسِ اقبال میں شرکت کی دعوت دے کر میرا اعزاز و اکرام بھی فرمایا — اور مجھے یہ موقع بھی عنایت فرمایا کہ چند نادر پُول ایسے منتخب روزگار حضرات کی محفل میں بیان کر سکوں۔ اور آخر دعوانا ن الحمد للہ رب العلمین کے مطابق سب سے آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں اللہ کا کہ اس نے مجھے بھی تین دن کی مختصر مدت کے اندر اپنے خیالات کو قلمبند کرنے کی توفیق عطا فرمائی ر میرے ساتھیوں کو بھی ہمت دی کہ اسی قلیل عرصہ میں اس کی طباعت کا مرحلہ طے کر لیں۔ ہم سے کوئی خیر بن آئے تو یہ سب اللہ ہی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ اور خطا ہوتی ہے تو ہمارے نفوس کی شرارت سے۔ اقول قولی ھذا و استغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

الہدیٰ

(نشست نمبر ۳۱)

(مباحثِ ایمان)

سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں

حظِ عظیم

ڈاکٹر اسرار احمد

(کے ٹیلیویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ)

(۲)

السلام علیکم - نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم - امّا بعد

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ — صدق اللہ العظیم

"اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں یقیناً مسلمانوں میں سے ہوں"

محترم حاضرین اور معزز ناظرین

یہ سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیت نمبر ۳۳ ہے جس کی تلاوت اور اس کا ترجمہ آپ نے سماعت فرمایا - اس آیتِ مبارکہ میں تواصی بالحق کی جو بلند ترین چوٹی ہے اس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی دعوت الی اللہ — اللہ کی طرف بلانا -

یہ بات جان لیجئے کہ اس کائنات کی عظیم ترین حقیقت ذاتِ باری تعالیٰ ہے قرآن مجید میں ایک سے زائد مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ اصل حق کامل حق ذات باری تعالیٰ ہے - لہٰذا تواصی بالحق یعنی حق کی وصیت حق کی نصیحت، حق کی طرف دعوت کے ضمن میں اگرچہ اس سے قبل یہ عرض کیا جا چکا ہے

کہ چھوٹی سی چھوٹی اخلاقی نصیحتیں بھی اس میں شامل ہو جائیں گی۔ اس میں حقوق العباد ادا کرنے کی تلقین بھی شامل ہو جائے گی۔ کسی بھی بھلائی کی ترغیب اور کسی بھی بُرائی سے روکنے کی کوشش، یہ بھی تواصی بالحق میں شامل ہیں لیکن اس کی بلند ترین چوٹی یہ ہے کہ اللہ کی طرف بلایا جائے۔ جیسے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارکہ ہوئی: وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔ آپؐ اللہ کی طرف بلانے والے ہیں، اسی کے حکم سے اسی کی جانب سے مامور ہو کر۔ اور آپؐ ہدایت کے ایک روشن چراغ ہیں۔

اب یہ بات جان لیجئے کہ دعوت الی اللہ انفرادی سطح پر بھی ہوگی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ نوعِ انسانی کو بحیثیتِ کل اور افراد کو بحیثیت فرد اللہ کی طرف بلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں کو اس بات کی دعوت دی جائے کہ وہ اللہ کو پہچانیں۔ اللہ پر ایمان اور یقین رکھیں۔ اللہ پر توکل رکھیں۔ اللہ پر اعتماد و بھروسہ رکھیں۔ اللہ کی محبت سے اپنے قلوب و اذہان کو منور کریں۔ اللہ ہی ان کا مطلوب و مقصود اور ملجا و ماویٰ بن جائے۔ پھر یہ کہ اس کی اطاعت کریں، اسی کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اس کی جانب سے جو بھی حکم ملے اُسے بجا لائیں۔ فرماں برداری کی روش اختیار کریں۔ یہ تمام چیزیں جب جمع ہو جائیں گی تو اس رویّے کا نام ہے عبادت۔ گویا اللہ کی عبادت کی دعوت۔ دعوتِ بندگیٔ رب۔ یہ ہے دعوت جو ایک ایک فردِ نوعِ بشر کے سامنے پیش کی جائے گی۔ یہ ہے دعوت الی اللہ کا حقیقی مفہوم۔ جیسا کہ ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں کہ سورہ بقرہ کے تیسرے رکوع کا آغاز ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

"اے لوگو! بندگی اختیار کرو، پرستش کرو، اطاعت کرو، لو لگاؤ اپنے اُس رب سے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے جتنے بھی انسان ہو گزرے ہیں، ان سب کو بھی پیدا کیا۔ اسی میں تمہارے لئے عافیت

ہے۔ اسی طرح تم بچ سکو گے۔ اس دُنیا میں گمراہی کے دھکوں سے بچنے کی سبیل یہی ہے اور آخرت میں بھی عذاب الٰہی سے بچنے کا بھی یہی واحد راستہ ہے۔“

نوعِ انسانی کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ اس کی عظیم اکثریت اپنے حقیقی پروردگار، اپنے پالن ہار، اپنے خالق سے غافل ہے۔ وہ یا تو انواع و اقسام کے شرک میں مبتلا ہے اور مختلف بندگیوں اور پرستشوں میں مشغول ہے۔ یا اس میں تمرّد ہے سرکشی ہے۔ طغیان ہے وہ خود اپنی آقا اور مالک بن بیٹھی ہے۔ یا کچھ ہوشیار و چالاک انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے آقا، مالک اور حاکم بن بیٹھے ہیں اور بقول شاعر؂ تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے۔ کا نقشہ جما ہوا ہے۔ ان تمام چیزوں کی نفی کر کے پوری نوعِ انسانی کو بلا لحاظِ ملک، بلا لحاظِ نسل، بلا لحاظ رنگ اور بلا لحاظ قوم دعوت دینا کہ وہ اللہ کی بندگی اختیار کریں اور سرکشی و تمرّد اور اپنے نفس کی خواہشات و شہوات کو چھوڑ کر اپنے آپ کو اللہ واحد کی بندگی اور پرستش کے حوالے کر دیں۔ یہ ہے دعوت الی اللہ — انفرادی سطح پر۔

اسی عبادت اِلی اللہ کا ایک مفہوم وہ ہے جس کا تعلق اجتماعی سطح سے ہے۔ یعنی یہ زمین اللہ کی ہے۔ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ آگاہ رہو کہ خالق وہی اللہ ہے لہٰذا حکم بھی اُسی کا چلنا چاہیے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ حکم کا اختیار تو اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ جب اس نے پیدا فرمایا ہے تو اُسی کے سامنے سرِ اطاعت خم ہونا چاہیے۔ اُسی کی مرضی کو یہاں نافذ ہونا چاہیے۔ جیسے اُس کی مرضی پوری کائنات میں ذرّے سے لے کر بڑے سے بڑے سیارے تک میں ساری و جاری ہے اور پوری کائنات اس کے تکوینی قانون میں جکڑی ہوتی ہے اور اُسی کا قوانینِ طبعیہ نافذ ہیں۔ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے وہ اسی کے سامنے سرِ اطاعت خم کیے ہوتے ہے۔ لیکن اس انسانی زندگی کا معاملہ ایسا ہے کہ اسے کچھ اختیار دیا گیا ہے۔ اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا

وَ اِمَّا کَفُوۡرًا - اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادی دی ہے کہ وہ اللہ کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی بسر کرے یا ناشکرا بن کر - اب اگر انسان اس اختیار اور آزادی کو اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے اللہ کے قدموں میں لا ڈالتا ہے تو گویا حق بمقدار رسید الا رویّہ اور معاملہ اختیار کرتا ہے -

جب یہ معاملہ اجتماعی سطح پر ہوگا تو اس کا نام ہے اقامتِ دین - یہ سورۃ حٰمٓ السجدہ کی چند آیات ہیں جن کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں - اور اس سے متصلاً بعد قرآن مجید میں سورۃ شوریٰ وارد ہوتی ہے - اس میں پانچ جلیل القدر انبیاء اور اولوالعزم من الرسل کا نام لے کر فرمایا گیا کہ ہم نے ان سب کو جو حکم دیا تھا وہ یہ تھا : اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ ؕ - دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں تفرقے میں مبتلا نہ ہو - اقامتِ دین یہ ہے کہ اس زمین پر انسان کی خود مختاری اور آزادی کے دائرے کے اندر اللہ تعالیٰ کے احکام، اس کے اوامر و نواہی نافذ ہوں انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی - اجتماعی نظام پر اُسی کی حکومت قائم ہو - اسی کو ہم اقامتِ دین کہتے ہیں - اسی کو حکومتِ الٰہیہ کہتے ہیں - اسی کو ہم تعبیر کرتے ہیں اعلاءِ کلمۃ اللہ سے - اللہ ہی کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے۔ لِتَكُوۡنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الۡعُلۡيَا - اللہ کا جھنڈا تمام جھنڈوں سے اونچا ہو - اللہ کی مرضی اور اس کے قانونِ تشریعی کے مطابق ساری دنیا کا اجتماعی نظام چل رہا ہو - اس کے لئے جو دعوت ہوگی، اس کے لئے جو جدوجہد کی جائے گی وہ دعوت الی اللہ کی اجتماعی صورت ہوگی -

اب غور کیجئے یہاں الفاظِ مبارکہ یہ ہیں : وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ - یہ بڑا پیارا انداز ہے کہ یوں تو ہر ایک کے پاس زبان ہے اور اس زبان سے جو شخص جو چاہتا ہے نکال دیتا ہے - جیسے ہم کہتے ہیں کہ جتنے مُنہ اتنی باتیں - اسی طرح آپ کو دُنیا میں بیسیوں دعوتیں ملیں گی - جو بھی ذہین تر لوگ ہیں وہ کسی نہ کسی دعوت کے داعی اور کسی نہ کسی نظریہ کے علم بردار ہو کر کھڑے ہوتے ہیں - لیکن فرمایا کہ ان تمام دعوتوں

میں بلند ترین، ان تمام دعوتوں میں سے سب سے اعلیٰ وارفع اور احسن دعوت یہ ہے کہ اللہ کی طرف بلایا جا رہا ہو۔ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ
اس کے بعد فرمایا: وَعَمِلَ صَالِحًا۔ "اور وہ نیک عمل کرتا ہو"
معلوم ہوا کہ عملِ صالح دعوتِ الیٰ اللہ کی شرط لازم ہے۔ دعوت الی اللہ مؤثر نہیں ہو گی جب تک داعی کی اپنی زندگی میں اخلاقِ حسنہ اور اخلاقِ عالیہ کا منظر لوگوں کو نظر نہ آئے۔ دوسری دعوتوں کو لے کر کھڑے ہونے والوں کو لوگ نظر انداز کر سکتے ہیں، معاف کر سکتے ہیں۔ اشتراکیت کی دعوت کا پرچار کرنے والوں کے اخلاق و معاملات کی طرف لوگوں کو نگاہ نہیں اٹھے گی۔ لیکن جو اللہ کی طرف بلانے کا داعیہ لے کر اٹھے۔ داعی الی اللہ بن کر لوگوں کے سامنے آئے تو اچھی طرح جان لیجئے کہ اس کی سیرت و کردار، اس کے اخلاق و معاملات پر لوگوں کی تنقیدی نگاہیں پڑ کر رہیں گی۔ اس دعوت کی تاثیر اگر ہے تو وہ عمل صالح میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ و مطہرہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب آپؐ کو دعوت و تبلیغ کا حکم ہوا اور آپؐ نے پہلا جلسہ عام منعقد فرمایا کوہ صفا پر آپؐ کھڑے ہوئے اور آپؐ نے وا صباحاہ کا نعرہ لگایا جس کو سن کر لوگ جمع ہوئے تو سب سے پہلے آپؐ نے اپنی سیرت، اپنے کردار اور اپنی صداقت و امانت کو دعوت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا۔ آپؐ نے لوگوں سے دریافت فرمایا کہ لوگو! تم نے مجھے کیا پایا! لوگوں نے بیک زبان یہ کہا کہ ہم نے آپؐ کو الصادق اور الامین پایا ہے۔ آپؐ سچے ہیں اور امانت دار ہیں۔ ہمیں آپؐ سے کبھی جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوا۔ ہم میں کسی کو آپ سے کسی بد معاملگی کا تجربہ نہیں ہوا۔ تو یہ عملِ صالح اور یہ خلقِ عظیم اور حسن معاملگی آپؐ کی دعوت کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ اور درحقیقت داعی الی اللہ کے ہاتھ میں جو قوتِ تسخیر ہوتی ہے جو دلوں کو فتح کرتی ہے۔ بقول کسے ؏ جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ۔ داعی الی اللہ کے ساتھ جو موثر ترین طاقت ہوتی ہے وہ اس کا اپنا کردار، اس کی اپنی سیرت اس کا اپنا اخلاق ہوتا ہے اگر اس کے اندر لوگوں کو اخلاق حسنہ کا نمونہ نظر آئے گا اور وہ

سے راست گو اور راست باز پائیں گے تو لوگ اس کی طرف کھنچتے چلے جائیں گے
ر اس کی بات کھلے دل کے ساتھ سنیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ الصف میں ہم مسلمانوں کو جھنجوڑنے کے انداز میں
فرمایا گیا۔ چونکہ ہمارا تو فرضِ منصبی دعوت الی اللہ ہے۔ جیسے سورۂ آل عمران
میں فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ "تمہیں
بہترین اُمّت بنایا اور لوگوں کے لئے برپا ہی کیا اسلئے گیا ہے کہ تم نیکیوں کا حکم
دیتے ہو اور بُرائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔ لہٰذا اگر ہمارے
قول و عمل میں تضاد ہوگا تو اس سے دعوت بدنام ہو جائے گی اس لئے سورۂ
الصف میں متنبہ کیا گیا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا
تَفْعَلُوْنَ ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝
"اے اہل ایمان! وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے غضب کو
بھڑکانے والی ہے یہ بات کہ تم وہ بات کہو جو تم کرتے نہیں ہو"۔ قرآن مجید
میں یہود پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں اُسی کے ضمن میں سورہ بقرہ میں خاص طور پر ان کے
علماء کے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں جو اس موضوع سے بہت متعلق ہیں کہ:
اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ
الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ "کیا تم لوگوں کو خیر، بھلائی اور نیکی کی تلقین کرتے
ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو درآں حالیکہ تم کتاب کے پڑھنے والے اور
اس کے عالم ہو تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔؟"— تمہاری یہ ساری تلقین،
نصیحت اور تمہاری خیر کی اور اللہ کی طرف یہ دعوت غیر مؤثر رہے گی اگر تمہارا
کردار اس کے مطابق نہیں ہے۔ تمہاری اپنی سیرتیں اور شخصیتیں اس سے
خالی ہیں اور اس کا کوئی نمونہ عملاً تمہارے اندر موجود نہیں ہے — تو یہاں
ان تمام مفاہیم کو سمو کر فرمایا: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ
اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا۔

اس آیت مبارکہ کا آخری ٹکڑا بہت اہم ہے۔ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں۔

LAST BUT NOT THE LEAST فرمایا: وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ "اور وہ یہ کہے میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں" یہ جملہ یہاں پر تین معانی ومفاہیم دے رہا ہے۔

پہلا مفہوم یہ کہ اگر ماحول مخالفانہ ہے، ناموافق ہے۔ زبان پر کلمۂ اسلام لانے کا نتیجہ مصائب و شدائد کو دعوت دینا ہے جیسا کہ مکّہ میں عملاً یہی کچھ ہوا اور یہ سورہ مبارکہ مکی ہے۔ اس ماحول میں یہ کلمۃ کلمۂ عزیمت ہے: اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ کہ انسان خم ٹھوک کر اعلان کرے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ مَیں نے شعوری طور پر یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ جیسا کہ سُورہ یٰسٓ میں اُس بستی کا ذکر ہوا ہے جہاں دعوت الی اللہ کے لئے پہلے دو پھر تیسرے رسول یعنی بیک وقت تین رسول بھیجے گئے وہاں اس بستی میں سے ایک نیک طینت و نیک خصلت صاحب نے ان کی دعوت کو قبول کیا ان کا حال اس سورہ مبارکہ میں بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اس بستی میں ایک مجمع عام میں یہ کہا: اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ ۝ کان کھول کر سن لو میں تو تمہارے رب پر ایمان لا چکا۔ تو یہ کلمۂ عزیمت ہے، یہ جراَت وہمت کا اظہار ہے۔

دوسرا مفہوم اس اعتبار سے کہ یہ ایک کلمۂ تواضع ہے۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ جو شخص دعوتِ الی اللہ کے منصب پر فائز ہو جائے۔ جو لوگوں کو خیر کی بھلائی کی، اللہ کی بندگی کی اور اسی کے دین کو قائم کرنے کی دعوت دے رہا ہو۔ اس کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور اندیشہ اس بات کا ہوتا ہے کہ کہیں اس کے دل میں تکبّر کوئی عُجب، جذبۂ تفاخر، اپنے بڑے ہونے کا احساس پیدا نہ ہو جائے۔ وہ لوگوں کو کہیں بہ نظر استحقار دیکھنا شروع نہ کر دے اور اپنے آپ کو ان سے بالا و برتر نہ سمجھنے لگے۔ تو ان الفاظ میں ان تمام خطرات کا سدباب کیا جا رہا ہے کہ وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ اور وہ یہ کہے کہ میں بھی مسلمانوں ہی میں سے ہوں۔ جیسے عام مسلمان ہیں، میں بھی ویسا ہی مسلمان ہوں۔ جیسا کہ ہم سورہ لقمان میں مطالعہ کر چکے ہیں کہ جہاں وہ بات

آئی تھی : يٰبُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا أَصَابَكَ ط تو اس کے بعد فوراً ہی اگلی آیت میں الفاظ آئے : وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ط " اپنے گالوں کو لوگوں کے لئے پھلا کر نہ رکھو۔ لوگوں کے لئے کج ادائی اختیار نہ کرو۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو " ۔ کہیں یہ عجب اور یہ تکبر تمہارے کئے دھرے پر پانی نہ پھیر دے ۔ تمہاری ساری کوششیں بے اثر اور معدوم کے درجہ میں ہو جائیں گی اگر یہ تکبر و عجب پیدا ہو گیا ۔ نبی اکرم ؐ کے بارے میں ہمیں سیرتِ مطہرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ جب صحابہ کرام ؓ کے ساتھ رونق افروز ہوتے تھے تو آپ ؐ اپنی کوئی امتیازی شان قائم ہونے نہ دیتے تھے۔ بسا اوقات باہر سے کسی نئے آنے والے کو یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا تھا کہ اس مجلس میں محمد رسول اللہ کون سے ہیں ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اس طرح آپ ؐ ملے جلے رہتے تھے ۔ آپ ؐ اس کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ آپ ؐ جب مجلس میں تشریف لائیں تو لوگ آپ ؐ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جائیں ۔ آپ ؐ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں تو اللہ کا ایک غلام ہوں اسی لئے غلاموں کی طرح کھانا کھاتا ہوں ۔ إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۔ إِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا ۔

اس کا تیسرا مفہوم ہمارے اس دور میں بہت ہی زیادہ قابل توجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کے منصب پر جو لوگ فائز ہو جائیں ۔ جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ توفیق مل جائے جو بہت ہی اعلیٰ توفیق ہے جس کو بھی پروردگار کی طرف سے اس کی ارزانی ہو جائے اس پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے ۔ ایسے شخص کو یہ بات جان لینی چاہیئے کہ وہ دعوتِ اسلام کی دے ۔ اسلام کے اُن بنیادی امور (FUNDAMENTALS) کی دعوت دے جو سب کے نزدیک مشترک ہیں جو متفق علیہ ہیں جن میں کوئی اختلاف نہیں۔ ہمارے مابین جو بھی فقہی اختلافات ہیں یا کلامی تعبیرات کے اعتبارات سے کچھ اونچ

پہنچ ہوگئی ہے۔ ان میں انیس بیس کا فرق ہے اس سے زیادہ نہیں ہے۔
لیکن اگر اس فرق ہی کو اور ان فقہی اختلافات ہی کو ہوا دی جاتی رہے گی تو
ان کی اہمیت بڑھتی چلی جائے گی۔ اُمت فرقوں اور گروہوں میں تقسیم در تقسیم
ہوتی چلی جائے گی اور وحدتِ امت میں انتشار و افتراق بڑھتا چلا جائیگا۔
اس کے برعکس روش یہ ہونی چاہیئے کہ دعوت خالصتاً اسلام کی ہو کسی فقہی
مسلک و مکتب فکر کی طرف دعوت نہ ہو۔ اسلام کے متفق علیہ امور اخلاق و
معاملات کی وہ تعلیم و دعوت ہو جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ دین کی
بنیادی تعلیمات کے اس اصول و مبادی کی دعوت دی جائے کہ جس کے بارے
میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ تمام مفاہیم اس آیت کے آخری حصے
سے مستنبط ہوتے ہیں کہ وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ہ ایسا نہ ہو کہ کوئی
شخص دعوت الی اللہ کا جذبہ لے کر اٹھے لیکن وہ اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں
میں ایک اور تقسیم کا باعث بن جائے اور ایک نئے فرقے کی بنا رکھ دے۔
بلکہ اس کی دعوت ہونی چاہیئے اسلام اور صرف اسلام کی طرف۔

یہ آیتِ مبارکہ دعوتِ الی اللہ کے ضمن میں نہایت جامع رہنمائی اور
ہدایات کی حامل ہے۔ جس کے بارے میں، میں نے عرض کیا کہ یہ تواصی بالحق
کی بلند ترین چوٹی ہے۔ اس کا ذروہ سنام ہے۔ اب میں یہ چاہوں گا کہ
آج کی گفتگو کے سلسلہ میں اگر کوئی سوال ہو یا کوئی وضاحت مطلوب ہو تو
پیش فرمائیں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے کہا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت
اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف بلانا حق کی طرف بلانا ہے۔
چنانچہ دنیا کے جو دوسرے مذاہب ہیں جیسے یہودیت ہے عیسائیت ہے وہ بھی
تو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے ہیں تو اِن میں کیا فرق ہے؟ ذرا اس کی وضاحت
فرمادیں۔!

جواب: ایک ہے اللہ کی طرف بلانا اس کی خالص توحید کے ساتھ جیسے

یہودیت عیسائیت یا دنیا میں جو دوسرے مذاہب ہیں وہ بھی اپنے دور میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف اور توحید باری تعالیٰ ہی کی طرف بلانے والے مذاہب تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ان سب میں بعد میں شرک کی آمیزش اور آلائش شامل ہوگئی۔ مثلاً عیسائیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ تثلیث کا عقیدہ ہے۔ ایک میں تین تین میں ایک! پھر ان کے ہاں سرے سے کوئی شریعت موجود ہی نہیں تو حلال و حرام کی قیود بھی مفقود ہیں۔ اسی طرح یہودیت میں بھی شریعت میں اتنی تحریفات ہوئیں کہ اس کا حلیہ ہی بالکل تبدیل ہوگیا۔ یہی حال بلکہ اس سے بھی بدتر حال دوسرے مذاہب کا ہوا جن میں شرک کی بے شمار آلائشیں اور آمیزشیں شامل ہوگئیں تو ان تمام آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک کر کے خالص توحید کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دینے کے لئے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ جیسے ہم نے پہلے درسوں میں دیکھا ہے کہ یوں تو ایمان لانا ضروری ہے اللہ پر بھی، آخرت پر بھی، کتابوں پر بھی نبوت و رسالت پر بھی۔ لیکن ایمان کی چوٹی اور اس کا لُبِ لباب یہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت پر انسان کا دل ٹھک جائے۔ چنانچہ سورہ حٰم السجدہ کی چند آیات کے درس کا جو سلسلہ چل رہا ہے۔ اس کی پہلی آیت میں فرمایا گیا تھا: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ جس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے اور باقی ایمانیات غیر ضروری ہیں معاذ اللہ۔ یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی طرح دعوت الی الخیر کی جو چوٹی ہے وہ دعوت الی اللہ ہے۔ لیکن چوٹی کسی بنیاد [illegible] کے بغیر نہیں ہوتی۔ لہٰذا بنیاد میں جو جزا شامل ہیں وہ سب کے سب دعوت الی اللہ میں بھی آپ سے آپ شامل ہیں۔ چنانچہ اس میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت بھی اس میں شامل ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ تواصی بالحق کی چوٹی یہ ہے کہ انفرادی و اجتماعی دونوں سطحوں پر اللہ کی طرف دعوت دی جائے۔

ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا ہے کہ اللہ کی طرف بلانا عمل کی بلند ترین چوٹی ہے جبکہ انسان کو ضروریات زندگی کی ہر وقت احتیاج ہے تو کیا ان کی طرف سے نگاہیں ہٹا لینی چاہئیں کیا اس طرح رہبانیت کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔؟

جواب: میری آج کی گفتگو سے یہ کہاں متبادر ہوا کہ ضروریاتِ زندگی کا حصول اور اس کے لئے کوشش کوئی ممنوعہ بات ہے۔ آپ کے سوال میں ایک مغالطہ ہے اس کو نوٹ کیجئے۔ زندگی کا مقصد ضروریاتِ زندگی کی تحصیل نہیں ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی تحصیل تو زندگی کو باقی رکھنے کا ذریعہ ہے۔ زندگی کا اپنا مقصد کیا ہے؟ یہ ایک بالکل مختلف سوال ہے۔ زندگی کو برقرار رکھنے والی چیزیں ہیں ضروریاتِ زندگی۔ لیکن زندگی کس لئے ہے۔؟ اس کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر سے سمجھئے۔

زندگی آمد برائے بندگی　　زندگی بے بندگی شرمندگی

اس زندگی کا مقصد ہے اللہ تعالےٰ کی بندگی: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ اس اعتبار سے از روئے قرآن ہمارا جو مقصودِ حیات ہے وہ اللہ تعالےٰ کی بندگی ہے۔ اس کے لئے جو دعوت دی جائے گی، وہ تمام دعوتوں میں اعلیٰ وارفع ترین دعوت ہے۔

حضرات! آج کی نشست میں دو سوالوں کے جواب میں آخر میں جو کچھ عرض کیا گیا وہی آج کی گفتگو کا حاصل اور لُبِّ لباب ہے۔ اللہ تعالےٰ ہمارے دلوں میں یہ امنگ اور یہ جذبہ پیدا فرما دے کہ ہم بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں اللہ کی طرف دعوت دینے والے بن جائیں۔ اور ہم بھی قرآن کی اس آیت اور الفاظ مبارکہ کی مصداق بن جائیں کہ:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ط ــــ آمین یارب العٰلمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن ۝

○○

تواضع کے بہتر آداب
-آپ کا بہترین انتخاب-
Freshwel
KARACHI
ASGULLA

روزہ، قرآن اور دعا!

آیاتِ صوم کی روشنی میں

[ذیل کا مضمون ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی، کے درس قرآن سے ماخوذ ہے۔]

ڈاکٹر عبدالسمیع

سورۃ بقرۃ کے ۲۳ ویں رکوع میں روزہ کا مضمون یکجا اور مفصل بیان ہوا ہے جو حکم و حکمت صوم، فضیلت ماہِ رمضان اور روزہ سے متعلقہ مسائل پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں ایک آیت دعا کی حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے۔ یاد رہے کہ قرآن مجید کسی شاعر کی شاعری نہیں بلکہ ایک فیصلہ کن قول مبارک ہے۔ اس کی آیات باہم مربوط ہیں۔ لہٰذا روزے کے مضمون میں دعا کا ذکر قطعاً بے معنی نہیں ہوسکتا۔ کیوں نہ اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، اللہ ہمیں قرآن کی صحیح سمجھ سے نوازے! (آمین)

حکم و حکمتِ صوم: پہلی آیت میں فرمایا: "ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا (صیام) فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ تاکہ تم متقی بن جاؤ" (یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچ کر اس کے عذاب سے بچنے والے بن جاؤ) عربی بڑی ہی SCIENTIFIC زبان ہے۔ اس میں اکثر الفاظ تین یا چار حرفی مادے سے نکلتے ہیں اور اس مادے کی ساخت اور اعراب میں معمولی تبدیلیوں سے سینکڑوں الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں۔ جن کا اپنا علیحدہ مطلب بھی ہوتا ہے جبکہ ان کا اصل مادے سے معنوی ربط بھی برقرار رہتا ہے، مثلاً ع ل م سے علم، علوم، عالم، معلم، متعلم اور معلوم وغیرہ۔ حکم اور حکمت بھی ایک ہی مادے سے ہیں۔ حکم کسی کام کے ظاہر سے متعلق ہوتا ہے کہ اس کو کرنا اور یوں کرنا ہے۔ جبکہ حکمت اس کام کے فوائد اور باطنی اثرات سے بحث کرتی ہے۔ اسی طرح مذکورہ آیت میں پہلے حکم ہے، پھر ترغیب اور آخر میں حکمت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اللہ کو ہمارے روزوں کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے کہ یہ اللہ کی معصیت اور

عذابِ خداوندی سے بچنے میں مدد دیتے ہیں۔

حقیقتِ صوم : صوم کے لغوی معنی: عرب 'صوم' کا لفظ ایک خاص جنگی تربیت کے لئے استعمال کرتے تھے جس میں گھوڑے کو بھوک اور پیاس کا عادی بنا کر جنگ کے تیار کیا جاتا تھا۔ لہٰذا جونہی گھوڑا جوان ہوتا عرب اس کو آہستہ آہستہ بھوکا اور پیاسا دھوپ میں کھڑا کرتے۔

حقیقتِ انسان : انسان مجموعہ ہے جسدِ حیوانی کا اور روحِ ربانی کا۔ روح کیا ہے! یہ اللہ کا ایک نور ہے جو انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے[1]۔ یاد رہے کہ روح LIFE یا زندگی کا دوسرا نام نہیں۔ زندگی تو پودوں کی پتیوں میں بھی ہوتی ہے مگر ان میں روح نہیں ہوتی۔ اسی طرح انسان کے علاوہ دوسرے حیوان زندگی تو رکھتے ہیں مگر روح نہیں۔ روح ہی انسان کا اصلی وجود ہے اور اسی کی بناء پر انسان اشرف المخلوقات ہے، روح کوئی خیالی شے نہیں، بلکہ اس کا ایک مشخص وجود ہے۔ جب کہا جاتا ہے 'یہ میری کتاب ہے' 'یہ میرا ہاتھ ہے یہ میرا دماغ ہے اور یہ میرا دل ہے' تو وہ روح ہی ہے جو تمام اشیاء پر اپنی ملکیت جتلا رہی ہوتی ہے۔ روح 'قرآن مجید کی اصطلاح ہے' فلاسفہ اس کو 'میں' 'انا' اور 'EGO' کہتے ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے اسے خودی کہہ کر اس کی خدا کے ساتھ نسبت کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جسم خاکی الاصل ہے اور ایک مادی وجود ہے جبکہ روح ایک آسمانی نور ہے۔ دماغ انسان کے جسدِ خاکی کا ایک عضو ہے روح کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ بعینہٖ معاملہ منبع روح یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے ۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے — داکبرؔ

جسم اور روح کا تعلق : گھوڑے اور سوار کی طرح کا معاملہ جسم اور روح کا ہے۔ روح جسم کی سوار ہے۔ جس طرح ایک اچھا سوار اپنے گھوڑے سے مرضی کے مطابق کام لیتا ہے اور اس کے برعکس بے قابو گھوڑا اپنے سوار کو بھی کسی کھڈ میں جا گراتا ہے، اسی طرح ایک قوی روح جسم سے بہتر سے بہتر کام لیتی ہے۔ لیکن اگر جسم کی قوت غالب آ جائے تو وہ روح کو بھی ہلاک کر دیتا ہے۔

---

[1] فنفخت فیہ من روحی

رُوح اور جسم کا فطری تقابل: اصولاً ہر چیز اپنے اصل اور ORIGIN کی طرف لوٹتی ہے۔ لہٰذا جسم زمین ہی میں دفن ہوتا ہے اور روح آسمان کی طرف پرواز کرتی ہے۔ مگر اس کے باوجود امتحان کی غرض سے زندگی کے ایک معین عرصے میں پہلی دفعہ روح اور جسم کو جوڑا جاتا ہے اس وقفۂ زندگی میں فطری تقابل کی بنا پر روح اپنی حکومت چاہتی ہے اور جسم اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ ایسے میں اگر روح کمزور پڑ جائے اور جسم کو بے جا ڈھیل مل جائے تو انسان کو اونچا کرنے والی نیک خواہشات پر جسم کی گھٹیا خواہشات کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً انسان نیک خواہشات رکھتے ہوئے بھی برائی ہی کرتا ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی (غالب)

صوم کا مذہبی مفہوم اور حصولِ تقویٰ: مذاہب میں بھی گھوڑے کی تربیت والے عمل کی طرح روح کے غلبے کو مضبوط کرنے والی ایک پریکٹیس کو صوم ہی کہا گیا جس میں جسم کی جائز فطری خواہشات پر بھی کچھ دیر کے لئے پابندی عائد کر کے جسم کو پہلے روح کے مقابلے میں کمزور کیا جاتا ہے۔ پھر جب روح غالب آجاتی ہے تو جسم کو توانا بنا کر اسی سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتی ہے کیونکہ محدود مدت میں جائز خواہشات پر کنٹرول آئندہ کم از کم ناجائز خواہشات سے بچنے میں ضرور مدد دیتا ہے' یہ تو ہوا 'تقویٰ' یا 'بچ جانا' لیکن مثبت طور پر انسان کے دل میں اپنے خالق سے ملنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس جذبے کی تسکین کے لئے وہ اللہ سے مدد اور رہنمائی کا طالب ہوتا ہے۔ اس رکوع کی دوسری آیت میں روزے کے کچھ ابتدائی احکام بیان ہوئے جن میں سے ایک حکم بعد میں منسوخ بھی ہو گیا۔ رکوع کی تیسری آیت میں ماہِ رمضان کی فضیلت کی وجہ بتائی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے" رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا لوگوں کیلئے ہدایت بنا کر اور حق و باطل کے کھلے امتیازات کے

له ایاک نعبد و ایاک نستعین ۰ اھدنا الصراط المستقیم اور پھر اسی کی قبولیت ہے۔ لہٰذا قرآن مجید جو شروع ہوتا ہے ان الفاظ سے" الم ہ ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین یاد رہے کہ قرآن خود کو ھدی للناس بھی کہتا ہے لہٰذا یہ نازل تو ہوا ہے تمام لوگوں کے لئے رہنمائی بن کر مگر اس سے اصلی رہنمائی صرف وہی پاتے ہیں جو متقی ہوں۔

ساتھ۔ سو جو کوئی بھی تم میں سے اس ماہ میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو تو دوسرے ایام میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے سختی نہیں چاہتا کہ اس نے جو تم کو ہدایت بخشی ہے۔ اس پر اس کی بڑائی کرو تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔"

فضیلتِ ماہِ رمضان: ماہِ رمضان کی فضیلت کی وجہ یہ بتائی کہ اس میں اللہ کی عظیم نعمت قرآن کا نزول ہوا۔ اس نزول سے قرآن کا لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا میں نزول ہے جو اس ماہ کی ایک رات (لیلۃ القدر) میں ہوا۔

قرآن اللہ سے جڑنے کا ذریعہ: قرآن کو صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی مضبوط رسی قرار دیا اور اس کے ساتھ جڑ جانے کی وصیت کی اور خود قرآن نے بھی اس کو تھامنے کا حکم دیا۔[1] اس رسی کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا جبرئیلؑ اور حضورؐ کے واسطے سے امت تک پہنچا ہے' اور سا اللہ راضی ہو اصحابہ کرام سے اور اللہ کی رحمتیں ہوں محدثین حضرات پر کہ جنہوں نے پھولوں کی ان لڑیوں کو بھی محفوظ کیا جو حضورؐ نے اس رسی کے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے جابجا اس کے ساتھ ٹانکیں' میری مراد آپؐ کی پیاری احادیث اور آپؐ کی سنتِ مطہرہ سے ہے جو ان احادیث کے پہرے میں اس قرآن کو کتابِ ہدایت مانتے ہوئے اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اس کی تلاوت کا حق ادا کرتا ہے۔ اس پر پورا پورا عمل کرتا ہے[2] اور ساتھ ہی اس کی تبلیغ کا حق ادا کرتا ہے تو وہ اس رسی کو اس طرح تھام لیتا ہے جس طرح اس کو تھام لینے کا حق ہے[3]۔ ذرا غور کیجئے اب وہ بیک وقت اللہ اور اس کے مقرب بندوں سے جڑ گیا۔ پھر کیوں نہ اللہ کے اس عظیم احسان پر اللہ کی بڑائی بیان کی جائے اور اس کا شکر بجا لایا جائے۔ چوتھی آیت میں فرمایا:

" اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو آپ ان کو بتا دیجئے کہ میں ان کے بہت قریب ہوں' جب دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا کو سنتا اور قبول کرتا ہوں پس ان کو بھی چاہیئے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ ہی پر ایمان لائیں تاکہ وہ (دائمی) ہدایت پائیں۔"

روح کی پاکیزگی' اللہ سے رابطہ اور دعا کی حقیقت: روحِ انسانی جو درحقیقت

---

[1] اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور پھر تفرقہ نہ ڈالو (آل عمران)

[2] ان: جس نے کمائی (خواہ) ایک برائی اور اس پر ڈیرہ ڈال دیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں [illegible]

[3] مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق مولفہ ڈاکٹر اسرار احمد

روحِ ربانی ہے جب ایک متقی آدمی کے تمسک بالقرآن کی بدولت پاکیزگی کے جملہ مدارج طے کرتی ہوئی انتہائی شفاف ہو جاتی ہے تو اس کی مثال سورج کی ایک ایسی شعاع کی سی ہوتی ہے جو بغیر کسی اسکاوٹ کے زمین تک پہنچ رہی ہو اور چونکہ اسے کوئی چیز راستے میں قطع نہیں کرتی۔ لہٰذا وہ سورج سے علیحدہ ہونے کے باوجود اس سے اپنا تعلق قائم رکھتی ہے۔ گویا ایک مومن اپنے دل میں خدا کو ہر وقت موجود پاتا ہے۔ کیونکہ دل ہی اس روح کا مسکن ہے جو خدا سے براہِ راست رابطہ رکھتی ہے، تو اب مومن کی دعا اور پکار زبان اور الفاظ کی محتاج نہیں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا اسلام اللہ علیہا سے جو غلطی سرزد ہوئی تو اس پر انہوں نے اللہ کے سامنے دل میں گہری ندامت کا اظہار کیا تو اللہ نے خود ان کو الفاظ بھی تلقین فرما دیئے۔

دعا اور علمِ انسانی: انسانی کا علم محدود بلکہ مفقود ہے اور یہ اپنی اچھائی اور برائی سے ناواقف ہے[ل] اور یہ اسی بات کا نتیجہ ہے جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۱ میں فرمایا ہے کہ انسان اس قدر جلدباز ہے کہ اچھائی کے بدلے برائی مانگ بیٹھتا ہے۔ یعنی اللہ کی کسی نعمت کی حکمت کو سمجھے بغیر اس کے فوری نتائج سے گھبرا کر اس نعمت سے اپنی تنگی کا اظہار اللہ سے کر دیتا ہے اور اللہ سے اس خیر کی بجائے شر کی دعا مانگتا ہے۔

بندے کی دعا اور مالک کا ردِّ عمل: اللہ جو ہمارا ہم سے زیادہ خیرخواہ ہے اگر ہمیں ہماری مرضی کے مطابق عطا نہ کرے تو یہ بات ہرگز دل میں نہ آئے کہ وہ چیز کیوں نہیں ملی۔ کیونکہ اس کے نہ ملنے میں ہمارے نہ جانے کتنے فائدے مضمر ہوتے ہیں۔ بچہ کھیلنا چاہتا ہے مگر بچے کے والدین جو بچے کے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ خیرخواہ ہوتے ہیں۔ اپنے لختِ جگر کو اس کی خواہش کے خلاف سکول بھیجتے ہیں۔ کیونکہ وہ تعلیم کو نتیجتاً اپنے بچے کے حق میں بہتر سمجھتے ہیں، اور عقلمند والدین بچے کی ہر اچھی بری خواہش کبھی پورا نہیں کرتے[ش] تو ہمارا مالک و خالق ہمیں اگر

ل حضورؐ نے فرمایا: اللہ کو اپنی مخلوق سے اس قدر سے محبت ہے کہ جس قدر ایک شفیق ترین باپ کو اپنی اولاد سے بھی نہیں ہوتی۔

ش ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو مگر وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے تم ایک چیز کو پسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہو اور اللہ تو جانتا ہے مگر تم نہیں جانتے (البقرۃ آیت ۲۱۶)

ہماری خواہش کے مطابق عطا نہیں کرتا تو ہمارے ہی فائدے کے لئے اور پھر یہ اس کی شفقت کا نتیجہ ہے کہ وہ ہماری جو خواہش دنیا کے اعتبار سے قبول نہیں کرتا اُس پر بھی آخرت میں اجر محفوظ رکھتا ہے کیونکہ وہ شاید اس سے بڑھ کر اور اس کسی بات سے خوش نہیں ہوتا کہ اس کا بندہ صرف اسی کو پکار رہا ہے۔

خلاصۂ کلام : روزہ حصول تقویٰ کے لئے ہے اور تقویٰ قرآن سے جڑنے کیلئے ہے اور قرآنِ مجید ذریعہ ہے اللہ کی معرفت دلانے کا اور اللہ سے جوڑنے کا جبکہ تعلق مع اللہ کا مظہر اتم ' دعا ' ہے کہ انسان براہ راست پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ خالص نجی سطح پر اپنے رب سے مخاطب ہو سکے اور اس کو پکار سکے۔ اسی لئے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو عبادت کا اصل جوہر قرار دیا۔ یاد رہے کہ تمام عبادات کا اصل مقصود یہی ہے۔ نماز، زکوٰۃ اور حج بھی اس منزل کو پہنچنے کے ذریعے ہیں جو روزے ہی کی طرح خود اللہ نے تلقین فرمائے ہیں۔ دراصل عبادت دعا ہی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " الدعاء ھو العبادۃ " اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا صحیح تعلق نصیب فرمائے۔
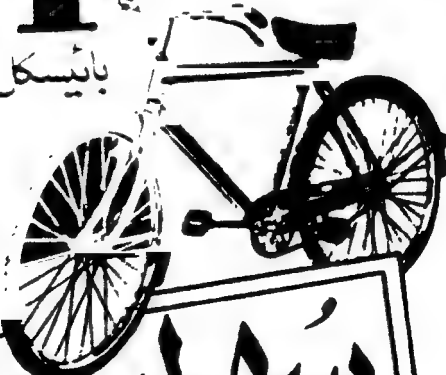
فتحِ مُبین

صُلح حدیبیہ ٥ فتحِ خیبر اور فتحِ مکّہ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے

ساتویں خطاب کی پہلی قسط

ترتیب و تسوید جمیل الرحمٰن

٥

الحمد للہ وکفٰی والصّلوٰۃ والسّلام علٰی عبادہِ الذین اصطفٰی خصوصًا علٰی افضلھم خاتم النبیّین محمدؐ الامین وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔ امّا بعد

فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ فی السورۃ الفتح

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم ۝ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ۝

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۝ ـــ

محترم ڈاکٹر صاحب نے بعد ازاں اسی سورہ مبارکہ کی آیت ۱۸ اور آخری آیات ۲۷ تا ۲۹ کی تلاوت فرمائی۔ نیز ادعیہ مسنونہ و ماثورہ پڑھیں اور فرمایا:

حضرات! پچھلے جمعہ کو ہم سیرت النبی علٰی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے مطالعہ کے سلسلہ میں غزوۂ احزاب کے ایک سال بعد عمرہ کے لئے حضورؐ کے آغازِ سفر کے ذکر تک پہنچ گئے تھے۔ یہ سفر عمرہ کی بجائے صلح حدیبیہ پر منتج ہوا جو ماہ ذیقعدہ ۶ھ میں منعقد ہوئی۔ یہ صلح سیرت النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم یا ہمارے زیرِ بحث موضوع کے اعتبار سے نبی اکرمؐ کی انقلابی جد و جہد میں ایک

بہت اہم موڑ (Turning Point) کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ آج آغاز میں سورۂ فتح کی جن آیاتِ مبارکہ کی میں نے تلاوت کی ہے۔ ان میں پہلی آیت جس سے یہ سورۂ مبارکہ شروع ہوئی ہے' یہ ہے کہ:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًاO "(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپؐ کو ایک نہایت روشن اور واضح اور کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی ہے"

میں چاہتا ہوں کہ صلح حدیبیہ کے بارے میں آج قدرے تفصیل سے گفتگو ہو۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ سیرت النبیؐ کا ہمارا یہ مطالعہ اس خاص زاویۂ نگاہ اور نقطۂ نظر سے ہو رہا ہے کہ ہم انقلابی جدوجہد کے مراحل' مدارج اور لوازم کو سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے حوالے سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہمیں اپنی جدوجہد کے لئے ان سے رہنمائی حاصل ہو۔

میں پچھلی مرتبہ یہ عرض کر چکا ہوں کہ غزوۂ احزاب کے بعد نبی اکرمؐ نے اہلِ ایمان سے یہ فرمایا تھا کہ: لَنْ تَغْزُوکُم قُرَیْش بَعْدَ عَامِکُم ھٰذَا وَلٰکِنَّکُمْ تَغْزُوْنَھُم۔ یعنی اس سال کے بعد قریش کو یہ جرأت نہیں ہوگی کہ وہ تم پر حملہ آور ہوں۔ یہ آخری بار تھی انہوں نے تم پر چڑھائی کی ہے۔ آئندہ Initiative تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔ یعنی آئندہ پہل تمہاری جانب سے ہوگی۔ اب اقدام تم کرو گے۔

حضورؐ کا خواب چنانچہ اگلے ہی سال ۶ ھ میں آپؐ نے خواب دیکھا اور آپ کو معلوم ہے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ جس میں آپؐ کو یہ دکھایا گیا کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہلِ ایمانؓ عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیبی اشارہ اور حکم سمجھ کر اعلانِ عام کرا دیا کہ ہم عمرہ کے لئے جائیں گے جو ہمارے ساتھ جانا چاہے وہ چلے۔ ساتھ چلنے والے صحابہ کرامؓ کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ چودہ سو سے لے کر دو ہزار تک کی تعداد کا ذکر احادیث کی مختلف روایات میں ملتا ہے۔ تاہم زیادہ تر روایات کے مطابق تعداد چودہ سو تھی۔ ذوالحلیفہ کا مقام مدینہ سے تقریباً سات آٹھ میل باہر ہے۔ یہاں سے عمرہ یا حج کے لئے احرام باندھنے کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ وہاں حضورؐ اور تمام ساتھیوں نے عمرہ کا احرام باندھا اور جو ھدی (قربانی) کے جانور ساتھ تھے' ان کے گلوں میں پٹے ڈال دیئے گئے جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ جانور قربانی کے ہیں۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر آپؐ نے مکہ کی طرف سفر جاری رکھا۔ حتیٰ کہ حدیبیہ کے مقام پر جا کر پڑاؤ کیا۔ اسی مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین

قریش کے مابین وہ صلح منعقد ہوئی جو تاریخ میں "صلح حدیبیہ" کے نام سے موسوم ہے اور جسے قرآن حکیم نے سورہ الفتح میں "فتح مبین" قرار دیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر حدیبیہ کے مقام پر قیام فرمایا، اُدھر قریش

اہلِ مکّہ کا ردِّ عمل

کے علم میں آگیا کہ حضورؐ عمرہ کے ارادہ سے تشریف لائے ہیں تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو کسی صورت میں بھی مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ بلکہ انہوں نے اپنے تمام حلیفوں کو پیغام بھیج دیا کہ وہ سب آئیں اور قریش کی مدد کریں تاکہ سب مجتمع ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا راستہ روک سکیں۔ نبی اکرم کو بھی یہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ بدیل ابن ورقہ خزاعی بنوخزاعہ کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جو مکّہ اور مدینہ کے مابین آباد تھا۔ اس قبیلہ کا کچھ دوستانہ تعلق قریش کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی تھا۔ تو حضورؐ نے بدیل ابن ورقہ کو اس کام کے لئے مامور کیا کہ وہ مکّہ والوں کی خبر لا کر دیں کہ صورت حال کیا ہے! انہوں نے آکر خبر دی کہ قریش نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے اور ان کا عزم مصمّم ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی آپؐ کو مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم مکّہ جا کر قریش سے ہماری طرف سے کہو کہ ہمارا جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کسی سے لڑنے بھڑنے کی ہماری کوئی نیت نہیں ہے۔ ہم محض عمرہ کے لئے آنا چاہتے ہیں۔ اور قریش کو سمجھاؤ کہ تمہیں پہلے بھی ان جنگوں کے سلسلہ نے بہت نقصان پہنچا دیا ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ ہمارے اور ان کے مابین کچھ عرصہ کے لئے صلح ہو جائے اور قریش ہمیں عرب کے دوسرے قبائل سے نمٹنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں تاکہ ہم بقیہ عرب کے ساتھ اپنے معاملات طے کر لیں۔ اسی میں خیر ہے، اسی میں بہتری ہے۔ وہ ہمیں پُرامن طور پر عمرہ کرنے دیں اور مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیں۔ حضورؐ کے اس پیغام کے ساتھ بدیل ابن ورقہ مکّہ پہنچے۔ وہاں ان کی ایک بڑی چوپال میں جا کر جہاں قریش کے مختلف بڑے بڑے گھرانوں کے سردار جمع تھے، انہوں نے کہا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں۔ اگر آپ حضرات اجازت دیں تو عرض کروں!

—— شاید انہوں نے یہ انداز اس لئے اختیار کیا ہوگا کہ پہلے یہ اندازہ ہو جائے کہ قریش کا موڈ (MOOD) کیا ہے! ان کا ارادہ کیا ہے اور رجحان کیا ہے! آپ کو یاد ہوگا کہ قریش کے دو مختلف طبقات کی مزاجی و نفسیاتی کیفیات کی تفہیم کے لئے میں انگریزی زبان کی دو اصطلاحات استعمال کرتا رہا ہوں۔ ایک HAWKS اور دوسری DOVES۔ تو ان میں جو HAWKS تھے یعنی مشتعل

زاج اور جنگ جو لوگ، انہوں نے تو فوراً کہا کہ ہم کوئی بات سننے کے لئے نہ تیار ہیں اور نہ ہمیں اس کوئی ضرورت اور حاجت ہے۔ لیکن جیسا کہ میں بار ہا عرض کر چکا ہوں کہ ہر طرح کے لوگ ہر دور میں معاشرہ میں موجود رہے ہیں۔ خدا پنج انگشت یک ساں نہ کرد۔ وہاں کچھ نسبتاً حلیم الطبع اور صلح جو (Doves) بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں! ہمیں بات سننی چاہیئے اور بدیل سے کہا سناؤ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے کیا ہیں! انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام من وعن سُنا دیا۔

عروہ ابن مسعود ثقفی کا مدبرانہ رویہ

اس وقت طائف کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے سردار عروہ ابن مسعود ثقفی بھی وہاں موجود تھے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مکہ اور طائف کو جڑواں شہروں (Twin cities) کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے مابین رشتہ داریاں بھی بہت تھیں اور مکہ کے اکثر رؤسا کی جائیدادیں اور باغات بھی طائف میں کثرت سے تھے۔ اس موقع پہ ان ثقفی سردار عروہ ابن مسعود نے کھڑے ہو کر کہا۔ "اے قریش! کیا میں تمہارے لئے باپ کی مانند نہیں ہوں! اور کیا تم میرے بچوں کی مانند نہیں ہو!" چونکہ معمر اور بزرگ تھے اس لئے انہوں نے یہ انداز اختیار کیا۔۔۔ بعد میں یہ ایمان لے آئے تھے اور انہیں صحابی ہونے کا شرف حاصل ہے لہٰذا میں ان کا نام ادب سے لے رہا ہوں۔۔۔ مجلس کے شرکا نے کہا "ایسا ہی ہے" پھر انہوں نے کہا کہ "کیا تمہیں مجھ پر اعتماد ہے کہ میں جو کچھ کہوں گا تمہاری بہتری کے لئے کہوں گا"۔۔۔ لوگوں نے جواب میں کہا کہ ہاں ہمیں اس پر بھی اعتماد ہے۔۔۔ تو انہوں نے کہا مجھے اجازت دو کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤں اور ان سے بات چیت کروں۔ لوگوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔

عروہ ابن مسعود کی نبی اکرمؐ سے گفت و شنید!!

حدیبیہ میں جہاں حضورؐ اور صحابہؓ کا پڑاؤ تھا، عروہ وہاں آئے۔ وہ بہت ہی زیرک، دانا اور بہت ہی مدبر انسان تھے۔ آخر ثقیف کے سردار تھے۔ جو قریش کے بعد سب سے معزز قبیلہ شمار ہوتا تھا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے لشکر کے ماحول اور نظم و ضبط کا ایک اندازہ قائم کرنے کے لئے بھرپور جائزہ لیا پھر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلے تو انہوں نے خوفزدہ کرنے کا انداز اختیار کیا اور انہوں نے کہا کہ:

"محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک طرف قریش اور ان کے حلیف ہیں۔ ان کی پوری قوت مجتمع ہے۔ اور ان کا فیصلہ ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، وہ اس پر تُلے ہوئے ہیں۔ اب تم

دیکھ لو کہ اگر جنگ ہوئی اور بالفرض تم نے مکہ والوں کو ختم کر دیا تو کیا یہ کوئی اچھی بات ہو گی! اس سے پہلے کیا کسی شریف انسان کی ایسی مثال موجود ہے کہ اس نے اس طرح اپنے ہی قبیلہ کو ختم کر دیا ہو! اور اگر معاملہ برعکس ہوا تو میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ جو جمعیت ہے وہ تو مختلف قبائل سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے۔ (گویا کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑہ والا معاملہ ہے) شکست اور ہزیمت کی صورت میں یہ سب تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ ان میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ کھڑا نہیں رہے گا۔"

عروہ ابن مسعود کے پیش نظر چونکہ قبائلی نظام تھا اور جانتے تھے کہ قبائل تو عموماً حمیتِ قبائلی کے تحت لڑتے تھے جبکہ امر واقعہ یہی تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جمعیت مختلف قبائل کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ عروہ ابن مسعود نے یہ بات اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہی تھی۔

صدیق اکبرؓ کا ردِ عمل

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ تھے۔ اُن کو عروہ ابن مسعود کی اس بات پر طیش آگیا ـــ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ حضرت ابوبکرؓ کی پوری زندگی میں اُن کی زبان سے کبھی کوئی ناشائستہ جملہ نکلا ہو لیکن اس وقت طیش کی حالت میں انؓ کی زبان سے عروہ کے لئے ایک عریاں گالی نکل گئی اور انہوںؓ نے کہا کہ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو چھوڑ دیں گے۔ خدا کی قسم ہم انؐ کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔"

گالی سُن کر عروہ نے پوچھا کہ "یہ کون ہیں"۔ بتایا گیا کہ یہ ابوبکرؓ ہیں۔ تو عروہ نے کہا کہ "ان کا مجھ پر ایک احسان ہے۔ اگر ان کا وہ احسان مجھ پر نہ ہوتا تو آج میں انہیں اس گالی کا جواب دیتا۔"

عُروہ کا گستاخانہ انداز

اس کے بعد عروہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے گفتگو کرتے ہوئے یہ گستاخانہ انداز اختیار کیا کہ بار بار حضورؐ کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتے۔ وہ شاید یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ حضورؐ کے ساتھیوںؓ کا انداز ہے کیا؟ ـــــ حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحیثیت محافظ وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے عروہ کی بار بار کی یہ حرکت دیکھ کر اپنی تلوار کا دستہ ان کے ہاتھ پر مارا اور کہا کہ آئندہ یہ ہاتھ حضورؐ کی ریش مبارک تک بڑھا تو قطع ہو جائے گا۔ واپس نہیں جا سکے گا ـــ بہرحال عروہ یہ گفتگو کر کے اور ایک تاثر قائم کر کے واپس مکہ چلے گئے۔

عُروہ کا قریش کے سامنے اپنے تاثرات کا اظہار

مکہ پہنچ کر عروہ ابن مسعود نے قریش کے سرداروں کے سامنے جو رپورٹ پیش کی اس سے ان کے ان تاثرات کا اندازہ ہوتا ہے جو اہلِ ایمان کے لشکر کے نظم و ضبط، ان کے جوش و خروش اور ان کی فدائیانہ کیفیات کو دیکھ کر ان کے دل و دماغ پر مترتب ہوا تھا۔ انہوں نے کہا:

"اے قریش کے لوگو! دیکھو، میں قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں گیا ہوں میں نے ان کے دربار دیکھے ہیں۔ ان کا ٹھاٹھ باٹھ دیکھا ہے۔ لیکن خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو اس کی اپنی قوم میں ایسا محترم نہیں دیکھا جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے اصحاب میں دیکھا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہیں ان کو جتنی محبت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہے اور جتنی عقیدت و توقیر اور عزت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ان کے دلوں میں ہے، اور اپنے دین کی جو حمیت اور فدائیانہ جذبہ ان کے دلوں میں ہے، وہ مجھے پوری زندگی میں کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وضو کرتے ہیں تو لوگ ان کے وضو کے پانی کو تبرک کے طور پر لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں اگر وہ تھوکتے ہیں یا ان کے دہن سے بلغم نکلتا ہے تو لوگ اسے جھپٹ لیتے ہیں اور اس کو اپنے ہاتھوں اور چہروں پر مل لیتے ہیں۔ یہ محبت میں نے کسی قوم میں اپنے سردار اور قائد حتیٰ کہ کسی بادشاہ تک کے لئے نہیں دیکھی۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم ان سے مت بھڑو، ان سے جنگ کا ارادہ ترک کردو اور مصالحت کر لو۔"

قریش کے جوشیلے افراد کا ردِ عمل ـــ

اس پر وہاں بڑا شور و غوغا ہوا کہ ہم مصالحت کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو واپس جانا پڑے گا ورنہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی اور ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کسی صورت میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے یہی پیغام اپنے دو دوسرے اشخاص کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا لیکن کوئی بات بنتی نظر نہیں آئی۔ کوئی بھی اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ تناؤ اور TENSION کی کیفیت برقرار رہی

کیفیت برقرار رہی ۔

قریش کے رویہ میں لچک — اور سہیل ابن عمرو کا گفتگو کے لئے تقرر

جب قریش نے ایک طرف یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی دھمکی سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔ دوسری طرف ان کے حلیم الطبع اشخاص نے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا اور قریش کے سامنے خون ریزی کے ہولناک نتائج رکھے تو بالآخر ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اگر کوئی مصالحت ہو جائے تو وہ بہتر ہوگا۔ لہٰذا آخرکار انہوں نے مصالحانہ گفتگو کے لئے سہیل ابن عمرو کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سہیل ابن عمرو ان کے بڑے متحمل اور مدبر سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب نبی اکرمؐ کو خبر ملی کہ اس مرتبہ سہیل ابن عمرو گفتگو کے لئے آئے ہیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس کا مطلب ہے کہ قریش مصالحت پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سہیل ابن عمرو کے مابین جو گفتگو ہوئی جس کے نتیجہ میں صلح نامہ حدیبیہ طے پایا اس کا ذکر میں آگے کروں گا۔ فی الحال یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ فتح مکہ کے بعد یہ سہیل ابن عمرو بھی ایمان لے آئے اور حضورؐ کے صحابی ہونے کے شرف سے مشرف ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ارتداد کا جو فتنہ اٹھا اس کے اثرات مکہ تک بھی پہنچے لیکن یہ سہیل ابن عمرو رضی اللہ عنہ نہ صرف خود ثابت قدم اور اسلام پر قائم رہے بلکہ چونکہ نہایت شعلہ بیان خطیب بھی تھے۔ لہٰذا اپنے مؤثر و مدلل خطبات کے ذریعہ مکہ والوں کو اس فتنۂ ارتداد سے بچانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔

مصالحت کے لئے نبی اکرمؐ کی طرف سے مساعی —

یہ تو ایک طرف کی داستان تھی جو میں نے آپ کو سنائی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر مقیم ہونے کے بعد بدیل ابن ورقہ خزاعی کے ذریعہ پہلا پیغام بھیجا تھا۔ جس کے نتیجہ میں پہلے عروہ ابن مسعود حضورؐ کی خدمت میں گفتگو کے لئے آئے تھے اور اس کے بعد قریش کے چند مشتعل مزاج (HOT HEADS) لوگ آپؐ کے پاس آئے لیکن ان کا رویہ مصالحانہ نہیں تھا بلکہ جارحانہ اور رعب ڈالنے والا تھا۔ سہیل ابن عمرو کے آنے سے قبل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سلسلہ جنبانی شروع کرنے کا ارادہ فرمایا یعنی اپنے اصحابؓ میں سے کسی کو مکہ والوں کے پاس افہام و تفہیم کے لئے بھیجا جائے تو سب سے پہلے آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ تم مکہ جاؤ اور قریش سے مصالحت کی کوشش کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ حضورؐ اب مکہ میں میرا کوئی ایسا رشتہ دار نہیں ہے کہ جس کی امان و حمایت میں، میں مکہ میں داخل ہو سکوں۔ ہو سکتا

ہے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی بغیر بات چیت کے قتل کر دیں تو میں تجویز کرتا ہوں کہ میری بجائے عثمانؓ ابن عفان کو بھیجیے۔ ان کا قبیلہ بنو امیہ بہت مضبوط ہے۔ ان کے بہت سے قریبی رشتہ دار بھی وہاں موجود ہیں جن میں سے کسی کی بھی امان و حمایت میں وہ مکہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ تعالیٰ کو مکہ جانے کا حکم فرمایا اور وہ تعمیلِ حکم میں مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ کا مکہ پہنچنا۔ اُنؓ کی شہادت کی افواہ کا پھیلنا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس سفارت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب آں جنابؓ کی بے شمار فضیلتوں میں سے ایک فضیلت ہے۔ بہرحال حضرت عثمانؓ ابھی مکہ میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ باہر ہی ان کو اپنے چچازاد بھائی ابان ابن سعید ابن عاص مل گئے۔ انہوں نے آنجنابؓ کو اپنی پناہ اور حمایت میں لے لیا اور اس طرح حضرت عثمانؓ قریش کے پاس پہنچ گئے۔ گفت و شنید کا سلسلہ دو تین روز تک چلتا رہا اگرچہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مصالحت پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اب جب تم مکہ میں آ ہی گئے ہو تو ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم کعبہ کا طواف کر لو[1]۔

گفت و شنید میں جو دیر لگی۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے دانستہ ایسے حالات پیدا کیے، گویا وہ حضرت عثمانؓ کو مکہ میں روکے رکھنا چاہتے ہیں۔ اس ایک نوع کی وہ کیفیت پیدا ہو گئی جسے آج کل کی سیاسی اصطلاح میں 'نظر بندی' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ادھر حالات یہ خبر اڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔

بیعتِ رضوان : بیعت علی الموت

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی تو آپؐ نے وہ بیعت لی جو کتبِ سیر میں 'بیعتِ رضوان' کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ اور جس کا ذکر سورۂ فتح کی آیت نمبر ۱۸ میں ہے۔ پہلے آیت سن لیجیے جس سے بیعتِ رضوان' کی اصطلاح

---

[1] حضرت عثمانؓ کے مکہ جانے کے بعد بعض اصحابِ رسولؐ نے کہا کہ "عثمانؓ کو خانہ کعبہ کا طواف مبارک ہو" حضورؐ تک جب یہ قول پہنچا تو حضورؐ نے فرمایا کہ "مجھے یقین ہے کہ اگر عثمانؓ عرصہ دراز تک بھی مکہ میں رہ جائیں تو بھی وہ اس وقت تک طواف نہیں کریں گے جب تک میں طواف نہ کر لوں" (مرتب)

ماخوذ ہے :۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝

"(اے نبیؐ) بے شک اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے اور اُسے ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ لہٰذا اس نے ان پر سکینہ یعنی قلبی اطمینان و سکون نازل فرمایا اور انعام میں ان کو فتح قریب بخشی۔"

بیعت علی الموت

حدیبیہ کے مقام پر کوئی چھوٹا سا درخت تھا جس کے سایہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہو گئے اور وہاں آپؐ نے فرمایا کہ "اب ہر مسلمان مجھ سے بیعت کرے۔ ایک عہد کرے" ـــــ اس بیعت کے بارے میں دو روایات ہمیں ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ بیعت علی الموت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہر مسلمان میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرے کہ چاہے ہم سب یہاں ہلاک ہو جائیں لیکن عثمانؓ کے قتل اور خون کا بدلہ لئے بغیر ہم یہاں سے ہرگز نہیں ہٹیں گے"۔ دوسری روایت ہے کہ اس بات پر بیعت لی گئی کہ : اَنْ لَا نَفِرَّ "ہم یہاں سے بھاگیں گے نہیں۔ پیٹھ نہیں موڑیں گے۔ فرار اختیار نہیں کریں گے"۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ بیعت کے اس وقت جو الفاظ ہوں ان میں یہ دونوں چیزیں شامل ہوں ـــ بہرحال اس بیعت کا جو مقصد سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی حالت میں پیٹھ نہیں دکھانی ہے۔ میدان سے جان بچا کر نہیں جانا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جان بچانے کی چند شکلیں وہ ہیں جن کی سورۂ انفال کے اندر اجازت دی گئی ہے۔ جن کو جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ پینترا بدلنا مقصود ہو یا کوئی جنگی حکمت عملی (Strategy) ہو جس کا تقاضا ہے کہ پیچھے ہٹ جایا جائے۔ تو گویا یہاں اس امر کا فیصلہ ہو گیا کہ کسی صورت میں بھی یہاں سے نہیں ہٹنا۔ اب یہاں سے کوئی Strategic Retreat یعنی جنگی حکمت عملی کے تحت بھی پسپائی نہیں ہے۔ رہا جان بچا کر بھگدڑ کا معاملہ تو یہ عمل گناہِ کبیرہ میں شامل ہے۔ گویا یہ بیعت علی الموت تھی کہ ہر شخص میدان میں ڈٹا رہے گا صرف موت ہی اسے اس جنگ سے رستگاری دے سکے گی۔

حضرت عثمانؓ کی مزید فضیلتیں

زبان ترجمانِ وحی جناب محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بے شمار فضائل و مناقب مروی ہیں۔ ان کے علاوہ سیرت عثمانی کے متعدد واقعات ہیں جو آنجنابؓ کی فضیلتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں سے دو فضیلتیں وہ ہیں کہ حضرت عثمان کی عدم موجودگی کے باوجود حضورؐ نے گویا انؓ کو موجود قرار دیا۔ پہلا موقع غزوۂ بدر کا ہے۔ آنجنابؓ کی اہلیہ اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی لختِ جگر حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کافی علیل تھیں۔ اس لئے ان کی تیمارداری کے لیے حضورؐ نے آنجنابؓ کو مدینہ میں چھوڑ دیا تھا اور انؓ کو اس لشکر میں شامل نہیں فرمایا تھا جو اوّلاً تو ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کو INTERCEPT کرنے کے لئے نکلا تھا۔ لیکن بالآخر غزوۂ بدر پر منتج ہوا تھا۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عثمانؓ کو بدر کے مالِ غنیمت میں سے وہی حصّہ مرحمت فرمایا جو دوسرے بدری صحابہؓ کو مرحمت کیا گیا تھا۔ گویا حضورؐ نے انؓ کو مجازی طور پر اس غزوہ میں شریک قرار دیا جبکہ حقیقی طور پر وہ شریک نہیں تھے۔

دوسرا موقع حدیبیہ کے مقام پر پیش آیا۔ حضرت عثمانؓ چونکہ موجود نہیں تھے۔ لہٰذا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خود ہی اپنا ایک دستِ مبارک دوسرے دستِ مبارک پر رکھ کر ارشاد فرمایا کہ "یہ عثمانؓ کا ہاتھ ہے اور یہ عثمانؓ کی طرف سے بیعت ہے"۔ یہ بھی درحقیقت حضرت عثمانؓ کے فضائل میں بہت بلند مقام ہے اور یہ بہت بڑی سعادت ہے جو اس روز انؓ کو حاصل ہوئی ۔۔۔

پھر یہ کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خونِ عثمانؓ کے قصاص کے لئے حدیبیہ کے مقام پر موجود تمام صحابہ کرامؓ سے یہ بیعت لی ہے جن کی مختلف تعداد بیان ہوئی ہے لیکن مستند ترین روایات میں چودہ سو کی تعداد کا ذکر ہے۔ یہ بھی انتہائی اعلیٰ مرتبہ ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا ہے اور جیسا کہ میں سورۂ فتح کی آیت نمبر ۱۰ کے حوالہ سے عرض کر چکا ہوں کہ یہ وہ بیعت ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی اور خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔ اور اس طرح بیعت کا یہ عظیم الشان واقعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام قرآن مجید میں ہمیشہ ہمیش کے لئے محفوظ فرما دیا ہے۔[1]

---

[1] حضرت عثمان ذو النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل و مناقب اور مظلومانہ شہادت پر محترم ڈاکٹر صاحب

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہاں یہ ضمنی بات بھی سمجھ لیجیے کہ حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں جب چند باغیوں نے ان تیسرے خلیفہ راشد کو مظلومانہ طور پر ناحق شہید کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو آنجناب رضی کے عہدِ خلافت میں ان لوگوں نے جو حضرتِ عثمان رضی کے خونِ ناحق کے قصاص کا مطالبہ لے کر کھڑے ہوئے تھے۔ اسی بیعتِ رضوان کے واقعہ کو بطورِ دلیل پیش کیا۔ چنانچہ اس قصاص کا مطالبہ لے کر کھڑی ہوئی تھیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان رضی کے ہم رکاب تھے حضرت زبیر ابن العوام اور حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

اس بیعت کی ضرورت کیا تھی؟ انتہائی غور طلب بات یہ ہے کہ حضورؐ کو یہ بیعت لینے کی ضرورت کیا تھی! حضورؐ کے ساتھ جو چودہ یا پندرہ سو افراد آئے تھے ان میں سے کوئی بھی اس بیعت میں پیچھے نہیں رہا۔ صرف ایک شخص جد ابن قیس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ وہ اپنے اونٹ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے اس نے بیعت نہیں کی۔ اس کے سوا بقیہ تمام لوگوں نے بیعت کی۔ اس شخص کا سفر تبوک کے ضمن میں بھی ذکر آتا ہے کہ اس موقعہ پر اس کا نفاق بالکل کھل گیا تھا۔ یہ درحقیقت منافق تھا۔ بہرحال اس بیعت کے بارے میں غور و فکر کے بعد میرا موقف یہ ہے کہ یہ درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد والوں کے لئے ایک سنت چھوڑی ہے۔ ورنہ حضورؐ کے ساتھ جو اشخاص آئے تھے ان میں سے جد ابن قیس جیسا کوئی دوسرا شخص شاید ہی ہو۔ اگر حضورؐ جنگ کا فیصلہ فرما دیتے تو بایقین سے عرض کرتا ہوں کہ ان مومنینِ صادقین میں سے کوئی شخص بھی کسی صورت میں پیٹھ پھیرنے والا نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود حضورؐ بیعت لے رہے ہیں تو درحقیقت یہ اس لئے لی گئی کہ بیعت کا یہ اصول اور بیعت کا یہ عمل آنے والوں کی رہنمائی کے لئے سیرت مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بحیثیت سنت ہمیشہ ہمیش کے لئے ثبت ہو جائے۔ یہ بیعتِ رضوان اس اعتبار سے ایک نہایت روشن دلیل ہے کہ کسی خاص اور اعلیٰ مقصد کے لئے جیسے ہجرت

(باقی صفحہ ۸۴ پر)

سلسل، کا ایک مؤثر خطاب - شہیدِ مظلوم کے عنوان سے طبع شدہ موجود ہے۔ جو مختصر ہونے کے باوجود انتہائی جامع ہے اور جس کو خواص و عوام سے بے حد خراجِ تحسین حاصل ہوا ہے۔ اس خطاب کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پانچ سال کے عرصہ میں یہ تقریباً چالیس ہزار کی تعداد میں نکل چکا ہے

تنظیمِ اسلامی کی خصوصی تربیت گاہ اور گیارہواں سالانہ اجتماع

ایک جائزہ اور اہم فیصلوں کا اعلان

مُرتّب : چوہدری غلام محمد (معتمد عمومی تنظیمِ اسلامی پاکستان)

الحمد للہ والمنۃ تنظیمِ اسلامی پاکستان کے زیرِ اہتمام ایک خصوصی تربیت گاہ کا انعقاد ۲۱ مارچ تا ۲۰ اپریل اور اس کے متصلاً بعد ۲۰ تا ۶ اپریل تنظیمِ اسلامی پاکستان کے گیارہویں سالانہ اجتماع کی تقریبات بحسن و خوبی انجام پذیر ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے اندرون و بیرون ملک کے بیشتر رفقائے تنظیمِ اسلامی نے ان تقریبات میں شرکت کی۔ تربیت گاہ کے دوران ہم نے روداد تنظیمِ اسلامی کے اہم حصص کا اجتماعی مطالعہ کیا اور اس طرح اس قافلہ کے سفرِ زندگی کے اہم معاملات اور کیفیات پر ہم نے نگاہِ بازگشت ڈالی۔ یہ مفید سلسلہ جہاں بعض نئے رفقاء کے لئے معلومات افزا، اور افہام و تفہیم کا موجب ہوا وہاں پرانے اور سینئر رفقاء کے لئے جائزہ اور احتساب کا ذریعہ بنا۔ الحمد للہ ہم نے یہ اطمینان حاصل کیا کہ اس دوران توفیقِ خداوندی سے کچھ پیشقدمی ہوئی ہے اور بفضلہ تعالیٰ ہمارے قدم اس راہ پر اور ہمارا رُخ اسی منزل کی جانب ہے جس کا تعین ہم نے ابتداء ہی میں قرآن و سُنت کی روشنی میں کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی اس عنایتِ خصوصی پر ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور آئندہ مراحل کے لئے بھی ہدایت و استقامت کے طلبگار ہیں۔ خصوصی تربیت گاہ میں پہلے ہفتہ کے دوران چائے شام کے اوقات بعض بزرگ نادرِ روزگار ہستیوں کی صحبت میں بسر ہوئے جو مختلف علوم دینیہ میں مقامِ بلند پر فائز ہیں اور جن کا وجود بہت غنیمت ہے۔ دوسرے ہفتہ کے دوران شام کے اوقات انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام ہفت روزہ محاضراتِ قرآنی کے لئے مختص رہے جس میں مختلف الخیال اصحابِ فکر و نظر نے امیرِ محترم کی تالیف "استحکامِ پاکستان" پر اظہارِ خیال کیا۔ تربیتی نقطۂ نظر سے یہ پروگرام بہت مفید ثابت ہوئے۔ مزید برآں تربیت گاہ کی کھلی فضا میں رفقائے تنظیم نے تنظیمی و حرکی امور پر بھرپور اظہارِ خیال کیا اور بہت مفید تجاویز سامنے آئیں۔ جن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جنابِ امیرِ تنظیمِ اسلامی نے آئندہ کے طریقِ عمل سے متعلق بعض اہم مناسب فیصلے فرمائے۔ جن کا اعلان وہ بنفسِ نفیس سالانہ اجتماع میں کر چکے ہیں۔ تاہم اس خطہ کے ذریعہ آپ کو ان کی باضابطہ اطلاع دی جاتی ہے۔

I تنظیم اسلامی کے انتظامی ڈھانچے کے متعلق امیر محترم نے مندرجہ ذیل تبدیلیوں کا اعلان فرمایا۔

۱۔ نائب امیر تنظیم اسلامی کا عہدہ ختم کر دیا گیا ہے۔

۲۔ میاں محمد نسیم صاحب آئندہ قیم تنظیم اسلامی پاکستان ہوں گے اور اندرون ملک تنظیم اسلامی کے تنظیمی و دعوتی امور کے ذمہ دار ہوں گے۔ امیر محترم کے اندرون ملک دوروں میں وہ امیر محترم کے ہمرکاب رہیں گے۔

۳۔ جناب قمر سعید قریشی صاحب قیم تنظیم اسلامی برائے بیرون پاکستان کی حیثیت سے بیرون پاکستان کے تنظیمی و دعوتی امور کے نگران ہوں گے اور بیرون ملک دوروں میں امیر محترم کا ساتھ دیں گے۔

۴۔ امیر محترم نے راقم الحروف کو معتمد عمومی تنظیم اسلامی پاکستان کی حیثیت سے مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان کی نگہداشت اور متعلقہ امور کی انجام دہی کی ذمہ داری تفویض فرمائی ہے۔

II جناب امیر تنظیم اسلامی نے اعلان فرمایا کہ ان شاء اللہ العزیز آئندہ سال ہم اپنی بھرپور مساعی استحکام پاکستان کی مہم پر صرف کریں گے۔ اس مقصد کے لئے رفقاء کو چاہیئے کہ اس کتاب "استحکام پاکستان" کا بغور مطالعہ کریں بالخصوص اس کا اول دا آخر تو اس پہلو سے انتہائی اہم ہے کہ یہ ہماری دعوت کا خلاصہ ہے اس کے متعلق تائیدی یا تنقیدی مضامین کا بھی وقت نظر سے جائزہ لیں ـــــ تحریر و تقریر سے اس کتاب کے مضامین کو اجاگر کریں۔ مذاکرہ اور تنقید و تبصرہ کی محافل کا اہتمام کریں۔ ان شاء اللہ العزیز اس کام سے وطن عزیز کی خدمت بھی ہوگی اور ہماری دعوت کے لئے بھی راستے کھلیں گے۔

III جناب امیر تنظیم اسلامی نے اس فیصلہ کا بھی اعلان فرمایا کہ ان شاء اللہ العزیز اب ہم مالیاتی نظام کے علاوہ اپنے نظام کو بالکلیہ نظام بیعت سے ہم آہنگ کر دیں گے نظام مالیات کے بارے میں عملاً کام جاری ہے کہ اس کے قواعد و ضوابط واضح ہوں اور ان کی پابندی کی جائے مجلس مشاورت ان امور پر غور کر رہی ہے گی۔ مردوں اور خواتین سے بیعت کے لئے قرآن و سنت سے ماخوذ الفاظ پر مشتمل نئے بیعت فارم تیار کر لئے گئے ہیں تنظیم اسلامی میں شمولیت کیلئے بیعت اب اصلاً تحریری ہی ہوگی تاہم مردوں کے لئے اس کی توثیق ہاتھ میں ہاتھ دیکر بیعت کرنے کے مسنون طریقے سے بھی جاری رہے گی تنظیم اسلامی کے موجودہ رفقاء کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ از سر نو جائزہ لیں۔ اگر تنظیم اسلامی کے مقاصد اور طریق کار کے فی الجملہ اتفاق اور آئندہ مراحل کے دوران ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ اور سمع و طاعت فی المعروف پر پوری طرح انشراح صدر محسوس ہو تو وہ بھی اس نئے بیعت فارم پر دستخط فرما کر تنظیم اسلامی کی رفاقت کے عہد کو از سر نو تازہ کر لیں۔ آئندہ تنظیم اسلامی کے رفیق وہی شمار ہوں گے جن کی جانب سے یہ نئے بیعت فارم دستخط شدہ موصول ہوں گے۔ نئے بیعت فارم کے حصول کے لیے رفقاء تنظیم سے التماس ہے کہ براہ کرم اپنے مقامی

امیر تنظیم اسلامی سے رابطہ فرمائیں یا مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان سے بذریعہ ڈاک طلب فرمائیں۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

منیر محمود

(چوہدری غلام محمد)
معتمد عمومی تنظیم اسلامی پاکستان

بقیہ : مراحلِ انقلاب

و جہاد ، بیعت لینا سنت ثابتہ ہے۔ ورنہ غور کیجئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کوئی شخص بھی ایسا ہو سکتا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیعت لیے بغیر خون عثمان رض کے قصاص کے لیے جنگ کا حکم دیتے تو اس سے اعراض کرتا — پھر یہی نہیں بلکہ مختلف مواقع پر انہی مخلص و صادق صحابہ کرام سے مختلف امور کے لئے حضورؐ کا بیعت لینا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ انہی احادیث سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ، اقامت دین، اظہار دین الحق علی الدین کلّہ، تکبیرِ رب یعنی انقلاب محمدیؐ کی جد و جہد کے لئے جو ہیئت اجتماعیہ وجود میں آئے وہ بیعت ہی کے اصول پر قائم ہو ۔ یہی سُنّت کا تقاضہ ہے ۔ (جاری ہے)

۵

بقیہ : رفقاء کی ذمہ داریاں

رفقاء کی ذمہ داریوں کے ضمن میں آخر میں ایک حدیث مبارک کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں جس میں آپؐ نے فرمایا کہ روزِ قیامت کوئی شخص اس وقت تک اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتا جب تک پانچ سوالوں کے جواب نہیں دے لیتا۔ ان میں سے پہلے دو سوال زندگی بالخصوص جوانی گذارنے کے بارے میں ہیں۔ چنانچہ ہمیں چاہیئے کہ ہر لمحے کا پہرہ دیں اور اس روز کی ندامت اور شرمندگی سے بچیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق دے کہ ہم اپنا وقت اللہ کی رضا کے مطابق صرف کریں۔

ٹی وی اور ویڈیو کیسٹ کی شرعی حیثیت

—— مولانا مدنی میاں ——

مولانا مدنی میاں ہندوستان کی مشہور خانقاہ کچھوچھا شریف سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپکے علم وفضل کا شہرہ یورپ میں بھی ہے۔ اکثر تبلیغی دورے فرماتے رہتے ہیں۔ زیر نظر مضمون آپ نے ایک استفتاء کے جواب میں قلمبند فرمایا ہے۔ اور پاک و ہند کے جید علمائے کرام نے اس کی تائید و توثیق بھی فرمائی ہے۔ تاہم اگر کسی صاحب علم کو آپ کی تحقیق سے اختلاف ہو تو ماہنامہ "ترجمان" کے صفحات ان کیلئے حاضر ہیں۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ مندرجہ ذیل میں کہ ویڈیو کیمرے کے ذریعہ تصویریں بنائی جاتی ہیں ان پر حرمت اور شرعی ممانعت کا حکم لگے گا کہ نہیں۔ علمائے کرام کی تقاریر اور بیاہ شادی کے موقع پر تصاویر نکالنا اور ویڈیو کیسٹ پر پروگرام کو ریکارڈ کرنا یادگار کے طور پر یا علمائے کرام کی تقاریر تبلیغ وہدایت کی نسبت سے ویڈیو بنانا جائز ہے کہ نہیں۔

المستفتی محمد نبی بخش اشرفی نائب صدر جمعیۃ فیض الاسلام ڈہرکی ، ضلع سندھ۔

الجواب :۔ مذکورہ بالا سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائل ویڈیو کیمرے کی حقیقت وماہیت سے واقف نہیں ہے۔ جبھی تو اس نے اس کو تصویر کشی کا آلہ سمجھ لیا ہے۔ اور اس کے خیال میں ویڈیو کیسٹ کے نتیجہ میں تصویریں ہوتی ہیں جنہیں ٹی وی کے ذریعہ دکھایا جاتا ہے۔ حالانکہ تحقیق اس کے خلاف ہے میں نے اس سلسلے میں بذات خود ویڈیو اور ٹی وی کے مسلم وغیر مسلم ماہرین سے بالمقابل گفتگو کی اور معلومات حاصل کیں۔ تحقیق کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ویڈیو کیسٹ میں کسی طرح کی کوئی تصویر نہیں کھنچتی بلکہ اس کے ذریعہ اس کے سامنے والی چیزوں کو ریز (RAYS) شعاعوں کو ٹیپ کر لیا جاتا ہے۔ جس طرح آواز کو ٹیپ کر لیا جاتا ہے۔ ٹیپ ہونے کے باوجود جس طرح آواز کی کوئی صورت نہیں ہوتی بلکہ غیر مرئی ہوتی ہے۔ اسی طرح ان ریز (RAYS) کی بھی کوئی صورت نہیں ہوتی جنہیں دیکھا جا سکے۔ المختصر ویڈیو کیمرہ کا کام ان غیر مرئی ریز (RAYS) اور آوازوں کو ٹیپ کرنا ہے۔ لہٰذا ان کو ان فلمی فیتوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں جن میں باقاعدہ تصویریں کھنچتی ہیں۔ جو دیکھی بھی جا سکتی ہیں اور جنہیں پردہ سکرین پر بڑا کر کے دکھایا جاتا ہے۔ ویڈیو کیسٹ میگنیٹک (مقناطیسی) ہوتے ہیں جو کہ ریز RAYS (کرنوں) کو جذب کر لیتے ہیں پھر انہیں جذب شدہ ٹی وی سے منسلک کیا جاتا ہے تو ٹی وی ان ریز RAYS کو صورت شکل بدل کر اپنے آئینے سے ظاہر کر دیتا ہے۔ چونکہ یہ صورت متحرک وغیر قائم ہوتی ہے اس لئے اس کو عام آئینوں کی صورتوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

جب تک آئینے کے روبرو رہے اس میں صورت رہے گی اور ہٹ جانے کی شکل میں ختم ہو جائیگی۔ یہاں بھی جب تک ویڈیو کا رابطہ ٹی وی سے رہیگا تصویر نظر آئیگی اور رابطہ منقطع ہوتے ہی تصویر فنا ہو جائیگی۔ رہ گئی یہ بات کہ فلم والا پردہ ایک نظر کے لئے ہی بٹن وغیرہ کو حرکت میں لایا جاتا ہے تب جا کے صورت نظر آتی ہے۔ تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ پردہ آئینے میں پردہ ہٹانے کے بعد ہی صورت منعکس ہوتی ہے۔ الغرض یہاں بھی انعکاس صورت کے لئے پردہ ہٹانے کا عمل ناگزیر ہے۔ ان متحرک و غیر قار تصویروں کو پردہ فلم کی متحرک و غیر قار تصویروں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ پردہ فلم کی تصویریں درحقیقت جامد و ساکن ہوتی ہیں۔ جن کی حرکت محض نگاہوں کا دھوکہ ہے جیسے کہ ریل پر چلنے والا باہر کے درختوں اور زمینوں کو پیچھے بھاگتا ہوا دیکھتا ہے۔ ویسے بھی پردہ فلم پر جن جامد و غیر متحرک تصویروں کو چلا کر کے دکھایا جاتا ہے ان کے غیر متحرک و جامد ہونے میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔

ویڈیو کیسٹ کا معاملہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔ اس میں کسی طرح کی کوئی تصویر منعکس ہوتی ہی نہیں اور جب اس کے ریز RAYS ٹی وی میں پہونچ کر تصویر کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ تو وہ متحرک و غیر قار ہوتے ہیں اس لئے ٹی وی کی تصویروں کے حقیقی طور پر جامد ہونے کا شبہ تک نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقام پر یہ بات بھی خالی از فائدہ نہیں کہ بہر کیف جس پروگرام کو ویڈیو کیسٹ کے بغیر براہ راست ٹی وی سے نشر کیا جاتا ہے ان میں بھی یہی ہوتا ہے کہ کیمروں اور مشینوں کے ذریعہ ان ہی ریز RAYS کو ٹی وی ٹاور تک پہونچایا جاتا ہے۔ ٹی وی ٹاور انہیں اکٹھا کر کے ٹی وی بکس کی طرف منتقل کر دیتا ہے پھر وہی صورت ہو جاتی ہے جو ویڈیو کیسٹ کے رابطہ کی صورت میں ٹی وی سے ظاہر ہوتی ہے اور سارے مناظر نظر آنے لگتے ہیں چونکہ یہ آلات جدید ہیں۔ اس لئے مذکورہ بالا تحقیق نہایت ضروری تھی اور مزید یہ کہ

- لیکن اسلامی کے ناپائیدار عکسوں کو حقیقی معنوں میں تصویر، تمثال، مجسمہ، بت وغیرہ کہنا صحیح نہیں۔ اس لئے کہ پائیدار ہونے سے پہلے عکس صرف عکس ہی رہتا ہے تصویر نہیں بنتا اور جب اسے کسی طریقے سے پائیدار کر لیا جائے تو وہی تصویر بن جاتا ہے۔ اب رہ گیا فہم ناظرین کے اعتبار سے ناپائیدار عکوس کو مجازاً تصویر، تمثال، مجسمہ وغیرہ کا نام دیا جائے تو یہ مجاز ہوگا۔ اور قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقت کا مراد لینا متعذر نہ ہو۔ یا مجاز مراد لینے پر کوئی واضح قرینہ نہ ہو حقیقی معنی ہی مراد لینا صحیح ہے۔

جن نصوص میں پائیدار کی تصاویر و تماثیل کی حرمت مذکور ہے انہیں ان کے سر بریدہ کر دینے، ٹکڑے ٹکڑے کر دینے اور پامال کر دینے کی روایات بھی ہیں اور گر وہ جائے اہانت میں ہوں تو ان کو رکھ چھوڑنے کی رخصت بھی ہے۔ اس سے اندازہ لگتا ہے کہ تصاویر محرمہ وہی ہیں جو حقیقی معنوں میں تصاویر ہوں یعنی پائیدار ہوں جنہیں سر بریدہ بھی کیا جا سکے جن کے ٹکڑے بھی کئے جا سکیں جن کے ٹکڑے ہو سکیں اور جنہیں موضع اہانت میں رکھا

جا سکے ۔ ظاہر ہے کہ ناپائیدار عکس کے ساتھ ان میں سے کوئی بھی سلوک نہیں کیا جا سکتا ۔ المختصر ۔
حرمت تصاویر کے نصوص کے عموم میں سرے سے ناپائیدار عکس داخل ہی نہیں کہ ان کو نکالنے کے لئے کسی
مخصص کی ضرورت ہو۔

موجودہ معروف و متعارف آئینہ بالکلیہ انسانی صنعت گری ہے لہٰذا اس میں بھی عکس کے ظہور میں قطعی طور
پر عمل انسانی کا دخل ہے۔ اس لئے اگر ٹی وی کے آئینے پر عکس کے ظہور میں عمل انسانی دخیل ہے۔
جب بھی اس کا حکم آئینے کے عکس کے حکم کی طرح ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ غیر قار و ناپائیدار ہونے میں دونوں
بالکل ایک طرح ہیں۔

اس تحقیق کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ویڈیو اور ٹی وی کے استعمال کرنے کا معاملہ بالکل گراموفون،
ٹیپ ریکارڈ اور آئینوں کے استعمال کرنے کی طرح ہے۔ جس طرح بالاتفاق گراموفون اور ٹیپ ریکارڈ سے وہ باتیں
سنی جا سکتی ہے جن کا سننا ان کے بغیر بھی جائز ہے اور جس طرح آئینہ کے اندر ہر اس چیز کو دیکھا جا سکتا ہے جس کا دیکھنا
آئینہ کے باہر بھی جائز ہے۔ بالکل اسی طرح ویڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ ہر ایسی چیز کو دیکھا اور سنا جا سکتا ہے جس کا دیکھنا
سننا اس کے بغیر بھی جائز ہو سکے۔ وہ امور جن کا دیکھنا سننا ناجائز و حرام ہو، ویڈیو اور ٹی وی کے ذریعے بھی ان کا
سننا اور دیکھنا ناجائز و حرام ہے۔ چونکہ فلم میں جاندار وغیرہ متحرک تصاویر ہی بنیاد ہیں۔ اس لئے اس کو دیکھنے اور سننے کے
تعلق سے جائز و ناجائز کا مذکورہ بالا فرق نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر بالفرض کوئی ایسی فلم تیار کی جائے جس میں ایک بھی
جاندار کی تصویر نہ ہو اور وہ حرام اور ناجائز نغمات و حرکات سے ملوث نہ ہو تو اس کو بھی دیکھنے میں بالاتفاق کوئی مضائقہ
نہیں۔ ان تفصیلات کے بعد سائل کے سوال کو سامنے رکھتے ہوئے جواب کی صورت یہ ہوگی کہ

ویڈیو کیمرے کے ذریعہ کسی طرح کی کوئی تصویر نہیں بنائی جاتی لہٰذا جاندار کی تصویر کشی کی حرمت اور ممانعت
کے جو نصوص ہیں اس کا اطلاق اس پر ہوتا ہی نہیں۔ بیاہ شادی کے موقع کے وہ جائز مناظر جن کو دیکھنے اور سننے
میں شرعاً کوئی مضائقہ نہ ہو، ویڈیو اور ٹی وی کے ذریعے بھی دیکھے اور سنے جا سکتے ہیں۔

اس صورت میں اس بات کی احتیاط ضروری ہے کہ آج کل شادی بیاہ میں بے پردگی و بے حجابی کے
سبب جو عورتیں ہر ہر پروگرام میں پیش پیش نظر آتی ہیں اور گاتی بجاتی ہیں۔ ویڈیو کو ان مناظر سے بچایا جائے۔ اس لئے کہ
جس طرح نامحرموں کے سامنے ان کا آنا اور نامحرموں کو ان کا دیکھنا اور ان کا گانا سننا حرام و ناجائز ہے۔ اسی طرح ٹی وی
پر ان کو دیکھنے اور ان کے گانے بجانے کے سننے کا یہی حکم رہے گا۔ علماء کرام کی تقاریر نیز دینی و مذہبی پروگرام کی نشر
و اشاعت کے لئے ویڈیو کا استعمال بالکل جائز ہے۔ بلکہ جن علاقوں میں کوئی گھر ٹی وی سے خالی نہ ہو اور لوگ
غیر شرعی پروگرام دیکھ دیکھ کر اپنے اخلاق و کردار کو خراب کر رہے ہوں۔ نیز ان کے بچے بھی دیکھا دیکھی اس کے شائق

پھیل رہے ہوں۔ نہایت مناسب عمل ہوگا اگر ریڈیو کے ذریعے تبلیغ و ہدایت اور تعلیم و اصلاح کا کام انجام دیا جائے۔ اس طرح ایک طرف لوگوں کو ٹی وی کے صحیح استعمال سے روشناس کرایا جاسکتا ہے۔ تو دوسری طرف حدود شرع میں رہ کر عظیم تعمیری کام بھی انجام دیئے جاسکتے ہیں۔

انا الفقیر الی حضرۃ الرب الغنی السید محمد مدنی الاشرفی الجیلانی جانشین مخدوم الملت حضور محدث اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان
کچھوچھا شریف ضلع فیض آباد یوپی۔

مولانا مدنی میاں کے اس فتوے کی تائید ہندوستان کے مفتی شریف الحق امجدی صاحب ادارہ شرعیہ پٹنہ بہار کے مفتی عبدالواحد صاحب اور دارالعلوم غریب نواز الٰہ آباد کے مفتی شبیر احمد صاحب مدظلہم العالیہ نے بھرپور طریقے سے کی ہے اور پاکستان کی مشہور علمی شخصیت حضرت مولانا احمد سعید کاظمی شیخ الحدیث انوار العلوم ملتان نے تائید کے ساتھ ساتھ مولانا مدنی میاں کو مندرجہ ذیل مکتوب تحریر فرمایا

رئیس المتکلمین حضرت علامہ سید محمد مدنی الاشرفی الجیلانی دامت معالیہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہٗ۔ مزاج اقدس!

حضرت کا مکتوب گرامی شرف صدور لایا، یاد فرمائی کا بے حد شکریہ۔ جناب کے ارسال کردہ مستند فتاوی کو بغور سنا۔ تینوں فتاوی حضرت کی فہم و ذکاء اور تحقیق و جستجو کا منہ بولتا شاہکار ہیں۔ بے شک جناب کی ذہانت اور استنباط دلائل صد ستائش اور قابل تحسین و آفرین ہیں۔ آپ نے جس آسانی سے ایسے مشکل مسائل کو عام فہم انداز میں ڈھال کر حل فرمایا ہے وہ آپ ہی کا حق ہے۔ بزرگان دین اور علماء امت کے مختلف اقوال کو جس عمدگی سے بیان فرمایا ہے۔ اور جس حسن و خوبی سے نبھایا ہے وہ آپ کے انشراح صدر اور علوم عقلی و نقلی میں مہارت تامہ کا مظہر اتم ہے۔ خصوصاً طرز استدلال اور انداز تحریر باعث رشک ہیں۔

میں ہر سہ فتاوی میں آپ سے متفق ہوں۔ بالخصوص ویڈیو کیسٹ فلم اور ٹی وی کے بارے میں جس مستند عرق ریزی سے جناب نے تحقیق فرمائی ہے اور پھر جس خوبصورتی سے ان حقائق کی روشنی میں جائز اور ناجائز صورتوں میں امتیاز کرتے ہوئے فتوی مرتب فرمایا وہ قابل تقلید ہے۔ اسی طرح لاؤڈ اسپیکر کے مسئلے میں بھی حضرت نے علماء اہلسنت کے تمام اقوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ممنوع اور ناجائز صورتوں کو ممتاز فرما کر آپ نے فتوی صحیح صادر فرمادیا۔

نماز عشاء کے اوقات کے مسئلے میں میں نے بھی ایک فتوی مرتب کیا تھا، جو پیش خدمت ہے۔

میں بارگاہ رب العزت جل جلالہٗ میں صمیم قلب سے دعاگو ہوں کہ آپ جیسے اہل علم اور صاحب فہم و ذکاء حضرات کا سایہ اہلسنت پر تادیر قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ والسلام مع الاحترام

سید احمد سعید کاظمی

شکریہ ماہنامہ "تجارت" کراچی مارچ ۱۹۸۶ء

فراہم کرتا ہے جو روس کو مسلمانوں کا ہمدرد سمجھتے ہیں۔ اگر روس واقعی لیبیا کا ہمدرد اور حلیف ہے تو اب تک اُس نے زبانی جمع خرچ کے علاوہ امریکہ کے خلاف کونسی عملی کارروائی کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسرائیل کو تربیت یافتہ افرادی قوت بہم پہنچانے والے سب سے بڑا ملک روس ہے اور افغانستان میں لاکھوں مسلمانوں کے خون سے اُس کے ہاتھ رنگین ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ تمام مسلم ممالک سُرخ اور سفید سامراج کی بساط پر مہروں کا کردار ادا کرنے کی بجائے اسلام کی بنیاد پر متحد ہوجائیں کیونکہ روس اور امریکہ دونوں ہمارے دشمن ہیں اور یہ بوقتِ ضرورت مسلمانوں کو لالچ اور خوف کے ذریعے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کا عالمی افق پر ایک قوت کی صورت میں اُبھر کر آنا ہی وقت کا اہم تقاضا ہے اور اسی میں دُنیا کی غریب اقوام کی بقاء اور سلامتی پوشیدہ ہے۔"

اِس سال ۲۱ر مارچ کو مرکزیہ مجلسِ اقبال کے تحت یومِ اقبال کے جلسے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو خصوصی دعوت دی گئی تھی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر اپنے خیالات کو منضبط طور پر ایک تحریر کی شکل میں پیش فرمایا۔ موصوف کی یہ تحریر بھی شاملِ اشاعت ہے۔ اِس اہم جلسے کی ایک مختصر رپورٹ ہمارے ہمارے معاونِ کار مقبول الرحیم مفتی صاحب نے تیار کی ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

"بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش"

مرکزیہ مجلس اقبال نے اپنی دیرینہ روایت کے مطابق اس سال بھی ۲۱ر اپریل کو یومِ اقبال کے موقع پر ایک نشست کا اہتمام کیا اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو بھی دعوتِ خطاب دی۔ اپنی گوناگوں مصروفیات اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے باوجود صاحبینِ مجلس یعنی پروفیسر مرزا محمد منور اور مدیر نوائے وقت جناب مجید نظامی

کے خلوص اور فکرِ اقبال سے اپنے قلبی اور عملی تعلق کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کے لیے انکار
کرنا ممکن نہ ہوا۔ لیکن اپنے انقلابی اور عملی مزاج کے باوصف جب ڈاکٹر صاحب
شریکِ مجلس ہوئے تو اِس شان کے ساتھ کہ ایک گھنٹے کی طویل تقریر ۴۸ صفحات
پر مشتمل کتابچے کی صورت میں ایک خوب صورت لفافے میں بند "ہدیہ یومِ اقبال"
کے طور پر سامعین کے ہاتھوں میں تھی۔

جس طرح عشق کی ہر منزل میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں، اسی طرح
"حاملانِ فکرِ اقبال (جنہیں عرفِ عام میں "اقبالیے" بھی کہا جاتا ہے) کی راہ میں
بھی عمل کی دشوار گھاٹی آتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے اپنے خطاب میں
جسے آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے "سخن گسترانہ" انداز میں انہیں
آمادۂ عمل کرنے کے لیے اُن کی بے عملی کا تذکرہ بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب تو مصرع
طرح دے کر کراچی چلے گئے لیکن اُن کے جاتے ہی جناب مفتی طفیل گوندی صاحب
نے اِس پر اصرار کے انداز میں گرہ لگائی تو سامعین نے انہیں پھر اس انداز میں
داد دی کہ وہ اپنی غزل مکمل نہ کر سکے۔ بات صاف ہے کہ ہر شخص شورش کاشمیری نہیں
بن سکتا۔ شورش ایسے سپوت اور پھر وہ بھی پنجاب کی مٹی سے روز روز تو پیدا
نہیں ہو سکتے۔ جناب گوندی صاحب کے بعد مجلس کا رنگ جمانے کے لیے
آزاد بن حیدر صاحب کو دعوت دی گئی۔ انہوں نے فی الواقع اپنی ذاکرانہ خطابت
سے لوگوں کو نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے پر مجبور کر دیا۔ آزاد بن حیدر جب یہ کہہ
رہے تھے کہ ہم نے ان لوگوں کا کیا بگاڑ لیا جنہوں نے پاکستان توڑا تھا کہ اب ہم
توڑنے کی دھمکی دینے والوں کو للکار رہے ہیں تو میرے ذہن میں کسی کا یہ شعر گونج
رہا تھا کہ ؎

ہم ایک لاکھ تھے ہم نے تو سر جھکا ڈالے
حسین رضؓ تیرے بہتر سروں کو لاکھ سلام

استاذِ محترم پروفیسر مرزا محمد منور مائیک پر تشریف لائے تو ہال کئی منٹ تک تالیوں
سے گونجتا رہا۔ پروفیسر صاحب نے اپنے مخصوص مشفقانہ اور استادانہ انداز میں
تقریر نہیں گفتگو کا آغاز اِن الفاظ سے کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں غیرت دلائی
ہے تازیانہ لگایا ہے اور دھمکی دی ہے کہ اب بھی اگر ہم منتشر رہے بکھرے رہے

بشکریہ ماہنامہ "تبیان" کراچی مارچ ۱۹۸۶ء

تو زیادہ ہونے کے باوجود کم ہی رہیں گے۔ مرزا صاحب کی ساری گفتگو بھی ایک تازیانۂ عمل کا پیغام تھی، اتحاد کی دعوت تھی لیکن اس عہدِ ہوسناک و ہوس پرور میں "فغانِ درویش" سننے کی فرصت کسے میسر ہے۔ بقول پروفیسر صاحب جملہ حامیانِ دین و مفتیانِ شرعِ متین حسب سابق و حسبِ معمول "جیت کر ہارنے" کی تیاریوں میں دن رات ہمہ تن مصروف ہیں۔

ناخدا مستِ طربِ اہلِ سفینہ مدہوش سر پہ اُمڈا ہوا طوفان ہے خدا خیر کرے

پسرِ اقبال جناب جسٹس جاوید اقبال سخن گوئی پر آئے تو بہت سے سخن فہموں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی اُن کے دل میں ہے

جسٹس جاوید فرما رہے تھے کہ اتحاد کے ترانے تو ہم گذشتہ چالیس برس سے سُن رہے ہیں لیکن عروسہ اتحاد ہے کہ حجلۂ عروسی سے برآمد ہی نہیں ہوتی۔ اتحاد کی رسّی ہے کہ ٹوٹتی تو روز ہے لیکن جوڑنے کا اہتمام دکھائی نہیں دیتا۔ اسلام نافذ ہوتا ہے مگر اس کی برکات نازل نہیں ہوتیں بلکہ کوڑے برستے ہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم فکرِ اقبال کی روشنی میں اسلام کی تعزیرات و حدود کی بجائے ایسا اسلام نافذ کریں جس کے نفاذ کے بعد مدینے کی گلیوں میں زکواۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔ پسرِ اقبال کا کہنا تھا کہ جب تک حرف "قل العفو" میں پوشیدہ حقیقت عمل کا روپ نہیں دھار لیتی اسلام کا اور پیغام اقبال کا منشا پورا نہیں ہو سکتا۔

صدرِ مجلس جناب قاضی عبدالمجید عابد کو صدارتی کلمات کہنے کے لیے زحمتِ کلام دینے سے قبل سٹیج سیکرٹری نے سامعین کے موڈ اور مقررین کے تیور دیکھ کر یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھا کہ ہم نے قاضی عابد صاحب کو اِس لیے صدرِ مجلس نہیں بنایا کہ وہ "وفاقی وزیر" ہیں بلکہ فکرِ اقبال سے اُن کا رابطہ اتنا گہرا ہے کہ وہ اِس مجلس کی صدارت کے اہل ہیں۔ جناب قاضی عابد نے اپنے خطاب کا آغاز بھی اسی قسم کے جملوں سے کیا لیکن پھر انہوں نے جو تقریر فرمائی وہ "سیاسی کہہ مکرنی" کا شاندار نمونہ تھی۔ اُس میں خود ستائی بھی تھی، حریفوں پر دشنام بھی تھا، اور سب سے بڑھ کر صاحبانِ اقتدار یعنی صدرِ مملکت و چیف آف آرمی سٹاف جنرل محمد ضیاء الحق

اور اُن کے نامزد کردہ وزیرِ اعظم جناب محمد خان جونیجو کی مدح و ثنا بھی۔ اگر میں اس بات کا تذکرہ نہ کروں تو ناانصافی ہوگی کہ وزیرِ موصوف کے خطاب میں بقدرِ اشکِ بلبل ذکرِ اقبال بھی تھا۔ ایک موقعے پر تو بالکل ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم "یومِ اقبال" کے جلسے کی بجائے جی ایم سیّد کی "برسی" میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ انہوں نے اپنی صدارت کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور دوسرے روز کے اخبارات کی سرخیوں میں یہ سرخی بھی شامل تھی کہ "وزیرِ اعظم جونیجو قد و قامت میں قائدِ اعظم سے مشابہت رکھتے ہیں"! خدا سے دعا ہے کہ وہ قائدِ اعظم کی مغفرت فرمائے اُن کے درجات بلند فرمائے مگر اُن کی روح کو جناب قاضی عبد المجید عابد کے اس بیان کی خبر سے محفوظ رکھے۔

❊

قرآن اکیڈمی میں ۳۱ مارچ سے ۳ اپریل تک رفقائے تنظیم کی اپنے مقصد کی تذکیر اور اپنے افکار و نظریات کی تطہیر نیز اسلامی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے جو تربیت گاہ منعقد ہوئی تھی اور اس سے متصلاً بعد تنظیم اسلامی کا جو گیارھواں سالانہ اجتماع از ۴ تا ۶ اپریل منعقد ہوا تھا، کا مختصر جائزہ اور اس اجتماع کے اہم فیصلے بھی شمارہ ہذا میں قارئین کی نظر سے گزریں گے۔ رضائے الٰہی کے حصول کے پیشِ نظر اپنے جملہ دینی فرائض کی انجام دہی میں ممد و معاون ہونے کے لیے تنظیم اسلامی کے نام سے جو قافلہ ترتیب پا رہا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قافلے میں وسعت عطا فرمائے۔ شریکِ سفر رفقاء میں للّٰہیت اور نہ صرف آپس میں محبت و اُنس بلکہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہمدردی، نصح اور خیر خواہی کے جذبات صادقہ کو پروان چڑھائے اور وہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

حسبنا اللہ ونعم الوکیل ۞ نعم المولیٰ ونعم النصیر

احقر

جمیل الرحمٰن عفی عنہ

افکار و آراء

تنظیم اسلامی کے رفقاء کی ذمہ داریاں اور انکے مسائل

مرزا محمد ایوب بیگ

میرے محترم و رفقاء گرامی! السلام علیکم۔ میری گفتگو کا عنوان ہے "رفقاء اور ناظمین کی ذمہ داریاں اور ان کے مسائل"۔ علاوہ ازیں میں ایک ایسے پہلو کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو میرے اور چند دوسرے رفقاء کے نزدیک تنظیم کے لڑیچر اور اس کے پلیٹ فارم سے ہونے والی تقاریر میں بری طرح ignore ہوتا رہا۔

رفقاء کی ذمہ داریاں

رفقاء کی ذمہ داریوں کے ذیل میں ان سے کیا عرض کرنا چاہتا ہوں اس کا تعین بڑی آسانی سے ایک خوبصورت قول، ایک تشبیہ اور ایک تاریخی واقعہ سے ہو جائے گا جو میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ قول یہ ہے "کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جہاد چھوڑ دے اور اللہ اس پر ذلت مسلط کر دے"۔ اور مثال جو امام غزالیؒ نے ایک جگہ دی ہے جس کا اصل مقصد انسان بالخصوص مسلمان کو یہ جتلانا ہے کہ تو کیوں بھول گیا کہ تجھے دنیا میں بھیجنے کا اصل مقصد کیا ہے! آپ لکھتے ہیں کہ ایک شخص فریضۂ حج ادا کرنے گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا ہے اور وہاں جا کر گھوڑے کی دیکھ بھال اور اس کے کھانے پینے کے بندوبست میں زیادہ وقت صرف کرتا ہے اور مناسک حج ادا کرنے میں غفلت اور تساہل برتتا ہے۔ حصولِ مقصد کے اعتبار سے اس شخص کے طرزِ عمل کو کیا کہا جائے گا۔ تاریخی واقعہ ایک مقالے کا اقتباس ہے جو مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی جھنڈانگری نے مرکزی دارالعلوم بنارس کی ایک کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اسے میں حرف بحرف نقل کر رہا ہوں۔

مولانا شبلی مرحوم نے جب ندوۃ العلماء جاری کیا تو اس کو بلند معیار پر لے جانے کے لئے گورنمنٹ سے کچھ مالی امداد کے طالب ہوئے تو ان کو یوپی کے گورنر سر جیمز ہوٹ نے بلا کر کہا کہ اگر آپ ندوۃ العلماء کے نصابِ تعلیم میں سے سورۂ انفال، سورۂ توبہ، سورۂ ممتحنہ اور سورۂ صف نکال دیں اور حدیث کے درس کو لازمی جز قرار نہ دیں تو انگریز گورنمنٹ کم از کم ایک لاکھ روپیہ سالانہ گرانٹ دینے کے لئے تیار ہے۔ مولانا شبلیؒ نے انگریز کی اس شرط کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ ظاہر ہے انگریز نے یہ شرط کیوں رکھی۔ ان سورتوں کا مرکزی مضمون ہجرت و جہاد ہے۔ دوست اور دشمن سب جانتے ہیں کہ اگر مسلمان قوم اس راہ پر پڑ گئی تو دین کے دشمنوں کی خیر نہیں۔

رفقاء گرامی میں سمجھتا ہوں کہ خرابی کی بنیاد یوں پڑتی ہے کہ ہم بالخصوص نئے رفقاء جب بیعت کرتے

ہیں تو اس کا ذکر یا تو اہلِ خانہ سے کرتے ہی نہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو ڈرتے ہوئے انتہائی سرسری انداز میں جیسے یہ کوئی خاص واقعہ ہوا ہی نہیں اور نہ ہی ان کے روزمرہ کے معمولات متاثر ہوں گے۔ نتیجۃً یا تو وہ شروع ہی سے اس تاثر کو قائم رکھنے کے لئے اجتماعات میں کم از کم شریک ہوتے ہیں اور غیر فعال کہلواتے ہیں اور اگر اس کے برعکس اپنا وقت تنظیم کو دیتے ہیں جو اہلِ خانہ کے لئے غیر متوقع ہوتا ہے اور گھر میں سخت کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اور اسے کبھی گھر والوں کے سامنے اور کبھی ناظم کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ اپنی تنظیمی مصروفیت کے بارے میں گھر میں بانگِ دہل اعلان کرتے رہیں اور اسے کسی بھی لحاظ سے کمتر کام نہ جانیں۔ خود اعتمادی پیدا کریں اور اپنے بارے میں گھر میں یہ تاثر پیدا کریں کہ ہر شے ممکن ہے۔ لیکن اس کا اب اس راستہ سے ہٹنا ممکن نہیں۔ Routine کے اجتماعات اپنے اہلِ خانہ کو بھی ازبر کرا دیں۔ اس کے کئی فوائد ہیں مثلاً ہم سب انسان ہیں کسی وقت خود بھول سکتے ہیں کہ یہ کسی اجتماع کا وقت ہے۔ گھر والے آپ کو ایسے موقع پر یاد دلا دیں گے۔ ہر وقت اس تاک میں رہیے کہ گھر کا کوئی کام جو آپ کے ذمے ہے اسے پہلے ہی سے اس طرح Adjust کریں کہ دونوں متاثر نہ ہوں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ مستعدی اور خوش دلی سے گھریلو ذمہ داریاں ادا کریں۔ ایک بات جو انتہائی خطرناک ہے لیکن ہمارے قومی کردار کا حصہ بن چکی ہے۔ وہ ہے وقت کا کاٹنا یا گزارنا اور ایسے اشغال میں وقت صرف کرنا جن میں دین و دنیا کسی کا بھلا نہ ہو اس فتنے سے جتنا ممکن ہو سکے بچیں۔ تنظیمی امور کی انجام دہی کے لئے وقت اپنے آرام اور ذاتی امور میں سے نکالئے۔ شفیق باپ، فرمانبردار بیٹے اور خیرخواہ و ہمدرد بھائی بنئے۔ آپ کا یہ طرزِ عمل تنظیمی امور کی انجام دہی میں آپ کے لئے سہولت پیدا کرے گا اور انشاء اللہ اہلِ خانہ خود آپ کو کوئی ذمہ داری سونپنے سے پہلے آپ کی تنظیمی مصروفیت کا لحاظ رکھیں گے۔ قصہ مختصر گھروں میں بھی معاملہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر چلتا ہے اور اگر آپ نے دین کی سرفرازی کے لئے جد و جہد کو زندگی کا مقصد بنا ہی لیا ہے اور پہلے ہی قدم پر یعنی گھر والے رکاوٹیں کھڑی کرنے لگے ہیں تو میرے نزدیک اس کا یہی حل ہے کہ یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ گھر والوں کے تو مجھ پر حقوق ہیں لیکن میرا کوئی حق اپنی ذات کے لئے ان پر نہیں صرف فرائض ہی فرائض ہیں اور میرا حق تو صرف اللہ ہی کے ذمہ ہے جس کے دین کی سربلندی کے لئے میں اپنی ذات کے حقوق سے دست بردار ہوا ہوں۔ اسی بات کو گھر سے باہر خاندان اہلِ محلہ اور معاشرہ تک وسیع کر لیں یعنی یہی طریقہ کار وسیع تر حلقہ میں اپنائیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کا دائرہ کار شریعت سے باہر نہیں ہوگا۔ میں دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ صد فی صد کامیابی ہوگی البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے کام کی راہ میں رکاوٹوں کے دور ہونے کے روشن امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ یہ روشنی بھی ہمیں در اصل سرچشمہ نور و ہدایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سیرت ہی سے ملتی ہے۔ آپ نے بھی اپنے آپ کو یک قریہ لوگوں کے حوالے کر دیا ہوا تھا جس

نے جس طرح چاہا ستایا لیکن آپ کی ذات سے لوگوں کے لئے بھلائی ہی برآمد ہوئی۔

رفقاء گرامی اب اگر ہم نے اللہ کے فضل و کرم سے دین کے لئے وقت نکال ہی لیا ہے تو میرے نزدیک ہمارے ذمہ اصل کام کیا ہیں۔ اوّل یہ کہ جماعت کے نظم و ضبط کی پابندی۔ اس معاملے میں آئیڈیل صورت حال تو یہ ہے کہ سنو اور اطاعت کرو اور ہر شے پر حکم کو ترجیح دو یعنی کشتیاں جلا کر کود جاؤ اور کم تر درجہ یہ ہے اور میں خود کو بھی اس کمتر مقام پر بغیر کسی غیر ضروری عاجزی اور انکساری کے پاتا ہوں وہ یہ کہ جب بھی کسی حکم پر عمل کرنے میں کوئی عذر حائل ہو تو انتہائی دیانت داری اور غیر جانب داری سے خود کو اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا کر لیں ضمیر سے جو صدا فوری طور پر آتی ہے اکثر و بیشتر درست ہوتی ہے وقت گذرنے کے ساتھ نفس کے شر کے سہارے انسان بہت سی تاویلات گھڑ لیتا ہے۔ مجھے یقین ہے بلکہ ذاتی تجربہ کی بنیاد پر عرض کرتا ہوں کہ اس مقام پر رہ کر بھی کوئی رفیق سال بھر میں ایک دو بار سے زیادہ حکم عدولی کا مرتکب نہیں ہوگا۔ البتہ ہر حال میں پہلا درجہ بطور آئیڈیل کے سامنے رہنا چاہئے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم کٹی پتنگ یا درخت سے گرے ہوئے پتے کی طرح نہ ہوں کہ ہوائیں جس طرح چاہیں اڑاتی پھریں بلکہ استقامت کے پہاڑ بنیں تاکہ بادِ مخالف اگر ٹکرائے بھی تو اپنا ہی رُخ بدلنے پر مجبور ہو جائے۔

ایک رفیق کے لئے کرنے کا اصل کام کے ذیل میں دوسری گذارش پہلے بھی ایک دو بار بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ آپ کے گوش گذار کر چکا ہوں اور پھر عرض کرنا ضروری سمجھوں گا۔ وہ یہ کہ ایک رفیق کے لئے لازم ہے کہ وہ عوام میں کام کرے اور تنظیم کی افرادی قوت میں اضافہ کے لئے زبردست جدوجہد کرے اور فرداً فرداً لوگوں کے دلوں پر اس دعوت کی دستک دے۔ بڑے افسوس سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ اجتماعات میں بڑی پابندی کے ساتھ آنے والے رفقاء بھی اس طرف توجہ نہیں دیتے جب تک مناسب افرادی قوت حاصل نہیں ہوتی بڑی بڑی تجاویز اور منصوبے صرف کاغذوں پر ہی دوڑتے اور پھیلتے نظر آئیں گے۔ بلاشبہ Right is might میں ہمیں پورا پورا یقین ہے لیکن اگر might پیدا یا حاصل کرنے میں ناکام رہے تو از روئے قرآن یہ کوتاہی ہے اور باطل کو غالب ہونے یا رہنے کا موقع مہیا کرنے کے مساوی ہے۔ برٹرینڈ رسل کے ایک قول کی ترجمانی آپ کے سامنے کئے دیتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر مجھے آپ دنیا کی طاقتور ترین فوج اور اس کے لئے وسائل مہیا کر دیں تو میں ثابت کر دوں گا کہ ۲+۲ = ۳ اور ____ Water is freezed by boiling۔ چنانچہ ہمیں چاہیئے کہ اپنے وقت کو اس طرف بھی صرف کریں۔ اس میں ہمیں ایک سہولت یہ بھی ہے کہ اس کام کے لئے کسی خاص وقت کی پابندی نہیں ہے بلکہ ہم اپنی سہولت کے مطابق فارغ وقت کو اس طرف لگا سکتے ہیں۔

(باقی صـ۹۴ پر)

سندھ کی صورتِ حال: ایک جائزہ، ایک

سندھی ۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطاب

وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

PEPSI

MIRINDA

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

(نوٹ: قرآن اکیڈمی میں نئے داخلوں سے متعلق اعلان صفحہ ۹۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

عاکف سعید

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

الحمد للہ، جون کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ توقع ہے کہ عید الفطر کے باعث اگر ڈاک کے نظام میں کوئی بڑی رکاوٹ واقع نہ ہوئی تو یہ شمارہ عید سے قبل قارئین کے ہاتھوں میں ہو گا۔ ادارہ میثاق کی جانب سے قارئین کرام عید کی مبارکباد قبول فرمائیں، اقبال کے اِس خوبصورت شعر کے ہدیہ کے ساتھ کہ ؎

شکوۂ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حر کی تکبیریں!

اِس شمارے کا ایک اہم مضمون تو وہی ہے جس کا حوالہ سرورق پر دیا گیا ہے یعنی "سندھ کی صورتِ حال: ایک جائزہ!"۔ یہ مضمون دراصل والدِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ایک خطاب پر مشتمل ہے جو انہوں نے اندرونِ سندھ کے دورے سے واپسی پر ماہِ رمضان سے متصلاً قبل مسجد دار السلام لاہور میں ارشاد فرمایا تھا۔ (محترم نجیب صدیقی صاحب کی مرتب کردہ اِس دورے کی ایک اجمالی رپورٹ بھی اسی شمارے میں شامل ہے۔) ــــ سندھ کی پریشان کن صورتِ حال ہر ذی شعور مخلص پاکستانی کے لیے باعثِ تشویش ہے۔ اور اگرچہ اب تو سنسر کی پابندی ختم ہو جانے کے بعد اخبارات میں سندھ کی خبریں شائع ہو جاتی ہیں جن کے باعث اب ایک عام قاری بھی وہاں کے حالات کے بارے میں کسی قدر اندازہ قائم کر سکتا ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ والدِ محترم نے آج سے ساڑھے چار سال قبل حالات کے رُخ کو دیکھتے ہوئے اپنے ایک مفصل خط کے ذریعے صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو سندھ کے بارے میں اپنی تشویش سے آگاہ کر دیا تھا اور شدت سے اس بات پر زور دیا تھا کہ ملک میں مثبت طور پر سیاسی عمل کا آغاز کیا جائے

لیکن اس سب کے باوجود ابھی تک محترم والد صاحب کو خود اندرونِ سندھ جاکر
حالات کے مشاہدے کا موقع نہیں ملا تھا۔ چنانچہ اس اپریل میں جب اندرونِ
سندھ جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے تشویشناک اور حد درجہ سنگین حالات
کو بچشمِ سر دیکھنے کا موقع ہوا تو اس سے فطری طور پر جو صدمہ پہنچا اس نے
اُن کے اعصاب کو اس درجہ متاثر کیا کہ واپس آکر کئی دن تک طبیعت پر شدید
اضمحلال طاری رہا۔

جیسا کہ قارئین کے علم میں ہے، 'استحکامِ پاکستان' کے موضوع پر والد محترم
کی مفصل تحریر جو پہلے قسط وار روزنامہ جنگ" میں اور پھر بالاقساط 'میثاق' میں
شائع ہوئی اب کتابی شکل میں چھپ کر آ چکی ہے۔ اکثر احباب کے علم میں ہوگا
کہ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس مرتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام
محاضراتِ قرآنی منعقدہ مارچ ۸۶ء میں 'استحکامِ پاکستان' ہی کو موضوع بناتے
ہوئے مذاکرے کی شکل میں پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ محاضرات چھ دنوں
پر محیط تھے جن میں ہر مکتبۂ فکر کے اہلِ علم و دانش حضرات نے حصہ لیا اور اپنے خیالات
کا اظہار کیا۔ یہ ایک مفید پروگرام تھا جس میں استحکامِ پاکستان سے متعلق ہر
طبقۂ فکر اور طرزِ خیال کے لوگوں کا نقطۂ نظر سامعین کے سامنے آ گیا۔ شرکاءِ مذاکرہ
میں سے اکثر نے زبانی اظہارِ خیال کیا جبکہ بعض حضرات نے مقالات بھی پیش کیے۔
اسی طرح کا ایک پروگرام بعد میں کراچی میں ترتیب دیا گیا۔ کراچی میں یہ پروگرام
تاج محل کے آڈیٹوریم میں ۲۳ اپریل کی شام کو منعقد ہوا تھا ـــ ان 'مذاکروں' میں
پیش کیے گئے مقالات کو ہم سلسلہ وار میثاق کے صفحات میں جگہ دیں گے۔ اس
سلسلے کی پہلی اور دوسری قسط اسی شمارے میں شامل کر دی گئی ہے۔

ماہِ رمضان المبارک کے دوران لاہور اور کراچی میں دورۂ ترجمۂ قرآن کے
پروگراموں کے بارے میں جو اعلان گزشتہ میثاق میں شائع ہوا تھا، الحمد للہ
تمام پروگرام اُس کے مطابق ہو رہے ہیں۔ محترم والد صاحب کراچی میں ناظم آباد
کے بلاک نمبر ۵ کی جامع مسجد میں نمازِ تراویح کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ
کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان فرما رہے ہیں جبکہ لاہور میں دو مقامات پر یہ پروگرام

چل رہا ہے، قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن میں پروفیسر حافظ احمد یار صاحب اور اور مرکزی دفتر تنظیم اسلامی گڑھی شاہو میں یہ فریضہ برادرم ڈاکٹر عبد الخالق صاحب انجام دے رہے ہیں۔ اللہ کے فضل اور توفیق سے یہ تینوں پروگرام کامیابی سے چل رہے ہیں۔ یہ رات بھر کا پروگرام ہوتا ہے اس لیے کہ اِس کے اختتام پر اسی قدر موقع ہوتا ہے کہ سحری کر لی جائے۔ بہرحال اللہ کے کچھ بندے ہیں جنہیں اللہ نے یہ توفیق دی ہے کہ وہ اِس پروگرام میں شرکت کے ذریعے 'صیام' کے ساتھ ساتھ اپنے لیے 'قرآن' کو بھی 'شافع' بنا رہے ہیں۔ میرا اشارہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس فرمانِ مبارک کی جانب ہے۔ جس میں آپؐ نے ایسے بندۂ مومن کے لیے خوشخبری دی ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

عن عبد اللہ بن عمرٍو انَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الصِّیَامُ والقرآن یُشفعانِ للعبدِ یقول الصِّیامُ ای ربِّ انّی منعتہُ الطعامَ والشَّھواتِ بالنَّھارِ فشفّعنی فیہِ و یقول القرآن منعتہ النّومَ باللّیل فشفّعنی فیہ فیشفّعانِ ـ

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے (یعنی اُس بندے کی جو دن میں روزے رکھتے گا اور رات میں اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سُنے گا!) روزہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! مَیں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا، آج میری سفارش اِس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا کہ: مَیں نے اس کو رات کے سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، خداوندا آج اِس کے حق میں میری سفارش قبول فرما!) چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اِس بندہ کے حق میں قبول فرمائی جائے گی (اور اس کے لیے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا!)

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

رنگ، خوشبو، ذائقے اور معیار میں
۸۰ سال سے بے مثال
مشروبِ مشرق روح افزا
ہمدرد پاکستان

تذکرہ و تبصرہ

سندھ کی صورتِ حال

ایک جائزہ، ایک تجزیہ

دورۂ سندھ کے تاثرات پر مبنی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک اہم خطاب

محترم حضرات و خواتین — السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ حضرات کو اخباری اعلان کے ذریعہ معلوم ہو چکا ہے کہ میں آج اپنے خطبہ جمعہ میں سندھ کے دورہ کے تاثرات بیان کروں گا۔

مؤرسہ سندھ کے بڑے بڑے شہروں میں میرا آنا جانا ویسے تو کافی عرصہ سے ہے۔ کراچی سندھ ہی کا نہیں۔ بلکہ پورے پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے سندھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہاں غالب اکثریت مہاجرین کی ہے اور مہاجرین بھی کسی ایک جگہ کے نہیں بلکہ ہندوستان کے قریباً ہر صوبے اور مقام کے لوگ وہاں آباد ہیں اور پھر پنجاب اور سرحد کے لوگ بھی وہاں کافی تعداد میں آباد ہو چکے ہیں اور تقریباً یہی حال سندھ کے دوسرے بڑوں شہروں، حیدرآباد، سکھر، میرپور وغیرہ کا ہے۔ سندھ کے یہ جو بڑے بڑے شہر ہیں ان میں جانے آنے سے مجھے ویسے تو وہاں کے حالات کا ایک حد تک اندازہ تھا۔ اسی بنا پر میں نے ضیاء الحق صاحب کو ایک خط ۲۷ دسمبر ۱۹۸۲ء کو تحریر کیا تھا۔ جس میں خاص طور پر سندھ کے تشویشناک حالات کی نشاندہی کرتے ہوئے ملک میں سیاسی عمل کے آغاز کی اہمیت پر زور دیا تھا اور اس ضمن میں ایک قابلِ عمل لائحہ عمل بھی سامنے رکھا تھا۔ [1]

---

[1] محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط میں سندھ کی خوفناک صورتِ حال کے بارے میں تجزیہ پیش کیا تھا اس میں یہ الفاظ بھی تھے: (بقیہ حاشیہ اگلے پر دیکھئے)

میرے اس خط کے تحریر کرنے کے آٹھ ماہ بعد ہی وہ لاوا پھٹ گیا اور پنجابی اس انداز اور شدت کے ساتھ کہ سیاسی تجزیہ نگار حیران ہو گئے۔ لیکن میرے لئے اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی۔ عام طور پر تاثر یہ تھا کہ سندھی قوم بزدل ہے ان میں یہ صلاحیت کہاں کہ وہ حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلا سکیں! لیکن پہلی مرتبہ لوگوں کو معلوم ہوا کہ کس طرح انہوں نے پولیس اور فوج کا مقابلہ کیا۔ پھر جس طریقے سے وہاں ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں اور جس طرح وہاں دن دہاڑے قتل و غارتگری کا بازار گرم ہے اس سے تو اب کم از کم اس مغالطے کی تصحیح ہو چکی ہو گی کہ وہ کوئی تحریک چلانے کی صلاحیت سے محروم ہیں یا بزدل قوم ہیں۔ لیکن بہر حال اس وقت تو وہ اکثر لوگوں کے لئے ایک حیران کن بات تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت انہیں کوئی بیرونی مدد حاصل نہیں ہوتی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر اس وقت اندرا گاندھی چوک نہ گئی ہوتیں تو پاکستان کی سالمیت شدید خطرہ سے دو چار ہو چکی تھی۔ وہ اس اُمید پر تھی کہ ابھی یہ لڑائی اور ایجیٹیشن اور آگے بڑھے گا تو پھر ہم بعد میں مداخلت کریں گے۔ مداخلت کا طریقہ وہی ہوتا جس طرح مشرقی پاکستان میں ہوا تھا۔ یعنی ہندو جو وہاں آباد ہیں وہ سندھ سے ترک وطن کر کے ہندوستان میں داخل ہو جاتے اس کے لئے تو انہیں صرف ایک جھنڈی دکھانے کی ضرورت تھی۔ پھر سرحد کے ساتھ ان کے کیمپ بنا دیئے جاتے اس طرح ہندوستان کو پولیس ایکشن کا موقع مل جاتا۔ اندرا گاندھی منتظر ہی رہی اور اللہ نے اسی میں پاکستان کو بچا لیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

"میرے اندازے میں "سندھو دیش" کے لئے میدان پوری طرح اس طرح ہموار ہو چکا ہے جیسے مشرقی پاکستان میں "بنگلہ دیش" کے لئے ہوا تھا اور اب فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دُور اور کٹا ہوا تھا، اس لئے مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول نہ کر سکی اور سندھ چونکہ زمینی طور پر ملحق ہے۔ لہٰذا یہاں ایسی کسی بھی تحریک کو کچلا جا سکتا ہے' لیکن میرے نزدیک اس عامل (FACTOR) پر زیادہ انحصار بھی سخت ناعاقبت اندیشی ہے"

اس دفعہ میں نے سندھ کے بعض اندرونی علاقوں مثلاً گھوٹکی، کندھ کوٹ، مبارک پور، اور گاڑھی مورو کا پروگرام بنایا تاکہ اندرونِ سندھ کے حالات کا بھی بچشمِ سر جائزہ لے سکوں اس لئے کہ انتہائی تشویشناک خبریں تو سننے میں آتی رہی ہیں لیکن ابھی تک معاملہ محض شنید تک محدود تھا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق پہلے میں گھوٹکی گیا جس کا ریلوے اسٹیشن حال ہی میں جلایا گیا تھا۔ وہاں ہندوؤں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ پھر کندھ کوٹ جانا ہوا وہاں بھی ہندو آبادی مسلمان آبادی کے مساوی ہے۔ پھر مبارک پور جانا ہوا۔ اسی طرح گاڑھی موری جانے کا موقع بھی ملا جو سندھ کے حالیہ چیف منسٹر سید غوث علی شاہ صاحب کا آبائی شہر ہے۔ پھر یہ کہ روہڑی کی سیمنٹ فیکٹری میں بھی مجھے خطاب کا موقع ملا۔ یوں سمجھئے کہ سکھر کے اردگرد کوئی پچاس اور سو میل کے دائرہ میں میں نے ایک چکر لگایا۔

اندرونِ سندھ کے اس دورے کے دوران سندھ کے جو حالات میرے مشاہدہ میں آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے میرے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہاں سے آتے ہی میری طبیعت پر شدید اضمحلال طاری ہوا اور صورتِ حال یہ ہے کہ اب بھی مجھے ٹمپریچر ہے۔ اور بخار کی یہ کیفیت مسلسل جاری ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے میں اپنے دروس و تقاریر کے پروگرام ایسے ہی کسی سبب سے کینسل نہیں کرتا لیکن اس دفعہ ناسازئ طبع کے باعث مجھے اپنا دورۂ اسلام آباد منسوخ کرنا پڑا اور میں سمجھتا ہوں کہ میری طبیعت کی اس خرابی میں جہاں جسمانی مشقت کو دخل حاصل ہے وہاں اس اعصابی دباؤ کا بھی بڑا حصہ ہے جو سندھ کی خوفناک صورتِ حال کے مشاہدے کا نتیجہ ہے۔

سندھ کے بارے میں یہ بات اچھی طرح جان لیجئے کہ معاملہ یہ نہیں ہے کہ وہاں پاکستان سے خیرخواہی رکھنے والے عنصر (PRO-PAKISTAN ELEMENT) موجود نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بڑے مخلص لوگ موجود ہیں۔ لیکن ایک سرگرم تحریک وہاں ایسی ہے جو پاکستان دشمن ہے اور اس کے ہاتھ میں دلیل ایسی ہے کہ جس نے مخلص لوگوں کے منہ بند کر دیئے ہیں۔ میں اس پوری صورتِ حال کا تجزیہ کر کے آپ کو بتاؤں گا۔ اصل میں تو یہ تحریک آج سے بیس پچیس برس پہلے شروع ہوئی

تھی۔ جب جی ایم سید صاحب اور اُنہی کی طرح کے کچھ اور دانشوروں نے بڑی منصوبہ بندی (PLANNING) کے ساتھ سندھیوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ اس وقت ہم بہت حیران ہوتے تھے کہ ایسا بھی کوئی دریدہ دہن انسان ہو سکتا ہے جو محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو لٹیرا اور ڈاکو کہے اور راجہ داہر کو بیا فوجی ہیرو قرار دے۔ لیکن یہ کہ جی ایم سید کی تحریک نے کھلے بندوں ان اسلام دشمن خیالات کو عام کرنا شروع کر دیا۔ کتابیں چھپتی رہیں اور ادب ثقافت کے بارے میں، نظموں اور ڈراموں کی شکل میں اس زہر کو عام کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ فکر عام کیا گیا کہ ہمارا اصل کلچر کچھ اور ہے ہمارا اصل ماضی کچھ اور ہے یہ اسلام خواہ مخواہ ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ یہ تو باہر سے آکر ڈاکے ڈالنے والوں کا مذہب تھا ـــــ اس کے ساتھ ساتھ ان خیالات کو بھی عام کیا گیا کہ پاکستان میں حکومت تو صرف پنجاب کی ہے! پنجاب ہمارا استحصال کر رہا ہے، پنجاب ہمارا خون چوس رہا ہے، پنجابیوں نے ہماری زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے، اُدھر سے مہاجرین نے آکر ہماری تمام شہری جائیدادیں ہتھیالی ہیں اور سارے کاروبار پر قبضہ کر لیا ہے ـــــ تو یہ تحریک کوئی آج کی نہیں ہے کم سے کم پچیس برس سے وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہمارا معاملہ کیا تھا ہمارے اکثر و بیشتر لوگ آپس کی اقتدار کی جنگ اور حکومت کے ساتھ کھینچا تانی میں مصروف تھے۔ ہماری تمام تر توانائیاں انہی منفی کاموں میں صرف ہوتی رہیں اور ہم اس سے بے خبر رہے کہ سندھ میں کیا ہو رہا ہے اور اگر کچھ خبر ہوگی بھی تو ہم نے اسکی طرف زیادہ توجہ نہیں دی ـــــ بہرکیف اس پوری صورت حال پر گویا جلتی پر تیل کا کام کیا حالیہ ساڑھے آٹھ نو برس کے مارشل لاء نے چنانچہ اس میں وہ لوگ جو وہاں اسلام اور پاکستان کے ساتھ خلوص کا تعلق رکھتے ہیں انکی زبانیں بند کر دی گئی ہیں اس لئے کہ اتنی بڑی دلیل ہاتھ آگئی ان لوگوں کے کہ جو سندھ کو پاکستان سے کاٹنا چاہتے ہیں، جو اس کا الحاق چاہتے ہیں ہندوستان سے یا یہ کہ جو آزاد سندھو دیش کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ اور یہ دلیل وہی ہے جو صدر ایوب کے مارشل لاء نے مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسند عناصر کو فراہم کی تھی یعنی یہ کہ مارشل لاء سا

مطلب کیا ہے فوج کی حکومت ۔ اور فوج میں ہمارا کوئی حصہ ہے نہیں، فوج تو تمام تر
مغربی پاکستان کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ لہٰذا فوج کی حکومت کا مطلب یہ ہوا کہ مغربی
پاکستان حکومت کر رہا ہے۔ ہم پہ وہ حاکم ہے ہم محکوم ہیں۔ ہم نے انگریز سے آزادی
اس لئے تو حاصل نہیں کی تھی کہ مغربی پاکستان ہم پر حکومت کرے۔ یہ دلیل اتنی قوی
تھی ورنہ ہندو وہاں پہلے بھی موجود تھا بنگلہ نیشنلزم کے لئے وہ کام کر رہا تھا۔
اندر ہی اندر یہ آگ جل رہی تھی لیکن اس آگ پر بھی تیل پڑا مارشل لاء کے ذریعے
سے ۔ اب اس دلیل کے آگے وہاں کوئی پرو پاکستان شخص کہے تو کیا کہے۔ اس دلیل
کو مزید اشتعال انگیز بنانے کے لئے اضافی طور پہ اعداد و شمار دکھائے جاتے تھے
کہ فوج پہ اتنا خرچ ہوتا ہے ہماری کل آمدنی کا اتنے فیصد حصہ بجٹ پہ جاتا ہے۔ یہ
یہ سارا حصہ کہاں گیا! مغربی پاکستان کو گیا۔ اس لئے کہ فوج مغربی پاکستان کی ہے
لہٰذا کماتے ہم ہیں کھاتے وہ ہیں اور ایسے ایسے اعداد و شمار کہ فلاں لیفٹیننٹ کے
ساتھ ایک اردلی ہے اور فلاں کے ساتھ ایک بوٹ پالش کرنے والا ہے یہ
سب کیا ہے! گلچھرے اڑائے جا رہے ہیں ہمارے پیسے پر۔ جو پٹ سن اور چاول
کے ذریعے سے ہم زرِ مبادلہ کماتے ہیں وہ خرچ ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان پر اگرچہ
آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ صدر ایوب نے وہاں پر ملیں لگانے کا کام کارخانے لگانے
کا کام ڈیویلپمنٹ کا کام بے تحاشہ کیا لیکن یہ سارے کا سارا کام اس دلیل کے آگے
کالعدم ہو کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ آپ کو یاد ہوگا اور اگر یاد نہ ہو تو میں آپ کو بتانا
چاہتا ہوں کہ وہاں کے مذہبی طبقے کی اکثریت بھی اسی عوامی دباؤ میں بہہ گئی تھی۔
مجھے ایک صاحب نے چشم دید واقعہ سنایا ہے کہ وہاں جو قتل عام ہوا ہے وہ
صرف مکتی باہنی یا ہندو فوج نے نہیں کیا ہے، اس میں وہاں کے مسلمان اور اچھے
خاصے مذہبی مسلمان بھی شریک تھے۔ ایک صاحب جو وہاں کے ہنگاموں میں بچ
کر آ گئے تھے چشم دید واقعہ سناتے ہیں کہ وہ بھی وہاں پکڑے گئے تھے۔ ۱۷، ۱۸ افراد
کا گروپ تھا جسے باندھ کر کھڑا کر دیا گیا۔ ارادہ یہ تھا کہ سب کو شوٹ کرنا ہے اور
وہ مقامی باشندے جو ان کی جان کے درپے تھے انہوں نے شوٹ کرنے سے پہلے وضو
کیا، نماز پڑھی اور پھر دعا کی کہ اے اللہ ہم ان کو صرف اس لئے مار رہے ہیں کہ

نہوں نے ہم پر ظلم کیا ہے۔ ہم صرف بدلہ لے رہے ہیں۔ ہم کوئی ظلم نہیں کر رہے ہیں۔ یہ سب کرنے کے بعد انہوں نے پورے گروپ کو شوٹ کر دیا۔ وہ صاحب جنہوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے وہ بتاتے ہیں کہ وہ گولی لگے بغیر گر گئے اور وہ لوگ انہیں بھی مردہ افراد کے ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ بقیہ ۱۶ ہلاک ہو گئے اور صرف یہ صاحب بچ نکلے۔ آپ دیکھ لیجئے کہ یہ کام کن لوگوں نے کیا ہے! جنہوں نے نماز پڑھی ہے جنہوں نے وضو کیا ہے جو مذہبی عنصر تھا لیکن یہ کہ ان کو اس درجہ بھکایا گیا ہے کہ حقوق کا معاملہ ہے، یہ معاملہ ظلم کا ہے، ظلم کے خلاف ہمیں اٹھنا پڑے گا۔

میں نے ۱۹۷۱ء میں لکھا تھا اور آج بھی میرا یہ موقف ہے کہ اگر وہاں ریفرنڈم کرایا گیا ہوتا تو یقیناً زیادہ تعداد انہی لوگوں کی تھی جو علیحدگی نہیں چاہتے تھے۔ مولانا متین ہاشمی صاحب چونکہ وہیں تھے۔ وہ سارے ہنگامے سے گزر کر آئے ہیں انہوں نے ابھی شہدائے بالاکوٹ کانفرنس میں جو تقریر کی اسمیں انہوں نے بھی اسی بات کی تائید کی اور یہ بات وثوق سے کہی کہ وہاں ۶۰ فی صد سے زائد لوگ پرو پاکستانی تھے۔ لیکن المیہ یہی ہے کہ پاکستان کے خیرخواہ لوگوں کی ایک بڑی اکثریت انکی دلیل کے سامنے خاموش بلکہ بے بس ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ وہاں بہت قربانیاں بھی دی گئیں۔ خاص طور پر جماعت اسلامی کے زیر اثر نوجوانوں نے ہزاروں کی تعداد میں اپنی جانیں پیش کیں لیکن عوامی بہاؤ جب آتا ہے تو اس کے سامنے یہ چند ہزار بند نہیں باندھ سکتے۔

بعینہ یہ معاملہ سندھ میں ہو چکا ہے۔ یہی دلیل ان کے ہاتھ میں ہے کہ صاحب فوج کی حکومت کا مطلب ہے پنجاب کی حکومت اور بحیثیت پاکستانی حکومت میں ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا پنجابیوں کا ہم پنجاب سے کسی درجے میں کمتر نہیں ہیں۔ ہم پنجاب کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ وہ بات ہے جو ہر سندھی نوجوان کو اپیل کرتی ہے۔ اب آپ خود بتائیے کہ اس دلیل کے جواب میں کوئی کچھ کہے تو کیا کہے! دکھ یہ ہے کہ ان کی اس دلیل کو مزید تقویت دینے کا سامان ہم نے خود فراہم کیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ ان کے اس اعتراض کا آپ کے پاس کیا جواب ہے کہ مارشل لاء کے دور میں پنجاب کا گورنر ایک پنجابی آدمی ہے، سندھ کا گورنر پٹھان

تھا۔ لیکن سندھ کا گورنر کوئی سندھی نہیں ہے بلکہ پنجابی ہے! پھر یہ کہ جب اپنے
سویلین گورنر بنائے تو بھی سندھ کا معاملہ یہ رکھا کہ ایک ہی تاریخ میں ایک جرنیل
کو آپ نے فوج سے ریٹائر کیا اور اسی وقت اسے گورنر بنا دیا گویا
پورے سندھ میں آپ کو ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جس پر اعتماد کر سکیں۔ جسے
آپ اسے گورنر بنا سکیں۔ حالانکہ آپ ہی کے زیر انتظام الیکشن میں وہاں کے لوگوں
نے بھی حصہ لیا تھا۔ آپ کی جماعت میں انہوں نے شرکت کی ہے اکثیر تعداد میں
لوگ آپ کے ساتھی ہیں لیکن پھر یہ سب کیا ہے؟ اس کا جواب کوئی کیا دے!
یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن کی وجہ سے وہاں کے مسلمان گڈمڈ ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں نے
کم سے کم جن علاقوں میں ان دنوں میں سفر کیا میں نے محسوس کیا اُس علاقے کا
عام سندھی مسلمان عام پنجابی مسلمان سے زیادہ مذہبی ہے۔ ان کی مساجد دیہات
میں زیادہ آباد ہیں لیکن یہ جو ابھر رہا ہے اپر سندھ کا یہاں تمام مذہبی عنصر جمعیت
علمائے پاکستان سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ دیہات میں پورے کا پورا دیوبند کا حلقہ
ہے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ پورا حلقہ جمعیت علمائے اسلام کی گرفت
میں ہے۔ مولانا عبدالکریم بیگ شریف والے اس وقت بڑی مقتدر شخصیت
ہیں۔ ان کا حلقہ اثر بہت ہے لیکن وہ سب کے سب آپکو معلوم ہے ایم آر ڈی
میں ہیں۔ اور حال ہی میں سندھ میں جو ایجی ٹیشن ہوا ہے اُس میں خاص طور پر اپر
سندھ کے علاقے میں سب سے بڑا حصہ جمعیت علمائے اسلام کے اُس گروپ کا تھا جو
مولانا فضل الرحمن سے متعلق ہے۔ اس تحریک میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا
اور اپنے تئیں قربانیاں بھی دیں۔ اس لئے کہ اُن کا کہنا ہے کہ یہ بنیادی حقوق کا
معاملہ ہے۔ دین کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ دین ہم سب کا مشترک ہے۔ آپ
ہی دین کے ٹھیکیدار نہیں ہیں نمازیں ہم بھی پڑھتے ہیں روزے ہم بھی رکھتے ہیں لیکن
آپ دین کے حوالے سے ہمیں ہمارے حقوق سے محروم نہیں کر سکتے۔ دین کا معاملہ
اپنی جگہ اور حقوق کی بات اپنی جگہ ——— میں نے محسوس کیا ہے کہ سندھ کے
کم از کم اس علاقے میں دین و مذہب سے لگاؤ کی ایک عمومی فضا ہے اور میں نے
یہ طے کیا ہے کہ اگر اللہ نے ہمت اور صحت دیئے رکھی تو جب بھی پاکستان میں ہوں

گا، ہر ماہ اندرونِ سندھ کا ایک دورہ ضرور کروں گا - اس لئے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اب پاکستان کی بقا میں سندھ کو ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے -

موجودہ حالات میں سندھ کی خصوصی اہمیت

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہمارے ملک میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کی شکل میں صوبوں کی جو تقسیم ہے - اس میں جہاں تک سرحد اور بلوچستان کا تعلق ہے - وہاں حالات اتنے خوفناک نہیں ہیں - پختونستان کا ہوّا اب ختم ہو چکا ہے، وہ اپنی موت آپ مر چکا ہے اسلئے کہ افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد نے صورتِ حال ہی بدل دی ہے - اب ایک نئی صورتِ حال ہے جس نے ایک نئی بحث کو جنم دیا ہے، سرِ دست میں اس معاملے کو زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا - لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ فرنٹیئر (سرحد) میں دیگر جماعتوں میں اتنی قوت موجود ہے کہ وہ اندرونی طور پر ملک دشمن عناصر کا مقابلہ کر سکتے ہیں - خطرہ باہر سے تو ہو سکتا ہے لیکن اندرونی حالات اُس درجے تشویشناک نہیں - اسی طرح بلوچستان کے حالات بھی اب بہتر ہو چکے ہیں - بھٹو کے دَورِ حکومت میں وہاں جس عمل (PROCESS) کا آغاز ہوا تھا جسے (OPENING UP OPRATION) کہا گیا ہے - کہ بلوچستان کا یہ علاقہ جو بقیہ پاکستان سے بالکل کٹا ہوا ہے اور وہاں سکول کھولے جائیں، سڑکیں بنائی جائیں اور دیگر ترقیاتی کام کئے جائیں تاکہ وہاں بھی ایک مڈل کلاس وجود میں آئے اور صورتِ حال میں کچھ تبدیلی پیدا ہو - اُس عمل کو اِس حکومت نے بھی آگے بڑھایا خاص طور پر جنرل رحیم الدین صاحب کے دور میں وہاں بے پناہ کام ہوا ہے جس کے نتیجے میں وہاں ایک مڈل کلاس وجود میں آ چکی ہے - اور میرا اندازہ یہ ہے کہ اب بلوچستان میں کم از کم اندر سے کوئی بڑی ملک دشمن قوت نہیں اٹھ سکتی - باقی جہاں تک بین الاقوامی سیاست کا معاملہ ہے اُس کے تحت باہر سے کسی خطرہ کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - وہ ایک مختلف بات ہو جائے گی جسے اس وقت ہم کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں -

میرے اندازے میں پاکستان میں اِس وقت جو سب سے بڑا خطرہ کا مقام (DANGER SPOT) ہے وہ سندھ ہے - اندرونی طور پر وہاں پاکستان دشمن تحریک بہت پختہ اور

گہری ہو چکی ہے۔ جس کے کچھ مظاہر میں بیان کر چکا ہوں۔ ایک مظہر یہ بھی ہے۔ کہ 'اسلامی جمعیتِ طلبہ' وہاں بالکل نیست و نابود (WASH OFF) ہو چکی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ تحریک وہ تھی جسے اسلام دوست اور پاکستان دوست سمجھا جاتا تھا۔ کالجوں میں ان کی یونینیں تھیں اور بڑی مضبوط پوزیشن تھی۔ لیکن پچھلے کچھ عرصے میں حالات بہت تیزی سے بدل چکے ہیں۔ اندرونِ سندھ اب جمعیت طلبہ کا نام مٹ چکا ہے۔ جو نوجوان اس کے ساتھ منسلک ہیں وہ بھی خوف کے باعث برملا جمعیت کے ساتھ اپنے تعلق کا اظہار نہیں کر سکتے اس لئے کہ جمعیتِ طلبہ اب وہاں پنجاب ایجنٹ کے طور پر مشہور ہو چکی ہے ——— اندرونِ سندھ یہ صورتِ حال بہت خوفناک ہے اور کسی بڑے دھماکے کے لئے اندرونی فضا بالکل تیار ہے ——— ہندو وہاں بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک حکمتِ عملی اختیار کئے ہوئے ہے۔ وہ اپنے پیسے سے سندھو دیش جیسی تحریکوں میں سندھی نوجوانوں کو آگے بڑھا رہا ہے لیکن خود ہندو نوجوان دل لگا کر پڑھتا ہے۔ کالجوں میں ہندو لڑکوں کی تعداد ان کی آبادی کی نسبت سے بیس تیس گنا زیادہ ہے۔ اس لئے کہ وہاں کوٹہ سسٹم نہیں ہے کہ اتنی نشستیں مسلمانوں کی اور اتنی ہندوؤں کی۔ بلکہ میرٹ پر داخلے ہوتے ہیں۔ شہروں میں چونکہ مہاجرین ہیں ان کا راستہ روکنے کے لئے داخلوں کے معاملے میں وہاں شہری اور دیہاتی کی تقسیم تو ملحوظ رکھی جاتی ہے اور اس کے ذیل میں کوٹہ معین ہے لیکن ہندو مسلمان کی تقسیم موجود نہیں ہے۔ چنانچہ اندرونِ سندھ تعلیم حاصل کرنے کا سارا فائدہ ہندو اٹھا رہا ہے۔ چنانچہ ہندو نوجوان خود تو میڈیکل کالجوں اور انجینئرنگ کالجوں میں پورے طور پر چھایا ہوا ہے۔ لیکن ہندو سرمایہ اس وقت پاکستان کی جڑیں کاٹنے میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس سرمائے کے ذریعے اُن لوگوں کے ہاتھ مضبوط کئے جا رہے ہیں جو سندھ کو پاکستان سے کاٹنے کی فکر میں ہیں۔ یہ صورتِ حال انتہائی تشویشناک ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو شخص بھی اسلام اور پاکستان کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتا ہے اوّلاً تو اسے پوری صورتِ حال کا شعور و ادراک ہونا چاہیئے۔ پھر اُسے مثبت کام کے لئے کمر کس لینی چاہیئے۔

اس ضمن میں میں چاہتا ہوں کہ بعض ایسی باتیں آپ کے سامنے رکھوں کہ پنجاب کا مسلمان اگر انہیں نہیں سمجھے گا تو سندھی مسلمان کے لئے اُس کے دل میں ہمدردی راہ نہ

پا سکے گی۔ اور میرے نزدیک یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ اگر آپ اپنے مدمقابل کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اُس کا پس منظر کیا ہے۔ اُس کے پاس دلیل کیا ہے۔ اسکی شکایت کیا ہے، اُس کی الجھن کیا ہے!

پنجاب اور سندھ کے حالات کا تقابلی جائزہ اور سندھ میں مہاجرین کا کردار

آپ کو معلوم ہے کہ پنجاب اور سندھ ہی پاکستان کے دو بڑے صوبے ہیں۔ پنجاب سب صوبوں میں بڑا ہے جبکہ سندھ کا نمبر دوسرا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اہمیت کے اعتبار سے سندھ پنجاب کے ہم پلہ ہو چکا ہے۔ پاکستان کے مستقبل کے لحاظ سے جتنی کچھ اہمیت پنجاب کی ہے۔ سندھ کی اُس سے کم نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ہم اُس کے تاریخی پس منظر کو جاننے کی کوشش کریں جس کو سمجھے بغیر اس الجھاؤ کو حل کرنا ممکن نہیں ہے۔

میں نے پہلے بھی ایک بات کہی تھی آج پھر اسے سمجھ لیجیے کہ تقسیم کے وقت ہمارے یہاں پنجاب میں بھی تبادلۂ آبادی (EXCHANGE OF POPULATION) ہوا تھا اور سندھ میں بھی ہوا تھا۔ لیکن اس معاملے میں ایک بنیادی فرق ہے جو واقع ہوا ہے اور وہ یہ کہ پنجاب سے جو ہندو یا سکھ گئے تھے وہ پنجابی بولتے ہوئے گئے تھے اور جو مہاجر پنجاب میں آکر آباد ہوئے اُن کی اکثریت بھی پنجابی بولنے والوں پر مشتمل تھی۔ لہٰذا کوئی لسانی یا ثقافتی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ یہاں مہاجرین کی بہت کم تعداد ایسی آباد ہوئی جو اُردو بولنے والی تھی۔ دوسری طرف سندھ میں کیا ہوا! وہاں جو صورت حال ہے اگر آپ اُسے ذہن میں لائیں تو یقیناً آپ اپنے دل میں سندھیوں سے ایک گونہ ہمدردی محسوس کریں گے۔ اور اس سے مخالفانہ ضد کے عنصر میں کمی واقع ہو گی۔ سندھ میں ہُوا یہ کہ سندھی زبان بولنے والا ہندو گیا اور اُردو بولنے والا مہاجر آکر آباد ہوا۔ اب ایک لسانی اور ثقافتی پرابلم کا پیدا ہونا فطری تھا۔ چنانچہ الجھاؤ پیدا ہوا، اور اس الجھاؤ کو دوچند کیا خود ان مہاجرین کے رویے نے۔ مَیں یہ بات سکھر میں بھی برملا کہہ آیا ہوں اور کراچی جو مہاجرین کا گڑھ ہے وہاں بھی مَیں نے ڈنکے کی چوٹ کہا ہے کہ خدا کے بندو! کچھ تو سوچو! ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم نے اسلام کے لئے ہجرت کی تھی لیکن ذرا اپنے گریبانوں میں جھانکو بلکہ اپنے کردار کو دیکھو! تم نے یہاں آکر یہ روش اختیار کی کہ جس کے پاس جا بیٹھے آگئے اُس نے گھر سے بُرقعہ

اتار کر پھینک دیا - کیا یہ علامت ہے اس بات کی کہ ہجرت اسلام کے نام پر کی گئی تھی!
ہم نے اپنے کردار سے تو یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ہجرت اسلام کے لئے نہیں تھی صرف
دنیا کے لئے تھی، محض دُنیاوی منافع کے حصول کے لئے تھی - ہم نے درحقیقت ہجرت کے
نام کو بٹہ لگایا ہے - یہاں ہم نے اپنی تمام توانائیاں دُنیاداری میں لگائی ہیں، یہ بتایئے
کہ اسلام کے لئے کیا کیا ہے؟ آخر ہمارے اس طرزِ عمل کا کوئی ردِّ عمل پیدا ہونا تھا یا نہیں!
چنانچہ وہ ردِّ عمل پیدا ہوا کہ ٹھیک ہے، اگر یہی بات ہے تو اسلام اور پاکستان کے لئے ہم ہی
قربانی کیوں دیں؟ اگر معاملہ مفادات کا ہے تو مفادات کی دَوڑ میں ہم پیچھے کیوں رہیں؟
پھر تو قومیت کی بنیاد پر ہم ہر قیمت پر اپنے حقوق حاصل کریں گے — یہ ہیں وہ سارے
معاملات جنہیں ہمدردانہ انداز میں سمجھنے کی ضرورت ہے - ہم نے جو اسلام کے نام پر ہجرت
کی تھی تو آخر انہیں ہماری زندگیوں میں کون سا اسلام نظر آیا! ہم نے یہاں آکر دھونس
جمائی - ہم نے یہ سمجھا کہ ہم زیادہ تعلیمیافتہ لوگ ہیں، ہم زیادہ مہذب ہیں اور یہ مقامی
لوگ بالکل اُجڈ اور گنوار ہیں - بلکہ یہی رویّہ جو ہماری بیوروکریسی نے مشرقی پاکستان
میں اختیار کیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو حقیر جانا اور اپنا محکوم سمجھا اور خود برٹش بیورو
کریسی کے انداز میں وہاں شاہانہ رویّہ اختیار کیا - اس کے نتیجے میں وہاں ردِّ عمل پیدا ہوا۔
بعینہٖ یہ معاملہ سندھ میں ہوا ہے - لیکن صرف بیوروکریسی ہی نہیں پوری مہاجر کمیونٹی نے
یہ کردار ادا کیا ہے، اور بجائے اس کے کہ اسلام کی خدمت اور ملک کی تعمیر کے لئے مقامی
آبادی کے ساتھ مل جل کر مثبت کام کرتے، یہاں آکر اپنی تہذیب اپنی، اپنی ثقافت اور
اپنی زباندانی کی دھونس جمانے کی کوشش کی ہے - اب ظاہر ہے اس کا ردِّ عمل تو پیدا ہونا ہی
تھا — اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ زبان کا معاملہ بھی کم اہم نہیں ہے - زبان کی
رکاوٹ تعلیم کے میدان کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے - ظاہر بات ہے کہ اس میدان میں
وہ بچے آگے نکل جائیں گے جن کی نصابی کُتب اُن کی مادری زبان میں ہوں گی، اور جن کے لئے
وہ زبان نئی ہوگی اُن کے لئے اس رکاوٹ کے ہوتے ہوئے آگے نکلنا تقریباً ناممکن ہو جائیگا۔
اور اس طرح ایک مستقل فاصلہ (GAP) برقرار رہے گا - چنانچہ اس GAP کو انہوں نے محسوس
کیا یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو زبان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہم اسے قومی زبان نہیں
بننے دیں گے — اس لئے کہ اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ یہ (مہاجر) لوگ ہی صرف اسلام

چاہتے ہیں اور کچھ نہیں چاہتے تو پھر اُن کی سوچ کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے ۔ کاش ہماری اس وقت کی قیادت اگر دُور اندیش ہوتی تو یہ لسانی مسئلہ بہت پہلے طے ہو جاتا ۔ دو ایسے افراد ریکارڈ پر ہیں ۔ جنہوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ عربی زبان کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے ۔ اُن میں سے ایک سر آغا خان تھے اور دوسرے تھے سٹیٹ بنک کے پہلے گورنر جناب زاہد حسین صاحب ۔ لیکن کون سنتا ہے زبانِ درویش ! نتیجہ کیا نکلا کہ آج تک اُردو بھی آپ کی سرکاری زبان نہیں بن سکی ! اور آپ جانتے ہیں کہ زبان ہی کا مسئلہ تھا جس نے مشرقی پاکستان میں ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں ہتھیار فراہم کئے تھے ۔ اسی زبان کے حوالے سے بنگلہ دیش موومنٹ شروع ہوئی تھی ، جو بالآخر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بن گئی ۔

زبان کے معاملے میں محض کسی جذباتی انداز میں سوچنے کے بجائے ہمیں حقیقت پسندانہ انداز میں غور و فکر کرنا چاہیئے اور ان لوگوں کے لئے ہمدردانہ اور خیرخواہانہ رویّہ اختیار کرنا چاہیئے جو زبان کی رکاوٹ کے باعث مشکلات سے دوچار ہیں ——— تو یہ دو بنیادی وجوہ (FACTORS) ہیں جو مَیں نے آپ کے سامنے رکھے کہ جن کے باعث سندھ اور پنجاب کے حالات میں نمایاں فرق واقع ہوا ہے ۔ ایک بنیادی فرق تقسیم کے وقت تبادلۂ آبادی (EXCHANGE OF POPULATION) کی شکل میں سامنے آیا کہ پنجاب میں جو مہاجر آئے وہ اکثر و بیشتر مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے تھے لہٰذا کوئی لسانی یا ثقافتی الجھاؤ پیدا نہیں ہوا اسکے برعکس سندھ میں چونکہ زیادہ اُردو بولنے والے مہاجر جا کر آباد ہوتے لہٰذا وہاں زبان و ثقافت کی وہ پیچیدگیاں پیدا ہوئیں جن سے پنجاب محفوظ تھا ——— اور پھر یہ کہ اس فرق کو زیادہ نمایاں کیا مہاجرین کے طرزِ عمل نے کہ جنہوں نے اپنے کردار اور رویّے سے یہ ثابت کیا کہ ان کی ہجرت گویا دین کیلئے نہیں محض دُنیا کے حصول کے لئے تھی ۔ کچھ استثناءات یقیناً ہیں ۔ لیکن دین کا کوئی نقشہ اب اُن گھرانوں میں نظر نہیں آتا ، الا ماشاء اللہ میں ذاتی طور پر ان گھرانوں سے واقف ہوں جنکی خواتین کے بارے میں حفیظؔ کا یہ شعر صد فی صد درست تھا کہ ؎

"وہ چشمِ فلک نے آج تک دیکھی نہ تھی جن کی جھلک !"

ان مسلمان گھرانوں کی خواتین کہ جو نہ صرف یہ کہ برقعہ پوش ہوتی تھیں بلکہ تانگے میں بیٹھ

کر اگر گھر سے نکلتی تھیں تو دونوں طرف چادریں تان دی جاتی تھیں یعنی وہی نقشہ جو کہیں کہیں صوبہ سرحد میں اب بھی نظر آجاتا ہے، اب اُنہی خواتین کی پوتیاں یا نواسیاں کراچی کی سڑکوں پر نیم عریاں لباس میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ یہ آخر کس بات کا ثبوت ہے! تو بہر حال ان باتوں کا کوئی ردِ عمل تو ہونا تھا۔

تاریخی پس منظر کا ایک اہم اختلاف

ایک اور بات جس کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ سیاسی اور تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے اور پنجاب اور سندھ کے درمیان صحت مند ڈائیلاگ کے لئے اُس کا شعور بہت ضروری ہے۔ پنجابیوں اور سندھیوں کے درمیان بلاوجہ سوءِ ظن کی جو ایک فضا قائم ہو چکی ہے اُس میں کمی باہمی رابطے اور غیر متعصبانہ گفت و شنید ہی سے ممکن ہے۔ لیکن اس باہمی رابطے میں تاریخی پس منظر کا ایک بہت بڑا اختلاف حائل ہے جس کے تدارک کے لئے پہلے اُسے سمجھنا ضروری ہے۔

وہ پس منظر یہ ہے کہ سندھ محکوم رہا صرف سو برس۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ پر انگریز کا قبضہ ہوا صرف سو برس اس نے غلامی کے دیکھے ہیں اس سے زائد نہیں۔ گویا کم سے کم عرصہ جس نے برصغیر میں غلامی کا کاٹا ہے وہ ہمارا سندھی بھائی سندھی مسلمان ہے۔ باقی آپ کو معلوم ہے۔ بنگال میں تو پلاسی کی جنگ کے بعد غلامی آگئی تھی وہاں دو سو برس غلامی رہی ہے۔ اچھا پنجاب کا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ انگریز یہاں آیا تو تھا ۱۸۴۹ء میں لیکن اس سے پہلے پچاس برس یہاں سکھا شاہی رہی ہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ جو پچاس برس کی غلامی سکھوں کی رہی ہے اور اس دور میں جو سکھا گردی یہاں رہی ہے وہ کئی سو برس کی غلامی کے برابر ہے۔ ایسی غلامی کہ جس میں مسجدوں کی حرمت پامال ہوئی۔ لاہور کی بادشاہی مسجد اصطبل بنی ہوئی تھی۔ مسجدوں میں سیڑھیوں پر قرآن رکھے گئے تھے۔ تاکہ خالصہ اس پر پاؤں جما کر چڑھ سکے۔ یہ سب کچھ لاہور میں ہوا ہے۔ اذانیں سالہا سال بند رہی ہیں۔ خالصہ کا حکم تھا کہ کوئی اذان نہیں دی جا سکتی۔ اس قدر ظلم کہ جسے چاہے لوٹے جسے چاہے پیٹے، جو چاہے کرے۔ اُسے حکومت نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو دراصل حکومت کے نام پر غنڈہ گردی تھی۔ پنجاب کا مسلمان بدقسمتی سے ڈیڑھ سو برس کی غلامی دیکھ چکا ہے اور میرے حساب سے غلامی کے اثرات دراصل

ڈیڑھ سو برس کے نہیں بلکہ تین سو برس کے ہیں ۔ اس لئے کہ غلامی، غلامی میں فرق ہے ۔ انگریز کی غلامی اُس درجے کی نہیں رہی ہے جس درجہ کی غلامی سکھوں کی تھی ۔

اب اس سے جو فرق واقع ہوا ہے ۔ وہ بہت اہم ہے ۔ صورت حال یہ ہوئی کہ انگریز نے مسلمانوں سے سندھ کی حکومت چھینی تھی لہٰذا سندھی مسلمان میں انگریز کے خلاف شدید نفرت تھی ۔ ظاہر بات ہے کہ جو آپ کی آزادی چھینے گا۔ اس کے خلاف آپ کے جذبات نفرت ہی کے ہوں گے اور انتقام کا جذبہ ہوگا۔ یہی جذبہ ہے جس کے مظاہر ہمیں اس دور میں نظر آتے ہیں ۔ مَیں نے آپ کو بتایا کہ ۱۸۴۳ء میں تالپوروں کی حکومت ختم ہوئی اور سندھ پہ انگریز کی حکومت شروع ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں مَیں اپنی یادداشت سے آپ کو بتا رہا ہوں کہ حُر تحریک اپنی پوری شدت کے ساتھ چل رہی تھی ۔ روزانہ ہم اخبار میں پڑھتے تھے کہ آج فلاں سٹیشن پر حملہ ہوا آج فلاں جیل توڑ دی گئی آج فلاں تھانے پر حملہ کیا گیا ۔ یہ حُر کون تھے ! کاش کہ آپ کو معلوم ہوتا، درحقیقت سید احمد شہیدؒ کی تحریک ہی کا ایک تسلسل تھا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اسی کی ایک شاخ تھی ۔ یہ اس لئے کہ سید صاحب جب یہاں سے گزرے تھے تو موجودہ پیر پگاڑا صاحب کے جو جدّ امجد تھے، پیر پگاڑا صاحب کے والد کا نام بھی صبغت اللہ شاہ راشدی ہے ۔ جن کو کہ انگریزوں نے پھانسی دی تھی اور انکی پانچویں پشت میں جو ان کے بزرگ تھے جبکہ سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا قافلہ وہاں سے گزر رہا تھا، اس وقت بھی ان کا نام بھی صبغت اللہ راشدی تھا۔ انہوں نے سید صاحبؒ کی بہت آؤ بھگت کی تھی، بہت تعاون کیا تھا بلکہ وہ ساتھ جہاد پہ جانے کو تیار تھے ۔ پہلے سے بھی انکا کردار مجاہدانہ تھا ۔ یہ حُر تحریک انہی کی شروع کردہ ہے —— دراصل سید صاحب کا پروگرام یہ تھا کہ ہم اُدھر شمال سے سکھوں پر حملہ کریں اور اِدھر جنوب سے آپ لوگ حملہ کریں تاکہ ان پہ دو طرف سے یلغار ہو تو پھر وہ جم نہ سکیں، ٹک نہ سکیں —— وہ جو جذبۂ جہاد اور رُوحِ جہاد اس وقت سے چلا آ رہا تھا یہ وہی حُر موومنٹ ہے جس نے ۱۹۴۲ء تک انگریز کو وہاں چین سے بیٹھنے نہ دیا۔

یہ تو تھا سندھی مسلمان کا تاریخی کردار، اب ذرا پنجاب کی طرف آیئے، یہاں

کے مسلمان کا رویہ اس کے بالکل برعکس ہے، اس لئے کہ انگریز کو اُس نے خوش آمدید کہا لیکن اس کی بھی ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ پنجاب کے مسلمان کو تو سکھا شاہی سے نجات دلائی تھی۔ اس میں پنجابی کا قصور نہیں ہے۔ بلکہ اُن حالات میں پنجابیوں کا یہ طرزِ عمل بالکل فطری تھا کہ انگریز ان کے لئے نجات دہندہ بن کر آیا تھا۔ کہاں سکھوں کی بدترین غلامی اور کہاں اب انگریز کی محض دستوری و آئینی (نوعیت کی بالادستی) یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریز نے انتہائی ظلم اور بربریت کا معاملہ کیا تھا لیکن اُس کے بعد تو یہاں "تلوار" کی بجائے "قلم" کی عملداری تھی۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ پنجابی مسلمان کے دل میں انگریز کے خلاف نفرت کے جذبات کیوں پیدا نہیں ہوئے بلکہ ایک گونہ احسان مندی کا احساس پیدا ہوا۔ اس لئے کہ "هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ" احسان کا بدلہ تو احسان ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی مسلمان برِصغیر کے تمام مسلمانوں میں انگریز کا سب سے بڑا محسن ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ایک وقت وہ آیا تھا کہ انگریز دہلی سے نکالا جا چکا تھا اور انگریز نے دہلی پر دوبارہ جو قبضہ کیا وہ پنجابی مسلمان کی مدد سے کیا تھا۔ اگر پنجاب سے انگریزوں کی مدد کے لئے فوجیں نہ جاتیں تو ۱۸۵۷ء کے بعد برِصغیر سے انگریز کا نام و نشان مٹ جاتا ـــــ بہرحال یہ وہ تاریخی پس منظر ہے جس کی وجہ سے پنجابی مسلمان نے انگریزی فوج میں خدمات انجام دیں اور آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے کچھ بھائی وہ بھی تھے جنہوں نے نہ صرف عراق، مصر، بلکہ سعودی عرب کی زمین کو بھی اپنے خون سے رنگین کیا۔ مقابلہ کس سے تھا؟ مسلمانوں ہی سے! اور یہ سب کچھ محض انگریز کے استعمار کو وہاں جمانے کے لئے کیا گیا۔

اب اس پس منظر میں دیکھئے کہ انگریز کیا پالیسی اختیار کرتا ہے! انگریز نے یہ دیکھتے ہوئے کہ سندھی مسلمان میں بغاوت کے جراثیم موجود ہیں، اپنی فوج کے دروازے اُس پر بند کر دیئے اور یہ پالیسی اُس کے نقطۂ نظر سے بہت صحیح تھی اس لئے کہ جس میں بغاوت کے جراثیم ہوں اُسے فوج میں لانا گویا اپنی موت کو خود دعوت دینا ہے۔ ساتھ ہی انگریز نے یہ پراپیگنڈا بھی شروع کر دیا کہ سندھی نان مارشل ریس

(NON-MARTIAL RACE) ہیں کہ ان کی نسل میں جنگ کرنے اور لڑنے بھڑنے کی صلاحیت نہیں ہے یہ پروپیگنڈا سو برس سے جاری ہے۔ انگریز کے اس پراپیگنڈا اور حکمتِ عمل کے اثرات یہ نکلے کہ سندھی مسلمان ایک خول میں بند ہو کر رہ گیا اور کیفیت یہ ہو گئی کہ سندھی اپنے صوبے سے باہر نکلنے کو بھی یہ سمجھتا ہے کہ اس سے اس کی روایت ٹوٹ گئی اور وہ پردیسی ہو گیا ــــ اس پس منظر کے اختلاف سے سارا فرق واقع ہوتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سندھی مسلمان پنجابی کو یہ الزام دیتا ہے کہ یہ انگریز کے غلام تھے، یہ کرائے کے فوجی تھے، انہوں نے انگریز کی حکومت کو تقویت پہنچائی وغیرہ۔ آپ کو یاد ہو گا کہ سندھ کی ایک معروف شخصیت غلام مصطفیٰ شاہ صاحب نے ایک بار یہ بیان دیا تھا، اور میں پڑھ کر بہت حیران ہوا تھا۔ کہ "ہم نے کبھی کرائے کے فوجی کا کردار ادا نہیں کیا" اور یہ پنجابیوں پر ایک کھلا طنز تھا ــــ دوسری طرف پنجابی مسلمان کا اعتراض یہ ہے کہ سندھی فوج میں نہیں آتے۔ یہ نان مارشل ریس ہیں، ہم نے کب ان پر فوج کے دروازے بند کئے ہیں!

یہ ہے وہ الجھاؤ جسے سمجھنے اور سلجھانے کی ضرورت ہے۔ اگر ہماری کوئی قیادت ایسی ہوتی جو اس تمام پس منظر کو سامنے رکھ کر سندھی مسلمان کو اس خول سے نکالتی، انہیں ایسے مواقع فراہم کئے جاتے کہ ان کے لئے فوج میں آنا آسان ہوتا تو اصلاحِ احوال کا کوئی امکان پیدا ہوتا۔ آخر سندھی نوجوان بھی پنجابی نوجوان سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان کے قد و قامت کو دیکھئے اور پھر یہ کہ ان میں صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن انگریز نے انہیں پیچھے رکھا اور وہ بھی اپنے خول میں بند ہو گئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پوری صورتِ حال کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھا جائے اور باہمی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے ــــ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ پنجابی مسلمان بھی بے غیرت نہیں لیکن اب اسے کیا کیا جائے کہ انگریز نے انہیں بدترین سکھا شاہی سے نجات دلائی تھی لہٰذا اُس کے دل میں انگریز کے خلاف نفرت نہیں پیدا ہو سکی۔ ان حقائق کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ سندھی نوجوان بھی نان مارشل یعنی جنگی صلاحیت سے عاری نہیں ہے۔ اور اُسے اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے۔ سندھ میں جو کچھ ہو رہا ہے، جس طور سے جیلیں توڑی جا رہی ہیں تو کیا کوئی نان مارشل ریس یہ کچھ کرتی ہے! آخر یہ سب کام بھی بغیر کسی صلاحیت

بغیر کسی آرگنائزیشن کے نہیں ہوتے ۔ اس وقت وہاں کالج کے طلباء جوڈاکے ڈال رہے ہیں اُن کے گینگ بہت منظم ہیں اور سندھ کی پولیس اُن سے عاجز آچکی ہے۔ اُن کے پاس وہ ہتھیار ہیں جو ہماری پولیس کے پاس بھی نہیں لہٰذا ہر دوسرے روز اُس قسم کی افسوسناک خبریں سننے میں آتی ہیں کہ پولیس والے مارے جارہے ہیں اور اُن کی تخریبی کارروائیاں جاری ہیں ۔ اُن کے مختلف گروہوں نے آپس میں علاقے تقسیم کئے ہوئے ہیں ۔ حال ہی میں مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہاں ایک صاحب کو جب اغوا کیا گیا تو ان کے والد ڈیڑھ لاکھ روپے دیکر اُنہیں چھڑا کر لائے انہوں نے اپنے بیٹے کی بازیابی میں حکومت سے کوئی مدد نہیں لی بلکہ براہ راست اغوا کرنے والوں سے رابطہ کیا ۔ جو صاحب چھڑانے گئے تھے وہ کوئی پروفیسر ہیں وہ جب گئے تو انہیں وہاں اپنے ہی شاگرد نظر آئے ۔ ان "شاگردوں" نے یہ تو ضرور کہا کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ آپکا لڑکا ہے ورنہ ہم اسے اغوا نہ کرتے لیکن انہوں نے اس بات سے معذوری ظاہر کی کہ وہ بغیر کوئی تاوان اور معاوضہ لئے چھوڑ دیں گے ۔ انہوں نے بتایا کہ اُس رقم میں تو کئی گروہوں کا حصہ شامل ہے ۔ ہم صرف اپنا حصہ چھوڑ سکتے ہیں دیگر حصوں کو چھوڑنے کا اختیار ہمیں حاصل نہیں ہے ۔

حاصلِ کلام یہ حالات بہت خوفناک ہیں لیکن یہاں ان کے ذکر سے سندھیوں پر تنقید کرنا مقصود ہے اور نہ پنجابیوں پر بلکہ میری کوشش یہ ہے کہ پورے پس منظر کو واضح کردوں تاکہ اس کے حل کے لئے صحیح رُخ پر کوشش کی جاسکے ۔ مثبت پہلو جو مجھے وہاں نظر آیا یہ ہے کہ میری وہاں جن لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی اُن میں اکثر کے بارے میں میرا احساس یہ تھا کہ دین سے محبت کی ایک چنگاری اُن کے دلوں میں موجود ہے ۔ میں نے جب اُنہیں توجہ دلانے کیلئے بعض باتیں ان کے سامنے رکھیں تو میں نے اُن کی آنکھوں میں روشنی کی ایک جھلک محسوس کی ۔ میں نے اُنہیں سمجھایا کہ بھئی اگر تمہارا جھگڑا کوئی سیاسی جھگڑا ہے تو میں اس سے آپ کو نہیں روکتا ۔ ٹھیک ہے آپ اپنے سیاسی حقوق حاصل کرنے کیلئے جدوجہد کریں لیکن بھئی اسلام کو بیچ میں کیوں لاتے ہو! اسلام پر تو تمہارا حق زیادہ ہے اس لئے کہ برصغیر میں تو اسلام سب سے پہلے آیا ہی سندھ کے راستے تھا ۔ اسلام کی

کرنیں یہیں سے پورے برصغیر میں پھیلی ہیں۔ سب سے پہلی تفسیر سندھی زبان میں لکھی گئی۔ وہاں ایک عجیب تاریخی حقیقت میرے علم میں آئی کہ محمد حیاتؒ سندھ کے ایک بڑے محدث تھے جو ہجرت کرکے حرمین میں جا کر مقیم ہو گئے تھے اور وہاں انہوں نے درس وتدریس کا کام شروع کر دیا۔ مجھے بتایا گیا کہ شیخ محمد ابن عبدالوہابؒ بھی اُن کے شاگرد تھے اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ گھوٹکی کی ایک انتہائی قدیم مسجد میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا وہاں یہ بات میرے علم میں لائی گئی کہ شیخ سعدیؒ بھی وہاں کچھ دن کے لئے اقامت پذیر رہے ہیں۔ سندھ کو تو اس برصغیر کا پہلا دارالاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے اور وہاں اب صورت یہ ہے کہ اسلام ہی کی جڑیں کاٹی جا رہی ہیں۔

میرا تو پہلے بھی یہ موقف رہا ہے کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ نظامِ حکومت صدارتی ہو یا پارلیمانی ہو اسی طرح یہ معاملہ کہ صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا معاملہ کس طور سے ہو، یہ کسی فردِ واحد کے طے کرنے کی باتیں نہیں ہیں یہ چیزیں کثرتِ رائے سے طے ہونی چاہئیں اور ان معاملات میں عوام کی مرضی کا احترام ضروری ہے۔ چنانچہ اس حد تک اگر سندھ کے لوگ اپنے حقوق کیلئے جدوجہد کرتے ہیں تو میں اسے ان کا حق تسلیم کرتا ہوں لیکن جہاں تک اسلام کا معاملہ ہے اُس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ماضی کے حوالے سے گفتگو کی جائے اور یہ جو ایک فتنۂ ارتداد وہاں پھیل چکا ہے۔ گو انہوں نے اپنے نام نہیں بدلے لیکن میں اسے 'ارتداد' ہی سے تعبیر کروں گا اس لئے کہ ایک کثیر تعداد میں سندھی نوجوان حقیقت کے اعتبار سے مرتد ہو چکا ہے جو لوگ اسلام کو گالیاں دیں اور شعائرِ دینی کا مذاق اڑائیں انہیں ہم اور کیا کہیں گے! اسی لئے میں نے تقریر کے آغاز میں سورہ مائدہ کی وہ آیت سنائی تھی جس کا مفہوم یہ ہے کہ — اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین سے مرتد ہو گیا تو جان لو! اللہ تعالیٰ عاجز نہیں ہے وہ تمہیں ہٹا کر کسی ایسی قوم کو لے آئے گا جن سے وہ محبت رکھتا ہو گا اور وہ اس سے محبت رکھتے ہوں گے، جو اہلِ ایمان کے حق میں بہت نرم لیکن کفار کے مقابلے میں بہت سخت ہوں گے اور وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی

ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے ـــــ! وہاں یہ سارا فتنہ سندھی نیشلزم یا سندھی مارکزم کے نام پر اٹھایا جا رہا ہے اور مجھے بتایا گیا کہ اس کثرت سے یہ مسموم لٹریچر وہاں پھیلایا جا رہا ہے کہ سندھی مارکزم وغیرہ سے متعلق روزانہ ایک نئی کتاب چھپ جاتی ہے۔

وہاں بعض دینی ادارے ایسے موجود ہیں جو اسلام کا لٹریچر پھیلانا چاہتے ہیں لیکن وقت یہ ہے کہ وہ اگر اپنے وسائل کی فراہمی کے لئے حکومت سے مدد لیتے ہیں تو حکومت کے پٹھو قرار پاتے ہیں اور اس بنا پر مسترد کر دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان کو بچانے کے لئے پنجاب کے درد مند اور مخلص لوگ ایثار سے کام لیں اور ایسے اداروں کو تعاون فراہم کریں تاکہ وہ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لٹریچر سندھی زبان میں منتقل کر کے عوام میں لا سکیں ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے نہ تو کوئی سنسنی خیزی مقصود ہے نہ آپ کو مایوس کرنا پیش نظر لیکن صورت حال سامنے آئی ہے اس سے آپ کو آگاہ کرنا میں ضروری سمجھتا تھا تاکہ اگر آپ کچھ کرنے پر آمادہ ہوں تو وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

سیاسی سطح پر کوئی اصلاح احوال تو ہمارے امکان میں نہیں ہے۔ لیکن یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم نے سیاست ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے، حالانکہ دیگر سطحوں پر بھی کام کیا جا سکتا ہے، لٹریچر کے ذریعے، ثقافتی سطح پر اور دینی سطح پر اصلاح کا کام کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہندوؤں نے غیر سیاسی سطح پر منصوبہ بندی سے کام کر کے پہلے مشرقی پاکستان میں ہماری جڑیں کھودنے کا منفی کام کیا تھا اور یہی کام سندھ میں کر رہے ہیں۔ تو ہم اس طور سے کوئی مثبت کام کیوں نہیں کر سکتے۔ اور یہ کام لٹریچر کے ذریعے اور کلچرل لیول پر کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے ذریعے سے لوگوں کے اندر دینی جذبے کو پھر ابھارا جا سکتا ہے ـــــ اور اگر یہ کام نہ ہوا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اگر سندھ کی صورتِ حال دوبارہ اس درجے بگڑ گئی

جس کا ایک تجربہ ماضی قریب میں ہمیں ہو چکا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ بھارت اب دیر نہیں کرے گا اور پاکستان پر کاری ضرب لگانے کے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ جیسا کہ ۱۹۷۰ء میں بھارت کے ڈیفنس اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ مسٹر سبرامنیم نے مشرقی پاکستان کے حالات کو بھانپتے ہوئے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اُس نے یہ کہا تھا کہ "It is a centuries occasion" یعنی ایسا موقع کہیں صدیوں میں آتا ہے لہٰذا اسے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہیئے ـــــ اسی طرح اندیشہ ہے کہ سندھ کی صورتِ حال بھی کہیں بھارت کے لئے پاکستان دشمنی کی دیرینہ خواہش کو بھرپور طور پر پورا کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں ان خطرات سے محفوظ رکھے اور مجھے اور آپ کو یہ توفیق دے کہ ہم اس سلسلے میں کچھ مثبت کام کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ (آمین)

اَلْہُدٰی

(نشست ۳۲)

(مباحثِ ایمان)

سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں

حَظٍّ عظیم

ڈاکٹر اسرار احمد

(کے ٹیلیویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ)

(۴)

السلام علیکم نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ وَمَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلٰنَا الْعَظِیْمُ ۝

اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں تو مدافعت کرو اس طور سے جو نہایت عمدہ ہو تو تم دیکھو گے کہ وہی شخص کہ تمہارے اور جس کے مابین دشمنی ہے وہ تمہارا جاں نثار دوست بن جائے گا اور نہیں پہنچ پاتے اس مرتبہ اور مقام کو مگر وہی لوگ جو صبر کرنے والے ہیں اور نہیں حاصل کر

یہ اس رتبہ کو مگر وہ لوگ جو بڑے نصیب والے ہیں اور اگر تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ ہو ہی جائے تو فوراً اللہ کی پناہ میں آجاؤ۔ یقیناً وہی ہے سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا۔"

(سچ فرمایا ہمارے بزرگ و برتر آقا نے)

عزیز حاضرین اور مکرم سامعین!

یہ سورہ حٰم السجدہ کی آیات ۳۴ تا ۳۶ ہیں اور یہ ہمارے منتخب نصاب درس نمبر ۹ کی آخری قسط ہے۔ اس میں صبر کا بیان ہے لیکن جیسے ہم نے سورۃ السجدہ کی آیات ۳۱ تا ۳۳ کے درس میں دیکھا کہ ہر پہلو سے دین کی جو بلند ترین چوٹیاں ہیں ان کا ذکر ہوا ہے۔ ایمان کی چوٹی، اللہ کی ربوبیت پر دل کا جم جانا اور ٹھک جانا، مستقیم ہو جانا۔ تواصی بالحق کی چوٹی، اللہ کی طرف بلانا، دعوت الی اللہ اعمال صالحہ کی چوٹی، اپنے آپ کو مسلم کہنا اور اللہ کی تابعداری اختیار کرنا۔ اسی طرح لوازم نجات میں، سورۃ العصر کی رُو سے تواصی بالصبر کی جو آخری چوٹی ہے، اس کی بھی بلند ترین چوٹی کا یہاں بیان ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے! کہ اسلام کا ایک نظام قانونی ہے۔ شرعی، فقہی یا قانونی نظام کے اعتبار سے بدی کا بدلہ بدی ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی آپ کے ساتھ زیادتی کرے تو آپ کو بھی اسی طرح کی اس کے ساتھ زیادتی کرنے کا حق ہے۔ قصاص اور بدلے پر اسلام کا قانونی نظام قائم ہے۔ چنانچہ سورۃ حٰم السجدہ کے متصلاً بعد سورۃ شوریٰ آرہی ہے۔ اس میں قاعدہ کلیہ یہ بیان ہو رہا ہے کہ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ "کسی برائی کا بدلہ اس جیسی ہی برائی ہے"، یہ قانون ہے۔ البتہ ایک اس سے بلند تر سطح ہے، وہ ہے : فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ "لیکن اگر کوئی معاف کر دے اور اصلاح احوال کے لئے کوشاں ہو تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے"۔ اس نے اپنے لئے بہت بڑی نیکی کمائی۔ پھر اسی سورۃ مبارکہ میں آگے یہ اصول بیان فرمایا گیا کہ اگر کسی شخص پر زیادتی ہوئی ہو اور وہ بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں ہو گی۔ اس نے اپنا ایک قانونی حق

استعمال کیا ہے۔ لیکن پھر تلقین ہوئی : وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۔ ہاں جو صبر سے کام لے اور معاف کر دے تو یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے ۔ قرآنِ مجید کی جو جامع تعلیمات ہیں یہ اُن کا بڑا ہی حسین نمونہ ہے کہ قانون بدلہ اور قصاص پر مبنی ہے لیکن اخلاق کی بلندی، عفو، مغفرت اور درگزر اور گالیوں کے جواب میں دعائیں دینا ہے ۔

یہ بات جان لینی چاہیئے کہ مقامِ دعوت پر جو شخص فائز ہو جائے، جو دعوت الیٰ اللہ کا فریضہ انجام دے رہا ہو ۔ جس کے متعلق سابقہ سبق میں ہم نے دیکھا کہ عملِ صالح اس کی شرط لازم ہے لہٰذا اس کے لئے بدلہ لینے کا معاملہ اس کے منصب کے اعتبار سے مناسب نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے لئے وہ مقام ہے جو اِن آیات میں بیان ہوا فرمایا، وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ۔ ’’نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں‘‘ ۔ یہ بڑا پیارا انداز ہے اس میں ایک ایسی آفاقی حقیقت (Initiation of Universal Truth) سے متعارف کرایا گیا ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں ۔ ہر انسان تسلیم کرے گا کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں ۔ محبت آپ کریں گے تو جواب میں محبت ملے گی "Love begets Love" ۔ چاہے تاخیر سے ملے ۔ بسا اوقات انسان محبت کو پہچان نہیں پاتا ۔ جگر مرادآبادی کا بڑا پیارا شعر ہے کہ ؎

جگر وہ تو سراپا محبت ہی محبت ہیں
مگر اُن کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

پہچاننے میں دیر لگ سکتی ہے لیکن جب فطرتِ انسانی محبت کو پہچان لے گی تو محبت کا جواب محبت سے دے گی ۔ اسی طرح ظاہر بات ہے کہ نفرت و عداوت کی کوکھ سے نفرت و عداوت ہی جنم لے گی ۔ (Hatred begets Hatred)

تو یہ وہ ابدی و آفاقی حقیقت اور قاعدہ کلیہ ہے جس سے بات شروع کی گئی : وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا، اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ۔ جب تم مقامِ دعوت پر فائز ہو

جب تم خیر کی، نیکی کی، بھلائی کی، فلاح وصلاح کی اور اللہ کی طرف دعوت دے رہے ہو تو مخالفت تو ہوگی (Vested Interests) مفادات، قیادتیں، سیادتیں اور چودھراہٹیں راستہ روکیں گی۔ لوگ مزاحمت ومخالفت کریں گے لیکن اس مخالفت کے ردعمل کے طور پر تمہارا جوابی رویّہ ایسا ہونا چاہئے جو نہایت اعلیٰ ہو۔ بہت عمدہ ہو۔ دیکھنے والے دیکھیں کہ لوگ گالیاں دے رہے ہیں، تمسخر واستہزاء کر رہے ہیں تم دعائیں دے رہے ہو۔ جب تم پر پتھروں کی بارش ہو تو جواب میں تم پھول پیش کرو یہ بات جان لیجئے کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ اسی لئے آگے چل کر فرمایا ہے: وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ۔ نہیں پہنچ سکتے اس مقام اور مرتبہ کو مگر وہی جن میں سہار کا مادہ ہو، جن میں صبر اور تحمّل ہو۔ جو جھیل جانے والے ہوں، جو کڑوے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جن میں سختیوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہو۔ یہ لوگ برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتے، سختی کے جواب میں سختی نہیں کرتے اور یہ وہ لوگ ہیں جو بڑے نصیبے والے ہیں۔ صاحب حظِ عظیم ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مقام پر کامل ترین مثال تو جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اس کا مرتبہ بکمال وتمام مصداق تو، ذاتِ محمدؐ ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ طائف کی گلیوں میں پتھراؤ ہو رہا ہے۔ جسم مبارک لہولہان ہو گیا ہے۔ نعلین شریف خون سے جم گئی ہیں۔ لوگ تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ استہزاء اور تمسخر ہو رہا ہے، ٹھٹھے لگائے جا رہے ہیں، دل کو چھید دینے والے طنز وطعن کے تیر برسائے جا رہے ہیں۔ لیکن جب حضور وہاں سے واپس تشریف لاکر ایک پہاڑی کے دامن سے سہارا لے کر کچھ دیر استراحت فرما رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت ملک الجبال خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا ہے۔ وہ فرشتہ جو پہاڑوں کے انتظام وانصرام پر مامور ہے اور وہ عرض کرتا ہے کہ حضور مجھے اللہ تعالیٰ نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو میں ان پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دوں؟ جن کے مابین طائف

کی یہ بستی آباد ہے اور اس میں بسنے والے سب لوگ پس کر سرمہ ہو جائیں، لیکن حضورؐ رحمۃ العالمینؐ نے فرمایا نہیں۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت کی توفیق عطا فرما دے۔ غور کیجئے! کہ یہ کتنی بڑی تاریخی حقیقت ہے کہ ہم پاکستان کے بسنے والے نبی اکرمؐ کے اِس قول کو زیادہ بہتر طریق پر سمجھ سکتے ہیں چونکہ اس سرزمین میں' اسلام کا پیغام لانے والی شخصیت محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ یہ کون تھے؟ یہ ثقفی تھے۔ بنو ثقیف کا قبیلہ طائف میں رہنے والا قبیلہ تھا۔ اگر طائف کی وہ بستی' تباہ و برباد کر دی گئی ہوتی تو محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کہاں سے آتے۔!

صبر و تحمل کی یہ جو چوٹی ہے اور کردار کی یہ جو بلندی ہے' میں نے عرض کیا کہ اس کی کامل ترین مثال اور مصداق ہیں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس کے بعد درجہ ہے تمام انبیاء و رسل کا اور پھر مقام و رتبہ ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا۔

صحابہ کرامؓ کے دورِ سعید کے بعد اس نقشے پر ہمیں نظر آتے ہیں اولیاء اللہ اور صوفیاء کرام رحمہم اللہ علیہم۔ انہوں نے جس طرح نفرت کا جواب محبت سے دیا۔ انہوں نے جس طرح گالیوں کے جواب میں دعائیں دیں۔ لوگوں کی طرف سے دی جانے والی ایذاؤں کے جواب میں جس طرح انہوں نے خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنایا' اس کے جو نتائج نکلے' اسے کسی کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے کہ:

ع ۔ جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

ان بزرگوں نے دلوں کو فتح کیا اور وہ زمانہ کے فاتح بنے۔ غور کیجئے کہ حضرت شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کفر کے گڑھ میں آکر بیٹھے۔ ان کے پاس کونسی قوتِ تسخیر تھی جس کے نتیجہ میں نوّے ہزار اشخاص' ایک فردِ واحد کے ہاتھ پر ایمان لے آئے۔ پھر دیکھئے شیخ بابا فرید الدین رحؒ کے ہاتھ پر دریائے ستلج اور دریائے راوی کے دونوں طرف راجپوتوں کے جتنے قبائل آباد تھے وہ سب کے سب اس فردِ واحد کی تبلیغ سے ایمان کی دعوت قبول کرنے والے بنے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان بزرگوں کی زندگیاں نقشہ تھیں اسوۂ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا۔

اب آیت زیرِ درس کی طرف رجوع کیجئے، فرمایا: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں۔ اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، مدافعت کرو۔ لوگوں کی مخالفت کو دور کرو، اسے دفع کرو، اسے غیر مؤثر بنا دو۔ لیکن اُس طور سے جو نہایت اعلیٰ ہو، بہت عمدہ ہو، تو نتیجہ کے طور پر تم دیکھو گے، فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ۔ کہ وہی جو آج تمہارے دشمن ہیں، خون کے پیاسے ہیں، وہی کل تمہارے جاں نثار ہوں گے۔ جو آج تمہارا خون بہانے کے درپے ہیں، کل جہاں تمہارا پسینہ گرے گا وہاں وہ اپنا خون بہانے کو اپنے لئے موجبِ سعادت سمجھیں گے۔

یہ بات جان لیجئے کہ کچھ ایسی مسخ شدہ طبیعتیں بھی ہوتی ہیں (Perverted mentality) کے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جن پر محبت بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ ابوجہل نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کا اثر قبول نہیں کیا۔ ابولہب میں وہ صلاحیت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ فاتحِ عالمِ محبت جس کے جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیکرِ مجسّم تھے اسے متأثر کرسکتی۔ لیکن ایسی مثالیں استثنائی ہوتی ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی نوعِ انسانی محبت، اعلیٰ و ارفع اخلاق اور ہمدردی، دلسوزی، دمسازی کے طرزِ عمل کا اثر قبول کرتی ہے، جلد یا بدیر۔

اس کے بعد فرمایا، وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ۔ اگر کبھی شیطان کی طرف سے بر بنائے طبعِ بشری کوئی اکساہٹ ہو ہی جائے اور ہوسکتا ہے کہ گالیاں دینے والوں، استہزا اور تمسخر کرنے والوں تشدد و تعدی کرنے والوں اور الزام تراشیاں کرنے والوں کی باتوں پر دل میں غصہ اور انتقام کا جذبہ پیدا ہو ہی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت انسان کا نفس اسے آمادہ کرے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ ہوسکتا ہے کہ ان تمام مخالفانہ و معاندانہ حرکتوں سے انسان کی طبیعت میں اشتعال کی کیفیت پیدا ہوجائے۔ یہ صورتِ حال محسوس کرو تو جان لو کہ یہ شیطان کی وسوسہ اندازی ہے۔ یہ اس کی اکساہٹ ہے۔ وہ تمہیں اس راستہ پر ڈال کر تمہاری دعوت کو نقصان پہنچانا اور اسے غیر مؤثر کردینا چاہتا ہے۔ داعی

(بقیہ صہ۹۲ پر)

اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم

فتح مُبین

صُلح حدیبیہ ٥ فتحِ خیبر اور فتح مکّہ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے

(ساتویں خطاب کی دُوسری قسط)

ترتیب و تسوید جمیل الرحمٰن

صلح نامہ کی تحریر، شرائط اور چند اہم واقعات

یہ بات تو برسبیل تذکرہ درمیان میں آ گئی۔ اب آیئے پھر سہیل ابنِ عمرو کی مصالحت کی گفتگو کی طرف۔۔ اِس موقع پر یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ قریش کو بیعتِ رضوان کی خبر پہنچ چکی تھی جس پر ان میں کافی سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ اسی لیے انہوں نے سہیل ابنِ عمرو کو اپنی طرف سے نمائندہ بنا کر بھیجا تھا کہ وہ ایسی شرائط پر مصالحت کر لیں جو قریش کے لیے آبرومندانہ ہوں۔ سبکی کا باعث نہ ہوں۔ وہ جب حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے مصالحت کا عندیہ ظاہر کیا اور گفت و شنید کے بعد طے ہُوا کہ صلح نامہ تحریر کر لیا جائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ تحریر (DICTATE) کرانا شروع کیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کاتب کا فرض انجام دے رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا: لکھو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"۔ سہیل ابنِ عمرو نے فوراً ٹوک دیا کہ نہیں! ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے واقف نہیں ہیں۔ ہم تو ہمیشہ سے "باسمک اللّٰھم"

استعمال کرتے رہے ہیں لہٰذا یہی الفاظ لکھے جائیں گے۔ ہم آپؐ کے الفاظ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تسلیم کرنے کیلیے تیار نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا "ٹھیک ہے لکھ دو: باسمک اللّٰھم فرق کوئی واقع نہیں ہوتا" اِس کے بعد حضورؐ نے حضرت علی رضؓ سے فرمایا کہ لکھو کہ "یہ وہ صلح ہے جو محمد الرسول اللہ اور قریش کے مابین منعقد ہوئی" سہیل ابن عمرو نے فوراً دوسرا اعتراض جڑ دیا کہ "محمد الرسول اللہ کے الفاظ نہیں لکھے جا سکتے۔ اِس لیے کہ اسی پر تو ہمارا سارا تنازعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ صلح نامہ کے نیچے فریقین کے دستخط ہوں گے یہ پوری عبارت گویا دونوں کے مابین متفق علیہ ہوگی لہٰذا اس میں اگر آپؐ کا نام رسول اللہ لکھا ہوا ہے تو ہم اگر آپؐ کو رسول اللہ مان لیں تو کوئی جھگڑا ہی نہ رہے کوئی تنازعہ باقی نہ رہے۔ پھر صلح کا کیا سوال اِس آپؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھا نہیں جائے گا" سہیل ابنِ عمرو کا یہ اعتراض قانونی اعتبار سے درست تھا VALID تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے ذہین اور مدبّر شخص تھے ۔۔۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس اعتراض پر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم مانو یا نہ مانو میں اللہ کا رسول ہوں۔

حضرت علی رضؓ کا طرزِ عمل

ساتھ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا جو اس صلح نامہ کی کتابت کر رہے تھے کہ "علی! رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور اس کی جگہ محمد ابنِ عبداللہ لکھ دو" صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت علی رضؓ نے جواب میں عرض کیا کہ "حضورؐ! یہ کام میں نہیں کر سکتا"۔

میں آپ حضرات سے عرض کرتا ہوں کہ آپ اس بات کو خوب اچھی طرح نوٹ کر لیں اِس لیے کہ بعد میں ایک گروہ نے ایک دوسرے واقعہ کو جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے، اِس پروپیگنڈے کی بنیاد بنایا ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے حضورؐ کی شان میں گستاخی کی اور انہوں رضؓ نے صلح نامہ حدیبیہ پر ناراضگی اور خفگی کا اظہار کیا جو مستلزم ہے اظہارِ عدمِ اعتماد کو۔ چنانچہ اِس بات کو ایک خاص گروہ نے حضرتِ عمر فاروق رضؓ کی شخصیت کو مجروح کرنے اور سبّ و شتم کا نشانہ بنانے کا ذریعہ اختیار کرنے کے سبب استعمال کیا جاتا حال جاری ہے۔ میں عرض کروں گا کہ یہاں نوٹ کیجیے کہ اگر یہ کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علی رضؓ اس موقع پر نبی اکرمؐ کی حکم عدولی کر رہے ہیں کہ حضورؐ فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو اور وہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں مٹاؤں گا۔

اِس موقع پر حضورؐ نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کہاں ہیں وہ الفاظ! چونکہ آپؐ تو اُمّی تھے۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ دنیوی طور پر لکھنا پڑھنا آپؐ نے نہیں سیکھا تھا تو حضرتِ علی رضؓ نے وہ مقام بتایا اور حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے وہ الفاظ مٹا دیئے۔ پھر وہاں لکھا گیا کہ محمد ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب اور قریش کے مابین یہ معاہدہ طے پایا۔

معاہدہ کی شرائط

اِس معاہدہ کی جو شرائط تھیں ان میں سے بعض بظاہر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ کرام رضؓ کے لیے نہایت سبکی کا باعث اور توہین آمیز تھیں۔ سہیل نے سب سے پہلے تو یہ شرط پیش کی کہ ہم یہ برداشت کر ہی نہیں سکتے کہ اِس سال مسلمان عمرہ کریں۔ اِس سال عمرہ کرنے کی اجازت دینے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ پورے عالمِ عرب میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی بات پوری ہوگئی اور قریش کو جھکنا پڑا اور ہتھیار ڈالنے پڑے۔ لہٰذا اِس سال تو آپؐ کو یہیں سے واپس جانا ہوگا۔ البتہ اگلے سال آپؐ تشریف لے آیئے اور ہم تین دن کے لیے مکّہ کو خالی کر دیں گے۔ ہم پہاڑوں پر چلے جائیں گے مکّہ آپؐ کے DISPOSAL پر ہوگا۔ آپؐ وہاں رہیئے اور عمرہ کیجیے۔ مکّہ والے وہاں رہیں گے ہی نہیں تاکہ کوئی شخص بھی جذبات سے مشتعل ہو کر کوئی اقدام نہ اُٹھا بیٹھے۔ اِس تصادم کے امکان کو بھی روک دیا جائے گا۔ البتہ آپؐ کے ساتھ تلواریں اگر ہوں گی تو وہ نیام میں ہوں گی اور نیام بھی تھیلوں میں بند ہوں گے تھیلے احرام کی حالت ہی میں ہاتھ میں رہیں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ تلواریں نیام میں ساتھ لٹکی ہوئی ہوں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ دس سال تک ہمارے اور آپؐ کے مابین بالکل امن رہے گا۔ کوئی جنگ نہیں ہوگی۔ تیسری شرط یہ طے ہوئی کہ عرب کے دوسرے قبائل میں سے جو چاہے ہمارا حلیف بن جائے اور جو چاہے آپؐ کا حلیف بن جائے۔ فریقین کے حلیف بھی امن وامان سے رہیں گے۔ ان کے مابین بھی جنگ وجدال بالکل نہیں ہوگی۔ یہاں نوٹ کیجئے کہ بنو خزاعہ جس کے سردار تھے بدیل ابن ورقہ جن کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا ہے، انہوں نے وہیں سے اعلان کیا کہ ہم محمد کے ساتھ ہیں۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ بنو بکر ایک دوسرا قبیلہ ہے جس کی بنو خزاعہ سے پُرانی دشمنی تھی، اس نے فوراً دوسرا

رُخ اختیار کر لیا کہ ہم اس معاہدہ کی رو سے قریش کے حلیف ہیں۔ معاہدہ کی چوتھی
مسلمانوں کے لیے بظاہر بہت توہین آمیز اور دل آزاری کا باعث تھی۔ وہ یہ کہ ا
مکہ کا کوئی شخص اپنے ولی یا سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا تو مسلما
کو اُسے لوٹانا ہوگا۔ لیکن مدینہ سے اگر کوئی شخص مکہ آجائے گا تو اُسے ہم واپس نہ
کریں گے۔ یہ وہ شرط تھی کہ اس میں بڑی غیر منصفانہ (UN-EQUAL) بات پ
سہیل ابن عمرو کا اصرار تھا۔ صحابہ کرام رض اس پر بڑے جز بز ہوئے۔ ان کے جذبات
میں جوش و ہیجان پیدا ہوا کہ ہم یہ صورت کیوں گوارا کر رہے ہیں! ہم دب کر اور گ
کر کیوں صلح کریں! ہم اس وقت چودہ سو کی تعداد میں موجود ہے اور ہمیں تو شہادت
کی موت مطلوب ہے۔ ہم بیعت علی الموت کر چکے ہیں اور ہم سب کے سب کلمۂ حق
کے لیے اپنی گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہی نہیں بے تاب ہیں۔ لہذا ہم ان شرائط پ
صلح کیوں کریں جو سہیل منوانا چاہتے ہیں! جو بظاہر احوال واقعتاً گر کر اور دب کر صلح کرنے
کے مترادف معاملہ تھا۔ صحابہ کرام رض کے یہ جذبات تھے لیکن سب کے سب مہر بلب

حضرت عمر رض کا اضطراب

یہ وہ لمحات ہیں جن کے متعلق ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صحابہ کرام رض کے جذبات کا کیا عالم ہوگا

یہ وہ وقت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دینی حمیت و غیرت کے باعث اضطراب
اتنا بڑھا کہ صبر کا دامن ان رض کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ رض آگے بڑھے اور حضور
صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ مکالمہ کیا جو تمام مستند سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے۔
دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمر رض کو قدرت کی طرف سے جلالی طبیعت ودیعت ہوئی تھی۔
اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد ان رض کی اس کیفیت میں کافی اعتدال
آگیا تھا لیکن کبھی کبھار دین کی حمیت کے باعث اُس جلالی طبیعت کا غلبہ ہو جاتا تھا۔
دراصل یہ سبب تھا کہ انہوں رض نے تیکھے انداز سے اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
سے گفتگو کی۔ جس کا ان رض کو ساری عمر تأسف رہا ہے اور انہوں رض نے اُس اندازِ گفتگو کے
کفارہ کے طور پر جو بظاہر گستاخانہ انداز تھا نہ معلوم کتنی نفلی عبادات کی تھیں۔
انہوں رض نے آپ سے عرض کیا، حضور! کیا آپ حق پر نہیں ہیں اور کیا آپ اللہ کے نبی
نہیں ہیں؟! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے جواب میں ارشاد فرمایا، یقیناً

میں حق پر ہوں اور میں اللہ کا نبی ہوں۔" پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ "تو حضورؐ! پھر ہم اِس طرح معاملہ کیوں کر رہے ہیں!! کیا اللہ ہمارے ساتھ نہیں ہے!!!" حضورؐ نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا "اللہ میرے ساتھ ہے اور میں اس کا نبی ہوں اور میں وہی کچھ کر رہا ہوں جس کا مجھے حکم ہے"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تبسم کے ساتھ جوابات کا انداز بتا رہا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اِس اندازِ تخاطب سے آپؐ قطعی ناراض نہیں ہوئے تھے۔

صدیق اکبرؓ کا جواب

ظاہر بات ہے کہ نبی اکرمؐ کے جوابات سُن کر حضرت عمرؓ کو حضورؐ سے تو مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی لیکن طبیعت میں ایک تلاطم ہے، ایک طوفان ہے ایک ہیجانی کیفیت ہے۔ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے جو اُس وقت اِس خیمہ میں موجود نہیں تھے۔ ان رضؓ سے بھی اسی نوع کا مکالمہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ "کیا ہم حق پر نہیں ہیں! اور کیا محمد اللہ کے رسول نہیں ہیں!! (صلی اللہ علیہ وسلم)"۔ انہوں نے فرمایا کہ "کیوں نہیں۔ یقیناً ہم حق تھے" ایسا محال ہے کہ اس موقع پر کسی صحابی کی زبان سے کوئی اعتراض یا احتجاج کا کوئی لفظ نکلا ہو۔

ابو جندلؓ کی آمد

ادھر تو بات کا یہ عالم تھا ادھر اس سلگتے ہوئے جذبات پر اِس واقعہ نے تیل کا کام کیا کہ انہی سہیل ابن عمرو کے صاحبزادے تھے ابو جندلؓ جو ایمان لا چکے تھے اور سہیل نے ان کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر رکھا تھا۔ پھر یہ کہ سہیل اور قریش کے دوسرے لوگ ان رضؓ [illegible] کیا کرتے تھے تاکہ وہ اِس تشدد سے گھبرا کر اپنے آبائی بُت پرستی کے دین کی طرف لوٹ آئیں۔ انہیں جب پتہ چلا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے ہیں جو مکہ سے چودہ پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے تو انہوں نے کسی نہ کسی طرح بیڑیاں تڑوائیں اور چھپتے چھپاتے حدیبیہ میں حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ابھی اِس معاہدہ کی سیاہی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس موقع پر ابو جندلؓ وہاں پہنچے ہیں۔ زنجیریں ان کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہیں۔ جسم پر مار کے نشان ہیں۔ وہؓ سیدھے آئے اور نبی اکرمؐ کے قدموں میں لپٹ گئے۔ سہیل ابن عمرو نے فوراً کہا کہ یہ ہے

پہلا معاملہ۔ صلح کی جو شرائط ہمارے مابین طے ہو چکی ہیں ان کے مطابق آپ کو ابوجندل کو میرے حوالے کرنا ہوگا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ" شرائط ضرور طے ہو گئی ہیں لیکن تم ان کو تو ہمارے ساتھ رہنے کی اجازت دے دو۔" سہیل نے کہا کہ" قطعاً نہیں، اسے تو بہر صورت آپ کو واپس کرنا ہوگا۔" حضورؐ نے پھر فرمایا " سہیل تم اس کو یہیں رہنے دو۔" اس نے فوراً کہا کہ" پھر ہمیں کوئی صلح نہیں چاہیئے۔ شرائط کالعدم۔ اب تلوار ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی"۔ حضورؐ نے فرمایا کہ" اچھا تم نہیں مانتے تو ٹھیک ہے۔ صلح کی شرائط باقی رہیں گی جنگ سے صلح بہتر ہے"۔ ابوجندلؓ چیخ رہے ہیں اور اب انہوں نے خیمہ میں موجود مسلمانوں سے استغاثہ کیا کہ" مسلمانو! مجھے کن بھیڑیوں کے حوالہ کر رہے ہو!" ۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ جذبات کا کیا عالم ہوگا! سب کے دل مجروح تھے لیکن جوش سے لبریز تھے۔ سینوں میں دل بے تاب تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذرا سا بھی اشارہ ہو جائے تو تلواریں نیام سے نکل آئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مرحلہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اطاعت شعاری کا بڑا کڑا، بڑا شدید اور بڑا نازک امتحان تھا جس سے اللہ تعالیٰ ان کو گزار رہا تھا۔

حضرت عمرؓ کا اضطراب

یہ وہ لمحات ہیں جن کے متعلق ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے جذبات کا کیا عالم ہوگا! یہ وہ وقت ہے کہ حضرت عمرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دینی حمیت و غیرت کے باعث اضطراب اتنا بڑھا کہ صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہؓ آگے بڑھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ مکالمہ کیا جو تمام مستند سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمرؓ کو قدرت کی طرف سے جلالی طبیعت ودیعت ہوئی تھی۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد ان کیؓ اس کیفیت میں کافی اعتدال آگیا تھا۔ لیکن کبھی کبھار دین کی حمیت کے باعث اُس جلالی طبیعت کا غلبہ ہو جاتا تھا۔ دراصل یہ سبب تھا کہ انہوںؓ نے تیکھے انداز سے اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی۔ جس کا ان کو ساری عمر تاسف رہا ہے اور انہوںؓ نے اس انداز گفتگو کے کفارہ کے طور پر جو بظاہر گستاخانہ انداز تھا نہ معلوم کتنی نفلی عبادات کی تھیں۔ انہوں نے آپؐ سے عرض کیا " حضورؐ! کیا آپؐ حق پر نہیں ہیں اور کیا آپؐ اللہ کے نبی

نہیں ہیں !"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے جواب میں ارشاد فرمایا " یقیناً میں حق پر ہوں اور میں اللہ کا نبی ہوں "۔ پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ " تو حضورؐ ! پھر ہم اس طرح معاملہ کیوں کر رہے ہیں ! ! کیا اللہ ہمارے ساتھ نہیں ہے !!! "۔ حضورؐ نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا۔" اللہ میرے ساتھ ہے اور میں اس کا نبی ہوں اور میں وہی کچھ کر رہا ہوں جس کا مجھے حکم ہے "۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تبسم کے ساتھ جوابات کا انداز بتا رہا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس انداز تخاطب سے آپؐ قطعی ناراض نہیں ہوئے تھے۔

صدیق اکبرؓ کا جواب

ظاہر بات ہے کہ نبی اکرمؐ کے جوابات سن کر حضرت عمرؓ کو حضورؐ سے تو مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ لیکن طبیعت میں ایک تلاطم ہے، ایک طوفان ہے، ایک ہیجانی کیفیت ہے۔ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے جو اس وقت اس خیمہ میں موجود نہیں تھے۔ ان سے بھی اسی نوع کا مکالمہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے کہا " کیا ہم حق پر نہیں ہیں !! اور کیا محمد اللہ کے رسولؐ نہیں ہیں !! "۔ انہوں نے فرمایا کہ " کیوں نہیں یقیناً ہم حق پر ہیں۔ اور حضورؐ اللہ کے رسول ہیں "۔ حضرت عمرؓ نے پھر وہی بات کہی جو حضورؐ سے عرض کر چکے تھے کہ " پھر یہ کیا ہو رہا ہے اور ہم کیوں دب کر صلح کر رہے ہیں ! "۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں بعینہٖ وہی الفاظ کہے کہ " بے شک ہم حق پر ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور وہؐ وہی کرتے ہیں جس کا انہیںؐ حکم ہوتا ہے "۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ ہے مقام صدیقیت — اور یہ کہ نبی اور صدیق کے مزاج میں بہت قرب ہوتا ہے۔

ایک مخصوص گروہ کی اتہام طرازی اور اس کا ازالہ

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساری عمر اس رویہ پر جو بظاہر گستاخانہ معلوم ہوتا ہے پشیمانی اور تاسف رہا ہے اور وہ جنہ کفارہ کے طور پر ساری عمر متعدد نفلی عبادتیں کرتے رہے ہیں لیکن ایک خاص گروہ اس واقعہ کو لے اڑا ہے اور حضرت عمرؓ کو متہم کرتا اور سب و شتم کا نشانہ بناتا چلا آ رہا ہے کہ

وہ بڑے گستاخ تھے اور وہ ایسے تھے، ویسے تھے۔ الغرض ایک خاص گروہ کی طرف سے حضرت عمرؓ کی شان میں گستاخیاں کرنے اور انہیں متہم کرنے کے لیے اِس واقعہ کو بھی نمک مرچ لگا کر خوب اُچھالا جاتا ہے۔۔۔ میں اِس بارے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر اِس معنی و مفہوم میں یہ بات لی جائے گی تو گویا بات حضرت عمرؓ کی ذات تک نہیں رہے گی بلکہ اِس کی زد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی بھی آجائے گی کہ انہوں نے بھی گستاخی کی کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے سرتابی کی۔ حالانکہ دنیا کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ "الامر فوق الادب" — حکم ادب سے بالاتر ہے۔ جب حکم دیا جا رہا ہو تو ادب و تعظیم کا معاملہ پیچھے رہ جائے گا۔ حکم پر بہرصورت عمل کیا جائے گا لیکن معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ نہ حضرت علیؓ کی نیت میں کوئی خلل تھا اور نہ ہی حضرت عمرؓ کی نیت میں کوئی فتور تھا۔۔۔ ان دونوں جلیل القدر اصحابِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم و رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ذہنوں میں نہ بغاوت و سرتابی کے جراثیم تھے اور نہ ہی گستاخی کا کوئی ارادہ تھا۔ بلکہ درحقیقت یہ حمیتِ حق تھی جس کی وجہ سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اِس فرمان پر کہ "رسول اللہ" کا لفظ صلح نامے سے مٹا دو، حضرت علیؓ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو گئے کہ "میں تو یہ کام کرنے والا نہیں ہوں" اور اسی حمیتِ حق کے سبب سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا اندازِ گفتگو اختیار کیا۔ ان دونوں حضراتِ گرامؓ کے اِس طرزِ عمل پر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نہ کوئی سرزنش فرمائی نہ ہی اظہارِ ناراضگی و ناپسندیدگی فرمایا۔۔۔ بلکہ حضرت علیؓ سے فرمایا کہ مجھے بتاؤ کہ "رسول اللہ" کے الفاظ کہاں مرقوم ہیں، اور پھر اپنے دستِ مبارک سے اُسے مٹا دیا۔۔۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت عمرؓ کے تیکھے انداز میں کیے گئے تمام سوالات کے جوابات نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تبسم کے ساتھ ارشاد فرمائے۔ یہ تمام باتیں اِس امر کی علامت ہیں کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم ان حضراتِ گرامیؓ کے جذبات کی صحیح نوعیت سے بخوبی آگاہ تھے۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حضرت ابوجندلؓ کو نصیحت ۔۔۔

بہرحال سہیل ابن عمرو کی ضد اور اصرار کو دیکھ کر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم

نے فیصلہ صادر فرمادیا کہ ابوجندل رض کو سہیل رض کے حوالہ کر دیا جائے اور ان رض سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ " اے ابوجندل رض! صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور دوسروں کے لیے جو انہی حالات میں مظلومانہ طور پر مقید ہیں کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا۔ ہم صلح کی شرائط طے کر چکے ہیں اور ان کی رو سے ہم پابند ہیں کہ تمہیں واپس کر دیں " چنانچہ سہیل اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ واپس لے گئے۔

صحابہ کرام رض کا غیر معمولی طرزِ عمل

اب جبکہ صلح ہو گئی۔ اِس پر دستخط ثبت ہو گئے اور سہیل واپس چلے گئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ نے صحابہ کرام رض سے فرمایا کہ " اب تم قربانی کے لیے جو جانور ساتھ لائے ہو ان کی یہیں پر قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو " اب آپ اِس وقت مسلمانوں کے جذبات کا جو عالم تھا اس کا اندازہ کیجئے — ہوا یہ ایک شخص بھی نہیں اُٹھا — جذبات کی یہ کیفیت تھی کہ گویا ان کے اعصاب و اعضاء بالکل شل ہو گئے ہیں۔ حرکت کرنے کی بھی ان میں طاقت نہیں ہے۔ اِس درجہ ان کے دل بجھے ہوئے ہیں۔ ان کا جوش و خروش تو یہ تھا کہ وہ جان نثاری اور سرفروشی دکھائیں۔ اور اللہ کے دین کی راہ میں گردنیں کٹوا کر سرخرو ہو جائیں۔ اُن الفاظِ مبارکہ کی عملی میں جو سورۂ احزاب میں وارد ہو چکے تھے کہ :

اِس آیت مبارکہ کی ترجمانی ہو گی ان الفاظ میں کہ :

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ (۲۳)

" اہل ایمان میں کتنے جواں مرد ہیں کہ جنہوں نے جو عہد اپنے پروردگار سے کیا تھا اُسے پورا کر دکھایا پس ان میں وہ بھی ہیں جو اپنی گردنیں کٹوا چلے اور اپنا ہدیۂ جاں پیش کر چکے اپنی نذر اللہ کے حضور میں گزار چکے اور

ان میں کتنے ہیں جو منتظر ہیں کہ کب ہماری باری آئے اور ہم بھی ہم جانیں دے کر سرخرو ہو جائیں اور نہیں بدلا انہوں نے اپنے عہد کا ایک ذرہ بھی"

تو اُس وقت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ اجمعین کی یہ کیفیت تھی۔ معلوم ہُوا کہ اس وقت حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے جو جذباتی کیفیت صادر ہوئی۔ وہ صرف ان دونوں کی نہیں تھی بلکہ تمام مسلمانوں کی تھی۔ سب ہی دل شکستہ تھے۔ ہم تصور نہیں کر سکتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حکم دے رہے ہیں کہ "اٹھو، قربانیاں دے کر احرام کھول دو"۔ اور کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھ رہا۔ دوسری مرتبہ حکم دیا کہ "اٹھو، یہیں قربانیاں کرو اور احرام کھول دو" — پھر بھی کوئی نہیں اُٹھا۔ صحابہ رضؓ کے ذہن میں تو یہ تھا کہ ہم مکے جائیں گے کعبہ کا طواف اور سعی کریں گے اور پھر قربان گاہ پر قربانیاں کریں گے۔ جو جانور ساتھ ہیں وہ تو ہدی ہے کعبہ کی۔ اب یہاں پر ہم قربانیاں کیسے کر دیں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری مرتبہ پھر فرمایا "اٹھو، قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو"۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کسی اور موقع پر اس کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہُوا!! یہ اس لیے ہُوا کہ صحابہ کرام رضؓ کی جذباتی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اس صورتِ حال کے لیے ذہناً تیار نہیں تھے وہ اپنی جانیں دینے اور گردنیں کٹوانے کے لیے تو تیار تھے لیکن جن شرائط پر صلح ہُوئی تھی، اُسے ان کے اعصاب اور مزاج قبول نہیں کر رہے تھے اور ان کے اعصاب گو یا شل ہو کر رہ گئے۔

اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہ رضؓ کا مُدبّرانہ مشورہ

الحمدللہ ہمارے محدثین عظام رحؒ نے ہمارے لیے تمام واقعات کی تفاصیل محفوظ کر دی ہیں چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ملول ہو کر اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ حضورؐ کا یہ معمول تھا کہ سفر میں ایک زوجہ محترمہ کو ساتھ رکھتے تھے۔ سفر کے موقع پر قرعہ پڑا کرتا تھا کہ اِس مرتبہ کون ساتھ جائے گا۔ تو حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا اِس

سفر میں حضورؐ کے ساتھ تھیں۔ حضورؐ خیمہ میں تشریف لے گئے اور حضرت اُمِّ سلمہ رضؓ سے ذکر کیا ۔۔۔ اور ظاہر بات ہے کہ صدمہ کے انداز سے ذکر کیا کہ میں نے تین مرتبہ کہا کہ "اٹھو، قربانیاں دے دو اور احرام کھول دو، لیکن کوئی ایک شخص بھی نہیں اُٹھا" ۔۔ اِس پر انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ زبان سے کچھ نہ فرمایئے۔ آپؐ خیمہ سے باہر تشریف لے جایئے۔ قربانی دیجئے اور حلق کرا کے احرام کھول دیجئے" ۔۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس مشورہ پر عمل کیا، باہر تشریف لائے، قربانی دی، حجّام کو بلایا کہ میرے سر کے بال مونڈ دو اور بعدہٗ احرام کھول دیا۔

صحابہ کرام رضؓ کا ردِّ عمل اور اس کی تاویل

صحابہ کرام رضؓ نے جب یہ سب کچھ دیکھ لیا تو اب سب کے سب کھڑے ہو گئے جو حضرات ہدی کے جانور ساتھ لائے تھے، انہوں نے قربانیاں دیں اور تمام صحابہ کرام رضؓ نے حلق یا قصر کرایا اور احرام کھول دیئے۔

تاویل : میں اِس صورتِ حال کی تاویل یہ کیا کرتا ہوں کہ صحابہ کرام رضؓ پر ابھی تک ایک حالتِ منتظرہ طاری تھی۔ وہ اِس خیال میں تھے کہ شاید صورتِ حال بدل جائے! شاید کوئی نئی شکل پیدا ہو جائے۔ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نئی وحی آ جائے!! ۔۔ جب تک یہ صورت سامنے نہیں آئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قربانی دینے اور حلق کرانے کے بعد احرام کھول دیا تو اُس وقت سے پہلے ان کے ذہنوں میں صورتِ حال کی تبدیلی کا ایک امکان برقرار تھا کہ جس کے وہ شاید انتظار میں تھے ۔ لیکن جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دیا تو صحابہ کرام رضؓ جان گئے کہ یہی آخری فیصلہ ہے چنانچہ حالتِ منتظرہ ختم ہو گئی اور سب نے احرام کھول دیئے ۔ عمرہ کی جو نیت ۔۔ کی ہوئی تھی اُسے اگلے سال کے لیے مؤخر کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حدیبیہ سے مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی۔

(جاری ہے)

ٹینٹ اور ترپال
بنانے کا
ممتاز ادارہ
ایچ نظام دین
اینڈ سنز
مرکزی دفتر
محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

حکیم محمود احمد برکاتی

"استحکامِ پاکستان" ـــ ایک جائزہ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیر تالیف کتاب استحکام پاکستان پیشِ نظر ہے۔
استحکام پاکستان ایک توجہ طلب مسئلہ اور بہت اہم موضوع ہے، مؤلف قابل تبریک ہیں کہ انہوں نے اس اہم موضوع کی طرف توجہ فرمائی، جس کا نتیجہ یہ معلومات افزا، فکر انگیز اور قابلِ قدر کتاب ہے کتاب میں تحریک پاکستان کے تاریخی پس منظر اور مملکت پاکستان کے چالیس سالہ ماضی و حال کا جائزہ لیا ہے یہ جائزہ بھرپور اور جامع ہے، متوازن اور حقیقت پسندانہ ہے۔ پھر عدم استحکام کے اسباب کی تحقیق کی ہے اور استحکام کی تدابیر تجویز کی ہیں۔

مؤلف کا انداز فکر معروضی اور حقیقت پسندانہ ہے اور جذباتیت سے ان کا دامن پاک ہے انہوں نے اپنے نتائجِ افکار کا اظہار بڑی بیباکی کے ساتھ کیا ہے اور مختلف طبقات پر اظہارِ رائے میں مروت کا شکار نہیں ہوئے، افراد اور جماعات پر اظہار خیال میں بڑی وسعت قلب، دیانتداری اور روا داری کا ثبوت دیا ہے، خصوصاً خادم دین اشخاص اور حلقوں کے ساتھ ہمدردی اور قدر دانی کا معاملہ کیا ہے۔

آیئے، پہلے کتاب پر ایک نظر ڈالیں پہلے ایک تمہید ہے جس میں پاکستان کے اپنی عمر کے چالیس سال پورے کرلینے پر بنی اسرائیل کی تاریخ کے حوالے سے یہ امید ظاہر کی ہے کہ ملت پاکستان بھی بنی اسرائیل کی طرح اپنا چہل سالہ عہد غفلت بسر کر کے بیدار ہوگی اور منزلِ مقصود کی طرف اقدام کرے گی۔

پھر اصل کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے پہلے پانچ ابواب کا رنگ کچھ اور ہے اور دوسرے چھ ابواب کا رنگ کچھ اور ابتدا کے پانچ ابواب میں پاکستان کے عدم استحکام کے اسباب، تحریک پاکستان کی اساس، استحکام پاکستان کی اساسات، اسلام کی نوعیت اور ملت پاکستان کی اسلام سے بے تعلقی پر گفتگو کی ہے جو مؤلف کی وسعت نظر، تدبر، جرأت گفتار اور سیاسی بصیرت پر دال ہے۔

بعد کے چھ ابواب میں ہمت شکن اور یاس انگیز گفتگو کے برعکس، تصویر کا روشن رُخ دکھایا ہے کیونکہ ان ابواب کا موضوع، پاکستان کا ماضی و حال نہیں بلکہ مستقبل ہے۔ پہلے باب میں پاکستان کے غیر متوقع اور غیر مترقب قیام کا ذکر ہے۔ دوسرے میں قائد اعظم علیہ الرحمۃ کے کمالِ تدبر اور بلندیٔ کردار پر گفتگو کی ہے۔ تیسرے میں پاکستان کی بقا کی کوئی تدبیر نہ ہونے اور والیانِ پاکستان کی نااہلی و بے تدبیری کے باوجود اس کے باقی رہ جانے کا بیان ہے کہ یہ صرف نصرتِ حق کا کرشمہ ہے۔ اس کے بعد ایک باب میں اسلام کے متوقع عالمی غلبے کے حوالے سے پاکستان میں بھی اسلام کے نفاذ کی توقع ظاہر کی ہے، دوسرے باب میں الف ثانی کی تجدیدی مساعی کا تذکرہ ہے جس میں شیخ مجدد، شاہ محدث، تحریک مجاہدین، حضرت اقبال، تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے، آخری باب کا عنوان ہے فیصلہ کن دوراہا، ایک راستہ تباہی کی طرف، ایک راستہ منزلِ مراد کی طرف۔!

اب میں کتاب کے ان پہلوؤں کی طرف اشارات کروں گا جن سے میں متاثر ہوا ہوں۔

۱۔ پہلی چیز مؤلف کی وسعتِ نظر ہے، ظاہر ہے کہ یہ ایک سیاسی موضوع ہے، میں نے اب تک ڈاکٹر صاحب کی کوئی سیاسی تحریر نہیں پڑھی تھی، اس لیے یہ کتاب پڑھ کر اس پہلو سے دلی مسرت ہوئی کہ الحمدللہ ہماری دینی تحریکات میں ایسے حضرات بھی ہیں جو سیاسی موضوعات کے ماله و ماعلیہ سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ورنہ ہمارے بعض اکابرین کے نزدیک تو سیاست شاید محرمات میں سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے موضوع سے متعلق اکثر قابلِ ذکر تحریروں کا مطالعہ کر کے بڑے سلیقے سے مواد جمع کیا ہے اور یوں مسلح ہو کر قلم ہاتھ میں لیا ہے۔ کتاب پڑھ کر مؤلف کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے موضوع پر فکر و مطالعہ کا حق ادا نہیں کیا۔ ان کا استحضار بھی قابلِ رشک ہے، کتاب میں متعدد مقامات پر مجھے ایسے واقعات نظر آئے جو علم میں تھے لیکن مستحضر نہیں رہے تھے، ڈاکٹر صاحب نے انہیں یاد رکھا اور برمحل صرف کیا ہے

۲۔ مؤلف کی جرأتِ اظہار بھی قابلِ ذکر ہے، ایک مقام پر انہوں نے پاکستان کے محرکات کی تشخیص کرنی چاہی ہے اور طویل گفتگو کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ پاکستان کا محرک مذہبی جذبہ نہیں قومی جذبہ تھا اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ

تحریکِ پاکستان کی اصل قیادت علی ہرگز مذہبی لوگوں پر مشتمل نہیں تھی .....

پھر لکھتے ہیں۔

تحریک پاکستان کی اصل قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی وہ نہ صرف
اس وقت عوامی سطح پر مروجہ تصورات کے مطابق مذہبی لوگ نہ تھے بلکہ ان کی
اکثریت جدید دور کی مروجہ اصطلاح کے مطابق PRACTICING MUSLIMS؛
پر مشتمل نہ تھی ص۱۸

اسی سلسلہ کلام میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

ایسے وہ علماء و مشائخ جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تو خواہ وہ اپنے
اپنے مقام کی بھی مرتبے اور حیثیت کے مالک رہے ہوں واقعہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان
کی قیادت کے ضمن میں ان کا مقام اولین صف میں نہیں بلکہ ثانوی درجے میں تھا اور
ان کی اصل حیثیت قائدین کی نہیں بلکہ معاونین کی تھی ص۹۱

کتاب کے پانچویں باب میں پاکستانی مسلمانوں کے اسلام سے تعلق کا تجزیہ کیا ہے اور صاف
کہہ دیا ہے کہ۔

ہماری عظیم اکثریت کا مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے ص۱۴
پھر ہمارے معاشرے کے ایک طبقے کے متعلق جو دنیا سے دلچسپی رکھنے والا طبقہ شمار ہوتا
ہے یہ بے محابا اظہار حق کرتے ہیں۔

اس طبقے کی ایک عظیم اکثریت کا تصور دین نہ صرف یہ کہ نہایت محدود ہے بلکہ
اکثر و بیشتر حالتوں میں سخت مسخ شدہ ہے چنانچہ ان کے نزدیک مذہب صرف
علامات و رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور اس کا کوئی تعلق نہ ان کی انفرادی
سیرت و کردار سے رہ گیا ہے نہ قومی و ملی اور اجتماعی معاملات سے نتیجۃً وہ دین
جو اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے پوری انسانی زندگی پر حکمرانی چاہتا ہے ان
کی عملی زندگی کے بہت ہی چھوٹے سے گوشے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس
کے وسیع تر تقاضوں کا انہیں سرے سے کوئی احساس نہیں رہا۔" ص۲۴

دوسرے پیرے میں اپنی ڈاکٹر مزید تلخ ہو کر فرماتے ہیں۔

"اس طبقے کی غالب اکثریت کا یہ حال ہے کہ دینداری کے جملہ مظاہر یعنی نماز
روزہ اور حج حتیٰ کہ پوری شرعی وضع قطع کے ساتھ بلیک مارکیٹ بھی چلتی ہے اور
ذخیرہ اندوزی بھی۔ اسمگلنگ بھی جاری رہتی ہے اور کرنسی کا غیر قانونی لین دین

بھی، اشیاء خورد و نوش ہی نہیں ادویات تک ان کے ہاتھوں ملاوٹ ایسی
حد درجہ مکروہ حرکت سے محفوظ نہیں رہیں انکم ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی کی چوری کو
مباح کا مقام دینے میں رہیں فدا باک نہیں، رشوت دی بھی جاتی ہے سادرلی بھی،
سودی رقوم سے کاروبار وسیع تر کرنا اور مکان تعمیر کرنا تو شیر مادر ہے ہی جہاں موقع
ملے سٹے سے بھی اجتناب نہیں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ الا ماشاء اللہ اس حلقے کی اکثریت
ذاتی اخلاق اور بین الانسانی معاملات کے دائرے میں بالعموم بہت پست کردار
کا مظاہرہ کرتی ہے"۔ صہ۴۴

عوام کے طبقات کے بعد جب دینی جماعتوں کی بات آتی ہے تو اگرچہ مؤلف نے تبلیغی جماعت
اور جماعت اسلامی کے ساتھ لطف و مروت کا معاملہ کیا ہے، جماعت اسلامی سے میری مراد مولانا
مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی مرحوم و مغفور جماعت اسلامی نہیں میاں طفیل محمد کی جماعت اسلامی ہے
اور تبلیغی جماعت کے نہی عن المنکر سے اجتناب کرنا بیان نہیں کیا۔ بہر حال مؤلف نے ملک کی جمعیتوں
کے سلسلے میں بڑی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ لکھا ہے۔

"مذہب کی نام لیوا بلکہ علم بردار جماعتوں اور جمعیتوں کے بارے میں سب سے
نمایاں المیہ ان کا باہمی اختلاف بلکہ مخالفت ہے جو حد درجہ مکروہ الزام تراشی بلکہ
دشنام طرازی کی حد تک پہنچ جاتی ہے . . .
جس مایوس کن شکست کا سامنا مذہب کے نام لیواؤں کو ملک کے عام انتخابات میں
کرنا پڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں بہت حد تک دخل اس باہمی تفرقہ بازی اور
سر پھٹول کو حاصل ہے"۔ صہ۴۹

معشر علماء کے لیے ایک مقام پر اس سے بھی زیادہ دلخراش الفاظ میں لکھا ہے۔
"علماء دین کے حلقے میں ایک کثیر تعداد ان علماء سو کی ہے جن کی روش سے ہویدا
حب دنیا، حب مال، حب جاہ ان کے یہاں کی ناگفتہ بہ حالت کی غمازی کر رہی ہے
مزید براں ان کی پیدا کردہ فرقہ واریت کی جو ل تا کی روز بروز بڑھ رہی ہے اور قومی
سطح پر تشتت و انتشار میں ایک مزید اور حد درجہ تشویش ناک سمت کا اضافہ کر رہی ہے"۔ صہ۳۰

۴۔ مؤلف نے ایک سلسلہ کلام میں بھٹو صاحب کے ایک قابل تحسین بلکہ نہایت جرات مندانہ
اور تاریخی اقدام کا تحسین و سپاس کے انداز میں ذکر کرکے اپنی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔

بھٹو صاحب کے عہد اقتدار و تسلط میں قادیانیوں کے کفر و ارتداد کا جو فیصلہ ہوا تھا واقعہ یہ ہے کہ
اس کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے، جو کام خواجہ ناظم الدین جیسے نیک مرد کے زمانے میں انجام نہ دیا
جاسکا وہ قدرت نے بھٹو صاحب جیسے جری و قوی انسان کے لیے مختص کر دیا تھا، بھٹو صاحب اپنے
کام اور ظالمانہ عہد حکومت کی بنا پر اہل پاکستان کے لیے ناپسندیدہ شخصیت ہیں اور ان کا نام آتے
ہی ذائقے میں تلخی گھل جاتی ہے مگر ہر شخص میں معائب کے ساتھ محاسن بھی ہوتے ہیں اور ہماری
کسی ناپسندیدہ شخصیت سے بھی کوئی قابل تعریف کام بھی سرزد ہو سکتا ہے، اس کام کی تحسین بجائے
خود قابل تحسین ہے۔

اب میں بعض ایسے پہلوؤں کی طرف ڈاکٹر صاحب کی توجہ دلاؤں گا جو مجھے کھٹکے۔

اس کتاب میں سب سے زیادہ جو چیز کھٹکتی ہے وہ ہے طول کلام، جس سے مراد ہے موضوع سے
غیر متعلق تفاصیل چاہے وہ کتنی ہی دلچسپ، معلومات افزا، اور کسی دوسرے مقصد کے لیے مفید کیوں
نہ ہوں لیکن موجودہ موضوع سے غیر متعلق ہوں تو ان کے ذکر سے قاری کا عطف توجہ ہو جاتا ہے
قرآنی طرز بیان یہی ہے کہ کسی واقعے کے صرف وہ پہلو بیان کیے جائیں جو مقصد سے متعلق ہوں اور
مقصد سے غیر متعلق تفاصیل و جزئیات نظر انداز کر دی جائیں میں صرف نشان دہی بھی کر دینا چاہتا ہوں

باب سوم کے ایک مقام پر مولانا شبلی کے رشتوں کا ذکر ص ۴۰،

باب چہارم کا وہ مقام جہاں صفدر میر کا نام آیا ہے۔ ص ۱۴۰

تمہید کا وہ مقام جہاں پروفیسر مرزا محمد منور کا ذکر ہے ص ۳۴

تمہید کا وہ حصہ جہاں سلیم چشتی مرحوم کی ایک روایت نقل کی گئی ہے ص ۱۸

تمہید کا وہ حاشیہ جہاں بھٹو صاحب کے آبائی وطن کی تحقیق کی گئی ہے ص ۲۹

تمہید کے وہ دو صفحے جن میں ایک آیۂ مبارکہ سے استفادہ کا ماخذ درج ہے ص ۱۴۲، ۴۳

ذاتی وضاحت کے لیے سوا دو سو صفحات کی اس کتاب میں ۱۲ صفحات کا صرف بے جا ہے۔

۲۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کو پاکستان کے پہلے اور آخری شیخ الاسلام لکھا ہے ص ۵۹ مولانا عثمانی
بزرگ علماء میں سے تھے۔ تحریک پاکستان کے حامیوں میں سے تھے۔ دستور ساز پاکستان کے رکن تھے مگر
شیخ الاسلام؟ نہیں کس نے بنایا تھا، کب بنایا تھا؟

۳۔ مولانا حسین احمد مدنی کے نظریۂ قومیت متحدہ پر علامہ اقبال نے جو تنقید کی تھی اسے ڈاکٹر
صاحب نہایت سخت اور تند و تیز تنقید لکھا ہے (ص ۱۲۹) اور یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا نے یہ حکایت
تھی، اس نظریہ کی وکالت نہیں کی تھی، یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ علامہ اقبال کے اشعار کے ساتھ

ایک وضاحتی حاشیہ بھی شائع کیا جانا چاہیئے۔ مگر مولانا مرحوم نے علامہ کے وصال کے فوراً بعد متحدہ قومیت کے نام جو تحریر شائع کی، نیز مولانا کے مجموعہ مکاتیب اور خود نوشت "نقش حیات" کے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا متحدہ قومیت کے قائل تھے۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مقام پر پاکستان قومی اتحاد کے ذکر میں اس دور کی ایک اصطلاح نظامِ مصطفیٰ کا بھی ذکر کیا ہے، ڈاکٹر صاحب اس مقام سے یہ ترکیب استعمال کیے بغیر گزر سکتے تھے اور یہ استعمال کی ہی تھی تو حاشیے میں ہی بھی اس پر تنکیر کرنی چاہیئے تھی۔ نظام اسلام کے لیے تاریخ میں پہلی بار نظامِ مصطفیٰ کی اصطلاح وضع کی گئی ہے اور اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

۴۔ قیام پاکستان کے موقع پر قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے جو خلاف توقع بیان دیا تھا کہ

"عن قریب پاکستان میں مسلمان، مسلمان رہیں گے نہ ہندو، ہندو، مذہبی اعتبار سے نہیں بلکہ اس لیے کہ مذہب تو اشخاص کا انفرادی معاملہ ہے بلکہ سیاسی مفہوم کے لحاظ سے۔"

قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی جو تاویل ڈاکٹر صاحب نے کی ہے اس کی نسبت ڈاکٹر صاحب کی طرف کرنے میں مجھے تامل و توقف ہے، ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد مسلمان یہاں اکثریت میں ہوں گے اور وہ نظام اسلام نافذ کرنا چاہیں گے تو۔

"خالص سیکولر جمہوری نظام بھی ان کے راستے میں ہرگز رکاوٹ نہیں بن سکتا لہٰذا فوری طور پر دستوری و قانونی سطح پر مذہبیت کا راگ الاپنے اور پوری دنیا کو خبردار اور چوکنا کر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک جمہوری نظام میں قانون سازی کا سارا دار و مدار کثرت رائے پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر بالفرض پاکستان میں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو دین و مذہب کی جانب پیش قدمی سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔" صریحاً

میں قائد اعظم کے اس قول اور ڈاکٹر صاحب کی اس تاویل دونوں پر اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس قسم کی عقیدت مندانہ تاویلات کے بجائے ہم کسی دن ہمت کر کے یہ فیصلہ کیوں نہ کرلیں کہ اپنے اکابر و اعاظم کی غلط باتوں کو غلط ہی مانیں اور جانیں گے۔

ڈاکٹر عبد الخالق

کتاب "استحکامِ پاکستان" پر چند خیالات

(یہ مقالہ سالانہ محاضراتِ قرآنی منعقدہ مارچ ۸۶ء کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا)

میرا ارادہ تھا کہ کتاب چھپ جائے تو اسے دل جمعی سے پڑھوں، سمجھوں اور پھر اس پر رائے زنی کروں لیکن برادرِ مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تبصرے کا حکم دے دیا بڑی ہی معروف مسافرت کی حالت میں کتاب کا مسودہ مجھے ملا۔ میں نے اس کا ایک ایک فقرہ پڑھا اشارات لکھے مضامین ترتیب دیئے اور اپنے زعم میں مطمئن ہو کر نماز جمعہ کے لئے چلا گیا۔ وہاں ڈاکٹر صاحب کی تقریر سنی تو خیال آیا بیشتر اقتباسات کی اب ضرورت نہیں۔ پھر جب مقررین کے ناموں کا اعلان کیا گیا تو پانچویں سوار کو اپنی بے بضاعتی کا شدت سے احساس ہوا ایاز قدر خویش بشناس۔ اس احساس نے مقالے کی کانٹ چھانٹ کو لازم کر دیا۔ وقت دیکھا تو معلوم ہوا نئے سرے سے قلم برداشتہ لکھنا بہتر ہے۔ منطقیانہ تجزیے کے لئے مولانا عبدالقدوس ہاشمی اور مولانا محمد متین ہاشمی کافی ہیں۔ میں نے منطق نہیں پڑھی۔ اور میڈیکل کالج میں صغریٰ کبریٰ جوڑنے کی جو مشق کرائی جاتی ہے وہ کچھ کام دیتی تو میں اور ڈاکٹر صاحب ایک ہی درسگاہ کے طالب علم ہیں اساتذہ بھی ایک تھے اور اسباق بھی ایک۔

با مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
اُو بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

ہمارا عشق مجازی ہی رہا۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک جست نے انہیں عشق حقیقی تک پہنچا دیا۔ جست لگانا ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان معنوں میں انتہا پسند

ضرور ہیں کہ اپنے معاملے میں اعلیٰ سطح سے کم کے لئے کوشاں ہی نہیں ہوتے
ہی کے ہو رہتے تو بھی چوٹی سے نیچے دم نہ لیتے۔

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

ان کے دوست انہیں راہِ حق میں اپنی جان گھلاتے اور کھپاتے دیکھتے ہیں تو کڑھتے ہیں
دُعا کے علاوہ کچھ کر نہیں پاتے۔ منت سماجت کی، سمجھایا، دلائل دیئے ان کے جسم کا
دلایا لیکن مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی پہلے موم بتی کا دوسرا سرا سلگا یا پھر درمیا
بھی آگ لگا اب تو تن ہمہ سوختہ شد کے قریب پہنچنے کی کوشش میں ہیں۔ ان
کان صرف ایک ہی آواز کو سنتے ہیں۔ جاھدوا فی اللہ حق جھادہٖ۔
جب حق کی بات آتی ہے تو حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کا عُذر موجود ہے۔ ہزار
ابھی معیار جنوں ناپختہ ہے تنظیم مے خانہ کے لئے بے پناہ توانائیاں درکار ہیں!
نامعتبر ہے بڑے مستوں کا چلن ساقی مان کر نہیں دیتے۔

ہم نے بھی اللہ میاں کی عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا ہے۔ کہتے ہیں فوجدا
میں پہل مفید ہوتی ہے۔ تاکہ کل جب ہم ان کے مجرم بن کر پکڑے جائیں اور یہ فریا
کریں کہ اے مالک۔ یہ ہیں میری دوستی کا دم بھرنے والے۔ میری تقریروں
سر دھنتے تھے۔ میری تعریفیں کرتے تھکتے نہیں تھے پر جب میں نے ان سے کہا

مزا تو جب تھا کہ ساحل پہ بیٹھنے والے
بھنور میں گھر کے بھی تھوڑی سی ہاؤ ہُو کرتے

تو جواب ملا ہم نے تو متاعِ غرور کا سودا کیا ہے۔ اذھب انت و ربک
فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون۔ تو ہمارے لئے بھی ان کا دامن پکڑنے کی گنجائش ہے
لیکن مجھے خدشہ ہے اُس دن بھی وہ یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے۔ دامن از کجا آرم
من دامن ندارم۔ صحتِ تن کی خبر خود لیتے رہتے ہیں صحتِ داماں کی خبر گیری
دوسروں کے ذمّہ ہے۔

میرے ایک ایڈووکیٹ دوست نے کہا ڈاکٹر صاحب سے عرض کر دو وہ
بار بار سوتے ہوئے کتے کی دُم پر پاؤں کیوں رکھ دیتے ہیں۔ کبھی کرکٹ پر ہنگا

کھڑا کر لیا، کبھی پردے پر کبھی مزارعت پر، کبھی بیعتِ جہاد پر - ان کے الہدیٰ
کے لئے ملحد، خدا پرست، عالم، بے علم، شیعہ، سُنّی اہلِ حدیث، مستورات، کشوفات
سارے ہی چشم براہ رہے تھے وہ عصرِ حاضر کے اعلیٰ ذہنی معیار سے اسلام کی آفاقیت
کی گواہی دلوا رہے تھے ان کی آواز دلوں میں اترتی اور دماغوں کو مسخر کرتی تھی۔
آخر مصلحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے ۔

میں نے بھی ان سے ایک دفعہ مصلحت کا تذکرہ کیا تھا ڈاکٹر صاحب مجلسِ
شوریٰ چھوڑنا چاہتے تھے خوب سوچ بچار کیا دوستوں سے رائے لی فیصلے کے دن
ہم دونوں ان کے دفتر میں بیٹھے تھے میں نے حمزہ صاحب کا مشورہ پیش کیا ایک
دو اور ساتھیوں کا پیغام پہنچایا کہ ہر سیشن میں حاضری ضروری نہیں کبھی کبھار
ایک آدھ دن کے لئے آجایا کیجئے رائے دیجئے اور چلے جایئے - ڈاکٹر صاحب نے
جواب دیا کہ کے گارڈ (KIERKEGAARD) نے انسانوں کی دو قسمیں
گنوائی ہیں ایک جمالیاتی (AESTHETIC) دوسرے اخلاقی
جمالیاتی آدمی بعض اوقات ضمیر کو دبا کر بھی اچھے مقصد کے حصول کے لئے کوئی
غلط کام کر گذرتا ہے اُسکی شخصیت باقی رہتی ہے لیکن اخلاقی (MORAL) آدمی
اگر ضمیر کے فیصلے کے خلاف کوئی قدم اٹھائے تو اس کی شخصیت بالکل ٹوٹ پھوٹ
جاتی ہے -میں نے بلا تامل کہا "آپ فوراً استعفیٰ ہو جایئے ۔" ع

عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی!

کتاب سے پہلے صاحبِ کتاب کا تذکرہ ذرا طولانی ہو گیا لیکن اس کتاب کو
مصنف کی شخصیت سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں -جو اصحاب انہیں حکمتِ عملی
کی منلق سے قائل کرنا چاہیں وہ ذرا سوچ لیں ۔

مجھے ڈاکٹر صاحب سے اتفاق بھی ہے اور کچھ اختلاف بھی - وہ فرماتے ہیں:

"حالات و واقعات کے اس "صغریٰ" کو قوموں کے عروج وزوال
کے ضمن میں قدرت کے اٹل اُصولوں اور اسباب و علل اور عواقب
و نتائج کے باہمی لزوم کے کبریٰ کے ساتھ جوڑ کر قیاس کیا جائے تو
حاصل مایوسی اور نا اُمید کے کچھ نہیں بنتا اور حساب کتاب کے کسی

بھی قاعدے سے اُمید کی کرن نظر نہیں آتی ٭٭

اور یہ کہ

ہمارے تجزیہ کے مطابق ایک جانب پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کی واحد اساس اسلام ہے اور اس کے بقاء و استحکام کا واحد ذریعہ ایک ایسا زور اور متحرک مذہبی جذبہ بن سکتا ہے جس کی جڑیں عوامی سطح پر اسلام کے ساتھ واقعی اور عملی تعلق میں گہری اتری ہوئی ہوں اور دوسری جانب بحیثیتِ مجموعی پاکستان کے موجودہ مسلم معاشرے کا دین و مذہب کے ساتھ حقیقی و عملی تعلق نہ ہونے کے برابر ہے! ۔ تو میرے دل سے آواز نکلتی ہے ۔ تری آواز مکے اور مدینے ٭٭

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

کتنی معروضی حقیقت (OBJECTIVE REALITY) ہے ۔ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مگر اس کے فوراً بعد جب وہ قومی و ملی وجود کی تصویر کا دوسرا رُخ یہ کہہ کر دکھاتے ہیں کہ

"ہمارے قومی و ملی وجود کی تصویر کا روشن اور تابناک رُخ بالکلیہ ارادہ و مشیتِ ایزدی اور تائید و نصرتِ الٰہی کا مظہر ہے جس کے نتیجے میں پاکستان کا عالمِ وجود میں ظہور بھی ایک خاص معجزہ کی حیثیت سے ہوا تھا اور اس کا اب تک قائم رہنا بھی معجزات ہی کے تسلسل کا مرہونِ منت ہے ٭٭

تو تھوڑے بہت ایمان کے ساتھ بھی یہ دعویٰ سراسر موضوعی یا (SUBJECTIVE) نظر آتا ہے ۔

میرے لئے اپنے بھائی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر سرِ عام تنقید کا پہلا تجربہ ہے لیکن چونکہ اس کا محرک سراسر خیر خواہی کا جذبہ ہے اس لئے مجھے اظہارِ خیال میں تذبذب نہیں ہوتا ۔ میں ان سے عرض پرداز ہوں ۔

ممکن ہے کہ تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں
اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا

بے یقینی، بے مقصدی اور انتشار و خلفشار کے صحرا سے عقابی روح، بے داغ شباب
اور ضربِ کاری والی نسلیں نہیں ابھریں۔

ان ھولاءِ یحبون العاجلۃ و یذرون وراءھم یوماً ثقیلاً
والی اُمت نمودار ہوتی ہے۔ کل کی فکر سے بے نیاز، آنے کی تن آسانی، عیاشی اور
اوباشی کے گرویدہ الا ماشاءاللہ۔ ہم صحرانوردوں کے حوالے نہیں کئے گئے بلکہ اللہ کے
رسول کے بقول مال و دولت کے فتنے میں ڈالے گئے ہیں اور اس آزمائش میں ہم
نے کفرانِ نعمت کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں بدترین عذاب کی زد میں ہیں۔ ہماری
بصارت ہے بصیرت غائب۔ دل اندھے ہو گئے۔ سماعت ہے لیکن دل کے کان نہیں
جو زمانے کی اس پکار کو سنے۔ ع

میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ہم نے عذاب کے پہلے کوڑے کو بھی کبڑے کی پشت پر لات سمجھ لیا ہے۔ ملک
میں کتنے ہیں جو پاکستان مشرقی میں اپنی ذلت آمیز شکست پر خون کے آنسو رو رہے
ہیں اکثریت کا رویہ بے نیازی کا ہے چلو اچھا ہوا جان چھوٹی بوجھ اُترا۔

میرے بھائی مجھے تو اپنی ملت کے معاملے میں سنتِ الٰہی کی حکمتِ
انقلاب کا آغاز دکھائی دیتا ہے۔ ع

ترسم آں روزے کہ محرومش کنند

آپ کہہ سکتے ہیں۔

فرق است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ باب و من فتح باب می شنوم

خدا کرے میری نگاہیں دھوکا کھا رہی ہوں۔

میں اسلامی انقلاب کو دل و دماغ کی گہرائیوں سے اپنے تمام مسائل کا
حل سمجھتا ہوں اپنے ہی نہیں بنی نوعِ انسان کے مسائل کا۔ لیکن اس کے مادی
ظہور کے لئے جس ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے وہ بھی ابھی غیر موثر ہے۔
اس کے طالب بے شمار لیکن جو یا خال خال۔ کروڑوں کی آبادی میں وہ کسی
شمار و قطار میں نہیں۔ آرزو پیدا ہوتی لیکن ابھی تک خام ہے۔ ابھی کیفیت

یہ ہے۔ ؎

کوئی دیکھے تو یہ راہِ طلب میں آرزو میری
کہ میں بیٹھا رہوں منزل کرے خود جستجو میری

رہ گئے عوام تو وہ عملاً ابھی تک کالانعام ہیں۔ لادو بیل کی طرح۔ نوکر شاہی جاگیردار، سرمایہ دار، زمیندار، صنعتکار اور ملک کے چوکیدار باری باری بھی ایکا کرکے بھی ان پر سواری کرتے ہیں۔ وہ سر نیہوڑائے چلتے رہتے ہیں کبھی کبھار کوئی ان کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ ان کی حالت زار پر آنسو بہاتا ہے، فریاد کرتا ہے تو یہ اپنی پشت اُس کی سواری کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ وہ دگنا بوجھ لادتا ہے۔ ڈنڈے برساتا ہے کچوکے دیتا ہے لیکن وہ اُس کے آنسوے دیکھتے ہیں اُس کے وعدوں پر فریفتہ رہتے ہیں۔ وہ تیر کھا کر بھی اُسے شکاری ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ سوشلزم کے نقیب آئے تو میں صدقے میں واری ہم تمہارے ہیں۔ مگر تمہارا لیے اسلامی نظام کا نعرہ سنا تو پکار اٹھے اور جو باقی ہے وہ نام خدا لے جائیے ؎

ہم سے سادہ لوح لوگوں پہ ذوقِ اسیری ختم ہوا
ہم نہ رہے تو کس کی خاطر جال سنہرے بُنّے گا

دیارِ چنیں شہر یارے چنیں

جو عوام کے سروں پر مسلط ہو گیا وہ انہیں باشعور ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے جب گر گیا تو انکی سادگی اور بے شعوری کا رونا روتا ہے۔

عوام کو حقیقی آزادی ملے تو انہیں اس نعمت کا احساس ہو۔ جب غلامی ہی مقدر ہے تو اپنوں کی کیا اور بیگانوں کی کیا، بلکہ انگریزوں کی غلامی ایک نعمت معلوم ہوتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

آزادی کا مفہوم ان لوگوں کے لئے ہے جو اس سے بہرہ مند ہیں۔ جس ملک میں ظالم کو لوٹنے اور مظلوم کو لٹنے کی آزادی ہو۔ جہاں اقتدار نے ہمیشہ استحصالی طبقوں کی پشت پناہی کی ہو وہاں آزادی کے واسطے سے تحریک اٹھانا کلئے وارد!

وفا کیسی کہاں کا عشق جو سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

اسلام ایک نجات دہندہ قوت ہے۔ ہر ظلم و ستم سے نجات، ہر استحصال سے مکمل خلاصی۔ حقیقی انسانی مساوات، طبی، تعلیمی، رہائشی اور روزگار کی سہولتیں سب کے لئے یکساں، قانون میں عدل، معاشرت میں احسان۔ ایسا اسلام کتابوں میں موجود ہے کسی زمین پر نظر نہیں آتا۔

ادھر انسانوں کی مادی ضروریات سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں نے پوری کرکے دکھائی ہیں۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ لوگوں کا ان کی طرف متوجہ ہونا فطری بات ہے۔

ایسے حالات میں اسلام کو محض نعرے کے طور پر استعمال کرنا خدا اور رسولؐ اور اسکے بندوں سے کھلے فریب کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اسلامی انقلاب کی بنیاد اسوۂ رسول پر رکھتے ہیں۔ اور اس کے ثمرات کو سیاسی، سماجی اور قانونی ہر شعبے میں فراواں رکھنے کی ضمانت دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے آئندہ مضامین سے ہو جائے گا۔

میرا خیال یہ ہے کہ اسلامی انقلاب فرد سے شروع ہوتا ہے ایسے فرد سے جس کا اللہ کی ذات پر اٹل ایمان ہو جس کی زندگی قول و فعل دونوں میں سنت رسول کے تابع نظر آئے اور جو زندگی اس طرح گذارے کہ ایک ایک لمحے اور ایک ایک شئے کا حساب دینا ہے۔ جس کے لئے آخرت دنیا سے زیادہ حقیقی ہو۔ آخرت کا یقین پیدا کرنے کے لئے مکی سورتوں کو حرزِ جاں بنانا ضروری ہے۔ صاحب کردار داعی الی الحق کو اس طرف توجہ دینا چاہیئے۔

اسلامی انقلاب ایک صبر آزما کام ہے۔ سالہا سال کی تربیت اور آزمائش سے ایک جماعت تیار ہوتی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس جماعت کی تیاری میں اپنی زندگیاں کھپا دیں۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ وطنِ عزیز کے حالات ایک بار فوری طور پر تحریک پاکستان جیسی عظیم الشان عوامی یعنی جس میں کام کے مسلمانوں کے علاوہ نام کے مسلمان بھی شامل جدوجہد کا تقاضا کرتے ہیں۔ پاکستان باقی ہے تو ہم بھی آزاد ہیں اپنی زمین پر جو تجربہ چاہیں کریں جس نظریات کو چاہیں اپنا لیں۔ یہ

صحیح ہے کہ منظم اور مؤثر تحریک ایک قابلِ اعتماد شخصیت کی قیادت ہی اٹھا سکتی ہے اور اپنی حالت کس مپرسی کی ہے۔

زکارِ نا تمام را چہ پرسی
نمی دانی کہ ملت بے امام است

تاہم کیا عجب ہے کہ بہت سے چھوٹے کارکنوں کی مخلصانہ جدوجہد بارگاہِ الٰہی میں ہماری سفارش بن جائے اور ہمیں مطلوبہ قائد بھی مل جائے اور ہمارے یقین وثبات سے اندرونی اور بیرونی دونوں دشمنوں کی آنکھیں کھل جائیں۔

میرا بیان بھی موضوعی (SUBJECTIVE) آرزو پر ختم ہوتا ہے لیکن اور جائے امان ہے کہاں۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

خانہ بربادی سے بچاؤ کی صورت یہی تو ہے کہ اپنی کمزوری، ناتوانی کو شکستہ دلی کے ساتھ اُس کے دربار میں لے جائیں۔ اجتماعی توبہ کی اُمید اور دُعا کے ساتھ اُس کے حضور گڑگڑائیں۔

اے اللہ ہمیں والذین جاھدو فینا کا مصداق بنا۔ یا رب العالمین ہمیں لنھدینھم سبلنا کی نعمت سے سرفراز فرما۔ آمین۔

بقیۂ استحکامِ پاکستان

اسی صراطِ مستقیم پر گامزن، فتح مند اور سرخرو ہوتے دیکھیں یہ آرزو دینی فریضہ بھی ہے اور ملک وملت کے عزائم سے وفاداری بھی۔ اور یہ ہم سب کا اخلاقی فرض بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس بھاری ذمہ داری سے کماحقہ عہدہ برآ ہو کر سبکدوش ہوں۔ آمین یا رب العالمین۔

مولانا خلیق احمد
سابق ایڈیٹر "الیقین انٹرنیشنل" کراچی

"استحکامِ پاکستان": ایک ہمہ گیر مُرقع

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم۔ امّا بعد قال اللّٰہ تعالٰی فی سورۃ الصّٰفّٰت (آیت: ۶۱) اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم "لِمِثْلِ ھٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ" صدق اللّٰہ العظیم۔

ترجمہ:۔ "ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔"

جنابِ صدر! محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، معزز حاضرین!

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ تعالٰی وبرکاتہٗ!

میرے لیے یہ بات باعثِ صد عزت و مسرت ہے کہ میں شریکِ مجلس ہوں مگر ضعفِ بصارت اور ضعفِ قلب کے سبب میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنی معروضات آپ کی خدمت میں براہِ راست پیش کر سکوں۔ لہٰذا عزیزم ضمیر اختر صاحب میری نیابت کریں گے۔

موضوع کی وسعت اور وقت کی قلت کے مدِّنظر کسی خاص تمہید کے بغیر نفسِ مضمون کے متعلق اپنی گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

بفضلہ تعالٰی امتِ مسلمہ کی صلاح و فلاح اور بے راہ روی کے خلاف بر وقت انتباہ کے لیے نظامِ رشد و ہدایت قرونِ اولٰی سے جاری و ساری ہے چنانچہ ہر زمانے میں چند نفوسِ قدسی اسی اہم فریضے کی ادائیگی کے لیے سرگرمِ عمل رہے ہیں زہے نصیب کہ موجودہ زمانے میں بھی باوجود قحط الرجال کے ایسے حضرات موجود ہیں اور نہایت تندہی، اخلاص و ایثار کے ساتھ امتِ مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لیے ہمہ تن مصروفِ عمل ہیں۔ مگر ان حضرات کو فی الوقت ایک عجیب مسئلہ درپیش ہے یعنی بعض افراد قوم کو قوم دشمنی سے بلکہ بنائے وطن کو بقول شخصے "ملک کے حصے بخرے کرنے سے باز رکھنا اور پھر راہِ راست پر لانا چونکہ یہ حضرات توڑ پھوڑ اور تخریبی کاروائیوں کی پشت پناہی کا زعم رکھتے ہیں۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ۔ واقعی بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتا ہے اور جس قدر ان کے دلوں

میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے۔ (آل عمران: ۱۱۸)

اے کاش! ہمارا معاشرہ اگر اسلامی اسوروں سے مطابق صحت مند ہوتا تو ایسے منفی رجحانات نہ کبھی سر اٹھا سکتے اور نہ ہی ان کے پروان چڑھنے کا کوئی امکان ہوتا۔ ایسے ناپسندیدہ رجحانات کو ناپختہ اذہان کی پیداوار اور طفلانہ حرکت اور خام خیالی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تو ملک و ملت کے خلاف ہر تحریک اپنی موت خود مر جاتی۔ مگر صد حیف ایسا نہیں ہوا اور نوبت ایں جا رسید کہ حقائق سے انحراف، مستر ملکی اور ملی مقاصد سے اعراض اور قومی تشخص سے بھی انکار اور عار کا علی الا علان پرچار کیا جا رہا ہے۔ افسوس صد افسوس!

چنانچہ آج کل مخلص اور محب ملک و ملت حضرات انہیں مسائل سے دوچار ہیں بالفاظ دیگر ملک کی سالمیت اور ملت کے شیرازے کی حفاظت وحصار یا مختصراً استحکام پاکستان کے لیے رائے عامہ کو ہموار اور استوار کرنے کے لیے شب و روز پورے انہماک کے ساتھ مصروف ہیں۔

ان مردان حق میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہستی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ہے آپ نے اپنی زندگی اصلاح نظر و فکر اور خالص اسلامی ذہن کے نشوونما کے مبارک و مثبت فریضے کی انجام دہی کے لیے وقف کر رکھی ہے ڈاکٹر صاحب ایک صاحب بصیرت محب ملک و ملت اور علامہ اقبال کے الفاظ میں "دیدہ ور" کی حیثیت سے قومی سطح پر ابھرے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے فن کلام میں ایک جداگانہ اور پسندیدہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنی متوازن و معتدل، واضح اور روشن، تعصب سے بالکل پاک جو نہایت مؤثر ثابت ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ ملک بھر میں محبوب و مقبول مقرر اور ممتاز مفکر کی حیثیت سے ہر دلعزیز ہوتے جا رہے ہیں اللّٰھم کثر امثالہ اسی طرح ڈاکٹر صاحب کا طرز نگارش بھی جداگانہ اوصاف کا حامل ہے۔ یعنی حقیقت پسندی، صاف گوئی، سلامت روی اور افراط و تفریط سے مبرا۔ بقول شخصے ڈاکٹر صاحب کے ہاں سودا کھرا اور ہر سوال کا جواب سکہ بند ہے۔ ان کے ہاں نہ کوئی ذو معانی کلام ہے نہ تحریر میں کوئی لاگ لپیٹ۔

ڈاکٹر صاحب نے حال ہی میں ایک ہمہ گیر مرقعہ "استحکام پاکستان" کے عنوان سے

ابنائے وطن اور برادرانِ قوم کی آگاہی اور عمل پذیرائی کے لئے نہایت دلسوزی، کوشش وکاوش سے مرتب کیا ہے یہ سلسلہ مضامین اردو روزنامہ جنگ کراچی کی ۱۴ (آخری قسط جمعہ ۲۸ فروری ۱۹۸۶ء) اور اردو ماہنامہ میثاق ماڈل ٹاؤن لاہور کی ۴ قسطوں (جنوری تا اپریل ۱۹۸۶ء) میں شائع ہو چکا ہے میرے نزدیک یہ سیر حاصل مقالہ اس نازک اور اہم مسئلے پر اپنی جامعیت کی بدولت قرطاسِ ابیض کا مقام رکھتا ہے اور اس سرزمین پاکستان میں اعلیٰ فہم و فراست کی روئیدگی و بالیدگی کا بیّن ثبوت ہے اور یہ بھی کہ نامور و مخلص حضرات نے بے لوث و بے لاگ، متین و سنجیدہ جائزے، تبصرے اور تذکرے کو اپنا شعار بنایا ہے۔ قوم کو بھی خود ساختہ بے سروپا لیڈروں کی تقریر و تحریر میں ایسے ہی بلند معیار کا تقاضا کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے بیانات بھی انہی کی اپنی طرح بے سروپا ہوتے ہیں۔ اور ان کو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے، آوازے کسنے اور دلخراش نعرے لگانے سے مضبوطی سے منع کرنا چاہیئے اور خود بھی ایسی ہی اعلیٰ معیار کو اختیار کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ گراں قدر سلسلۂ مضامین "استحکام پاکستان" (جو میری دلی تمنا کے مطابق ایک دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع ہو کر ہر خاص و عام کے استفادے کے لیے دستیاب ہے۔) بیک وقت شش جہت اور ہشت پہلو زاویہ نگاہ سے قرآنی احکام اور موجودہ صدی ڈیڑھ صدی کے حالات و واقعات اور اس کے "بڑے" لوگوں کے اقوال و افعال سے مستحکم و مرصع ہے اسی لیے پڑھنے والے کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے موضوع پر تاریخی، جغرافیائی، بین الملی، معاشی، سیاسی، ثقافتی، طبقاتی، لسانی اور خالص اسلامی زاویۂ نگاہ سے مسئلہ پاکستان کی ابتدائے اول سے موجودہ حالات تک کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ ایک عالمانہ تبصرہ بھی ہے اور محققانہ تذکرہ بھی، اس کے ایک ایک لفظ سے خلوص اور ملک و ملت سے تعلق ٹپکتا ہے اور پڑھنے والے کی آنکھوں سے آنسو! پاکستانی معاشرے کے چار طبقاتی ذہن کو ماہرانہ کمال سے جانچا اور پرکھا ہے اندرونی اور ناگفتنی کیفیات اور حقائق کی وضاحت سے عکاسی کی ہے گویا کہ معاشرے کے ہر فردِ بشر کے ہاتھ میں ایک آئینہ دے دیا ہے۔ جس میں وہ اپنی سیرت کے خدوخال بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ آئینہ شیشے کا نہیں، کہ...

"سامانِ خود بینی" ہو بلکہ ذریعہ حق بینی و حق شناسی ہے جو ہمیشہ تابناک اور صاف و شفاف رہے گا۔ اس آئینے میں اپنی شکل و صورت پہچاننے کے بعد ہر ذی شعور اور ذی حس پاکستانی اس بات پر آمادہ ہی نہیں بلکہ مجبور ہوگا کہ وہ کوئی نہ کوئی فیصلہ اپنی زندگی کے لائحہ عمل کے لیے کر ڈالے۔ یہ عاجز بھی ضمیر کے اسی تقاضے پر قلم اٹھانے پر مجبور ہوا ہے اگر غدا نخواستہ قوم خوابِ غفلت میں محو و مدہوش رہتی ہے تو وہ پیش آنے والے مہیب اور ہولناک نتائج کا خمیازہ بھگتنے کے لیے بھی تیار رہے۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیفِ لطیف مدتہائے مدید اور عرصۂ دراز تک زندہ جاوید اور تازہ و تابندہ رہے گی جو آنے والی نسلوں کے لیے بھی بجا طور پر قابلِ فخر ثابت ہوگی اسی لیے میں یہ کہنے پر اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ یہ ۷۶ اصفحات پر مشتمل رشحاتِ قلم ایک عظیم الشان (CLASSICAL) کارنامہ ہے اس کے پڑھنے والوں کے لیئے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب نے افرادِ قوم میں خود پسندی و خود فریبی کے طلسم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چاک کر دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے "نوشتۂ بر دیوار" (WRITING ON THE WALL) اپنی دوربین اور بصیرت افروز آنکھوں سے پڑھ لیا ہے اور اسی سے متاثر ہوکر مخلصانہ احساسات و جذبات قلم بند کیے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سچی اور پکی بات کہنے اور لکھنے کے عادی ہیں انہوں نے جو کچھ استحکام پاکستان کے عنوان سے لکھا ہے وہ قرآنی اور تاریخی دلائل کی روشنی میں لکھا ہے۔ وہ سبق آموز بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب لسانُ الغیب کی حیثیت سے قوم سے مخاطب ہیں اور میری دعا ہے کہ وہ امت مرحومہ کے لیئے خضرِ راہ بھی ثابت ہوں۔ آمین۔

ڈاکٹر صاحب نے جملہ نشیب و فراز کی نشاندہی نہایت وضاحت اور قوت کے ساتھ کی ہے۔ آپ کا اسلوب بیان، طرزِ دلائل اور موازنۂ قدیم و جدید اس قدر مربوط و مضبوط ہے کہ اُن کی ہر بات دل کو لگتی ہے اور دل میں اترتی جاتی ہے۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ اس کو کلیتہً تسلیم کر لیا جائے اور عمل کے لیئے مجوزہ طریقۂ کار کو اپنایا جائے۔

چونکہ بحمد للہ استحکام پاکستان کے متعلق مضامین ایک کتاب کی شکل میں فراہم

ہیں حق تو یہ ہے کہ ہر طبقہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ جو اپنے ملک و ملت کا ہمدرد
و بہی خواہ ہے اور وہ حضرات بھی جو فی الحال اس زمرے میں شامل نہیں اس کا بغور
مطالعہ کریں بلکہ بار بار لفظ بلفظ پڑھا کریں تاکہ وہ جذبۂ محبت و لگن جس کے ماتحت یہ
تصنیف ظہور میں آئی ہے پڑھنے والوں کے رگ و ریشہ اور فکر و نظر میں سرایت کر جائے
اور ان کا ذہن سراسر تعمیری اور اسلامی ہو جائے اور منفی سیاست غیر مفید بحث و مباحثہ
کی طرف سے یکسو ہو جائے یہ کوئی بڑا بھاری کام نہیں ہوگا بلکہ ایک فطری تقاضے کی تکمیل
کے مترادف ہوگا کیونکہ ہر مسلمان کا ایمان قرآن مجید اور سیرت پاک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر
ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ انہی مقدس ذخائر پر مبنی ہے ہم سب کو
ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہماری اہم ترین ضرورت کو کس حسن و خوبی سے اور عین وقت
پر پورا کیا ہے تاکہ حسرت و افسوس کا کوئی موقع ہی نہ آنے پائے بلکہ ہم سب فوراً
عمل پیرا ہو کر اصلاح و بہبود کی کوشش میں لگ جائیں اور ملک کو صحیح معنوں میں اسلامی
معاشرے کا گہوارہ اور دین اسلام کا مضبوط قلعہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کریں۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ گراں بار عطیہ لائق صد ستائش ہے جو بقول شخصے مفت
میں حاصل ہو گیا ہے: "اس مجوزہ مہم جوئی کے لیے ضروری ہوگا کہ کتاب زیر بحث کی
کاپیاں ملک کے گوشے گوشے میں دستیاب ہوں اور اس کے متعلق تذکرہ و تبصرہ
بھی جا بجا اور گاہ بگاہ ہوتا رہے۔

جواں نسل کا وہ طبقہ جس نے پاکستان میں آنکھیں کھولی ہیں اور پاکستان کی اصل
محرکات اور عوامل سے بڑی حد تک ناواقف و نابلد ہے اس کے لیے یہ خزانۂ معلومات
نعم غیب دستیاب ہو گیا ہے اس کے مطالعے کے بعد وہ اچھی طرح تمام متعلقہ افکار و
حوادث جو شروع صدی سے قائد اعظمؒ کی قیادت کے وقت تک قابل ذکر ہیں۔ واقف
ہو جائیں گے اور یہ حق آگاہی ان کے تعمیری ذہن کی نشوونما کے لیے نہایت مفید ثابت
ہوگی اس سلسلے میں ایک اہم بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ تصنیف "استحکام پاکستان"
کے مطالعے کے بعد ان عزیزان قوم کو قرآن مجید سے دلچسپی اور وابستگی کا ذوق و شوق پیدا
ہوگا یہی اصلی سرچشمۂ حیات اور خزینۂ ہدایت عملی قوت کو بروئے کار لانے کے لیے
[illegible]

ترجمہ :۔ یہ قرآن بتلاتا ہے وہ راہ جو سب سے سیدھی ہے اور خوشخبری سناتا ہے ایمان والوں کو جو عمل کرتے ہیں اچھے کہ ان کیلئے ہے ثواب بڑا۔ (بنی اسرائیل : ۹)

قرآن مجید سے جس قدر کمال کا تعلق ہوگا اسی قدر کمالِ ایمان ہوگا اور پھر اس کمالِ ایمان سے کمالِ عمل کی توفیق حاصل ہوگی اس کے نتیجے میں ان کا عزم و حوصلہ ہمیشہ کے لیے بلند ہوئے گا اور طبیعت مستعد و تیار رہے گی۔

استحکام پاکستان کی اہمیت مسلم ہے حق آگاہی کے طالب و متلاشی حضرات ڈاکٹر صاحب کی تصنیف سے ہر طرح کی روشنی حاصل کر سکتے ہیں یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ احسان عظیم ہے اور الہام ربانی ہے کہ موجودہ انتشار و خلفشار کے دور میں اس قسم کی ٹھوس اور مسلمہ حقیقتوں پر مبنی ایک دستاویز ہمارے ہاتھوں میں آئی ہے اگر خدانخواستہ اس سے قطع نظر کیا گیا یا پڑھ کر بھلا دیا گیا تو یہ ایک بہت بڑی ناقدری اور فرض ناشناسی ہوگی جس کے نتائج کے تصور سے بھی دل لرزتا ہے کیونکہ میرا ذہن سورۃ سبا کی آیات ۱۵ تا ۲۱ کی طرف منتقل ہوتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے ایک قوم و قریہ کا عبرت انگیز قصہ بیان فرمایا ہے جن کے مجموعی حالات میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں یعنی رہنے کو عمدہ شہر اور رب کا دیا ہوا سب کچھ تھا یہ لوگ عیش و عشرت کی زندگی دو رویہ باغوں کی بستی میں خدائے غفور و رحیم کے سایۂ رحمت میں بسر کر رہے ہیں۔ ان کی سرتابی، ناسپاسی اور نافرمانیوں کے سبب ان بستیوں کو قہر خداوندی نے اجاڑ دیا تھا اور سورۃ اعراف کی آیت نمبر ۱۰ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"بے شک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کو جگہ دی اور تمہارے لیے اس میں سامان زندگانی پیدا کیا۔ تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ایسا معاملہ نہ فرمائے اور نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ کہ وہ دن آئے۔

استحکام پاکستان کا اہم اور پروگرام اس قدر ہمہ گیر ہے کہ اس کے ساتھ دیگر ملکی معاملات کی طرف متوجہ ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔ خصوصاً وہ معاملات جن کو عرف عام میں سیاست کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود اس سے بے تعلقی کا صاف صاف اظہار فرمایا ہے اور اس عاجز کا دلی تقاضا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کبھی بھی اس کی طرف قدم نہ بڑھائیں۔ موجودہ

دور کی سیاست ایک خوفناک دلدل ہے اور وادیٔ پرخار بھی۔ جس کا سراسر انحصار ڈپلومیسی پر ہے اور یہ بات سب پر واضح ہے کہ ڈپلومیسی اور دین کا کیا جوڑ! اسی ضمن میں یہ بھی عرض کرنی ہے کہ اپنے تجویز شدہ لائحہ عمل کے علاوہ کسی سوال یا بحث و مباحثہ کو درخورِ اعتناد نہ خیال فرمائیں۔ معذرت کے ساتھ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ سیاست کی طرح صحافت بھی ذریعۂ اصلاح سے زیادہ ذریعہ فساد ثابت ہو رہی ہے اور ملک میں قحط الرجال کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سال بہ سال متعدد ہونہار ہستیاں اور جماعتیں سیاست و صحافت کی بھینٹ چڑھتی رہتی ہیں۔ الامان الحفیظ۔

میری دلی دعا ہے کہ جو سعادت نظام رشد و ہدایت کی قرونِ اولیٰ سے چلی آرہی ہے وہ رب کریم اپنے حبیب کریمؐ کے طفیل ہمارے لیے مقدر فرما دے۔ اور پاکستان کے مستقبل کو مستحکم اور روشن فرمائے تاکہ اُن لاکھوں قربانیوں کی قبولیت کا ثبوت سب پر واضح ہو جائے۔ ہم سب اللہ تعالیٰ کے روبرو ان کی لافانی قربانیوں کے حق کی ادائیگی کے لیے جوابدہ ہوں گے۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس مقدس فریضے کی ادائیگی ہمارے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچے۔ آمین ثم آمین۔

ڈاکٹر صاحب نے خود بھی بڑے وثوق و یقین کے ساتھ پاکستان کے استحکام اور اس کی سربلندی اور خوشحالی سے متعلق یقین دعائی فرمائی ہے مگر اس مقصد کے حصول کے لیے جہد مسلسل اور عمل پیہم کی کڑی شرط لگائی ہے ان کا نمونہ عمل ہمارے سامنے ہے۔ یہ ہر برکت اسی میں ہے کہ ہم ہر ممکن طریقے سے یعنی دامے، قدمے، سخنے ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تصنیف "استحکام پاکستان" میں پوری وضاحت کے ساتھ راہِ عمل کو معین کر دیا ہے اب ہمارا یہ فرض ہے کہ تصدیق اور عمل کے ذریعے انہیں بھرپور تعاون کا یقین دلائیں اور عملی ثبوت پیش کریں۔

ابھی وہ حضرات موجود ہیں جن کی آنکھوں نے وہ جوش و خروش اور خلوص اور والہانہ عقیدت کے منظر اور کارنامے دیکھے ہیں اور وہ فلک شگاف نعرے کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ اپنے کانوں سے سنے ہیں ان کی یہ سب سے بڑی دعا اور سب سے محبوب آرزو ہے کہ وہ اپنی آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنے برادرانِ قوم کو
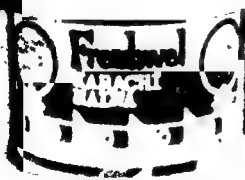
"استحکام پاکستان" پر

ریڈیو پاکستان کا تبصرہ

تحریر: اقبال احمد صدیقی

ڈاکٹر اسرار احمد پاکستان کی معروف دینی اور ممتاز علمی شخصیت ہیں۔ گذشتہ دس پندرہ برسوں کے دوران انہوں نے مختلف مقامات پر اپنے خطابات جمعہ اور مختلف اداروں میں عام تقاریر کے دوران "استحکام پاکستان" کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ بالخصوص گزشتہ برس ماہ اگست کے دوران پہلے لاہور میں تین گھنٹے کی ایک نشست اور پھر راولپنڈی میں اڑھائی اڑھائی گھنٹے کی دو نشستوں میں میر حاصل گفتگو کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ "پاکستان کی اصل اساس"، "استحکام پاکستان کی ٹھوس بنیاد" "پاکستان کا معجزانہ قیام"، "قائداعظم مرحوم کی غیر معمولی شخصیت" "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور پاکستان" کے اہم عنوانات کے تحت اُن کے خیالات مربوط شکل میں بیک وقت سامنے آئے۔ ان خیالات کی وسیع تر پیمانہ پر اشاعت کی خاطر انہوں نے حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا اور طائف کے پرسکون ماحول میں جو کچھ لکھا وہ زیرِ تبصرہ کتاب کے مقدمے اور پہلے تین ابواب پر چھا گیا۔ یہ مواد اور اس کے بعد کی تحریریں ملک کے ایک کثیر الاشاعت اخبار کی جمعہ کی اشاعت کا حصہ بنیں اور بیک وقت سارے ملک میں پھیل گئیں۔ قومی روزنامے کی چودہ اشاعتوں میں جو کچھ شائع ہوا وہ ماہنامہ "میثاق" کی چار اشاعتوں میں سمیٹ لیا گیا اور یہیں سے اس کتاب کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔

دراصل ڈاکٹر اسرار احمد مردِ میدانِ خطابت ہیں۔ جس طرح خطیب کی حیثیت سے اُن کا کلام دل کو لبھاتا ہے اسی طرح اُن کی تحریر کا اسلوب دلکش و دلنشیں اور بیان کا انداز موثر اور دلنشیں ہے البتہ کہیں کہیں تحریر میں تقریر کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد جذبات کو معقولات میں راہ پانے نہیں دیتے۔ دعوے کے ساتھ دلیل پیش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ برصغیر کی تقسیم دراصل ایک معجزہ ہے

کم نہیں اور اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت کارفرما تھی کہ وہ پاکستان سے پوری دُنیا میں اپنے دین کے غلبہ کا کام لینا چاہتا ہے۔ اب اس دعوے کی دلیل خود اُنہیں کے الفاظ میں سن لیجیے۔ مسلم لیگ کی طرف سے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں "ہندوستان کے ماضی قریب کی تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ یہ قائدِ اعظم مرحوم کی سیاسی زندگی کا نازک ترین مرحلہ اور اُن کے تدبر و تحمل اور دور اندیشی و معاملہ فہمی کا سخت ترین امتحان تھا۔ اُنہیں ایک طرف صاف نظر آ رہا تھا کہ برطانوی حکومت مختلف داخلی و خارجی عوامل کے تحت ہندوستان سے بوریا بستر سمیٹنے پر تلی ہوئی ہے اور اگر اس مرحلے پر مسلم لیگ کی جانب سے ذرا بھی ضد اور ہٹ کا مظاہرہ ہوا تو لیبر پارٹی کی گورنمنٹ ہندوستان کی حکومت یک طرفہ طور پر کانگریس کے حوالے کر دے گی اور پھر ہندوؤں کے چنگل سے رہائی پانا شاید لاکھوں نہیں کروڑوں جانوں کی قربانی ہی سے ممکن ہو سکے۔ دوسری طرف یہ بات بھی واضح تھی کہ اس منصوبہ کو تسلیم کرنے کے معنی یہ تھے کہ مسلم لیگ نے ہار مان لی اور کم از کم وقتی طور پر آزاد اور خود مختار پاکستان کے مطالبے سے دستبرداری اختیار کر لی۔

گویا قائدِ اعظم اور مسلم لیگ دونوں کو اُس وقت 'ایک جانب کنواں اور دوسری جانب کھائی' والی صورتِ حال سے سابقہ تھا۔ البتہ کیبنٹ مشن پلان میں دو باتیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق تھیں۔ ایک یہ کہ اس میں تین خطوں (ZONES) کی صورت میں پاکستان کے نقشے کی دھندلی سی تصویر موجود تھی۔ دوسرے یہ کہ دس سال کے بعد ہر خطے کے لیے مرکزی حکومت کے ساتھ اپنے تعلق پر نظرِ ثانی کرنے کی گنجائش۔ اس طرح اُس وقت نہیں تو دس سال بعد آزاد پاکستان کے قیام کا امکان کم از کم نظری طور پر موجود تھا۔ اگرچہ یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ ایک بار مرکزی حکومت کے قیام کے بعد اس کا بالفعل امکان بہت کم تھا۔ میرے نزدیک یہ قائدِ اعظم کے سیاسی تدبر (STATESMANSHIP) اور واقعیت پسندی (REALISM) کا شاہکار تھا کہ انہوں نے ۶ جون ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لیا۔"

اس موقع پر مشیتِ ایزدی اور قدرتِ خداوندی کا خصوصی ظہور اُس حدیثِ

نبوی کے مطابق کہ تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے مابین ہیں وہ اُنہیں جدھر چاہے پھیر دیتا ہے" پنڈت نہرو کے اُن بیانات کی صورت میں ہوا جو اُنہوں نے فتح کے نشے میں بدمست ہو کر دیئے جن کے نتیجے میں کانگریس کی جانب سے پلان کی منظوری کی بالفعل نفی ہو گی" (ص ۱۱۸ - ۱۱۶)

چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کو کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کو واپس لینے کا جواز ہاتھ آ گیا اور اس طرح ایک آزاد اور خود مختار پاکستان کے قیام کا مسئلہ جو اصولی طور پر کم سے کم دس سال کے لئے اور واقعتاً ہمیشہ کے لئے طاق نسیاں کی زینت بن گیا تھا از سر نو سامنے آ گیا۔ نظر بظاہر اکھنڈ بھارت کا سارا بنا بنایا کھیل پنڈت جواہر لعل نہرو صدر انڈین نیشنل کانگریس کی حماقت کی بدولت بگڑا۔ لیکن ڈاکٹر اسرار احمد اس سارے واقعہ کی تاویل اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی تصرف کا مظہر تھا اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے گویا مسلمانانِ ہند پر یہ حجت قائم فرمائی تھی کہ تم تو ایک کلیتہً آزاد و خود مختار پاکستان کے مطالبے سے دست بردار ہو گئے تھے ہم نے اپنی مشیت و قدرت کو بروئے کار لا کر تمہیں ایک کاملتہً آزاد و خود مختار پاکستان عطا فرمایا۔ تاکہ دیکھیں کہ اب تم کیا کرتے ہو۔ (ص ۱۲۰ - ۱۱۹)

ڈاکٹر اسرار احمد کا شمار بجا طور پر اُن لوگوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنی کم سنی کے باوصف آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکنوں کی حیثیت سے تحریک پاکستان کے ننھے منے کارکنوں کی فہرست میں اپنا نام بھی لکھوایا اور اُن لوگوں کی صف میں بھی شامل ہوئے جن کے سامنے قیام پاکستان کے بعد رونما ہونے والے حالات اور واقعات کی بناء پر مایوسی کی شدت کے عالم میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ پاکستان کا قیام درست اقدام تھا بھی یا نہیں؟ اس سوال کا جواب بھی خود فاضل مصنف کے الفاظ میں سن لیجئے۔

"الحمد للہ ہمیشہ صورت یہ رہی کہ جب بھی میں نے از سر نو صغریٰ کبریٰ جوڑ کر حساب لگایا نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ پاکستان کا قیام صحیح اور درست تھا"،

اس سے بڑھ کر جو بات ڈاکٹر اسرار احمد نے کہی وہ یہ ہے کہ

"پاکستان کا معجزانہ قیام - قائداعظم کی غیر معمولی قیادت اور پاکستان کی تا حال خصوصی حفاظت وصیانت کی صرف ایک توجیہہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ پاکستان اسلام کے عالمی غلبہ کی خدائی تدبیر کے سلسلہ کی اہم کڑی ہے -"

عین ممکن ہے کہ پاکستان کے قیام وبقا کی یہ توجیہہ مغربی افکار سے مرعوب و مغلوب ذہنوں کے لئے قابل قبول نہ ہو لیکن جو لوگ نظریہ پاکستان کے مبنی بر اسلام ہونے پر یقین رکھتے ہیں اُن کے لئے زیر تبصرہ کتاب کا مطالعہ ایک لمحہ فکریہ مہیا کرے گا اور جب وہ اندریں حالات مملکتِ خداداد پاکستان کے استحکام کے موضوع پر غور فرمائیں گے تو فاضل مصنف کے اس خیال سے کلیتاً اتفاق کرکے پاکرنے کیلئے کہ "پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے" انکی متوقع تالیف "پاکستان میں اسلامی انقلاب کب اور کیسے"؟ کا انتظار کرنے کو ترجیح دیں گے - تاکہ حتمی رائے قائم کرنے سے قبل اس بات کی تفصیلی وضاحت سامنے آجائے کہ اسلامی انقلاب سے ڈاکٹر صاحب کی مراد کیا ہے اور نتیجتاً جو سماجی معاشی نظام وجود میں آئے گا۔ اُس کے اہم خدوخال کیا ہوں گے -"

کتاب کی کتابت، طباعت اور کاغذ کی عمدگی مصنف کی خوش ذوقی پر دلالت کرتی ہے - کتاب کی ضخامت کے پیش نظر مجلد اور غیر مجلد دونوں کی قیمت بازار میں کتابوں کی قیمت کے مقابلے میں کچھ نہیں بہت کم ہے - اغلباً مقصد کتاب کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوگا - شاید کتاب کی عاجلانہ اشاعت اس کا سبب ہو۔ کہیں کہیں پروف ریڈنگ میں عجلت سے کام لیا گیا ہے اور چھوٹی موٹی غلطیاں رہ گئی ہیں - مثلاً صفحہ ۳۰ پر دوسرے پیراگراف میں مشہور ماہر اقبالیات اور معروف شاعر مرزا محمد منور کے متعلق ایک جملہ میں از سرتا پیر کی ترکیب خاصی کھٹکتی ہے اسی جملہ میں ایک نقطہ کی کمی سے ظاہر و باطن، طاہر و باطن بن گیا - اسی طرح صفحہ ۷۵ پر سماجی معاشی اور سیاسی نظام کے وجود میں آنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور وجود کی دال غائب ہے - اگر اس خوبصورت کتاب کو نظر بد سے بچانے کے لئے یہ اور اس قبیل کی دیگر غلطیاں دانستہ طور پر نہیں کی گئیں تو توقع کی جاسکتی ہے - کہ آئندہ ایڈیشن میں انکی اصلاح کر دی جائے گی اور پوری کتاب پر نظر ثانی کرتے وقت دقت نظر سے کام لیا جائے گا۔

رفتارِ کار

امیر تنظیم اسلامی کا دورۂ سکھر و اندرونِ سندھ

مرتب : نجیب صدیقی

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب درس و تدریس کے لئے تقریباً ربع صدی سے سکھر آتے جاتے رہے ہیں ، درمیان میں طویل وقفے بھی ہوتے ہیں ، بہرحال قرآن حکیم کے دروس کا سلسلہ جاری رہا ۔ یہ دروس عموماً مساجد میں ہوتے رہے ہیں ۔ تنظیم اسلامی قائم ہونے کے بعد بھی سکھر شہر کے لوگ قرآن حکیم کے دروس سے محروم نہیں رہے ۔ البتہ اندرون سندھ امیر محترم کا یہ پہلا دورہ تھا ۔ اس سے قبل اس بات کی شدید خواہش تھی کہ سندھ کے دور دراز علاقوں میں جایا جائے اور پیغام ربانی پہنچایا جائے ، ایک سال قبل کندھ کوٹ کا پروگرام بھی بنا مگر بعض وجوہات کی بنا پر منسوخ ہو گیا ، اندرونِ سندھ نہ جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمیں کوئی ایسا ساتھی ابھی میسر نہیں آیا تھا جس کی توسط سے وہاں انتظام کیا جا سکے ۔

الحمدللہ یہ راستہ کھلا تنظیم فکر و نظر کے صدر جناب پروفیسر اسد اللہ بھٹو صاحب نے اندرونِ سندھ کے لئے انتظامات کئے ۔ انہیں دنوں تنظیم فکر و نظر نے سکھر میں سہ روزہ شاہ عبداللطیف بھٹائی عالمی کانفرنس منعقد کی تھی جو ۲۴ - ۲۵ - ۲۶ اپریل کو تھی ۔ ابھی اسد اللہ بھٹو صاحب مہمانوں کو پوری طرح رخصت نہ کر پائے تھے کہ ہماری طے شدہ تاریخیں آن پہنچیں ۔ یعنی ۲۹ اپریل کو گھوٹکی ، ۳۰ اپریل کو کندھ کوٹ ، یکم اور ۲ مئی کو سکھر پروگرام رکھا گیا تھا ۔ ۲۷ اپریل کی صبح قیم تنظیم اسلامی میاں محمد نعیم صاحب کراچی حیدر آباد ہوتے ہوئے سکھر پہنچے ، ان کا یہ دورہ رفقائے تنظیم سے رابطہ اور ملاقات کے لئے تھا ، سکھر میں ہمارے رفقاء جلسہ کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے پھر ہمیں ۲۸ اپریل کی صبح رحیم یار خاں پہنچنا تھا اس لئے کہ امیر محترم نے اپنا دورہ رحیم یار خان سے شروع کیا تھا ، اس طرح راقم

الحروف قیم تنظیم اسلامی میاں محمد نعیم صاحب کے ساتھ ۲۸ اپریل کی صبح رحیم یارخاں پہنچا۔ اسٹیشن پر جناب غلام اکبر صاحب موجود تھے جو رحیم یارخاں میں تنظیم کے واحد رفیق ہیں۔ ہمارا قیام جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کے مکان پر ہوا۔

ڈاکٹر عبدالخالق صاحب امیر محترم سے گہری محبت رکھتے ہیں تنظیم کی دعوت اور اس فکر کو رحیم یارخاں کے پڑھے لکھے طبقے تک بہ حسن وخوبی پہنچاتے رہے ہیں، میثاق میں جب استحکام پاکستان کے مضامین چھپے تو آپ نے ان مضامین کے ۲۰۰ سیٹ خرید کر اہل علم کو پہنچائے تاکہ وہ لوگ غور وفکر کریں اور جس مقصد کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ پورا ہو۔

رحیم یارخاں

رحیم یارخاں میں پہلا اجتماع ۲۸ اپریل صبح ۱۱ بجے کے قریب ہوا۔ یہ اجتماع خواتین کا تھا گرلز کالج میں اس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ امیر محترم نے خواتین کی ذمہ داریاں اور انکی حدود کار کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ بعدازاں سوال وجواب میں خواتین نے حصہ لیا اور اپنے اشکالات پیش کئے جس کا جواب امیر محترم کی طرف سے دیا گیا۔

دوسرا اجتماع جسے خصوصی اجتماع کہا جاسکتا ہے، مجلس فکروادب خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کی طرف سے امیر محترم کی کتاب "استحکام پاکستان" پر بحث وگفتگو کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ دعوت نامے جاری کئے گئے تھے، یہ اجتماع کالج کے شیخ زید آڈیٹوریم میں شام ۵½ بجے رکھا گیا تھا۔ ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی تھی کتاب کے ہر حصے پر وہ اپنے خیالات اور رائے پیش کرسکتا ہے۔ یہ گفتگو مغرب تک چلتی رہی، ہال بھر چکا تھا باہر کرسیاں رکھی گئی تھیں، لیکن فیصلہ یہی ہوا کہ بعد نماز مغرب سامنے وسیع وعریض مسجد میں بقیہ کارروائی کی جائے۔ تاکہ جگہ کی تنگ دامانی حائل نہ ہوسکے۔ یہ علم وفکر کی نشست عشاء تک چلتی رہی۔ آخر میں امیر محترم نے استحکام پاکستان کے سلسلے میں ہونے والے سوالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ہر گوشے کو اپنی بصیرت افروز تقریر سے منور کیا۔

۲۹ اپریل کی صبح صادق آباد ہوتے ہوئے ہم اجمل باغ رحیم آباد پہنچے۔ دوپہر تک قیام رہا، سردار اجمل خاں لغاری صاحب نے اپنی زندگی کے بہترین ایام جماعت

اسلامی میں گزارے ہیں ۔ مرکزی مجلسِ شوریٰ کے ہمیشہ رکن رہے ، اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنی تمام تر توانائیاں اور جوانی کے بھرپور ایام جماعت اسلامی کے نذر کئے تو یہ بیجا نہ ہوگا ۔ تن من دھن سے ساتھ دینے والوں میں جو چند نام ہیں ان میں سردار صاحب کا نام نمایاں ہے ۔ ڈاکٹر صاحب سے بہت محبت کرتے ہیں ، اپنے قیمتی مشوروں سے نوازنے میں بخل سے کام نہیں لیتے ۔ قارئین میثاق کو یاد ہو گا کہ کچھ ماہ قبل آپ کے خطوط میثاق میں شائع ہوئے ہیں جس میں آپ نے بہت قیمتی مشوروں سے نوازا تھا ۔ ماچھی گوٹھ کے حادثہ کے بعد مایوس ہو کر جماعت سے الگ ہوئے اور اب وہ کسی نئے تجربہ کے حق میں نہیں ، مایوسی کے شدید ردعمل نے سوچ کی راہیں بھی جدا کر دی ہیں ۔ سردار صاحب سے کچھ مفید باتیں بھی ہوئیں وقت کم تھا ہمیں سہ پہر تک گھوٹکی پہنچنا تھا ۔ تشنگی باقی رہی ۔ دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ میں گھوٹکی کے لئے روانہ ہوئے اور اللہ کے فضل وکرم سے عصر سے کچھ دیر قبل گھوٹکی پہنچ گئے ۔

گھوٹکی یہاں جلسہ کا انتظام یہاں کی مقامی تنظیم فکر ونظر نے کیا تھا ۔ جناب حاجی محمد شریف قریشی صاحب نے میزبانی کے فرائض انجام دیئے ان کا لڑکا صلاح الدین خدمت میں پیش پیش رہا ، جناب اسد اللہ بھٹو صاحب صبح پہنچ چکے تھے آپ نے شہر میں اعلان کا انتظام کیا تھا ۔ خود انفرادی ملاقاتوں میں لوگوں کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی ، اشتہارات تقسیم کئے ۔ اس طرح گھوٹکی میں پہلا تعارفی جلسہ تھا ۔ یہ جلسہ نئی غلہ منڈی کی مسجد میں منعقد کیا گیا تھا مسجد کی کمیٹی نے بھرپور تعاون کیا ۔

بعد نماز عشاء امیر محترم کی تقریر ہوئی ، آپ نے فرمایا ۔ اندرون سندھ ہمارا یہ پہلا دورہ ہے ۔ یہاں آنے کے بعد ہمیں شدید احساس ہوا ہے کہ ہم نے پہنچنے میں بہت دیر کی ، اپنے بھائیوں کے جذبات سے بہت دیر میں آگاہی ہوئی ، یوں تو حالات معلوم تھے اور اس کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہیں ہوئی لیکن براہِ راست ملاقات و مشاہدہ کا آج پورا موقع تھا ۔

امیر محترم کی تقریر انتہائی جذباتی ، پرسوز ، پُر درد تھی ، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ

ایک بچھڑا ہوا بھائی ایک عرصہ کے بعد اپنے بھائی سے مل رہا ہے اور دل کا درد بیان کر رہا ہے۔ اس پُرتاثیر تقریر نے دلوں کو گرمایا بھی اور تڑپایا بھی اور اس بات کا شدید احساس دلایا کہ ہماری بقا اور نجات قدم ملا کر چلنے میں ہے۔

امیر محترم نے فرمایا، حقوق کی جنگ میں اسلام کو شامل نہ کریں، اپنا حق وصول کریں، میں آپ کا ساتھ دوں گا مگر خدارا اسلام کو درمیان میں نہ لائیں، آپ نے ایک حدیث مبارکہ بیان کی کہ سودا لینے میں اس طرح کوشش کریں کہ پسینہ آجائے، کوئی آپ سے چار آنے زائد وصول نہ کرسکے ـــــ یہ آپ کا حق ہے۔ آپ نے فرمایا ـــ اس برصغیر میں اسلام کے پہلے امین آپ ہیں، سندھ اس کا پہلا مرکز ہے یہیں سے اسلام کاٹھیاوار اور گجرات تک اور شمال میں لاہور اور اس کے اوپر کے علاقوں تک گیا ہے۔ آج بھی اس کی عزت و بقا آپ کے ہاتھ ہے۔

گھوٹکی کے رہنے والوں نے اس قسم کی تقریر آج پہلی بار سنی تھی، وہ بے حد متاثر تھے، امیر محترم جب تقریر کر کے مسجد سے نیچے اُترے تو ایک مدرسہ کے مہتمم صاحب نے گھیر لیا اور فرمانے لگے کہ آپ کو ہمارے مدرسے میں آنا ہوگا تقریر نہ سہی دعا کریں میں وعدہ لئے بغیر جانے نہ دوں گا۔ اس خلوص و محبت اور بے ساختگی پر ڈاکٹر صاحب نے وعدہ فرمالیا، نماز فجر ہم نے اُنکی مسجد میں جو اسٹیشن سے متصل ہے ادا کی، بعدہٗ امیر محترم نے سورۃ العصر کا مختصر درس دیا اور دُعا کی۔

تقریر سے متاثر ہونے والے اور قومی درد رکھنے والے افراد صبح ملاقات کے لئے پہنچے، ہمارا خیال تھا کہ صبح ۸ بجے کندھ کوٹ کے لئے روانگی ہو جائے گی مگر ایسا نہ ہو سکا اور گفتگو میں سوا دس بج گئے۔ سوا دس بجے ہم لوگ کندھ کوٹ کے لئے روانہ ہوئے

کندھ کوٹ

ہم ظہر تک پہنچ گئے، ہمارا خیر مقدم جناب ڈاکٹر غلام نبی شجراہ صاحب نے کیا، آپ سے ہم سب کی پہلی ملاقات تھی، پروفیسر اسد اللہ بھٹو صاحب تو پہلے سے واقف تھے۔ البتہ ہمارے لئے یہ نام افراد نئے تھے۔ ڈاکٹر شجراہ صاحب اور انکے احباب نے جلسہ کا انتظام اپنے ایک ساتھی کے مکان جس کا صحن کافی وسیع و عریض تھا کیا تھا، شہر میں اعلان بھی آپ ہی کیطرف سے ہوا تھا، انفرادی ملاقاتوں میں لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا یہی وجہ تھی کہ حاضری بڑی

بندہ افراد کی تھی -

امیر محترم نے جن جذبات کا اظہار گھوٹکی میں کیا تھا اسی انداز میں یہاں بھی دل
بات کہی، دل سے نکلی ہوئی بات دل میں ضرور گھر کر لیتی ہے، سامعین نے محسوس
یا کہ یہ شخص اجنبی نہیں ہمارا اپنا ہے - اس نے ہمارے دل میں آ کر بات کی ہے اسکی
اپنی بات ہے - یہ شخص ہمارا ہمدرد ہی نہیں - ہمارا بھائی بھی ہے، اس نے ہمیں
ت سے گلے لگایا ہے - تقریر کے بعد ہر شخص بڑے جوش و خروش کے ساتھ مل رہا
-

گھوٹکی میں بھی ہم نے مکتبہ لگایا تھا اور کندھ کوٹ میں بھی، مگر کندھ کوٹ میں
تبہ پر رش پڑ گیا - امیر محترم سے دلچسپی کا ایک بڑا اظہار اس طرح بھی ہوا -
بیں کا ناشتہ جناب بشیر احمد صاحب ایڈووکیٹ کی طرف سے تھا - سوالات
ابات کا سلسلہ جس طرح محفل میں تھا اس طرح دستر خوان پر بھی رہا - جب ہم
مبارکپور کے لئے روزانہ ہوئے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم لوگ ایک
سرے کو برسوں سے جانتے ہیں اور رخصت ہوتے وقت وہی کیفیت نمایاں تھی -
ت کی کمی کا شکوہ بھی تھا - تشنگی بھی باقی رہی -

بارک پور جناب اسد اللہ صاحب کا اپنا گوٹھ ہے، اطلاع تو پہلے سے تھی
ہی، لوگ منتظر تھے - جلسہ کا انتظام مسجد میں کیا گیا تھا، امیر
م نے پر جوش تقریر فرمائی - اور وہی باتیں جو گھوٹکی اور کندھ کوٹ میں کہی
بی نئے انداز سے دھرائیں - تقریر کے بعد منشور کا سندھی ترجمہ تقسیم کیا گیا، اور
ما خیر ہم سکھر کے لئے روانہ ہو گئے -

سکھر میں درس و تدریس کا سلسلہ تو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ تقریباً ربع
صدی سے جاری ہے، لیکن یہ درس عموماً مساجد، کسی کلب، سیا
نہ میں ہوتے رہے ہیں - یہ پہلا اتفاق تھا اس جلسہ کا انتظام کھلے میدان میں
یا تھا - تنظیم فکر و نظر کے وسیع پلاٹ میں جو کبھی غازی عبدالرشید پارک کے نام
وسوم تھا جلسہ کا انتظام کیا گیا تھا - ہمارے رفقاء کے لئے بھی یہ نیا تجربہ تھا،
صد کرسیاں بڑے سلیقے سے بچھائی گئی تھیں، جلسہ بعد نماز عشاء تھا، کرسیاں بھر

گئیں تو دریاں بچھائی گئیں اس طرح حاضرین کی تعداد ۸۰۰ کے قریب رہی۔
پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب نے امیر محترم کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا انقلابی پروگرام وہ واحد طریقہ ہے جس سے اسلامی نظام کا قیام ممکن ہے، سکھر والوں نے انتخاب کا بارہا تجربہ کیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اسلام کے نام پر ملنے والے ووٹوں کی تعداد کل ساڑھے تین ہزار تھی جبکہ دوسری طرف کی تعداد اس سے دس گنا زائد تھی۔ انتخابی سمت میں ہماری صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں، آج اس بات کی ضرورت ہے کہ اس انقلابی طریقہ کار کو اپنایا جائے۔

امیر محترم نے اپنی تقریر میں استحکام پاکستان اور عدم استحکام کا تفصیل سے جائزہ لیا اور فرمایا، ملک کی واحد اساس اسلام ہے، چاروناچار اسے اختیار کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری اساس موجود نہیں، نہ زبان بنیاد بن سکتی ہے۔ نہ تہذیب اور نہ تاریخی عمل موجود ہے ـــ پاکستان میں اسلام انتخابی عمل سے نہیں آئے گا۔ امیر محترم نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر بھرپور تبصرہ کیا اور اپنے تبصرے میں ان تمام باتوں کا بھی اعادہ ہو گیا جو گھوٹکی اور کندھ کوٹ میں فرما چکے تھے۔

گاڑھی موری ۲ رمئی سکھر سے ۱۱ کلومیٹر دور وزیراعلیٰ سندھ جناب غوث علی شاہ صاحب کے گاؤں میں نماز فجر ادا کی گئی، جناب ندیم انصاری صاحب نے ہمیں مدعو کیا تھا۔ آپ دینی درد رکھنے والے اس گاؤں کے ممتاز فرد ہیں۔ محکمہ تعلیم سے آپ کا تعلق ہے، اچھے شاعر اور ادیب ہیں۔

امیر محترم نے نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تین آیات کا درس دیا۔ ان آیات کی روشنی میں سندھ میں بسنے والے اپنے بھائیوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا۔ باب الاسلام کے حوالے سے ان کا بھولا ہوا سبق انہیں یاد دلایا۔

سیمنٹ فیکٹری روہڑی یہاں جمعہ کی نماز ادا کرنی تھی، ٹھیک ۱۲½ بجے ہم جامع مسجد پہنچ گئے امیر محترم نے اپنی تقریر میں ماہ صیام کے حوالے سے گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا روزہ محض بھوکا رہنے کا نام نہیں روزہ سے اگر انسان میں تقویٰ پیدا نہیں ہوتا تو اللہ کو اسکی ضرورت نہیں کہ کوئی بھوکا پیاسا رہے۔ پھر آپ نے تقویٰ کی تشریح کی، تقویٰ کا اثر اس کی روانہ آپ

اور اجتماعی زندگی میں پڑنا چاہیئے ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اظہار ہی تقویٰ کی علامت ہے ۔ معاشرے میں رائج تقویٰ کی ظاہری شکل پر آپ نے تنقید فرمائی ۔

فاران کلب سکھر

عصر تا عشاء فاران کلب کی طرف سے تقریر کی دعوت تھی، تقریر کا انتظام ایک ہائی اسکول میں کیا گیا تھا، فاران کلب کے صدر نے امیر محترم کا خیر مقدم کیا اور کلب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ۔ یہ کلب بھی کراچی فاران کلب کی ایک شاخ ہے جو دینی اجتماعات کا انعقاد کیا کرتا ہے ۔ عصر تا مغرب سوالات و جوابات کی نشست رہی، عموماً سوالات انتخابات اور انقلاب کے موضوع پر رہے ۔ فاران کلب کی طرف سے جو موضوع دیا گیا تھا وہ یہ تھا ۔ "پیغمبرِ اسلام اور ماہ صیام" مگر سوالات کے رُخ نے تقریر کے موضوع میں ترمیم پر آمادہ کیا اور امیر محترم نے "پہلے مذکورہ موضوع پر گفتگو کی پھر بقیہ وقت میں انقلاب کے مراحل مختصر اور جامع انداز میں بیان کئے ۔

اللہ تعالےٰ سے دُعا ہے کہ وہ اس سعی و جہد کو بار آور کرے اور ہم سب کے حق میں اسے توشہ آخرت بنائے ۔ آمین
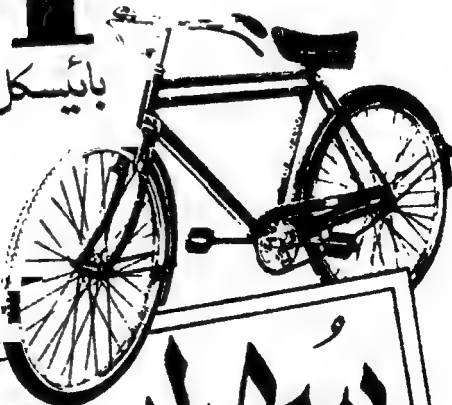
سالانہ رپورٹ

تنظیمِ اسلامی پاکستان

(یکم مارچ ۱۹۸۵ء تا ۸ر فروری ۱۹۸۶ء)

مرتب: چوہدری غلام محمد، معتمد تنظیمِ اسلامی

تنظیم اسلامی کا قیام مارچ ۱۹۷۵ء میں عمل میں آیا تھا۔ لہٰذا اب اس قافلہ کو تشکیل پائے گیارہ سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ گزشتہ سال دسواں سالانہ اجتماع ۲۳ تا ۲۸ر مارچ ۱۹۸۵ء منعقد ہوا تھا۔ اب بفضلہ تعالیٰ اس سال تنظیم اسلامی کا گیارہواں سالانہ اجتماع ۴ تا ۶ر اپریل ۸۶ء منعقد ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس رپورٹ میں پیش کئے جانے والے اعداد و شمار اور سال بھر کی کاموں کی مختصر روداد از یکم مارچ ۱۹۸۵ء تا ۲۷ فروری ۸۶ء کے عرصہ پر محیط ہوں گے۔

گزشتہ سالانہ اجتماع کے موقع پر اس مختصر سے قافلہ کی زندگی کے دس سال پورے ہونے پر ہم نے توفیق خداوندی سے اپنی دس سالہ کارگذاری پر نگاہ بازگشت ڈالنے کے علاوہ اپنے دینی فکر بالخصوص تصور فرائض دینی کے بھرپور تنقیدی جائزہ کا اہتمام کیا تھا۔ سالانہ اجتماع کے ساتھ ہی منعقد ہونے والے محاضرات قرآنی میں اہل علم و فضل نے اپنی تائیدی تنقیدی یا اختلافی آراء کا اظہار فرمایا تھا۔ جن کا پوری وسعت قلبی سے جائزہ لیا گیا۔ الحمد للہ محکم دلائل کے ساتھ کوئی اختلافی رائے ہمارے سامنے نہ آسکی اور ہمیں اس بات پر مزید اطمینان اور انشراح صدر نصیب ہوا۔ کہ ہم نے جس فکر پر تنظیم اسلامی کی تاسیس کی تھی وہ درست ہے۔ ان محاضرات پر سیر حاصل تبصرہ امیر محترم سپرد قلم کر چکے ہیں اور "میثاق" کے اپریل، جون ۸۵ء کے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مزید براں جناب امیر تنظیم اسلامی نے تمام رفقائے تنظیم کے نام جاری شدہ اپنے مکتوب مورخہ ۱۰ جون ۸۵ء میں اس بات پر اظہار تشکر و امتنان کیا تھا کہ تنظیم اسلامی کی

دعوت اور ہیئت اجتماعیہ کے لئے جو لائحہ عمل اختیار کیا تھا بفضلہ تعالےٰ و سبحانہٗ وہ عین کتاب و سنّت سے ماخوذ ہے ۔ نیز یہ توقع ظاہر فرمائی تھی کہ اب تمام رفقائے تنظیم پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے فرائض دینی کی بجا آوری میں منہمک ہو جائیں گے ۔ جناب امیر تنظیم نے اس مکتوب میں بعض اصولی ہدایات کے علاوہ آئندہ کی کارگذاری کے لئے کچھ خطوط بھی معین فرمائے تھے ۔ اس سالانہ رپورٹ میں انہی خطوط کی روشنی میں تنظیم اسلامی کی اس سال کے دوران کارگذاری کا جائزہ پیش کرنا مقصود ہے ۔

گذشتہ سالانہ اجتماع کے موقع پر اندرون ملک ۲۲ اور بیرون ملک ۳ مقامی تنظیمیں قائم ہو چکی تھیں علاوہ ازیں پانچ مقامی اسرہ جات بھی موجود تھے ۔ اس سال کے دوران تنظیم اسلامی حیدر آباد کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے ایک نئی مقامی تنظیم لطیف آباد کا قیام عمل میں آیا ہے ۔ واہ کینٹ میں ایک نیا مقامی اسرہ بھی قائم کیا گیا ہے ۔ اس طرح اب اندرون ملک ۲۳ مقامی تنظیمیں اور چھ مقامی اسرہ جات موجود ہیں ۔ گذشتہ ماہ اکتوبر میں جناب امیر تنظیم اسلامی سعودی عرب تشریف لے گئے تھے اس موقع پر وہاں دو مقامی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا ۔ جدہ اور طائف میں مقیم رفقائے تنظیم کو تنظیم اسلامی جدہ میں شامل کیا گیا اور ریاض میں مقیم رفقاء پر مشتمل تنظیم اسلامی ریاض تشکیل دی گئی ۔ اس طرح اب بیرون ملک پانچ مقامی تنظیمیں کام کر رہی ہیں ۔ مزید براں دسمبر ۸۵ء میں امیر محترم نے ابوظہبی کا دعوتی دورہ بھی کیا تھا ۔ جہاں ہمارے چار رفقاء پہلے سے موجود تھے ۳۶ نئے اصحاب عہد نامہ رفاقت اٹھا کر او بیعت کر کے تنظیم اسلامی میں شامل ہوئے ۔ امارات کی دوسری ریاستوں میں بھی ۵ منفرد رفقاء موجود ہیں ۔ فی الحال امارات میں مقیم رفقاء کو باقاعدہ تنظیم کی شکل دینے کے بجائے وہاں اسرہ قائم کیا گیا ہے ۔ الحمد للہ بیرونِ پاکستان کی تنظیموں اور اسروں اور رفقاء سے خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ کی بنیاد مضبوط تر ہو گئی ہے ۔ چونکہ امیر محترم نے ابوظہبی کے دورے سے مراجعت کے بعد یہ ذمہ داری جناب بھائی قمر سعید قریشی صاحب کو تفویض کر دی ہے اور وہ کافی محنت و اہتمام کے ساتھ اس کام کو انجام دے رہے ہیں ۔ اللہ تعالےٰ ان کی ان مساعی کو نتیجہ خیز اور مشکور فرمائے

گذشتہ سالانہ اجتماع کے بعد یہ طے کیا گیا تھا کہ بیعت سمع و طاعت فی المعروف کے تقاضوں کے مطابق اب ہمارے ہاں ایسی فضا قائم ہو جانی چاہیے جن میں قانونیت

کم سے کم اور ترغیب و تشویق پر زیادہ زور ہو - اس مقصد کے لئے اس سال کے دوران
لاہور اور کراچی کی تنظیموں میں اجتماعات کا ایسا نظام اختیار کیا گیا - جس میں محاسبہ
و باز پرس کی بجائے دعوت و تذکیر اور وعظ و نصیحت نمایاں ہو - چنانچہ اجتماعات
خصوصی و عمومی کی تفریق ختم کر دی گئی - اب ایک اجتماع تربیتی و تذکیری نوعیت
کا ہوتا ہے - جس سے اصل مقصود رفقاء کی تربیت ہے لیکن اس میں دوسرے حضرات
بھی شریک ہو سکتے ہیں - دوسرا اجتماع دعوتی و تبلیغی مقاصد کے لئے ہوتا ہے -
جس کے اصل مخاطب نئے لوگ ہوتے ہیں لیکن اس میں رفقاء بھی شریک ہوتے ہیں -
لاہور کی تنظیموں کے یہ اجتماعات مشترکہ اور ماہوار منعقد ہو رہے ہیں - اگرچہ اسکے
علاوہ اسرہ جاتی سطح پر ہفتہ وار اجتماعات کا بھی اہتمام ہے - دعوتی اجتماع مختلف
مقامات پر مختلف تنظیموں کے زیر اہتمام ہوتا رہا ہے - اور اب بفضلہٖ
تعالیٰ اس نے ایک جلسہ عام کی حیثیت اختیار کر لی ہے - جناب امیر تنظیم اسلامی
نے ان اجتماعات میں اسلامی انقلاب اور پاکستان کے موضوع پر مفصل خطابات
فرمائے ہیں - تربیتی و تذکیری اجتماع بھی باقاعدگی سے منعقد ہوتا رہا ہے - جناب
امیر تنظیم کی اس میں بنفس نفیس شرکت نے جہاں اس کو تربیتی نقطۂ نظر سے بہت
مفید بنا دیا ہے - وہاں رفقاء سے ربط و ضبط کی بھی ایک بہت موزوں صورت
پیدا ہوئی ہے - ان اجتماعات سے متعلق امور کی نگہداشت اور دیگر پیش آمدہ ضروری
معاملات پر مشورہ اور تصفیہ کے لئے لاہور کی تنظیموں کے امراء کا ہفتہ وار اجتماع
سال کے دوران باقاعدگی سے ہوتا رہا ہے - امسال کراچی کی تنظیم کو بھی تین مستقل
تنظیموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے وہاں دعوتی و تذکیری اجتماعات ہر تنظیم کی سطح پر
الحمدللہ باقاعدگی سے الگ الگ ہوتے رہتے ہیں - البتہ عوامی سطح پر ماہانہ دعوتی
اجتماعات کے انعقاد میں تاحال وہاں باقاعدگی پیدا نہیں ہوئی ہے -

ہفتہ وار احتسابی یادداشت یا رپورٹ کے بارہ میں ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ
اس کی تحریری جائزہ کے نظام کو از سر نو پورے اہتمام کے ساتھ جاری کر دیا جائے -
اس ضمن میں ہدایات جاری کی گئیں - امراء و ناظمین نے اس کے لئے کوشش
کی - لیکن کما حقہٗ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا - اس کا اہتمام ابھی جزوی ہے -

خواتین کے حلقہ کو منظم اور فعال بنانے کا ہم نے ارادہ کیا تھا۔ اس مقصد کے لئے بعض ضروری اقدامات ہم نے کئے۔ لیکن بوجوہ اس میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ ایک مختصر سے حلقہ خواتین کا قرآن اکیڈمی میں ہفتہ وار اجتماع ہوتا ہے۔ جس میں تعلیم و تدریس اور تلقین ہو رہی ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر بھی خواتین نے تنظیم میں شرکت کی ہے۔ لیکن ان کے لئے کسی مناسب نظم کا قیام و خط و کتابت اور ان کے ریکارڈ کی درستگی نہیں ہو سکی۔ ہمیں اس پر مزید غور کرنا چاہیئے۔ مزید براں خواتین سے بیعت لینے کیلئے سورہ الممتحنہ کی آیت مبارکہ ۱۲ کے الفاظ اور اسلوب لے کر عبارت مرتب کر لی گئی ہے۔

ہم نے یہ طے کیا تھا کہ اس سال کے دوران پانچ مقامات (کوئٹہ ۔ حیدر آباد ملتان ۔ راولپنڈی ۔ پشاور) پر علاقائی اجتماعات منعقد ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پروگرام کے مطابق ان مقامات پر اجتماعات کا انعقاد بحسن و خوبی عمل میں آگیا ہے۔ ماہنامہ میثاق میں ان کی تفصیلی روداد کی اشاعت کا اہتمام ہوتا رہا ہے۔ ان کی نمایاں خصوصیت ان تمام مقامات پر جلسوں کی صورت میں جناب امیر تنظیم اسلامی کے وہ مفصل عوامی خطابات تھے۔ جن کا مشترک عنوان ۔ "اسلامی انقلاب کیا۔ کیوں اور کیسے ؟" تھا۔ الحمد اللہ ان خطابات کے ذریعہ وسیع حلقہ میں تنظیم اسلامی کے تعارف اور توسیع دعوت کے علاوہ ملکی سطح پر کرنے کے اصل کام کی نشان دہی اور وضاحت ہو گئی۔ علاوہ ازیں ان علاقائی اجتماعات میں تنظیمی مسائل کے متعلق قرآنی ہدایات پر مشتمل قرآن مجید کے منتخب نصاب نمبر ۲ کا بیان ہمارے بعض رفقاء نے کیا۔ اس سے جہاں تنظیمی امور اور قرآن مجید کی ہدایات کی تذکیر ہوئی وہاں کچھ رفقاء کو درس و خطاب کی مشق کا موقع بھی فراہم ہوا۔ ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ہر رفیق تنظیم اسلامی ان علاقائی اجتماعات میں سے حسب فرصت و سہولت دو اجتماعات میں ضرور شریک ہو۔ ان اجتماعات کے انعقاد کے بارہ میں اطلاعات قبل از وقت بذریعہ میثاق ۔ سرکلرز اور خطوط تمام رفقائے تنظیم تک پہنچائی جاتی رہی ہیں ہیں۔ تاہم تقریباً ۵۰ فیصد رفقاء نے ان اجتماعات میں شمولیت کی۔

تعلیم و تربیت کے نقطۂ نظر سے بھی سال کے شروع ہی میں انجمن خدام القرآن

اور تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام پروگرام وضع کر لئے گئے تھے۔ انجمن کے زیر اہتمام دو سالہ تدریسی سکیم کی دوسری کلاس کا اجراء بھی ہوا اور نوجوان طلباء کے لئے ایک دو ماہی تربیت گاہ کا انعقاد موسم گرما کی تعطیلات میں بھی ہوا۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء اور ان کے متعلقین کی اس میں شرکت برائے نام رہی۔ تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام ایک پندرہ روزہ تربیت گاہ تو گذشتہ سالانہ اجتماع کے متصلاً بعد منعقد ہوگئی تھی۔ اس میں ۲۵ حضرات شریک ہوئے جن میں ۱۶ رفقائے تنظیم تھے اس کے بعد سال کے دوران چار پندرہ روزہ تربیتی پروگرام منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کے انعقاد کا اہتمام بھی ہوگیا لیکن ان میں رفقاء کی شرکت اطمینان بخش نہیں رہی۔ بہت محنت اور اہتمام سے ترتیب دئے ہوئے تربیتی پروگراموں سے استفادہ کے لئے رفقاء وقت فارغ نہیں کر سکے۔ اس موضوع پر از سر نو غور و خوض اور نئی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

میثاق تنظیم اسلامی کا ترجمان ہے۔ سال کے دوران الحمدللہ اس کی اشاعت میں باقاعدگی رہی۔ اگرچہ اشاعت میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔ اب یہ قریباً سات ہزار کی تعداد میں چھپ رہا ہے۔ تنظیم اسلامی کی دعوت سے متعلق امیر محترم کے دروس وخطابات اور دیگر مضامین کے علاوہ اطلاعات، رفقاء کار۔ امیر محترم کے دعوتی وتنظیمی دوروں کی تفصیلات اس کے مندرجات کا مستقل حصہ ہیں۔ اس کے معیار کو مزید بہتر بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ نشر القرآن کیسٹ سیریز اور الہدیٰ کیسٹ لائبریری کے معاملات الحمدللہ بخیر وخوبی چلتے رہے ہیں۔ وڈیو کیسٹس موجودہ دور میں۔ تعلیم وتربیت اور نشر واشاعت کا ایک بہت موثر ذریعہ بن گیا ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ دینی مقاصد کے لئے بھی اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔ اب نشر القرآن سیریز میں وڈیو کیسٹس کا اضافہ کیا گیا ہے اس مقصد کے لئے ضروری سامان فراہم کر لیا گیا ہے اور اب اہم خطابات ودروس کی باقاعدہ ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ پیش نظر یہ ہے کہ کوئی ایسا قابل عمل نظام وضع کیا جائے جس سے مختلف تنظیموں میں مختلف مقامات پر اس سے استفادہ کیا جا سکے۔
گذشتہ پندرہ روزہ تربیتی پروگرام میں اس کے استعمال سے بہت مفید نتائج

برآمد ہو رہے تھے۔ بعض انتظامی پیچیدگیوں کی وجہ سے نشر القرآن اور اس کے متعلقات کو تنظیم اسلامی سے انجمن خدام القرآن کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

سال کے دوران تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت کے سہ ماہی اجلاس پابندی سے منعقد ہوتے رہے ہیں جن میں دعوتی اور تنظیمی امور پر غور و خوض اور ان کی روشنی میں مناسب فیصلے کئے جاتے رہے ہیں۔

دفتر تنظیم اسلامی پاکستان کی زیر تعمیر عمارت جزوی طور پر مکمل ہو گئی ہے اور مرکزی دفتر وہاں پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ بیرون پاکستان کا شعبہ قرآن اکیڈمی ہی میں جناب امیر تنظیم اسلامی کی براہ راست نگرانی میں کام کرتا رہے گا اور جناب قمر سعید قریشی صاحب نائب امیر تنظیم اسلامی بیرون پاکستان کی حیثیت سے اس کے ذمہ دار ہیں۔ نامزد نائب امیر تنظیم اسلامی پاکستان جناب میاں محمد نعیم صاحب اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر ہمہ وقت خدمت دین میں لگ جانے کے لئے وسط اکتوبر میں مرکز پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے رفقاء سے رابطہ اور ان میں جذبہ و حرکت پیدا کرنے کے لئے کئی تدابیر اختیار کی ہیں۔ ابتداء میں انہوں نے گوجرانوالہ۔ راولپنڈی۔ اسلام آباد ایبٹ آباد اور پشاور کے رفقاء سے رابطہ قائم کیا لیکن بعد ازاں ان کا زیادہ وقت لاہور ہی میں صرف ہوا ہے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ اسی نہج پر دوسرے مقامات پر بھی رفقاء اب عمل اقدامات کے لئے کمر کس لیں۔ امیر تنظیم کی اجازت سے اب میاں محمد نعیم صاحب اپنے دائرہ کار کو دوسرے مقامات تک وسعت دیں گے۔

اس سال کے دوران جناب امیر تنظیم اسلامی کی بیرون لاہور مصروفیات میں نسبتاً کچھ کمی واقع ہوئی۔ گزشتہ رمضان المبارک میں دورہ ترجمہ القرآن کی شدید مشقت کے بعد تقریباً دو تین ماہ ناسازی طبع کی بنا پر پابند مسکن ہونا پڑا۔ تاہم کراچی کے ماہوار پروگرام شام الہدیٰ اور اسلام آباد کمیونٹی سنٹر میں ماہوار درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ ان پروگراموں سے ملحق مزید دعوتی و تبلیغی پروگرام بھی مختلف مقامات پر ہوتے رہے۔ چنانچہ سکھر۔ حیدرآباد۔ پشاور۔ رحیم یار خاں۔ صادق آباد اور کئی دیگر مقامات پر جانا ہوا۔ کوئٹہ کے علاقائی اجتماع ۱۳ تا ۱۸ ستمبر سے متصلاً قبل ۸ تا ۱۲ ستمبر بلوچستان کے مقامات خضدار۔ لورالائی اور پشین کا دورہ ہوا۔ ہمارے

رفقاء نے اس کے لئے خصوصی محنت کی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسطرح دور دراز علاقوں میں تنظیم اسلامی کا تعارف ہوا اور توسیع دعوت کے مواقع پیدا ہوئے۔ علاوہ ازیں کوئٹہ، راولپنڈی، پشاور، حیدر آباد اور ملتان کے علاقائی اجتماعات کے دوران بھی امیر تنظیم نے بہت بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب فرمایا اور بفضلہ تعالیٰ تنظیم اسلامی کے حلقۂ اثر کو وسعت نصیب ہوئی۔ بعض مقامات پر اگرچہ بغرض آرام ہی جانے کا پروگرام ہوا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی کئی پہلوؤں سے مفید بنادیا۔ چنانچہ مری اور ایبٹ آباد کے چند روزہ قیام کے دوران صاحبزادہ غلام النصیر چلاسی المعروف چلاسی بابا سے ملاقات ہوئی جو کہ اس علاقہ کی معروف بااثر دینی شخصیت ہونے کے علاوہ ایک صحیح اسلامی فکر کے حامل مرد درویش ہیں۔ اکتوبر کے وسط میں اگرچہ سعودی عرب آرام اور بحالی صحت کے لئے پروگرام بنا تاہم وہاں قیام کے دوران جدہ۔ مکّہ مکرّمہ۔ طائف۔ ریاض اور الخبر میں محدود نشستوں اور بڑے اجتماعات میں دروس و خطابات کا اہتمام ہوگیا۔ اواخر نومبر بھارت جانا ہوا۔ وہاں پر پندرہ روزہ قیام کے دوران دہلی اور حیدر آباد دکن میں مختلف چھوٹے بڑے اجتماعات میں خطاب اور محافل میں گفتگو کا موقع میسر آیا۔ موخر الذکر میں ۱۲ اور ۱۳ ربیع الاول کے اجتماعات میں شرکاء کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز بتائی جاتی ہے۔ وسط دسمبر میں ابوظہبی کے بہت کامیاب دورہ کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ وہاں پر تنظیم اسلامی کے اب چالیس رفقاء موجود ہیں اور الحمدللہ نائب امیر تنظیم اسلامی برائے بیرون پاکستان جناب قمر سعید قریشی صاحب کا ان سے فرداً فرداً رابطہ قائم ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حلقہ کو مزید وسعت اور استحکام عطا کرے اور احیائے دین کے لئے مفید بنائے۔

اسلامی انقلاب اور اس کے مراحل کی وضاحت جناب امیر تنظیم اسلامی کے گزشتہ سال کے خطابات جمعہ اور عوامی تقاریر کا موضوع رہا تھا۔ اس سے تنظیم اسلامی کے پیش نظر انقلابی عمل نکھر کر سامنے آگیا تھا۔ اس سال کے دوران اس میں پاکستان کے حوالہ گفتگو کا اضافہ ہوا ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان کی بقاء و استحکام کا ضامن صرف اسلامی انقلاب ہے۔ امیر تنظیم نے اس نقطہ نظر کو اندرون و بیرون ملک

مختلف اسالیب اور زاویوں سے بدلائل و براہین بیان فرمایا ہے۔ ان شاء اللہ العزیز۔ اب کسی اپنے یا پرائے کے لیے تنظیم اسلامی کی پکار اور منہج عمل کی تفصیلات کے ضمن میں کوئی ابہام باقی رہنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ تنظیم اسلامی اولاً پاکستان اور بالآخر پورے کرۂ ارضی پر اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ہم پر دورانِ سال یہ فضل ہوا ہے کہ یہ تمام تصریحات اب احاطہ تحریر میں بھی آتی چلی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا مزید کرم یہ ہوا کہ طائف کے تقریباً دس روز کے قیام میں "استحکامِ پاکستان" کے موضوع کو ضبط تحریر میں لانے کی سبیل پیدا ہوگئی اور امیر محترم نے اس عرصہ میں کتاب کا مقدمہ اور پہلے تین ابواب کو سپردِ قلم کر دیا۔ واپسی پر امیر محترم کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ خیال ڈالا کہ اس "قیسے از حجاز" کی اشاعت کسی کثیر الاشاعت روزنامہ میں کر دی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی سبیل پیدا فرما دی اور پاکستان کے مشہور و معروف "روزنامہ جنگ" کے چاروں ایڈیشنوں (کراچی، لاہور، راولپنڈی اور کوئٹہ) میں دسمبر ۸۵ء سے ہر جمعہ ایڈیشن میں ادارتی صفحہ پر اس کا اہتمام ہوگیا اور اس کا ایک فائدہ بقول امیر محترم یہ ہوا کہ اسی طرح پاس عہد سے احساس فرض دو آتشہ ہوگیا اور ۱۷ فروری ۸۶ء تک جملہ اقساط ضبط تحریر میں آکر ۲۸ فروری ۸۶ء تک روزنامہ جنگ میں شائع ہوگئیں۔ ساتھ ساتھ یہ جملہ اقساط جنوری ۸۶ء سے اپریل تک ماہنامہ "میثاق" میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے یہ کتاب ۲۷ مارچ کو نہایت دیدہ زیب کتابت و طباعت کی صورت میں منصہ شہود پر آگئی ہے۔ امسال ۲۸ مارچ سے ۳ اپریل ۸۶ء تک مرکزی انجمن خدام القرآن کے سالانہ محاضرات قرآنی کے تحت اس کتاب پر سات روز تک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی جس میں متعدد اہل علم و فضل نے شرکت فرمائی۔ اس مذاکرہ کی مفصل روداد "حکمتِ قرآن" کے مئی ۸۶ء میں دیکھی جا سکتی ہے، اور اب طبع ہو کر بھی ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ تنظیم اسلامی کے تعارف اور اسلام کے انقلابی منشور کے مختصر بیان پر مشتمل ایک چہار ورقہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ جس میں اسلامی انقلاب کے نتیجہ میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کی طرف بھی اشارات موجود ہیں اور اس انتخاب

کو برپا کرنے کے لئے تنظیم اسلامی نے جو طریق کار اختیار کیا ہے ۔ اس کا بھی مختصر تذکرہ ہے ۔ اس طرح اس سے تنظیم اسلامی اور دوسری دینی جماعتوں میں فرق و امتیاز پوری طرح واضح ہو جاتا ہے ۔ یہ ایک پیغام اور دعوت بھی ہے ۔ ارادہ یہ ہے کہ اس کو پاکستان گیر پیمانہ پر وسیع تر حلقوں میں پھیلا دیا جائے ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اسلامی منشور کو لے کر دور و نزدیک معاشرے کے تمام طبقات میں پھیل جائیں۔ شاید ہماری کوشش سے کچھ ایسے باصلاحیت مردان کار اقامت دین کی کٹھن راہ میں ہمارے رفیق سفر بن جائیں جو واقعتہً ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کام میں لگ جائیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری کوتاہیوں کو معاف کرے اور ہمیں اس محنت اور ایثار و قربانی کی توفیق عطا فرمائے جو اس راہ پر پیشقدمی کے لئے مطلوب ہے ۔ آمین۔

افکار و آراء

مسلمان خواتین کی جنگوں میں شرکت

صوبائی وزیر ساجدہ نیز عابدی صاحبہ نے ایک انٹرویو میں کہا ہے۔ کہ جن خواتین نے محاذِ جنگ پر نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ بھی بر تیغ پہن کر نہیں لڑیں۔ درحقیقت صرف ان ایک محترمہ ہی پر کیا منحصر ہے ماضی میں بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی دورِ اوّل میں مسلمان خواتین کی بعض جنگوں میں شرکت کو اسلام میں بے پردگی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے ان تمام لوگوں کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آغازِ اسلام میں جنگوں میں عورتوں کی شرکت بعض سیاسی، حربی، طبی و دیگر وقتی یا ہنگامی مجبوریوں یا مصلحتوں کی بنا پر جائز سمجھا گیا۔

(۱) اسلام کے ابتدائی دَور میں مسلمانوں کو ابھی سیاسی استحکام بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ کہ مخالفین سے جنگوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ شروع ہوگیا۔ پھر مسلمان بمقابلہ کفار و دشمنوں کے تعداد میں بھی بہت کم ہوا کرتے تھے اور ان کے پاس جنگی ساز و سامان و دیگر آلاتِ حرب کی بہت کمی تھی۔ کفار ہر میدان جنگ میں عورتوں کی کھیپ کی کھیپ اپنے ساتھ لایا کرتے تھے اس عددی قوت اور جنگی ساز و سامان کی کمی کے پیش نظر مسلمان خواتین کی جنگوں میں شرکت کو سیاسی نقطہ نظر سے جائز سمجھا گیا۔

(۲) ان ایام میں خصوصاً عرب میں طب خانگی تجربہ و عمل تک محدود تھی۔ عورتیں مردوں سے زیادہ اس فن سے واقفیت رکھتی تھیں اور اسی وجہ سے ان کو زخمیوں کی مرہم پٹی وغیرہ کرنے کی اجازت دے دی جایا کرتی تھی۔

(۳) خواتین کی جنگوں میں شرکت ہمیشہ رسول اللہ کی خصوصی اجازت سے اور اپنے قبیلے یا انتہائی قابل اعتماد افراد کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ عموماً خواتین کے باپ بھائی حقیقی سرپرست اور اولاد جیسے قریب ترین محرم مرد ہی انکو محاذِ جنگ پر اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔

(۴) میدان جنگ میں خواتین کی خدمات کا دائرہ بھی اُن کے اپنے عزیز و اقارب تک محدود رہتا تھا اور اگر کبھی کسی نامحرم مجاہد سے واسطہ پڑ بھی جاتا تو خواتین اپنا بدن اُس مجاہد کے جسم سے مَس نہ ہونے دیتی تھیں۔ الا یہ کہ ایسا کرنا ناگزیر ہو جاتا، (شرح مسلم ۲۸ ص ۱۱۴)

(۵) مسلمانوں کی پوری تاریخ میں خواتین کی جہاد میں شامل ہونے کی باقاعدہ دعوت یا ترغیب نہیں دی جاتی تھی، بلکہ اس کے برعکس جب کبھی بھی خواتین کی طرف سے اس قسم کی خواہش کا اظہار کیا جاتا تو حوصلہ شکنی ہی کی جاتی تھی شرح بن زیادہ اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ

کے ساتھ جنگ خیبر کے لئے روانہ ہوئیں تو ان کے ساتھ دوسری پانچ عورتیں بھی تھیں، اُن کا بیان ہے کہ اس کی خبر جب آپؐ کو ہوئی ۔ تو آپؐ نے ایک شخص کو بھیج کر ہمیں طلب کر لیا۔ ہم حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر غصے کے آثار ہیں ۔ آپؐ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: تم کس کے ساتھ گھر سے نکلیں اور کس کی اجازت سے نکلیں ؟ (مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۷۱)

(۶) جب حضرت عائشہؓ نے جنگ جمل میں شرکت کا فیصلہ کیا تو حضرت اُم سلمہؓ نے انہیں ایک خط لکھا آپ کی حیثیت رسول اللہؐ اور امت کے درمیان ایک دروازے کی ہے اور آپؓ حجاب دیا اس پر حرمت کا پردہ ہے ۔ اللہ نے آپ کو اپنے گھر میں بٹھایا ہے اسے چھوڑ کر میدان میں نہ چلی آیئے ۔ عورتوں کا جہاد اور ان کے لئے انتہائی محبوب بات یہ ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنا دامن سمیٹے رہیں ۔

احمد بن حنبل نے زوائد الزہد میں اور ابن المنذر ابن ابی شیبہ اور ابن سعد نے اپنی کتابوں میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ جب تلاوت قرآن کرتے ہوئے اس آیت "وقرن فی بیوتکن" پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ بھیگ جاتا تھا کیوں کہ اس پر انہیں جنگ جمل میں شرکت کا فیصلہ یاد آجاتا تھا ۔ پھر یہ شرکت بے پردہ ہو کر نہیں بلکہ ہودج (محمل) میں بیٹھ کر کی تھی ۔ جب حضور اکرمؐ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو غزوہ بنی مصطلق میں اپنے ہمراہ لے گئے ۔ تو اس وقت بھی ہودج (محمل) میں سوار تھیں ۔

الغرض مسلمان خواتین کی غزوات اور دیگر جنگوں میں شرکت کسی 'اصول' کے تحت نہیں تھی بلکہ یہ ایک استثنائی شکل تھی ۔ زیادہ طور پر یہ "شرکت" ستر و حجاب کے احکام کے نزول سے پہلے ثابت ہوتی ہے بعد میں تو ویسے ہی اس شرکت کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی جاتی رہی علاوہ ازیں اسلام دین فطرت ہے یہ کوئی اندھا بہرہ مذہب نہیں ہے اگر آج بھی جنگی حالات پیدا ہو جائیں اور خواتین کا محاذ جنگ پر جا کر خدمت سرانجام دینا ضروری ہو جائے تو اسلام اس میں حارج نہیں ہوگا ۔ لیکن اس صورت میں بھی وہ تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرنا پڑیں گی ۔ کہ جو حضور اکرمؐ کے زمانے میں جاتی تھیں ۔ نیز جنگی حالات ختم ہوتے ہی خواتین کو واپس اپنے اصلی محاذ گھر کی جانب لوٹ جانا ہوگا اور پردے کی پابندی پھر سے اپنانی ہوگی ۔ استثنائی شکلوں میں اضطراری کیفیات کے سبب شریعت مسلمان مردوں اور عورتوں کے حق میں جو نرمیاں رعایات، چھوٹ یا ڈھیل روا رکھتی ہے سے اصولاً غیر اضطراری صورت حالات میں فائدہ اٹھانا کسی طور صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا ہے مثلاً ایک پیاسا شخص جان بچانے کے لئے شراب پی سکتا ہے تو کیا اُسے ہمیشہ شراب پینے کی اجازت دی جاسکتی ہے ۔ ؟

آخر میں میں خواتین پر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ماضی میں مسلم خواتین نے بر قعے

پہن کر بھی جنگوں میں حصّہ لیا ہے اور ایران کی عورتیں آج بھی برقع پہن کر جنگ میں شریک ہوتی ہیں بات صرف ایمان اور ذہن کی ہے، وگرنہ برقع عورت کی زندگی میں کہیں حائل نہیں ہوتا۔

مرسلہ: مظہر علی ادیب

عربی زبان مڈل نہیں، ایف اے تک لازمی قرار دی جا چکی ہے

آپکے مؤقر جریدہ کی وساطت سے میں عربی زبان سے متعلق چند سطور ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ میری یہ تحریر کردہ سطور قومی اور تعلیمی لحاظ سے فائدہ مند ثابت ہونگی۔

نہ صرف مذہبی بلکہ معاشی اور سیاسی لحاظ سے بھی عربی زبان کی ضرورت و اہمیت کوئی محتاجِ بیان نہیں ہے۔ خاص طور پر مملکتِ خداداد پاکستان میں کہ جس کی بنیاد ہی دینِ اسلام پر رکھی گئی ہے۔ یہ زبان دینِ اسلام کی زبان، قرآن کی زبان، حدیث کی زبان کتبِ تفسیر، کتبِ فقہ کی زبان ہے۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ ہادیٔ برحق ہمارے نبی محمد مصطفٰےؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک بھی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے مذہبی مراکز حرمین شریفین کی زبان بھی ہے۔ حرمین شریفین سے ہمارے رُوحانی ہی نہیں مذہبی ہی نہیں بلکہ سیاسی روابط بھی ہیں۔ اُن کا نفع و نقصان ہمارا بھی نفع و نقصان ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ہم وہ زبان نہ سکھیں جو ہمارے اور اُن کے روابط کو مضبوط اور مستحکم کرے کوئی قوم اُس وقت تک دوسری قوم سے کما حقہٗ استفادہ نہیں کر سکتی جب تک وہ اُس قوم کی زبان سے واقف نہ ہو حالانکہ (المسلم ملۃ واحدۃ) مسلمان ایک قوم ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان ہماری مذہبی ہی نہیں قومی زبان بھی ہے۔ البتہ۔ اُردو۔ ملکی۔ سندھی۔ پنجابی۔ بلوچی اور پشتو علاقائی زبانیں ہیں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ جب انگریز نے برصغیر میں قدم رکھا تو فوراً ہی قومی زبان اُردو کو نہ صرف پڑھنا اور لکھنا سیکھنا شروع کر دیا بلکہ اس کی ترقی و ترویج کے لئے "ولیم کالج" کی بنیاد رکھی اور ملک کے مایاناز اُدبا، شعراء اور مصنفین سے استفادہ کیا گیا۔

اس پر مستزاد یہ کہ ہمیں عربی زبان سے محبت کرنے کی واضح ہدایت حدیث شریف سے بھی ملتی ہے۔ کہ جیسا کہ علامہ حاکم نے "المستدرک" میں علامہ بیہقی نے "الشعب" میں، علامہ الطبرانی نے "الکبیر" میں اور جامع صغیر میں اس حدیث پر درست

اور صحیح کی علامت لگائی ہے، اور روایت کیا ہے۔ کہ

"عربی زبان سے تین وجوہ کی بنا پر محبت کرنا چاہیئے ایک یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ عربی ہیں۔ دوئم یہ کہ قرآن عربی ہے اور سوئم یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہے" (کلا الحدیث)

بنا بریں موجودہ حکومت پاکستان نے اہل پاکستان کے ایک دیرینہ مطالبہ کو ۱۶ اراگست ۱۹۸۲ء میں عربی زبان کو جماعت ششم سے بارہویں تک لازمی مضمون کی حیثیت دیکر ایک مستحسن لیکن ناقص اقدام کیا ہے۔ مستحسن اس لئے کہ یہ نفاذ اسلام کی طرف ایک بنیادی اور درست پیش رفت ہے۔ ناقص اس لئے کہ یہ مطالبہ بی۔ اے تک لازمی قرار دینے کا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا جیسا کہ انگریزی بی۔ اے تک لازمی چلی آرہی ہے۔ سوال انگریزی کی افادیت کا نہیں اور نہ یہ کہ جس کا رزلٹ ۱۸ بز یا ۲۲ بز سے آگے نہیں بڑھا۔ بلکہ بسا اوقات صفر بز بھی رہا ہے۔ بلکہ سوال عربی زبان کی ترقی و ترویج اور اس کا اصلی مقام دلانے کا ہے۔ لہٰذا حکومت سے یہ مطالبہ ہے کہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے۔ نیز عربی کو نفاذ اسلام کے لئے اپنے خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے بی اے تک لازمی قرار دیدے۔

تاہم ہر ذی علم، صاحب قلم نیز درد دل رکھنے والے ہر پاکستانی کے لئے لازمی ہے کہ وہ حتی المقدور عربی زبان کے فروغ کے لئے اپنے آپ کو وقف کرے۔ جبکہ بعض ارباب حل وعقد فروغ عربی کے راستہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں، پھر رکاوٹیں کھڑی کی جارہی ہیں۔ نیز معلمین عربی کے لئے مسائل در مسائل پیدا کئے جارہے ہوں تو اس صورت حال میں ان کی ذمہ داری دوچند ہو جاتی ہے۔

رکاوٹ کے سلسلہ میں ایک بات قابل ذکر ہے۔ کہ حکومت پاکستان کی وہ چیٹھی جس کے ذریعہ عربی زبان کو چھٹی تا بارہویں جماعت لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے۔ اسے نہ تو مشتہر کیا جارہا ہے اور نہ ہی اُسے متعلقہ معلمین کے علم میں یہ لایا جارہا ہے۔ چنانچہ برادرم عبدالحق اوٹی گورنمنٹ ہائی سکول موسیٰ خیل (میانوالی)، کا روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۲۴ فروری میں شائع شدہ وہ خط شاہد عادل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں عربی کو بی اے تک لازمی قرار دیے جانے کا مطالبہ کرتے ہوئے موصوف نے گلہ کیا ہے کہ عربی کو حکومت نے صرف مڈل کی سطح تک لازمی قرار دے کر کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے۔

نہ صرف مدرس مذکور صاحب کی اطلاع کے لئے بلکہ افسران بالا محکمہ تعلیم کی خصوصی نیز ارباب حکومت پاکستان کی عمومی اطلاع کے لئے تحریر ہے کہ منسٹری آف ایجوکیشن گورنمنٹ آف پاکستان۔ اسلام آباد کی چیٹھی نمبر ایف ۴-۳/۸۲/ ایس ٹی۔ مورخہ ۱۶ شہ ۸۲ کی رو

(بقیہ صہ ۹۳ پر)

بقیہ: الہدیٰ

الی اللہ اور داعی الی الخیر کو ان جذباتی اور نفسیاتی کیفیات اور لمحات سے سابقہ پیش آتا ہے لہذا ہدایت دی جا رہی ہے کہ اگر بربنائے طبع بشری کبھی شیطان کی طرف سے اکساہٹ ہو ہی جائے تب بھی ایک راستہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے۔ ایک پناہ گاہ تمہارے لئے موجود ہے، فوراً اس پناہ گاہ کی طرف لپکو: فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ، فوراً اللہ کی پناہ میں آجاؤ۔ اسی کی پناہ طلب کرو۔ اس میں گویا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہوگیا جو ہمارے سابقہ درس میں وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ کی تشریح میں بھی بیان ہو چکی ہے کہ کوئی انسان اپنے متعلق یہ نہ سمجھے کہ میں اس مقام پر پہنچ گیا کہ اب اس کیلئے شیطان کی وسوسہ اندازی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، میں ہمیشہ کے لئے مسکون و مامون ہوگیا۔ جب تک انسان عالم بشریت میں ہے شیطان اپنا وار کرتا ہے۔ اُسے اللہ کی طرف سے یہ چھوٹ ملی ہوئی ہے کہ وہ وسوسہ اندازی کرے، اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ۔ جس کے بارے میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ کَمَجْرَی الدَّمِ۔ شیطان تو انسان کے پورے وجود میں اس طرح سرائت کر جاتا ہے جیسے خون اس کے جسم میں حرکت کرتا ہے۔ لہذا انسان کو ہر وقت اس کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے۔ ہر دم چوکس رہنا چاہئے۔ جوں ہی وہ اس طرح کی کیفیات و جذبات اپنے نفس میں محسوس کرے تو سمجھ لے کہ یہ شیطان کی طرف سے اکساہٹ ہے اور فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ یہ ہے وہ تعلیم اور ہدایت جو اس آئت کے ذریعہ ہمارے سامنے آئی۔ آیت کے آخر میں فرمایا: اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ تمہارا پشت پناہ، تمہارا مددگار، تمہارا حامی تو اللہ ہی ہے جو سب کچھ سننے والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے اگر تم اس سے وابستہ رہو گے، تم اسی سے لو لگائے رکھو گے تو وہ تمہاری نصرت و مدد کے لئے ہر آن موجود ہے۔ وہ از خود سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

دیکھیے! ہمارے اس سبق کا جو نقطۂ آغاز تھا، بات پھر وہیں پہنچ

گئی ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ۔ بات یہاں سے شروع ہوئی ۔ بیشک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے ، ہمارا پروردگار ، ہمارا پالن ہار ، ہمارا پرورش کنندہ ، ہمارا رازق ، اللہ ہے ۔ پھر وہ اس پر جم گئے ؛ اُن کے لئے وعدے ہیں کہ اُن پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے جو اُن کی ہمت بندھاتے ہیں کہ نہ خوف کھاؤ نہ غم اور اندیشہ کرو بلکہ اس جنت کی خوشیاں مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اور اس کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہو رہا ہے : وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ۔ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔ اور جب کبھی شیطان کی جانب سے کوئی اکساہٹ ، کوئی وسوسہ اندازی محسوس ہو ، فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹو ، جب بھی کوئی شخص پناہ کے لئے اس کی طرف آتا ہے ، رحمتِ خداوندی اسے پناہ دیتی ہے ۔

یہاں ہمارا یہ سبق ختم ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صبر کے اِس اعلیٰ و ارفع مقام تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے جو اس سبق کے ذریعہ ہمارے سامنے آئے ہیں ۔ وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

(نوٹ) افسوس ہے کہ بجلی چلے جانے کے باعث اِس نشست کے سوال و جواب ریکارڈ نہیں ہو سکے ۔ (ادارہ)

(بقیہ : افکار و آراء)

ے عربی زبان چھٹی جماعت سے ایف اے تک لازمی مضمون کی حیثیت اختیار کر چکی ہے ۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اس کی تشہیر کیوں نہیں کی جا رہی ہے یا یہ کہ متعلقہ مدرسین کے ٘میں یہ بات کیوں نہیں ہے تو بات صاف ہے کہ مملکت خداداد پاکستان میں نوکر شاہی ٘زمت پاکستان کے ہر اس اقدام کو جو نظام اسلام کی طرف اٹھتا ہے نہ صرف اس ٘مخالفت کرتی ہے بلکہ اس اقدام کو سبوتاژ کرنے کی ناکام کوششیں کر دیتی ہے ۔

درحقیقت اس عربی مضمون کے ایف اے ۔ بی اے تک لازمی ہو جانے کی بنا اسلام کے بنیادی مآخذ قرآن کو حدیث کو صحیح طور پر سمجھنے والوں کی تعداد بڑھے گی ۔ ۔یوں نظامِ اسلام کے چاہنے والوں میں اضافہ ہوگا ۔ لہٰذا نوکر شاہی کا ذہن رکھنے ٘ل اور بائیں بازو کی دال نہیں گلے گی ۔ والسلام

راؤ محمد ایوب سالک عربک ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول ماڈل ٹاؤن شپ لاہور ۔ ۴۰

قرآن اکیڈمی کے تحت مختلف تعلیمی اسکیموں میں

نئے داخلوں کا اعلان

دو سالہ تدریسی نصاب

مئی ۱۹۸۴ء میں ہم نے قرآن اکیڈمی میں 'دو سالہ تدریسی نصاب' کے عنوان سے جس دینی تعلیمی اسکیم کا آغاز کیا تھا، الحمد للہ کہ وہ باقاعدگی اور کامیابی سے چل رہی ہے۔ ۸۴ء میں جس گروپ نے قرآن اکیڈمی میں داخلہ لیا تھا اُس نے حال ہی میں اِس دو سالہ نصاب کی کامیابی کے ساتھ تکمیل کر لی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ ۸۵ء میں جس گروپ کو داخلہ دیا گیا تھا، اُس نے بھی اپنا پہلا تعلیمی سال مکمل کر لیا ہے اور اب یکم جولائی ۱۹۸۶ء سے اُن کے دوسرے سال کی تدریس کا آغاز ہو جائے گا۔

آئندہ تعلیمی سال میں نئے داخلوں کے بارے میں حسب ذیل فیصلے کیے گئے ہیں۔

سال اوّل کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز اِن شاء اللہ یکم جولائی ۱۹۸۶ء (۲۳ شوال ۱۴۰۶ھ) سے ہو جائے گا۔ جو حضرات اِس دو سالہ تدریسی نصاب میں داخلے کے خواہش مند ہوں، وہ اپنی درخواستیں زیادہ سے زیادہ ۱۵ جون (۶ شوال) تک مع مکمل تعلیمی کوائف ہمیں ارسال کر دیں۔ واضح رہے کہ اِس اسکیم میں صرف ایم اے۔ ایم ایس سی اور بی اے۔ بی ایس سی کم از کم سیکنڈ ڈویژن میں پاس شدہ طلبہ کو لیا جائے گا۔

— تدریسی اوقات صبح آٹھ تا ظہر ہر ایک ہوں گے۔ تدریسی اوقات اور ڈسپلن کی پابندی ضروری ہوگی۔ غیر حاضری یا ڈسپلن کی خلاف ورزی پر جرمانے عائد کیے جائیں گے۔

— ایم اے۔ ایم ایس سی کے لیے ماہانہ وظیفہ ۸۰۰/- ہوگا، جبکہ بی اے۔ بی ایس سی کے لیے وظیفے کی شرح ۶۰۰/- متعین کی گئی ہے البتہ سیکنڈ ڈویژن پاس ایم اے اسلامیات کو وظیفے کے معاملے میں بی اے/بی ایس سی کے کھاتے میں شمار کیا جائیگا

— وظیفے کی رقم میں سے ماہ بماہ ادائیگی صرف ۵۰ فیصد کی ہوگی۔ بقیہ ۵۰ فیصد انجمن کے پاس ان کے حساب میں جمع رہے گا اور کورس کی کامیابی کے ساتھ تکمیل پر یکمشت ادا کر دیا جائے گا۔ جو طالب علم درمیان میں چھوڑ جائیں گے یا اُن کے نامناسب طرزِ عمل یا غیر تسلی بخش رفتارِ کار کی بنا پر اکیڈمی اُن کا اخراج کر دیگی اُن کی یہ جمع شدہ رقم ضبط کر لی جائے گی۔

سال دوم کی تعلیم کا آغاز بھی اِن شاء اللہ یکم جولائی سے ہو جائے گا۔ اِس میں اصلاً تو وہی لوگ شامل ہوں گے، جنہوں نے قرآن اکیڈمی میں پہلے سال کی کامیابی کے ساتھ تکمیل کر لی ہو — تاہم پہلے سال

میں چونکہ اصل زور (EMPHASIS) عربی زبان کی تحصیل پر تھا لہٰذا سالِ دوم کی کلاس میں ایسے طلبہ کو بھی داخلہ دیا جا سکے گا جو عربی زبان کی اچھی استعداد رکھتے ہوں۔ کم از کم گریجویشن کی شرط یہاں بھی برقرار رہے گی۔ عربی کی استعداد کو جانچنے کی غرض سے داخلہ سے قبل اُن کا باقاعدہ تحریری امتحان لیا جائے گا۔ اِس کلاس میں شرکت کے خواہشمند طلبہ کی درخواستیں بھی ۲۶ شوال تک پہنچ جانی چاہئیں۔ اِن حضرات کے لیے وظیفے کی شرح بھی وہی ہو گی جس کا سطورِ بالا میں اعلان کیا جا چکا ہے۔

سالِ سوم کی کلاس کا اجرا

متذکرہ بالا دو سالہ تدریسی نصاب کے ساتھ ساتھ اِس سال یکم جولائی سے قرآن اکیڈمی میں علومِ دینیہ کی اعلیٰ تر سطح پر تدریس کے لیے سالِ سوم کی کلاس کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ اِس کلاس میں صرف اُنہی طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا جو قرآن اکیڈمی میں دو سالہ تدریسی نصاب کی کامیابی کے ساتھ تکمیل کر چکے ہوں۔ اِس تیسرے سال میں نصابِ تعلیم حسبِ ذیل ہو گا:

(i) حدیث کے ضمن میں 'جامع ترمذی' (مکمل) (ii) عربی نحو کے ذیل میں 'المفصّل' اور (iii) عربی ادب کے ضمن میں 'حماسہ'

نئی تعلیمی اسکیم: قرآن کالج

الحمد للہ کہ اِس سال سے مرکزی انجمن کے تحت قرآن کالج کے نام سے ایک نئی تعلیمی اسکیم کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ پیشِ نظر یہ ہے کہ ایف اے، ایف ایس سی پاس طلبہ کو تین سال میں ایک جانب بی اے کے امتحان کی مناسب تیاری کرا دی جائے اور دُوسری جانب عربی صرف و نحو کی بنیاد کو پختہ کر کے پورے قرآن حکیم کا ترجمہ مع مختصر تفسیر اور حدیثِ نبوی کا منتخب نصاب پڑھا دیا جائے ۔۔ توقع ہے کہ اِس اسکیم کے ذریعے تحریکِ رجوع الی القرآن کے مقاصد نہایت عمدگی اور سُرعت کے ساتھ حاصل ہوں گے ۔۔ اور اس کے لیے اُمید ہے کہ اچھی صلاحیت و استعداد کے حامل نوجوان بھی مل جائیں گے۔ اِس لیے کہ ایف ایس سی کے امتحان کے بعد کافی تعداد میں ایسے نوجوان طلبہ جنہیں نمبروں کے معمولی فرق کے باعث میڈیکل یا انجنیئرنگ کالج میں داخلہ نہیں ملتا، اِن شاء اللہ اِس کورس میں داخلہ لیں گے۔ ان میں اچھی استعداد کے حامل نوجوانوں کے دینی جذبات کو بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل غیر مستطیع نوجوانوں کو وظائف اور دیگر مراعات کے ذریعے بھی راغب کیا جا سکتا ہے۔

اِس اسکیم کے تحت تعلیم کا باقاعدہ آغاز بھی یکم جولائی سے ہو جائے گا۔ شرکت کے خواہشمند طلبہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ جون تک اپنی درخواستیں مع مکمل تعلیمی کوائف ہمیں ارسال کر دیں۔ تفصیلی معلومات کے لیے ذیل کے پتہ پر اطلاع کریں۔

المعلن: ڈاکٹر ابصار احمد، ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون ۸۵۲۶۸۳

ایک اہم شہادت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مجھے یہ بات نہایت ہی وثوق اور کُلی اعتماد کے ساتھ یاد ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب کہ پاکستان کو قائم ہوئے ایک سال گذر رہا تھا حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت (بمبئی) تشریف لائے، میں اس وقت جامعہ اسلامیہ میں مدرس تھا۔ ایک مجلس میں بعض حضرات نے (اس بنا پر کہ حضرت مدنیؒ کا تعلق کانگریس سے تھا اور کانگریس کی سیاست پاکستان کی حامی نہ تھی اور تحریک پاکستان کی مخالف تھی) حضرت مدنیؒ سے پاکستان کے متعلق سوال کیا کہ اب حضرت کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے! حضرت اقدسؒ نے اس سوال کے جواب میں جو کلمات فرمائے وہ مجھے آج تک یاد ہیں فرمایا "بھائی! یہ ممکن ہے کہ اگر کسی جگہ مسجد کی تعمیر کرنے کی گفتگو ہو تو اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ اس جگہ مسجد تعمیر کی جائے یا نہ کی جائے۔ لیکن جب مسجد بن گئی تو اب کوئی گنجائش اس اختلاف کی نہیں رہ سکتی کہ اس مسجد کو باقی رکھا جائے یا منہدم کیا جائے۔" سبحان اللہ حضرت کے ان الفاظ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ قیام پاکستان سے قبل اگر کسی عالم اور بزرگ کو اختلاف تھا تو وہ ایک نظری اور اجتہادی اختلاف تھا کہ انگریز کی غلامی سے آزادی کس طرح ممکن ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد کسی بھی عالم اور بزرگ نے خواہ اس کا تعلق کانگریس سے تھا۔ کبھی پاکستان کی مخالفت نہیں کی۔ اس مجلس میں حضرت مولانا احمد بزرگؒ، مولانا مفتی اسماعیلؒ و دیگر اکابر علماء موجود تھے۔

محمد مالک کاندھلوی
شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

21 JUL 1986

وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

استحکامِ پاکستان

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مدیر مسئول

بمطابق

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی، فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

ذوالقعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق جولائی ۸۶ء کا 'میثاق'، ہدیہ ناظرین ہے۔ موجودہ شمارہ بھی قریباً ایک عشرہ کی تاخیر سے قارئین کرام تک پہنچے گا۔ مئی اور جون میں قریباً پورا پاکستان خاص طور پر لاہور و کراچی گرمی کے جس شدید موسم سے دوچار رہے ہیں اس کا پورا اندازہ ہمارے تمام کرم فرماؤں کو ہوگا۔ اس پر مستزاد یہ کہ مئی کے آخر کے دو عشرے اور جون کے پہلے عشرہ میں ایک طرف صوم رمضان المبارک کے فرض کی ادائیگی تھی۔ تو دوسری طرف 'ادارہ میثاق' کے بیشتر کارکن بحمد للہ لاہور اور کراچی میں منعقد ہونے والے دورۂ ترجمہ قرآن اور قیام اللیل میں شریک رہے جس میں روزانہ قریباً پانچ گھنٹے لگتے تھے۔ بایں وجوہ پرچہ کی بروقت تیاری کو متاثر ہونا ہی تھا۔ بہرحال یہ کوشش پیش نظر ہے کہ ان شاء اللہ اگست کا شمارہ ابتدائی تاریخوں میں ہی سپرد ڈاک کر دیا جائے گا تاکہ ۵-۶ تاریخ تک قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

کراچی میں دورۂ ترجمہ قرآن بحمدہٖ تعالےٰ وعونہٖ توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ ۳۰ شعبان المعظم کو بعد نماز عشاء امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ نے "عظمتِ قرآن و رمضان — اور ان کے باہمی تعلق" کے موضوع پر ناظم آباد بلاک ۵ رضویہ نگر کی وسیع و عریض جامع مسجد میں نہایت مبسوط، جامع اور پرتاثیر خطاب ارشاد فرمایا اور شرکاء کو دورۂ ترجمۂ قرآن میں شرکت کی تشویق و ترغیب دلائی۔ موصوف نے بتایا کہ از روئے احادیث شریفہ ماہ رمضان المبارک کے پروگرام کی دو شقیں ہیں۔ ایک دن کا صیام دوسری شب کا قیام — البتہ صوم فرائض دینی میں سے ایک فرض ہے اور رات کا قیام تطوع اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے مجعول ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے رات کے قیام کی فضیلت یہ بیان فرمائی ہے کہ روزِ قیامت جہاں روزہ روزے دا
کے حق میں سفارش کرے گا وہاں قرآن بھی کہے گا کہ "میں نے اس کو رات کو سونے ا
آرام کرنے سے روکے رکھا تھا تو اے اللہ! اب اس کے حق میں میری سفارش قبول
(ویقول القرآن منعتہ النوم باللیل فشفعنی فیہ") پھر حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے بشارت دی کہ "فیشفعان" "روزے اور قرآن دونوں کی سفارش قبول
کی جائے گی"۔ اس خطاب میں قریباً آٹھ سو کی حاضری تھی۔

یکم رمضان المبارک کی شب سے بفضلہ تعالےٰ دورۂ ترجمۂ قرآن کے مبارک
ومفید سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ امیرِ محترم نے پہلی رات سورۃ الفاتحہ اور پہلی چار رکعات
میں تلاوت کئے جانے والے حصہ کا ترجمہ اور مختصر تشریح فرمائی۔ بعدہٗ ہر ترویحہ میں یہ
سلسلہ جاری رہتا تھا۔ تراویح میں قرآن مجید پڑھنے کی ذمہ داری تنظیم اسلامی کے رفیق
اور قرآن اکیڈمی کے فیلو بھائی حافظ محمد رفیق کے سپرد تھی۔ حافظ صاحب موصوف پر
اللہ تعالےٰ کا یہ خصوصی فضل ہے کہ جہاں قرآن حکیم ان کے سینہ میں پوری طرح محفوظ اور
زبان پر پوری طرح رواں ہے۔ کیا مجال! کہ ان کو سامع کو لقمہ دینے کی ضرورت محسوس ہوتی
ہو۔ وہاں ان کو لحنِ داؤدی سے بھی حصہ ودیعت ہوا ہے۔ آواز ماشاء اللہ
بہت اچھی ہے اور تلاوت کے انداز میں یہ حُسن ہے کہ ایک ایک لفظ سامعین کی سمجھ میں
آتا ہے — یہ پروگرام عموماً ہر شب کو پونے دس بجے شروع ہو کر صبح دو بجکر پچپن منٹ
پر ختم ہوتا تھا۔ اس طرح بفضلہ تعالےٰ ۲۶ رمضان المبارک کی شب کو یہ پروگرام اختتام
پذیر ہوا۔

ابتدائی دو تین راتوں کو شرکاء کی تعداد توقع کے برخلاف لگ بھگ دو سو
افراد رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۳۰ شعبان المعظم کو گرو مار کے علاقہ گل بہار میں ایک
روڈ ایکسیڈنٹ کے باعث ہنگامہ ہو گیا جس نے دیکھتے دیکھتے ہی ناظم آباد اور لیاقت
آباد کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ان علاقوں میں کرفیو نافذ ہو گیا چنانچہ ناظم آباد
نمبر ۵ کی طرف شہر سے آنے والے اکثر راستے بلاک ہو گئے۔ جن حضرات نے اس سے قبل
بلاک ۵ کی جامع مسجد نہیں دیکھی تھی یا جو شہر سے مسجد تک آنے والے دوسرے طویل
راستوں سے پوری طرح واقف نہیں تھے وہ لوگ مسجد نہ پہنچ سکے اور گھوم گھام کر انہیں

واپس جانا پڑا - البتہ جیسے ہی ۴ر رمضان المبارک سے کرفیو میں نرمی کی گئی اور ۱۶ر رمضان المبارک کو بالکل ختم کردیا گیا، ویسے ہی شرکاء کی تعداد میں اضافہ شروع ہوگیا اور یہ تعداد پونے تین اور تین سو تک پہنچ گئی پابندی سے آنے والوں میں کلفٹن، کورنگی، ڈرگ روڈ کالونی اور ملیر تک سے بعض حضرات شامل تھے - جملہ شرکاء کی کثیر تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل ہوتی تھی - جمعہ اور ہفتہ کی راتوں میں (قمری حساب سے) یہ تعداد چار سوا چار سو تک پہنچ جاتی تھی - ۲۱ر رمضان المبارک سے لیلۃ القدر میں یہ تعداد تقریباً پانچ سو ہو گئی تھی - ۲۶ر رمضان المبارک یعنی اس پروگرام کے اختتام والی شب کو یہ تعداد چھ سو افراد سے بھی متجاوز تھی - خواتین کی تعداد بھی پورے پروگرام میں روزانہ اوسطاً پچاس رہی -

ایک طرف فاران کلب کراچی کے ارباب حل وعقد کی خواہش اور پیش کش تھی کہ دورۂ ترجمہ قرآن کا یہ پروگرام ان کی مسجد میں رکھا جائے جو اسٹیڈیم روڈ پر واقع ہے - انہوں نے اس پروگرام کے لئے مسجد میں بہت سے ضروری انتظامات بھی کرائے تھے - دوسری طرف ناظم آباد (پاپوش نگر) کی جامع مسجد کے منتظمین کی پیش کش تھی کہ یہ پروگرام ان کی مسجد میں رکھا جائے - اس کام کے لئے انہوں نے مسجد کا دوسری منزل کا وسیع وعریض ہال وقف کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا نیز یہ بھی یقین دہانی کرائی تھی کہ نیچے مصلیٰ پر اور گیلریوں وغیرہ میں جو حفاظ تراویح پڑھا رہے ہیں گے جن کی تعداد چھ تھی اُن کے لئے لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کیا جائے گا تاکہ دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام میں جہاں لاؤڈ اسپیکر استعمال ہوگا وہاں کوئی الجھن حائل نہ ہو - جگہ کی وسیع ترین گنجائش اور اعلیٰ پیمانے پر دوسری ضروریات کی فراہمی کے پیش نظر دورۂ ترجمۂ قرآن کے لئے اسی مسجد کا انتخاب عمل میں آیا - ان شاء اللہ فاران کلب کے منتظمین بھی اپنی مخلصانہ پیش کش کے اجر وثواب سے بہرہ مند ہوں گے -

جہاں تک ناظم آباد بلاک ۵ کی جامع مسجد کے جملہ منتظمین اور محترم خطیب وامام مسجد مدظلہ کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات نے پورے پروگرام کے لئے اتنا بھرپور تعاون فرمایا کہ اس کے شکریہ کے لئے موزوں الفاظ ملنے مشکل ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تعاون علی البر کو ان سب حضرات کے لئے مستوجب اجر وثواب قرار فرمائے -

امیرِ محترم جب ۲۹ر شعبان المعظم کو اس پروگرام کے لئے کراچی تشریف لائے تو موصوف کی طبیعت کافی مضمحل تھی حتیٰ کہ ٹمپریچر بھی تھا۔ اس پر مستزاد شدید گرمی ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے دستگیری فرمائی اور ۲۶ر دنوں میں بحمداللہ یہ پروگرام بغیر کسی وقفہ اور رکاوٹ کے تکمیل کو پہنچا۔ شرکاء کا شدید اصرار تھا کہ آئندہ سال کے رمضان المبارک میں بھی یہ پروگرام کراچی ہی میں رکھا جائے۔ تمام ہی شرکاء کا تاثر یہ تھا کہ یہ پروگرام اپنی افادیت کے اعتبار سے منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ ایک طرف پُرجلال کلامِ الٰہی کی معجز نمائی ۔ اور اسکی اپنی انتہائی تاثیر۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے خزانہ فضل سے امیرِ محترم کو اپنی کتاب مبین فرقانِ حمید کا جو فہم ودیعت فرمایا ہے اور پھر اس کی تفہیم و تعلیم کی جو صلاحیت بیان و تبیین کی جو اہلیت اور اسلوب بیان میں جو اثر پذیری عطا فرمائی ہے، ان دونوں کے امتزاج سے پانچ گھنٹوں تک شرکاء جس وجد و عرفان اور جن روحانی و نورانی کیفیات سے سرشار و شادکام رہے، ان کو ضبطِ تحریر میں لانے سے قلم قاصر ہے ۔ امیرِ محترم نے شرکاء کے شوق و اشتیاق اور اصرار پر اس ارادے کا اظہار فرمایا کہ بشرطِ صحت و زندگی اور حالات کی سازگاری وہ ان شاء اللہ آئندہ سال کراچی ہی کو ترجیح دینے کا خیال رکھیں گے۔

اس دورہ ترجمۂ قرآن کی برکات و اثرات کا ایک مظہر یہ بھی سامنے آیا کہ چونؔ بالکل نئے حضرات نے بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف اور ہجرت و جہاد کے لئے بیعت کے فادم پُر کئے ۔ اکثر حضرات نے ۲۶ر رمضان المبارک کو افطار کے بعد امیرِ محترم کے ہاتھ پر مسنون طریقہ سے بیعت بھی کر لی ۔ بقیہ حضرات نے عید الفطر کے بعد "شام الہدیٰ" کراچی کے لئے امیرِ محترم کے ورود مسعود کے موقع پر مسنونہ طریق پر بیعت بھی کر لی ۔ اس طرح چون رفقاء کا کراچی کی تنظیم میں اضافہ ہوا۔
اسی دورۂ ترجمۂ قرآن کے دوران دو حضرات نے انجمن خدام القرآن سندھ۔ کراچی کی تاسیسی رکنیت اختیار کی اور متعدد حضرات نے عام رکنیت قبول کی ۔ بحمداللہ ۳۰ر مئی ۸۶ء کو کراچی میں اس انجمن کی باقاعدہ تاسیس عمل میں آچکی ہے، مجلس منتظمہ بھی تشکیل پاچکی ہے۔ عہدیداران کا بھی تقرر ہو چکا ہے۔ اور

انجمن باقاعدہ رجسٹرڈ بھی ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے مقاصد کی طرف جلد از جلد پیش رفت کی توفیق عطا فرمائے۔

ایک مزید اطلاع یہ نوٹ فرمائیں کہ کراچی کے مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن کی ریکارڈنگ کا الحمد للہ انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے کیسٹ لاہور اور کراچی میں تنظیم اور انجمن کے دفاتر سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ امیر محترم نے سب سے پہلے رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ میں قرآن اکیڈمی لاہور میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز کیا تھا جس کا بحمد اللہ اگلے ہی رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ میں بھی اعادہ ہوا۔ امسال چونکہ اس کام کے لئے امیر محترم نے کراچی کا فیصلہ کیا تھا چنانچہ امسال قرآن اکیڈمی لاہور میں دورۂ ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری محترم حافظ احمد یار مدظلہ نے ادا فرمائی۔ موصوف ایک مستند عالم دین ہیں۔ کئی سالوں تک پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے صدر رہے ہیں۔ موصوف کو تعلیم و تدریس کا نہایت وسیع تجربہ حاصل ہے۔ نیز قرآن حکیم کی تعلیم و تعلّم سے گہرا شغف ہے۔ اسلوب بیان میں جہاں سادگی ہے وہاں گیرائی و گہرائی بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس میں شریک ہونے والے حضرات کا یہ تاثر سامنے آیا ہے کہ محترم حافظ صاحب کے بیان سے لوگ کافی مستفید ہوتے۔ الحمد للہ اس رمضان المبارک میں قرآن اکیڈمی میں حافظ صاحب محترم نے دورۂ ترجمۂ قرآن حکیم مکمل فرمایا۔ معلوم ہوا ہے کہ شرکاء کی تعداد اوسطاً ڈیڑھ سو رہی۔ حافظ صاحب موصوف نے اپنی ضعیفی کے باوصف جس لگن اور ذمہ داری کے ساتھ تفویض کردہ کام انجام دیا ہے۔ اس پر وہ ان شاء اللہ العزیز آخرت میں مستحق اجر و ثواب قرار پائیں گے۔ قرآن اکیڈمی میں صلوٰۃ التراویح کی ذمہ داری عزیزم حافظ عاکف سعید سلمہ کے سپرد تھی۔

تنظیم اسلامی (مرکزی) کے دفاتر اور اجتماع گاہ کے لئے گڑھی شاہو حال علامہ اقبال روڈ لاہور پر تعمیرات کا جو سلسلہ جاری ہے وہ قریباً تین چوتھائی تک رمضان المبارک سے قبل مکمل ہو چکا تھا۔ امیرِ محترم نے فیصلہ فرمایا تھا کہ یہاں اجتماع گاہ میں بھی دورۂ ترجمان القرآن کا انتظام ہو گا اور یہ ذمہ داری موصوف نے محترم بھائی ڈاکٹر عبدالخالق صاحب رفیقِ تنظیم کے سپرد کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ

ڈاکٹر صاحب کو ایسی اہم ذمہ داری تفویض کی گئی تھی ۔ موصوف قرآن اکیڈمی کے دو سالہ تعلیمی کورس سے گزر چکے ہیں ۔ معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے بڑی محنت کے ساتھ اس اہم اور کٹھن ذمہ داری کو ادا کیا ہے ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے کلام پاک اور دینِ متین میں زیادہ سے زیادہ بصیرت اور اس کا زیادہ سے زیادہ فہم عطا فرمائے اور آخرت میں ان کا شمار بھی خادمانِ دینِ متین اور خادمانِ قرآن حکیم میں ہو ۔
یہاں صلوٰۃ التراویح کی ذمہ داری ہمارے رفیق حافظ محمد اشرف نے ادا فرمائی مستقل طور پر شریک ہونے والوں کی تعداد چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ۔

قرآن اکیڈمی اور تنظیم اسلامی کے مرکز گڑھی شاہو میں بھی ۲۶ رمضان المبارک ہی کی شب کو دورۂ ترجمہ قرآن کی بفضلہ تعالیٰ تکمیل ہو گئی تھی ۔ ۲۶ ویں روزے کو دن میں امیر محترم لاہور واپس تشریف لے آئے تھے ۔ چنانچہ ستائیسویں شب کو تراویح کی نماز سے قبل موصوف نے قرآن اکیڈمی میں " رمضان اور پاکستان " کے موضوع پر مختصر خطاب ارشاد فرمایا ۔ بعدۂ اکیڈمی میں ۲۷ سے ۲۹ رمضان المبارک کی تین راتوں میں تراویح میں پورے قرآن مجید کا ختم ہوا ۔

اسکنڈے نیویا کے ملک ناروے کے دارالحکومت اوسلو سے وہاں کے اسلامک سنٹر سے امیر محترم کو دعوتی دورے کی دعوت قریباً آٹھ نو سال قبل ملی تھی ۔ لیکن اس وقت تک امیر محترم نے بیرونِ پاکستان دعوتی دوروں کے متعلق کوئی مثبت فیصلہ نہیں کیا تھا ۔ ہر کام کے لئے اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ایک وقت مقرر ہے ۔ بیرونِ ممالک کے دوروں کی ابتدا شمالی امریکہ سے ہوئی اور ناروے کے دورے کا موقع جون ۱۹۸۶ء میں ملا ۔ اصل دعوت کوپن ہیگن ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن کے اسلامک سنٹر سے آئی تھی اور انہوں ہی نے اسکینڈے نیویا کے دو ملکوں سویڈن اور ناروے کے دارالحکومتوں میں بھی امیر محترم کے دروس قرآن حکیم اور خطابات کا اہتمام کیا تھا ۔ اس دورے میں محترم بھائی قمر سعید صاحب قیم تنظیم اسلامی برائے بیرونِ ممالک امیر محترم کے ہمراہ تھے ۔ انہوں نے دورے کے اہم نکات لکھ لئے تھے جس کی مدد سے ہمارے معاون کار مقبول الرحیم مفتی صاحب نے ایک روداد مرتب کی جو اس شمارہ میں قارئین کرام کی نظر سے گزرے گی ۔ امیر محترم نے ۲۷ جون کے خطاب جمعہ میں اس دورے

کے جو تاثرات بیان فرمائے تھے، وہ بھی اس شمارہ میں شامل ہیں۔

ابوظہبی (امارات) کا دسمبر ۸۵ء کے وسطی عشرہ میں امیرِ محترم کا جو دعوتی دورہ ہوا تھا، اس کی روداد قلم بند کرنے کی ذمہ داری خاکسار کے سپرد تھی۔ روداد کا کافی حصہ ضبطِ تحریر میں آچکا ہے، لیکن اندازہ ہوا کہ اس میں غیر معمولی طوالت ہو گئی ہے۔ اب اس کو دوبارہ لکھنا ایک مشکل کام نظر آ رہا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو وہ آئندہ کسی موقع پر شائع ہو جائے گی۔ ویسے اس دورے کے متعلق امیرِ محترم نے اپنے "تبصرہ و تذکرہ" شائع شدہ میثاق بابت فروری ۸۶ء میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے زیادہ اس دورے کو خراجِ تحسین پیش کرنا راقم کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ امیرِ محترم نے تحریر فرمایا تھا:

"... ابوظہبی میں مجھے ایک نہایت خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا۔ اس لئے کہ میرے آج تک کے بیرونِ پاکستان کے تمام دوران کے دوران جن کا آغاز ۱۹۷۶ء کے سفرِ امریکہ سے ہوا تھا آج تک کہیں کوئی پروگرام اس قدر بھرپور، اتنا پیشگی مرتب شدہ (PRE - PLANNED) اتنا منظم (WELL - ORGANISED) اتنی خوبصورتی اور باقاعدگی کے ساتھ چلایا جانے والا (WELL - CONDUCTED) اور ان سب کے نتیجے میں اتنا کامیاب اور نتیجہ خیز (PRODUCTIVE) نہیں رہا جتنا ابوظہبی کا یہ دس روزہ پروگرام! (اس کے آس پاس اگر کوئی پروگرام آتا ہے تو وہ صرف ۱۹۸۱ء کا ٹورنٹو (کینیڈا) کا پروگرام تھا لیکن وہ بھی بہرحال نمبر دو پر ہے) اس کی وجہ چند نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہمارے موجودہ معیارات کے اعتبار سے 'طبقۂ اعلیٰ' سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی اجتماعی محنت (TEAM WORK) ہے ــ اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو حُسنِ قبول سے سرفراز فرمائے! آمین یا رب العٰلمین ــ"

امیرِ محترم اور بھائی قمر سعید صاحب ۱۳ جولائی ۸۶ء کو شمالی امریکہ کے دورے کے لئے ان شاء اللہ عازمِ سفر ہوں گے۔ پروگرام کی تفاصیل مئی ۸۶ء کے 'میثاق' میں شائع ہو چکی ہیں۔ البتہ اس میں یہ اضافہ ہوا ہے کہ جاتے ہوئے یہ حضرات گرامی تین دن کے لئے ابوظہبی میں قیام فرمائیں گے ــــ واپسی کے موقع پر اگر

سعودی عرب کا حج ویزا مل گیا تو ان شاء اللہ العزیز ۲۲ اگست ۸۶ء کو ان حضرات کی وطن مراجعت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس سفر میں ان کا حامی و ناصر ہو اور اس سفر کو دین مبین کے لئے نافع بنائے۔ آمین۔

"میثاق" کے قارئین کرام خدمت میں ادارہ کی ایک کوتاہی اور فروگذاشت کے ضمن میں معذرت پیش کرنی ہے۔ ہوا یہ کہ ایک طرف مہنگائی اور دوسری طرف 'میثاق' کے صفحات میں پے در پے اضافے نے مجبور کر دیا کہ سالانہ زر معاون میں دس روپے اور فی شمارہ ایک روپے کا اضافہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اپریل سے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا جبکہ اصولاً ہونا یہ چاہیئے تھا کہ اس اضافہ سے قبل یا اس کے ساتھ ہی اپریل کے شمارہ میں اس کا اعلان ہوتا۔ یہ بات نظر انداز ہو گئی اور مئی و جون کے شمارے میں بھی اس کا تذکرہ نہ ہو سکا۔ ادارہ کی جانب سے اس کوتاہی پر دلی معذرت پیش ہے۔

تذکرہ و تبصرہ

امیر تنظیمِ اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے وسط جون میں بعض احباب کی دعوت پر سکینڈے نیویّن ممالک کا ایک مختصر دورہ کیا تھا۔ اس دس روزہ دورے سے واپسی پر جمعہ ۲۷ جون کو دارالسلام میں محترم ڈاکٹر صاحب نے دورہ کے جو تاثرات بیان فرمائے اُن کی ایک تلخیص ہمارے معاونِ کار مفتی مقبول الرحیم نے مرتب کی ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔ (ادارہ)

میں اُصولاً اس بات کا قائل ہوں کہ دعوتِ دین کے ضمن میں ہر مسلمان کا دائرۂ کار اُس کا اپنا ملک ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اُسے پیدا کیا ہے۔ جس طرح کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ اسکی موت کہاں واقع ہو گی اسی طرح اپنی پیدائش میں بھی کسی کے اختیار اور ارادے کو کوئی دخل نہیں، گویا یہ خالصتاً اللہ کا فعل ہے۔ پھر تبلیغ و ابلاغ کے اعتبار سے یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ انسان اپنے احساسات و جذبات کا اظہار جس انداز سے اپنی مادری زبان میں کر سکتا ہے وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں، خواہ انسان اس کا کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ بن جائے۔ اس لئے بیرونی ممالک میں جا کر تبلیغ کرنا میرے پروگرام اور لائحہ عمل کا کوئی مستقل حصہ ہے ہی نہیں۔ اور نہ ہی کبھی میں نے اپنے بیرونی دوروں کے لئے تبلیغی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میرا اصل دائرۂ کار یہی مملکتِ خداداد پاکستان ہے۔

۱۹۷۹ء میں بعض اسباب کی بناء پر امریکہ جانے کا اتفاق ہوا اور پھر وہاں کے احباب سے ایسے تعلقات استوار ہوئے کہ آئندہ اُن کی دعوت کو رد کرنا میرے لئے ممکن نہ رہا۔ مزید یہ کہ وہاں باصلاحیت پاکستانیوں کی اتنی بڑی تعداد موجود ہے کہ انہیں

RE-CLAIM کرنے کے لئے دین کی طرف اور پاکستان کی طرف بلانے کے لئے جانا مفید سمجھا ہے۔ امریکہ میں اپنے ہم وطنوں کی اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں قحط الرجال کیوں ہے! ڈالر کی کشش میں اتنے بڑے پیمانے پر BRAIN DRAIN ہوا ہے کہ ہم افرادی قوت کے بحران میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ امریکہ آتے جاتے ہوئے چند روز کے لئے لندن میں رکنے کا اتفاق تو ہوتا رہا لیکن یورپ جانے کا یا رکنے کا موقع کبھی نہیں آیا تھا۔ چونکہ سکنڈے نیوین ممالک کے بارے میں بہت کچھ سننے میں آتا رہتا تھا۔ اس لئے جب وہاں کے دورے کی دعوت ملی تو ان سنی ہوئی باتوں کی براہ راست تحقیق، توثیق یا تردید کی نیت سے میں نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔

اس سفر کے تاثرات بیان کرنے سے پہلے ان ممالک کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں بھی عرض کر دوں۔ ڈنمارک کی تہذیب دنیا کی چند قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ یہاں بادشاہت کا سلسلہ دو ہزار برس سے ایک ہی خاندان میں چلا آرہا ہے۔ اس وقت ایک ملکہ سربراہ مملکت ہے۔ لیکن جاپان کے بادشاہ اور برطانیہ کی ملکہ کی طرح ڈنمارک کی ملکہ کی حیثیت بھی علامتی اور روایتی ہے۔ ملک کے معاملات میں انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ڈنمارک کے ساتھ ایک سمندری پٹی کو عبور کر کے آباد دنیا کے انتہائی شمال میں سویڈن اور ناروے واقع ہیں۔ ناروے ہی میں وہ مشہور مقام بھی ہے جہاں آدھی رات کا سورج (MIDNIGHT SUN) نظر آتا ہے اور لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آتے ہیں۔ ناروے سے آگے اگر ہم مزید شمال میں بڑھتے جائیں تو قطب شمالی کے وہ غیر آباد اور سرد ترین علاقے آتے ہیں جہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے۔ تینوں ممالک آبادی کے لحاظ سے بہت چھوٹے ہیں۔ ان کی آبادیوں کا شمار کروڑوں میں نہیں لاکھوں میں ہوتا ہے۔ ڈنمارک کا رقبہ زیادہ نہیں لیکن کم و بیش سارا علاقہ آباد ہے۔ سویڈن اور ناروے کا رقبہ بہت زیادہ ہے ایک لمبی پٹی ہے جو قطب شمالی تک چلی گئی ہے لیکن بہت سا علاقہ غیر آباد ہے۔ ان ممالک میں بسنے والے مسلمانوں میں اکثریت پاکستانیوں کی ہے۔ یہ لوگ بالعموم ۱۹۷۰ء کے زمانے میں وہاں گئے تھے جب باہر سے آنے والوں پر وہ پابندیاں نہیں تھیں جو اب ہیں۔ زیادہ تر پاکستانیوں کا تعلق ضلع گجرات سے ہے۔ پاکستانیوں کے بعد ترکوں کا نمبر آتا ہے۔ جن کی اکثریت

تو جرمنی میں آباد ہے لیکن چونکہ ڈنمارک جرمنی کا ہمسایہ ہے اور تہذیبی اعتبار سے بھی جرمن تہذیب ہی کا حصّہ ہے اس لئے ترک تارکین وطن کی اچھی خاصی تعداد سکنڈے نیوین ممالک اور بالخصوص ڈنمارک میں آباد ہے۔ عرب اکا دُکا نظر آتے ہیں۔ لیکن اُن کا تعلق اکثر و بیشتر عرب سفارت خانوں سے ہوتا ہے۔ بہرحال ان ممالک میں مسلمان تارکین وطن کی مجموعی تعداد کا اندازہ بھی ہزاروں میں ہی ہے۔ کسی ملک میں آٹھ ہزار کسی میں بارہ ہزار چودہ ہزار۔ ان اعداد و شمار اور پس منظر سے آپکے ذہنوں میں وہ بنیادی خاکہ (FRAME OF REFERENCE) تیار ہو گیا ہے جس کے مطابق میں اپنے تاثرات بیان کروں گا۔

میرا سب سے پہلا تاثر یہ تھا کہ قدرت نے اس علاقے کو جن نعمتوں سے نوازا ہے ان کا تصور بھی اس سے پہلے ذہن میں نہیں تھا۔ یہ علاقے انتہائی سرسبز و شاداب ہیں۔ سویڈن کے ساحلی شہر ہنسبرگ سے سٹاک ہام تک تقریباً سات سو کلو میٹر کا سفر بذریعہ کار طے کرنے کا موقع ملا۔ بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ کہیں ایک انچ زمین بھی ننگی نظر نہیں آئی۔ دونوں طرف سمندر ہے پھر جگہ جگہ جھیلیں ہیں۔ پانی اور زرخیز زمین کے اعتبار سے اللہ کی عطا و عنایت کی انتہا نظر آتی ہے۔ یا کھیت نظر آتے ہیں یا جنگلات ہوائی جہاز سے دیکھئے تو سمندر اور سرسبزی کے درمیان صرف ایک لکیر دکھائی دیتی ہے کہیں ریت یا سفید زمین نظر نہیں آتی جو عام ساحلی علاقوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس نظارے کو دیکھ کر فوراً ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اللہ نے اپنی مادی نعمتوں کیلئے تو اس علاقے کو چنا اور اپنی رُوحانی نعمت یعنی ہدایت کے لئے اُس علاقے کو چنا جو "وادٍ غیر ذی ذرع" ہے۔ اب کروڑوں روپے خرچ کر کے وہاں کچھ سبزہ اُگانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ بھی دس پندرہ سال کی بات ہے۔ تیل بھی اس علاقے سے نہیں نکلتا، عرب کے مشرقی ساحل سے نکلتا ہے۔ یہ اللہ کی اپنی حکمتیں ہیں اور وہی ان کو بہتر جانتا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم میں بھی اہل ایمان کے لئے قناعت کا درس ہے کہ جنہیں ہدایت ملی ہے وہ دنیوی وسائل سے اپنی محرومی پر قانع ہو جائیں۔ زمین کے خطوں میں وسائل کی تقسیم سے بھی یہ نظر آ رہا ہے کہ جسے دیتے ہیں اُسے یہ نہیں دیتے۔ حضرت علی کا اسی مضمون کا ایک شعر ہے کہ ؎

رضینا قسمة الجبار فینا   لنا علم وللجہال مال

(ہم اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے ہمیں علم دیا اور جاہلوں کو مال)

دوسرا اور اہم تر تاثر یہ ہے کہ قدرت کی عنایت کے ساتھ خود انسان کی کوششوں کے نتائج بھی ان ممالک میں اپنے عروج پر ہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں نہ صرف وسائلِ معاش اور اسبابِ ضرورت کی فراوانی بلکہ اسبابِ تعیش کی فراوانی یہ پہلو تو بقیہ یورپ، امریکہ اور برطانیہ میں بھی ملے گا سکنڈے نیوین ممالک کے حوالے سے جس چیز کی اہمیت ہے وہ ہے انسانوں کا اپنا بنایا ہوا اجتماعی نظام۔ اس کے بھی دو پہلو ہیں ایک معاشی دوسرا سیاسی۔ ان دونوں کے اعتبارات سے واقعتاً محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے باوجود اور ہدایتِ آسمانی سے محرومی کے باوجود اُس جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں اسلام ہمیں پہنچانا چاہتا ہے۔ جبکہ ہمارے کسی ملک کا رُخ بھی اُدھر نہیں ہے۔ کوئی طبقاتی تقسیم نہیں ہے۔ وزیرِ خزانہ بھی اپنا چیک کیش کروانے کے لئے لائن میں کھڑا ہوتا ہے۔ حکومت کے کسی عہدیدار کے لئے کوئی سرکاری قیام گاہ ہے ہی نہیں۔ نہ کوٹھیاں ہیں نہ پہرے ہیں نہ ہٹو بچو ہے۔ اقتدار میں آنے سے پہلے اپنے جن گھروں میں وہ رہتے تھے اقتدار میں آنے کے بعد بھی وہیں اور اقتدار سے ہٹنے کے بعد بھی وہیں رہتے ہیں۔ کسی کے وزیر ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ڈنمارک میں جس شے کا نام ملکہ ہے اُس کے ملکہ ہونے کے صرف دو مظاہر ہیں کہ ایک یہ کہ اُس کے پاس اپنی خصوصی کشتی ہے اور دوسرے یہ کہ ملک کے صرف ایک ہسپتال میں اُس کے لئے ایک کمرہ مخصوص ہے۔ برطانیہ کی طرح یہاں شاہی شان و شوکت کا کوئی اہتمام نہیں۔ جو سہولتیں اور جو حقوق کسی عام شہری کو کسی فیکٹری ورکر کو حاصل ہیں وہی وزیرِ اعظم کو حاصل ہیں۔ حکمرانوں کے بچے بھی عام بچوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کسی مراعات یافتہ طبقے کا کوئی وجود نہیں۔ انسانی مساوات کے وہ نمونے جو ہمارے اسلاف میں پائے جاتے تھے جن کا تصور اسلام نے دیا تھا، جنہیں ہم تقریروں میں بیان کرتے ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ کہانیاں بیان ہو رہی ہیں وہاں عملاً دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے

نوجوان اُنہیں دیکھ کر متاثر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ حقیقی اسلام تو یہاں ہے سیاسی اور سماجی مساوات اور انصاف کا جو نظام انہوں نے قائم کر رکھا ہے وہ انتہائی متاثر اور مرعوب کرنے والا ہے۔ اس کے ساتھ معاشی میدان میں بھی اُن کی کامیابی حیران کن ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی ساری آزادیاں ساری خوبیاں موجود ہیں اُس کے ساتھ ہی کسی انسان کے بھوکا مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کام کرنے والے کی تنخواہ اور کام نہ کرنے والے کے بیروزگاری الاؤنس میں بہت معمولی سا فرق ہے۔ حضرت عمرؓ کے مشہور قول کہ "فرات کے کنارے ایک کتا بھی پیاسا مر جائے تو اُس کا ذمہ دار عمرؓ ہوگا" کی عملی تفسیر اور تصویر وہاں نظر آتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور کیمونزم کی خوبیوں کا حسین امتزاج انہوں نے ممکن کر دکھایا ہے۔ انسان چار و ناچار اُسی طرف جا رہا ہے جہاں اسلام اُسے پہنچانا چاہتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کی بہت خوبصورت تعبیر کی ہے۔ ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو	زانکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست	یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

(اس جہانِ رنگ و بو کی خاک میں جہاں بھی آرزو پیدا ہو رہی ہے وہ یا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ ہدایت کا نتیجہ ہے۔ یا اُس نورِ ہدایت کی تلاش میں ہے)

اُن کا نظام کیا ہے؟ آزاد معیشت ہے کام کرنے کی کمانے کی آزادی ہے۔ ٹیکس کی شرح بہت بھاری ہے لیکن لوگ خوش دلی سے ادا کرتے ہیں کیونکہ اُن سے جو نظام چل رہا ہے اُس کے فوائد اُن تک پہنچتے ہیں۔ آپ بیمار پڑ جائیں، بیکار ہو جائیں۔ آپ کے علاج کا، بچوں کی تعلیم کا، اخراجات کا مکمل انتظام حکومت کی طرف سے بالکل مساویانہ سطح پر موجود ہے۔ یعنی ایک فلاحی مملکت میں کفالتِ عامہ کا بہترین نظام عملاً چل رہا ہے۔ کوئی کیمونسٹ حکومت ساری آزادیاں سلب کرنے کے باوجود اور تمام ذرائع و وسائل پر اختیار حاصل کرنے کے باوجود ایسا نظام قائم نہیں کر سکی۔ تمام تر آزادیوں کے ساتھ کفالتِ عامہ کا جو نظام انہوں نے ممکن کر دکھایا ہے وہ اگر کہیں ہے تو اسلام میں ہے لیکن ہم جب کہتے ہیں تو وہ ایک نظری بات ہوتی ہے۔

کیونکہ دُنیا میں مسلمانوں کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کی مثال ہم پیش کر سکیں کہ یہ نمونہ موجود ہے۔ اس نمونے کو پیش کرنے کے لئے تو بقول قائداعظم پاکستان ہم نے حاصل کیا تھا۔ کہ "ہم پاکستان کی شکل میں اسلام کے اصول حریت و اخوت و مساوات کا اس جدید دُنیا کے سامنے ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں" لیکن افسوس کہ چالیس برس ہم نے ضائع کر دیئے۔ ہمارے ہاں تو انتشار ہے ظلم ہے طبقاتی تقسیم ہے استحصال ہے سماجی اونچ نیچ ہے۔ کون سی سماجی اور معاشی بُرائی ہے جو ہمارے موجود نہیں ہے۔ رشوت، بددیانتی، چور بازاری اور سمگلنگ وغیرہ تو اضافی چیزیں ہیں۔

ان ممالک کی تصویر کے اس روشن رُخ ساتھ تصویر کا تاریک بلکہ تاریک ترین پہلو وہ جنسی آزادی ہے جس نے اُن کی خاندانی زندگی اور اخلاقی اقدار کا جنازہ نکال دیا ہے۔ جنسی اعتبار سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہا۔ در اصل ایک صدی قبل فرانس سے اس مادر پدر آزادی کی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ ایسا ادب لکھا گیا جس کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ جس طرح حیوانوں میں رشتوں کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ اس طرح انسانوں میں بھی نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ انسان بھی ایک حیوان ہے۔ اس چیز کو رہنما اصول مان کر ادیبوں نے کتابیں لکھیں کہ ظالم سماج نے خواہ مخواہ کی پابندیاں اور رکاوٹیں عائد کر رکھی ہیں۔ عورت عورت ہے کوئی ہو مرد مرد ہے کوئی ہو۔ عریانی فحاشی، بے حیائی کو نکتہ عروج پر دیکھنا ہو تو ان ممالک میں بھی دیکھیئے۔

امریکہ میں بھی وہ آزادی نہیں ملے گی جو یہاں ہے۔ موسم گرما میں ساحلوں پر میلوں تک ننگے جسموں کا ایک نظارہ ملتا ہے۔ صرف ایک مختصر سا جانگیا اور اوپر کچھ نہیں۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ ستر و حیا کا کوئی تصور ہے ہی نہیں۔ حیوانات میں بھی شرم و حیا کا مادہ پایا جاتا ہے۔ صرف سور ایک ایسا حیوان ہے جس میں قطعاً شرم و حیا کا کوئی احساس نہیں پایا جاتا اور وہی یہاں خوراک کا جزو اعظم ہے اور یہی وجہ ہے کہ جنسی اعتبار سے بھی انسان یہاں بالکل سور کا ہم پلہ ہے۔ یہی حکمت ہے کہ قرآن نے چار مقامات پر جن چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اُن میں صرف سور ہی ایک ایسا جانور ہے جس کا نام لے کر اُس کے گوشت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ باقی تین چیزیں مردار، خون اور ایسا جانور جسے غیر اللہ کے نام پہ ذبح کیا گیا ہو ہیں۔ ان ممالک

میں خاندانی نظام شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے لیکن دو مردوں کی باہمی شادی اور
دو عورتوں کی شادی قانونی طور پر جائز قرار دی گئی ہے۔ اگر کوئی مرد اور عورت بغیر شادی کے اکٹھے رہتے
ہیں تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں بلکہ اگر وہ حکومت کو یہ اطلاع دے دیں کہ ہم
اکٹھے رہ رہے ہیں تو اُنہیں قانونی طور پر وہ تمام مراعات اور سہولتیں ملیں گی جو ایک
باقاعدہ شادی شدہ جوڑے کو ملتی ہیں۔ یہ ہے وہ تضاد اور پستی کی انتہا جو ان
ممالک میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ آسمانی ہدایت سے دامن وابستہ
نہیں ہے۔ شریعت پر ایمان اور عمل ہوتا تو ہر چیز اپنی جگہ ٹھیک ہوتی۔ معاشرہ
پاک صاف ہوتا۔ بیوی بیوی ہوتی، بہن بہن ہوتی، بیٹی بیٹی ہوتی صرف عورت نہ ہوتی۔
باپ باپ ہوتا، شوہر شوہر ہوتا۔ بیٹا بیٹا ہوتا صرف ایک مرد نہ ہوتا۔

یہاں اپنی بدبختی پر بھی غور کر لیجئے۔ اُن کی اِن برائیوں کو اختیار کرنے کے راستے
پر ہم کس تیزی سے سفر کر رہے ہیں۔ خواتین کی آزادی اور مساوات کی تحریکیں
چل رہی ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ بیگمات تمام اخلاقی اقدار اور سماجی بندھنوں کو
پامال کر کے کھُل کھیلنا چاہتی ہیں۔ ان تحریکوں کو فکری غذا اور رہنمائی وہیں سے
مل رہی ہے۔ لیکن وہاں جو چیزیں اچھی ہیں جو ہبلو خیر کے ہیں اُن کی طرف پیش
قدمی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ معاشی استحصال کا خاتمہ اور کفالت عامہ کے اصول
کا اطلاق تو بہت دور کی بات ہے ہم سماجی سطح پر بھی کوئی اصلاح کرنے اور مساوات
کی طرف قدم بڑھانے کو تیار نہیں ہیں۔ سید زادہ خواہ شرابی ہو یا زانی وہ اونچا ہی
رہے گا۔ مصلی، نائی، موچی کتنا ہی نیک پارسا اور متقی ہو وہ نیچ اور گھٹیا ہی رہیگا۔
سیاسی طور پر بھی ہم حاکموں اور محکوموں کی تقسیم کو ختم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہاں
وزیر اعظم اولف پالمے ایک عام آدمی کی طرح بازار میں چلتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔
اس کے ساتھ محافظوں کا کوئی لاؤ لشکر اور ہٹو بچو کا کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ چہ نسبت
خاک را با عالم پاک۔ لیکن سوچئے یہ تصور آیا کہاں سے۔ خلفاء راشدین میں سے کس نے
اپنے لئے باڈی گارڈ رکھے یا امتناعی نظر بندی کے قوانین بنائے۔ جو چیزیں کبھی ہمارا
طرۂ امتیاز تھیں اُنہیں غیروں کے ہاں دیکھ کر ان کامیابیوں پر جتنا رشک آتا ہے۔
اس سے زیادہ اپنی محرومیوں کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ہم ہی تو تھے ہمارے اسلاف

نے ہی چودہ سو سال پہلے ان سب چیزوں پر عمل کر کے دکھایا تھا۔
وہاں اس سے بھی زیادہ عبرت ناک اور قابلِ افسوس کیفیت ان پاکستانیوں کی ہے جنہیں ہم تارکینِ وطن کہتے ہیں۔ شروع میں دو تین روز تو وہ وہاں کے نظام کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ جنت ارضی میں رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ کھلتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کس جہنم میں رہ رہے ہیں۔ اُن کی نئی نسلیں اُن کی آنکھوں کے سامنے برباد ہو رہی ہیں لیکن دولت اور آرام کے لالچ نے انہیں اندھا کر دیا ہے۔ صرف ایک شہر اوسلو میں چار سو پاکستانی عورتیں اپنے شوہروں سے طلاق لے چکی ہیں۔ حکومت نے انہیں پولیس کے پہرے میں علیحدہ رہائش مہیا کر رکھی ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے کہ ہمیں اپنے شوہروں سے خطرہ ہے، ان کی بیویاں، لڑکے اور لڑکیاں بالکل وہاں کے معاشرے کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ میں صرف ایک واقعہ عرض کر دوں اس سے آپ ماحول کی زہرناکی کا اندازہ کر لیجئے کوپن ہیگن کے اسلامی مرکز میں جمعہ پڑھانے کے بعد میں روانہ ہو رہا تھا کہ ایک پاکستانی آیا اور کہنے لگا کہ چند منٹ میری بات سن لیجئے۔ میں نے کہا بھائی میں نے فلائٹ پکڑنی ہے۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں آنسو اُتر آئے۔ میں نے کہا بتائیے کیا مسئلہ ہے۔ کہنے لگا میرے چھ بچے ہیں بیوی ہے۔ میری بیوی بہت عرصہ پہلے میری عزت کا سودا کر چکی۔ اب پھر وہ یہاں مجھ سے الگ ایک پاکستانی کے ساتھ رہ رہی ہے۔ ایک بار میرا خون جوش میں آگیا تو میں نے اُسے تھپڑ مار دیا میری دو جوان بیٹیوں نے جن کی عمریں سترہ اور اُنیس برس ہیں دونوں نے مل کر ڈنڈوں سے میری پٹائی کی۔ میری جوان بیٹیاں میری آنکھوں کے سامنے سب کچھ کرتی ہیں لیکن میں انہیں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یعنی بالکل لغوی اعتبار سے مادر پدر آزادی ہے مسئلہ وہ یہ پوچھ رہا تھا کہ میں حج پر جا رہا ہوں۔ تو اس بیوی اور اس اولاد کا خرچہ میرے ذمے ہے یا نہیں۔ اس کی سادہ لوحی پر میں نے ماتھا پیٹ لیا۔ مسئلے اور اُس کے حل کو چھوڑیئے ذرا اُس نقشے پر غور کیجیے جو اس واقعے سے سامنے آتا ہے اور یہ ایک آدمی کا قصہ نہیں ہے۔ کتنے ہی خاندان اس طرح ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔ مجھے تو جہاں موقع ملا میں نے اُنہیں یہی کہا کہ واپس آؤ۔ اس جہنم سے نکلو۔ اس بات پہ وہ بہ

کی بدنظمی رشوت اور دیگر معاشرتی برائیوں کا رونا روتے ہیں۔ حالانکہ اُن کا فرض ہے کہ جس خیر کو اور بھلائی کو انہوں نے وہاں دیکھا ہے اُسے اپنے ملک میں جاری کرنے کے لئے یہاں آکر جدوجہد کریں۔ وہاں بیٹھے رہنا تو فراریت ہے۔ میں نے اُنہیں اور کیا کیا کہا وہ تو ایک طویل داستان ہے۔ آخر میں ایک ناخوشگوار واقعہ کا ذکر بھی سن لیجئے۔ جس کی خبر آپ اخبار میں یہاں بھی پڑھ چکے ہیں۔ دراصل سویڈن میں پیپلز پارٹی کے وہ سارے جلاوطن عناصر سیاسی پناہ لئے ہوتے ہیں جنہیں طیارے کے اغواء کے نتیجے میں جیلوں سے رہائی ملی تھی۔ اُن لوگوں نے اُس ہال کے باہر مظاہرے کا اہتمام کیا تھا۔ جہاں میں نے درس قرآن دیا۔ اُنہوں نے صرف مظاہرہ ہی نہیں کیا افواہیں بھی پھیلائیں۔ کسی کو کہا کہ لندن میں ڈاکٹر اسرار احمد پر دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ تو دوسرے جہان میں پہنچ چکا۔ کسی کو کہا کہ ہم وہاں ہنگامہ کریں گے۔ جسے جان عزیز ہے وہ درس سننے نہ جائے۔ ان حرکتوں نے حاضری کو خاصا متاثر کیا۔ لیکن اُنہیں ہال کے قریب آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ہال سے کافی فاصلے پر چند عورتیں اور چند مرد ایک بینر لئے کھڑے تھے اور واپس واپس جاؤ کے نعرے لگا رہے تھے۔ وہاں کے اخبارات نے اس مظاہرے کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا۔ اس مظاہرے کے دو ہی روز بعد اوسلو میں میں نے چوہدری عبدالحمید صاحب کا وہ مضمون دیکھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ میں مسجد دارالسلام میں پیپلز پارٹی شو منعقد کرتا ہوں۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ ہم افراط و تفریط سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتے۔ چوہدری صاحب میرے بزرگ ہیں میں ان کا احترام کرتا ہوں لیکن میرا معاملہ تو وہی ہے کہ بقول اقبال ؂

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

میں گذشتہ بیس برس سے فہم قرآن کے جس مشن میں لگا ہوا ہوں اُس سے چوہدری صاحب اور دیگر احباب واقف ہیں۔ اگر میں نے یہ کہہ دیا ہے کہ ملک کو انتشار کے حوالے کرنے سے بہتر ہے کہ درمیانی مدت کے انتخاب کرا لئے جائیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں پیپلز پارٹی کا گرویدہ ہو گیا ہوں۔ ان کی خرابیاں اپنی جگہ ہیں۔ باقی نہ یہ میرا مطالبہ

ہے کہ مڈٹرم الیکشن ضرور کروائے جائیں ۔ ہمیں نے انتخاب میں حصّہ لینا ہے ۔ ہمیں تو صرف "الدین النصیحہ" کا فریضہ ادا کرتے ہوئے مشورۃً ایک بار عرض کی تھی لیکن ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

واٰخر دعوانا عن الحمد للہ رب العالمین ۰

بیرونِ پاکستان کیلئے میثاق کے سالانہ زرِتعاون کی نئی شرح

ہمیں افسوس ہے یکم جولائی ۱۹۷۶ء سے بیرونِ پاکستان ڈاک کی شرح میں اچانک اضافے کے باعث ہمیں بیرونِ پاکستان کے لئے میثاق کے سالانہ زرِتعاون میں اضافہ کرنا پڑا ہے ۔ ہمیں توقع ہے کہ قارئین اس اضافے کو ناگزیر سمجھتے ہوئے خوشدلی سے قبول فرمائیں گے ۔ آئندہ سے مختلف ممالک کے لئے سالانہ زرِتعاون کی شرح حسبِ ذیل ہوگی اور اس کا اطلاق یکم جولائی سے ہو جائے گا ۔

★ الجزائر، مصر، بنگلہ دیش ۔ عراق، ایران، ترکی، اومان، اردن، شام	۶۰۔ امریکی ڈالر
★ سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات	۲۵ سعودی ریال یا ۲۵ درہم امارات
★ یورپ، انگلستان، افریقہ، جاپان	۹ امریکی ڈالر
★ شمالی جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۔ نیوزی لینڈ	۱۲ ″ ″

(نشست ۳۳)

الہدیٰ

تعمیر سیرت کی اساسات اور قرآن کا انسان مطلوب

سورۂ مومنون اور سورۂ معارج کی روشنی میں

(مباحث عمل صالح)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۱)

السلام علیکم ۔ نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ۔ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٭

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

صدق اللہ العظیم !!

"کامیاب اور بامراد ہوگئے اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع سے کام لیتے ہیں اور جو بیکار اور بے مقصد باتوں سے احتراز کرتے ہیں اور جو تزکیہ نفس پر مسلسل کاربند رہتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں یعنی اپنی شہوت کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں یا باندیوں

کے۔ لہٰذا ان کے اس معاملے میں ان پر کوئی ملامت نہیں ہے لیکن جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا تو وہی حد سے بڑھ جانے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی پابندی کرتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو وارث بنیں گے۔ جنہیں جنت الفردوس کی وراثت ملے گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"

محترم حاضرین اور معزز ناظرین!

یہ سورۂ مومنون کی ابتدائی گیارہ آیات ہیں، جن پر ہمارے اس منتخب نصاب کا دسواں سبق مشتمل ہے۔ اسی سبق سے اس منتخب نصاب کے تیسرے حصے کا بھی آغاز ہوتا ہے اور یہ حصہ قرآن حکیم کے چند ایسے منتخب مقامات پر مشتمل ہے جن میں اعمال صالحہ کی کسی قدر تفصیل بیان ہوئی ہے۔ یعنی انسانی زندگی کے عملی اور اخلاقی پہلو۔ اگرچہ اس سے قبل اس سلسلہ درس میں جتنے بھی دروس ہوئے ہیں ان میں ہر ایک میں بلا استثنیٰ ایمان کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے عملی اور اخلاقی پہلوؤں کا بھی ذکر ملا ہے۔ ایمان کے عملی تقاضے، ایمان کے عملی لوازم، ایمان کے عملی اور اخلاقی نتائج، یہ قریباً تمام اسباق میں ہمارے سامنے آتے رہے ہیں لیکن اس حصے میں بنیادی طور پر ہماری توجہ مرتکز اور Focussed رہے گی۔ اعمال صالحہ ہی کی بحث پر ـــــ اور اس میں جو تدریج پیشِ نظر ہے اسے آپ پہلے ہی ذہن نشین فرما لیں۔ وہ یہ کہ سب سے پہلے ہم ایک فرد، ایک شخص، ایک انسان کی سیرت و کردار میں جو اوصاف مطلوب ہیں، ان کے اعتبار سے قرآن مجید کے بعض مقامات کا مطالعہ کریں گے۔ گویا کہ ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ قرآن کا انسانِ مطلوب کیسا ہوتا ہے! جس کی نقشہ کشی علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں "مردِ مومن" کے حوالے سے کی ہے۔ اس کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں! اس کی سیرت و کردار میں کون سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں! پھر بحث ہمارے اس سلسلہ سبق میں دو سطحوں پر آئے گی۔ ایک تو یہ کہ تعمیرِ سیرت کے لئے اساسات کون سی ہیں! وہ بنیادیں کون سی ہیں کہ جن پر ایک اعلیٰ سیرت و کردار کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر عمارت کی ایک بنیاد ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر وہ عمارت اٹھتی ہے اور اسی بنیاد کے مستحکم ہونے پر اس عمارت کے استحکام کا دارومدار ہوتا ہے۔ لہٰذا تعمیرِ ذات یا تعمیرِ سیرت یا اگر علامہ اقبال کی اصطلاح مستعار لی جائے تو تعمیرِ خودی کے لئے قرآن مجید کیا لائحۂ عمل پیش کرتا ہے اور اس کی اساسات کیا ہیں! اس کی بنیادیں کون سی ہیں! پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ جب ان بنیادوں پر ایک انسانی شخصیت کی تمام و کمال تعمیر ہو جاتی ہے۔ تو اس کے امتیازی خدوخال

کیا ہوتے ہیں! اس میں جو حسن اور جو دلکشی پیدا ہوتی ہے وہ کن اوصاف کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ مجھے علامہ اقبال کا اس موقع پر یہ شعر یاد آ رہا ہے کہ ؎

حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن
کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن!

تو مومن کی شخصیت کی جو دل آویزی ہے وہ کون کون سی خصوصیات اور اس کے کون کون سے اوصاف پر مبنی ہے! ـــــ

پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ جب ایک فرد سے ہم آگے بڑھتے ہیں تو ایک خاندان وجود میں آتا ہے تو خاندان اور عائلی زندگی کے سلسلہ میں قرآن مجید ہمیں کیا رہنمائی دیتا ہے! اس کی عملی تشکیل کے لئے کیا اصول دیتا ہے! ایک اچھا خاندان قرآن مجید کے نزدیک کون سا ہے! اس کے خصائص و اوصاف کیا ہیں!

اس سے ہم جب آگے بڑھیں گے تو دیکھیں گے کہ خاندانوں کے مجموعے سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے اس انسانی معاشرے میں کن اقدار و اوصاف کو قرآن مجید چاہتا ہے کہ وہ نافذ ہوں، رائج ہوں! قرآن مجید کو کن values کی ترویج ایک معاشرے میں عملاً مطلوب ہے! اور وہ کون سی سماجی خرابیاں اور برائیاں (Social Evils) از روئے قرآن ہیں کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ انسانی معاشرے سے دور رہیں، ان کا استحصال کیا جائے ـــــ پھر اس عملِ صالح کی بحث کی بلند ترین سطح یہ ہوگی کہ ملت و ریاست کی سطح پر، حکومت اور نظامِ حکومت کی سطح پر قرآن مجید ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے! تو ہمارا آج کا سبق اس سلسلہ کا پہلا سبق ہے اور اس میں اصل میں وہ اساسات بیان ہوئی ہیں، وہ بنیادیں معیّن کی گئی ہیں کہ جن پر ایک مردِ مومن کی شخصیت کی تعمیر ہو سکتی ہے ـــ انسانی سیرت و کردار کی پختگی کے لئے جو لوازم ہیں، ان کا تعیّن کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کا وہ شعر آپ کے ذہن میں ہوگا کہ ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو ۔۔۔ پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

لہٰذا یہ پختگی ـ یہ انسانی سیرت و کردار کا مستحکم ہو جانا، اس کے لئے کون سی محنت ضروری ہے! کونسی مشقت اور ریاضت ہے کہ جس کی طرف قرآن مجید رہنمائی کرتا ہے!

اب آپ نوٹ کیجئے کہ آپ نے آغاز میں سورۂ مومنون کی جو ابتدائی گیارہ آیات

سماعت فرمائیں اور ان کا ترجمہ بھی سنا تو اس میں چند اوصاف سلسلہ وار بیان ہوئے ہیں۔ اہم ترین وصف ہے صلوٰۃ ـــــ جس کا ترجمہ ہم عام طور پر "نماز" کرتے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ اوصاف کی اس فہرست میں آغاز بھی نماز سے ہوا، اختتام بھی نماز پر ہوا: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ "کامیاب ہو گئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع سے کام لیتے ہیں۔" پھر چند اوصاف بیان کرنے کے بعد آخری وصف بیان ہوا: وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ "اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ انہیں ضائع نہیں ہونے دیتے" ـــــــــــــــــــ ـــــــ معلوم ہوا کہ اس فہرست میں اوّل بھی نماز ہے، آخر بھی نماز ہے۔ اس سے یہ خصوصی رہنمائی حاصل ہوئی کہ تعمیرِ سیرت کا جو قرآنی پروگرام ہے، اس کا جو لائحہ عمل ہے، اس میں نہایت اہمیت کا حامل نماز کا پروگرام اور نماز کا نظام ہے۔

دوسرا وصف آتا ہے اعراض عَنِ اللَّغْوِ ـ "بے کار باتوں سے احتراز کرنا، بچنا، دامن بچائے رکھنا، اپنے وقت کی قدر و قیمت کا احساس رہے اور انسان ہر ہر لمحہ کو مفید بنائے۔ با مقصد بنائے، نتیجہ خیز بنائے۔ انسان کا وقت یا تو اس حیاتِ دنیوی کی کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے صرف ہو رہا ہو اور یا اپنی حیاتِ معنوی کی تعمیر اور اس کے تزکیہ کے لیے صرف ہو رہا ہو۔ یا حیاتِ اخروی کے لئے کچھ کمانے اور بنانے میں صرف ہو رہا ہو۔ ان کاموں کے سوا وقت کا صَرف ضیاع بھی ہے اور زیاں بھی ـــ

تیسرا وصف آتا ہے: وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝ "وہ لوگ جو زکوٰۃ پر عمل کرتے رہتے ہیں" یہاں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں عموماً زکوٰۃ کے ساتھ لفظ "ایتاء" آتا ہے۔ جیسے اٰتَی الزَّكٰوةَ ـ يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ ـ یہاں آپ نے دیکھا کہ بالکل مختلف فعل استعمال ہوا: وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝ یہاں فَاعِلُونَ یہ مفہوم ادا کر رہا ہے کہ مسلسل کوشاں رہتے ہیں، مسلسل کاربند رہتے ہیں۔ تزکیۂ نفس کے لئے ان کی جد و جہد مسلسل جاری رہتی ہے۔

چوتھا وصف ہے اپنے جنسی جذبہ یعنی اپنی شہوت پر کنٹرول (Sex Discipline) کہ اس کی تسکین کے لئے قرآن مجید نے جو جائز راہ معیّن کر دی ہے، اس پر اکتفا کیا جائے۔

ں کے بارے میں یہ بھی صراحت کر دی گئی کہ ان جائز راہوں سے اگر کوئی اپنے اس جذبہ کی تسکین کرتا ہے تو اس میں ہرگز کوئی ملامت والی بات نہیں ہے۔ یعنی جذبہ (Sexual Instinct) فی نفسہٖ شر نہیں ہے، برائی نہیں، Evil نہیں ہے۔ اس کا غلط استعمال درحقیقت برائی ہے۔ اگر اس میں انضباط (Discipline) ہو اور اس میں بے راہ روی اور کجروی (Perversion) نہ ہو۔ یعنی اس میں نہ تو بے قابو ہونے کی کیفیت پیدا ہو اور نہ جائز راہوں سے انحراف ہو تو فی نفسہٖ کوئی ملامت والی بات نہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ ـــــ غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں 'غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ' کے اسلوب سے جائز راستوں کے جواز کا اسلوب کیوں اختیار کیا گیا! اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں تجرّد کی زندگی بسر کرنا اور اپنے جنسی جذبہ کو جو فطرت درحقیقت میں ایک نہایت قوی جذبہ ہے، کچلنا ایک اعلیٰ ترین روحانی قدر قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ اسلام دینِ فطرت ہے وہ اس فطری و جبلّی جذبہ کو بالکلیہ کچلنے اور دبانے کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ اس کا منشاء و مدعا یہ ہے کہ اس جذبہ کی تسکین کے لئے جائز اور حلال راہیں اختیار کی جائیں۔ نکاح کو اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سُنتوں میں سے ایک سنّت قرار دیا ہے۔ آپ میں سے اکثر حضرات نے یہ حدیث سنی ہوگی جو ہر خطبۂ نکاح میں پڑھی جاتی ہے کہ: اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ۔ اسی کے ساتھ ایک دوسری طویل حدیث کا یہ آخری حصہ بھی پڑھا جاتا ہے کہ: وَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ ـــ "جس کو میری سنّت پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں"۔ ـــــ اس مقام پر جہاں جنسی تسکین کے لئے جائز راہوں کی طرف رہنمائی کی گئی وہاں اس کے ساتھ ہی فرما دیا گیا: فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ تو جو کوئی ڈھونڈے، اختیار کرے، پسند کرے اس کے سوا کوئی اور راہ تو وہی لوگ ہیں حد سے بڑھنے والے ـــ یعنی طاغی اور باغی ـــــ اگلی آیت میں دو اوصاف آئے۔ گویا پانچواں وصف 'امانتوں کی پاسداری' اور چھٹا وصف 'ایفاءِ عہد' فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ "اور وہ لوگ (فلاح پاگئے) جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہیں۔ امانت داری اور ایفائے عہد کے معاملوں میں چوکس رہتے ہیں۔

یہ چھ اوصاف ہیں یہ گویا Corner stones ہیں۔ اساسات ہیں، یہ بنیادیں ہیں کہ جن پر انسانی شخصیت کی اس رُخ پر تعمیر کامل مبنی ہو سکتا ہے کہ جس رُخ پر اللہ کو انسان کی شخصیت

کی تعمیر اپنید ہے۔ تعمیرِ ذات، تعمیرِ سیرت، تعمیرِ کردار کے بھی مختلف معیارات ہو سکتے ہیں۔ مختلف نظریات اور مختلف فلسفوں پر مبنی انسانی سیرت و کردار کے مختلف ہیولے لوگوں کے ذہنوں میں ہو سکتے ہیں لیکن اللہ کا انسانِ مطلوب، قرآن کا مردِ مومن، اس کی جو سیرت و کردار اس کے خالق و مالک اور پروردگار کو مطلوب ہے اس کی تعمیر کے لئے یہ چھ ناگزیر، لابدی، اٹل (Inevitable) اساسات ہیں ـــــ ان چھ اوصاف کے بیان کے بعد پھر نماز کا ذکر فرمایا گیا تاکہ دین میں نماز کی جو اہمیت ہے وہ مستحضر رہے اور ایک مردِ مومن جان لے کہ تعمیرِ سیرت کا اہم ترین عامل نماز کی حفاظت ہے۔ فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ٥

آخر میں ان لوگوں کو جو مستقل طور پر اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کریں، ان اساسات پر اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کریں انہیں بشارت دی گئی کہ یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ٥

قرآن حکیم کا یہ اسلوب ہے کہ جو مضامین بار بار آئیں گے، بار بار آئیں گے گویا ان کی اہمیت مسلّم ہوتی چلی جائے گی۔ چنانچہ دیکھئے انتیسویں پارے میں سورۂ معارج ہے۔ اس کی آیات ۱۹ تا ۳۵ میں پڑھ رہا ہوں۔ اور ان کی ترجمانی بھی ساتھ ساتھ کر دوں گا تاکہ تقابل ہوتا چلا جائے کہ سورۂ مومنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۂ معارج کی ان سترہ آیات میں کس قدر مشابہت ہے۔ فرمایا: اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ٥ "یقیناً انسان تھڑدلا اور کم ہمت پیدا ہوا ہے"۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ٥ "جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے، فریاد کرتا ہے، نالہ و شیون کرتا ہے" وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ٥ "لیکن جب اس کو کوئی خیر ملتا ہے، مال و دولت اس کو آتی ہے، اللہ تعالیٰ نعمتیں دیتا ہے تو ان کو روک روک کر رکھتا ہے، سینت سینت کر رکھتا ہے، دوسروں تک نہیں پہنچنے نہیں دیتا" ـــ یہ دراصل انسان کی سیرت کی اس خامی کی طرف اشارہ ہے کہ جس سے انسان کی رستگاری اور اس کو آزادی دلانا اس پروگرام کا مقصد ہے۔ آگے فرمایا: اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ٥ "سوائے ان کے جو نماز کے خوگر اور عادی ہو گئے ہوں" ـــــ یہاں نماز کی یہ اہمیت سامنے آئی کہ وہاں قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ کا لفظ آیا تھا اس کی بجائے یہاں "مُصَلِّيْنَ" آیا گویا مومن اور نمازی یہ مترادف اور ہم معنی الفاظ ہیں ـــــ آگے فرمایا: اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ٥

جو اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں، ہمیشگی اختیار کرتے ہیں. وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ "اور وہ لوگ جن کے اموال میں حق ہے معین اور معلوم مانگنے والوں کے لئے بھی اور ان لوگوں کے لئے بھی جو کسی سبب سے محروم ہو جائیں". یہ گویا سورۃ المومنون میں جو الفاظ آئے: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ یہاں اس کے مترادف الفاظ آگئے ـــ آگے فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ "اور وہ لوگ جو روزِ جزا، یوم قیامت کی تصدیق کرنے والے ہیں" ـــ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ "اور وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں، ڈرتے رہتے ہیں": اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ اور واقعۃً ان کے رب کا عذاب ایسی ہی چیز ہے جس سے نچنت نہیں ہوا جا سکتا جس سے بے خوف ہونا ممکن نہیں ہے"! ان تین آیات کے بارے میں میں عرض کروں گا کہ ان کا تعلق "اعراض عن اللغو" سے ہے۔ یہ ایمان بالآخرت ہے جس کے نتیجہ میں دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہو جاتا ہے ـــ اور اس کا حاصل ہے "اعراض عن اللغو" بیکار باتوں سے دامن بچانا، پہلو تہی کرنا ـــ اس کی قدرے وضاحت ان شاء اللہ اگلے سبق میں آئے گی۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ بعینہٖ وہ الفاظ دوبارہ آ رہے ہیں جو سورۃ المومنون میں آئے تھے: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ کوئی فرق نہیں ہے بعینہٖ یہی الفاظ سورۃ مومنون کی آیات ۵ تا ۸ میں ہیں اور بعینہٖ یہ الفاظ یہاں سورہ معارج میں وارد ہوئے ہیں. البتہ یہاں ایک چیز کا اضافہ کیا گیا وہ یہ کہ امانت اور عہد کے ضمن میں شہادت پر قائم رہنا گواہی پر قائم رہنا۔ فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ ـــ آخر میں وہی نماز وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ جیسے وہاں اول و آخر نماز ویسے یہاں اوّل و آخر نماز ـــ آگے فرمایا: اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝ "یہ ہیں وہ لوگ جو جنتوں میں ہوں گے اور وہاں ان کا اکرام و اعزاز ہوگا" ـــ سورۃ مومنون میں فرمایا تھا: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ـــ یہاں ان الفاظ میں بشارت دی گئی: اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ـــ سورۃ مومنون اور سورۃ معارج کے ان دونوں مقامات کو اچھی طرح ذہن نشین فرما لیجئے۔ آئندہ ان شاء اللہ

اگلی نشست میں ان میں سے ایک ایک موضوع پر کسی قدر تفصیلی گفتگو ہوگی۔ آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے سرِدست اس سے متعلق اگر کوئی اشکال یا سوال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال وجواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! سورۃ معارج کی ایک آیت میں آیا ہے کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ کم حوصلہ ہونا انسانی سرشت میں شامل ہے؟

جواب: یہ بہت عمدہ سوال ہے۔ اگرچہ اس پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو اگلے درس میں آئے گی کہ انسانی خلقت میں بعض پہلو واقعتہً ایسے ہیں کہ جو کمزوریاں لئے ہوئے ہیں اور ان سے اپنے آپ کو آزاد کرا کے اپنی شخصیت کی صحیح طرز پر تعمیر کرنا ہی درحقیقت انسان کے کرنے کا اصل کام ہے اور اسی کے لئے جو چیزیں لازم ہیں وہ ہمارے آج کے سبق میں سامنے آئی ہیں۔ ان پر جیسا کہ عرض کیا گیا ہر موضوع پر ان شاء اللہ آئندہ نشستوں میں قدرے وضاحت سے گفتگو ہوگی۔

حضرات! ہمارا آج کا سبق اصل میں ایک طویل موضوع کی صرف تمہید ہے۔ آج ہمارے سامنے وہ چھ امور آگئے ہیں کہ جن پر از روئے قرآن تعمیرِ سیرت کے پروگرام کا دارومدار ہے۔ اللہ تعالیٰ آج کے اس درس سے یہ ارادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی سیرتوں کی تعمیر انہی خطوط پر کرنے کی کوشش کریں گے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ ۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔

(۲)
نشست نمبر ۳۴

السلام علیکم۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔ اما بعد

فَأَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۔ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ـــــ

فَقَالَ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ فِي سُورَةِ الْمَعَارِجِ:

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۞ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۞ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۞ ـــــ صَدَقَ اللَّهُ الْعَظِيمُ ـ

معزز حاضرین و محترم ناظرین و سامعین!

ہمارے مطالعہ قرآنِ حکیم کے اس منتخب نصاب کے دسویں سبق کے آغاز میں سورۃ مؤمنون میں ایک اصطلاح وارد ہوئی ہے "فلاح"۔ یہ لفظ قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اور سورۂ معارج کا جو حصہ سورۂ مؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات کے مشابہ ہے جن کا ہم نے گذشتہ نشست میں مطالعہ کیا تھا۔ اس کے آغاز میں الفاظ آئے کہ: اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ "بے شک انسان تھڑدلا اور کم ہمتا پیدا کیا گیا ہے"۔ اس کی مزید وضاحت ہوئی: اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ "جب اسے کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے' نالہ و شیون سے کام لیتا ہے' فریاد کرتا ہے' چیختا چلاتا ہے"۔ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اور جب خیر یا بھلائی یا دولت اسے ملتی ہے تو اسے سینت سینت کر' سمیٹ سمیٹ کر اپنے ہی پاس رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے دوسرے ابنائے نوع کو اس میں حصہ دار بنانے کی ہمت نہیں رکھتا"۔

آج ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ انسان کی شخصیت میں ضعف اور کمزوری کے وہ کون کون سے پہلو ہیں جن کی نشان دہی قرآن مجید نے کی ہے اور جن کے ازالہ کے لئے انسان کے لئے محنت و مشقت اور ریاضت ضروری ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے ایک بڑی عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک طرف قرآن مجید انسان کی عظمت کو نمایاں (Emphasise) کرتا ہے کہ یہ بہت اعلیٰ خلقت کا حامل ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید انسانی خلقت کے بعض خلا اور اس کی بعض کمزوریوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ ایک طرف بلندیاں ہیں اور ساتھ ہی پستیاں ہیں۔ جیسے سورۃ التین میں فرمایا گیا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اس کی بہت خوبصورتی سے شیخ سعدی رحمۃ اللہ نے ترجمانی کی ہے وہ کہتے ہیں ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است

از فرشتہ سرشتہ و ز حیوان —!

یہ انسان "آدمی زادہ" حضرت آدم کی اولاد عجیب مرکب وجود کا حامل ہے۔ یہ چوں چوں کا مربہ ہے۔ اس میں ایک جانب بڑی بلندیاں ہیں۔ وہ بلندیاں جو اسے ملائکہ کا ہم پلہ ہی نہیں مسجود بناتی ہیں۔ دوسری طرف اس میں پستیاں ہیں اور یہ خالص حیوانات کی سطح پر بھی گر جاتا ہے۔ پس اس میں ملکوتیت اور حیوانیت کے اوصاف بیک وقت موجود ہیں — اگر ہم خود کچھ درون بینی کی عادت ڈالیں اور اپنے اندر بھی جھانکا کریں تو ہم محسوس ہوگا کہ یہ دو متضاد تقاضے ہمارے اندر موجود ہیں۔ خیر و شر

کے عواطف و میلانات بیک وقت ہمیں اپنے باطن میں محسوس ہوتے ہیں۔ نیکی، بھلائی، علوِ ہمت اور کردار کی بلندی کی طرف بھی رجحان ہمارے اندر موجود ہے۔ ساتھ ہی پستی کی طرف میلان خود ہمارے اندر موجود ہے۔ اسے ہم تعبیر کرتے ہیں کشمکش خیر و شر سے، جس کے داعیات اور عواطف اور میلانات ہمارے اپنے اندر موجود ہیں ۔۔۔ اسی کو علامہ اقبال نے ایک مقام پر "معرکۂ روح و بدن" سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش!
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

فرائڈ ایک بہت بڑا ماہر نفسیات شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے بہت سے نظریات گمراہ کن بھی ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے انسانی نفسیات کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرائی میں اتر کر کیا ہے۔ اس کے یہاں آپ کو یہ اصطلاحات ملیں گی۔ ایک طرف 'ID' اور 'LIBIDO' ہے یعنی حیوانی جبلتیں (Animal Instincts) حیوانی تقاضے ۔۔۔ دوسری طرف 'EGO' اور 'Super EGO' یعنی انا اور انائے کبیر بھی موجود ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو رفعت اور اخلاق کی بلند منزلوں کی طرف کھینچتی ہیں۔

قرآن مجید نے بھی نفس کو کہیں تو ایک وحدت کی حیثیت سے لیا ہے تو وہ پستی کا مظہر ہے اور اس کے مقابلہ میں قلب و روح کو بلندی اور رفعت کا مظہر قرار دیا ہے ۔۔۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ نفس ہی کو ایک جامع اصطلاح کے طور پر لے کر اس کی تین حالتوں اور کیفیات کی نشان دہی کی گئی ہے ۔۔۔ پہلی ہے نفسِ امّارہ یعنی اس میں برائی، بے حیائی، شہوت، خواہشات، حیوانی جبلتیں ۔۔۔ انہی کی طرف سارا میلان اور رجحان ہے۔ چنانچہ تیرھویں پارے کی پہلی آیت آپ میں سے اکثر کو یاد ہو گی: وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوْٓءِ۔

لیکن قرآن مجید دوسری کیفیت نفسِ لوّامہ کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے۔ اسے وقوعِ قیامت پر بطور شہادت پیش کیا ہے جس کا ہم سورۂ قیامہ میں مطالعہ کر چکے ہیں: وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ ○ برائی پر ملامت کرنے والی چیز بھی انسان کے اپنے اندر موجود ہے۔ پھر ایک بلند ترین کیفیت ہے: نفسِ مطمئنہ۔ جب آدمی زادہ حیوانیت سے آزادی اور رستگاری

حاصل کر کے انسانیت کے بلند مقام پر متمکن ہو جائے، وہاں قائم ہو جائے، جم جائے تو یہ ہے نفس المطمئنہ جس کا ذکر ہے سورۃ الفجر کے آخر میں: يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ لہٰذا یہ ہیں وہ متضاد میلانات و رجحانات جو انسان کے اندر موجود ہیں۔

مزید توجہ کیجئے۔ قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ وہ مسجود ملائک ہے۔ قرآن مجید میں سات مرتبہ اس کا ذکر ہے کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ مزید قرآن حکیم سورۂ بنی اسرائیل میں بتاتا ہے کہ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝ "ہم نے انسان کو بڑی عزت بخشی ہے اور ہم اسے بحر و بر میں اٹھائے پھرتے ہیں اور اسے پاکیزہ رزق دیتے ہیں اور ہم نے جو کچھ بنایا ہے اس میں سے بہتوں پر اسے فضیلت عطا کی ہے۔ یہ بھی اس کا اعزاز و اکرام ہے" — قرآن یہ بھی کہتا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ "ہم نے انسان کو بہترین خلقت پر پیدا کیا ہے" — اور سورہ صٓ کی آیت نمبر ۷۵ میں یہ الفاظ بھی آگئے ہیں: لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ "اس انسان کو تو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اور اگرچہ قرآن میں تو اس کا ذکر نہیں ہے لیکن ایک مضمون ہے جو تورات میں ہے۔ وہ یہ کہ:

"And God created man in his own image"

در بعینہٖ یہ مضمون حدیث نبوی میں بھی ہے کہ: خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ "اللہ نے آدم کی تخلیق فرمائی ہے اپنی صورت پر" — اس کو بلا تشبیہ خیال کیجئے — اب ایک طرف تو انسان کی عظمتوں کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف قرآن یہ بھی بتاتا ہے: خُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا "انسان کمزور پیدا ہوا ہے" — إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ "انسان تھڑدلا، کم ہمتا پیدا ہوا ہے" — خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ "انسان میں جلد بازی کا مادّہ ہے جو اس کی طبیعت میں ودیعت شدہ ہے" کہیں فرمایا جاتا ہے: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ "انسان کے لئے عورتوں سے دلچسپی اور ان کی طرف شہوت کا میلان، اولاد کی محبت اور مال و اسباب دنیا کی مختلف صورتوں کی طرف بھی ایک کشش ہے جو اس میں طبعی طور پر ودیعت کر دی گئی ہے"۔ یہ ہے انسان کی حقیقت از روئے قرآن — اب غور طلب اصل مسئلہ کیا ہے! وہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی ان خامیوں، اپنی ان کمزوریوں

اپنی خلقت کے ضعف کے حامل ان پہلوؤں سے کشمکش اور کشاکش کر کے محنت و مشقت کر کے اور اپنی ریاضت سے جو اپنی جو اصل بلندی اور رفعت ہے اسے Attain کرتا ہے اس کا جو اصل مرتبہ اور مقام ہے اس کو حاصل کرتا ہے۔ جیسے سورۃ التین میں فرمایا:
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ " ہم نے انسان کو اعلیٰ ترین تخلیق پر پیدا فرمایا پھر اُسے نچلوں میں سے سب سے نیچے لوٹا دیا سوائے ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے " پس ایمان اور عمل صالح اس جد و جہد کا عنوان ہے کہ جس کے ذریعے سے انسان اپنی پستی سے اُبھر کر اپنے اس مقام بلند تک پہنچتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بِالْقُوَّۃِ (Potentially) تخلیق فرمایا ہے۔ اس محنت، اس مشقت اور اس ریاضت کا نام ہے شریعت، طریقت اور سلوک۔ محنت کرنی پڑے گی۔ چلنا پڑے گا۔ پستی سے بلندیوں تک پہنچنے کے لئے کچھ محنت، کچھ مشقت، کچھ ریاضت لازمی ہے۔

اس کے لئے قرآن مجید جامع ترین لفظ استعمال کرتا ہے فلح ـــ اب غور کیجئے کہ اس لفظ کا لغوی مفہوم کیا ہے! اس کا ہم عام طور پر ترجمہ کر دیتے ہیں کامیابی ـــ بامراد ہونا لیکن فلح، یعنی ف ل ح، یا فا لام حا ـــ یہ جو عربی زبان میں سہ حرفی مادہ ہے، اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو توڑنا، پھاڑنا، کسی چیز کو پھاڑ کر اس میں سے کوئی اور چیز برآمد کرنا۔ چنانچہ عربی زبان کی ضرب المثل ہے جیسے ہمارے یہاں ہے کہ "لوہے کو لوہا کاٹتا ہے" عربی میں کہا جاتا ہے: اِنَّ الْحَدِیْدَ بِالْحَدِیْدِ یُفْلَحُ ـــ "لوہا لوہے ہی سے کٹتا ہے"۔ اسی طرح جدید عربی میں فلاح کہتے ہیں کسان کو۔ چونکہ وہ اپنے ہل کی نوک سے دھرتی کے سینہ کو چیرتا ہے۔ ہل اس کا آلۂ فلح ہے جس سے کسان، کاشت کار، فلاح زمین میں شگاف ڈالتا ہے۔ اب اس لفظ کو ذہن میں رکھئے اور غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسانی شخصیت کے اندر ایک معنوی حقیقت مضمر ہے جو اس کی اصل شخصیت ہے جو اس کی خودی ہے، جو اس کی انا ہے۔ میں جب اشارہ کرتا ہوں "میں" تو کسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہوں! یہ میرا ہاتھ ہے، یہ میرے پاؤں ہیں، یہ میری آنکھیں ہیں، یہ میرے کان ہیں، یہ میرا سر ہے، یہ میرا بدن ہے تو میں کون ہوں! جس کی یہ تمام چیزیں ہیں ـــ یہ "میں"، انا، خودی یہ ہے انسان کی اصل حقیقت، انسان کی اصل معنوی شخصیت ـــ لیکن یہ میں یا یہ انا یا یہ

ی دی چند مادّی اور شہوانی غلافوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ جو انسان کے حیوانی وجود کے اندر ودیعت
لئے گئے ہیں۔ وہ حیوانی وجود اسے پستیوں کی طرف کھینچتا ہے۔ سارے حیوانی داعیات ۔
(Animal Instincts) اس کے ساتھ لگے ہوتے ہیں جو اس کو بلندیوں کی
ف نہیں جانے دیتے بلکہ پستیوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ اس سے رستگاری حاصل کرنا اور اپنے
ڈی اور شہوانی غلافوں کو پھاڑ کر اس میں سے اپنی اصل معنوی شخصیت کو برآمد کرنا اور اس کو نشوونما
ینا یہ عمل فلح ہے۔ جیسے آم کی گٹھلی پھٹتی ہے تو اس میں سے آم کا پودا برآمد ہوتا ہے اور جیسے ایک
ٖشق ہوتا ہے، اس میں سے پتیاں نکلتی ہیں۔ عربی زبان میں فلح کے بہت ہی قریب کا لفظ
ہے "فلق"۔ فا، لام اور ق۔ فلق کے معنی بھی پھاڑنا ہے، صبح کے لئے قرآن میں آتا
ہے : فَالِقُ الْاِصْبَاحِ۔ اللہ رات کی تاریکی کا پردہ چاک کرتا اور دن کی روشنی برآمد کرتا
ہے۔ اور اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى "بالتحقیق اللہ دانوں، بیجوں اور گٹھلیوں کو
پھاڑتا ہے اور ان میں سے پودے برآمد کرتا ہے۔" تو فلاح انسانی کیا ہے! یہ کہ انسان
پنے مادّی اور شہوانی میلانات اور رجحانات، اپنے حیوانی تقاضوں اور جبلتوں کے خول سے ان
پھاڑ کر اپنی معنوی شخصیت، اپنی خودی اور اپنی انا کو برآمد کرنا، اس کو پروان چڑھانا اور
ں کی تعمیر کرنا ـــــ یہ ہے انسان کی فلاح از روئے قرآن حکیم ـــ
حکمت چونکہ انسان کی ایک مشترک متاع ہے اس لئے میں آپ کو اپنشد کے ایک جملہ
ا انگریزی ترجمہ سناتا ہوں :

Man in his ignorance identifies himself with the material sheats which encompass his real self:

" انسان اپنی نادانی اور جہالت میں اپنے آپ کو ان مادّی غلافوں سے تعبیر کر بیٹھتا ہے جن
کے اندر اس کی اصل حقیقت مضمر اور پنہاں ہے اور بایں وجوہ اس کی اصل حقیقت اس کی
نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے "ـــــ سورۃ الحشر میں فرمایا گیا : وَلَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۔ " اور ان لوگوں کے مانند نہ بن جانا
جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے خود انہیں اپنی حقیقت اور اپنی عظمت سے غافل کر دیا۔"
ـــــ یہ ہے قرآن مجید کے ذریعہ تعمیر سیرت کا پروگرام اور اس کا مقصد ہے "فلاح" ـــــ

آج میں اسی پر اکتفا کر رہا ہوں۔ اب اس ضمن میں اگر کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں!

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! آج کے درس میں ایک حدیث کے حوالہ سے تو اللہ تعالیٰ کی صورت کا ذکر آیا ہے اور ایک آیتِ قرآنی سے اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کا ذکر آیا ہے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ کا بھی کوئی جسم ہے؟

جواب: یہ بہت ہی مناسب اور متعلق سوال ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے الفاظ بھی آئے ہیں کہ جو جسم کے مختلف اعضاء کے لئے بولے جاتے ہیں۔ جیسے ہاتھ ہیں، چہرہ ہے، پنڈلی ہے، مٹھی ہے ___ لہٰذا ہم ان الفاظ سے یہ مراد لیں گے کہ کوئی حقیقتِ معنوی ہے جس کو ان الفاظ سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ ہم اپنے جسموں پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ، یا اسی طرح کا اللہ تعالیٰ کا کوئی چہرہ یا اللہ تعالیٰ کی آنکھ ہم نہیں مان سکتے۔ اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیت سے پاک ہے۔ اعلیٰ ہے، ارفع ہے اور منزّہ ہے: سُبۡحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ___ البتہ اجمالاً جب یہ الفاظ آتے ہیں تو ہمارا ایمان رہے گا کہ کوئی حقیقتِ معنوی ہے جن کو ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! براہِ کرم اس بات کی وضاحت کر دیجئے کہ جسم اور روح کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

جواب: پہلے تو میں یہ عرض کروں گا کہ اگر کسی کے ذہن میں یہ مغالطہ ہے کہ روح سے مراد ہے زندگی یعنی حیات (Life) تو یہ بات از روئے قرآن درست نہیں ہے۔ اس مغالطہ کو دور کر لینا چاہیے ___ جان بالکل شے دگر ہے۔ جان تو حیوانات اور کیڑے مکوڑوں میں بھی ہوتی ہے اور اب تو ہم یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ جان تو نباتات میں بھی ہے وہ بھی بے جان مخلوق نہیں ہے ___ انسان میں جسم کے ساتھ جان بھی ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک معنوی حقیقت اس میں اور بھی ہے جس کا خاص تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں تخلیق آدم کے متعلق دو جگہ فرمایا گیا: فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَنَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ: پس جب میں آدم کے سنوارنے کا کام کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں ___ لہٰذا یہ جو روح ہے یہ جان سے بالکل علیحدہ شے ہے۔ جسم اور جان مل کر تو انسان کا حیوانی Element بنے گا اور روح کا

ایک مستقل جداگانہ وجود ہے روحانی وجود ـــــ جسم وجان کے ساتھ اس کے تعلق کی اصل نوعیت کیا ہے؟ اس کو ہم سمجھ نہیں سکتے ـــــ میں آپ کے سامنے یہ عرض کروں گا کہ ہم ابھی تک صحیح معنوں میں یہ بھی نہیں جانتے کہ جسم اور جان کا کیا رشتہ ہے! ـــــ ہمارے جسم میں جان کہاں رہتی ہے! تاحال ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہے۔ تو جسم کے مقابلہ میں جان ایک لطیف حقیقت ہے اور ابھی تک ہم اسے بھی نہیں جانتے تو اس سے کہیں زیادہ لطیف تر روح ہے لہٰذا اسے ہم کیسے جانیں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ایک سوال نقل کیا گیا وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ یہ آپؐ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں؛ جواب دیا گیا: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ٥ " اے نبی! کہہ دیجئے کہ روح تو امرِ ربانی میں سے ایک امر ہے اور تمہیں علم میں سے تھوڑا ہی حصہ ملا ہے ۔" یعنی تم اس روح کی اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے ۔ ایک بڑا پیارا شعر ہے وہ میں آپ کو سنا دیتا ہوں ۔ امید ہے کہ بات مزید واضح ہو جائے گی ۔ شعر ہے ؎

جاں نہاں در جسم او در جاں نہاں!
اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں

حضرات! آج ہم نے فلاح کا قرآنی مفہوم سمجھا اور تعمیرِ سیرت کا از روئے قرآن جو اصل مقصد ہے وہ ہمارے سامنے آیا۔ اب ان شاء اللہ آئندہ نشست سے تعمیرِ سیرت کا جو قرآنی پروگرام اور لائحہ عمل ہے، اس کی جو مختلف شقیں، پہلو اور گوشے ہیں، ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوگی ـــــ

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ؕ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ

تہذیب، ثقافت، معاشرہ
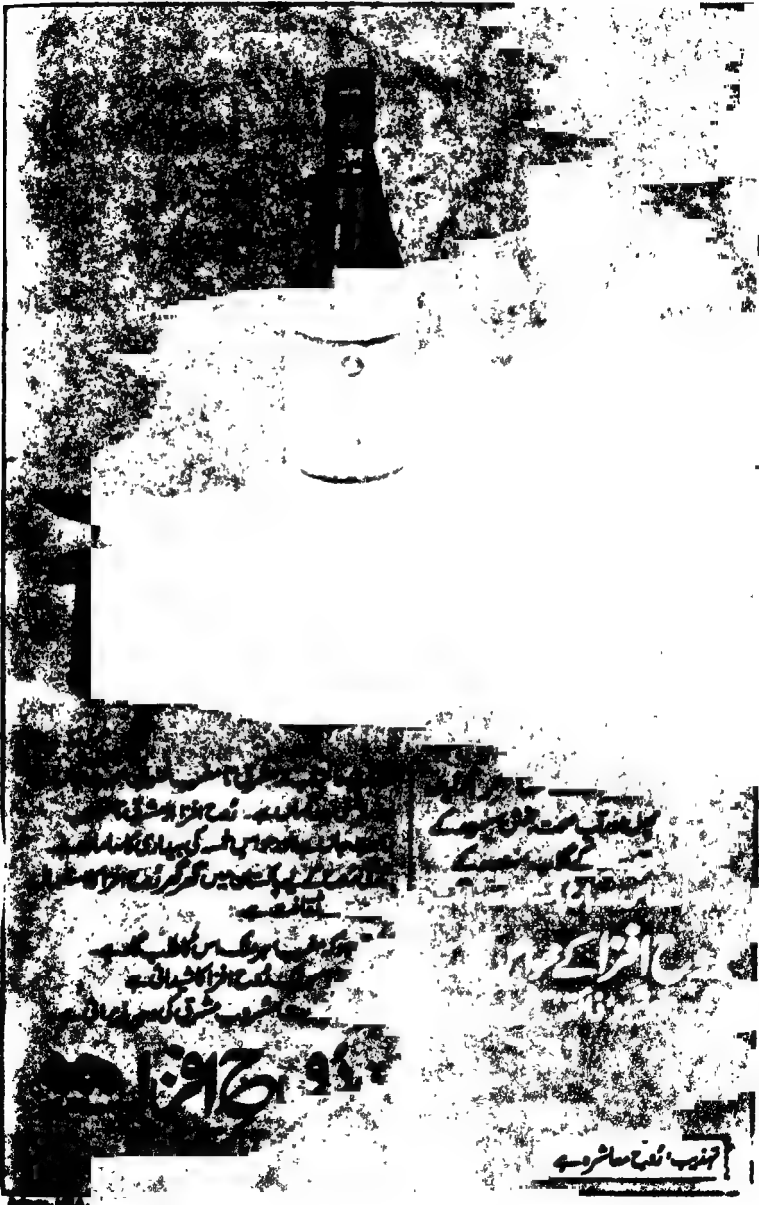
تاریخ کی قرآنی تعبیر

ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب "استحکام پاکستان" پر تبصرہ

اِس سال محاضراتِ قرآنی منعقدہ اواخر مارچ ۸۶ء میں دیگر مقررین و مقالہ نگار حضرات کے علاوہ محترم سراج منیر صاحب ڈائریکٹر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ نے بھی "استحکامِ پاکستان" پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ گو موصوف کا ہم سے یہ پختہ وعدہ ہے کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات ایک مقالے کی شکل میں مرتب کر کے ہمیں ارسال فرمائیں گے لیکن ایفائے وعدہ میں چونکہ کچھ تاخیر ہو رہی تھی لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ سرِدست جناب سراج منیر کی اُس تقریر کو ٹیپ سے اتار کر ہدیۂ قارئین کر دیا جائے جو موصوف نے اس موضوع پر محاضراتِ قرآنی میں ارشاد فرمائی تھی تاہم وہ وعدہ اپنی جگہ قائم ہے اور ہم بدستور اُن کی جانب سے مقالے کے انتظار میں ہیں۔ اور جیسے ہی وہ مقالہ موصول ہوا اسے بھی ان شاء اللہ میثاق میں شائع کر دیا جائے گا (ادارہ)

جناب صدرِ محفل، حاضرینِ گرامی اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ہمیں عادت ہے ادبی کتابوں کی تقریبِ رونمائی میں مقالہ پڑھنے یا گفتگو کرنے کی۔ اُس میں ایک آسانی یہ ہوتی ہے کہ اُن کتابوں کو پڑھنا کچھ ضروری نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جس ٹائیٹل کے ساتھ جو کتاب آئی ہے اُس میں کیا ہو گا۔ کتاب سونگھ کر اُس پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مجھے آج ایک مشکل میں ڈال دیا۔ جب انہوں نے مجھے یہ کتاب دی۔

میں نے ذرا ورق گردانی کی تو مجھے احساس ہوا کہ اس کتاب میں فلوک (FLUKE) نہیں چلے گا کیونکہ یہ کتاب خود فلوک (FLUKE) کی بنیاد پر نہیں لکھی گئی۔ اور دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جتنا تفکر کسی خیال کے پیچھے ہوا اتنی توجہ اُس کتاب کا یا اُس خیال کا حق ہوتا ہے۔ لہٰذا جو رائے اب میں یہاں عرض کروں گا وہ اُسی بنیاد پر ہوگی لیکن میں پہلے ہی عرض کر دوں کہ کتاب کو میں نے اتنی توجہ سے نہیں دیکھا جو اُس کا حق ہے۔ ایسی کتابیں نظر سے گزرتی رہتی ہیں لیکن اس کتاب میں ایک بات ذرا الگ ہے اور اُس پر توجہ مزید ہونی چاہیئے۔ عام طور پر اس طرح کے عنوانات سے جو کتابیں شائع ہوتی ہیں اُن میں یا تو تاریخ کا بیان ہوتا ہے۔ یا جذباتی انداز میں اُسے دیکھنے کی اور پاکستان کے مسائل کو سمجھنے کی پُرخلوص کوشش ہوتی ہے۔ مگر یہاں آغاز جس چیز سے ہوا ہے وہ علمی طور پر بھی ایک بہت قابلِ لحاظ (SIGNIFICANT) بات ہے۔ عام طور پر دُنیا میں آج کل اسلام کا تصورِ تاریخ یا قرآن کا تصورِ تاریخ تو بیان ہوتا ہے لیکن یہ کتاب قرآن کے تصورِ تاریخ سے بات نہیں کرتی بلکہ قرآن کے تصورِ تخلیقِ تاریخ سے بحث کرتی ہے۔ بنی اسرائیل کے ذکر کا جو حوالہ ابتدا میں ہے اور اس کے بعد تاریخ کی پوری MECHANICS کو دیکھنے کا جو نقطۂ نظر ڈاکٹر صاحب نے اختیار کیا ہے اُس میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ انہوں نے حکایاتِ قرآنی کو یا بیاناتِ قرآنی کو کسی تاریخ کے تسلسل اور تاریخ کی MECHANICS کے طور پر دیکھا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ اس MECHANICS یعنی اس نظامِ تخلیقِ تاریخ کا اطلاق (APPLICATION) اُمتِ مسلمہ کی حدود میں کس کس طرح ہوگا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کے بارے میں ہم شاید یہ کہہ سکیں کہ اس سے پہلے کے اُس ادب میں جو دین اور تاریخ کے تصور سے بحث کرتا ہے، دین اور تاریخ کا اتنا مربوط اور عالمانہ (SCIENTIFICALLY ORGANISED) تصور کہیں اور نگاہ میں نہیں آیا اور جس بنیاد پر ڈاکٹر صاحب نے پاکستان کی تاریخ سے واقعات کا انتخاب کیا ہے اور انہیں ایک شکل دینے کی کوشش کی ہے اُس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ابھی ایک ابتدا ہے۔ کیونکہ قرآن کے تصورِ تخلیقِ تاریخ کو جب ہم موجودہ تاریخ کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کریں اور اس سے نتائج نکالنے کی کوشش کریں تو یہ بات ظاہر ہے کہ کسی بھی نظریئے کے

ابلے میں یا کسی بھی انسانی ظن وگمان یا محض انسانی تفکر کے مقابلے میں ہمارے قدم
یادہ مستحکم زمین پر ہوتے ہیں اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس سے پہلے پاکستان کی
ریخ کا تجزیہ اس صورت میں کیا گیا ہو کہ اس کے پیچھے ہر جگہ کوئی نہ کوئی قرآنی اصول
ا تعبیر و تفسیر کارفرما ہو ۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب میں شروع سے لیکر
یہ تک جو اصول بھی برتے گئے ہیں وہ اصول وہم وگمان کی منطق سے پیدا نہیں ہوئے
لکہ اس سرچشمے سے پیدا ہوئے ہیں جسے دنیا میں کوئی حفاظت کے نقطہ نظر سے
فائیت کے نقطۂ نظر سے اور زمانیت اور لازمانیت کے نقطۂ نظر سے چیلنج کرنے کی
پوزیشن میں دیانت کے ساتھ نہیں ہے ۔ لیکن یہ بات صحیح ہے کہ جب اس تاریخ
تجزیہ کیا جائے اور اس پر قرآنی اصولوں کا اطلاق کیا جائے تو یہ انسانی کوشش
ن DOMAIN ہے لہٰذا اس میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور خصوصاً تعبیر کی مختلف
شکلیں بھی ہو سکتی ہیں ۔ مگر جو نقطۂ نظر اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے اختیار کیا و
بد جدید میں تاریخ کے یا فلسفۂ تاریخ کے تصور سے مختلف ہے ۔ فلسفۂ تاریخ کا عام
سور تو یہ ہے کہ تاریخ پڑھ کر اس سے اُن اصولوں کا استنباط کیا جائے جن سے تاریخ
حرکت وقوع پذیر ہوتی ہے ۔ چنانچہ اس سے ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی زمانے میں اور
ر زمانوں میں انسانی تاریخ کے MECHANICS میں کوئی خرابی ہے تو اصول سازی
اس عمل کے نتیجے میں وہ خرابی اصول میں بھی آجاتی ہے ۔ کیونکہ امر واقعہ یہ ہے
تاریخ نے اس وقت حرکت اس طرح کی ۔ اور اس سے فلسفۂ تاریخ کے ماہر
یہ نتیجہ نکالا کہ تاریخ یوں ہی حرکت کیا کرتی ہے ۔ لیکن جب اصول کا تعین آپ
قرآن سے کیا اور اس کا انطباق آپ نے تاریخ پر کیا تو تاریخ کی حرکت سند
یں ہے خدا کا کلام سند ہے ۔ یہ ایک اپروچ کا فرق ہے ۔ تصورِ تاریخ یا تاریخی
زیے کی جو منطق استعمال کی جا رہی ہے اس میں غالباً پہلی مرتبہ یہ ایک چیز آئی
ہے اور آج جہاں ہم یہ کہتے کہ اس ملک میں بحران اور کنفیوژن صحافیوں نے
ا کیا، سیاستدانوں نے پیدا کیا، مزدوروں نے پیدا کیا یا علماء نے پیدا کیا ۔
ین حقیقت یہ ہے سب سے بڑا کنفیوژن (CONFUSION) اس امر سے پیدا ہوا کہ
کستان تخلیق ہوا، تاریخ کی اُن قوتوں کے ذریعے جو اوپر سے متعین ہوتی ہیں اور

اس کی تعبیر کی گئی اُن قوتوں کے ذریعے جو ادنیٰ درجے سے پیدا ہوئیں - چنانچہ اس
کی وجہ سے حضرت سلیمان اور داؤد کا قصہ یاد آتا ہے کہ دو عورتیں ایک بچے کو لے کر
پہنچیں معروف قصہ ہے - اسی طرح محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کے ایوان میں آج
اور ریاست اپنے بچے کو یعنی فرد کو لے کر پہنچی ہوئی ہیں اصل ماں اُس کی دین ہے جس
کا جی نہیں چاہتا کہ اسے دو ٹکڑے کر دیا جائے جبکہ ریاست اس بات پر مصر ہے
یہ بچہ اُس کا ہے اور اگر آدھا بھی اُسے مل جائے تو کافی ہے اس کے پیچھے
الجھن یہ ہے جو سمجھ میں نہیں آتی کہ اصل کنفیوژن (CONFUSION) ذہنوں میں تف
انسان کے بارے میں ہے - اگر آپ کا تصورِ انسان یہ ہے کہ انسان ایک سماجی
ہے تو آپ اس کے علاوہ کسی اور نتیجے پہ پہنچ ہی نہیں سکتے کہ مغربی طرز
کے علاوہ پاکستان کو چلایا جا سکتا ہے - اگر آپ کا تصور یہ ہے انسان ایک معا
حیوان ہے تو اشیاء اور خیالات کی منطق آپ کو اس کے علاوہ کسی نتیجے پر پہنچنے
دے گی کہ پاکستان کا مستقبل مارکسزم ہے - لیکن اگر آپ کا تصور یہ ہے کہ انسا
اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے تو آپ کے ذہن کی منطق اور آپ
پورا استدلال آپ کو مجبور کر کے یہاں لے جائے گا کہ اس مملکت کا مقصود او
کی بنیاد اس کا ROOT اور اس کا CROWN دونوں غیر مذہبی کسی طرح نہیں ہو سکتے
اس لئے کہ دین آدھے پونے چوتھائی آدمی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ

Absoluteness of Truth demands totality of Faith.

تو یہ جو بحران ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ پاکستان کے بارے میں یہ کسی ایسے تصور سے پ
ہو رہا ہے جہاں فساد نیت میں ہے یا فہم میں ہے بقول سخن شناس نہ ای ، دلبر
خطا ایں جا است ! اصل کنفیوژن (CONFUSION) پاکستان کے تشخص
بارے میں نہیں ہے اپنے قلب کے تصور کے بارے میں ہے - اگر یہ قلب سوائے اللہ
کے اور اُس کے رسول کے کسی کے لئے نہیں ہے تو معلوم یہ ہوگا کہ دنیا میں
میں جو چیزیں عزیز ہیں وہ اُسی واسطے سے اور اُسی تعلق سے عزیز ہیں - یہ کوئی
جذباتی بات نہیں ہے بلکہ اشیاء کی منطق اور انسانی فکر و خیال اور جذبات کا
باہم تانا بانا (CO-ORDINATION) سے اس کی بنیادی منطق ہے - کتاب -

غلبہ پر ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھی بات یہ کی ہے کہ یہ فرق قائم کر دیا ہے کہ اس کتاب کے مخاطبین کون لوگ ہیں! اس لئے کہ جہاں قصور فہم میں ہو اُس کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تھوڑا راستے میں ہموار ہو سکے اُس فالج کو کسی اجتماعی تحریک کی قوت سے شاید دور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں قصور اور فتور نیت میں ہو، جس عمارت کی بنیاد میں سنگِ فتور رکھا جائے اور پھر اُس کی تقویت کے لئے پوری دنیا کی قوتیں پاکستان کے باہر اور اُن کی لابیاں پاکستان کے اندر اس فسادِ نیت کے خارجی نتائج کی منتظر ہوں اور اُسے پروان چڑھانے کے لئے تیار ہوں اُن سے کوئی مکالمہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ قرآن کا ناطق فیصلہ ہے لیکن بعض اوقات مغربی حلقوں سے مکالمے کے دوران آدابِ محفل (SOCIAL CURTESY) اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم ذرا کھل کر اُن سے گفتگو کر سکیں۔ کہ تاریخ کا عمل جب چلتا ہے اور تاریخ کے گھوڑے کی لگامیں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہیں تو اُس کا معاملہ کیا ہوتا ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ بعض ذرائع ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں کسی نظام کو بہتر طور پر چلانے کے لئے اور اُس نظام میں بہتر نتائج پیدا کرنے کے لئے تو برتا جا سکتا ہے۔ لیکن اُس نظام کو تبدیل کرنے کے لئے اُن کو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ مسئلہ یہی ہے کہ خود یہاں تک ہم ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک اور ایک دور سے دوسرے دور میں آئے ہیں اسلام کی تاریخ کے بارے میں ہمارا جو بھی فیصلہ ہو لیکن ہندوستان میں عہدِ آخر تک جو تسلسل تھا وہ اُسی اقتدار کا تسلسل تھا جس کا آغاز مدینہ منورہ سے ہوا تھا اور استعمار کے آنے کے بعد اس نئی مملکت کی تخلیق جب ہوئی تو کیا اس تسلسل اقتدار کے ٹوٹنے اور اس کے دوبارہ قائم ہونے کے درمیان کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ عالمی سطح پر وہ کونسے نئے تقاضے پیدا ہوئے ہیں جو اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ نظام کے تمام درجات کو، نظام کی تمام سطحوں کو، غور سے دیکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اقتدار کی کیمسٹری پچھلے عرصے میں کیا رہی ہے اور اقتدار کی کیمسٹری موجودہ GEO-POLITICAL SITUATION (علاقائی سیاسی صورت حال) میں کیا ہے۔ درحقیقت جب ہم کہتے یہ ہیں کہ اقتدار چھن گیا تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ تاریخ کی قوتوں کو متعین کرنے اور تاریخ کو اپنے قلب اور ایمان کے متعین

کردہ راستے پر لے جانے کے جو طریقے تھے وہ طریقے بدل گئے ہیں۔ اقتدار چھن جانے سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ جو باجگزاری ہوتی تھی اور جو خراج ملتا تھا وہ خراج ملنا بند ہوگیا ہے بلکہ دُنیا کی عالمی (GLOBAL) سیاست میں اسلام جس طرح تاریخ کی قوتوں کے رُخ متعین کرتا تھا اُس طرح تاریخ کی قوتوں کے رُخ متعین کرنے کے جو ذرائع تھے وہ ہمارے ہاتھ سے جاتے رہے اور پاکستان کی تخلیق اس امکان کی تخلیق تھی کہ دوبارہ اُسی طرح تاریخ کے گھوڑے کی لگامیں اُدھاسیں شاید مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائیں۔ لیکن ؎

وہاں دیوار اٹھادی مرے معمار دل نے   گھر کے نقشے میں مقرر تھا جہاں در ہوگا

یعنی جو ابتدائے کار تھا اُسے ٹیڑھا کردیا۔ ڈاکٹر صاحب نے جو تجزیہ کیا ہے اُس کی روشنی میں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ جس کتاب کا یہ وعدہ کررہے ہیں اور جس کا حوالہ اس کتاب میں بھی موجود ہے وہ کیا شے ہے! اور کیا کیا کنفیوژن اس ملک میں پیدا ہوئے۔ اس مسئلہ پر۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کیا اصل مقصود یہ ہے کہ دُنیا میں انسانوں کے تخلیق کئے ہوئے نظاموں کے برابر لاکر الوہی پیغام کو کھڑا کردیا جائے یا اصل مقصود یہ ہے کہ جناب آدم علیہ السلام کی آمد سے لے کر آج تک دُنیا کی تاریخ خدا کے متعین کردہ جس راستے پر چلی جارہی ہے اُس راستے پر ہمارا جو رول ایک مملکت کی حیثیت سے اور ایک اجتماع کی حیثیت سے بنتا ہے ہم اُس رول کو ادا کریں۔ اور کیا یہ نہیں ہوا کہ اس مملکت میں نظام اور فقہ کی اصطلاح کے تحت ایک التباس پیدا ہوا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ بدنیتی سے پیدا ہوا لیکن تاریخ کی حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ یہ التباس جو پیدا ہوا یہ نقصان دہ ہے۔ جس وقت ضرورت یہ تھی کہ اُن قوتوں کی تشکیل کی جاتی جو صورتِ حال کو متغیر کرسکیں ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی اور اسلام کا اس مملکت کے حوالے سے ایک بین الاقوامی رول متعین کرسکیں اُس وقت کوشش یہ ہورہی تھی کہ فروعات اور جزئیات کا کوئی فیصلہ ہوجائے۔ جب ایک مرتبہ آپ نے اُس DOMAIN میں یعنی اُس دُنیا میں قدم رکھ دیا جو ظاہر میں پھیلتی ہوئی اور ہزار ہا اختلافات کی دنیا ہے DIVERSITY تو اُس کا نتیجہ سوائے کنفیوژن کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اُس کی اپنی ایک ضرورت ہے لیکن اُس کا اپنا ایک وقت ہے تو

نتیجہ کیا ہوا کہ تخلیقِ مملکت کے بعد پہلی کوشش جو تھی تخلیقِ قدر کی، یہاں میں آپ
سے عرض کر دوں کہ جب ہم تخلیقِ قدر کہتے ہیں تو اُس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ عدمِ محض
سے قدر کو تخلیق کرنا ہے بلکہ انسانی صورتِ حال میں انسانی اجتماع میں جو قدریں
گمراہیوں کی وجہ سے متروک ہوتی جا رہی ہیں — اس لئے کہ قدر تو خیرِ مطلق کی انسانی
EXTENTION ہے — اور ارادہ ساکت ہوتا جا رہا ہے اِن دونوں کے ربط کو درست
کیا جائے لیکن قانون کے ذریعے تخلیقِ قدر نہیں ہو سکتی - ہاں تحفظِ قدر ہو سکتی ہے -
پاکستان پینل کوڈ کے ذریعے تحفظِ پاکستان ہو سکتا ہے تخلیقِ پاکستان نہیں ہو سکتی - یہ
ایک بنیادی کنفیوژن تھا جس نے قانون کو آئیڈیل سے ہم آہنگ کر دیا قانون اور
آئیڈیل کو یک معنی کر دیا - چنانچہ ہم چلتے تھے پایاب پانی میں اور رُخ کرتے تھے سمندر
کا - نتیجہ اُس کا یہ ہونا تھا عزائم اور نعرے بلند اور حاصل کم - اس چیز نے ایمان
اور یقین کا دیوالہ نکال دیا کہ دعوے تو حق کی کامیابی کے ہیں اور مشاہدے باطل کی
کامرانی کے ہیں - سوال یہ ہے کہ آپ کا وہ تصورِ تاریخ جو خارج میں نتائج پیدا
نہیں کر سکتا عین ممکن ہے کہ پختہ ایمان کے لوگوں میں اُن کے ایمان بالغیب کو
DISTUR نہ کرے لیکن یہ تو ممکن ہے کہ اُن کے یقین کا جنازہ نکال دے کیونکہ
ان کا مدار اور یقین کی بنیاد تجرباتی مشاہدات یعنی EMPIRICAL FACT اور
EMPIRICAL VERIFICATI پر ہے اگر ہم یہ کہیں تو ہم سے بڑا احسان فراموش
نہیں ہوگا کہ اس ملک کے عوام اسلام سے زندہ دلچسپی نہیں رکھتے - روزانہ اس
کے مشاہدے ہوتے ہیں الحمد للہ جو کیفیت قلب ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم نے حضرتِ صدیق اکبرؓ کے بارے میں بھی تو یہی فرمایا تھا کہ ولکن شیٔ فی
ب کہ اُن کے دل میں کوئی چیز ہے - تو جو اجتماعی کیفیتِ قلب ہے اسکے بارے
الحمد للہ دلوں کو اطمینان ہے اور ذہنوں کو یہ اندازہ ہے کہ وہ کیفیتِ قلب کتنی گہری ہے اور کتنی
بڑی نعمت ہے - لیکن اُس کے مظاہرِ خارجی کی تخلیق کرنے والی جو قوتیں رہیں
اوقات فتورِ نیت سے اور بعض اوقات فتورِ فہم سے انہوں نے وہ راستے اختیار کئے
اسلام کی آفاقیت سے مطابقت نہیں رکھتے تھے - ایک بات یاد رکھیئے کہ دُنیا کے
کونے میں ایک آدمی بھی جب اسلام کا اصل موقف اختیار کرے گا تو اُس کا مقابلہ

اور معالعفہ صرف وہاں کی قوتیں نہیں کریگی بلکہ چونکہ اسلام کے ہر اصول میں ایک
آفاقیت کارفرما ہے - لہٰذا بدی کی آفاقی قوتیں اُس کے مقابل صف آراء ہو جائینگی
یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر آپ ایک موقف اختیار کریں اور وہ آپ کے محلے تک محدو
رہ جائے تو وہ اسلامی نہیں ہوگا کیونکہ اگر وہ موقف درست ہے، اسلامی ہے یعنی
اگر وحی اتری ہے تو ابو جہل کو تکلیف ہونی ضروری ہے اگر تکلیف نہیں ہو رہی تو وحی
نہیں اتری - تو صورتِ حال یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ملک کا راستہ کوئی اور متعین
کریں، معیشت کا راستہ کوئی اور متعین کریں سیاست کسی اور رُخ سے چلائیں اور خارجہ
پالیسی کسی اور چیز کا اتباع کرتی ہو - اس وقت پاکستان کے استحکام سے بحث کرنے
مطلب یہ ہے کہ پاکستان کی باطنی سالمیت اور اُس کے خارجی وجود کا تحفظ کیا جائے
کہ دُنیا کی بڑی قوتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے لیکن اس کی صورت حال اس وقت الحمد
بہت اچھے امکانات سے پُر ہے - آج سے دس سال پہلے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن
کی مسلمان اقلیتوں میں شعور کی جو لہریں پیدا ہو رہی ہیں اُن سے صَرفِ نظر کرنا
ممکن نہیں ہے - پاکستان کے رول کو اُس کے استحکام کو جب تک اُن سے جوڑ کر
دیکھا جائے گا اس کے معنی واضح نہیں ہوں گے کیونکہ اگر اس کے معنی واضح ہو
تو ملّت کے ایک حصے کی حیثیت سے ہوں گے آپ کا کیا خیال ہے بعض لوگ کہتے
کہ روس کی نظریں گرم پانیوں کے سمندر پر ہیں - یہ لوگ ذہنی طور پہ اٹھارویں
کے اواخر میں رہتے ہیں - انہیں معلوم نہیں ہے کہ آج کی دُنیا کی ٹیکنالوجی میں گرم
اور ٹھنڈے پانی کے کوئی معنی نہیں رہ گئے ہیں، یہ سٹار وار کا زمانہ ہے - معاملہ
اتنا ہے کہ بزعم خویش روس ایک نظریاتی ملک ہے اور اُس کی آبادی میں مسلما
کی CONSOLIDATED آبادی کا بہت بڑا حصہ موجود ہے ایک جگہ پر اور
درمیان ان کی نسل بھی مشترک ہے ان کا کلچر بھی مشترک ہے اور دین بھی مش
ہے - ایک نظریاتی مملکت کی حیثیت سے اُسے اس بات کا خوب اندازہ ہے کہ
دینی اور نظریاتی مملکت کا بالکل اُس کے ساتھ واقع ہونا کتنے بڑے خطرے
ہے - یہ تو بارود خانے کے برابر تنور لگانے والی بات ہے چنگاری کا پتہ نہیں
۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۵ء والی چنگاری کا کسے پتہ تھا - یہ جو آگ اندر جل رہی ہے

علق گرم پانیوں سے نہیں اس کا تعلق کسی شعلے سے ہے ۔ کیونکہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

رصل جس تصورِ تاریخ کی بنیاد پر یہ ملک بنا اُس کے سرچشمے اور اس کے SOU-
RCE کے مطابق اگر ہم اپنا تصورِ تاریخ قائم نہیں کریں گے تو عقل شریف میں کچھ
ے گا عمل شریف میں کچھ آئے گا ۔ حقیقت معاملہ یہ ہے کہ پاکستان بنا تو تاریخ کی اُس
لت سے جس کا سرچشمہ قلب ہے ۔ یہ جو لوگ آج استہزا کے ساتھ کہتے ہیں کہ فلاں
ہز محض ایک نعرہ تھی ۔ نعرے کی حقیقت پر بھی تو غور کیجیے کبھی ہونٹ سے نکلتا ہے،
ہی حلق سے نکلتا ہے، کبھی دل سے نکلتا ہے اور کبھی دل پھاڑ کر نکلتا ہے ۔ تھا تو
رہ لیکن یہ آواز آ کہاں سے رہی تھی ! یہ نعرہ ملّت کا پھڑکتا ہوا دل تھا ۔

چنانچہ جب یہ ہوا کہ تصورِ تاریخ آپ نے کہیں سے لیا اور نتائجِ تاریخ کسی
ور ذریعے سے برآمد کئے تو ان کے درمیان جو اختلاف پیدا ہوا اُس اختلاف کا لازمی
یجہ انتشار تھا اور اُس انتشار نے دو نتائج پیدا کئے ایک نصب العین کی خیرگی ۔
ج اگر پاکستان کا کوئی باطنی بحران ہے تو وہ یہ ہے کہ نصب العین خیرہ ہو گیا ہے ۔
ک کو محض بچا لینا نصب العین نہیں شرط ہے ۔ جس طرح سانس لینا زندگی نہیں
طِ زندگی ہے ۔ ملک کو خارجی حملوں سے اور اندرونی سازشوں سے بچا لینا
بُ العین نہیں ہے ۔ نصبُ العین تو آفاقی ہو گا ۔ نصبُ العین تو یہ ہو گا کہ پاکستان
لحمدللہ مستحکم و مضبوط ہے اب اِس کا بین الاقوامی سیاست میں کیا رول ہو ۔ پوری
یا میں اسلام کی ایک مصلحتِ کلّی ہے جو ایک بسیط حقیقت کے طور پر عمل (OPERATE)
ر رہی ہے اُس میں پاکستان کا کیا رول ہو ۔ نصبُ العین کی بحث تو وہاں ہو گی ۔ یہ تو
م صرف شرط پر گفتگو کر رہے ہیں ۔ اصل بات یہ ہے کہ نصب العین خیرہ ہو گیا ہے ۔
کسی آدمی سے آپ یہ پوچھتے کہ پاکستان اگر توانا اور قوی اور مضبوط اور مستحکم ہو
نے تو دُنیا میں کیا کرے گا اُس شخص کو بیان کی اجازت مغربی طرزِ سیاست سے نہیں ملتی ۔
ذکر وہ منزل وہ مقصود سامنے نہ رکھا گیا تو اس ملک کا جواز ہی باقی نہیں رہتا ۔ سلیم احمد
ایک جگہ لکھا تھا کہ ہمارا جمہوریت سے معاملہ مرحوم آغا کی صاحبزادی کا سا ہے

کہ کبھی تو آقا سے وفاداری یاد آتی ہے تو اُس کی خدمت میں لگ جاتے ہیں کبھی
بُعد محسوس ہوتا ہے تو ہٹ کر دور بیٹھ جاتے ہیں کہ اب آقا تو رہے نہیں اب اِن
کیا پاسداری کرنی ۔ یہ خیرگی ہے ۔ اور یہ خیرگی ایک باطنی ذہنی اجتماعی کیفیت
کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے ۔ اس کیفیت کا بہت عمدہ تجزیہ " استحکام پاکستان"
میں کیا گیا ہے اور جماعتوں کے اعتبار سے بڑے واضح اور نمایاں (SIGNIFI-
CANT) انداز میں کیا گیا ہے ۔ اگر نصب العین میں باطنی یعنی خیال کی سطح پر اور اجتماعی
امنگ کی سطح پر خیرگی پیدا ہو جائے تو خارج میں تنظیم کی سطح پر بھی پیدا ہو جاتی ہے ۔
بات یاد رکھنے کی ہے کہ نتیجہ خیزی کا تعلق خیال سے نہیں ہے نتیجہ خیزی کا تعلق محض
عمل سے بھی نہیں ہے ۔ نتیجہ خیزی کا تعلق صرف تنظیم سے ہے ۔ بدی کی تنظیم پیدا کر دیں
بدی کے نتائج پیدا ہوں گے ۔ تخلیقِ نتائج کا تعلق تنظیم سے ہے ، خیر کی قوتوں کو
کر دیجئے خیر کے نتائج پیدا ہوں گے ۔ اس لئے جب باطن میں نصب العین کی خیرگی
پیدا ہوئی اور ظاہر میں تنظیم میں بحران پیدا ہوا تو نتیجہ خیزی بند ہو گئی اور سمتِ
معدوم ہو گئی ۔ پاکستان کی تاریخ کو اب ہم ذرا اس نقطۂ نظر سے دیکھیں گے ۔
اس خیرگی کی کارفرمائی کا اثر یہ ہوا کہ ملک میں GROUP CONTRADICTION پیدا ہو گیا
آپ خود غور کیجئے کہ قرآن کے بالکل آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ یہ بات واضح فرماتے
ہیں کہ انسانوں میں سے کچھ مومنین ہوتے ہیں کچھ منافقین اور کچھ کفار ہوتے ہیں
معاملہ کیا ہے ۔ یہ انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کی بنیادی کلید ہے کہ جب ایک
موقف اختیار کیا جائے گا تو اس کے تین ردِعمل پیدا ہوں گے ۔ جسے اسلام کی اصطلاح
میں ایمان کفر اور نفاق کہتے ہیں ۔ ہمارے ہاں کوشش یہ رہی کہ یہ گروپ الگ الگ
مشخص (DEFINE) نہ ہونے پائیں لہٰذا وہ چیز جسے سامنے آکر تاریخ کی حرکت
میں اپنی شکلیں اختیار کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہئے تھا اور اس کے ٹکراؤ سے نتائج
پیدا ہونے چاہئیں تھے وہ چیز قومی مزاج سے ساقط ہو گئی اور قرآنی اعتبار سے
اوقات اس واجب ٹکراؤ (CONFRONTATION) کو جب AVOID کیا جائے
تو اُس کا اثر باطن میں اتر جائے گا ، امت کے باطن میں اتر جائے گا ، فرد کے باطن
میں اتر جائے گا ۔ فرد کے باطن میں اترے گا تو نفاق پیدا ہوگا ۔ امت کے باطن میں

گا تو فروعی اختلافات پیدا کرے گا اور اس سے شرک کی مختلف شکلیں پیدا ہوں گی۔ جو
چیلنج سامنے ہے اُس چیلنج کے مقابل ایک چیلنج ہے۔ اگر خدانخواستہ چیلنج پاکستان
کے وجود کے لئے ہے تو اُن قوتوں کے وجود کے لئے بھی پاکستان کی طرف سے ایک
چیلنج ہو جن کی طرف سے یہ چیلنج پیدا ہو رہا ہے۔

جبتک چیلنج کے جواب میں چیلنج کا تناسب برابر نہیں ہوگا۔ حرکت نتیجہ خیز اور مقصد
سے قریب تر کرنے والی نہیں ہوگی۔ تو یہ باتیں طے کرنی ہیں کہ وہ کونسا بنیادی تضاد
ہے جسکی بنیاد پر اس ملک میں یا دُنیا میں کہیں آپکا موقف طے ہوگا ——— سلام کی بنیاد پر؟
تضاد پیدا ہوتا ہے چونکہ اسلام ایک بسیط حقیقت ہے اس لئے وہ چیلنج وہ تضاد بھی آفاقی
ہوتا ہے ——— تو وہ کون سا بنیادی نقطہ ہے جو آپ کا موقف بنے گا۔ اس کی طرف اشارے
موجود ہیں اور وعدہ ہے کہ اگلی کتاب میں اُس کا ذکر ہوگا۔ وہ چیلنج اور وہ تضاد جب
شدّت اختیار کرتا ہے تو گروپ کی تنظیم کی نوعیت کیا ہوگی۔ کیونکہ ہمارے ہاں تنظیم کی
نوعیت سے مراد سیاسی جماعتیں پالنا سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح موقف وجود کی کلیت چاہتا
ہے اسی طرح تنظیم وجود کی کلیت چاہتی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ آپ کا ایک چوتھائی مفاد
دوسرے کے ایک بٹا آٹھ (۱/۸) مفاد سے وابستہ ہوجائے تو یہ گروپ کی تنظیم ہوگی۔
زندگی اور موت کے سارے وسائل جب وابستہ ہونگے تو تنظیم ہوگی۔ مواخات کا فیصلہ، آپ
کا کیا خیال ہے کہ کسی وقت رقتِ قلب سے پیدا ہوا تھا؟ انسانی فطرت سے پیدا ہوا
تھا کہ تمہارا مذہبی موقف ایک ہے تمہاری سیاسی حیثیت ایک ہے۔ تمہاری مملکت
میں زندگی اور موت ایک ہے تو آؤ جو چیزیں تمہارے درمیان مشترک ہوسکتی ہیں وہ
بھی مشترک ہوجائیں۔ یہ تھا پہلا پتھر پہلی اینٹ تنظیمی اصول کی۔ یہ تفصیلی مسائل ہیں
ان پر گفتگو ہوسکتی ہے لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ آج پاکستان کی تاریخ کو ایک
نئی سطح سے دیکھا جا رہا ہے۔ میں نے پاکستان کی تاریخ کے بارے میں یا مسلمانوں کی
تاریخ کے بارے میں کچھ چیزیں دیکھی ہیں اُن کے نیچے حاشیوں کی بھرمار بھی دیکھی ہے۔
ابن خلدون سے لے کر ٹائن بی تک حوالے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ مقصود
ہمارا زوال کی توجیہ کرنا نہیں۔ ابن خلدون سے لے کر ٹائن بی تک دُنیا کے تمام
فلسفیانِ تاریخ زوال کی توجیہہ کرتے ہیں۔ زوال سے نکلنے کا راستہ کوئی نہیں بتاتا۔

یہ بالکل ایک اصول ہے ۔ یہ تو بتا دیں گے کہ زوال کیوں ہوا ۔ ابن خلدون نے بتا
کہ جب عصبیت زائل ہو جائے تو قوم میں زوال آجاتا ہے ۔ لیکن عصبیت دوبارہ پیدا
کرنے کی کیا شکل ہوگی ۔ ابن خلدون اس پر خاموش رہے ۔ ٹائن بی نے بتایا کہ اگر
معاشرے میں ر RESPONSE) پیدا ہونا ختم ہو جائے تو زوال پیدا ہو جاتا ہے تو ا
سے پوچھا جائے کہ (RESPONSE کیسے پیدا ہوتا ہے تو اس کا ان کے پاس کوئی
جواب نہیں ۔ دُنیا میں صرف ایک کتاب ایسی ہے جو زوال کی توجیہہ ہی نہیں کرتی
زوال سے نکلنے کا راستہ بھی بتاتی ہے اور وہ کتاب ہے قرآن کریم اور اُسی کے سائے
ہم آج بھی زوال سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈ سکتے ہیں ورنہ ہمارے زوال کی توجیہہ پر
مغرب کی کئی یونیورسٹیاں پل رہی ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی صورتِ حال اور عائلی قوانین کا مسئلہ

کل ہند مجلس تعمیر ملت کے جنرل سیکرٹری جناب عبدالرحیم قریشی صاحب کا مفصل انٹرویو

مرتب: مفتی مقبول الرحیم

س: میں قارئین کی سہولت کے لیے گزارش کرتا ہوں کہ گفتگو کے آغاز پر ہی آپ اپنا تعارف کروا دیں۔

ج: میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اِس بات کا موقعہ دیا کہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں کوئی گفتگو کروں۔ جہاں تک میرے تعارف کا تعلق ہے میں مسلمانانِ ہند کی ایک غیر سیاسی، سماجی اور مذہبی تنظیم "کل ہند مجلسِ تعمیرِ ملت" سے وابستہ ہوں اور اُس کا جنرل سیکرٹری ہوں اور اُس کے ساتھ ساتھ "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" جو ہندوستان میں شرعی قوانین یعنی مسلمانوں کے پرسنل لا کے تحفظ کے لیے کوشاں ہے، کا بھی سیکرٹری ہوں۔ جہاں تک مسلمانانِ ہند کی خدمت کا تعلق ہے اِس میدان میں ایک عرصے سے سرگرم عمل ہوں اور اللہ سے یہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ مجھے توفیق دے اور زندگی کے جو بھی دن باقی ہیں اور جو بھی صلاحیتیں اور توانائی ہے، اللہ اپنے دین اور اُس کے ماننے والوں کی خدمت کے لیے قبول کرلے۔

س: کچھ خاندانی پس منظر اور لائف کیریر کے بارے میں فرمائیے۔

ج: خاندانی پس منظر کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ کیونکہ میں اِس بات کا قائل نہیں ہوں کہ خاندانی تفاخر کا جذبہ کوئی بیان کرنے والی چیز ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ بہرحال ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا اور ایک ایسے مسلمان گھرانے

میں پیدا ہوا کہ میرے والد کو پورے محلّے میں مولوی صاحب کہا جاتا تھا کیونکہ وہ توحید کے معاملے میں بہت ہی سخت تھے۔ تعلیم کے معاملے میں بی ایس سی اور ایل ایل بی ہوں۔ گریجویشن کے بعد میں نے ریاضی میں ایم ایس سی کرنے کے لیے داخلہ لیا تھا لیکن گھر کے کچھ حالات ایسے تھے کہ مجھے ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر سے میں نے ملازمت کا آغاز کیا اور پھر میرے لیے ترقی کے بھی خاصے امکانات تھے۔ لیکن بعد میں حالات کچھ ایسے ہوئے کہ میں نے ملازمت سے استعفٰی دے دیا ہُوا یہ کہ ۱۹۵۸ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک اجلاس ہُوا تھا اور اس موقعے پر ہم لوگوں نے وہاں ایک مظاہرہ کیا اور یہ مظاہرہ تھا اُس تباہی کے خلاف جو پولیس ایکشن کے نتیجے میں حیدرآباد میں آئی تھی اور اُس تباہی کے نتیجے میں جن مسلمانوں کی جائداد پر ناجائز قبضے ہوگئے تھے اور پھر اُس کے نتیجے میں جو ہزاروں مسلمان خواتین بیوہ ہوگئی تھیں اُن کے مسائل کے حل کے لیے یہ مظاہرہ کیا گیا تھا۔ اُس نمائندگی اور اُس مظاہرے میں میری شمولیت کی اطلاع جب دفتر کو پہنچی تو انھوں نے بہتر یہ سمجھا کہ مجھے حیدرآباد سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ میرا تبادلہ ایک بہت ہی دُور کے مقام پر کر دیا گیا ترقی کے ساتھ۔ لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ اب اِس بیڑی کو کاٹ دیا جائے اور اس کے بعد پھر کچھ دن سیاست سے منسلک رہا جبکہ اِس وقت میں ایک ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے "مجلس تعمیرِ ملّت" میں خدمات انجام دے رہا ہوں۔

س : اِس وقت آپ جس معاملے کو سُلجھانے میں لگے ہُوئے ہیں، اُس کے حوالے سے میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ "شاہ بانو کیس" میں بھارتی سپریم کورٹ نے فیصلہ کس بنیاد پر دیا تھا۔

ج : اِس مسئلے کی وضاحت کے لیے اُس کے پس منظر کا جاننا بہت ضروری ہے جہاں تک نفقے کا تعلق ہے، غیر منقسم ہندوستان کے ضابطہ فوجداری یعنی (CRIMINAL PROCEDURE CODE) میں ایک دفعہ تھی ۴۸۸۔ اُس دفعہ میں جہاں اور بہت سی چیزیں تھیں، وہاں یہ بھی تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو نان نفقہ نہ دے تو اس میں یہ گنجائش رکھی گئی تھی کہ بیوی مجسٹریٹ سے رجوع کرکے

نان نفقہ کی ادائیگی کا حکم حاصل کر سکتی ہے۔ تقسیم ملک کے وقت یہی قانون رائج تھا۔ پھر ہندوستان میں بھی یہ ایک عرصے تک رائج رہا۔ ۱۹۷۳ء میں ہندوستان نے اِس ضابطہ فوجداری کی نئی تدوین کی۔ جب وقت یہ نئی تدوین کی جا رہی تھی اُس وقت مسودے میں "بیوی" کی تعریف یوں کی گئی کہ وہ عورت بھی بیوی ہی سمجھی جائے گی۔ جس نے خود طلاق لے لی ہو یا جسے مرد نے طلاق دے دی ہو۔ مگر اُس عورت نے دوسری شادی نہ کی ہو۔ تو گویا اُس وقت قانون یہ بنا کہ کوئی ایسی مطلقہ عورت جس نے دوسری شادی نہیں کی ہے، وہ دوسری شادی تک یا بصورتِ دیگر تاحیات اپنے سابقہ شوہر سے نفقہ پائے گی۔ جب یہ چیز ہمارے علم میں آئی تو مسلم پرسنل لاء بورڈ نے جو تمام مسلم جماعتوں کا مشترکہ پلیٹ فارم ہے، شرعی عائلی قوانین کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اُس وقت کی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔ انہوں نے ہمارے مطالبہ کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں نئے ضابطۂ فوجداری کی تیسری خواندگی کے دوران ترمیم کروائی اور ایک ذیلی دفعہ کا اضافہ کیا کہ اگر پرسنل لاء یا مروجہ قانون کے تحت جو واجبات عائد ہوتے ہیں اگر وہ دے دیئے جائیں تو ایسی صورت میں تاعقدِ ثانی یا تاحیات نفقہ دینے کا حکم مجسٹریٹ منسوخ کر دے گا۔ اُس پر ہم مطمئن تھے کیونکہ زوجہ کی تعریف میں مطلقہ کو شامل کرنے سے شریعت پر جو اثر پڑ سکتا تھا اُس کی تلافی کر دی گئی تھی۔ اب جب "شاہ بانو" کا مقدمہ سپریم کورٹ میں آیا اور سپریم کورٹ میں اُس پر جو فیصلہ دیا وہ کئی اعتبار سے انتہائی قابلِ اعتراض ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ فیصلے کی جو زبان ہے اُس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ایسے شخص نے یہ فیصلہ لکھا ہے جو اسلام سے انتہائی بغض اور عناد اپنے دل میں رکھتا ہے۔ چنانچہ فیصلے کے پہلے ہی پیراگراف میں ایک انتہائی غیر معروف انگریز مصنف کے حوالے سے یہ لکھا گیا ہے کہ "اسلام کا مہلک ترین پہلو عورتوں کی اہانت ہے۔"

"The most fatal point of Islam is degradation of women"

یہ اُس فیصلے کا جملہ ہے۔ پھر انہوں نے یہ کہا ہے کہ اگر پرسنل لاء کا تصادم ملک کے کسی قانون سے ہوتا ہے تو ملک کا قانون فوقیت رکھے گا اور پرسنل لاء کا تعلق ظاہر ہے

مسلمانوں کی شریعت سے ہے ملکی قانون سے نہیں۔ اِس کے علاوہ ایک اور بات
انتہائی تشویش اور اندیشے کی تھی وہ یہ تھی کہ سپریم کورٹ نے مسلمانوں کی ان تمام
لیوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہ جن میں یہ صاف لکھا تھا کہ مطلقہ عورت کے نان نفقے کی
نہ داری شوہر پر صرف عدت کے دنوں تک ہی رہتی ہے۔ یہ بھی کہا کہ قرآن حکیم سے
حکم بھی نکالا جا سکتا ہے کہ سابقہ شوہر تا عقدِ ثانی یا تا حینِ حیات مطلقہ کو نان
نفقہ دینے کا پابند ہے اور اس کے لیے سورہ بقرہ کی آیت " مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ
حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ " یہاں اب ہمارے سامنے صرف مطلقہ کے نفقے کا معاملہ
نہیں تھا بلکہ معاملہ یہ تھا کہ کیا ہم سپریم کورٹ کو اِس بات کی اجازت دیں کہ وہ
قرآن کی من مانی تشریح اور پھر اُس من مانی تشریح کے ذریعے ہم پر ایک قانون مسلط
کرے۔ اور یہ کہے کہ یہ قانون قرآن سے اخذ کیا ہوا قانون ہے اور ہندوستان
کی عدلیہ میں یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ ایک عدالت نے اِس بات کی کوشش کی ہے
کہ اپنے طور پر قرآن کی ایک آیت کے معنیٰ و مفہوم کو متعین کرے۔ اور ظاہر ہے
مسلمان کے لئے چاہے وہ کتنا ہی بڑے سے بڑا ادارہ ہو اگر اُس ادارے کے لوگ
قرآن کو آسمانی اور الٰہی صحیفہ نہیں مانتے اور اُس پر ایمان نہیں رکھتے اور قرآن
کے فہم کے لیے جو بنیادی صلاحیتیں ہونا ضروری ہیں اُن سے محروم ہیں تو ظاہر ہے
ایسے کسی ادارے کو ہم ایسے اختیارات نہیں دے سکتے۔ کہ وہ ایسی کوئی تعریف کرے
ایسی کوئی تاویل کرے۔ اِس فیصلے سے ہمیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس مرحلے پر
اگر سیلاب کے آگے پشتہ نہ باندھیں اور اس فیصلے کے اثر کو زائل کروانے کی
کوشش نہ کریں تو پھر خدانخواستہ، خدانخواستہ ہمیں وہ دن بھی دیکھنا پڑے گا،
بلکہ قرآن کی ہر آیت کو اِسی طرح مسخ کیا جائے گا۔ اور اسی طرح غلط تاویل کر کے
اس کو مسلمانوں کے اوپر ٹھونسا جائے گا۔ قرآن کی یہ غلط تاویل کرتے ہوئے
سپریم کورٹ نے کہا کہ اسلام میں اس بات کی گنجائش ہے کہ مطلقہ عورت سابقہ
شوہر سے تا عقدِ ثانی یا تا حینِ حیات نان نفقہ حاصل کرنے کی حقدار ہے۔ جب
یہ تاویل مسلمانوں کے سامنے لائی گئی تو مسلمانوں کے اندر ہیجان پیدا ہوا بے چینی پیدا
ہوئی۔ "مسلم پرسنل لاء بورڈ" نے یہ مہم شروع کی اور اس مہم کو منظم کیا کہ حکومت

ہند نئی قانون سازی کے ذریعے اِس فیصلے کے اثر کو زائل کر دے۔ اِس مسئلے کی وجہ سے صرف یہ کہ جماعتی لحاظ سے مسلمانوں کے اندر اتحاد پیدا ہُوا بلکہ مسالک کے لحاظ سے بھی بڑا قرب پیدا ہُوا۔ چنانچہ "مسلم پرسنل لاء بورڈ" کے اندر شیعہ حضرات بھی ہیں اور انہوں نے پوری مہم میں بہت بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اس کے ساتھ "داؤدی بوہری جماعت" بھی ہمارے ساتھ شریک رہی ہے اور اِس وقت تک ہماری شریکِ کار ہے۔ وزیرِ اعظم سے ہماری ملاقات کے بعد وزیرِ اعظم نے یہ محسوس کیا کہ اِس معاملے پر مسلمان متحد و متفق ہیں اور جب تک اِس فیصلے کے مضر قانونی اثرات کو ختم نہیں کیا جائے گا قانون سازی کے ذریعے مسلمان مطمئن نہیں ہوں گے تو حکومت کی جانب سے ایک مسوّدہ قانون پیش کیا گیا ہے جس میں ہمارے اُس بنیادی مطالبے کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مطلقہ کے نفقہ کے بارے میں سابقہ شوہر کی ذمّہ داری کی مدّت صرف عدّت کی مدّت تک رہتی ہے اُس کے بعد نہیں البتہ اِس مسوّدہ قانون میں کچھ سقم پائے جاتے ہیں۔ اِس لیے ہم نے پرسنل لاء بورڈ کی طرف سے کئی ترامیم تجویز کی ہیں۔ اور اب ہم توقع رکھتے ہیں کہ مئی میں پارلیمنٹ کے اجلاس میں اِس پر بحث ہو گی اور انشاء اللہ امید ہے کہ ہمارے مطالبے کے مطابق اصلاح ہو جائے گی۔

س : غالباً دنیا کے کسی بھی مذہب میں یہ پابندی نہیں ہے کہ شوہر مطلقہ عورت کو تاحیات یا تا عقدِ ثانی نان نفقہ دے۔ اِس لیے فوراً ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے دیگر مذاہب کے پیروکاروں نے آپ کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔ یا آپ نے اُن کا تعاون حاصل کیوں نہیں کیا

ج : ہندوستان میں اس وقت کیفیت کچھ اور ہے۔ وہاں اُس وقت رائج قانون کے لحاظ سے مسلمانوں کو چھوڑ کر دوسرے تمام شہریوں کے لیے یعنی دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے لیے لازم ہے کہ اگر وہ بیوی کو طلاق دیتے ہیں تو انہیں تا عقدِ ثانی یا تاحیات نفقہ دینا پڑے گا۔ چنانچہ جب یہ سپریم کورٹ کا فیصلہ آیا اور اُس کے خلاف مسلمانوں نے یہ آواز اُٹھائی کہ یہ ہماری شریعت میں مداخلت ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ مطالبہ یا

ہماری کشمکش حکومت کے ساتھ ہے اور ہم چاہتے تھے کہ دوسرے مذاہب کے عوام بھی ہمارا ساتھ دیں اور ہم نے اس کے لیے بہت کوشش بھی کی لیکن انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندو سماج کا ایک بڑا طبقہ یہ سمجھتا رہا کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ دراصل اُن کی جیت ہے۔ اور اس فیصلے کے ذریعے ہندو سماج کو ایک موقع مل گیا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیبی اور تمدنی انفرادیت کو ختم کر دے۔ چنانچہ وہاں کے پریس نے بجز اردو پریس کے جو کہ مسلمانوں کے کنٹرول میں ہے، نے بڑی شدید مہم چلائی اور ایک انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو اور شاہ بانو کے نام کو ہندو صحافت نے اسلام پر تنقید کے لیے اور اسلام پر بے جا حملوں کے لیے استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری خواہش اور کوشش کے باوجود ہمیں دوسروں کا تعاون نہیں مل سکا۔

س : نان نفقے کا یہ قانون دوسرے مذاہب کے لوگوں پر عملاً نافذ بھی ہوتا ہے یا نہیں ؟۔

ج : قانون تو یہی ہے۔ لیکن ہندو سماج میں طلاق کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں ۔ اب قانوناً یہ تصور پیدا کیا گیا ہے مگر عملاً ہندو معاشرے میں طلاق شاذونادر ہی ہوتی ہے لیکن ہو جائے تو قانون نافذ کیا جاتا ہے۔

س : عیسائی اقلیت کا کیا ردِعمل ہے ۔

ج : عیسائی بھی اب بیدار ہوئے ہیں اور اپنی انفرادیت قائم کرنے کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ ماہ اُن کی بھی ایک کانفرنس ہوئی تھی جس میں انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ ہمیں بھی مسلمانوں کی طرح اس قانون سے مستثنٰی قرار دیا جائے۔

س : پاکستانی پریس میں خبر چھپی ہے کہ شاہ بانو نے ادائیگی مہر کا نیا مقدمہ دائر کیا ہے جس میں تین ہزار طلائی سکوں کی مانگ کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ براہِ راست معلومات آپ فراہم کرنا پسند کریں گے۔

ج : شاہ بانو نے تاحیات نفقے کا جو پروانہ حاصل کیا تھا سپریم کورٹ سے اُس سے تو وہ دستبردار ہو گئی ہے لیکن اب اس نے مہر کی رقم کے بارے میں مقدمہ دائر کیا ہے

اس کا کہنا یہ ہے کہ جس وقت نکاح ہوا تھا اُس وقت چاندی کے سکے مہر میں باندھے گئے تھے اِس لیے آج بازار میں اُن سکوں کا جو نرخ ہے اُس لحاظ سے یعنی چاندی کی قیمت کے حساب سے ادائیگی کی جائے۔ اور یہ مطالبہ اُس کا جائز ہے۔ اِس میں مداخلت فی الدین کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ عدالت صرف رقم کا تعین کرے گی۔

س: "شاہ بانو" کیس اتفاقاً شروع ہوا یا اِس کے پس منظر میں کوئی پلاننگ یا سازش تھی؟

ج: نہیں! یہ مقدمہ تو بالکل اتفاقاً شروع ہوا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی سازش نہیں تھی۔ البتہ اِس کے بعد جو مختلف مقدمات سپریم کورٹ میں آئے ہیں اور ابھی التوا میں پڑے ہیں وہ سب باقاعدہ منصوبہ بندی اور سازش کے ذریعے اور ایک مہم کے طور پر دائر کیے گئے ہیں۔ مہاراشٹر میں ایک تنظیم ہے "مسلم ستیہ شودھک منڈل"۔ لیکن صرف نام کے ساتھ لفظ مسلم لگا یا گیا ہے اور اس مہم کو چلانے والے اور آگے بڑھانے والوں میں کوئی مسلمان نہیں۔ یہ انجمن بنائی تھی ایک شخص نے جس کا نام تھا حمید دلوائی۔ اس نے کئی دفعہ اعلان کیا تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں مگر میرا نام مسلمانوں جیسا ہے۔ اب اُس کی بیوی جس کا نام مہرالنساء ہے اِس تنظیم کو چلا رہی ہے لیکن اسلام سے وہ کس حد تک وابستہ ہے اِس کا اندازہ آپ اِس سے لگا سکتے ہیں کہ اُس نے اپنی بیٹی کی شادی خود ایک ہندو سے کی اور اِس پر فخر کا اظہار کیا کہ میں اپنی بیٹی کی شادی ایک ہندو سے کر رہی ہوں اِس کے پیچھے جو لوگ ہیں وہ زیادہ تر آر ایس ایس سے متعلق یا پھر جنتا پارٹی کے لوگ ہیں۔ چنانچہ اِس وقت "ستیہ شودھک منڈل" کی طرف سے جو بھی سرگرمی ہے، اُسے جنتا پارٹی کے مشہور لیڈر ڈنڈاوتی کی اہلیہ کی تائید اور آشیرواد حاصل ہے۔ اِس تنظیم نے کچھ مسلمان عورتوں کو تیار کیا ہے اور اُن کے ذریعے اِس وقت تین مقدمات سپریم کورٹ میں دائر کیے جا چکے ہیں اور ان تینوں مقدمات میں مطالبہ یہی ہے کہ شریعت کے قانون کے نفاذ کے بارے میں انگریزوں نے جو قانون بنایا تھا جسے نفاذِ شریعت ایکٹ (SHARIAT APPLICATION ACT) کہا جاتا ہے اُسے منسوخ کیا جائے۔

س: ایک ہندو مسلم شادی کا ذکر کیا ہے آپ نے۔ ابھی کچھ دن پہلے مشہور ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر کی بیٹیوں کے بارے میں خبر چھپی تھی کہ انہوں نے ہندوؤں سے شادیاں کی ہیں۔ یہ بھارتی مسلمانوں میں کوئی عام رو ہے یا صرف ایک مخصوص طبقہ ہے جو یہ کام کر رہا ہے۔

ج: جہاں تک ہندوؤں سے شادی بیاہ کا معاملہ ہے یہ مسلمانوں میں عام بات نہیں ہے۔ یہ صرف ترقی پسند طبقے تک یا اشتراکی خیالات کے حامی طبقے تک محدود ہے یا جدید تہذیب سے متاثر اس فیشن پرست اور امیر طبقے میں بھی یہ چیز پائی جاتی ہے جن کے گھروں سے دین کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ختم ہو چکا ہے ہندوستان کا عام مسلمان اس وبا سے بالکل محفوظ ہے۔ صرف چند خاندان جو نسلی اعتبار سے تو مسلمان ہیں لیکن عملاً دین سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ

س: مسلم معاشرے میں ایسے لوگوں کا تناسب کیا ہے؟

ج: بمشکل دس ہزار میں ایک۔

س: کیا کچھ اونچے مسلم سیاسی گھرانے بھی اس کام میں شریک ہیں۔

ج: نہیں۔ سیاسی سطح پر ایسی کوئی بات نہیں۔ صرف وہی گھرانے جو ترقی پسند کے حامل ہیں یا فیشن زدہ ہیں وہیں تک یہ چیز محدود ہے۔

س: ہندو مسلمانوں کو لڑکی دیتے بھی ہیں یا صرف لڑکی لینے کا معاملہ ہے۔ یا دونوں طرح کا سلسلہ ہوتا

ج: دونوں طرح کا معاملہ ہے۔ اصل میں لڑکی لینے کا معاملہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی مسلمان لڑکی کو کسی ہندو یا غیر مسلم لڑکے کے ساتھ رہنے کا موقع ملتا ہے جیسے کسی دفتر میں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور انہوں نے شادی کر لی۔ لیکن جہاں تک لڑکی لینے کا معاملہ ہے تو ایسی صورت میں بالعموم لڑکی اسلام قبول کر لیتی ہے اور ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ لڑکی بت رہے یا اپنے مذہب پہ قائم رہے۔ لڑکی بالعموم مسلمان ہو جاتی ہے۔

س۔ آزادی کے بعد مسلمان معاشرے میں اور بالخصوص مسلم خواتین میں اسلام کے ساتھ

تعلق میں اضافہ ہوا ہے یا کچھ کمی محسوس کرتے ہیں آپ ۔

- مسلمانوں میں چاہے وہ مرد ہو یا عورت آزادی کے بعد سے اُس میں اسلام سے وابستگی کا احساس بڑھا ہے ۔ حالانکہ حالات بہت ہی ہمت شکن محسوس ہوتے تھے لیکن مسلمانوں میں اسلام سے وابستگی کے جذبے میں اضافہ ہوا ہے اور خواتین میں بھی یہ بات جذبے اور احساس کی حد تک بالکل صحیح ہے ۔ البتہ رسوم و رواج بڑی حد تک اُسی ڈگر پر ہیں جس ڈگر پر تقسیم سے پہلے تھے ۔ لیکن اب کچھ عرصے سے مختلف تنظیموں کی کوششوں کے نتیجے میں اور شاہ بانو کیس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تحفظِ شریعت کی ملک گیر مہم کے نتیجے میں خود مسلمان خواتین میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ وہ غیر اسلامی رسوم و رواج کو ترک کریں ۔ اور اگر دیکھا جائے تو معاشرے میں پائے جانے والے مختلف رسوم اور رواجات کے قائم رہنے کا ایک بڑا سبب عورتوں کا اُن پر سختی سے کاربند رہنا ہے ۔ اور اگر معاشرے کے اس طبقے یعنی خواتین کی اصلاح ہو جائے تو بڑی حد تک ان چیزوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ مسلم پرسنل لاء بورڈ میں یہ تجویز زیرِ غور ہے کہ اب اس مہم کو زیادہ تیزی سے چلایا جائے کہ مسلمانوں کو ہر لحاظ سے اور مسلم خواتین کو بطورِ خاص اسلام سے شعوری طور پر وابستہ کیا جائے اور اُن کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اسلام پر کاربند رہیں اور جو غیر اسلامی طور طریقے اور رسوم و رواجات اُن کے معاشرے میں راہ پا گئے ہیں اُن کو ترک کریں ۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آزادی کے بعد سے اسلام سے وابستگی میں اضافہ ہوا ہے ۔

- ہندوستان سے آئے دن دلہنوں کو جہیز نہ لانے یا کم جہیز لانے کی پاداش میں زندہ جلا دینے کی خبریں آتی رہتی ہیں ۔ ایسے واقعات مسلمانوں کے ہاں بھی ہوتے ہیں یا صرف ہندوؤں کے ہاں یا دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں بھی یہ لعنت پیدا ہو گئی ہے ۔

- اللہ کا انتہائی فضل و کرم ہے کہ دلہنوں اور بیویوں کو جلانے کا ایک بھی کیس مسلمانوں کے ہاں نہیں ہوا ۔ یہ چیز صرف ہندو معاشرے کی حد تک ہی محدود ہے ۔ دیگر مذاہب میں بھی ایسا کوئی واقعہ سننے میں نہیں آیا ۔ البتہ ہندو معاشرے میں یہ

بیماری بہت بڑھتی جارہی ہے۔ چنانچہ اس شاہ بانو کیس کے سلسلے میں جب ہماری یہ مہم چل رہی تھی تو ہندوؤں کے اعتراضات کے جواب میں ہم یہی کہتے کہ آپ جو تا عقد ثانی یا تا حیات نفقے کے لزوم کی بات کرتے ہیں اگر ہم بھی اسے مان لیں تو ہمارے معاشرے کا بھی وہی حشر ہوگا جو تمہارے سماج کا ہو رہا ہے۔ ظاہر کہ ایسی صورت میں مرد بیوی کو چھوڑے گا نہیں۔ وہ تو یہی سمجھے گا کہ میں چھوڑ بھی اور نفقے کی ذمّہ داری بھی قبول کروں۔ کیوں نہ اُسے مصیبت میں مبتلا کر چھوڑنے کی تو ایک ہی صورت باقی رہے گی جو دلہنوں کو زندہ جلانے کی صورت میں ہندو معاشرے میں پائی جاتی ہے۔

س۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی عمومی کیفیت کیسی ہے۔

ج۔ اگر ہم تقسیم ملک سے بہت پہلے کے حالات کا موازنہ آج کے حالات سے کریں تو ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو مایوسی کی صورت حال نظر آئے۔ لیکن تقسیم ہند کے فوراً بعد جو مسلمانوں کی کیفیت تھی اُس کے مقابلے میں آج کی کیفیت اور حالات بہت اُمید افزا ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فسادات ہوتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیمی نصاب میں ہندوؤں کے مشرکانہ تصورات کی تبلیغ موجود ہے تاریخ کے نصاب سے مسلم دور کو نکال دیا گیا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آج مسلمان میں ہندوستان کے اندر بحیثیت مسلمان زندہ رہنے کا حوصلہ پایا جاتا ہے اور یہ چیز بہت خوش آئند ہے کہ اب مسلمان میں یہ حوصلہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ فسادات میں صرف مار نہیں کھائے گا بلکہ مقابلہ کرے گا اور ہندوستان میں زندہ رہنے کے لئے اپنی مساویانہ حیثیت کو منوائے گا۔ مسلمانوں کے اندر اس عزم اور حوصلے کا پایا جانا میرے نزدیک ایک بہت اُمید افزا بات ہے۔ اس نے مایوسی کا خاتمہ کر دیا ہے۔

س۔ تقسیم کے بعد یوپی میں جہاں مسلمانوں کی زمینیں تھیں حکومت نے زمینداری ختم کر دیا اور پھر ملازمتوں کے دروازے بھی مسلمانوں پر بند ہو گئے اس کے نتیجے میں مسلمان تجارت کی طرف بھی راغب ہوتے ہیں یا نہیں یا ان کا رجحان دستکاری

کی طرف زیادہ ہو رہا ہے۔

ج ۔ ملازمتوں کے دروازے بند ہونے اور زمینداری کے خاتمے کے نتیجے میں مسلمان ایک معاشی مشکل کا شکار تو ہوا لیکن فوراً ہی انہوں نے متبادل ذریعے تلاش کر لیئے ہیں ۔ اُن ذرائع میں چھوٹی تجارت ہے ، بڑی تجارت میں تو اب بھی مسلمان بہت پیچھے ہیں ، دستکاریاں ہیں اور بعض چھوٹی صنعتیں ہیں ۔ ان شعبوں میں مسلمان آگے آرہے ہیں لہٰذا اب مسلمان نے صرف سرکاری ملازمتوں پر تکیہ کرنا چھوڑ دیا ہے ۔

س ۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا مسلمان مجموعی طور پر مفلوک الحال نہیں ہے بلکہ متوسط طبقے میں شامل ہے ۔

ج ۔ جی ہاں ۔ آپ کا اندازہ درست ہے ۔

س : اپنی نئی نسل کو اپنے دین اور اپنی زبان سے آشنا رکھنے اور نصاب میں شامل ہندوانہ اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا کر رہے ہیں ۔

ج ۔ مسلمانوں کی جانب سے اس طرح کی کوششیں مسلسل ہو رہی ہیں ۔ خود میرا تعلق جس تنظیم سے ہے اُس کا پہلا مقصد ہی اسلامی تعلیمات کی اشاعت ہے اور اس میں بھی ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نوخیز نسل کو دین سے واقف کرایا جائے ۔ اُن کی دینی تعلیم کا بندوبست کیا جائے ۔ چنانچہ جزوقتی اور شبینہ مکتب ہماری تنظیم کے تحت چلائے جاتے ہیں ۔ اسی طرح اور بھی دینی اور رفاہی ادارے اس کام پر توجہ دیتے ہیں ۔ لیکن ہندوستان جتنا وسیع اور عریض ملک ہے اور مسلمان جس طرح سے پھیلے ہوتے ہیں دیہات دیہات ، اُس لحاظ سے اس کام کو اور بھی وسیع پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ جو زہر پھیلایا جا رہا ہے اُس کا جب تک ہم تریاق فراہم نہیں کریں گے اور نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کے ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کریں گے ہندوستان میں ہمارا مستقبل محفوظ نہیں ہو سکتا ۔

س ۔ آپ کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے جہاں تقسیم ملک کے وقت تک اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی حکومت تھی جسے تقسیم کے فوراً بعد ختم کر دیا گیا

اُس کا ایک شدید منفی اثر بھی ہوا وہاں کے مسلمانوں پر۔ اس حوالے سے اب حیدر آباد کے مسلمانوں کی کیا حالت ہے۔

ج - یہ سوال آپ نے بہت اچھا کیا۔ ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد میں پولیس ایکشن کے نام سے جو فوجی کارروائی ہوئی اور جس کے نتیجے میں ریاست حیدر آباد کو ہندوستان میں شامل کیا گیا۔ یہ سانحہ اور المیہ ہمارے لئے محض اقتدار کی تبدیلی یا حکمران کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ ہمارے لئے یہ ایسا ہی صدمہ تھا جیسا کہ عالم اسلام کے لئے بغداد کا سقوط۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صحیح یا غلط ہم نے نظام کی حکومت اور نظام کو دین سے وابستہ کر لیا تھا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ریاست حیدر آباد اسلام کی آخری نشانی ہے اور ہمارے ذہنوں میں یہ بھی تصور بیٹھ گیا کہ بادشاہ کے اوپر چالیس اولیاء اللہ کا سایہ ہوتا ہے اور بادشاہ کو گزند اور کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا چنانچہ اسی قسم کا دعویٰ حیدر آباد کے آخری فرمانروا میر عثمان علی خاں نے اپنے ایک شعر میں بھی کیا ہے کہ

سلاطین سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

ایسی سلطنت جب بھارتی فوج کے ایک حملے کی بھی تاب نہ لا سکی اور ختم ہوئی تو اُس کا جو اثر نوجوانوں پر اور بالخصوص تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مترتب ہوا وہ یہ تھا کہ جو سلطنت اسلام کا نشان ہو اسلام کی قوت کا نشان ہو اگر ایک حملے کی تاب نہ لا سکے اُس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے اندر کوئی حقانیت نہیں کوئی صداقت نہیں۔ چنانچہ اُس پولیس ایکشن کے جہاں دوسرے بہت سے نتائج ہیں کہ صاحب مسلمان لٹ گئے تباہ ہو گئے۔ معاشی طور پر بالکل برباد ہو گئے۔ ان چیزوں سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے نوجوان طبقے کا اپنے دین پر سے یقین اور اعتماد ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تقسیم ملک کے فوراً بعد ریاست حیدر آباد کے اندر کمیونسٹ پارٹی کو بڑی تقویت ملی۔ ظاہر ہے کہ مسلمان اسلام پر سے اعتماد اٹھنے کے بعد اُسی طرف لپکنے لگے اُسی طرف دوڑنے لگے۔ اس سلسلے میں خلیل اللہ حسینی صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے وقت کی نزاکت کو

دئے آگے بڑھ کر مسلم نوجوانوں کو بتایا کہ ریاستِ حیدرآباد کی شکست اس وجہ سے
ہں تھی کہ یہ مسلمانوں کے اقتدار کی آخری نشان تھی بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ
انے اسلام کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مسلسل کوشش کی کہ مسلمانانِ
یدرآباد کا اسلام پر اعتماد بحال ہو۔ ان کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور جیسا
آپ جانتے ہیں کہ دین پر اعتماد انسان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ اپنے
پ پر اپنی صلاحیتوں پر اعتماد پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ آج حیدرآباد
مسلمان زندگی کے ہر میدان میں نہ صرف جما ہوا ہے بلکہ اپنی صلاحیتوں کو منوا رہا
ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہندوستان سے باہر حیدرآباد کے مسلمانوں نے نہ
رف یہ کہ اپنی صلاحیتوں کو منوایا بلکہ جہاں جہاں بھی وہ ہیں امریکہ میں یورپ میں
لینڈ میں مشرقِ وسطیٰ میں وہ کسی نہ کسی اسلامی تحریک، کسی نہ کسی اسلامی جماعت
سی نہ کسی اسلامی کام کے اندر جُتے ہوئے ہیں اور پوری لگن کے ساتھ اسلام کے
اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر رہے ہیں۔

ں۔ اس وقت حیدرآباد کے اندر مسلمانوں کی صورتحال کیسی ہے۔

ج۔ اس وقت موجودہ صورتحال مسلمانوں کی یہ ہے کہ مسلمان وہاں نہ صرف
اپنے آپ کو منوانا چاہتا ہے بلکہ اپنے پورے دینی اور تہذیبی تشخص کے ساتھ
منوانا چاہتا ہے۔ چنانچہ بہت سی تجارتوں میں جہاں پولیس ایکشن سے پہلے
مسلمان نہیں تھے۔ آج مسلمان آپ کو ملیں گے۔ صنعت کے اندر پولیس ایکشن
سے پہلے ایک بھی مسلمان نہیں تھا لیکن آج چھوٹی صنعتوں کے اندر ماشاء اللہ
مسلمان خوب لگے ہوتے ہیں اور اسی طرح سے اردو کے تحفظ کے لئے حیدرآباد
کا مسلمان ڈٹا ہوا ہے۔ تو ایک عام تاثر جو تھا کہ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد
کا مسلمان مر جائے گا تو وہ مرا نہیں ہے۔ اللہ نے اُس کو زندہ رکھا ہے اور اللہ
ہی اُس کا محافظ ہے۔

س۔ نظام کے خاندان اور پسماندگان کی کیا سماجی اور سیاسی حیثیت ہے۔
حیدرآباد میں مسلمانوں کی قیادت میں اُن کا بھی کچھ ہے یا نہیں۔

ج۔ نہیں۔ اب تو نظام کے اہلِ خاندان کی حیثیت بھی عام شہریوں کی سی ہے

بہت سے لوگ اُن کے ہندوستان سے باہر رہتے ہیں ۔ اب سیاست یا قیادت
میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہے ۔

س : آسام میں جو جوانوں کی حکومت بن گئی ہے ۔ اس مسئلے کا بھی مسلمانوں سے
ایک خاص تعلق ہے آپ نے بھی اس ضمن میں خاصا کام کیا ہے ۔ اب وہاں مسلم
کا مسئلہ کس مقام پر ہے ۔ نئی حکومت اپنے الیکشن سے پہلے والے موقف
پر ہی قائم ہے یا اُنہیں حقائق کا کچھ احساس ہوا ہے ۔

ج : نئی حکومت کو کچھ تھوڑا سا حقائق کا احساس ہوا ہے اور نئی حکومت اس
بات کا اعلان کر رہی ہے کہ اس سے پہلے جو وعدے اُن لوگوں کے بارے
میں کیے گئے جو کہ غیر آسامی ہیں وہ اُنہیں نبھانے کی کوشش کرے گی ۔
نئی حکومت پر عہدہ سنبھالنے کے بعد کچھ حقائق منکشف ہوتے ہیں ۔ آسام کے
مسلمانوں کے مسئلے میں ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کیونکہ یہ پہلو
بہت کم سامنے آیا ہے ۔ وہ یہ ہے کہ وہاں جو مسلمان بنگالی نژاد ہیں جنہیں
عموماً غیر ملکی یا بنگلہ دیشی کہا جاتا ہے وہ یعنی ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کے
دور میں آ کر وہاں آباد ہوتے تھے یہ اُن کی اولاد ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ
نسلاً بنگالی ہیں ان کی زبان بنگالی ہے لیکن اس بنیاد پر اُنہیں بنگلہ دیشی
قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اُن کے آباؤ اجداد کا تعلق اُس علاقے سے رہا ہے
جو آج بنگلہ دیش میں شامل ہے ۔ کیونکہ جس وقت ہندوستان آزاد ہوا
ہے وہ آسام کے باشندے تھے ۔ آسام کے اندر ان کی سکونت تھی اور اس
اعتبار سے وہ ہندوستانی شہری ہیں ۔ اب سلسلے میں جو پروپیگنڈا کیا جاتا
ہے اُس میں اس حقیقت کو کسی نے چیلنج نہیں کیا اصل میں کہا یہ جاتا ہے
کہ صاحب وہاں کے مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کی جو شرح ہے وہ بالکل غیر
معلوم ہوتی ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمانوں کی آبادی میں دس سال کے اندر
پینتیس فیصد یا چالیس فیصد اضافہ ہوا ۔ یہ اضافہ اُس صورت میں ممکن ہے
کہ جب کہ مسلمان دوسرے علاقوں سے وہاں پہنچیں ۔ اس تعلق سے میں نے
اعداد و شمار شائع کئے ہیں اُس میں میں نے یہ ثابت کیا ہے کہ دراصل ا

ہیں جو مردم شماری ہوئی تھی وہ مردم شماری بہت ناقص تھی۔ اس میں مسلمانوں کی بڑی آبادی کو شمار نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سامنے آئے تو محسوس ہوا کہ مسلمانوں کی تعداد میں بہت بھاری اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں اُن مسلمانوں کو بھی شمار نہیں کیا گیا جو نہرو لیاقت معاہدے کے تحت مشرقی پاکستان سے واپس آ کر آباد ہوئے تھے۔ اس معاہدے کے مطابق وہ سب ہندوستانی شہریت رکھتے ہیں اُنہیں ہندوستانی شہری شمار کیا جانا چاہیئے ہمیں اُمید ہے کہ نئی حکومت ایسی پالیسی اختیار کرے گی جس سے مسلمانوں کے شکوک و شبہات دُور ہوں۔

س۔ بنگلہ دیش کا قیام برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے۔

ج: بنگلہ دیش کا قیام ایک سانحہ ضرور تھا لیکن ہندوستان کے مسلمانوں پر اس کا مثبت اثر پڑا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ یہ ہر معاملے میں پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں اور اس بات میں بھی کچھ صداقت ضرور تھی کہ ہر فساد کے بعد مسلمانوں کی کچھ تعداد پاکستان ہجرت کر جانے پر آمادہ ہو جاتی تھی تاکہ محفوظ و مامون رہے۔ لیکن بنگلہ دیش بننے کے بعد پاکستان کے بارے میں یہ احساس جو مسلمانوں کی ایک مختصر تعداد میں پایا جاتا تھا وہ بالکل ختم ہو گیا۔ اور ان میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے اور جس طرح بھی رہنا ہے اسی ہندوستان میں رہ کر کرنا ہے۔ تو اس کا یہ ایک مثبت اثر ہندوستان کے مسلمانوں پر مرتب ہوا ہے اور جو لوگ پہلے یہ الزام لگاتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں اب اُن کیلئے اس قسم کی الزام ~~لگاتے تھے~~ تراشی کا کوئی موقع بھی باقی نہیں رہا۔

س: بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے آپ کے روابط کی نوعیت کیا ہے۔

ج۔ ابھی تک تو کوئی ایسا موقع ہی نہیں آیا کہ اُن سے ربط پیدا ہو سکے۔

س۔ ہندوستان میں اُردو کا مستقبل بھی مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن ہندی کے نفاذ اور اس کے دیوناگری رسم الخط کے حوالے سے مسلمانوں کی نئی نسل

جس طرح اردو سے بیگانہ ہو گئی ہے ۔ اس تناظر میں آپ کو ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا نظر آتا ہے ۔

ج ۔ اردو کے مستقبل کا جہاں تک مسئلہ ہے تو بول چال کی زبان کی حیثیت سے اور مسلمانوں کی گھر کی زبان کی حیثیت سے تو اس کا مستقبل محفوظ ہے لیکن اس سے ہٹ کر اردو کی جو نوعیت ہے ذریعہ تعلیم کے طور پر اور ایک علمی زبان کی حیثیت سے تو اس کے بارے میں کسی امید کا اظہار کرنا بہت مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کو جو مراعات ملنی چاہئیں ہندوستان کی قومی زبان کی حیثیت سے وہ مراعات نہیں ملیں ۔ یو پی جسے اردو کا گہوارہ کہا جا سکتا ہے وہاں آج تک سرکاری طور پر اردو کو کوئی سرپرستی میسر نہیں آئی ، بہار میں اردو کو دوسری زبان تسلیم کیا گیا ہے لیکن کچھ شرائط کے ساتھ دوسری طرف خود مسلمانوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر انگلش میڈیم سکولوں میں بچوں کو پڑھایا جائے ۔ والدین یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح بچے کے لئے اعلیٰ تعلیم کے زیادہ مواقع میسر آئیں گے ۔ ان دو وجوہات کی وجہ سے اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے پیچھے ہوتی جا رہی ہے ۔ اب اس بات کا خدشہ ہے کہ آئندہ اردو میں تعلیم دینے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا ۔ اب مسلمانانِ ہند کو اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینے پر مصر رہیں یا یہ کہ انگریزی یا کسی اور زبان کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کرتے ہوئے بھی اردو کو ہائی سکول تک ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے ۔ اس وقت اردو کے بطور ایک علمی زبان باقی رہنے یا ذریعہ تعلیم قرار پانے کے بارے میں تو کوئی امید افزا بات نہیں کی جا سکتی لیکن بول چال کی زبان کی حیثیت سے اردو کا دائرہ کار بڑھ رہا ہے بہت سے ایسے علاقے جہاں آزادی سے پہلے اردو کا چلن نہیں تھا ۔ وہاں بھی اردو پھیل رہی ہے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں میں مہاراشٹر کے جنوبی علاقے کوکن کا ذکر کروں گا ۔ لیکن یو پی اور مدھیہ پردیش جیسے علاقوں میں حکومت اردو کے ساتھ جو سلوک کر رہی ہے اسے دیکھ کر بہت مایوسی ہوتی ہے ۔

س : رسم الخط کے علاوہ اردو اور ہندی میں کیا فرق ہے ۔

ج : رسم الخط سے قطع نظر اگر عام بول چال کی حد تک دیکھا جائے تو اُردو اور ہندی میں کوئی خاص فرق نہیں ۔ چنانچہ وہ تمام فلمیں جنہیں ہندی کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے ۔ اگر اُن کی زبان کو دیکھا جائے تو پچانوے فیصد فلموں کی زبان آپ کو اردو ہی ملے گی ۔ لیکن سرکاری سطح پر جو زبان استعمال کی جاتی ہے ریڈیو پر ٹیلیویژن پر یا وزراء اور حکومت کے دیگر عہدیدار جس زبان میں تقریریں کرتے ہیں وہ زبان انتہائی مشکل اور سنسکرت آمیز ہوتی ہے اور اُس کا کوئی تعلق عوام کی زبان سے نہیں ہوتا ۔ بول چال کی حد تک اُردو اور ہندی کوئی فرق نہیں ۔ مگر سرکار جس زبان کو رائج کرنے کی کوشش کر رہی ہے بہت مختلف ہے ۔ خود ہم لوگوں کو بعض اوقات ہندی نشریات کو سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے ۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ایک عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد پنڈت نہرو نے سنگ بنیاد پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے کے بعد پوچھا کہ اس پر کیا لکھا ہوا ہے ۔

س : ہندوستان جیسے ملک میں جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں بالعموم کون سی زبان رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کی جاتی ہے ۔

ج ۔ بالعموم تو انگریزی ہی سمجھی جاتی ہے اور سرکاری سطح پر بھی رابطے کا کام انگریزی سے ہی لیا جاتا ہے ۔ لیکن اب ہندی کو رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔

س : سیاسی انقلابات کے اثرات سے زبانوں کے بننے اور بگڑنے کا عمل تو جاری رہتا ہے ۔ لیکن اُردو کے رسم الخط کے ساتھ جو ہمارا علمی اور ادبی ورثہ اور دینی لٹریچر وابستہ ہے اُس ورثے کو نئے رسم الخط اور مقامی زبانوں میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کچھ کام ہو رہا ہے ۔

ج : اس سلسلے میں کافی کام ہو چکا ہے ۔ ہمارے دینی سرمائے کی مختلف کتابیں جو اُردو میں رائج تھیں اُن میں اکثر کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی ہیں اسی طرح سے علاقائی زبانوں میں اُنہیں منتقل کیا جا چکا ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں اہم تربات یہ ہے کہ ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے بچے کو قرآن مجید پڑھائے ۔ اور قرآن مجید جب پڑھایا جاتا ہے تو عربی حروف سے بچے کو واقفیت حاصل ہوتی ہے ۔ اُن کے جوڑوں کی شناخت بھی بچے کو ہو جاتی ہے ۔ تو اس طرح سے ایک مسلمان بچہ

قرآن مجید پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان الفاظ سے بھی واقف ہو جاتا ہے جو اُردو کی بنیاد ہیں۔ اس مرحلے پر اگر والدین تھوڑی سی توجہ دیں تو بچہ بہت آسانی سے اُردو رسم الخط سے واقف ہو سکتا ہے۔

س : اُردو کے ساتھ جامعہ عثمانیہ کا ذکر ناگزیر ہے۔ اب جامعہ عثمانیہ کی کیا حیثیت ہے اور ترجمہ کا جو عظیم کام اس جامعہ میں شروع ہوا تھا وہ کچھ آگے بڑھ رہا ہے۔

ج : دراصل سیاسی تبدیلی کے بعد اُردو ذریعہ تعلیم کو تو ختم کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد دارالترجمہ میں بھی کوئی کام تو نہیں ہو رہا۔ اور سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ دارالترجمہ نے مختلف علوم اور فنون کی اصطلاحات کے ترجمے کا جو عظیم الشان کام کیا تھا اُسے بھی ضائع کر دیا گیا۔ پولیس ایکشن کے چند ہی سال کے بعد یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی کہ ایک اتفاقی حادثے کے نتیجے میں دارالترجمہ کا سارا ذخیرہ جل گیا ہے۔ لیکن ہمیں شبہ ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ ایک سازش کے تحت اُس ذخیرے کو جلا دیا گیا۔ اب اُس جامعہ عثمانیہ میں جو قائم ہی کی گئی تھی اُردو میں اعلیٰ تعلیم کے لئے اردو کا کوئی کام نہیں ہوتا۔

س : اردو کا جو علمی سرمایہ نذرِ آتش کر دیا گیا اُس کی نقول کہیں اور بھی موجود ہیں؟

ج : اُس ذخیرے میں سے جو چیزیں چھپ چکی ہیں وہ تو محفوظ ہیں لیکن مسوّدات کی صورت میں ایک بہت بڑا ذخیرہ جو ابھی چھپا نہیں تھا وہ سب ضائع ہو گیا۔

س : جامعہ عثمانیہ کے علاوہ مسلمانوں نے تعلیم اور تحقیق کے مراکز قائم کئے تھے جن میں علی گڑھ، ندوۃ العلماء دیوبند، جامعہ ملیہ، مدرسہ اصلاح وغیرہ شامل ہیں ان کی کیا کیفیت ہے اور مسلم معاشرے میں اُن کا کیا مقام ہے۔

ج : ان اداروں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں تو دیوبند، ندوۃ العلماء اور مدرستہ الاصلاح شامل ہیں۔ یہ خالص دینی تعلیم کے ادارے ہیں۔ یہاں دینی علماء تیار کئے جاتے ہیں اور اسی لحاظ سے اُن کا نصاب اور طریقہ تعلیم۔ ان میں سے دیوبند ایک بحران کا شکار ہو گیا تھا پچھلے دنوں اور اس کے نتیجے میں دارالعلوم دیوبند کے دو حصے ہو چکے ہیں۔ ایک تو قدیم عمارت میں چل رہا ہے اور دوسرا حصہ

چل رہا ہے دیوبند کی مسجد میں ۔ اس کے پیچھے کچھ سیاسی محرکات بھی ہیں ۔ بہرحال دیوبند ہو یا ندوہ یہ اپنی ڈگر پہ ترقی کر رہے ہیں ۔ آج کل ہندوستان میں ابتدائی دینی تعلیم کے مدارس کھولنے کا رجحان بڑھ رہا ہے ۔ ہر بڑی آبادی میں بڑے قصبے میں آپ کو دینی تعلیم کا ایک آدھ ادارہ ملے گا ۔ اسی طور سے علی گڑھ ہے ۔ اس مسلم ادارے کے مسلم اقلیتی کردار کو بھی ختم کر دیا گیا تھا ۔ کئی سال کی جد و جہد کے بعد اس کا یہ کردار بحال کیا گیا ہے اُس کے بعد کچھ حالات بہتر ہوتے ہیں ۔ جامعہ ملیہ اور علی گڑھ دونوں کی نوعیت ندوے یا دیوبند سے الگ ہے کیونکہ یہ دونوں ہی یونیورسٹیاں ہیں اور یہاں جدید عصری تعلیم کا بندوبست ہے ۔ اگر مختلف شعبوں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو جامعہ ملیہ بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہے لیکن اُس کا مایوس کن پہلو یہ ہے کہ اس میں پڑھنے والے طلبہ میں مسلمانوں کا تناسب گھٹتا جا رہا ہے حالانکہ نام جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے ۔ اور مسلم طلبہ میں بھی زیادہ تناسب طالبات کا ہے طلبہ کی تعداد نسبتاً کم ہے ۔ یہ صورت حال ظاہر ہے کہ کوئی اچھی صورت حال نہیں ہے ۔ دلی اور اطراف کے مسلمانوں کو اس طرف توجہ دینی چاہیئے کیونکہ اعلیٰ تعلیم میں طالبات کا بڑھتا ہوا تناسب سماجی مسائل بھی پیدا کرے گا ۔ والدین کو چاہیئے کہ نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب کریں ۔ جن بچوں میں تعلیم کا شوق ہو اُن کی حوصلہ افزائی کریں اُنہیں دیگر کاموں میں نہ لگائیں ۔

س : لڑکیوں میں اعلیٰ تعلیم کا بڑھتا ہوا تناسب اُن میں دین سے دُوری تو پیدا نہیں کر رہا ۔

ج : اصل میں دین سے قُرب اور بُعد کا معاملہ گھر کے ماحول اور بچپن کی دینی تربیت سے زیادہ تعلق رکھتا ہے ۔ جن بچیوں کی دینی تربیت بچپن میں ہو جاتی ہے اُن پر اعلیٰ تعلیم کے دوران کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ میں بہت سی ایسی خواتین سے واقف ہوں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود دین سے برگشتہ نہیں ہیں ۔

س : ہندوستان کے مسلمانوں میں فرقہ بندی کی کیا کیفیت ہے ۔

ج : اختلافات تو آج بھی ہیں ۔ لیکن اس وقت مناظرے کی سی کیفیت نہیں ہے ۔ البتہ چند مقامات ہیں جہاں ہر سال تناؤ اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے ۔ مثلاً لکھنؤ

میں شیعہ سنی کشیدگی محرم اور محرم کے بعد کے دنوں میں ہر سال رہتی ہے۔ بعض علاقوں میں بریلوی اور دیوبندی کشمکش کے مظاہرے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن پہلے کی طرح CONFRONTATION کی کیفیت اب نہیں ہے۔

س : مسلم پرسنل لا ر کے مسئلے پر مسلم جماعتوں کے اتحاد میں جمیعت العلمائے ہند بھی شامل تھی۔

ج : مسلم پرسنل لا بورڈ کے اندر تو جمیعت العلمار بھی شامل ہے۔ چنانچہ مجلس عاملہ میں مولانا اسعد مدنی صاحب بھی ہیں اور جمیعت العلمار کے سید احمد ہاشمی صاحب بھی ہیں۔ لیکن تحفظِ شریعت کے سلسلے میں جو مہم پرسنل لا بورڈ نے چلائی اُس میں عملاً جمیعت العلمار نے اپنا حصہ ادا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے طور کچھ مہم انہوں نے چلانے کی کوشش کی۔ لیکن مطالبے کی حد تک وہ سب کے ساتھ ہیں۔

س : دارالعلوم دیوبند کے دو حصے ہونے سے وہاں تعلیمی معیار اور دارالعلوم کی ساکھ پر کیا اثر پڑا ہے۔

ج : دیوبند کے تنازعے سے نہ صرف یہ کہ دیوبند کی ساکھ متاثر ہوئی ہے بلکہ عام مسلمانوں میں علمار کے طبقے کی ساکھ بھی متاثر ہوئی ہے۔ لوگ کہنے کہ یہ ایک ہی مسلک کے علمار ہیں مگر پھر بھی آپس میں لڑتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس تنازعے کے دوران ایک دوسرے پر الزام تراشی اور بیانات اور جوابی بیانات کا جو سلسلہ چلا اُس نے نہ صرف ادارے کو بدنام کیا ہے بلکہ علمار کے بارے میں بڑی بددلی پھیلی ہے مسلمانوں میں۔ اور اس تنازعے نے اس تاریخی ادارے کو یقیناً بہت نقصان پہنچایا ہے۔

س : ہندوستان کے مسلم معاشرے میں علمار کی قوت قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُردو کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس پہلو پر کبھی توجہ کی آپ نے۔

ج : بالکل۔ ایسا بآسانی ہو سکتا ہے لیکن اس طرف توجہ نہیں کی کسی نے اب تک۔

س : ہندوستان کے مسلمانوں نے دین اور دنیا کی تعلیم کو اکٹھا کرنے کی کئی کوششیں کیں۔ ندوۃ العلمار، مدرسہ اصلاح اور جامعہ ملیہ انہیں کوششوں کے نتیجے میں قائم ہوئے لیکن کسی کوشش سے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ کیا اب ایسا ذہن پایا جاتا ہے کہ

کوئی نئی کوشش کی جاتی ہے۔

؟ : دیکھئے ذہن تو ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی کوشش شروع نہیں ہوئی ہے آج بھی سوچنے والے سوچتے ہیں کہ ایسا تعلیمی نظام بنایا جائے جہاں دونوں علوم کو سمجھا جائے اور ظاہر ہے کہ اسلام میں تو دین اور دُنیا کی تفریق ہے ہی نہیں۔ لیکن عملی کوشش نہیں ہو رہی۔

س : یہ قدیم ادارے یعنی ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح اور جامعہ ملیہ تو اب بھی موجود ہیں یہ اب کیا کر رہے ہیں۔

ج : جہاں تک ندوۃ العلماء کا تعلق ہے اس کا شمار دینی تعلیم کی اعلیٰ درسگاہوں میں ہوتا ہے کیونکہ اس کے نصاب میں بھی جدید سوشل سائنسز کی تعلیم شامل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ نصاب کا رُخ ایک ہی طرف کو ہے اور یہی حال مدرسۃ الاصلاح کا ہے۔ اب رہ گیا جامعہ ملیہ تو اُس میں دینی تعلیم کا جو پہلو تھا وہ ختم ہو گیا ہے اور اُس کے بجائے عصری تعلیم کا پہلو رہ گیا اور وہ بھی اب بالکل علیگڑھ کی طرح کی ایک یونیورسٹی بنتی جا رہی ہے۔

س : پاکستان کے مسلمانوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا موازنہ آپ نے ضرور کیا ہوگا۔

ج : اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا یا گہری نگاہ سے دیکھنے کا موقع کم ملا ہے۔ لاہور کے بارے میں تو کچھ نہیں کہتا کہ یہاں میرا قیام بہت کم رہا لیکن کراچی میں میں نے جو کچھ محسوس کیا وہ یہ ہے کہ وہاں اس وقت مسلمان کی زندگی کی ساری سرگرمی صرف معیارِ زندگی بلند کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔ اسی بھاگ دوڑ میں وہ لگا ہوا ہے اور دوسری طرف جتنی توجہ چاہیئے وہ نہیں ہے اور یہ علامت کچھ اچھی نہیں ہے۔ معیارِ زندگی بلند کرنے کی جو کوشش ہے اس کی تو کوئی انتہا نہیں اور اس میں انسان بسا اوقات اپنی ذاتی اخلاقی اقدار کو بالکل بالائے طاق رکھ دیتا ہے، اور جو اقبال نے کہا تھا کہ مرگِ روح و بدن در پیش ہے بالکل وہی کیفیت ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسلم معاشرے سے کوئی تقابل نہیں کر سکتا کیونکہ وہاں حالات الگ ہیں یہاں حالات الگ ہیں۔

وہاں ہمارے سامنے کئی چیلنج ہیں اور اُن میں سب سے بڑا چیلنج ہمارے سامنے اپنے
مادّی اور معنوی وجود کو باقی اور برقرار رکھنے کا ہے اور یہاں وہ چیلنج درپیش
نہیں ہے۔ یہاں اصل میں چیلنج یہ ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی زندگی کے ساتھ
ساتھ اجتماعی زندگی کے لئے کس نصب العین کا تعین کرتے ہیں اور اُس
نصب العین کے لئے کیا کوششیں کرتے ہیں۔ ان دونوں چیلنجز (Challenges)
کے فرق کی وجہ سے تقابل بہت مشکل ہے۔

س : مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کا ہندوستان کی سیاست میں اور خود مسلمانوں
میں اس وقت کیا مقام ہے۔

ج : ہندوستان میں مسلمانوں کی تین سیاسی جماعتیں ہیں اور یہ تین سیاسی جماعتیں
ہندوستان کے تین الگ علاقوں میں اپنا اثر رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ سوال
تو پیدا نہیں ہوتا کہ مقابلتاً کون زیادہ فعال ہے۔ جیسے مسلم لیگ کا زیادہ تر اثر
ہے کیرالا میں اُس کے بعد تامل ناڈو میں ہے اور پھر اُس کے بعد کرناٹک میں ہے
ان تین جنوبی ریاستوں کے بعد مغربی ہندوستان کی ریاست مہاراشٹرا میں ہے
اور کچھ شاخیں دلی یوپی اور دوسرے مقامات پر بھی ہیں لیکن مسلم لیگ کے
زیادہ تر اثرات جنوب کی ریاستوں میں ہیں۔ دوسری جماعت مجلس اتحاد
المسلمین ہے اس کا دائرہ اثر ریاست حیدرآباد تک ہے اور اس کے اثرات
کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے حالیہ
انتخابات میں مجلس نے سو میں سے اڑتیس نشستیں حاصل کی ہیں اور سب سے
بڑی پارٹی کی صورت میں آئی ہے۔ تیسری سیاسی جماعت ہے مسلم مجلس اس
کا دائرہ کار یوپی میں ہے۔ یہ یوپی میں ہی قائم بھی ہوئی۔ کسی زمانے میں یوپی
میں اس کا خاصا اثر تھا لیکن ڈاکٹر فریدی کے انتقال کے بعد اس کا اثر خاصا
گھٹ گیا ہے۔ یوپی میں مسلم لیگ بھی موجود ہے لیکن دونوں کے اثر کے علاقے
الگ الگ ہیں بجز ایک مقام کے۔ اس بات کی کوشش بھی کی گئی کہ مسلم جماعتوں کا
ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنایا جائے "نیشنل مسلم فرنٹ" کے نام سے۔ اس کوشش
میں تینوں جماعتیں شامل تھیں لیکن بعض وجوہات کی بنا پر یہ کوشش آگے نہیں

بڑھ سکی۔ لیکن چونکہ تینوں جماعتوں کے علاقے الگ ہیں اس لئے ایسی کوشش بارآور نہیں ہو سکی ہیں۔

س : ہندوستان میں جماعت اسلامی کے اثرات اور کام کی نوعیت کیا ہے۔

ج ۔ جماعت اسلامی کا اثر وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے کی حد تک محدود ہے تعلیم یافتہ مسلمان جماعت سے انتہائی متاثر ہے۔ البتہ تحفظ شریعت کی مہم میں جماعت اسلامی کے کام کا اہم پہلو یہ سامنے آیا کہ اس نے اپنے پلیٹ فارم سے مسلم خواتین کو میدان عمل میں متحرک کیا۔ جماعت اسلامی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور دوسرے مسلمانوں کے اجتماعی کاموں میں برابر شریک ہے۔

س ۔ جماعت اسلامی کے قیام کے وقت مولانا مودودی مرحوم نے جس طرح جماعت اسلامی کی دعوت کا مخاطب ہندوستان کے ہر مسلم باشندے کو قرار دیا تھا۔ کیا اب بھی ہندوستان میں جماعت کی دعوت کا رنگ باقی ہے۔

ج : ہندوستان میں اب جماعت کی دعوت کا وہ رنگ باقی نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان میں بھی اب دعوت کا پہلو تھوڑا سا کم ہو رہا ہے اور "مسلمانوں کی جماعت" کا رنگ اس میں غالب آتا جا رہا ہے۔ مسلم مسائل کو پیش کرنا مسلم مسائل کی ترجمانی کرنا۔ ظاہر ہے یہ مرحلہ جب آئے گا تو دعوت کا پہلو خود بخود کم ہوتا جائے گا اور اب دعوت کا پہلو کم ہو چکا ہے۔ عام دعوت کا کام اس حد تک محدود ہے کہ مختلف علاقائی زبانوں میں انہوں نے تفہیم کے ترجمے کا کام شروع کیا ہے۔ اس سے ہٹ کر عام لوگوں میں دعوت کا کام نہیں ہو رہا۔

س : غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کے حوالے سے کچھ عرصہ قبل پٹر و ڈالر کا بھی بہت تذکرہ ہوا تھا۔ اس بارے میں کچھ وضاحت فرمائیں۔

ج : دراصل ہوا یہ تھا کہ جنوبی ہند کی ریاست تامل ناڈو کے بالکل جنوبی علاقے میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے نیچ ذات کے ہندوؤں کے ساتھ انتہائی ظالمانہ رویہ اپنا رکھا تھا۔ ظلم کی ایک کیفیت یہ بھی ہے کہ نیچ ذات کے لوگ اعلیٰ ذات کے لوگوں کے مکانوں کے سامنے سے گزر بھی نہیں سکتے۔ ان کا سایہ بھی پڑ جائے تو اعلیٰ ذات کا ہندو ناپاک ہو جاتا ہے اس ظلم کے نتیجے میں ان کے اندر ذات پات کے نظام کے خلاف

نفرت کا جذبہ پیدا ہوا - اس صورت حال میں اُس علاقے کے مسلمانوں نے بہت ہی آہستگی کے ساتھ ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور اس کے نتیجے میں ہریجن وہاں اسلام کی طرف راغب ہونے لگے اور انفرادی حیثیت سے اسلام قبول کرنے کے واقعات وہاں ایک عرصے سے ہو رہے تھے - لیکن یہ چیز نظر میں نہیں آتی تھی اب ہوا یہ کہ "میناکشی پورم" نام کا جو گاؤں تھا ہریجنوں کا اس سارے گاؤں نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کیا - اجتماعی طور پر اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اُس کو ایک پبلسٹی ملی اور ردعمل شروع ہوا - جہاں تک پٹرو ڈالر کی بات ہے تو اس میں کوئی صداقت نہیں ہے اُس علاقے میں ہمارے دو وفد جا چکے ہیں - ایک دفعہ میں خود بھی جا چکا ہوں - پٹرو ڈالر کا اندازہ آپ اُس گاؤں کی مسجد سے لگا سکتے ہیں کہ کہ ناریل کے درخت کے تنوں کو ستونوں کے طور پر کھڑا کر کے اوپر ناریل کے پتوں کی ہی چھت بنائی گئی ہے - اصل میں اُن لوگوں کا قبولِ اسلام وہاں کے کچھ مقامی مسلمانوں کی برسہا برس کی محنتوں اور کوششوں کا پھل ہے - جو اللہ نے اپنے فضلِ خاص سے عنایت فرمایا ہے - اس کے بعد جنوبِ ہند کے کئی علاقوں میں قبول اسلام کی ایک لہر پیدا ہو گئی - کئی مقامات پر لوگوں نے اچھی خاصی تعداد میں اسلام قبول کیا - اس کے اثرات خود ہمارے علاقے حیدر آباد تک بھی پہنچے لیکن یہ سب واقعات انفرادی قبول اسلام کے ہیں اجتماعی واقعہ ایک ہی ہوا -

س : ان نو مسلم حضرات کو مسلم معاشرے میں جذب ہونے میں بھی کچھ مشکلات پیش آتی ہوں گی -

ج : عموماً جہاں جہاں بھی اس قسم کے واقعات ہوتے ہیں مسلمانوں نے نو مسلموں کو اپنی معاشرت میں جذب کیا ہے اُن سے رشتے ناطے اور شادی بیاہ کے معاملے کئے ہیں - جنوبِ ہند میں تو نو مسلموں کو اس معاملے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی لیکن شمالی ہند کے مسلمانوں کے اندر خود برادری کا نظام اتنا رچا بسا ہوا ہے اور اونچ نیچ کا تصور اتنا بیٹھا ہوا ہے ذہنوں کے اندر کہ وہاں کے مسلم معاشرے میں نو مسلموں کا جذب ہونا بہت مشکل ہے - وہاں ایسے بھی واقعات ہوتے کہ نو مسلم خاندانوں کیلئے

ں کی شادیوں کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ مسلمانوں نے ان کی لڑکیوں کو قبول نہیں کیا
ں کے نتیجے میں اُن کے اندر مایوسی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ شمالی ہند کے مسلمانوں میں
س اعتبار سے ان غیر اسلامی تصورات کی اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ شمالی ہند
سلم معاشرے سے جب تک اونچ نیچ کے تصورات ختم نہیں ہوتے اُس میں جذب کی
یفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

: غیر مسلم سوسائٹی کا ردعمل کیا ہوتا ہے نومسلموں کے بارے میں۔

: جہاں تک انفرادی قبول اسلام کا تعلق ہے تو شروع میں خاندانوں میں کچھ رنجش اور خفگی کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن بعد میں لوگ برداشت کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر اجتماعی حیثیت میں اسلام قبول کریں تو اُس کا ردعمل شدید ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منی کشم پورم کے واقعے کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اور کہا یہ جاتا ہے کہ جب آریہ سماج کا ایک وفد سابق وزیر اعظم مسز گاندھی سے ملا اور اُس نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ حکومت کو اس چیز کو روکنا چاہیئے تو مسز گاندھی نے کہا کہ آپ لوگ کچھ کیجیئے اور اُس کے بعد آریہ سماج نے سارے ہندوستان میں ایک مہم شروع کی جس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر ملک بھر میں فسادات ہوتے۔ اُن فسادات کا محرک یہی تھا کہ ہریجنوں کو فسادات کے ذریعے اتنا خوفزدہ کیا جائے کہ مسلمان ہونے کا تصور بھی اُن کے ذہنوں میں نہ آسکے۔

س : ہندوستان میں مسلمانوں کی شرح پیدائش کے بارے میں جو دعوے کئے جاتے ہیں اُن کا کیا پس منظر ہے۔

ج : یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں کے ہاں شرح پیدائش نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں دوسری قوموں سے زیادہ ہے اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری قوموں کے لوگ معیار زندگی بلند کرنے کی خاطر اور رزق کی تنگی کے خوف سے خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرتے ہیں۔ جبکہ عام مسلمان کا ایمان تو یہی ہے رزق اللہ دیتا ہے۔ اس لئے اُس کا ذہن ان چیزوں کو قبول نہیں کرتا۔

فتح مبین

صلح حدیبیہ ۰ فتح خیبر اور فتح مکہ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے

(ساتویں خطاب کی تیسری قسط)

ترتیب و تسوید جمیل الرحمٰن

یہ صلح 'فتح مبین' کن عتبارات سے تھی!

اِس اہم واقعہ کو قرآن مجید نے فتح مبین کس اعتبار سے قرار دیا کہ حدیبیہ سے واپسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۔ اور میں اسے حضورؐ کی انقلابی جدوجہد کے ضمن میں ایک نہایت اہم موڑ (TURNING POINT) کیوں کہتا ہوں! اِس پر ہمیں غور و تدبر کرنا ہے ۔ اِس بات کو اگر میں جدید اصطلاحات کی مدد سے بیان کروں تو شاید بہتر طور پر سمجھ میں آ ئے۔ درحقیقت اِس صلح اور معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ قریش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک "طاقت" کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ جس طریقہ سے آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ براہِ راست بات چیت کرنے کے لیے کسی طور پر بھی آمادہ نہیں۔ وجہ یہی ہے کہ براہِ راست گفت و شنید کا مطلب ہوگا کہ عرب ممالک نے اسرائیل کو ایک مساوی

طاقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے۔ کوئی معاہدہ کریں گے تو اس کے معنی ہوں گے کہ انہوں نے اسرائیل کو ایک آزاد و خود مختار ریاست کی حیثیت سے مان لیا، (RECOGNISE) کر لیا۔ یہی موقف ہماری حکومت کا ہے کہ افغانستان میں ببرک کارمل کی نام نہاد حکومت سے براہِ راست بات چیت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بالواسطہ (INDIRECT) گفت و شنید تو ہو سکتی ہے لیکن بلاواسطہ اور براہِ راست کارمل حکومت (REGIME) کے ساتھ گفتگو کا مطلب ہوگا کہ ہم نے کارمل حکومت کی دستوری آئینی حیثیت کو تسلیم کر لیا جسے ہم سیاسی اعتبار سے درست نہیں سمجھتے۔ حالانکہ روس کا پُرزور مطالبہ ہے کہ پاکستان کارمل حکومت کو تسلیم کر کے اس سے براہِ راست بات چیت کر کے معاملات طے کرلے۔ اس کے بعد ہم اپنی فوجیں ہٹا لیں گے۔ لیکن یہی وہ بات ہے جو اصل میں سیاسیات اور بین الاقوامی معاملات میں فیصلہ کن ہوتی ہے کہ اگر کسی فریق کی قانونی و آئینی حیثیت تسلیم کر لی جائے تو اس کے لیے یہ ایک بہت بڑا (BREAK - THROUGH) ہو جاتا ہے۔ یعنی اس فریق کو بہت سے حقوق و تحفظات حاصل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا قریش کی طرف سے مصالحت پر آمادہ ہو جانے اور ایک باضابطہ تحریری شکل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لینے کے اس عمل کے متعلق میں سیرتِ مطہرہ پر اپنی تقاریر میں کہا کرتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا قریش نے یہ تسلیم کر لیا کہ:

"MOHAMMAD (صلی اللہ علیہ وسلم) IS A POWER TO RECKON WITH."

یعنی قریش کو تسلیم (کرنا پڑا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب ایک طاقت ہیں، ایک قوت ہیں جنہیں تسلیم کیے بغیر ہم اب کوئی چارہ کار اپنے لیے نہیں پاتے۔ یہ تھی پوری صورتِ حال — جس کے پس منظر میں مدینہ منورہ کی واپسی کے سفر کے دوران سورہ فتح نازل ہوئی جس کا آغاز ہوتا ہے اس آیتِ مبارکہ سے:

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۙ "بے شک ہم نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے لیے تابناک اور کھلی فتح کا فیصلہ فرما دیا۔"

اور اسی سورہ مبارکہ میں یہ آیات بھی نازل ہوئیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۔

"بے شک جو لوگ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ (در حقیقت) اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ کے اوپر۔"

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ......

"تحقیق اللہ راضی ہو گیا ایمان والوں سے جب وہ بیعت کرنے لگے (اے نبیؐ) آپؐ سے درخت کے نیچے..... "

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ وَ مُقَصِّرِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ ۔

"بے شک اللہ نے سچ دکھایا اپنے رسول کو خواب حق کے ساتھ۔ تم لازماً داخل ہو کر رہو گے مسجدِ حرام میں اگر اللہ نے چاہا آرام سے اپنے سروں کے بال مونڈتے اور کترتے ہوئے بے کھٹکے"۔

جب یہ آیات نازل ہوئیں اور اہلِ ایمان کے سامنے ان کی تلاوت کی گئی تو ان آیات نے گویا ان کے زخمی دلوں پر مرہم کے پھاہے کا کام کیا۔ اہلِ ایمان جس چیز کو اپنے خیال میں شکست سمجھتے تھے، اللہ تعالےٰ نے اس کو فتح مبین قرار دیا۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا۔ اِس سے مسلمانوں کے دل مسرّت و شادمانی سے باغ باغ ہو گئے۔ صحیح مسلم میں روایت موجود ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو بلا کر ان رضؓ کو بتایا کہ یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے پہلے تو کچھ تعجب کا اظہار کیا لیکن جب حضورؐ نے فرمایا کہ ان اللہ تعالےٰ نے اسے فتحِ مبین قرار دیا ہے تو ان رضؓ کے دل کو قرار کو بھی قرار آ گیا اور وہؓ بھی شاداں و فرحاں ہو گئے۔

حضرت ابو جندل رضؓ دوسرا اقدام

صلح حدیبیہ کے ثمرات و فوائد بیان کرنے سے قبل مَیں چاہوں گا کہ حضرت ابو جندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوسرے اقدام کا واقعہ سنا دوں۔ مَیں بتا چکا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

معاہدہ کی شرط کے مطابق اور سہیل ابن عمرو کے اصرار پر ان رضؓ کو کفار کے حوالہ کر دیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اپنی قید سے دوبارہ نکلے۔ مدینہ منورہ تو گئے نہیں اس لیے کہ انہوں رضؓ نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو معاہدہ کی وجہ سے پابند ہیں لہذا حضورؐ تو مجھے دوبارہ واپس بھجوا دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بحیرہ احمر کا رُخ کیا اور ساحل کے قریب جنگل میں پناہ لی۔ اس کے بعد ایک اور صحابی عتبہ بن اسید رضؓ جو اپنی کنیت ابو بصیر کے حوالے سے زیادہ مشہور ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۔۔۔ وہ بھی مکہ والوں کی قید سے چھٹکارا پاکر مدینہ پہنچے۔ اِدھر وہ پہنچے اُدھر مکہ سے دو اشخاص پہنچ گئے۔ اور حضورؐ سے مطالبہ کیا کہ ابو بصیر رضؓ کو اپنے معاہدے کی وجہ سے ہمارے حوالے کیجئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بصیر رضؓ کو حکم دیا کہ واپس جاؤ اور انہیں رضؓ ان دونوں ایلچیوں کے حوالے کر دیا۔ ابھی یہ تینوں ذوالحلیفہ پہنچے ہی تھے کہ ابو بصیر رضؓ نے انہی دو میں سے موقع پاکر ایک کی تلوار پر قبضہ کر کے اس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا مدینہ کی طرف سرپٹ بھاگا۔ پیچھے پیچھے ابو بصیر رضؓ بھی مدینہ پہنچ گئے۔ مکہ والا حضورؐ سے فریاد کر رہا تھا کہ ابو بصیر رضؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا، میں نے تو اب ایک کو قتل کر کے آزادی حاصل کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شخص پھر کہیں جنگ کی آگ نہ بھڑکا دے! کوئی ہے جو اس کو قابو میں کرے! یہ سُننا تھا کہ ابو بصیر وہاں سے بھاگے اور مدینہ سے نکل کر بحرِ احمر کے ساحلی جنگل جا کر حضرت ابو جندل رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ساتھ مل گئے۔ ایک اکیلا دو گیارہ کے مصداق یہ دو ہو گئے۔ اس کے بعد جب مکہ کے بے کس اور مظلوم مسلمانوں کو پتہ چلا کہ جان بچانے کا ایک دوسرا ٹھکانا بن گیا ہے تو چوری چھپے مکہ سے فرار ہو کر مدینہ کا رُخ کرنے کے بجائے یہاں پناہ کے لیے پہنچنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھوڑے ہی دنوں میں وہاں ایک اچھی خاصی جمعیت فراہم ہو گئی۔ اب انہوں نے قریش کے جو قافلے شام کے لئے بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے ان پر تاخت اور مار دھاڑ شروع کر دی۔ اس لیے کہ یہ لوگ مدینہ میں تو تھے نہیں لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدہ کی شرائط کے پابند نہیں تھے۔ تجارتی قافلوں کے یہ راستے

قریش کی معیشت کے لیے شہ رگ کا درجہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ میں ابتدائی تقریروں میں بیان کر چکا ہوں ــــ ان لوگوں کی لوٹ مار اور دھاڑ کے ہاتھوں مجبور ہو کر قریش ایک وفد ان کی طرف سے تحریر لے کر مدینہ آیا کہ معاہدہ کی اس شرط کو ہم خود واپس لیتے ہیں۔ اب مکہ سے جو بھی آپؐ کے پاس مدینہ آکر آباد ہونا چاہے وہ آسکتا ہے۔ ہم اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ آپؐ ابوجندل رضؓ اور ابوبصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کو مدینہ بلا لیجئے ــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمان بھیجا۔ اور وہ سب کے سب مدینہ آکر آباد ہو گئے اور قریش کے قافلوں کا راستہ بدستور محفوظ و مامون ہو گیا۔

حاصلِ کلام یہ کہ صلح کی اُس شق سے جو اہلِ ایمان کو سب سے زیادہ شاق گزری تھی خود قریش کو تائب ہونا پڑا۔ گویا اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا کا ایک نظارہ بہت ہی جلد مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ــــ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر حضرت ابوجندل رضؓ کو واپس کرتے ہوئے جو الفاظِ مبارکہ فرمائے تھے کہ: یا ابوجندل اصبر واحتسب فان اللہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجًا و مخرجًا "اے ابوجندل! صبر اور ضبط سے کام لو اللہ تمہارے لیے اور دوسرے ضعیفوں اور مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکال دے گا۔" تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ایک حقیقی واقعہ کی شکل میں متشکل ہو کر نگاہوں کے سامنے آگیا۔

صلح حدیبیہ کے ثمرات

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ مزید وہ کون کون سے پہلو ہیں جن کے اعتبار سے اِس صلح کو "فتح مبین" قرار دیا گیا! تیسرا یہ کہ اس صلح کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یکسو ہو کر اپنی دعوتی سرگرمیوں پر پوری توجہ دینے کا موقع مل گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ اصحابِ صفہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی حضورؐ نے ان کے وفود بنا بنا کر مختلف قبائل کی طرف بھیجنے شروع فرمائے۔ مزید آں اب تک مسلمان اور مشرکین کا آپس میں کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس صلح کے بعد یہ روک ٹوک اٹھ گئی۔ آمد و رفت شروع ہوئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات و روابط کی وجہ سے کفارِ مکہ

مدینہ منورہ میں آتے، طویل عرصہ تک قیام کرتے۔ مسلمانوں سے میل جول رہتا تھا۔ باتوں باتوں میں اسلام کی دعوتِ توحید اور مسائل کا تذکرہ اور ان پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ ہر مسلمان اخلاص اور حسنِ عمل کا پیکر، نیکوکاری، حسنِ معاملات اور پاکیزہ اخلاق کی زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکہ جاتے تھے، ان کی صورتیں، ان کے اعمال، ان کے اخلاق، ان کے معاملات یہی مناظر پیش کرتے۔ ان اوصاف کی وجہ سے مشرکینِ مکہ کے دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچے چلے آتے۔ الغرض اس صلح کے نتیجہ میں اسلام جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگا۔ مؤرخین اور سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ اِس صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ اس سے قبل نہیں لائے تھے۔

حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ ابن العاص کا قبولِ اسلام

صلح حدیبیہ کو اللہ تعالٰی نے "فتح مبین" قرار دیا ہے۔ لیکن یہ اجسام کی نہیں قلوب کی فتح و تسخیر کا معاملہ تھا۔ اس مرحلہ پر اسلام کو اپنی دعوت کی اشاعت کے لیے امن درکار تھا جو اِس صلح سے حاصل ہو گیا۔ دعوتِ توحید کی وسعت کو دیکھ کر خود قریش یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ ہماری شکست اور جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صلح حدیبیہ سے قبل قریش اور اہلِ ایمان کے مابین جو معرکے ہوئے تو ایک جنگجو اور باصلاحیت شہسوار کی حیثیت سے قریش کی صفوں میں خالد ابنِ ولیدؓ کا نام ممتاز نظر آتا تھا۔ گھڑ سوار دستوں کی قیادت انہی کے سپرد رہتی تھی۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر ان ہی کی تدبیر سے قریش کی شکست فتح میں بدل گئی تھی اور مسلمانوں کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش نے گھڑ سواروں کا ایک دستہ ان کی زیرِ کمان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ آپؐ کو اطلاع مل گئی اور حضورؐ نے راستہ بدل دیا۔ ورنہ خالد ابنِ ولید تو حضورؐ کا راستہ روکنے کے لیے رابغ سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ صحابہ کرامؓ نے جگہ جگہ پڑاؤ ڈال رکھے تھے۔

الد ابن ولید کو جب پتہ چلا تو وہ بھی اپنے گھڑ سواروں کے دستہ کے ساتھ
ٹ کر حدیبیہ پہنچ گئے۔

الد ابنِ ولید کا انوکھا طرزِ عمل :۔ یہاں پہنچ کر خالد ابن ولید کی طرف سے
یب انوکھے طرزِ عمل کا مظاہرہ ہوا۔ یہ ایک ایسے پڑاؤ پر پہنچ گئے جہاں صحابہ
رام میں سے دو ڈھائی سو کی نفری فروکش تھی۔ خالد نے انتہائی کوشش کی کہ
سی طرح یہ اہلِ ایمان مشتعل (   ) ہو جائیں اور کسی مسلمان کا
یک مرتبہ ذرا ہاتھ اُٹھ جائے۔۔۔ اس بات کو ذرا سمجھ لیجئے کہ قریش کی کچھ روایات
تھیں چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم احرام کی
حالت میں تھے اور ان کی قدیم روایات چلی آ رہی تھیں کہ مُحرِم پر ہاتھ نہ اٹھایا
جائے۔ اس لیے خالد ابنِ ولید جنگ کی پہل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں
نے اشتعال انگیزی کی حتی الامکان کوشش کی۔ وہ اپنے گھوڑے لے کر بار بار
صحابہ رض کی اس جماعت پر ایسے چڑھ چڑھ کر آئے ہیں جیسے ان کو گھوڑوں کے
سموں سے کچل دیں گے۔ کئی بار انہوں نے اس عمل کو دہرایا لیکن جو حکم تھا
جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام رض اس پر کاربند رہے۔ نہ کوئی
ہراساں ہُوا، نہ کوئی بھاگا اور نہ ہی کسی نے مدافعت کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ لہٰذا میں
سمجھتا ہوں کہ نظم و ضبط (   ) کے اس مشاہدہ کا خالد ابنِ ولید پر
اتنا گہرا اثر ہو چکا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک   نہیں کر سکے اور ان کا
گھائل دِل بالآخر مسخر ہُوا جس کا ظہور صلح حدیبیہ کے بعد ہُوا اور وہ مشرف بہ ایمان
ہونے کے لیے مدینہ کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ ایمان لانے کے بعد یہی خالد ابنِ
ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ "سیفٌ مِن سیوفِ اللہِ" قرار پائے۔

حضرت عمرو ابنِ العاص کا معاملہ :۔ حضرت خالد ابن ولید رض جب سوئے
مدینہ چلے ہیں تو راستہ میں حضرت عمرو ابنِ العاص مل گئے جو قریش کے ایک
اعلیٰ مدبر، شجاع و دلیر اور فنونِ حرب کے بہت ماہر تسلیم کیے جاتے تھے۔ یہی
تھے جن کو سفیر بنا کر قریش نے حبشہ ہجرت کرنے والے مہاجرین کی بازیابی کے
لیے ۵ نبوی میں جنابِ نجاشی رح کے دربار میں حبشہ بھیجا تھا۔ حضرت خالد

نے دریافت کیا کہ کہاں کا قصد ہے! بولے اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ جارہا ہوں۔ میرے دل نے تسلیم کر لیا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول برحق ہیں اور اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ حضرت خالد رضؓ نے کہا اپنا بھی یہی حال ہے ۔ قریش کے یہ دونوں مایہ ناز اور جلیل القدر فرزند بارگاہِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حاضر ہوئے اور دولتِ ایمان سے مشرف ہوئے۔ اور اس طرح وہ جوہر جو اُس وقت تک اسلام کی مخالفت میں صرف ہو رہا تھا، اب اسلام کی محبت اور اس کی اشاعت و توسیع میں صرف ہونے لگا۔ حضرت خالد ابنِ ولید رضؓ اور حضرت عمرو ابنِ العاص رضؓ نے دورِ نبوت اور بعدہٗ دورِ خلافتِ صدیقی و فاروقی میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ رہتی دنیا تک بھلائے نہیں جا سکتے۔ اول الذکر کا دنیا کے عظیم ترین جرنیلوں میں شمار ہوتا ہے۔ دورِ صدیقی میں فتنۂ ارتداد کی سرکوبی میں انہوں نے ہی فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح کسریٰ پر ابتدائی کاری ضرب انہی رضؓ کے ہاتھوں لگی اور انہی رضؓ کے ہاتھوں قیصر کی سلطنت میں سے شام کا ملک اسلامی قلمرو میں شامل ہوا اور آخر الذکر مصر کے فاتح ہوئے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان دو عظیم انسانوں کا قبولِ اسلام دراصل صلح حدیبیہ ہی کے ثمرات کا مظہر تھا۔

اِس صلح حدیبیہ کے ثمرات و فوائد میں سے چند ہی کا اِس مختصر وقت میں ذکر کر سکا ہوں ــ البتہ ایک بات مزید عرض کر دوں کہ درحقیقت یہ صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ کی تمہید بنی ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ۶ھ سے ۸ھ تک جو امن و سکون کے جو دو سال ملے ہیں اس میں توحید کی انقلابی دعوت نے نہایت سرعت کے ساتھ وسعت اختیار کی اور مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت فراہم ہو گئی ــ فتح مکہ کے احوال پر میں آگے قدرے اختصار سے کچھ عرض کروں گا۔

ایک حادثہ فاجعہ

میں نے عرض کیا تھا کہ اصحابِ صفہ کی جو جماعت بنفسِ نفیس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیرِ تربیت تیار ہو رہی تھی، صلح حدیبیہ کے بعد ان کے وفود بنا کر آپؐ نے گرد و پیش کے مختلف قبائل میں اسلام کی انقلابی دعوت کی نشر و اشاعت کے لئے بھیجے۔ اسی دوران میں ایک قبیلے نے اس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان اور زک پہنچانے کا ذریعہ بنا لیا۔

چنانچہ اس قبیلہ کی طرف سے تقاضا آیا کہ ہمارے یہاں اپنے چند مبلغین بھیجیے تاکہ وہ یہاں آکر ہمیں قرآن پڑھائیں اور اسلام کی تعلیم دیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب صفہ میں سے ستر صحابہ کرامؓ کو بھیج دیا۔ انہوں نے ایک جگہ پہلے ہی سے طے کی ہوئی تھی جہاں اس قبیلہ کی ایک بڑی نفری چھپی ہوئی تھی۔ وہاں انہوں نے یک بارگی حملہ کیا اور ستر صحابہ کرامؓ میں سے ایک کے سوا سب شہید ہو گئے۔ بچنے والے حضورؐ کی خدمت میں واپس ہوئے اور حضور کو سارا ماجرا سنایا۔ آپؐ کو اس حادثۂ فاجعہ پر انتہائی صدمہ ہوا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فجر کی نماز میں آخری رکعت کے رکوع سے اٹھ کر مسلسل ایک ماہ تک وہ دعائے قنوت پڑھی جو 'قنوتِ نازلہ' کے نام سے مشہور ہے۔

بہرحال اب پھر آئیے صلح حدیبیہ کے مابعد اور فتح مکہ سے قبل ظہور پذیر ہونے والے چند دوسرے اہم واقعات کی طرف:

بیرونِ عرب دعوتی خطوط کی ترسیل

یہی موقع تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے پہلی مرتبہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر بھی متعدد سلاطین کو اپنے دعوتی مکتوبات ارسال فرمائے۔ اس سے پہلے بیرونِ عرب آپؐ نے کوئی نامہ مبارک نہیں لکھا نہ اس سے قبل آپؐ نے کوئی ایلچی بھیجا۔ ابھی تک ۶ ہجری تک تمام دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں جزیرہ نمائے عرب کے اندر اندر تھیں۔ اس سے باہر کوئی دعوتی سرگرمی نہیں تھی۔ لیکن صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتی سرگرمی عرب کی حدود سے باہر بھی شروع فرمائی اور آپؐ نے مختلف صحابہؓ کو ایلچی بنا کر عرب کے اطراف و جوانب میں تمام سربراہانِ سلطنت کی جانب بھیجا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔

یوں سمجھیے کہ گویا صلح حدیبیہ کے بعد اب حضورؐ کی دعوتی سرگرمیاں دو شاخوں میں بٹ گئیں — ایک اندرونِ ملکِ عرب اور دوسری بیرونِ ملکِ عرب — آخرالذکر مرحلہ کو میں انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا ساتواں مرحلہ (Seventh Phase) قرار دیا کرتا ہوں۔ اس مرحلہ کے متعلق مجھے قدرے تفصیل سے اگلے جمعہ کو گفتگو کرنی ہے۔ اندرونِ عرب ان دو سالوں میں جو کچھ ہوا ہے میں چاہتا ہوں کہ پہلے اسے اختصار کے ساتھ مکمل کر دوں۔

ادائے عمرہ

اگلے سال ذیقعدہ ۷ھ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ قضا ادا فرمایا۔ آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ جو اصحاب پچھلے سال حدیبیہ میں موجود تھے، ان میں سے

کی مدد نہ جائے ۔سب چلیں۔ چنانچہ اس دوران جو لوگ فوت ہو گئے تھے ان کے سوا سب نے
کی پکار پر لبیک کہا ۔ اور عمرے کی سعادت حاصل کی ۔ صلح حدیبیہ میں طے شدہ شرط کے مطابق
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جلو میں حالت احرام میں مکہ تشریف
ئے ۔ حضورؐ اور صحابہ کرامؓ باآواز بلند تلبیہ کہتے ہوئے حرم شریف کی طرف بڑھے ۔ حضرت عبداللہ
ن رواحہ انصاری نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ کی مہار پکڑے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے ۔ ان
عار کو امام ترمذیؒ نے شمائل میں نقل کیا ہے :-

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ	"کافرو آج سامنے سے ہٹ جاؤ ۔
الیوم نضربکم علیٰ تنزیلہ	آج تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار
ضربا یزیل الھام عن مقیلہ	کریں گے ۔ وہ وار جو سر کو خوابگاہ سر
و یذھل الخلیل عن خلیلہ	سے الگ کر دے اور دوست کے دل
	سے دوست کی یاد بھلا دے ۔

صحابہ کا ہجوم غفیر تھا اور وہ کعبہ شریف کی دید سے شادکام ہو رہے تھے اور پورے جوش
خروش اور چشم تر سے عمرہ ادا کرنے کی تمنا و آرزو کو بجا لا رہے تھے ۔ شرط کے مطابق حضورؐ
ور صحابہؓ تین دن تک مکہ میں مقیم رہے ۔ قریش کے تمام بڑے بڑے لوگ مکہ سے نکل گئے کہ نہ ہم
ہیں نہ ہمارا خون کھولے اور نہ کوئی تصادم اور حادثہ وقوع پذیر ہو ۔ لہٰذا وہ سب کے
سب پہاڑوں پر چڑھ گئے ۔

قریش کی شکست خوردگی حقیقی نہیں تو معنوی طور پر یہ قریش کی زبردست شکست تھی اور
حضورؐ اور صحابہؓ کے اس عمرہ سے ان کی ساکھ کو بڑا شدید
نقصان پہنچا تھا ۔ اس کی وجہ کیا تھی ؟ یہ کہ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ اگرچہ عرب میں کوئی
باقاعدہ حکومت نہیں تھی لیکن پورے عرب کی سیاسی، مذہبی اور معاشی سیادت و قیادت قریش
کے ہاتھ میں تھی ۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ باقاعدہ اور تسلیم شدہ نہ سہی لیکن بظاہر احوال در حقیقت
(De facto) قریش کو پورے عرب پر ایک نوع کی حکمرانی حاصل تھی ۔ اگرچہ کوئی باضابطہ
اعلان شدہ (Declared) حکومت نہیں تھی کوئی تحریری معاہدہ یا دستور و آئین
موجود نہیں تھا ۔ اس لئے کہ وہاں قبائلی نظام تھا ۔ لیکن قدیم روایات موجود تھیں جس کے

(باقی صفحہ ۹۲ پر)

رفتارِ کار

دس دِن
سکنڈے نیوین ممالک میں

امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور قیم تنظیم برائے بیرونِ پاکستان جناب قمر سعید قریشی ۲۳ جون ۱۹۸۶ء کو ناروے، ڈنمارک اور سویڈن کا دورہ مکمل کرکے لاہور واپس پہنچے ہمارے ایک معاونِ کار مفتی مقبول الرحیم نے قارئینِ میثاق کے لئے جناب قمر سعید صاحب کی تحریری یادداشتوں اور گفتگو کی مدد سے اس دورے کی مختصر روداد مرتب کی ہے۔ تقاریر کے کیسٹ اور تفصیلی رپورٹیں موصول ہونے پر انشاء اللہ اس دورے کے مزید پہلو بھی سامنے آئیں گے۔

ادارہ

ڈنمارک میں مقیم ایک پاکستانی بھائی ملک محمد اسحاق صاحب کو گذشتہ سال قرآن اکیڈمی میں ماہِ رمضان المبارک (۱۴۰۵ھ) کے دوران ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دَورۂ ترجمہ قرآن میں شرکت کا موقع ملا تو اُن کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو سکنڈے نیوین ممالک میں مقیم پاکستانی اور دیگر ممالک کے مسلمانوں تک قرآن کا پیغام پہنچانے کی دعوت دی جائے۔ ڈنمارک واپس جاکر انہوں نے ہم خیال احباب سے مشورہ کیا۔ ملک اسحاق صاحب کی کوششوں کے نتیجے میں ڈنمارک میں پاکستانی احباب کی ایک تنظیم مجلس اشاعتِ توحید و سُنّت نے ڈاکٹر صاحب کو ڈنمارک کے دعوتی و تبلیغی دَورے پر بلانے کا فیصلہ کیا۔ اس مجلس کے نائب صدر جناب خالد محمود، ملک اسحق صاحب کے بھتیجے ہیں۔ مجلس کا دعوت نامہ انجمن خدام القرآن لاہور کے حلقۂ محسنین کے رکن ملک مسعود صاحب کے ذریعے لاہور پہنچا۔ اپریل کے آخری عشرے میں ڈاکٹر صاحب کی رضامندی کے بعد دورے کی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ناروے اور سویڈن کے پاکستانی احباب نے بھی اور سلو اور

سٹاک ہالم میں درس اور سوال جواب کی نشستوں کا اہتمام کر لیا۔ اور یوں ۱۵ جون سے ۲۲ جون تک ایک بھرپور پروگرام ترتیب پا گیا۔

روانگی سے قبل آٹھ روز تک تقریباً روزانہ ہی مجلسِ اشاعتِ توحید وسنت کے صدر حاجی عبداللہ صاحب اور قمر سعید قریشی صاحب کے درمیان ٹیلیفونی رابطہ قائم رہا لیکن پاکستان میں عید کی چھٹیوں اور چند دیگر وجوہات کی بنا پر ویزے کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب اور قمر سعید قریشی صاحب کو بہت ہی اہم مصروفیات مؤخر کر کے ۱۲ جون کو ویزوں کے حصول کے لئے اسلام آباد کا سفر کرنا پڑا کیونکہ جمعہ ۱۳ جون کی شب کو لاہور اور پھر اسلام آباد سے روانگی طے تھی۔ اسلام آباد سے صرف ناروے کا ویزہ لگ سکا۔ البتہ مجلس اشاعتِ توحید والسنۃ کے ذمہ دار حضرات سے ٹیلیفون پر یہ طے پایا کہ ڈاکٹر صاحب حسبِ پروگرام یہاں سے روانہ ہوں گے۔ اور ڈنمارک کا ویزا انشاء اللہ کوپن ہیگن کے ہوائی اڈے پر ہی مل جائے گا۔ ۱۴ جون کی صبح کو ساڑھے سات گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد جب دونوں حضرات کوپن ہیگن کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو مجلسِ اشاعتِ توحید وسنت کے صدر جناب حاجی محمد عبداللہ اور نائب صدر جناب خالد محمود اپنے بہت سے احباب کے ساتھ استقبال کے لئے موجود تھے۔ خان ٹریولز کے مالک جناب مسعود خان کے تعاون سے ویزا کے حصول کا مسئلہ اتنے مختصر وقت میں حل ہو گیا کہ ابھی جہاز کے بہت سے مسافر اپنا سامان بھی وصول نہ کر پائے تھے۔ ملک مسعود صاحب جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے ۱۳ جون کو ہی براستہ لندن کوپن ہیگن پہنچ چکے تھے اور ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ بعد ازاں پورے دورے کے دوران تمام پروگراموں میں شریک رہے۔

دعوتِ قرآنی کے اس وفد کے ساتھ آگے بڑھنے سے بیشتر مناسب یہی ہے کہ ان ممالک کے جغرافیے اور معاشرت کے بارے میں چند بنیادی امور بیان کر دیئے جائیں تاکہ بات کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ سکنڈے نیوین ممالک قطب شمالی کے بالکل قریب اُس خطے میں واقع ہیں جس کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے اور یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ موسم گرما میں یعنی آج کل وہاں سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے اعتبار سے رات اتنی مختصر ہوتی ہے کہ عشاء اور فجر کے درمیان بمشکل ڈھائی تین گھنٹے کا وقفہ ہوتا ہے اور پھر سورج غروب ہونے کے بعد

بھی اتنی روشنی باقی رہتی ہے کہ اس پر رات کا گمان نہیں ہوتا بس ایسی ہی کیفیت رہتی ہے جیسے ہمارے ہاں نمازِ مغرب کا وقت ہو۔ نمازوں کے اوقات سے قارئین کو رات ن کی اس انوکھی کیفیت کا اندازہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ نماز فجر عموماً صبح ڈھائی اور ین بجے کے درمیان ظہر بالعموم دوپہر کو ڈیڑھ دو بجے، عصر کی نماز شام چھ بجے کے لگ بھگ مغرب رات دس اور ساڑھے دس کے آس پاس اور عشاء اکثر و بیشتر رات بارہ بجے دا کی جاتی ہے۔ اس لئے نماز پڑھنے والوں کو آرام کا وقفہ عشاء و فجر کی بجائے فجر ظہر کے درمیان ملتا ہے۔

ان ممالک کی معاشرت کے بارے میں انگریزی زبان کی اصطلاح بہت جامع اور موزوں ہے۔ یعنی ایسے معاشرے جہاں روایات، اخلاقی اقدار اور معاشرتی بندھنوں کے خلاف بغاوت کو نہ صرف یہ کہ اخلاقی اعتبار سے معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ قانوناً بھی جائز اور درست تسلیم کیا جاتا ہے۔

سیاسی آزادیوں اور فلاحی ریاست کی ذمہ داریوں کو حکومتیں عملاً پورا کر رہی ہیں تا دنیا بھر کی جابرانہ اور آمرانہ حکومتوں کے ستائے ہوئے لوگوں کو سیاسی پناہ اور معاشی ان بھی مہیا کی جاتی ہے۔ اسی حوالے سے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد گزشتہ کئی سال سے ان ممالک میں سیاسی پناہ لئے ہوئے ہے۔ پیپلز پارٹی کی "گمشدہ بھیڑوں" کے علاوہ بھی ان ممالک میں آباد تارکین وطن میں پاکستانیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان میں سے اکثر کا تعلق پنجاب کے ضلع گجرات سے ہے۔ اور انہیں وہاں کام کرتے ہوئے بالعموم سولہ سترہ برس کا عرصہ ہو چکا ہے۔

آیئے اس مختصر سیاسی اور جغرافیائی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے پھر ہم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور قمر سعید قریشی صاحب کے تعاقب میں چلتے ہیں۔

ہوائی اڈے کی کارروائیوں اور استقبال کے لئے تشریف لانے والے یارانِ وطن کے پُرخلوص مصافحوں اور معانقوں سے فارغ ہو کر یہ قافلہ نو بجے صبح رہائش گاہ پر پہنچا۔ نمازِ ظہر کے بعد برمنگھم سے ایک اہل حدیث عالم دین اور جریدہ "صراط مستقیم" کے ایڈیٹر مولانا محمود احمد میر پوری ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ ساڑھے چار بجے ویسٹرڈ منزلیدہ کی مسجد میں سوال جواب کی مختصر نشست منعقد ہوئی۔ مسجد کے مصری امام

مولانا محمد الولبن نے عربی زبان میں ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرایا۔ کم و بیش پچاس پچپن
شرکا میں پاکستانی، ہندوستانی اور عرب ممالک کے باشندے شامل تھے۔ ایک پرجوش
اُردنی بزرگ ابو طاہر مدنی نے اقامتِ دین کے حوالے سے مسلمانوں کی ذمہ داریوں پر گفتگو
کی۔ زبانی جواب کے علاوہ اُنہیں "مسلمانوں پر قرآن کے حقوق" کا عربی ترجمہ بھی پیش
کیا گیا۔ ایک مقامی نومسلم عبدالواحد پیڈرسن صاحب سے بھی اس نشست میں تعارف
ہوا۔ نماز عصر کے بعد ویل بی ہال میں حاجی عبداللہ صاحب کے صاحبزادے شاہد عبدا
نے سورہ واقعہ کی آیات تلاوت کرکے پروگرام کا باقاعدہ آغاز کیا۔ نعت خوانی کے
بعد مرکز اسلامی سے منسلک پاکستانی عالمِ دین مولانا محمد نواز ظفر نے اتحادِ بین المسلمین
کے موضوع پر سورۃ صف کی آیت ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ....
کی روشنی میں نصف گھنٹے تک خطاب فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب کے درسِ قرآن سے پہلے جنرل
مولانا محمود میرپوری نے اپنے مخصوص انداز میں بطورِ تعارف ڈاکٹر اسرار احمد صاحب
کی ذات اور خدمات کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی سورۃ صف کی اُنہی آیات کی
کے بعد مولانا محمد نواز ظفر کے خطاب کے حوالے سے ہی بات شروع کی اور ڈیڑھ گھنٹے
کے مفصل خطاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصد اور آپ
کے بعد اُمت کی ذمہ داریوں کے حوالے سے فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت کو واضح
کوپن ہیگن میں یہ اس دورے کا پہلا بھرپور اجتماع تھا۔ حاضرین کی تعداد کا محتا
اندازہ پانچ سو سے زائد ہی تھا۔ اجتماع کے بعد ایک پاکستانی دوست میر صاحب
ہاں کھانے کا اہتمام تھا۔ نماز عشاء کے بعد کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو گھڑیوں میں
تاریخ بدل چکی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ رات پون بجے بستر پر لیٹنے کا موقع ملا اور تین
نماز فجر کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ فجر کے بعد حاجی عبداللہ صاحب اور ادریس صاحب
کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب بذریعہ کار سویڈن کے دارالحکومت سٹاک ہام کے لئے روانہ ہو
ڈاکٹر صاحب کو آٹھ گھنٹے کے طویل سفر کے دوران کار کی پچھلی نشست پر آرام کا موقع
کی غرض سے قمر سعید قریشی صاحب نے کوپن ہیگن میں ہی آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ سٹاک
کے میڈ بورگا ہال میں ڈاکٹر صاحب نے خطاب کیا۔ یہاں بھی چار پانچ سو حاضرین کی آ
متوقع تھی لیکن پیپلز پارٹی کے جلاوطن رہنماؤں اور اُن کی بیگمات کے مظاہرے

ہمکیوں نے حاضرین کی آمد کو خاصا متاثر کیا۔ کیونکہ انہوں نے یہ افواہ پھیلانے کا اہتمام
کیا تھا کہ ہم مظاہرے کے ساتھ فساد بھی کریں گے۔ اس لئے دین کے ساتھ دلچسپی
رکھنے والے شرفاء کی اکثریت نے گھروں میں بیٹھے رہنے ہی میں عافیت سمجھی۔ البتہ ڈاکٹر
صاحب کی آمد کے موقع پر مظاہرین نے جن کی تعداد پاکستانی اخبار نوائے وقت کی اطلاع
کے مطابق تیس تھی، واپس جاؤ واپس جاؤ کے نعرے بلند کئے۔ اگلے روز صبح دس بجے
ترکوں کی مسجد میں سوال جواب کی نشست منعقد ہوئی۔ حاضری سو کے لگ بھگ تھی۔
اس نشست میں الٰہ آباد بھارت کے کلیم صدیقی ہری پور ہزارہ کے رشید تنولی مردان
کے ڈاکٹر نور خان کراچی کے تاجر عبدالقادر میمن اور راجہ ابراہیم سے خصوصی تعارف
ہوا۔ اسی مسجد میں نمازِ ظہر کے فوراً بعد درسِ قرآن کا پروگرام تھا جس کے اختتام
کے ساتھ کوپن ہیگن واپسی کا سفر درپیش تھا۔ آٹھ گھنٹے کا یہ طویل سفر ساڑھے
گیارہ بجے شام مکمل ہوا۔ سترہ جون کو دوپہر کا کھانا اشرف صاحب کے ہاں طے تھا
نمازِ عصر مولانا محمد ابولبن کی مسجد میں ادا کی۔ وہاں کچھ عرب اور پاکستانی احباب
کے اجتماع کا بندوبست بھی تھا۔ عربوں تک اپنا مافی الضمیر پہنچانے کے لئے تو ڈاکٹر
صاحب کو انگریزی کا سہارا لینا پڑا۔ البتہ پاک و ہند کے احباب سے گفتگو اردو میں
ہوئی۔ سوال جواب کا سلسلہ نو بجے تک چلتا رہا۔ ابھی نمازِ مغرب میں خاصا وقت
باقی تھا۔ اس لئے مولانا محمد ابولبن کی پُرخلوص محفل کو بادلِ ناخواستہ چھوڑ کر مجلس
اشاعتِ توحید و سنت کے نائب صدر جناب خالد محمود کے گھر کی راہ لی کہ رات کے
کھانے کا پروگرام وہیں تھا۔

اٹھارہ جون کو نمازِ ظہر سے پہلے کوپن ہیگن کی قدیم آبادی میں واقع واکنگ
مارکیٹ اور راؤنڈ ٹاور کا نظارہ کیا۔ ۴½ بجے تنظیم اسلامی کے احباب سے خصوصی
ملاقات طے تھی۔ سویڈن میں جماعتِ اسلامی کے ہم خیال احباب تنظیم اسلامی کے نام
سے کام کر رہے ہیں۔ بقول ان کے انہوں نے یہ نام اس لئے اختیار کیا ہے کہ وہ اپنے
آپ کو تقویٰ و تنظیم کے اس معیار پر نہیں پاتے کہ جماعتِ اسلامی کا نام استعمال کریں۔
یہ حضرات "تنظیم" نام کا اپنا ایک ہفت روزہ شائع کرتے ہیں اور تبلیغی مقاصد کے لئے
انہوں نے پرائیویٹ ریڈیو سٹیشن بھی قائم کیا ہوا ہے جس کا نام الفتح ہے۔ تنظیم کے دفاتر

اور ریڈیو سٹیشن دیکھنے کے بعد سوا پانچ بجے تنظیم کے رفیق طارق عسکری صاحب کے مکان پر پندرہ سولہ حضرات کے ساتھ طویل گفتگو ہوئی۔ شرکاء میں تین ارکان اور باقی رفقاء تھے۔ تنظیم کے صدر جناب حامد صدیقی صاحب علمی شخصیت ہیں۔ سویڈن سے ہفت روزہ تکبیر کے ساتھ قلمی تعاون کا سلسلہ بھی قائم ہے۔ رات ساڑھے آٹھ بجے خان ٹریولز کے مالک جناب مسعود خاں صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں کھانے کی دعوت پر کم و بیش چالیس حضرات کو بلا رکھا تھا جن میں پاکستانی سفارتخانے کے دو ذمہ دار حضرات یعنی ٹریڈ کونسلر جناب شاہد باغپتی اور لیبر اتاشی کرنل صابر علی شاہ بھی شامل تھے۔ کھانے سے پہلے صاحب خانہ کی فرمائش پر ڈاکٹر صاحب نے "استحکام پاکستان" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ گفت و شنید و خورد و نوش کی یہ نشست نماز عشاء تک جاری رہی۔ دیار غیر میں رہنے والوں کی زندگی میں اس قسم کی نشستیں صحرا میں نخلستان کی سی شان رکھتی ہیں۔ ان کی اہمیت و افادیت کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کبھی خود ساختہ جلاوطنی کی لذتوں سے آشنا ہوتے ہوں۔

۱۹ رجون کا دن مجموعی طور پر سیر و تفریح میں گزرا۔ گیارہ بجے فلائنگ بوٹ پر بحیرہ بالٹک اور بحر شمال کے مقام اتصال مالموکو دیکھنے گئے۔ واپسی پر ظہر کی نماز کے بعد شہر سے تیس میل کے فاصلے پر ویلبرڈ یرو سلاٹ کا قدیم قلعہ دیکھا جہاں سویڈن کے بادشاہوں کے نوادرات کو محفوظ کیا گیا ہے۔ قلعے کے سرسبز لان میں ادریس صاحب کے گھر سے آیا ہوا کھانا کھایا۔ مغربی شہنشاہوں کی یادگاروں کے سائے میں مشرق کے لذیذ پکوانوں نے عجیب لطف بھی دیا مگر دل میں مشرق کے ان مسکینوں کی حالت پر کرب اور رنج کی کیفیت بھی رہ رہ کر پہلو بدلتی رہی جن کا دل مغرب میں اٹکا ہے کہ وہ اپنی شناخت سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

عصر کی نماز سے کچھ پہلے یہ محفل برہم ہوئی۔ نماز قیام گاہ پر پہنچ کر ادا کی۔ نماز کے بعد تنظیم اسلامی رجس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، کے چند رفقاء حسب پروگرام تشریف لے آئے۔ دو گھنٹے کی طویل گفتگو کے دوران تحریک اسلامی کے طریق تنظیم، طریق دعوت اور فلسفہ انقلاب جیسے اہم موضوعات زیر بحث آئے۔ رات کا کھانا مسعود بیگ صاحب کے ہاں کھایا۔

۲۰ مئی کو اسلامک سنٹر میں ڈاکٹر صاحب نے نمازِ جمعہ کے اجتماع سے حاضرین کی
لت کے مطابق اردو اور انگریزی میں خطاب کیا۔ گفتگو کا موضوع سورہ صف
اور سورہ جمعہ کی آیات کے حوالے سے "مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں" تھا۔ نمازِ جمعہ
فراغت کے بعد ساڑھے چار بجے صبا ٹریولنگ ایجنسی کے مالک جناب منور علی شاہ
گھر دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس دعوت میں بھی سفارت پاکستان کے بیرا تاشی کرنل صابر علی
ہ اور تھرڈ کونسلر جناب باغیتی موجود تھے۔ کھانے کے بعد ان کے ساتھ طویل نشست
۔ ساڑھے چھ بجے یعنی نمازِ عصر سے فارغ ہو کر وہاں سے سیدھے ہوائی اڈے پہنچے۔
لو کے لئے جہاز تیار کھڑا تھا۔ آٹھ بجے اوسلو کے فضائی مستقر پر کھڑے تھے۔ اسلامک
ل سنٹر کے سید اظہر صاحب سیکرٹری جیس صاحب اور سنٹر کے امام و خطیب مولانا قاری
۔ الرحمان صاحب دیگر احباب کے ہمراہ چشم براہ تھے۔ مرکز میں پہنچ کر تمام احباب
تعارف ہوا۔ نماز مغرب کے بعد اظہر صاحب کے ہاں کھانا کھایا۔ رہائش کا بندوبست
رسے باہر بیس کلومیٹر کے فاصلے پر فیصل آباد کے دو بھائیوں میاں اصغر علی اور میاں
علی کے پُر فضا بنگلے میں کیا گیا تھا۔ رات ½۱۲ بجے کوپن ہیگن کے احباب کا آٹھ رکنی
فد جو نماز جمعہ کے بعد حاجی عبداللہ صاحب کی قیادت میں کاروں میں روانہ ہوا تھا
ی رہائش گاہ میں پہنچ گیا۔

ہفتہ اکیس جون کو اوسلو کے عوامی ہال میں جسے مقامی زبان میں فالکٹ ہاؤس
ہے ہیں۔ تقریباً ڈھائی سو پاکستانی احباب جمع ہوئے۔ مولانا محبوب الرحمان کے تعارفی
ت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے "مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں" کے موضوع پر دو گھنٹے
مدلل خطاب میں پورے شرح و بسط سے روشنی ڈالی۔ خطاب کے بعد ڈنمارک ریڈیو
ے انٹرویو لیا تھا۔ ریڈیو کے بھارتی نژاد مسلمان نمائندے نے عورتوں کے مسئلے
پر تیکھے اور چبھتے ہوئے سوالات کئے۔ اس اثناء میں تمام سامعین قریب ہی واقع
سلامک سنٹر میں دوبارہ اکٹھے ہو گئے جہاں شام دس بجے تک سوال جواب کا سلسلہ
ہتا رہا۔ رات کا کھانا ایک پاکستانی دوست افضل صاحب کے گھر کھایا۔

۲۲ جون دورے کا آخری دن تھا۔ حاجی عبداللہ صاحب اور کوپن ہیگن کے دیگر احباب
ساڑھے گیارہ بجے الوداعی ملاقات کے بعد رخصت ہو گئے۔ بارہ بجے اوسلو سے شائع ہونے

والے جریدے "آواز" کے چیف ایڈیٹر میاں ز. بد رضوانی انٹرویو کے لئے تشریف لائے
کا پرچہ تین زبانوں اُردو انگریزی اور ناروے کی زبان نارسک میں چھپتا ہے۔ اُن
انٹرویو کا موضوع بھی "دعوت" ہی تھی۔ ناروے میں رہنے والے پاکستانیوں کے
اور خاندانی مسائل پر بھی گفتگو ہوئی۔

انٹرویو کے بعد مرکز اسلامی میں اس دورے کا آخری پروگرام منعقد ہوا۔ دعوت
دین اور شہادتِ حق کے کام سے تعارف اور دلچسپی رکھنے والے پچاس ساٹھ اف
کے سامنے ڈاکٹر صاحب نے سورۃ حجرات کی آیات کی روشنی میں ایمان اور اسلام کے
اور تعلق پر روشنی ڈالی اور ہجرت و جہاد کی دعوت پیش کی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے در
کے معاً بعد دعوتِ حق کے صاحبین کا یہ قافلہ بذریعہ ہوائی جہاز ۱۲ بجے واپس
ہیگن پہنچا جہاں منور علی شاہ صاحب اور نسیم باری صاحب پی آئی اے کی
دس بجے کی پرواز کے بورڈنگ کارڈ لئے منتظر تھے جس کی منزل اسلام آباد تھی

بقیہ: "اسلامی انقلاب کے مراحل"

مطابق معاملہ چل رہا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آج تک برطانیہ کا کوئی تحریری دستو
(Written Constitution) موجود نہیں ہے۔ بلکہ روایات کی بنیاد پر ان کا معاملہ چل
ہے۔ کم وبیش یہی معاملہ اہل عرب کا تھا۔ جس کی رُو سے گویا قریش عرب کے حکمران تھے۔
کعبۃ اللہ کے باعث مذہبی سیادت ان کے پاس تھی۔ معاشی اعتبار سے نہایت خوشحال
میں بیان کر چکا ہوں کہ ان کے قافلوں پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا تھا اس لئے کہ ہر قبیلہ کا خد
بت کی شکل میں بطور یرغمال قریش کے پاس رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ قریش کو پورے عرب پر چوہدر
و سیادت حاصل تھی وہی اسلامی انقلاب کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ لہٰذا یہ واقعہ
کہ ہجرت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ ان کے خلاف اقدامات فرمائے
ذکر میں اپنی گذشتہ تین تقریروں میں تفصیل سے کر چکا ہوں۔

اب آئیے یہود کے ساتھ معاملات کے احوال و کوائف کی طرف اور خاص طور پر ان د
کی جانب جو صلح حدیبیہ کے بعد بعد گویا صلح کے ثمرات کے طور پر وقوع پذیر ہوئے۔

ادارہ

اسلامی قوانین اور جدید سائنسی نقطہ نظر

اسلام جس کو ہم دین فطرت مانتے ہیں اس پر اہل مغرب اور مغرب پرست طبقہ کے حضرات اعتراض کرتے آئے ہیں
وقت ہم ان اعتراضات کی بات کر رہے ہیں جو کہ اہل مغرب عمرانیات دانوں (Sociologist) نے
میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت پر کئے ہیں اور ہمارے یہاں مغرب پرست طبقے نے yes - man کا کردار
تے ہوئے ان کے اعتراضات کو مانا ہی نہیں بلکہ اس کو نافذ بھی کیا۔ جس کی مثال ایوب خان کا قانون ہے جو بدستور
ہے۔

مزے کی بات یہاں یہ ہے کہ آج کی سائنس ٹھوس ثبوت کے ذریعے ان عمرانیات دانوں کے نظریئے کی نفی کر رہی
سائنس دان اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انسان متعدد ازدواج کی فطرت ہی پر پیدا کیا گیا ہے۔
امریکہ کے صف اوّل کے سائنسی جریدے ڈسکوور اپریل ۱۹۸۵ (DISCOVER , APRIL , 1985) کی اشاعت
س مسئلہ پر بحث کی گئی ہے اور ریسرچ کام کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔
اس جریدے کے مطابق سائنس دانوں نے انسان کی بناوٹ کا تقابل اس کے قریب ترین جاندار یعنی بندر کی
ف نسلوں سے کیا۔ جو کہ اپنی ساخت، قدوقامت، جسامت اور رویئے میں کسی نہ کسی طرح مختلف ہیں یعنی ان بندر کی
یک نسل دوسری نسل سے کسی نہ کسی طرح مختلف ہے۔ ان میں بندروں کی بعض نسلیں یک زوجگی کی حالت میں زندگی
رتی ہیں۔ مثلاً گبن (Gibbon) اور کچھ کثرت ازدواج کی حالت میں یعنی ایک نر کے ماتحت کئی مادہ ہوتی ہیں۔
گوریلا نسل کے بندر۔

سائنس دانوں نے دیکھا کہ بندر کی وہ نسل جو کہ اپنی زندگی یک زوجگی کی حالت میں بسر کرتی ہے یعنی ایک نر اور
دہ کا جوڑا بنتا ہے اس میں نر اور مادہ قدوقامت اور جسامت میں برابر ہوتے ہیں۔ مثلاً گبن نسل کے نر اور مادہ
قدوقامت اور جسامت میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ جبکہ بندر کی وہ نسل جو کثرت ازدواج کی حالت میں زندگی
ہے جیسا کہ گوریلا بندر کی نسل کہ ایک نر کے ماتحت متعدد مادہ ہوتی ہیں اس نسل کے نر قدوقامت اور جسامت
دہ سے بڑے ہوتے ہیں۔

اس طرح سائنس داں اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر قدوقامت اور جسامت نر اور مادہ کی برابر ہیں تو وہ نسل فطرتاً
زوجگی پر پیدا کی گئی ہے اور اگر نر کی قدوقامت اور جسامت مادہ سے زیادہ تو وہ نسل متعدد ازدواج کی فطرت
دی گئی ہے۔

جب سائنس داں یہ اصول لے کر حضرتِ انسان کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کو پتہ چلا کہ انسان میں مرد کا وزن عورت سے اوسطاً ۲۰ ٪ زیادہ ہے اور اس کا قد عورت سے اوسطاً ۸ ٪ زیادہ ہے۔ لہٰذا وہ اس بات کو ماننے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ انسان فطرتاً متعدد ازدواج کی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے۔

صرف یہی ایک مثال نہیں ہے بلکہ سائنس دانوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یک زوجگی کی حالت میں نر و مادہ کو اگر کچھ فاصلہ سے دیکھا جائے تو وہ مختلف نظر نہیں آتے۔ اس میں بھی گبن نسل کے بندروں کی مثال دی گئی ہے۔ لیکن متعدد ازدواج کی نسل کے بندر جن کی بہترین مثال گوریلا نسل کے بندر ہیں نر و مادہ میں دور ہی سے تمیز کی جا سکتی ہے جبکہ گوریلا نر کی پیٹھ پر سفید بال ہوتے ہیں اور سر ابھرا ہوا ہوتا ہے۔ جو کہ نر اور مادہ کی تمیز دور ہی سے کر دیتا ہے۔

یعنی یک زوجگی کی حالت میں دور سے نر و مادہ میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ لیکن کثرتِ ازدواج کی نسل فطرتاً پیدا کی گئی ہے اس میں، نر اور مادہ میں دور ہی سے تمیز ہو جاتی ہے۔

یہ اصول ہو بہو انسان پر ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے چہرے پر بال اور عورت کی مخصوص ساخت کی وجہ سے مرد اور عورت میں دور ہی سے تمیز کی جا سکتی ہے جو کہ پھر ایک دفعہ دلیل فراہم کرتی ہے کہ انسان کی پیدائش متعدد ازدواج پر کی گئی ہے اور یہی جریدہ اسی مضمون میں آگے اس بات کو ایک سروے سے ثابت کرتا ہے کہ مرد کا فطری رجحان متعدد ازدواج کی طرف پایا گیا ہے جو کہ ان کے معاشرے میں وہ غیر قانونی طور پر اس کو پورا کرتا ہے۔ اور اسی سروے کے مطابق عورت کا رجحان فطرتاً یک زوجگی کی طرف یعنی ایک شوہر کی طرف ہوتا ہے اور اگر وہ عام طور پر کسی دوسرے مرد کی طرف راغب ہوتی ہے تو اس کی وجہ اپنے شوہر کی طرف سے ناکافی جنسی تسکین ہوتی ہے جس میں یا تو مرد کا دخل ہوتا ہے یا پھر اس کی کوئی اور وجہ ہوتی ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان میں متعدد ازدواج کا ہونا انسان کی عین فطرت میں داخل ہے۔ تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ دینِ فطرت اس کی اجازت نہ دیتا۔

مگر جو مغرب پرست طبقہ کی اکثریت اور " ترقی پسند خواتین " جو کہ مغربی تمدن کی اندھی تقلید کرتی ہیں وہ اس کی پیروی کرتی آئی ہیں جو کہ وہاں کے معاشرے میں ہو رہا ہے۔

شاید علامہ اقبال نے انہی جیسے غلامانہ ذہنیت والی کالی بھیڑوں سے متنبہ کیا ہے!

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پہ
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

جاوید عباسی

Coca-Cola
Coca-Cola

واضع کے بہتر آداب
- آپ کا بہترین انتخاب
فریش
KARACHI
ASGULLA

وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

AUG 199

نفاذِ شریعت اور فقہی اختلافات

ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی کا ایک اہم خطاب

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور

سب آفس ۱۱۔ داؤد منزل۔ نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

یل الرحمٰن

عرضِ احوال

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

ذوالحجہ ۱۴۰۶ھ مطابق اگست ۱۹۸۶ء کا "میثاق" ہدیۂ ناظرین ہے۔ چند
ز یر موانع کے باعث یہ شمارہ بھی قدرے تاخیر سے قارئین تک پہنچے گا جس کے لیے
رہ معذرت خواہ ہے۔ اِس سال اگست کا مہینہ اہلِ پاکستان کے لیے دوہری سعادت
ِ مسرت کا پیغام لے کر آیا ہے کہ ۱۴ اگست کو جب ہم یہاں اپنی آزادی کی یاد منا
رہے کر رہے ہوں گے۔ انشاء اللہ اُسی روز لاکھوں فرزندانِ توحید میدانِ عرفات میں
ع ہو کر اپنی عبدیت کا اظہار کر رہے ہوں گے۔

ذوالحجہ کے مہینہ کی ہمارے دین میں جو اہمیت ہے اس
ے یقیناً ہر ذی شعور مسلمان واقف ہوگا۔ اس ماہ میں ارکانِ اسلام میں سے پانچواں
عظیم ترین رکن حج مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا کی شرط کے ساتھ شامل ہے۔ پھر
ی مہینہ میں ۱۰ ذوالحجہ کو تمام عالم میں مسلمان عید الاضحٰی کی دوگانہ نماز باجماعت
دا کرتے ہیں اور ایامِ تشریق میں سنتِ ابراہیمی کے اعادہ کے طور پر اللہ کی راہ میں
جانوروں کی قربانی پیش کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا کہ اس عید کی
نمایاں ترین اور امتیازی شان "قربانی" ہی ہے۔ حج کا رکنِ رکین وقوفِ عرفات ہے،
جس کے بغیر حج ہی نہیں ہوتا۔ حج کے جو مراسم، مناسک اور ارکان ہیں۔ ان کا تعلق مکہ مکرمہ
د اس کے لوازم سے ہے۔ جو کہیں اور ادا نہیں کیے جا سکتے۔ البتہ "قربانی" جو ارکانِ
ن حج کا ایک بنیادی رکن ہے اُسے ہمارے دین میں اتنی وسعت دی گئی ہے کہ
روئے ارضی پر بسنے والا ہر مسلمان حج کے اس بنیادی رکن میں شریک ہو جائے۔
ساتھ ہی اس قربانی کی حکمت یہ بھی ہے کہ دلوں میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کا تقویٰ
پیدا ہو۔ بفحوائے آیتِ قرآنیہ:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۗؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ط

اللہ تک نہیں پہنچتا (ان قربانیوں کا) گوشت اور خون — البتہ اس تک رسائی ہے تمہارے تقویٰ کی۔"

اور دوسری طرف یہ کہ اللہ تعالےٰ کے حضور میں جانور کی قربانی پیش کرتے وقت مسلمان اپنے اس جذبہ اور عزم کا اعادہ کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بوقتِ ضرورت اپنی محبوب ترین اشیاء کی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کریں گے اور ان کا مال ومنال اور جسم وجان سب اللہ ہی کا ہے۔ اور اس کی راہ میں لگ جانا کھپ جانا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ

"بے شک میری نماز اور میری قربانی، اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے۔"

اللہ تعالےٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اصل روحِ قربانی کو اپنی شخصیتوں میں جذب کرنے کے لیے کمرِ ہمت کس لیں اور اپنا مقصدِ زندگی اس بات کو بنالیں کہ

"میرا سب کچھ میرے خدا کا ہے"

∴

مسلمانانِ برِصغیر کے اعتبار سے ماہِ اگست کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک آزاد وخودمختار ریاست کی حیثیت سے "پاکستان" کا قیام عمل میں آیا تھا — ہر سال کی طرح ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کو بھی "یومِ پاکستان" منایا جائے گا۔ جلسے جلوس ہوں گے، ذرائع ابلاغ مسرت وشادمانی کے زمزمے اور غلغلے پیش کریں گے اور میلے ٹھیلے ہوں گے۔ الغرض خوشیاں منانے کے جو طور طریقے بھی دنیا میں رائج ہیں، وہ سب اختیار کیے جاتے رہے ہیں اور اس سال بھی کیے جائیں گے۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے سوچنے اور غور کرنے کا مسئلہ یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا، اُس کی طرف کتنی پیش رفت

..ئی ہے ا نہایت دکھ کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ اس اعتبار سے جب ہم
جائزہ لیتے ہیں تو مایوسی کے اندھیروں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ یہ صحیح ہے کہ
معاشی طور پر ہم نے نمایاں طور پر ترقی کی ہے۔ لیکن قیامِ پاکستان کا اصل مقصد
اور حقیقی محرک تو یہ جذبہ تھا کہ:

پاکستان کا مطلب کیا —— لا الٰہ الا اللہ

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر دردمند دل اس کا اعتراف کرے گا کہ دینی و اخلاقی
اعتبار سے مسلمانانِ پاکستان کا حال قیامِ پاکستان کے وقت کے مقابلہ میں ترقی کے
بجائے زوال و انحطاط سے دوچار ہوتا چلا آ رہا ہے —— اخلاقی پہلو سے صرفِ نظر
کرتے ہوئے اگر ہم قراردادِ مقاصد سے نویں ترمیمی بل تک کے دستوری سفر کا جائزہ
لیں تو دین کے بارے میں ہمارے حکمرانوں کا رویہ مبرہن ہو جاتا ہے۔ اِس رویے کا
تازہ ترین مظہر یہ ہے کہ سینیٹ میں موجود علماء کرام کو نفاذِ شریعت کے لیے پرائیویٹ
بل پیش کرنا پڑا۔ اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان کی ماں ہونے کا دعوےٰ کرنے والی
برسرِ اقتدار جماعت دن رات اسلام کی تسبیح پڑھنے کے باوجود کابل شرحِ صدر
اور اتحاد و اتفاق سے بل کی مخالفت پر ڈٹی ہوئی ہے۔ دوسری جانب نوزائیدہ
جمہوریت کے بانی اور سرپرست عوام اور اُن کے نمائندوں کو لڑانے کی پالیسی پر گامزن
ہیں کہ اسی میں انہیں اپنی بقاء اور فلاح نظر آتی ہے۔ بقول حضرتِ اقبال ؎

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اس موضوع پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا فکر انگیز خطاب "تذکرہ و تبصرہ"
کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے۔ ذی الحجہ کی مناسبت سے فلسفۂ حج پر امیرِ تنظیم
کا تازہ ترین خطاب بھی نذرِ قارئین ہے۔ اسی شمارے میں مراحلِ انقلاب کے ساتویں
خطاب تک کی اشاعت کے بعد صرف دو خطاب باقی رہ گئے ہیں۔ اللہ جلّ شانہٗ کی
توفیق شاملِ حال رہی تو یہ سلسلہ بھی جلد ہی اختتام کو پہنچے گا۔

آئندہ سالانہ اجتماع تک تنظیمِ اسلامی کے تحت

اہم اجتماعات کی تفصیل

تنظیمِ اسلامی کی مرکزی مجلسِ مشاورت کے فیصلوں کے مطابق سالِ رواں (یعنی آئندہ سالانہ اجتماع سے قبل تک) کے دوران تنظیمِ اسلامی کے زیرِ اہتمام اجتماعات منعقد ہوں گے (ان شاء اللہ) رفقاءِ تنظیم سے گذارش ہے کہ وہ ان اجتماعات کی تاریخوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ابھی سے ان میں اپنی شرکت کو یقینی بنانے کی غرض سے حسبِ پروگرام دفاتر وغیرہ سے چھٹیاں حاصل کریں۔

سہ روزہ علاقائی اجتماع

(۱) اجتماع کراچی ——— برائے رفقاء سندھ و بلوچستان

یہ اجتماع ۲۷ر اکتوبر تا ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۶ء منعقد ہوگا۔

(۲) اجتماع فیصل آباد ——— برائے رفقاء پنجاب سرحد و شمالی علاقے

یہ اجتماع ۲۵ دسمبر تا ۲۹ر دسمبر ۸۶ء منعقد ہوگا

اجلاس مجلس مشاورت

(۱) ۹ اور ۱۰ دسمبر ۸۶ء — بمقام قرآن اکیڈمی لاہور۔

(۲) ۱۰ جنوری ۸۷ء تا ۱۲ جنوری ۸۷ء 〃 〃 〃

بارہواں سالانہ اجتماع

تنظیم اسلامی کا بارہواں سالانہ اجتماع ان شاء اللہ العزیز ۴ر اپریل ۸۷ء بعد شام تا ۷ اپریل ۸۷ء لاہور میں منعقد ہوگا

المعلن: میاں محمد نعیم (قیم تنظیم اسلامی پاکستان)

تذکرہ و تبصرہ
ڈاکٹر اسرار احمد
خطاب جمعہ - ۱۱ - جولائی

نفاذِ شریعت اور فقہی اختلافات

زیرِ نظر خطاب میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ملک کے موجودہ حالات اور حقائق کا معروضی تجزیہ کرتے ہوئے نفاذِ شریعت کی راہ کی ایک بڑی رکاوٹ یعنی اُمت کے فقہی اختلافات کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے عملی تجاویز پیش کی ہیں۔ ان تجاویز کا مقصد موجودہ جاگیردارانہ معاشرے اور سیکولر جمہوری نظامِ حکومت کے اندر شرعی قوانین کے نفاذ کے لئے جگہ پیدا کرنا ہے۔ ورنہ اسلام جب ایک عوامی تحریک کے نتیجے میں غلبہ حاصل کرے گا اُس وقت عوام کا اجتماعی شعور اسلام کے پیغامِ اتحاد سے اس درجہ ہم آہنگ ہو چکا ہوگا۔ اور تبدیلی اتنی بھرپور اور ہمہ گیر ہوگی کہ موجودہ فرقہ بندیاں اور اختلافات کے منفی اثرات خود بخود بے اثر ہو جائیں گے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے خطاب کی تلخیص ہمارے معاون کارِ مقبول الرحیم مفتی صاحب نے تیار کی ہے

———— (ادارہ)

ایک اسلامی ریاست میں نفاذِ شریعت کے معاملے پر گفتگو کرتے ہوئے جو بنیادی اصول ذہن میں واضح اور روشن رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ حاکمیتِ مطلقہ یا اقتدارِ اعلیٰ ———— (SOVEREIGN) صرف اللہ کے لئے ہے۔ قانون سازی کا اختیارِ مطلق بھی صرف اللہ کے رسولؐ کو حاصل ہے۔ قرآن و سنت کے واضح اور صریح احکام میں تغیر و تبدل کا اختیار نہ اکثریت کو حاصل ہے اور نہ کسی اقلیت کو۔ ایک ملک تو کجا پوری دنیا کے مسلمان مل کر ان میں کسی معمولی ترمیم، اضافے یا تنسیخ کا اختیار نہیں رکھتے۔ اگر ہم اس قسم کا کوئی دعویٰ یا اختیار اپنے لئے رکھنا چاہتے ہیں تو یہ بات اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ کے اصول کی نفی کرتی ہے۔ اس کے

نتیجے میں تو حاکمیتِ مطلقہ عوام کو منتقل ہو جائے گی۔ اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اسلام کو مغر
کے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام سے ممتاز و ممیز کرتا ہے۔ البتہ شریعت میں مباحات کا ایک بہ
بڑا دائرہ ہے جس میں مسلمان آزاد ہیں۔ اس میں وہ اپنی اکثریت کی رائے اور مرضی کے مطا
قانون سازی کر سکتے ہیں۔ خود اکثریت کی رائے کو معلوم اور متعین کرنے کا معاملہ بھی مباحا
کے اسی دائرے میں آتا ہے۔ الیکشن کیسے ہوں، نظام پارلیمانی ہو یا صدارتی۔ یک ایوانی ہ
ہو یا دو ایوانی یہ تمام امور مباحات میں شامل ہیں۔ گویا ایک اعتبار سے مسلمان معاشرہ اور مسلم
ریاست آزاد ہے اور ایک اعتبار سے پابند ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، وہ پابندی کیا
سورۃ الحجرات کی پہلی ہی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:-

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا
اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے
ڈرتے رہو۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

دوسری طرف آزادی کی حدود بھی قرآن نے بتا دی ہیں۔ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ
بَيْنَهُمْ (سورہ شوریٰ آیت ۳۸۔ اور وہ اپنے معاملات آپس میں مشورے سے
ہیں)۔ یہی جمہوریت ہے اور یہی مطلوب ہے۔ آزادی کے اس دائرے میں کسی فرد واد
کسی مخصوص طبقے یا گروہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے کچھ خصوصی اختیار
دعویٰ کرے۔ یہ مسلمانوں کی ایک مشترک متاع ہے جس میں اکثریت کی رائے کو ظاہر ا
ہونے کا بھرپور موقع ملنا چاہیئے۔ یہ بنیادی امور اگر واضح ہو جائیں اور ہمارے خو
عوام دونوں کو ان کے بارے میں شرح صدر حاصل ہو جائے تو ہمارے بہت سے
مسائل خود بخود حل ہوتے چلے جائیں گے۔

حضرات ایک اسلامی ریاست کے ان بنیادی تصورات اور مطالبات کی روشنی
جب ہم پاکستان کی چالیس سالہ آئینی تاریخ کے سفر پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں سب سے
سنگِ میل۔ قراردادِ مقاصد کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ قرارداد دراصل ریا
طرف سے اس بات کا اقرار و اعلان تھا کہ ہم مادر پدر آزاد جمہوریت میں یقین نہ
کہ جس میں حاکمیتِ مطلقہ (SOVEREIGNTY) انسانوں کی ہوتی ہے

ہم حاکمیت مطلقہ اور قانون سازی کا اختیار صرف اللہ کے لیے سمجھتے ہیں اور اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے یہ اس کے رسول کو حاصل ہے۔ جیسے کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے کے لیے صرف کلمہ شہادت ادا کرنا ہوتا ہے لیکن اس کلمے کا اقرار کرنے کے بعد اس کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ دائرہ اسلام سے باہر تھا اس کے بعد وہ دائرہ اسلام کے اندر آ گیا۔ خواہ ابھی اسے اسلام کا اور کوئی حکم معلوم نہیں ہوا۔ خواہ ابھی وقت نہیں آیا اور اس نے کوئی نماز بھی ادا نہیں کی۔ لیکن بہر حال وہ مسلمان ہے۔ مجرد کلمہ شہادت کے اقرار و اعلان نے اسے مسلمان بنا دیا ہے۔ بالکل یہی معاملہ قرار دادِ مقاصد کا ہے۔ دستور ساز اسمبلی جو ہماری قوم اور ریاست کی اجتماعی زبان تھی اس نے جب قرار دادِ مقاصد کی صورت میں کلمہ شہادت کا اقرار و اعلان کر دیا تو ریاست مسلمان ہو گئی۔ یہ ہماری دستوری تاریخ کا بہت اہم موڑ ہے۔ دوسری اہم علامت ہمارے تمام دستوری خاکوں اور دستوروں میں لکھی جانے والی یہ دفعہ ہے کہ :

"NO LEGISLATION WILL BE DONE REPUGNANT TO THE HOLY QURAN AND SUNNAH"

یعنی کوئی قانون سازی قرآن اور سنت کے منافی نہیں کی جا سکے گی ـــ یہ دفعہ درحقیقت قانونی اور دستوری زبان میں سورہ حجرات کی پہلی آیت کے الفاظ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (مت بڑھو آگے اللہ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے) کی بہترین اور صحیح ترین ترجمانی ہے۔ اللہ کی جگہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے اور رسول کے قائم مقام ہمارے پاس رسول کی سنت ہے۔ جس شخص نے بھی یہ دفعہ لکھی ہے اگرچہ میں اسے نہیں جانتا لیکن غائبانہ طور پر اسے خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ اسے بہترین اجر سے نوازے۔

بدقسمتی سے یہ دفعہ تیس تینتیس برس تک محض رہنما اصولوں میں ہی شامل رہی۔ عملاً قانون سازی کرتے ہوئے اسے کبھی پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ عدلیہ کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اس دفعہ کی روشنی میں قرآن و سنت کے مطابق فیصلے کرے۔ شہریوں کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ عدالت میں جا کر ثابت کریں کہ جناب فلاں قانون اس دستوری دفعہ سے متصادم ہے اس لئے اسے ختم کیا جائے۔ نفاذ شریعت کی جانب دستوری سفر کا تیسرا قدم چیف مارشل لا ر

ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے وفاقی شرعی عدالت قائم کر کے اٹھایا۔ اس عدالت میں مستند علماء کرام کو بٹھا کر اس دفعہ کو جزوی طور پر بروئے عمل کرنے کا اختیار دیا گیا۔ لیکن اس اہتمام کے ساتھ کہ زندگی کے بیشتر معاملات اس کی دسترس سے باہر رہیں۔ انسانی زندگی کی بنیادی اجتماعیت یعنی خاندانی اور عائلی زندگی سے متعلق قوانین اور موجودہ دور میں اجتماعیت کے سب سے اہم پیچیدہ اور مؤثر جزو یعنی معاشیات و مالیات سے متعلق قوانین کو بھی وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیارات سے باہر رکھا گیا یعنی معاملات زندگی کی ابتدا اور انتہا کو خارج از بحث قرار دے کر بیچ کے کچھ مسائل و معاملات اور قوانین کے بارے میں شرعی عدالت کو کچھ مشق کرنے کی اجازتِ خسروانہ مرحمت فرمائی گئی۔ اس طرز عمل پر میں نے پہلے بھی شدید ترین تنقیدیں کی ہیں اور آج بھی کرتا ہوں۔ کیونکہ قرآن مجید کی رو سے یہ عمل انتہائی ناپسندیدہ اور غضب الٰہی کو دعوت دینے والا ہے کہ آپ دین کو حصوں میں تقسیم کر لیں اور زندگی کو بانٹ لیں کہ ایک حصے میں آپ شریعت کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں اور ایک حصے میں نہیں کرتے۔ یہ درحقیقت:

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ

(اے نبیؐ) جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً اُن سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ سورۃ انعام۔ آیت ۱۵۹) کا مصداق بنانے والا کام ہے۔ زندگی ایک وحدت ہے۔ ایک اکائی ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ اسلام میں آنا ہے تو پورے آؤ ورنہ دفع ہو جاؤ۔ دراصل یہ ضرورت ہماری ہے۔ اللہ کی ضرورت ہوتی تو وہ کہتا کہ اچھا پورا نہیں مانتے تو آدھا مان لو۔ آدھا بھی بھاری ہے تو چوتھائی مان لو۔ دین کے کچھ حصے کو ماننے اور کچھ کا انکار کرنے پر شدید ترین وعید سورہ بقرہ میں اس طرح آئی ہے

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

"تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو! پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب

کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو"
یہ قرآن مجید کی سخت ترین آیات میں سے ایک آیت ہے۔ شریعت کو ماننے والوں
کو شدید ترین عذاب کی وعید سنائی جا رہی ہے۔ قصور ان کا کیا ہے کہ کچھ کو مانتے ہیں اور
کچھ کو نہیں مانتے جبکہ یہ چیز اللہ کے ہاں سخت ناپسندیدہ ہے۔ لیکن اس وقت ہم جس
پہلو سے ملک کی دستوری تاریخ کا جائزہ لے رہے ہیں اس کے حوالے سے وفاقی شرعی
عدالت کا قیام بھی ایک اہم کڑی ہے۔ پہلے دستور کی یہ دفعہ سو فیصدی غیر مؤثر تھی۔ اب
کچھ معاملات میں عدلیہ کو یہ طے کرنے کا اختیار دیا گیا کہ کیا چیز قرآن و سنت کے تابع
ہے اور کیا شریعت سے متصادم ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک مثبت پیشقدمی تھی۔
اب سینیٹ نے آئین میں نویں ترمیم کا جو بل پاس کیا ہے وہ بھی اگرچہ ناکافی ہے لیکن بہرحال
ایک قدم اور آگے بڑھا ہے۔ اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس ترمیم نے عائلی
قوانین کو مستثنیات کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ اب انشاء اللہ توقع یہی ہے کہ
قومی اسمبلی میں بھی یہ ترمیمی بل اسی طرح منظور کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد ان شاء اللہ
شرعی عدالت عائلی قوانین پر از خود غور کرنے کی مجاز ہو گی اور شہریوں کو بھی یہ حق
حاصل ہوگا کہ وہ ان قوانین کو چیلنج کریں۔ اس پر میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور ممبران
سینیٹ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس ترمیم کے ذریعے شرعی عدالت کو مالی قوانین پر بھی
غور کرنے کا اختیار تو دیا گیا ہے لیکن عدالت کا فیصلہ اس وقت تک نافذ نہیں ہوگا
جب تک پارلیمنٹ اس کے لئے مناسب قانون سازی نہ کرے۔ اس طرح سے معاملہ
کو طول دینے کا راستہ نکال لیا گیا ہے لیکن ہم جس تاریخی تدریجی ارتقاء کا جائزہ لے
رہے ہیں اس میں یہ بھی ایک اہم پیش رفت ہے۔ شریعت کی طرف جو قدم بھی آگے بڑھے
ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس کے لئے جن لوگوں نے محنت کی ہے انہیں ہدیۂ تبریک پیش
کرتے ہیں۔ نویں ترمیمی بل کی منظوری کے ساتھ جو اہم مسئلہ درپیش ہے وہ ہے شریعت بل
کی منظوری کا۔ یہ بل صوبہ سرحد سے سینیٹ کے دو ارکان جناب قاضی سمیع الحق اور مولانا
عبدالحق نے پرائیویٹ بل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ۷ رجولائی کو اس بل کی منظوری کے لئے
پارلیمنٹ کے سامنے شدید بارش کے دوران بھرپور عوامی مظاہرہ کیا گیا۔ اللہ تعالےٰ نے
مجھے بھی اس مظاہرے میں شریک ہونے کی سعادت بخشی۔ اگرچہ میں گیا تو صرف مظاہرہ

دیکھنے تھا لیکن منتظمین کے اصرار پر وہاں مختصر خطاب بھی کیا۔ وہاں بھی میں نے وہی بات
کہی جو ہمیشہ کہتا ہوں کہ شریعت کے لیے پیش قدمی اسی طریقہ سے ہوگی۔ جب تک منظم
طریقہ سے رائے عامہ کا دباؤ سامنے نہیں آئے گا اس وقت تک برسر اقتدار طبقہ ماننے والا
نہیں ہے۔ بلکہ محض مظاہروں سے کام نہیں چلے گا۔ ایک مرحلہ آئے گا جب لوگوں کو
خون بھی دینا ہوگا۔ جان کی بازی بھی لگانی ہوگی۔ شریعت اتنی آسانی سے نہیں آجائیگی۔
دین کا کام قربانی کے بغیر نہ کبھی پہلے ہوا ہے نہ اب ہوگا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ نویں ترمیم میں کیا خلا رہ ہے، کیا کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے
یہ شریعت بل پیش کیا گیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایک طبقہ جان بوجھ کر قرآن و سنت کے
نام پر کنفیوژن اور الجھنیں پیدا کرتا ہے۔ اس طرز عمل کا مظاہرہ قانون شہادت اور
عورت کی دیت کے مسئلے پر ساری قوم دیکھ چکی ہے۔ اس بل میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ
قرآن و سنت کا مفہوم طے کرنے والے ذرائع کا تعین کر دیا جائے تاکہ جدیدیت زدہ
دانشوروں اور بیگمات کو اپنے مخصوص انداز میں کنفیوژن پھیلانے کا موقع نہ ملے۔ یہ طبقہ
اس انداز سے بات کرتا ہے جیسے آج ان پر قرآن و سنت کا نزول ہو رہا ہے۔ اور وہ
اس کی تعبیر و تشریح کرنے میں بالکل آزاد ہیں۔ حالانکہ یہ امت آج پیدا نہیں ہوئی ہے
اس کی چودہ سو سال کی تاریخ ہے۔ خلفائے راشدین، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، ائمہ
مجتہدین، محدثین، فقہاء کرام کی زندگی بھر کی محنتوں کا ثمر ہمارے پاس موجود ہے۔ اس سرمائے
سے محروم ہو کر ہم کیسے قرآن و سنت کو سمجھ سکتے ہیں۔ حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا
واضح ارشاد موجود ہے کہ تم پر لازم ہے کہ میری سنت کو پکڑو اور میرے خلفائے راشدین مہدیین
کی سنت کو پکڑو اور کس طرح پکڑو۔ دانتوں سے پکڑو۔ یہ شریعت بل درحقیقت قرارداد مقاصد
حالیہ نویں ترمیم تک جو قدم بہ قدم پیش قدمی ہوئی ہے اس کا اگلا قدم ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ملک
کی ایک نہیں ساری عدالتیں ہی شرعی ہونی چاہئیں۔ کسی حکمران کو، صدر کو، وزیراعظم کو،
وزیراعلیٰ کو کوئی قانونی تحفظ حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ قانون اور عدالت کے سامنے سب
برابر ہونے چاہئیں۔ اور بھی بہت ساری باتیں ہیں تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں
اس پرائیویٹ شریعت بل میں بھی ایک خلا رہ ہے، جس کی طرف پیر پگاڑو صاحب
اور دوسرے کئی اصحاب نے اشارہ کیا ہے اور درست کیا ہے۔ اس بل میں یہ تو کہا گیا ہے

شریعت کا اصل ماخذ قرآن پاک اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ لیکن قرآن و سنت سے احکام کے استنباط اور تشریح و تعبیر کے ضمن میں کسی تعیین کے بغیر فقہاء، مجتہدین، روایت، اجماع امت، قیاس اور اجتہاد سب باتوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا ہے۔ اس بنا پر ہر شخص کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ جناب میں تو فلاں امام کو مانتا ہوں اس کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیے۔ کوئی کہے گا میں حنفی ہوں، کوئی کہے گا میں غیر مقلد ہوں، کوئی کہے گا میرے امام تو امام جعفر صادق ہیں۔ نتیجۃً اختلاف و انتشار کی ایک ایسی فضا پیدا ہوگی کہ کوئی شے بھی نافذ نہیں ہوگی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ واقعتاً ہمارے ہاں فقہی اختلافات کی نوعیت بہت گمبھیر ہے۔ اس مسئلے کا ایک حل تو یہ ہے کہ یہ علماء کرام جو شریعت بل کو لے کر آئے ہیں اسے پیش کرنے سے پہلے تمام علماء کو بٹھا کر مشورہ کر لیتے کہ ان فقہی اختلافات کو طے کرنے کی کیا صورت ہوگی۔ اور پھر اس طے شدہ فارمولے کو اس بل میں پیش کرتے۔ لیکن یہ کام چونکہ مشکل تھا اس لئے انہوں نے اس کا آسان حل یہ نکالا کہ سب چیزوں کو ایک ہی جگہ پر جمع کر دیا ہے۔ اصل میں آج میں اسی الجھن کا عملی حل پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس کے لئے ہمیں کچھ جرأت مندانہ اقدام کرنے ہوں گے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جب ہم اس دفعہ کو نافذ کریں گے تو جہاں مسائل اور اختلافات سامنے آئیں گے وہاں ان کا حل بھی فطری انداز سے سامنے آ جائے گا۔ اس نقص یا کمی کو دلیل بنا کر یہ کہنا کہ یہ بل ہی منظور نہ کیا جائے سب بالکل غلط بات ہے۔ پیر صاحب پگارو اور ان کے ہم خیال تمام حضرات کو اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ کیا فقہی اختلافات کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ ہم نفاذ شریعت کی طرف پیش قدمی ہی نہ کریں یا ان اختلافات کی وجہ سے شریعت کو بالائے طاق رکھ دیں۔ کسی مسلمان کی سوچ کا رخ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا طرز فکر تو یہ ہونا چاہیے کہ شریعت پر تو ہمیں ہر صورت میں چلنا ہے۔ اس میں رد و قبول کا کوئی معاملہ ہے ہی نہیں۔ البتہ نفاذ کی راہ میں جو دقتیں، رکاوٹیں اور مشکلات پیش آئیں ان کا حل تلاش کرنے کے لئے پر خلوص کے ساتھ کوشش کی جائے۔

عملی تجاویز

فقہی اختلافات کا عملی حل پیش کرنے سے پہلے ایک بنیادی بات جو ذرا چونکا دینے والی ہے عرض کر دوں۔ ہمارا آئیڈیل تو یہ ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک امت ہیں اور اسی بنیاد پر انہیں متحد ہونا چاہیے اور اس صدی میں اتحاد امت کا سب سے بڑا نقیب علامہ اقبال ہمارے اسی شہر میں مدفون ہے لیکن عملاً جو صورت حال ہے وہ سب کے

سامنے ہے۔ مسلمانوں کے کتنے آزاد ممالک ہیں ! ان میں کتنا اتحاد ہے ! ان کے نظام آپس میں
کتنے مختلف ہیں ! یہی وجہ ہے کہ اتحاد کا داعی علمبردار اقبال اپنے مشہور زمانہ لیکچرز
RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM
میں یہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ سردست اگر ایک COMMON WEALTH OF MUSLIM
NATIONS وجود میں آ جائے تو بڑی غنیمت ہوگی ۔ اور اسی خیال کو انہوں نے شعر میں بھی پیش
کیا ہے کہ ؎

تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا !
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

جغرافیائی اعتبار سے بھی تہران آزاد مسلم ممالک کے بالکل وسط میں واقع ہے ۔ اس
مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مثالی تصورات (IDEALS) اور عملی حقائق میں کتنا فرق ہو
ہے ۔ اب زیر بحث معاملے میں بھی اسلام کا اعلیٰ اور ارفع مطمح نظر تو یہی ہے کہ اسلام میں
کوئی فرقہ نہیں ۔ قرآن میں فرقہ بندی کی سخت مذمت کی گئی ہے اور انتشار اور تفرق کو عذ
خداوندی بھی کہا گیا ہے لیکن عملاً صورتحال کیا ہے ۔ مسلمانوں میں دو فرقے شیعہ اور سنّی تو ا...
کی سطح پر بالکل حقیقی بن چکے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں ان کے علاوہ دو مزید مصنوعی فرقے بھی
چکے ہیں ۔ پہلے حقیقی فرقوں کے اختلافات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے ۔ اوّل تو ان کی کتاب
سے ہمیں یہ شک ہوتا ہے کہ وہ قرآن کو محفوظ نہیں مانتے ۔ لیکن جب بات ہوتی ہے تو وہ
ہیں کہ نہیں صاحب ہم اسی قرآن کو مکمل مانتے ہیں لیکن سنّت کے ماخذ پر آ کر معاملہ با...
صاف ہو جاتا ہے ۔ ان کے ہاں سنّت کے ماخذ بالکل جدا ہیں ۔ ان کی حدیث کی کتابیں ب...
الگ ہیں ۔ اہل بیت کے سوا وہ کسی کی روایت کو تسلیم ہی نہیں کرتے ۔ یہ ان کا بنیادی اص...
ہے ۔ جب کہ اہل سنّت کے نزدیک "الصحابۃ کلھم عدول" روایت حدیث کا بنیا...
اصول ہے ۔ یعنی روایت حدیث کے معاملے میں تمام صحابہ کرامؓ مقام عدل پر ہیں ۔
یہ تو ہو سکتا ہے کہ صحابی سے جو روایت کر رہا ہو اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو یا ...
کے سلسلے میں کوئی جھوٹا آدمی آ گیا ہو ۔ ان باتوں کی تحقیق تو ہم کریں گے ۔ لیکن جس
کی سند صحابی تک پہنچ جائے اس پر ہم "الصحابۃ کلھم عدول" کے اصول کے مطا...
جرح نہیں کریں گے ۔ ہر صحابی کی بات کو ہم تسلیم کرتے ہیں ۔ سنّت کے ماخذ ۔

خلاف کی وجہ سے شیعہ اور سنی کے درمیان بہت بنیادی فرق واقع ہوگیا ہے اس
لئے اِن دو فرقوں کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ پھر یہ اختلاف یہاں ختم نہیں
ہوتا بلکہ آگے بڑھتا ہے۔ ہم خلافت کے قائل ہیں۔ ہمارے نزدیک خلافت ایک
منتخب ادارہ ہے مسلمان اپنے باہمی مشورے سے خلیفہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ جب کہ
شیعہ امامتِ معصومہ کے قائل ہیں جو اُن کے خیال میں ایک خاندان میں چلتی رہی
ہے۔ اس میں بھی اُن کی دو شاخیں ہوگئی ہیں یعنی اثنا عشری شیعہ اور چھ اماموں کے
بعد تا حال امامت کو جاری ماننے والے اسماعیلی شیعہ۔ اُن کا امام معصوم آج بھی زندہ
موجود ہے جبکہ ہمارے نزدیک معصومیت خاصہ نبوت ہے جسے معصوم مان لیا اسے گویا
نبی مان لیا۔ پھر یہ کہ پہلے تین خلفائے راشدین جو ہمارے لئے انتہائی اہم ہیں۔ ان کا
طرزِ حکومت اور فیصلے سنت اور شریعت کا ایک اہم ماخذ (SOURCE) ہیں انکو
وہ غاصب اور نہ جانے کیا کیا کہتے اور سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک تو خلافت اور
امامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ کو پہنچی ہے درمیان میں کچھ ہے
ہی نہیں۔ میں بہت نرم الفاظ استعمال کر رہا ہوں ورنہ شیعہ کے نزدیک تو درمیان
میں دغا ہے فریب ہے دھوکا ہے، غبن اور حق تلفی ہے۔ یعنی اُن کے نزدیک صحابہ
کرامؓ اور خلفائے ثلاثہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اس درجے کے لوگ ہیں۔ ان
بہت بنیادی اہم اور محکم وجوہات کی بنیاد پر ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہیئے کہ سنی
اور شیعہ کا اختلاف بالکل حقیقی ہے۔ وہ اعتباری نہیں ہے۔ جب بھی تنفیذ کا معاملہ
آئے گا ہمیں اِن حقائق کا سامنا کرنا پڑے گا، انہیں ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں
بڑی جرأت کے ساتھ اِن اختلافات کا مواجہہ (FACE) کرنا چاہیئے۔ ان کا
حل وہ فیصلہ وہی ہے جو ایران میں ہمارے شیعہ بھائیوں نے کیا ہے۔ بظاہر تو وہ ہر جگہ
اتحاد کی بات کرتے ہیں۔ لا شیعیہ لا سنیہ اور لا شرقیہ لا غربیہ اسلامیہ اسلامیہ کے
نعرے لگاتے ہیں۔ لیکن یہ صرف نعرے ہیں۔ جو ریاست انہوں نے قائم کی ہے اُس کے
دستور میں لکھ دیا ہے کہ ایران شیعہ اسلامی ریاست ہے اور اسکی سرکاری فقہ،
فقہ جعفری ہے، اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ غلط نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایران کی عظیم
اکثریت شیعہ ہے۔ انہوں نے سنیوں کے بارے میں یہ طے کر دیا کہ پرسنل لاء

(PERSONAL LAW) میں انہیں اپنی فقہ کے مطابق عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔
عبادات میں عائلی قوانین یعنی نکاح و طلاق، پیدائش موت وراثت اور ان سے متعلق
تمام معاملات میں وہ اپنی فقہ پر عمل کر سکتے ہیں۔ ہم بھی بالکل ایران کی طرح شیعوں
کے بارے ایسا ہی فیصلہ کریں گے تو یہاں بھی شریعت نافذ ہوگی۔ ورنہ نہیں ہو سکتی۔
ہمیں بھی ایران کی طرح دستور میں یہ بات لکھ دینی چاہیئے کہ پاکستان سنی اسلامی
ریاست ہے۔ یہاں شیعوں کو ان کے پرسنل لاء میں مکمل آزادی ہوگی۔ عبادات
میں شادی بیاہ کے معاملات میں وراثت میں انہیں مکمل آزادی دی جائے گی۔ اگر
وہ متعہ کرنا چاہتے ہیں تو کریں۔ لیکن وہ شیعہ کا شیعہ کے ساتھ ہی ہوگا۔ ہم تو
اسے حرام مطلق سمجھتے ہیں۔ البتہ ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ شیعہ اور سنی
کے درمیان شادی یعنی دائمی نکاح کو ہم جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی شادی کے
معاملے میں ایک اضافہ یہ ہے کہ جہاں حکومت نے نکاح کے لئے اتنا بڑا فارم بنا
ہے اس میں ایک خانہ یہ بھی بنا دیا جائے کہ اس شادی یا نکاح کے بعد پیدا ہونے
والے معاملات کس فقہ کے تحت طے کئے جائیں گے۔ مثلاً بیوی شیعہ ہے شوہر سنی
ہے یا بیوی سنی ہے اور شوہر شیعہ ہے تو نکاح کے وقت یہ بات تحریری طور پر طے
ہو جانی چاہیئے کہ ان کے تمام معاملات یعنی طلاق، وراثت اور اولاد کے معاملات
کا فیصلہ کس فقہ کے تحت ہوگا۔ اگر بر شادی کے وقت یہ بات طے کر لی جائے تو
بعد میں پیدا ہونے والی بہت سی الجھنوں سے بچا جا سکتا ہے۔

نفاذ شریعت کے لئے یہ پہلا قدم بالکل ناگزیر ہے۔ اب صرف اسلامی کے لفظ
سے کام نہیں چلے گا۔ پاکستان کو سنی اسلامی ریاست ماننا پڑے گا۔ یہ بات بلا شبہ
ہمارے مثالی تصورات (IDEALS) کے خلاف ہے۔ لیکن عملی حقائق نظر انداز
کرنے سے گاڑی نہیں چلے گی۔ ڈی فیکٹو پوزیشن (DE-FACTO POSITION)
تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور اب معاملہ اس مرحلے پر پہنچ گیا ہے کہ نفاذ کا عمل آگے نہ بڑھا
تو پھر ریورس گیئر (REVERSE GEAR) لگے گا۔ لوگ بغلیں بجائیں گے کہ دیکھا اب
جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔ ہم نہ کہتے تھے کہ شریعت کی طرف پیش قدمی نہ کرو۔
اس جگ ہنسائی اور رسوائی سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ حقائق کو تسلیم کر کے مسائل

کا حل ڈھونڈا جائے۔

اب لیجئے مسئلہ اہل سنت کے درمیان مسالک اور مذاہب کے اختلافات کا۔ آبادی کے اعتبار سے ملک کی عظیم اکثریت فقہ حنفی کے ماننے والوں کی ہے۔ دوسرے نمبر پہ آتے ہیں اہل حدیث حضرات۔ ملک میں بلاشبہ ایسے گاؤں قصبے اور شہر بھی موجود ہیں جہاں کی ساری آبادی یا آبادی کی اکثریت اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھنے والوں پہ مشتمل ہے۔ کراچی میں غالباً بمبئی سے آنے والے کچھ خاندان شافعی مسلک کے ماننے والے بھی ہیں۔ شاید کچھ حنبلی بھی ہوں۔ لیکن ان کا معاملہ توالشاذ کالمعدوم کا سا ہے۔ پہلے اس اختلاف کی نوعیت سمجھ لیجئے۔ کتاب اور سنت پر سب کا اتفاق ہے سُنّت کا ماخذ سب کا ایک ہے۔ معاملہ صرف تعبیر و تشریح کا ہے۔ کوئی ایک حدیث کو زیادہ صحیح سمجھتا تو اُس سے مسئلہ نکالتا ہے دوسرا کسی دوسری حدیث سے استنباط کرتا ہے۔ لیکن حل اس مسئلے کا بھی وہی ہے۔ کہ عبادات میں پرسنل لا۔ میں وراثت میں تو سب کو مکمل آزادی دے دی جائے۔ لیکن ملکی قانون اکثریت کے فقہ کے مطابق بنایا جائے۔ یہ رائے میں پہلی دفعہ بیان نہیں کر رہا۔ ۱۹۸۰ء میں اسلام آباد میں جو پہلا علماء کنونشن ہوا تھا اُس میں مَیں نے اسی موضوع پہ تقریر کی تھی۔ اُس وقت بھی بہت سے بزرگ اور دوست ناراض ہو گئے تھے اور آج بھی ناراض ہونگے۔ در اصل اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی آپ سے ناراض نہ ہو تو خاموش رہیئے یا گول مول بات کیجئے اگر آپ کوئی بات واضح طور پر اور ڈٹ کر کہنا چاہتے ہیں تو پھر ذہناً کچھ لوگوں کی ناراضگی برداشت کرنے کے لئے تیار رہیئے۔ مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ کون ناراض ہو رہا ہے اور کون راضی ہو رہا ہے۔ جس بات کو صحیح سمجھتا ہوں وہی کہتا ہوں۔

موجودہ حالات میں فقہی اختلافات کے اس مسئلے کا اس کے سوا اور کوئی حل نہیں کہ پرسنل لا میں سب کو آزادی دے دی جائے۔ تمام فرقوں کی رجسٹریشن کی جائے۔ مردم شماری کے فارم میں مسلک کا خانہ بھی بڑھایا جائے۔ تاکہ یہ معلوم ہو کہ کس کی تعداد کیا ہے۔ یہ روز روز کے متضاد دعوے اور بیان بازیاں بھی ختم ہو جائیں۔ پھر تمام فرقوں اور مسلکوں کے علماء کے منتخب بورڈ بنا دیئے جائیں جن کا کام یہ ہو کہ اپنے

اپنے فرقے کے معاملات خود طے کریں ۔ یہ تصور کوئی نیا نہیں ہے ۔ انگریزی دورِ حکومت
میں علماء کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ جب تک انگریز مسلط ہے اُس وقت تک بھی
ہمیں شریعت سے بے خبر اور غافل نہیں ہو جانا چاہیئے ۔ اُس وقت یہ تجویز پیش
ہوئی تھی کہ ہر صوبے میں امارت شرعیہ کا نظام قائم کیا جائے اور مرکز میں بھی ایک
امارت شرعیہ ہو ۔ مسلمانوں کی ایک تنظیم ہو دہلی میں اُن کا ایک مرکزی امیر ہو تاکہ
کم از کم عائلی زندگی میں وہ اپنے معاملات خود طے کریں ۔ ایک غیر مسلم حکومت کی
عدالتوں میں اپنے بہت سارے معاملات لے جانے سے بچ جائیں ۔ حکومت کی طرف
سے بھی پابندی نہیں تھی نہ یہ کہ ضرور ہماری عدالتوں میں آؤ ۔ بڑے پیمانے پر ہند
میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی پہلی تجویز تو بعض علماء کے اختلاف کی
وجہ سے ناکام ہو گئی ۔ لیکن صوبہ بہار کے مسلمانوں نے امارتِ شرعیہ بہار کے نام سے
اپنا نظام اُس وقت ہی قائم کر لیا تھا اور وہ اتنا مضبوط نظام ہے کہ آج تک چل رہا
ہے ۔ انگریزی حکومت کی عدالتوں میں بھی امارتِ شرعیہ بہار کے فیصلوں کو تسلیم کیا
جاتا تھا ۔ آج بھی اگر ہم اسلام پر چلنا چاہتے ہیں شریعت کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو
نعرے بازی نہیں ہے تو پھر یہ سب کچھ کرنا پڑے گا ۔

اسی ضمن میں آج مولانا شاہ احمد نورانی نے ایک بڑی عمدہ بات کہی ہے ا
میں اس کی تائید کرتا ہوں ۔ وہ یہ کہ دوسرے مسلمان ممالک کی حکومتیں بھی اگر ہمارا
کچھ مذہبی یا رفاہی کام کرنا چاہتی ہیں مسجد میں بنانا چاہتی ہیں مدارس کھولنا
ہے ۔ تو وہ کسی فرقے کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک نہ کریں ۔ اس طرح سے ملکی معاملا
میں بیرونی مداخلت کا ایک تصور پیدا ہوتا ہے اور فرقوں کے درمیان ایک خواہ مخواہ کی
رقابت جنم لیتی ہے ۔ اگر کوئی حکومت اس مد میں کچھ امداد کرنا چاہتی ہے تو وہ حکومت
پاکستان کو دے اور اگر تمام فرقے رجسٹرڈ ہوں تو حکومت اُن کی تعداد کے مطابق حصہ
رسدی اُن میں تقسیم کر دے ۔ اسی طرح مسجد بنانے سے پہلے یہ طے ہو جانا چاہیئے کہ یہ
کس مسلک کی مسجد ہے تاکہ مسجد بنانے کے بعد دنگا فساد کرنے کی ضرورت پیش نہ آ
مسجدوں کے معاملے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ شیعہ یا اہلحدیث کی مساجد میں دنگا
فساد اور سر پھٹول کی نوبت کبھی نہیں آئی ۔ سارا جھگڑا ہوتا ہے دیوبندی بریلوی مذ

۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کہتے ہیں ۔جب دونوں
مسلک ایک ہے تو مسجد کی جداگانہ حیثیت نہیں ۔اب جس میں زور ہوگا وہ
مسجد پر قبضہ کرلے گا۔ تعمیر کسی نے بھی کی ہو تابع وہ رہے گا جس کے بازو میں قوت
ہے ۔ان تمام مسائل کا حل رجسٹریشن ہے ۔
۱۹۸۰ء میں بھی علماء کنونشن کے دوران میں نے دست بستہ عرض کیا تھا کہ آپ زکوٰۃ
آرڈی ننس واپس لے لیں ۔کیونکہ اگرچہ زکوٰۃ ایک مالی معاملہ ہے لیکن اصلاً یہ عبادت ہے ۔
با تو ابوبکرؓ والا ایمان لائیے اور سب کے ساتھ یکساں معاملہ کیجئے ۔ جو مسلمان ہے اُسے زکوٰۃ
حکومت کو دینی ہوگی ۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ کچھ لوگوں کو آپ رعایت دے دیں کہ وہ اپنے
شیعہ ہونے کا بیان دے کر زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہو جائیں اور اپنی وصول شدہ زکوٰۃ بھی واپس
لے لیں ۔اب وہ ساری خرابیاں بالفعل ظاہر ہو چکی ہیں اگر آپ آزادی چاہتے ہیں تو سب کو
آزادی دیجئے ۔ یہ عجیب تماشہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے تو ہوں صرف سنی مگر لینے والوں میں
کوئی تفریق نہ ہو ۔مزید یہ کہ کئی جگہ تو شیعہ زکوٰۃ کمیٹیوں کے چیئرمین بھی بنے ہوئے ہیں ۔
بے شمار سنیوں کو شیعہ بنانے کا دروازہ آپ نے ویسے کھول دیا ۔ ایک بیان حلفی دے
کر زکوٰۃ کی کٹوتی سے بچ گئے ۔
اب مثال لیجئے طلاق کی ۔ فقہ حنفی میں تین طلاقیں بیک وقت واقع ہو جاتی ہیں ۔ طلاق
مغلظ ہو جاتی ہے ۔ مرد نہ رجوع کر سکتا ہے نہ شرعی حلالہ کے بغیر نکاح کر سکتا ہے جبکہ اہلحدیث کے نزدیک
اور اہل تشیع کے نزدیک ایک وقت میں ایک طلاق واقع ہوتی ہے کتنا بڑا فرق ہے ۔
فقہ حنفی کے مطابق اگر بیک وقت تین طلاقیں دینے کے بعد رجوع کرتا ہے تو زنا کا مرتکب
ہوتا ہے اولاد ناجائز ہوتی ہے جبکہ اہلحدیث اور اہل تشیع کے مطابق درست ہے ۔ یہ
معاملات بہت نازک ہیں ۔ اس کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ سب کو آزادی دے دی جائے
اس جگہ بریلوی دیوبندی اختلاف کے بارے میں ایک بات سمجھنا ضروری ہے ۔
درنہ بالکل مصنوعی ہیں ۔ ان کی فقہ ایک ۔ اِن کی عقائد کی کتابیں ایک ۔ صرف گزشتہ
سو سال میں برصغیر کی حد تک بعض شخصیتوں کے ٹکراؤ کا معاملہ ہے ۔ کوئی کسی کا احترام
ہے ۔کوئی کسی کا احترام کرتا ہے ۔ کسی کو کسی مصنف کے بعض جملوں پر بہت غصہ
ہے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کر دی ہے ۔ کوئی سمجھتا ہے کہ اس کے معنی

یہ نہیں ہیں یہ ہیں۔ فقہ حنفی کے نفاذ سے ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کی کئی صورتیں نکل آئیں گی۔

اب آخری بات یہ کہ سن ۱۹۸۰ء میں میں نے کہا تھا کہ عام ملکی قانون یعنی لا آف دی لینڈ (LAW OF THE LAND) میں کسی فقہ کو تسلیم نہ کیا جائے صرف کتاب و سنت کو معیار بنایا جائے۔ لیکن اِس وقت میں اُس میں اضافہ کر رہا ہوں۔ اگرچہ میرے بہت سے دوست اور بزرگ ناراض ہوں گے لیکن عملی مسائل و مشکلات کو دیکھتے ہوئے یہ اضافہ ناگزیر ہے اور وہ اضافہ یہ ہے کہ اگر یہاں کی غالب اکثریت فقہ حنفی کی پیروکار ہے تو حنفی فقہ کو لا آف دی لینڈ قرار دیا جائے۔

اہلحدیث حضرات کو اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ کیا اس اختلاف کی وجہ سے وہ اتنا آگے جائیں گے کہ الحاد اور لادینیت کی طرف پیش قدمی آسان ہو جائے۔ کیا کوئی اہلحدیث یہ کہہ سکتا ہے کہ حنفیت دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جب حنفی فقہ کا نفاذ ہوگا عملی مشکلات سامنے آئیں گی تو پھر وسعتِ نظر پیدا ہوگی۔ قرآن و سنت کی روشنی میں معاملات و مسائل پر غور کرنے کا راستہ کھلے گا۔ اس کی بہت واضح مثال مفقود الخبر شوہر کے معاملے میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور فتویٰ ہے۔ اگرچہ وہ مسلکاً حنفی تھے لیکن جب انہیں عملی صورتِ حال سے واسطہ پڑا تو انہوں نے فقہ مالکی کے مطابق فتویٰ دیا۔ فقہ حنفی کے مطابق تو جس عورت کا شوہر لاپتہ ہو جائے وہ نوے برس تک انتظار کرے۔ اب سوچیئے تو نوے برس تک انتظار کون کر سکتا ہے اور اس انتظار کے بعد کیا کوئی عورت شادی کے قابل بھی رہ سکتی ہے؟

اہلِ حدیث حضرات کو اپنے دلوں میں وسعت پیدا کرنی چاہیئے۔ اگر آپ کو حنفیت قبول نہیں تو پھر لادینیت آئے گی۔ قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے موقع پر بھی کہنے والوں نے کہا تھا کہ اس قرار داد کی وجہ سے ہمارے سر شرم سے جھک گئے ہیں ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اب ان اڑتیس برسوں میں تو لادینیت نے، الحاد نے، جدیدیت نے بہت ترقی کر لی ہے۔ لادین قوتیں آپ کے اختلاف سے فائدہ اٹھانے کے لیے بالکل تیار بیٹھی ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ شریعت بل پیش کرنے والے علماء کرام نے اور بل کے حق میں مہم چلانے والے متحدہ شریعت محاذ نے ان تمام امور پر واضح اور مضبوط موقف اختیار نہ کیا اور گول مول بات کی تو اُن کی ساری کوششوں کے منفی نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔ جیسا کہ پیر صاحب پگاڑو اور دیگر حضرات کہہ رہے ہیں کہ اتنی فقہیں ہو جائیں گی۔ کھینچ تان ہو گی قوم تقسیم ہو جائے گی۔ جی ہاں پھر یہ سب کچھ بالفعل ہو گا۔ اور دین دشمن قوتوں کی پیش قدمی کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی۔ جو مسائل کل سامنے آنے والے ہیں ان کو سمجھ کر ابھی سے پیش بندی کر لی جائے تو بحیثیتِ مجموعی دین کے لیے جدوجہد کرنے والے دونوں حلقوں کے لیے آسانیاں پیدا ہوں گی۔

آخر میں اس ساری بحث کے نکات کو ترتیب وار ذہن میں بٹھا لیجئے تاکہ آپ دوسروں تک پہنچانے میں آپ کو آسانی رہے۔

۱- دستور میں ترمیم کر کے پاکستان کو سنی اسلامی ریاست قرار دیا جائے۔

۲- فقہ حنفی کو لاء آف دی لینڈ قرار دیا جائے۔

۳- پرسنل لاء یعنی عبادات، عائلی قوانین اور وراثت کے معاملات میں شیعہ اور اہلِ سنت کے تمام مسالک و مذاہب کو مکمل آزادی دی جائے۔

۴- تمام فرقوں کی مردم شماری کر کے انہیں رجسٹر کیا جائے۔

۵- تمام فرقوں کے علماء کے بورڈ بنائے جائیں۔ جن کی تشکیل متعلقہ فرقے کے عوام براہ راست انتخاب کے ذریعے کریں۔

۶- علماء کے ان بورڈوں کو اپنے اپنے فرقے کے پرسنل لاء کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ اور جب حکومت کسی فرقے کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہے تو متعلقہ فرقے کے علماء کے بورڈ کا مشورہ اس میں شامل ہو۔

وآخر دعوانا عن الحمد للہ رب العلمین

تنظیمِ اسلامی کے مرکزی دفتر میں تعلیمی پروگراموں کا اجراء

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ تنظیمِ اسلامی کے مرکزی دفتر واقع ۴۶/A علامہ اقبال روڈ لاہور میں رفقاءِ تنظیم کی سہولت کے لیے شام کے اوقات میں درج ذیل تعلیمی پروگراموں کا آغاز ۲۷ جولائی ۸۶ء سے ہو چکا ہے۔

(i)	تجوید و حفظ کی کلاس	روزانہ عصر تا مغرب
(ii)	عربی کلاس	بعد نمازِ مغرب ایک گھنٹہ
(iii)	ترجمۂ قرآن کی کلاس	عربی کلاس کے بعد ایک گھنٹہ

نوٹ: مؤخر الذکر دونوں کلاسیں ہفتہ میں چار دن (اتوار، سوموار، منگل اور بدھ) ہوتی ہیں۔

لاہور میں مقیم رفقاءِ تنظیم سے خصوصی گذارش ہے کہ وہ اِس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ وقت اِس کام کے لیے نکالیں اور کوشش کرکے تینوں کلاسوں میں اپنی شرکت کو ممکن بنائیں۔

المعلن: میاں محمد نعیم، قیّم تنظیمِ اسلامی پاکستان

فریضۂ حج

حجّاج کرام کی خدمت میں چند گذارشات

محترم امیر تنظیمِ اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۵ جولائی کو سٹیٹ بنک بلڈنگ لاہور میں عازمینِ حج کے ایک خصوصی اجتماع سے خطاب فرمایا۔ قارئین کے استفادہ کے لئے اس خطاب کی تلخیص ادارہ "میثاق" کے رفیقِ کار مولانا شیخ رحیم الدین دکنی نے تیار کی ہے۔ (ادارہ)

محترم حجاجِ بیت اللہ العظیم اور مکرم حاضرین

میں اسے اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں کہ ایسے حضرات سے مخاطب ہوں جو کہ عنقریب سفرِ حج کا آغاز کرنے والے ہیں، اگرچہ یہ سعادت مجھے بھی نصیب ہو چکی ہے لیکن یہ معاملہ ۔ دہ ہے کہ جب بھی موسمِ حج آتا ہے تو ہر صاحبِ ایمان کے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھتی ہے ۔ اش میں پھر وہیں حاضر ہوتا لیکن بعض انتظامی اُمور اور حکومتوں کی طرف کے عائد شدہ پابندیوں کی وجہ سے یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی ۔ ب میں سے بعض حضرات کے علم میں ہو گا کہ میری طبیعت ایک عرصہ سے ناساز چل رہی ہے ۔ س کی وجہ سے آجکل میں اپنے مستقل پروگرام کے علاوہ کسی دوسرے پروگرام کی دعوت ۔ ل نہیں کر رہا ہوں ۔ لیکن جب مجھے اس مُبارک اجتماع میں خطاب کرنے کی دعوت دی ۔ ئی تو انکار نہ کر سکا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے محسوس کیا کہ شاید آپ حضرات کی سعادتوں میں سے مجھے بھی کوئی حصّہ مِل جائے ۔

جہاں تک حج کے احکامات کا تعلق ہے اس مختصر سے وقت میں اُن ۔ بیان ممکن نہیں ہے اور ویسے بھی آپ حضرات کو "پی ، آئی ، اے" کی جانب سے جو ۔ تاب احکاماتِ حج سے متعلق ملی ہے وہ اس قدر جامع ہے کہ پہلی دفعہ حج کرنے والے شخص کو بھی ان شاء اللہ کوئی دِقّت باقی نہیں رہے گی ۔

میں آج کی محفل میں آپ حضرات کی توجہ فلسفۂ حج، حکمتِ حج یا جو حج کی اصل روح ہے اسکی طرف دلاؤں گا۔ حج کی جو روحانی برکات ہیں اسکو صرف وہی حضرات محسوس کر سکتے ہیں جو اس کوچے سے واقف ہیں۔ دوسرے حضرات جنہوں نے اس کوچہ میں قدم نہیں رکھا وہ اس کو محسوس نہیں کر سکتے۔ حج کی عبادت خاص طور پر ایسی ہے کہ اس میں اکثر مناسک ایسے ہیں جن کی بظاہر کوئی حکمت سمجھ میں نہیں آتی، اور وہاں جا کر انسان کو یہ تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ عقل کو ایک طرف رکھ کر صرف "اتباعِ رسولؐ" کرنا ہے۔ بغیر یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کی حکمت کیا ہے؟ اور غرض و غایت کیا ہے؟ — عام طور پر دین کے جتنے احکام ہیں ان کی حکمتیں بھی بتلائی گئی ہیں مثلاً نماز کی حکمت کے متعلق فرمایا گیا:-
اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ یعنی نماز اللہ کی یاد کے لئے ہے، روزہ کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ البقرہ آیت ۱۸۳
یعنی روزے کی حکمت وغرض وغایت "تقویٰ" ہے — لیکن حج کے ضمن میں کئی مناسک ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں ہم قطعاً یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی غرض وغایت کیا ہے؟ سوائے اس کے کہ صرف ایک بات ہمارے سامنے رہے کہ محمد رسول اللہ نے ایسا کیا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ چنانچہ آپ میں سے اکثر حضرات نے حضرت عمرؓ کا یہ مقولہ سنا ہوگا جب کہ وہ حجر اسود کو بوسہ دیا کرتے تو فرمایا کرتے تھے کہ "اے حجرِ اسود میں جانتا ہوں کہ تو صرف ایک پتھر ہے تیرے اندر کوئی الوہیت نہیں ہے۔ لیکن میں تجھے صرف اس وجہ سے بوسہ دے رہا ہوں کہ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے بوسہ دیا تھا" یہ مناسک میں سے ایک رمی جمرات ہے جو کہ بہت مشکل کام ہے۔ اس کے بارے میں بھی کوئی قطعی بات ہمارے پاس نہیں ہے کہ یہ کس بات کی علامت ہے۔ ویسے اس کو شیطان تو کہتے ہیں لیکن یہ کہ شیطان کا کونسا واقعہ اس کے ساتھ ہے۔ بعض روایات تو موجود ہیں مگر وہ روایات مرفوعہ نہیں ہیں۔ یعنی ایسی کوئی بات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہو اور اس سے معلوم ہو سکے کہ اس کی غرض وغایت کیا ہے، ذخیرۂ احادیث میں ہمیں نہیں ملتی۔ یہاں پر بھی صرف اتباعِ نبویؐ ہی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔
جن حضرات کو روحانی کیفیات و واردات میں سے کچھ حصہ ملا ہے وہاں ان کا

یا کیا حاصل ہوتا ہے تو وہی بتلا سکتے ہیں ۔ لیکن اس سے ذرا کمتر سطح پر آ کر میں عرض کروں گا کہ حج کا یہ پورا نظام اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ایک شخصیت کی یاد پر مشتمل ہے اور وہ شخصیت ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جن کی کہ تین نسبتیں ہیں اور وہ تینوں ہی بہت عظیم ہیں ۔ ایک تو یہ کہ ان کی نسبت اللہ کی طرف ہے : وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۔ " اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست قرار دیا " یعنی خلیل بنا لیا ۔ دوسری طرف ان کی نسبت نوعِ انسانی کے ساتھ ہے اور وہ یہ کہ : اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۔ یعنی اے ابراہیم میں تمہیں نوعِ انسانی کا امام بنانے والا ہوں ۔ اور ان کی تیسری نسبت آپ میں سے اکثر حضرات کو معلوم ہوگی یعنی یہ کہ اُن کی نسل میں بے شمار نبی آتے یہاں تک کہ نبی آخر الزّمان بھی آپ ہی کی ذریّت میں سے ہیں ۔ اس طرح آپ ابو الانبیاء ہیں ، خلیل اللہ ہیں ، اور امام الناس ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ معمارِ حرم بھی ہیں ۔ اس حرم کے جس کی زیارت کی نیت سے آپ حضرات جا رہے ہیں جس کے متعلق قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے : ۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ۔	اور یاد کرو جب کہ ہم نے ابراہیم کے لئے وہ جگہ معین کر دی جو خانہ گھر کی جگہ تھی کہ ہمارے اس گھر کی تعمیر بھی کرنا اور اس کو پاک صاف بھی رکھو طواف کرنے والوں کے لئے ، قیام کرنے والوں کے لئے ، رکوع سجود کرنے والوں کے لئے " اور لوگوں کو بلاؤ حج کے لئے تم دیکھو گے کہ وہ چلے آئیں گے اس گھر کی طرف پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر سوار ہو کر

بھی بڑے دور دراز راستوں سے اور بڑی گہری وادیاں عبور کر کے تاکہ وہ پہنچیں ان جگہوں پر جہاں ان کے لئے نفع ہے اور اپنے نفع کے مقامات پر موجود ہوں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں کہ اللہ تعالےٰ نے ان کے لئے کیا کیا نفع کی

چیزیں رکھی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معمار قرار دیا گیا ہے بیت اللہ کا۔ اگرچہ اس میں ایک اختلاف ہے کہ معمار اوّل کون ہیں۔ میرے نزدیک یہ رائے زیادہ قوی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ معمار ثانی ہیں۔ معمار اوّل حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ	یعنی رُوئے ارضی پر اللہ کی عبادت
لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ	کے لئے جو سب سے پہلا گھر بنایا گیا وہ مکہ میں ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان کم از کم چار پانچ سال کا فصل ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اس دوران میں نوع انسانی نے کوئی گھر نہ کی عبادت کے لئے تعمیر نہ کیا ہو۔ اسی لئے میری قوی رائے یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے معمار اوّل حضرت آدمؑ ہیں۔ امتداد زمانہ اور سیلاب و طوفان کی وجہ سے یہ منہدم ہو گیا تھا پھر اس کی دوبارہ تعمیر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں کروائی اسی لئے قرآن میں ارشاد ہے۔

وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ	جبکہ ابراہیم اور اسماعیل دونوں باپ
الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ	بیٹے اس گھر کی دیواروں کو اٹھا رہے
وَاِسۡمٰعِیۡلُ ؕ	تھے۔

یعنی جہاں تک اس کی بنیادوں کا تعلق ہے وہ موجود تھیں اور انہی بنیادوں پر از سر نو تعمیر کا فریضہ انجام دیا ہے ان باپ بیٹا دونوں نے۔

حج کے اکثر مناسک کا تعلق ہے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اور ان کے واقعات سے اگر آپ ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی پوری کی پوری زندگی آز اور امتحانوں کا مجموعہ ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۱۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے: وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ اور یاد کرو جب ابراہیم کا امتحان اس کے رب نے بہت سی باتوں میں اور اس نے ان سب کو پورا کر دکھایا۔ اور تمام امتحانات میں ثابت قدم رہے۔ ان کی سب سے پہلی آزمائش ان کی فکر اور عقل سلیم کی آزمائش ہے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولتے ہیں کہ جس کے چاروں طرف کفر و شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے ہیں۔ بتوں کو پوجا جا رہا ہے۔ اجرام سماویہ سورج

اندر اور ستاروں کو پوجا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بادشاہِ وقت نمرود خود معبود بننے کا مدعی ہے۔ گویا اس معاشرہ میں تین طرح کے شرک موجود تھے۔ جس میں اس جوان نے آنکھ کھولی ہے۔ لیکن یہ ان کی سلامتی طبع اور فطرتِ سلیمہ کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں انہوں نے توحید کی روشنی کو دیکھا اور اسکی طرف اپنا رُخ کر لیا اور ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر یہ نعرۂ توحید ان کی زبان پر آتا ہے: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ کہ میں ان تمام سے اپنا تعلق منقطع کرتا ہوں۔ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ انہوں نے کہا کہ میں اس چیز سے بری اور بیزار ہوں جو تم سب کرتے ہو۔ میں تو صرف خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی پرستش کروں گا۔ ان کے اس نعرہ مستانہ کے ساتھ ہی ان پر امتحانات آنے شروع ہو گئے۔ والد نے انتہائی ترش لہجے میں کہا: قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰٓاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّکَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ۝ "اے ابراہیمؑ! کیا تم میرے معبودوں سے روگردانی کر رہے ہو۔ ہماری قومی و نسلی روایات ان سب کو اپنے پاؤں تلے روند دینا چاہتے ہو۔ اگر تم باز نہیں آؤ گے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا" یہ تو خیر بعد کی بات ہے "سر دست تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جاؤ۔ اور فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ"۔ اپنے والد کی یہ تلخ اور کڑوی بات سننے کے بعد بڑے حلم اور وقار کے ساتھ یہ کہتے ہوئے: قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْکَ سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ اِنَّهٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا ۝ ٹھیک ہے کہ میں آپ کے گھر سے رخصت ہو رہا ہوں۔ وَاَعْتَزِلُکُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ عَسٰٓی اَلَّآ اَکُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا ۝ میں تم سب سے ترک تعلق کرتا ہوں ورنہ رب اللہ کو پکاروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرا اللہ مجھے ناکام و نامراد نہیں کرے گا۔ یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے دوسرا امتحان یہ ہوا کہ قوم نے آگ میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

جب اس موحد کو قوم نے آگ میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم فرمایا:

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۔ اللہ کے حکم سے یہ آگ گل و گلزار بن گئی اور آپ اس امتحان میں بھی سرخرو ہو گئے۔ پھر آپ نے اپنے وطن کو خیر باد کہی: اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ میں تو اب اللہ کی راہ میں ہجرت کر رہا ہوں۔ اس کے بعد وہ کبھی شام میں رہے کبھی مصر میں رہے کبھی حجاز میں گئے گویا پوری زندگی صحرا نوردی میں گزری کسی بھی جگہ ٹک کر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ آپ نے ہر جگہ توحید کے مراکز قائم کئے حضرت لوطؑ کو شرق اردن میں مامور کیا۔

حضرت ابراہیمؑ کی عمر شریف جب ستاسی برس کی ہوئی تو محسوس ہوا کہ اب میرے قویٰ مضمحل ہو رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میرے بعد ان توحید کے مراکز کا اور میری دعوت کا وارث کون ہوگا۔ تب آپ نے یہ دعا کی رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ "اے میرے رب مجھے ساتھی عطا فرما جو صالحین یعنی نیکو کاروں میں سے ہو۔" اللہ تعالیٰ نے فوراً دعا قبول فرمائی اور حضرت اسماعیلؑ جیسا فرزند عطا فرمایا۔

جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ابراہیمؑ کی زندگی امتحانات کا مجموعہ ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے اولاد کے لئے دعائیں مانگیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ستاسی برس کی عمر میں ایک فرزند عطا فرمایا ابھی وہ فرزند شیر خوار ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ اس شیر خوار بچے اور اس کی ماں کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ۔ ذرا تصور کیجئے کہ جہاں آج سے چار پانچ ہزار سال قبل آبادی نام کی کوئی چیز بھی وہاں نہ تھی اور نہ درخت وغیرہ تھے۔ یہ موحد اعظم اللہ کے حکم کی فرمانبرداری میں ان دونوں کو وہاں چھوڑ کر فوراً واپس چل پڑتے ہیں۔ ایسے موقع پر حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا پکارتی ہیں آپ ہمیں اس جنگل بیابان میں کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں فرمایا۔ "اللہ کے حکم سے" آگے کے واقعات آپ حضرات کو معلوم ہیں کہ جب کھانے پینے کی کوئی چیز ان کے پاس باقی نہ رہی اور حضرت اسماعیلؑ پیاس سے بیتاب ہونے اس وقت حضرت ہاجرہ نے جو دوڑ لگائی ہے ان دو پہاڑیوں (یعنی صفا و مروہ) کے درمیان اب نہ صرف ان کی علامتیں رہ گئی ہیں۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان آپ کو عمدہ ماربل کا فرش ملے گا جس پر کہ آپ چلیں گے، پانی کی تلاش میں کہ کبھی اس پہاڑی

چڑھ جاتی ہیں تو کبھی اُس پہاڑی پر کہ کوئی انسان نظر آئے تو اس کو مدد کے لئے
ریں اس طرح وہ سات چکر لگاتی ہیں۔ حضرت ہاجرہ ابھی تلاش ہی میں اِدھر اُدھر
وڑ رہی تھیں کہ وہ دیکھتی ہیں کہ جہاں حضرت اسماعیلؑ ایڑیاں رگڑ رہے تھے وہاں
ں مالک چشمہ جاری ہوگیا ہے۔ یہ وہی زم زم ہے کہ جس کو پینے کی سعادت آپ وہاں
ر حاصل کریں گے۔ یہ سعی صفا اور مروہ کے درمیان حضرت ابراہیمؑ کے اس امتحان کی
دگار ہے۔ یہ چیزیں میں اس لئے بتا رہا ہوں کہ ہماری زندگی میں بھی قدم قدم پر امتحانات
ہیں۔ ہماری زندگی تیاری ہے۔ اس کے متعلق سورۃ ملک میں فرمایا گیا: اَلَّذِیْ خَلَقَ
موْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط ہمیں بھی زندگی کے ہر موڑ
پر دوراہا ملتا ہے کہ یہ حلال ہے یہ حرام ہے یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے اب ہمارے
معاشرہ کا یہ حال ہوگیا ہے کہ اس امتحان میں اچھے اچھے لوگ ناکام ہو جاتے ہیں۔ اگر
ہم حج پر جا کر حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے ان واقعات کی صرف یاد منالیں تو اس سے
دل حقیقی فائدہ نہیں ہوگا۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ ہمیں ان کی زندگی سے رہنمائی
حاصل کرنی ہے۔

حضرت اسماعیلؑ قریباً تیرہ برس کے ہوگئے ہیں بوڑھا باپ اپنے جوان ہوتے
ہوئے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جی رہا ہے کہ اس وقت دل کو چھید جانے والے امتحان کا حکم ہوتا
ہے کہ اپنے اس لخت جگر کو اللہ کی راہ میں قربان کر دو۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں اس
واقعہ کی تصویر کشی اس انداز سے کی گئی ہے۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَہُ السَّعْیَ اور جب وہ
ابراہیم کے ساتھ) بھاگ دوڑ کے قابل ہوتے تب ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ میں
اسماعیلؑ کو ذبح کر رہا ہوں۔ ایک دن خواب دیکھا پریشان ہو گئے پھر دوسرے دن
تیسرے دن یہی خواب دیکھا اس لئے قرآن مجید میں آیا ہے: یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی
الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ط میں خواب میں متواتر یہ دیکھ
رہا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ تم اب ذرا سوچو اور غور و فکر کر کے بتلاؤ کہ تمہاری
رائے کیا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کے جواب کو اللہ تعالیٰ نے ابدالآباد تک کے لئے محفوظ
کر دیا۔ انہوں نے فرمایا: قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ
اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ہ ابا جان کر گزرئیے جس کا آپ کو حکم ہو رہا ہے۔ ان شاء

اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے ۔ آگے ارشاد ہوتا ہے فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ہ جب باپ بیٹے دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور باپ نے اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ یہاں یہ بات بڑی قابلِ غور ہے کہ ذبح کرتے وقت تو چہرے کو سامنے کیا جاتا ہے تاکہ گردن کا نرم حصہ سامنے رہے لیکن حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو جو الٹا لٹایا اس میں حکمت یہ تھی کہ بیٹے کی نگاہ سامنے نہ رہے اور ایسا نہ ہو کہ شفقتِ پدری کہیں جوش میں آجائے اور ہاتھ میں قوت نہ رہے اور اطاعتِ خداوندی میں لغزش آجائے ۔ ابھی وہ اپنے نورِ نظر کی گردن پر چھری پھیرنے والے ہی تھے کہ : وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ہ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ج پھر ہم نے پکارا اور کہا کہ اے ابراہیمؑ! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا اس سے آگے نہیں ۔ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ہ یہ وہ ذبحِ عظیم ہے جس کی یاد ہم ہر سال مناتے ہیں اور اب تو یہ صرف ایک رسم بن کر رہ گئی ہے : اگر ہم اپنے جذبات کو اللہ کے حکم کے آگے قربان نہ کر سکے ، اپنے معاملات کو اللہ کے احکامات کے تابع نہ کر سکے اس طرح ہم اپنی دنیاوی خواہشات کو آخرت کے مقابلہ میں قربان نہ کر سکے تو پھر اس کے کوئی معنی نہیں ہے ۔ بقول اقبالؒ

رہ گئی رسمِ اذاں رُوحِ بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالیؒ نہ رہی

جیسے کہ ہم نے نماز کو ایک رسم بنا لیا ہے ، اسی طرح روزہ کو بھی رسم بنا لیا ہے کیونکہ اس کی تو اصل غرض و غایت ہے وہ تو ہماری آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے ۔ ایک حدیث میں حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص روزہ رکھ کر بھی جھوٹ بولنا نہیں چھوڑتا اور اسی طرح اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑتا تو اللہ کو کوئی احتیاج نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے ایسے شخص نے روزہ نہیں رکھا بلکہ اس نے فاقہ کیا ہے ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جبکہ ایک اندازہ کے مطابق لاکھ صحابہ کرامؓ کا اجتماع تھا ۔ ان سے مخاطب ہو کر فرمایا اے مسلمانو! اب دین کی ذمہ داری تمہارے کندھوں پر آگئی ہے ۔ میں نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے ۔ اب تمہیں یہ پیغام سارے عالم میں پہنچانا ہے ۔ میں نے اللہ کے دین کو جزیرہ نمائے عرب میں غالب کر دیا ہے اب تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس کو پورے کرۂ ارضی پر غالب کر دو ۔ تو آپ

...دم ہے کہ اس سوا لاکھ کی تعداد نے چوبیس برس کی قلیل مدت میں بحر الکاہل کے
...س سے لے کر افریقہ کے مغربی ساحل تک اور افریقہ کے مغربی ساحل سے لے کر
...ن لے علاقے تک اور افغانستان سے روسی ترکستان تک کے علاقے فتح کئے۔ اور یہاں پر اللہ کے دین
...نذ کر دیا۔ ان حضرات نے قربانیاں دیں۔ محنتیں کیں، اللہ کے دین کے لئے اپنی جان،
...اور اولاد کو لگا دیا۔ جس کے نتیجہ میں اللہ کا دین غالب ہوا۔ لیکن آج ہمارے حج
...موقع پر تیس تیس لاکھ کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا دنیا میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔
...لوگ جیسے جاتے ہیں ویسے ہی واپس آتے ہیں، حج کا
...ری سیرت و کردار پہ کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو ہم نے صرف
...سم بنا لیا ہے۔ اس کی اصل غرض و غایت نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ آپ حضرات
...ب کثیر رقم خرچ کریں گے اور اس کے ساتھ ساتھ سفر کی مشقتیں جھیلیں گے اپنے گھر میں
...ا ساتشوں کو چھوڑیں گے۔ سفر کے متعلق حضور نے فرمایا: السفر قطعة من
عذاب لیکن سفرِ حج کے موقع پر یہ تکالیف اور بھی زائد ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ
ہے کہ لوگوں کا اژدحام ہوتا ہے ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے اس لئے بعض دفعہ
...ھگڑے بھی ہو جاتے ہیں، بدگمانیاں بھی ہوتی ہیں، بدقسمتی سے آج سے پہلے ہمارے یہاں
...ئی نظم نہیں تھا اب تو پھر بھی گروپ کی شکل میں جاتے ہیں۔ کسی کو لیڈر بناتے ہیں۔
...ب یہ شکل نہ تھی تو جھگڑے ہی جھگڑے تھے۔ اکثر و بیشتر یہ ہوتا تھا کہ دو انتہائی قریبی دوست
...بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حج کے لئے جاتے تھے مگر واپسی پر ان کے دل پھٹے ہوئے ہوتے
تھے اور وہ ایک دوسرے سے بدظن ہو جاتے تھے۔ یہ ہمارا اپنا مشاہدہ رہا ہے اس کی
...س وجہ یہ ہے کہ جو مقصد تھا وہ سامنے نہ رہا۔ اور جب مقصد سامنے نہ ہو گا تو پھر کئی مواقع
...یسے آئیں گے کہ جھگڑے خود بخود کھڑے ہو جائیں گے۔ مثلاً بس میں سفر ہے جو شخص
کھڑکی کے ساتھ بیٹھے گا اس کو زیادہ آرام ملے گا اس کی نسبت سے جو درمیان میں بیٹھے
...ب اس بات پہ دل میں میل آجائے گا۔ کہ کون کھڑکی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ بعینہ یہی
...ت سامنے آتی ہے جو کہ حالی نے کہی تھی ؎

...ہیں پانی پینے پلانے میں جھگڑا   کہیں گھوڑا آگے بڑھانے میں جھگڑا

...یاں بہت نمایاں ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج جو پہلی آیت پڑھی ہے

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۔ ان باتوں سے حج میں اجتناب کرنا ہے ۔ پہلے سے آپ حضرات اس بات کا عزم مصمم کریں کہ کسی قسم کا آپس میں جھگڑا نہیں کریں گے ۔ اپنا حق دوسروں کو دیں گے اور اپنے حق کے لئے کبھی دوسرے سے نہیں لڑیں گے ، اب تو آپ حضرات ماشاء اللہ ایک امیر کی امارت میں سفر کریں گے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دو شخص بھی سفر میں نکلیں تو ان میں سے ایک کو امیر بنالیں ۔ امیر کا مطلب ہوتا ہے ۔ "صاحب امر" امیر کو مشورہ تو دیا جا سکتا ہے لیکن اس پر کوئی مشورہ ٹھونسا نہیں جا سکتا ، آپ اپنا مشورہ اپنی رائے دے دیں اس کے بعد آپ فارغ ہیں ۔ اب امیر کا کام ہے کہ جو چاہے فیصلہ کرے ۔ اس کے فیصلے پر اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کیجئے بلکہ یہ تو کہ اس کو تو میں نے اپنا امیر مانا ہے اس کا ہر فیصلہ خوش دلی سے قبول کرنا ہے ۔ اگر امیر کوئی کوتاہی کریگا نا انصافی کرے گا تو اللہ کے یہاں وہ جواب دہ ہوگا ۔ اگر ہم خواہ مخواہ اس کے ساتھ جھگڑیں گے تو جو ہم نے معاہدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی کریں گے ۔ اس سفر میں بھی روحانی واخلاقی ترقی ہو اُس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں —

اب میں آپ حضرات کو ایک اہم بات کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس کی آپ شدت سے پابندی کریں ۔ الحج کے احکامات کے متعلق فرمایا : فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ایک تو یہ کہ حج میں مرد اور عورتیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں ۔ طواف اور رمی جمرات میں مرد اور عورتوں کی علیحدگی کا معاملہ نہیں ہو سکتا ۔ یہاں بے پناہ ہجوم ہوتا ہے اور یہی وہ ہوتے ہیں جب کہ شیطان کو انسان کے اندر شہوت کا جذبہ اُبھارنے کا موقع ملتا ہے سے امکانی حد تک اپنے آپ کو بچانا ہے اپنی نگاہوں کو نیچے رکھنا ہے ۔ ظاہر بات ہے عورتیں احرام میں ہونگی جس کی وجہ سے ان کے چہرے کھلے ہوں گے ۔ اس لئے امتحان ہو جاتا ہے اس لئے فرمایا ۔ فلا رفث کوئی شہوت کی بات نہ کریں کہ جس سے جذبہ پیدا ہو ۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام پر کھڑے ہوئے تھے اور آپ کے ساتھ ایک نوجوان صحابی بھی تھے ۔ کچھ خواتین کا ادھر سے گذر ہوا جو کہ احرام میں تھیں ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے ۔ ان صحابی کی نگاہ ایک خاتون کے چہرہ پر جم گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ان کے چہرے کو

دیا - اور فرمایا: پہلی مرتبہ اتفاقاً نگاہ پڑ جائے تو مواخذہ نہیں - مگر نامحرم کو بلا ارادہ
دیکھنا جائز نہیں - آپ حضرات اس بات کی طرف خاص خیال رکھیں - کہ کسی نامحرم کی طرف
نہ دیکھیں - دوسرے آپ اس بات کا بھی عزم کر لیں کہ وہاں کسی سے بھی نہیں جھگڑیں گے۔
بنی مرضی یا مزاج کے خلاف، اگر کوئی بات دیکھیں تو اس سے درگزر کریں اور اپنے آپ پر
قابو رکھیں - تیسرے یہ کہ آپ جہاں جا رہے ہیں - وہاں کافی مارکیٹیں ہیں اور چونکہ وہاں
کسٹم وغیرہ نہیں ہے جس کی وجہ سے چیزیں سستی مل جاتی ہیں - دیکھا گیا ہے کہ اکثر حضرات
مارکیٹوں میں چیزوں کی بھاؤ وغیرہ معلوم کرتے رہتے ہیں اور پھر آپس میں بھی بیٹھ کر اسی
پر تبادلہ خیال کرتے ہیں - جس کی وجہ سے وقت کا ایک بہت بڑا حصہ اس کام میں ضائع
ہو جاتا ہے - حالانکہ وہاں کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اور بعض عبادتیں تو ایسی ہیں جو کہ صرف
صرف اسی جگہ کے ساتھ خاص ہیں اور وہ دُنیا کے کسی اور گوشے میں ادا نہیں ہو سکتیں
طواف ہے یہ صرف اس گھر کے ساتھ مخصوص ہے - اور وہاں کی سب سے افضل عبادت
یہی ہے - اسی لئے آپ کو چاہیئے کہ جتنے طواف بھی کر سکیں کریں - اگر تھک جائیں
بیٹھ کر خانہ کعبہ کو محبت تعظیم اور احترام سے دیکھنا بھی عبادت ہے -

یہاں میں آپ کو اپنا ایک تاثر بھی بیان کروں گا کہ جب میں پہلی مرتبہ ۶۳ء میں
ہر گیا تھا تو جب میں نے مسجد حرام کا باہر کا نقشہ دیکھا کہ ساری کی ساری دیواریں سنگ مرمر
کی بنی ہوئی ہیں تو مجھ پر اچھا اثر نہیں پڑا - میں آپ کو سچ سچ بتاؤں کہ الٹا رد عمل ہوا۔
میں نے کہا کسی والڈ مرڈیٹ کا بت بڑا بنک بھی اس عمارت سے اچھا بنا ہوا نہیں ہو گا -
لیکن اندر جا کر جب اس گھر پر نظر پڑی جس کی سادگی آج بھی وہی ہے جو کہ آج سے چودہ سو
برس پہلے تھی - وہی ایک سیاہ کپڑا اس کو ڈھانپے ہوئے ہے - اس میں کہیں کوئی سنگ مرمر
نہیں - اس گھر پر نظر پڑتے ہی انسان کی کیفیت بدل جاتی ہے - خانہ کعبہ کو دیکھنے کے وقت
ایک خاص دُعا ہے آپ حضرات اس کو یاد کریں - آپ کی زبان پر اس وقت اس دُعا کا
آنا ہی درحقیقت یہ سب سے پہلی برکت ہو گی جو آپ کو حاصل ہو گی -

میں یہ سمجھتا ہوں کہ سعودی عرب کی حکومت اس حکم کی بڑی احسن طریقے سے تعمیل کر رہی
ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو دیا تھا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ -
گھر کو پاک و صاف رکھو پاک و صاف رکھنے میں ایک اس کی باطنی پاکی ہے - کہ

نجاست آلودہ نہ ہونے دیا جائے اور ایک اس کی ظاہری پاکی اور صفائی ہے کہ وہاں گندگی نہ ہو اور صفائی ستھرائی کا پورا پورا اہتمام ہو۔ تاکہ کوئی شخص جائے تو اس کی طبیعت میں انقباض نہ ہو۔

اس بیت اللہ کے اندر جو رُوحانی عظمت ہے اس کا اصل ادراک تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جنکی باطنی آنکھیں کھلی ہوں لیکن کچھ نہ کچھ ہمیں اپنی آنکھوں سے بھی نظر آتا ہے کہ اس میں کوئی شئے ہے جو کہ ہمیں کھینچتی ہے۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ ہم اس کو الفاظ میں بیان کر سکیں کہ وہ کیا چیز ہے۔

مناسک حج میں سے جہاں تک طواف بیت اللہ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ وہ تو مکہ مکرمہ ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ البتہ قربانی کو عید الاضحیٰ کی صورت میں رُوئے زمین ان تمام لوگوں کے لئے عام کر دیا گیا جو اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی راہ اختیار کر کے ابراہیم ہی کی معنوی ذرّیت میں شامل ہو گئے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان کا کوئی صلبی نسلی تعلق ان سے ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایک روایت کی رو سے جسے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے امام احمد ابن حنبل اور امام ابن ماجہ رحمہما اللہ نے اپنی اپنی مسند میں نقل کیا ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ "یا رسول اللہ! ان قربانیوں کی حیثیت کیا ہے؟" تو جواباً آپ نے ارشاد فرمایا "یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سُنّت ہے!" — گویا بھیڑوں، بکریوں، گایوں اور اونٹوں کی قربانی اصلاً علامت کی حیثیت رکھتی ہے اطاعت و فرمانبرداری اور تسلیم و انقیاد اور اس پر مداومت و استقامت کی اس رُوح کے لئے جو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری شخصیت میں رچی بسی ہوئی تھی اور ان کی پوری زندگی میں جاری و ساری رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں متذکرہ بالا آیات کے متصلاً بعد یہ متنبہ فرما دیا گیا تھا کہ:۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا	اللہ تک نہیں پہنچتا ان قربانیوں کا گوشت
دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ	یا خون ہاں اس تک رسائی ہے
التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج: ۳۷)	تمہارے تقویٰ کی۔

یہ دوسری بات ہے کہ جس طرح ہم نے دین کے دوسرے تمام حقائق کو محض رسموں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے جس کا مرثیہ کہا ہے علامہ اقبال ؒ نے اس شعر میں کہ ؎

رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالی نہ رہی　　　فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

طرح قربانی کی روح بھی آج نام نہاد مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت کے عمل ہی سے نہیں
خیال سے بھی غائب ہو چکی ہے اور اب اس کی حیثیت بعض کے نزدیک محض ایک رسم
ہے اور اکثر کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر صرف ایک قومی تہوار کی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ
ن پندرہ لاکھ سے بھی زائد کلمہ گو حج کرتے ہیں اور بلا مبالغہ کروڑوں کی تعداد میں جانوروں
قربانی دی جاتی ہے لیکن وہ روحِ تقویٰ کہیں نظر نہیں آتی جس کی رسائی اللہ تک ہے!
ل علامہ اقبال مرحوم

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے　　　وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج　　　یہ سب باقی ہے، تو باقی نہیں ہے

کاش کہ ہم جرأت کے ساتھ موجودہ صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کر سکیں اور اصل روح
ن کو اپنی شخصیتوں میں جذب کرنے پر کمر ہمت کس لیں، اور عیدِ قربان پر جب اللہ کے لئے
ے بکرا یا دنبہ ذبح کریں تو ساتھ ہی عزم مصمم کر لیں کہ اپنا تن، من، دھن اللہ کی رضا پر
ن کر دیں گے — گویا بقول شاعر

"میرا سب کچھ میرے خدا کا ہے۔"

اور بمصداق الفاظ قرآنی:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝
لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ افراد کا اتنا نتیجہ خیز اجتماع ہوا کہ چوبیس برس کے اندر
دنیا میں انقلاب آ گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات بھی حج سے واپسی پر اپنی
ذمہ داریوں کا شعور حاصل کر کے آئیں۔ صحابہ کرامؓ کو یہ احساس شدت سے تھا کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذمہ داری اپنے شانوں سے اتار کر اب ہمارے کندھوں پر رکھ
دی ہے۔ میں آپ حضرات کو وہ پورا نقشہ بتانا چاہتا ہوں تاکہ آپ کے اندر بھی کوئی
احساس پیدا ہو۔ حجۃ الوداع میں جب حضورؐ نے اپنا خطبہ ختم کر لیا تو آخر میں ایک سوال
کیا۔ ھل بلغت لوگو کیا میں نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے کہ نہیں؟ پورے مجمع نے
یک زبان ہو کر جواب دیا ہاں حضورؐ ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا، حق

نصیحت ادا کر دیا، حقِ امانت ادا کر دیا۔ تین مرتبہ حضورؐ نے یہی سوال کیا اور تینوں مرتبہ مجمع نے یہی جواب دیا۔ پھر روایات میں آتا ہے حضورؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور بارگاہ خداوندی میں تین مرتبہ عرض کی اللّٰھم اشھد، اللّٰھم اشھد، اللّٰھم اشھد اے اللہ تو بھی گواہ رہ کہ آج وہ بارِ گراں میرے کندھوں سے اتر کر ان کے کندھوں پر آگیا ہے۔ یہ مان رہے ہیں کہ میں نے پہنچا دیا۔ یہ مان رہے ہیں کہ میں نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا ہے آخری جملہ جو آپؐ نے فرمایا وہ وہ ہے جو کہ ہر صحابی نے اپنے پلے باندھ لیا وہ یہ تھا فلیبلغ الشاھد الغائب اب لازم ہے ہر اس شخص پر جو کہ یہاں موجود ہے کہ پہنچائے یہ پیغام ان سب کو جو کہ یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے کہ میں صرف تمہاری طرف رسول بن کر نہیں آیا بلکہ میں تو پورے کرۂ ارضی کے لئے رسول بن کر آیا ہوں۔

——————— اے محمدؐ! ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لئے بشیر و نذیر بنا کر۔ لیکن میں نے تو ابھی تم تک پہنچایا ہے — ظاہر بات ہے کہ ابھی ہندوستان تک حضورؐ کا پیغام نہیں آیا تھا۔ اسی طرح روس اور سائبیریا کے لوگوں تک پیغام نہیں پہنچا تھا۔ یورپ اور افریقہ کے لوگوں پر بھی ابھی تک اتمامِ حجت نہیں ہوا تھا۔ حضورؐ نے تو ابھی صرف چند بادشاہوں کے نام خطوط ارسال فرمائے تھے)۔ اب تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس پیغام کو نوعِ انسانی کے ہر ہر فرد تک پہنچاؤ۔ خدا کرے کہ آپ میں سے ہر شخص کو احساسِ ذمہ داری عطا فرمائے۔

آپ حضرات سفرِ حج پر روانہ ہونے والے ہیں۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حجِ مبرور کی توفیق عطا فرمائیں حجِ مبرور وہ حج ہے کہ جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! تین اعمال ایسے ہیں کہ جن سے سابقہ زندگی کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں پہلا عمل کفر سے اسلام میں داخل ہونا ہے۔ یعنی پہلے کافر تھا اب مسلمان ہو گیا اس سے سابقہ زندگی کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ دوسرا عمل اللہ کے لئے ہجرت ہے۔ یعنی اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے گھر بار، وطن اور اہل و عیال کو چھوڑ دینا۔ صحابہ کرامؓ نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اپنے گھر بار، اہل و عیال کو مکہ کے درندہ صفت انسانوں کے حوالہ کر کے مدینہ منورہ ہجرت کر گئے، اور انہیں بخوبی علم تھا کہ مکہ والے ان کے بیوی بچوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔ آخر یہی ہوا کہ مکہ والوں نے ان کے مال و اسباب اور

گھروں کو لوٹ لیا۔ تیسرا عمل جس سے کہ زندگی کے سابقہ گناہ سب معاف ہو جاتے ہیں وہ حج مبرور ہے یعنی وہ حج جو کہ اللہ کے یہاں قبول ہو جاتے۔ اس حج مبرور میں شرط یہ ہے کہ آپ کی نیت درست ہو۔ اس میں ریاکاری نہ ہو۔ سفرِ حج اور دوسری ضروریات میں جو روپیہ خرچ کر رہا ہو۔ وہ جائز ذرائع سے کمایا گیا ہو، اور آئندہ کے لئے عزم مصمم کریں کہ آپ کی کمائی میں کبھی کوئی حرام پیسہ شامل نہ ہو گا اور اپنے پچھلے کے اعمال پر اللہ سے توبہ کریں اور اس سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کریں۔ آپ توبہ اس طرح کریں کہ اپنے پچھلے گناہوں پر نادم ہوں ور آئندہ کے لئے پکا ارادہ کریں کہ کوئی گناہ نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ آپ کے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ لوگوں کے جو حقوق غصب کئے ہیں ان کو ان کا حق لوٹا دیں، اور جن جن کے حق آپ کے ذمہ میں ہوں ان کو ادا کر دیں۔ ہنوں کی اگر میراث وصول کر لی ہے تو اس کو واپس کرنے کی فکر کریں۔ اور آخری شرط میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں وہ یہ کہ: فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج یہ پورا سفر حج آپ کا اس شان سے گزرے کہ اس میں کوئی معصیت یا گناہ نہ کیا ہو۔ کسی سے جھگڑا نہ کیا ہو۔ کسی کی دل آزاری نہ کی ہو۔ کسی سے تلخ کلامی نہ کی ہو۔ اپنے حقوق ل دست برداری کے لئے تیار ہوں۔ اور دوسروں کو آرام پہنچانے کے لئے تیار رہیں ارکان ؑ میں سے آپ جس رکن کو بھی ادا کر رہے ہوں پورے ادب و احترام سے کریں اور معلمین ؑ وہ کے رویہ سے بددل نہ ہوں۔ وہ لوگ تو کاروباری حضرات ہیں اور جو کچھ کاروباری نہ ت میں ہوتا ہے وہ سب کچھ ہوتا ہے اس لئے ان کے افعال و اعمال سے صرف نظر کریں آپ کی زندگیوں میں ایک انقلاب بپا ہو گا اور ہر ایک اللہ کے دین کا سپاہی بن جائے ۔۔ اور ہر ایک یہ سمجھے گا کہ یہ دین میرے پاس ایک امانت ہے، اور اسے تمام انسانوں تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔ آپ کی زندگی کی بھاگ دوڑ بدل جائیگی۔

آخر میں میں ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کر دوں کہ اصل میں حج نام ہے۔ "وقوف عرفہ" کا اگر حج کے ارکان میں سے کوئی رکن رہ جائے تو اس کی تلافی کفارہ وغیرہ سے پوری کر دی جا سکتی ہے مگر جس کا "وقوف عرفہ" رہ گیا اس کا حج نہیں ہوا۔ "وقوف عرفہ" زوال کے بعد سے شروع ہو کر غروب آفتاب کے بعد تک ہے، اور اس دوران میں تین نمازیں ظہر، عصر، مغرب آتی ہیں۔ لیکن ظہر اور عصر کی نماز میدان عرفات سے باہر کسی

مسجد میں پڑھ کر میدان عرفات میں داخل ہوتے تھے - اسی طرح مغرب کی نماز بھی یا
نہیں پڑھ سکتے بلکہ مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر مزدلفہ میں پڑھیں گے وقوف عرفہ کی
اصل عبادت دُعا ہے - اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ کتابیں کھول کھول کر دُعائیں پڑ
رہتے ہیں - یہ دُعا مانگنا تو نہ ہوا بلکہ دُعا کی تلاوت ہو گئی - دُعا کی حقیقت تو یہ
کہ آپ اپنے دل کی گہرائیوں سے اللہ سے ہمکلام ہو کر کچھ مانگ رہے ہوں لٰہذا تو جو
دُعائیں آپ کو یاد ہوں وہ پڑھیں - ایک دُعا جو کہ آپ میں سے ہر ایک کو یاد بھی ہو
وہ آپ کو طواف کے ہر چکر میں رکن یمانی سے لے کر حجر اسود تک کے درمیان میں پڑھنی
ہے وہ ایک جامع دُعا ہے - ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃً وفی الاخرۃ حسنۃً
وقنا عذاب النار اس کے علاوہ آپ جو چاہیں دُعا مانگیں - اور یہ سارا وقت
دُعائیں مانگنے کے لئے ہے - اگر خدانخواستہ کیفیت ایسی ہو جائے کہ سب کچھ مانگ
بیٹھا - اب کیا مانگو اور سمجھ میں نہیں آ رہا تو تلاوت قرآن مجید شروع کر دیں - اور
سارا وقت اسی میں گزاریں -

آخر میں آپ سے گزارش ہے کہ میرے لئے ہر جگہ دُعا کیجئے اس کے ساتھ دین کی جس ت
کے لئے میں نے اور میرے ساتھیوں نے کمر کس لی ہے اس پر استقامت کے لئے اللہ
سے دُعا کریں - اور دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحابہ کرامؓ کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا
فرمائے - اور ہم میں سے ہر ایک کو دین کا سپاہی بنائے آمین -

اقول قولی ھذا استغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین
والمسلمات -

❋ ❋

الـهـدیٰ

نشست (۳۵)

تعمیر سیرت کی اساسات اور

قرآن کا انسان مطلوب

سورۂ مومنون اور سورۂ معارج کی روشنی میں

(مباحثِ عمل صالح)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۳)

السلام علیکم ـــــ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ـــــ اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ ہُمْ فِیْ صَلَاتِہِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ ۔ اِلٰی قَوْلِہٖ تعالیٰ ـــــ وَالَّذِیْنَ ہُمْ عَلٰی صَلَوٰتِہِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝

فَقَالَ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ سُوْرَۃِ الْمَعَارِجِ ـــــ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۝ الَّذِیْنَ ہُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ ـــــ اِلٰی قَوْلِہٖ تَعَالٰی ـــــ وَالَّذِیْنَ ہُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ۔

محترم حاضرینِ مجلس اور ناظرینِ کرام!

انسان کی انفرادی شخصیت اور سیرت و کردار کی تعمیر کا جو قرآنی پروگرام اور لائحۂ عمل ہے، پچھلی دو نشستوں سے سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ کے حوالے سے زیرِ گفتگو ہے اور جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسانی شخصیتوں کے خام مال سے ایک تعمیر، مستحکم سیرت و کردار وجود میں آئے۔ جس کا حوالہ علامہ اقبال کے اس شعر میں ہے ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تُو ۔ پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو

اور اس سے بھی زیادہ پیارے انداز میں اس بات کو علامہ اقبال نے فارسی میں ادا کیا ہے ؎

با نشہ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

آپ کو معلوم ہے کہ اگر ریت کا ایک گولا بنا کر اسے آپ کسی شیشے پر دے ماریں تو شیشہ نہیں ٹوٹے گا، اس کا کچھ نہیں بگڑے گا، وہ ریت خود ہی بکھر جائے گی۔ لیکن اس ریت کو آپ پکا لیں، پختہ کریں اور وہ اینٹ کی شکل اختیار کرے تو اب اس کی ضرب کاری ہو گی، نتیجہ خیز ہو گی۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے جن کو علامہ اقبال اپنا مرشدِ معنوی کہا کرتے تھے، اسی بات کو بڑے سادہ لیکن پُر اثر انداز میں یوں ادا کیا ہے ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل، جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ، تعمیر نہ کر!

اسلام اور قرآن حکیم انسان کے سامنے جو اعلیٰ نصب العین پیش کرتے ہیں، اس کے حصول کے لیے جو جدوجہد درکار ہے، اس کے لیے پہلے پختہ انسانی شخصیتیں ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ان پختہ شخصیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے جو پروگرام اور لائحہ عمل قرآن مجید تجویز کرتا ہے، اس کا اوّل و آخر صلوٰۃ ہے ــــــ ہم نے اِن دو مقامات پر دیکھا کہ آغاز میں بھی ذکر نماز کا ہے اور اختتام پر بھی ذکر نماز کا ہے۔ میں اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تین احادیث سے واضح کروں گا کہ اسلام کا نقطۂ آغاز نماز ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْاِسْلَامِ وَالْکُفْرِ الصَّلٰوۃُ "اسلام اور کفر کے مابین امتیاز ہی قائم ہوتا ہے نماز سے" ــــــ پھر دیکھیے کسی عمارت کی درمیانی اور اہم شے ہوتی ہے اس کا عمود جس پر چھت کھڑی ہے۔ جسے ہم ستون کہتے ہیں۔ فرمایا، اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ "نماز ہی دین کا ستون ہے"۔ پھر یہ کہ دین کی بلند ترین حقیقت کے بارے میں فرمایا اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ "یہ صلوٰۃ مومنین کے لیے معراج کے درجہ میں ہے، معراج کے حکم میں ہے" ــــــ تو گویا کہ ابتدا بھی، اہم اور درمیانی عمود بھی اور چوٹی بھی، ان تمام مرحلوں میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ نماز دین کی اہم ترین شے ہے۔ میں اگر اسے یوں تعبیر کروں کہ اگر ہم انسان کی سیرت سازی کو ایک شہر سے تشبیہہ دیں تو اس کے گرداگرد جو فصیل کھینچی ہوئی ہے وہ نماز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی اگر دیکھا جائے کہ نماز کو اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں قائم کرے

تو اس کی زندگی گویا کہ ایک حصار میں آجاتی ہے۔ ایک کھونٹے سے بندھ جاتی ہے۔ پھر اس کے سارے پروگرام اس نماز کے حوالے سے طے ہوں گے۔ اس کی Appointments اگر ہوں گی تو نماز کے اوقات کو مدِنظر رکھ کر ہوں گی۔ اس کے شب و روز کے جو معمولات ہوں گے تو ان میں فیصلہ کن چیز نماز ہو گی ___ لہٰذا پوری انسانی زندگی کو شکنجہ میں کس لینے والی شے نماز ہے۔

آیئے پہلے ہم یہ سمجھیں کہ صلوٰۃ جو قرآن مجید کا اصل لفظ ہے جبکہ نماز فارسی کا لفظ ہے اور ان دونوں کا مفاہیم میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ اب یہ ہماری مجبوری ہے کہ چونکہ ہمارے یہاں اسلام جب پہونچا ہے تو فارسی زبان کے حوالے سے پہونچا ہے لہٰذا اکثر اصطلاحاتِ قرآنیہ کا ترجمہ جو اردو میں مستعمل ہے وہ فارسی الاصل ہے۔ فارسی زبان میں ان الفاظ کا ایک اپنا مفہوم پہلے سے تھا۔ وہ کہیں غیر شعوری طور پر ان اصطلاحات کے اُس اصل مفہوم میں شامل نہیں ہو جانا چاہیے جو قرآن کریم اور ہمارے دین میں سے مُراد ہے ___ عربی زبان میں ص ل ی کا مادہ (Root) جس سے یہ لفظ صلوٰۃ بنا ہے، اپنے اندر دو بنیادی مفہوم رکھتا ہے ___ اِقْدَامُ اِلَی الشَّیْءِ کسی کی طرف بڑھنا، کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا ___ گویا کہ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے اور متوجہ ہونے کا نام ہے۔ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا نام ہے ___ اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ چونکہ مکالمہ و مخاطبۂ الٰہی سے مشرف کرنے والی چیز ہے لہٰذا یہ حقیقی ایمان کے لیے معراج کے درجہ میں ہے۔ اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ ___ یہی لفظ دعا کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی سے دعا کرتا ہے تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، ہمہ تن متوجہ ___ اپنے قلب اور اپنے ذہن میں تمام تر اس کی طرف متوجہ ہو گا جب ہی تو دعا کرے گا ___ یہی لفظ عنایت و شفقت کے مفہوم میں آتا ہے۔ جیسے سورہ احزاب میں وارد ہوا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ۔ بے شک اللہ صلوٰۃ بھیجتا ہے اپنے نبی پر اور اس کے فرشتے بھی ___ اسی سورت میں آیا هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ ___ کہ اے اہلِ ایمان اپنے نصیب پر فخر کرو کہ "وہ اللہ تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی"۔ اس سے مراد کیا ہے! اللہ کی طرف منسوب ہو تو اس کا مفہوم ہو گا ___ اس تبارک و تعالیٰ کی طرف سے عنایت، شفقت، رحمت، توجہ ___ فرشتوں کی طرف منسوب ہو کر اسی کا مفہوم ہو جائے گا ان کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنینِ صادقین کے لیے اللہ کی شفقت، عنایت، رحمت اور توجہ کے لیے اس کے حضور میں دعا ___ تو یہ سب باتیں اس لفظِ صلوٰۃ کے پہلے بنیادی مفہوم میں شامل ہیں۔

آپ میں سے اکثر کو معلوم ہوگا کہ صلوٰۃ کے آغاز کے لیے حدیث میں سورۂ انعا
کی آیت نمبر ۷۹، کے یہ الفاظ مبارکہ بھی آتے ہیں اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَ
حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ "میں نے اپنی توجہ کو مرتکز کر لیا ہے اس ذات کی طرف، اس ہ
کی جانب جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں ہر شے سے اپنی توجہ کو ہٹا کر، یکسو ہو کر اس کی جانب
میں متوجہ ہو رہا ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں"۔ یہ صلوٰۃ کا نقطۂ آغاز ہے۔

صلوٰۃ کا یہ جو مفہوم ہے اس کے اعتبار سے یہ بات ذہن میں رکھیے کہ صلوٰۃ یا نماز کا مقصد
ذکر الٰہی بنتا ہے آپ اس تبارک و تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ عزّوجلّ آپ کو یاد آتا ہے۔ کی ہے
سورۂ طٰہٰ میں فرمایا: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ۔ "نماز کو قائم کرو، صلوٰۃ کو قائم رکھو میری یاد کے لیے"
اس لفظ کا دوسرا بنیادی مفہوم ہے "آگ سے حرارت حاصل کرنا، تاپنا"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے
اپنے اہل سے فرمایا تھا: اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ
تَصْطَلُوْنَ ○ "میں نے آگ دیکھی ہے میں اس آگ کے پاس جا کر کوئی خبر لاؤں گا یا کوئی انگارا لاؤں تا
تم سردی سے بچنے کے لیے آگ سے خود کو تاپ سکو" (نمل-۷)۔ اس مفہوم کو بھی مدنظر رکھیے۔ اس کے
حوالے سے حقیقتِ صلوٰۃ کا یہ پہلو سامنے آنا چاہیے کہ یہ انسان کی روح میں اگر ضعف و اضمحلال پیدا ہو
ہو، اگر اس پر افسردگی طاری ہوگئی ہو تو اس میں حرارتِ تازہ پیدا کرنے کا ذریعہ صلوٰۃ ہے۔ جذباتِ د
کے متعلق اگر محسوس ہو کہ ان پر کچھ ٹھنڈ طاری ہے یا اوس پڑ گئی ہے تو ان جذبات کے اندر از سرِ نو
ایک حرارتِ ایمانی کا پیدا کرنا یہ صلوٰۃ کا مقصد ہے۔ ان دونوں بنیادی مفاہیم اور ان کے ذیلی مفا
کو ذہن میں رکھیے تو صلوٰۃ کا جو اصل مطلوب و مقصود ہے، جو اس کی اصل حکمت ہے، جو اس کی اصل
غرض و غایت ہے، وہ سامنے آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے توجہ دلا
ہے کہ اگر یہ باطنی کیفیات موجود نہ ہوں تو پھر نماز ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے۔ اس میں رکوع و سجود تو ہ
ہے لیکن توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہی نہیں، وہ ایک جسمانی مشقت تو ہوگئی لیکن اس کا جو اصل حاصل ہے
اس تک انسان کی رسائی نہیں ہوتی۔ علامہ کہتے ہیں ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام | میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق | عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

توجہ اور انابت الی اللہ کے بغیر عبادات محض رسومات بن کر رہ جاتی ہیں، وہ رسم پرستی ہ
جو اصل حقائق و مقاصد ہیں، وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہا علامہ نے ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی — فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

البتہ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ جب یہ کیفیت ہوگی تو بھی یہ نماز فائدے سے بالکل خالی نہیں ہے۔ ایک شخص نے اگر اپنا وقت صرف کیا ہے۔ وہ اپنے کاروبار اور مشغولیات سے نکلا ہے۔ اس نے وضو کیا ہے۔ وہ نیت باندھ کر اللہ کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے تو اس نے جو جسمانی مشقت جھیلی ہے آخر اس کا اجر و ثواب تو اسے ملنا چاہیئے۔ یہی وقت وہ کاروبار میں لگاتا، یہی وقت وہ زندگی کی کسی اور مصروفیت و مشغولیت میں صرف کرتا۔ اس سے وہ کوئی منفعت حاصل کرتا لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا کوئی اجر و ثواب نہ ہو۔ اجر و ثواب تو ملے گا۔ فرض کی ادائیگی فی نفسہٖ بہت بڑی بات ہے کہ اس نے اللہ کے ایک حکم پر عمل کیا ہے۔ امتثالِ امر بجا لایا ہے لیکن نماز کے جو اصل مقاصد ہیں وہ حاصل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ توجہ نہ ہو، وہ انابت نہ ہو، وہ خشوع اور خضوع نہ ہو، وہ حضوریِ قلب کی کیفیت نہ ہو جو مطلوب ہے۔ علامہ اقبال اس کے متعلق جذبات سے مغلوب ہو کر کہتے ہیں ؎

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور — ایسی نماز سے گذر، ایسے امام سے گزر

اب آگے چلیئے۔ اس صلوٰۃ کا ایک ظاہری نظام ہے، اس کی ہیئات ہیں، سکنات ہیں، حرکات ہیں اس میں تکبیر تحریمہ ہے۔ ہاتھوں کا اٹھانا ہے، اس میں قیام ہے، رکوع ہے، پھر قومہ ہے، پھر سجدہ ہے، پھر جلسہ ہے، پھر سجدہ ہے۔ یہ ایک رکعت کی تکمیل ہوئی۔ اس کے اوقات ہیں۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۔ اس میں رکعتوں کی تعداد کا تعین ہے۔ پھر نماز باجماعت کا نظام ہے، یہ پورا صلوٰۃ کا نظام ظاہری ہے۔ اس کے بارے میں اولاً تو یہ اصل الاصول ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ سارا کا سارا منقول ہے، ماثور ہے، مسنون ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اس کی اصل بنیاد میرا اجتہاد یا آپ کا اجتہاد یا کسی اور کا اجتہاد نہیں ہے۔ شخصی اجتہاد پر معاملہ لے آئیں گے تو سب کی نماز علیحدہ علیحدہ ہو جائے گی یکسانی نہیں رہے گی، ایک رنگی نہیں رہے گی۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ ۔ صلوٰۃ ایسے ادا کرو، نماز ایسے پڑھو۔ جیسے مجھے دیکھتے ہو کہ میں نماز پڑھتا ہوں۔

اس صلوٰۃ کے ظاہری نظام کے بارے میں یہ بات بھی جان لیجئے کہ اس میں ہمیں عجیب حکمت پہ نظر آتی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں اجتماعی سطح پر تطہیر و تنظیم کا ایک نہایت اعلیٰ نظام اس کے ذریعہ سے قائم کیا گیا ہے۔ اجتماعی طور پر نماز ادا ہو رہی ہے۔ ایک ہی وقت ہر روز دن میں پانچ مرتبہ مسلمان مساجد میں جمع ہو رہے ہیں۔ اجتماعی ماحول اس کے لیے جزوِ لازم بن گیا ہے۔ جزوِ لاینفک ہے۔ پھر اس میں تنظیم کا اعادہ مستقل طور پر ہو رہا ہے۔ محلہ وار تنظیم بھی ہے۔ جمعہ کے دن اس سے بھی بڑی تنظیم ہے۔ عیدین میں

بڑے بڑے شہروں میں تنظیم ہے۔ حج کے موقع پر پورے کرۂ ارضی سے وہ لوگ جوق جوق جمع ہوتے ہیں جو مانتے والے ہیں توحید کے اور جو کہ گواہی دیتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس طرح مسلمانانِ عالم کا عالمی اجتماع اور عالمی تنظیم کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اس نظامِ صلوٰۃ میں اجتماعی تطہیر و تنظیم بھی پیشِ نظر ہے۔

آگے چلیے۔ نظامِ صلوٰۃ کے متعلق یہ بات جان لیجئے کہ اس میں اہم ترین چیز ہوگی محافظت اور مداومت۔ اس نظام کو مستقل قائم و دائم رکھنا۔ یہ نہیں کہ جب چاہا نماز ادا کر دی، جب چاہا گول کر دی۔ گینڈے دار نماز ہو تو وہ پھر اقامتِ صلوٰۃ نہیں ہوگی۔ یا جب جی چاہا نماز پڑھ لی اوقات کی پابندی نہیں کی گئی۔ یا بلا کسی عذر اور مجبوری کے گھر میں ہی ادا کر لی۔ مسجد میں حاضر نہیں ہوئے۔ یہ اقامتِ صلوٰۃ کے تقاضوں کو ختم کر دینے والی چیز ہے۔ اس کی اجتماعی مصلحتیں اور حکمتیں اس طرح بالکل ضائع ہو جائیں گی۔ اس کے لیے لازم ہے محافظت اور مداومت۔ میں نے یہ دونوں الفاظ اسی سبق سے لیے ہیں۔ سورہ مومنون اور سورہ معارج میں صلوٰۃ کے لیے جو آخری بات آئی ہے وہ محافظت ہے۔ سورہ مومنون میں فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ اور سورہ معارج میں فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ اس کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے تمام قواعد و ضوابط اور اس کے تمام آداب کی پابندی ملحوظ رکھتے ہیں۔ نیز سورہ معارج میں فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ "وہ لوگ جو اپنی نمازوں میں مداومت ہمیشگی اور پابندی کرتے ہیں۔" لہٰذا صلوٰۃ کے نظامِ ظاہری کے سلسلہ میں اقامت، محافظت اور مداومت ان تین الفاظ کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیجئے۔

آگے چلیے۔ صلوٰۃ کی ایک ہے روحِ باطنی۔ اس کے لیے لفظ خشوع آیا۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ "فلاح سے ہمکنار ہوئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔" یہاں خشوع سے مراد ہے انسان کی معنوی شخصیت کا اپنے رب کے حضور میں جھک جانا۔ ظاہری طور پر تو جسم جھک ہی رہا ہے۔ آپ کھڑے ہوتے ہیں تو اس انداز سے جس میں جھکاؤ ہوتا ہے۔ سینہ تان کر کھڑے نہیں ہوتے۔ پھر رکوع کرتے ہیں۔ تو مزید جھکاؤ ہو گیا ہے۔ پھر جب سجدے میں گئے تو جھکاؤ کی انتہا ہو گئی۔ لیکن اگر صرف ظاہری جسم جھک رہا ہو لیکن وہ معنوی شخصیت، وہ اندر کا انسان، اگر اس کی گردن اکڑی ہوئی ہو، وہ اللہ کے سامنے معنوی طور پر سرنگوں اور SURRENDER نہ ہو رہا ہو، انسان کا نفسِ امارہ سرکشی اور تمرد پر تلا ہوا ہو، وہ اللہ کے سامنے نہ جھک رہا ہو تو ...

نماز تو ادا ہو گئی لیکن وہ جو حقیقی نماز ہے وہ ادا نہیں ہو گی۔ اسی لیے اس سبق میں خشوع کی طرف بھی توجہ دلا
ئی۔ خشوع و خضوع اور حضورِ قلب یہ ہیں باطنی کیفیات جو مطلوب ہیں اور اقامت، محافظت اور مداومت
یہ وہ چیزیں ہیں جو نظامِ صلوٰۃ کے ظاہر کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس ظاہر کے ساتھ اسلامی معاشرے کی
تمامی مصلحتیں وابستہ ہیں اور اُس باطنی کیفیات کے ساتھ ایک بندۂ مومن کی اپنی ذاتی سیرت و کردار کی
تعمیر اور اس کے ترفع کا مسئلہ متعلق و وابستہ ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے نماز سے وہ اصل و حقیقی
برکات ظاہر ہوتی ہیں جن کا ذکر سورۂ عنکبوت کی آیت نمبر ۴۵ کے درمیان میں فرمایا گیا ہے۔ جو آپ اکثر
خطبہ جمعہ کے اختتام پر سنتے ہوں گے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ۔
بے شک نماز روکتی ہے۔ بے حیائی اور بری بات سے اور اللہ کی یاد ہی ہے سب سے بڑی، اعلیٰ
اور ارفع بات ۔ لیکن اگر اس کے برعکس معاملہ ہوگا تو صلوٰۃ کی ادائیگی کے باوجود معاشرہ ان برکات سے
محروم رہے گا۔

ایک بات اور جان لیجئے کہ نمازوں میں ایک تو ہیں فرض نمازیں اور بقیہ نوافل سنن ہیں ۔ فرض
نمازیں لازم ہیں ان کو ہر صورت میں ادا کرنا ہے۔ البتہ ان کی ادائیگی کے لیے خود ہی شریعت نے چند
رعایتیں دے رکھی ہیں ۔ مثلاً کوئی عذر ہے تو آپ مسجد میں نہ جائیں۔ نماز گھر میں ادا کریں، بیمار ہیں تو
بیٹھ کر پڑھ لیں، اس سے بھی زیادہ معذور ہیں لیٹ کر پڑھ لیں جس میں قیام و رکوع قومہ سجدہ، جلسہ، قاعدہ
کے بدلے اشارات کفایت کریں گے۔ ایسی رعایتیں خود شریعت نے فراہم کر دی ہیں، لیکن فرض نماز کا
قصداً ضائع کر دینا، تو اس کے بارے میں یہ جان لیجئے کہ یہ گویا حقیقی و قلبی ایمان کا ضائع کر دینا ہے ۔
یہی وجہ ہے کہ ہم نے سورۂ معارج میں دیکھا کہ وہاں اس مقام پر لفظ "مُصَلِّیْنَ" لایا گیا ہے جس مقام
پہ سورۂ مومنون میں "مُؤْمِنُوْنَ" کا لفظ آیا ہے، قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خٰشِعُوْنَ
اور سورۂ معارج میں فرمایا: اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۝ الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ ۝

بہر حال ہماری آج کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ تعمیر سیرتِ انسانی کے قرآنی پروگرام کا
مرکز و محور، اس کا نقطۂ آغاز اور اس کی آخری منزل یہ سب صلوٰۃ پر مبنی ہے۔

اب آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال۔ ڈاکٹر صاحب! آج کے درس میں آپ نے فرمایا ہے کہ نماز سیرت سازی میں اہم کردار ادا

کرتی ہے لیکن ہمارے معاشرے میں اکثر نمازیوں میں وہ اوصاف نظر نہیں آتے جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- میں نے عرض کیا تھا کہ نماز کا ایک ظاہر ہے ایک اس کا باطن ہے۔ تو ظاہر کی پابندی جس طرح ہو رہی ہے اُسے بھی بہرحال میں غنیمت سمجھتا ہوں۔ میں اس کی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتا تاہم ہمارے یہاں اس وقت جو کمی ہے وہ نماز کی اصل روح سے متعلق ہے۔ یعنی خشوع و خضوع، حضور اور خلوص و اخلاص ـــ ان تمام چیزوں کا تعلق ہے ایمان کے ساتھ ـــ چونکہ ہمارا ایمان بہت سے اسباب سے مضمحل ہو گیا ہے لہذا جو کیفیات باطنی نمازیں ہونی چاہئیں، وہ بھی نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ نمازیوں کا تناسب بھی ہمارے معاشرے میں بہت ہی کم ہے۔ چنانچہ یہ وجوہ ہیں کہ نماز کے جو اصل نتائج ہیں وہ ظاہر نہیں ہو رہے اور نماز کی حقیقی برکات سے ہمارا معاشرہ کم و بیش محروم ہے۔ بہرحال اس کے لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے ایمان کو پختہ کریں، دعوت ایمانی کے داعی بنیں۔ جب ایمانی کیفیات کے ساتھ معاشرے میں نماز ادا کی جائے گی تو اس کا جو لازمی نتیجہ ہمارے اخلاق و اعمال میں کھلنا چاہیے وہ برآمد ہو گا اور معاشرہ نماز کی برکات سے بہرہ مند ہو گا ـــ ان شاء اللہ العزیز۔

حضرات! ہماری آج کی گفتگو اکثر و بیشتر نماز سے متعلق رہی ہے۔ جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کا ستون بھی قرار دیا اور اہل ایمان کے حق میں معراج بھی قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ ایک طرف تو ہمیں نماز کی محافظت اور مداومت کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی زندگیوں میں نماز کو قائم کریں جیسا کہ اُس کو قائم کرنے کا حق ہے۔ اور دوسری طرف نماز کی جو اصل روح ہے یعنی خشوع و خضوع، حضورِ قلب اور خلوص و اخلاص اس سے بھی اللہ تعالیٰ ہمیں حصہ وافر عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

(۴)

نشست ۳۶

السلام علیکم ـــ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ـــ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِہِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ

اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ o وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ o وقال تبارك وتعالى

فی سورة المعارج :

وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ o لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ o وَالَّذِيْنَ

يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ o وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ o

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ o ———— صدق اللہ العظیم

محترم حاضرین اور معزز ناظرین!

انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے ضمن میں جو اساسی پروگرام قرآن حکیم ہمیں دیتا ہے، اس کے اول کے بارے میں جو اس لائحہ عمل کا اہم ترین جزو ہے، اس کے متعلق ہم نے سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں یہ دیکھا کہ دونوں جگہ کامل مطابقت ہے کہ اولاً بھی ذکر صلوٰۃ کا آیا دونوں مقامات پر اور اختتام بھی صلوٰۃ پر ہوا۔ پھر یہ کہ دونوں جگہوں پر صلوٰۃ کی محافظت پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ سورہ مومنون میں خشوع و خضوع کی طرف توجہ دلائی گئی اور سورہ معارج میں مداومت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ ان تمام چیزوں کو جمع کر لیا جائے تو اس سے اقامت صلوٰۃ کی اصطلاح وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ ہم بعد کی سورتوں میں قرآن حکیم میں اسی اصطلاح کو دیکھتے ہیں: اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ۔

اب آگے چلیے! اس پروگرام کے جو دوسرے اور تیسرے اجزاء ہیں، ان کے ضمن میں ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں، جن کا دونوں سورتوں میں تذکرہ ہو رہا ہے۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ ایک تو ترتیب کا فرق ہے یعنی سورہ مومنون میں پہلے ذکر ہے اعراض عن اللغو کا — اور بعد میں ذکر ہے زکوٰۃ اور تزکیہ کا — سورہ معارج میں پہلے ذکر ہے زکوٰۃ اور تزکیہ کا اور پھر ذکر ہے ایمان بالآخرۃ یا ایمان بالغیب کا جس کا ظاہر تعلق ہے اعراض عن اللغو سے — پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان دونوں اوصاف کے بیان میں جو کہ یہ دونوں مقامات پر جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ قدرے مختلف ہیں اور ان سے ہمیں ان دونوں کی اصل حقیقت اور اصل روح کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ہم اس وقت گفتگو کریں گے سورہ مومنون کی ابتدائی آیات کی ترتیب کے تحت۔ چنانچہ اس میں مومنین کا جو دوسرا وصف آیا ہے وہ ہے اعراض عن اللغو — لغو کا مفہوم معصیت یا گناہ نہیں ہے بلکہ وہ کام مراد ہے جو خواہ بجائے خود مباح ہو، اس کی شریعت میں ممانعت نہ ہو، لیکن اس کا کوئی فائدہ

انسان کو نہ پہونچتا ہو۔ انسان کے وقت کی قدر و قیمت کے معاملہ پر قرآن مجید بہت زور دیتا ہے۔ اس کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے کہ یہی انسان کا اصل سرمایہ ہے۔ یہی اس کا اصل راس المال ہے۔ اس وقت ہی سے انسان کو بنانا ہے جو کچھ بھی بنانا ہے اور اس وقت ہی میں بننا ہے جو کچھ بھی بننا ہے۔ لہٰذا اس وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہیئے یہ وقت یا تو کسی حقیقی دنیوی ضرورت کو پورا کرنے میں صرف ہو اور یا اس کے ذریعہ سے آخرت کے لیے کوئی کمائی کی جائے۔ ہر وہ کام جس سے نہ تو کوئی دنیوی ضرورت حاصل ہو رہی ہو اور نہ جس کے ذریعہ آخرت کے لیے انسان کوئی کمائی کر رہا ہو۔ تو ایسا کام "لغو" شمار ہوگا خواہ وہ ممنوعات کی فہرست میں شامل نہ ہو، وہ حرام و ناجائز نہ ہو اور معصیت اور گناہ نہ ہو اس حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا۔ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ ط یعنی۔ انسان کے دین اور اسلام کے حسن اور خوبی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وہ اس چیز کو ترک کر دے جو لایعنی ہو۔ جس کا کوئی فائدہ اسے نہ پہونچ رہا ہو۔ تو ہر لایعنی اور غیر مفید کام کو چھوڑ دینا یہ ہے اعراض عن اللغو۔

اب آپ غور کیجئے کہ اصل میں اس کا گہرا تعلق ہمارے تصورِ حیات سے ہے۔ اگر کوئی شخص دنیا کی زندگی کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ بس کل یہی زندگی ہے۔ بعث بعد الموت نہیں، کوئی آخرت نہیں، کوئی جزا و سزا نہیں پھر تو ظاہر بات ہے کہ اپنی معاشی ضروریات سے جو وقت بھی بچ رہا ہو گا اس کا وہ کوئی مصرف تلاش کرے گا۔ کوئی HOBBY ہو کوئی مشغلہ ہو کوئی AMUSEMENT ہو، کوئی تفریح ہو، وقت گزاری (TO PASS TIME) کے لیے کوئی شغل ہو۔ لیکن جب ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ اصل میں اس دنیا کی زندگی تو ایک دیباچہ ہے۔ ایک مقدمہ ہے۔ اصل کتاب زندگی تو موت کے بعد کھلے گی، وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ٥ "اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اصل گھر تو آخرت کا گھر ہے۔ کاش انہیں معلوم ہوتا"۔ جب یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی تو غور سے سماعت فرمایئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی پیاری حدیث ہے جس میں حضور نے وہ نتیجہ بیان فرما دیا جو اس حقیقت کے انکشاف سے برآمد ہوتا ہے۔ فرمایا الصادق والمصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے، اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے۔ ظاہر بات ہے کہ اب اس دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہو گیا۔ ہمیں اس میں بونا ہے تاکہ اُسے ہم آخرت میں کاٹ سکیں۔ لہٰذا جس کے دل میں یہ ایمان بالآخرہ ہوگا وہ اپنے وقت

جس طرح قدر و قیمت کا احساس کریگا۔ ایسا اس شخص کا معاملہ نہیں ہو سکتا جو آخرت پر یقین نہیں
تا۔ چنانچہ ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں خاص طور پر وہ سورۂ مبارکہ جہاں سے ہمارے اس
ہ درس کا آغاز ہوا۔ اس میں ہم نے جو پہلا لفظ پڑھا وہ ہے "والعصر" "زمانہ کی قسم ہے" یہ
ہ تیزی سے گزرا جا رہا ہے۔ یہی تمہارا راس المال ہے۔ میں نے اس وقت آپ کو بتایا تھا کہ ایک
سر نے بڑی عبرت انگیز مثال پیش کی ہے کہ برف کا ایک تاجر چلاتا ہے کہ لوگو! رحم کرو اگر میرا یہ
ت فروخت نہ ہوا تو میرا جو راس المال ہے وہ پگھل جائے گا۔ دوسرے کا معاملہ یہ نہیں ہوتا کوئی
زار جو منیاری یا پرچون کا سوداگر ہو وہ رات کو دوکان بند کر دے تو اس کا مال اس کے پاس
ر ذور رہتا ہے۔ راس المال تو کہیں نہیں جاتا! لیکن برف کے تاجر کا تو اصل راس المال پگھلا جا رہا
ہے۔ شاید میں نے ایک انگریزی نظم PSALM OF LIFE کے حوالے سے پہلے بھی یہ بات
ن کی ہے۔ اسے پھر سن لیجئے۔

Art is long and time is fleeting
And our hearts though stout and brave

Still, like muffled drums are beating
Funeral marches to the grave

وقت دوڑ رہا ہے، گزر رہا ہے، بھاگ رہا ہے۔ اس وقت کی قدر کرو ہمارے دل کی ہر دھڑکن گویا
ن قبر سے ہمیں قریب تر کر رہی ہے۔" یہ احساس اگر سامنے ہو تو معلوم ہو گا کہ وقت کی کیا قدر و قیمت
۔ لہٰذا یہاں جو دوسرا وصف تعمیر سیرت کے ذیل میں بیان ہو رہا ہے 'اعراض عن اللغو' اور اس پر
ۂ معارج کے ان الفاظ سے روشنی پڑی: وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ○ "وہ لوگ جو روز جزا کی
یق کرتے ہیں، قیامت کے دن کو مانتے ہیں"۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ○ "اور
ک جو اپنے رب کے عذاب کے خیال سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ: اِنَّ
اب رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ○ "بے شک ان کے رب کا عذاب چیز ہی ایسی ہے جس سے
ت مند بخت ہوا ہی نہیں جا سکتا"۔

تیسرا وصف سورۃ المؤمنون میں یہ بیان ہوا: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ○ "اور وہ لوگ
زکوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں"۔ میں نے پہلے بھی توجہ دلائی تھی کہ جب زکوٰۃ کا قرآن مجید میں ایک اصطلاح
ہ طور پر ذکر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ فعل آتا ہے۔ اِيْتَاء — اِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ، يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ، اٰتَاهُ الزَّكٰوةَ

"تُؤْتُوْنَ الزَّكٰوۃَ" سے تو اس طور پر زکوٰۃ کا لفظ ہے اصطلاحات جیسے اقامت الصلوٰۃ — اور انبیاء اولیٰ
۔ لیکن یہاں فرمایا گیا: وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ ۔ اس میں ایک تو دراصل زکوٰۃ کی جو بنیادی
حقیقت ہے، اس کی طرف توجہ دلائی گئی اور دوسرے یہ کہ "فاعلون" فرما کر اس بات کو واضح کیا گیا
وہ لوگ جو مسلسل یہ عمل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں اس بات کو جان لیجئے کہ زکوٰۃ کا اصل مفہوم اور اس کی
بنیادی حقیقت کیا ہے! جیسے فا۔ لام۔ ح کے مادے سے ہم نے فلح کا مفہوم سمجھا تھا۔ ایسے ہی یہ
اور ہی جیسے عربی میں کہا جانے کا زا، ک، یا۔ اس کے حوالے سے اس کا اصل مفہوم کیا ہے! اسے آپ
ایک مالی کے عمل پر قیاس کر کے بخوبی سمجھ سکیں گے۔ ایک مالی ہے اس نے ایک باغیچہ لگایا ہے جس
میں کچھ پودے اس نے خود لگائے ہیں جو یا پھل دار ہیں یا پھول دار ہیں۔ لیکن اس باغیچہ میں خود رو گھاس
اور کچھ جھاڑ جھنکار اپنے آپ اُگ آتا ہے اور خود رو گھاس یا جھاڑ جھنکار ان پودوں کے نشوونما میں رکاوٹ
بنتا ہے۔ زمین میں جتنی قوتِ نمو ہے اسے اگر یہ خود رو گھاس اور جھاڑ جھنکار نہ کھینچ رہے ہوں تو
یہ ساری قوتِ نمو اُن پودوں کو ملے گی جو اس مالی نے خود لگائے ہیں، ورنہ یہ گھاس اور جھاڑ
جھنکار بھی اس میں سے اپنا حصہ وصول کریں گے۔ اسی طرح ہوا کی آکسیجن سے سورج کی تمازت
سے ہو سکتا ہے کہ یہ خود رو چیزیں ان پودوں کے لیے رکاوٹ بن رہی ہوں، لہٰذا مالی جس کا نشو
کر رہا ہے جو اس کے اندر میں ہوتا ہے، وہ اس کے ذریعہ سے اس باغیچہ کے اندر سے تمام خود رو
گھاس اور جھاڑ جھنکار کو علیحدہ کر دے گا۔ مالی کا یہ عمل "تزکیہ" ہے۔ اصل مفہوم یہ ہوا کہ کسی شے کے نشوونما
میں جو رکاوٹ ہو اس کو دور کر دینا تزکیہ ہے۔ اب اس بات کو جان لیجئے کہ ہر انسان، ہر فرد نوعِ بشر
اللہ تعالیٰ کی کیاری کا ایک پودا ہے جو اس نے لگایا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ یہ پروان چڑھے، پھلے
پھولے، اس میں جو استعدادات اللہ نے ودیعت کی ہیں وہ پورے طور پر بروئے کار آئیں، نشوونما
پائیں۔ انسان اپنے اس اصل مقام کو حاصل کرے جس کے لیے اللہ نے اُسے بالقوہ یعنی
(POTENTIALLY) تخلیق فرمایا ہے۔ لیکن کچھ چیزیں اس کے اس نشوونما میں رکاوٹ بنتی ہیں
اس بات کو اس ضرب المثل سے سمجھئے کہ "ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں" ان تمام چیزوں کو
جمع کریں گے تو وہ ہے حُبِّ دنیا — دنیا کی محبت۔ چنانچہ آپ قرآن مجید میں بار بار دیکھیں گے کہ
انسان کی گمراہی اور بے راہ روی کے اصل سبب کی تشخیص جہاں ہوتی ہے وہاں عموماً یہ بات آئے
گی: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی "تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ

بی ہے اور باقی رہنے والی بھی"۔ کہیں فرمایا جاتا ہے: کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ
خِرَةَ ۝ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ سورۃ قیامہ کے درس میں ہم نے ان آیات کا مطالعہ کیا تھا کہ "تمہاری
کا اصل سبب یہ ہے کہ حُبِّ عاجلہ میں تمہارے دل گرفتار ہو گئے ہیں اور آخرت کو تم نظر انداز
تے ہو"۔ اور عاجلہ سے مُراد ہے یہ دنیا۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے آیئے، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس حُبِّ دنیا کا سب سے
شان، اس کی سب سے بڑی علامت، اس کا سب سے بڑا symbol حُبِّ مال ہے:
بُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ "تم مال سے بڑی محبت کرتے ہو اور اُسے جمع کرنے کی تم پر دُھن سوار
ہتی ہے"۔ اور سورۃ الھُمَزَہ میں فرمایا: اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝
ہی ہے اس شخص کے لیے) جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال
سے دوام بخشے گا"۔ پس یہ مال کی محبت ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے انسان کے اخلاقی ارتقا
میں، اس کی اعلیٰ اقدار کی نشو ونما میں۔ جس رُخ پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کی شخصیت ترقی اور
نشو ونما پائے، اس کا ارتقا ہو، اس کی تعمیر ہو، اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے مال کی
محبت۔ لہٰذا اس مال کی محبت کو دل سے کھرچنے کے لیے نسخہ ہے انفاقِ مال۔ مال کا اللہ کی خوشنودی
اور رضا کے حصول کے لیے خرچ کرنا۔ وہ خیرات وصدقات ہوں، وہ محتاجوں، مسکینوں، یتیموں،
بیواؤں کی مدد میں صرف ہو رہا ہو، وہ قرابت داروں کا حق ادا کرنے میں صرف ہو رہا ہو، وہ اللہ تعالیٰ
کے دین کی خدمت میں صرف ہو رہا ہو، وہ پیغامِ الٰہی کی نشر واشاعت کے لیے صرف ہو رہا ہو، وہ دین
کی سربلندی اور غلبہ کے لیے اور اس کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے صرف ہو رہا ہو۔
یہ ہے اصل میں عملِ تزکیہ۔ یہ کرتے رہو گے تو دل سے مال کی محبت ختم ہو گی جو اصل علامت ہے۔
حُبِّ دنیا کی۔ اور حُبِّ دنیا کا یہ BRAKE اگر کھل گیا، اس کی گرفت اگر ختم ہو گئی تو اب تمہاری گاڑی
پوری رفتار کے ساتھ اس شاہراہ پر چلے گی کہ جس پر چل کر تم تعمیرِ ذات، تعمیرِ خودی، تعمیرِ شخصیت، تعمیرِ سیرت
کے باب میں ترقی کر سکو گے۔

اب اس ارتقا وترقی کے لیے قرآن مجید نے ایک دو گونہ پروگرام بنایا ہے۔ جیسا کہ میں نے پچھلی مرتبہ
عرض کیا تھا کہ صلوٰۃ میں وہ نماز بھی شامل ہے جو فرض ہے جس کو ہر حالت میں آپ نے ادا کرنا ہے۔ وہ
ہیں پنج وقتہ فرض نمازوں کا نظام۔ اور اس کے ساتھ ہی نفل نمازوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی۔ اسی طریقہ

سے اس زکوٰۃ کے عمل کے بھی دو اجزا کر دیئے گئے۔ ایک زکوٰۃ تو لازم اور فرض ہو گئی۔ اس کے لیے
ایک خاص حد معین کر دی گئی ہے جسے "نصاب" کہا جاتا ہے۔ مالی حیثیت سے اس سے زائد ہو
ہے اس پر شرحِ نصاب کے مطابق لازماً رقم نکالی جائے گی۔ اس کی ادائیگی فرض ہے۔ اس کو اصطلاحاً
زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ بلکہ عمل تزکیہ تو دائم ہے۔ اس میں صرف زکوٰۃِ مفروضہ ہی نہیں بلکہ اس کے سوا بھی
بڑھ کر ادا ہو۔ جیسے ہمارا دوسرا سبق تھا آیتِ بِر جس میں فرمایا گیا: وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی
وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّکٰوةَ ۚ
یہاں فرض زکوٰۃ کا علیحدہ ذکر ہے اور اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ زکوٰۃ کے علاوہ اور دو۔ بڑھ چڑھ کر دو۔
جس کی جب آخری حد پوچھی گئی کہ حضورؐ کہاں تک دیں! تو اس کی قرآن مجید میں وضاحت فرمائی گئی:
یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۔ "یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا دیں! تو اے نبی! ان سے
کہیئے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہے اسے دے ڈالو" پھر مزید تشویق و ترغیب کے لیے فرمایا:
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ "تم نیکی کے (بلند ترین) مقام تک نہیں پہنچ سکو گے جب
تک کہ اللہ کی راہ میں وہ چیز صرف نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے"۔ اب یہ ہے وہ عمل تزکیہ جس کی ترغیب
و تاکید قرآن مجید میں بار بار آتی ہے۔ آخری پارے کی سورۃ الشمس میں نفسِ انسانی کے بارے میں فرمایا
گیا: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا
"گواہ ہے یہ نفسِ انسانی اور جو اللہ نے اُسے بنایا اور سنوارا اور اس میں طرح طرح کی صلاحیتیں رکھیں
اس میں بہت سی استعدادات ودیعت فرمائیں۔ پھر اس میں نیکی اور بدی کا شعور بھی الہامی طور پر
پیدا فرما دیا۔ تو جس کسی نے اس کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ہوا اور جو شخص اسے مٹی میں دبا بیٹھا جس
نے اُسے خاک آلود کر دیا وہ ناکام و نامراد ہوا"۔ یہی بات ہم سورۃ الاعلیٰ میں دیکھتے ہیں: قَدْ اَفْلَحَ
مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ "کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے تزکیہ حاصل کر لیا اور
نے اپنے رب کا نام جپا اور اس نے نماز ادا کی"۔ سورۃ الاعلیٰ کی یہ دو آیتیں سورہ مومنون کی
آیات سے بہت مشابہ ہیں: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ
هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ ۔

لہٰذا آج تعمیرِ سیرت کے قرآنی پروگرام میں دو چیزیں ہمارے سامنے آئیں ایک اِعْرَاض عَنِ
اللَّغْو جس کا براہِ راست تعلق ہے ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالقیامۃ سے — اور دوسرے تزکیہ

عمل پیرا رہنا ۔ اسی کے لیے سورہ معارج میں یہ الفاظ آئے : وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ " وہ لوگ کہ جن کے اموال میں حق ہے ، جو جانا پہچانا ہے سائل کے لیے بھی اور محروم کے لیے بھی "۔

اب آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے ضمن میں اگر کوئی سوال یا اشکال ہو تو آپ پیش فرمائیں ، میں حاضر ہوں ۔

سوال و جواب

سوال : ڈاکٹر صاحب ! جو لوگ ایمان تو رکھتے ہیں لیکن اللہ کی راہ میں مال خرچ نہیں کرتے ۔ ایسے لوگوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ۔ ؟

جواب : یہ مضمون اصل میں ہمارے اس منتخب نصاب کے دوسرے سبق کے درس کے ضمن میں بڑی تفصیل سے زیر بحث آچکا ہے ۔ میں نے اس وقت قرآن مجید کے متعدد مقامات کے حوالہ سے یہ بات عرض کی تھی کہ قرآن مجید نیکی کا لازمی جزو اور اس کی لازمی شرط قرار دیتا ہے " اللہ کی راہ میں مال کا خرچ کرسکنا "۔ میں نے آج بھی اس آیت کا حوالہ دیا تھا : لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۔ جن لوگوں میں یہ وصف نہیں ہے ۔ وہ عابد ہو سکتے ہیں ، زاہد ہو سکتے ہیں ، وہ از روئے قرآن نیک قرار نہیں پا سکتے ۔ پھر قرآن مجید اہل ایمان کی سیرتوں کی تعمیر جس رخ پر کرنا چاہتا ہے اس میں انفاق فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ کی بڑی اہمیت ہے ۔

سوال : آپ نے پچھلے سبق کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس میں مانگنے والوں کو دینے کی ترغیب دی گئی ہے ۔ کیا اس طرح گداگری کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی ؟

جواب : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق ہمیں بڑی متوازن تعلیم دی ہے ۔ ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی شدت کے ساتھ مذمت فرمائی ہے اور آپ نے یہ فرمایا ہے کہ یہ انسان کے شرف اور اس کے مقام و مرتبہ سے فروتر ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے کسی انسان کے سامنے دست سوال دراز کرے ۔ جب مانگنا ہو ، اللہ سے مانگو ۔ حضور نے اس کو انتہا تک پہنچایا کہ فرمایا کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی درکار ہو تو اللہ سے مانگو ۔ البتہ دوسری طرف یہ تلقین بھی فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی صورت سے دوچار ہے اور ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو گیا ہے کہ وہ اپنی عزت نفس اپنی ہتھیلی پر رکھ کر آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہے ۔ تو اب یہ آپ کی مروت

و شرافت کے خلاف ہو گا آپ اسے دے سکتا ردیں۔ قرآن مجید بھی یہی تعلیم دیتا ہے: وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ اگر کچھ دے سکتے ہیں تو ضرور دیں، نہ دے سکتے ہوں تو نرمی سے معذرت کر دیں۔ موجودہ گداگری جس نے ایک پیشہ کی صورت اختیار کر لی ہے، اس کو ختم کرنا ایک حقیقی و واقعی اسلامی نظام کی ذمہ داری ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! بعض لوگ بُرے حالات کا شکار ہوتے ہیں مگر وہ کسی سے سوال نہیں کرتے تو کیا معاشرہ پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ ایسے لوگوں کا خیال رکھیں؟

جواب: یہ آپ نے بہت عمدہ سوال کیا ہے، یہ بہت ضروری بات ہے۔ اس کا جواب ایک جملہ میں تو یہ ہے کہ یقیناً یہ معاشرہ کا فرض ہے۔ ویسے میں آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ سورۂ بقرہ کے آخر میں یہ مضمون بڑی وضاحت کے ساتھ آیا ہے کہ آپ کے حسنِ سلوک کے سب سے زیادہ مستحق وہ لوگ ہیں کہ: لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۔ "جو لپٹ کر لوگوں سے سوال نہیں کرتے۔ جو ان کے پیچھے پڑ کر نہیں رہ جاتے"۔ بلکہ آپ کو خود انہیں پہچاننا ہو گا وہ خود دستِ سوال دراز نہیں کریں گے۔ چنانچہ جو الفاظِ مبارکہ آپ کو سنائے ہیں اس سے ماقبل فرمایا: تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ ۔ "ان کو تم پہچانو گے ان کی پیشانیوں سے، ان کے چہروں پر کوئی انداز ایسا ہو گا جس سے معلوم ہو جائے کہ انہیں کوئی احتیاج ہے۔ لیکن وہ زبان سے سوال کریں گے اور نہ اپنا ہاتھ پھیلائیں گے"۔ یہ لوگ زیادہ حقدار ہیں۔ ایسے لوگوں کو تلاش کر کے خود انسان ان تک اپنا مالی تعاون پہنچائے۔ یہ ہے اصل میں سب سے اعلیٰ مرتبہ کا انفاق۔

حضرات! آج سورہ مومنون کی ابتدائی آیات اور سورہ معارج کی ہم مضمون آیات کے حوالے سے تعمیرِ سیرتِ انسانی کے جس پروگرام پر ہم غور کر رہے ہیں، اس کے ضمن میں دو اور اوصاف ہمارے سامنے آئے۔ ایک اعراض عن اللغو اور دوسرے تزکیۂ نفس پر کاربند رہنے اور اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے اس کی راہ میں مسلسل اپنا مال خرچ کرتے رہنا۔ ہم اپنے دلوں میں ارادہ کریں اور اللہ سے توفیق طلب کریں کہ وہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرنے کی ہمت اور ان پر کاربند رہنے کی سعادت عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

فتحِ مُبین

از

فتحِ خیبر — فتحِ مکّہ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے

(ساتویں خطاب کی چوتھی و آخری قسط)

ترتیب و تسوید : جمیل الرحمٰن

فتحِ خیبر : یہود کی عسکری قوت کا جزیرہ نمائے عرب سے خاتمہ

آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ میں اپنی ایک تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ ہجرت کے نتیجہ میں مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کام فی الفور انجام دیئے تھے پہلا کام : اقامتِ صلوٰۃ کے لیے "مسجد نبوی" کی تعمیر۔ جو محض مسجد ہی نہیں تھی بلکہ اسے اسلامی انقلابی حکومت کے مرکز، ایوانِ حکومت نیز تربیت گاہ کا مقام بھی حاصل تھا۔ دوسرا کام : مہاجرین و انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں رشتۂ مواخات کا قائم کرنا اور تیسرا کام : یہود کے ان تین قبیلوں سے معاہدے جو مستقل طور پر مدینہ یا اس کے اطراف میں آباد تھے۔ اور انہوں نے بڑے مضبوط برج اور قلعے بنا رکھے تھے۔ اہلِ یثرب (مدینہ کا قدیم نام) پر یہود کا علمی رعب بھی بڑا زبردست تھا۔ چونکہ یہ اہلِ کتاب تھے۔ ان کے یہاں لکھنے پڑھنے کا بھی رواج تھا۔ تورات کا عربی ترجمہ بھی ان کے علماء اور احبار و رہبان کے پاس تھا۔ جس کی درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ پھر یہ کہ کافی مال دار اور صاحبِ ثروت تھے۔ تجارت پر ان کی ایک نوع کی اجارہ داری تھی۔ صناع بھی تھے اور زمیندار بھی۔ معاشی طور پر انہوں نے سودی قرضوں سے اہلِ یثرب کو جکڑ رکھا تھا۔ مزید یہ کہ یثرب میں انصار کے جو دو قبیلے تھے اوس و خزرج۔ ان میں بڑی ناچاقی

رہتی تھی۔ حتیٰ کہ باہم جنگ وجدال تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ ان کے مابین جو آخری معرکہ ہوا تھا وہ جنگ بعاث کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں دونوں قبیلوں کا زبردست جانی نقصان ہوا تھا اور اس جنگ نے دونوں قبیلوں کو کمزور کر دیا تھا۔ یہود اس مقصد کے پیش نظر کہ یہ دونوں قبیلے کبھی باہم متحد نہ ہو جائیں۔ ان کے درمیان اختلاف و افتراق کو ہوا دیتے رہتے تھے۔

یہود کے تین قبیلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے وقت وہاں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ حضورؐ نے مدینہ تشریف لاتے ہی انہیں ایک معاہدہ میں جکڑ لیا تھا[1]۔ اس معاہدے کی وجہ سے یہ قبیلے مسلمانوں کے مقابلہ میں کھلم کھلا نہیں آسکے لیکن پس پردہ ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے۔ فروغ اسلام اور انصار کے دونوں قبیلوں اور مہاجرین کو باہم شیر و شکر دیکھ دیکھ کر صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنا شروع ہوا۔ پھر شعبان ۲ھ میں تحویل قبلہ کے واقعہ نے ان یہودیوں کو سخت برہم کر دیا اور ان کی ناراضگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور اب وہ کھلم کھلا اسلام پر زبانِ طعن دراز کرنے اور انصار کو دینِ اسلام سے بدگمان اور برگشتہ کرنے کی مہم زور و شور سے چلانے لگے۔ اس سے قبل یہ وہ یہی رقابت کرتے رہتے تھے۔

بنو قینقاع کا معاملہ غزوۂ بدر کے متصلاً بعد شوال ۲ھ میں تو فوراً بنو قینقاع کے ساتھ معاملہ ہو گیا۔ یہ زرگر تھے۔ ان کے پاس اسلحہ جنگ

---

[1] ابن ہشام ؒ نے یہ پورا معاہدہ نقل کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔
۱۔ خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا اب بھی قائم رہے گا۔
۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی معاملات سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔
۳۔ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔
۴۔ یہود یا مسلمانوں کو کسی بیرونی فریق سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔
۵۔ کوئی فریق قریش کو امان نہیں دے گا۔
۶۔ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق ایک دوسرے کے شریک ہو کر جنگ کریں گے۔
۷۔ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی اس صلح میں شریک ہوگا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔
(مرتب)

بہت تھا۔ دوسرے یہودی قبیلوں کے مقابلہ میں یہ جری اور بہادر اور شجاع بھی تھے۔ اسلام
کی ترقی کو دیکھ کر وہ زیادہ دیر تک ضبط نہیں کر سکے۔ غزوہ بدر کے بعد انہوں نے حضورؐ کے
خلاف اقدام کیا اور جنگ کے اعلان کی جرأت کی۔ ہوا یہ کہ ایک انصاری کی نقاب پوش بیوی
ایک یہودی کی دوکان میں جو اس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا آئیں۔ یہودیوں نے ان کی بے حرمتی
کی۔ ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بے تاب ہو گیا۔ اور اس نے یہودی کو مار ڈالا۔ یہودیوں
نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو آپؐ
بنفس نفیس ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ "اللہ سے ڈرو، ایسا نہ ہو کہ بدر والوں کی طرح
تم بھی عذاب میں مبتلا کر دیئے جاؤ"۔ جواب میں یہودیوں نے کہا کہ "ہم قریش نہیں ہیں۔ ہم سے معاملہ
پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے۔ اور ایسا ہی ہے تو ہم اعلان جنگ کرتے ہیں۔
دنیا دیکھ لے گی کہ بہادر کون ہے!" اس طرح ان کی طرف سے نقض عہد اور اعلان جنگ ہو گیا۔
مجبور ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر چڑھائی کی۔ وہ قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ دن تک
محاصرہ رہا۔ بالآخر وہ اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ کریں گے انہیں
قبول ہوگا۔ حضورؐ نے نرمی اور رأفت سے کام لیا اور فیصلہ فرما دیا کہ وہ اونٹوں پر جتنا سامان لے
جا سکتے ہیں لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں۔ وہ اب مدینہ میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ وہ اپنا زیادہ سے
زیادہ مال و اسباب لے کر جلا وطن ہو گئے اور ایک روایت کے مطابق ان میں سے کچھ لوگ خیبر میں
جا کر آباد ہو گئے جو مدینہ سے دو سو میل شمال کی طرف یہودیوں کا ایک بہت مضبوط گڑھ تھا۔
یہ بڑا سرسبز اور زرخیز علاقہ بھی تھا۔

بنو نضیر کا معاملہ غزوہ احد کے بعد اسی نوع کا معاملہ ربیع الاول ۴ھ میں بنو نضیر کے
ساتھ ہو گیا۔ یہ قبیلہ عرب کے ایک مضبوط قبیلہ "طے" کا حلیف تھا۔ چونکہ
ان کے سردار نے جو قبیلہ طے سے تھا اس یہودی قبیلہ کے مقتدا ابو رافع کی لڑکی سے شادی کی تھی۔
ابو رافع کا لقب تاجر الحجاز تھا۔ چونکہ وہ بڑا مالدار تھا۔ کعب ابن اشرف کا بیٹا اور ابو رافع
کا نواسہ تھا۔ اس دو طرفہ رشتہ داری کی وجہ سے اس کا یہود اور عرب سے برابر کا تعلق تھا۔
وہ قادر الکلام شاعر تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا اثر گہرا تھا۔ کعب کو اسلام سے سخت عداوت
تھی۔ غزوہ بدر میں قریش کے سرداروں کے قتل ہونے کا اسے نہایت صدمہ تھا۔ یہ مکہ گیا اور

مقتولین بدر کے پُر دَرد مرثیے پڑھے جن میں انتقام کی ترغیب تھی ۔ وہ یہ مرثیے بڑے سوز کے سا
پڑھتا ۔ خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا ۔ الغرض مدینہ پر قریش کو انتقامی طور پر چڑھائی
کرنے کی ترغیب میں اس نے نہایت مؤثر کردار ادا کیا تھا ۔ پھر جب مدینہ واپس آیا تو نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہجو کے اشعار کہنے لگا اور یہودیوں کو اسلام کے خلاف بھڑکانے
لگا ۔ اپنی دولت مندی کے بل پر منافقین کو اپنا ہم خیال بنانے لگا ۔ اور ضعیف الایمان لوگوں
اثر انداز ہونے لگا ۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے پروگرام بنایا کہ چپکے سے نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کو قتل کرا دے ۔ چنانچہ ایک روز آپؐ کو دعوت میں بلایا اور اپنے چند لوگوں کو مقرر کر
کر دہ یکبارگی حملہ کر کے حضورؐ کو شہید کر دیں ۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اپنے نبی صلی
کو مطلع فرما دیا ۔ اس کی فتنہ انگیزی کو دیکھ کر حضرت محمدؓ ابن مسلمہ نے اسکو قتل کر دیا ۔ اس واقعہ
بنو نضیر میں غیض و غضب مزید بھڑکا دیا ۔

مزید برآں وادی نخلہ میں قبیلۂ عامر کے جو دو اشخاص قتل ہوئے تھے ان کا خون بہا
یک واجب الادا تھا ۔ اس کا ایک حصہ معاہدے کی رُو سے یہود کے قبیلے بنی نضیر پر باقی تھا ۔
کے مطالبہ کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے ۔ انہوں نے
سی ردّ و قدح کے بعد بظاہر مان لیا لیکن در پردہ ایک شخص کو مقرر کر رکھا تھا کہ چپکے سے بالا خا
سے حضورؐ پر پتھر گرا دے ۔ چونکہ حضورؐ بالا خانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے گفتگو فرما رہے تھے
حضورؐ کو اس سازش کا علم ہو گیا ۔ اور آپؐ فوراً مدینہ واپس چلے آئے ۔

ادھر قریش کی جانب سے بنو نضیر کے پاس پیغام پر پیغام آ رہے تھے کہ تم نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کو قتل کر دو ۔ ورنہ ہمیں جب بھی موقع ملا جو ضرور مل کر رہے گا تو ہم تمہارے پورے قبیلہ
کو تہ تیغ کر دیں گے ۔ ادھر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید کا فروغ دیکھ کر انگاروں
پر لوٹ رہے تھے ۔ انہوں نے ایک سازش کے تحت نبی اکرمؐ کو پیغام بھیجا کہ آپؐ اپنے تیس
اصحاب کو ساتھ لے کر آئیں ہم بھی اپنے علماء و احبار کو جمع کر رکھیں گے ۔ آپؐ کی دعوت اور آپؐ
نازل شدہ کلام الٰہی سن کر ہمارے علماء تصدیق کر دیں گے تو ہم اسلام قبول کر لیں گے ۔ لیکن آنحضرت
کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک نیا معاہدہ لکھ کر نہ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا لیکن بنو نضیر
آمادہ نہیں ہوئے ۔

اسی دوران آپؐ بنو قریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کے

پیش کی۔ انہوں نے تعمیل کر دی۔ اب بنو نضیر کے سامنے گویا ایک نظیر موجود تھی لیکن اس کے باوجود وہ کسی طرح دوبارہ معاہدہ کے لئے آمادہ نہیں ہوئے۔ آخر کار انہوں نے پیغام بھیجا کہ آپؐ تین آدمی لے کر آئیں۔ ہم بھی اپنے تین عالم لے کر آتے ہیں۔ کوئی درمیانی جگہ جمع ہوتے ہیں۔ یہ علماء اگر آپؐ پر ایمان لے آئے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ آپؐ اس کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن اثنائے راہ ہی میں آپؐ کو صحیح ذریعہ سے اطلاع مل گئی کہ بنو نضیر نے خفیہ طور پر یہ انتظام کر رکھا ہے کہ آپؐ جب مقررہ مقام پر پہنچیں تو یکبارگی اور اچانک حملہ کر کے آپؐ کو شہید کر دیں۔ چنانچہ یہ اطلاع ملنے کے بعد حضورؐ راستہ ہی سے واپس چلے گئے۔ آپؐ نے پھر ان کو پیغام بھیجا کہ یا تو تجدید معاہدہ کر لو یا اپنے سرکردہ علماء کو لے کر میرے پاس آجاؤ۔ لیکن بنو نضیر نے صاف انکار کر دیا۔ انکی اس سرکشی کے مختلف اسباب تھے۔ وہ دو مضبوط قلعوں میں پناہ گزین تھے جہاں اجناس، پانی اور اسلحہ کا وافر ذخیرہ تھا۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ عبد اللہ بن ابی نے انہیں کہلا بھیجا تھا کہ ہم (یعنی منافقین) اور بنو قریظہ تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ لہٰذا تم اطاعت نہ کرنا۔ اس صورت حال کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زیادہ مہلت دینی مناسب نہیں سمجھی اور ان کے قلعوں پر چڑھائی کر دی۔ پندرہ دن تک محاصرہ جاری رہا۔ بنی نضیر اس انتظار میں رہے کہ عبد اللہ ابن ابی اور بنو قریظہ اپنے وعدہ کو وفا کریں گے لیکن دونوں فریق دم سادھے تماشہ دیکھتے رہے۔ بالآخر بنو قریظہ نے یہ پیش کش کی کہ ہمارے ساتھ بھی بنو قینقاع والا معاملہ کیا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رافت و رحمت نے یہ پیش کش منظور فرمائی۔ بنو نضیر اپنی گڑھیوں سے اس شان سے نکلے کہ جشن کا گمان ہوتا تھا۔ عورتیں دف بجاتی اور گاتی جاتی تھیں۔ الغرض ان کے قبیلہ کے اکثر لوگ بھی خیبر جا کر آباد ہو گئے۔ ان کے دو معزز رؤسا کا خیبر والوں نے اتنا احترام کیا کہ انہیں خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا۔ یہ واقعہ درحقیقت غزوۂ خیبر کا دیباچہ ہے۔

بنو قریظہ کا معاملہ

اب مدینہ میں یہود کا صرف ایک قبیلہ بنو قریظہ باقی رہ گیا تھا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جو ذوقعدہ ۵ھ میں وقوع پذیر ہوا اس قبیلہ نے غداری کی۔ بنو نضیر کے سرداروں نے خیبر میں بیٹھ کر قریش اور مدینہ کے اطراف کے غیر مسلم قبائل سے سازباز کی اور ان کو اپنے تعاون کا یقین دلایا جس کے نتیجہ میں بارہ ہزار کا لشکر جرار تین طرف سے مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر چڑھ دوڑا۔ اس سے بڑا لشکر عرب کی تاریخ میں اس سے

پہلے شاید ہی کبھی ترتیب پایا ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورے سے جبل احد کے مشرقی اور مغربی گوشوں میں خندق کھدوا کر مدافعانہ جنگ کے انتظامات فرمائے تھے۔ چونکہ مدینہ کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ صرف ان اطراف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ کفار و مشرکین اس طریق دفاع سے نا آشنا تھے۔ ناچار انہیں شدید جاڑے کے موسم میں ایک طویل محاصرہ پہ مجبور ہونا پڑا۔ اب ان کے لیے ایک ہی چارہ کار رہ گیا تھا کہ وہ بنو قریظہ کو مدینہ پر جنوب مشرقی گوشے سے حملہ پر آمادہ کریں۔ بنو نضیر کے سرداروں نے بنو قریظہ کو نقض عہد پر آمادہ کر لیا۔ اور وہ پشت سے حملہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت حال سے بے خبر نہیں تھے۔ پھر منافقین کا گروہ بھی مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے لیے یہ افواہیں پھیلا رہا تھا کہ بنو قریظہ کی طرف سے حملہ ہوا ہی چاہتا ہے جس کی زد میں پہلے ہماری عورتیں اور بچے آئیں گے جو شہر میں انہی بنو قریظہ کی گڑھیوں کے قریب پناہ گزین تھے۔ نبی اکرمؐ نے دو انصارؓ کو بنی قریظہ کے عزائم معلوم کرنے اور ان کو سمجھانے کے لیے بھیجا۔ بنو قریظہ نے ان سے صاف کہدیا کہ لا عقد بیننا و بین محمد۔ یعنی وہ عہد، خلاص ــــ مزید کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بڑے گستاخ کلمات کہے۔ وہ تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ قبیلہ غطفان کے ایک صاحب نعیم ابن مسعود نے اسلام قبول کر رکھا تھا لیکن انہوں نے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا ہوا تھا اور وہ قبیلہ غطفان کی طرف سے ان کے لشکر میں شریک تھے۔ انہوں نے ایک ایسی تدبیر کی کہ بنو قریظہ اور قریش کے درمیان ایک نوع کی بدگمانی پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے بنو قریظہ غداری کے لیے اپنی تمام تیاریوں کے باوجود تذبذب میں رہے اور کوئی اقدام نہ کر سکے۔ اسی دوران اللہ کی مدد ایک زوردار آندھی کی صورت میں ایک رات نازل ہوئی اور قریش اور ان کے حلیفوں کے خیموں اور پڑاؤ کو تہس نہس کر ڈالا۔ نتیجۃً صبح ہوتے ہی تمام لشکر منتشر ہو گیا اور تمام قبائل بے نیل و مرام اپنے اپنے مستقروں پر واپس چلے گئے۔

لشکروں کی واپسی کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی ہتھیار کھول ہی رہے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کے رسولؐ آپؐ ہتھیار اتار رہے ہیں اور ہم نے ابھی تک ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔ للہٰذا آپؐ فوراً تشریف لے جا کر بنو قریظہ کے معاملے کو نمٹا دیجئے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ بنو قریظہ کو کیفر کردار تک

چھنا جائے۔ لہٰذا اسی وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی بھی مسلمان ہتھیار نہ کھولے۔ سب کے سب جلد از جلد بنو قریظہ کی بستی پہنچیں اور کوئی بھی عصر کی نماز وہاں پہنچنے سے قبل نہ پڑھے۔

بنو قریظہ کا انجام

بنو قریظہ کے قلعے بڑے مضبوط تھے۔ قریباً ایک ماہ محاصرہ جاری رہا۔ اس سے تنگ آکر آخر انہوں نے از خود اس شرط پر ہتھیار ڈالنے اور خود کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ ان کے معاملے میں قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعدؓ ابن معاذ کو حکم بنایا جائے۔ وہ جو بھی فیصلہ کریں گے تسلیم کر لیا جائے گا۔ قبیلۂ اوس ان کا حلیف رہا تھا اور اُن کے مابین مدتوں سے خوشگوار تعلقات چلے آرہے تھے۔ لہٰذا ان کو توقع تھی کہ حضرت سعدؓ ابن معاذ ان کا لحاظ کریں گے۔ حضرت سعدؓ ابن معاذ کو، جو غزوہ احزاب میں ایک تیر لگنے کی وجہ سے شدید زخمی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انؓ کے علاج معالجہ کے لئے مسجد نبوی میں ایک خیمہ لگوا رکھا تھا اور خود اُنؓ کے زخم کو اپنے دست مبارک سے داغا تھا، ایک ڈولی میں بنی قریظہ کی بستی میں لایا گیا۔ حضرت سعدؓ ابن معاذ نے عین یہود کی شریعت کے مطابق یہ فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے لڑنے کے قابل تمام مرد قتل کئے جائیں۔ عورتیں و بچے اور دیگر مردوں کو غلام بنایا جائے اور ان کے مال و اسباب کو مال غنیمت قرار دیا جائے۔[1] چنانچہ اس فیصلے کے مطابق ان کے کئی سو جوان قتل کئے گئے۔ اور عورتوں بچوں اور دیگر عمر رسیدہ مردوں کو غلام بنا لیا گیا۔ ان کا مال و اسباب مالِ غنیمت قرار دیا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تم نے آسمانی فیصلہ کیا۔ یہ تورات کے حکم کی طرف اشارہ تھا۔ اگر یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حَکم تسلیم کر لیتے اور اپنا معاملہ آپؐ کے ہاتھ میں دیدیتے تو یقیناً آپؐ اپنی رافت و رحمت کی وجہ سے وہی فیصلہ فرماتے جو بنو قینقاع اور بنو نضیر کے حق میں

---

[1] تورات کتاب تثنیہ اصحاح ۲۰، آیت ۱۰ میں ہے۔

"جب کسی شہر پر حملہ کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے۔ لیکن اگر صلح نہ کریں تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لئے مالِ غنیمت ہوں گے۔" (مرتب)

فرمایا تھا۔ لیکن مشیت الٰہی یہی تھی۔ لہٰذا ان کی مت ماری گئی۔ اور انہوں نے حضورؐ جیسے رؤف و رحیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عدم اعتماد کیا چنانچہ حیی ابن اخطب کے جو ان تمام فتن کا باعث تھ جو آخری الفاظ کتب سیرت مطہرہ میں ملتے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے کہ " لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل م کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ایک حکم الٰہی تھا۔ یہ لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک سزا تھی جو خدا نے بنو اسرائیل پر لکھ دی تھی ! حیات طیبہ کے دوران اجتماعی قتل اور سخت ترین سزا کا یہی ایک واقعہ ہوا ہے جو بنو قریظہ کے سات

فتح خیبر خیبر پہلے ہی عرب میں یہود کا مضبوط ترین گڑھ تھا۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر کے بہت سے لوگ وہیں مقیم ہوئے۔ اس طرح ان کی قوت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ غزوہ احزاب کے موقع پر قریش اور دوسرے عرب قبائل کا اتنی بڑی تعداد میں مدینہ پر چڑھالانے میں خیبر کے یہودی سر کا سب سے زیادہ عمل دخل تھا۔ بارہ ہزار کے لشکر میں کم و بیش دو ہزار یہودی بھی شامل تھے۔ پھر بنو قر کو نقض عہد اور پشت سے مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے لئے آمادہ کرنے میں بھی انہی یہود سرداروں کی کوششوں کا ہاتھ تھا۔ الغرض عرب کے قبائل خصوصاً قریش کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنے میں خیبر ہی کے سرداران یہود پیش پیش رہتے تھے۔

جب ذو قعدہ ۶ھ میں قریش سے حدیبیہ کے مقام پر دس سال کے لئے صلح ہو گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو ۶ھ کے آخر میں جزیرہ نمائے عرب آپؐ نے یہود کی اس طاقت کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ فرمایا جو خیبر کے مقام پر مجتمع ہو گئی تھی قبیلہ غطفان جس کا شمار بھی عرب کے مضبوط قبائل میں ہوتا تھا۔ ان کی آبادی خیبر سے متصل واقع اور یہ کافی عرصہ سے خیبر کے یہود کے حلیف تھے۔ خیبر کے رئیس ابورافع سلام نے جو بنو نضیر سے تعلق رکھتا تھا لیکن بہت بڑا تاجر اور صاحب ثروت ہونے کے باعث خیبر کی سرداری پر فائز تھا ۵ھ میں خود جا جا کر قبیلہ غطفان اور آس پاس کے قبائل کو متحد ہو کر اسلام کے خلاف اقد لئے تیار کر لیا تھا اور ایک عظیم لشکر لے کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر لی تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ کو یہ تمام خبریں مل رہی تھیں۔ رمضان ۶ھ میں ابورافع سلام ایک خزرجی انصاری کے ہاتھ قتل ہوا۔ اس کے بعد اُسیر نامی خیبر کا ایک یہودی خیبر کی مسند سرداری پر فائز ہوا۔ اس نے ابورافع سلام کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے پوری تیاری کر لی۔ پھر مدینہ کے منافقین بھی خیبر کو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے تھے اور ان کو ہمت دلاتے تھے کہ مسلمان تمہاری فوجوں کے ٹھہر نہیں سکیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوشش فرمائی کہ کوئی معاہدہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے صلح
حدیبیہ سے پہلے اور بعد میں بھی کئی سفارتیں خیبر کے یہود کے پاس بھیجیں لیکن وہ اپنے ارادوں
سے باز نہیں آئے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے چھاپہ مار دستے آتے اور مدینہ کے باہر متفرق چھوٹی
چھوٹی آبادیوں پر تاخت کرتے اور غارت گری کے بعد بھاگ جاتے۔ بالآخر نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم نے ان کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے مقصد کے پیش نظر ذی الحجہ ۶ھ میں
مسلمانوں کے ایک لشکر کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ فرمایا۔ لیکن خیبر کا معرکہ ۷ھ کے اوائل میں پیش
آیا۔ اس غزوہ نے کافی طول کھینچا۔ یہود کی بڑی قوت تھی۔ یکے بعد دیگرے ان کے بڑے مضبوط
قلعے تھے۔ ہر قلعہ پر زبردست جنگ ہوئی۔ آخری مضبوط ترین قلعہ (قموص) حضرت علی رضی اللہ
تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ یہود کے بڑے بڑے سرداران معرکوں میں مارے جا چکے تھے۔
چنانچہ انہوں نے کامل شکست تسلیم کر لی۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب سے یہود کی عسکری قوت
کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کر لیا گیا لیکن یہود کی درخواست پر زمین ان کے قبضہ میں
اس شرط کے ساتھ رہنے دی گئی کہ وہ پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کیا کریں گے۔ جب
بٹائی کا وقت آتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس صحابیؓ کو بھیجتے تھے وہ آ کر غلہ کو دو برابر حصوں
میں تقسیم کر کے یہود سے کہا کرتے تھے کہ انتخاب کا حق تمہیں حاصل ہے جو حصہ چاہو تم لے لو۔ یہود
اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ "زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہیں"۔ غزوۂ خیبر وہ پہلا غزوہ ہے
جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے۔ گویا صلح حدیبیہ اور یہود کا رعیت کی حیثیت قبول کرنا اس بات
کی علامات میں شامل ہیں کہ اسلامی طرزِ حکومت کی بنیاد بھی قائم ہو گئی اور اس کا عملی ظہور بھی شروع ہو گیا۔
— حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کے آغاز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم مرضِ وفات میں وصیت فرما گئے تھے کہ یہود جزیرہ نمائے عرب میں رہنے نہ پائیں۔ حضرت
ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کذابانِ نبوت اور مانعینِ زکوٰۃ اور فتنۂ ارتداد سے کامل طور پر نمٹنے
میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس معاملہ کی طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اگرچہ خلافتِ صدیقی
کے دور ہی میں یہ تمام فتن ختم ہو چکے تھے۔ لیکن ساتھ ہی توحید کی اس انقلابی دعوت کی توسیع کے عمل
کا بیرونِ ملکِ عرب آغاز ہو چکا تھا قیصر و کسریٰ سے باقاعدہ لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ چنانچہ یہود کے

جزیرہ نمائے عرب سے مکمل اخراج کا معاملہ دورِ خلافتِ صدیقی کے بجائے دورِ خلافت فاروقی کے آغاز میں شروع ہوا اور قلیل عرصہ میں تمام یہود جزیرہ نمائے عرب سے جلاوطن کر دیئے گئے۔ ان کو کامل آزادی دی گئی کہ وہ اپنا جملہ منقولہ ساز و سامان ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوئی۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب یہود جیسی سازشی قوم سے خالی ہو گیا۔

اب آیئے پھر قریش کے معاملے کی طرف۔ میں نے عرض کیا تھا کہ صلح حدیبیہ فتح مکہ کی تمہید تھی۔ اس صلح کی بدولت قریباً دو سال تک قریش اور اہلِ ایمان کے مابین امن رہا۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے شہروں میں آتے جاتے رہے۔ روابط قائم ہوئے اور کفار و مشرکینِ قریش اہلِ ایمان کی پاکیزہ سیرت و کردار سے متاثر ہوتے رہے۔ اس دوران اسلام کو نہایت فروغ حاصل ہوا۔ صلح حدیبیہ کے بعد ہی حضرت خالد ابن ولید اور حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے شجاع ایمان لائے کہ میں اس سے قبل آپ کو بتا چکا ہوں۔

بنو خزاعہ پر بنو بکر کی تاخت میں یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس صلح کے موقع پر ہی بنو خزاعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بن گئے تھے اور ان کے حریف بنو بکر قریش کے حلیف ہو گئے تھے۔ ان دونوں میں مدت سے عداوت چلی آ رہی تھی اور ان کے مابین لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اسلام کے ظہور نے عرب کا دھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں۔ صلح حدیبیہ کے باعث قریش اور مسلمانوں کے درمیان امن قائم ہو گیا تو بنو بکر نے یہ سوچا کہ بنو خزاعہ سے اب انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے صلح کے قریباً دو سال بعد دفعتہً بنو خزاعہ پر حملہ کیا۔ روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ قریش کے چند بڑے بڑے سرداروں نے بھی صورتیں اور بھیس بدل کر بنو بکر کا ساتھ دیا اور اس طرح اس حملے کے نتیجہ میں بنو خزاعہ کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ بنو خزاعہ نے حرم میں پناہ لی لیکن بنو بکر کے رئیس کے اکسانے پر وہاں بھی انہیں نہیں چھوڑا اور عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

بنو خزاعہ کی دربارِ نبوی میں فریاد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں رونق افروز تھے کہ خزاعہ کے چالیس افراد فریاد کرتے اور دہائی دیتے ہوئے وہاں پہنچے کہ ہمارے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے۔ اب صلح حدیبیہ کی رو سے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اس کے پابند ہیں کہ ہمارا بدلہ بنو بکر اور قریش سے لیں[1]۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

یہ واقعات سن کر سخت رنج ہوا۔ تاہم حضورؐ نے قریش پر حجت قائم کرنے کے لئے ان کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں۔ پہلی یہ کہ مقتولوں کا خون بہا ادا کرو۔ دوسری یہ کہ اگر تم اس کے لئے تیار نہیں ہو تو بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جاؤ تاکہ ہم بنو خزاعہ کے ساتھ مل کر بنو بکر سے بدلہ لے لیں۔ تیسری یہ کہ اگر یہ بھی منظور نہیں ہے تو اعلان کر دو کہ صلح حدیبیہ ختم ہو گئی۔

قریش کا ردعمل قریش کے جو مشتعل اور جنگ پسند لوگ (Hawks) تھے، انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی زبانی آپؐ کی شرائط سنتے ہی فوراً جواب دیا کہ ہمیں تو صرف تیسری شرط منظور ہے۔ بس آج سے صلح حدیبیہ ختم۔ حضورؐ کے ایلچی تو یہ جواب سن کر مدینہ واپس چلے گئے۔ لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد ان کے جو مدبر اور صلح پسند لوگ (Doves) تھے، ان کو خوب اندازہ تھا کہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت کتنی ہے! اور قریش کا حال کیا ہے! ان کی پختہ رائے یہ تھی کہ قریش کسی صورت میں بھی اب اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر سکیں۔ اس وقت ابوسفیان کو قریش کے سردار کی حیثیت حاصل تھی ــ اور میں اپنی ان تقاریر میں شروع ہی سے حسبِ موقع آپ حضرات کو یہ بات نوٹ کراتا رہا ہوں کہ وہ بہت حقیقت پسند انسان تھے۔ جذباتی نہیں تھے، مشتعل مزاج نہیں تھے بلکہ ایک ایسے مدبر انسان تھے کہ جو حقیقی صورتِ حال سامنے ہو اس کے مالہٗ و ماعلیہ کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ چند جوشیلے لوگوں سے جذبات میں آکر بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ اگر ہم نے صلح حدیبیہ کی تجدید نہ کرائی تو پھر قریش کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہو گی۔ چنانچہ وہ خود چل کر صلح کی تجدید کرانے کی غرض سے مدینہ پہنچے اور وہاں پہنچ کر،

ــــــــ حاشیہ صفحہ گذشتہ ــــــــ

ے طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ اس وفد کے قائد کا نام عمرو بن سالم تھا اور اس نے ان الفاظ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فریاد پیش کی تھی۔

لاھُمّ انی شاھد محمدًا	اے اللہ! میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو
حلف ابینا وابیہ الا تلدا	وہ وعدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور
نا نصر رسول اللہ نصرًا عتدًا	ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے۔ اے
وادع عباد اللہ یاتوا مددًا	اللہ کے رسولؐ ہماری اعانت کیجئے اور اللہ
	کے بندوں کو پکارئیے۔ سب مدد کے لئے حاضر ہوں گے۔ (مرتب)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تجدید صلح کی درخواست کی لیکن بارگاہ رسالت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اب ان کو کوئی ایسی سفارش درکار تھی جو تجدید کی کوشش میں ان کی معاون ہو۔ انہوں نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بیچ میں ڈالنا چاہا لیکن دونوں نے کانوں پر ہاتھ دھرا۔ پھر وہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں آئے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت پانچ برس کی تھی۔ انہوں نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ بچہ اپنی زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرادیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا۔ اور اس بچہ کے یہ کہہ دینے سے نہ معلوم کتنی جانیں بچ جائیں گی۔ جناب سیدہؓ نے فرمایا "بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل"۔ اب یہ واقعہ نوٹ کیجیے جو بہت عجیب واقعہ ہے ــــ کہ بالآخر ابوسفیان ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنی صاحبزادی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس پہنچے۔ حضرت ام حبیبہؓ سابقون الاولون میں سے تھیں اور مہاجرین حبشہ میں سے تھیں۔ جہاں وہؓ اپنے شوہر کے ساتھ گئی تھیں۔ وہ بھی ایمان لاچکے تھے۔ وہ شراب کے نہایت رسیا تھے۔ بہر حال حبشہ جاکر مرتد ہو گئے اور عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ لہٰذا ام حبیبہؓ ان کے عقد نکاح سے آزاد ہو گئیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ اطلاع ملی تو آپ نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور نجاشیؓ نے حضور کے وکیل کی حیثیت سے نکاح پڑھایا تھا۔ بعدہ وہ ام المومنینؓ کی حیثیت سے مدینہ منورہ تشریف لے آئی تھیں۔ اب ابوسفیان کی صاحبزادی حضرت ام سلمہؓ کے حرم میں تھیں ــــ باپ بیٹی کے پاس پہنچتا ہے تاکہ بیٹی۔ یہ سفارش کرائے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب وہ انؓ کے حجرے میں داخل ہوئے تو وہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر بچھا ہوا تھا وہ اس پر بیٹھنے لگے تو حضرت ام حبیبہؓ نے فرمایا۔ "ابا جان ذرا ٹھہریئے" پھر بستر تہہ کر کے کہا کہ اب تشریف رکھئے۔ اب یہ قریش کا سردار ابوسفیان، نہایت مدبر انسان! ــــ انہوں نے فوراً سوال کیا کہ بیٹی! یہ بستر میرے لائق نہ تھا یا میں اس بستر کے لائق نہیں ہوں۔ بیٹی کہتی ہیں۔ ابا جان آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں۔ یہ بستر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور آپ مشرک ہیں، نجس ہیں آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتے ــــــ میں کہا کرتا ہوں کہ ابوسفیان اس بات سے جتنے خفیف اور خجل ہوئے ہوں گے اور انہوں نے کتنی سبکی محسوس کی ہوگی! اس کا ہر شخص اپنے طور پر کچھ نہ کچھ اندازہ لگا سکتا ہے۔ اب انہیں سفارش کا کہاں حوصلہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مزید کچھ کہے بغیر مایوس ہو کر واپس ہوئے۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے کہا کہ میں نبی اکرمؐ سے تو کچھ عرض کرنے کی جرأت

نہیں کر سکتا لیکن میں تمہیں یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ مسجد نبوی میں جا کر یہ اعلان کر دو کہ میں نے قریش کے سردار کی حیثیت سے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔ چنانچہ ابوسفیان نے حضرت علیؓ کے ایما پر ایسا ہی کیا اور مسجد نبوی میں جا کر تجدید صلح کا یکطرفہ اعلان کر دیا کہ میں قریش کا سردار ابوسفیان صلح حدیبیہ کی تجدید کرتا ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا لیکن یہ اعلان کر کے وہ فوراً مکہ واپس روانہ ہو گئے ــــــ مکہ پہنچے۔ لوگوں نے پوچھا کیا کر کے آئے ہو! انہوں نے تفصیل بتائی۔ لوگوں نے کہا کہ ہم نہ اسے تجدید صلح سمجھ سکتے ہیں کہ آرام سے سوئیں۔ نہ جنگ سمجھ سکتے ہیں کہ تیاری کریں۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

نبی اکرمؐ کی طرف سے تیاریاں اور ایک بدری صحابیؓ کی غلطی!!!

ادھر مکہ والے شش و پنج میں تھے کہ ابوسفیان جو کچھ کر کے آئے ہیں، اسے کیا سمجھا جائے ــ!! ادھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں تیاریاں کرنے کا حکم دے دیا اور اپنے حلیف قبائل کے پاس قاصد بھیج دیئے کہ تیار ہو کر مدینہ آ جائیں۔ لیکن یہ احتیاط کی گئی کہ یہ اعلان نہیں فرمایا کہ مکہ کا قصد ہے۔ آپؐ نے یہ بات بالکل مخفی رکھی کہ کدھر جانا ہے! لیکن ایک معزز صحابی حضرت حاطب ابن ابی بلتعہ رضؓ سے اس وقت ایک خطا ہو گئی ــ ان کے اہل و عیال اس وقت تک مکہ میں تھے۔ انہوں رضؓ نے اندازہ کر لیا کہ حضورؐ کا ارادہ مبارک مکہ پر چڑھائی کا ہے۔ انہیں خوف لاحق ہوا کہ اب مکہ میں جو خون ریزی ہو گی تو وہاں میرے اہل و عیال کو بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ اللہ جانے ان کا کیا حال ہو گا۔ چونکہ قریش سب سے پہلے تو مکہ میں جو مسلمان ہیں یا ہجرت کرنے والوں کے جو اہل و عیال ہیں ان ہی کو ختم کریں گے۔ ان اندیشوں کے پیش نظر انہوں نے مخفی طور پر قریش پر احسان دھرنے کے لئے ایک خط لکھا جس میں یہ خبر تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے ہیں اور حضورؐ جلد ہی مکہ کی طرف کوچ کرنے والے ہیں۔ انہوں نے یہ خط ایک عورت کے حوالے کیا کہ وہ خفیہ طور پر مکہ جا کر یہ خط سرداران قریش کو پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کو وحی کے ذریعے یہ خبر دے دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ اور ان کے ساتھ دو صحابہؓ کو بھیجا کہ جاؤ ایک عورت فلاں مقام پر ہے، اس کے پاس ایک رقعہ ہے اسے لے کر آ جاؤ۔ یہ حضراتؓ وہاں پہنچے۔ وہ عورت سمجھ گئی اور اس نے صاف انکار کر دیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے، ممکن نہیں ہے کہ تمہارے پاس کوئی خط نہ ہو، اگر تم نہیں دو گی تو میں تمہیں برہنہ کر کے تلاشی لوں گا۔ یہ دھمکی سن کر اس نے بالوں کی چٹیا سے خط نکال کر پیش کر دیا۔ یہ خط اور اس عورت کو لے کر حضرت علی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خط سن کر تمام صحابہؓ کو حضرت حاطبؓ کی جانب سے افشائے راز پر حیرت بھی ہوئی، رنج بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلال میں آکر بیتاب ہو گئے۔ اور انہوںؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ آپؐ مجھے اجازت دیجئے کہ میں حاطبؓ کی گردن اڑا دوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے عمرؓ! جانتے نہیں ہو کہ یہ بدری ہیں اور اللہ تعالیٰ اہل بدر کو مخاطب کر کے فرما چکا ہے کہ تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ان کی خطائیں معاف کر چکا۔ غلطی ضرور ہوئی ہے لیکن اس پر کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ حضرت حاطبؓ نے بھی عرض کیا کہ حضورؐ! مجھ سے اس اندیشہ کے سبب سے یہ خطا ہو گئی ہے، جس پر میں نادم بھی ہوں اور توبہ بھی کرتا ہوں۔ چنانچہ آپؐ نے ان کو معاف کر دیا گیا۔

مکہ کی طرف کوچ

بہرحال اب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف روانہ ہوئے ہیں تو دس ہزار قدسیوں کا لشکر حضورؐ کے ہمرکاب تھا۔ یہ رمضان ۸ھ ہے۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ واقعۂ ہجرت کو دس برس اور مسلح تصادم (Armed Conflict) کے مرحلے کو شروع ہوئے صرف چھ سال بیتے ہیں۔ یوں تو سیرت مطہرہ میں بہت سے غزوات اور سرایا کا ذکر ملتا ہے لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ان تمام جنگوں میں جانی نقصان چند سو سے زیادہ نہیں ہوا۔ کفار کی طرف سے جو لوگ قتل ہوئے اور مسلمانوں کی طرف سے جو شہید ہوئے ان کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اگرچہ کئی بار خوں ریزی ہوئی، لیکن اگر اموات (CASUALITIES) کی گنتی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک غیر خونی BLOODLESS انقلاب تھا۔ سب سے زیادہ خون ریزی اگر ہو سکتی تو فتح مکہ کے وقت ہوتی۔ اس لئے کہ جو خون کے پیاسے تھے، جو جانی دشمن تھے، وہ سب کے سب مکہ میں موجود تھے۔ ان میں وہ شخص بھی تھا جس کے دھوکے سے پھینکے ہوئے برچھے سے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے تھے یعنی وحشی۔ ان میں وہ خاتون بھی تھیں یعنی ہندہ بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان کہ جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ کا مثلہ بھی کرایا تھا اور پھر یہ کہ سید الشہداء کا کلیجہ چبانے کی کوشش بھی کی تھی۔ تو اس وقت مکہ والوں کو یہ اندیشے لاحق تھے کہ اب کیا ہوگا!

ان پر شدید خوف اور اضطراب طاری تھا۔

ابوسفیان ایمان لاتے ہیں

دس ہزار قدسیوں اور جان نثاروں کے جلو میں جب کوکب نبویؐ نہایت عظمت و شان کے ساتھ مکہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہوا تو تحقیق کے لئے قریش کی طرف سے ابوسفیان، حکیم ابن حزام (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) اور بدیل ابن ورقہ چھپ چھپا کر اہل ایمان کے لشکر تک پہنچے۔ ابوسفیان کو مسلمانوں نے پہچان لیا اور گرفتار کر کے دربار رسالت میں پیش کئے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خیمہ میں آ کر عرض کیا کہ اس عدو اللہ و عدو رسولہ کو قتل کا حکم دیجئے تاکہ کفر کے بالکلیہ استیصال کا آغاز ہو جائے۔ حضرت عباس ابن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جان بخشی کی درخواست کی ــــ ابوسفیان کے پچھلے تمام کارنامے، ان کی اسلام دشمنی سب کے سامنے تھی۔ ان کا ایک ایک فعل ان کے قتل کا دعویدار اور مستوجب تھا۔ لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز تھی اور وہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رافت، رحمت اور عفو کا جوہر جو ابوسفیان کو دل ہی دل میں اطمینان دلا رہا تھا کہ خوف کا مقام نہیں ہے۔ نبی اکرمؐ کے اخلاق حسنہ سے دل پہلے سے گھائل تھا۔ حق کا بول بالا اور اسلام کی فتح و سربلندی نگاہوں کے سامنے تھی۔ حضرت عباسؓ جگری دوست تھے، ان کی ترغیب اور ان تمام چیزوں نے اس آہنی چٹان کو پگھلا دیا۔ اور وہ بالآخر دولت اسلام سے مشرف ہوئے اور مومن صادق ثابت ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ــــ غزوۂ طائف میں انؓ کی ایک آنکھ زخمی ہوئی جو عہد خلافت راشدہ میں جنگ یرموک (شام) کے موقع پہ بالکل جاتی رہی۔

ابوسفیان کا اعزاز و اکرام

علی الصبح جب لشکر اسلام مکہ کی طرف بڑھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان رضؓ کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو تاکہ وہ افواج الٰہی کا جلال اپنی آنکھوں سے دیکھیں نیز مکہ میں داخل ہوتے ہی اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیانؓ کے گھر میں پناہ لے گا یا حرم کعبہ میں داخل ہوگا تو اس کو امن دیا جائے گا۔

اہل ایمان کی فوجیں الگ الگ پرچموں کے تلے نعرۂ تکبیر بلند کرتی ہوئی مکہ کی طرف بڑھ

لہ یہ بھی فتح مکہ کے موقع پر ایمان لے آئے تھے (مرتب)

رہی تھیں اور حضرت ابوسفیانؓ ان کو دیکھ کر متحیر ہو رہے تھے۔ سب سے آخر میں انصار کے قبیلہ خزرج کا لشکر حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں گزرا جنؓ کے ہاتھ میں علم تھا۔ تو انہوںؓ نے جب حضرت ابوسفیان کو دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھے۔

الیوم یوم الملحمۃ الیوم تستحل الکعبہ آج خون بہانے کا دن ہے آج کعبہ حلال کردیا جائیگا

یوم المرحمہ مختلف لشکروں کے پیچھے کوکب نبوی نمودار ہوا۔ حضرت زبیرؓ ابن العوام علمبردار تھے۔ حضرت ابوسفیانؓ کی نظر جب جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے۔ کہ حضورؐ! آپؐ نے سنا کہ عبادہؓ یہ کہتے ہوئے گزرے ہیں کہ الیوم الملحمہ الیوم تستحل الکعبہ نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ نہیں عبادہؓ نے صحیح نہیں کہا بلکہ آج کا دن تو

الیوم یوم المرحمہ والیوم عظمۃ الکعبۃ

"آج کا دن رحمت کا دن ہے اور آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے"

لحم بنا ہے لحم سے۔ لحم جانوروں کے ذبح خانہ اور اس مقام کو کہتے ہیں جہاں ذبیحہ کے پارچے یا قیمہ بنایا جاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وزن پہ رحم اور رحمت کے لفظ سے اس دن کو یوم المرحمہ قرار دیا۔ یعنی رحم، رحمت اور شفقت کا دن ـــــ ساتھ ہی حضورؐ نے حکم دیا کہ حضرت عبادہؓ سے علم لے کر انؓ کے بیٹے کو دے دیا جائے۔

ایک معمولی جھڑپ ان قدوسیوں کے تمام لشکر پُرامن طور پر مکہ میں داخل ہو گئے۔ یہ تمام لشکر مکہ کے بالائی حصّہ سے داخل ہوئے تھے۔ جب کہ حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں جو لشکر تھا وہ مکہ معظّمہ کے زیریں حصہ سے مکہ میں داخل ہونے کے لئے آیا تھا۔ قریش کے ایک گروہ نے حضرت خالدؓ کے لشکر پر تیر برسائے۔ چنانچہ تین صحابہ کرامؓ شہید ہو گئے۔ حضرت خالدؓ نے مجبور ہو کر اس گروہ پر حملہ کیا اور یہ لوگ تیرہ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تلواروں کی چمک دیکھی اور جھنکار سنی تو تحقیق حال فرمائی لیکن جب معلوم ہوا کہ ابتدار مخالفین کی جانب سے ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی"۔

فتح مُبین کا اتمام اللہ کی شان دیکھئے کہ جس مکہ میں آٹھ سال قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا فیصلہ ہو گیا تھا اور جہاں سے نبی اکرمؐ نے راتوں رات چھپ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی پھر غارِ ثور میں تین دن پناہ لینی پڑی تھی جس کے دہانے تک کھوجی کفارِ مکہ کو لے آئے تھے اور جہاں سے اللہ تعالیٰ نے معجزانہ

لو رپہ حضورؐ کو بچایا تھا جب حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کا اضطراب دیکھ کر ان سے وہ جملہ فرمایا
تھا جو توکل علی اللہ کا شاہکار ہے کہ:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ۰

سی مکہ میں آٹھ سال بعد رمضان المبارک سے ۸ھ میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بحیثیت فاتح داخل ہو رہے ہیں۔ عجز و انکساری کا یہ عالم ہے کہ روایات میں آتا ہے کہ حضور
کی پیشانی مبارک گھوڑے کے ایال کو مس کر رہی تھی۔ زبانِ مبارک پر ترانۂ حمد جاری تھا۔
دنیا نے نہ اس سے قبل ایسا کوئی فاتح دیکھا تھا اور نہ قیامت تک دیکھ سکے گی۔

بت شکنی وہ حرم محترم جو خلیل اللہ علیہ السلام جیسے بت شکن نے اللہ واحد کی پرستش کے
لیے تعمیر فرمایا تھا اس کے آغوش میں تین سو ساٹھ بت موجود تھے لیکن اب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے لیے موقع تھا کہ اپنے جدِ امجد کی سنت کی تجدید فرمائیں۔ چنانچہ حضورؐ
ایک ایک بت کو چھڑی سے ٹھوکے دے کر گراتے اور زبانِ مبارک سے پڑھتے جاتے تھے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط "حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل
اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۰ مٹنے ہی کی چیز تھی" [1]

(بنی اسرائیل: ۸۱)

عین خانہ کعبہ کے اندر بہت سے بت رکھے تھے اور اندر دیواروں پر تصویریں بھی
تھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب بت
نکلوائے جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر جتنی تصویریں تھیں مٹا دیں اور حضرت
علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام بت اٹھا اٹھا کر باہر پھینک دیئے۔ چند دنوں بعد ان بتوں
کو بھی پاش پاش کرا دیا گیا جن کے استھان اطراف مکہ میں مختلف مقامات پر قائم تھے۔ اس
طرح اسلام کی انقلابی دعوت توحید کی تکمیل ہو گئی۔ شرک اور بت پرستی کا طلسم ختم ہوا اور
شرک کی بنیاد پر جو استحصالی نظام قائم تھا اس کا استیصال ہو گیا۔

مکہ میں داخلہ کے دوسرے دن مکہ و مدینہ کے بے تاج بادشاہ سرورِ عالمؐ

---

[1] صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔ جاء الحق و زھق الباطل وما یبدی الباطل وما
یعید۔ "حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور اب پھر نہیں آئے گا" (مرتب)

رحمتہ للعالمین نے کھڑے ہو کر دربارِ عام میں گویا خلافتِ الٰہی کے منصب پہ فائز ہونے کے بعد جو پہلا خطاب فرمایا ہے اس کے مخاطب صرف اہلِ مکہ ہی نہیں بلکہ سارا عالم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ صدق وعدهٗ وَنَصَرَ عبدهٗ وهزم الاحزاب وحدهٗ اَلَا كُلّ ماثرة اودم اومال يدعى فهو تحت قدمى هاتين الا سدنة البيت وسقاية الحجاج.....	"ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور اس نے تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا۔ ہاں (اب) تمام مفاخر، تمام انتقامات، خون بہائے قدیم سب میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں۔
يا معشر قريش ان الله قد اذهب عنكم نخوة الجاهلية وتعظمها بالآباء الناس من آدم و آدم من تراب	اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسبت کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔"

اس کے بعد سورہ الحجرات کی یہ آیت پڑھی:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝	"اے لوگو! میں نے تم سب کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ۔ تحقیق اللہ کے نزدیک شریف وہ ہے

جو تم میں سے سب سے زیادہ (اللہ کا) تقویٰ رکھتا ہو۔ اس کے فرامین کی خلاف ورزی سے سب سے زیادہ بچتا ہو۔ بے شک اللہ دانا اور واقف کار ہے۔"

خطبۂ مبارکہ کے بنیادی مطالب و مفاہیم

آپ نے دیکھا کہ اس مختصر سے خطبہ میں اسلامی انقلابی دعوت و پیغام کے چند اہم اصول بیان ہوگئے۔ دین اسلام کا اصل الاصول توحید ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی حاکم نہیں، کوئی مقنن نہیں، کوئی دستگیر نہیں، کوئی خالق و مالک نہیں ــــ لفظ اللہ میں یہ تمام مفاہیم موجود ہیں۔ ساتھ ہی شرک جیسے گناہ کی تردید بھی آگئی۔ لیظہرہ علی الدین کلہ کا بیان بھی آگیا۔ پرانی عداوتوں اور انتقام کی پرزور مذمت بھی آگئی۔ مفاخر قومی و نسبی کی بیخ کنی بھی ہوگئی۔ اور آپ نے ان تمام جاہلیت کی جہالتوں کے متعلق فرمادیا کہ "میں نے ان تمام چیزوں کو پاؤں سے کچل دیا"۔

عرب ہی میں نہیں تمام دنیا میں نسل، قوم اور خاندان کی تمیز کی بنا پر فرق و تفاوت اور امتیازات و مراتب قائم تھے۔ جیسے ہندو دھرم میں چار مستقل ذاتیں تاحال قائم ہیں۔ ان میں سے کوئی ذات کسی دوسری ذات میں ضم نہیں ہوسکتی۔ یہ مستقل اور دائمی ہیں ان میں شودر کو اچھوت کا درجہ دیا گیا ہے جو غلیظ و ناپاک جانوروں سے بھی کم تر ہے ــــ پوری دنیا پر اسلام کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے کامل انسانی مساوات کے اصول سے دنیا کو روشناس کرایا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ نے اس اصول پر اسلامی حکومت کو عملاً چلا کر دنیا کے سامنے حجت پیش کردی کہ نسل، رنگ، زبان، وطن، پیشے اور جنس کی بنیاد پر کوئی نہ اونچا ہے نہ نیچا ہے۔ سب برابر ہیں، سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلم اور عفو

خطبہ کے بعد فاتح مکہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع کی طرف دیکھا۔ جبّارانِ قریش سامنے تھے۔ فرمایا کہ تمہارا کیا گمان ہے کہ میں آج تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں! یہ لوگ اگرچہ شقی تھے، بے رحم تھے، ظالم تھے، لیکن مزاج شناس بھی تھے۔ لہٰذا بے اختیار پکار اٹھے۔

اَخٌ کَرِیْمٌ وَّابْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ ۔ آپ شریف اور بامروّت بھائی ہیں اور آپ ایک شریف اور بامروّت انسان کے بیٹے ہیں"

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ میں آج تم سے وہی کہتا ہوں
جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے کہا تھا۔

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط "آج تم پر کوئی الزام نہیں ہے"

اور اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءَ "جاؤ تم سب آزاد ہو"

ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اسلام کی توحید کی انقلابی دعوت کے دلی دشمن اور اس
کے مٹانے کے درپے تھے۔ وہ بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز و تعریض
کیا کرتے اور حضورؐ پر تضحیک و تمسخر اور استہزا کے تیر برسایا کرتے تھے حتیٰ کہ دشنام طرازی
تک کیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ
مَعَهٗ (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں اور ان
کو شہید کیا تھا، وہ بھی تھے جو پیکرِ قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے
وہ بھی تھے جو تلاوت آیاتِ الٰہی اور وعظ و دعوت کے موقع پر شور و غل اور مذاق و ٹھٹھا کیا کرتے
تھے، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو دہکتی آگ اور جلتی ریت پر لٹا کر ان کی پیٹھوں اور سینوں
پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینۃ النبیؐ کے چھوٹے
سے شہر کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا ـــــ لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے مثال
وصفِ رأفت و رحمت اور عفو کا یہ کرشمہ ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ
آج کے دن تم پر نہ کوئی الزام ہے اور نہ ہی کوئی ملامت ہے۔ میں آج تمہیں زبانی بھی
کوئی دکھ پہنچانا نہیں چاہتا کہ پچھلی کوئی بات یاد دلاؤں اور تمہیں شرمندہ و شرمسار کروں
کون نہیں جانتا کہ بسا اوقات جسمانی ایذا سے کہیں زیادہ تکلیف دہ زبانی ایذا ہو جاتی ہے
وہ زبانی ایذا جس کا ذکر میں اپنی ابتدائی تقریر میں کر چکا ہوں کہ اجرائے وحی کے ابتدائی
تین سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدف بنے رہے تھے۔ جس پر قرآن مجید میں نبی
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی کے لئے آیات نازل ہوا کرتی تھیں، جن میں سے اکثر
آپ حضرات کو سنا چکا ہوں ـــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہے کوئی جسمانی ایذا نہ پہنچاتے
لیکن حضورؐ اس موقع پر چند جملے ایسے ارشاد فرما سکتے تھے جو قریش کی ذہنی ایذا کا سبب
بن سکتے تھے۔ لیکن رؤف و رحیم اور کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت و مروّت نے
یہ بھی گوارا نہیں کیا اور قریش کے اس سہمے اور خوف زدہ مجمع سے فرمایا تو یہ فرمایا:

تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اِذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءَ

ہماری مجسم

سیرت کی کتابوں میں بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گو اہل مکہ کو امن عطا فرما دیا تھا لیکن چند لوگ وہ تھے جن کے متعلق تھا کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں۔ مختلف روایات میں ان کی مختلف تعداد آتی ہے ... اور کثیر روایات میں دس لوگوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے چھ خلوص دل سے ایمان ... تے اور انہیں معافی مل گئی ان ایمان لانے والوں افراد میں وحشی بھی تھے جو ... اللہ واسد رسولہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتل تھے۔ بعد میں ان ہی کے ... مسیلمہ کذّاب واصل جہنم ہوا جو کذّابانِ نبوت کا سرخیل تھا۔ صرف چار شخص قتل ہوئے ... اور ایک عورت۔ مردوں میں وہ لوگ تھے جن میں ایک خونی اور مرتد تھا اور دو خونی تھے۔ ایک نے بظاہر منافقانہ طور پر ایمان لا کر جنگ میں کہیں چھپ کر ایک انصاری کو ... تھا۔ ایک وہ تھا جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں کے ساتھ شرارت ... جب وہ ہجرت کر رہی تھیں۔ ان کو اونٹوں سے گرا دیا تھا جس کے نتیجے میں حضرت زینب ... تعالیٰ عنہا کے حمل کا اسقاط ہو گیا تھا ـــــ ایک لونڈی تھی جو فاحشہ بھی تھی اور ... بھی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں نہایت شرمناک گیت گایا کرتی تھی۔

...مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ کا اصل ظہور !!

بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ گویا فتح مکہ کی صورت میں اندرونِ ملکِ عرب انقلاب محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل ہو گئی۔ اور سورۃ صف میں جو میرے ... ور مطالعہ کی رو سے غزوہ احزاب اور سورۃ الاحزاب سے متصل بعد نازل ... الفاظ مبارکہ میں جو بشارت دی گئی تھی کہ:

... تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ

... پوری ہو گئی۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان پختہ رکھنے والوں ... راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں اور اللہ کی ... جم کر اس طرح قتال کرنے والوں کو جیسے وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں، ... لغزشوں اور خطاؤں کی مغفرت، دخولِ جنت اور جنّاتِ عدن کے پاکیزہ

اصل ہے ۔ جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں اصل ہے
گھروں میں خلود و سکونت کے وعدوں کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں اصل ہے
ہے ۔ باین الفاظ مبارکہ : ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وغیرہ ۔۔۔۔ اس دنیا میں بھی نمو
اور فتح قریب کی نوید جاں فزا سنائی گئی تھی جو فطری اعتبار سے انسان کو بڑی مح
ہوتی ہے ۔ چنانچہ فتح مکہ کی صورت میں اس بشارت کا ظہور ہوگیا اور صحابہ کرام رض
اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی نگاہوں کے سامنے مشہود ہے ۔ گویا اس طرح اِنَّا فَتَحْنَا
فَتْحًا مُّبِيْنًا کا اکمال و اتمام ہوگیا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلاب مح
صاحب الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل ہوگئی ۔
ان شاء اللہ آئندہ جمعہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بین الاقوامی مرحلہ
گفتگو ہوگی ۔
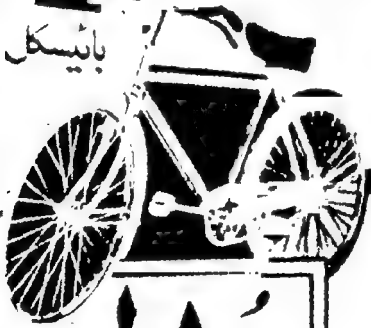
تحریک پاکستان اور نظام بیعت

چوہدری عبدالحمید

انگریزی استعمار کی دو سو سالہ غلامی نے برصغیر کے مسلمانوں کو جن اعلیٰ ملی، دینی اور علمی روایات سے بیگانہ کیا ان میں جماعت سازی کا مسنون و ماثور طریقہ یعنی "نظام بیعت" بھی ایک اہم ترین روایت ہے۔ لیکن حیرت اور مسرت کا مقام ہے کہ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اور پھر علی گڑھ میں تقسیم ملک سے قبل غیر ملکی برادرانِ اور پروفیسر ڈاکٹر سید ظفر الحسن مرحوم جیسی شخصیات موجود تھیں جنہوں نے نہ صرف نظام بیعت کی اہمیت کو سمجھا بلکہ اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی۔ زیر نظر مضمون میں تحریک پاکستان کے تناظر میں نظام بیعت کے احیاء کی ایک گمنام کوشش پر روشنی ڈالی گئی ہے ——— (الادارہ)

برصغیر کے فلسفیوں میں ڈاکٹر سید ظفر الحسن (مرحوم) کو ایک بلند مقام حاصل تھا [ا]ور [بھا]رت کے سابق صدر اور مشہور فلسفی سرراد ھا کرشنن ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ڈاکٹر [صاح]ب نے مغربی فلسفے میں تخصص حاصل کیا ہوا تھا۔ اس وجہ سے مغرب کے فلسفی ان کے [ہاں آ]مد و رفت کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کو خاندانی ورثے کے طور پر [مشرق]ی فلسفے پر بھی عبور حاصل تھا۔ چنانچہ علی گڑھ کے ایم اے (فلسفہ) کے نصاب میں [مشرق]ی فلسفے کا اس وقت بھی ایک پرچہ ہوتا تھا۔ جب دوسری کسی یونیورسٹی میں مسلم [فلسف]ہ کا پرچہ داخلِ نصاب نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں علی گڑھ کے شعبہ فلسفہ [کی ش]ہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ اپنے لکھے ہوئے [مقالا]ت کی تکمیل کے لئے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ لینے آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب خود تو وہ سنگ [گرا]ں [کہ] خورد نشکین است "پر عمل فرماتے ہوئے باہر کی مجالس میں جانے آنے کے چنداں [شائق] نہ تھے اور اپنی جگہ پر ہی مطالعہ و تحقیق میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن شعبہ کے اساتذہ

فلاسافیکل کانگریسوں میں شامل ہوتے رہتے تھے۔
ڈاکٹر صاحب اپنے زمانے کے مشہور ادیب۔ شاعر اور مبلغ سید غلام بھیک نیرنگ
کے عزیز اور داماد تھے۔ اس لحاظ سے بڑی شدید اسلامی حس انہیں ورثے میں ملی تھی
اور وہ اپنی ساری صلاحیتوں کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں صرف کرنا چاہتے تھے
ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ میں اپنے زیر ہدایت ایک خفیہ سوسائٹی بھی قائم کر رکھی تھی جس کا
مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں ایک آزاد حکومت قائم کی جائے۔ اس
وقت تک ابھی "پاکستان" کا نام ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس سوسائٹی میں شامل
ہونے والوں سے دو رکعت نماز نفل پڑھ کر اور پڑھوا کر بیعت لیا کرتے تھے۔ سوسائٹی
کا ہر ممبر ہر روز بعد از نماز فجر مندرجہ ذیل حلف نامہ ایک وظیفہ کی طرح پڑھا کرتا تھا۔
ہم لوگوں نے یہ وظیفہ پاکستان بن جانے تک جاری رکھا۔ آخر خدائے بزرگ و برتر نے وہ
دن دکھایا کہ گناہ گاروں کی دعائیں باب اجابت تک پہنچ کر جواب باصواب لائیں۔ اب
یہ وظیفہ پڑھنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اس سوسائٹی کے ممبر جہاں
کہیں بھی ہیں پاکستان کے استحکام کی دعائیں یقیناً" کر رہے ہوں گے۔۔۔

بیعت ۔۔۔ فلاں بن فلاں خدا کو حاضر و ناظر جان کر پورے صدق اور خلوص کے ساتھ
آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ
ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج و اقبال ہمیشہ میری غایت ہوگی اور اس غایت کو
حاصل کرنے کے لئے میں اپنی جان و مال عزت اور آسائش ہر چیز قربان کرنے کو ہمیشہ تیار
آمادہ رہوں گا اور ہر طرح جدو جہد کروں گا ۔۔۔ اور میں قرآن پہ ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتا
ہوں کہ اس غایت کو حاصل کرنے کے لئے جو حکم آپ بہ حیثیت امیر مجھے دیں گے اس کی بے چون
وچرا بدل و جان تعمیل کروں گا"۔۔۔

میں فلاں بن فلاں، بیعت کے تحت میں نہایت پکا وعدہ کرتا ہوں کہ۔۔۔
۱۔ ۔۔۔ غایت معلومہ کو حاصل کرنے کے لئے میں ملک کی سیاسیات میں اپنا نصب العین
یہ رکھوں گا کہ اولاً مسلمان صوبوں میں اتحاد کل قائم ہو جائے، اور ثانیاً پنجاب، سرحد، سندھ
اور بلوچستان کی ایک فیڈریشن بن جائے۔ جو باقی ہندوستان سے بالکل علیحدہ ہو۔ مرکز
میں نیابت بہ اعتبار آبادی ہو مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب ہو اور ان کے حاصل کرنا

...نی سعی کروں گا۔

۔ . . . . . ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کی ورزش کیا کروں گا تاکہ میری صحت و قوت قائم
...ہے۔ نیز اجتماعی و انفرادی مدافعت کے طریقے سیکھوں گا۔

۔ . . . . . میں حتی الامکان قرض نہیں لوں گا اور اگر قرض کے بغیر چارہ نہ ہو تو اس
...رت میں مسلمان سے قرض لوں۔ غیر مسلم سے ہرگز قرض نہیں لوں گا اور اپنی جائیداد غیر
...لم کے ہاتھ ہرگز رہن یا بیع نہیں کروں گا۔

۔ . . . . . کسی پر بوجھ بن کر نہیں رہوں گا۔ اپنی معاش خود پیدا کروں گا اور اس
...ے کوئی حرفت سیکھوں گا۔

د . . . . . حتی الامکان مسلمانوں سے خریداری کروں گا اور مسلمانوں سے اُجرت پر کام
...وں گا۔

۔ . . . . . اپنی ذات میں وہ اخلاق پیدا کروں گا جو ہماری غایت کے لئے مفید ہیں۔
...اعت رازداری، وفاداری جسارت، استقامت، خودداری، صداقت، ایثار،
...بت شعاری، سادگی اور اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہوں گا۔ مسائل مذہبی میں اختلافات
...اجتناب کروں گا اور حتی الامکان اسلام اور اسلامیات کی پابندی کروں گا اور ان
...ائقہ پیدا کروں گا۔

۔ . . . . . دوسرے ارکان کے ساتھ محبت و اخوت کے ساتھ رہوں گا۔ اور حتی الامکان
...ن مدد کروں گا۔ کبھی کسی رکن کو دھوکا نہیں دوں گا۔ اور جماعت میں شریک ہو جانے
...ذاتی فائدہ اٹھانے کا ذریعہ نہیں بناؤں گا اور امیر کی نسبت بدگمانی نہیں کروں گا۔

... . امیر کی اجازت کے بغیر کسی سیاسی جماعت میں شریک نہیں ہوں گا اور
...ل رضی کے خلاف ملکی انتخابات میں ووٹ نہیں دوں گا اس کی رضا کے بغیر ملازمت
...سفر نہیں کروں گا۔ اور نہ ممالک غیر میں جاؤں گا۔

. . . . . حتی الامکان دوسروں کو اپنا ہم خیال بناؤں گا۔ کہ وہ جماعت میں شریک
...ن و مسلمانوں میں جماعت کے خیالات کو پھیلاؤں گا۔

. . . شودروں کو مسلمان بنانے کی کوشش کروں گا۔ اور اس کوشش میں مدد
...دوں گا۔

۱۱ - ..... بہ طیب خاطر جماعت کو... ماہوار پابندی کے ساتھ ہمیشہ چندا دیتا رہوں گا اور اسکی مالی امداد کرنے سے دریغ نہیں کروں گا ۔

۱۲ - .... صبح کو اٹھتے وقت اور رات کو سوتے وقت بہ خشوع وخضوع یہ دعا کروں گا:

"یا اللہ! اپنے خاص فضل وکرم سے مجھے اپنی بیعت پر قائم رکھ اور وعدوں کو پورا کرنے کی توفیق دے"۔

اس کے بعد اپنے عہد بیعت کو دہراؤں گا اور ہر ہفتہ جمعہ کے دن صبح کے وقت اپنے وعدوں کو بھی دہراؤں گا ۔

حصول مقصد کے لئے علامہ اقبال سے بھی ڈاکٹر صاحب کا تبادلہ خیال ہوتا رہتا۔ چنانچہ "اقبال ریویو" سے ماخوذ مندرجہ ذیل سطور سے اس طرف اشارہ ملتا ہے ۔

۱ - "۲۸ فروری ۱۹۲۵ء کل رات صوفی (غلام مصطفی تبسم) صاحب کے ہاں اس غرض سے مجلس مشاورت ہوئی کہ سر محمد اقبال کے تجویز کردہ نظام "شبان المسلمین" پر غور کیا جائے۔ دراصل یہ سکیم جو ہمارے زیر غور ہے۔ میر غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر ظفر الحسن کی تجویز کی ہوئی ہے جس کا مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج واقبال ہے"۔

۲ - "علی گڑھ سے ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے دو صاحبوں کو لاہور اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے متعلق تفصیل طور پر تبادلہ خیال کریں"۔ (یہ دو صاحبان ڈاکٹر ایم ایم احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی تھے)

(ماخوذ از اقبال ریویو - جولائی)

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیعت کنندگان کو رائفل ٹریننگ اور بندوق سکھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ہم ان کی دونالی بندوق لے کر میدان کی طرف نکل جاتے اور چیلوں گدھوں کے نشانے کرتے رہتے۔ بندوق سکھانے کی حکمت اس وقت میری سمجھ میں نہ آئی تھی - لیکن ایک مرتبہ اس پریکٹس کی وجہ سے مارچ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جان بچ گئی تو مشیت الہی کی حکمت خوب سمجھ میں آگئی - یہ واقعہ تفصیل طلب ہے ۔ اس لئے اسے یہیں چھوڑتا ہوں - (بشکریہ روزنامہ نوائے وقت)

تارد آرام

سردار اجمل خان لغاری کا وضاحتی مراسلہ

۴ جون ۱۹۸۶ء

مکرم و محترم مجمع حسنات نجیب بھائی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ مزاج شریف

ماہنامہ میثاق جون ۸۶ء کے صفحہ ۳۰ پر میرے متعلق آپ کا یہ ارشاد نظر سے گزرا
"مایوسی کے شدید ردِّ عمل نے سوچ کی راہیں بھی جُدا کر دی ہیں"
اس سے یقیناً آپ کا مدعا یہ ہوگا کہ اچھی گو ٹھ کے حادثہ کے بعد جماعت سے مایوس ہو کر میں جماعت سے الگ ہوا اور جماعت سے مایوسی کے شدید ردِّ عمل نے سوچ کی راہیں بھی جدا کر دی ہیں ۔

میثاق میں اپنے اس ارشاد کو ایک دفعہ پھر پڑھ لیں جس میں خط کشیدہ لفظ "جماعت" کا استعمال نہیں فرمایا گیا ۔ کیا اس سے یہ تو نہیں سمجھا جائے گا کہ مایوس ہو کر میں دینی کام سے فارغ ہو بیٹھا ہوں ۔ حالانکہ راہیں جُدا ہو جانے کے بعد کسی دینی کام کی تشریح میں آراء کا مختلف ہونا علیحدہ بات ہے اور مایوس ہونا علیحدہ بات ہے ۔
میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ زبانی کلامی جس قدر باتیں ہو جاتی ہیں وہ کافی ہوتی ہیں ۔ کیونکہ رسائل میں باہمی باتوں کا اندراج یا ایک دوسرے کے متعلق رائے زنی مفید نہیں ہوتی ۔

کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اہلِ ذکر اور اہلِ علم کے فیوض سے جو راہ پائی ہے نہ میں اسے آپ جیسے زیرک احباب کو سمجھا سکتا ہوں اور نہ آپ حضرات مجھ جیسے ناقص کے معروضات پر کان دھرتے ہیں لہٰذا رسائل میں ان کی اشاعت ضروری نہیں ہوتی ۔

من گنگ خواب دیدم عالم تمام کر
من عاجزم زگفتن مخلوق از شنیدنش

مہربانی فرما کر میرے اس عریضہ کو میثاق میں درج کرنے کی فرمائش کر دیں ۔ تاکہ میرے

متعلق قارئین میں کسی قسم کی غلط فہمی نہ رہے۔

والسلام

اجمل خان انصاری

رحیم آباد۔ ضلع رحیم یار خاں

(۱۱)

"استحکام پاکستان" کا خصوصی مطالعہ

استحکام پاکستان کے عنوان سے حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو دینی علوم و ہمہ جہت شخصیت اور اسکالر ڈاکٹر اسرار احمد کی تصنیف ہے ڈاکٹر صاحب عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ جدید عمرانی و معاشرتی اور سائنسی علوم سے بھی آگہی رکھتے ہیں، انکی تحریر میں اختصار و جامعیت کا وصف نمایاں ہے اور وہ قرآن و سنت کی روشنی میں عصر حاضر کے مسائل کا کامیاب تجزیہ کرتے ہیں۔

وہ حق بات کہنے میں کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کی حقیقت پسندی و تجزیاتی بصیرت نے اُن کی تحریروں میں وہ عالمانہ شان پیدا کر دی ہے جو کہیں اور نظر نہ آئی۔ اُن کی تصانیف کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے اثرات اتنے ہمہ گیر ہیں کہ اپنے بیان و استدلال کے سبب اپنے ہم عصر علماء میں ممتاز و منفرد نظر آتے ہیں اُن کا مخصوص فکر اور طرز استدلال ان کی زیر نظر کتاب "استحکام پاکستان" میں پوری طرح کار فرما ہے۔

استحکام پاکستان میں ڈاکٹر اسرار احمد اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ پاکستان نظریاتی ریاست کے طور پر حاصل کیا گیا ہے۔ جس کا بنیادی محرک اسلام تھا۔ وہ اس امر کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ پاکستان اقتصادی اور معاشی مقاصد کے تحت معرض وجود میں آیا تھا۔ اس نقطۂ نظر کی وضاحت تحریک پاکستان کے واقعات سے بھی ہوتی ہے کہ کسی مسلم لیگی راہنما نے کبھی یہ نہیں کہا کہ پاکستان معاشی استحکام کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے بلکہ تحریک پاکستان کی پوری تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پاکستان کے حصول کا محرک صرف احیائے دین اور اسلامی ریاست کے قیام کا جذبہ تھا۔ اپریل ۱۹۴۳ء میں قائد اعظم نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن صوبہ سرحد کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا ہے۔

قرآن حکیم کی صورت میں ہمارے پاس ایک راہنما اور بصیرت افروز پیغام موجود ہے
اس کی موجودگی میں کسی اور پیغام کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی فکری اور عملی جدوجہد سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی پوری
زندگی دینِ محمدی کی سربلندی اور مسلمانوں کے فکر و عمل کی اصلاح کے لئے وقف کر رکھی تھی ۔
وہ اپنے دل میں دُنیا اسلام اور مسلمانانِ پاکستان کے لئے یکساں جذبہ رکھتے ہیں اور اُن کی
تحریروں میں پاکستان اور دُنیائے اسلام الگ الگ نظر آتے ہیں اور ایک ساتھ بھی استحکام
پاکستان میں وہ بڑے کرب کے ساتھ اس تکلیف دہ صورت حال کا احساس دلاتے ہیں
کہ ہم نے پاکستان جس جذبہ محرکہ کے تحت حاصل کیا تھا

اُسے جلد ہی ذہن سے محو کر دیا۔ اس صورت حاصل کے سبب ایک ایسا معاشرہ
وجود میں آیا جس کی واضح اکثریت خود غرضی بددیانتی اور احسان فراموشی کی مرتکب
ہوئی ہے ۔

مشرقی پاکستان ہم سے جُدا ہو چکا ہے ۔ اور "جئے سندھ" جیسی تحریکوں کے سبب
موجودہ پاکستان کے وجود کو بھی خطرہ ہے ۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے وہ فکر و عمل
کی تعمیر نو پر زور دیتے ہیں ۔ اور پاکستان کو ایک معجزے سے تعبیر کرتے ہوئے آزاد فضاؤں
میں پروان چڑھنے والی نئی نسل کی رہنمائی پر زور دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نئی پود پختگی
شعور کی عمر کو پہنچ چکی ہے اور صحیح رہنمائی ملنے پر اپنی بالغ نظری اور جرأت و ہمت کے سبب
ملت و اطاعت اور اسلام کی سربلندی کے نئے افق تلاش کر سکتی ہے اس ضمن میں وہ
ذہنی انقلاب پر زور دیتے ہوئے پانچ رہنما اصولوں کی نشان دہی کرتے ہیں جن پہ عمل پیرا
ہو کر اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اسلامی ریاست کا قیام ممکن ہے ۔

مبصر: محمود جلال آبادی

(بشکریہ روزنامہ مشرق)

———(۱۱۱)———

بے حسی کی انتہا: ایک لمحہ فکریہ

یہ کوئی ۹ جون ۱۹۸۶ء کی بات ہے میں عید کے لئے اپنے گاؤں گیا جو کہ بہاولپور۔

۲۰ میل دور احمد پور کے علاقے میں شامل ہے یعنی احمد پور سے دو میل آگے ایک بو
محراب والا ہے اور اس سے چار میل آگے ایک گاؤں ہے جو کھوتی یا کھوئیاں کے نام
سے موسوم ہے۔ وہاں گاؤں کی مسجد میں لاؤڈ سپیکر کی سہولت موجود ہے اور وہاں
اصول طے ہے کہ جس شخص نے کوئی اعلان کرانا ہو وہ دو روپے مسجد فنڈ میں جمع کرائے اور
پھر اعلان کرے۔ اُس روز ہم عشاء کی نماز پڑھ کے جب گھر آئے تو مسجد میں سے ایک
جوان نے اعلان کیا جس کی عمر تقریباً ۲۰ یا ۲۵ سال کے درمیان ہوگی کہ وہ فلک شیر نام
(جو کہ میرے پھوپھا ہیں اور مسجد کے منتظم ہیں) ناراض نہ ہونا میں دو روپے رکھ رہا ہوں
اور ایک اعلان کرا رہا ہوں لوگو! ایک ضروری اعلان سنو! فدا حسین کے گھر ...
فلمیں چل رہی ہیں جسنے دیکھنی ہوں وہ وہاں چلا جائے"۔ اس نے یہ اعلان دو مرتبہ ...
میرے پھوپھا جان کے کان پر جوں تک نہ رینگی کہ یہ اعلان کیوں ہوا حالانکہ مسجد کا
انتظام اُن کے ذمے تھا۔ میں نے احتجاج کیا تو بڑے آرام سے بولے آئندہ سے ہم اذان
کے لئے ۵ روپے رکھ دیں گے۔

غفلت کی تاریکی اتنی پھیل چکی ہے کہ انسان اس میں گم ہو کر رہ گیا ہے اگر وہ
بُرا کام کر رہا ہوتا ہے تو اُسے احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے وہاں مسلمان
بستے ہیں لیکن اللہ کے گھر سے فحاشی کا اعلان ڈنکے کی چوٹ پر کیا جاتا ہے۔ اللہ نہ کرے
وہاں اللہ کا عذاب آیا تو نیک لوگ بھی فاسق لوگوں کے ساتھ رگڑے جائیں گے کیونکہ
گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں بار بار حکم آیا ہے کہ
بُرائیوں سے روکتے رہو اور نیکیوں کا حکم دیتے رہو اور یہ کام جو لوگ کرتے ہیں وہی
ہیں فلاح پانے والے" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ "قیامت
کے دن انسان کے قدم اس وقت تک نہیں ہٹیں گے جب تک کہ ان سے ۵ باتوں کے
بارے میں حساب نہیں لیا جاتا کہ عمر کن مشاغل میں گزاری، علم حاصل کیا تو اس پر
کہاں تک عمل کیا مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور جسم کو کس کام میں کھپایا
یعنی عمر کا بہترین حصہ فضول کاموں میں ضائع کیا کیونکہ وقت ایک قیمتی سرمایہ ہے اور
جس کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی، علم اگر حاصل کیا تو اس پر عمل کیا یا نہیں۔ حضور صلی
اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ کچھ لوگ قیامت کے دن ایسے ہوں گے جنکی گردنوں
پر آخرت کی پونجی ہوگی جبکہ کچھ ایسے ہوں گے جن کی گردنیں دُنیاوی مال سے لدی ہونگی

(باقی صفحہ ۸۸ پر)

رفقارِ کار

امیر تنظیم اسلامی کا دورہ گجرات و وزیرآباد

میری خواہش تھی کہ وہ آواز جو عرصہ دراز سے کوہ و دمن، صحرا و دریا، بستی و جنگل میں قرآن کے
حیات آفریں پیغام کو بلند کر رہی ہے میرے شہر وزیرآباد میں بھی سنی جائے اور وہ مردِ قلندر جس کے نعرۂ مستانہ
نے [illegible] دربار کے ایوانوں میں لرزش پیدا کر دی اہالیانِ وزیرآباد بچشمِ سر اس کا مظاہرہ کر سکیں۔ چنانچہ
میں نے رمضان المبارک سے پہلے ہی چوہدری غلام محمد صاحب معتمد عمومی تنظیم اسلامی سے درخواست کی تھی کہ
وقت ملتے ہی لاہور سے صرف ۶۰ میل دور کے فاصلہ پر وزیرآباد کے لئے امیر محترم کے دورے کو ضرور
ترتیب دیں۔ چنانچہ گوناگوں مصروفیات اور شدت کی گرمی کے باوجود ۲۵ جون ۱۹۸۶ء کو امیر محترم نے
وزیرآباد و گجرات کے لئے وقت دے دیا۔

چونکہ وزیرآباد میں اس سے قبل تنظیم کا کام نہیں ہوا تھا چنانچہ میاں محمد نعیم صاحب قیم تنظیم کی
ہدایت پر ۲۳ جون ۸۶ء کو پونے سات بجے ایک گروپ جو جناب چوہدری محمد رفیق صاحب، جناب
محمد [illegible] صاحب، جناب عابد گلزار صاحب، جناب ڈاکٹر منظور احمد صاحب، جناب محمد اقبال صاحب،
جناب محمد وحید صاحب اور جناب نور محمد صاحب پر مشتمل تھا لاہور سے وزیرآباد پہنچا۔ ناشتہ سے فارغ
ہونے کے بعد وہ گروپ پلے کارڈ اور ہینڈبل لے کر وزیرآباد شہر میں پبلسٹی مہم اور ذاتی تربیت کے
لئے نکل گیا۔ چونکہ مقصود ذاتی تربیت تھی۔ اس لئے یہ حضرات دل میں اللہ کی یاد لئے ہوئے بندگانِ
خدا تک حق کی دعوت پہنچانے کے لئے وزیرآباد کی گلی گلی میں گھوم گئے۔ اور یہ سلسلہ نماز ظہر تک جاری
رہا۔ نماز و کھانے سے فارغ ہو کر بعد نماز عصر راقم اور چوہدری محمد اسحاق صاحب سوک کلاں گجرات چلے
گئے جہاں جناب خادم حسین صاحب سے رابطہ قائم کیا جنہوں نے سوک کلاں میں امیر تنظیم کا پروگرام ترتیب
دیا تھا۔ اس دوران بقیہ حضرات نظام آباد اور اللہ آباد کی بستیوں میں حسب سابق کام کرتے رہے۔ ا
[illegible] میں گوجرانوالہ سے ہارون پاشا بھی شامل ہو گئے تھے۔

بعد نماز عشاء جامع مسجد اہلِ حدیث میں جناب محمد حنیف صاحب کی دعوت پر جانا ہوا۔ وہاں تنظیم
کی دعوت اور ڈاکٹر صاحب کے کام سے اہلِ محلہ کو روشناس کرایا جس کے لئے ہم محمد حنیف صاحب

کے شکر گزار ہیں۔

اگلی صبح یعنی ۲۴ جون کو حسب مشورہ فجر کی نماز ہم نے سوہدرہ اور تلواڑیہ کی مساجد میں ادا کی اور وہاں پروگرام کے ہینڈ بل تقسیم کئے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر واپس وزیرآباد آئے اور حاجی پورہ میں احباب سے ملاقاتیں کیں۔

بعد نماز ظہر باہمی مذاکرہ کیا اور ہر رفیق تنظیم نے تنظیم کی دعوت کے ضمن میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد نماز عصر نواحی بستی دھونکل چلے گئے۔

اگلے دن یعنی ۲۵ جون کو تمام احباب بعد نماز فجر سوک کلاں گجرات گئے۔ وہاں بارش کی وجہ سے موسم قدرے خوشگوار تھا۔ جناب خادم حسین شہریار صاحب کے احباب نے مل جل کر بہت عمدہ انتظام کیا تھا۔ تاہم تنظیم کے رفقاء کے بروقت پہنچ جانے سے انتظامات میں مزید بہتری پیدا ہو گئی۔ دن کے گیارہ بجے محترم ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا آغاز ہوا جو دو گھنٹوں پر محیط تھی۔ موضوع تھا "اسلام کا پیغام مسلمانانِ پاکستان کے نام"۔ باوجودیکہ گاؤں کا معاملہ اور کاروبار کا وقت تھا تاہم حاضری قابل اطمینان تھی اور اللہ تعالیٰ اس پروگرام کے جملہ معاملات کی برکات سے ہمیں نوازے۔

میری مدد کے لئے جناب محمد یعقوب صاحب علی الصبح ہی گوجرانوالہ سے تشریف لا چکے تھے جنہوں انہوں نے جلسہ گاہ کے جملہ انتظامات سنبھال لئے اور باحسن وجوہ سرانجام دیئے۔ ان کی مدد کے لئے جناب ہارون پاشا بیگ صاحب۔ جناب مصطفےٰ صاحب اور ثناء اللہ صاحب صالح محمد صاحب بھی تھے اور سیالکوٹ سے محمد اقبال منیر صاحب بھی معاونت فرماتے رہے۔

امیر محترم گجرات سے واپس وزیرآباد تقریباً ۴ بجے شام تشریف لائے۔ میرے بعد وہ لمحات انتہائی قیمتی تھے جو اس مرد حق نے میرے غریب خانے پر گزارے۔ ۹ بجے رات کو کیپٹن ڈاکٹر صالح محمد صاحب کی مسجد میں نماز عشاء ادا کی اور ساڑھے نو بجے امیر تنظیم اسلامی جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔

جلسہ کا اہتمام گورنمنٹ پبلک ہائی سکول وزیرآباد کے صحن میں کیا گیا تھا جس میں ایک ہزار طلبہ کی اسمبلی کی گنجائش ہے۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ جلسہ گاہ ناکافی ہے۔ اگرچہ دریوں کا انتظام کیا گیا تھا حاضرین زیادہ سما سکیں مزید برآں چھت پر ۵ سو کرسیاں بچھائی گئی تھیں اور خواتین کے پردہ کا انتظام گیلری میں کیا گیا تھا۔ ہماری توقع سے زیادہ حاضری ہونے کی وجہ سے مجھے پریشانی لاحق ہوئی تاہم جلسہ کی کارروائی ساڑھے نو بجے شروع کر دی گئی۔ جناب قاری محمد ارشاد صاحب نے تلاوت فرمائی اور بعد ازاں رحمت اللہ بٹر صاحب نے خطاب فرمایا۔ ٹھیک دس بجے جناب ڈاکٹر اسرار

ب کا خطاب شروع ہوا۔ دورانِ تقریر بارش شروع ہو گئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے بارش اور
می کے باوجود مسلسل دو گھنٹے خطاب فرمایا۔ موضوع تھا۔ "اسلام کا پیغام مسلمانانِ پاکستان کے نام"
نے اس موضوع پر خطاب فرماتے ہوئے کہا اسلام کے پیغام کی تین سطحیں (۱،۲،۳) ہیں۔
کا ایک پیغام تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے پھر یہ کہ اسلام کا ایک پیغام تمام عالم اسلام کے لئے
پھر اسلام کا ایک پیغام ہے جو مسلمانانِ پاکستان کے نام ہے۔ موضوع اتنا اہم، فکر انگیز اور تقریر اتنی
مسحور کن تھی کہ ہر سطح کے لوگوں نے اسے پوری توجہ اور دلچسپی سے سنا اور پسند کیا۔ چند باہمت
تے متاثر ہوئے کہ انہوں نے تنظیم میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔

بارش کے باعث اگرچہ سارے انتظامات درہم برہم ہو گئے تاہم لوگوں کا شوق دیدنی تھا۔ کونوں
میں گھس کر تقریر سنتے رہے۔ تندیٔ بادِ مخالف نے اہالیانِ وزیر آباد کے اعصاب پہ کوئی
نہیں ڈالا۔

بجے رات یہ محفل بارانِ رحمت کی بہاریں لوٹتی ہوئی ختم ہوئی۔ کھانا کھانے کے بعد تقریباً
بجے رات کو امیر محترم کو نیند کے لیے کچھ وقت ملا۔ نمازِ فجر کے بعد جامع مسجد حنفیہ مین بازار میں
سوال و جواب کی نشست منعقد ہوئی۔ ایک گھنٹے کی اس نشست میں مختلف انداز میں
ت ہوتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب سے مولانا نصیر الدین رفاہی صاحب نے سوال کیا کہ آپ نے
ت کی سربراہی کو جائز قرار دیا ہے۔ امیر محترم نے فرمایا کہ پریس نے مختلف انداز میں اسے اچھالا ہے
میں نے عورت کی سربراہی کو جائز قرار نہیں دیتا۔ تاہم اگر کوئی عورت سربراہ مملکت بن جائے
صورت میں بھی اپنے مشن کو جاری رکھوں گا جس کا میں برملا اظہار کرتا ہوں۔

ناشتہ کے بعد یہ قافلہ حسین نقوش چھوڑتا ہوا عازم لاہور ہوا

تنظیم اسلامی کے دورۂ وزیر آباد کے نتیجے میں چند باہمت لوگ تنظیم اسلامی میں شامل ہوئے
میں گلزار احمد صاحب کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اس نوجوان نے اپنے گھر میں دفتر کھولا جس کا باقاعدہ
وزیر آباد کی معروف دینی و سماجی شخصیت جناب شیخ محمد انور صاحب نے کیا۔ مرکز سے
جناب میاں محمد نعیم صاحب تشریف لائے تھے۔ ۱۹ جولائی ۸۶ء بروز جمعہ جناب
احمد صاحب نے اپنے گھر پر شہر کی تمام قابلِ ذکر شخصیات کو دعوت دی جس میں راقم نے
تعارف کرایا اور میاں محمد نعیم صاحب نے ہماری دینی ذمہ داریاں کے موضوع پر
گفتگو کی۔ قبل از مغرب یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

یہ دفتر باقاعدہ بعد نماز مغرب کھلتا ہے ۔ اس میں لائبریری بھی کھولی گئی ہے ۔ راقم نے منتخب نصاب کا درس شروع کیا ہوا ہے ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کارِ خیر میں برکت عطا فرمائے ۔

شمس الحق اعوان
رفیق تنظیم اسلامی ، وزیر آباد

بقیہ : افکار و آراء

اُس دن میں اُن کے کچھ کام نہیں آؤں گا " آئیے ہمیں چاہیئے کہ گناہوں سے توبہ کریں اور نیکی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں اسی میں ہمارے لئے بہتری ہے ۔ دُنیاوی اور اُخروی لحاظ سے اسی میں ہماری نجات ہے ۔

مرسلہ : مسعود احمد خان

دین کے انتہائی اہم اور بنیادی موضوع
حقیقت و اقسامِ شرک پر ڈاکٹر اسرار احمد
کے ایک ایک گھنٹے کے چھ لیکچرز جو C-60 کے چھ کیسٹوں میں دستیاب ہیں
ہدیہ پاکستانی کیسٹ -/۱۰۰ روپے (جاپانی کیسٹ -/۱۹۰ روپے) مع محصول ڈاک

تواضع کے بہتر آداب
- آپ کا بہترین انتخاب
فریش
حلوہ جوزی
Freshvel
KARACHI
HALWA

رُوح افزا لیموں

ڈاکٹر اسرار احمد

قارئین میثاق کی خدمت میں

ماہنامہ میثاق صرف ایک عام دینی و علمی پرچہ نہیں بلکہ آپ کی اُس اصلاحی انقلابی دعوت کا علم بردار ہے جس کا مقصد پاکستان میں نظام باطل کو مٹا کر دین حق کے نفاذ کیلئے راہ ہموار کرنا ہے۔ ہمیں اس مشن میں آپ کا عملی تعاون درکار ہے۔ درج ذیل صورتوں کے علاوہ بھی آپ جس شکل میں تعاون کرنا چاہیں ہم آپ کے عملی تعاون اور پُرخلوص مشوروں کے لئے چشم براہ ہیں۔

(۱) اگر آپ خود میثاق کے سالانہ خریدار نہیں ہیں تو براہ کرم فوراً سالانہ خریدار بن کر اس مشن میں ہمارے ساتھ تعاون کیجئے۔

(۲) اگر آپ خود سالانہ خریدار ہیں تو اس یک ماہی مہم کے دوران کم از کم پانچ حضرات کو سالانہ خریدار بنائیے۔

(۳) قریبی بکسٹال، میڈیکل سٹور یا کسی بھی مناسب کاروباری مقام پر ہر ماہ میثاق رکھنے یا رکھوانے کا انتظام کیجئے۔

۴۔ قریبی سکولوں کالجوں اور دیگر پبلک لائبریریوں کے لئے اپنی طرف سے میثاق کی خریداری کی بنیاد پر پہنچانے کا انتظام کیجئے۔

۵۔ اپنے حلقہ احباب میں سے جن حضرات کے متعلق آپ کو حسن ظن ہو کہ وہ توجہ دینے پر میثاق کے سالانہ خریدار بن سکتے ہیں ہمیں اُن کے پتے روانہ کیجئے تاکہ ہم انہیں نمونے کے پرچے اس گذارش کے ساتھ مفت ارسال کریں کہ وہ میثاق کی سالانہ خریداری قبول فرمائیں۔

۶۔ میثاق کی پبلسٹی کے ضمن میں پبلسٹی میٹریل مثلاً اسٹیکرز بلے کارڈز وغیرہ مفت حاصل کرنے کے لئے ہم سے رابطہ قائم کیجئے۔

۷۔ میثاق کی توسیع اشاعت مہم کو بہتر طور پر چلانے کے لئے اپنے مفید مشوروں سے نوازیئے۔

۸۔ میثاق کی پبلسٹی کے ضمن میں بلے کارڈز، اسٹیکرز اور پوسٹرز کی ترتیب و تزئین کے لئے بھی ہم آپ کی تجاویز اور تخیلات IDEAS کے منتظر ہیں۔

شعبہ نشر و اشاعت ماہنامہ میثاق لاہور ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور

اسلامی کا ایک اہم خطاب

ریاست کے اسلامی اصول اور پاکستان میں ان کا

میثاق

لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی (المائدہ)

ماہنامہ میثاق لاہور

سب آفس ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی، فون ۲۱۶۵۰۲

مشمولات

ماہنامہ میثاق کی توسیع اشاعت

قارئینِ "میثاق" کی خدمت میں

جیسا کہ آپ کے علم ہے ماہنامہ میثاق محض ایک روایتی انداز کا دینی و علمی پرچہ نہیں، بلکہ یہ ایسی اسلامی انقلابی دعوت کا علمبردار ہے جس کا مقصد پاکستان میں نظام باطل کو مٹا کر دین حق کے نفاذ کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔ ہمیں اس مشن میں آپ کا عملی تعاون درکار ہے۔ درج ذیل صورتوں کے علاوہ بھی آپ جس شکل میں تعاون کرنا چاہیں ہم آپ کے عملی تعاون اور پرخلوص مشوروں کیلئے چشم براہیں

(۱) اگر آپ خود میثاق کے سالانہ خریدار نہیں ہیں تو براہِ کرم فوراً سالانہ خریدار بن کر ہمارے ساتھ تعاون کیجئے

(۲) اگر آپ پہلے سے سالانہ خریدار ہیں تو۔ ۔ ۔

۱۔ میثاق کی توسیع اشاعت مہم میں عملی حصہ لیتے ہوئے اِسی ماہ کے دوران کم از کم پانچ حضرات کو سالانہ خریدار بنایئے۔

۲۔ قریبی بک سٹال، میڈیکل سٹور یا کسی بھی مناسب کاروباری مقام پر ہر ماہ میثاق رکھنے یا رکھوانے کا انتظام کرایئے۔

۳۔ قریبی سکولوں، کالجوں اور دیگر پبلک لائبریریوں کے لیے اپنی طرف سے سالانہ خریداری کی بنیاد پر میثاق پہنچانے کا انتظام کیجیے۔

۴۔ اپنے حلقہ احباب میں سے جن حضرات کے بارے میں آپ کو حسن ظن ہو کہ وہ توجہ دلانے پر میثاق کے سالانہ خریدار بن سکتے ہیں، ہمیں ان کے پتے روانہ کیجیے تاکہ ہم انہیں نمونے کے پرچے اس گذارش کے ساتھ مفت ارسال کریں کہ اگر وہ ہمارے مشن سے اتفاق رکھتے ہوں تو ماہنامہ میثاق کی سالانہ خریداری قبول فرمائیں۔

۵۔ میثاق کی پبلسٹی کے ضمن میں پبلسٹی میٹریل مثلاً اسٹیکرز اور پلے کارڈ وغیرہ مفت حاصل کرنے کے لیے ہم سے رابطہ قائم کیجیے۔

۶۔ میثاق کی توسیع اشاعت مہم کو بہتر طور پر چلانے کے لیے اپنے مفید مشوروں سے نوازیئے۔

۷۔ میثاق کی پبلسٹی کے ضمن میں اسٹیکرز، پلے کارڈ اور پوسٹرز وغیرہ کی ترتیب و تزئین کے لیے بھی ہم آپ کی گرانقدر تجاویز اور تخیلات (IDEAS) کے منتظر ہیں۔

شعبہ نشر و اشاعت ماہنامہ میثاق لاہور ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نئے اسلامی سال کی آمد آمد ہے۔ محرم الحرام کا چاند دیکھے جانے پر ہمارا اسلامی کیلنڈر
پندرھویں صدی ہجری کے سات برس مکمل کر کے آٹھویں سال میں داخل ہو جائے گا۔ یوں
تو ہر مہینے کے آغاز میں ہلال کو دیکھ کر امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کی دعا کرنا مسنون
ہے۔ لیکن خاص طور پر آجکل مملکتِ خداداد پاکستان جس سنگین اندرونی انتشار اور جن
بیرونی خطرات کا شکار ہے وہ گویا ایک بار پھر وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ کا سا
منظر پیش کر رہے ہیں، اس کے پیش نظر نئے سال کی آمد پر ہر مخلص پاکستانی کو پورے شعور
کے ساتھ یہ دعا مانگنی چاہیئے اور ہر شخص کے قلب کی گہرائیوں سے یہ مسنون الفاظ ادا ہونے
چاہئیں کہ اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهُ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ
ترجمہ: اے ہمارے رب ہمارے لئے اس چاند کو امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کا باعث بنا۔

امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد اور ناظم تنظیم برائے بیرون پاکستان جناب قمر سعید امریکہ
اور کینیڈا کے دورے سے واپس تشریف لا چکے ہیں۔ واپسی پر دونوں حضرات حج بیت اللہ
اور زیارت مسجد نبوی کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ ۱۲ ذی الحجہ کو منیٰ میں ڈاکٹر اسرار احمد
صاحب کو شدید بخار نے آلیا۔ پانچ چھ روز انتہائی بخار کے عالم میں گزرے۔ ۱۰۲۰ درجے
کے بخار کی حالت میں جدہ سے واپسی کے لئے رخت سفر باندھا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے
اپنے فضل خاص سے ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ سفر ملتوی کئے بغیر طے شدہ پروگرام کے
مطابق ۲۱ اور ۲۲ اگست کی درمیانی شب کو واپس لاہور پہنچ گئے۔ تاحال صحت پورے
طور سے بحال نہیں ہوئی۔ شدید نقاہت و کمزوری کے علاوہ ہلکا ہلکا بخار بھی جاری ہے۔
۲۲ اگست کو تو بخار کی اسی کیفیت کی وجہ سے امیر محترم نے نمازِ جمعہ قرآن اکیڈمی کی مسجد
ہی میں ادا کی۔ البتہ ۲۹ اگست کو سو درجے کے بخار کے باوجود جامع دارالسلام باغ جناح میں خطبہ
جمعہ کے دوران دیگر باتوں کے علاوہ ملک کے موجودہ سیاسی انتشار اور تصادم کی کیفیت پر
بھی مفصل تبصرہ کیا۔ جمعرات ۲۸ اگست کو بعد نماز عشاء امیر محترم نے لاہور کے رفقاء کی دعوت

کی۔ کھانا پیش کرنے سے پہلے اپنے خطاب میں انہوں نے مختصراً دورے کی نوعیت اور اثرات پر گفتگو کے ساتھ اپنی غیر حاضری کے دوران تنظیم اسلامی، انجمن خدام القرآن و قرآن اکیڈمی کی کارکردگی پر تبصرہ کرتے ہوئے گہرے اطمینان کا اظہار کیا۔ میاں محمد نعیم نے اس دوران توسیع دعوت کا جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے اس کے طریق کار سے اتفاق کرتے ہوئے چند اہم امور کی طرف توجہ دلائی۔ سفرِ امریکہ کی روداد اور امیر محترم کا مذکورہ خطاب انشاء اللہ آئندہ ماہ کے میثاق میں پیش خدمت کئے جائیں گے۔ آخر میں قارئینِ میثاق سے التماس ہے کہ امیر محترم کی صحت کے لئے خصوصی دعا فرمائیں۔

تذکرہ و تبصرہ

ریاست و سیاست کے اسلامی اصول اور پاکستان میں اُن کا نفاذ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد
خطاب جمعہ ۴ رجولائی ۱۹۸۶ء باغ جناح لاہور

تحقیق و ترتیب : مقبول الرحیم مفتی

حضرات قومی اور ملّی اعتبار سے آج ہمیں جس افسوسناک صورتحال کا سامنا ہے اُس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ آزادی کے چالیس برس گزرنے کے بعد اب تک ہماری ملّی زندگی کا ایک رُخ متعیّن نہیں ہو سکا۔ ہماری قوم کے فعال اور سنجیدہ عناصر جو کسی نہ کسی صورت میں قیادت و سیادت اور رہنمائی کے منصب پر فائز ہیں عملی اور فکری دونوں اعتبار سے مختلف گروہوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ میں جب اس صورت حال کا جائزہ لیتا ہوں تو تین حلقے بالکل واضح نظر آتے ہیں۔ ایک حلقہ تو وہ ہے جس کی ساری فکر ساری جدوجہد صرف اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کے گرد گھومتی ہے۔ بدقسمتی سے یہی طبقہ سب سے بڑا ہے۔ اس طبقے کی اکثریت اُن لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں وراثت میں کچھ گدیاں کچھ جاگیریں مل گئی ہیں اور اُن کے طفیل جو مراعات اور مفادات اس طبقے نے حاصل کر لئے ہیں اُن کا تحفظ اور ان کی بقاء ہی اس گروہ کا مقصدِ زندگی ہے۔ اس طبقے کو دین سے مذہب سے جمہوریت سیکولرزم سے قوم سے وطن سے کسی شے سے کچھ سروکار نہیں۔

دوسرا حلقہ وہ ہے جو دین کا علم بردار ہے۔ یہ حلقہ خود مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹا ہوا ہے۔ میرے نزدیک جو بھی دینی جماعتیں اسلام کی سربلندی اور

شریعت کی بالادستی کے لئے سرگرم عمل ہیں اُن کے درمیان طریق کار کا خواہ کتنا ہی ما
اختلاف کیوں نہ نظر آئے سب مخلص ہیں کسی کی نیت پہ شک نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ
کو اختلاف ہے تو اپنے اختلاف کا اظہار کیجئے لیکن کسی کے بارے میں یہ کہنا کہ
وہ مخلص نہیں ہے یا فلاں کے ہاتھ بکا ہوا ہے درست نہیں ہے۔ ہر مسلمان کو بدگمانی
سے بچنا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ سوئے ظن ہے اور قرآن میں اس سے بچنے کی واضح
ہدایت کی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا	اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، بہت
كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ	گمان کرنے سے بچو کہ بعض گمان گناہ
بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ	ہوتے ہیں۔

(سورۃ الحجرات آیت - ۱۲)

دینی حلقے کی بعض جماعتیں تو وہ ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں بھی شریعت کو
نافذ ہوتا دیکھنا چاہتی ہیں انہیں عوام کے حقوق اور جمہوریت کی زیادہ فکر نہیں۔
جبکہ اسی دینی حلقے میں ایسے افراد اور جماعتیں بھی موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت
آئے گی، عوام کے حقوق بحال ہوں گے تب نفاذِ شریعت کا مرحلہ آئے گا۔ مولانا
مفتی محمود مرحوم کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمان کی جماعت جمعیت علمائے اسلام
اس موقف کی سب سے بڑی علمبردار ہے۔ اسی وجہ سے وہ شریعت بل کی مہم سے بالکل
الگ ہیں بلکہ اسے جمہوریت کی جدوجہد کے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ دینی حلقوں
کا موجودہ اختلاف بھی بالکل ویسا ہی ہے جیسے تقسیم ملک سے پہلے جدوجہد آزادی
کے دوران مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ
علیہ کا اختلاف تھا۔ مجھے اُن دونوں بزرگوں میں سے کسی کی نیت پر شک نہیں ہے
مولانا مدنی رح کی رائے یہ تھی کہ تمام خرابیوں کی جڑ انگریز کا اقتدار اور تسلط ہے
اس لئے پہلے ہندوؤں کے ساتھ ملکر مشترکہ جدوجہد کے ذریعے انگریز کو نکالا جائے
آزادی کے بعد ہندو مسلم معاملے کو ہم نمٹالیں گے۔ جبکہ مولانا عثمانی رح کی رائے یہ تھی
کہ ہندوؤں کے عزائم بہت خطرناک ہیں اگر انگریز اچانک آزادی دے کر چلا گیا تو
مسلمان ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائیں گے اس لئے آزادی سے پہلے مسلمانوں

ے مستقبل کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ دونوں آراء میں بظاہر زمین آسمان کا فرق تھا لیکن
میرے نزدیک دونوں بزرگوں کی آراء اخلاص پر مبنی تھیں۔ تیسرا حلقہ وہ ہے جسے
دین اور مذہب سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ یہاں صرف جمہوریت چاہتا ہے۔ اس حلقے
میں مختلف الخیال لوگ جمع ہیں۔ ہر ایک کے پاس جمہوریت کا اپنا اپنا تصور ہے۔
کسی کے پیش نظر امریکہ کی سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے۔ کوئی برطانوی جمہوریت
کا دلدادہ ہے۔ کسی کا آئیڈیل سکنڈے نیوین ممالک کی سوشل ڈیماکریسی ہے۔ کچھ
لوگ روسی طرز کی جمہوریت یہاں لانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے بھی آمریت کو
بطور اصول موضوعہ کے تسلیم نہیں کیا۔ روس کا دستوری نام بھی یو ایس ایس آر
یعنی یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلکس ہے۔ بہرحال ان تمام علمبرداران
جمہوریت کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ انہیں دین سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ دین کے ہمہ گیر
تصور سے ہی ناآشنا ہیں۔ یہ مذہب کے قائل ہیں لیکن اُسے فرد کا ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں
ہر شخص کو پوجا پاٹ کی عقائد کی اور عبادات کی آزادی دینے کے قائل ہیں اور دنیا کے
تمام سیکولر نظام ہائے حکومت میں کم از کم دستوری سطح پر اس مذہبی آزادی کی ضمانت
دی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی ملک میں ایک مذہب کے ماننے والے اتنی بڑی
اکثریت میں ہوں کہ فطری طور پر دوسروں کے لئے رکاوٹ بن جائیں۔ مذہب کے بارے میں یہی
رویہ ہمارے ملک کی اُن جماعتوں کا ہے جو جمہوریت کی داعی ہیں۔ ری پبلکن پارٹی
ہو تحریک استقلال ہو پیپلز پارٹی ہو ان میں سے کوئی بھی مذہب کے خلاف نہیں
ہے۔ سب مذہبی آزادی کی قائل ہیں۔ بھٹو صاحب نے مذہب کو اسی درجے میں رکھا
تھا۔ کہ جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ سوشلزم ہماری معیشت ہے اور اسلام ہمارا
مذہب ہے۔ یہاں ضمناً اُس پرانی بحث کو اپنے ذہن میں تازہ کیجئے جو ۷۰۔۶۹ کے
زمانے میں اپنے عروج پر تھی۔ جب پیپلز پارٹی نے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح
استعمال کی تھی تو ہمارے دینی حلقے کے اکثر و بیشتر لوگوں نے اُسے بڑی شدت سے رد
کیا تھا حالانکہ وہ خود اسی سے ملتی جلتی اصطلاح "اسلامی جمہوریت" بڑے زور شور
سے استعمال کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ میں نے اُس وقت بھی لکھا تھا اور آج بھی دہرا
رہا ہوں کہ یہ تناقض یہ دوہرا معیار یہ دوغلاپن کیوں ہے؟ اگر اسلام مکمل دین ہے

اور بلا شبہ ہے تو پھر آپ اُس کے ساتھ جمہوریت کا پیوند کیوں لگاتے ہیں اور اگر آپ کے لئے یہ جائز ہے تو دوسروں کے لئے سوشلزم کا پیوند لگانا کیوں ناجائز ہے۔ میرا موقف تو یہ ہے کہ اسلام کامل دین ہے۔ ایک حیاتیاتی اکائی ہے۔ یہ ایک ایسا درخت ہے جس میں کسی دوسرے درخت کی قلم نہیں لگ سکتی۔ یہاں پیوند کاری ممکن نہیں ہے۔ اس کی اپنی جڑ ہے، اپنا تنا ہے، اپنا پھیلاؤ ہے۔ البتہ اُس کے بعض پہلو جمہوریت سے مشابہ ہیں تو بعض سوشلزم سے۔ اس مشابہت کی وجہ سے اگر آپ نئی اصطلاحات وضع کرنا چاہتے ہیں تو جس طرح "اسلامی جمہوریت" میں کوئی قباحت نہیں اُسی طرح "اسلامی سوشلزم" میں بھی کوئی برائی نہیں۔

اصل میں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں اشتراکیت اور جمہوریت دونوں کی اچھائیاں موجود ہیں تو فوراً ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دورِ جدید کی ریاست میں اس کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس مسئلے نے عوام اور خواص، جہلا اور علماء سب کو الجھن (CONFUSION) میں ڈال رکھا ہے۔ جب تک تمدن کے ارتقاء کے حوالے سے احکامِ الٰہی کی حکمت کو نہ سمجھ لیا جائے یہ الجھن دور نہیں ہو سکتی۔ صورت مسئلہ یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت زندگی کے جن پہلوؤں پر انسانی تمدن اور انسانی فکر کا ارتقاء جاری تھا اُن کے بارے تفصیلی احکام نہیں دیئے گئے۔ صرف بنیادی اور اصولی باتیں بتا دی گئیں۔ تاکہ بوقت ضرورت اُن کی روشنی میں انسان اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنے لئے راہِ عمل تلاش کرے۔ اجتماعی زندگی کی بالکل ابتدائی سطح یعنی خاندان، میاں بیوی کا تعلق، اولاد و والدین کے حقوق معاشرے اور سماج میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات، میل ملاپ کے بارے میں تفصیلی احکام دیئے گئے ہیں۔ سورہ بقرہ، سورہ نساء، سورہ مائدہ، سورہ نور، سورہ احزاب، سورہ تحریم، سورہ طلاق، سورہ مجادلہ اور سورہ ممتحنہ جیسی مدنی سورتوں میں عائلی زندگی کے بارے میں آپ کو تفصیلی احکام ملیں گے۔ اس کی وجہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ انسانی فکر و تمدن اس پہلو سے اپنا ارتقاء مکمل کر چکے تھے اس لئے تفصیلی احکام عطا کر دیئے گئے۔

اس معاملے کو ایک مثال کے ذریعے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ قدیم زمانے میں

ین میں چھوٹے پاؤں عورت کے نسوانی حسن کا لازمہ سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے
بچیوں کے پیروں کی نشوونما کو ایک خاص حد پر روکنے کے لئے انہیں لوہے کے جوتے
پنا دیئے جاتے تھے۔ یہ مثال جزوی طور پر یہاں صادق آتی ہے یعنی انسان کی عائلی
زندگی میں چونکہ مزید نشوونما کی گنجائش نہیں تھی اس لئے تفصیلی احکام دیکر اُسے
لوہے کے جوتے پہنا دیئے گئے۔ اب اُن احکام سے آپ تجاوز نہیں کر سکتے۔

معاشیات اور سیاسیات کے بارے میں صرف بنیادی اصول دینے پر اکتفا کیا
گیا۔ کیونکہ ان معاملات میں فکرِ انسانی نے ابھی بڑی طویل مسافتیں طے کرنی تھیں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ایک ہزار سال بعد صنعتی انقلاب INDUSTRIAL
REVOLUTION نے رونما ہونا تھا۔ اس لئے یہاں تفصیلی احکامات کی بجائے صرف
بنیادی اصول بتا دیئے گئے۔ دیکھئے مشین کی ایجاد نے پورے معاشی ڈھانچے کو بدل
کر رکھ دیا ہے۔ ایک آدمی سرمائے سے مشین لگاتا ہے کچھ آدمی اُس مشین پر کام کرتے
ہیں۔ اُس کی پیداوار (PRODUCTION) بہت زیادہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا
ہے کہ اس پیداوار اور منافع میں سرمایہ لگانے والے اور محنت کرنے والوں کا کتنا
حصہ ہونا چاہیئے۔ یہ انتہائی پیچیدہ مسئلہ ہے دُنیا بھر کے معیشت دان اسی گتھی
کو سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح نظامِ سیاسیات کا معاملہ ہے۔ جب حضور
(صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے عرب میں قبائلی نظام تھا۔ فکرِ انسانی ریاست کے
تصور سے ناآشنا تھی۔ آج ریاست اور حکومت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اصل
شے ریاست ہے حکومت اُس کا انتظامی بازو (Administrative Wing) ہے۔
شہری کی اصل وفاداری ریاست سے ہوتی ہے حکومت سے نہیں۔ حکومت لوگوں کی
مرضی اور رائے سے بنتی ہے۔ لوگ کسی حکومت کی کارکردگی سے مطمئن ہوں تو اُسے
برقرار رہنے دیں یعنی الیکشن میں دوبارہ انہی لوگوں کو ووٹ دے کر برسرِ اقتدار رہنے
دیں اور اگر اُنہیں نااہل سمجھیں تو دوسرے لوگوں کو ووٹ دیکر برسرِ اقتدار لے آئیں۔
انسان نے سینکڑوں سالوں کی جدوجہد کے بعد حکومت کو بدلنے کا حق حاصل کیا ہے۔
نزولِ اسلام کے وقت یہ کیفیت نہیں تھی۔ لہٰذا اُس وقت کوئی ایسا سیاسی ڈھانچہ نہیں
دیا جو لوہے کے جوتے کی مانند پاؤں میں پڑ جاتا اور پھر اسلام تمدنی ارتقاء کا ساتھ نہ

جا سکتا۔ اسلام نے حکومت و سیاست کے ضمن میں بڑے جامع اصول عطا کئے ہیں۔ اُمت نے عہدِ خلافتِ راشدہ میں اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ان اصولوں کی روشنی میں نظام سلطنت قائم کیا اور چلایا ہے۔ آج ہم بھی انہی اصولوں کی روشنی میں اپنے لئے ریاست و حکومت کا جدید ترین نظام وضع کر سکتے ہیں۔ آیئے قرآن و سنت کی روشنی میں ان اصولوں کا ایک اجمالی جائزہ لیں۔ پہلا اصول سورہ حجرات کی پہلی آیت میں بتایا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

دوسرا اصول سورہ شوریٰ کی اڑتیسویں آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ	اور اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔

ان دو آیات میں بڑی جامعیت کے ساتھ آزادی اور پابندی کی حدود واضح کر دی گئی ہیں۔ معاملات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سورہ شوریٰ کی آیت میں اَمْرُهُمْ کا لفظ قابلِ توجہ ہے۔ اَمْرُهُمْ یعنی اپنے باہمی معاملات میں تو آزادی ہے۔ آپس کے مشورے سے اپنے لئے کوئی فیصلہ کریں۔ لیکن جو معاملات اللہ کے ہیں جن کے بارے اللہ نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامات و قوانین عطا کر دیئے ہیں اُن میں کسی کو ترمیم و تنسیخ کا یا کمی بیشی کا اختیار حاصل نہیں۔ سورہ حجرات کی پہلی آیت میں یہی اصول بیان کیا گیا ہے۔ دنیا کے سارے مسلمان مل کر بھی کسی حکم الٰہی میں تبدیلی یا تنسیخ کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یہ اسلام کا وہ حصہ ہے جس میں جمہوریت کا کوئی دخل نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے کو بڑی خوبصورت مثال سے واضح کیا ہے کہ مومن کی مثال اُس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ اب اگر اُس کی رسی سو گز لمبی ہے تو سو گز تک

(RAD...) کا ایک دائرہ وجود میں آجائے گا اُس کے اندر گھوڑا آزاد ہے جو چاہے
کرے - پچاس فٹ پر بیٹھے یا پچاس گز پر بیٹھے - کھونٹے سے ٹیک لگا کر بیٹھے یا پوری
رسی کھینچ کر سو گز کے فاصلے پر چلا جائے - بہر حال کسی طرف سے بھی وہ سو گز کے
دائرے سے باہر نہیں جا سکتا - یہ اُس کی حدود ہیں - آزادی اور پابندی کا یہی امتزاج
اسلامی ریاست میں کار فرما ہوگا - جہاں اللہ اور رسول کا واضح حکم موجود نہیں ہے وہاں
اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے مطابق باہمی مشورے سے معاملہ طے ہوگا - ہماری
فقہ کا بنیادی اصول ہی یہی ہے کہ جب تک کسی شے کو قرآن و سنت کی روشنی میں
حرام ثابت نہ کر دیا جائے وہ مباح ہے یعنی حلال ہے - اس اصول نے مباحات کے
دائرے کو بہت وسیع کر دیا ہے - یہی مباحات کا دائرہ ہے جس کو اَمْرُهُمْ
کہا گیا ہے - اس دائرے میں کسی فرد یا کسی گروہ کو اپنا خصوصی حق یا دعویٰ جتانے
کا کوئی اختیار نہیں - شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے حکم کے مطابق معاملات تمام مسلمانوں
کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے - یہی وہ شے ہے جسے کہتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت
ہے -

آزادی اور پابندی کے ان دو بنیادی اصولوں کے ساتھ تیسرا حکم ہے -

اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (سورۃ البقرہ - آیت ۲۰۸) پورے کے پورے دین میں داخل ہو جاؤ -

پورے دین کو بلا استثناء قبول کرنا پڑے گا - دین کے کسی حصے کو آپ نے جان
بوجھ کر چھوڑ دیا ہے تو گویا آپ نے پورے دین کو چھوڑ دیا ہے - اللہ تعالیٰ اس رویے
کو کسی درجے میں بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے - بنی اسرائیل کے اسی طرز عمل پر
اللہ نے انہیں جو وعید سنائی ہے وہ آج ہم پر بھی صادق آتی ہے -

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ	تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان
وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا	لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ
جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ	کفر کرتے ہو ! پھر تم میں سے جو
مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ	لوگ ایسا کریں، اُن کی سزا اس
الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ	کے سوا کیا ہے کہ دنیا میں ذلیل

يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞
(سورۃ البقرہ آیت ۸۵)

ذخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں! اللہ اُن حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔

کبھی جذبات کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے زیر اثر خطا ہو جائے تو وہ بات الگ ہے بندہ مومن سے کبھی غلطی یا گناہ سرزد ہو جائے تو وہ وہاں ڈیرہ نہیں لگا لیتا بلکہ فوراً توبہ کرتا ہے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرتا ہے۔ یہ ایمان کی نشانی ہے۔

آزادی اور پابندی کی حدود اور کامل اطاعت کے مطالبے کے ساتھ ساتھ شریعت اور شوریٰ کے نفاذ اور انعقاد (IMPLIMENTATION) کے اصول بھی قرآن نے بتا دیئے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ
(سورۃ النساء آیت ۔ ۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔

اس آیت میں اللہ اور رسولؐ کے ساتھ اطاعت کا لفظ دو مرتبہ لایا گیا ہے۔ تیسری مرتبہ اولی الامر کے ساتھ نہیں لایا گیا۔ علمائے تفسیر نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعتیں مستقل اور بالذات (THEIR OWN RIGHT) ہیں۔ رسولؐ سے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے یہ حکم دیا ہے تو اسکی دلیل لایئے قرآن سے یعنی رسولؐ کی اطاعت قرآن کے تابع (DEPENDENT) نہیں بلکہ اپنی جگہ مستقل (INDEPENDENT) ہیں۔ دوبار اَطِيْعُوْا کا لفظ اسی معنی کا اظہار کرتا ہے۔ جبکہ اولی الامر کی اطاعت مستقل نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے تابع ہے۔ اولی الامر سے اُس کے حکم کی دلیل طلب کی جا سکتی ہے۔ قرآن سنت سے دلیل لاؤ تب ہم اطاعت کریں گے۔ پھر مباحات کے دائرے میں بھی وہ اُمت کے مشورے کا پابند ہے۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے مطابق اُسے عوام کی رائے کا احترام کرنا ہوگا۔ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا ہوگا لوگوں سے رائے لینی ہو

لف آپکے ہمنوا ہیں ہم خیال ہیں تو آپ کا حکم مانا جائے گا۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت
ں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت عمرؓ کی رائے اُس وقت تک نافذ نہیں
ئی جب تک شوریٰ نے اُسے تسلیم نہیں کر لیا۔ سب سے اہم مثال اس شورائیت کی عراق
ر شام کی زرعی زمینوں کے مسئلے پر ملتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں جب
اق اور شام کے زرخیز علاقے فتح ہوئے تو مجاہدین نے جن کی تعداد بلاشبہ چند ہزار
ے زیادہ نہیں تھی اور جو سب کے سب یا صحابی تھے یا تابعی تھے حضرت عمرؓ سے
طالبہ کیا کہ ان علاقوں کی زرعی زمینیں مالِ غنیمت کی تقسیم کے شرعی اصول کے
طابق لشکریوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ بظاہر معاملہ بڑا سادہ تھا مالِ غنیمت
ی تقسیم کا واضح حکم قرآن میں موجود تھا کہ پانچواں حصہ بیت المال کا اور بقیہ چار
صے مجاہدین کے۔ مگر حضرت عمرؓ کی عقابی نگاہ اس کے نتائج کو دیکھ رہی تھی۔
گر اُس وقت یہ مطالبہ مان لیا جاتا تو دُنیا کا بدترین جاگیردارانہ نظام قائم ہو جاتا۔
ضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کا قرآنی حکم صرف اموالِ منقولہ
ے بارے میں ہے اموالِ غیر منقولہ اس کی ذیل میں نہیں آتے۔ لیکن حضرت عمرؓ کی
ئے محض اس وجہ سے نافذ نہیں ہوئی کہ یہ ایک صاحبِ امر کی رائے تھی۔
ئی ماہ تک معاملہ معلق رہا۔ اصحابِ حل و عقد کے سامنے دونوں طرف سے دلائل
یش کئے گئے۔ جب مجلسِ شوریٰ کے اصحابؓ حضرت عمرؓ کے دلائل سن کر اُن
ی رائے سے متفق ہو گئے تب ان کی رائے کو نافذ کیا گیا۔ خلافتِ عمرؓ کا یہی
یصلہ فقہِ حنفی میں اس اصول کی بنیاد بنا ہے کہ دُنیا کے جس ملک کو بھی مسلمان
ر قوت فتح کریں گے اُس کی زمینیں انفرادی ملکیت نہیں ہوں گی بلکہ وہ
مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہوں گی۔ یعنی ریاست اُن کی مالک ہوگی اور ان کی
نی حکومت کے بیت المال میں داخل کی جائے گی۔ اُن پر کاشت کرنے والوں
ی حیثیت موروثی مزارعین کی ہو جائے گی۔ وہ عشر کی بجائے خراج ادا کریں گے۔
ور خراج کا تعین حکومتِ وقت کے اختیار میں ہوگا۔ عشری اور خراجی زمینوں
میں یہی فرق ہے کہ عشری زمینیں انفرادی ملکیت ہوتی ہیں جبکہ خراجی زمینیں
ریاست کی ملکیت ہوتی ہیں۔ عشر کی شرح شریعت نے طے کر دی ہے خراج کی شرح

حکومت وقت طے کرتی ہے بالکل اُسی طرح جیسے زکوٰۃ کی شرح شریعت نے طے کر دی لیکن فدیہ اور جزیہ جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا اُس کی شرح حکومت طے کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ کا اجتہاد تھا۔ جس پر صحابہؓ کا اجماع ہو گیا۔ اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت مستقل نہیں ہے بلکہ کے معاملے میں کتاب و سنت کے تابع ہے اور اَمْرُ ھم یعنی مباحات کے دائرے میں مشورے سے مشروط ہے۔ اولی الامر کی رائے بجائے خود فیصلہ کن نہیں البتہ اگر وہ اپنے دلائل سے لوگوں کی اکثریت کو قائل کر لے تو اَمْرُھُمْ شوریٰ بَیْنَھُمْ کے مصداق وہ رائے نافذ ہو جائے گی۔

اس ساری بحث میں اہم ترا ور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے کہیں یہ نہیں بتایا کہ "اولی الامر" کہاں سے آئیں گے۔ حالانکہ آج کی جدید ریاست کے ڈھانچے میں یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ "اولی الامر" کا انتخاب کیسے ہوگا۔ ووٹر کی صفات (QUALIFICATIONS) کیا ہوں گی۔ انتخاب کتنے عرصے بعد ہوگا جو ایک بار منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آجائے گا وہ زندگی بھر بیٹھ آئے گا یا اُس کے لئے کوئی وقت یا عرصہ معین ہوگا۔ قرآن کی حد تک میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس میں اِن میں سے کسی سوال کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی۔ حدیث میں بھی جہاں تک میرا علم ہے "اولی الامر" کو وجود میں لانے کے طریق کار (PROCESS) کی وضاحت نہیں ملتی۔

اہلِ سنت کے نزدیک "اولی الامر" کا انتخاب بھی "اَمرھم شوریٰ بینھم" کے دائرے میں آتا ہے۔ مشورے کی حدود مقرر نہیں ہیں۔ حالات کے مطابق اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ جیسے سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا نام تجویز کیا جس پر سب لوگوں نے اتفاق رائے کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کیا اور لوگوں نے اُسے قبول کر کے حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت عمرؓ نے اپنی شہادت سے قبل چھ افراد کی کمیٹی قائم کر دی کہ وہ لوگوں سے مشورے کے بعد خلیفہ نامزد کریں۔ یہ سب مشورے کی مختلف صورتیں ہیں قرآن نے مشورے کی کوئی صورت معین نہیں کی۔ صرف

بہرحال ایسی صورت حال میں اسلام نے مسلمانوں کو مکلف نہیں ٹھہرایا کہ وہ بغاوت کریں البتہ "اولی الامر" کے عزل و نصب کے بارے میں اصول بات بتا دی کہ اس کا تعین مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہئے۔ یہ ایک طرح سے معیارِ مطلوب ہے۔ آئیڈیل

صول بتا دیا۔ وجہ کیا تھی؟ ابھی تمدنی ارتقاء کا عمل جاری تھا۔ اُس وقت صرف
ند قبائل کا معاملہ تھا قبیلوں کے شیوخ یا سرداروں کا مشورہ کر لیتے تو مشورے کا حق ادا
ہو جاتا تھا۔ ایک ایک شخص سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن یہ قبائلی نظام
یک عارضی شے تھی۔ اب بھی ہمارے ملک کے بعض حصوں میں اُس کی کچھ صورتیں
تی ہیں۔ بلوچستان میں سرحد میں لیکن اب یہ ایک علامتی چیز ہے۔ یہاں ایک نازک
ور باریک نکتہ بھی سمجھ لیجئے۔ اگر کوئی شخص طاقت سے یا کسی ذریعے سے مشورے
ے بغیر زبردستی حاکم بن جاتا ہے تو اسلام نے اُسے بھی حرام قرار نہیں دیا۔ اگر ایسا
ہوتا تو اُس کے خلاف بغاوت ہر صاحبِ ایمان پر فرض ہو جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو
سلم معاشرہ زبردست انتشار اور خونریزی کا شکار ہو جاتا۔ مثال کے طور پر ہندوستان
ں مغل بادشاہ بابر نے باہر سے آکر یہاں کے مسلمان بادشاہ ابراہیم لودھی کو شکست
ی اور اپنی سلطنت قائم کر لی۔ اُس نے یہ کام مقامی مسلمانوں کے مشورے سے نہیں
یا۔ ابراہیمؒ لودھی کی سلطنت کے خلاف بھی لوگوں نے بغاوت نہیں کی تھی اس
عتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ عوام نے اُس کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس پہلو سے ہم
کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک شکل تھی اُس دور میں "اولی الامر" کے وجود میں آنے کی۔
مثل جیسے ہمارے ہاں مارشل لاء کا معاملہ ہے۔ آخر سپریم کورٹ نے نظریہ ضرورت
ے تحت مارشل کو جواز عطا کیا ہے۔ کیا سپریم کورٹ یہ فیصلہ دے سکتی ہے کہ ہر شخص کو
مارشل لاء کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہیئے؟ بغاوت کر دینی چاہیئے؟ یہ بالکل انہونی
بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ سپریم کورٹ نے یہ پابندی لگائی کہ جلد از جلد انتخاب
کروائے جائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مارشل لاء لگانے والے بہت ماہر ثابت ہوئے
نوے دن کے وعدے کو ۹۰ مہینے بلکہ سو مہینے سے بھی زیادہ تک کھینچ لے گئے۔
جو عبوری دستوری حکم (پی سی او) کے ذریعے ان جج صاحبان کی ہی چھٹی کروا دی جنہوں
نے اُن کے اقتدار کو سندِ جواز عطا کی تھی۔ اس داستان کو ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے۔
بہر حال ایسی صورتِ حال میں اسلام نے مسلمانوں کو مکلف نہیں ٹھہرایا کہ وہ بغاوت کر دیں
نسبتہ "اولی الامر" کے عزل و نصب کے بارے میں اصول بات بتا دی کہ اُس کا تعین
مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیئے۔ یہ ایک طرح سے معیارِ مطلوب ہے۔ آئیڈیل

ہے۔ اب اگر کوئی شخص جبر سے آکر مسلط ہو گیا ہے اُس کے خلاف بغاوت کر
کی بجائے اُسے درست کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اُسے شریعت کا پابند بنانے کے ل
اُس کے سامنے کلمہ حق کہنے کو جہاد قرار دیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
فریضہ ادا کرنے میں جان کی بازی تک لگائی جا سکتی ہے۔ لیکن اُس کے خلاف بغا
کی اجازت نہیں دی گئی اگر کوئی حاکم امراللہ میں رخنہ نہیں ڈال رہا تو اُس کے خلاف
محض اس وجہ سے بغاوت نہیں کی جا سکتی کہ وہ لوگوں کے مشورے کے بغیر برسرا
آگیا ہے۔ یہاں ایک اور فرق بھی پیش نظر رہنا چاہیئے۔ ممانعت صرف بغاوت
کی گئی ہے۔ کلمۂ حق بلند کرنے کی نصیحت کرنے کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی ممانعت
نہیں کی گئی۔

اس بحث سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ قرآن میں اور سنت میں "اولی الامر"
وجود میں لانے کے لئے کوئی نظام نہیں دیا گیا۔ صرف اصول بتا دیا گیا کہ یہ کام "آ
میں مشورے" سے طے ہونا چاہیئے۔ مسلمان عوام باہمی مشورے سے حکومت کی تشکیل
کا کوئی بھی نظام اپنا سکتے ہیں۔ اب اس کے بعد اگلا سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ
کہ کسی اختلاف یا نزاع کی صورت میں اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ "اولی الامر"
حکومت کا فلاں اقدام شریعت کے مطابق ہے قرآن و سنت کے مطابق ہے یا ا
کے خلاف ہے۔ اس ضمن میں ۱۹۴۷ء کی منتخب شدہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمب
میں علماء بورڈ کی تجویز پیش ہوئی تھی۔ یعنی قرآن و سنت کے اور فقہِ اسلامی کے
علماء کا ایک بورڈ بنایا جاتے جو یہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہو کہ حکومت کا فلاں اقدام یا مقننہ
فلاں قانون قرآن و سنت کی حدود سے تجاوز کر رہا ہے یا قرآن و سنت کے مطا
ہے۔ اس تجویز پر یہ سوال پیدا ہوا اور بہت سے پیدا ہوا کہ اس اقدام سے مقننہ
پارلیمنٹ کا اختیار محدود ہو جائے گا۔ چند فقہا یا علماء کے ہاتھ میں ساری قوت
جائے گی۔ عملاً جمہوریت کی نفی ہو جائے گی۔ ایک طرح علماء کی حکومت قائم ہو جائے
ایران میں انقلاب کے بعد خمینی صاحب نے "ولایتِ فقیہہ" کے نام سے کم و بیش یہی اصول ا
کیا ہے اور جدید اصطلاح میں تھیوکریسی (THEOCRACY) ایسی ہی حکومت
کہتے ہیں ــــ ہمارے ہاں اس اصول کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ پھر بعد ازاں سابق مذکو

خاں مرحوم نے ۱۹۷۳ء کے دستور میں نظریاتی کونسل کے نام سے جدید و قدیم علماء پر مشتمل ایک مشاورتی ادارہ قائم کیا جو اب تک چلا آرہا ہے۔ اس ادارے میں تمام مکاتیبِ فکر کے علماء کرام شامل ہیں اور انہوں نے بلاشبہ بڑی محنت سے متفقہ طور پر بڑی تعداد میں مفید تجاویز پیش کی ہیں اور بہت کام کیا ہے اور تمام فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر کیا ہے لیکن وہ سب کچھ وزارت قانون میں جا کر DUMP ہو گیا ہے۔

اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل ممکن نظر آتا ہے۔ اختلاف خواہ حکومت اور عوام کے درمیان ہو۔ یا جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنے والے حلقوں اور دین کی بالادستی کے لئے کوشش کرنے والی قوتوں کے درمیان ہو۔ اس وقت ہمارے پاس کوئی POINT OF CONTACT نہیں ہے۔ کوئی نقطہ اتصال نہیں، افہام و تفہیم کا کوئی فورم نہیں۔ وہ ممکنہ فورم صرف عدلیہ کی صورت میں میسر آسکتا ہے۔ ملک کی اعلیٰ عدالتیں جو دستور کی محافظ سمجھی جاتی ہیں۔ انہیں اس بات کا اختیار دیا جائے کہ وہ اختلاف کی صورت میں فیصلہ کریں کہ کیا چیز قرآن و سنت کے مطابق ہے اور کیا چیز قرآن و سنت سے متجاوز ہے۔ جدید ریاستوں میں دستوری اختلافات بھی اعلیٰ عدالتوں میں ہی طے ہوتے ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت بھی اعلیٰ عدالتیں ہی فراہم کرتی ہیں۔ اسی طرح سے یہ اختیار بھی عدلیہ کو دیا جائے۔ جس شخص کو بھی کسی قانون یا کسی حکم کے بارے میں قرآن و سنت کے حوالے سے اختلاف ہے وہ عدلیہ کے سامنے اپنا موقف پیش کرنے میں آزاد ہو۔ عدالتیں فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں۔ علماء کرام اپنے دلائل پیش کریں۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات اور ماہرینِ قانون اپنی ماہرانہ رائے پیش کریں۔ سب کو سننے کے بعد عدلیہ جس چیز کو قرآن و سنت کے خلاف سمجھے اُسے ساقط کر دے۔ یا معاملہ دوبارہ غور کے لئے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے۔ عدلیہ کے فیصلے کی روشنی میں پارلیمنٹ قرآن و سنت کے مطابق نیا قانون بنائے اس ضمن میں یہ اعتراض بے معنی ہے کہ عدلیہ میں قرآن و سنت کو جاننے والے لوگ موجود نہیں۔ جب یہ نظام آجائے گا تو لوگ خود بخود قرآن و سنت کو جاننے کی تگ و دو کریں گے۔ مزید یہ کہ جب دونوں طرف

سے دلائل پیش کئے جائیں گے تو فاضل جج صاحبان دونوں فریقوں کو سن کر تمام
صحیح فیصلے پر پہنچ جائیں گے - ایک جاہل آدمی بھی دو فریقین کی بات سن کر معاملہ
کی تہ تک پہنچ جاتا ہے - ہمارے جج صاحبان تو بلاشبہ فاضل لوگ ہیں - آگے
بڑھنے کے لئے بہر حال ہمیں اپنے نظام کو مربوط (INTEGRATE) کرنا ہوگا - دین
اور دُنیا کی دوئی ختم کرنی ہوگی - یہی تو در اصل سیکولرزم ہے کہ مذہب علیحدہ
سیاست علیحدہ - شرعی عدالتیں علیحدہ دُنیاوی عدالتیں علیحدہ - جب تک
دو عدالتی نظام چلتے رہیں گے دو تعلیمی نظام چلتے رہیں گے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔
جب عدالتی نظام کی دوئی (—— DUALITY) کو ختم کر کے اعلیٰ عدالتوں کو قرآن و سنت
کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو پھر علماء کا مثبت کردار بھی سامنے
آئے گا - ایک طرف تو وہ عوام میں یہ جذبہ بیدار رکھیں گے کہ ہمیں انفرادی اور
اجتماعی دونوں سطحوں پر دین کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے دوسری طرف وہ مذہب
کے سامنے علمی سطح پر قانونی سطح پر قرآن و سنت کی وضاحت کریں گے - جمہوری
اور دینی قوتوں کا یہ اختلاف بھی ختم ہو جائے گا کہ اسلام کے لئے تحریک چلائی
جائے یا عوام کے حقوق کے لئے تحریک چلائی جائے۔

حضرات! آج کی گفتگو میں میں نے امکانی حد تک یہ واضح کرنے کی کوشش کی
ہے کہ جدید دور کی ریاست کو چلانے کے لئے اسلام نے ہمیں کیا اصول عطا کئے
ہیں اور انہیں ہم موجودہ نظام میں کیسے سمو سکتے ہیں - کیسے INCORPORATE
کر سکتے ہیں۔

اگر دو بنیادی سے امور کو طے کر دیا جائے
اول یہ کہ ملک میں عملاً شریعت کی بالادستی ہوگی۔
دوسرے یہ کہ اختلافی امور پر فیصلے کا اختیار عدلیہ کو ہوگا۔
تو بہت سے اختلافات اور نزاعات خود بخود ختم ہو جائیں گے - نتیجتاً ایک
اسلامی جمہوری فلاحی مملکت کے قیام کے لئے متحدہ جدوجہد کے راستے میں پیشقدمی
نسبتاً آسان ہو جائے گی۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

الہدیٰ

(نشست ۲۷)

تعمیر سیرت کی اساسات اور قرآن کا انسان مطلوب

سورۂ مومنون اور سورۂ معارج کی روشنی میں

(مباحث عمل صالح)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۵)

...علیکم! احمدہ واصلی علی رسولہ الکریم ـــــ امابعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ـــ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والذین ہم لفروجہم حٰفظون ۝ الا علی ازواجہم او ما ملکت ایمانہم فانہم غیر ملومین ۝ فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک ہم العٰدون ۝ ـــــ صدق اللہ العظیم!!

"اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور باندیوں کے پس ان کے معاملہ میں ان پر کوئی ملامت نہیں تو جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا تو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے۔"

حاضرین و ناظرین کرام! تعمیر سیرت کے جس قرآنی پروگرام کا ہم سورۂ مومنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۂ معارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ کے حوالہ سے مطالعہ کر رہے ہیں اس میں چوتھا وصف یا اس کا تقاضا جنسی جذبہ پر قابو رکھنا ہے ـــ یہ بات اپنی جگہ اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ انسان میں مختلف قسم کے حیوانی میلانات اور داعیات ہیں ان میں سے ایک اہم میلان جنسی جذبہ بھی ہے۔ جس طرح پیٹ کھانے کو مانگتا ہے اس سے اس کی اپنی زندگی کا تسلسل وابستہ ہے۔ اسی طرح تمام

حیوانات میں اپنی نسل و تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے فاطرِ فطرت نے جنسی جذبہ ودیعت کیا ہے۔ اس
کی اہمیت کتنی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دورِ جدید کے ایک بہت
بڑے ماہرِ نفسیات فرائڈ نے جنسی جذبہ کو انسان کے محرکاتِ عمل میں سب سے زیادہ قوی جذبہ قرار
دیا ہے۔ ہم اگرچہ اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ اس کا مغالطہ ہے۔ اس کی نگاہ میں ایک چیز
اہمیت اختیار کر گئی ہے اور انسانی فکر کا یہ خاصہ ہے کہ بسا اوقات کوئی ایک چیز انسان کے ذہن
پہ اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ باقی تمام چیزیں اسے اس کے تابع نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی
معاملہ فرائڈ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنی جگہ پر جنسی جذبہ
ایک بہت بڑا محرک ہے اور نہایت قوی جذبہ ہے۔

اس ضمن میں اگر ہم تاریخ انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انسانوں میں افراط و تفریط کی دو
انتہائیں نظر آتی ہیں۔ یا تو ایک طرف انسان نے اس جذبہ کو فی نفسہٖ شر قرار دیا کہ یہ ہے ہی سر تا سر
یہ برائیوں کی ماں ہے۔ اسی لئے ہمیں ایک بہت بڑے طبقہ میں یہ خیال ملے گا کہ جنسی جذبہ فی نفسہ
شر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ روحانی ترقی کا راستہ تجرد کی زندگی کے ذریعے سے اختیار کیا
کہ ساری عمر شادی بیاہ نہ کیا جائے۔ گھر گرہستی کا کھیڑا نہ پالا جائے۔ اس لئے کہ یہ راستہ ہے ہی
برائی کا۔ اس میں کوئی خیر ہے ہی نہیں۔ یہ ہے رہبانیت کا نظریہ جو دنیا میں مختلف مذاہب
میں مختلف ناموں سے رائج رہا ہے۔

پھر اس ضمن میں دوسری انتہا یہ ہوئی کہ اپنے اس جنسی جذبہ کی آزاد اور بے قید و بند
سے تسکین کرنا۔ اس میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ کرنا اور صحیح و غلط کے فرق و امتیاز کو ملحوظ نہ رکھنا،
ان سب کو روا رکھا گیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نوعِ انسانی جن بہت بڑی بڑی گمراہیوں
میں مبتلا ہوئی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جذبہ PERVERT ہو کر یعنی کج رو ہو کر فطرت
کی جو ایک معین راہ ہے اس کی بجائے دوسرے راستے اختیار کرتا ہے تو تاریخ انسانی میں
دو انتہائیں رہی ہیں۔

ان آیات میں قرآن مجید کا جو متوازن بیان ہمارے سامنے آتا ہے اس کے متعلق آپ نے
نوٹ کیا ہوگا کہ تین تین آیات دونوں مقامات پہ (سورہ مومنون اور سورہ معارج میں) بعینہٖ
شان سے وارد ہوئی ہیں کہ ایک شوشے تک کا فرق نہیں ہے اور جیسا کہ ہم آخر میں دیکھیں گے
کہ سات اوصاف یہاں زیر بحث آئے ہیں جن میں سے تین پہلے ہیں، تین بعد میں ہیں اور

...بی ہے۔ پھر اس مسئلہ پر دونوں مقامات پر تین تین آیات وقف کی گئی ہیں تو اس سے اس
...یت کا اندازہ ہوتا ہے۔

...ن آیات میں ہمارے سامنے جو متوازن بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر قانون کے دائرہ
...حلال پر اکتفا کرتے ہوئے ایک انسان اپنے اس فطری جذبہ کی تسکین حاصل کرتا ہے تو
... فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ کے۔ اس میں کوئی ملامت کی بات نہیں ہے اس میں
...کوئی برائی نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بلکہ صاف طور پر فرمایا: لَا رَهْبَانِيَّةَ
...الْإِسْلَامِ: اسلام میں رہبانیت بالکل نہیں ہے۔ اس کے برعکس آپؐ نے فرمایا:
...مِنْ سُنَّتِي۔ نکاح کرنا، شادی بیاہ کرنا، گھر گرہستی کی زندگی اختیار کرنا یہ میرا طریقہ
... یہ میری سُنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ لہٰذا ترکِ دنیا والی روش، تعمیرِ سیرت کے
... اخلاقی ترفیع حاصل کرنے کے لیے اسلام کی روش نہیں ہے، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ
...وسلم کی سنت نہیں ہے۔ وہ حضورؐ کا طریقہ نہیں ہے۔

لیکن ... دوسری طرف اس کے لیے حدبندیاں کر دی گئیں۔ نکاح کا جائز راستہ کھول دیا
... اس راستہ سے جو انسان اپنے جذبہ کی جو تسکین حاصل کرے اس کے لیے حدیث میں
...تک فرمایا کہ ایک بندہ مومن کے لیے یہ عمل بھی عبادت کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ جب
...یہ عمل اس قاعدہ، اس ضابطہ اور قانون کے تابع ہو رہا ہو جو اللہ نے اس کے لیے معین
...دیا ہے۔

ہمارے آج کے درس کا جو مرکزی موضوع تھا۔ اس کی جو MAIN THEME تھی
...سے متعلق بات تو اتنی ہی ہے جتنی میں نے آپ کے سامنے بیان کر دی۔ البتہ ان آیات
...ضمنی طور پر ایک مسئلہ ایسا بھی سامنے آیا ہے جس کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ بہت
...سے سوالات آپ کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے ہوں گے۔ ایک یہ کہ جنسی جذبہ کی تسکین کے
...جو قانونی راستے ہیں اس کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید دونوں مقامات پر: إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ
... مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ - یہ دونوں الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ بیویوں کا ذکر بھی ہے اور باندیوں
...یوں کا ذکر بھی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس کے بارے میں بہت سے اشکالات

... یہاں لا نفی جنس ہے۔ جس کا مفہوم ہوتا ہے کہ اس نوع کی کسی چیز کا بالکل نہ
ہونا۔ (مرتب)

آپ کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہوں گے۔ یہ بہت پیچیدہ معاملہ بھی ہے اور بڑا تفصیل طلب بھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چند باتیں اس ضمن میں آپ اچھی طرح ذہن نشین کریں تو ان شاء اللہ اشکالات رفع ہو جائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے کہ لونڈیوں یا غلاموں کا INSTITUTION (ادارہ) اسلام نے اپنے نظام کا کوئی جزو لازم نہیں ہے۔ لونڈی یا غلام رکھنا نہ فرائض میں سے ہے نہ واجبات میں سے ہے۔ یہ اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو لازم نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ جس وقت قرآن مجید نازل ہوا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ ہوئی تو معاشرہ میں یہ بالفعل موجود تھا جیسے بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو اصلاح طلب تھیں ویسے ہی یہ ادارہ بھی اصلاح طلب ادارہ کی حیثیت سے موجود تھا جیسے تدریجی طور پر اسلام نے دوسری چیزوں میں اپنے اصلاحی پروگرام کو آگے بڑھایا۔ ایسے ہی اس معاملہ میں بھی بہت سی اصلاحات اسلام نے نافذ کیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اجراء فرمایا۔ سب سے پہلی اصلاح یہ کہ یہ بات بار بار فرمائی گئی کہ یہ لونڈی غلام تمہارے ہی بھائی ہیں۔ یہ صرف ایک RELATIONSHIP ہے جو دنیا میں تمہارے اور ان کے مابین قائم ہو گئی ہے جیسے ایک EMPLOYER ہے اور ایک EMPLOYEE ہے لیکن بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں پس اگر یہ اونچ نیچ کہیں چلی آ رہی ہے کہ کوئی آقا ہے کوئی غلام ہے تو بحیثیت انسان وہ مساوی ہیں۔ لہٰذا آپ نے فرمایا کہ جو تم کھاتے ہو اپنے غلاموں کو بھی کچھ کھلاؤ اور جو کچھ خود تم پہنتے ہو وہی ان کو پہناؤ۔ ان کے ساتھ محبت، شفقت اور حسنِ سلوک رکھو۔ ایک طرف تو یہ اخلاقی تعلیم جس کے ذریعہ سے ان کی تالیفِ قلبی کی گئی یعنی — وہ جو گرے ہوئے تھے، دبے ہوئے تھے، پسے ہوئے تھے، ان کو اس حالت سے اٹھا کر جو آزاد انسان تھے ان کے برابر لانے کی کوشش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور اس کی دشمن بھی گواہی دیتے ہیں۔ ایچ جی ویلز جو حضور سے بہت دشمنی رکھتا ہے وہ بھی گواہی دیتا ہے کہ یہ پروگرام واقعتاً محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے روبعمل لا کے دکھایا۔

تیسری بات یہ کہ آپ نے ان کی آزادی کا ایک راستہ کھول دیا۔ قرآن مجید میں مکاتبت کا حکم آیا یعنی اگر کوئی غلام اپنے آقا سے یہ معاہدہ کر لے کہ میں اتنی رقم (اپنی آزادی کی قیمت کے طور پر) تمہیں ادا کر دوں گا تو اس آقا کو از روئے شریعت پابند کیا گیا ہے کہ وہ اس غلام

ے ساتھ معاہدہ کر دے ۔ اب وہ غلام محنت کرے، کمائی کرے اور طے شدہ رقم اپنے آقا
دے دے، وہ آزاد ہو جائے گا ۔ اس معاملہ میں کوئی آقا انکار نہیں کر سکتا کہ میں یہ
معاہدہ تمہارے ساتھ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں ۔ ان کی آزادی کے لئے پہلی شکل
اختیار کی گئی ۔ چنانچہ فرمایا گیا : وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ
اور وہ لوگ جو تمہاری ملک یمین یعنی غلام ہیں جو چاہتے ہیں معاہدہ (مکاتبت) آزادی کی کچھ
ے کر تو تم ان سے معاہدہ کر لو اس کو لکھ کر دے دو : فَكَاتِبُوْهُمْ فرمایا گیا ہے ۔
ن امر ہے اور امر وجوب کیلئے بھی آتا ہے ۔ پھر مسلمانوں عتی کہ ان آقاؤں کو بھی تلقین کی گئی
س معاملہ میں ان کے ساتھ تعاون کرو ۔ ان کی صدقہ اور خیرات سے مدد کرو ۔ چنانچہ
آیت میں جس میں مکاتبت کے لئے حکم آیا ہے آگے چل کر فرمایا : وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ
ہ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ " اور دو ان کو اللہ کے مال میں سے جو اس نے تم کو دیا ہے"
یہ نکتہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انسان کے پاس جو مال ہے اس کی ملکیت حقیقی
نسبت اللہ تعالیٰ اپنی طرف فرما رہا ہے ۔ یہ دوسری شکل ہے جو قرآن مجید نے اختیار کی ۔ اس
ن ان کی تالیف قلبی ان کے رتبہ کی بلندی اور ان کی آزادی کی راہ نکلی ــــــــــ پھر
پ کو یاد ہوگا کہ مطالعہ قرآن حکیم کے دوسرے سبق میں جب ہم نے حقیقی نیکی کو سمجھنے کے لئے
بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ کا مطالعہ کیا تھا جسے میں "آیت البر" سے تعبیر کیا کرتا ہوں تو گردن چھڑانے
ن غلاموں کی آزادی کے عمل کو اعلیٰ ترین نیکی کے کاموں میں شامل کیا گیا تھا ۔ پھر سورہ توبہ کی
ت ۶۰ میں صدقات واجبہ یعنی زکوٰۃ کے مستحقین کی جو آٹھ مدات مقرر فرمائی گئی ہیں ان
بھی گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے لئے زکوٰۃ سے رقم ادا کرنے کی مد بھی شامل ہے
۔ سورۃ البلد میں بڑے پیارے انداز میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے
اور شاید پہلے بھی ہو چکا ہے ۔ وہاں فرمایا : فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ
الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ انسان گھاٹی کو عبور کر نہیں پایا اور تم جانتے ہو کہ وہ گھاٹی
۔ تو ہے ؟ اس گھاٹی کی جب تفصیل بیان کی گئی تو سب سے پہلے ذکر ہوا ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ کا
۔ گردن کو آزاد کرا دینا ــــــ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دفتر فضائل کا
۔ نمایاں باب یہ بھی ہے کہ غلاموں اور کنیزوں کے طبقے میں سے جنہوں نے اسلام قبول
۔ وہ مسلمان جن میں حضرت بلال بھی شامل ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خطیر رقم دے کر

خریدا اور ان کو آزاد کیا ـــــ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں
آتا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں جس روز سے ایمان لایا ہوں ـــــ اور اندازہ کیجئے کہ
سابقون الاولون میں سے ہیں حضرت عثمان رضی کا ایمان لانے والوں میں چوتھا
نمبر ہے ـــ اس روز کے بعد سے کوئی جمعہ مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے ایک غلام آزاد نہ کیا
ہو لا اگر اتفاقاً ایسا ہو گیا کہ کسی جمعہ کو میرے لئے ممکن نہ ہوا تو اگلے جمعہ کو میں نے دو غلام آزاد کئے
یا کرائے ـ پھر شریعت کے احکام کی بعض فروگذاشتوں کے کفارہ کے طور پر ایک غلام یا لونڈی کو
آزاد کرنا یا کرانا قرار دیا گیا ـــــ تو یہ ہیں وہ تدابیر جو اسلام نے اس مسئلہ کی اصلاح کے لئے اختیار کیں

آگے بڑھنے سے قبل اس تیسری بات کے ضمن میں ایک ضروری بات مزید نوٹ کر لیجئے۔ یہ کہ اسلام
نے اس بات کو سب سے بڑے گناہوں یعنی کبائر معصیت میں قرار دیا ہے کہ کسی آزاد انسان کو پکڑ کر
غلام بنا لیا جائے ـــــ اسلام میں صرف ان لوگوں کو غلام اور لونڈی بنایا گیا ہے جو خالص قتال فی سبیل اللہ
کے نتیجہ میں محاذ جنگ پر گرفتار ہوتے تھے۔ ان کو کبھی فدیہ لے کر، کبھی بطور احسان، کبھی مسلمان قیدیوں
کے تبادلہ میں رہا کر دیا جاتا تھا اگر ان میں سے کوئی صورت مصالح دینی کے لحاظ سے مناسب نہ ہوتی ان کو
مسلمان معاشرہ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ان کے لئے حسن سلوک کی جو اعلیٰ اخلاقی تعلیمات اسلام دیتا ہے۔
اسے محدود وقت کے باعث میں اختصار سے بیان کر چکا ہوں۔

اس وقت دنیا میں جو سب سے زیادہ متمدن اور مہذب ترین مملکت کہلاتی ہے۔ یعنی امریکہ
اس میں جو کالے ہیں وہ کون ہیں؟ جنہیں غلاموں کی حیثیت سے اس طرح پکڑ پکڑ کر جس طرح شکاری گھات
لگا کر شکار کو زندہ پکڑتے ہیں، افریقہ سے جہازوں میں ایسے لاد کر جیسے بھیڑ بکریاں لادی جاتی ہیں
بطور غلام امریکہ لے جایا گیا۔ وہاں ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے ملک میں آزاد تھے
اور اس کے آزاد باشندے تھے۔ اگرچہ بعد میں امریکی سوسائٹی نے کسی حد تک اپنے آباء و اجداد کے اس
جرم کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسے ماننا پڑے گا۔ ابراہم لنکن کی عظمت اس ضمن میں تسلیم
کرنی چاہیئے۔ گو امریکن ذہنا اب بھی کالوں کو اپنے برابر سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ لیکن نوٹ کرنے
والی بات یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کچھ بھی ہوا ہے اور ان لوگوں نے کیا ہے جو صدیوں سے بڑے متمدن
اور مہذب ہونے کے مدعی چلے آ رہے ہیں۔ اسلام نے اس کو ایک بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ
کسی آزاد کو پکڑ کر غلام بنا لیں۔ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک کبیرہ معصیت ہے۔

اب میں چوتھی بات یہ عرض کروں گا کہ اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ اس CONSTITUTION

یعنی قطعی و حتمی منسوخی کی کوئی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ FINAL ABOLITION
جیسے کہ ہم شراب کے بارے میں دیکھتے ہیں کہ ابتدا میں حکم آیا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ تدریجاً
اصلاح کا قدم اٹھایا گیا اور بالآخر وہ وقت آگیا کہ فرمایا گیا: فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ "پس کیا
تم اس سے) باز آتے ہو کہ نہیں؟" اور فَاجْتَنِبُوْهُ "اب اس سے باز آجاؤ" اسی طریقہ
سے سود کی سب سے پہلے سورۂ روم میں اخلاقی سطح پر مذمت کی گئی۔ پھر سود در سود سے منع کیا گیا۔
سورہ آل عمران میں ہے۔ پھر حرمت کی آخری آیت سنہ ہجری میں حضورؐ کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل نازل
ہوئی۔ وہ سورہ بقرہ میں ہے کہ ہر نوع کا سود حرام مطلق قرار دے دیا گیا لیکن غلاموں اور لونڈیوں
کے بارے میں چونکہ اس نوعیت کا کوئی حکم قرآن مجید میں نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ ادارہ
یہ مدت تک چلتا رہا ہے۔

اب آپ یہ ہدایات پیش نظر رکھئے کہ جو خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ، جو خود پہنو وہ ان کو
پہناؤ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ پھر یہ کہ ان کی گردنوں کو چھڑانے کے لئے اخلاقی تعلیمات
بھی موجود ہوں۔ جیسے فَكُّ رَقَبَةٍ اور صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ میں گردنیں چھڑانے
کی مستقل مد رکھ دی گئی ہو۔ ان اسلامی تدابیر کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام میں وہ دور بھی آیا کہ
مشرق و مغرب میں عظیم ترین مملکتیں ان کی تھیں جن کو ممالیک اور غلام کہتے ہیں۔ ہندوستان میں جو
خاندان غلاماں حکمران تھا اور مصر میں جو ممالیک کی حکومت تھی تو یہ ہے نتیجہ اس اصلاحی عمل یعنی ———
REFOM کا جس کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ غلاموں کو
کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ غلامی سے اٹھا کر شہنشاہی تک پہنچا دیا۔ تخت ہند پر متمکن ہے غلام۔ وہ
چاہے قطب الدین ایبک ہو۔ وہ چاہے شمس الدین التمش جیسا درویش صفت اور ولی اللہ بادشاہ
ہو۔ اس طرح آپ کو دور خلفائے راشدینؓ، دور بنو امیہ اور دور بنو عباس میں علوم دین کی مسند
پر بہت سے وہ اکابر جلوہ افروز نظر آئیں گے جو آزاد کردہ غلاموں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جن
کی جوتیاں سیدھی کرنا اور اٹھانا بنو امیہ اور بنو عباس کے باجبروت بادشاہوں کے شہزادگان
اپنے لئے بہت بڑی سعادت خیال کرتے تھے۔

لیکن بہرحال اگر حکمت خداوندی نے اس کی آخری تنسیخ نہیں کی ——— اور کوئی شخص یہ
دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی ہے جو اسے FINALLY ABOLISH کرتی
ہو۔ اس ادارہ (INSTITUTION) کو حتمی و قطعی طور پر منسوخ قرار دیتی ہو تو بھی حیثیت

مسلمان اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ایمان واعتماد رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے
وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ذکر کہیں معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نسیان سے یہ بات رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ
مجھے معاف فرمائے میں یہ کلمے آپ کو سمجھانے کے لئے زبان سے نکال رہا ہوں۔ وَمَا كَانَ
رَبُّكَ نَسِيًّا۔ یہ معاذ اللہ کسی بھول چوک سے نہیں ہوا۔ ہمیں بہرحال اپنے علم سے اللہ
کے علم کو مقدم رکھنا ہے۔ کہاں ہماری عقل اور کہاں ہماری منطق! کہاں ہمارے فلسفے! جو تمام تر
کوتاہ اور محدود ہیں اور کہاں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں!! حکمة الله البالغة۔ تو وہ جو حکمت
بالغہ اور حکمت کاملہ ہے یقیناً اسی کا ظہور ہے کہ اس کی آخری درجہ میں تنسیخ قرآن مجید میں نہیں
آئی ــــ!!!

میں آخر میں پھر عرض کروں گا کہ اگر یہ نکات جو آج زیر گفتگو آئے ہیں ذہن نشین ہو جائیں
تو ان شاء اللہ اس ضمن میں کوئی اشکال نہیں رہے گا۔ اب میں آج کی اس گفتگو کو یہیں ختم کرتے
ہوئے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آج کے درس کے بارے میں آپ کوئی سوال یا اشکال پیش
کرنا چاہیں تو اپنی استعداد کی حد تک اس کا جواب دینے کے لئے حاضر ہوں۔

ــــ سوال وجواب ــــ

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا ہے کہ مصر میں اور ہندوستان میں غلاموں کی حکومت
رہی تو کیا اسلام کی رو سے غلام آزاد انسانوں پر حکومت کر سکتا ہے؟

جواب: بہت مناسب سوال ہے۔ اصل میں یہ بات جان لینی چاہیے وہ خاندان غلامان
یا ممالیک غلاموں اور مملوکوں کی نسل سے تھے لیکن اُس وقت غلام اور مملوک نہیں تھے۔ یہ
بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلامی تعلیمات کی بدولت غلاموں نے جو تدریجاً آزادی
کی شکل اختیار کی ہے تو غلاموں کے طبقہ سے ابھرنے والے لوگوں کو اس قدر عروج حاصل
ہوا کہ وہ تخت حکومت تک بھی پہنچ گئے اور علوم دینیہ کی مسندوں تک بھی حضرت بلال حبشی
رضی اللہ تعالیٰ عنہ غلام تھے لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔ اب وہ آزاد
تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ ان کو خطاب کرتے تھے تو فرماتے تھے "سیدنا بلال"
ہمارے آقا بلالؓ۔ اگرچہ سابقہ عہد میں غلام آزاد ہونے کے بعد بھی آزاد لوگوں کے مساوی
نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان کا مولیٰ کہلاتا تھا جنہوں نے اس کو آزاد کیا ہوتا تھا لیکن اسلام نے
جب ان کو آزادی دی ہے تو ان کو مساوی کر دیا ہے آزادوں کے ساتھ۔ ان میں کوئی فرق

و تفاوت نہیں رہا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے آج تلاوت کردہ آیات کی تفسیر فرماتے وقت یہ خیال پیش کیا تھا کہ مجرد رہنا صحیح نہیں ہے جبکہ بعض لوگ اسے روحانی ارتقاء کے لئے اچھی خصوصیت سمجھتے ہیں کچھ اس کی وضاحت فرمائیں!

جواب: اصل میں ہمارے یہاں بھی یہ تصورات باہر سے آگئے ہیں۔ یہ ہمارے دین کا نظریہ نہیں ہے۔ ویسے اس معاملہ میں یہ احتیاط رکھنی چاہیئے کہ اگر کسی شخص کی کوئی حقیقی مجبوری ہے تو اس پر بھی کوئی ملامت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں بھی ہے کہ اگر کوئی نکاح کی مقدرت نہیں رکھتا اس کے پاس اتنے مالی ذرائع نہیں ہیں کہ وہ خاندان کی کفالت کرسکے تو ایسی مجبوری کی وجہ سے اگر کوئی شخص شادی نہیں کر رہا تو یہ ایسی بات نہیں ہے کہ شادی کرنا کوئی فرض عین تھا جس کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کی زندگی کچھ ناقص ہوگئی۔ وہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے لیکن اسلام اس کو ایک مثالی قدر کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا کہ مجرد رہنے میں روحانی ترقی ہے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے کہ اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ۔ میں روحانی ارتقاء و ترفع کا جو راستہ لے کر آیا ہوں وہ شادی بیاہ اور گھر گرہستی کے باہر باہر سے نہیں نکلتا بلکہ اس کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے۔

حضرات! ہمارے آج کے درس کے بارے میں جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا جو مضمون چل رہا ہے، سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کا اہم ترین حصّہ تو یہ ہے کہ انسان اپنے جنسی جذبہ کی تسکین کے معاملہ میں حلال و حرام پر کاربند ہو۔ ناجائز راستوں کا رخ نہ کرے۔ اسی ضمن میں ایک مسئلہ اور بھی زیر بحث آگیا جس کے بارے میں میں نے چند وضاحتیں پیش کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ میری ان وضاحتوں سے آپ کو دلی اطمینان حاصل ہو جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اضع کے بہتر آداب
آپ کا بہترین انتخاب
فریش

فراستِ نبویؐ کا شاہکار

- غزوۂ حنین و اوطاس
- محاصرۂ طائف
- مشرکینِ عرب کا قلع قمع
- اہلِ کتاب سے معاملہ

ڈاکٹر اسرار احمد

آٹھویں خطاب کی پہلی قسط

ترتیب و تسوید : جمیل الرحمٰن

حضرات! میں نے گزشتہ جمعہ عرض کیا تھا کہ جہاں تک جزیرہ نمائے عرب میں انقلابِ اسلامی کی تکمیل کا تعلق ہے اس حد تک سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا بیان مکمل ہو گیا ہے اور میں اگلے جمعہ میں یعنی آج اسلامی انقلاب کے بین الاقوامی مرحلہ کو تفصیل سے بیان کروں گا۔ جس کا آغاز تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ میں خود فرما دیا تھا مگر جو فی الواقع خلافتِ راشدہ کے دوران اس شان سے آگے بڑھا ہے کہ محسوس نہ تھا کسی سیلِ رواں جیسا! لیکن چند وجوہ کی بنا پر میں نے اپنا یہ فیصلہ بدلا ہے۔ اولاً یہ کہ اس بات کی وضاحت نہیں ہو سکی تھی کہ اندرونِ ملکِ عرب انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل کے ضمن میں انقلابِ اسلامی کی مزاحم و مخالف قوتوں کے خاتمے یعنی MOPPING UP OPERATION کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کن کن اقدامات پر ہوگا! ——— ثانیاً میں نے یہ محسوس کیا کہ پچھلی مرتبہ انقلابِ اسلامی کے آخری یعنی چھٹے مرحلے کے بعض اہم واقعات بیان ہونے سے رہ گئے تھے ——— لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ آج اسی مرحلہ کے بارے میں مزید گفتگو ہو ——— رہا بین الاقوامی مرحلے کے آغاز کا مسئلہ! تو اس پر ان شاء اللہ اگلے جمعہ کو گفتگو ہوگی۔

انقلاب اسلامی کے اہم ترین موڑ انقلاب محمدی علی صاحب الصلوٰۃ والسلام کی جد و جہد کے دوران یکے بعد دیگرے اور برق رفتاری سے جو اہم واقعات پیش آئے ان میں سے بعض کو اہم ترین موڑ (TURNING POINT) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "النبی الخاتم" میں سفر ہجرت کو TURNING POINT قرار دیا ہے ___ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مشورہ سے اسلامی تقویم کا "واقعہ ہجرت" سے آغاز فرمانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آنجنابؓ کے نزدیک "ہجرت" کو بھی سیرت میں ایک اہم موڑ کی حیثیت حاصل تھی کیونکہ ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے انقلاب محمدی علی صاحب الصلوٰۃ والسلام کے لیے ایک base فراہم کی تھی جو تمکن فی الارض کے لئے ایک بنیاد بنی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے سورۃ حج کی اس آیت مبارکہ میں کہ: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ___ جس کے متعلق حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول یہ ہے کہ یہ اور اس سے ماقبل والی آیت دوران سفر ہجرت میں نازل ہوئی ہیں ___ پھر غزوۂ احزاب پر غور کیجیے ___ عرب میں ایک طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں اور دوسری طرف تمام مشرکین عرب بالخصوص قریش مکہ اور یہود ہیں ___ گویا حق و باطل کے مابین جو کشمکش جاری تھی اس طویل کشمکش میں اس اعتبار سے اس غزوہ احزاب کو بھی TURNING POINT کی حیثیت حاصل ہے۔ چونکہ اس غزوہ کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ: لَنْ تَغْزُوَكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ ___ چنانچہ اس کے نتیجہ میں حضورؐ نے اگلے سال عمرہ کی نیت سے وہ سفر کیا جو صلح حدیبیہ پر منتج ہوا اور جو درحقیقت فتح مکہ کی تمہید بنی۔ اس صلح اور فتح مکہ کے مابین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریباً دو سال کا جو پُرامن عرصہ ملا تو حضورؐ نے اس دوران اپنی دعوتی سرگرمیوں کو اندرون عرب تیز تر کر دیا اور آپؐ نے اپنی حیات طیبہ میں اسی مرحلہ پر پہلی مرتبہ بیرون ملک عرب بھی دعوتی سرگرمی کا آغاز فرمایا۔ چنانچہ حضورؐ نے متعدد سلاطین اور روساء کو نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے۔ حضورؐ کے اس اقدام سے واقعات کا جو سلسلہ شروع ہوا اس پر تو انشاء اللہ آئندہ صحبت میں گفتگو ہوگی۔ بہرحال اس موقع پر نوٹ کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ انقلاب محمدی علی صاحب الصلوٰۃ والسلام میں صلح حدیبیہ کو بھی اہم ترین موڑ کا مقام حاصل ہے۔

صلح حدیبیہ کے ٹوٹنے کے اسباب پچھلی تقاریر میں ان امور نیز صلح حدیبیہ کے ٹوٹنے کے اسباب پر میں قدرے تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں ـــــ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے بتایا تھا کہ صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ دوسرے عرب قبائل کا یہ اختیار تسلیم کیا گیا تھا کہ جو چاہے قریش کے ساتھ حلیف ہونے کا رشتہ قائم کر لے اور جو چاہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ـــــ اور جو چاہے بالکل غیر جانب دار رہے ـــــ چنانچہ صلح حدیبیہ ہی کے موقع پر بنو خزاعہ نے حضور کے اور بنو بکر نے قریش کے ساتھ تحالف کے تعلق کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ دونوں قبیلے مکہ کے باہر آباد تھے۔ اور ان میں کافی عرصہ سے باہمی عداوت چلی آ رہی تھی ـــــ ۸ھ کے غالباً جمادی الثانی میں بنو بکر کی طرف سے اچانک بنو خزاعہ پر حملہ ہوا۔ قریش کے بعض سربرآوردہ لوگوں نے بھیس بدل کر بنو بکر کا ساتھ دیا۔ بنو خزاعہ کے چند لوگوں نے حرم کعبہ میں پناہ لی لیکن ان کو وہاں بھی بخشا نہیں گیا اور ان کے اکثر افراد کا وہاں بھی خون بہایا گیا۔ بنو خزاعہ کا ایک وفد فریاد لے کر مدینہ منورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جس کے نتیجے میں آپ نے ان تین شرائط کے ساتھ اپنا سفیر مکہ بھیجا تاکہ قریش پر حجت قائم ہو جائے۔ پہلی یہ کہ بنو خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے اور جو مالی نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کی جائے۔ یہ منظور نہ ہو تو قریش بنو بکر کی حمایت سے دست کش ہو جائیں تاکہ مسلمان اپنے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ کے ساتھ مل کر اس جارح قبیلہ سے نمٹ لیں اور ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی منظور نہ ہو تو تیسری شکل یہ ہے کہ اعلان کر دیا جائے کہ ان سے صلح حدیبیہ ختم ہوتی ہے۔ اس وقت وہاں جوشیلے قسم کے لوگوں (HAWKS) نے فوراً جواب دیا کہ ہمیں صرف تیسری بات منظور ہے اور کوئی دوسری بات منظور نہیں ہے چنانچہ اس جواب سے گویا صلح حدیبیہ خود قریش نے ختم کر دی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی واپس تشریف لے آئے۔

قریش کا احساسِ پشیمانی فوری جوش کے ردعمل میں قریش کے جوشیلے لوگوں کی طرف سے صلح حدیبیہ کو ختم کرنے کا اعلان تو ہو گیا لیکن جلد ہی ابوسفیان کو احساس ہوا کہ یہ بات قریش کے مفاد میں نہیں ہوئی بلکہ ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی ـــــ اس وقت تمام بڑے لوگ تو رخصت ہو چکے تھے لہٰذا اب قریش کے رئیس اعظم ہونے کی حیثیت ان کو حاصل تھی

میں پہلے کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ ابوسفیان بڑے ٹھنڈے اور متحمل مزاج اور دوررس نگاہ کے حامل انسان تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو بڑے ہی جوشیلے اور ناعاقبت اندیش مزاج کے حامل لوگ ہوتے ہیں اگرچہ ابوسفیان نے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا لیکن ان کے اور قریش کے دوسرے جوشیلی طبیعت رکھنے والے لوگوں کے مزاج میں بڑا فرق تھا۔ وہ معاملات کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر غور و تدبر کے بعد اپنی رائے قائم کرتے تھے۔ چنانچہ ان کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے اور ہمیں جو کچھ بھی ہو اس صلح کی تجدید کر لینی چاہیے۔

صلح کی تجدید کے لیے ابوسفیان کی کوششیں!

میں وہ واقعات بیان کر چکا ہوں جو مدینہ آ کر صلح کی تجدید کے لیے ان کی کوششوں سے متعلق تھے۔ ان کو ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ وہ اپنی صاحبزادی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ میں بھی گئے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح میں تھیں تاکہ ان سے سفارش کروائیں لیکن وہاں جو کچھ ہوا وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اپنی بیٹی کے اس طرز عمل کو دیکھ کر انہیں ان سے سفارش کی گفتگو کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ اور وہ وہاں سے خاموشی کے ساتھ واپس آ گئے ——— ذرا نرم بات کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ تم یک طرفہ یہ اعلان کر کے کہ "میں قریش کے رئیس کی حیثیت سے صلح کی تجدید کرتا ہوں مکہ واپس چلے جاؤ اور پھر دیکھو کہ کیا ہوتا ہے"۔ چنانچہ ابوسفیان اس مشورہ پر عمل کر کے واپس چلے گئے۔ وہاں جب انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ میں یہ معاملہ کر کے آیا ہوں تو اکثر لوگوں نے کہا کہ یہ تو بالکل بے نتیجہ بات ہوئی۔ اسے نہ تو ہم صلح کی تجدید سمجھ سکتے ہیں کہ آرام سے بیٹھیں اور نہ اعلان جنگ سمجھ سکتے ہیں کہ جنگ کی تیاری کریں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقع پر طرزِ عمل اور عزم نیز اس کی مصلحتیں!!!

لیکن ادھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو عزم (Determination) سامنے آیا اور حضورؐ نے اس وقت جو یہ طرز عمل اختیار فرمایا کہ اب صلح کی تجدید نہیں کرنی ہے تو یہ وہ بات ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آج اس پر کچھ روشنی ڈالوں۔ سورہ توبہ کے قریباً دو رکوع ایسے ہیں جن کے مین السطور اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔

فی الوقت مسئلہ پر اس نقطۂ نظر سے غور کیجیے کہ اگر بظاہر دیکھا جائے تو ایک بہت بڑا تضاد (CONTRAST) سامنے آتا ہے کہ دو سال پہلے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شرائط پر صلح فرما رہے ہیں کہ جن کے متعلق تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یہ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ توہین آمیز ہیں۔ اس کا جو ردِّ عمل حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر ہوا وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ پھر یہ کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہ ردِّ عمل بھی ہمارے سامنے آ چکا ہے کہ حضورؐ فرما رہے ہیں کہ اٹھو اور احرام کھول دو اور ساتھ لائے ہوئے جانوروں کی قربانیاں دے دو۔ لیکن ایک شخص بھی نہیں اٹھا۔ تو بظاہر اس درجہ گر کر دو سال پہلے صلح کی گئی کہ جس سے تمام صحابہ کے دل مجروح ہوئے تھے۔۔۔ اور اب قریش کا رئیس اعظم مکہ سے چل کر مدینہ آتا ہے اور سر توڑ کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح صلح کی تجدید ہو جائے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ ہی نہیں ہوتے اور صلح نہیں فرما رہے۔۔۔ تو یہ یقیناً ظاہری اعتبار سے ایک بہت بڑا تضاد (CONTRAST) ہے۔

مستشرقین کی کوتاہ نظری!

اصل میں مستشرقین نے سیرتِ مطہرہ کے ایسے ہی معاملات کے اوپر ڈیرے جمائے ہیں۔ میں نے کئی بار آپ کو ٹائن بی جیسے PHILOSOPHER OF HISTORY کے طور پر بہت اونچے مقام پر تسلیم کیا جاتا ہے، کا جملہ سنایا ہے جس میں اس نے اپنی دانست میں اس تضاد کو SUM UP (سمو دیا) کیا ہے۔ اور وہ جملہ یہ ہے کہ:

"MOHAMMAD FAILED AS A PROPHET BUT SUCCEEDED AS A STATESMAN."

یعنی کفر نباشد کہ

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت سے ناکام رہے لیکن ایک سیاستدان اور مدبر کی حیثیت سے کامیاب رہے۔"

اس کے نزدیک مکہ میں حضورؐ کا جو بھی رویہ اور کردار سامنے آتا ہے، وہ تو یقیناً انبیاء کا ہے لیکن مدینہ میں آپؐ کا جو کردار ہے، وہ تو ایک مدبر، ایک سیاست دان، ایک STATESMAN اور ایک فوجی جرنیل کا کیرکٹر ہے۔ اور اس کی رائے ہے کہ کامیابی اس کو ہوئی ہے، اُس کو نہیں ہوئی۔

میں نے آپ کو پہلے بھی کسی موقع پر بتایا ہے کہ مسٹر منٹگمری واٹ نے جسے ایک مرتبہ
مارشل لا ء حکومت نے بھی پاکستان بلایا تھا کہ نیشنل سیرت کانفرنس میں وہ ہمیں سیرت کو سمجھائیں۔
وہ صاحب ہیں کہ جنہوں نے دو جلدوں (VOLUMES) میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت
مبارکہ لکھی ہے۔ لیکن انہوں نے دونوں جلدوں کے عنوانات علیحدہ علیحدہ رکھے گویا کہ
انہوں نے اپنے باطل نظریہ کے مطابق تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلی جلد کا عنوان
ہے " MOHAMMAD (صلی اللہ علیہ وسلم) AT MAKKA " اور دوسری
جلد کا عنوان ہے " MOHAMMAD (صلی اللہ علیہ وسلم) AT MADINA "
گویا اس کے نزدیک دو محمد ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) ــــ ایک مکہ والے اور دوسرے مدینہ
والے ۔ اعیاذ باللہ !

تضادِ ظاہری کا حل

یہ جو بظاہر تضاد (CONTRAST) سمجھا جاتا ہے جس پر مستشرقین نے ڈیرے جمائے ہیں۔ یہ دراصل حل (RESOLVE) ہو جاتا ہے
صرف اس بات پر غور و تدبر سے کہ ایک " انقلاب " کے مراحل و لوازم کے تقاضے کیا ہوتے ہیں
اور اس بات کی تفہیم سے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت صرف دیگر انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام
والی نہیں ہے۔ آپؐ خاتم الانبیاء ہیں، آپؐ آخر المرسلین ہیں۔ آپؐ پر نبوت اور رسالت کی تکمیل
ہوئی ہے۔ لہٰذا آپؐ کے سپرد یہ اضافی مشن بھی کیا گیا تھا کہ آپؐ دین الحق کو بالفعل قائم و غالب
اور نافذ فرمائیں ۔ آپؐ کی بعثت کی خصوصی و امتیازی شان یہ قرار دی گئی ہے اور آپؐ کو یہ امتیاز
سونپی گئی کہ :

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ
عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ :

" وہ (اللہ) ہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (قرآن مجید)
اور دین الحق (کامل شریعت) کے ساتھ تاکہ وہ (ہمارا رسول) اس کو تمام نظام ہائے
زندگی و اطاعت پر غالب کر دے "

جب کہ عام نبوت کا غالب فرض منصبی دعوت ہے، تبلیغ ہے، تذکرہ ہے، انذار و
تبشیر ہے۔ چنانچہ منصب نبوت کی اس بنیادی ذمہ داری کے ضمن میں قرآن مجید میں بار بار یہ الفاظ
آئے ہیں کہ ہمارے نبی اور رسول کے ذمہ سوائے پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت خاتم الانبیاء اور آخر المرسلین کہ جن پر نبوت اور رسالت کی
ہیں ہو رہی ہے ۔ ان تمام اساسی ذمہ داری کے ساتھ ایک اضافی اور خصوصی ذمہ داری یہ
تھی کہ آپ نظام دین الحق کو عملاً غالب اور قائم و نافذ کر کے دنیا کے سامنے اس کی ایک نظیر و مثال
قائم کر دیں تاکہ ابدالآباد تک کے لئے نوع انسانی پر حجت قائم ہو جائے ۔

خصوصی منصب کے خصوصی تقاضے

درحقیقت یہ وہ کام ہے جو ایک انقلابی جدوجہد (REVOLUTIONARY STRUGGLE)
کا متقاضی ہے ۔ ایک قائم شدہ نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ ایک صالح نظام کو قائم
کرنے کے تقاضے بالکل مختلف ہوتے ہیں ۔ یہ انقلاب صرف دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت
سے نہیں آتا ۔ اگرچہ اس میں بھی آغاز دعوت اور تبلیغ اور وعظ و نصیحت ہی سے ہوگا اور اس میں
تبشیر بھی ہوگی تبشیر بھی اور انذار بھی ہوگا ۔ لیکن اس کا ہدف ہوگا ان تمام کاموں کے نتیجہ میں ایک
انقلابی جمعیت فراہم کرنا ، اسے منظم کرنا ، اس کی تربیت کرنا اور اس میں وہ تمام ضروری اوصاف
پیدا کرنا جو کسی انقلاب کے لئے لازم ہے اور ناگزیر ہیں اور اس جمعیت میں آرمی والا ڈسپلن
پیدا کرنا "There is not to reason why! There is but to do and die"

جب یہ نظم اور ڈسپلن فراہم شدہ جماعت میں پیدا ہو جائے تو پھر اسے نظام باطل سے
ٹکرا ۔ جیسے میں علامہ اقبال کے اس شعر کے ذریعہ بار ہا بیان کرتا رہا ہوں کہ:

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

صلح حدیبیہ کی مصلحتیں

تو چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر انقلاب کا یہ نقشہ تھا ۔
اور چونکہ آپ کا دست مبارک ہر وقت حالات کی نبض پر رہتا تھا
لہٰذا آپ نے جس وقت اور جس موقع پر جو عمل فرمایا وہ درحقیقت اس مقصد کے پیش نظر فرمایا :
جب آپؐ نے یہ دیکھا کہ ابھی مہلت درکار ہے جسے ہم کہتے ہیں "TO BUY TIME" تو آپؐ
نے اس کے مطابق عمل فرمایا ۔ حدیبیہ کے مقام پر بظاہر گر کر اور دب کر صلح کرنے میں یہ مصلحت تھی کہ ابھی
وقت اور مہلت درکار تھی ۔ قرآن مجید میں اس کی ایک اور مصلحت بھی بیان ہوئی ہے ۔ وہ یہ کہ اگر اس
وقت جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سنہ ۶ھ میں حدیبیہ تک پہنچ گئے تھے ، قریش سے مسلح ٹکراؤ ہو جاتا

تو نہ صرف یہ کہ خونریزی بہت ہوتی بلکہ اندیشہ یہ تھا کہ بہت سے وہ مسلمان جو مکہ میں موجود تھے لیکن اپنی بعض مجبوریوں کے باعث ہجرت نہ کر پائے تھے، وہ اس مسلح تصادم کے نتیجہ میں مکہ میں قریش کے ہاتھوں قتل کر دیئے جاتے۔ اس لئے کہ جب جنگ ہوتی ہے تو اکثر اخلاقی اقدار اور قبائل کی روایات کا لحاظ نہیں رہتا۔ جذبات کے عالم میں یہ سب پامال ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلح تصادم ٹال دیا اور ہاتھ روک دیئے۔ چنانچہ اسی کا ذکر ہے سورۂ فتح کی آیت ۲۴ کے ان الفاظ میں: وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ.

تو یہ وہ مصلحتیں تھیں جن کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر بظاہر توہین آمیز شرائط پر بھی صلح کر لی۔

دو سال کے بعد کی صورت حال !!

لیکن دو سال کے بعد حالات کافی بدل گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جد و جہد کی کامیابی کے لئے فضا تیار ہو گئی۔ میں یہ وہی الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک حالات کی نبض پر مستقل طور پر رہا ہے۔ آپ کو اب بخوبی اندازہ ہے کہ اس وقت مکہ والوں میں کوئی دم خم اور بل بوتا موجود ہی نہیں ہے۔ اب کسی خونریز مقابلہ کا سرے سے امکان ہی نہیں ہے۔ اب قریش میں اتنی طاقت ہے نہیں کہ وہ [illegible] کر سکیں مقابلہ میں آ سکیں — اس کے برعکس ان دو سالوں کے اندر دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں اب مسلمانوں کی قوت اس قابل ہو گئی ہے کہ فیصلہ کن اقدام کیا جا سکتا ہے — پھر صلح ختم کرنے کی کوئی اخلاقی ذمہ داری مسلمانوں پر کسی طرح بھی عاید نہیں ہوتی — اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرما دیئے کہ قریش کے ایک حلیف قبیلہ نے مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ پر حملہ کیا۔ ان کو قتل کیا حتیٰ کہ حرم محترم میں بھی ان کو امان نہیں ملی۔ وہاں بھی ان کا خون بہایا گیا — اور اس خونریز معرکہ میں قریش نے بھی بھیس بدل کر اپنے حلیف قبیلہ کا پورا پورا ساتھ دیا۔ صلح حدیبیہ کی ایک شرط کی اس خلاف ورزی کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت منصفانہ اور عادلانہ شرائط پیش فرمائیں کہ بنی خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کیا جائے۔ ان کے مالی نقصان کی تلافی کی جائے — یا یہ کہ بنی بکر کی حمایت سے قریش دست بردار ہو جائیں تاکہ بنی خزاعہ اور مسلمان بنو بکر کے قبیلہ سے خود ہی نمٹ لیں۔ ان دونوں شرائط میں سے کوئی بھی منظور نہ ہو تو اعلان کر دیا جائے کہ آج سے صلح حدیبیہ ختم۔

قریش کے جوشیلے لوگوں نے جواب میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ ہمیں تیسری بات منظور ہے ۔ آج سے صلح حدیبیہ ختم ہے بے اثر و کالعدم ہوگئی ۔ اس موقع پر ابوسفیان بھی خاموش رہے اور قریش کے دوسرے جہاں دیدہ اور زیرک سردار بھی ـــــ یہ تو ابوسفیان کے بعد کے غور و فکر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ صلح حدیبیہ کو توڑنے کا اعلان کر کے ہم سے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب ہوا ہے ۔ اسی لئے وہ دوڑے دوڑے مدینہ پہنچے اور انہوں نے تجدید صلح کی کوششیں کیں ۔ جس میں ان کو ناکامی ہوئی ۔ آپ حضرات خود غور فرمائیں کہ اس موقع پر اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان کی پیش کش پر صلح کی تجدید فرما لیتے تو اس کے معنی کیا تھے ؟ یہ کہ کفر اور شرک کو بلا ضرورت اور خواہ مخواہ عرب کے مرکز مکہ مکرمہ اور حرم محترم پر قابض رہنے کے لئے مزید مہلت دی جائے ۔ جسے آج کل کی اصطلاح میں : FRESH RELEASE OF EXISTANCE کہا جاتا ہے ـــــــ اب اس کی قطعی ضرورت ہے نہ حاجت ۔ چونکہ مشیت الٰہی نے قریش کی عقلوں پر پردے ڈال دیئے تھے اور خود انہوں نے صلح حدیبیہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا تھا ۔ اس طرح اس بشارت کے عملی ظہور کا وقت آگیا تھا جو ہجرت سے متصلاً قبل سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ دی تھی :

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝ وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝

(آیات ۸۰ - ۸۱)

اور (اے نبی) کہہ دیجئے اے رب میرے ! (جہاں بھی تو مجھے داخل کرے) تو مجھ کو داخل کر سچا داخل کرنا اور (جہاں سے بھی تو مجھے نکالے) تو نکال مجھ کو سچا نکالنا اور مجھ کو عطا کر دے اپنے پاس سے حکومت کی مدد ٭ اور (اے نبی) کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل نکل بھاگا ۔ بے شک باطل ہے ہی بھاگ جانے اور مٹ جانے والا تھا

٭ ان دو آیات مذکورہ پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے جو حاشیے رقم فرمائے ہیں ان کا مطالعہ انشاء اللہ (باقی اگلے صفحہ پر)

صورت حال کا ادراک و شعور ضروری ہے

یہ ہے اصل صورت حال۔ ظاہر بات ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی مشن اور آپ کا امتیازی منصب دین الحق کو بالفعل بنفس نفیس قائم کرنا لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو تو کوتاہ نظری کے باعث یہ تضاد نمایاں نظر آئے گا کہ دو سال پہلے حضورؐ بظاہر اہانت آمیز شرائط پر صلح فرما رہے ہیں اور دو سال کے بعد مخالف فریق کا رئیس اعظم خود چل کر مدینہ آکر خوشامدیں کر رہا ہے۔ سفارشیں پہنچانے کی کوششیں کر رہا ہے کہ کسی طرح صلح کی تجدید ہو جائے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ و

(تسلسل) مفید رہے گا۔ مولانا مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

لے یعنی جہاں مجھے پہنچانا ہے (مثلاً مدینہ میں) نہایت آبرو اور خوبی و خوش اسلوبی سے پہنچا کہ حق کا بول بالا رہے اور جہاں سے نکالنا یعنی علیحدہ کرنا ہو (مثلاً مکہ سے) تو وہاں سے آبرو اور خوبی و خوش اسلوبی سے ہو کہ دشمن ذلیل و خوار اور دوست شاداں و فرحاں ہوں اور ہر صورت سچائی کی فتح اور جھوٹ کا سرنیچا ہو۔

لے یعنی غلبہ اور تسلط عنایت فرما جس کے ساتھ تیری مدد و نصرت ہو کہ حق کا بول بالا رہے۔ معاندین ذلیل و پست ہوں۔ دنیا میں کوئی قانون ہو سماوی یا ارضی اس کے نفاذ کے لئے ایک درجہ میں ضروری ہے کہ حکومت کا دباؤ ہو۔ جو لوگ دلائل و براہین سنتے اور آفتاب کی طرح حق واضح ہو چکنے کے بعد بھی ضد و عناد پر قائم رہیں۔ ان کے شر و فساد کو حکومت کی مدد ہی روک سکتی ہے۔ اس لئے سورۂ حدید میں فرمایا: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ ... وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ... الی آخر۔ (حدید رکوع ۳) ــــ یہ عظیم الشان پیش گوئی مکہ میں کی گئی جہاں ہر کوئی سامان غلبہ حق کا نہ تھا۔

سے یعنی کہہ دو قرآن کریم مومنین کو بشارتیں سناتا ہوا اور باطل کو کچلتا ہوا پہنچا بس سمجھ لو کہ اب دین حق غالب ہوا اور کفر بھاگا نہ صرف مکہ سے بلکہ سارے عرب سے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے اس وقت کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ ایک چھڑی سے سب پر ضرب لگاتے اور فرماتے: جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا اور جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ (الخ)۔ ہر ایک اوندھے منہ گر جاتا تھا۔ اس طرح قرآن کی ایک پیشگوئی پوری ہوئی۔"

ہیں کہ توجہ ہی نہیں دے رہے اور کامل خاموشی اختیار فرما رہے ہیں۔

میں چاہتا تھا کہ آج اس بات کو واضح کر دوں کہ یہ ہے درحقیقت وہ نکتہ کہ سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا صحیح فہم حاصل ہو ہی نہیں سکتا جب تک یہ بات پیش نظر نہ ہو کہ مشن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا مشن ASSIGN کیا گیا تھا! حضورؐ کو خصوصی ذمہ داری یہ سپرد کی گئی تھی! چنانچہ آیت مبارکہ کا یہ حصہ کہ: ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ! ایک شوشہ کے تغیر کے بغیر سورۂ توبہ، سورۂ فتح اور سورۂ صف میں وارد ہوا ہے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے آیت کے اس حصہ کو پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا کہ ان الفاظ مبارکہ کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک صالح انقلاب عملاً برپا کرنے کا مشن سونپا گیا تھا۔ لہٰذا انقلاب کے جو مراحل ہیں ان میں سے ہر مرحلہ پر اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چاہے بظاہر اس میں تضاد نظر آ رہا ہو۔

تضادات کے ضمن میں نہایت غور طلب بات!!

سب سے نمایاں تضاد تو وہ ہے جو میں کئی بار بیان کر چکا ہوں کہ مکہ میں بارہ برس تک حکم یہ ہے کہ لا تقدمت اتھاؤ۔ چاہے تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پہ لٹا کر تمہارے کباب بنانے کا سامان کیا جائے۔ تمہیں ہر طرح سے اذیتیں دی جائیں تم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جائیں۔ تمہاری نگاہوں کے سامنے تمہاری دینی بہن (حضرت سمیہؓ) کو انتہائی بہیمانہ طور پر شہید کر دیا جائے۔ ان کے شوہر حضرت یاسرؓ کے جسم کے وحشیانہ طریق سے چیتھڑے اڑا دیئے جائیں۔ یہ سب کچھ جھیلو، برداشت کرو تمہیں جوابی کارروائی تو کجا اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

لیکن مدینہ آنے کے بعد وہی محمد رسول اللہ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ کا اب حال کیا ہے! یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ۔ وہ اللہ کی راہ میں قتال کر رہے ہیں۔ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ تو بظاہر اس میں بھی بڑا نمایاں تضاد ہے لیکن بظاہر یہ جو سارے تضادات ہیں اور یہ جو سارے CONTRASTS بظاہر نظر آتے ہیں۔ یہ سارے حل ہوتے اور RESOLVE ہوتے ہیں تو صرف اسی طور سے کہ انقلاب کے فلسفہ کو سامنے رکھ کر اس کے مختلف مراحل اور ہر مرحلہ کے مختلف تقاضوں کو

سمجھنے کی معروضی کوشش کی جائے۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کو اسلامی انقلابی جدوجہد سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے گا تو یہ تمام مراحل ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی نظر آئیں گے۔ فکر و نظر گواہی دیں گے کہ ہر مرحلہ صحیح ہے اور ہر اقدام اس مرحلے کی مناسبت سے بالکل درست اور مناسب ہے۔

غزوۂ حنین و اوطاس، محاصرۂ طائف

گذشتہ جمعہ کی تقریر میں بات فتح مکہ تک پہنچی تھی اور فتح کے بعد کے چند اہم واقعات کا ذکر رہ گیا تھا۔ میری کوشش ہوگی کہ ان کو بھی آج اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔

فتح کے بعد کے چند اہم واقعات

فتح مکہ کے بعد قریش کے بہت سے لوگ ایمان لے آئے اور مکہ کے اردگرد کے بہت سے قبائل نے بھی از خود پیش قدمی کر کے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ہوازان اور ثقیف کے قبائل پر اس کا الٹا اثر پڑا۔ جو طائف اور اس کے اردگرد کی سرسبز و شاداب وادیوں میں آباد تھے۔ یہ دونوں قبیلے بھی بڑے جنگ جو اور فنونِ حرب سے واقف تھے۔ میں اپنی کسی سابقہ تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ طائف کو بعض اعتبارات سے مکہ کے جڑواں شہر (TWIN CITIES) کا مقام حاصل تھا۔ طائف میں رؤسائے مکہ کے باغات اور جائیدادیں بھی۔ پھر ان قبائل کے مابین تجارت بھی تھی اور رشتہ داریاں بھی ——— چنانچہ فتح مکہ کے بعد یہ قبائل بڑے مضطرب ہوئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب ہماری باری ہے لہٰذا دونوں قبیلوں کے سرداروں نے مشورہ کر کے طے کیا کہ اس وقت مسلمان مکہ میں جمع ہیں، ہم خود پیش قدمی کر کے پورے جوش و خروش اور زور و شور سے ان پر حملہ کر دیں۔ ان حالات کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں خبر پہنچی تو آپؐ نے تحقیق و تصدیق کے بعد تیاریاں شروع کر دیں اور اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ دس ہزار تو وہ قدسی شامل تھے جو مدینہ سے آئے تھے، دو ہزار میں فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے نو مسلم اور مشرکین بھی شریک تھے۔ یہ فوجیں حنین کی طرف بڑھیں۔ چنانچہ انقلابِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے ضمیمہ اور تکملہ کے طور پر اگلے ہی مہینے شوال ۸ھ میں غزوۂ حنین و غزوۂ اوطاس ہوا اور حضورؐ نے طائف کا محاصرہ کیا۔ اب طرح جزیرہ نمائے عرب کی

یکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ آخری مسلح اقدامات تھے ۔

زدۂ حنین

ہوزان اور ثقیف کے قبائل کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اہل وعیال کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے تاکہ ان کی حفاظت کی غرض سے ان کی فوجیں بڑی پامردی ردیں، جانیں دیدیں لیکن کسی صورت میں بھی پسپائی اختیار نہ کریں۔ انہوں نے فوج کی ترتیب طرح کی کہ اپنے بہت سے قدر انداز وں کے دستوں کو پہاڑیوں پہ اور گھاٹیوں پر تعینات اور بقیہ فوج نے دوبدو جنگ کیلئے پہلے سے پہنچ کر میدان میں موزوں و مناسب مقامات صف آرائی کرلی۔ اس موقع پر بعض مسلمانوں کی زبان سے اپنی کثرت کے زعم میں یہ الفاظ نکل کہ آج مسلمانوں پر کون غالب آسکتا ہے ۔! جب وہ تین سو تیرہ تھے اور ایک ہزار کے لشکر ب آئے تھے تو اس موقع پر تو مسلمانوں کا بارہ ہزار کا لشکر تھا ۔ اللہ تعالیٰ کو یہ گھمنڈ پسند نہ تھا کثر مؤرخین کا بیان ہے کہ پہلے تبے ہی میں ہوزان اور ثقیف کے تیر اندازوں نے مسلمانوں پر جو لی کی بوچھاڑ کی ہے تو ایک عام بھگدڑ مچ گئی ۔ بارہ ہزار کا لشکر تتر بتر ہو گیا ۔ اکثر روایات کی ے ایک پیکرِ مقدس میدان میں اپنی سواری پر جارہا ۔ جو تنہا ایک فوج تھا، ایک اقلیم تھا، مہ کمالاتِ انسانیہ تھا ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ چارسو جاں نثار ساتھ تھے ۔ بارہ ہزار کے لشکر میں سے صرف سو ۔ بہرحال اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری سے اترے اور علَم ہاتھ میں لیا اور ی حیاتِ مطہرہ میں پہلی بار پورے جلال نبوت کے ساتھ رجز پڑھا ۔ صحیح بخاری میں روایت ہے پ نے بلند آواز سے فرمایا:

انا النبیّ لا کذب	"میں اللہ کا نبی ہوں (اس میں ذرہ برابر
انا ابنَ عبدِ المطلب	جھوٹ نہیں ہے، میں عبد المطلب
	(جیسے شجاع) کا بیٹا ہوں۔"

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قریب ہی تھے ۔ وہ بلند آواز بھی تھے ۔ لہٰذا آپ نے انہیں ۔۔۔ نصار و مہاجرین کو پکارو ـــــ انہوں نے نعرہ لگایا:

یا معشر الانصار !	"اے گروہ انصار"
یا اصحاب الشجرۃ !	"اے اصحاب شجرہ! (بیعت رضوان والو!)"

ان پرتاثیر الفاظ کا کانوں میں پڑنا تھا کہ انصار و مہاجرین یہ کہتے ہوئے دفعتاً پلٹ پڑے کہ: لَبَّیْكَ یَا رَسُولَ اللّٰہِ! وَسَعْدَیْكَ نَحْنُ بَیْنَ یَدَیْكَ ۔ پھر جو مسلمانوں نے کو کیا ہے تو اچانک جنگ کا نقشہ ہی پلٹ گیا ۔ عارضی و وقتی شکست کا۱ فتح سے بدل گئی ۔ بہت سے کافر کھیت رہے ۔ اکثریت فرار ہو گئی اور جو رہ گئے وہ اسیر بنا لیے گئے ۔ بے شمار مالِ غنیمت (مویشی ۔ سامانِ حرب) ہاتھ آیا ہے ۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس پوری صورت حال کا بیان الفاظ مبارکہ ہوا فرمایا ہے :

..... وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ○

(سورۂ توبہ ۲۵ ۔ ۲۶)

اور حنین کا دن یاد کرو جب تم اپنی کثرت پہ نازاں تھے لیکن وہ تمہارے کچھ کام نہیں آئی اور تم پر زمین وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی ۔ پھر تم پیٹھ موڑ کر بھاگ نکلے ۔ پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور اہل ایمان پر تسلی و تسکین نازل فرمائی اور ایسی فوجیں بھیجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور کافروں کو عذاب دیا ۔ اور کافروں کی سزا یہی ہے ۔

---

۱ اکثر مورخین اور اہل سیر کی رائے یہ ہے کہ پہلے ہی ہلے میں مسلمانوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی جبکہ صحیح بخاری میں حضرت براءؓ کی حدیث یہ ہے کہ: وانا لما حملنا علیھم انکشفوا فاکبنا علی الغنائم فاستقبلنا بالسھام " اور ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے ، تو ہم مال غنیمت پر لوٹ پڑے ۔ تو انہوں نے ہمیں تیروں پہ دھر لیا " ۔ اس تیراندازی سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی ، انتشار اور پراگندگی پیدا ہو گئی اور وہ میدان سے بھاگ نکلے ۔ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہی تھا کہ اس جنگ میں بعض نومسلم اور اکثر مشرکین اس غرض سے شریک ہوئے تھے کہ عین جنگ میں دغا دیں ۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ام سلیمؓ کے جو اس جنگ میں شریک تھیں یہ الفاظ مروی ہیں کہ فتح کے بعد انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ اقتل من بعدنا من الطلقاء انھزموا بک (اہل مکہ)

مغالطہ کا ازالہ اس موقع پر یہ عرض کر دوں کہ یہ مغالطہ لاحق نہ ہو کہ معاذ اللہ یہ تبصرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یا سابقون الاوّلون اور مومنین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ہے۔ دس ہزار کا جو لشکر حضورؐ کے جلو میں آیا تھا ممکن ہے کہ ان میں کچھ ضعیف الایمان اور کچھ منافقین بھی شامل ہوں۔ ایک بڑے مجمع اور لشکر میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اس لشکر میں دو ہزار کے لگ بھگ وہ افراد بھی تھے جن میں سے اکثر ایک ماہ قبل ایمان لائے تھے۔ رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا ہے اور شوال ۸ھ میں غزوہ حنین ہوا ہے گویا ایمان کی حالت میں ان پر ایک ماہ سے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ پھر اس دو ہزار کی تعداد میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو ابھی ایمان ہی نہیں لائے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ قبیلہ کی عصبیت یا مالِ غنیمت کے حصول کے لئے اسلامی لشکر کے ساتھ ہو گئے ہوں۔

مآل کار بہر حال تھوڑے یا زیادہ لوگ اپنی کثرت پر نازاں تھے کہ آج ہمیں کون شکست دے سکتا ہے۔ چونکہ اُمّتِ مسلمہ کو پوری نوعِ انسانی کو رشد و ہدایت، دعوتِ خیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے برپا کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا غلطی پر تنبیہہ اور سزا بھی ضروری تھی۔ جیسا کہ غزوۂ اُحدؓ کے موقع پر ہوا تھا کہ بتیسؓ افراد کی طرف سے اپنے کمانڈر کے حکم کی نافرمانی کی پاداش میں ابتدائی فتح شکست میں بدل گئی تھی اور ستر صحابہ کرامؓ شہید اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوتے تھے۔ چنانچہ کثرت پر جو ناز ہوا تھا اس کی سزا ملی کہ ابتدا میں حنین و ثقیف کے تیر اندازوں نے اسلامی لشکر کی صفیں درہم برہم کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس طور پر یہ سبق دیا کہ حسب اللہ کا توکل اسباب پر نہ ہو بلکہ مسبب الاسباب پر ہو۔ حسب استطاعت مادی اسباب و وسائل ضرور فراہم کئے جائیں لیکن مومن کو تو ہر آن اور ہر لحظہ نگاہ رکھنی چاہئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر: اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ — اللہ کے اذن کے بغیر پتا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ کسی کام کے لئے کتنے ہی اسباب و وسائل جمع ہو جائیں، لازم نہیں ہے کہ وہ کام حسب منشا تکمیل پا جائے اور کسی شے

[illegible] مسلسل، یا رسول اللہ! ہمارے سارے ان کفار کو قتل کر دیجئے۔ انہی نے آپؐ کو ہزیمت و شکست دلوائی۔ (مرتب)

کے لئے کچھ بھی وسائل و اسباب موجود نہ ہوں پھر بھی اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ شے عدم محض سے آن واحد میں وجود میں آ جائے۔ اللہ کی قدرت کاملہ پہ جب تک اس نوع کا ایمان نہ ہو اور جب تک اس کی ذات پر کامل توکل نہ ہو جائے تو یوں سمجھئے کہ وہ ابتدائی اوصاف (Pre-Qualifications) اور وہ صلاحیتیں جو اسلام کو دنیا میں ایک کامل نظام زندگی کی حیثیت سے غالب، قائم اور نافذ کرنے کے لئے درکار ہیں۔ ابھی انہی کا فقدان ہے۔ اسلامی انقلاب جیسے عظیم ترین کام کے لئے تو وہ جماعت درکار ہے جس کے ہر ہر فرد میں یہ صفات پہلے وجود میں آ چکی ہوں کہ ان کا اللہ پر کامل ایمان و یقین ہو اور ان کا کوئی تکیہ اور بھروسہ ظاہری اسباب و وسائل اور ذرائع پر نہ ہو بلکہ توکل خالصتاً اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔ اسی بات کو اذہان و قلوب میں راسخ کرنے کے لئے حنین میں وقتی و عارضی شکست کے ذریعہ مسلمانوں کو جھنجوڑ دیا گیا۔

اوطاس شکست خوردہ فوج کا ایک حصہ نخلہ اور طائف کے درمیان اوطاس کے مقام پر رک گیا اور ایک بڑا حصہ طائف جا کر پناہ گزین ہوا۔ ایک اور قبیلہ جشم کا سردار درید ابن الصمۃ جو بہادری اور شاعری میں پورے عرب میں مشہور تھا جس کی عمر اس وقت سو برس سے بھی زیادہ ہو گئی تھی لیکن طائف کا سردار مالک ابن عوف اس کو چارپائی پر ڈال کر حنین لے گیا تھا تاکہ اس کے سو سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا سکے۔ حنین کی شکست کے بعد درید اپنے قبیلہ کی کئی ہزار جمعیت لے کر اوطاس آیا، طائف کے جو لوگ یہاں رک گئے تھے وہ بھی اس کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر خبریں پہنچ رہی تھیں۔ چنانچہ آپؐ نے ایک مختصر فوج ان کے استیصال کے لئے بھیج دی جس کے ہاتھوں اللہ نے فتح نصیب فرمائی۔ درید قتل ہوا جس کے بعد یہ جمعیت اپنے مقتولین کو چھوڑ کر منتشر ہو گئی۔ کچھ لوگ طائف چلے گئے اور کچھ اسیر بنا لئے گئے۔

محاصرۂ طائف حنین اور اوطاس کی شکست خوردہ فوجیں طائف میں پناہ گزین ہوئیں لہٰذا طائف والوں کی مدد سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا وہ قریش کا تقریباً ہمسر تھا۔ نہایت شجاع، دلیر اور فنون جنگ سے واقف ــــ عروہ ابن مسعود یہاں کے رئیس تھے۔ سورۃ الزخرف میں مشرکین کا جو یہ قول نقل ہوا ہے: وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ” اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اترا یہ قرآن کسی بڑے شخص پر ان دو بستیوں

ہیں کہ قرتین سے ان کی مراد مکہ اور طائف کے شہر تھے اور طائف کے بڑے آدمی سے مراد عروہ بن مسعود تھے۔ ان کا ذکر صلح حدیبیہ کے ضمن میں آچکا ہے۔ وہ بعد میں ایمان لے آئے تھے لہٰذا صحابیت کے شرف سے مشرف ہوئے ۔ طائف کے گرد مضبوط فصیل تھی اور وہاں ایک مضبوط قلعہ بھی موجود تھا جس میں طائف والوں نے سال بھر کا سامان خورد ونوش جمع کیا تھا۔ فصیل پہ چاروں طرف منجنیق اور جابجا تیر انداز معین کر دیئے تھے ۔ اسلامی فوجوں نے محاصرہ کیا اور یہ پہلا موقع تھا جب اسلامی فوج کی طرف سے فصیل اور قلعہ شکن آلات کا استعمال ہوا۔ طائف کے لوگوں نے فصیل سے لوہے کی گرم سلاخیں اور آگ برسائی اور اتنی شدت سے تیر پھینکے کہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا ۔ بیس دن محاصرہ رہا لیکن شہر فتح نہ ہوسکا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاورت کے بعد محاصرہ اٹھالیا۔ اس موقع پر بعض اصحابؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اہل طائف کے لئے بد دعا فرمائیں۔ لیکن نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا کے بجائے دعا فرمائی :

اللّٰھُمَّ اھْدِ ثَقِیْفًا وَأْتِ بِھِمْ "اے اللہ! ثقیف کو ہدایت بخش کر میرے پاس حاضر ہو جائیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول ہوئی اور محاصرہ اٹھانے کے چند دنوں بعد ہی عروہ بن مسعود اپنے چیدہ چیدہ ساتھیوں کے ساتھ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ بعد ازاں انہی حضرات کی دعوت و تبلیغ سے ہوزان اور ثقیف کے قبیلوں کے تمام افراد ایمان لے آئے ۔

(جاری ہے)

شہدائے بالاکوٹ کا مقام اور پیغام

بالاکوٹ کے معرکہ میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے جو عالم انسانیت کے لئے رونق و زینت، اور مسلمانوں کے لئے شرف و عزت اور خیر و برکت کا باعث تھے، مردانگی و جوانمردی، پاکیزگی و پاکبازی، تقدس و تقویٰ، اتباع سنت و شریعت، اور دینی حمیت و شجاعت کا وہ عطر جو خدا جانے کتنے باغوں کے پھولوں سے کھینچا گیا تھا، اور انسانیت اور اسلام کے باغ کا جیسا عطر مجموعہ صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا، اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لئے کافی تھا، ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ کی مٹی میں مل کر رہ گیا، مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی، حکومت شرعی ایک عرصہ کے لئے خواب بے تعبیر ہو گئی، بالاکوٹ کی زمین اس پاک خون سے لالہ زار اور اس گنج شہیداں سے گلزار بنی جس کا اخلاص و للہیت، جس کی بلند ہمتی و استقامت، جس کی جرأت و ہمت اور جس کے جذبۂ جہاد و شوق شہادت کی نظیر پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے، بالاکوٹ کی سنگلاخ و ناہموار زمین پر چلنے والے بے خبر مسافر کو کیا خبر کہ یہ سرزمین کن عشاق کا مدفن اور اسلامیت کی کس متاع گرانمایہ کا مخزن ہے،

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

اللہ کے کچھ مخلص بندوں نے ایک مخلص بندے کے ہاتھ پر اپنے مالک سے اس کی رضا اس کے نام کی بلندی اور اس کے دین کی فتح مندی کے لئے آخری سانس تک کوشش کرنے اور اس کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دینے کا عہد کیا تھا جب تک ان کے دم میں دم رہا اسی راہ

میں سرگرم رہے، بالآخر اپنے خون شہادت سے اس پیمان وفا پر آخری مہر لگادی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۴ ر ذوالقعدہ کا دن گزر کر جو رات آئی وہ پہلی رات تھی جس رات کو وہ سبک دوش و سبک سر ہو کر میٹھی نیند سوئے۔

وہ خلعت شہادت پہن کر جس کریم کی بارگاہ میں پہنچے وہاں نہ مقاصد کی کامیابی کا سوال ہے نہ کوششوں کے نتائج کا مطالبہ، نہ شکست و ناکامی پر عتاب ہے نہ کسی سلطنت کے عدم قیام پر محاسبہ، وہاں صرف دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں، صدق و اخلاص اور اپنی مساعی اور وسائل کا پورا استعمال، اس لحاظ سے شہداء بالاکوٹ اس دنیا میں سرخرو ہیں، اور انشاء اللہ دربار الٰہی میں بھی باآبرو کہ انھوں نے اخلاص کے ساتھ اپنے مالک کی رضا کے لئے اپنی مساعی اور وسائل کے استعمال میں ذرہ برابر کمی نہیں کی، ان کا وہ خون شہادت جو ہماری مادی نگاہوں کے سامنے بالاکوٹ کی مٹی میں جذب ہو گیا، اور اس کے جو چھینٹے ہم تم پر باقی تھے، ۲۶ ر ذوالقعدہ کی بارش نے ان کو بھی دھو دیا، وہ خون جس کے نتیجہ میں کوئی سلطنت قائم نہیں ہوئی کسی قوم کا مادی و سیاسی عروج نہیں ہوا اور کوئی نخل آرزو اس سے سرسبز ہو کر بارآور نہیں ہوا، اس خون کے چند قطرے اللہ کی میزان عدل میں پوری سلطنتوں سے زیادہ وزنی ہیں، یہ فقیران بے نوا جنھوں نے عالم مسافرت میں بیکسی کے ساتھ جان دی اور جن کی اب دنیا میں کوئی مادی یادگار نہیں یہ اللہ کے یہاں ان بانیان سلطنت اور مؤسسین حکومت سے کہیں زیادہ قیمتی اور معزز ہیں، جن کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے "وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ" (منافقون ۴)

بے شک شہداء بالاکوٹ کے خون نے دنیا کے سیاسی و جغرافیائی نقشہ میں کوئی

ری تغیر نہیں پیدا کیا، خون شہادت کی ایک مختصر سی سرخ لکیر ابھری تھی، اس کی جگہ نہ جغرافیہ نویس کے طبعی نقشہ میں تھی، نہ مورخ کے سیاسی مرقع میں، لیکن کسے خبر کہ یہ خون شہادت دفتر قضا و قدر میں کس اہمیت و اثر کا مستحق سمجھا گیا، اس نے مسلمانوں کے نوشتۂ تقدیر کے کتنے دھبے دھوئے، اس نے اللہ تعالیٰ کے یہاں جس کے یہاں محو و اثبات کا عمل جاری رہتا ہے "یَمۡحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثۡبِتُ وَعِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ" (رعد ۳۹) کون سے نئے فیصلے کروائے، اس نے کسی مستحکم سلطنت کے لئے خاتمہ و زوال اور کسی پسماندہ قوم کے لئے عروج و اقبال کا فیصلہ کروایا، اس سے کس قوم کا بخت بیدار ہوا، اور کس سرزمین کی قسمت جاگی، اس نے کتنی بظاہر ناممکن الوقوع باتوں کو ممکن بنا دیا اور کتنی بعید از قیاس چیزوں کو واقعہ اور مشاہدہ بنا کے دکھا دیا۔

یوں تو شہدائے بالاکوٹ میں سے ہر فرد کا پیغام یہ ہے کہ "یٰلَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ ۙ بِمَا غَفَرَ لِیۡ رَبِّیۡ وَجَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ" (یٰسین ۲۶، ۲۷) مگر گوش شنوا اور دیدۂ بینا کے لئے ان کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لئے جد و جہد کرتے رہے، جہاں ہم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکیں، جہاں ہم دنیا کو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا نمونہ دکھا کر اسلام کی طرف مائل اور اس کی صداقت و عظمت کا قائل کر سکیں، جہاں نفس و شیطان، حاکم و سلطان اور رسم و رواج کے بجائے خالص اللہ کی حکومت و اطاعت ہو "وَیَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ" (انفال ۳۹) جہاں طاعت و عبادت اور صلاح و تقویٰ کے لئے اللہ کی زمین وسیع اور فضا سازگار ہو، اور فسق و فجور و معصیت کے لئے زمین تنگ اور فضا ناسازگار ہو، جہاں ہم کو صدیاں گزر جانے کے بعد پھر "اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ

وَآتَوُا الزَّکوٰةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ[1] کی تفسیر اور تصویر پیش کرنے کا موقع مل سکے، تقدیر الٰہی نے ہمارے لئے اس سعادت و مسرت اور اس آرزو کی تکمیل کے مقابلے میں میدان جنگ کی شہادت اور اپنے قرب و رضا کی دولت کو ترجیح دی، ہم اپنے رب کے اس فیصلہ پر رضامند و خورسند ہیں، اب اگر اللہ نے تم کو دنیا کے کسی حصہ میں کوئی ایسا خطۂ زمین عطا فرمایا، جہاں تم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکو، اور اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرہ کے قائم کرنے میں کوئی مجبوری مخل اور کوئی بیرونی طاقت حائل نہ ہو، پھر بھی تم اس سے گریز کرو اور ان شرائط و اوصاف کا ثبوت نہ دو، جو مہاجرین و مظلومین کے اقتدار اور سلطنت کا تمغۂ امتیاز ہیں[2] تو تم ایسے کفران نعمت اور ایک ایسی بدعہدی کے مرتکب ہوگئے جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے، ہم نے جس زمین کے چپہ چپہ کے لئے جدوجہد کی اور اس کو اپنے خون سے رنگین کردیا، اکوڑے اور شیدو کے میدان اور نورد اور مایار کی رزم گاہ سے لیکر بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ہمارے خون شہادت کی مہریں اور ہمارے شہیدوں کی قبریں ہیں، تم کو خدا نے اس زمین کے وسیع رقبہ اور

---

[1] ترجمہ۔ وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں، تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰة اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے (الحج، ۴۱)

[2] أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ، الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۔" (الحج ۳۹، ۴۰)

[3] پھر ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں جانشین کیا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ (یونس۔ ۱۴)

سرسبز و شاداب خطے سپرد فرمائے اور بعض اوقات قلم کی ایک جنبش اور بڑے نام کوشش نے تم کو عظیم سلطنتوں کا مالک بنا دیا۔ "ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ"۔ اب اگر تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور تم نے آزادی کی اس نعمت اور خداداد سلطنت کی اس دولت کو جاہ و اقتدار کے حصول اور حقیر و فانی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا، تم نے اپنے نفوس اور اپنے متعلقین، ملک کے شہریوں اور باشندوں پر خدا کی حکومت اور اسلام کا قانون جاری نہ کیا، اور تمہارے ملک اور تمہاری سلطنتیں اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے قانون و سیاست اور تمہارے حاکم اپنے اخلاق و سیرت اور اپنی تعلیم و تربیت میں غیر اسلامی سلطنتوں اور غیر مسلم حاکموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے، تو تم آج دنیا کی ان قوموں کے سامنے جن سے تم نے مسلمانوں کے لئے الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا اور کل خدا کی عدالت میں جہاں اس امانت کا ذرہ ذرہ حساب دینا پڑیگا کیا جواب دو گے؟

ایسا نادر و زریں موقعہ عطا فرمایا ہے جس کے انتظار میں چرخ کہن نے سیکڑوں کروٹیں بدلیں، اور تاریخ اسلام نے ہزاروں صفحے الٹے، جس کی حسرت و آرزو میں خدا کے لاکھوں پر نفس اور عالی ہمت بندے دنیا سے چلے گئے، اس موقعہ کو اگر تم نے ضائع کر دیا تو اس سے بڑا تاریخی سانحہ اور اس سے بڑھ کر حوصلہ شکن اور یاس انگیز واقعہ نہ ہوگا، بالاکوٹ کے ان شہیدوں کا جو ایک دور افتادہ بستی کے ایک گوشہ میں آسودۂ خاک ہیں، ان سب لوگوں کے لئے جو اقتدار و اختیار کی نعمت سے سرفراز اور ایک آزاد اسلامی ملک کے باشندے ہیں پیغام ہے: "فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ"[1]

---

[1] ماخوذ از سیرت سید احمد شہید جلد ثانی۔

Coca-Cola
Coca-Cola
it!

ڈاکٹر اسرار

سے

فیق ڈوگر کا

خصوصی انٹرویو

ہم انتخابی سیاست پر یقین نہیں رکھتے مظاہروں سے اقتدار پر قبضہ کریں گے

ہفت روزہ "دید شنید" نے جون ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا خصوصی انٹرویو شائع کیا۔ دورانِ گفتگو ڈاکٹر صاحب نے پاکستان میں احیائے اسلام کی کوششوں اور مشکلات و اختلافات کی تاریخ پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا۔ یہ باتیں اگرچہ پہلے بھی کئی مرتبہ مختلف انداز میں سامنے آچکی ہیں۔ لیکن ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

کے علاوہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے حوالے سے اس تاریخ کی ایک تعلیمی اہمیت بھی ہے

(ادارہ)

س: آپ نے زندگی کا سفر کہاں سے شروع کیا۔
ب تک کن مراحل سے گزرے۔

ج: زندگی تو شروع ہوتی ہے اس دنیا میں پیدائش سے، ہونے ہوئے حالات اس طرح ہیں، پیدائش اپریل ۱۹۳۲ء کی ہے۔ مشرقی پنجاب میں ایک قصبہ ہے حصار، جو اب ہریانہ میں ہے۔ پیدائش وہاں کی ہے۔ میٹرک ؎ ہ ڈسٹرکٹ ہ ۱۹۴۷ء میں میٹرک کیا۔ وہیں سے امتحان دیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پر آیا تھا۔ نویں اور دسویں جماعت میں تھا جب مسلم لیگ کا نقطہ عروج تھا۔ تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا۔ حصار مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ ۱۹۴۶ء میں قائد اعظم نے اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں جو خطاب کیا تھا اس میں حصار سے دو نمائندے آئے ان میں ایک میں تھا لیکن اس سے پہلے میں مولانا مودودی کی تحریک سے بھی متعارف ہو چکا تھا اور ایک ہمدردی اور دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ بچپن میں علامہ اقبال کی ملی شاعری سے بھی بہت متاثر تھا۔ ساتویں جماعت کا طالب علم تھا جب میرے بھائی نے مجھے بانگِ درا لاکر دی تھی میں اُسے پڑھتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں اس کا اثر میرے دل پر سب سے گہرا ہے۔ حفیظ کے شاہنامہ سے بھی ملی جذبہ پیدا ہوا، جب پاکستان بنا تو ہم ۱۷ میل پیدل چل کر قافلے کے ساتھ پاکستان آئے۔ ۲۰ دنوں میں آگ اور

خون کے دریا عبور کر کے آئے ہم ایک ماہ محصور رہے یہاں
وہاں ایک بزرگ تھے جنہوں نے مسلم مسجد کا سنگ بنیاد
رکھا تھا۔ مولانا عبدالصمد خاں نقشبندی۔ ان کا مزار
رینالہ خورد میں اب بھی ہے، اُن کے بیٹے وہاں گدی
نشین ہیں۔ ان کی روحانی برکت اور مرکزی شخصیت کی
وجہ سے مسلمان وہاں مجتمع رہے متحد رہے اور ہندوؤں
کا مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر فوج نے آکر ہمارے محاصرے کو
توڑا تھا۔ یہاں آتے ہی میرا جماعت اسلامی سے
تعلق ہو گیا۔

پہلے میں جماعت اسلامی کا ہمدرد رہا دو سال تک،
اس وقت میں گورنمنٹ کالج میں ایف ایس سی کا طالب علم
تھا۔ میڈیکل کالج میں گیا تو اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن بن
گیا پھر ناظم لاہور، ناظم پنجاب اور پھر ناظم اعلیٰ تک بنا۔
۱۹۵۴ء میں تعلیم سے فارغ ہوا تو جماعت اسلامی کی رکنیت
اختیار کر لی۔ لیکن اس کے جلد ہی بعد مجھے محسوس ہوا کہ
جماعت کی پالیسی صحیح نہیں ہے جماعت قبل از وقت سیاست
میں آگئی ہے اور اس نے الیکشن کا جو راستہ اختیار کیا
ہے وہ اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کا مزاج انقلابی
تھا اور اُسے انقلابی طریقے سے آگے چلنا چاہیئے تھا۔

کسی اجتماعی تحریک کا آغاز نہیں کیا۔ آخر کار میں نے ۱۹۶۵ء
میں اکیلے تحریک کا آغاز کیا، سوچا چاہے بزرگ کچھ نہیں
کرتے تو خود اُٹھنا ہے خود کام کرنا ہے اسیلئے ۱۹۶۵ء
کے اواخر میں لاہور منتقل ہوا۔ یہاں میں نے حلقۂ درس
قرآن کا آغاز کیا۔ اپنا ایک اشاعتی ادارہ کھولا، مولانا
امین احسن اصلاحی کی تفسیر شائع کی۔ اپنی ۱۹۵۷ء کی لکھی
ہوئی کتاب شائع کی۔ پھر میثاق جو اصلاحی صاحب چلا نہیں
سکے تھے اور بند تھا اُسے دوبارہ شروع کیا۔ اس وقت
سے زندگی اسی نہج پر اور اسی ڈگر پر چل رہی ہے چھ سال
بالکل تنہا کام کیا ہے نہ کوئی ادارہ نہ کوئی جماعت۔ ۱۹۷۲ء
میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم کی ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی
قائم کی۔ یوں سمجھئے جیسے جماعت اسلامی ۱۹۴۱ء میں قائم
ہوئی تھی انہی لائنوں پر۔ اگرچہ اس میں کچھ فرق ہے لیکن
بنیادی طور پر وہی کچھ تھا۔ ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی کا
سنگ بنیاد رکھا۔ یہ سب کچھ دس برس میں بنا ہے۔ اب ایک
قرآن کالج کا منصوبہ بنایا ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں پلاٹ
حاصل کیا گیا اس پر قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم تعمیر
کیے جائیں گے۔

س: آپ نے اقبال کے سیاسی فلسفہ سے اثر لیا،

عورت ملک کی سربراہ نہیں ہو سکتی

۱۹۵۶ء میں ایک بیان لکھا جو ۱۹۶۶ء میں شائع
بھی ہوا (تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ)
۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے مستعفی ہوا۔ اس کے بعد
کچھ وقت جو بزرگ جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے ان کے
پیچھے گزارا کہ وہ کوئی اجتماعی کام کریں۔ مولانا اصلاحی،
مولانا عبدالغفار حسن، مولانا عبدالرحیم اشرف یہ حضرات
تھے لیکن یہ ہمارے نوجوانوں کی بدقسمتی سمجھ لیں کہ ان بزرگوں
نے کوئی اجتماعی کام نہیں کیا۔ اپنی اپنی جگہ پر وہ اصلاحی
علمی، تعلیمی کام کرتے رہے مگر اجتماعی کام کوئی نہیں کیا۔

مسلم لیگ اور جماعت اسلامی سے کسی نہ کسی حیثیت
میں منسلک رہے آپ نے جماعت اور مسلم لیگ میں کیا
فرق محسوس کیا ہے؟

ج: میں نے محسوس کیا کہ جب جماعت اسلامی قائم
ہوئی تو یہ ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کی حیثیت
سے میدان میں آئی تھی، ایک اصولی جماعت کی حیثیت
سے۔ جب کہ مسلم لیگ کی تحریک بنیادی طور پر ایک مسلم
قومی تحریک تھی، وقتی مصلحت کے مطابق یا مسلمانوں کو
خطرے سے بچانے کے لیے یہ ایک قومی تحریک تھی پاکستان

جانے کے بعد یہ قومی تحریک تقریباً ختم ہو گئی، تحلیل ہو
ئی اس وقت جماعت نے تقریباً وہی موقف اختیار کر
یا جو قیام پاکستان سے پہلے مسلم لیگ کا تھا، قیام پاکستان
سے پہلے چونکہ ملک اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا اس لیے
سلام کے بارے میں وعدے پورے کرو اور یہاں اسلام
نافذ کرو۔ جماعت والے نے پہلے ایک دستور کی مہم لیکر
سامنے آئے کہ ایک دستور بننا چاہیئے یہ تحریک قیام
پاکستان کا منطقی نتیجہ تھی، اس کے ساتھ ہی انقلاب قیادت
نعرہ لگا دیا۔ میں سمجھتا ہوں جہاں تک پہلی مہم کا تعلق
وہ درست تھی لیکن جہاں تک دوسری بات کا تعلق
ہے انقلاب قیادت کا وہ میں سمجھتا ہوں حکمت کے منافی
ر کیا گیا یہ فیصلہ قبل از وقت اور حکمت عملی کے منافی
۔ اور پھر اسی دلدل میں پھنس کر جماعت اسلامی
ئی۔

س:۔ آپ نے فرمایا کہ جماعت اسلامی نے وہی
م شروع کیا جو مسلم لیگ نے چھوڑا تھا لیکن اس سے
ر کوئی غلطی نہیں ہوئی یا تھوڑا سا موقف بدلا لیکن سوال
یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جماعت مسلم لیگ کے کام کو مکمل کرنا
چاہتی تھی تو تھوڑی سی غلطی کی وجہ سے آپ نے اسے کیوں
چھوڑ دیا اور بزرگ اس سے علیحدہ ہو گئے

ج:۔ بزرگوں کی نمائندگی تو [illegible] ہے
کہ کس نے کس وجہ سے جماعت سے علیحدگی اختیار
کی۔ اس حد تک بات صحیح ہے۔ جہاں تک [illegible]
تقریباً ایک ساتھ جماعت کی پالیسی کے بارے میں لیکن
میں کا فرق اس میں بھی تھا کسی کے نزدیک جماعت
نے اپنی سابقہ پالیسی سے انحراف کیا کسی کے نزدیک عدم
[illegible] ہو گیا لیکن جہاں تک جماعت سے علیحدگی کا تعلق
ہے اس کی بنیاد مختلف تھی بلکہ میری علیحدگی کی اساس
یہ تھی کہ جماعت اپنے اصل طریق کار سے منحرف ہو چکی ہے
کیسے میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا لیکن مولانا
مودودی کا موقف یہ تھا کہ مولانا مودودی نے جماعت کے
جمہوری اور شورائی نظم کو [illegible] تھا اس کی بجائے امرانہ [illegible]
اختیار کیا ہے اس لیے وہ علیحدہ ہو گئے یعنی جو بھی [illegible]

رائے یہ تھا کہ اسے وہ جمہوری اور شورائی طریقے سے حل
نہیں کر سکے بلکہ انہوں نے تحکمانہ انداز اختیار کیا اگرچہ
پالیسی کے بارے میں ان کی رائے بھی وہی تھی جو ہماری تھی
لیکن اس اختلاف رائے کی وجہ سے وہ جماعت سے علیحدہ
نہ ہوتے اگر اس اختلاف رائے کو جمہوری طریقے سے
حل کیا جاتا۔ ایسا ہو جاتا تو شاید ہم لوگ بھی علیحدہ نہ ہوتے

س:۔ ایک ہے نظریہ یا مقصد جماعت ایک ہے اس
مقصد کے حصول کا طریقہ اور ایک اس بارے میں آپس
کے اختلافات حل کرنے کا طریقہ تو آپ کی علیحدگی نہ نظریہ پر
تھی نہ طریقے پر بلکہ باہمی اختلافات حل کرنے کے طریقے پر؟

ج:۔ مقصد میں کوئی اختلاف نہیں تھا، مقصد کی بالادستی
میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ طریقہ کار میں اختلاف تھا جماعت
اسلامی کی ایک پالیسی قبل از تقسیم ہند تھی ایک وہ ہے
جو انہوں نے بعد میں اختیار کی۔ جب شروع کیا تو سب
ہی ساتھ تھے۔ بعد میں بہت سے لوگوں کو محسوس ہوا
کہ ہم نے طریق کار تبدیل کر کے غلطی کی ہے پہلے راستہ
پر واپس جانا چاہیئے۔ ہم اس دوسرے گروپ سے
اتفاق رکھتے تھے جس نے سمجھا کہ ہم نے غلطی کی ہے ہمیں
اسی اصولی انقلابی منہج پر کام جاری رکھنا چاہیئے تھا
جیسے کہ مودودی صاحب نے یہ بات آن دی ریکارڈ
ہے ۱۹۴۸ء میں انہوں نے ایک سوال کے جواب میں
یہ لکھا تھا کہ ایک طریقہ کار تو وہ تھا جو ہم یوم تاسیس
سے قیام پاکستان تک عمل پیرا ہے۔ ایک طریقہ کار
یہ ہے جس کو ہم شروع کر رہے ہیں اگر اس سے کامیاب
ہو جاتے ہیں تو گویا کہ پاکستان کے قیام کی شکل میں ہمیں
اپنے مقصد کے حصول میں ایک شارٹ کٹ مل گیا ہے
لیکن اگر ہم نے دیکھا کہ اس سے مقصد پورا نہیں ہوتا
تو پھر ہم اسی پرانے طریقہ کار کو اپنائیں گے اور رجوع
کریں گے یہ مولانا کی ۱۹۴۸ء کی اپنی تحریر ہے۔

تو ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ کافی تجربہ ہو چکا ہے
اس طرح کام کے کوئی مفید نتائج سامنے نہیں آ سکے،
تو ہمیں واپس جانا چاہیئے۔ اب اس اختلاف کو پھر

مولانا مودودی نے جس انداز میں ہینڈل کیا اس میں جو اُن کا اصل تقاضا ہے ہمارے بعض بزرگوں نے یہ سمجھا کہ یہ آمرانہ ہے۔ تحکمانہ ہے۔ جمہوریت اور شورائیت کے بالکل منافی ہے۔ علیحدگی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

س:۔ کیا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اصلاحی صاحب اور مودودی صاحب کے درمیان کوئی دو شخصیتوں کا تصادم تھا؟

ج:۔ اصل میں میں ان دونوں حضرات سے اتنا چھوٹا ہوں عمر میں، علم میں کہ اس قسم کے کسی مسئلے میں کوئی رائے دینا مجھے زیب نہیں دیتا۔ لیکن میں صرف یہ کہا کرتا ہوں کہ اس قسم کا کوئی امکان تھا بھی تو مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے درمیان امکان تو ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے اور مودودی صاحب کے بارے میں یا میرے اور اصلاحی صاحب کے بارے میں تو یہ امکان بھی نہیں ہو سکتا۔ تو مجھے ایک طرح کا تحفظ حاصل ہے۔ اس حد تک تو میں کہا کرتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں حضرات کے درمیان بھی کوئی معاملہ شخصیت کے تصادم کا نہیں تھا۔ مولانا اصلاحی صاحب نے جس طریقے سے سترہ سال مولانا مودودی کا ساتھ دیا اگر پرسنیلٹی کلیش کا معاملہ ہوتا تو بہت شروع میں ہو جاتا۔ انہوں نے اپنے آپ کو ان کے ساتھ بالکل ہم آہنگ کیا اور ساتھ چلتے رہے۔

س:۔ آپ نے ابھی فرمایا کہ آپ کئی سال بزرگوں کا انتظار کرتے رہے کہ وہ اجتماعی کام کریں، طریقہ اختیار کریں۔ لیکن ان بزرگوں نے اتنے سال گزرنے کے باوجود اس مقصد کے حصول کے لیے کچھ نہیں کیا۔ کوئی ادارہ نہیں بنایا۔ اس کی وجہ کیا تھا کیا یہ کہ جب کہ وہ اپنے مقصد سے ہٹ گئے یا انہوں نے محسوس کیا کہ ہم میں یہ صلاحیت نہیں؟

ج:۔ آپ کی بات کو میری بات نہ سمجھا جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انہوں نے کچھ نہیں کیا، ادارے نہیں بنائے ہیں۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے جامعہ تعلیمات اسلامیہ بنایا۔ اصلاحی صاحب نے علوم قرآن و حدیث بلند پایہ تفسیر لکھی ہے۔ [illegible] نے کام کیے لیکن انفرادی کیے یا صرف تعلیمی یادرس و تدریس پر اتفاق کیا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ انہوں نے جماعت اسلامی [illegible] کی کوئی [illegible] نہیں [illegible] سے وابستہ رہے تھے، کام کو اجتماعی طور پہ آگے بڑھانے کی تو میں اس بارے میں بھی بہرا اتجزیہ یہ ہے کہ اس کام کی صلاحیت غالباً ان حضرات میں نہیں تھی۔ [illegible] ایک آدمی بہت بڑا عالم ہو۔ لیکن یہ ضروری [illegible] کسی کام کو شروع کرنے والا میدان میں [illegible] بنے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں یہ صفت [illegible] مولانا اصلاحی صاحب تو ہمیشہ خود بھی کہتے [illegible] میں کسی کا بہترین ساتھی تو بن سکتا ہوں مگر میں [illegible] کام کی قیادت یا اس کا داعی بننے کی صلاحیت نہیں۔ یہ ان کے اپنے الفاظ ہیں۔ ان حضرات نے ابتدا [illegible] کوششیں بھی کیں لیکن محسوس یہ ہوا کہ انہوں نے [illegible] اپنے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں سمجھا۔ یہ خواہش

جماعت اسلامی کا

انقلابی ڈھانچہ

سیاست میں

مس فٹ

ہے

جب کسی کے اندر ہوتی ہے کہ میرے لیے یہ زندگی اور
موت کا مسئلہ ہے تو کچھ نہ کچھ کام ہو جاتا ہے لیکن اگر
آپ یہ سوچیں کہ چلیں یہ کام ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ
میں کوئی اور کام بھی کر سکتا ہوں اگر اس طرح کا ذہن
ہو تو پھر کوئی نئی تحریک اٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔

س:۔ آپ نے فرمایا کہ آپ نے مولانا اصلاحی صاحب
کی تفسیر شائع کی ۔ میرے خیال میں آپ نے ان سے
استفادہ کیا اس لحاظ سے آپ ان کے شاگرد بھی کہلا سکتے
ہیں۔ آپ نے علمی اختلاف بھی کیا اس سب کچھ کی تفصیل
کیا ہے؟

ج:۔ میں اصل میں اپنے آپ کو مولانا مودودی اور
مولانا اصلاحی دونوں ہی کا ان معنوں میں شاگرد بھی
سمجھتا ہوں کہ میں نے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی سے
استفادہ بھی کیا ہے۔ دونوں کا اس معانی میں شاگرد بھی
ہوں کہ میری اپنی فکر کے اجزائے ترکیبی علامہ اقبال، مولانا
مودودی، مولانا اصلاحی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی
فکر کے اجزا سے لیے گئے ہیں۔ میں ان چار افراد کو
بنیادی سمجھتا ہوں کہ جو بھی میری سوچ بنی ہے ان چار
کا عمل دخل زیادہ ہے۔ لیکن اس لیے میں آپ
کی بات کی تردید کروں گا جب اصلاحی صاحب مجھ
سے ناراض ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ شخص اپنے آپ میرا
شاگرد کہتا ہے لیکن یہ میرا شاگرد نہیں ہے۔ اس لیے
یہ لفظ استعمال نہ کیجئے، اس لیے کہ مولانا اصلاحی کو یہ لفظ
پسند نہیں اس لیے کہ جب وہ ناراض ہوں تو بزرگوں
کی ناراضگی بھی شدت ہوتی ہے۔ باقی جو ان کا اور میرا
اختلاف کا معاملہ ہے اس میں کچھ تو ... مثلاً تصوف
... ہے جو ان کے نقطہ نظر سے مختلف ہے ان
کا ... ہے کہ تصوف کل کا کل ضلالت ہے ... ہے
... کوئی میرا مطلب ہی نہیں جب کہ میں یہ رائے
نہیں رکھتا میرے نزدیک تصوف بھی ایک شعبہ ہے اور
اس کے اندر جو صحیح حصہ اس کا ہے جیسے قرآن سنت میں
... مرتب ہے۔ وہ دین کی اصل روح ہے تو اس کی

بعض چیزوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ کل کو غلط کہنا
صحیح نہیں ہے۔ جب میں نے میثاق شروع کیا۔ شروع تو کیا
تھا اصلاحی صاحب نے اب چلا میں رہا تھا پالیسی میرے
ہاتھ میں تھی۔ کچھ ایسے مضامین بھی آئے جس سے مولانا نے
اظہار ناپسندیدگی کیا۔ مولانا علی میاں کا ایک مضمون آیا تصوف
کے موضوع پر۔ پروفیسر سلیم چشتی کی کتاب (اسلامی تصوف)
سب سے پہلے میں نے ہی قسط وار میثاق میں شائع
کی تھی۔ اس کے بعد جب انجمن خدام القرآن کے قیام کا
مرحلہ آیا اس میں میں نے اپنے لیے ویٹو کا حق رکھا مولانا
اصلاحی صاحب کو اس سے شدید اختلاف ہوا کیونکہ ان
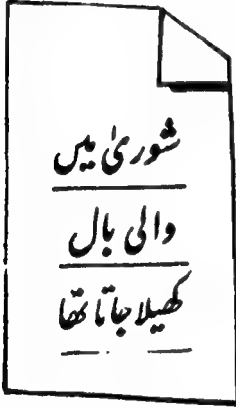
کے ذہن میں جمہوریت تھی اور جمہوریت میں ویٹو پاور
کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ وہ اسے ذہنی طور پر قبول نہیں
کرتے جب اس کا خاکہ بن رہا تھا مولانا بہت زیادہ
علیل تھے اور ان کی یادداشت متاثر ہو چکی تھی تو اس
وقت ان سے مشورہ کرنا مناسب نہیں تھا جب میں اس
کا خاکہ بنا کر شائع کر چکا تب ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے
صحت دے دی اب انہیں اعتراض ہوا۔ پھر میں نے
یہی موقف اختیار کیا کہ مولانا اب تو میں اس کا اعلان
کر چکا ہوں۔ اگر آپ مجھے قائل کر لیں کہ یہ از روئے
شریعت اور دین یہ ویٹو کا حق غلط ہے تب تو میں اسے
واپس لے سکتا ہوں۔ ورنہ نہیں۔ بہرحال میں نے اس
کو برقرار رکھا۔ اس انجمن کے معاملات میں بھی مجھے ویٹو

کا حق حاصل ہے اگرچہ چودہ برس ہو گئے آج تک کوئی ایسا موقع نہیں آیا جب یہ مجھے استعمال کرنا پڑا ہو بہرحال نظری طور پر یہ رکھا۔ تو ایک اختلاف اس پر ہوا، پھر جب تنظیم اسلامی کے قیام کے مراحل آئے تب بھی ہمارے اختلافات رفتہ رفتہ بڑھتے گئے اس میں جو آخری معاملہ آیا ہے وہ مولانا کی رجم کے بارے میں رائے سے ہوا یہ رائے اصل میں تدبر قرآن کی جلد چہارم میں چھپ چکی تھی جو ہمارے ہی مکتبہ نے شائع کی تھی لیکن میں نے یہ پڑھی نہیں تھی جب میرا اپنا درس اس مقام پر پہنچا اور میں نے اس کا مطالعہ کیا تو میں نے محسوس کیا کہ مولانا نے جو رائے دی ہے وہ سلف سے بالکل ہٹ کر ہے۔ اس لیے میرے لیے اس کی اشاعت میں حصے دار بننا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا ان کی تفسیر اور دیگر تصانیف جن کی اشاعت کے حقوق انجمن کے پاس تھے ہم نے واپس کر دیے۔

س:۔ آپ نے فرمایا کہ شروع میں جماعت اسلامی سے اس لیے الگ ہوئے کہ اختلافات دور کرنے کا طریقہ جمہوری نہیں تھا لیکن ایک کسی جماعت یا تنظیم کے سربراہ کو ویٹو کا حق دینا جمہوری ہے؟

ج:۔ میں نے تو ان کی بات کہی ہے اپنی بات نہیں کہی دوسرے یہ کہ میں خود سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب کا اپنا ذہن تھا کہ اسلامی جماعت کے امیر کے پاس ویٹو کا حق ہونا چاہیے لیکن جب یہ مولانا اصلاحی صاحب جمع ہوئے ان کی رائے ان کے خلاف ہوئی تو انہیں اپنی رائے بدلنا پڑی۔ پھر جب وقت آیا تو انہوں نے اپنی رائے کے مطابق عمل کیا جس پر کہ مولانا اصلاحی صاحب ناراض ہوئے۔ میرے نزدیک اسلامی تحریک اور انقلابی تحریک کے امیر کے پاس ویٹو ہونا چاہیے۔

س:۔ سوال یہ ہے کیوں؟

ج:۔ اس لیے کہ تحریک چلتی ہی اس طریقے سے ہے۔ ایک ہے حکومت کا نظام اس میں شورائیت ہے جمہوریت ہے رائے شماری کر کے چلنا یہ معاملہ درست بھی ہے اور مناسب بھی ہے درست بھی ہے اور ممکن بھی ہے۔ تحریکوں کے ساتھ یہ بات نہیں چلتی۔ تحریک کھڑی ہوتی ہے اپنی داعی کی بنیاد پر کوئی شخص اپنا فکر پیش کرتا ہے لوگ اس کی ذات پر جمع ہوتے ہیں اور اس کو اس کی قیادت اور رہنمائی از خود حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے میں نے جو جماعت بنائی ہے بیعت کی بنیاد پر بنائی ہے کہ جو شخص میرے ساتھ شامل ہونا چاہے میں یہ کام کر رہا ہوں میرے ساتھ شامل ہو جائے، وہ میرا ساتھی ہے وہ مجھے مشورہ تو ضرور دے گا لیکن فیصلہ جو آخری ہو گا میرا ہو گا، شرط یہ ہے کہ وہ شریعت سے باہر نہ ہو۔ مثلاً ایک رائے یہ ہے کہ ادھر چلنا چاہیے دوسری رائے یہ ہے کہ نہیں دوسری طرف چلنا چاہیے۔ اس معاملے میں داعی کو حق دیا جانا چاہیے کہ فیصلہ اس کی مرضی کے مطابق ہو کہ کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔

س:۔ اس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ بیعت کرنے والوں کے ذہن میں پہلے یہ بات ہو کہ جس کی وہ بیعت کر رہے ہیں وہ غلطی نہیں کر سکتا اور غلطی وہی نہیں کر سکتا جسے اللہ تعالیٰ نے ربانی ارشاد حاصل ہو۔

ج:۔ بالکل یہ نہیں ہے۔ اصل یہ بات ہے کہ غلطی کس چیز کو کہیں گے ایک یہ ہے کہ کتاب و سنت سے باہر نکل جانا، ایک یہ ہے کہ کتاب و سنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے تدبیر کے بارے میں آراء کا اختلاف شریعت کی حدود کے اندر اندر رہیں چلنا ہے۔ اب اس کے اندر کسی چیز کی ترجیح کسی دوسری چیز پر دینا، اس میں اگر یہ کیا جائے کہ ووٹوں کی تعداد سے فیصلہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اشخاص کو برابر قرار دیا جائے حالانکہ ان میں بعض صاحب الرائے ہوتے ہیں۔ کچھ میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی اس لیے یہ معاملہ

...ر پہ چھوڑ دیا جائے ہو سکتا ہے وہ کسی وقت اتفاق
...ے پر فیصلہ کرے لیکن اس کو معصوم ہرگز نہیں سمجھا جائیگا
...و وہ ہوگا اور پورے طرح لوگوں کو حق ہوگا مخالفت
...نے کا یہ نہیں کہ لوگ اپنی زبان بند کریں بلکہ کھلی

... محمود ... کی
... کے
... قائد میں ...

...ا مزاں ہا چاہیے۔ فیصلہ امیر کی مرضی سے ہوگا۔ اصل میں
...ن میں ہوتا ۔ ... کیا ہے دو لوگوں کی بنیاد پر فیصلہ ہو
...دہاں سارا دستوری ڈھانچہ بدلنا پڑتا ہے۔ یہ کہ
...ٹ دینے کا اہل کون ہے۔ ووٹ دینے کا حق دار
...ہے جو خود ووٹ دے کر آیا ہو۔ اور وہ شوریٰ کا
...ن منتخب ہو کر آیا ہو۔ پہلے تو وہ حق دار ہوگا پھر
...ووٹ دینے والے لوگ ہیں پھر اس پیمانہ وا سدیار
...بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کو اپنا نظم جو ہے
...طرح کا رکھنا پڑا ہے کہ پہلے وہ امیدوار بن کر آئے
...دو ... رح دیکھ بھال کر لیں جیسی میں سے گزار
...ہے اس کے ہاتھ میں ووٹ دیتے ہیں۔ اس سے
...مت کی توسیع بالکل رک گئی۔ وہ اٹک گئے ہیں مجبوری
...سیاسی طرز پر جب کہ ان کا تنظیمی ڈھانچہ جو ہے وہ
...مذہبی رنگ کا ہے اس لیے وہ مس فٹ ہیں۔ ہم نے جو
...اختیار کیا ہے وہ ہے جو کتاب و سنت کا طریقہ
...ہے ... ملتی ہے کسی داعی کی بنیاد پر سوئی بات یہ
...ہے اس داعی پر جیسے اعتماد ہو بحیثیت مجموعی یہ اعتماد ہو
...مسلک فلسفہ درست ہے دوسرا یہ اعتماد ہو کہ یہ دھوکے
...باز نہیں ہے۔ یہ کوئی فریبی آدمی نہیں ہے اس کے
...بعد بھی آنکھیں، کان اور دماغ کو کھلا رکھے تا کہ

اور اگر وہ یہ سمجھے کہ ان کی پالیسی اب غلط ہو گئی ہے تو وہ سلام کرے اور علیحدہ ہو جائے ان تمام معاملات میں اپنی بھرپور رائے پیش کرے اور اگر وہ سمجھے کہ اس حد تک معاملہ ناقابل برداشت ہے کہ وہ چل ہی نہیں سکتا تو وہ علیحدہ ہو جائے۔ ... یہ فطری، اس میں امیر کے پانچ یا سات سال بعد انتخاب کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو داعی ہے اس نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے یہ اس کا حق ہے کہ وہ ہمیشہ امیر رہے۔

س:۔ اس کا مطلب ہے آپ زندگی بھر کے لیے تنظیم اسلامی کے سربراہ ہیں۔

ج:۔ جی! بلکہ میں انجمن کا بھی زندگی بھر کے لیے سربراہ ہوں۔

س:۔ اگر کوئی اختلاف کرتا ہے تو اسے چھوڑنا پڑتا ہے۔

ج:۔ ابھی تک کوئی ایسا مرحلہ نہیں آیا۔

س:۔ اگر کوئی کرے تو؟

ج:۔ میرا مطلب یہ ہے اختلاف اس درجے میں کہ وہ یہ سمجھے کہ میں اب اس کے ساتھ نہیں چل سکتا اختلاف کرنے کی اسے پوری آزادی ہے۔ اختلاف کرے اور اسے ظاہر کرے، پورے زوردار طریقے سے ظاہر کرے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن صرف اس بنیاد پر میں انہیں نکال نہیں دوں گا لیکن اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اب اتنا شدید اختلاف ہے کہ میں ان کے ساتھ اب تعاون نہیں کر سکتا تو وہ چھوڑ دے۔

س:۔ ایک طرف تو علمائے کرام یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہے اور جمہوریت میں اختلاف ملتے ہے عدم اعتماد کی تحریک ہے انتخاب ہے، دوسری طرف آپ یہ فرماتے ہیں کہ آپ نے جو طریقہ اپنایا ہے وہ اسلامی ہے

ج:۔ یہ چیز آپ مکس کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا ایک ہے حکومت کا نظام ایک ہے تحریک کا نظام ان دونوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط نہ کریں۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ حکومت جتنے علاقے پر قائم ہے اس علاقے

میں جو بھی شخص ہے اس حکومت کا رکن ہے جماعت
یا تحریک کا کوئی حلقہ نہیں ہے کوئی شخص اس میں داخل
ہو یا نکل جائے کوئی اس میں ملاقاتی تسلط نہیں ہے اور
آزادی سے آتے بھی ہیں اور نکل بھی سکتے ہیں یہ بنیادی
فرق ہے تو حکومت کے نظام میں ہر بالغ تا حیات کے
رہنے والے میں ان کی رائے کا عمل دخل ہونا یہ ایک
فطری مطالبہ ہے ۔ بجائے تحریک کے کہ اس میں ہر شخص
اپنی آزاد مرضی سے آتا ہے اور آزاد مرضی سے جاتا ہے
میری نظر میں اسلامی حکومت جو بھی اس دور میں قائم ہو
گی اللہ تعالےٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم پاکستان میں قائم کر
سکیں وہ اس وقت کے جو اعلےٰ جمہوری معیار ہیں اس
پر پوری اترے گی اور جمہوری حکومت ہو گی اس لئے
ایک فرق ہے کہ جو آج کی دنیا کی جمہوریت ہے جو بھی ادارہ
بنتا ہے چاہے اس کا جو نام ہو کانگریس ہو یا کچھ بھی کہہ لیں
جو بھی کہہ لیں مقننہ کے قانون سازی اختیارات غیر محدود ہیں
جو چاہے قانون بنائے ۔ جو چاہے جائز قرار دے دے
شراب کو حلال قرار دے جو چاہے کر دے جب کہ اسلامی
حکومت میں قانون سازی کے اختیارات محدود ہوں گے
قرآن اور سنت کے اصولوں کے مطابق ہوں گے اس
کے سوا میرے نزدیک کوئی بھی اسلامی جمہوریت کا نظام
قائم کرنے میں مطلب یہ کہ وہ پارلیمانی ہو یا صدارتی ہو ۔
اسلام آپ پر کوئی پابندی نہیں لگاتا ۔ اسلام نے اس پہ
کوئی بحث نہیں کی کہ نظام وفاقی ہو یا کنفیڈریشن ہو ۔
پارٹی بنانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے صرف ایک بات
ہے کہ ہر شخص کو اپنے ضمیر کے مطابق رائے دینے کا حق
ہونا چاہیئے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگوں کی تعلیم کا ایک
اہم ذریعہ ہے کہ اس طرح لوگ سمجھ سکیں کہ ان کی آزادانہ
تو میں نے عرض کیا کہ اس جدید دور میں جو اسلامی ریاست
بنے گی جو جدید ترین جمہوریت ہے اس کا اعلےٰ ترین نمونہ
ہو گی ۔ اس کے علاوہ کہ قرآن و سنت کے اصولوں کے
خلاف مقننہ قانون نہیں بنا سکے گی اس کا فیصلہ سپریم کورٹ
کرے گی کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے مطابق ہے یا

منافی ہو یا اس پیمانے پر جو ہے جمہوریت اگر تو ہے دوسری
پارٹی تو وہ بھی اس قسم کی پارٹی بنا سکتی ہے جو اندر سے
وہ بھی اپنے اندر جمہوریت قائم رکھے لیکن جس چیز کا نام
انقلابی تحریک ہے اس میں اس طرح کا ڈھیلا ڈھالا دور
میں نہیں سکتا ۔ اس میں ایک حرکت ہوتی ہے بعض اوقات
فوری اقدام ضروری ہوتا ہے اس لیے انقلابی جماعت میں
اس طرح کی جمہوریت نہیں ہو سکتی ۔

س ۔ اگر آپ کی حکومت آتی ہے تو پھر آپ کے ارکان
اسمبلی کو پالیسیوں کے بارے میں اختلاف کی اجازت ہوگی

ج : بالکل ہو گی ۔ حکومت کی سطح پہ پالیسیوں سے
اختلاف ہو سکے گا ۔ اول تو اس کا کوئی امکان نہیں کہ ہماری
حکومت آئے ۔ حکومت کے لیول پہ تو مفروضے کی بات کر
رہے ہیں ۔

س ۔ نظریاتی بات ہے ۔

ج ۔ ہاں اگر حکومت ہوئی تو پورا نظام جمہوری ہوگا

س ۔ اس کا امکان کیوں نہیں کہ آپ کی حکومت آئے
آپ اتنی محنت سے کام کر رہے ہیں جب کوئی آدمی اتنی
محنت سے کام کر رہا ہو کوئی مقصد لے کر چلتا ہے تو
اسے کامیابی کا یقین ہوتا ہے جب کسی کے ذہن میں یہ
ہی یہ ہو کہ کامیابی کا امکان نہیں وہ کیا کرے گا ؟

ج ۔ میرے اعتبار سے یہ آپ کا اصول درست نہیں
اس لیے کہ ہمارے لیے کام کا اصل محرک کامیابی کا جذبہ
نہیں بلکہ احساس فرض ہے کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت
سے ہمیں اسلام کے لیے تن من دھن لگانا ہے ۔ کامیابی
کا یقین تو رشتہ ہمارا منقطع ہو گیا ہے ۔ مجھے تو کوئی امید تو
ابھی نہیں ہے کہ اپنی زندگی کے اندر کوئی اس قسم کی تبدیلی
دیکھ پائیں گے ۔ اس لیے کہ حالات جو ہیں ہم ان سے خوش
بند نہیں کر سکتے جو صورت حال اس وقت ملک کی ہے بڑا
ملک ہے ۔ اللہ تعالےٰ کے فضل سے ہم نا امید نہیں ہیں
کہ کسی وقت صورت حال بدل دے سب کچھ اس کے ہاتھ میں
سارا اختیار ہے لیکن فی الحال ایک وقتی جائزہ لیں کہ ہم پا سکیں
سکتے کیونکہ حالات سازگار نہیں ہیں البتہ احساس فرض ۔

مسلمان کا فرض یہی ہے کہ اُسے اللہ کے حکم کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ جہاں تک تاریخ کی بات ہے بہت سے انبیاء یہ کام کرتے آئے ہیں بہت سے انبیاء ایسے بھی تھے جنہوں نے تنہا کام کیا کوئی ایک بھی ساتھی نہیں ملا یا دو چار ساتھی ملے ساڑھے نو سو برس حضرت نوحؑ نے دعوت دی کیا نتیجہ نکلا؟ یہ ضرور ہے کہ چونکہ وہ اللہ کے رسول تھے جب قوم نے انہیں قبول نہیں کیا تو خدا نے اس قوم کو ہلاک کر دیا۔ غیر رسول کے لیے تو یہ بھی قاعدہ نہیں ہے۔ نبی آئے بہت سے، حضرت یعقوب علیہ جن کی کوئی دعوت کسی نے نہیں مانی، حضرت ابراہیم علیہ کو ان کے زمانے میں کتنے لوگوں نے مانا تھا؟ آج دنیا میں آدھی سے زیادہ آبادی ان کا نام لیتی ہے عزت سے احترام سے لیکن ان کی اپنی زندگی میں کیا ہوا کچھ بھی نہیں جس زمانے میں میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو رہا تھا میں حیران ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں فیض کی ایک کتاب آئی تھی جس میں وہ نظم تھی۔ جو میری ذہنی حالت کی عکاسی کرتی تھی کہ۔

یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی
کھیتی کے کونوں کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رت کی فکر کرو
پھر اگلی رُت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

اصل چیز احساسِ فرض ہے۔ یہی تو وہ چیز متحرک کرتی ہے احساسِ فرض ہے۔

س: ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ ایک جماعت ہے جس نے انقلاب لانا ہے اقتدار تک پہنچنا ہے یہ الگ بات ہے کہ آپ کی زندگی میں پہنچے یا نہ پہنچے اس کا طریقہ کار اور مقصد تو یہ ہونا چاہیئے یا ہوگا دوسری طرف آپ نے جب جماعت اسلامی سے اختلاف کیا۔ تو ان کی انتخابی سیاست سے آپ کو اختلاف ہوا۔ کہ وہ انقلابی سے ہٹ کر سیاسی میں آ گئے ہیں۔ آپ کی جو انقلابی تحریک ہے اس کا مقصد ملک میں انقلاب لانا ہے اور اعلیٰ عہدے تک پہنچنا ہے، آپ انتخاب پر تو یقین نہیں رکھتے اقتدار کے حصول کا کیا طریقہ ہوگا؟

ج: اس کا طریقہ میں نے پہلے بھی بیان کیا پھر بیان کرتا ہوں۔ میرے نزدیک وہ طریقہ ہے ڈیمانسٹریشن کا جس کو آج کی اصطلاح میں ایجی ٹیشن بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میں اس لفظ سے بچ کر کہہ سکتا ہوں۔ PEACEFUL DEMANSTRATION OF WILL جو اگلا قدم اٹھا کر پکٹنگ کی شکل اختیار کر سکتی ہے لیکن اس کی کچھ ضروریات ہیں جب تک وہ ضروریات پوری نہیں ہوں گی ہم ڈیمانسٹریشن نہیں کریں گے، وہ یہ ہیں کہ ایک کثیر تعداد ہمارے پاس ایسے لوگوں کی موجود ہو۔ جن کو اسلام کے ساتھ سو فی صد کمٹمنٹ ہو جو صرف اسلام کا نعرہ نہ لگاتے ہوں، اسلام پسند نہ ہوں بلکہ اس پر عمل کرتے ہوں۔ حکم دیا جائے چلو تو چلیں حکم دیا جائے رُک جاؤ تو رُک جائیں۔ اس طرح کی اگر تربیت یافتہ تعداد موجود ہے جب تک ہماری تعداد اتنی نہیں ہے ہم صرف زبان سے کہتے رہیں گے یہ چیز غلط ہے۔ مت کرو یہ چیز حرام ہے ناجائز ہے شریعت کے منافی ہے اس کو حدیث میں کہا گیا ہے "زبان سے ہٹ کا سوں سے روکنا" لیکن جب ہمارے پاس یہ طاقت ہوگی تو ہم چیلنج کریں گے یہ کام غلط ہے۔ ہم یہ کام نہیں ہونے دیں گے ہم پکٹنگ کریں گے ہم ڈیمانسٹریشن کریں گے اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ پُرامن ہو گا کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے ہم ہاتھ نہیں اٹھائیں گے چاہے ہم پہ ڈنڈے برسیں ہمیں جیلوں میں جانا پڑے اس سے فیصلہ ہو گا کہ ہمارے پاس اتنی

تم نے لوگوں کو جمع کیا جا سکتا ہے لیکن جب تعمیری کام کرنا
ہو تو ایسی صورت میں قدم قدم پر رکاوٹیں آتی ہیں۔ ایک نظریہ
چلے گا تو وہ چلے گا اس لیے ایک گروپ کے لیے لازم ہوتا
ہے کہ وہ باقی گروپوں کا خاتمہ کر دے۔ یہ ان کی مجبوری یا
ضرورت تھی جو اسلامی انقلاب کی پیشگی شرائط پوری نہ کرنے
کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

س:۔ اسلام میں اس کی اجازت ہے؟ ہم کہاں تک کہہ
سکتے ہیں کہ ایران کا انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟

ج:۔ میں ہر اعتبار سے اسے اسلامی انقلاب نہیں مانتا
بلکہ لوگوں کا ایک سڑکوں پر آنے کا معاملہ تھا جو اسلامی تھا۔

س:۔ ایران کی بات آئی ہے تو یہ بتائیں کہ ایرانی انقلاب
کے ہمارے اور دوسرے ممالک پر کیا اثرات مرتب ہوئے
ہوں گے۔

ج:۔ میرا خیال ہے کہ اس کو رہنے ہی دیں تو بہتر ہے
میرے نزدیک اس بارے میں رائے دینا مناسب نہیں
ہمارے ملک میں اس وقت پہلے ہی سے ایک شیعہ
سنی بات موجود ہے اس لیے یہ رائے دینا مناسب
نہیں ہے۔

س:۔ مگر ہم مذہبی اثرات کی نہیں سیاسی اثرات کی بات
کر رہے ہیں....؟

ج:۔ اصل میں ہمارے ملک کی سیاست کو مذہب
سے علیحدہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ دونوں چیزیں مل چکی ہیں
اور سیاست میں لوٹ بھی ہو لیکن بہرحال وہ لوٹ
ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام کا تعلق تو ہے اس لیے
سمجھتا ہوں کہ رائے دینا مناسب نہیں ہے۔

س:۔ ڈیمانسٹریشن آف ول پاور رہی تو ایک قوت ہی
ہے تو کیا آپ قوت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کریں گے

ج:۔ جس حد تک میں نے کہا ہے اس حد تک لفظ ان
تو آپ لفظ قوت کو صحافتی زبان میں کہیں اور معانی
میں لیتے ہیں تو یہ غلط ہے۔

س:۔ اس وقت بھی تو سڑکوں پر مظاہرہ ہو رہے ہیں
عوام ان کا ابھی کوئی مطالبہ نہیں ہے یہ جلسہ ہوا

ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ الیکشن ہونا چاہیے لیکن پارٹی
سطح پر ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ
مجھے ڈی۔ ٹو سے پانچ جولائی کو مقرر کرنا ہے۔ اس طرح
بات ابھی نہیں ہوتی۔

س:۔ اگر ہو جاتی تو؟

ج:۔ ہو جاتی تو ان کے لیے راستہ ہے۔

س:۔ جائز راستہ ہے؟ موجودہ صورت میں۔

ج:۔ توڑ پھوڑ کریں تو ناجائز ہے اگر اس کے بغیر
کریں تو جائز ہے بلکہ بہت جائز ہے

س:۔ اچھا اگر آپ کی حکومت ملک میں قائم ہو جائے
تو آپ کے پاس تو پورے اختیار ہوں گے، قومی زندگی
میں خواتین کے شرکت کے بارے میں آپ کا کیا رویہ ہوگا؟
آپ کہاں تک اجازت دیں گے؟

ج:۔ ہم تو پابندیاں صرف وہی لگائیں گے جو شریعت
نے لگائی ہیں، ان کا لباس شریعت کے مطابق ہونا چاہیے
اور حجاب ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ جو بھی وہ کام کر
سکیں کریں، کوئی شریعت نے پابندی نہیں لگائی۔ شریعت
کی روح ایک ہے یہ دوسری بات ہے۔ ایک یہ ہے کہ شریعت
پابندی کیا لگاتی ہے۔ شریعت کی روح تو ہے کہ کوئی شخص
اپنے پاس کچھ نہ رکھے سب کچھ اللہ کی راہ میں دے دے جو
اس کی ضرورت سے زیادہ ہو۔ لیکن شریعت لازم کیا کرتی
ہے۔ ایک یہ لازم کرتی ہے کہ کمائی جائز ذرائع سے ہو اور
دوسرے یہ کہ اس میں سے زکوٰۃ ادا کر دو باقی کے تم
مالک ہو اپنی مرضی سے دینا چاہو تو دو۔ اس طرح خواتین
کے متعلق ایک تو ہے روح، وہ تو یہ ہے کہ خواتین کا اصل
دائرہ کار تو گھر ہے۔ دراصل آنے والی نسل کی تربیت
ان کے ذمے ہے، اس میں اچھے خیالات پیدا کرنا جذبہ
پیدا کرنا یہی اصل کام عورت کا ہے بہت بڑا اور اہم
کام ہے۔ جب عورت گھر سے نکل کر کام کرنے لگتی ہے تو
اس کی توجہ سے محروم ہو جاتی ہے اور قومی سطح پر بڑا
نقصان ہوتا ہے۔ لیکن کوئی عورت حالات کی وجہ سے مجبوراً
کام کر سکتی ہے اس پر کوئی پابندی نہیں شرط یہی ہے کہ

حجاب میں رہ کر کرے۔ یہ بات کہ علاوہ ہمارے ملک
میں ہو تو ہم کیا کریں گے۔ ہم یہ کریں گے کہ خواتین کی
صلاحیتوں سے کام لینے کے لیے خواتین کے علیحدہ ادارے
بنائیں گے۔ ہمارے سکولوں کالجوں میں جہاں لڑکیاں پڑھتی
ہیں وہاں لیڈی ٹیچر پڑھاتی ہیں ہم خواتین کی یونیورسٹیاں
بنائیں گے۔ خواتین کے کسی راستے میں رکاوٹ نہیں۔ ہم یہ کہیں
کہ خواتین کے لیے نصاب میں کس طرح ہونا چاہیئے نفسیات ہونا
چاہیئے کیونکہ یہ اگلی نسل کے لیے زیادہ مفید ہو سکتی ہیں لیکن
اگر وہ ڈاکٹری یا کوئی اور چیز پڑھنا چاہتی ہیں تو کوئی حرام نہیں
ہم زنانہ ہسپتال میں نرسیں بھی خواتین رکھیں گے، ڈاکٹر بھی
خواتین۔ مردانہ ہسپتال میں کوئی عورت نرس نہیں ہوگی جیسے
انگلینڈ کے اندر جہاں شدید ترین ضرورت ہوتی ہے نرسنگ
کی۔ وہاں یہ سب کام مرد کرتے ہیں تو اور ہسپتالوں میں کیوں
نہیں کر سکتے۔ اس طرح ہر میدان میں خواتین کیلئے رکاوٹ
نہیں بنیں گے۔ باقی ہم ایسی چیزوں کی حوصلہ شکنی کریں گے
جہاں مرد اور عورت کو اکٹھے کام کرنا پڑتا ہے انڈسٹری میں
ہم کاٹیج انڈسٹری کی طرف زیادہ توجہ دیں گے جیسے جب
سے انگلینڈ کی طرز پر چلی ہے جاپان نے چھوڑ دیا ہے
اور اس سے پہلے یہ پوری انڈسٹری سوئٹزرلینڈ کی تھی میں
نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے دوسری جنگ عظیم کے
دوران دہلی میں ایک محلہ کا ہر ہر گھر جیسے فیکٹری بنا ہوا
ہے۔ طرح طرح کے پیسے کو خام مال دے جاتے تھے اور
شام کو لے جاتے تھے وہاں دستیاں بنتی ہیں۔ فوج کا
سارا کام وہاں ہوتا ہے ایسے ادارے جہاں خواتین کام کریں
وہاں چائلڈ کیئر کا انتظام ہو گا تاکہ عورت گھر کی بھی دیکھ بھال
کر سکے۔ ہمارا نقطہ نظر ایک ہو جائے یہی بنیادی ہے اگر یہ
ہو جائے کہ ہمیں اسلام لاتے پہنچنا ہے تو پھر خود بخود
راستہ کھل جائے گا۔

پرائمری تعلیم پوری طور پر خواتین کے حوالے کر دیں گے
پنجاب کا دعویٰ ہے کہ کیا کہ پرائمری ٹیچر نہیں ہونا چاہیے۔ اس
بچے کی بہتر طور پر عورت ہی دیکھ بھال کر سکتی ہے۔
اور مادرانہ شفقت عورت ہی دے سکتی ہے۔ اگر کوئی
عورت وکالت کرنا چاہتی ہے تو کرے۔ یہ اس کی اپنی مرضی

س: بعض علمائے کرام کہتے ہیں اگرچہ مولانا مودودی اور
بعض دیگر علماء نے مس فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی اس کے
باوجود اکثریت کہتی ہے کہ کوئی خاتون سربراہ مملکت نہیں بن
سکتی۔ آپ کی کیا رائے ہے۔

ج: میری رائے تو یہ ہے کہ یہ اسلامی تعلیمات کے
منافی ہے۔ البتہ مودودی صاحب نے یہ سمجھا ہو کہ یہ ایمرجنسی
ہے۔ ایمرجنسی میں تو پردہ کی پابندی بھی نہیں رہتی۔ اگر گھر
میں آگ لگی ہے تو ہم کھڑے رہیں گے کہ پردہ نہیں کر
سکیں۔ ایمرجنسی میں تو جائیں گے جان بچائیں گے۔ ایک نوجوان
لڑکی جب دریا میں جا رہی ہے وہ نکل ہو گئی ہے تو اسے ڈوبنے
سے بچانے کے لیے حجاب کی پابندی کا ادا ہو گی۔ ایمرجنسی
میں شریعت کے احکام جتنی ضرورت ہو ساقط ہو جاتے ہیں
جیسے کھانے پینے میں اگر بھوک سے مر رہا ہے تو سور کھا سکتا
ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے ایمرجنسی میں تو حضرت عائشہ
نکل آئی تھیں۔ لیکن اس سے شریعت کا اصل منشا ظاہر نہیں
ہوتا بلکہ معیشت کے معاملات، جنگ کے معاملات، معاشرے
کے معاملات بنیادی طور پر مردوں کے لیے ہیں۔ عورت پر
فطرت نے پہلے ہی اتنا بڑا بوجھ ڈالا ہوا ہے نسل انسانی
کا تسلسل جاری رکھنے کا بوجھ۔ اس کے لیے عورت کو کتنی تکلیف
برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ پیدائش کے بعد بچے کو دودھ
پلانا اس عورت کا ہے اور اپنا دودھ نہیں پلاتی تو اس کی سزا
قدرت اسے دے رہی ہے چھاتی کا کینسر اسی کا نتیجہ ہے
کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کیونکہ جس چیز کو قدرت
نے جس کام کے لیے بنایا تھا اگر آپ اس کو استعمال نہ
کریں تو اس کا نقصان ہوگا۔ سب سے بڑا کینسر
ہے اور اس کی وجہ یہی ہے اب اتنا بڑا بوجھ ڈالا
گیا ہے پہلے۔ اس اعتبار سے دوسری چیزوں
کا بوجھ ان پر کم کر دیا گیا ہے یہ کام بنیادی طور پر مرد
کے ذمہ ہیں کہ وہ معاش پیدا کریں اپنے لیے اپنی بیوی
بچوں کے لیے اگر خبر میں شمولیت ہو گئی ہے تو ہمارے مرد
ساتھ ملازمت کرتے ہیں اس صورت میں عورت ان

رٹنے گی۔

س: اچھا ڈاکٹر صاحب چار شادیوں کے مسئلہ پر اجتہاد
[ہو سک]تا ہے؟

ج: اس میں اجتہاد نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ قرآن میں صاف
[...]یا ہے۔ چار کی اجازت ہے چار واجب تو نہیں ہیں کہ
نہیں کیا گیا لیکن اجازت کی حد تک کوئی شخص اس کو
روک سکتا۔ اگر کسی شخص نے اس حائل تو اس پر پابندی
ہے تو خاص غیر اسلامی ہے شریعت کے منافی ہے۔

س: آپ پہلے تو شوریٰ میں شامل ہوئے اگرچہ وہ
[...] آئی تھی مارشل کے ذریعے سے، آپ جیسے نظریاتی
کے لیے اس شوریٰ میں جانا مناسب نہیں تھا، اس
[...]د آپ نے علیحدگی اختیار کی اس کی وجہ کیا تھی؟

ج: اس کی وجہ یہ تھی کہ بہرحال ایک اخلاقی حکومت
تو قائم ہو گئی ہے۔ لیکن جب وہ قائم ہو تو ہم اسے یہ نہیں
[...]نے یہ چاہا ہماری سپریم کورٹ نے اسے [illegible]
[...]ت دیا ہو۔ اور بعد میں نظریہ ضرورت کے تحت اس
[...]زت دی جائے وہ وہی نظریہ ضرورت اشخاص کو بھی
[...]پڑتا ہے کہ اس حکومت کو تسلیم کریں۔ ان حالات میں
[...]تے ہوئے کہ مارشل ختم کریں، اگر کوئی درست مشورہ
[...]ہیے تو اس کی اجازت ہے ضیاء صاحب کی طرف سے
[...]کش کی گئی کہ جناب آپ تشریف لا کر مشورہ دیں۔ تو میں
[...]ے قبول کیا۔ لیکن وہاں جاتے ہی میں نے محسوس کیا کہ
[...]یہ بات یہ نہیں ہے کہ مشورے سے فائدہ اٹھانا ہے
[...]نا کر صرف دھوکہ دینے کے لیے ہے ایک فراڈ ہے تاثر
[...]ہے کہ ہم سول کے لوگ بھی ساتھ شامل کر لیے ہیں پھر انہوں
[...]ں کے لیے جو قانون بنایا اس سے سارا وقت ضائع
تھا۔ یہ پوائنٹ آف آرڈر ہے یہ وہ ہے۔ حالانکہ کسی
اختیار تو شوریٰ کو تھا نہیں۔ لیکن وہاں یہ دلیل پال[...]
[...]جاری تھی اس کے بعد دوسرے سیشن میں ضیاء صاحب
[...]ہ یہ اسلامی نظام کا اعلان ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شوریٰ
[...]ے سب اللہ کے ساتھ تھے مجھے تو یہ گوارا نہیں تھا میں علیحدہ
[...]یا۔

س: ٹی وی پر آپ کا یہ پروگرام اسی وجہ سے بند کیا گیا تھا
ج: مجھے اس کا کوئی علم نہیں یہ تو وہی جانیں جنہوں
نے بند کیا ہے۔

س: شروع کرنے کی وجہ کیا تھی؟

ج: شروع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے ظاہر کیا کہ
ہم درس قرآن کا یہ پروگرام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے درخواست
کی اور انہوں نے منظور کی۔

س: اس وقت ملک میں جتنی بھی اسلامی جماعتیں
ہیں جو مختلف سمتوں میں کام کر رہی ہیں اس سے ملک کو
نقصان ہو گا یا فائدہ ہو گا۔

ج: ان میں دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں کہ ان میں جتنا
اتحاد ہو گا مفید ہو گا البتہ اس کی عملی شکل کیا ہو میں آپ
کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ پہلے تو ان جماعتوں کی ایک فطری
تقسیم ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ووٹ کے ذریعے ہم
یہاں اسلام لا سکتے ہیں۔ انہیں الیکشن میں حصہ لینا چاہیے
اور وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس راستے سے اسلام نہیں
آئے گا تو ان کے طریقہ کار میں فرق ہو گا۔ طریقہ کار کے
فرق کی موجودگی میں متحدہ کوشش نہیں ہو سکتی لیکن جو لوگ
یہ سمجھتے ہیں کہ ووٹ کے ذریعے اسلام آ سکتا ہے انہیں
لازماً ایک جماعت بننا چاہیے یا کم از کم انتخابی اتحاد کر
لینا چاہیے ورنہ وہ ۱۹۷۰ء جیسی شکست سے دوچار ہوں گے
یہ ان کی لازمی ضرورت ہے وہ اتحاد بنائیں۔ میں سمجھتا ہوں
جماعت اسلامی جے یو آئی، جے یو پی، اہل حدیث ان
کو ایک متحدہ محاذ قائم کرنا چاہیے تاکہ ان کے ووٹ تقسیم
نہ ہوں۔ یہ ان کے لیے ناگزیر ہے بلکہ زندگی موت کا
مسئلہ ہے اگر انہوں نے یہ نہ کیا تو مار کھائیں گے جیسے
پہلے ہوا۔ اس سے آگے بڑھ کر دوسری قسم کی جماعتوں
سے بھی اتحاد ہو سکتا ہے جو صرف انقلابی طریقے پر عمل
پیرا ہیں اور دین کی خدمت کسی اور طرح کر رہے ہیں۔
تعلیمی، علمی، اشاعتی، تدریسی جن کا انداز تبلیغ ہے یہ
سب مل کر متحدہ محاذ بنا سکتے ہیں۔ وہ اس نوعیت کا
جس طرح ایم آر ڈی کا تھا۔ یا اب بھی ہے نظریاتی

غیر اہل کتاب کے ساتھ کھانا کھانے کا مسئلہ

غازی عزیز، الخبر (المملکۃ العربیۃ السعودیہ)

محترم غازی عزیر صاحب کی شخصیت قارئینِ میثاق کے لیے محتاجِ تعارف نہیں ۔ موصوف کے متعدد طویل سلسلہ وار مضامین ماہنامہ "میثاق" میں شائع ہو چکے ہیں ۔ زیرِ نظر مقالے میں محترم غازی صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی جس رائے پر تنقید سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا ہے، اس مسئلہ میں درحقیقت امیرِ تنظیم نے فتوٰی کی زبان استعمال نہیں کی تھی بلکہ، جیسا کہ قارئین بھی بخوبی اندازہ کر سکیں گے، بات صرف اتنی تھی کہ امیرِ تنظیم نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مشورۃً اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ باقی جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے یعنی غیر مسلموں کے ساتھ کھانا کھانے کا مسئلہ تو اس مسئلہ کے خالص شرعی حکم کے ساتھ ساتھ کچھ دیگر ثقافتی اور سیاسی پہلو بھی ہیں جن پر ان شاء اللہ کبھی آئندہ انہی صفحات میں تفصیل سے گفتگو ہو گی تاہم مسئلہ کی شرعی نوعیت کی وضاحت کے لیے محترم غازی صاحب کا مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔ غازی صاحب کی اس تحریر کا ایک تکملہ بعنوان "غیر مسلمین کے ساتھ موالات کا حکم" ان شاء اللہ العزیز آئندہ شمارہ میں شائع کیا جائے گا۔ قارئینِ میثاق میں سے اگر کوئی صاحب مسئلہ زیرِ بحث پر اظہارِ خیال کرنا چاہیں تو ہماری طرف سے میثاق کے صفحات حاضر ہیں۔ (ادارہ)

پس منظر

واقعہ یہ ہے کہ تمام خلیجی عرب ممالک، بالخصوص سعودی عرب میں اپنے بہت سے پاکستانی بھائیوں سے ملاقات کے دوران یہ چیز علم میں آئی کہ غیر مسلم اشخاص بالخصوص غیر اہلِ کتاب (مثلاً ہندو، سکھ، جینی، بدھسٹ اور لادین وغیرہ کے ساتھ کھانا کھانا شرعاً درست نہیں ہے۔ نیز شریعت میں ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے کی ممانعت بھی علماء سے منقول ہے۔ راقم الحروف پہلے دن سے عوام کی اس غلط فہمی کو دُور کرنے کی کوشش قولاً و فعلاً کرتا رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ نے شدت اُس وقت اختیار کی جب انجمن خدام القرآن لاہور و پاکستان تنظیم اسلامی کے مؤسس و امیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے سعودی عرب میں اپنے تبلیغی دورہ کے دوران پاکستانی کمیونٹی ہائی اسکول الخبر (سعودی عرب) میں تشریف لا کر اپنے خطاب کے بعد پاکستان کے قومی و ملی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے انتہائی وثوق و اعتماد کے ساتھ اسی غلط تصور کو بیان کیا۔ آں موصوف کے اس تبلیغی دورے کی رپورٹ روزنامہ "نوائے وقت" کراچی مجریہ ۹؍ نومبر ۱۹۸۵ء اور بعدہٗ ڈاکٹر صاحب موصوف کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے تنظیم اسلامی پاکستان کے آرگن ماہنامہ "میثاق" لاہور کے شمارہ بابت ماہِ فروری ۱۹۸۶ء میں صفحات نمبر ۹-۱۰ پر بحوالہ "نوائے وقت" کراچی شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> "سعودی عرب میں تارکینِ وطن کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ انہیں کیمپوں میں ہندوؤں کے ساتھ یا ہندو باورچیوں کا تیار کردہ کھانا برداشت کرنا پڑتا ہے جس پر متعدد پاکستانیوں کو ناگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ غیر اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے کی ممانعت ہے اس لیے مسلمانوں کو احتیاط کرنی چاہیئے ..... الخ"
>
> (ماہنامہ "میثاق" لاہور منارج ۳۵ عدد شمارہ ۲)

اِس خلافِ واقعہ بیان کے شائع ہونے سے اکثر مقامات پر پاکستانی عوام اور اہلِ علم حضرات کے مابین یہ مسئلہ انتہائی نزاعی صورت اختیار کر گیا جس کو دلائل کے ساتھ رفع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔

اسی اثناء میں کراچی، لاہور، راولپنڈی اور کوئٹہ سے شائع ہونے والے کثیرالاشاعت روزنامہ "جنگ" کے ایک جمعہ ایڈیشن میں اسی موضوع سے متعلق ایک فتویٰ "اقراء — اسلامی صفحہ" پر زیرِ عنوان "آپ کے مسائل اور اُن کا حل" شائع ہوا ہے جو حسب ذیل ہے:

"س: ایک مسلمان (اس غرض سے کہ وہ لوگ اسلام قبول کرلیں) ایک غیر اہلِ کتاب کے گھر آتا جاتا ہے اور انہیں ماں بہن کی طرح تصور کرتا ہے، کیا اُس گھر یا اُن کے ہاتھ کا یا اُن کے برتن میں کھانا اُس مسلم کے لیے جائز ہے!"

ج: اگر اطمینان ہو کہ یہ برتن پاک ہیں اور کھانا حلال ہے تو کھانا پینا جائز ہے۔" (مستفتی نثار احمد خاں صاحب، از کراچی، مفتی: مولانا یوسف لدھیانوی صاحب، روزنامہ "جنگ" بابت ۱۴ رمارچ ۱۹۸۶ء)

پیشِ نظر فتویٰ میں مستفتی کا سوال جس قدر غلط ہے اُس سے کہیں زیادہ غلط اور تشنہ مفتی صاحب کا جواب ہے۔ مستفتی نے اپنے سوال کے جواب میں مفتی صاحب نے اپنے سوال میں اُن غیر اہلِ کتاب کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے مقصد و غرض کی شرط لگائی ہے جبکہ مذکورہ مشروط سوال کے جواب میں مفتی صاحب نے اس امر کی وضاحت سے گریز کیا ہے کہ نفس مسئلہ کا اسلام کی طرف دعوت دینے کی غرض سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیز کسی غیر محرم عورت (خواہ مسلم ہو، اہلِ کتاب ہو غیر اہلِ کتاب) کے ساتھ ملاقات و نشست و برخواست کے تعلقات رکھنے کا اسلام میں کیا شرعی حکم ہے!

بہرحال اصلاحی جذبہ و احقاق حق کے پیشِ نظر اور رفقاء کے بیحد اصرار پر راقم کو نہایت ناخوشگواری کے ساتھ یہ فریضہ انجام دینا پڑ رہا ہے۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو نفس و ہوا کی پیروی سے محفوظ و مامون رکھے اور شریعتِ مطہرہ کی فہم و فراست کے ساتھ ہمیشہ کتاب و سنت کے احکام کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اصل مسئلہ پر بحث شروع کرنے سے قبل ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اسلام میں حلال و حرام کے معیار اور اس سے متعلق چند اصولی و بنیادی باتیں واضح کر دی جائیں تاکہ موضوع زیرِ بحث کو بخوبی سمجھنے میں کوئی دقت و دشواری پیش نہ آئے۔

قرآنِ کریم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تحلیل و تحریم کی تمام بحث کی محور

میں مذکور ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں یہ مسئلہ فروعات و جزئیات کا نہیں بلکہ مستحکم اصول و کلیات کا ہے۔ کسی چیز کو حرام یا حرام قرار دینے کے لیے اسلام نے جو اصول وضع کیے ہیں، اُن میں سے پہلا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ تمام دنیاوی چیزیں اصلاً مباح اور حلال ہیں بجز اُن چیزوں کے جن کی حُرمت کے متعلق صحیح اور صریح نصوص وارد ہوئی ہیں۔ لہٰذا اگر صحیح نص موجود نہ ہو بلکہ ضعیف ہو یا ایسی ہو کہ حُرمت پر واضح و صریح طور پر دلالت نہ کرتی ہو تو اُس چیز کی اصل اباحت برقرار رہے گی۔

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"اگرچہ بعض چیزیں استحباب اور بعض چیزیں کراہت کے درجہ میں ہوتی ہیں لیکن جب تک شریعت واضح طور پر پابندی عائد نہ کرے وہ اپنی اصل اطلاقی حالت پر باقی رہتی ہیں۔"

(القواعد النورانیہ الفقہیہ تالیف امام ابن تیمیہؒ صـ۱۱۲-۱۱۳)

اسلامی شریعت میں محرمات کا دائرہ بہت تنگ اور اس کے برعکس مباح اور حلال چیزوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ۔

(سورہ الانعام - ۱۱۹)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کی تفصیل بیان فرما دی ہے جن کو تم پر حرام ٹھہرایا ہے۔"

یہ حدیث نبویؐ میں مروی ہے:

ما احل اللہ فی کتابہ فھو حلالٌ وما حرم فھو حرامٌ وما سکت عنہ فھو عفوٌ فاقبلوا من اللہ عافیتہٗ فان اللہ لم یکن ینسیٰ شیئًا وتلا وما کان ربک نسیًّا۔

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جس چیز کو حلال ٹھہرایا وہ حلال ہے اور جس چیز کو حرام ٹھہرایا وہ حرام ہے اور جن چیزوں کے بارے میں سکوت فرمایا وہ معاف ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اس فیاضی کو قبول کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ سے بھول چوک کا صدور نہیں ہوتا۔

پھر آپ نے سورہ مریم کی آیت ۶۴ یعنی "آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے" تلاوت فرمائی۔ (سورۃ المریم الآیہ ۔ ۶۴)

ایک حدیث نبویؐ میں مروی ہے:

"وحرم أشياء فلا تنتهكوها. وسكت عن أشياء رحمة بكم غير نسيان فلا تبحثوا عنها۔" (رواہ الدارقطنی)

ترجمہ: "اور جن چیزوں کو اُس تم نے حرام ٹھہرایا ہے اُن کی بے حرمتی نہ کرو اور جن چیزوں کے بارے میں اُس نے دانستہ سکوت اختیار فرمایا ہے، وہ چیزیں تمہارے لیے رحمت ہیں۔ لہٰذا ایسی چیزوں کے متعلق بحث میں نہ پڑو۔"

سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الحلال ما احل الله فی كتابه والحرام ما حرم الله فی كتابه وما سكت عنه مما عفا لكم۔" (رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

ترجمہ: "حلال وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال ٹھہرایا اور حرام وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام ٹھہرایا۔ باقی وہ اشیاء جن سے اُس نے سکوت فرمایا وہ معاف ہیں۔"

اسلام کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ تحلیل و تحریم کا اختیار کسی مخلوق کو ہیں بلکہ یہ حق فقط اور فقط خالقِ حقیقی کا ہے۔ کسی مولوی، مفتی، عالم، پیر، ولی، امی، فقیہہ، محدث، امام، مجتہد یا حکمران کو قطعاً یہ حق و اختیار نہیں ہے کہ وہ مدگانِ خدا تعالیٰ پر کسی حلال چیز کو حرام یا حرام چیز کو حلال ٹھہرائے۔ جو شخص بھی س فعلِ مذموم کی جسارت کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تشریعی حقوق میں سے تجاوز کا مرتکب ہوگا، نیز جو ایسے شخص کی اتباع کرے گا اور اپنے قول یا مل سے اُس کے ساتھ تعاون یا اُس پر رضامندی کا اظہار کرے گا وہ شرک کا مستوجب قرار پائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ

"ترجمہ: "کیا ان کے کچھ ایسے شریک خدائی ہیں جنہوں نے اُن کے لیے ایسا

يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ ۔ دین مقرر کر دیا ہے جس کی اللہ تعالٰے
(سورۃ الشوریٰ - ۲۱) نے اجازت نہیں دی ہے؟

اس آیت میں استفہامِ انکاری سے مقصود یہ ہے کہ کوئی اس قابل نہیں کہ خدا کے خلاف اُس کا مقرر کیا ہوا دین معتبر ہو سکے۔

یہود و نصاریٰ نے تحلیل و تحریم کے اختیارات اپنے علماء و مشائخ کو دے رکھے تھے جس پر اللہ تبارک و تعالٰے نے قرآنِ کریم میں سخت نکیر فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے :

"اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝
(سورۃ التوبہ - ۳۱)

ترجمہ: "انہوں نے اللہ تعالٰے کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو (باعتبارِ اطاعت کے) اپنا رب بنا رکھا ہے اور مسیح ابنِ مریم کو بھی حالانکہ انہیں ایک معبود کے سوا کسی کی عبادت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا وہ جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ ان کی مشرکانہ باتوں سے پاک ہے۔"

ایک حدیث میں مروی ہے :

وقد جاء عدی بن حاتم الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ فلما سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ ھٰذہ الآیۃ قال یا رسول اللہ انھم لم یعبدوھم فقال بلیٰ انھم حرموا علیھم الحلال واحلوا لھم الحرام فاتبعوھم فذالک

ترجمہ: "جب عدی بن حاتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے سنا تو عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کی عبادت تو نہیں کی۔ آپؐ نے فرمایا: کیوں نہیں اُنہوں نے اُن پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرایا تھا۔ اور ان لوگوں

عبادتہم ایاھم (رواہ الترمذی)

نے ان کی اتباع کی۔ علماء و مشائخ (احبار و رہبان) کی عبادت کا یہی مطلب ہے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

" اما انہم لم یکونوا یعبدونہم ولکنہم کانوا اذا احلوا لہم شیئاً استحلوہ واذا حرموا علیہم شیئاً حرموہ۔"

ترجمہ: "یہ لوگ علماء و مشائخ کی پرستش نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے لیے حلال اور حرام کی ہوئی چیز کو اپنے لیے حرام کر لیتے تھے۔"

پس واضح ہوا کہ حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دینے کا حق و اختیار فقط اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اگر کوئی انسان کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال ٹھہرائے تو اس کا یہ فعل بد شرک کے قبیل سے قرار پائے گا۔ اسلام نے اُن لوگوں کی شدید مذمت کی ہے جو تحلیل و تحریم کے مختار بن جائیں، خاص طور سے اُس نے حلال کو حرام کرنے والوں پر سخت گرفت کی ہے کیونکہ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق بلا سبب تنگی اور ضیق میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اس کے اندر تعمق پسندانہ رجحانات سر اُبھارنے لگتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمق و تشدد کے رجحانات سے منع فرمایا ہے اور اس قسم کا رویّہ اختیار کرنے والوں کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

" الا ھلک المتنطعون، الا ھلک المتنطعون، الا ھلک المتنطعون۔" (رواہ مسلم و احمد و ابوداؤد)

ترجمہ: "آگاہ ہو جاؤ کہ دین میں تعمق و تشدد پیدا کرنے والے ہلاک ہو گئے، آگاہ ہو جاؤ کہ دین میں تعمق و تشدد پیدا کرنے والے ہلاک ہو گئے، آگاہ ہو جاؤ کہ دین میں تعمق و تشدد

پیدا کرنے والے ہلاک ہو گئے۔"

ایک حدیث میں رسالتِ محمدیؐ کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ:

"بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ" (رواہ احمد)

ترجمہ: "میں ایسے دین کے ساتھ بھیجا گیا ہوں جو حنیف ہے اور فراخ بھی۔"

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالےٰ فرماتا ہے:

"انی خلقت عبادی حنفاء وانھم اتتھم الشیاطین فاجتالتھم عن دینھم وحرمت علیھم ما احللت لھم وامرتھم ان یشرکوا بی مالم انزل بہ سلطانا"۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: "میں نے اپنے بندوں کو دینِ حنیف پر پیدا کیا، لیکن شیاطین نے انہیں بہکایا اور ان پر ان چیزوں کو حرام کر دیا جن کو میں نے حلال کر دیا تھا اور انہیں حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ ان کو شریک ٹھہرائیں جن کے شریکِ خدا ہونے کی میں نے قطعاً کوئی سند نازل نہیں کی۔"

مشہور واقعہ ہے کہ مدینہ منورہ میں صحابہ کرامؓ کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جن میں شدت پسندی اور طیبات اور مباح چیزوں کو اپنے نفس پر حرام کر لینے کا رجحان غالب ہو گیا تھا۔ اس موقع پر اللہ تبارک و تعالےٰ نے محکم آیات نازل فرما کر ان کو حدود اللہ پر پابند رہنے اور صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی ہدایت فرمائی جو قرآن کریم میں اس طرح مذکور ہے:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ وَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰہَ

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کی ہیں ان کو حرام نہ ٹھہراؤ۔ اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالےٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا جو حلال و طیب

الَّذِیٓ اَنۡتُمۡ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ۔ (سورہ المائدہ ۸۷/۸۸)

رزق اللہ تعالیٰ نے تم کو بخشا ہے اُسے کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔"

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ سے منقول ہے کہ" سلف صالحین حرام کا لاق صرف اس چیز پر کیا کرتے تھے جس کی حرمت قطعی طور پر ثابت ہے۔" ، طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تحلیل و تحریم سے متعلق سوالات کے جواب میں فرماتے: یں اسے مکروہ خیال کرتا ہوں یا اچھا نہیں سمجھتا یا یہ پسندیدہ نہیں ہے۔" ، بات امام مالک رح ، امام ابوحنیفہ رح اور دیگر تمام ائمہ و فقہاء و اجتہاد سے منقول ہے ضی ابو یوسف رح فرماتے ہیں کہ " میں نے بہت سے اہلِ علم مشائخ کو دیکھا کہ وہ اس بارے میں فتویٰ دینا پسند نہیں کرتے اور کسی چیز کو حلال یا حرام ہ کے بجائے کتاب اللہ میں جو کچھ مذکور ہے اسے بلا تفسیر بیان کرنے پر اکتفا کرتے یں۔ کوفہ کے ممتاز فقہائے تابعین میں سے امام ابراہیم نخعی رح سے منقول ہے کہ جب ن کے اصحاب فتویٰ دیتے تو یہ مکروہ ہے یا اس میں کوئی حرج نہیں کے الفاظ ستعمال کرتے تھے کیونکہ کسی چیز کی حلت و حرمت کا حکم لگانے سے زیادہ غیر مہ دارانہ بات اور کیا ہو سکتی ہے۔" (کتاب الام تالیف امام شافعی مختصراً)

اِس تمہیدی بحث کے اختتام پر تحلیل و تحریم کے سلسلہ میں یہ وضاحت رنا یقیناً غیر مفید نہ ہوگا کہ اس قبیل کی صرف اُن چیزوں سے روکنا چاہیے جن اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح حرام ٹھہرایا ہے۔ بصورت یگر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہم پر صادق آئے گا:

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ لَـكُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ فَجَعَلۡتُمۡ مِّنۡهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلۡ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَـكُمۡ اَمۡ عَلَى اللّٰهِ تَفۡتَرُوۡنَ ۔ (سورہ یونس ۵۹)

ترجمہ: " آپؐ (اُن سے) کہہ دیجئے کہ کیا تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رزق تمہارے لیے نازل فرمایا تھا اُس میں سے (از خود) کسی کو تم نے حرام اور کسی کو حلال ٹھہرا لیا؟ آپؐ (اُن سے) پوچھیے کہ کیا اللہ تعالیٰ

نے تمہیں اس بات کی اجازت دی تھی یا محض (تم اللہ تعالیٰ پر افترا کرتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ پر افتراء اور کذب بیانی سے کام لینے والا شخص بلاشبہ ہرگز نجات و فلاح نہیں پا سکتا جیسا کہ قرآن کریم میں خود باری تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ" (سورہ النحل: ۱۱۶)

ترجمہ: "یہ جو تمہاری زبانیں اللہ تعالیٰ پر کذب بیانی کرتے ہوئے جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ چیز حرام ہے تو ایسی باتیں نہ کیا کرو کیونکہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ ہرگز فلاح نہ پائیں گے۔"

اب زیر بحث موضوع سے متعلق پیدا ہونے والے مختلف النوع سوالات اور شریعت مطہرہ کی روشن تعلیمات میں اُن سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی سعی کی جائے گی۔ وباللہ التوفیق والمنہ۔

اِس مسئلہ کا پہلا سوال یہ ہے کہ کیا کسی غیر مسلم (بالخصوص غیر اہلِ کتاب ولادین) شخص کے ساتھ اُس کے برتنوں میں کھانا کھانا یا کسی غیر اہلِ کتاب ولادین شخص کے ہاتھ کا تیار کردہ کھانا ایک مسلمان کے لیے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کے لیے کیا شرائط اور استثنائی صورتیں ہیں؟

مندرجہ بالا سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی غیر اہلِ کتاب یا لادین شخص کے ساتھ اُس کے برتنوں میں کھانا کھانا یا اُس کے ہاتھ کا تیار کردہ کھانا کھانے میں ہرگز کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، کیونکہ اُس کی حرمت کتاب اللہ یا کسی صریح حدیث نبوی سے قطعاً ثابت نہیں ہے بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کافرہ کے ساتھ کھانا کھانا ثابت ہے۔ امام بخاری رح نے اپنی صحیح میں "قبول الہدیۃ من المشرکین" کے عنوان سے مستقل ایک باب باندھا ہے جس میں وہ چار روایات لائے ہیں۔ اسی باب کی ایک روایت میں آں صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غیر مسلم کی پیش

اور زہر آلود بکری کا قبول کرنا اور اسے تناول کرنا مذکور ہے۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب الہبۃ باب قبول الہدیۃ من المشرکین)۔

کسی غیر مسلم کے کھانے کو استعمال کرنے کے لیے جو چند شرائط ہیں، وہ یہ ہیں کہ: کھانا کھانے کے برتن اور ساتھ کھانا کھانے والا غیر اہلِ کتاب شخص ظاہری طور پر جسمانی نجاست سے پاک ہو نیز وہ کھانا اُن اشیاء پر مشتمل نہ ہو یا کھانا پکانے کے دوران ایسے برتن یا ایسی چیزوں کا استعمال نہ کیا گیا ہو جن کی حرمت صراحت کے ساتھ کتاب و سنّت میں مذکور ہے۔ ان شرائط کے علاوہ اس کے لیے کوئی اور شرط یا عرض یا استثنائی صورت کتاب و سنّت میں نہیں ملتی۔

بعض لوگ کسی غیر اہلِ کتاب سے مستقل طور پر کے طور پر خدمت لینا مکروہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ بعض فقہائے حنفیہ کا قول ہے کہ اتفاقیہ ایک دو بار مشرکین کے ساتھ یا اُن کے ہاتھ کا تیار کردہ کھانا کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ایک کافرہ کے ساتھ کھانا تناول فرمانا ثابت ہے لیکن اسے ہمیشہ کی عادت بنا لینا مکروہ ہے: "ان کان ذالك مرۃ او مرتین یجوز لان النبی صلّی اللہ علیہ وسلم اکل مع کافرۃ فیصلنا علیٰ ذالك ولکن یکرہ المداومۃ علیہ۔" کذا فی نصاب الاحتساب باب چہارم ونفع المفتی والسائل مثلاً)

اسی طرح فقہ حنفی کی مشہور کتاب "فتاویٰ عالمگیری" میں کہیں گھر جانے کی صورت میں اس بات کی ایک دو دفعہ اجازت دی ہے لیکن مداومت کو مکروہ قرار دیا ہے:

"ان ابتلی بہ المسلم مرۃ او مرتین فلا باس و اما الدوام علیہ فیکرہ۔"

(فتاویٰ عالمگیری، کتاب الکراہیۃ)

مداومت سے متعلق فقہائے حنفیہ کی بیان کردہ "کراہت" علوم نقلیہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض قیاس اور اجتہادی رائے پر ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ واضح، قابلِ اور حق و انصاف کے قریب تر فتویٰ مشہور حنفی عالم جناب مولانا عبدالحئی لکھنوی مرحوم کا ہے جس میں آپ سے کسی مستفتی نے سوال کیا: "(س) کیا فرماتے ہیں علمائے شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت میں کہ قوم مہتر یا ڈوم یا چمار یا دو ساد ہیہ جو ہندو کافر مردار نہ ہوتے ہیں اکثر چیزیں حرام مثل چوہا اور بلا اور ضب یعنی گوہ اور کیکڑا وغیرہا کو کھایا کرتے ہیں الخ

کے یہاں کی چیزیں از قسم حلال پکی ہوئی کھانا یا ان کے ہاتھ کا پانی کنوئیں یا دریا سے نکالا ہوا، کہ جس میں کوئی شبہ تلویث اشیاء حرام یا نجاست وغیرہا کا نہ ہو شرعاً ممنوع ہے یا جائز؟ اور ان کے ہاتھ سے چیزیں مثل روٹی اور گوشت یا شکر اور دال پکوانا یہ سب چیزیں اُن لوگوں کے ہاتھ کی چھوئی ہوئی مسلمانوں کو کھانا روا ہوگا یا نہیں؟ الخ؟

آں محترم نے اس مفصل سوال کے جواب میں تحریر فرمایا: "(ج) جب تک کوئی نجاست ظاہری یقیناً اعضائے ظاہرہ کافر پر نہ ہو اس کے ہاتھ سے کھانا پکوانا یا پانی نکلوانا یہ سب درست ہے۔ دائمی روا ہوگا جب تک تیقن نجاست نہیں ہوگا۔ الخ"

(فتاویٰ عبدالحی لکھنوی ج ۱ ص ۱۸۱، استفتاء رقم ۱۳۶ مختصراً)

بعض فقہاء یہاں تک فرماتے ہیں کہ مشرکین کے کھانے میں اگر نجاست موجود ہونے کا وہم ہو تو بھی اس کھانے پر طہارت اور صحت و سلامتی کا حکم لگے گا الا یہ کہ تیقن نجاست اور فساد و بطلان پر کوئی قطعی حجت و دلیل قائم ہو۔ پس ایسی صورت میں کفار و مشرکین یا کسی بھی لادین کے ساتھ کھانا کھانا روا ہوگا چنانچہ "فتاویٰ حمادیہ میں مذکور ہے":

"والاطعمة التی یتخذها اهل الشرك ویتوهم فیها اصابة النجاسة علی ذالك محكوم بطهارته حتی تیقن بنجاستها" الخ (فتاویٰ حمادیہ مختصراً)

اگر مشرکین کے برتنوں کی نجاست کا پہلے سے علم نہ ہو تو انہیں بلا دھوئے ہوئے کھانا پکانا بھی جائز ہے۔ اگر برتنوں کی نجاست کا علم پہلے سے ہو مگر انہیں استعمال سے قبل دھو کر پاک کر لیا گیا ہو تو ان میں کوئی نجاست نہیں رہ جاتی، لیکن بغیر دھوئے ہوئے ایسے برتن جن کی نجاست کا علم ہو استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

مملکۃ العربیۃ السعودیہ کی مشہور یونیورسٹی جامعہ امام محمد بن سعود الریاض کے استاذ شیخ عبدالعزیز محمد سلمان لکھتے ہیں: "کفار کے برتن اور لباس مباح ہیں اگر انکی کیفیت نامعلوم ہو کیونکہ مروی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے ایک مشرکہ کے مزادہ سے وضو فرمایا تھا۔"

(الاسئلۃ والاجوبۃ الفقہیۃ المقرونۃ بالادلۃ الشرعیۃ ج ۱ ص ۵ طبع دوم مطبعۃ الریاض وکذا فی الصحیحین)

سنن ابوداؤد کی ایک روایت جسے امام احمد نے بھی روایت کیا ہے، میں دوران غزوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا مشرکین کے برتن استعمال کرنے کا ذکر

ما ہے۔ اس روایت کو حضرت جابرؓ نے اس طرح روایت کیا ہے۔
" کنا نغزو مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنصیب من
نیۃ المشرکین واستقیتہم بہا فلا یعیب ذالک علیہم"
(رواہ ابو داؤد واحمد)

ایک اور روایت میں ابی ثعلبہ الخشنی سے مروی ہے کہ :" انہ سأل
سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انا نجاور اھل الکتاب وھم
طبخون فی قدورھم الخنزیر ویشربون فی اٰنیتہم الخمر
فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان وجدتم غیرھا فکلوا
فیہا واشربوا وان لم تجدوا غیرھا فارحضوھا بالماء وکلوا
واشربوا " (رواہ ابو داؤد مع العون المعبود ج ۳ ص ۴۲۸ باب الاکل فی آنیۃ اہل الکتاب
طبع دہلی و ملتان)

شارح سنن ابو داؤد علامہ شمس الحق عظیم آبادیؒ فرماتے ہیں، خطابیؒ کا قول ہے کہ
(اوپر بیان کی ہوئی پہلی) حدیث سے ظاہر ہے کہ مشرکین کے برتن بغیر دھوئے اور پاک
کئے ہوئے استعمال کرنا علی الاطلاق مباح ہیں اور یہ اباحت مقیدۃ ہے اس شرط کے ساتھ
جو اس باب کی (دوسری) حدیث میں مذکور ہے۔ (بزاز کی روایت میں یہ بھی ملتا ہے کہ ہم
نے ان برتنوں کو دھویا اور ان میں کھانا کھایا جب کہ حافظؒ نے فتح میں بیان کیا ہے) خطابیؒ
کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے برتنوں کے غسل کی اجازت ہے لیکن اس سلسلہ میں اصل
قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اگر مشرکین کا حال معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے برتنوں میں خنزیر پکاتے اور
شراب پیتے ہیں تو ان برتنوں کا بغیر دھوئے ہوئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے!
(عون المعبود شرح سنن ابو داؤد ج ۳ ص ۴۲۸ طبع دہلی و ملتان)

بعض فقہائے حنفیہ کے نزدیک مشرکین کے برتنوں میں بغیر دھوئے ہوئے کھانا پینا جائز
لیکن مکروہ ہے بشرطیکہ برتنوں کی نجاست کا علم نہ ہو بصورت دیگر بغیر دھوئے ہوئے کھانا پینا
ناجائز ہے، جیسا کہ " فتاوی عالمگیری" میں مذکور ہے۔ " ویکرہ الاکل والشرب
فی اوانی المشرکین قبل الغسل ومع ھذا لو اکل او شرب قبل الغسل
جاز ولا یکون آکلا ولا شاربا حراما وھذا اذا لم یعلم بنجاسۃ الاوانی

فاما اذا علم فانہ لایجوز ان لیشرب ویاکل منہ ماقبل الغسل" (فتاویٰ عالمگیری ج ۱ طبع مصری) "عالمگیری" کی اس مذکورہ کراہت کی بنیاد بھی محض قیاس پر ہے جسے ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اثر موجود نہیں ہے۔

موضوع زیر بحث کے سلسلہ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا کسی غیر مسلم اور غیر اہل کتاب کا جھوٹا کھانا پینا کسی مسلم کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی غیر مسلم اور غیر اہل کتاب کا جھوٹا کھانے پینے میں مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ وہ کھانا یا مشروب حلال اشیاء سے تیار کیا گیا ہو، جس برتن میں اسے پکایا اور رکھا گیا ہو وہ دونوں پاک ہوں یا کم از کم ان برتنوں کی نجاست کا علم نہ ہو، جس غیر اہل کتاب شخص نے اسے کھایا یا پیا ہو وہ ظاہری نجاست حقیقی سے پاک ہو نیز بظاہر اس جھوٹے کھانے یا مشروب میں کوئی نجاست پڑی ہوئی نظر نہ آتی ہو۔ اس حلت کی دلیل یہ ہے کہ ہر بنی آدم کا لعاب دہن بلا تفریق رنگ و نسل و بلا امتیاز دین و مذہب طاہر و پاک ہے چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "بحر الرائق" میں مذکور ہے۔

"سؤر الآدمی طاهر لا فرق بين الجنب و الطاهر و الحائض و النفساء و الصغير و الكبير و المسلم و الكافر و الذكر و الانثى يعني ان الكل طاهر و طهور غير كراهة ۔ الخ" (بحر الرائق)

ترجمہ: "آدمی کا لعاب دہن پاک ہے جس میں جنبی اور پاک، حائضہ اور نفاس والی عورت، چھوٹے اور بڑے، مسلم اور کافر، مذکر اور مؤنث کا کوئی فرق نہیں ہے یعنی سب پاک ہیں اور طہور اس کی عدم کراہت سے ہے۔"

اسی طرح "فتاویٰ عالمگیری" میں ہے۔

سؤر الآدمی طاهر و يدخل فيه الجنب و الحائض و النفساء و الكافر ۔ الخ" (فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۲۳)

ترجمہ: "آدمی کا لعاب پاک ہے، اس حکم میں جنبی، حائض، نفاس والی عورتیں اور کافر سب داخل ہیں۔"

اور در مختار میں ہے:

"فسؤر الآدمی مطلقاً ولو جنباً او كافراً طاهر ۔ الخ"

ترجمہ: "انسان کا لعاب دہن مطلقاً پاک ہے خواہ وہ جنبی ہو یا کافر۔"

ردالمحتار علی ہامش درالمختار ج۱ ص۱۴۸

علامہ عبدالرحمن الجزیریؒ بیان کرتے ہیں :" مالکیہ کا قول ہے : اللعاب ھو ما لیسیل من الفم حال الیقظۃ أو والنوم وھذا طاھر بلانزاع اما مایخرج من المعدۃ الی الفم فانہ نجس الخ یعنی لعاب وہ ہے جو منہ سے حالت بیداری اور خواب میں بہتا ہے اور یہ بلانزاع پاک ہے لیکن جو معدہ سے خارج ہوکر منہ میں آتا ہے وہ نجس ہے ۔ اور حنابلہ کا قول ہے کہ پسینہ ، بلغم اور تھوک سب پاک ہیں ۔" (الفقہ علی المذاہب الاربعہ الجزء الاول ص۶ طبع استانبول ۱۹۸۳ء)

مشہور مترجم و شارح احادیث نبویؐ علامہ مولانا وحیدالزمانؒ صاحب صحیح بخاری کے باب " البصاق والمخاط ونحوہ فی الثوب " یعنی " تھوک اور رینٹ وغیرہ کپڑے میں لگنے کا بیان " کے فائدہ کے طور پر تحریر فرماتے ہیں : " اس حدیث سے یہ نکلا کہ آدمی کا تھوک پاک ہے اگر منہ میں کوئی نجاست نہ ہو اور یہی باب کا مطلب ہے ۔ اس حدیث کو خود امام بخاریؒ نے کتاب الشروط میں وصل کیا ہے الخ ۔" (تیسیرالباری اردو ترجمہ و شرح صحیح بخاری ج۱ ص۱۶۱ کتاب الوضوء طبع تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی)

جامعہ امام محمد بن سعود الریاض (سعودی عرب) کے استاد شیخ عبدالعزیز محمد سلمان نے تمام انسانوں کے لعاب دہن کی طہارت اور اس کے بہت سے دلائل اپنی کتاب " الاسئلہ والاجوبہ " میں بیان کیے ہیں جو قابل مطالعہ ہیں ۔ (ملاحظہ ہو الأسئلہ والأجوبہ الفقہیہ المقرونۃ بالادلۃ الشرعیہ ج۱ ص۵۴ - ۵۵ طبع دہم الریاض)

"ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کفار و مشرکین کے " نجس عین " ہونے کا وہم غالباً قرآن کریم کے اس ارشاد باری تعالیٰ سے ہوا ہے :

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ترجمہ : " مشرکین ناپاک ہیں "

(سورہ التوبہ - ۲۸)

حالانکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے مراد یہ ہے کہ مشرکین کی نجاست اعتقادی ہے نہ کہ ظاہری و جسمانی جیسا کہ تمام مفسرین متقدمین و متأخرین نے بیان کیا ہے ۔ اپنے موقف کی تائید میں ہم ذیل میں چند مشہور مفسرین کی تفاسیر سے اقتباسات پیش کرتے ہیں ۔

امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ " مشرکین اپنی باطنی خباثت کے باعث نجس ہیں ۔" (القرآن الکریم مع تفسیر جلالین علی الھامش ص۱۵۶ طبع مکتبۃ الشعبیہ المصریہ)

حافظ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں : " یہ آیت کریمہ مشرک کی نجاست پر دلالت کرتی ہے جیساکہ صحیح میں موجود ہے کہ (المؤمن لا ینجس) ولما نجاستہ بدنہ فالجمہور علی انہ لیس بنجس البدن یعنی مشرک کے بدن کی نجاست کے متعلق جمہور کا قول ہے کہ ان کا بدن اور ذات نجس نہیں ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کا طعام حلال قرار دیا ہے لیکن بعض ظاہریہ ان کی جسمانی نجاست کے بھی قائل ہیں۔ اشعث نے حسن سے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی مشرک ان سے مصافحہ کر لیتا تو وہ وضو کرتے "۔ (تفسیر ابن کثیرؒ ص۳۴۶ پ ۲ ج۲ وکذا فی تفسیر ابن جریرؒ)

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم فرماتے ہیں : ناپاک ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ بذات خود ناپاک ہیں بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعتقادات، ان کے اخلاق ان کے اعمال اور ان کے جاہلانہ طریقِ زندگی ناپاک ہیں الخ "

تفہیم القرآن ج ۲ ص۱۸۷ حاشیہ عہ۲۵ طبع ادارہ ترجمان القرآن لاہور نومبر ۱۹۸۲ء

مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے بھی اِس کا ترجمہ یوں فرمایا ہے : " مشرک لوگ (بوجہ عقائدِ خبیثہ) نرے ناپاک ہیں الخ " (تفسیر و ترجمہ اختصار شدہ بیان القرآن ص۱۷۲ طبع تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور و کراچی)

اور علامہ شمس الحق عظیم آبادیؒ فرماتے ہیں : " لیس بذات بجنس" یعنی وہ بذاتِ خود نجس نہیں ہیں۔ (عون المعبود ج ۱ ص۲۵ طبع دہلی و ملتان)

علامہ عبدالرحمٰن الجزیریؒ فرماتے ہیں :

" اما قولہ تعالیٰ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فالمراد بہ النجاسۃ المعنویۃ التی حکم بہ الشارع ولیس المراد ان ذات المشرک بجسمۃ کنجاسۃ الخنزیر الخ" (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱ ص۱ طبع استنبول)	ترجمہ : " اللہ تعالیٰ کا قول کہ مشرکین نجس ہیں سے مراد معنوی نجاست ہے کہ جس کا حکم شارع نے بیان کیا ہے۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ مشرک کی ذات بھی خنزیر کی ذات کی طرح ناپاک ہے "

فقہ حنفی کی مشہور کتاب " بحر الرائق " میں مذکور ہے :

ان المراد بقولہ تعالیٰ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ، النجاسۃ فی	ترجمہ : " اللہ تعالیٰ کا قول کہ مشرکین نجس ہیں سے مراد ان کے اعتقاد کی

اعتقادھو" (بحرالرائق) نجاست ہے۔"

چنانچہ امام ابو حنیفہؒ کے ایک مشہور شاگرد امام محمدؒ غیر مسلمین کے متعلق یہاں تک فرماتے ہیں کہ :

لجوز غیر المسلم ان یمسہ (ای قرآن الکریم) اذا اغتسل اما تحفیظ غیر المسلم القرآن فانہ جائز الخ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ صفحہ ۴۸)

ترجمہ: اگر کوئی غیر مسلم غسل کے بعد قرآن کریم کو چھوئے تو یہ جائز ہے نیز قرآن کریم کی تحفیظ بھی غیر مسلم کے لیے جائز ہے۔"

امام محمدؒ کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ غیر مسلم کی نجاست محض اعتقادی اور معنوی ہے۔ حقیقی، جسمانی اور ذاتی نہیں ہے۔ یہی بات اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس ارشادِ حقانی " ولقد کرمنا بنی آدم" یعنی " ہم نے بنی آدم کو مکرم بنایا" کی متقاضی بھی ہے۔

اب ڈاکٹر صاحب کی محولہ تحریر و گفتگو کی مصدقہ رپورٹ کے بعض جملوں پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالتا چلوں :

جہاں تک " سعودی عرب میں تارکینِ وطن" کے مختلف " کیمپوں میں ہندوؤں کے ساتھ یا ہندو باورچیوں کا تیار کردہ کھانا برداشت کرنے" کے اِس " مسئلہ" کی " اہمیت" کا تعلق ہے یا جس کے باعث " متعدد بار" پاکستانی حضرات کو " ناگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے" وہ سرے سے کوئی اہم یا غیر اہم مسئلہ ہی نہیں ہے جیسا کہ اوپر شرعی دلائل کے ساتھ واضح کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک باشندگانِ " اسلامی جمہوریۂ پاکستان" کی غالب اکثریت میں اسی فکر کے پائے جانے کا تعلق ہے تو یہ ان کی دین و مذہب کی تعلیمات سے لاعلمی، بیجا تنگ نظر اور تعصب کی غمازی کرتا ہے جس کا غالب عامل دین و مذہب کے ساتھ وابستگی سے کہیں زیادہ ماضی کے تلخ سیاسی و ملکی حالات اور شخصی تہی دامن کا احساس شدید ہے۔ مخلصانہ طور پر عرض کرتا ہوں کہ ان حالات میں عوام کے پیش نظر بحیثیت سچے مسلم کے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد رہنا چاہیئے :

" عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "

ترجمہ: " عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اور ان لوگوں کے مابین محبت ڈال دے جن سے تمہاری عداوت ہے۔ اللہ تعالیٰ

بڑی قدرت والا، غفور اور رحیم ہے۔" (الممتحنہ۔ ۷)

تقریباً یہی مضمون ایک حدیث نبویؐ میں اس طرح مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ابغض عدوک ھوناً ما	ترجمہ: "اپنے دشمن سے بغض و عناد
عسیٰ ان یکون حبیبک	کسی قدر کم رکھو، ہوسکتا ہے کہ وہ
یوماً ما" (رواہ الترمذی والبیہقی)	(عدو) کسی دن تمہارا دوست بن جائے۔"

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس فکر کو پھیلانے میں خود غرض سیاست دان حضرات نیز مفاد پرست اور نام نہاد علمائے سوء نے ہم زبان ہوکر ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے چنانچہ اس ناجائز منافرت اور نہ جانے اس جیسی کتنی خرافات کا پروپیگنڈہ (تشہیر) اس قدر وسیع پیمانہ پر کیا گیا ہے کہ عوام کے نزدیک یہ بالکل افکار و نظریات جزو ایمان و جزو دین کا مقام پا چکے ہیں جو فی الواقع شریعتِ مطہرہ میں ادنیٰ سا مقام بھی نہیں رکھتے۔ وانا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس موقع پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد یاد آرہا ہے جس میں آپ نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے:

"من احدث فی امرنا ھٰذا ما	ترجمہ: "جو شخص ہمارے اس دین میں
لیس منہ فھو رد"۔"	کوئی نئی بات پیدا کرے جو اس سے
(صحیح بخاری ج۵ ص۳۰۱ و صحیح مسلم ج۲ ص۷۷)	متعلق نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔"

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"والمراد بہ امر الدین الخ"	ترجمہ: "اس سے مراد دینی امر ہے۔"
(فتح الباری ج۵ ص۲۲۱)	

حافظ ابن رجبؒ فرماتے ہیں:

"کل من احدث فی الدین مالم	ترجمہ: "جس نے دین کے اندر کوئی
یاذن بہ اللہ و رسولہ فلیس	ایسی چیز ایجاد کی جس کی اجازت اللہ تعالیٰ
من الدین فی شئ الخ"	اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے
(جامع العلوم والحکم ص۴۲)	نہ دی ہو تو اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

باقی صفحہ ۹۱ پر

کار و آراء

ٹیلیویژن کی مجرائی ثقافت !!

حکومت مسلم لیگ کی ! دعویٰ پاکستان کے نظریاتی کردار کے احیاء کا ! غلغلہ نفاذ شریعت کی آئینی راہ ہموار کرنے
نعرہ کا ! اور وزیر اطلاعات معتبر مسلم لیگی خاندان کا چشم و چراغ ! مگر یہ ایں پاکستان ٹیلی ویژن بے لگام ہے،
ے باہر ہے ۔ اس کی انتظامیہ کے چوہدری وزیر اطلاعات کو در خورِ اعتنا نہ سمجھ کر من مانی اور مکمل خود سری پر
ہیں ۔ حکومت کے نظریاتی کردار کو مسخ ، بے اعتبار اور غیر مؤثر کرنے پر کمربستہ ہیں ۔ برسوں سے پاکستان ٹیلیویژن
تدریج کے ساتھ اس کوشش میں قدم بقدم آگے بڑھ رہا ہے کہ اس قوم کے مزاج اور دینی کردار کو بدل کر
نیت اور جدیدیت کی راہ پر لے آئے ۔ اس ٹیلی ویژن نے پردے کے بعد دوپٹے کو اس معاشرے سے
ست کرنے ، ناچ گانے کو رائج کرکے، اسے قوم کے مزاج کی لازمی طلب بنا ڈالنے میں بڑا جارحانہ کردار
یا ہے ۔ اور پورے ملک کے ثقافتی تشخص کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے ۔ تضادات کو ابھارا اور منافقت
وصلہ افزائی کی ہے ۔

گذشتہ دورِ حکومت میں اسلامی ممالک کی موسیقی کے عنوان سے ایسے پروگراموں کا سلسلہ شروع
کیا تھا جو بظاہر موسیقی کے پروگرام تھے مگر جن سے اہلِ پاکستان کو یہ بتانا مقصود تھا کہ دنیا کے تمام مسلم ممالک
رقص و موسیقی کے پروگرام ہوتے ہیں ۔ یہ صرف پاکستان ہے جہاں دین کے نام پر رقص کی مخالفت والی
بت پسندی" باقی رہ گئی ہے ۔ پھر ایسے پاکستانی پروگرام پیش کئے جانے لگے جن میں گلوکاروں کے فن
ام تر ارتکاز گلوکاری سے زیادہ بدن تھرکانے اور "ایٹی ٹیوڈ" کرنے پر ہوتا تھا ۔ پاکستان میں دینی
ح رکھنے والے حلقوں نے اس پر شدید مزاحمت کی مگر حکومت اور ٹیلی ویژن انتظامیہ نے اس کی قطعی
اہ نہ کی اور پاکستان کی مسلم ثقافت کو مشرف بہ جدیدیت و لادینیت کرنے کا جارحانہ پروگرام جاری رہا ۔
وہ اشتعال انگیزیاں تھیں جن کے نتائج نے شعلہ جوالہ بن کر نظام مصطفیٰ کی پرجوش تحریک کی صورت میں ظہور
۔ اور اس تحریک ہی کے اثرات تھے کہ بعد ازاں مارشل لاء حکومت نے چادر اور چار دیواری کے
د کا نعرہ اختیار کیا ۔ اور ٹیلی ویژن کو حقیقی قومی ثقافت کے تقاضوں کی متابعت میں لگام دینے کی کوشش
۔ دوپٹے کو ٹیلیویژن پر واپس لایا گیا اور بہت سی بے اعتدالیوں کی روک تھام کی گئی مگر اس کے باوجود
ویژن کی انتظامیہ نے منہ زور گھوڑے کی سی سرکشی کے مظاہرے کئے اور قومی ثقافت کی ردا ٹیلی ویژن
چہرے پر ڈالنے کی پرزور مزاحمت کی ۔ مارشل لاء اس منہ زور گھوڑے کو قابو میں لانے کے سلسلے میں اس

بےبس بھی تھی کہ وہ غیر سیاسی اور خالص نوجی حکومت تھی اور رائے عامہ کی لگام سے بیوروکریسی کوتاہ بزرگ کے ہنر سے بے بہرہ تھے

اس پس منظر میں مسلم لیگ کی منتخب حکومت آئی اور اس نے ملک کو حقیقی اسلامی مملکت بنا کے نصب العین کا اعلان کیا تو توقع کی جانے لگی تھی کہ یہ سیاسی حکومت بالآخر ٹیلی ویژن کا قبلہ درست کر میں زیادہ مؤثر ثابت ہوگی خصوصاً چوہدری ظہور الٰہی کے سے نظریۂ پاکستان کے مجاہد کے فرزند کے وزیر ... ہونے پر یہ توقع اور زیادہ بڑھ گئی تھی کہ لیکن ہم افسوس کے ساتھ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ نہ صرف توقعات پوری نہیں ہوئیں بلکہ ٹیلی ویژن کی قومی ثقافت کی حدود کو توڑنے کی سرکشی پہلے سے زیادہ جا انداز اختیار کرتی جارہی ہے ۔ بہت ہی تواتر کے ساتھ ایسے موسیقی اور نغمات کے پروگرام پیش ہونے جن میں فن کار ایک تہائی گلوکاری اور دو تہائی بے ہنگم رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

پچھلے دنوں جمہوری آزادیوں کے نام پر ملک کے بنیادی نظریئے اور تصورات کے باغی عناصر لئے ٹیلی ویژن کے دروازے وا کئے گئے ۔ یہ وہ عناصر ہیں جن کے وطن بیزار طرز عمل اور سرگرمیوں طویل مشاہدے کے بعد وزارت اطلاعات نے ٹیلی ویژن پر ان کی نمائش اور پیش کش کو ممنوع ٹھہرا تھا۔ جمہوری آزادی کے بعد ذرائع ابلاغ پر عائد قدغنوں کو ختم کرنے کے باب میں ان عناصر کے سرپرست حلقوں کی طرف سے دباؤ پڑنا فطری بات ہے۔ اور حکومت نے علامتی اقدام کے طور پر یہ فیصلہ کیا ... یہ چاہیں گے کہ مذکورہ صدر افراد پر عائد کی جانے والی سابقہ بندش کے وقت وزارت اطلاعات ٹیلی ویژن کے اعلیٰ حکام کی فائلوں میں ان افراد کے سلسلے میں جو ریکارڈ تیار ہوا وہ بھی مشتہر کیا جائے تاکہ رائے عامہ صحیح نتائج پر پہنچ سکے کہ پابندی لگنے کے اسباب زیادہ قوی تھے یا پابندی اٹھا لینے کے محرکات زیادہ وقیع ہیں۔ جس طرح حکومت نے اعلیٰ عدالتوں کے ججوں پر مشتمل ایک ٹربیونل قائم کر کے اس کے سپرد انتظامی نظر بندی والے معاملات کو رکھا ہے اور اس ٹربیونل نے بعض اسیروں کو رہا کیا اور بعض کی نظر بندی کا جواز مستحکم سمجھتے ہوئے ان کی نظر بندی کو برقرار رکھا۔ اسی طرح ٹیلی ویژن پر ممنوع کئے جانے والے ان تمام چالیس افراد کا معاملہ بھی کسی ٹربیونل کے سامنے پیش ہونا چاہیے تھا تاکہ ہر فرد کے انفرادی معاملے کی تفتیش جانچ پرکھ کے بعد یہ دیکھا جا سکے کہ کن افراد پر عائد پابندی روا تھی اور کن پر ناروا دبے جا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پچھلی حکومت نے جن سوشلسٹ لادین اور ملک کی سالمیت پر یقین نہ رکھنے والے عنا کی ٹیلی ویژن پر رونمائی کو وطن عزیز کے بنیادی نظریئے سے ان کی بیزاری کے حوالے سے ممنوع ٹھہرایا تھا ان پر پابندی تو بالاعلان اٹھائی گئی اور یہ بتانے کی زحمت نہ کی گئی کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر یہ پابندی لگائی گئی تھی اور وہ کیا محرکات ہیں جن کے مقابلہ میں پابندی کے اسباب کو غیر مؤثر سمجھ لیا گیا ہے مگر ایسے

بت سے افراد و عناصر پر پابندیٔ بلا اعلان پابندیاں برقرار رہیں جو ٹیلی ویژن کے جدیدیت زدہ لادین اور
سوشلسٹ میلانات رکھنے والے اہلکاروں کی نظروں میں معتوب ہیں۔ یا جن کو اسی قماش کے بیرونی عناصر
کے دباؤ پر ٹیلی ویژن بدر کیا گیا تھا ان میں نمایاں مثال ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ہے اور ڈاکٹر
سرار احمد صاحب کی طرح بے شمار ایسے افراد بھی ہیں جن کی اہلیت و صلاحیت سے ٹیلی ویژن
کے ناظرین کو مثبت طور پر مستفید کیا جا سکتا ہے مگر چونکہ وہ ٹیلی ویژن کے یک سمتے دانشوروں
کی نظر میں رجعت پسند ہیں۔ اس لئے بلا اعلان ٹیلی ویژن کے اسکرین پر ان کی رونمائی ممنوع ہے۔
نہ صرف یہ کہ ٹیلی ویژن کے تفریحی پروگراموں کے ذریعے ملی و قومی ثقافتی اقدار اور روایات کو
پامال کر کے مجرائی ثقافت کو ملک پر مسلط کیا جا رہا ہے بلکہ دینی پروگراموں کو بھی غیر مؤثر کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔
ہم نے ٹیلیویژن سے متعلق اپنی معروضات صراحت سے پیش کر دی ہیں۔ ہم اس سلسلے میں وزارت
اطلاعات سے مناسب جواب اور کارروائی کی توقع رکھتے ہیں۔

(ماخوذ از ہفت روزہ "تکبیر" اشاعت ۱۵ تا ۲۸ اگست ۸۶ء)

صنعتی شعبہ میں اسلام کا نظامِ عدل وقسط

اسلام خدا کا بھیجا ہوا ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لئے ہدایت موجود
ہے۔ خواہ انسان کی اخلاقی و روحانی مزوریں ہوں یا سیاسی و معاشرتی اور معاشی الجھنیں، ان سب کے سدھار
کے لئے دینِ اسلام میں نہایت ہی اعتدال پسندانہ اور فطری اصول و احکام موجود ہیں۔ اسلام انسان کو نہ تو صرف
مادیت کا پیکر بنا کر جانوروں کے گلے میں چھوڑ دیتا ہے اور نہ ہی اسے صرف روحانیت کے میدان تک محدود رکھنا
چاہتا ہے کہ جہاں زندگی کے نشانات ناپید ہوں بلکہ اسلام اسے روحانیت اور مادیت دونوں کے درمیان
اعتدال کی راہ دکھاتا ہے۔

اس وقت دنیا کا سنجیدہ طبقہ موجودہ خالص مادی نظام ہائے حیات سے تنگ آچکا ہے۔ خواہ
وہ جمہوری نظام ہو (جسے بجا طور پر جاگیردارانہ نظام کہا جا سکتا ہے) یا اشتراکی نظام۔ دنیا کا یہ سنجیدہ طبقہ ایک
صالح اور اخلاقی نظام عدل و قسط کی تلاش میں ہے۔ اس لئے ہمارے دینی تقاضوں کے علاوہ موجودہ حالات
کا تقاضا بھی ہے کہ ایسی دنیا کے سامنے جو اپنے طریقے آزما کر تھک چکی ہو، اسلام کے فطری اور معتدل نظام عدل و
... کو پیش کیا جائے۔ اس وقت دنیا کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ معاش کا ہے۔ جیسے مغرب کے مادی
... حیات اور خاص طور پر اشتراکیت نے روٹی کپڑے اور مکان کو زندگی کے سارے مسائل کا محور بنا کر انسان

کو معاشی حیوان بنا دیا ہے۔ اس لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ رائج الوقت معاشی نظاموں کے مقابلے میں اسلام کے معاشی نظام کو اس کے تمام لوازمات کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ اور دنیا کو عملاً دکھا دیا جائے کہ رائج الوقت معاشی نظاموں میں نہ تو انسان کی فطری ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور نہ ہی اس کی فطری صلاحیتوں کی نشو و نما کی رعایت کی گئی ہے۔ اس وقت پوری دنیا دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصے میں لادینی جمہوریت (Secular Democracy) کی حکمرانی ہے جس میں سرمایہ کو بے قید معیشت کی کھلی چھٹی ہے۔ جس سے سرمایہ داری کو فروغ مل رہا ہے جس سے اجتماعی زندگی میں فساد برپا ہے۔ دوسرے حصے میں اشتراکیت کا دور دورہ ہے۔ جس میں انسانوں کو مجبورِ محض بنا کر ان کے معاشی ذرائع و وسائل پر قبضہ کر کے انہیں چند انسانوں کے ہاتھوں میں تھما دیا ہے۔ اور اس کو لوگوں کی نگاہوں میں خوشنما بنانے کے لئے اس پر اجتماعیت اور مساوات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ جس سے انسان کی شخصی صلاحیتیں دب کر رہ گئی ہیں۔ ان دونوں نظاموں کے مقابلے میں اسلام میں نہ تو سرمایہ کو بے قید معیشت کی اجازت دی گئی ہے جو اجتماعیت کے لئے کسی حیثیت سے بھی نقصان دہ ہو۔ اور نہ انسانوں کو ایسے معاشی نظام کے چنگل میں جکڑا گیا ہے جس سے اس کی فطری صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ جائیں بلکہ ان دونوں نظام ہائے حیات کے درمیان ایک ایسا توازن قائم کیا ہے کہ جس سے فرد کی شخصی آزادی بھی برقرار رہتی ہے اور وہ اجتماعیت کو بھی نقصان نہیں پہنچاتی۔

اسلام کا انسانی زندگی کے بارے میں ایک مخصوص اخلاقی زاویۂ فکر ہے۔ جس کے مطابق وہ انسانی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی بنیاد توحید و آخرت کے تصور پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے زندگی کے کسی مسئلے کے حل کے لئے اسے مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اسلام کے نزدیک معاش کا مسئلہ انسانی زندگی کے دوسرے مسائل سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ اسی کا ایک جزو ہے۔ انسانی زندگی اگر جسم ہے تو انسان کے عقائد اس کے عقلی اور ذہنی تقاضے، سیاسی و معاشرتی اور معاشی مطالبے اعضاء و جوارح ہیں اس لئے انسانی زندگی کے کسی شعبے کا حل اس کے مجموعے سے الگ ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا معاشی نظام مادہ پرستانہ نظام نہیں ہے بلکہ وہ تمام تر معاشی ترقیوں اور اس کے لئے جد و جہد میں انسان کے سامنے یہ بات مستحضر رکھنا چاہتا ہے کہ "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْآخِرَۃِ" دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو معاشی نظام اس بنیاد پر قائم ہوگا اس میں ظلم و زیادتی، خود غرضی اور طبقاتی کشمکش کیسے فروغ پا سکتی ہے۔ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی الجھن یہی ہے۔

لیبر مسائل نے اب سیاسی و سماجی اور معاشرتی حلقوں میں بہت اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اگرچہ انیسویں صدی غلامی کے خاتمے کی صدی تھی لیکن صنعتی دور اپنے ساتھ آجر اور مزدور کے تعلق کے نئے مسائل لے کر آیا۔ صنعتی دور سے پہلے بہت کم لوگوں کو ملازمت پر رکھنا پڑتا تھا لیکن اس دور کے آنے سے بہت تعداد

ورگرں کو ملازم رکھنا پڑا۔ آجر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ کم سے کم اجرت پر مزدور بھرتی
ے۔ اور ان میں زیادہ وقت انہیں کام پر مجبور کرے اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ یہ اقتصادی بحران
ت یا بہبود کے لئے کتنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ مزدور کو آجر کی ڈیمانڈ کے آگے مجبوراً جھکنا پڑتا ہے۔
ماں میں آج کل صنعتی مزدور کی اجرت اتنی کم ہے کہ اس کا پورا خاندان اس قلیل اجرت سے بمشکل جسم و
ح کا رشتہ برقرار رکھ پاتے ہیں۔ مزدوروں کے جائز مطالبات نہ ماننے والی سب سے بڑی پارٹی آجر کی
۔ اس کو یہ نمایاں برتری حاصل ہے کہ مزدوروں کی سپلائی اس کے لئے کبھی مسئلہ نہیں بنی اور وہ ہمیشہ اس
ین میں رہا کہ بھرتی ہونے والوں سے اپنی شرائط منوا سکے کیونکہ یہاں پر بیروزگاروں کے لئے کوئی تحفظ
ں۔ اس وجہ سے طبقاتی کشمکش میں اضافہ اور امیر و غریب کے درمیان خلیج وسیع ہوتی گئی۔ لہٰذا
ست کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ملکی اقتصادی و صنعتی مفاد کے لئے دونوں متحارب گروپوں
ے مطالبات میں ہم آہنگی پیدا کرے اور مزدوروں کی حالت بہتر بنانے کے لئے اقدامات تجویز کرے۔

زدور کو کتنی اجرت ملنی چاہیئے

معاشرے پر مزدوروں کی اجرت کا اثر بڑا ہمہ گیر ہوتا ہے۔ مزدور کو اجرت کم ملے تو نہ صرف اس کا بلکہ اس کے خاندان کا
ورزندگی بھی پست رہتا ہے۔ بلکہ مجموعی حیثیت سے اس کا اثر پوری ریاست پر پڑتا ہے۔ کیونکہ ہر ملک میں
ت کش طبقے کی ہی اکثریت ہوتی ہے۔ خواہ وہ دماغی کام کرنے والے ملازمین ہوں یا جسمانی محنت کرنے
ے مزدور۔ مزدور کی اجرت کا تعین کیوں کر ہو۔ اسلامی معاشیات آجروں سے یہ خواہش کرتی ہے کہ وہ
ں تک اجرت میں اضافہ کر سکتے ہوں کریں۔ اس میں کمی نہ کریں تاکہ کم از کم خوراک، لباس اور رہائش جیسی ضروریات
ندگی آسانی سے فراہم ہو سکیں۔ ضرورت مند کو بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا صرف آجر ہی کی ذمہ داری
ہیں اور نہ صرف بیت المال اور حکمران کی بلکہ پوری ریاست کی ذمہ داری ہے۔ مندرجہ ذیل احادیث اس
ول کو تقویت دیتی ہیں ؛

"اللہ اور اس کے پیغمبر ان کے سرپرست ہیں جن کا کوئی وارث نہیں"۔ (ترمذی)

"اگر کوئی شخص دولت چھوڑ کر مر جاتا ہے تو یہ اس کے خاندان کے لئے ہے اور ان زیرِ کفالت افراد
کا ذمہ دار میں ہوں جن کو وہ تنگ حالات میں پیچھے چھوڑ کر جاتا ہے" (بخاری کتاب الاموال)

"وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے امور کا ذمہ دار بناتا ہے اور وہ ان کی ضروریات
و حاجات اور غربت سے صرف نظر کر لیتا ہے اللہ اس کی ضروریات و حاجات سے منہ پھیر لیگا"

سرمایہ دار کے ہاتھوں غریب کے استحصال کا تصور اسلام کے اصولوں کی قطعی ضد ہے۔ اسلام
ہ بد رسد کے کسی ایسے اصول کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا جس میں ہو کہ مزدوروں کے ایک انبوہ سے
زدار ایسے افراد کو منتخب کریں جو گندہ اوقات کی سطح سے بھی کم تر سطح پر اس کی اجرت کی پیشکش کو قبول

کرلیں اور نامناسب اور غیر صحت مندانہ ماحول میں اس کے مقرر کردہ طویل اوقات تک اس کے ماتحت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آجر پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مزدور کے آرام اور اس کی بہبود کا خیال رکھے اس سے بھائیوں جیسا سلوک رکھے اور اس کی طاقت سے زیادہ کام نہ لے۔ اگر آجر اس میں ناکام ہو تو شریعت کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ریاست کی مداخلت ضروری ہو جاتی ہے۔

بخاری کی روایت ہے:

هُمْ اِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ اَخَاهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا وَلَا يُكَلِّفْهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يَغْلِبُهُ فَاِنْ كَلَّفَهٗ مَا يَغْلِبُهُ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ (بخاری و مسلم)

(ترجمہ) وہ (مزدور) تمہارے بھائی ہیں۔ ان کو خدا نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ پس جس کے ماتحت خدا نے اس کے بھائی کو کیا ہے اس کو چاہیئے کہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے۔ جو خود پہنے وہی اس کو بھی پہنائے اور جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو تو اس کی اسے تکلیف نہ دے اور اگر تکلیف دے تو اس کی مدد کرے۔"

اس صاف اور واضح رہنمائی سے مندرجہ ذیل بنیادی اصول ملتے ہیں۔

(۱) آجر مزدوروں کو اپنا بھائی سمجھے اور دونوں کے تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسے کہ بھائی بھائی میں ہوتی ہے۔

(۲) کم از کم کھانے اور پہننے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح برابر ہو۔

(۳) وقت اور کام دونوں کے حساب سے مزدور پر اتنا بوجھ نہ ڈالے جو اس کو تھکا دے۔ یہ اصول ہے جس سے اس دور میں بھی وقت اور کام کی نوعیت کے مسئلے کو بخوبی حل کیا جا سکتا ہے۔

(۴) اگر کوئی ایسا کام درپیش آ جائے جس کی انجام دہی میں مزدوروں کو دشواری ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کام کو کرایا نہ جائے اور نہ یہ مطلب ہے کہ چاہے مزدور پر کچھ ہی کیوں نہ گذر جائے وہ کام اسی سے لیا جائے۔ ایسی صورت میں جہاں تک ممکن ہو سکے مزدوروں کی اعانت اسے کرے۔

ہر شخص کو روزانہ کتنے گھنٹے کام کرنا چاہیئے اس کی نسبت نبی کریمؐ سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل پسندیدہ ہے۔ فرمایا دوامی عمل قلیل ہو اور مزید فرمایا کہ جس قدر تم بآسانی کر سکو اتنے کا التزام کر لیا کرو" قاعدہ کلیہ بھی قرار پائے

اسلام میں آجر اور مزدور کے تعلقات اس کے لئے قرآن مجید نے دو پیغمبروں کی زندگیاں بطور نمونہ پیش کی ہیں۔

کراجیر اور دوسرے کو مزدور کی شکل میں پیش کیا گیا ہے
مزدور کی صفات طاقتوری اور امانت داری ہیں " قَالَتْ اِحْدٰهُمَا يٰاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ
یرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ " (القرآن) ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا اے میرے
پ تم اسے (موسیٰؑ) مزدوری پر رکھ لو۔ بے شک جنہیں تم مزدور بناؤ ان میں وہی بہتر ہے جو طاقتور اور
ت دار ہے "۔

جر کی صفات وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ "
میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ بخدا تم مجھے نیکوکار پاؤ گے " یہ ہیں سیدنا شعیب
یہ السلام۔

قرآن و حدیث کے ان اقوال پر مزید حکم ہوا کہ اگر نوکر ستر (۷۰) دفعہ بھی غلطی کرے تو درگذر کی
ے۔ رسول اکرمؐ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ پوچھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں کتنی مرتبہ اپنے
کر کو معاف کروں! رسول اکرمؐ خاموش رہے۔ دوبارہ عرض کی اے اللہ کے رسولؐ کتنی مرتبہ میں
ے نوکر کا قصور معاف کروں! فرمایا ستر (۷۰) مرتبہ " (ترمذی) مراد ہے بکثرت۔ " اِرْحَمُوْا
نْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ " (بخاری و ترمذی) —— اور بقول حالی —

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر   خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

صحابہؓ کے دور میں غذائی مساوات عتبہ بن فرقد نے آذربائیجان (موجودہ روسی ترکستان) فتح کیا تو انہوں نے دو بڑی ٹوکریوں میں
مٹھائی بھر کر ان کو چمڑے اور نمدے سے پیک کر کے اپنے آزاد کردہ غلام سحیم کے ذریعے حضرت عمرؓ کی خدمت
میں بھیجا۔ سحیم جب حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا تو آپؓ نے پوچھا کہ تم میرے پاس کیا لائے ہو۔ درہم یا دینار! پھر
کھولنے کا حکم دیا۔ مٹھائی چکھی اور کہا مزا اچھا ہے لیکن کیا یہ مٹھائی تمام مہاجرین نے بھی سیر ہو کر کھائی۔
انہوں نے کہا جی نہیں۔ یہ تو آپؓ ہی کے لئے بھیجی گئی ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے عتبہ بن فرقد کو لکھا،

اللہ کے بندے امیر المومنین کی جانب سے عتبہ بن فرقد کو۔ امابعد!
یہ نہ تو تمہاری کوشش اور مشقت کا پھل ہے نہ تمہاری ماں کی کوشش اور مشقت کا اور نہ
تمہارے باپ کی کوشش اور مشقت کا۔ ہم کوئی ایسی چیز نہیں کھاتے جو تمام مسلمانوں کے
گھروں میں کافی مقدار میں نہ ہو "

حضرت عمرؓ ہی کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا۔ (جو تواریخ میں عام الرمادہ کے نام سے
مشہور ہے) مؤرخین کا بیان ہے کہ عوام کو کافی مقدار میں گوشت نہ ملنے پر خود حضرت عمرؓ نے گوشت کا
ستعمال ترک کر دیا تھا اور بجائے گھی کے صرف تیل استعمال کرتے تھے۔ تیل کے استعمال سے امیر المومنین کے

چہرے کی رنگت تک بدل گئی۔ (تاریخ الخلفاء حالات حضرت عمرؓ) اسلامی تاریخ اس طرح کے سینکڑوں واقعات سے بھری پڑی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان غذائی مساوات ضروری ہے۔

لباس میں مساوات

معرور کہتے ہیں کہ میں نے ایک چادر ابوذر غفاریؓ کو اور اسی قسم کی ایک چادر ان کے غلام کو اوڑھے ہوئے دیکھ کر ابوذر سے کہا کہ اگر تم اس چادر کو بھی لے کر اوڑھ لیتے تو اس چادر کی جوڑی ہو جاتی۔ اور اس کو کوئی اور کپڑا دے دیتے۔" اس سے لباس میں مساوات کا پتا چلتا ہے۔

سواری میں مساوات

حضرت عمر فاروقؓ جب بیت المقدس کے سرکاری سفر پر روانہ ہوئے تو غلام کی سواری اور آپ کی سواری میں کچھ فرق نہ تھا۔ ایک منزل آپ سفر کرتے تو دوسری منزل غلام سفر کرتا۔

اسلام ہر معاملے میں خواہ وہ سماجی و معاشرتی ہو یا معاشی و سیاسی ــ عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔ مگر آج ہمارے ملک پاکستان میں جو اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے اجتماعی سطح پر ظلم ہو رہا ہے۔ خصوصاً معاشی سطح پر تو لوگوں کو ایک معاشی حیوان بنا دیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں صنعتی مزدوروں کو خاص طور پر تختہ مشق بنایا گیا ہے۔ اس وقت پاکستان میں ایک صنعتی مزدور کی ماہانہ اجرت ۴۵۰/- سے ۷۰۰/- روپے تک ہے۔ آٹھ دس افراد پر مشتمل کنبہ کسی طور پر بھی اس قلیل اجرت پر اپنے جسم و روح کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ ایک محتاط ترین اندازے کے مطابق اوسط تعداد پر مشتمل افراد کے کنبے کے لئے آج کم از کم ۲ ہزار روپے کا ماہانہ میزانیہ بنتا ہے۔ ان حالات کے باوجود حکومت مزدوروں کی اصلاحِ احوال کے لئے کوئی قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں بلکہ وہ مزدور کو اپنے معاملات آجروں سے خود طے کرنے کا مشورہ دیتی نظر آتی ہے۔ ایک طرف مزدوروں پر تمام پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں تاکہ وہ اپنے حقوق کے لئے کچھ نہ کر سکیں اور دوسری طرف سرمایہ دار کو پورا تحفظ دیا گیا ہے اور سب کچھ اس دور میں ہو رہا ہے جس میں اسلام کا نام بہت کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ کا فرمان ہے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔

جدید معیشت اتنی پیچیدہ ہے کہ ان مسائل کو نظر انداز کرنا غیر حقیقت پسندانہ ہوگا۔ صنعتکار اور مزدوروں کے تعلقات کو ریاستی مداخلت کے بغیر سیدھا کرنا براہِ راست قومی اقتصادیات کو متاثر کرے گا۔ اگر ریاستی کنٹرول کو ختم کر دیا جائے جیسا کہ اب ہے تو سرمایہ دار کو اپنے منتخب کردہ کے مطابق ترجیحی شرائط پر لیبر کو اپنی مرضی کے مطابق بھرتی کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو وہ مزدوروں کو بقا کی سطح سے بھی کم تر اجرت والی ملازمت کی شرائط پر مجبور کرے گا۔ کیونکہ وہ حالات

ی وجہ سے مجبور ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کیا جبر و اکراہ سے پیدا کردہ ایک معاہداتی تعلق شریعت
یں درست سمجھا جائے گا۔

اسلامی معاشرے میں سرمایہ داری کے ہتھکنڈوں اور مظالم کا علاج — !!

اس کے لیے اسلامی معیشت میں اجتماعی کفالت کا نظام "تریاق" کی حیثیت رکھتا ہے۔
"اجتماعی کفالت" کے اس نظام سے سرمایہ داروں کی قوت کا خاتمہ مؤثر طور پر کیا جاسکتا ہے۔
اس سے نہ تو کارخانہ دار ظلم کی غرض سے کارخانوں میں تالہ بندی (lock out) کر کے
مزدوروں کو شکست دے کر ناجائز فائدہ اٹھا سکے گا اور نہ ہی اس کے لیے مزدوروں کو
منصفانہ اجرت دیے بغیر کوئی چارۂ کار ہوگا۔ اسلامی حکومت مزدوروں کے مفادات کے
تحفظ کے لیے بیت المال کو استعمال میں لا سکتی ہے اور اس کے لیے تو ضرورت پڑنے پر سرمایہ دار
کو انصاف کرنے پر مجبور بھی کیا جاتا ہے تاکہ عدل و قسط کے بنیادی اصول کو قائم رکھا جا سکے۔ اور
معیشت کے لئے ہمارے پاس جو بنیادی اصول ہے وہ یہ ہے۔

تُؤخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِ ھِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَاءِ ھِمْ۔
(مالداروں سے وصول کیا جائے گا اور ناداروں کو لوٹایا جائے گا)

اس اصول کی روح کا ایک پرتو ہمیں نظام زکوٰۃ میں بھی کار فرما نظر آتا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر ملک پاکستان میں فوری طور پر
موجودہ معاشی نظام میں اسلامی اصولوں کے مطابق انقلابی تبدیلی نہ کی گئی۔ خواہ یہ زرعی
زمینیں ہوں یا صنعتی شعبہ (ہر دو جگہ) یہ تبدیلی ناگزیر ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ اس ملک کی اکثریت جو
زرعی کاشت کاروں اور صنعتی مزدوروں پر مشتمل ہے اسلام سے بدظن ہو کر کسی اور نظام کے
متلاشی نہ بن جائیں۔

معاشی نظام میں یہ تبدیلی نہ صرف ہمارا دینی فریضہ ہے بلکہ ہماری ملی ضرورت بھی ہے اور
وقت کا اہم تقاضا بھی!

مرسلہ: نعیم اختر

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں ا
ور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ انکا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا
جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں انکو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بقیہ : امیرِ تنظیم سے انٹرویو

دو سال میں عربی زبان اور قرآن مجید کا مکمل ترجمہ اور حدیث
بھی پڑھائیں گے تاکہ دین کے ساتھ تعلق ہو جائے۔ اب
کسی شخص نے ایف ایس سی پڑھی ہے۔ اسے قرآن کا پتہ ہے
نہ حدیث کا، کسی نے فلسفہ پڑھا ہے اسے بھی نہیں معلوم لیکن
ہے زندگی کے بارے میں وہ تھوڑا بہت علم رکھتے ہیں،
ہم ایسے نوجوانوں کو قرآن و حدیث پڑھائیں گے تاکہ اپنے
اپنے فیلڈ میں کوئی کام کر سکیں۔ ایسے شخص جو تحقیقی صلاحیت
رکھتے ہوں۔ الحمد للہ ہم اکاڈمی میں لیتے ہیں ان کو ہم گورنمنٹ
کے سترہ گریڈ کے برابر سب کچھ دیتے ہیں جیپوں کے
علاوہ وہ ہم حکومت کے افسروں کے برابر نہیں دے سکتے

س: آپ ادارے میں ہمہ وقت ملازم تو نہیں لہٰذا یہ
ہمہ وقت امیر ہیں آپ اپنی روزی کیسے کماتے ہیں
ج: میرا ایک مکان ہے اس کے کرایہ سے گھر کی دال
روٹی چلتی ہے۔ رہائش، بجلی پانی وغیرہ سب انجمن و تنظیم
س: بچے کاروبار کرتے ہیں۔
ج: بچے بھی میرے ابھی دو سال میں آگئے ہیں وہ
اکاڈمی میں وہی سترہ گریڈ میں کام کر رہے ہیں۔
س: تنظیم اخراجات وغیرہ وغیرہ
ج: جو لوگ دعوت دیتے ہیں وہ برداشت کرتے
ہیں۔۔۔!!

بقیہ : غیر اہلِ کتاب کیساتھ کھانے کا مسئلہ

اور "من احدث فی دیننا مالیس منہ فھو رد" الخ" ترجمہ: "جس شخص نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات پیدا کی جو اس سے متعلق نہیں ہے تو وہ مردود ہے"۔ (جامع العلوم والحکم ص۴۳ وغیرہ)

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم وآلہ واصحابہ اجمعین

اس شمارے کی خصوصیت:
جہادِ قسطنطنیہ اور وفات ابو ایوب
پر ایک معلومات افزا مضمون

میثاق

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی
لاہور

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا
ماہنامہ
میثاق
لاہور
مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد
ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی
حافظ عاکف سعید
جلد ۳۵
شمارہ ۱۰
اکتوبر ۱۹۸۶ء
مطابق
صفر المظفر ۱۴۰۷ھ
زر سالانہ
۴۰ روپے
فی شمارہ ۴/ روپے
مکتبہ تنظیم اسلامی
۳۶ کے ماڈل ٹاؤن
لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۲۸۳
سب آفس ۱۱۔ داؤد منزل۔ نزد آرام باغ۔ شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J.M.I. New Delhi

مشمولات

تنظیمِ اسلامی سندھ و بلوچستان کا

علاقائی تربیتی اجتماع

اِن شاء اللہ العزیز — حسبِ پروگرام

۲۷ تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء کراچی میں منعقد ہوگا

پروگرام

۱) عمومی خطابات ڈاکٹر اسرار احمد، امیر تنظیمِ اسلامی

★ ۲۷ اکتوبر سوموار: پونے سات بجے شام "دشام الہدیٰ" تاج محل ہوٹل
موضوع: "قوموں پر عمومی عذاب اور اس سے نجات کی راہ:
سورۂ انفال کی آیات ۲۰ تا ۲۹ کی روشنی میں"

★ ۲۸ اکتوبر، بعد نماز عشاء جامع مسجد، بلاک نمبر ۵ ناظم آباد
موضوع: "تنظیمِ اسلامی کا مقصد اور لائحہ عمل"

★ ۲۹ اکتوبر، بعد نماز عشاء اسی مقام پر سوالات کے جواب!

۲) تربیتی پروگرام جامع مسجد بلاک نمبر ۵ ناظم آباد

★ ۲۸ تا ۳۰ اکتوبر روزانہ صبح ۸½ تا ۱ اور شام پونے پانچ تا آٹھ:
اِس پروگرام میں ۳۰ اکتوبر کو صبح کی نشست میں امیر تنظیم بھی شرکت فرمائیں گے

۳) جمعہ ۳۱ اکتوبر کو صبح ۹ تا ۱۲ جامع الصفا، شریف آباد میں

منعقد ہونے والا تنظیمِ اسلامی کراچی کا ہفتہ وار اجتماع عمومی بھی اس پروگرام کا حصہ متصوّر ہوگا

المعلن: سراج الحق سید، امیر تنظیم اسلامی، کراچی

(رابطہ کے لیے پتے اور فون نمبر اور شرکاء کے لیے ہدایات صفحہ ۹۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

ادارہ

عرضِ احوال

نئے اسلامی سال ۱۴۰۶ھ کے ماہِ اوّل میں وطنِ عزیز کے کچھ حصّوں میں جو اندوہناک واقعات رونما ہوئے، اُن کا تذکرہ بھی طبعِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ لیکن دوسرے مقامات سے قطع نظر ملک کے سب سے بڑے صوبے کے دارالحکومت لاہور میں جو کچھ ہُوا اس کے بعض پہلوؤں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل نہ کرنا بھی تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اہم واقعات تو اخبارات کی زینت بن کر ریکارڈ کا حصّہ بن گئے ہیں۔ لیکن ان کا تھوڑا بہت پس منظر اگر ضبطِ تحریر میں نہ آیا تو کچھ ہی دنوں بعد واقعات کی کڑیاں ملانا مشکل ہو جائے گا۔

اصلاً یہ سارا قصّہ ایک مفصّل مقالے کا طالب ہے جو اس کے اسباب و علل پر جزئیات میں بحث کرے لیکن ملک کی موجودہ داخلی صورتِ حال اور بین الاقوامی تعلقات کا "حسّاس" معاملہ ایسے عوامل ہمیں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ تفصیلات کو فی الحال ملتوی کیا جائے۔ چنانچہ ہم اپنے قارئین کی توجہ اس وقت صرف اس طوفان کی طرف مبذول کرا رہے ہیں جو بلاسبب اٹھایا گیا اور پھر حد درجہ چابکدستی سے اس کا رُخ امیرِ تنظیمِ اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ذات کی طرف موڑ دیا گیا ؎ "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں" — فرقہ وارانہ فسادات اور غنڈہ گردی کا باعث ڈاکٹر اسرار احمد! ایں چہ بوالعجبی است!! اس پر مستزاد بعد ازاں کراچی میں اُن کے داخلے پر تیس روزہ پابندی نے گویا یہ لیبل باقاعدہ چسپاں کر دیا۔

لاہور کے ایک فرقہ دارانہ اردو ہفت روزہ کے بقول ڈاکٹر اسرار احمد کے حامی "ان گنڈوں نے جلوس کی صورت میں ہاتھوں میں ڈنڈے اور سوٹے لے کر نعرہ بازی کی اور گالی گلوچ و بد زبانی کرتے رہے" ؎ دہن بگڑا سو بگڑا تھا خبر لیجیے زباں بگڑی (تصرف کے لیے معذرت) - کراچی کے ایک انگریزی روزنامے کے دانشور اور کالم نویس

نے جن کا تشخص ان کے نام سے ظاہر ہے، نشاندہی کرنی چاہی کہ باغِ جناح کی پُر فضا
مسجد دارالسلام میں اسس خطیبے کو "the doc" نے آگ دکھائی تو الزام میں الفاظ
شاہ خرچی اور ملزم کے نام کے لیے مختصر نویسی کا شاہکار سامنے آیا۔ لیکن راولپنڈی
کے انگریزی روزنامے نے جو ایک مخصوص فرقے کا معروف ترجمان ہے، جب
شناخت پریڈ کرائی تو اس کے وقائع نگاروں کو کوئی شک باقی نہیں رہا کہ فساد
کی جڑ ڈاکٹر اسرار احمد کی ذات ہے۔ اس روزنامے نے یہ تہمت تین بار
ڈاکٹر صاحب موصوف پر اُن کا پورا نام درج کر کے جڑی

ہمیں یقین ہے کہ یہ مہم جس کا ہدف ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ تھے، اپنی پوری ہمہ گیری
اور کمال چابکدستی کے باوصف اور شائع شدہ مواد اور کہی سُنی باتوں اور بے پَر کی
اُڑی افواہوں کے طویل و عریض طومار کے باوجود ان شاء اللہ العزیز اپنے مذموم مقاصد
کے اعتبار سے ہرگز کامیاب نہیں ہوگی اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب کی ذات، اُن کا
فکر اور وہ مشن جس کے لیے انہوں نے اولاً انجمن خدام القرآن کی تاسیس کی اور بعدازاں
تنظیم اسلامی کی بنیاد رکھی، نہ اہلِ لاہور کے لیے اجنبی ہے نہ جملہ اہالیانِ پاکستان کے لیے
بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مشرقِ بعید سے مغربِ بعید تک پورے عالمِ ارضی کے دینی مزاج کے
حامل اردو داں لوگوں میں شاذ ہی کوئی ہوگا جو اِن سے ناواقف ہو! حقیقت یہ ہے کہ
انہیں فرقہ واریت میں ملوث کرنے کی اس مہم کے پس پردہ ایک گہری سازش کارفرما
ہے۔ جس کے کرداروں کے بارے میں ع "ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی" کے
مصداق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے، البتہ جیسے کہ ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ نے ۹ ارستمبر کے خطاب
جمعہ میں فرمایا تھا، یہ اصلاً حکومت کی ذمہ داری ہے!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب شہادتِ حضرت حسین رضؓ اور کربلا کے حادثۂ فاجعہ
کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر فلسفۂ دین اور تاریخ کے حوالے سے کتنی ہی بار اجتماعاتِ عام
میں بیان کر چکے ہیں۔ اس موضوع پر اُن کی تقاریر کے کیسٹ گذشتہ کئی سالوں میں
پاکستان ہی نہیں پوری دنیا میں پھیلے ہیں اور اسی مضمون پر مشتمل اُن کے دو کتابچے
"شہیدِ مظلوم رضؓ" اور "سانحۂ کربلا" کے نام سے ۱۹۷۶ء سے اب تک لگ بھگ
بیس ہزار کی تعداد میں طبع ہو چکے ہیں۔ اپنے معمول کے مطابق اس بار بھی سالِ نو کے آغاز

پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ میں سانحۂ کربلا کے پس منظر پر گفتگو کا آغاز کیا۔ اور ۶ محرم الحرام کے جمعہ کو بات ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی کہ اگلے روز یعنی ۱۲ ستمبر کے روزنامہ جنگ میں اُن کا خطاب جمعہ یوں رپورٹ ہوا:

تاریخ اسلام کے افسوسناک واقعات انقلاب دشمن قوتوں کی سازش کا نتیجہ تھے

حضرت عثمانؓ کی شہادت ... انقلاب دشمن قوتوں ... [illegible]

لاہور (سٹاف رپورٹر) امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے لے کر کربلا کے حادثہ تک تاریخ اسلام کے تمام افسوسناک واقعات دراصل انقلاب دشمن قوتوں کی سازش کا نتیجہ تھے انہوں نے کہا کہ ہمارے اسلاف میں تو اس درجہ اتحاد تھا کہ امام حسنؓ اور امام حسینؓ نے قسطنطنیہ کے اس جہاد میں شرکت کی جس کے سپہ سالار یزید تھے لیکن آج امت انہیں کے نام پر ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہوئی جاتی ہے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں جزیرہ نمائے عرب میں انقلاب کی تکمیل کے بعد عرب کی حدود سے باہر انقلاب کی توسیع کے اقدامات کا آغاز کر دیا تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے انقلاب دشمن قوتوں کو اپنی ریشہ دوانیوں کے لئے ایک موقع ہاتھ آ گیا انہوں نے کہا کہ جب بھی کوئی انقلاب کامیابی حاصل کرتا ہے تو اس کے غلبے سے متاثر ہونے والے عناصر ابتداء میں تو دب جاتے اور مفاہمت اور تعاون کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن جونہی انہیں موقع ملتا ہے وہ پورے جوش و جذبے کے ساتھ انقلاب دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں اسلامی انقلاب کی توسیع و تکمیل سے جن عناصر کے سیاسی اور مذہبی اقتدار اور مفادات کو زک پہنچی تھی ان میں سرفہرست عرب میں رہنے والے یہودی تھے یمن کے ایک یہودی عبداللہ ابن سبا نے جو بظاہر مسلمان ہو گیا تھا حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں اپنی ریشہ دوانیوں کا آغاز کیا اس نے بنو ہاشم اور بنو امیہ کی پرانی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر امت کو ایک بہت بڑے فتنے میں مبتلا کر دیا اس فتنے کی سنگینی اور وسعت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؓ کے دور خلافت سے لے کر حضرت حسنؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی صلح تک ۵ برس کے مختصر عرصے میں مسلمانوں کی آپس کی لڑائیوں میں ایک لاکھ مسلمان مارے گئے اور اسلامی انقلاب کی توسیع کا عمل بھی رکا رہا لیکن جونہی مسلمانوں نے اپنے باہمی اختلافات پر قابو پا لیا تو حضرت امیر معاویہؓ کے بیس سالہ دور خلافت میں اسی رفتار سے فتوحات اور توسیع انقلاب کا عمل جاری ہو گیا جس طرح پہلے تین خلفائے راشدینؓ کے عہد میں جاری تھا ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ کوفہ دراصل عبداللہ ابن سبا کے پیروکاروں کا مرکز تھا انہوں نے پہلے حضرت علیؓ کی طرف سے صلح کی تمام کوششوں کو ناکام بنایا اور بالآخر وہی لوگ حضرت حسینؓ کی شہادت کا سبب بنے جامع دارالسلام باغ جناح میں نماز جمعہ کے بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ تمام حقائق تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن ہم نے ان کے بجائے افسانوی داستانوں کو اختیار کر لیا ہے۔

اس سے اگلے روز روزنامہ جنگ نے ہی مندرجہ بالا خبر پر شیعہ حضرات کے شدید ردِ عمل اور غیظ و غضب کی تفصیل اپنی طرف سے معذرت کے ساتھ شائع کی اور ۱۵ ستمبر کو ملک بھر کے اخبارات ڈاکٹر صاحب کے خلاف شیعہ حضرات کے شدید احتجاجی مظاہروں کی خبروں اور تصویروں سے بھرے پڑے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے خلاف ان مظاہروں میں اُن کا پتلا جلانے کے علاوہ جو زبان استعمال کی گئی، گالیوں کی جو بوچھاڑ ہوئی اور نعروں میں جو جارحانہ انداز اختیار کیا گیا اس کی تفصیل اخبارات میں تو نہ آ سکی لیکن ہزاروں آنکھیں اور کان اس کے گواہ ہیں ـــ تنظیم اسلامی کے صدر دفتر واقع گڑھی شاہو، علامہ

روڈ پر اوّلاً ۹ محرم کو حملہ کیا گیا اور توڑ پھوڑ کی گئی۔ ثانیاً ۱۰ محرم الحرام کو پھر ایک بزرگ پر
حملہ آور ہوا لیکن اُس روز الحمدللہ کہ پولیس نے مؤثر طور پر روک تھام کر لی۔ الحمدللہ
کہ اس سب کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا،
گالیوں کو اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھا اور ایک نہایت دھیما وضاحتی بیان اخبارات
کو جاری کیا، جو اس شمارے کے صفحہ ۱۱ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ لکھتے ہوئے بہت دُکھ ہوتا ہے کہ اس بیان کو جس کا مقصد جذبات کو
ٹھنڈا کرنا تھا، اخبارات نے بالعموم قابلِ اعتناء نہ سمجھا۔ روزنامہ 'جنگ' اور
'نوائے وقت' نے تو اس کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ 'امروز' لاہور نے بہت اختصار
کے ساتھ شائع کیا اور روزنامہ 'مشرق' نے اگرچہ پورا متن من و عن شائع کیا لیکن اسے
غیر نمایاں طور پر کہ عام قاری کی نظر اسے بمشکل ہی تلاش کر سکتی تھی۔ بہرصورت
ہم اس کے لیے بھی روزنامہ 'مشرق' کے ممنونِ احسان ہیں۔

لاہور کے اخبارات کا طرزِ عمل ایک اور خبر کے ضمن میں بھی تعجب انگیز ہے۔ ایک بات
روزنامہ 'جسارت' نے اپنی اشاعت بابت ۲۴ ستمبر میں سید افتخار حسین نقوی صدر
تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پنجاب کی ۲۳ ستمبر کی پریس کانفرنس کے ضمن میں ان کا یہ اعتراف
بھی شائع کیا ہے کہ:

"ڈاکٹر اسرار کے خلاف مظاہرہ، ان کے خلاف نعرے
بازی اور اُن کا پتلا جلانا ایک غیر محتاط اقدام تھا..."

(جسارت نے ان ہی الفاظ کو سُرخی میں جلی طور پر درج کیا۔ ح) — لیکن لاہور کے کسی اخبار نے
یہ الفاظ شائع نہیں کیے۔ حالانکہ اگرچہ محترم نقوی صاحب نے نہایت 'محتاط' الفاظ
استعمال کیے تاہم فرقہ وارانہ کشیدگی کی جو فضا اُن دنوں لاہور پر طاری تھی اُس
کے پیشِ نظر اہلِ تشیع کے ایک ذمہ دار فرد کی جانب سے یہ اعتراف بھی صورتِ حال
میں کچھ نہ کچھ بہتری پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتا تھا۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!

نُطق کی "دسترس گجر بیانی" اور قلم کی "انگشت بدنداں" میں مزید اضافہ ہوا اِس اطلاع سے (دروغ برگردنِ راوی) کہ ریڈیو تہران نے وہ خبر نشر کی کہ جس جلوس نے لاہور میں "امام بارگاہوں" کو جلایا اور توڑ پھوڑ کی اُس کی قیادت ڈاکٹر اسرار نے کی! ۔ اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون! ——— "باخبری عالمِ بالا معلوم شد!!"

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جب سے اپنی قرآنی دعوت اور انقلابی تحریک کا آغاز کیا ہے، صرف ایک مظاہرے میں شرکت کی ہے جو ۶ جولائی ۱۹۸۶ء کو "نفاذِ شریعت محاذ" کے زیرِ اہتمام اسلام آباد میں ہُوا تھا۔ اِن کی یہ شرکت بھی خالص اتفاقی تھی اگرچہ ڈاکٹر صاحب اسے اپنے حق میں نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں ——— اس کے علاوہ گذشتہ بیس سال کے دوران انہوں نے نہ کسی جلوس میں شرکت کی نہ مظاہرے میں! ——— بلکہ حد یہ ہے کہ ان کے خلاف جو طوفانِ بدتمیزی لاہور میں اٹھایا گیا اس پر احتجاج کے لیے اہلِ سنّت کا جو اجتماع ۱۹ ستمبر کو بعد نمازِ جمعہ مسجدِ شہداء کے اندر اور جو مظاہرہ اس کے باہر ہُوا، ڈاکٹر صاحب نے اس میں بھی منتظمین کی شدید خواہش اور اصرار کے باوجود شرکت نہیں کی! ——— گویا حقیقت و واقعہ اور بیان و خبر کے مابین بُعد و فصل "از کجا ست" تا بہ کجا"!! کا مصداق ہے - اب یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ع "کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں!"

پیشِ نظر شمارے میں ادارۂ میثاق، امیرِ تنظیمِ اسلامی کے وضاحتی بیان کے ساتھ نہ صرف اُس بیان میں شامل حوالہ جات کا متن شائع کر رہا ہے، یعنی علامہ حافظ ابنِ کثیرؒ کی مشہور عالم کتاب "البدایہ والنہایہ" کی بعض عبارات کا عکس، مع ترجمہ اور بخاری شریف کی وہ حدیث جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح قبرص اور قسطنطنیہ کے جہادِ اوّل کی پیشین گوئی بھی فرمائی تھی اور ان دونوں مہمّوں میں حصہ لینے والے لوگوں کے لیے بشارتیں بھی دی تھیں ——— بلکہ ان دونوں مہمات کی تفصیل اور ان میں سے مؤخر الذکر کے ضمن میں میزبانِ رسولؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی وفات اور قسطنطنیہ کی فصیل تلے تدفین کے ایمان افروز واقعات بھی تفصیلی حوالوں کے ساتھ شائع کیے جا رہے ہیں ——— تاکہ تاریخِ اسلام کے صدرِ اوّل کا ایک روشن باب بھی پوری طرح نگاہوں کے سامنے آ جائے

ریہ بھی واضح ہو جائے کہ جو کچھ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے فرمایا تھا وہ "تاریخ
نخ کرنا نہیں بلکہ اس کے ریکارڈ کو درست (STRAIGHT) کرنا ہے ——
.شاء اللہ العزیز تاریخ اسلام کے اہم واقعات سے متعلق صحیح اور مدلل و مستند
د آئندہ بھی شائع کیا جاتا رہے گا۔

خوش قسمتی سے ان ہی دنوں "البدایہ والنہایہ" کا جو حصہ کربلا کے حادثۂ فاجعہ
متعلق ہے (یعنی اس کے جزو نمبر ۸ کے صفحات ۱۴۹ تا ۲۱۱) اُس کا اُردو ترجمہ
شہیدِ کربلا" کے عنوان سے شائع ہو گیا ہے۔ یہ ترجمہ جناب ہدایت اللہ ندوی
کیا ہے جن کے بعض دوسرے تراجم کی تصویب و تحسین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ظلہ نے فرمائی ہے۔ اور اسے شائع حافظ شبیر حسن بھوجیانی نے مین بازار میاں چنوں
لع ملتان) سے کیا ہے۔ یہ کتاب ہمارے یہاں تبصرہ کے لیے آئی تھی لیکن حافظ ابن کثیر
، تحریر کسی تبصرہ کی محتاج نہیں —— رہا کتاب کا تعارف تو وہ ان سطور کے ذریعے ہو گیا
ہے۔ جو حضرات چاہیں، ناشر سے طلب فرمالیں۔

' میثاق ' میں قارئین کی دلچسپی کے لیے امیر تنظیم اسلامی کے بعض دوسرے
ںبارات و جرائد میں شائع ہونے والے انٹرویو بھی شائع کر دیے جاتے ہیں اور بالعموم
س مقصد کے لیے متعلقہ صفحات کا عکس استعمال کیا جاتا ہے تاکہ "نقل مطابق
ںل" کا تقاضا بتمام و کمال پورا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس میں رپورٹنگ اور
ںصوص جلی سرخیوں کی ذمہ داری ' میثاق ' پر نہیں ہوتی۔ تاہم صحافتی اصول کے
طابق اس پر کوئی ادارتی نوٹ ہونا چاہیئے جس کے ضمن میں بالعموم کوتاہی ہو جاتی
ہے۔ اگرچہ اس کا سبب یہ اعتماد ہوتا ہے کہ قارئینِ ' میثاق ' ڈاکٹر اسرار احمد اور
ںظیم اسلامی کے مؤقف سے کماحقہٗ واقف ہی ہیں۔ وہ ایسی چیزوں سے کسی مغالطے
ںں مبتلا نہیں ہوں گے۔ اسی قسم کی ایک جلی سرخی گذشتہ شمارے میں ہفت روزہ
' دشنید ' میں شائع شدہ انٹرویو کی پیشانی پر ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے:

"ہم انتخابی سیاست پر یقین نہیں رکھتے۔ مظاہروں سے اقتدار
پر قبضہ کریں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اس میں آخری الفاظ مغالطہ آمیز ہیں۔ تنظیم اسلامی کے نزدیک اسلامی انقلاب کے ابتدائی لوازم و شرائط کے پورے ہو جانے کے بعد آخری اقدام یعنی حکومت کی تبدیلی کے لیے عوامی تحریک اور مظاہروں وغیرہ کا راستہ ہی واحد لائحہ عمل ہے ___ لیکن اُس کا مقصد "اقتدار پر قبضہ" نہیں نظام کی تبدیلی ہے۔

اِس ضمن میں ایک نہایت خوشگوار حیرت ' PLEASANT SURPRISE ' کے طور پر سامنے آیا ہے روزنامہ 'جنگ' میں شائع شدہ "بنگلہ دیش کی 'جدوجہد آزادی' کے ہیرو" میجر جلیل کا مؤقف جو تنظیم اسلامی کے مؤقف کے ساتھ صدفی صد مطابقت رکھتا ہے۔ ادارہ 'میثاق' میجر جلیل کی گفتگو کو بھی 'جنگ' کے شکریہ کے ساتھ اس شمارے میں شائع کر رہا ہے تاکہ ایک جانب ع "متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!" کے مصداق تنظیم اسلامی کے مؤقف کی تائید سامنے آ جائے اور دوسری جانب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے کربناک اور المناک حادثے کے ضمن میں دونوں اطراف یعنی مشرقی پاکستانی رہنماؤں اور مرکزی حکومت سے جو غلطیاں سرزد ہوئی تھیں اُن کے آئینے میں ہم سندھ کی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لے سکیں ___ اور ایک جانب آج کے حکمران سوچیں کہ وہ ان ہی غلطیوں کا اعادہ تو نہیں کر رہے ہیں جو اُن کے پیشرو دَور سے صادر ہوئی تھیں اور دوسری جانب سندھی رہنما بھی تنظرِ ثانی فرمائیں کہ کہیں وہ بھی اُسی ڈگر پر تو نہیں چل رہے جس کے نتیجے میں خدانخواستہ انہیں بھی کبھی ع "ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!" کی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے!

میثاق کے سابقہ شمارے میں محترم غازی عزیر صاحب کے مضمون کے ادارتی نوٹ میں ہم نے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ موصوف کا دوسرا مقالہ بعنوان "غیر مسلمین کے ساتھ موالات کا حکم" اکتوبر کے شمارے میں شائع کیا جائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس ... بعض دیگر مضامین کی فوری اہمیت کے پیشِ نظر مندرجہ بالا مضمون کے لیے میثاق میں جگہ نہیں نکل سکی۔ قارئین یہ نوٹ کر لیں کہ یہ مضمون اب میثاق کی بجائے ان شاء اللہ حکمت قرآن کے آئندہ شمارے میں شائع کیا جائے گا۔ ___

---

۱ ؎ ... ۱۹۶۱ء ... اضافہ فرمائیں۔

وضاحتی بیان ڈاکٹر اسرار احمد

(جو ۱ ستمبر کو لاہور کے تمام اخبارات کو ارسال کیا گیا لیکن سوائے روزنامہ 'مشرق' اور
جزوی طور پر روزنامہ امروز کے اور کسی اخبار نے شائع نہیں کیا۔)

"میرے گذشتہ جمعہ کے خطاب کی اخباری اطلاع پر شیعہ حضرات نے جس شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ انتہائی
ہولناک ہے۔ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ میری تقریر میں سرے سے نہ کربلا کے حادثہ فاجعہ پر کوئی گفتگو ہوئی تھی نہ
یزید کی شخصیت ہی زیرِ بحث آئی تھی۔ البتہ انقلابِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی بین الاقوامی سطح پر توسیع اور اس کے
ت اغیار، بالخصوص یہود کے سازشی کردار کے حوالے سے یہ ذکر آیا تھا کہ اسلام دشمن طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے
ث مسلمانوں کی جس باہمی خانہ جنگی کا سلسلہ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے شروع ہوا اور پانچ سال تک جاری رہا،
ں میں لگ بھگ ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے اور الحمدللہ یہ خانہ جنگی نواسۂ رسولؐ
حضرت حسنؓ کے کمالِ حلم و ایثار کی بدولت ختم ہوئی۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ کے بیس سالہ عہدِ حکومت میں مکمل
ن و امان بھی رہا اور صلح و آشتی اور اتحاد و اتفاق کی فضا بھی برقرار رہی۔ اس اتحاد کی ایک مثال کے طور پر
ں جہادِ قسطنطنیہ کا ذکر بھی آیا جس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی بھی صحیح بخاری میں
موجود ہے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت کے تقریباً وسط میں اُن کے بیٹے یزید کی کمان میں مجاہدین کا جو
شکر مدینۂ قیصر یعنی قسطنطنیہ پر اوّلین حملے کے لئے گیا تھا اس میں میزبانِ رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور بہت
ے کبار صحابہ کرام جیسے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت عبداللہ ابنِ زبیر رضی اللہ
عنہم کے ساتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ اس تاریخی واقعہ کا ذکر بہت سے محدثین اور مورخین کے
ورہ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تالیف "البدایہ والنہایہ" کے جزو ہشتم کے صفحات ۱۵۰ - ۱۵۱ اور ۲۲۹ پر
صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ اس حوالے کا مقصد صرف اس حقیقتِ واقعی کا اظہار تھا کہ حضرت معاویہؓ کے دور
میں تمام مسلمان آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کے مطابق ایک کنگھی کے دندانوں یا بنیانِ مرصوص کی
ن متحد اور منظم تھے۔ چنانچہ اسی کی برکت سے اس دور میں انقلابِ محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توسیع کا عمل
ہ دوبارہ جاری ہو گیا۔ یہاں یہ واضح رہنا چاہیئے کہ کربلا کا سانحہ جہادِ قسطنطنیہ کے کم و بیش دس گیارہ
ال بعد پیش آیا۔ نیز یہ کہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موقع پر کسی کی سپہ سالاری سے اس کی افضلیت ثابت
ہیں ہوتی۔ اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری ایام میں روم کے خلاف جو لشکر تیار کیا تھا
س کی کمان حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کے سپرد کی تھی اور اس کے ہرگز یہ معنی نہیں تھے کہ اس بنا پر حضرت
اسامہؓ اُن بزرگ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے افضل ہو گئے تھے جو اس لشکر میں شامل تھے۔"

نوٹ: ڈاکٹر اسرار احمد کے اس خطابِ جمعہ کا کیسٹ تنظیم اسلامی کے مرکزی دفتر ۶۷/A علامہ اقبال روڈ
گڑھی شاہو لاہور اور مرکزی مکتبہ انجمن خدام القرآن ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور سے عاریتاً یا قیمتاً
حاصل کیا جا سکتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں قسطنطیہ پر مسلمانوں کا اوّلین حملہ اور اسمیں حضرت حسینؓ کی شرکت

اقتباسات از "البدایہ والنہایہ" تالیف مفسرِ جلیل و مؤرخ کبیر حافظ ابن کثیرؒ

وسنذكر ما كان رسول الله (ص) يكرمهما به ، وما كان يظهر من محبتهما والحنو عليهما والمقصود أن الحسين عاصر رسول الله (ص) وصحبه إلى أن توفى وهو عنه راض ، ولكنه كان صغيراً . ثم كان الصديق يكرمه و يعظمه ، وكذلك عمر وعثمان ، وصحب أباه وروى عنه ، وكان معه فى مغازيه كلها ، فى الجمل وصفين ، وكان معظما موقراً ، ولم يزل فى طاعة أبيه حتى قتل ، فلما آلت الخلافة إلى أخيه وأراد أن يصالح شق ذلك عليه ولم يسدد رأى أخيه فى ذلك ، بل حثه على قتال أهل الشام ، فقال له أخوه : والله لقد هممت أن أسجنك فى بيت وأطبق عليك بابه حتى أفرغ من هذا الشأن ثم أخرجك . فلما رأى الحسين ذلك سكت وسلم ، فلما استقرت الخلافة لمعاوية كان الحسين يتردد إليه مع أخيه الحسن فيكرمهما معاوية إكراماً زائداً ، و يقول لهما : مرحبا وأهلا ، و يعطيهما عطاء جزيلا ، وقد أطلق لهما فى يوم واحد مائتى ألف ، وقال : خذاها وأنا ابن هند ، والله لا يعطيكماها أحد قبلى ولا بعدى ، فقال الحسين : والله لن تعطى أنت ولا أحد قبلك ولا بعدك رجلا أفضل منا . ولما توفى الحسن كان الحسين يفد إلى معاوية فى كل عام فيعطيه و يكرمه ، وقد كان فى الجيش الذين غزوا القسطنطينية مع ابن معاوية يزيد ، فى سنة إحدى وخمسين

(جزء ۸ صفحات ۱۵۰ ، ۱۵۱)

وقد كان يزيد أول من غزى مدينة قسطنطينية فى سنة تسع وأربعين فى قول يعقوب بن سفيان وقال خليفة بن خياط : سنة خمسين . ثم حج بالناس فى تلك السنة بعد مرجعه من هذه الغزوة من أرض الروم . وقد ثبت فى الحديث أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : « أول جيش يغزو مدينة قيصر مغفور لهم » . وهو الجيش الثانى الذى رآه رسول الله صلى الله عليه وسلم فى منامه عند أم حرام فقالت : ادع الله أن يجعلنى منهم ، فقال : « أنت من الأولين » . يعنى جيش معاوية حين غزا قبرص ، ففتحها فى سنة سبع وعشرين أيام عثمان بن عفان ، وكانت معهم أم حرام فماتت هنالك بقبرص ، ثم كان أمير الجيش الثانى ابنه يزيد بن معاوية ، ولم تدرك أم حرام جيش يزيد هذا . وهذا من أعظم دلائل النبوة .

(جز ۸ صفحہ ۲۲۹)

اور عنقریب ہم اس بات کا ذکر بھی کریں گے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن دونوں (یعنی حضرات حسنین)
کا اکرام فرمایا کرتے تھے اور اُن سے کس درجہ محبت اور شفقت فرماتے تھے۔ اور مقصود یہ ہے کہ حضرت حسین رضی
، نبی علیہ السلام کا زمانہ اور صحبت پائی۔ یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا اور آپ ان سے راضی تھے۔ البتہ
ن وقت وہ رضی کم سن ضرور تھے۔ اس کے بعد حضرت صدیق اکبر ان کا اکرام اور تعظیم فرماتے تھے اور اسی طرح حضرت
اور حضرت عثمان رضی بھی۔ اور حضرت حسین نے اپنے والد کی صحبت پائی اور اُن سے (حدیث کی) روایت
ں۔ اور وہ اپنے والد کے ساتھ تمام جنگوں میں شریک رہے یعنی جنگ جمل اور جنگ صفین میں۔ وہ بڑے
اقدر اور ذی وقار تھے اور ہمیشہ اپنے والد کی اطاعت کرتے رہے تا آنکہ وہ (یعنی حضرت علی رض) شہید ہو گئے
۔ خلافت کی ذمہ داری اُن کے بھائی حسن کے کاندھوں پر آئی اور انہوں نے (یعنی حضرت حسن نے) صلح
ے کا ارادہ کیا۔ تو یہ بات اُن کو ناگوار گزری۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے حضرت حسن کی رائے کی تصویب
ں۔ بلکہ اُنہیں اہل شام کے ساتھ جنگ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس پر حضرت حسن نے کہا ”خدا
، میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں کسی کمرے میں قید کر کے دروازے بند کر دوں تا آنکہ میں اس کام (یعنی صلح)
ے فارغ ہو جاؤں تو پھر تمہیں رہا کر دوں“۔ جب حسین نے یہ دیکھا تو خاموشی اختیار کی اور بڑے بھائی کی
ان لی۔ چنانچہ جب خلافت کا معاملہ حضرت امیر معاویہ کے لئے طے پا گیا تو حضرت حسین اپنے بھائی حضرت
سن کے ہمراہ اُن کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور امیر معاویہ اُن دونوں کا بہت اکرام فرماتے اور انہیں خوش آمدید
رہتے تھے۔ اور اُن کو بہت بڑے بڑے عطیے اور ہدیے دیا کرتے تھے۔ اور ایک موقع پر تو امیر معاویہ نے ایک
ن میں دو لاکھ روپے اُن کی نذر کئے اور کہا یہ ہندہ کے بیٹے کی طرف سے قبول فرمایئے۔ خدا کی قسم اتنا بڑا
مجھ سے پہلے کسی نے آپ کو دیا ہوگا اور نہ بعد میں کوئی دے گا۔ اس پر حضرت حسین نے فرمایا خدا کی قسم نہ آپ
ے پہلے اور نہ آپ کے بعد کوئی شخص کسی ایسے شخص کو کچھ دے سکے گا جو ہم سے افضل ہو۔ پھر
حضرت حسن کا انتقال ہوا تو حضرت حسین ہر سال امیر معاویہ کے پاس تشریف لاتے، حضرت
معاویہ تحائف دیتے اور اکرام فرماتے۔ اور ۵۱ھ میں حضرت حسین اُس لشکر میں یزید بن معاویہ کے
ہمراہ تھے جس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا . . . .

یعقوب بن سفیان کے قول کے مطابق ۴۹ھ میں اور خلیفہ بن خیاط کے قول کے مطابق ۵۰ھ میں یزید نے
قسطنطنیہ پر سب سے پہلا حملہ کیا تھا۔ پھر اسی سال سرزمین روم کی اس لڑائی سے واپسی پر امارت حج کے فرائض
انجام دیئے۔ اور حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ پہلا لشکر جو مدینہ
قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا وہ مغفور لہم ہے۔ یعنی اُن کی بخشش کی گئی۔ اور یہ وہ دوسرا لشکر
ہے جو نبی علیہ السلام نے اُم حرام کے ہاں خواب میں دیکھا تھا۔ جس پر اُم حرام نے عرض کیا تھا کہ اے اللہ
کے رسول دُعا کیجئے کہ اللہ مجھے بھی اُنہی میں سے کر دے۔ تو نبی علیہ السلام نے فرمایا تم پہلوں میں سے ہو گی یعنی
معاویہ کے اُس لشکر کے ساتھ جس نے قبرص پر حملہ کیا اور حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں ۲۷ھ میں
تھا۔ چنانچہ واقعتہً اُم حرام اس لشکر کے ساتھ تھیں اور وہیں قبرص میں انکی وفات ہو گئی۔ اسکے بعد
لشکر کا سپہ سالار امیر معاویہ کا لڑکا یزید تھا اور ام حرام نے یزید کے اس لشکر کو نہیں پایا اور یہ
نبوت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

حدیث بخاری

سیدہ حضرت اُمِّ حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:۔

سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اول جیش من امتی یغزون البحر قد اوجبوا۔ قالت امّ حرام قلتُ یا رسول اللہ انا فیہم (وفی روایۃ انس ص۳۹۲/۱ ادع اللہ ان یجعلنی منہم فدعا لھا) قال انتِ فیہم قالتُ ثم قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اول جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفورٌ لہم فقلتُ انا فیہم یا رسول اللہ ؟ قال لا

(بخاری جلد اول ص ۴۱۰)

"میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت کا سب سے پہلا وہ لشکر جو بحری جہاد شروع کرے گا، ان کے لئے جنت واجب ہے۔ حضرت ام حرامؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں ان میں سے ہوں گی ؟

بخاری ص۳۹۲/۱ کی حدیث بروایت حضرت انسؓ کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ مجھے ان میں سے کر دیں۔ آپ نے ان کے حق میں دعا کی اور فرمایا تم ان میں ہو گی۔ حضرت ام حرامؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا کہ میری امت کا وہ پہلا لشکر جو قیصر کے دار الحکومت "قسطنطنیہ" پر حملہ کرے گا وہ بخشا ہوا ہے ـــ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں ان میں سے ہوں؟ آپ نے فرمایا نہیں (بلکہ تم پہلے میں سے ہو گی)

صداقتِ نبوّت کا ایک اہم ثبوت

تاریخِ اسلام کا ایک روشن ورق

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی

کے عین مطابق

فتحِ قبرص

قسطنطنیہ کا جہادِ اوّلین

اور اس کے ضمن میں

میزبانِ رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی وفات

اور قسطنطنیہ کی فصیل کے پاس تدفین

کے ایمان افروز واقعات !

نوٹ :۔ اس مضمون کے ضمن میں ادارہ 'میثاق' نے متعدد اصحابِ قلم کی تحریروں سے آزادانہ استفادہ کیا ہے۔ جن کا شکریہ ادارہ کے ذمہ ہے لیکن چونکہ عبارت میں کافی لفظی ردّ و بدل ہوا ہے لہٰذا بحالتِ موجودہ اس مضمون کی ذمہ داری ادارۂ 'میثاق' پر ہے اور اسی بنا پر ان حضرات کے نام بھی درج نہیں کئے جا رہے ہیں۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پیشینگوئی

سیدہ حضرت اُمِ حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اوّل جیش من اُمتی یغزون البحر قد اوجبوا۔ قالت ام حرام قلتُ یا رسول اللہ انا فیھم (وفی روایۃ انس صـ۳۹۲ ج ۱ ادع اللہ ان یجعلنی منھم فدعالھا) قال انت فیھم قالت ثم قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اوّل جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفورٌ لھم فقلت انا فیھم یا رسول اللہ؟ قال لا۔ (بخاری جلد اوّل صـ۴۱۰)

"میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ میری اُمت کا سب سے پہلا وہ لشکر جو بحری جہاد شروع کرے گا، ان کے لئے جنت واجب ہے۔ حضرت ام حرام رض کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں ان میں سے ہوں گی؟

بخاری صـ۳۹۲ ج ۱ کی حدیث بروایت حضرت انس رض کے الفاظ یہ ہیں کہ آپؐ میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ مجھے ان میں سے کر دیں۔ آپؐ نے ان کے حق میں دعا کی اور فرمایا تم ان میں سے ہوگی۔ حضرت ام حرام رض فرماتی ہیں کہ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا کہ میری اُمت کا وہ پہلا لشکر جو قیصر کے دارالحکومت "قسطنطنیہ" پر حملہ کرے گا وہ بخشا ہوا ہے ___ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ میں ان میں سے ہوں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں (بلکہ تم پہلے میں سے ہوگی)

صحیح بخاری کی اس مستند و معتبر حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے دو لشکروں کے متعلق پیشین گوئی فرمائی ہے۔

اوّل: وہ لشکر جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی بار سمندری جہاد کرے گا

دوم: وہ لشکر جو رومی پائے تخت قسطنطنیہ پر پہلی بار چڑھائی کرے گا۔

صحیح بخاری میں کئی مقامات پر اس بات کی صراحت و وضاحت پائی جاتی ہے کہ ان
بہر دو لشکروں کے ایمان افروز مناظر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلم کو رؤیاء و خواب
میں دکھا دیئے گئے تھے، انہیں دیکھ کر ہی آپؐ نے پیشین گوئی کرتے ہوئے قد اوجبوا
اور مغفور لھم کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے ـــــ اور چونکہ بخاری ص۲۵ ج ۱ و
ترمذی ص۲۹ ج ۲ میں درج حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق یہ ایک مسلمہ
حقیقت ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے خواب بھی وحی کا درجہ رکھتے ہیں ـــــ
رؤیا الانبیاء وحی ـــــ اس لئے لازمی طور پر تسلیم کرنا ہوگا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ واصحابہ
وسلم کا یہ خواب اور حالت بیداری میں دی ہوئی یہ بشارت و خوشخبری بھی وحی ربانی ہے۔

حضرت معاویہؓ کی خوش نصیبی و بخت بیداری کس قدر قابل رشک ہے کہ اللہ تعالیٰ
نے آپ کے دورِ امارت اور عہدِ خلافت میں نبی صادق صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلم کی
پیشین گوئی کو پورا اور آپؐ کے مبارک خواب کو شرمندۂ تعبیر فرمایا، جس کی تفصیل یہ ہے:

مجاہدینِ قبرص

حضرت معاویہؓ نے عہدِ فاروقی میں "اسلامی بحریہ" کی تشکیل کے لئے بہت
کوشش کی لیکن خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر فاروق اعظمؓ نے بعض وجوہات کے پیش نظر
نیا بحری محاذ کھولنے کی اجازت نہ دی ـــــ عہدِ عثمانی میں آپ نے پھر اجازت چاہی
بالآخر آپ کے مسلسل اصرار پر امیر المومنین سیدنا عثمان ذوالنورینؓ نے اجازت مرحمت
فرمائی۔ دربارِ خلافت سے اجازت کا ملنا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے بڑی تندہی اور یکسوئی
کے ساتھ ایک طرف جنگی جہازوں کی تیاری شروع کرائی اور دوسری جانب مسلمان
فوجوں کی بحری تربیت کا معقول بندوبست کیا۔

اس طرح پانچسو سے زائد جنگی جہازوں پر مشتمل یہ پہلا اسلامی بحریہ عالم وجود میں آیا،
جسے اسلام کی تاریخ میں بحری فتوحات کے سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔

بلاشبہ یہ حضرت معاویہؓ کا عظیم ترین کارنامہ ہی نہیں بلکہ مسلمان قوم پر ایک عظیم احسان بھی ہے ۔۔۔ لیکن کس قدر حیرت و تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں کی بحری فتوحات و خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ہی نہیں، بحری کارناموں کے صدے اعزازی تمغے اور نشانات دیتے ہوئے بھی "بانی اسلامی بحریہ" حضرت معاویہؓ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور جس شخصیت کے قائم کردہ نقوش پر آج فخر سے سر اونچا کیا جاتا ہے ان کو تاریخ کے اس اہم گوشے سے حرفِ غلط کی مانند کھرچ پھینکنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔

بہرحال بحری بیڑے کی تیاری کے بعد ۲۸ھ ہجری میں حضرت معاویہؓ نے اپنی زیر قیادت سمندر پار، قبرص جیسے اہم یونانی علاقے پر اسلامی پرچم لہرایا۔

اس جہاد میں حضرت ابوذر غفاریؓ حضرت ابو الدرداءؓ اور حضرت عبادہ بن صامتؓ جیسے اکابر صحابہؓ شامل تھے۔ یہی وہ غزوہ ہے جس میں شریک ہونے والے تمام مجاہدین کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بخاری کی روایت کے مطابق جنتی ہونے کی خوشخبری دی تھی، سنائی اور جس میں شمولیت کے لیے سیدہ ام حرامؓ نے آپؐ سے خصوصی دعا کرائی تھی۔ ۔۔۔ سیدہ ام حرامؓ اپنے شوہر سیدنا عبادہ بن صامتؓ کے ساتھ شریک جہاد تھیں فتح قبرص کے بعد جب لشکرِ اسلام واپس ہونے لگا تو یہ سواری کا خچر بدکنے سے گر کر شہید ہو گئیں۔

سیدنا انس بن مالکؓ فرماتے ہیں: (بخاری ج ۲ صہ ۹۳۰)

خرجت مع زوجها عبادة بن الصامت غازیا اوّل ما رکب المسلمون البحر مع معاویة فلما انصرفوا من غزوتهم قافلین فنزلوا الشام فقربت الیها دابة لترکبها فصرعتها فماتت

"حضرت ام حرامؓ ۔ اپنے شوہر حضرت عبادہ بن صامتؓ کے ہمراہ جہاد میں نکلیں وہ سب سے پہلا جہاد تھا جس میں مسلمان حضرت معاویہؓ کے ساتھ سمندر پار گئے تھے۔ جب وہ لوگ جہاد سے فارغ ہو کر شام واپس ہوئے تو سیدہ ام حرامؓ کی سواری کا جانور لایا گیا۔ وہ اس سے گر کر انتقال فرما گئیں۔"

علامہ ابن الاثیر جزری لکھتے ہیں: (اسد الغابۃ ج۵ صـ ۵۰۰)

وکان امیر ھذا الجیش معاویۃ بن ابی سفیان فی خلافۃ عثمان

و معہ ابوذر و ابوالدرداء و غیرھما من الصحابۃ

"سیدنا عثمان ذوالنورینؓ کی خلافت میں، اس بحری لشکر کے سربراہ حضرت معاویہؓ تھے، ان کے ساتھ حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت ابو درداءؓ وغیرہ صحابہ کرام بھی شریک جہاد تھے۔"

مجاہدینِ قسطنطنیہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ و اصحابہ وسلم کی وفات کے بعد جناب سیدنا ابوبکر صدیقؓ آپ کے جانشین و خلیفہ ہوئے۔ آپ کی خلافت کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کو مسیلمہ کذاب وغیرہ جھوٹے مدعیانِ نبوت سے نبرد آزما ہونا پڑا ــــ اور چونکہ ان باغیانِ اسلام کی پشت پناہی و حوصلہ افزائی اس وقت کی ایرانی مجوسی حکومت کر رہی تھی (حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط صـ ۴۹) اس لیے ان سے فراغت کے بعد ایران کے سرحدی علاقوں پر تادیبی حملہ ناگزیر ہو گیا تھا۔ جس نے آگے چل کر باقاعدہ فتوحات کی صورت اختیار کر لی ــــ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے انتقال کے بعد سیدنا عمر فاروق اعظمؓ خلیفہ ہوئے۔ اگرچہ آپ فرمایا کرتے کہ "کاش ہمارے اور فارس کے درمیان آگ کا پہاڑ حائل ہوتا، نہ وہ ہم پر حملہ آور ہو سکتے اور نہ ہی ہم ان پر چڑھ سکتے"۔۔۔۔۔ تاہم ناگزیر حالات و اسباب کے پیشِ نظر فتوحات کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ آپ کے عہدِ خلافت میں نہ صرف ایران بلکہ روم و مصر وغیرہ ممالک کے بہت سے علاقے اسلام کے زیرِ نگیں آئے۔ اسلامی فتوحات و تسخیر کا سلسلہ جاری تھا کہ اسلام کے خلاف خطرناک عجمی سازش کے ذریعے سیدنا عمر فاروقِ اعظمؓ کو شہید کر دیا گیا۔ ان کے بعد سیدنا عثمان ذوالنورینؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے بھی فتوحات اور جہادی

سرگرمیاں حسبِ سابق جاری رکھیں اور ان میں کسی قسم کا تعطل پیدا نہ ہونے دیا۔ یہاں تک کہ ایران کی مجوسی حکومت آپ ہی کے دورِ خلافت میں خاتمہ کو پہنچی۔ بالآخر عجمی نومسلموں اور جنگی قیدیوں وغیرہ اسلام دشمن عناصر نے عرب معاشرے کے بعض بزرگوں کو آڑ بنا کر سیدنا عثمان غنیؓ کے خلاف شورش کھڑی کی، جس کے نتیجہ میں آپ کی دردناک شہادت واقع ہوئی۔

سیدنا عثمان ذوالنورینؓ کی انتہائی مظلومانہ شہادت سے جس فتنۂ کبریٰ اور باہمی افتراق وانتشار کے پانچ سالہ دور کا آغاز ہوا اس کے دوران ایک جانب خانہ جنگی سے لگ بھگ ایک لاکھ مسلمان لقمۂ اجل بنے اور دوسری جانب اسلامی فتوحات اور 'دارالاسلام' کی توسیعِ مزید کا عمل بالکل رکا رہا۔ تا آنکہ سبطِ رسول سیدنا حسنؓ کے کمالِ حلم وایثار اور حضرت معاویہؓ کے حق میں دست برداری کے نتیجے میں صلح ہوئی اور سنہ ۴۱ھ سے صلح وآشتی اور اتحاد واتفاق کے بیس سالہ دور کا آغاز ہوا اور اس کے نتیجے میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ بھی از سرِ نو شروع ہو گیا۔

ایران کی فتح حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت میں مکمل ہو چکی تھی، لیکن روم کے بیشتر علاقوں پر اسلام کا پرچم لہرانے جانے کے باوجود، روم کی عیسائی حکومت کا پایۂ تخت قسطنطنیہ ابھی تک باقی تھا جہاں سے وہ وقتاً فوقتاً مسلمان علاقوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ اس لئے حضرت معاویہؓ نے فیصلہ کیا کہ عیسائی دارالحکومت قسطنطنیہ کو فتح کر کے رومیوں کی ریشہ دوانیوں کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر دیا جائے — نیز حضرت معاویہؓ جیسے عظیم فاتح اور مدبر جرنیل سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ یورپ اور مغربی ممالک کی فتوحات کے لئے قسطنطنیہ کو دروازے کی حیثیت حاصل ہے، جسے فتح کئے بغیر سمندر پار ان ملکوں تک اسلام کا پیغام پہنچانا ممکن نہیں — سب سے بڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی ہوئی بشارت نے اور آپؐ کے دیکھے ہوئے رؤیا کی تعبیر نے قسطنطنیہ کی چڑھائی پر آمادہ کیا۔ آپ کی دلی تمنا تھی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حدیثِ بشارت کے پہلے حصے پر بحری جہاد کی صورت

میں پورا اترنے کی توفیق عنایت فرمائی، اسی طرح دوسرے جزو کا مصداق بننے کی سعادت بھی مجھے عطا فرمائے ـــــ یہ تھے وہ اسباب و عوامل جن کی وجہ سے حضرت معاویہؓ نے ۴۹ سنہ ہجری میں قسطنطنیہ پر فوج کشی کا قطعی فیصلہ کیا۔

یہ اس دور کی بات ہے جب نوجوان طبقہ ہی نہیں ـــ بچے، بوڑھے اور خواتین۔ سب ہی جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت سے سرشار تھے۔ اسلامی سرحدوں پر مصروفِ جہاد مجاہدین کے علاوہ اپنے علاقوں اور گھروں پر موجود افراد بھی ہر وقت گوش برآواز رہتے کب جہاد کے لئے پکار کانوں میں آئے اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے نکل کھڑے ہوں۔ ان حالات میں حضرتِ معاویہؓ کے اس عزم اور فیصلہ کی اطلاع نے پوری اسلامی امت میں روح پھونک دی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و اصحابہ وسلّم نے جس لشکر میں شریک مجاہدین کو "مغفورٌ لھم" قرار دیا تھا اس میں شامل ہونے کے لئے لوگ جوق در جوق دمشق آنے لگے ـــــ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت حسین بن علی اور میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ نے مدینہ منورہ سے تشریف لاکر اس لشکر میں شمولیت اختیار فرمائی۔ جس کی امارت و سپہ سالاری حضرتِ معاویہؓ نے اپنے جواں سال فرزند یزید کے سپرد فرمائی۔ یزید کی عمر اس وقت ۲۶، ۲۷ سال تھی۔

یہ تاریخ کا وہ مشہور و معروف واقعہ ہے جس کے بے شمار شواہد حدیث اور تاریخ کی معتبر ترین اور مقبول ترین کتابوں میں موجود ہیں جن میں سے چند ایک کا حوالہ درج ذیل ہے:۔

۱۔ امیر المؤمنین فی الحدیث امام محمد ابن اسمٰعیل بخاریؒ ارقام فرماتے ہیں:

قال محمود بن الربیع فحدثتھا قومًا فیھم ابو ایوب الانصاری صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوتہ التی توفی فیھا و یزید ابن معاویۃ علیھم بارض الروم (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۸)

محمود بن ربیع کہتے ہیں کہ میں نے یہ روایت غزوۂ قسطنطنیہ کے موقع پر لوگوں

"قسطنطنیہ پر پہلی چڑھائی کرنے والے لشکر کا سپہ سالار یزید تھا اور چونکہ لشکر معینہ تعداد کو کہا جاتا ہے۔ اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ اس فوج کا ہر فرد بشارت مغفرت میں شریک ہے ــــ کہا جاتا ہے کہ یزید نے اسی ارشاد نبوی کی خاطر قسطنطنیہ پر جہاد کیا تھا۔" (منہاج السنۃ ج ۲ صہ ۲۵۲)

۸۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں: (المنتقی صہ ۲۸۸ و ۲۹۰)

"فاول من غزا القسطنطنیہ جیش بعثھم معاویۃ وعلیھم ابنہ یزید وفیھم من سادات الصحابۃ ابوایوب الانصاری فی اسروھا وقد صح ان اول جیش یغزوا القسطنطنیۃ مغفور لھم واول جیش غزاھا۔ کان امیرھم یزید"

"قسطنطنیہ پر پہلی بار حملہ کرنے والے لشکر کو حضرت معاویہؓ نے یزید کی قیادت میں روانہ کیا تھا۔ جس میں اکابر صحابہ میں سے ابوایوب انصاریؓ وغیرہ شریک تھے۔"

"یہ حقیقت ہے کہ سب سے اول قسطنطنیہ پر جہاد کرنے والا لشکر مغفور ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لشکر کا امیر و قائد یزید تھا۔"

۹۔ استیعاب میں ہے:

"وکان ابوایوب الانصاری مع علی ابن ابی طالب فی حروب کلھا ثم مات بالقسطنطنیہ من بلاد الروم فی زمن معاویۃ کانت غزاتہ تحت رآیۃ یزید بن معاویۃ وھو کان امیرھم یومئذٍ" (صہ ۱۵۷)

"حضرت ابوایوب انصاریؓ نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے ساتھ تمام جنگوں میں شرکت کی اور خلافت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں رومی شہروں میں وفات پائی۔ اس جنگ میں لشکر کی کمان یزید بن معاویہؓ کے ہاتھ میں تھی۔"

۱۰. مشہور و معروف مؤرخ محمد بن جریر طبری کا بیان ہے:

"یزید بن معاویہؓ نے روم میں جنگ کی یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک پہنچ گیا ابن عباسؓ و ابن عمرؓ و ابن زبیرؓ و ابو ایوب انصاریؓ اس کے ساتھ تھے۔"

(تاریخ طبری اردو ج ۴ صفحہ ۸۶)

۱۱. تاریخ ابن خلدون صفحہ ۱۱ ج ۳ (طبع مصر) پر مرقوم ہے کہ:

"یزید بن معاویہؓ بحیثیت امیر الجیش اس لشکر میں شامل تھا جس میں ابو ایوب انصاریؓ بھی تھے۔"

۱۲. شیخ العرب والعجم مولانا السید حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں:

"یزید کو متعدد معارک جہاد میں بھیجنے اور جزائر ابیض اور بلادہائے ایشیائے کوچک کے فتح کرنے حتیٰ کہ خود استنبول (قسطنطنیہ) پر بڑی بڑی افواج سے حملہ کرنے وغیرہ میں آزمایا جا چکا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ معارک عظیمہ میں یزید نے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔"

(مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ صفحہ ۲۵۰)

۱۳. مشہور و معروف سیرت نگار علامہ السید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ:

"یہ بشارت سب سے پہلے امیر معاویہؓ کے عہد میں پوری ہوئی اور دیکھا گیا کہ دمشق کی سرزمین پر اسلام میں سب سے پہلے تخت شاہی بچھایا جاتا ہے اور دمشق کا شہزادہ یزید اپنی سپہ سالاری میں مسلمانوں کا پہلا لشکر لے کر بحر خضر میں جہازوں کے بیڑے ڈالتا ہے اور دریا کو عبور کر کے قسطنطنیہ کی چار دیواری پر تلوار مارتا ہے۔" (سیرت النبی جلد سوم صفحہ ۲۶۰ مطبوعہ لاہور)

واضح رہے کہ اگرچہ بعض دوسری تاریخی روایات میں ارض روم پر حملہ آور ہونے والے پہلے اسلامی لشکر کے سپہ سالار کی حیثیت سے حضرت سفیان بن عوف کا نام بھی آیا ہے جیسے مثلاً کامل ابن اثیر کی روایت کے مطابق۔ لیکن اوّل تو ایسی روایات متذکرہ بالا معتبر اور معتمد علیہ روایات کے مقابلے میں زیادہ وقعت کی حامل نہیں ہیں، دوسرے

ان روایات سے بھی نہ صرف یہ کہ اس لشکر میں یزید کی شرکت ثابت ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ اس فوج کا وہ دوسرا بڑا دستہ جو "مدینۂ قیصر" یعنی قسطنطنیہ کی فصیل تک پہنچا اور جس میں بعض کبار صحابہؓ شریک تھے یزید ہی کی زیرِ کمان تھا۔ چنانچہ حافظ ابن اثیر کی مفصل عبارت کا ترجمہ درج ذیل ہے

"اور اسی سنہ میں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سنہ ۵۰ھ میں حضرت معاویہؓ نے جہاد کے لئے ایک بڑا بھاری لشکر بلاد روم کی طرف روانہ کیا اور اس لشکر کا امیر سفیان بن عوفؓ کو مقرر کیا اور اپنے بیٹے یزید کو بھی اس غزوہ میں شرکت کا حکم دیا۔ مگر یزید نے تعمیلِ حکم میں سستی کی اور معذرت کر دی۔ یہ دیکھ کر اس کے والد نے بھی اس کو رہنے دیا۔ وہاں جنگ میں لوگ بھوک اور شدید مرض کا شکار ہوئے تو یزید نے یہ شعر کہے (ترجمہ)

مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ غذ قذ و نہ (روم میں مسلمانوں کا فوجی کیمپ) میں مسلم مجاہدین کے دستہ ہائے فوج کو بخار اور چیچک کا سامنا ہے۔
جبکہ میں دیر مزان میں گدوں پر اونچے اونچے تکیوں کے سہارے بیٹھا ہوں اور میرے سامنے اُمِ کلثوم ہے۔

اُمِ کلثوم یزید کی بیوی عبداللہ بن عامر کی بیٹی تھی۔ حضرت معاویہؓ کو جب اس کے ان اشعار کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس کو قسم دے کر بتاکید کہا کہ اسے روم میں سفیان کے پاس پہنچنا ضروری ہے۔ تاکہ وہ لوگ جس مصیبت میں گرفتار ہیں یہ بھی گرفتار ہو۔ اب جو یہ روانہ ہوا تو اس کے والد ماجد نے ایک انبوہِ کثیر کا اس کے ساتھ اور اضافہ کر دیا۔ اسی لشکر میں حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن زبیرؓ اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ وغیرہ بھی تھے اور عبدالعزیز بن زراہ کلابی بھی۔ چنانچہ یہ لوگ بلادِ روم میں گھستے ہی چلے گئے تا آنکہ تیزی کے ساتھ یلغار کرتے ہوئے قسطنطنیہ تک جا پہنچے۔"

(بحوالہ "یزید کی شخصیت" تالیف مولانا عبدالرشید نعمانی صفحات ۱۸، ۱۹)

رہی مدینۂ قیصر پر حملہ آور ہونے والے اس پہلے اسلامی لشکر کے لئے نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بشارت کے مفہوم و مدلول کی تعیین جو "مغفور لہم" کے
الفاظِ مبارکہ میں وارد ہوئی ہے تو اس کے ضمن میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتے
ہیں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے حسبِ ذیل الفاظ جو "شرح تراجم
ابواب بخاری" میں وارد ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم!

"حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس حدیث میں "مغفور لہم" فرمانے سے
بعض لوگوں نے یزید کی نجات پر استدلال کیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی اس دوسرے
لشکر میں نہ صرف شریک بلکہ اس کا افسر و سربراہ تھا۔ جیسا کہ تاریخ شہادت
دیتی ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اس حدیث سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے
کہ اس غزوہ سے پہلے جو اس نے گناہ کئے تھے وہ بخشدیئے گئے۔ کیونکہ جہاد
کفارات میں سے ہے اور کفارات کا کام یہ ہے کہ وہ سابقہ گناہوں کے اثر
کو زائل کر دیتے ہیں۔ بعد میں ہونے والے گناہوں کے اثر کو نہیں۔ ہاں اگر
اسی کے ساتھ یہ بھی فرما دیا ہوتا کہ قیامت تک کے لئے اس کی بخشش کر دی گئی
ہے تو بے شک یہ حدیث اس کی نجات پر دلالت کرتی۔ اور جب یہ صورت
نہیں تو نجات بھی ثابت نہیں۔ بلکہ اس صورت میں اس کا معاملہ حق تعالےٰ
کے سپرد ہے۔"

(بحوالہ "یزید کی شخصیت" تالیف مولانا عبدالرشید نعمانی صفحات ۱۲ تا ۱۴)

وفات سیدنا ابو ایوب انصاریؓ

میزبانِ رسول سیدنا ابو ایوب انصاریؓ کی عمر اسّی سال سے بھی متجاوز تھی، بایں ہمہ اس
ضعیف العمری اور پیرانہ سالی میں مدینہ منورہ سے دمشق اور پھر دمشق سے قسطنطنیہ کے
طویل ترین سفر کی صعوبتیں آپ نے صرف اس لئے برداشت کیں تاکہ رسولِ برحق صلی اللہ
علیہ واصحابہ وسلم کے ارشادِ گرامی کے مطابق بشارتِ مغفرت پانے والے لشکر میں شرکت کی

سعادت حاصل کر سکیں ـــــ شدید گرمی، طول طویل سفر، موسم اور آب و ہوا کی تبدیلی اور پھر زندگی کے آخری کناروں کو چھوتی ہوئی ضعیفی و کمزوری، چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو پیچش کا عارضہ لاحق ہو گیا جس نے بڑھتے بڑھتے ایسی شدت اختیار کر لی کہ زندگی سے مایوسی ہونے لگی ـــــ امیر لشکر یزید عہدِ رسالت کی ان بزرگ ترین شخصیت کی دیکھ بھال اور مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا تو حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اسے وصیت فرمائی کہ مرنے کے بعد میرے جنازہ کو دشمن کی سرزمین میں جتنی دور ممکن ہو سکے جا کر دفن کرنا۔ نیز تمام مسلمانوں کو میرا سلام پہنچا کر میری طرف سے نبی صلی اللہ علیہ و اصحابہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بھی سنا دینا۔

من مات لا یشرک باللہ شیئاً جعلہ اللہ فی الجنۃ

"جو شخص اس حال میں فوت ہو گا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی بھی شے کو ساجھی نہ کیا ہو تو اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا"

یزید نے وصیت کے مطابق لوگوں کو حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا سلام پہنچایا۔ ان کا بیان فرمودہ فرمان نبویؐ سنایا اور تجہیز و تکفین کے بعد اس ہی نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی اور اگلے دن صبح رومیوں پر حملہ کے دوران قسطنطنیہ کے قلعے کی دیوار کے قریب دفن کر دیا۔ اس ضمن میں حدیث نبویؐ اور کتب تاریخ کے حسب ذیل حوالے مفید ہیں:

۱۔ علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

ان یزید بن معاویۃ کان امیراً علی الجیش الذی غزا فیہ ابو ایوب، فدخل علیہ عند الموت فقال لہ: اذا انا مت فاقرءوا علی الناس منی السلام واخبروھم انی سمعت رسول اللہ (ص) یقول "من مات لا یشرک باللہ شیئاً جعلہ اللہ فی الجنۃ" ولینطلقوا فیبعدوا بی فی ارض الروم ما استطاعوا قال فحدث الناس لما مات ابو ایوب فاسلم الناس وانطلقوا بجنازتہ (البدایہ والنہایہ ج ۸ صفحہ ۵۹)

"حضرت معاویہؓ کا بیٹا یزید اس لشکر کا امیر تھا، جس میں شامل ہو کر حضرت ابو ایوب انصاریؓ

نے جہاد کیا۔ ان کی وفات کے قریب یزید حاضرِ خدمت ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو لوگوں کو میری طرف سے سلام کہنا اور یہ ارشادِ نبوی انہیں سنانا کہ شرک سے محفوظ شخص کو اللہ جنت عطا کرے گا۔ نیز جہاں تک ممکن ہو روم کی سرزمین میں مجھے دور لے جا کر دفن کرنا ۔۔۔ چنانچہ یزید نے لوگوں کو حدیث سنائی اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا سلام پہنچایا۔ اس کے بعد جنازہ کو دفن کے لئے لے گیا۔"

۲۔ رئیس التبلیغ مولانا محمد یوسف دہلویؒ نقل فرماتے ہیں:

خرج الحاکم (ج ۳ ص ۵۸ ۴) عن محمد بن سیرین قال ......
فمرض وعلی الجیش یزید بن معاویۃ فدخل علیہ یعودہ فقال ماحاجتک؟ فقال حاجتی اذا انا مِتّ فارکب بی ثم سغ لی فی الارض العدو ما وجدت مساغاً فاذا لم تجد مساغاً فادفنّی ثم ارجع

(حیاۃ الصحابہ الجزء الاول ص ۴۲۲)

حاکم نے (مستدرک ص ۴۵۸ ج ۳ پر) امام محمد بن سیرینؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ بیمار ہوئے، اس وقت یزید امیرِ لشکر تھا۔ وہ بیمار پرسی کے لئے آیا۔ معلوم کیا کوئی ضرورت ہو تو بتائیں؟ اس پر حضرت ابو ایوب نے فرمایا میری خواہش ہے کہ جب میں مر جاؤں تو دشمن کے علاقے میں جس قدر ہو سکے دور لے جا کر دفن کر کے واپس آنا

۳۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وکان ابو ایوب (الانصاری) فی جیش یزید بن معاویۃ والیہ اوصی وھو الذی صلی علیہ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۵۸)

یعنی ابو ایوب انصاریؓ ۔۔۔ یزید بن معاویہؓ کی فوج میں تھے۔ انتقال سے پہلے انہوں نے یزید کو وصیت کی اور اسی نے حضرت ابو ایوب کی نماز جنازہ پڑھائی۔

۴۔ علامہ محمد بن سعدؒ کی نقل کردہ روایات ملاحظہ ہوں:

• پہلی روایت ـــــــ (طبقات ابن سعد اردو ج ۲ ص ۱۰۲)

وہ (یعنی حضرت ابو ایوب انصاریؓ) بیمار ہو گئے، لشکر یزید بن معاویہؓ کی

گمان میں تھا۔ وہ ان کے پاس عیادت کو آیا اور پوچھا کہ آپ کی کوئی خواہش ہو تو بیان کیجئے "انہوں نے کہا ہاں میری خواہش ہے کہ جب میں مرجاؤں تو مجھے اونٹ پر سوار کرا کے جہاں تک گنجائش ملے دشمن کے ملک میں لے جانا، جب گنجائش نہ پانا تو وہیں دفن کر دینا اور واپس آجانا۔ جب ان کی وفات ہوگئی تو اس نے انہیں سوار کیا اور جہاں تک گنجائش ملی دشمن کے ملک میں لے گیا اور دفن کر کے واپس آیا۔"

دوسری روایت —— (طبقات ج ۴ ص ۶۱)

"یزید جس وقت ابوایوب کے پاس آیا تو انہوں نے فرمایا کہ لوگوں سے میرا سلام کہنا۔ لوگوں کو چاہیئے کہ مجھے لے جائیں اور جتنا دور (دفن) کر سکیں کر دیں انہوں نے جو کچھ کہا تھا یزید نے لوگوں سے بیان کر دیا۔ لوگوں نے مانا۔ ان کے جنازے کو جس قدر اندر لے جا سکتے تھے لے گئے۔"

تیسری روایت —— (طبقات ج ۴ ص ۶۲)

"جس سال یزید بن معاویہ نے اپنے والد معاویہ بن ابی سفیان کی خلافت میں قسطنطنیہ کی جنگ کی، اسی سال ابوایوب کی وفات ہوئی۔ ان پر یزید بن معاویہ نے نماز پڑھی، ان کی قبر روم میں قلعہ قسطنطنیہ کی بنیاد میں ہے۔"

۵۔ قلعہ کی دیوار کے نزدیک کوئی چیز دفن کرتے ہوئے دیکھ کر رومی سربراہ قیصر نے قاصد کے ذریعے معلوم کرایا تو امیر لشکر یزید بن معاویہؓ نے کہا:

صاحب نبیّنا وقد سألنا ان نقدمه فی بلادك ونحن منفذون وصیّته او تلحق ارواحنا بالله۔

"یہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہیں، جنہوں نے تمہارے ملک میں اندر لے جا کر دفن کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔ اب ہم ان کی وصیت و خواہش کی تکمیل و تعمیل میں انہیں یہاں دفن کر رہے ہیں۔ ہم انہیں یہاں ضرور دفن کریں گے خواہ ہمیں اپنی جانیں دینی پڑیں۔" (العقد الفرید ج ۳ ص ۳۶۸)

یہ سن کر شاہِ روم کی زبان سے یہ گستاخانہ جملہ نکل گیا کہ —— مسلمانوں —

مے جانے کے بعد ہم یہ لاش نکلوا کر کتوں کے سامنے ڈلوادیں گے ـــــ قیصر کی زبان سے نکلے ہوئے ان گستاخانہ اور خبیث الفاظ کی اطلاع ملنی تھی کہ یزید نے شکر کو پوری شدت و قوت سے رومیوں پر حملہ کا حکم دیا ۔ اور یہ الفاظ کہے :

یااھل القسطنطینیہ ھذا رجل من اکابر اصحاب محمد نبینا وقد دفنا حیث ترون ۔ واللّٰہ لئن تعرضتم لہ لاھدمن کل کنیسۃ فی ارض الاسلام ولا یضرب ناقوس بارض العرب ابدًا ۔ (ناسخ التواریخ ج ۲ ص ۶۶)

"اے قسطنطنیہ کے باشندو! یہ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ ہم نے انہیں یہاں دفن کیا ہے۔ ـــــ واللہ! اگر تم نے ان کی قبر کو کسی قسم کا ضرر پہنچایا تو یاد رکھو کہ پوری سرزمین اسلام میں ہر کنیسہ منہدم کرادوں گا اور پھر پورے عرب میں کبھی بھی ناقوس تک نہیں بج سکے گا"۔

علامہ ابن عبد ربہ کی درج کردہ روایت کے الفاظ یہ ہیں :

لئن بلغنی انہ نبش من قبرہ او مثل بہ لا ترکت بارض العرب نصرانیا الا قتلتہ ولا کنیسۃ الا ھدمتھا (العقد الفرید ج ۳ ص ۳۶۸)

"اگر مجھے پتہ چلا کہ ان کی قبر اکھیڑی گئی یا ان کے ساتھ کسی بے ادبی کا ارتکاب کیا گیا ـــــ تو (کان کھول کر سن لو کہ) میں سرزمین عرب میں کسی نصرانی کو قتل اور کسی گرجا کو ڈھائے بغیر نہ چھوڑوں گا"۔

یزید کی اس جرأت مندانہ دھمکی اور شدید حملے سے قیصر پر اس قدر خوف طاری ہوا کہ اپنے مذہب کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر کے ساتھ کسی بھی قسم کی بے ادبی و گستاخی نہ ہوگی۔ بلکہ اس کی حفاظت کا بھرپور خیال رکھا جائے گا۔ چنانچہ بعد میں اس نے قبر پر ایک قبہ بنوا دیا۔

انه بنى على قبره قبة ويسرج فيها الى اليوم

(العقد الفريد ج ۲ ص ۱۳۳)

"اس نے حضرت ابوایوبؓ کی قبر پر ایک قبہ بھی بنوا دیا۔ جہاں آج تک چراغ روشن ہوتا ہے۔"

مورخین کا بیان ہے کہ میزبانِ رسول، سیدنا ابوایوب انصاریؓ کے جسم کی یہ حفاظت بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ واصحابہ وسلم کی دی ہوئی پیشین گوئی کے مطابق ظہور میں آئی ــــ اس لئے کہ یہی وہ صحابی تھے جن کو نہ صرف یہ امتیازی شرف حاصل ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری مدینہ کے ابتدائی ایام میں میزبانی کی خدمات انجام دیں۔ بلکہ آپ کے استراحت فرماتے وقت پہرہ بھی دیا تھا جس پر آپ نے فرمایا تھا کہ ابوایوب اللہ تمہارے جسم کی بھی اسی طرح حفاظت کرے جس طرح تم نے اللہ کے نبیؐ کی رات پہرہ داری کی ہے۔ صاحب کتاب "الروض الانف شرح السیرۃ النبویہ لابن ہشام لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی اس دعا سے ابوایوب انصاریؓ کے جسم کی رومیوں ہی سے حفاظت کرائی۔

چنانچہ آج بھی حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مقبرہ شہر قسطنطنیہ کے باہر صدق نبوت کے ایک زندہ اور منہ بولتے ثبوت کی حیثیت سے موجود ہے۔ فللہ"

●●●●●●●●

فراستِ نبوی کا شاہکار

• غزوۂ حنین واوطاس • محاصرۂ طائف

• مشرکینِ عرب کا قلع قمع • اہل کتاب سے معاملہ

ڈاکٹر اسرار احمد

آٹھویں خطاب کی آخری قسط

ترتیب و تسوید : جمیل الرحمٰن

ایک خاص واقعہ

غزوہ حنین واوطاس اور محاصرۂ طائف کے بعد جو ایک خاص واقعہ پیش آیا، میں اب آپ کو وہ سنانا چاہتا ہوں کہ جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ کیسی کیسی پیچیدہ پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہوتی تھیں — سیرتِ النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا میں جو بیان کر رہا ہوں تو ایسا نہیں ہے کہ یہ کوئی سایہ دار ہموار شاہراہ پر چلنے (SMOOTH SAILING) والا معاملہ تھا کہ جس میں کوئی پیچیدگی نہ ہو، کوئی تکلیف نہ ہو، کوئی نشیب و فراز نہ ہو اور انقلاب کی تکمیل ہو جائے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی انقلابی جدوجہد کی راہ میں جتنی مشکلات و رکاوٹیں آسکتی ہیں وہ ہمیں آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں نظر آتی ہیں۔ نبوت و رسالت کے منصب پر باقاعدہ فائز ہونے کے بعد حضورؐ کی بائیس تیئیس سالہ حیاتِ طیبہ نہایت شدید اور جاں گسل جدّوجہد میں گزری ہے۔ بے پناہ مصائب و مشکلات کا مواجہہ کرنا پڑا ہے۔ خود آپؐ کا ارشادِ گرامی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجھ پر تنہا وہ سب تکلیفیں اور مشکلیں بیتی ہیں جو تمام انبیاء و رسل علیہم السلام پر بیتی تھیں — اگرچہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ اگر اس کی مشیت ہوتی تو اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم، اس تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک میں

ایک کانٹا بھی چبھنے نہ دیتا اور انقلابِ اسلامی کی تکمیل بھی ہو جاتی۔ لیکن بالفعل ایسا نہیں ہوا۔ حضورؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو بے حد و حساب تکلیفیں جھیلنی پڑی ہیں۔ مصائب برداشت کرنے پڑے ہیں۔ بارہا آپؐ کو پیچیدہ سے پیچیدہ صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونا پڑا ہے۔ مشرکین و کفار کی طرف سے استہزا اور تمسخر اور طعن و تشنیع سے جو ذہنی اذیت و کوفت آپؐ کو پہنچتی رہی ہے، اُسے ہم سب جانتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ متعدد مواقع پر ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ لوگ جو حضورؐ کا کلمہ پڑھ رہے تھے اُن کے ہاتھوں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید نوعیت کی قلبی و ذہنی کوفت اور اذیت اُٹھانا پڑی۔ عبداللہ بن اُبی اور اس کے دوسرے منافق ساتھی بھی تو کلمہ گو تھے اور ان کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا تھا۔ یہی عبداللہ بن اُبی ہے جس نے کئی بار مہاجرین و انصار میں پھوٹ ڈالنے اور باہم دگر دست و گریباں کرانے اور مہاجرین کی توہین و تذلیل کی کوششیں کیں۔ اسی طرح ان منافقین نے غزوۂ احد اور غزوۂ خندق کے مواقع پر مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے جو اوچھے ہتھکنڈے اختیار کیے وہ بھی آنحضورؐ اور صحابہؓ کے لیے انتہائی ذہنی اذیت کا باعث بنے [1]

---

[1] غزوۂ احزاب کے موقع پر اس گروہ کے منافقانہ کردار پر سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظِ مبارکہ تبصرہ فرمایا ہے:

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ	"اور یاد کرو وہ وقت جب منافقین
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا	اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں
وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ	روگ تھا، صاف صاف کہہ رہے
اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَاِذْ قَالَتْ	تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے
طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ	جو وعدے ہم سے کیے تھے، وہ فریب
يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ	کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب ان میں سے
فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ	ایک گروہ نے کہا، اے یثرب کے
فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ	لوگو! تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا

پھر یہی عبداللہ بن ابی تھا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا پر تہمت لگا رہا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی ذہنی و قلبی اذیت جھیلنی پڑ رہی ہے۔ پھر یہ کہ اس معاملے میں چند وہ لوگ بھی ملوث ہو گئے جو صادق الایمان تھے۔ اس لیے کہ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اس میں ذہنی آمادگی رہتی ہے کہ کسی کے بارے میں بری بات بیان ہو تو اُسے وہ جلد قبول کر لیتا ہے جبکہ اگر کسی کے بارے میں اچھی بات بیان ہو تو اُسے آسانی سے قبول نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا متواتر ایک مہینہ نہایت سخت کرب کی حالت میں گزرا۔ اس لیے قریباً سوا مہینے کے بعد سورۂ نور نازل ہوئی جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی پر لگائی ہوئی تہمت کی تردید کی گئی اور آپؓ کی پاک دامنی کی شہادت دی گئی۔ میں نے اس واقعہ کا اس سے قبل اس سلسلۂ تقاریر میں اس لیے ذکر نہیں کیا تھا کہ اس واقعہ کا انقلاب کے مراحل سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ یوں تو سیرتِ مطہرہ کے بے شمار گوشے ہیں لیکن میں نے اس سلسلے میں اب تک جو متواتر سات تقاریر کی ہیں وہ خاص طور

يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ۝ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ۝
(آیات ۱۳ تا ۱۵)

کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو۔ جب ایک فریق نبی سے یہ کہہ کر رخصت طلب کر رہا تھا کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے۔ دراصل وہ (محاذِ جنگ) سے فرار ہونا چاہتے تھے۔ اگر شہر کی اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اس وقت انہیں فتنہ کی دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں فتنہ میں شریک ہونے میں تامل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور اللہ سے کیے گئے عہد کی باز پرس تو ہونی ہی تھی۔"

پر انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مراحل کے اعتبار سے کی ہیں۔ البتہ غزوۂ حنین واوطاس کے بعد جو ایک خاص واقعہ ہوا جس کا بیان اس وقت میرے پیشِ نظر ہے، وہ اس سلسلہ تقاریر کے اصل موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ چنانچہ مَیں نے یہ تمام باتیں اُسی واقعے کے لیے تمہیداً عرض کی ہیں۔ وہ خاص واقعہ کیا ہے، اب اسے توجہ سے سماعت فرمایئے۔

غنائم اور اسیرانِ جنگ: ہوزان اور ثقیف کے قبائل بہت طاقتور اور دولت مند قبائل تھے۔ چنانچہ ان معرکوں میں بے شمار اور کثیر مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ معتبر روایات میں مذکور ہے کہ قریباً چوبیس ہزار اونٹ اور چالیس ہزار بکریاں اور بھیڑیں مالِ غنیمت میں ملیں۔ عرب کا اصل مال اور سرمایہ یہی مویشی ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈھیروں مال و اسباب کے ساتھ چار ہزار اوقیہ چاندی بھی تھی جو مسلمانوں کے ہاتھ لگی — یہ قبائل اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لائے تھے تاکہ ان کے لشکر اپنے اہل و عیال کے تحفظ کی خاطر بے جگری سے لڑیں اور میدان جنگ سے پیٹھ نہ موڑیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد آ گئی اور جب کافروں کو سزا دینے کا غیبی فیصلہ ہو گیا گویا وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا — والی صورتِ حال عملاً پیدا ہو گئی تو ہوزان اور ثقیف کے قبیلوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور جان بچانے کے لیے جس کا جدھر منہ اٹھا فرار ہو گیا۔ مال مویشی ہی نہیں بلکہ وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی چھوڑ بھاگے۔ چنانچہ مال مویشی کے علاوہ قریباً چھ ہزار افراد جن میں عورتوں بچوں کی عظیم اکثریت تھی اسیر بنا لیے گئے[1]

---

[1] ان اسیران میں شیما نامی ایک خاتون بھی تھیں جو حضرت حلیمہؓ کی بیٹی اور حضورؐ کی رضاعی بہن تھیں۔ گرفتاری کے موقع پر ہی انہوں نے کہا کہ "مَیں تمہارے نبی کی بہن ہوں"۔ اس کی تصدیق کے لیے فوراً ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ حضرت شیما نے پہچان کے طور پر اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی۔ چونکہ حضورؐ نے ایک دفعہ بچپن میں پیٹھ پر دانتوں سے کاٹا تھا اس کا نشان موجود تھا۔ حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپؐ نے ان کے بیٹھنے کے لیے خود اپنی ردائے مبارک بچھائی۔ دلجوئی کی باتیں

تقسیم غنائم اور ایک پیچیدہ صورت حال

مختصراً یہ کہ اس غزوہ کی فتح کے نتیجے میں بے شمار مال و اسباب ہاتھ آیا۔ یہ بات واضح رہے کہ صدقات کی تقسیم کے لیے سورہ توبہ میں جو شقیں بیان ہوئی ہیں ان میں ایک شق، مُؤَلَّفَۃُ قُلُوبُہُم بھی ہے۔ یعنی وہ لوگ بھی ان صدقات کے مستحق ہیں جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنائم کی تقسیم میں قریش کے ان لوگوں کو زیادہ نوازا جو فتح مکہ کے بعد نئے ایمان لائے تھے۔ ان میں سے بھی خاص طور پر جو قریش کے مختلف گھرانوں کے سربراہان اور سردار تھے۔ ان کو مالِ غنیمت میں سے نسبتاً زیادہ حصہ دیا۔

اب اس تقسیم پر چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں، چونکہ اس عمل میں اتفاقی اور اتفاقی اعتبار سے یہ صورتِ حال موجود تھی کہ مکہ والے بہرحال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ کے لوگ تھے۔ کنبہ کے لوگ تھے۔ رشتہ دار تھے۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اگر مکہ کے لوگ آپؐ کے ہم قبیلہ اور رشتہ دار نہ ہوتے تب بھی حضورؐ ان کے ساتھ یہی معاملہ کرتے۔ اب صورتِ واقعہ یہ بنی کہ اگرچہ حضورؐ یہ معاملہ کر رہے تھے تالیفِ قلبی کی غرض سے لیکن بالفعل تو معاملہ یہ ہو گیا کہ یہ تالیفِ قلب جن کی ہو رہی تھی، وہ آپؐ کے رشتہ دار اور کنبے و قبیلے والے لوگ تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لشکر میں جو تھوڑے بہت منافقین شامل تھے، اب ان کو موقع مل گیا اور انہوں نے اس کو خوب اچھالا۔ اور یہ معاملہ چونکہ بہت نازک (SENSITIVE) تھا۔ لہٰذا منافقین کے پروپیگنڈے سے عام مسلمانوں میں بھی تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پھر آپ حضرات کی توجہ مبذول کرا رہا ہوں کہ وہ لوگ بھی انسان ہی تھے۔ انسان کی جو طبعی و فطری کمزوریاں ہیں وہ تو موجود رہتی ہیں۔ چنانچہ قرآن نے

کیں۔ چند اونٹ اور بکریاں مرحمت فرمائیں اور ارشاد فرمایا کہ جی چاہے تو میرے ساتھ چل کر رہو یا گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے۔ پہلے تو وہ ایمان لائیں۔ پھر عرض کیا کہ مجھے میرے اہلِ خاندان تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ان کو عزت و احترام کے ساتھ ان کے قبیلہ میں پہنچا دیا گیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

اسی حقیقت کو کہیں یوں بیان فرمایا ہے کہ : خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا،
کہیں یوں کہ : خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ اور کہیں یوں کہ اِنَّ
الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا ـــ یعنی انسان میں خلقی طور پر کچھ کمزوریاں رکھی
گئی ہیں، تب ہی تو وہ امتحان اور آزمائش کے اندر ڈالا گیا ہے۔ اگر وہ ہر اعتبار
سے کامل (PERFECT) ہوتا، اس کی خلقت میں کسی پہلو سے بھی کوئی نقص نہ ہوتا
تو پھر وہ فرشتہ ہوتا۔ پھر اس کے امتحان کی کیا احتیاج ہوتی! چنانچہ یہی ہُوا کہ
کہ اس واقعے سے ایک عام بے چینی مسلمانوں میں پھیل گئی اور خاص طور پر انصار
میں سے بہت سے مسلمانوں کی زبانوں پر جن میں مومنینِ صادقین بھی شامل تھے،
یہ بات آ گئی کہ :

> "دیکھا! جب جان دینے کا وقت آتا ہے، قربانیوں کا موقع
> ہوتا ہے تو ہم (یعنی مدینہ والے انصار) یاد آتے ہیں اور جب مالِ غنیمت
> کی تقسیم کا مرحلہ آیا ہے تو مکہ والے، اپنے قبیلے والے، اپنے اعزا و
> اقربا یاد آ گئے۔"

یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کے گوش ہائے مبارک تک یہ تمام باتیں پہنچ رہی تھیں اور حضورؐ کے قلب پر
جو کیفیات گذر رہی ہوں گی، اس کا کسی قدر اندازہ کوئی بھی صاحب قلبِ حساس کر سکتا ہے۔

فراستِ نبویؐ کا شاہکار

اب دیکھیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے
اس پیچیدہ صورتِ حال کو کیسے حل فرمایا! ـ

یہ ہے درحقیقت حضورؐ کی فراست اور حسنِ تدبیر کا شاہکار ـــ یہ اور اسی نوعیت
کی دیگر باتیں ہیں جن پر مستشرقین دنگ رہ جاتے ہیں چاہے وہ منٹگمری واٹ ہو
چاہے ایچ۔ جی ویلز ہو، چاہے خواہ کوئی اور نامی گرامی مستشرق ہو کہ یہ فراست، یہ
تدبّر! یہ انسانی فطرت اور نفسیات سے واقفیت! یہ انسان شناسی! جو بہت
ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ـــ اور یہ صلاحیت کہ پیچیدہ سے پیچیدہ صورتحال
کو خوب صورتی سے حل کر لینا یہ تمام اوصاف اُس ذاتؐ میں بدرجہ کامل جمع تھے
چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان میں تعریف و توصیف کے کوئی الفاظ ایسے باقی

نہیں رہ گئے ہیں جو مسٹر منٹگری واٹ نے اپنی کتاب " MOHAMMAD AT MEDINAH " میں حضورؐ کے لیے استعمال نہ کر دیئے ہوں ۔ انہوں نے لکھا ہے کہ :" اعلیٰ ترین تدبر و تفہیم، معاملہ فہمی، انسان شناسی، دُور اندیشی، ان تمام اعتبارات سے جو اصاف کسی بلند پایہ مدبّر، کسی سیاست دان، کسی حکمران، کسی STATESMAN کے اندر ہونے چاہئیں وہ بتمام و کمال موجود تھے محمدؐ میں (صلّی اللہ علیہ وسلّم)"

اسی فراست اور حسنِ تدبیر کی ایک نمایاں مثال ہے جو اس واقعہ میں سامنے آتی ہے ۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ چہ میگوئیاں سننے کے بعد حضورؐ نے ایک بہت بڑا خیمہ لگانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ایک بہت بڑا خیمہ نصب کیا گیا۔ پھر آپؐ نے تمام انصارؓ کو وہاں جمع کر لیا۔ وہاں آپؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ فصاحت و بلاغت کی معراج تو ہے ہی جیسے تمام اہلِ سِیر تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ خطبہ فراست و ذکاوت اور تدبّرِ نبویؐ کے ساتھ ساتھ علم نفسیاتِ انسانی کے ادراک میں آپؐ کی مہارت کا بھی شاہکار ہے۔ حضورؐ نے انصارؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

" اے معشر الانصار! کیا یہ درست نہیں ہے کہ تم گمراہ تھے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے تمہیں ہدایت بخشی!"

حضورؐ کے سوال کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ یہی کہ "کیوں نہیں۔ واقعتاً حقیقت یہی ہے۔ چنانچہ انصارؓ نے بیک زبان یہی جواب دیا:" بَلٰی یارسُول اللہ ۔

پھر حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

" یا معشر الانصار! کیا یہ درست نہیں ہے کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے میرے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر الفت و محبت اور اتفاق پیدا فرمایا؟" [۱]

۱۔ اشارہ ہے اس دشمنی کے خاتمہ کی طرف جو اوس و خزرج کے قبائل میں برسوں سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آ رہی تھی۔ جس کے باعث وقتاً فوقتاً ان میں بارہا

پھر حضورؐ نے فرمایا:

"یامعشر الانصار! کیا یہ درست نہیں ہے کہ تم مفلس تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے تمہیں غنی کر دیا"

اس طریقہ سے آپؐ وہ احسانات و انعامات گنواتے چلے گئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انصار پر بالخصوص اور نوعِ انسانی پر بالعموم ہوئے تھے۔ اور ہر جملہ پر تمام انصارؓ بیک زبان عرض کرتے کہ:

"بلیٰ یارسول اللہ۔ بلیٰ یارسول اللہ۔ (کیوں نہیں! اے اللہ کے رسولؐ ہم تسلیم کرتے ہیں)

اس ارشاد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطاب کا رُخ بدلا اور ارشاد فرمایا:

"یامعشر الانصار! تم جواب میں یہ کہہ سکتے ہو کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تمہاری قوم نے تمہیں جھٹلایا، تمہاری تکذیب کی تو ہم تم پر ایمان لائے اور ہم نے تمہاری تصدیق کی"۔ "میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو"۔ پھر فرمایا "یامعشر الانصار! تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب تمہیں تمہارے دشمنوں نے ہجرت پر مجبور کر دیا تو ہم نے تمہیں پناہ دی"۔ "میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو"۔ پھر حضورؐ نے فرمایا: "یامعشر الانصار! تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اے محمد

انتہائی خون ریز اور خوفناک جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور یہ دونوں قبیلے قریباً ختم ہوا چاہتے تھے اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف نہ لائے ہوتے۔ اسی کا ذکر ہے سورہ آلِ عمران میں بایں الفاظِ مبارکہ:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِنْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ط۔

(صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارا کوئی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ ہم نے اپنی جانیں دی ہیں، ہم نے اپنا خون بہایا ہے جس کی بدولت آپؐ کو یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔" اور میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پُرتاثیر خطبہ سے جب جذبات کی ایک خاص فضا پیدا ہوگئی تو آپؐ نے ایک بار پھر خطاب کا رُخ بدلا اور ارشاد فرمایا:

"یا معشر الانصار! کیا تمہیں یہ پسند اور منظور نہیں ہے کہ لوگ اونٹ بھیڑیں اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو واپس جائیں — اور تم محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھروں کو واپس لوٹو!!"

اس پر شدتِ جذبات سے تمام انصارؓ کی چیخیں نکل گئیں اور وہ سب بیک زبان پکار اُٹھے:

"رضینا۔ رضینا۔ رضینا" — ہم بالکل راضی ہیں (ہمیں نہ اُونٹ چاہئیں نہ بھیڑیں اور بکریاں۔ ہمیں تو صرف اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) درکار ہیں۔

مجمع میں اکثروں کا یہ عالم تھا کہ رونے روتے بے حال ہوگئے۔ آنسوؤں سے داڑھیاں تر ہوگئیں — اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارؓ کے سامنے حکمت بیان فرمائی کہ مکہ کے لوگ تازہ تازہ ایمان لائے ہیں ان کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ کسی ناحق جانبداری کی بنا پر نہیں دیا گیا ہے بلکہ تالیفِ قلب کے لیے دیا گیا ہے۔

اس انتہائی نازک اور پیچیدہ صورتِ حال پر غور کیجئے کہ یہ بالکل اتفاقیہ امر — INCIDENT) تھا کہ واقعتاً جن کی تالیف قلب کی گئی وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ والے تھے، بہت سے حضورؐ کے رشتہ دار تھے۔ لہٰذا ایسی صورتِ حال پیدا ہو جانا بالکل فطری تھا — لیکن فراستِ نبویؐ اور آپؐ کے حسنِ تدبیر نے کس خوبی سے اسے حل کیا! — اور میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ اسی زاویۂ نگاہ سے اسی حیثیت سے کرنے کی کوشش کریں اور واقعات پر غور کریں کہ دنیا میں کسی انقلابی جدوجہد میں جو بھی سخت مراحل آتے ہیں، جو بھی گھمبیر پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں،

اُن سب سے سابقہ پیش آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ بالفاظ دیگر کسی بھی انقلاب کے جو بھی اساسی تقاضے (PRE-REQUISITES) ہوتے ہیں وہ سب کے سب آپؐ کی انقلابی جدوجہد میں پورے کیے گئے تب وہ انقلاب برپا ہوا جو بلاشبہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا۔

اسیرانِ جنگ کی رہائی

مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد مسئلہ تھا اسیرانِ جنگ کی باقاعدہ تقسیم کا۔ یہ تمام افراد اس وقت تک جعرانہ میں محفوظ تھے۔ اصول کے مطابق ان کو لشکر میں شریک لوگوں میں تقسیم کرنا باقی تھا کہ ہوزان و ثقیف کی جانب سے ایک معزز سفارت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اسیرانِ جنگ کی رہائی کی درخواست پیش کی۔ رئیس سفارت نے کھڑے ہو کر حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا کہ " اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو عورتیں محبوس اور اسیر ہیں انہی میں تمہاری پھوپھیاں اور خالائیں بھی ہیں۔ تم نے ہمارے قبیلہ کی ایک خاتون کا دودھ پیا ہے۔ (مراد ہیں حضرت حلیمہ رضہ) لہٰذا ہم سب تمہارے قرابت دار ہیں۔ خدا کی قسم! اگر سلاطینِ عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو اُن سے بھی کچھ امیدیں وابستہ ہوتیں اور تم سے تو کہیں زیادہ توقعات ہیں"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ خاندانِ عبد المطلب کا جس قدر حصّہ ہوگا وہ میری طرف سے آزاد ہے۔ لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے مجمع میں یہ درخواست پیش کرو۔ چنانچہ نمازِ ظہر کے بعد رئیسِ سفارت نے یہ درخواست مجمع میں پیش کی۔ حضورؐ نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا " مجھے صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے جس کا حصّہ میں چھوڑتا ہوں اور تمام مسلمانوں سے بھی اسیران کی رہائی کی سفارش کرتا ہوں۔" مہاجرین و انصار اور دوسرے لوگ پکار اُٹھے " ہمارا حصّہ بھی حاضر ہے۔" چنانچہ اس طرح دفعتہً چھ ہزار اسیران آزاد ہو گئے۔

فتح مکّہ کے بعد پہلا حج ۸ھ

اب آیئے دوسرے چند اہم واقعات کی طرف — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تدبّر کو دیکھیے کہ اگرچہ ۸ھ میں حضورؐ مکّہ میں داخل ہوئے تھے ایک فاتح کی صورت

میں اور ایک فیصلہ کن انداز میں ــــ اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آپؐ نے تمام بتوں کو اس موقع پر پاش پاش کر دیا تھا۔ گویا: جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ کے وعدۂ الٰہی کا ظہور ہو چکا تھا۔ آپؐ کو یہ تو پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ قریش میں بالکل دم خم نہیں ہے کہ وہ اسلامی فوج کا مقابلہ کر سکیں ان کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے تو آپؐ نے صلح کی تجدید سے اعراض اختیار فرمایا تھا۔ لیکن فتح مکّہ کے بعد آپؐ نے یہ نہیں کیا کہ وہاں کے پورے نظام کو یکسر بدل دیا ہو۔ اس کے بالکل برعکس آپؐ نے وہ مختلف ذمّہ داریاں جو قریش کے مختلف خاندانوں کے سربراہوں کی تحویل میں تھیں، ان کو انہی کے سپرد رہنے دیا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں ــــ آپؐ نے وہاں کے انتظامی معاملات کو بالکل ڈسٹرب نہیں کیا، قطعی نہیں چھیڑا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اپنا کوئی امیرِ حج تک مقرر نہیں کیا کہ اب اس کی سرکردگی میں حج ہو گا۔ حالانکہ دو ماہ بعد حج ہونے والا تھا۔ بلکہ آپؐ نے نہایت نرم روش اختیار کی اور فتح مکّہ کے بعد ذی الحجہ ۸ھ میں جو پہلا حج آیا وہ پہلے ہی کی طرح مشرکین ہی کے زیرِ انتظام و اہتمام ہوا۔ اس میں صرف یہ فرق ہوا کہ مشرکین اپنے طور پر حج کر رہے تھے اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے امّتی موحّدین بھی اسلامی طریق پر حج کر رہے تھے۔

دوسرا حج ۹ھ

فتح مکّہ کے دوسرے سال ۹ھ میں جب حج کا موقع آیا تو اس میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مشرکین کی شرکت کی اجازت تو برقرار رکھی کہ وہ بھی حج کریں اور مسلمان بھی حج کریں گے۔ لیکن حج کے جملہ انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ خود تو تشریف نہیں لے گئے بلکہ آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیرِ حج بنا کر ان کے ہمراہ صحابہؓ کا ایک قافلہ حج کے لیے بھیج دیا۔ حج کے لیے قافلہ روانہ ہو چکا تھا کہ چند دنوں بعد ہی سورہ توبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں ــــ اور میرے نزدیک یہ چھ آیات دراصل اندرونِ عرب انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل کے اعلان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ درحقیقت جزیرہ نمائے عرب میں شرک کے قطعی اور مکمل قلع قمع کا آخری اقدام یہی ہے۔ جو ان آیات میں بیان ہوا۔ یہ آیات کیا ہیں! ان کے مطالعہ

سے قبل ایک وضاحت ضروری ہے۔

سورہ توبہ کے ساتھ بسم اللّٰہ کا نہ ہونا

یہ بات تو ہر وہ شخص جانتا ہے جو قرآن مجید سے کسی بھی نوع کا شغف اور تعلق رکھتا ہو، سورہ توبہ سے پہلے آیۂ بسم اللہ لکھی ہوئی نہیں ہے۔ قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے یہ واحد سورت ہے کہ جس کے آغاز میں نہ بسم اللہ لکھی جاتی ہے نہ پڑھی جاتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے!— بہت سے لوگوں نے مختلف توجیہات کی ہیں۔ اصل وجہ تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورہ کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھوائی۔ اس کے سوا کوئی دلیل ہے ہی نہیں— دلیل تو صرف حضورؐ کا فرمان ہے لیکن اس دلیل کی حکمت معلوم کرنے کے لیے' اس کی توجیہہ معلوم کرنے کے مختلف ہو سکتی ہیں تو حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ کی رائے یہ ہے' اور بڑی پیاری رائے ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ تلوار ہاتھ میں لے کر نازل ہوئی ہے۔ یہ مُخزیہ ہے، یہ مُشرّدہ ہے، یہ مقشقشہ ہے۔ یہ تو مشرکین کو فضیحت کرنے والی ہے۔ یہ ان کے لیے دنیا و آخرت کی رُسوائی کا اعلان کرنے والی ہے۔ یہ ان کے آخری استیصال اور بیخ کنی کا فرمان (EXTERMINATION PROCLAMATION) لے کر آئی ہے۔ یہ سورۃ تو تلوار بدست ہے لہٰذا اس کے آغاز میں بسم اللہ کیسے لکھی جائے جس میں اللہ کی صفتِ رحمت کی دو شانوں دو عظیم ترین اسمائے حسنیٰ، دو ارفع صفات یعنی رحمانیت اور رحیمیت کا ذکر ہے۔ آیت بسم اللہ تو رحمتِ الٰہی کا بہت عظیم خزانہ ہے— جبکہ اس سورۂ مبارکہ کے آغاز ہی میں اللہ تعالٰی کے غیظ و غضب اور انتقامی شان ظاہر ہو رہی ہے— لہٰذا یہ واحد سورۂ مبارکہ ہے' جس کے آغاز میں آیت بسم اللہ نہیں ہے۔

سورۂ توبہ کے ابتدائی چھ آیات کے مطالب و مفاہیم

اب آئیے— سورۂ توبہ کی ابتدائی چھ آیات اور ان کے مطالب و مفاہیم پر غور کریں۔ فرمایا: بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اعلان ہے لاتعلقی کا، بیزاری کا، براءت کا اللہ کی طرف سے اور

س کے رسولؐ کی طرف سے، ان سب مشرکین کے لیے جن سے (اے مسلمانو!) تم
ے معاہدہ کیا ہُوا ہے ۔" اس کی شرح بعد میں آئی ہے کہ جن مشرکین نے معاہدہ
شرائط اپنی طرف سے پوری کی ہیں، تم بھی اپنی طرف سے ان شرائط کو پورا کرو۔
ین اُس مدّت تک جس کے لیے معاہدہ ہُوا ہے ۔ اب کسی مشرک قبیلہ کے ساتھ
اہدہ کی تجدید (RENEWAL) نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اب انقلابِ محمدی علی
جبہا الصّلوٰۃ والسّلام کی تکمیل کا مرحلہ آگیا ہے۔ آگے فرمایا: فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ
بَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۔" تو اے مشرکو!
ں تمہارے لیے چار مہینے (مزید مہلت کے) ہیں جن میں تم لوگ اس سرزمین میں
ں پھرلو۔ اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے، شکست نہیں دے سکتے۔"
ونکہ یہ اشہرِ حرم ہیں، ان میں خونریزی ممنوع ہے، یہ حرمت والے مہینے ہیں
تہیں چار مہینوں کی مہلت ہے ۔ اور تم اللہ تعالیٰ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور تم
صورت دیکھ چکے ہو کہ: جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط إِنَّ الْبَاطِلَ
كَانَ زَهُوقًا ۝ باطل تو اب زائل ہو چکا ہے، اس کے لیے اب زوال مقدر
ہو چکا ہے۔ اسی آیت کا آخری ٹکڑا ہے: وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ ۝
در یہ کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو رُسوا اور ذلیل و خوار کر کے چھوڑے گا۔" اب تکمیل کا اعلان
ے جو تیسری آیت میں آ رہا ہے: وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۔" یہ اعلان
م ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے" إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ
مام نوعِ انسانی کی طرف سے حجِ اکبر کے دن۔"

حجِ اکبر کی صحیح نوعیت: یہاں ایک ضمنی بات بھی سمجھ لیجیے کہ 'حجِ اکبر' کے متعلق
رے یہاں ایک غلط تصور بیٹھ گیا ہے کہ جو حج جمعہ کے روز ہو، وہ 'حجِ اکبر' ہے۔
ںکل بے بنیاد اور غلط تصور ہے۔ حجِ اکبر درحقیقت حج ہی کو کہتے ہیں، اس لیے
عرب میں اسلام سے پہلے عمرہ کو حجِ اصغر کہا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں بھی قیامِ منیٰ، وقوف
فات، رمی جمرات اور قربانی کو چھوڑ کر دوسرے مناسک جو خالصتاً بیت اللہ سے
تعلق ہیں، جیسے احرام، طوافِ قدوم، سعی بین الصفا والمروہ، طوافِ وداع شامل
[illegible] عرفہ کا

جمعہ کے دن آجانا، اس کی کوئی خصوصی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن غلط العام کے طور پر یہ بات پھیل گئی ہے کہ وقوفِ عرفہ کا جمعہ کے دن آنا حجِ اکبر ہے۔

براءت کا اعلانِ عام: فرمایا: وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖٓ اِلَی النَّاسِ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ اَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ "اعلانِ عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کیلیے حجِ اکبر کے دن کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے بری الذمہ ہے (اُن سے اللہ اور اس کے رسول کا کوئی تعلق باقی نہیں ہے)"۔ آگے فرمایا: فَاِنْ تُبْتُمْ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ج "اب اگر تم توبہ کرو (یعنی اسلام قبول کرلو) تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے"۔ وَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰہِ "اور اے مشرکو! اب بھی تم نے روگردانی کی تو اچھی طرح جان لو کہ تم اللہ کو شکست نہیں دے سکتے۔ اُسے تم عاجز نہیں کرسکتے"۔ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ "اور ان کافروں کو اے نبی، آپ دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے"۔ یہاں تک تین آیات کا ہم نے مطالعہ ختم کیا۔ اب چوتھی آیت کے مضمون کا میں پہلے بھی حوالہ دے چکا ہوں۔ آیت اور اس کا ترجمہ سُن لیجئے:-

اِلَّا الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْکُمْ شَیْئًا وَّلَمْ یُظَاھِرُوْا عَلَیْکُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَیْھِمْ عَھْدَھُمْ اِلٰی مُدَّتِھِمْ ط اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۔ "سوائے اُن مشرکین کے جن سے تمہارے معاہدے ہیں پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں کوئی کمی کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا، تو ایسے لوگوں کے ساتھ جو تمہارا معاہدہ ہے تم اسے مدتِ معاہدہ تک وفا کرو بے شک اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے"۔ جیسا کہ عرض کرچکا ہوں کہ اس اسلوب میں یہ ہدایت مضمر ہے کہ اب اُن سے بھی معاہدہ کی تجدید نہیں ہوگی۔

عذابِ استیصال والی آیت: اب پانچویں آیت وہ آرہی ہے جو مشرکینِ عرب کے لیے عذابِ استیصال والی سخت ترین آیت ہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق اس سے سخت کوئی آیت قرآن مجید میں نہیں ہے۔ اس

اس سورۂ مبارکہ کی یہی آیت ہے جس میں تلوار ہاتھ میں لے کر اترنے والی شان
نمایاں نظر آتی ہے۔ فرمایا: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ " پس جب
حرمت والے یہ مہینے ختم ہو جائیں "۔ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْ
تُّمُوْهُمْ " تو قتل کرو ان مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ "۔ وَخُذُوْهُمْ " اور
ان کو پکڑ لو "۔ وَاحْصُرُوْهُمْ " ان کا محاصرہ کرو "۔ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ
كُلَّ مَرْصَدٍ " اور ان کو پکڑنے کے لیے، ان کی خوب خبر لینے کے لیے
ہر گھات میں بیٹھو "۔ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
" پھر اگر وہ توبہ کریں (یعنی ایمان لائیں) اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں "۔
فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ " تو ان کا راستہ چھوڑ دو "۔ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ " یقیناً اللہ غفور اور رحیم ہے "۔

اس آیت کا مفہوم

اب اس آیت کی IMPLICATION سمجھ لیجیے کہ اس سے مراد کیا ہے! اس کا مطلب
کیا ہے! پہلی بات تو یہ جان لیجیے کہ یہ آیت عام نہیں ہے۔ یہ دنیا کے تمام مشرکوں کے لیے
نہیں ہے۔ یہ صرف جزیرہ نمائے عرب کے اُن مشرکین کے لیے ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کی حیاتِ طیبہ میں وہاں آباد تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ صرف انہی کے لیے
کیوں ہے! تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن ہی میں سے تھے۔
اُن کی زبان میں قرآن نازل ہوا۔ اُن پر آخری درجہ میں اتمامِ حجت ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب بھی
اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں ــــ یہ بالکل وہی قانون
ہے کہ جس قانون کے تحت قومِ نوح غرق کی گئی۔ قوم ہود ہلاک کردی گئی۔ قومِ
صالح ہلاک کردی گئی۔ قومِ لوط ہلاک کردی گئی ــــ یعنی جس قوم کی طرف تعین کے
ساتھ رسول کو بھیج دیا جائے اور رسول دعوت و تبلیغ کے ذریعے اپنی قوم پر اتمامِ
حجت کر دے اور قوم اس کی بات کو نہ مانے تو وہ قوم کسی رعایت کی مستحق نہیں
رہتی اور اُسے اس دنیا میں نیست و نابود کر دیا جاتا ہے ــــ یہ کسی عام داعی کی
بات نہیں ہے، یہ رسول کی بات ہے۔ رسول تو اللہ تعالیٰ کی برہان بن کر مبعوث
ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے بیّنات لے کر آتا ہے۔ وہ اللہ کے حکم سے معجزات

دکھاتا ہے۔ اس پر اللہ کا کلام نازل ہوتا ہے کہ جس سے بڑی کوئی برہان اور ج
سے بڑی کوئی بیّنہ ممکن نہیں ہے۔ اب ان تمام باتوں کے بعد بھی لوگ ایمان نہیں لا
تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے اور یہ اللہ کا وہ غیر مبدّل قانون ہے جس
کے تحت پوری کی پوری قومیں ہلاک کردی گئی ہیں ۔ اور نقشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ
لَا یُریٰ اِلَّا مَسٰکِنُھُمْ — قوم ختم ہوگئی، مسکن رہ گئے، کھنڈرات رہ گ
مکان نظر آ رہے ہیں، مکین نظر نہیں آ رہے۔ مختلف قوموں پر عذابِ استیصال
مختلف صورتوں میں ہوا ہے — کہیں ایسا ہوا ہے کہ ایک عالمگیر طوفان کا سیلا
لاکر پوری کی پوری قوم کو غرق کر دیا، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے سا
ہوا۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ قوم کے چیدہ چیدہ لوگوں کو نکال کر سمندر میں غرق کر د
جیسے آلِ فرعون کے ساتھ ہوا۔ کہیں ایسا ہوا کہ منکرین کی بستیوں ہی میں عذا
آیا۔ کہیں زلزلہ آگیا، کہیں پتھراؤ آ گیا۔ کہیں حاصب بھیج دی گئیں۔ کہیں بستو
کو اٹھا کر پلٹ دیا گیا۔ کہیں ایک چنگھاڑ اور گرج ایسی بھیج دی کہ جس کو سُن کر بستی
پر بستیاں ختم ہوگئیں — تو عذابِ استیصال کی یہ مختلف صورتیں رہی ہیں۔

حضورؐ کی دو بعثتیں : آگے بڑھنے سے قبل یہ سمجھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ
کی بعثتیں دو ہیں۔ ایک بعثت خصوصی الی اہل العرب — وہ ہے بنی اسمٰعیل
طرف — جن میں سے نبی اکرم خود تھے — جن کی زبان میں حضورؐ پر اللہ کا کلام نا
ہوا — دوسری بعثت عمومی ہے اِلَی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ (یعنی پوری نوعِ انسانی
طرف) وہ اس وقت زیرِ گفتگو نہیں — البتہ جن کی طرف رسول اللہ صلی اللہ
کی بعثتِ خصوصی ہے تو ان پر دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت، انذار و تبشیر تذ
وصیت کے ذریعے سے حضورؐ رسالت کی تمام ذمہ داریاں بنفسِ نفیس ادا فرما چکے
ہیں۔ اس طرح ان پر اتمامِ حجت کیا جا چکا ہے لہٰذا ان کے لیے اب رعایت
کوئی سوال نہیں — ان پر جو عذاب آیا ہے اس کی پہلی قسط وہ تھی جو غزوۂ
کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جہاں ان کے بڑے بڑے سردار جیسا کہ میں نے پہلے
بھی عرض کیا تھا کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی مانند پڑے ہوئے تھے۔ انہی
ابوجہل ہے، عتبہ ابنِ ربیعہ ہے، عقبہ ابن ابی معیط ہے، انہی میں عتبہ ابن

بھائی اور بیٹا بھی ہے ۔ الغرض ان کے اکثر نامی گرامی سردار اس غزوہ میں
یت رہے تھے ۔ اسی طرح انہی میں نضر ابن حارث بھی تھا جو پکڑا گیا تھا ، بعد میں حضورؐ
قتل کرایا تھا ۔ پھر مختلف غزوات میں بہت سے صنادید مشرکین بتدریج اس
س دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں مقتول ہو کر واصلِ جہنم ہوتے رہے ۔
مل قلع قمع کا مرحلہ : اب ان آیات میں درحقیقت عرب سے شرک کے مکمل
اتمہ اور قلع قمع (MOPPING UP OPERATION) کا اعلانِ عام ہے کہ اب
لِ عرب کے مشرکین کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے ، اب کوئی نئی صلح نہیں ہو گی ۔
صلح پہلے سے ہو چکی ہیں ، ان میں سے کسی کی بھی مدت ختم ہو جانے کے بعد آئندہ
بدید نہیں ہو گی ۔ کسی نے صلح توڑ دی ، معاہدہ کی خلاف ورزی کی تو وہ اسی وقت ختم
ر کالعدم ہو جائے گی ۔ پھر یہ کہ چار مہینے گزرنے کے بعد پورے عرب کے اندر مشرکین کا قتل
م شروع ہو جائے گا ۔ کسی کی رو رعایت نہیں کی جائے گی ۔ کسی کی جان بخشی نہیں کی جائے گی ۔
وائے اس کے جو ایمان لے آئے ۔ دل کا حال اللہ جانتا ہے ۔ اس کا حساب وہ عزّوجل
ے گا ۔ یہاں اُسے اپنے ایمان کا اقرار و اعلان کرنا ہو گا ۔ کلمۂ شہادت ادا
رنا ہو گا ۔ نماز قائم کرنی ہو گی ۔ زکوٰۃ ادا کرنی ہو گی ۔ جو بھی ان شرائط کو پورا کر
ے گا اس کا راستہ چھوڑ دیا جائے گا یعنی جو لوگ نظامِ اسلام کو قبول کر لیں ،
ور مسلم ہو جائیں ، ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی ۔ باقی رہا یہ معاملہ
ہ اُن کے دلوں میں ایمان داخل ہُوا یا نہیں ہُوا اس کا فیصلہ اللہ کرے گا ۔
جیسا کہ عرض کیا کہ دلوں کا حال اس عَلِیۡمٌ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ کو ہے ۔ چنانچہ اسی
ضمون پر مشتمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی پیاری حدیث ہے جو
ضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا :

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ	" مجھے (اللہ کی طرف سے) یہ حکم دیا
النَّاسَ حَتّٰی یَشْھَدُوْا	گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں
اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ	حتیٰ کہ وہ شہادت دیں : لا الٰہ
وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ	اللہ محمد رسول اللہ ۔ اور نماز قائم
وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ	کریں اور زکوٰۃ ادا کریں پس جب

يؤتوا الزكوٰة فاذا فعلوا ذالك عصموا مني دماءهم واموالهم الا بحق الاسلام وحسابهم على الله عزّ وجلّ

دیں۔ پھر اگر یہ کام کریں تو وہ مجھ سے اپنے خون اور اپنے اموال بچالیں گے سوائے اس کے کہ اسلام کے حق میں ہو۔ اور (باقی رہا) اُن کا حساب، وہ اللہ کے ذمے ہے۔"

(متفق علیہ)

"معلوم ہوا کہ مشرکین کے لیے جان بخشی کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں تھی کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔

دورِ صدیقی کا ایک اہم واقعہ: ضمنی طور پر میں دورِ صدیقی کا وہ اہم واقعہ بھی یہاں بیان کر دیتا ہوں جو درحقیقت اسی حدیث سے متعلق ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب بعض قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے اور بعض نے مرکزی بیت المال کو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا۔ یہ دونوں گروہ "مانعین زکوٰۃ" کے نام سے اسلامی تاریخ میں موسوم کیے جاتے ہیں۔ تو خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان دونوں گروہوں سے قتال کا فیصلہ کیا۔ اس پر کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشورہ دیا کہ آپ بیک وقت تین تین محاذ مت کھولیے۔ ایک طرف تو جھوٹے مدعیانِ نبوت کھڑے ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف آپ رضی اللہ عنہ بعض کبار صحابہ کے مشورہ کے باوجود اس لشکر کو روکنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوئے اور اسے روانہ کر دیا جو حضور ﷺ نے حضرت اُسامہ کی سرکردگی میں شام کی سرحدوں تک جانے کے لیے تیار کیا تھا جہاں قیصرِ روم کی حملہ کی تیاری تھی تو یہ دو محاذ پہلے سے قائم ہیں۔ اب آپ یہ تیسرا محاذ مانعین زکوٰۃ کے خلاف کھولنا چاہ رہے ہیں۔ حالانکہ وہ کلمۂ شہادت بھی ادا کر رہے ہیں۔ نماز بھی پڑھ رہے ہیں۔ کچھ لوگ زکوٰۃ کی ادائیگی سے بالکل انکاری ہیں تو کچھ لوگ زکوٰۃ تو ادا کرنا چاہتے ہیں لیکن مرکز کو دینا نہیں چاہتے تو ان لوگوں کے خلاف اس وقت محاذ کھولنا مصلحت کے خلاف ہے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف کے حق میں جو استدلال کیا تھا تو وہ اسی حدیث سے کیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جنگ کے خاتمے کے لیے کم سے کم یہ تین شرائط بیان کی ہیں: "حتّٰی یشہدوا ان لا الٰہ الّا اللہ

نَّ محمّد ارسول اللہ و یقیمو الصّلوٰۃ و یؤتو الزکوٰۃ"

میں کون ہوتا ہوں ان شرائط سے کمتر پر صلح کرنے والا! ـــ یہ ہے وہ انتہائی

ب جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے تھا کہ کسی معاملہ

پر مُو فرق کرنے کے لیے آں جناب رض آمادہ نہیں تھے۔

چنانچہ یہی تین شرائط ہیں جو سورۃ توبہ کی زیرِ نظر آیت میں بیان کی گئیں اس

ق کے ساتھ کہ کلمۂ شہادت کی تعبیر توبہ سے کی گئی ہے فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا

الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ ـ پھر اگر وہ

برلیں یعنی ایمان لے آئیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو ان

جانے دو، اب ان کے مال اور ان کی جانیں محفوظ ہو گئیں ـــ باقی رہا یہ معاملہ کہ وہ

ل سے ایمان لائے تھے یا نہیں لائے تھے تو اس کا حساب اللہ تعالیٰ خود لے لے گا

ر یہ اس کی شان غفاری و رحیمی ہے کہ وہ ان تین شرائط کو پورا کرنے کے بعد

عذابِ استیصال سے محفوظ کر دیئے جائیں گے۔ خواہ وہ محض جان و مال بچانے

کے لیے ایمان لانے کا اقرار ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

مشرکین مکّہ کے بارے میں قرآن مجید کی یہ وہ سخت ترین آیات ہیں کہ جن کی

وجہ سے حضرت علی رض نے سورۃ توبہ کے متعلق یہ فرمایا کہ یہ سورہ مبارکہ تلوار ہاتھ

میں لے کر نازل ہوئی ہے ـــ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ الفاظ ہی بول رہے

ہیں: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْھُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ

وَجَدْتُّمُوْھُمْ وَخُذُوْھُمْ وَاحْصُرُوْھُمْ وَاقْعُدُوْا

لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ ۚ جیسے ہی حرمت والے مہینے ختم ہوں، مشرکین کو

جہاں پاؤ ان کو قتل کر دو، انہیں پکڑو اور اُن کا گھیراؤ کرو اور ان کے لیے ہر جگہ

گھات لگا کر بیٹھو۔

قتلِ عام کی نوبت نہیں آئی: میں یہ عرض کر دوں کہ اس کی نوبت عملاً آئی نہیں۔

کسی قسم کی کوئی خونریزی نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ اُن چار مہینوں کے اختتام پر مشرکین عرب

میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اسلام نہ لے آیا ہو۔ گنتی کے چند افراد کے بارے میں یہ صراحت

ملتی ہے کہ وہ آخر وقت تک کفر پر قائم رہے لیکن ایسے لوگ معیّن وقت ختم ہونے سے

پہلے ہی سرزمینِ عرب کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ چنانچہ کوئی حبشہ چلا گیا اور کسی نے شام یا مصر میں پناہ لی ۔۔۔ بہرحال خونریزی کا مرحلہ آیا نہیں۔ لیکن اصل میں اس اعلان کی حیثیت جزیرہ نمائے عرب سے کفر و شرک کے استیصال (MOPPING UP OPERATION) کی ہے کہ اگر اہلِ عرب بنی اسمٰعیل میں سے کوئی بھی انکار کرتا تو اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔ رہا دوسرے غیر عرب کفار کا معاملہ! تو اس میں فرق ہے جو میں آگے بیان کروں گا ۔۔۔ البتہ یہاں میں ایک اہم واقعہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں جس کے نتیجہ میں نظم کی اہمیت آپ کے سامنے آجائے گی۔

نظم کی اہمیت ' ایک اہم واقعہ

میں ان تقاریر میں یہ بات تفصیل سے بیان کرتا رہا ہوں کہ انقلاب کی لازمی شرائط (PRE-REQUISITES) میں سے ایک اہم شرط ایک منظم (DISCIPLINED) جماعت کا قیام بھی ہے ۔۔۔ اِس واقعہ کے ذریعہ سے اُس نظم کا نقشہ آپ کے سامنے آئے گا جو تربیت و تزکیۂ نبوی ؐ کے نتیجہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں راسخ ہو چکا تھا۔

وہ واقعہ یوں ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو اس سے پہلے حج کے لیے قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیرِ حج مقرر فرمایا تھا۔ اب ان آیات کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ روانہ فرمایا اور آں جنابؓ کو یہ ذمہ داری سپرد کی کہ حج کے موقع پر عرفات کے میدان میں جب کہ پورے عرب کے کونے کونے سے کھنچ کر لوگ وہاں جمع ہوں گے، جن میں مشرکین بھی ہوں گے، تو اُس مجمع میں یہ آیات میرے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے کھڑے ہو کر سنا دینا تاکہ تمام اہلِ عرب کو معلوم ہو جائے کہ اشہرِ حرم کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے مشرکینِ عرب، بنی اسماعیل سے کیا معاملہ ہوگا! ۔۔۔ یہ چھ آیات اور نبی اکرم ؐ کی طرف سے تفویض کردہ یہ ذمہ داری لے کر حضرت علیؓ روانہ ہو گئے۔ اور راستہ ہی میں قافلۂ حج کو جا لیا۔ جب وہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے پاس پہنچے تو حضرت ابوبکر رضؓ نے سلام و دعا کے بعد جو پہلا سوال کیا وہ نوٹ کر لیجیے۔ انہوں نے دریافت فرمایا: امیرٌ او مامورٌ ...

بات واضح کردیجئے کہ رسول اللہ نے آپؓ کو امیر بنا کر بھیجا ہے یا مامور بنا کر۔
سی اسلامی جماعت میں کسی بھی فرد کے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو وہ خود صاحب
مرینی امیر ہوگا بصورت دیگر کسی امیر کے تابع یعنی مامور ہوگا ـــــ اسی طرح یہاں
کیئے کہ حضرت ابوبکرؓ پوچھتے ہیں کہ امیرٌ او مأمورٌ! ـــ یعنی ایک
شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضورؐ نے آپؓ کو امیر بنا دیا ہو تو آپ ہی چارج سنبھال لیجئے۔
پنی پوزیشن میں آیئے تاکہ مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میں اب مامور ہوں اور میں آپ کے
احکم سنوں اور مانوں ـــ اور اگر دوسری صورت ہے کہ میں ہی امیر حج ہوں اور
آپؓ مامور ہیں تو یہ پوزیشن واضح ہو جانی چاہیئے ـــ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
جواب میں فوراً فرماتے ہیں: مأمورٌ ـــ میں امیر بن کر نہیں آیا میں مامور
ہی ہوں۔ اس قافلۂ حج کے امیر آپؓ ہی ہیں۔ البتہ رسول اللہؐ نے میرے ذمہ یہ کام
سپرد کیا ہے کہ آپؓ کی روانگی کے بعد جو چھ آیات نازل ہوئی ہیں، ان آیات کا
اعلانِ عام حج کے مجمع میں حضورؐ کے نمائندہ کی حیثیت سے کر دوں۔ یہ سوال کیا
جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ ہی بحیثیت امیر قافلہ حضورؐ کی جانب اعلان فرما
سکتے تھے تو یہ ذمہ داری خصوصیت کے ساتھ حضرت علیؓ کے سپرد کیوں کی گئی
اس کی وجہ سمجھ لیجئے ـــ عرب میں دستور تھا کہ کوئی اہم اور خاص اعلان کسی قبیلہ کے
سردار کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی قریب ترین عزیز ہی کیا کرتا تھا جو اسی قبیلہ
سے تعلق بھی رکھتا ہو ایسی صورت میں اس اعلان کی اہمیت مسلم ہوتی تھی ورنہ
رشتہ داری کے اعتبار سے حضرتِ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورؐ کے خسر تھے۔
لیکن آپؓ بنو ہاشم سے نہیں تھے۔ جبکہ ابھی تک قبائلی نظام بڑی حد تک باقی،
(INTACT) تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ چونکہ آپ کے قریب ترین عزیز بھی تھے۔ اور
قبیلہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ ذمہ داری حضرت علیؓ کے سپرد کی گئی۔
ایک رعایت: اس کے بعد چھٹی آیت میں مشرکین کے لیے ایک رعایت کا ذکر
ہے۔ فرمایا:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى — "(اے نبیؐ) اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے پناہ مانگ کر تمہارے پاس

يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ۝

آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اُسے پناہ دے دیجیے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے مامن یعنی مستقل قیام گاہ تک پہنچا دیجیے۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے یعنی ان کو اسلام کے پیغام کی پوری واقفیت نہیں ہے۔"

آیتِ مبارکہ کے ترجمہ ہی سے پوری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ مہلت کے چار مہینوں کے اندر کوئی مشرک دین کو جاننے اور سمجھنے کے لیے پناہ طلب کرے تو اُسے پناہ دی جائے، اُسے دین سمجھایا جائے، اگر اس کام میں چار ماہ کی مدت ختم ہو جائے اور وہ ایمان نہ لائے تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اُسے اس کی قیام گاہ تک پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں پہنچ کر وہ جو فیصلہ کرے اس کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔ ایمان لے آئے چھوڑ دیا جائے گا۔ ترکِ وطن کرنا چاہے تو راستہ روکا نہیں جائے گا۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس کے لیے قابلِ قبول نہ ہو تو اب وہ واجب القتل ہوگا ـــــ یہاں ایک اہم بات سورہ توبہ کی ترتیب کے بارے میں عرض کر دوں۔ بات ضمنی ہے اور موضوعِ زیرِ گفتگو یعنی 'اسلامی انقلاب کے مراحل' سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے تاہم اس سورہ مبارکہ کی تفہیم کے لیے ضروری ہے۔ اس سورہ مبارکہ کے ابتدائی پانچ رکوع اُس دور یعنی ۹ھ کے واقعات و حالات کے سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں۔ ویسے یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اس حصہ کو قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات میں سمجھا جاتا ہے اس لیے کہ اس کی ترتیب میں خاصا الجھاؤ ہے۔ چنانچہ معاملہ یہ ہے کہ اس سورۃ مبارکہ کی دوسرے اور تیسرے رکوع کی آیات زمانی اعتبار سے پہلے نازل ہوئی ہیں جبکہ پہلے رکوع کی آیات بعد میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن اہمیت کے پیشِ نظر ان کو پہلے رکھا گیا ہے۔ پھر چوتھے اور پانچویں رکوع کی آیات اپنے مضمون کے اعتبار سے پہلے رکوع کی آیات کے ساتھ مسلسل اور متصل ہیں ـــــ جن لوگوں کے سامنے یہ ترتیب واضح نہیں ہوتی وہ چکر میں پڑ جاتے ہیں کہ واقعات و حالات کی یہ ترتیب کس اعتبار سے آرہی ہے!

مشرکین کے لیے بیت اللہ میں داخلہ کی ممانعت: مشرکین کے لیے

،مندہ حج کرنے اور بیت الحرام میں داخل ہونے کی ممانعت کا حکم پہلے نازل ہو چکا
تھا جو تیسرے رکوع میں آپ کو ملے گا۔ وہاں فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا — "اے اہلِ ایمان، یہ مشرکین باطنی
إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ — نجاست میں مبتلا ہیں، لہٰذا اس
فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ — سال کے بعد یہ مسجدِ حرام کے قریب
بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا — نہ پھٹکنے پائیں" (آیت ۱۲۸ ابتدائی حصہ)

بیت اللہ کی تطہیر اب مکمل ہو گئی۔ لہٰذا آئندہ مشرکین کو حج کی اجازت نہیں ہوگی
وہ حرم شریف میں داخل ہو سکیں گے۔

میں انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے اس مرحلہ کو MOPPING UP OPERATION سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جب ہر نوع کی مزاحمت و رکاوٹ (RESISTANCE) ختم کر کے اور آخری وارننگ دے کر جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل کر دی گئی۔ اس بات کا اشارہ سورۃ المائدہ کی اس آیت مبارکہ میں بھی ملتا ہے۔

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ط (المائدہ: ۳)

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

یہ وہ آیتِ مبارکہ ہے جس کے متعلق یہودی بڑی حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ اگر اس مفہوم کی کوئی آیت ہمیں عطا ہو جاتی تو ہم اس کے یومِ نزول کو اپنی سالانہ عید کے طور پر مناتے۔

سورۃ المائدہ کی یہ آیت نہایت اہم، عظیم اور مہتم بالشان مطالب و مفاہیم کی حامل ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ اس آیت میں تکمیلِ دین کا اعلان ہے۔ یعنی نوعِ انسانی کو ایک ایسا مستقل اور بھرپور نظامِ زندگی عطا کر دیا گیا ہے کہ جس میں قیامت تک کے لیے بنی نوع انسان کے جملہ انفرادی و اجتما

مسائل کا نہایت معتدل تفصیل یا اصول حل موجود ہے۔ پھر اسی آیت میں اِتمامِ نعمت کا اعلان بھی ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ دین کمل ہو گیا بلکہ نعمت کی تکمیل بھی ہو گئی۔ اس نعمت سے یہاں مراد ہے سلسلۂ وحی اور نبوّت و رسالت۔ نبوّت و رسالت کا بنیادی مقصد لوگوں تک اللہ کے دین کو پہنچانا اور اپنے قول و فعل سے لوگوں پر حجت قائم کرنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس یہ کام کر کے دکھایا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دین کو بالفعل غالب فرما کر گویا اتمامِ حجت کا حق ادا کر دیا۔ اور اس طرح سلسلۂ نبوّت و رسالت بھی اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ اور اب چونکہ اللہ کا آخری اور مکمل پیغام بنی نوعِ انسان تک پہنچ گیا تھا اور اب اس آخری وحی کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ نے لے لیا تھا اور دوسری جانب حضور کی ذات میں سلسلۂ رسالت بھی اپنے کمال کو پہنچ چکا تھا اور اس میں مزید کسی اضافے (IMPROVEMENT) کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا سلسلۂ وحی اور نبوّت و رسالت کو اب ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔۔ اس پہلو سے یہ آیت اِتمام و اختتامِ نبوّت و رسالت پر بھی دلالت کرتی ہے۔

انقلابِ محمدیؐ کی تکمیل

فتح مکہ اور معرکہ حنین و اوطاس نیز محاصرۂ طائف کے بعد۔۔ بعد میں اہلِ طائف خود ہی مطیع ہو کر مشرف با اسلام ہو گئے تھے ۔۔۔ اسلامی انقلاب کی تکمیل ہو چکی تھی اور نقشہ یہ ہو گیا تھا کہ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دین اللہ دوسرے تمام باطل نظام ہائے حیات پر غالب و حکمران ہو گیا تھا۔

۔۔۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔ عرب کے جن قبائل نے اس وقت اسلام قبول نہیں کیا تھا ان میں مشاورتیں منعقد ہوئیں اور مدینہ کی طرف ان کے وفود کا تانتا بندھ گیا۔ ہر روز کسی نہ کسی قبیلہ کا وفد آتا، سرِ اطاعت خم کرتا اور اسلام قبول کر لیتا تھا۔ گویا کہ اسلام کے خلاف مزاحم قوتوں کا بڑی تیزی سے خاتمہ ہوتا جا رہا تھا ۔۔ اسلام کا اصل مفہوم ہے فرمانبرداری و اطاعت قبول کرنا۔ فارسی میں اس مفہوم کو "گردن نہادن" سے اور انگریزی میں "TO GIVE UP RESISTANCE" اور "TO SURRENDER" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کیفیت کو سورہ

النصر میں یوں بیان کیا گیا ہے :

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ ۝ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۝

"جب پہنچ چکی اللہ کی مدد اور (حاصل ہوگئی) فتح تو تم نے دیکھا لوگوں کو اللہ کے دین میں داخل ہوتے فوج در فوج ۔"

اِس طرح جزیرہ نمائے عرب میں بسنے والے تمام عرب دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے ـــــ انقلاب کے اُن چھ کے چھ مراحل سے گزرنے کے بعد انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کی تکمیل ہوگئی ۔ جن کا ذکر تفصیل سے گزشتہ تقاریر میں آچکا ہے ۔

غیر عرب منکرین و کفّار کا معاملہ

اب آئیے اِس مسئلہ کی طرف جسے مَیں نے مؤخر کیا تھا کہ اندرون جزیرہ نمائے عرب جو غیر اسماعیلی آباد تھے ، ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ـــ آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہ لوگ کون تھے ! یہ یہود اور نصاریٰ تھے ـــ یہ بنی اسماعیل میں سے نہیں تھے ۔ اِس طرح حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہم نسل نہیں تھے ۔ حضرت اسحاق علیہ السّلام جو حضرت اسماعیل علیہ السّلام کے چھوٹے بھائی تھے ، ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السّلام ہے جن کا لقب اسرائیل تھا ، جو نسل چلی وہ اسرائیلی یا بنی اسرائیل کہلائی ۔ یہود و نصاریٰ اسی نسل سے تھے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر جا کر یہ دونوں نسلیں مل جاتی ہیں ۔ لیکن چونکہ اسی وقت سے حضرتِ اسماعیل اور حضرتِ اسحاق علیہما السّلام کی رہائش گاہوں میں اتنا بُعدِ مکانی تھا کہ جس کے باعث علاحدہ علاحدہ دو نسلوں کی حیثیت سے ان کی ذرّیت پھیلی ۔ لہٰذا اسی دور سے یہ جدا جدا نسلیں شمار ہوتی چلی آرہی ہیں ـــ پھر بنی اسرائیل کے پاس پہلے سے آسمانی کتابیں اور صحیفے موجود تھے ۔ یہود کے پاس شریعت کا ایک ڈھانچہ بھی موجود تھا ۔ چاہے ان چیزوں میں تحریف ہو چکی تھی لیکن بہرحال وہ اہلِ کتاب تھے ۔ اور قرآن مجید نے ان کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے لہٰذا ان کی کیٹگری کو علاحدہ رکھا گیا اور ان کے متعلق سورۂ توبہ کی آیت ۲۹ میں احکامات آگئے ۔ فرمایا :

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ	(اے مسلمانو!) قتال کرو اہلِ کتاب
بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	میں سے اُن لوگوں سے جو نہ اللہ کو
وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا	مانتے ہیں (جیسا کہ اُس کے ماننے کا
حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ	حق ہے) اور نہ روزِ آخرت کو اور
وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ	نہ اُن چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	اللہ اور اُس کے رسول نے حرام کیا
حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ	اور نہ دینِ حق (اسلام) کو قبول
عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝	کرتے ہیں ۔ اُن سے جنگ کرو

یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

بنی اسماعیل کے لیے تو دو اختیارات میں سے ایک کو قبول کرنا تھا کہ یا ایمان لائیں یا قتل ہونے کے لیے تیار رہیں۔ تیسرا اختیار (OPTION) اس کے نتیجہ میں آپ سے آپ بن گیا تھا کہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں، دفع ہو جائیں۔ عرب میں رہتے ہوئے کوئی تیسرا OPTION ان کے لیے نہیں تھا۔ عرب میں کسی نوع کی غیر اللہ کی پرستش نہیں ہو سکتی چاہے وہ اصنام پرستی ہو، چاہے مظاہرِ قدرت کی لیکن بنی اسرائیل کے ساتھ معاملہ مختلف رکھا گیا۔ انہیں رعایت دی گئی اور اُن کے سامنے تین صورتیں رکھی گئیں۔ پہلی یہی کہ ایمان لے آؤ تو ہمارے برابر کے بھائی ہو، کوئی مغائرت باقی نہیں رہے گی۔ حقوق و فرائض میں سب مکمل طور پر مساوی ہوں گے۔ یہ منظور نہیں تو دوسری صورت یہ ہے کہ چھوٹے بن کر رہو۔ دینِ حق کے غلبہ کو تسلیم کرو، نظامِ اجتماعی (LAW OF THE LAND) اللہ کے دین کے مطابق نافذ و رائج ہوگا اور تمہیں اس کی اطاعت کرنی ہوگی اور اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ دینُ اللہ کے تحت تم یہودی یا عیسائی ہو کر رہ سکتے ہو۔ تمہارے احوالِ شخصیہ (PERSONAL LAW) میں اسلامی حکومت کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اس کی اجازت ہے۔[1] لیکن تم چھوٹے بن کر اور جزیہ ادا کر کے اسلامی حکومت کے تحت رہ سکتے ہو۔ اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو پھر تیسری صورت قتال کی ہے۔ اس کے سوا چوتھی شکل کوئی اور نہیں

---

[1] یہ بات سورہ بقرہ میں بایں الفاظ پہلے ہی فرما دی گئی تھی کہ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

ی بیں از خود یہ بات بھی مضمر ہے کہ اسلامی حکومت کے حیطۂ اختیار سے نکل کر
ہیں اور جگہ جا کر آباد ہو سکتے ہو۔
بین الاقوامی مرحلہ : اصل میں یہی وہ آیت جو بین الاقوامی مرحلہ میں بنیاد بنی ہے کہ
بعد میں خلافتِ راشدہ کے دوران جب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی
جلیں اعلائے کلمۃ اللہ اور اظہارِ دین الحق کے لیے نکلی ہیں تو وہ صلیبۃ یہی تین شرائط
(OPTIONS) پیش کرتے تھے۔ ایمان لے آؤ تم ہمارے برابر کے بھائی ہو گے
ہماری تمام املاک جوں کی توں تمہاری ملک میں رہیں گی، ہم کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں
گے۔ ہمارا تمہارا معاملہ ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے بالکل مساوی ہو جائے گا۔ اگر
یہ منظور نہیں کرتے تو تمہیں چھوٹے بن کر رہنا پڑے گا۔ غالب دین اللہ کا ہو گا۔
حکومت اللہ کی ہو گی۔ تم ماتحت رہ کر اور جزیہ دے کر خواہ عیسائی بن کر رہو۔
یہودی رہو، مجوسی رہو، ہندو رہو، سکھ رہو۔ جو چاہو رہو اس کی اجازت
ہو گی۔ تمہارے احوالِ شخصیہ میں اسلامی حکومت قطعی کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔
لیکن تمہیں چھوٹے ہو کر اور اللہ کے دین کو بحیثیتِ نظامِ اجتماعی ذہناً قبول کر کے اسلامی
حکومت میں رہنے کی اجازت ہو گی۔ لاء آف دی لینڈ اسلام ہی ہو گا۔ اگر یہ دونوں
تیں تمہارے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں تو قتال کے لیے میدان میں آؤ۔ تلوار ہمارے
اور تمہارے مابین فیصلہ کر دے گی۔ چوتھی کوئی شکل نہیں ہے۔ تو یہ شرائط درحقیقت
ی آیتِ مبارکہ پر مبنی ہیں کہ

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا
يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ
صٰغِرُوْنَ ٥ (سورۃ توبہ، آیت ۲۹)

اسی آیتِ مبارکہ سے درحقیقت ہماری گفتگو کا تعلق انقلابِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ
والسلام کے بین الاقوامی مرحلہ (INTERNATIONAL PHASE) سے قائم ہوتا
ہے جس کے بارے میں ان شاء اللہ تعالیٰ اگلے جمعہ میں گفتگو ہو گی۔ (جاری ہے)

۱۔۲۔۳

تواضع کے بہتر آداب
-آپ کا بہترین انتخاب
حلوہ جوزی
Freshwel
KARACHI
HALWA
RASGULLA

سفر لندن ——— آخری قسط ——— ارشاد احمد حقانی

بنگلہ دیش کی جدوجہد آزادی کے ایک ہیرو سے گفتگو

روزنامہ جنگ لاہور

س: پندرہ سال گزرنے کے بعد اب آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ نے بنگلہ دیش کی آزادی کے
ئے جو جدوجہد کی، وہ اس وقت ایک درست کارروائی تھی!

جلیل: اس جنگ میں جو کچھ میں نے کیا وہ نیک نیتی اور اخلاص سے کیا گیا۔ ہمیں ان سازشوں کا پتہ
ین تھا جو پس پردہ کی جا رہی تھیں۔ ہم سپاہی تھے اور سپاہی جو کام کرتا ہے، اخلاص سے کرتا ہے۔ ہم نے جو
ریا مخلصانہ کیا، لیکن پردہ کے پیچھے کیا تھا، اس کا ہمیں علم نہ تھا۔ ہندوستان تو ۱۹۴۷ء سے ہی پاکستان
توڑنا چاہتا تھا۔ انہوں نے کبھی پاکستان کے وجود اور مسلمانوں کے تشخص کو تسلیم نہیں کیا تھا اور جونہی مجیب
عوامی لیگ نے انہیں موقع دیا، انہوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ ہمارے دل میں پاکستان کے عوام
ے خلاف کوئی جذبات نہیں ہیں۔ آپ انہیں الزام نہیں دے سکتے۔ وہ ان تکلیف دہ حالات میں شامل
ہنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ میرے نزدیک پاکستان زمین کا ایک ٹکڑا نہیں تھا۔ یہ ایک تصور کا نام تھا ایک
ذہب کا نام تھا جس کا مقصد مسلمانوں کے لئے ایک ریاست قائم کرنا تھا۔ پنجابیوں، بنگالیوں یا پٹھانوں
کے لئے نہیں بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے۔ اگر ہم پاکستان کو ایک تصور، ایک تحریک سمجھیں، تو یہ آج بھی
وجود ہے، لیکن اگر محض زمین کا ایک ٹکڑا سمجھا جائے، تو یہ ٹوٹ چکا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ تصور ٹوٹ چکا
ہے۔ مسلمان ایک قوم، ایک ملت ہیں اور انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ ہم کہیں بھی ہوں۔ اگر ہمارے
ل لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے جذبہ سے سرشار ہیں تو ہم ہر جگہ ایک ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اسلام کی
علیمات پر عمل کرنا چاہیئے۔

س: آپ یہ بتائیے کہ جب آپ غیر سیاسی آدمی ہونے کے باوجود لڑائی میں شامل ہوئے تو
پ کے محرکات کیا تھے اور آپ نے ملک کو تقسیم کرنے کی جدوجہد کی حمایت کیوں کی! اس وقت آپ
ی سوچ کے عناصر ترکیبی کیا تھے!

جلیل: دیکھئے تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ پاکستان کے حکام غلطی
کرتے اور ہمارے خلاف طاقت استعمال نہ کرتے تو اس میں کیا ضرورت تھی کہ ہم ان کے خلاف اٹھ
کھڑے ہوتے۔ عوامی لیگ نے کچھ غلط کیا تھا، اسے سزا دی جا سکتی تھی۔ لیکن مارچ ۷۱ء میں جو جاری

الیکشن ہوا، اس میں بے گناہ لوگ بھی ملوث ہو گئے۔ اس نے ہم جیسے لوگوں کو آمادۂ عمل کر دیا۔

س: اس وقت صرف عوامی لیگ کو کس طرح سزا دی جاسکتی تھی، اس وقت تو عام لوگ ان کے ساتھ تھے اور امتیاز کرنا آسان نہ تھا۔

جلیل: دیکھیے اگر آپ تفصیلات میں جائیں تو میں عرض کروں گا کہ چونکہ مجیب نے انتخاب جیتا تھا تو اقتدار اسے منتقل ہونا چاہیے تھا۔ یہ سب گڑبڑ اس وقت شروع ہوئی جب مجیب کو اقتدار نہ دیا گیا تو مشرقی پاکستان کے لوگوں نے محسوس کیا کہ مغربی پاکستان کا حکمران ٹولہ نہیں چاہتا کہ بنگالی حکومت کریں۔ میری رائے میں ساری خرابی اقتدار منتقل نہ کرنے سے شروع ہوئی۔ یہ اس کا حق تھا۔ بعد میں وہ غلطیاں کرتا تو ہم دیکھتے کہ اس کا علاج کس طرح کرنا ہے۔ پھر ہم اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے۔

س: کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ دونوں طرف سے غلطیاں ہوئیں؟

جلیل: ہاں! میری یہی رائے ہے اور ہندوستان نے ہماری غلطیوں سے فائدہ اٹھایا۔ یہ واحد ملک تھا جس نے فائدہ اٹھایا۔ ہمارے عوام آج بھی مصائب کا شکار ہیں۔ وہی مارشل لا ہے۔ بنگلہ دیش اور پاکستان دونوں میں فوجی اور سول بیوروکریسی کا غلبہ ہے۔ عملاً حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ——— !

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بنگلہ دیش نے علیحدگی سے کچھ فوائد حاصل کئے ہیں؟

جلیل: آپ کو فائدے اور نقصان کی تعریف متعین کرنی پڑے گی۔ متحدہ پاکستان کا مقام و مرتبہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ نقصان ہم دونوں کا ہوا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے دنیا میں ہمارا پانچواں نمبر تھا وہ بھی ختم ہوا۔ پھر دنیا کے تمام مسلمان ممالک ہماری طرف دیکھتے تھے کہ یہ ایک طاقتور ملک ہے جو اقوام عالم میں مسلمانوں کی مدد کر سکتا ہے۔ تو آپ دیکھتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی ہم دونوں کا نقصان ہوا ہے!

س: آپ بنگلہ دیش سے کب آئے ہیں؟

جلیل: میں ۴ اگست کو آیا ہوں۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اقتصادی لحاظ سے بنگلہ دیش کو علیحدگی سے کچھ فائدہ ہوا ہے۔ اس وقت یہ کہانیاں عام تھیں کہ بنگلہ دیش کا زرمبادلہ پاکستان کھا رہا ہے۔ بنگلہ دیش کو کالونی بنا دیا ہے۔ ہماری ہر چیز لوٹی جا رہی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اقتصادی لحاظ سے آپ آج بہتر پوزیشن میں ہیں؟

جلیل: آزادی کے بعد بنگلہ دیش اپنے آپ کو ترقی دینے میں قطعاً کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس وقت یہ انتہائی بری حالت میں ہے۔ ہماری معیشت کا تمام تر دار و مدار غیر ملکی امداد، بالخصوص ہند

...امداد پہ ہے۔ ہندوستانی اقتصادی مفادات آج بھی بنگلہ دیش کی معیشت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔
پٹ سن، ٹیکسٹائل کی صنعت پر ہندوؤں اور ہندوستانیوں کا غلبہ ہے۔ لوگ بنگلہ دیش کو ہندوستان
کی منڈی سمجھتے ہیں۔ یہ چیز ہمیں پسند نہیں لیکن ایسا ہے۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کی مہم میں عوامی لیگ نے مغربی پاکستان کے خلاف
جو شکایات کیں، ان میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا؟

جلیل: یہ بات درست ہے شکایات ضرور تھیں لیکن ان میں مبالغہ کیا گیا۔

س: کیا آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس پروپیگنڈے کی پشت پر کہ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کو لوٹ
رہا ہے، ہندو ذہن کام کر رہا تھا؟

جلیل: یہ بھی درست ہے جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، ہندو برہمن ازم برصغیر کے لئے ایک خطرہ
ہے۔ اور اس کا خاتمہ ہونا چاہیئے، ہندو مسلمان کو مار رہا ہے، سکھ کو مار رہا ہے، وہ نیچ ذات کے ہندو
کو بھی مار رہا ہے۔ برصغیر میں امن نہیں ہو سکتا جب تک اونچی ذات کے ہندو کا غلبہ ختم نہیں کیا جاتا وہ
مہا بھارت کا خواب رکھتے ہیں اور اسے پورا کرنے کے لئے ہر وقت مصروف عمل ہیں۔ شاید ان کی نظر
پاکستان پہ بھی ہے کہ وہ اسے توڑ ڈالیں گے۔ تو آپ کو بھی محتاط ہونا چاہیئے۔

س: ڈاکٹر رحمن سبحان جیسے لوگ بنگالی دانشوروں کو اعداد و شمار دے رہے تھے کہ کس طرح ہمیں لوٹا
جا رہا ہے۔ ان اعداد و شمار کے بارے میں آپ کی رائے کیا تھی اور ہے؟

جلیل: ہمارے ساتھ امتیازی سلوک کیا گیا مگر وہ اعداد و شمار پوری طرح درست نہیں تھے۔ لیکن نہ
اس وقت ان کا توڑ کیا گیا اور نہ طرز عمل کی اصلاح کی گئی۔ آج جب بنگلہ دیش کے لوگ کہتے ہیں کہ ہم پاکستان
میں ہی نسبتاً خوش اور خوشحال تھے، تو میں ذاتی طور پر اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ
پھر ہم کو خونیں جنگ کی کیا ضرورت تھی۔ جدوجہد آزادی کے ایک کارکن کی حیثیت سے جب میں لوگوں
کو موجودہ حالات پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے سنتا ہوں تو میرا ضمیر ملامت کرتا ہے۔

اگر ہم نے اپنے عوام کی حالت بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کی تھی تو ہمارے لوگوں کو آج بہتر خوراک، رہائش
اور دوسری چیزیں ملنی چاہئیں اور سب سے بڑھ کر ہمیں ہندوستانیوں کا غلام نہیں بننا چاہیئے۔ ویسے میں آپ
کو بتا دوں کہ ہمارے لوگ آج بھی ضرورت ہو تو ہندوستان کی غلامی سے نجات پانے کے لئے خون دینے کے
لئے تیار ہیں۔

س: آپ پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان مستقبل میں تعلقات کی کیا شکل دیکھتے ہیں؟

جلیل: میں صرف پاکستان اور بنگلہ دیش کی بات نہیں کرتا۔ میری رائے میں پورے برصغیر کے مسلمانوں

کو باہم متحد ہو جانا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا کر سکیں تو وہ اسلام کے غلبہ کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ انقلابی اسلام کے علمبردار بنیں اور اس نے عدل اجتماعی اور سماجی انصاف کا جو تصور دیا ہے اس پر سچے دل سے عمل کریں۔ اسلام انسانیت کی بہتری چاہتا ہے۔ اس اسلام پر عمل کیا جائے تو برصغیر کی قسمت بدل سکتی ہے۔

س: آپ کی رائے میں ہندوستانی مسلمان کس طرح پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے متحد ہو سکتے ہیں!

جلیل: کوئی چیز ناممکن نہیں۔ ہم اکٹھے تھے۔ مسلمان توکل، تقویٰ اور جہاد پر عمل کریں تو کوئی چیز ناممکن نہیں۔

س: ان دنوں آپ کی مصروفیات کیا ہیں!

جلیل: میں نے ۱۹۸۴ء میں "تحریک قومی نجات" قائم کی۔ میں نے تیرہ سال بعد سوشلسٹ پارٹی کے بانی صدر کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ میری تحریک اب "کمبائنڈ ایکشن کمیٹی" کی رکن ہے۔ جس کے گیارہ ارکان ہیں۔ سات نوجوانوں کی تنظیمیں ہیں اور چار دوسری تنظیمیں ہیں۔ ہمارا مقصد ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ انتخابات کے ذریعہ نہیں، بلکہ عوامی انقلابی تحریک کے ذریعہ، انتخابات کے ذریعہ آپ حکمران طبقات کو اقتدار سے محروم نہیں کر سکتے بلکہ ہر انتخاب موجودہ نظام کو نئی زندگی عطا کر دیتا ہے۔

س: کیا آپ مسلح جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں!

جلیل: نہیں، عوامی تحریک پر۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب لوگ اللہ کے نام پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو کوئی انہیں شکست نہیں دے سکتا۔ ہم بنگلہ دیش میں ۱۰ کروڑ مسلمان ہیں اگر وہ اللہ اکبر کے نعرہ پر آمادۂ جہاد ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ انقلاب لا سکتے ہیں۔ کلمہ طیبہ پڑھ کر ہم عہد کریں کہ ہم صرف اللہ کی غلامی قبول کریں گے، انسانوں کی نہیں تو ہم بڑے سے بڑا معرکہ سر کر سکتے ہیں۔ میرے ساتھ حافظ جی حضور کی پارٹی ہے۔ جماعت اسلامی کے سابق امیر مولانا عبدالرحیم ہیں۔ خلافت ربانی پارٹی ہے، ہمارے درمیان فکری وحدت پائی جاتی ہے۔ یہ تمام قوتیں اب متحرک ہو رہی ہیں اور بنگلہ دیش میں ایک بڑی طاقت بن رہی ہیں میں اس کے مستقبل کے بارے میں بڑا پُر امید ہوں۔

س: آپ کا یونیورسٹیوں میں بھی کوئی اثر ہے!

جلیل: ہاں! وہاں ہمارا اثر بڑھ رہا ہے۔ سوشلزم سے بیزاری پیدا ہو رہی ہے۔ چین اور روس سے نوجوان مایوس ہو رہے ہیں۔ جماعت اسلامی ہمارے ساتھ نہیں ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ وہ انتخابات کے ذریعہ اسلامی مملکت قائم کر سکتے ہیں۔

(نشست ۴۸)

الہدیٰ

تعمیرِ سیرت کی اساسات اور قرآن کا انسانِ مطلوب

سورۃ مومنون اور سورۃ معارج کی روشنی میں

(مباحث عمل صالح)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۶)

السلام علیکم ___ نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم ___ اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِشَھٰدٰتِھِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّکْرَمُوْنَ ۝

صدق اللّٰہ العظیم!

محترم حاضرین و معزز ناظرین!

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا دور درسِ قرآن مجالس میں ہو رہا ہے۔ اس کے دسویں سبق کے ضمن میں آج ہماری ... ہے۔ یہ سبق جو سورۃ مومنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ معارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ پر مشتمل ہیں۔ ان میں انسانی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے ایک سات نکاتی پروگرام اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اوّلین نقطہ اور اہم ترین نقطہ اقامۃ الصلوٰۃ، دوسرا فعل ... تیسرا اعراض عن اللغو۔ چوتھا ضبطِ نفس یعنی جنسی جذبے پر قابو یافتہ ہونا۔

اس لائحہ عمل کے آخری تین اوصاف ہیں۔ نمبر ایک: امانت کی پاسداری۔ نمبر دو: ایفائے عہد
نمبر تین: اپنی شہادتوں پر قائم رہنا۔

اب اگر آپ ایک خاص اعتبار سے غور کریں گے (تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے) کہ پہلے تین اوصاف کا تعلق ہے ایک شخص کی اپنی ذات کے ساتھ۔ کوئی دوسرا شخص ان سے متاثر نہیں ہوتا۔ نماز کو قائم رکھنا، بیکار اور بے مقصد باتوں سے اعراض ہے، خرچ کرنا ہے اللہ کی راہ میں دینا ہے۔ یہ تو خاص ذاتی نوعیت کے اوصاف ہیں۔ چوتھا وصف وہ تھا جس پر انسانی تمدن کی صحت کا دار و مدار ہے۔ اس لئے کہ انسانی تہذیب و تمدن کے لئے جڑ اور بنیاد ہے خاندان کا ادارہ، عائلی زندگی۔ عائلی زندگی اور خاندان کے ادارے کی صحت اور استحکام کا دار و مدار ہے (اس پر) کہ انسان اپنے جنسی جذبہ پر قابو اور ضبط رکھتا ہو۔ اسے کسی غلط رخ پر نہ پڑنے دے۔

اب جو آخری تین اوصاف ہیں جن پر آج ہمیں اجمالاً گفتگو کرنی ہے ان کا تعلق ہے انسان کی اجتماعی زندگی کی اس سطح سے جسے ہم ملی اور سیاسی زندگی کہتے ہیں۔ حکومت کا نظام، نظامِ مملکت قومی و ملی معاملات۔ اس ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ تین اوصاف ہیں جو نہایت ضروری ہیں۔ سب سے پہلا وصف ہے امانت داری ——— دوسرا وصف ہے ایفائے عہد ——— امانت داری اور ایفائے عہد، اس کا ذکر سورۃ معارج میں بھی ہے اور سورۃ مومنون میں بھی ہے۔ اور دونوں جگہ ایک شوشے کے فرق کے بغیر الفاظ بعینہٖ وارد ہوئے ہیں:۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ امانتداری اور ایفائے عہد کے مابین جو تعلق و ربط ہے، اور ان کی جو اہمیت ہے وہ ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ سے بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کے راوی ہیں حضرت انس ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو مسلسل دس برس تک حضور کے خادم خاص رہے ہیں۔ اور اس کو روایت کیا ہے امام بیہقی رحمہ اللہ نے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

قلما خطبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا قال
شاذ ہی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں یہ الفاظ آپ نے نہ فرمائے ہوں:

لا ايمان لمن لا امانة له ولا دين لمن لا عهد له

جس میں امانت داری کا وصف نہیں ہے، اس میں کوئی ایمان نہیں ہے۔
اور جس میں پاسِ عہد نہیں ہے، ایفائے عہد کا وصف نہیں ہے اس کا
کوئی دین نہیں ہے۔

اس لئے کہ ایمان کا امانت داری سے گہرا رشتہ ہے۔ دونوں کا مادہ ہی ایک لفظ
ہے۔ امن سے ہی لفظِ امانت بنا اور اسی سے ایمان بنا۔ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ ان
چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایمان ہے تو امانت کا وصف بھی ہوگا۔ اگر امانت کا وصف
نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فتویٰ مبارک کی رو سے ایمان بھی نہیں ہے۔
حقیقی و قلبی ایمان ـــــ اسی طرح دین تو اصل میں نام ہے بندے اور رب کے مابین ایک
عہد و معاہدہ کا۔ ہم نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی جو مرکزی آیت ہے اسے جب پڑھتے
ہیں: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ " اے رب ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں
اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے"! تو یہ ایک قول و قرار ہے، یہ ایک
معاہدہ ہے، یہ ایک میثاق ہے اللہ کے ساتھ۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ جو شخص انسانوں
کے ساتھ کئے گئے عہد نہیں نباہ سکتا، جو انسانوں کے ساتھ کئے ہوئے وعدے پورے
نہیں کرسکتا۔ ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ کیا ہوا اتنا بڑا معاہدہ پوری زندگی کے لئے
کیا ہوا عہد کیسے نباہے گا۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا دین لمن لاعھد لہ
ایسا شخص حقیقی دین سے تہی دست ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایفائے عہد کے ضمن میں ... سے
اس منتخب نصاب کا جو دوسرا درس تھا اس میں اس پر تفصیل سے گفتگو ہوچکی ہے۔ وہاں الفاظِ
مبارکہ آئے تھے: والموفون بعھدھم اذا عاھدوا " اور اپنے عہد کو پورا
کرنے والے جب کہ باہم کوئی معاہدہ کرلیں"۔ اور میں نے اُس وقت تفصیل سے عرض کیا تھا
کہ ہمارے جتنے بھی بین الانسانی معاملات ہوتے ہیں ان سب میں کوئی نہ کوئی معاہدہ کارفرما
ہوتا ہے۔ جیسے آجر اور اجیر کا تعلق ہے۔ اسی طرح اگر EMPLOYER & EMPLOYEE
RELATIONSHIP ہے تو یہ سب کسی نہ کسی معاہدہ پر قائم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کہیں
عارضی یا مستقل ملازمت کرتا ہے تو ملازم رکھنے والے اور ملازمت کرنے والے کے مابین
کوئی قول و قرار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ شادی بھی ایک معاشرتی معاہدہ ہے۔
امانت داری اور ایفائے عہد کا ذکر سورہ مومنون اور معارج دونوں میں آیا ہے۔

لیکن سورہ معارج میں ایک تیسری چیز کا اضافہ کیا گیا ہے : وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ
قَائِمُونَ o " وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں"۔ غور کیجیے کہ اس کا ذکر سورہ
مومنون میں کیوں نہیں آیا! یہ وہ واحد مثال ہے کہ جب ہم نے دونوں مقامات کا تقابل
کیا تو صرف یہ ایک چیز ہے جس کا ذکر ہمیں سورہ مومنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں نہیں ملتا۔
کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت شہادت بھی ایک امانت ہے ۔ اگر کسی وقوعہ کے وقت
آپ موجود تھے۔ کوئی واقعہ ہوا ہے، کسی نے کسی پر دست درازی کی ہے، کسی نے کسی پر
کوئی ظلم کیا ہے، کسی نے کسی کو قتل کیا ہے۔ کوئی دوسرا حادثہ ہوا ہے۔ اگر آپ وہاں موجود
تھے تو آپ کی وہاں موجودگی کی بنا پر جو شہادت آپ کے پاس ہے وہ معاشرہ، قوم وملت
اور ملک کی ایک امانت آپ کے پاس ہے۔ اگر آپ اسے چھپاتے ہیں تو آپ اس امانت
میں خیانت کر رہے ہیں۔ لہٰذا قرآن حکیم جو چیز کسی فعل میں آپ سے آپ مضمر ہوتی ہے اس
کا ذکر نہیں کرتا اور کہیں اس مضمر شے کو بھی عیاں کر دیتا ہے، نمایاں کر دیتا ہے۔ چنانچہ شہادت
بھی درحقیقت ایک امانت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کے تصور کو اتنی وسعت
دی ہے کہ آپ نے فرمایا: ان المجالس بالامانات " مجالس بھی امانتوں پر قائم ہیں"۔ کسی
محفل میں کوئی بات ہو رہی تھی، آپ بھی اس میں موجود تھے۔ آپ نے کوئی بات وہاں سنی،
کہیں اور جا کر بیان کر دی جب کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی تو یہ خیانت ہے۔
آپ نے کسی محفل کی بات کو جا کر اگر کہیں اور نقل کر دیا تو غیر شعوری یا شعوری طور پر بات میں
کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور منشا کے خلاف بھی بیان ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بات
کہنے والے کے صحیح مفہوم کو سمجھ نہ پائے ہوں۔ تو نہ معلوم اس سے کتنے فتنے اٹھنے کا احتمال
پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یہی بے احتیاطی بعض لوگوں کے خلاف بعض کو بدظنی اور بدگمانی میں
مبتلا کرنے کا سبب بن جائے اور دلوں میں کدورت اور رنجش ڈیرہ ڈال لے تو کسی مجلس میں کسی
محفل میں آپ شریک ہیں تو وہاں کی باتیں آپ کے پاس ایک امانت کے طور پر ہیں جن کی آپ کو حفاظت
کرنی ہے ۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المستشار مؤتمن ہے۔ جس سے
کوئی مشورہ طلب کیا جاتا ہے گویا اس کے پاس بھی ایک امانت رکھوائی گئی ہے۔ مشورہ طلب کرنے
والے نے آپ پر اپنا اعتماد ظاہر کیا ہے۔ اب اگر آپ دیانتاً جو رائے رکھتے ہیں وہ کچھ
ہے کہ مجھے صحیح مشورہ یہ دینا چاہیے اس کے لیے یہ بات مفید ہے لیکن آپ کسی مصلحت ۔

ی اس دیانت دارانہ رائے کو چھپا کر کوئی اور رائے ظاہر کرتے ہیں تو آپ نے اس کی امانت میں
نت کی ۔ یہ معاملہ بھی جیسا کہ میں نے عرض کیا شہادت کا ہے ۔

سورہ بقرہ میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس کے درمیان میں فرمایا گیا ہے
منْ اظلم مِمَّنْ کَتَمَ شَہَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ " اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور
ن ہوگا کہ جس کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی شہادت ہو اور وہ اسے چھپائے " اس فرمانِ الٰہی
در امانت و شہادت کے حوالہ سے میں چاہوں گا کہ امتِ مسلمہ کا جو فرضِ منصبی ہے اسے سمجھئے ۔
ہارے پاس اللہ کا کلام ہے ۔ ہمارے پاس اللہ کی ہدایت ہے ۔ ہمارے پاس اللہ کا قانون ہے ۔
ہارے پاس اللہ کی شریعت ہے ۔ ہمارے پاس اللہ کے رسول جناب محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت
ہے ۔ حضور کی احادیث ہیں ۔ آپ کا اسوۂ حسنہ کامل صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے ۔ یہ تمام
نتیں ہیں جن کو ادا کرنے کی ذمّہ داری اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے کاندھوں پر رکھی گئی ہے
ن امانتوں کو ادا کرنا پوری امتِ مسلمہ کا فریضہ ہے ۔ اس لئے کہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لئے ہیں
رف ہمارے لئے نہیں ہیں ۔ جیسے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا سب سے بڑا وصف
ہوا " امین " ہے ۔ امانت دار رسول جن کے پاس پیغام ربانی آیا اور انہوں نے اسے بلا کم و
است لوگوں تک پہنچا دیا ۔ امانت کا حق ادا کر دیا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام
پہلے امین ہیں ، اس پیغام کے ، ان کا لقب بھی ہے رسول امین ۔ دوسرے امین ہیں جناب محمد
رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ۔ حضرت جبرئیل نے یہ امانت پہنچائی نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ۔
حضور نے یہ امانت پہنچا دی امّت دعوت کو ۔ اور اسی کو ہم یوں تعبیر کریں گے کہ نبی اکرم
صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حق کی گواہی دے دی ، امّت کے سامنے ۔ توحید کی گواہی دی ۔ اپنی رسالت
کی گواہی دی ۔ قرآن کی حقانیت کی گواہی دی ۔ دین و شریعت کے اوامر و نواہی
اور ہر فعل و عمل کی گواہی دی قولاً بھی اور عملاً بھی ۔ اب اس امانت اور اس شہادت کو ادا
کرنے کی ذمّہ داری کا بوجھ امتِ مسلمہ کے کاندھوں پر عائد ہوتا ہے ۔ جس کا ہر وہ شخص ایک
فرد اور رکن ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا اور کہلواتا ہے ۔

ہمارا فرضِ منصبی یہ قرار دیا گیا ہے کہ ہم شہادت دیں اس حق کی ، اس دین کی ، اس
توحید کی اور جناب محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کی کہ جن کے توسط سے ہمیں یہ الھدیٰ اور
یہ الحق ملا ہے ۔ اس موقع پر علامہ اقبال کا یہ مصرع بے اختیار میری زبان پر آجاتا ہے کہ :

ط دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی

یہ گواہی ہمیں دینی ہے قولاً اور یہ گواہی ہمیں دینی ہے عملاً اور فعلاً ۔ یہ گواہی ہ... نے دینی ہے اپنی گفتگو سے، دعوت و تبلیغ سے، اپنی قوت بیانیہ سے ۔ یہ گواہی ہ... نے دینی ہے اپنے قلم سے، مدلل مضامین و مقالات سے اور ہمیں یہ گواہی دینی ہے اپنے کردار اور اپنی سیرت سے ۔ یہ اگر ہم نہیں کرتے تو ہم کتمانِ شہادت کے بہت بڑے مجرم ہو رہے ہیں: ومن اظلم ممن کتم شہادۃ عندہ من اللہ ط

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ اس آیت سے چند آیات بعد سورہ بقرہ میں امت مسلمہ کا فرض منصبی ان الفاظ مبارکہ بیان ہوا ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط

ہم نے تمہیں ایک بہترین امت، درمیانی امت، امتِ وسط بنایا ہی اس لئے ہے کہ تم ہو جاؤ گواہ پوری نوعِ انسانی پر اور رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر ۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم از کم دو جگہ ضرور آتے ہیں ۔ ہمارے یہ درس ان مجالس میں قریباً چھ ماہ سے چل رہے ہیں ۔ میں نے آج کی اس مجلس کو ملا کر چھ نشستوں میں سورۂ مومنون کی گیارہ اور سورہ معارج کی سترہ آیات کا باہمی تقابل کیا ہے ۔ اسی کی ایک مثال اور جان لیجئے ۔ سورۂ مومنون سے متصلاً قبل سورہ حج ہے ۔ سورۂ مومنون کی پہلی آیت ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ اور سورۂ حج کی جو آخری آیت ہے اس میں اسی شہادت علی الناس کا ذکر ہے ۔ مسلمانوں سے خطاب فرما کے کہا جا رہا ہے ۔ وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط هُوَ اجْتَبٰىكُمْ ' اللہ کی راہ میں محنتیں کرو، مشقتیں کرو، ایثار کرو، قربانیاں دو، جان و مال کھپاؤ ۔ مجاہدہ کرو جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے ۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے ۔ امورِ نبوت کا وارث تمہیں بنا دیا ۔ کتاب الٰہی کا وارث تمہیں بنا دیا ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم ترین امانت تمہارے سپرد کی ہے ۔ اب اس کا حق ادا کرو ۔ اور اسی آیت میں ایک SUB-ORDINATE CLAUSE کے بعد آتا ہے ۔ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ "تاکہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ بن جائیں تم پر اور تم گواہ بن جاؤ پوری نوعِ انسانی پر۔"

ہے اجتماعی (COLLECTIVE) ذمہ داری پوری امتِ مسلمہ کی جو شہادت
ے اس لفظ کے حوالہ سے ہمیں جان لینی چاہیئے اور اسے اچھی طرح ذہن نشین اور قلب پر
ت کر لینا چاہیئے۔

ان آیات کے ذریعے تین اوصاف پاسِ امانت، پاسِ عہد اور شہادت کی ادائیگی
ارے سامنے آئی۔ بعدہ سورۃ مومنون اور سورہ معارج دونوں میں اولین اور اہم ترین
صف یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور اس کی حفاظت کے وصف کا اعادہ فرمایا گیا ۔۔ پھر سورۃ مومنون
ں فرمایا گیا: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ اور سورہ معارج میں ارشاد ہوا۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ
یہی وہ لوگ ہو جنت الفردوس کے وارث بنیں گے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا اعزاز و اکرام ہوگا
جنتوں میں ۔۔ آج کی اس مجلس میں اس سبق کا اختتام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اوصاف کو اپنی
شخصیتوں میں پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں بھی جنت میں داخل ہونے والوں
میں شامل کردے۔ آمین یا رب العٰلمین ۔۔۔

اب اگر آج کی گفتگو سے متعلق کوئی سوال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال وجواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! ان آیات میں جنت کی وراثت حاصل کرنے کا ذکر موجود ہے۔ براہ کرم
ذرا تفصیل سے بتائیے کہ جنت کا صحیح تصور کیا ہے!

جواب: قرآن مجید میں جنت و دوزخ کی بہت تفاصیل وارد ہوئی ہیں۔ ہمیں ان سب کو
اجمالاً ماننا ہے۔ ہمارا قرآن مجید پر جو ایمان ہے یہ اس کا لازمی تقاضا ہے۔ البتہ ان کی اصل
حقیقت کو اس عالم میں رہتے ہوئے ہم نہیں جان سکتے۔ یہ عالمِ آخرت کی حقیقتیں ہیں۔ ان کا
ایک اجمالی تصور تو ہمیں دے دیا گیا ہے اور انہیں مانتے ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں لیکن
کے ساتھ ہی حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ جنت کی نعمتیں وہ
ہیں کہ: ما لا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر ۔۔
جو جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ ان کا خیال بھی کسی انسان کے دل
میں کبھی آیا۔ لہٰذا اس حقیقت کے اعتبار سے ہمیں انتظار کرنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جنت
میں داخل فرمائے۔ تو ہمیں معلوم ہو کہ وہاں کی نعمتیں کیا ہیں!

سوال: ڈاکٹر صاحب! ان آیات میں انسانی شخصیت کا جو اعلیٰ تصور ملتا ہے کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک آفاقی تصور ہے؟

جواب: آپ نے بہت ہی عمدہ بات سوال کے انداز میں کہی ہے۔ یقیناً اسلام کا تصور آفاقی ہے۔ اس لئے کہ زمان و مکان، زبان و نسل اور خون و رنگ کی تمام بندشوں اور حدود سے بالا و بلند اور ورا ہے وہ پروگرام جو قرآن مجید پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قرآن مجید پوری نوع انسانی کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتا ہے تو خطاب کرتا ہے: يَآاَيُّهَا النَّاسُ (اے لوگو! اے بنی نوع انسان) سے۔ یہ ماحصل جس کا ہم نے چھ مسلسل نشستوں میں مطالعہ کیا ہے۔ یہ درحقیقت انسانی سیرت و کردار کی صحیح رُخ پر تعمیر کے مسلمہ اصول ہیں اور یہ یقیناً ایک آفاقی پروگرام ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! اگر ایک شخص کی سیرت معلوم معیار پر پوری نہیں اترتی تو اس کی ذمہ داری معاشرے پر عائد ہوگی یا افراد پر!

جواب: میرا یہ خیال ہے کہ بالعموم ذمہ داری دونوں ہی پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جس طریقے سے ایک پودے کی صحیح نشوونما پانے کا دارومدار دو چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ بیج خود درست ہو۔ دوسرے یہ کہ اسے زمین صحیح ملے اور فضا سے اسے صحیح غذا ملے۔ اسی طرح انسانی شخصیت کا صحیح رخ پر پروان چڑھنے کا دارومدار ان دو چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ انسان کی اپنی محنت ہے، سعی ہے، جدوجہد ہے، کوشش ہے اور دوسرے یہ کہ معاشرے سے، ماحول سے اسے اس سلسلہ میں صحیح و مناسب تعاون میسر آرہا ہے ـــــ اب یہ بات ہر انفرادی معاملہ (INDIVIDUAL CASE) میں دیکھنے کی ہوگی کہ کس میں کس چیز کی کمی رہی ہے اور کس حد تک رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب حساب لے گا تو چونکہ اللہ تعالیٰ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ہے۔ وہ ہر چیز کا کامل علم رکھنے والا ہے۔ لہٰذا وہ رؤف و عادل ہستی تمام عوامل کو سامنے رکھ کر ہی فیصلہ فرمائے گی۔

حضرات! ان سوالات و جوابات کے بعد ہمارے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا یہ دسواں درس جس پر ہم نے چھ نشستوں میں گفتگو کی ہے ختم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اوصاف کو اپنی شخصیتوں میں جذب کرنے کی ہمت عطا فرمائے اور قرآن مجید جسے فلاح کہتا ہے۔ ہمیں اس سے ہمکنار فرمائے اور آخرت میں ہمیں جنت میں داخل ہونے والے خوش نصیب لوگوں [illegible]

انقلابی جماعت کی تربیت

(سفرِ تبوک کی روشنی میں)

محمد یعقوب (گوجرانوالہ)

تنظیم اسلامی نے اسلامی انقلاب کے لیے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مراحل انقلاب
ذ ر کے اپنی تقاریر و تحاریر کے ذریعے ہم تک پہنچائے ہیں ان میں ایک مرحلہ 'تربیت' کا بھی ہے۔ اور
رچہ ان چھ مراحل میں "تربیت" کا نمبر تیسرا ہے لیکن بوجوہ پہلے اسی پر اظہارِ خیال کر رہا ہوں۔
کسی بھی عملی کام کے لیے اگرچہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو تربیت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے
ئے مجھے کوئی مثال دینے کی ضرورت نہیں۔ مثالیں روزمرہ زندگی میں چاروں طرف بکھری پڑی ہیں اور پھر
وم جس قدر اہم، مشکل اور کڑا ہوگا تربیت اسی لحاظ سے طویل اور کڑی ہوگی۔ "اسلامی انقلاب" جیسے
عظیم الشان کام کے لیے ظاہر ہے ایک طویل اور صبر آزما تربیت سے گزرنا لابدی ہے۔ اگرچہ افہام و تفہیم
کے لیے اسلامی انقلاب کے چھ مراحل کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے لیکن اصلاً یہ باہم مربوط اور پیوستہ ہیں۔
نعرۂ دعوت بلند ہوتے ہی یہ سب مراحل یا کم از کم پہلے پانچ مراحل یعنی دعوت، تنظیم، تربیت، تصادم اور
صبرِ محض فوراً ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ بلالؓ کو مار پڑ رہی ہے وہ جھیل رہے ہیں اور دوسرے صحابہؓ
ے دلوں پر اگرچہ آرے چل رہے ہیں لیکن حکم ہے جوابی کارروائی کی اجازت نہیں ــــ گویا اس بات
لی تربیت دی جا رہی ہے کہ اطاعت کرنا سیکھو۔ امیرؐ کے حکم کے بغیر کوئی اقدام نہ کرو۔ اپنی غیرت اور
جوش کو فی الحال دباؤ۔ تمہیں تیغ زنی اور تیر اندازی کا پورا پورا موقع فراہم کیا جائے گا۔ تم صرف مشرکینِ مکہ
کے خلاف لڑنے کو نہیں اٹھے۔ ابھی توقیصر و کسریٰ کی رزم گاہیں آئیں گی جہاں لاکھوں کے تو اعداد لشکر
تم سے مقابل ہوں گے اس لیے سرِ دست ماریں کھانا، شدائد برداشت کرنا اور امر کی اطاعت
ز سیکھو ــــ حضرت یاسرؓ اور ان کی بیوی کو مشرک درندوں نے پھاڑ کھایا، حضرت ابوبکرؓ
صدیق الملت کو کعبہ کی دیواروں کے سایہ میں اس قدر مار پڑی کہ چہرہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ اس پر ان
ہ قبیلہ مشتعل ہوا تو فرمایا اس کی ضرورت نہیں میں ٹھیک ہوں۔ آپ اسے صبرِ محض بھی کہہ سکتے ہیں۔

ایمان، صلوٰۃ یہ تربیت سے شدائد جھیلنے کی اور اطاعت امیر کی ـــــ تو گویا تربیت تو پہلے دن سے ہی شروع ہو گئی۔ پھر حکم ہوا ہجرت کا جہاد و جدوجہد کی طرف۔ اس کی ادبی جنگیں ہوں گی ایمان، یہ ہر پہلو میں بھی تربیت ہی کا تھا کہ اپنی محبتوں کو چھوڑنا سیکھو۔ اپنے رشتے ناطے منقطع کرنا سیکھو۔ ان بتوں کو توڑو بغیر کعبہ میں رکھے بت نہیں توڑا کرتے ؎

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

اب میدان آتا ہے غزوۂ تبوک کی طرف جہاں یہ "مرحلۂ تربیت" اپنے نقطۂ کمال کو پہنچا۔ اس سے پہلے اگرچہ بدر، احد و خندق کے شدائد گزر چکے تھے جہاں سرورِ عالم ہادیٔ آخر و کامل صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تربیت یافتگان کو آزما چکے تھے لیکن شاید ابھی ضرورت تھی کہ اس جماعتِ صحابہ کو تیرِ بے خطا اور تیغِ بے پناہ بنانے کے تربیت کی آخری کٹھالی سے گزارا جائے۔ خاص طور پر ان لوگوں کو جو غزوۂ احزاب کے بعد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے۔

اب ذرا چشمِ تصور میں لائیے وہ سارا ماحول جس میں حکم ہوا کہ سفرِ تبوک کی تیاری کرو۔ ہمارے ہاں تو ملتان، جیکب آباد اور سبی کی گرمی کو دیکھ رکھا، دونوں نے پسینے تک تحلیل کر ڈالے لیکن عرب کی صحرائی گرمی الامان و الحفیظ ـــــ سورج گویا سوا نیزے پر کھڑا ہے۔ صحرا کی مٹی کی باریک ریت بھوبل کی طرح دہک رہی ہے۔ بادِ سموم سے دم اکھڑتا ہے۔ لاکھوں ٹن مٹی کو اپنے دامن میں لے صحرا بگولے پر جوان گڑگڑاہٹ پیدا کرتے جب قافلوں کی طرف بڑھتے تھے تو انسان تو انسان اونٹ تک منہ کے بل گرتے تھے اور بارہا ایسا ہوا کہ سارے کا سارا قافلہ ہمیشہ کے لئے لاکھوں ٹن ریت میں دفن ہو گیا۔ یہ ہے وہ سفر جس کا حکم دیا جا رہا ہے، ناکافی سواریوں، ناکافی سامانِ خور و نوش اور ناکافی سامانِ حرب کے ساتھ۔ دوسری طرف مدینہ کے باغوں کی ٹھنڈی اور گھنیری چھاؤں، کھجوروں کے پکے ہوئے وزنی خوشے گویا ٹپک پڑنے کو تیار۔

ع تپتی راہیں مجھ کو پکاریں دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

یہی نہیں کہ پکی اور گدرائی ہوئی فصل سے ہاتھ اٹھا لو بلکہ حکم ہوتا ہے گھروں کا مال بھی لاؤ۔ اب جو پہلے ہی تربیت کی حدِ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، گھر کا کل اثاث البیت سمیت لائے ـــــ ارشاد ہوا ابوبکر! گھر کے لئے کچھ! عرض کیا بہت کچھ بلکہ سب کچھ۔ جہاں اللہ اور رسول اللہ کافی ہوں وہاں متاع الدنیا کی کیا حاجت۔ چہرہ روشن ہو تو حاجتِ گلگونہ فروش! عمرؓ کہ عدل و قسط میں تربیت کا

[...]واج پہ تھے بعینہٖ آدھا مال گھر والوں کے لیے چھوڑ آئے اور آدھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے [...] ڈھیر کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے تو غنی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ سونے اور چاندی سے رسول اللہ [...] جھولی بھر دی۔ اتنا مال دیا اتنا مال دیا کہ فرطِ مسرت سے حضورؐ کا چہرہ مبارک دمک اٹھا ـــــ اس [...] یہ نہیں کہ مال آیا تھا بلکہ اس لیے کہ برسوں کی تربیت کا مال آیا تھا۔ یہ تھی عملی تفسیر لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْنَ مِمَّا تُحِبُّوْنَ کی اور یہ تھی زندہ تفسیر اَلَّذِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ [...] مثالوں کی دیکھا دیکھی حضورؐ کی تشویق و ترغیب اور خود صحابہؓ کا اپنا جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ ـــــ مسجدِ نبوی میں ڈھیر لگ گئے ـــــ منافقین کے سینے بھنچے رہتے کہ یہ لوگ کیوں اپنے مال اور [...] نہیں کرتے ـــ کیوں اپنے ہاتھوں کی برسوں کی کمائی اپنے ہی ہاتھوں لٹائے جاتے ہیں۔

مال کا جہاد ختم ہوا تو باہر کسی جگہ پر لشکر گاہ قائم ہوئی۔ چاروں طرف سے مجاہدین جوق در جوق پہنچ گئے۔ مال تو وہ پہلے ہی دے چکے تھے۔ اب محبتیں چھوڑنے کا وقت آیا۔ سابقون الاوّلون تو صبر و استقامت کے پہاڑ تھے۔ ہزاروں ایسے بھی ہوں گے جو اس کڑی تربیت سے پہلی بار گزر رہے تھے ـــ کسی کا پہلوٹھی کا بچہ آغوشِ مادر میں کلکاریاں مار رہا تھا ـــ کوئی اپنی ماں سے رخصت طلب کر رہا تھا۔ ماں ماتھا چوم کر کہتی جا بیٹا جنگ مردوں کا کھیل ہے اور بیٹے کے رخصت ہوتے ہی اللہ کے حضور جھولی پھیلا دیتی کہ اے ربِ کریم میرے بیٹے کو قبول فرما، کسی کی نوبیاہتا بیوی دامن گیر ہوئی کہ ابھی تو چند روز گزرے ہیں۔ کسی کی بچی ٹانگوں سے لپٹ گئی کہ ابا کہاں جاتے ہو! پھر کب آؤ گے! کسی کے بوڑھے کمزور باپ نے اپنے گبھرو جوان بیٹے کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا چل میں تجھے لشکر گاہ تک چھوڑ آؤں۔

منافقین ٹھٹھا کرتے اور کبھی ناصح مشفق کا روپ دھارتے کہ صحرا تو تنور بنا ہوا ہے۔ ایسی گرمی میں نہ نکلو ـــ ایک طرف اپنے بستے بستے، دلوں کی طرح دھڑکتے آباد گھر تھے جو دلوں کو کھینچے لیے جاتے تھے اور پرے منافقین دلوں میں وسوسے ڈالتے تھے۔ لیکن اہلِ ایمان نکلے۔ محبتوں کی ان زنجیروں کو توڑتے ہوئے، ان وساوس کو جھٹکتے ہوئے، گھروں سے، دالانوں سے، کھیتوں سے کھلیانوں سے، باغوں سے راغوں سے ـــ کوئی کرکٹ میچ دیکھنے نہیں، کسی میلے میں موج میلہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک طویل، کڑے اور تھکا دینے والے سفر پر جس کے اختتام پر آرام دہ منزل نہیں بلکہ اس وقت کی سپر پاور کا لشکرِ جرار تھا جہاں

زندگی اور موت کا معرکہ لڑا جانا تھا۔

اب یہاں پر ایک بات سامنے آتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اطلاع ہی یہ ملی تھی کہ رومیوں کا لشکر سرحد پر جمع ہو رہا ہے۔ آپؐ نے تو بحیثیت سربراہ مملکت بحیثیت سالارِ اعظم اور بحیثیت رسول اللہ اس کی خوب خوب تیاری کرنا ہی تھی۔ لہٰذا آپؐ نے کی لیکن سب جانتے ہیں کہ لڑائی نہیں ہوئی ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خیر عالم غیب نہیں تھے لیکن خدائے علیم و خبیر کے علم میں تو ازل سے تھا کہ لڑائی نہ ہوگی لیکن ادھر سے بھی حکم آ رہا ہے۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ـــــ نکلو ہلکے ہو یا بھاری ـــ طبیعت آمادہ ہے یا نہیں ـــ سامانِ جنگ رکھتے ہو یا نہیں، زادِ راہ ہے یا خالی ہاتھ ہو ـــ ماں بیمار ہے یا تندرست ـــ بیوی علیل ہے یا بچے ـــ باپ بوڑھا ہے یا نہیں ـــ بس نکلو، ہر حال میں نکلو ـــ سارے بندھن توڑ کے نکلو ـــ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ یہ اجتماعی تربیت کے لئے تھا۔ اس کے یقیناً اور بھی مضمرات اور حکمتیں ہوں گی لیکن ایک بڑا مقصد یقیناً تربیت تھا کہ لوگوں کو گھروں کے پرامن اور آرام دہ ماحول سے نکالا جائے۔ ان سے مشقتیں جھیلوائی جائیں۔ انہیں طویل سفروں اور شدید موسموں میں ڈالا جائے تاکہ وہ تپ کر کندن ہو جائیں۔

یہ ہے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا اندازِ تربیت ـــــ محض خانقاہی ریاضتیں یا طویل اذکار نہیں طویل سفر ـــــ ہوا دار اور ٹھنڈے ہال نہیں دہکتے ہوئے صحرا ـــــ انہی تربیت یافتگان کے ہاتھوں قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں تنکوں کی طرح اڑ گئیں۔

ع چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

نشانِ کار

امیرِ تنظیم کا دورۂ شمالی امریکہ

الحمدللہ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور قیم برائے بیرونِ پاکستان جناب قمر سعید قریشی شمالی امریکہ اور کینیڈا کے دورے سے ۲۲ اگست کو واپس تشریف لائے۔ اس سفر کے اختتام پر انہیں حج بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ قارئین میثاق کے لئے امیر تنظیم اور قیم تنظیم کے ۴۲ روزہ سفر کی مختصر روداد مقبول الرحیم مفتی نے جناب قمر سعید قریشی کی یادداشتوں سے مرتب کی ہے ——————— (ادارہ)

اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآن حکیم میں بنی نوعِ آدم کو اپنی صفتِ تخلیق کا شاہکار بنایا ہے وہیں فطرتِ انسانی کے دوسرے پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے اسکے "اسفل سافلین" کے درجے تک گرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ درحقیقت خیر و شر، نیکی و بدی، بلندی و پستی یا بالفاظِ دیگر تضادات کا ایک مستقل و منظم سلسلہ اس پوری کائنات کی تکوین و تعمیر میں مضمر و کارفرما ہے۔ اسی طرح جب سے انسان نے کائنات پر غور و تحقیق اور تدبر و تفکر کے نتیجے میں ایجاد و تخلیق کے میدان میں قدم رکھا ہے اُس کی بنائی ہوئی اشیاء میں اُس کی فطرت کے دونوں اجزاء کے اثرات نمایاں چلے آ رہے ہیں۔ ایک ایٹم کی مثال ہی لے لیجیے ایک طرف حیات کی تخریب کا بندوبست ہو رہا ہے تو دوسری طرف تعمیرِ حیات کے بھی کئی پہلو اُس میں موجود ہیں۔ خود ہمارے ملک پاکستان ہی میں ایٹمی توانائی کے ذریعے بجلی پیدا کرنے اور ایٹم کی صلاحیتوں کی مدد سے زراعت اور صحت و طب کے میدانوں میں تحقیق و تفتیش اور تشخیص و علاج کے کئی مراکز کام کر رہے ہیں۔ لیکن چونکہ آج دنیا میں قیادت و رہنمائی کا منصب ہماری کوتاہیوں اور نالائقیوں کے سبب اور تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (یہ تو زمانے کے نشیب و فراز

ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ سورہ آل عمران آیت ۱۴۰
کے آسمانی اصول کی کارفرمائی کے نتیجے میں اُن اقوام کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے
ہدایت و رہنمائی سے آزاد ہو کر صرف اپنی عقل و دانش اور فہم و بصیرت کو ہی رہبر
پیشوا بنا رکھا ہے، اس لئے بالعموم سائنس کی ایجادات کے زیادہ تر منفی اور خلاف
شرع استعمالات و اثرات ہی اوّل اوّل سامنے آتے ہیں حالانکہ اُن کے اندر
بہت سے جائز اور مفید پہلو بھی موجود ہوتے ہیں۔ اس کی بہت عمدہ اور واضح
مثال آڈیو کیسٹس (AUDIO CASSETTES) کی ہے۔ اہل مغرب نے اور انکی نقالی میں
اہل مشرق نے عموماً ان کیسٹس کو موسیقی اور گانے کی شکل میں ایک فحش اور منکر کو
پھیلانے کا ذریعہ بنایا لیکن جب سے انہی کیسٹس کو قرآن کا پیغام پہنچانے اور دین
کی دعوت کو عام کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے یہ یکساں طور پر مفید ثابت
رہے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں جب پہلی مرتبہ امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد
امریکہ اور کینیڈا کے دورے کی دعوت ملی تو اُس کا بڑا سبب بھی یہی تھا کہ
لینے والے اُردو داں مسلمان ان کیسٹس کے ذریعے قرآن کے پیغام اور امیر تنظیم
اسلامی کے اندازِ بیان سے خوب آشنا ہو چکے تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف ا
محترم نے ایک خطاب میں ان الفاظ میں کیا تھا۔ "وہ میں پچھلے سال جب شمالی
امریکہ پہنچا تو حیران رہ گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس براعظم میں مقیم برصغیر
پاک و ہند کے رہنے والے مسلمانوں میں 'دعوت رجوع الی القرآن' اور 'تحریک
تجدیدِ ایمان۔ توبہ۔ تجدیدِ عہد' کا اتنا وسیع تعارف موجود ہوگا۔ نہ معلوم
کون کون سے شہروں میں میرے دروس کے ٹیپ پہنچ چکے ہیں۔ یہ صرف دعوت
قرآنی کا اعجاز ہے' جس کا مجھے وہاں مشاہدہ ہوا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم"۔
(میثاق۔ صفحہ ۴۰۔ جون ۱۹۸۱ء)

۱۹۷۹ سے ۱۹۸۶ تک صرف ۱۹۸۵ء کا ایک سال ایسا گزرا جس میں ڈاکٹر
اسرار احمد امریکہ نہیں گئے۔ اس کے علاوہ سعودی عرب بھارت اور مشرق وسطیٰ
کی دیگر ریاستوں میں بھی اُن کا جانا رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے
کبھی اپنے بیرونی سفر کو تبلیغی دورے کا نام نہیں دیا کیونکہ اُن کے نزدیک تبلیغ

لئے دعوت و تبلیغ کا فطری میدان وہی ماحول اور معاشرہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اُسے پیدا کیا ہے۔ اور پھر یہ کہ بیرونِ ملک اُن کے مخاطبین عموماً وہی مسلمان تارکینِ وطن ہوتے ہیں جو تلاشِ معاش، حصولِ علم یا کسی اور وجہ سے وہاں جا کر بس گئے ہیں۔ درحقیقت کسی غیر مسلم معاشرے میں تبلیغِ دین کا کام عارضی دَوروں سے ہونا ممکن بھی نہیں ہے۔ امریکہ میں تبلیغ دین کے امکانات، اس کے طریقِ کار، اس کی اہمیت اور امریکی معاشرے کی ہیئتِ ترکیبی پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو مسجد شہداء میں ایک خطاب کے دوران مفصل گفتگو کی تھی جو جون ۱۹۸۱ کے میثاق میں شائع بھی ہوئی۔ جو حضرات امریکی معاشرے کے خدوخال اور ڈاکٹر صاحب کے دورہ امریکہ کے پس منظر سے روشناس ہونا چاہیں اُن کے لئے میثاق جنوری فروری ۱۹۸۰ء کی مشترکہ اشاعت میں شامل دورہ امریکہ کے تحریری تاثرات (صفحہ ۱۰۵) اور جون ۱۹۸۱ء کے شمارے میں شامل تفصیلی خطاب کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ اُس خطاب کا ایک اقتباس نیچے دیا جا رہا ہے۔ جس کے مطالعے سے امریکہ میں تبلیغ کے کام کی اہمیت اور نوعیت کا اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا۔

"امریکی معاشرے کے مشاہدے اور اُس کے نفسیاتی جائزے سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اُس معاشرے میں انسان مشین بن کر رہ گیا ہے۔ مشین میں نہ دل ہوتا ہے نہ حسّیات ہوتی ہیں۔ اسی لئے وہاں کا انسان لطیف انسانی جذبات سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں رحمی رشتے بھی محبت و شفقت سے یکسر محروم ہیں (الا ماشاءاللہ) بوڑھے والدین کو ان کی اپنی حقیقی اولاد بھی پوچھتی تک نہیں۔ دوسرے رشتوں کا کیا سوال۔ اسی وجہ سے وہاں بڑے بڑے شہروں میں بوڑھوں کے ہوسٹل قائم ہیں۔ وہاں خاندان اور اُس کے متعلقہ روابط اور محبتیں ایک داستانِ پارینہ بن چکی ہیں۔ ان حالات میں شعوری اور غیر شعوری طور پر وہاں ایک ایسے نظامِ حیات کی پیاس پیدا ہو رہی ہے جو معتدل و متوازن ہو جس میں رُوح کی تسکین کا سامان ہو اور انسانی تہذیب و تمدن کے تمام داعیات کی جائز تسکین کا بھی ——————

یہ نظام موجود ہے۔ مُنَزَّل مِنَ اللّٰہ ہے۔ یہ ہمارا دینِ اسلام ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ چند درویش
صفت لوگ جو ہر لحاظ سے اسلامی تعلیمات کا عملی پیکر ہوں، وہاں جا کر مستقل
ڈیرہ لگائیں۔ وہاں دونوں طبقوں گوروں اور کالوں میں کام کا میدان موجود
آج امریکہ میں اس بات کی ضرورت ہے کہ کچھ درویش صفت اللہ کے بندے
دعوت و تبلیغ کے لئے خود کو وقف کر دیں اور وہاں جا کر بیٹھ جائیں۔ مجھے اس وقت
بار بار حضرت معین الدین اجمیریؒ یاد آ رہے ہیں جو کفر کے گڑھ میں آئے اور جم کر بیٹھ گئے اس عز
ساتھ کہ اب اُن کا جینا مرنا اسی کفرستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان کی زندگی
کے شب و روز اُن غیر مسلموں کے سامنے ہیں وہ سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہ
کہ اُن کے مشاغل کیا ہیں۔ اُن کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ اُن کے مقاصد کیا ہی
یہ یہاں روپیہ کمانے تو نہیں آئے کہ یہاں سے کما کما کر اپنے گھر والوں کو بھیج ر
ہوں۔ اپنا معیار زندگی بلند کرنے کی دھن تو اُن پر مسلط نہیں ہے۔ یہ یہاں ک
دنیوی غرض کے لئے تو نہیں آئے! اس کے برعکس جب اُنہوں نے دیکھا کہ ی
شخص انسان دوست ہے لوگوں سے محبت کرنے والا ہے۔ اُن کا ہمدرد و خیر خو
ہے اپنے وطن سے دور یہاں اس لئے آیا کہ اُس پر لوگوں کی آخرت سنوارنے
کی دھن مسلط ہے۔ درویش اور عابد و زاہد ہے بے غرض ہے اور صرف
معبود کی رضا کا طالب ہے تو ظلمت کدہ ہند میں خواجہ اجمیری کی قولی و عملی تبلیغ
کے جو نتائج نکلے وہ آج ہمارے سامنے ہیں (میثاق صفحہ ۹-۱۰ جون ۱۹[illegible]

۱۹۷۱ء میں جب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دورہ امریکہ کی دعوت قبول
تو اُس میں دعوت و تبلیغ کی نسبت امریکی معاشرے اور تہذیب کا براہ راست
مشاہدہ کرنے کی خواہش غالب تھی۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے وہاں برصغیر
پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے ایسے جدید تعلیم یافتہ احباب کا حلقہ میسر آ گیا۔ جو
پہلے سے اقامتِ دین کے تصوّر سے آشنا تھا اور قرآن کا پیغام سننے کے لئے
بھی بیتاب تھا۔ اُن حضرات کی طلب اور خلوص ہی کا نتیجہ ہے کہ دورۂ امریکہ
کے اس پروگرام نے ایک باقاعدہ صورت اختیار کر لی ہے اور اسی کا نتیجہ
کہ مختلف مقامات پر دعوتِ رجوع الی القرآن اور دعوتِ اقامتِ دین کے

قافلے بھی منظم ہو رہے ہیں ۔
حالیہ دورہ امریکہ کی امتیازی خصوصیت دو دعوتی و تربیتی کیمپ تھے۔ پہلا کیمپ ٹورنٹو سے دو سو میل کے فاصلے پر ایک تفریحی مقام، لانگ بے کیمپ (LONG BAY CAMP) میں تنظیم اسلامی ٹورنٹو کے زیر اہتمام منعقد ہوا جبکہ دوسرے کیمپ کا اہتمام انجمن خدام القرآن شکاگو نے اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے تعاون سے امریکہ کی ریاست انڈیانا پولس میں واقع ان کے مرکزی دفتر میں کیا تھا ۔
دوسرے کیمپ کا اہتمام اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست انڈیانا پولس میں واقع اپنے مرکز میں کیا تھا۔ ان دونوں مقامات کے پروگراموں کی روداد انشاءاللہ اپنے اپنے مقام پر بیان کی جائیگی۔
بتاریخ ۱۲ جولائی سے ڈاکٹر اسرار احمد اور جناب قمر سعید قریشی کے ساتھ قدم بقدم سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ اس سفر کی پہلی منزل کراچی تھی۔ ہوائی اڈے پر تنظیم اسلامی کراچی کے امیر جناب سراج الحق سید چشم براہ تھے۔ دوپہر ان کے ساتھ گزری۔ عصر کے بعد کراچی کے کچھ رفقاء تشریف لے آئے مختصر سی نشست کے بعد ہوائی اڈے روانہ ہو گئے۔ اگلی منزل دبئی تھی۔ رات ساڑھے نو بجے دوبئی ائرپورٹ پر اترے۔ ٹرانزٹ ویزا کے حصول میں دو گھنٹے لگ گئے۔ انجمن خدام القرآن ابوظہبی کے صدر جناب نسیم الدین دیگر احباب کے ہمراہ لاونج کے باہر انتظار کر رہے تھے۔ ائرپورٹ سے نکلتے ہی مزید کوئی وقت ضائع کئے بغیر بذریعہ کار ابوظہبی کیلئے روانہ ہوئے۔ رات ڈیڑھ بجے انجمن خدام القرآن ابوظہبی کے دفتر پہنچے۔ یہ دفتر ایک خوبصورت اور کشادہ فلیٹ میں قائم کیا گیا ہے جس میں مہمان خانہ بھی ہے۔ ابوظہبی میں مختصر قیام اسی مہمان خانے میں رہا۔
۱۳ جولائی کو مختلف حضرات ملاقوں کے لئے آتے رہے بالعموم گفتگو پاکستان کے سیاسی حالات کے بارے میں رہی۔ اسی دوران شکاگو میں برادرم خورشید ملک صاحب اور جدہ میں عزیزم فیض اللہ ملک صاحب سے ٹیلیفونی رابطہ بھی ہوا۔ نماز عصر کے بعد متحدہ عرب امارات کے اخبار "خلیج ٹائمز" کے بیورو چیف جناب وارہ قدوہ نے ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو کیا۔ سوا گھنٹے تک تفصیلی گفتگو

ہوئی۔ بعد نمازِ مغرب نسیم الدین صاحب کی قیام گاہ پر انجمن کے متعلقین اور...
کے ساتھ ایک نشست ہوئی۔ احباب اور رفقاء سے مشورے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے
سید نسیم الدین صاحب کو انجمن خدام القرآن ابوظبی کا صدر مقرر کیا۔ نمازِ عشاء کے بعد انجم...
کے دفتر میں پاکستان سنٹر ابوظبی کے روحِ رواں جناب جی ایم خان نے ایک عشائیے کا اہتمام
کر رکھا تھا ———————— کم و بیش پچاس
پاکستانی احباب تشریف فرما تھے اکثر و بیشتر دوستوں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے
پاکستان کے حالات پر گفتگو کرنے کی فرمائش کی۔ جس پر امیر محترم نے مختصر انداز میں
ملک کے موجودہ حالات اور اُن کا پس منظر بیان کیا اور اصلاحِ احوال کے لئے
اپنی رائے بھی سامعین کے سامنے رکھی۔ خطاب کے بعد بھی رات دیر تک سوال و
جواب کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

اگلے روز یعنی ۱۴ جولائی کو صبح نو بجے میجر جنرل امتیاز علی ملاقات کے لئے تشریف
لائے۔ امتیاز صاحب جولائی ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے وقت سابق
وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ملٹری سیکرٹری تھے۔ آج کل سلطان ابوظبی کے
فوجی مشیر ہیں۔ ایک بجے تک ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بعد نمازِ عصر دبئی روانہ
ہوئے کیونکہ اگلے روز وہاں سے نیویارک کی پرواز میں سوار ہونا تھا۔ دبئی میں
عبدالواحد نقدہ صاحب نے چائے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہاں دبئی کے رفقاء کے
علاوہ راس الخیمہ سے محمد طفیل گوندل صاحب خاص طور پر ملاقات کے لئے تشریف
لائے تھے۔ رات ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے بڑے صاحبزادے عبدالسلام صاحب
نے جو دبئی کے معروف بینکر (BANKER) ہیں اپنی رہائش گاہ پر عشائیے کا
اہتمام کر رکھا تھا۔ شہر کے اہم کاروباری حضرات اور ہم وطنوں کی اچھی خاصی تعداد
مدعو تھی۔ یہاں بھی رات گئے تک حالاتِ حاضرہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ بمشکل ایک
گھنٹہ آرام کے لئے مل سکا۔ ڈھائی بجے رات دوبئی ائرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے
صبح ساڑھے چار بجے پی آئی اے کا طیارہ جس کی منزل نیویارک تھی دبئی کی فضا
میں بلند ہو چکا تھا اور جب مسافروں نے اکیس گھنٹے کی طویل تھکا دینے والی
پرواز کے بعد نیویارک کے بین الاقوامی کینیڈی ائرپورٹ پر قدم رکھا تو نیویارک

گھڑیاں سہ پہر چار بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ مشرق سے مغرب کا سفر کرتے ہوئے وقت میں آٹھ گھنٹے کا فرق پڑ گیا تھا۔ یا یوں کہیے کہ ... افراد کے آٹھ گھنٹے فضا کی پہنائیوں میں کھو گئے تھے۔ شام ساڑھے پانچ بجے الطاف صاحب کے ہمراہ ان کے گھر پہنچے، ظہر سے عصر تک کی نمازیں ادا کیں۔ ڈاکٹر صاحب آنکھ میں کچھ تکلیف محسوس کر رہے تھے لیکن اللہ کے فضل سے دوا ڈالنے کے بعد جلد ہی افاقہ ہو گیا۔

۱۶ جولائی کو صبح جناب شمیم صدیقی اور شمشیر بیگ صاحب (ان دونوں حضرات کا تعلق جماعت اسلامی کے حلقے سے ہے) ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ ... صاحب کے ساتھ اُن کی طویل نشست رہی۔ اس اثنا میں قمر سعید قریشی صاحب ... صاحب کے ہمراہ انکے دفتر واقع مین ہیٹن میں تشریف لے گئے۔ وہاں سے دیگر ... کے علاوہ امیر تنظیم اسلامی ملتان جناب کرنل (ریٹائرڈ) غلام حیدر ترین صاحب سے ... قائم ہوا جو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے بڑے صاحبزادے کے ... جو نیو یارک میں انجینئر ہیں پہنچ چکے تھے۔ بعد نماز مغرب فلشنگ (FLUSHING) ... اسلامک سنٹر میں درس قرآن کا پروگرام تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سورۂ آل عمران ... والے سے سوا گھنٹے ایک تقویٰ کے موضوع پر گفتگو کی۔ بعد میں جب سوال جواب ... آیا تو قرآن کے ساتھ سامعین کی گہری دلچسپی اور انہماک کا اندازہ ہوا۔

۱۷ جولائی کو ناشتے پر اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ ( ) کے ... جناب نسیم صاحب ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ یہ جماعت اسلامی کے ہم خیال احباب کی تنظیم ہے۔ طٰہٰ پبلشرز لندن کے مالک جناب افسر صدیقی بھی ... کے وقت ہی پہنچ گئے۔ وہ لندن سے خاص طور پر ملاقات کے لئے تشریف ... تھے۔ آج ڈاکٹر صاحب کے خالہ زاد بھائی جناب ممنون مرغوب صدیقی (جو ... میں REAL ESTATE کا کاروبار کرتے ہیں) کے ہمراہ نیو یارک کی سیر کا پروگرام تھا۔ دونوں مہمان بھی ہمراہ تھے۔ گیارہ بجے گھر سے روانہ ہوئے۔ پہلے نسیم صاحب کی دعوت پر اُن کی تنظیم کا مرکز دیکھا۔ بعد میں شہر کا ایک تفصیلی چکر لگایا۔ دوران ... افسر صدیقی صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ ملائشیا کی مشہور

شخصیت تنکو عبدالرحمان نے ان کا شائع کردہ پمفلٹ AND FALL OF
UMMAH پڑھکر اُن سے رابطہ قائم کیا اور ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی خواہ
ظاہر کی ۔ افسر صدیقی صاحب کا کہنا تھا کہ تنکو عبدالرحمان امیر محترم کے تجزیے
بہت متاثر تھے ۔ نیو یارک کی سیاحت و مساحت کا آغاز مین ہیٹن سے ہوا۔ ای
سٹیٹ ، TWIN TOWERS اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹرز اور مجسمہ آزادی پر
نگاہ ڈالتے ہوئے کالوں کے علاقے ہارلم (HARLEM) میں پہنچے ۔ یہاں سے دُ
سے بڑا پل عبور کر کے بروک لن (BROOKLYN) گئے ۔ واپسی پر شہ
معروف اور مصروف علاقوں کا چکر لگاتے ہوئے نمازِ مغرب کے قریب الطاف
کے گھر پہنچے ۔ اور یوں چند گھنٹوں میں امریکہ کے بلکہ دنیا کے ایک بڑے شہر
مکمل ہو گئی ۔ یہ نیو یارک کے قیام کی آخری رات تھی ۔ الحمد للہ مناسب آرا
مل گیا ۔ اگلے روز یعنی جمعہ ۸ اراگست سے کینیڈا میں مصروف ترین پروگرام
ہونے والا تھا ۔

جمعہ کی صبح کو الطاف صاحب نیو یارک کے مقامی ہوائی اڈے لاگار
(LA GAURDIA) پر پہنچا کر رخصت ہوئے ۔ سفر کی اگلی منزل کینیڈا کے
اونٹاریو (ONTRIO) کا صدر مقام ٹورانٹو تھی ۔ طیارہ نیو یارک کے وقت
مطابق صبح سات بجے روانہ ہوا اور ٹورنٹو کے وقت کے مطابق پونے نو بجے
کے ہوائی اڈے پر اتر گیا ۔ اس سفر کے دورانیے میں بھی ایک گھنٹہ اور بڑ
لیجیے کیونکہ نیو یارک کا وقت ٹورنٹو کے وقت سے ایک گھنٹہ آگے ہے ۔
کے اکثر رفقاء ایرپورٹ پر استقبال کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے ۔
میں قیام کے لئے چوہدری عبدالغفور صاحب کا نو تعمیر شدہ مکان منتخب کیا
تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ٹورنٹو کی جامع مسجد میں پہنچے جہاں ڈاکٹر صاحب کے
جمعہ کا پروگرام تھا ——————— جامع مسجد کے امام مولانا عبداللہ حکیم
نومسلم ہیں ۔ معتدل مزاج کے جہاندیدہ انسان ہیں ۔ انہوں نے دینی تعلیم مشرق
ممالک اور سعودی عرب کے شہر ریاض میں حاصل کی ہے ۔ ہر مخلص اور درد م
مسلمان کی طرح مسلمانوں کو متحد دیکھنے کے خواہاں ہیں ۔ کینیڈا کی حد تک مسلمان

یک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوششیں بھی کرتے رہتے ہیں لیکن اُنہیں برصغیر
ے ہند سے آنے والے مسلمانوں سے گلہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی اور دینی اختلافات
ساتھ لے آتے ہیں ۔ خطاب جمعہ انگریزی میں تھا ۔ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ
سُوْلَہٗ بِالْھُدٰی کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت
ورت پر گفتگو کی ۔ سامعین کا انہماک دیدنی تھا ۔ شمالی امریکہ کے اس دورے
ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انگریزی میں خطبات و دروس کے کیسٹس کا
عمدہ سیٹ تیار ہو گیا ہے ۔ اس سے انشاء اللہ توسیع دعوت کے نئے دروازے
یں گے ۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے سابق ناظم اعلیٰ اور محاسب بشیر ملک
ب جو اپنی صاحبزادیوں کو ملنے کینیڈا آئے ہوئے تھے ۔ کینیڈا کے صوبے برٹش
مبیا کے ایک بڑے شہر وان کوور (VAN CUVAR) سے ڈھائی گھنٹے کا فضائی
ر کر کے ٹورانٹو پہنچے اور نماز جمعہ میں شریک ہوئے ۔ نماز جمعہ سے فراغت کے
گھر پہنچے تو تنظیم اسلامی ملتان کے امیر کرنل ترین صاحب بھی نیویارک سے تشریف
ے تھے ۔ بعد ازاں بشیر ملک اور کرنل ترین صاحب لانگ بے کیمپ کے تربیتی
اغ میں بھی شامل رہے ۔ نماز عصر کے بعد اسی مسجد میں درسِ قرآن کا
گرام تھا ۔ سورہ کہف کے پانچویں رکوع کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے
رکوع میں بیان شدہ " باغ والوں کے واقعے کے حوالے سے انسان کے
ل میں شرک کی کارفرمائی پر بڑی پر اثر گفتگو کی ۔ ہفتہ ۱۹ جولائی کو بھی
مسجد میں بعد نمازِ ظہر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا سورۃ البلد کا درس ہوا جس کے
وال جواب کا سلسلہ بھی چلا ۔ نمازِ عصر کے بعد دوسری نشست میں سورۃ
ۃ اور سورۃ التین کی آیات کے حوالے سے " حقیقت انسان " کے موضوع
طاب ہوا ۔ دروس کی تینوں نشستوں میں حاضری اوسطاً دو سو تک رہی ۔
کہ اتوار ۲۰ جولائی کو نمازِ ظہر کے بعد ٹورانٹو کی جامع مسجد میں اس دورے
خری درس تھا اس لئے حاضری مثالی تھی ۔ سورۃ حدید کی آیات کے درس
بعد سوال جواب کا سلسلہ چار بجے تک جاری رہا ۔ درس کے بعد مسجد سے
لانگ بے کیمپ کی طرف روانگی کا پروگرام تھا اس لئے گھر سے تیار ہو کر

نکلے تھے ۔ ٹورانٹو سے اس کیمپ کا فاصلہ کم وبیش دو سو میل بن جاتا ہے۔ لانگ
بے کیمپ دراصل جھیل کے کنارے واقع ایک تفریحی مقام (CAMPING SITE)
ہے جو ابھی تعمیر و ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے ۔
۲۱ ، جولائی سے ۲۵ جولائی تک اس پانچ روزہ تربیتی اجتماع کا پروگرام
بہت بھرپور تھا ۔ اس اجتماع کی ایک اہم خصوصیت خواتین کی بھرپور شرکت تھی
اکثر رفقاء اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ شریک ہوئے ۔ گویا یہ دعوت کے ضمن میں
الاقرب فالاقرب کے اصول کا قابلِ تقلید مظاہرہ تھا ——— مجموعی
حاضری ایک سو کے لگ بھگ تھی ۔ ٹورنٹو سے ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب کی قیادت
میں تیرہ رفقاء تشریف لائے تھے ۔ شکاگو سے احمد عبد[illegible] صاحب کے ہمراہ پانچ رفقاء
شرکت کے لیے آئے ——— مانٹریال سے جناب محمد شفیق ، جناب غوث
پاشا اور جناب سمیع ملک شریک ہوئے ۔ اجتماع کے تمام پروگرام تنظیمی معاملات
سے متعلق تھے ۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے لئے یہ اجتماع خاصا پُرمشقت تھا
۲۴ جولائی کو تو انہیں مجموعی طور پر آٹھ گھنٹے بولنا پڑا ۔ ۲۵ جولائی کی صبح کو اجتماع
کے پروگرام کا آخری جزء " تجدید بیعت " تھا ۔ الحمدللہ تمام پرانے رفقاء نے
تجدید بیعت کی ۔ نئے حضرات میں ٹورانٹو سے جناب صدیق عابث اور مانٹریال
سے جناب محمد شفیق اور جناب غوث پاشا شامل تھے ۔ تجدید بیعت کے بعد
امیر تنظیم کے اختتامی خطاب اور دعا کے ساتھ تمام رفقاء نے رخت سفر باندھا
لانگ بے کیمپ سے ساڑھے نو بجے روانگی ہوئی ۔ چوہدری عبدالغفور صاحب
مانٹریال تک الوداع کہنے آئے ۔ ساڑھے گیارہ بجے آٹووا (OTTOWA) پہنچے
نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد ساہیوال کے قدیم کرم فرما جناب محبوب علی چشتی کے
ہاں دوپہر کا کھانا کھایا ۔ کچھ دیر آرام کیا ۔ نماز عصر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سورۃ
عصر کا درس دیا ۔ درس انگریزی میں تھا ۔ درس کے فوراً بعد تبلیغی جماعت
کے مقامی امیر عبدالعزیز خاں کے شدید اصرار پر ان کے گھر چائے پینے گئے
شام ساڑھے سات بجے وہیں سے مانٹریال کا عزم کیا ۔ مانٹریال میں دوران
قیام فیصل آباد کے ڈاکٹر محمد اسحق صاحب کے ہاں رہا ۔ موصوف مانٹریال یونیورسٹی میں

یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیق سے وابستہ ہیں۔ پے در پے تقاریر اور سفر کی مشقت نے
ڈاکٹر محمد صاحب کو نڈھال کر دیا تھا۔ کچھ حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ البتہ رات کے
آرام اور دوا دونوں نے صبح تک طبیعت بحال کر دی۔ ساڑھے گیارہ بجے شہر کا طائرانہ
جائزہ لینے نکلے۔ فرانس کے زیر تسلط رہنے کی وجہ سے فن تعمیر اور دیگر شعبہ ہائے زندگی
میں فرانسیسی ذوق نمایاں تھا۔ شہر کی اہم شاہراہوں سے گزرتے ہوئے ایک بجے جامع
مسجد نور پہنچے۔ نماز ظہر ادا کی۔ نماز کے بعد درس کا پروگرام تھا۔ آیۂ بِرّ کے درس
کو سامعین نے بڑی توجہ سے سنا۔ حاضری تقریباً ایک سو تھی۔ مسجد کے امام مولانا
محمد منظور خاں تبلیغی جماعت کی مرکزی شخصیت ہیں۔ مزاج میں انکسار اور تواضع خوب
رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اسحاق صاحب نے رات کے کھانے پر انہیں مدعو کر رکھا تھا۔ اس لئے
ان سے تبادلۂ خیالات کا ایک عمدہ موقع میسر آگیا۔ اتوار ۲۷ر جولائی کو پہلا پہر تو
ملاقاتوں میں گزرا۔ نمازِ ظہر کے بعد مسجد نور ہی میں درس قرآن کی نشست
تھی۔ خواتین کی اچھی خاصی تعداد بھی درس سننے آئی تھی۔ مجموعی طور پر حاضری
گذشتہ روز سے دگنی تھی۔ درس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سامعین کے سوالوں کے
جواب بھی دیئے۔ چونکہ شام پونے آٹھ بجے کی پرواز سے شکاگو جانا تھا۔ اس لئے
درس سے فارغ ہوتے ہی سیدھے گھر واپس پہنچے اور کم سے کم وقت میں تیاری کر کے
ڈاکٹر اسحاق صاحب کو الوداع کہا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد شکاگو کے ہوائی
اڈے پر اترے تو ڈاکٹر خورشید ملک اور ڈاکٹر سلطان ملک ہوائی اڈے پر تشریف
لائے ہوئے تھے۔ البتہ انہیں تلاش کرنے میں بیس پچیس منٹ لگ گئے۔ چالیس
میل کی مسافت طے کر کے انکی رہائش گاہ پر پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے۔ سوموار
۲۸ر جولائی کو اگرچہ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا مگر آرام کا موقع بھی مل گیا۔
رات ڈاکٹر طور صاحب کے ہاں دعوت تھی۔ کم و بیش تیس حضرات شریکِ طعام تھے۔
کھانے کے ساتھ ملکی حالات اور دینی معاملات پر عمومی گفتگو کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

منگل ۲۹ جولائی کو صبح کی پرواز سے شکاگو سے سان ہوزے (ST. JOSE)
پہنچے۔ یہ مقام سان فرانسسکو سے ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہوائی اڈے پر خواجہ سعید الدین
صاحب اور محمد ضیاء اللہ واحدی صاحب ہمارے منتظر تھے۔ سان ہوزے کا پروگرام خواجہ

سعیدالدین صاحب کی کوششوں کا مرہونِ منت تھا۔ اس سے قبل ہوسٹن میں بھی انہوں نے ایک پروگرام کا اہتمام کیا تھا۔ ضیاء اللہ واحدی صاحب کا تعلق بھی پاکستان سے ہے۔ امریکہ میں ایروناٹیکل انجینئر کی حیثیت سے خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ واحدی صاحب کے ہم وطن ایک پاکستانی دوست پرویز چوہدری صاحب کے ہاں آرام کیا۔ نماز عصر کے بعد سانتاکلارا اسلامک سنٹر کی مسجد النور میں درس کا پروگرام تھا۔ عصر سے عشاء تک سورۃ حج کے آخری رکوع کا درس ہوا۔ دیگر سامعین کے علاوہ عرب طلبہ کا ایک گروپ بھی بہت دلچسپی اور توجہ سے سن رہا تھا۔ یہاں میزبانی کے فرائض کراچی کے ایک صالح اور سعادت مند نوجوان محمد علی سروہدی صاحب سنبھال رکھے تھے۔ وہ یہاں اکاؤنٹس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔

بدھ ۳۰ جولائی کو نماز فجر کے لئے مسجد میں داخل ہوئے تو بلیک بورڈ پر سورۃ شوریٰ کی آیات ۳۶ تا ۳۹ درج تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے انہی آیات کو درس کا موضوع بنا لیا۔ آیات کے ترجمے سے بھی درس کے مضامین کی وسعت اور تاثیر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ترجمہ:

> "جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں، جو اپنے رب کی ہر پکار پر لبیک کہتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اپنے باہمی معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں اور ہم نے جو کچھ رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

درس کے بعد ناشتے کا مرحلہ طے کیا اور پھر ضیاء اللہ واحدی صاحب کی رفاقت میں سان فرانسسکو کی سیر کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ الاسکا سے کیلیفورنیا تک ساحل اوقیانوس کے ساتھ ساتھ چلنے والی شاہراہ "ہائی وے ون" HIGH WAY ONE پر ایک سو پچاس میل سفر طے کیا اور تقریباً تین چھوٹے بڑے شہروں اور قصبوں میں سے گزرے، خلیج کے علاقے میں وہ پہاڑیاں بھی دیکھیں جن کی وجہ سے سمندر سے اٹھنے والے بخارات کا سفر رک جاتا ہے اور پہاڑیوں کے دامن میں شدید گرمی کے موسم میں بھی کم درجہ حرارت والا ایک مخصوص علاقہ (ZONE) وجود میں آ جاتا

ہے۔ انتہائی مختصر وقت میں جو کچھ مشاہدے میں آیا اس کی تفصیل بھی بیان کی
جائے تو مضمون اُس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ ظہر کے وقت واپس پہنچ
گئے۔ ساڑھے چار بجے خواتین کے اجتماع میں ڈاکٹر صاحب نے "نظریہ مساوات
مرد و زن اور اسلام" کے موضوع پہ تقریر کی اور خواتین کے استفسارات کا جواب بھی
دیا۔ شام سات بجے عمومی پروگرام میں سورۃ صف کے درس کے بعد بھی سوال جواب
کی نشست ہوئی۔

جمعرات ۳۱ جولائی کو نماز فجر کے بعد عرب طلبہ کے وفد کے ساتھ "انقلاب ایران"
پر تبادلہ خیالات ہوا۔ یہ سان ہوزے میں آخری نشست تھی۔ محمد علی سردہی صاحب
نے دوپہر بارہ بجے ہوائی اڈے پر پہنچایا۔ شام ساڑھے سات بجے براستہ کنساس سٹی شکاگو پہنچے۔
رات شکاگو میں انجمن خدام القرآن (________
کا اجلاس ہوا۔ تمام احباب سے ملاقات بھی ہوگئی۔

جمعہ یکم اگست کو خطاب جمعہ کا پروگرام شکاگو کے مسلم کمیونٹی سنٹر (MCC)
میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سورہ نساء کی آیات کے حوالے سے ایمان کے موضوع پر
انگریزی میں خطاب کیا۔ جسے ہر لحاظ سے پسند کیا گیا۔ انگریزی کا معیار بھی
ایسا عام فہم تھا کہ اوسط درجے کے انگریزی خواں سامعین بھی بآسانی گفتگو
سمجھ رہے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد دوپہر کا کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا اور عصر سے
پہلے ہی اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (ISNA) کے صدر دفتر کی طرف
روانہ ہو گئے۔ سوسائٹی کا صدر دفتر انڈیا ناپولس کے قریب پلینز فیلڈ (PLAINS
FIELD) میں واقع ہے۔ رات بارہ بجے کیمپ میں پہنچے۔ اس کیمپ کا اہتمام انجمن
خدام القرآن شکاگو نے ISNA کے تعاون سے کیا تھا۔

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (ICNA) دراصل کینیڈا اور ریاست
ہائے متحدہ امریکہ پر مشتمل براعظم شمالی امریکہ میں آباد دنیا بھر کے مسلمانوں کی فعال
تنظیم ہے اس کے ذمہ دار حضرات کی اکثریت کا تعلق جماعت اسلامی اور اخوان
المسلمون سے ہے۔ اس کیمپ کے ذریعے اُن حضرات کو بھی ڈاکٹر اسرار صاحب کی
قرآنی فکر اور انقلابی دعوت کو سمجھنے کا ایک عمدہ موقع ملا۔ ان کی سوسائٹی کا بنیادی

مقصد مغرب کے سیکولر معاشرے میں بطور اقلیت بسنے والے مسلمانوں اور اُن کی آئندہ نسلوں کے دین اور تہذیبی تشخص کو مغرب کی بے خدا تہذیب کے سمندر میں غرق ہونے سے بچانا ہے۔ اس سوسائٹی کے زیر انتظام پورے شمالی امریکہ میں بہت سے تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں جہاں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو دیگر علوم کی تدریس کے ساتھ دینی تعلیمات سے بھی آراستہ کیا جاتا ہے۔ ایسے علاقے جہاں ابھی تک باقاعدہ تعلیمی ادارے قائم نہیں کئے جا سکے اور مسلمان بچے ملک کے عام تعلیمی اداروں میں تعلیم کرتے ہیں وہاں مسلمان طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے گرمیوں کی چھٹیوں میں SUMMER SCHOOLS منعقد کئے جاتے ہیں۔ بچوں کے علاوہ بڑوں کی تربیت اور اُن کے معاشرتی مسائل کا حل پیش کرنے کے لئے مختلف علاقوں میں یہ تنظیم کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کرتی رہتی ہے۔ پلینز فیلڈ کا یہ چار روزہ تربیتی کیمپ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ ہفتہ ۲ اگست کی صبح سے منگل ۵ اگست کی شام تک چار دنوں میں دروس کی آٹھ نشستیں ہوئیں۔ ان دروس کے ذریعے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے پہلی بار قرآن کی انقلابی فکر کو انگریزی میں ایک تدریجی ترتیب کے ساتھ بیان کیا۔ دروس کے عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱ - حقیقت و ماہیتِ ایمان

۲ - ایمان اور عمل کا تعلق

۳ - فرائض دینی کا جامع تصور

۴ - اسلامی انقلاب کیا ہے

۵ - قرآن و سنتِ رسولؐ کی روشنی میں انقلابی جماعت کی تشکیل

۶ - اقامتِ دین کے لئے انقلابی جدوجہد کے مدارج و مراحل

۷ - احیاءِ اسلام کے لئے اسلامی افکار کی تدوینِ نو — کرنے کا اصل کام

۸ - روحِ انسانی اور مدارجِ ایمان

(نوٹ: ان عنوانات کا تعین دروس کے نوٹس سے کیا گیا ہے۔ اس لئے لفظی تغیر بھی ممکن ہے۔)

ان دروس میں شکاگو کی دو مشہور دینی شخصیات مولانا عبداللہ سلیم اور مولانا عرفان احمد صدیقی نے بھی شرکت کی

۵ ر اگست کو ISNA کی اہم شخصیت جناب ناظر حسین کے ہاں دعوت ہی سوسائٹی کے ڈائریکٹر ایجوکیشن جناب طلعت سلطان اور سیکرٹری جنرل جناب اقبال یونس سے ملاقات ہوئی۔

بدھ چھ اگست کی صبح کو رفقاء تنظیم کا خصوصی اجتماع ہوا۔ جس میں تمام پرانے رفقاء کی "تجدید بیعت" کے ساتھ ایک نئے رفیق ڈاکٹر عبدالسلام انصاری صاحب نے بھی بیعت کی۔ موصوف کیمسٹری میں PHD ہیں اور امریکہ کے کالے مسلمانوں کے ایک مدرسے میں پرنسپل ہیں۔ پرجوش انقلابی خیالات کے حامل نوجوان ہیں۔ انہوں نے کالے مسلمانوں کے بارے میں بہت مفید معلومات بہم پہنچائیں ——— رفقاء کا یہ اجتماع شمالی امریکہ کے دورے کا آخری پروگرام تھا۔ دوپہر کے کھانے بعد ISNA کے احباب کو الوداع کہہ کر انڈیانا پولس کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ جہاز ساڑھے چار بجے انڈیانا پولس سے روانہ ہوا اور سات بجے نیویارک پہنچا۔ ممنون مرغوب صدیقی ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ رات انہیں کی قیام گاہ پر بسر ہوئی۔

جمعرات سات اگست کا دن سفر حج کی تیاریوں میں صرف ہوا۔ شام چھ بجے الطاف صاحب کی ٹریول ایجنسی کے زیر اہتمام ۱۴۰ حجاج کرام کے قافلے کے ساتھ نیویارک کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر جدہ کی پرواز کے بورڈنگ کارڈ حاصل کئے۔

سعودی عرب میں دو ہفتے کے قیام کے دوران حج بیت اللہ کی سعادت کے ساتھ مسجد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔ اگرچہ منیٰ میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب کو شدید بخار نے آلیا تھا لیکن اللہ نے انہیں اتنی ہمت دی کہ بخار اور نقاہت کے باوجود جمعہ ۲۲ اگست کو پروگرام کے مطابق علی الصبح لاہور پہنچ گئے۔

قارئین کی توجہ کے لیے

'میثاق' میں 'افہام و تفہیم' کے عنوان سے سلسلۂ سوال و جواب شروع کیا جا رہا ہے۔ قارئین اپنے سوال اور اشکالات مختصر الفاظ میں ادارے کو ارسال فرمائیں لیکن یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ اس سلسلے سے مقصود چونکہ اس فکر اور کام کی تشریح اور وضاحت ہے جو امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب لے کر اٹھے ہیں لہٰذا سوالات اسی سے متعلقہ موضوعات پر ہونے چاہئیں۔ فقہی مسائل پر گفتگو کرنے سے ہم پیشگی معذرت کرتے ہیں۔ ادارے کے ساتھ افتاء کا کوئی شعبہ منسلک نہیں ہے۔
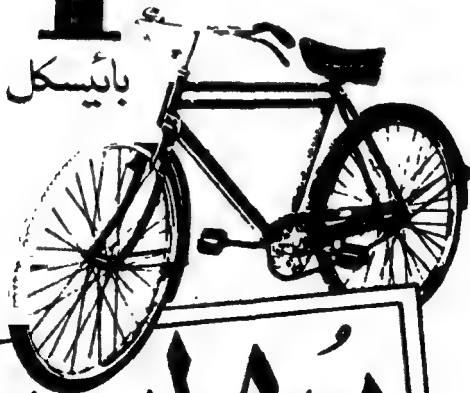
اسلام کی انقلابی قدروں کا علمبردار

میں **اشتہار** شائع کرائیں

نرخنامہ اشتہارات

سرورق:

آخری صفحہ	۱۵۰۰/= روپے	فی اشاعت
دوسرا صفحہ (اندرونی)	۱۲۰۰/= روپے	" "
تیسرا صفحہ (اندرونی)	۱۰۰۰/= روپے	" "

اندرونی عام صفحات

پورا صفحہ	۸۰۰/= روپے	" "
نصف صفحہ	۵۰۰/= روپے	" "

---

۱ اشتہار میں نہ کوئی تصویر چھپے گی نہ دینی اعتبار سے کوئی قابل اعتراض مواد!
۲ 'میثاق' کے پورے صفحے کا سائز ۵ x ۸ ہے!
۳ کسی خاص ڈیزائن کے لئے پوزیٹو فلم مشتہر حضرات کو خود فراہم کرنی ہوگی،
۴ رنگین اشتہارات میں رنگ کے لئے ۵۰ فی صد مزید معاوضہ ہوگا۔
۵ منظور شدہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو ۱۵ فی صد کمیشن دیا جائے گا،
۶ خاص حالات میں مشتہر حضرات کو بھی رعایت دی جا سکتی ہے،

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ!

پرچہ پریس میں جا ہی رہا تھا کہ ہفتہ ۲۷ ستمبر کی سہ پہر کو خانیوال سے لگ بھگ
[illegible]ٹھارہ میل کے فاصلے پر دُنیاپور کے قریب سڑک کا ایک جانگداز حادثہ پیش آگیا۔ جس
[illegible]ضمن میں سردست صرف اخباری اطلاع کا عکس شائع کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ
[illegible]ں کے لئے بھی جگہ بمشکل نکالی گئی ہے۔ بصورت دیگر پرچے کے لیٹ ہو جانیکا اندیشہ ہے۔

روزنامہ مشرق لاہور (۱) ۲۸ ستمبر ۸۶ء

[illegible]ٹر اسرار احمد کا داماد اور بھانجا ٹریفک کے حادثہ میں جاں بحق ہو گئے

خانیوال کے قریب دنیاپور میں کار اور ٹرک کا خوفناک تصادم

دونوں لاہور سے صادق آباد جا رہے تھے، آج سپردِ خاک کیا جائیگا

لاہور ۲۷ ستمبر (سٹاف رپورٹر) امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر
[illegible] احمد کے داماد اور بھتیجے محمد حمید احمد اور بھانجے عبداللہ طاہر
[illegible] آج صادق آباد جاتے ہی خانیوال کے قریب دنیاپور میں
[illegible] کے المناک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے دونوں تعمیراتی فرم
[illegible] کے ڈائریکٹر تھے اور کاروباری سلسلے میں صادق آباد
[illegible] تھے محمد حمید احمد ڈاکٹر اسرار احمد کے بھائی اقتدار احمد کے
[illegible] زادے تھے جبکہ عبداللہ طاہر سیال کے والد اللہ بخش
[illegible] صادق آباد میں رہتے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ محمد حمید احمد اور
عبداللہ طاہر سیال صادق آباد جانے کے لئے آج کار میں روانہ
ہوئے جب وہ خانیوال کے قریب دنیاپور میں پہنچے تو ایک تیز رفتار
ٹرک کار سے ٹکرا گیا حادثہ اس قدر شدید تھا کہ دونوں موقع پر
جاں بحق ہو گئے دنیاپور میں فرم انکسار لمیٹڈ کے سول ایجنٹ نے
اس حادثہ کی اطلاع لاہور میں دی ان کی میتیں لاہور لائی گئیں
دونوں کی میتیں جب لاہور پہنچیں تو ان کے گھروں میں کہرام مچ
گیا کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو دونوں کی المناک موت پر اشکبار نہ تھی
نماز جنازہ کل صبح دس بجے گارڈن ٹاؤن کے قبرستان نزد مڑیاں
ایس شاپ میں ادا کی جائے گی۔

[illegible] ڈاکٹر اسرار احمد کے داماد اور بھانجے کو سینکڑوں
سوگواروں کی موجودگی میں سپردِ خاک کر دیا گیا

میاں طفیل [illegible]

لاہور ۲۸ ستمبر [illegible] امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر
[illegible] احمد کے داماد مسٹر محمد حمید احمد اور بھانجے عبداللہ طاہر کو
[illegible] سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں نیو گارڈن ٹاؤن کے
[illegible] قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا نماز جنازہ ڈاکٹر اسرار احمد نے
پڑھائی جنازہ میں بھی امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد نائب امیر
[illegible] چوہدری رحمت الٰہی [illegible] قومی ڈائجسٹ کے مدیر
مجیب الرحمان شامی اردو ڈائجسٹ کے مدیر الطاف حسین قریشی
ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی وفاق کے ایڈیٹر مصطفیٰ صادق اقبال اکیڈمی
کے ڈائریکٹر پروفیسر منور مرزا آنکھوں کے ممتاز معالج ڈاکٹر محمد
یقین پروفیسر سی اے قادر اور دوسرے حضرات نے شرکت کی
مسٹر محمد حمید احمد مرحوم ڈاکٹر اسرار احمد کے چھوٹے بھائی اور
انکسار لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائریکٹر اقتدار احمد کے بیٹے اور عبداللہ
طاہر مسٹر اقتدار احمد کے داماد تھے دونوں کل صادق آباد
جاتے ہوئے دنیاپور کے قریب ٹریفک کے المناک حادثہ میں
جاں بحق ہو گئے تھے دونوں کی میتیں آج علی الصبح لاہور لائی
گئیں جنازہ قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن سے اٹھایا گیا

جملہ قارئین 'میثاق' سے بالعموم اور تنظیم اسلامی کے رفقاء سے بالخصوص درخواست
ہے کہ بصمیم قلب سے مرحومین کے لئے مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبرِ جمیل کی دُعا کریں (ادارہ)

اجتماع کراچی کے ضمن میں رابطہ

حسب ذیل پتوں پر کیا جا سکتا ہے:

۱۔ دفتر تنظیم اسلامی کراچی	فون:	۲۱۶۵۸۶
۲۔ امیر تنظیم اسلامی کراچی سید سراج الحق صاحب	فون:	۶۱۳۶۶۴ / ۶۱۶۹۸۰
۳۔ نائب امیر، مختار حسین فاروقی	〃	۳۱۲۵۳۸
۴۔ قیم تنظیم واحد علی رضوی	〃	۵۳۵۸۰۱
۵۔ ناظم بیت المال سید شاہد علی	〃	۶۸۱۲۹۴
۶۔ ناظم مکتبہ، عبدالواحد عاصم شائنگ ٹریڈرز، آرام باغ	〃	۲۱۴۶۰۹ / ۲۱۹۵۶۱

بر کر کر

اس شمارے کے اہم مضامین

اسرار احمد کے قلم سے

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

مینیجنگ ایڈیٹر اقتدار احمد

جلد ــــ ۳۵

شمارہ ــــ ۱۱

نومبر ۱۹۹۶ء

مطابق

[illegible]

زرِ سالانہ
۴۰ روپے

فی شمارہ ۴/- روپے

[illegible] شمارے کی قیمت ۵ روپے

مکتبہ تنظیم اسلامی [illegible]

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: [illegible]

١

مشمولات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرضِ احوال

راقم الحروف کو قارئینِ 'میثاق' کی اس حق تلفی کا شدت کے ساتھ احساس ہے کہ ان کے ساتھ براہِ راست خطاب کے ضمن میں آٹھ ماہ بعد قلم اٹھانے کی نوبت آئی بھی ہے تو بسلسلہ 'تذکرہ و تبصرہ' نہیں بلکہ صرف بغرضِ 'عرضِ احوال'!

اس عرصے کے دوران 'تذکرہ و تبصرہ' کے ذیل میں اکثر و بیشتر راقم کی تقاریر شائع ہوتی رہی ہیں جنہیں مختلف رفقاء کار اوّلاً کیسٹ کی ریل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے رہے اور اس کے بعد قدرے نوک پلک سنوار کر شائع کرتے رہے ——— اس سے یہ فائدہ تو کسی نہ کسی درجے میں حاصل ہو گیا کہ راقم کے ساتھ قارئین کا ذہنی رابطہ قائم رہا لیکن کچھ غلط فہمیاں اور ان کے نتیجے کے طور پر کچھ الجھنیں بھی پیدا ہوئیں ——— اس لئے کہ اوّل تو تقریر کا معاملہ تحریر سے ویسے ہی بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ راقم کو تو کہنہ مشق خطیب یا منجھا ہوا مقرر ہونے کا دعویٰ ہی نہیں ہے، بڑے سے بڑا مقرر بھی کسی خاص موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اس کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ اور ان کے مابین توازن اتنا برقرار نہیں رکھ سکتا جتنا تحریر میں ممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی تقریر میں مسئلہ زیرِ بحث کے کسی ایک پہلو پر تنا زور کہ دوسرا پہلو دب کر رہ جائے عین قرینِ قیاس ہے ——— پھر تقریر کی اشاعت کے متذکرہ بالا مراحل، بالخصوص "نوک پلک سنوارنے" اور "حک و اضافہ" کے دوران جو کارکن بھی یہ خدمت سرانجام دیتا ہے اس کے اپنے ذہن کا در آنا بھی صرف قرینِ عقل ہی نہیں عین مطابقِ واقعہ ہے ———!!

کچھ ایسی ہی صورتِ حال اس عرصے کے دوران راقم کی بعض تقاریر کی اوّلاً 'میثاق' اور پھر بعض اخبارات میں اشاعت سے پیش آئی ہے۔ خیال یہ تھا کہ اب جب بھی قلم اٹھاؤں گا ان کے ضمن میں پیدا شدہ مغالطوں کو رفع کر کے اپنے موقف کو بہ تمام و کمال اور توازن و اعتدال کے ساتھ پیش کر دوں گا۔ لیکن "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِم" کے مصداق "لمبے لمبے

آرزو کہ خاک شدہ!" والا معاملہ رہا ہے ـــــ اس لئے کہ گذشتہ پورے دو ماہ سے شدید نامساعد
حالات کا سامنا رہا ہے اور "عرضِ احوال" کے ضمن میں یہ چند سطور بھی رواروی ہی میں سپردِ قلم ہو رہی
ہیں۔ بہرحال ارادہ یہی ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی قارئین کا "قرض" ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔
واللہ الموفق والمستعان!

گذشتہ اشاعت کے ذریعے اس اندوہناک حادثہ کی مختصر اطلاع تو قارئین تک پہنچ چکی ہے
جو ۲۷ ستمبر ۸۶ء کو خانیوال سے جانبِ لودھراں اٹھارہ میل کے فاصلے پر دُنیاپور کے قریب پیش
آیا جس میں راقم کے ایک بھانجے عبداللہ طاہر سیال جو میرے چھوٹے بھائی اقتدار احمد کے داماد
بھی تھے ـــــ اور راقم کے بھتیجے محمد حمید احمد جو برادرم اقتدار احمد کے صاحبزادے اور ...
کے داماد تھے عین جوانی کے عالم میں اس عالمِ فانی سے راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون
ہمارے ملک میں سڑک کے حادثے روزانہ کا معمول بن گئے ہیں اور ہماری شاہراہوں نے
موت کے دریاؤں کی صورت اختیار کر لی ہے جن میں ہر روز بیسیوں قیمتی جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔
ان حادثوں پر مرحومین کے اعزہ و اقارب کے گھروں میں تو صفِ ماتم بچھتی ہی ہے، روابط اور
تعلقات کی وسعت کی نسبت سے سینکڑوں اور ہزاروں کو صدمہ اور رنج بھی ہوتا ہے ـــــ
باقی سب کے لئے ہر حادثہ ایک "خبر" کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن جن گھروں کے چراغ اس طرح اچانک
گل ہو جائیں کہ صبح کو خوش و خرم اور چاق و چوبند حالت میں گھر سے روانہ ہوئے ہوں اور شام
یا رات کو ان کی مسخ شدہ لاشیں واپس آئیں ان پر جو قیامتِ صغریٰ ٹوٹتی ہے اس کا کسی قدر
اندازہ ہر صاحبِ احساس انسان کر سکتا ہے۔!

حادثات کی اس کثرت کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس تیز رفتاری سے بڑی تعداد میں
کاروں اور دیو ہیکل اور فیل پیکر ٹرکوں اور ٹرالروں کا اضافہ ہوا ہے سڑکوں اور شاہراہوں
کی صحیح اصولوں اور مستند معیارات کے مطابق تعمیر، ان پر نشانات اور انتباہات کی صحیح اور مناسب
تنصیب اور سب سے بڑھ کر ڈرائیوروں میں ٹریفک کے قواعد و ضوابط کی پابندی کے احساس
و شعور میں اضافہ اس کے مقابلے میں عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اس خاص واقعے میں
ہوا یہ کہ ایک جانب تو ہمارے مرحوم عزیز جس سڑک پر جا رہے تھے وہ بڑی شاہراہ
(MAIN HIGHWAY) کا درجہ رکھتی ہے ـــــ اور دوسری سڑک جو

ے قطع کرتی ہے چھوٹی ہے۔ چنانچہ اصولاً چھوٹی سڑک سے آنے والی گاڑی کو زیادہ
ند ہونا چاہیے تھا لیکن غالباً یہاں بھی "صاحبِ قوت ہی صاحبِ حق بھی ہے!"
(MIGHT IS RIGHT) والا اصول کارفرما ہے کہ دیوہیکل ٹرک اپنا حق مقدم سمجھتے
ہیں خواہ وہ مین روڈ پر ہوں خواہ چھوٹی سڑک پر! ثانیاً جس چوک میں یہ حادثہ پیش آیا اس
کو کثرتِ حادثات کی بنا پر علاقہ کے لوگوں نے تو "خونی چوک" کا نام دے دیا ہے لیکن شاہراہوں
کے انتظام و انصرام کے ذمہ دار لوگوں کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ایک خاص مقام پر حادثات
کی کثرت کا سبب معلوم کرکے اس کے سدِّباب کی کوشش کریں۔

عوامی شعور کے فقدان، ڈرائیوروں اور بالخصوص ٹرک ڈرائیوروں کی بے حسی اور حکام
کی نااہلی پر مستزاد سب سے بڑی لعنت رشوت کی ہے جس نے مجرموں کو سزا و عقوبت سے بالکل
بے خوف و بے نیاز کر دیا ہے۔ چنانچہ پولیس کی کثرتِ تعداد اور تھانوں کی بہتات اور وسیع و عریض
عدالتی نظام کے باوجود ملک جنگل کے راج کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ الغرض معاملہ وہ ہے
کہ "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم!"

ہمارے جو عزیز 'مرحومین' کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں ان میں سے عبداللہ طاہر سیال
کی عمر ۳۱ برس تھی، تعلیم اور پیشہ کے اعتبار سے سول انجینئر تھے اور ایک جانب اپنے فن
میں نہایت ماہر و قابل تھے تو دوسری جانب بنیادی شخصیت کے اعتبار سے ذہانت اور شرافت
کے امتزاج کا مظہرِ کامل تھے[1] ـــــ جو ہمارے معاشرہ میں بہت نادر و کم یاب ہے، ان
کے والد اور ہمارے بہنوئی اللہ بخش سیال صاحب جماعتِ اسلامی کے نہایت قدیم اور حد درجہ
مخلص، مستقل مزاج اور انتھک کارکن ہیں۔ انہوں نے اس عظیم صدمے کو جس صبر و ہمت کے
ساتھ برداشت کیا ہے وہ ہر دیکھنے والے اور واقفِ حال کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال
ہے۔ مرحوم اگرچہ ذاتی زندگی میں دیانت و صداقت اور خودداری اور غیرت مندی ایسے اوصاف

---

[1] ہمارے نزدیکی اعزہ و اقارب میں دورانِ تعلیم امتحانات میں زیادہ نمبر حاصل کرنے میں
راقم الحروف کے میٹرک میں حاصل کردہ نمبروں کو ایک "ریکارڈ" کا درجہ حاصل تھا یعنی ساڑھے
آٹھ سو میں سے سات سو اٹھارہ ـــــ اس ریکارڈ کو ہماری دوسری نسل یعنی بہنوں بھائیوں کی اولاد
میں سے مرحوم عبداللہ طاہر نے توڑا تھا۔ جب کہ انہوں نے نو سو میں سے آٹھ سو پانچ نمبر حاصل کئے۔

حسنہ سے بتمام وکمال متصف تھے اور مذہب کے بھی پابند تھے تاہم ان کی مذہبیت نے تاحال فعّال تحریکیت کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اور اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ابھی جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے مابین 'مذبذب' تھے۔ تاہم راقم کو قوی امید تھی کہ وہ جلد ہی اس معاملے میں اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے مانند یکسو ہو جائیں گے ——— مرحوم نے چار لڑکے اور ایک بچی اپنی نشانی کے طور پر چھوڑی ہے ——— اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان بچوں کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنا دے! آمین!

محمد حمید احمد مرحوم کی کل عمر ۴۲ برس تھی، گویا وہ ابھی جوانی بھی نہیں نوجوانی کے عالم میں تھے اور ان کے بارے میں تو یہ شعر صد فی صد درست ہے کہ ؎

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے ——— حسرت تو اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

بی ایس سی سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنے والد اور بڑے بھائی کے ساتھ کاروبار میں برابر طور پر شریک ہو گئے تھے اور اپنے کاروباری حلقے میں اپنی ہنس مکھ طبیعت اور شگفتہ مزاجی کی بنا پر حد درجہ ہر دلعزیز تھے۔ میرے ساتھ مرحوم کا تعلق محض بھتیجے اور داماد ہی کا نہیں اس سے بھی بڑھ کر تنظیم اسلامی کی رفاقت اور سب سے زیادہ یہ تھا کہ انہوں نے کمال ذوق و شوق اور پوری پابندی اور مستقل مزاجی کے ساتھ قرآن اکیڈمی کا دو سالہ کورس مکمل کیا اور آخری امتحان میں امتیازی شان کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ اور اب ہم نے اس کورس میں نمایاں کامیابی حاصل کرنیوالوں کی مزید تعلیم و تربیت کے لئے جو شام کی کلاسز جاری کی ہیں وہ ان میں بھی شرکت کر رہے تھے ——— اور مجھے امید واثق تھی کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے میرے دو بیٹوں کو میرے مشن میں میرا دست و بازو بنا دیا ہے اسی طرح برادرم اقتدار احمد کی اولاد میں سے آنعزیز دین کے ہمہ وقت اور ہمہ تن خدمت کے لئے وقف ہو جائیں گے ——— لیکن اللہ تعالیٰ نے اس گُلِ نو شگفتہ کو الفاظِ قرآنی " تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا " کے مصداق فوری طور پر اپنے جوارِ رحمت میں طلب فرما لیا۔ اور یہ بھی ہم پر اسی کا فضل و کرم ہے کہ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس مصرعے کے مصداق کہ "رَضِينَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِينَا" اسکی رضا پر راضی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ برادرِ عزیز اقتدار احمد اور ان کی اہلیہ نے اس حادثۂ فاجعہ کو جس ہمت و استقامت کے ساتھ برداشت کیا اور صبر و تسلیم اور راضی برضائے رب رہنے کی جو مثال قائم کی وہ بیان سے باہر ہے۔ ان کے گھر سے بیک وقت ایک کڑیل جوان داماد اور

نوجوان و ہونہار بیٹے کی لاشیں نکلیں جس کے تصوّر ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں لیکن
ایمان و توکّل اور تسلیم و رضا کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ مردوں کی تو کیا خواتین کی آواز بھی بلند نہ ہوئی
اور بالکل وہ نقشہ نگاہوں کے سامنے آگیا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ مبارکہ میں
بیان ہوا ہے کہ " إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ ولا نقول الا ما يرضى
ربنا " یعنی آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہے لیکن ہم کہتے وہی ہیں جو ہمارے رب کو
پسند ہے "!

بندۂ مومن کی حادثاتی موت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت سے تعبیر فرمایا ہے۔
بنابریں بلاشبہ یہ دونوں مرحومین شہیدوں میں شامل ہیں۔ البتہ حمید احمد مرحوم جس جذبہ اور مستقل
مزاجی کے ساتھ دین کی خدمت کے لئے پیش قدمی کر رہے تھے اس کے پیش نظر ان کی شہادت
کا درجہ کے اعتبار سے بھی بہت بلند ہے۔ یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نوید کا ذکر
بے محل نہ ہوگا کہ :

"من جاءه الموت وهو يطلب العلم ليحيي به الاسلام فبينه وبين النبيين درجة واحدة في الجنة"
(مشکوٰۃ کتاب العلم، باب العلم، فصل سوم)

"جس شخص کو اس حال میں موت آئی کہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کے ارادے سے علم حاصل کر رہا تھا تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے مابین صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا"!

مرحوم حمید احمد نے اپنی یادگار کے طور پر دو پھول چھوڑے ہیں۔ ایک پونے دو سال کی
بچی اور ایک بچہ جو اب سوا پانچ ماہ کا ہوا ہے ـــــ عجیب بات یہ ہے کہ یہ بچہ اس سال
۶ مئی کو پیدا ہوا تھا ـــــ اور اسی روز ہم نے شہداء بالاکوٹ کی یاد میں ایک جلسہ
جناح ہال لاہور میں منعقد کیا تھا۔ چنانچہ اسی مناسبت سے راقم نے اس کا نام سیّد احمد شہیدؒ
کے نام پر سیّد احمد رکھا۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس بچے کو قتال فی سبیل اللہ والی اعلیٰ ترین شہادت
عطا فرمائے ؏ " شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را "!

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے ـــــ انہیں اعلیٰ علّیین میں داخل فرمائے
اور ان کے بچوں کو جملہ پس ماندگان بالخصوص دادا دادی کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے رکھے
آمین یا رب العالمین!!

مرحومین کی نمازِ جنازہ میں لگ بھگ ڈیڑھ ہزار اشخاص نے شرکت کی، جن م
امیرِ جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد مرکزِ جماعت کے تقریباً تمام عہدیداروں کے ساتھ ش
تھے۔ علمائے کرام میں سے مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا محمد مالک کاندھلوی ایسے بز
علماء کے ساتھ ساتھ مولانا سعید الرحمٰن علوی، قاری عبدالقیوم اور قاری سعید الرحمٰن سمیت
کثیر تعداد میں نوجوان علماء نے شرکت فرمائی۔ صحافی حضرات میں اردو ڈائجسٹ کے جوڑ
برادران (جو رشتے میں ہمارے چچا ہیں) کے علاوہ میاں محمد شفیع، مجیب الرحمٰن شامی
جناب مصطفیٰ صادق کے نام یاد رہ گئے ہیں، معروف دانشوروں میں سے پروفیسر مرزا محمد م
کے علاوہ پروفیسر سی اے قادر، ڈاکٹر عبدالخالق (شعبۂ فلسفہ جامعہ پنجاب) اور پروفیسر
کے نام قابلِ ذکر ہیں ——— راقم الحروف ان حضرات کے ساتھ ساتھ ان ڈیڑھ ہزار کے لگ
اعزہ و اقارب، رفقاء و احباب اور مرحومین کے کاروباری وابستگان و متعلقان کا تہ د
سے شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت فرمائی۔ اس لئے کہ ہمارے دین
فوتیدگی کے ضمن میں اجتماعی تقریب صرف یہی ایک ہے، باقی سب بعد کے اضافے
جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے بچا لیا ہے ——— بالعموم
میں آتا ہے کہ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے والوں کی اکثریت نماز کے فوراً بعد منتشر ہو
ہے اور تدفین اور اس کے بعد کی دعا میں صرف قریبی اعزہ ہی شریک ہوتے ہیں لیکن مرح
کی تدفین کے آخر تک جو انبوہِ کثیر موجود رہا اور تدفین کے بعد کی دعا میں جتنے لوگوں نے
شرکت فرمائی اس سے بھی شرکاء کے گہرے تاثر اور شدید دل گیری کا اندازہ ہوتا
فجزاهم الله عنا احسن الجزاء۔

تدفین (۲۸ ستمبر) کے بعد سے ان سطور کی تحریر (۱۹ اکتوبر) تک تعزیت کے
کے لئے ہر شعبۂ زندگی اور ہر طبقے اور سطح کے لوگ جس کثیر تعداد میں تشریف لائے اس سے
عربی شعر کی صداقت و حقانیت کے باوجود کہ ؎

يُعَزُّونَ عَنْكَ وَأَيْنَ الْعَزَاءُ
وَلٰكِنَّهُ عَمَلٌ مُسْتَحَبٌّ!

یقیناً ہمارا دکھ بٹا، اور ہمارے رنج و غم میں کمی ہوئی۔ راقم ان جملہ حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے
اور ان میں سے بالخصوص ان حضرات سے شکریہ کے ساتھ ساتھ معذرت خواہ بھی ہے جو

قرآن اکیڈمی تشریف لائے لیکن اس بنا پر مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی کہ میں اکثر و بیشتر برادرِ عزیز نذیر احمد کے مکان پر ہوتا تھا۔

اندرون و بیرونِ ملک سے ٹیلیفون کے ذریعے جن حضرات نے تعزیت فرمائی ان کا تو نہ شمار ہے نہ ریکارڈ۔ مزید برآں ان کا شکریہ بھی فوری طور پر 'بالمکالمہ' ادا ہو گیا تھا۔ البتہ تاروں اور خطوط کے ضخیم فائل بن گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے ہمارے زخمی دلوں کے لئے مرہم کا کام کیا۔ بعض خطوط علم و ادب کے شہ پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں، ان شاء اللہ ان میں سے چند ایک ہدیۂ قارئین بھی کئے جائیں گے ــــــ البتہ ان جملہ مکتوب نگار حضرات کا شکریہ بس اسی تحریر کے ذریعے حاضرِ خدمت ہے، راقم قلم کا ویسے بھی دھنی نہیں، خطوط نویسی میں تو بہت معذور ہے ــــــ چنانچہ ان سینکڑوں خطوط کا جواب اس کے لئے محالِ مطلق ہے ــــــ امید ہے کہ میری ان کمزوریوں کے پیشِ نظر میرے بزرگ، رفقاء و احباب میری معذرت قبول فرمائیں گے ــــ "والعذر عند کرام الناس مقبول"! ــــ اگر اس اشاعت میں گنجائش نکلی تو ان جملہ مکتوب نگار حضرات کے نام شائع کر دیئے جائیں گے تاکہ انہیں کم از کم اپنے خطوط کی رسید مل جائے۔!!!

آج کل کا عام مشاہدہ یہ ہے کہ جدید طرز کے دینی مفکر و دانشور اور داعی و مبلغ تو اکثر و بیشتر اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم محض ہیں ہی، قدیم طرز کے علمائے راسخین کے حلقوں میں بھی اب اس کی مثالیں کم ہی نظر آتی ہیں کہ ان اولادیں اور قریبی رشتہ دار بھی ان ہی کے نقشِ قدم پر گامزن اور ان کے مشن میں عملاً شریک ہوں ــــــ تو اگرچہ راقم الحروف اصلاً تو مقدم الذکر حلقے سے تعلق رکھتا ہے تاہم مؤخر الذکر طبقے سے اسے جو انس و محبت ہے

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ   لَعَلَّ اللهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحًا

کے مصداق حاصل ہے، غالباً یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ اس کی اولاد بھی کُل کی کُل اس کے مشن میں شریک ہے اور بھائیوں کی اکثریت اور قریب ترین اعزہ کی بڑی تعداد بھی اس کے معاونین میں شامل ہے ــــــ چنانچہ اللہ نے چار بیٹے عنایت فرمائے تو ان میں سے دو تنظیم اسلامی اور قرآن اکیڈمی دونوں کے 'رفقاء' کی حیثیت سے ہمہ وقت اور ہمہ تن شریک کار ہیں ہی، تیسرا اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں اسلامی معاشیات کا طالب علم اور تنظیم اسلامی میں شامل ہے۔ چوتھا بھی چھوٹا

ہے اور ہائی سکول کا طالب علم ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان دونوں کو بھی ہمہ تن ہمہ وقت دین کی خدمت کے لئے قبول فرمالے ——— اسی طرح میری پانچوں بیٹیاں تمام داماد بھی بفضلہ تعالیٰ تنظیم میں شامل اور میرے مشن میں عملاً شریک ہیں۔ بچوں اور بچیوں کی اس کیفیت میں ظاہر ہے کہ زیادہ عمل دخل میری اہلیہ کے رجحانِ طبع اور محنت و کوشش کا حاصل ہے اور اللہ کا بڑا فضل ہے کہ وہ میری صرف رفیقۂ حیات ہی نہیں رفیقۂ کار بھی ہیں۔ اولاد کے علاوہ ان کے ایک بھائی اور ایک بھتیجے بھی تنظیم اسلامی میں شامل ہیں۔ خود میرے حقیقی چچازاد بھائی ایک ہی ہیں اور بحمداللہ وہ بھی میرے شریکِ کار ہیں!

راقم کے حقیقی بھائی چار ہیں، الحمدللہ کہ ان میں سے بھی تین راقم سے باقاعدہ بیعت تنظیم میں باضابطہ شامل ہیں۔ ان میں سے برادرم اقتدار احمد کا معاملہ اس اعتبار سے منفرد کہ ایک جانب بالکل میرے اہل و عیال کے مانند ان کی بھی رفیقۂ حیات اور تمام بالغ بچے و بچیاں تنظیم میں شامل ہیں اور دوسری جانب وہ خود بھی اپنی تمام تر کاروباری مصروفیات کے باوصف انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے کاموں میں فعال طریقہ حصہ لے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلسِ منتظمہ کے منتخب رکن بھی ہیں اور یکے از اعزازی ناظمین بھی (ناظم مکتبہ و نشر و اشاعت) اور اس کے ساتھ ساتھ تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے منتخب رکن بھی ہیں اور تنظیم کے فعال کارکن بھی۔ گویا ان کی ذات میں مجھے بلاتشبیہ حضرت موسیٰؑ کی اس دعا کا عکسِ کامل نظر آتا ہے جو انہوں نے اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کے لئے کی تھی یعنی :

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝
وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝
وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝

ایک نوجوان بیٹے اور ایک جوان داماد کی اچانک موت کی صورت میں وہ جس جانکاہ صدمے سے دوچار ہوئے ہیں اس کے نتیجے میں، اور چونکہ وہ دونوں ان کے کاروبار میں بھی عملاً شریک تھے اور خصوصاً عبداللہ طاہر سیال مرحوم کو تو ان کے کاروبار کے اہم ستون کی حیثیت حاصل تھی لہٰذا اس میدان میں بھی جو فوری خلا پیدا ہوا ہے اس کے پیشِ نظر راقم کا خیال تھا کہ اب برادرِ عزیز اقتدار احمد تحریکی اور تنظیمی کاموں کے لئے کم وقت دے سکیں

ـــــ لیکن الحمدللہ کہ انہوں نے اس ضمن میں نہ صرف اپنی سابقہ ذمہ داریوں کو برقرار
ے کا عزم کیا ہے بلکہ رفیقِ مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی کراچی واپسی سے جو خلا 'میثاق'
'حکمتِ قرآن' کے ضمن میں پیدا ہوا ہے اسے بھی پورا کرنے کی اضافی ذمہ داری سنبھال لی
. چنانچہ آئندہ سے وہ ان دونوں ماہناموں کے 'مینجنگ ایڈیٹر' کی ذمہ داری بھی سنبھالیں
ـــــ اس ساری بات اور اس طویل تمہید کا اصل مقصد یہ ہے کہ قارئین کرام ان
ے خصوصی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہمت اور استقامت عطا فرمائے ـــــ اور
ے کاروباری معاملات میں جو خلا ان اچانک اموات سے پیدا ہوا ہے اسے اپنے خصوصی
ضل و کرم سے پُر فرما دے ـــــ تاکہ وہ خدمتِ دین کے ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کو یکسوئی
طمانیتِ قلب کے ساتھ کما حقہٗ پورا کر سکیں۔

خیال آیا کہ اگرچہ ذاتی امور پر گفتگو طویل ہو گئی ہے تاہم اتنا اور عرض کر ہی دیا جائے کہ
سب بھائیوں اور ہماری اولاد کو جو بھی توفیق خدمتِ دین کی نصیب ہوئی ہے اس میں
ترین حصہ ہماری والدہ صاحبہ محترمہ کی تعلیم و تربیت اور ان کی نیک آرزوؤں اور دعاؤں
ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تا دیر سلامت رکھے، ہم سب بھائیوں کی جانب سے
ن کی خدمت کا فرضِ کفایہ برادرِ عزیز وقار احمد سلمہٗ بحسن و خوبی ادا کر رہے ہیں۔ فجزاہُ اللہ
نا خیر الجزاء ـــــ راقم کو یہ عرض کرتے ہوئے حجاب محسوس ہوتا ہے کہ آج سے
۰ پانچ سال قبل سنّتِ بیعت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے والدہ صاحبہ نے بھی
ظیمِ اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی تھی!

راقم نے اس سال بیرونِ پاکستان سفر ایک تو ڈنمارک، سویڈن اور ناروے کا کیا تھا جو
رف دس روز پر محیط تھا اور جس کی روداد اور اس کے ضمن میں میرے تأثرات قارئین
ت پہنچ چکے ہیں ـــــ دوسرا بیرونی سفر ۱۲ جولائی تا ۲۳ اگست بیالیس دنوں
پھیلا ہوا تھا جس میں سے دو شب و روز اگر خالص سفر کے منہا کر دیئے جائیں تو بقیہ
لیس دنوں کی تقسیم یوں ہے: ابوظبی اور دبئی دو دن، حجازِ مقدس تیرہ دن اور شمالی امریکہ
دن ـــــ اس طرح یہ راقم الحروف کا مختصر ترین سفرِ امریکہ تھا! اس لئے کہ اس
ے قبل کے ساتوں سفر کم و بیش ایک 'چلّہ' پر مشتمل ہوتے تھے۔

گذشتہ سال میں نے اپنے بیرونی سفر کا کوٹہ حجاز و نجد کے علاوہ ابوظبی و دوبئی (
دہلی و حیدر آباد (دکن) کے لئے مختص کر دیا تھا اور شمالی امریکہ کے احباب سے معذرت
کر لی تھی بلکہ ۱۹۸۴ء میں ان پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میں آپ حضر
کو دے چکا ہوں ' اور میری " دعوتِ قرآنی " اب " بتمام و کمال " آپ حضرات کے پ
کیسٹوں کی شکل میں موجود ہے - لہٰذا اب میری ہر سال کی آمد محض ایک رسم اور تکلف ہو
ہوتی ہے - اب اس اسلامی انقلاب کی دعوت کی توسیع ___ اور اس کی اساس پر
برپا کرنا اصلاً آپ لوگوں کی ذمہ داری ہے ___ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میری یہ نصیحت
صرف ایک سال کے لئے مؤثر رہی اور اس سال پھر فرمائش کی شدت ہو گئی - ادھر میری
اس کمزوری سے احباب خوب واقف ہیں کہ رفقاء کی فرمائش کی نفی ___ اور بالخصوص
کے اصرار پر انکار میرے لئے محال ہے ! لہٰذا برادرم قمر سعید قریشی صاحب کی معیت میں
ہوا جس کی مختصر روداد گذشتہ شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔

اس وقت اس کے صرف ایک اہم پہلو کا ذکر مطلوب ہے اور وہ یہ کہ الحمد لل
اس سفر کے دوران جو دو تربیتی کیمپ شمالی امریکہ میں منعقد ہوئے یعنی ایک تنظیم اسلامی
زیر اہتمام کینیڈا میں (ٹورنٹو اور مانٹریال کے درمیان ایک گھنے جنگل میں واقع لانگ
کیمپنگ سائٹ پر) اور دوسرا انجمن خدام القرآن شکاگو کے زیر اہتمام انڈیاناپولیس
قریب پلین فیلڈ میں واقع اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (ISNA) کے مرکز میں
___ ان میں قرآن حکیم کی اس بنیادی انقلابی دعوت ' پر مستزاد جو لاتعداد کیسٹس
صورت میں پہلے ہی مسلمانانِ امریکہ کے وسیع حلقوں میں پہنچ چکی ہے ___
ایک جانب تحریکی و تنظیمی مسائل کے ضمن میں مطالعہ قرآن کا جو منتخب نصاب مرتب
ہوا ہے اس کے اکثر حصوں کے دروس اور ___ دوسری جانب سیرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کردہ انقلابِ اسلامی کے منہج و طریق اور مدارج و مراحل کی تفاصیل
مشتمل تقاریر بھی نہ صرف آڈیو (AUDIO) بلکہ (VIDEO) کیسٹس (...ETTES)
کی صورت میں محفوظ ہو گئی ہیں - ان میں سے اول الذکر اردو میں ہیں اور مؤخر الذکر انگریز
میں - اس لئے کہ ان میں ISNA کے بعض ایسے عہدیدار بھی شریک تھے جن کا تعلق متحدہ
عرب ممالک سے ہے ___ اس طرح اب اصلاً قرآن حکیم اور تبعاً سنتِ رسول

ن یک اسلامی انقلابی تحریک کے لئے تمام ضروری مواد امریکہ پہنچ چکا ہے اور اب یہ وہاں
رفقاء کا کام ہے کہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اس دعوت کو پھیلائیں ــــــ اور
ں اساس پر اقامتِ دین کی تحریک برپا کرنے کی کوشش کریں اس لئے کہ کچھ معلوم نہیں کہ شاید
مد تعالیٰ موجودہ پوری امّتِ مسلمہ کو رد کر کے یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ولا تضروه
شیئًا" کے مصداق کسی غیر مسلم قوم کو توفیقِ ہدایت دے کر اپنا دین کا جھنڈا اتھا دے۔ وما
لک علی اللہ بعزیز

ان سطور سے اصل مقصود یہ ہے کہ انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے امریکی رفقاء و
اب آئندہ راقم کو سفرِ امریکہ سے معذور سمجھیں تاکہ راقم اب اپنے تمام اوقات کو پاکستان ہی میں
لامی انقلاب کی تمہید کے لئے صرف کر سکے۔

اس ضمن میں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے ــــــ اور وہ یہ کہ جیسے کہ راقم نے بارہا
ن کیا ہے راقم امریکہ کے سفر کے ضمن میں بائبل کے الفاظ میں "کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش"
بھی پیشِ نظر رکھتا تھا یعنی ان تعلیمیافتہ اور ذہین و باصلاحیت لوگوں کو پاکستان واپس
نے پر آمادہ کرنا جو اوّلاً حصولِ تعلیم کے لئے بیرونِ ملک گئے تھے لیکن بعدازاں بہتر معاش کی
ش میں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں آباد ہو گئے ہیں اور ان میں ایک معتدبہ تعداد ایسے
وں کی بھی ہے جو دینی جذبے سے سرشار ہیں اور مختلف النوع دعوتی و تبلیغی اور تعلیمی و تدریسی
میوں سے منسلک ہیں! گویا بقول اقبال ؎

"میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!"

لیکن آٹھ سال کے تجربے سے یہ واضح ہوا کہ اوّل تو ان لوگوں کی اکثریت کو مراجعتِ وطن
پر آمادہ کرنا ہی محال ہے، اس لئے کہ اقبال کے قول کے مطابق "ہم مشرق کے مسکینوں کا دل
ب میں جا اٹکا ہے ــــ واں کنٹر سب بلوری ہیں، یاں ایک پرانا مٹکا ہے!" * ثانیاً

---

* س کے ضمن میں ایک بہت ہی دلچسپ اور عبرت آمیز بات ہے جو بالٹی مور میں آباد ایک
امراضِ چشم ڈاکٹر صاحب نے اب سے تین چار سال قبل راقم سے کہی تھی کہ "ڈاکٹر صاحب! یہ
امریکا افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کو تو لوہے کی زنجیروں میں باندھ کر یہاں لائے تھے ــــ اور ہمیں
انہوں نے یہاں سنہری زنجیروں میں جکڑ دیا ہے!" راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے
ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

جو لوگ ہجرت کر کے وطن واپس آجاتے ہیں متعدد مثالیں اس کی موجود ہیں کہ وہ لاکھ کوشش کے باوجود ــــــ اور شدید مالی نقصانات کے علی الرغم یہاں کے اس دفتری اور کاروباری نظام کے ساتھ کسی طرح سازگاری اختیار نہ کر سکے جس میں قدم قدم پر رشوت اور سفارش ہی نہیں جھوٹ اور فریب، جانبداری اور کنبہ پروری ــــــ اور ان سب پر مستزاد ایک دوسرے کی ٹانگیں گھسیٹنے اور پیٹھ پیچھے برائی کرنے کا جال بچھا ہوا ہے! لہٰذا انہیں بصد حسرت و یاس دوبارہ وطن ثانی کو خیرباد کہتے ہی بنی!

بنا بریں یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اب امریکی احباب کو ان کے حال پر چھوڑ کر اور ان کے ضمن میں دعاگوئی اور دُوردُور سے مشورہ و رہنمائی پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی توجہات کو تمام تر یہیں ہی پر صرف کیا جائے کہ اولاً "ہم" ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!" اور ثانیاً ہم پر اصل ذمہ داری یہیں کی ہے!

البتہ سعودی عرب اور متحدہ امارات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہاں کسی کو شہریت ملنے کا کوئی سوال نہیں ــــــ لہٰذا وہاں جو لوگ بغرض ملازمت یا کاروبار گئے ہوئے ہیں انہیں لازماً وطن واپس آنا ہے ــــــ جلد نہیں تو ذرا دیر سے!! ــــــ لہٰذا ان سے ربط و تعلق اور ان پر براہ راست محنت ان شاء اللہ خود پاکستان میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے لئے مفید اور بارآور ثابت ہوگی۔

امریکہ کی طرح الحمد للہ کہ گذشتہ کئی سال سے عمرہ کے لئے حرمین شریفین کی حاضری اور دعوتی و تنظیمی مقاصد کے تحت سعودی عرب کے دوسرے مقامات کا سالانہ سفر بھی معمول بن چکا ہے البتہ حج کی سعادت آخری بار ۱۹۷۶ء میں امریکہ کے پہلے سفر سے واپسی کے دوران حاصل ہوئی تھی اور گذشتہ دو تین سال سے اس کی پیاس شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ دو سال قبل

ے یادش بخیر! راقم الحروف کو زندگی میں پہلی بار حج کی سعادت والد مرحوم و مغفور اور والدہ صاحبہ مدظلہا کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں حاصل ہوئی تھی۔ اس کی یاد اس وقت اس لئے تازہ ہوگئی کہ عزیزم محمد حمید مرحوم کی ولادت کی خبر ہمیں کہ مکرمہ ہی میں موصول ہوئی تھی ــــــ آج ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کل ہی کی بات تھی "كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا" (النازعات)

ب صورت حج بدل کی بن بھی گئی تھی لیکن قرعہ میں نام نہ نکلا۔ اور دل کی حسرت دل ہی میں
رہی ـــــ اس سال اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امریکہ کا سفر پھر ایسے دنوں میں
ہوا کہ واپسی پر حج کی سعادت کا حصول ممکن ہوگیا۔

اپنے دل میں تو میں یہ ارادہ لے کر گیا تھا کہ حج کے بعد حرمین میں سے کسی مقام پر،
اں بھی اللہ تعالیٰ مناسب انتظام کرادے، قیام کرکے اپنی تالیف ''استحکام پاکستان'' کا
دسرا حصہ بعنوان ''پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا؟ کیوں! اور کیسے؟'' جس کا وعدہ
لی کتاب کے آخر میں کیا تھا سپردِ قلم کردوں ـــــ لیکن ''مَا شَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا
مْ یَشَاءْ لَمْ یَکُنْ'' مناسک حج سے فراغت ہوئی ہی تھی اور منیٰ سے واپسی کے
رختِ سفر باندھا ہی تھا کہ راقم کو ایکدم شدید تیز بخار ہوگیا۔ یہ بخار اوّلاً تو بغیر کپکپی کے
یے چڑھا تھا جیسے گرمی کی شدت سے مغلوبیت (HEAT STROKE) کا ٹمپریچر
ھتا ہے لیکن بعد میں وقفہ وقفہ سے جب بھی دافع بخار ادویات کے زیرِ اثر کچھ کم ہوتا
ا پھر شدید کپکپی کے ساتھ تیز ہوجاتا تھا ـــــ چنانچہ مسلسل پانچ دن تک بخار ۱۰۵ اور ۱۰۶
ے کے آس پاس رہا۔ نتیجۃً وہاں مزید قیام کا خیال ترک کرکے واپسی اختیار کرنی پڑی۔
ـــــ ۱۲ اگست کی سہ پہر کو جب جدہ ائرپورٹ کے لئے روانگی ہوئی تب بھی بخار ۱۰۴
رہ تھا ـــــ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی میں جلد واپسی ہی مقدر
ں کہ جدہ ائرپورٹ ہی سے بخار ہلکا ہونا شروع ہوگیا ـــــ اور لاہور پہنچنے تک صرف
مولی حرارت باقی رہ گئی۔ تاہم یہ ہلکی حرارت لگ بھگ تین ہفتے جاری رہی اور نقاہت کے
تم ہونے میں مزید دو ہفتے لگ گئے۔ اگرچہ راقم نے اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے
پنے معمولات کا آغاز جمعہ ۲۹ اگست سے کر دیا تھا۔ یہانتک کہ ۶ اور ۷ ستمبر کو راولپنڈی
ر اسلام آباد کا خاصا بھاری پروگرام بھی پورا ہوگیا۔

۱۲ تا ۱۴ ستمبر تنظیم اسلامی کی مرکزی شوریٰ کا اجلاس تھا۔ ابھی اس کی کارروائی جاری
ی تھی کہ لاہور میں اہلِ تشیع کی جانب سے میرے خلاف شورش شروع ہوگئی ـــــ
س کا اجمالی تذکرہ گذشتہ اشاعت میں ہوچکا ہے ـــــ تفصیل نہ ضروری ہے نہ مفید بلکہ ایسی
توں کا بھلا دینا ہی مناسب ہے کہ ؎

''یادِ ماضی عذاب ہے یارب — چھین لے مجھ سے حافظہ میرا!''

اللہ کا شکر ہے کہ راقم الحروف کا واقعی احساس ان دنوں یہ رہا کہ چند ایک شریر افراد
اشخاص کو چھوڑ کر جن لوگوں نے نازیبا حرکتیں کیں ان کی غالب اکثریت "اِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْن"
کے مصداق بالکل ناواقف اور غافل و بے خبر لوگوں پر مشتمل تھی جو محض سُنی سنائی باتوں
پر مشتعل ہو گئے تھے۔ اس بنا پر میرے دل کی گہرائیوں سے وہ مسنون دعا ہی نکلتی رہی جس
کا آخری ٹکڑا اوپر درج ہوا یعنی " اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْن "
غالب کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا !!

ابھی یہ ہنگامہ پوری شدت سے جاری تھا کہ اُس حادثۂ فاجعہ کی قیامت ٹوٹ پڑی جس
کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود اپنی ذاتی خواہش اور ارادے کی شدت اور بعض اہم حلقوں
اور شخصیتوں کی جانب سے شدید تقاضے کے باوجود[1] "استحکامِ پاکستان" کے دوسرے حصے
کے لیے قلم نہیں اٹھ سکا۔ اور بحالاتِ موجودہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان اور بالخصوص
لاہور میں رہتے ہوئے شاید یہ کام مستقبل قریب میں بھی نہ ہو پائے ——— لہٰذا چارو ناچار
علامہ اقبال مرحوم کے ان اشعار کے مطابق کہ :

باایں پیری رہِ یثرب گرفتم   نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام   کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ !

دوبارہ حرمین شریفین کا قصد کر لیا ہے ! ——— العزم منّا والاتمام من اللہ !

اس بار عرفات میں اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم رہا ——— اور انبساطِ قلب و
انشراحِ صدر کی کیفیات حاصل رہیں، اسی سے یہ امید بھی قائم ہوئی کہ ملک نصر اللہ خاں
عزیز مرحوم کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

روزہ میرے کریم نے فرما لیا قبول !   اب چاہے چاند ہو کہ نہ ہو عید ہو گئی

---

[1] واضح رہے کہ "استحکامِ پاکستان" کل ساڑھے سات ہزار کے لگ بھگ شائع ہوئی
تھی اور اس میں سے چھ ہزار نسخے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر قارئین کرام میں گردش
کر رہے ہیں۔

میری کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حج قبول فرمالیا ۔ ع

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را !

عرفات کے ان ہی لمحات میں اپنے آباء و امہات، اعزہ و اقارب، اہل وعیال
دوسرے بزرگوں اور محسنوں کے ساتھ ساتھ اولاً مولانا مودودی مرحوم و مغفور بھی یاد آئے
چنانچہ ان کے لئے صمیمِ قلب سے دعا ہوئی ــــــ پھر مولانا امین احسن اصلاحی یاد آئے
ــــ اور ان کے لئے دعا کے ساتھ ساتھ یہ ارادہ بھی دل کی گہرائیوں سے ابھرا کہ پاکستان
پہنچ کر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے تمام تر اختلاف رائے کے باوصف کم از کم 'تجدیدِ
ملاقات' کر لی جائے ــــ اختلاف رائے کے ضمن میں یہ عرض کرنے میں بھی کوئی حرج معلوم
نہیں ہوتا کہ ان کے لئے دوسری دعاؤں کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی قلب کی گہرائی سے نکلی کہ
اللہ تعالیٰ ان کے دل کو پھیر دے اور 'حدِ رجم' کے ضمن میں اجماعِ امت کے خلاف
جو رائے انہوں نے قائم کی ہے انہیں اس سے رجوع کی توفیق عطا فرمادے " فانّ
قلوب جمیع الناس بین اصبعین من اصابع الرحمٰن یصرفھا کیف یشاء ! " ــــ
اور بقول مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ ــــ " اصل تبدیلی تو دل کی ہوتی ہے ۔ دماغ تو کرائے
کا ملازم ہے جس جانب دل کا رجحان ہو جائے اسی جانب کے دلائل فراہم کر دیتا ہے ۔ ! "
بہرحال پاکستان واپسی پر علالت کی نقاہت کے باعث اس ارادۂ ملاقات میں تاخیر
ہوئی اور ایسے محسوس ہوا کہ غالباً پاکستان کی فضا میں اختلاف اور تشتت و انتشار کے جو آثار
ابھرے ہوئے ہیں ان کے زیرِ اثر ارادہ کچھ مضمحل سا ہوتا معلوم ہو رہا ہے تو اسی شدید نقاہت
کے عالم میں ان کے دروازے پر حاضر ہو گیا ــــ میں گیا تو اس خیال سے تھا کہ یہ
بھی ممکن ہے کہ مولانا ملنے سے صاف انکار کر دیں اور دروازے ہی سے لوٹا دیں ــــ
اور یہ بھی ممکن ہے کہ اندر بلا تو لیں لیکن پھر حسبِ عادت خوب اظہارِ غیظ و غضب فرمائیں ۔
لیکن معلوم ہوا کہ یہ " دل را بہ دل رہیست ! " والا معاملہ ہے ــــ اور مولانا
کے قلب کی کیفیت بھی بالکل بدل چکی ہے ۔ چنانچہ مولانا نے نہ صرف یہ کہ خوش آمدید کہی ۔
بلکہ معانقہ سینے سے لگایا اور بہ کمالِ لطف و کرم یہ فرمایا کہ :

" تم نے بہت اچھا کیا کہ خود آ گئے ــــ کچھ دنوں سے میرے دل کی کیفیت
بھی یہ ہو چکی ہے کہ میں اب عمر کے جس مرحلے میں ہوں اس کے پیشِ نظر میرا

رجوع کلیتہً اللہ ہی کی جانب ہو جانا چاہیے اور صرف ایک اختلاف رائے کے سوا کسی کے لیے کوئی کدورت یا بغض دل میں نہیں رہنا چاہیے۔ [لہ]

اس کے بعد، جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، نہ صرف یہ کہ مولانا مرحوم کے جنازے پر تشریف لائے بلکہ مزید تعزیت کے لیے اپنے خویش کلاں برادرم نعمان علی صاحب کی معیت میں قرآن اکیڈمی بھی تشریف لائے [ٹہ] جس کا شکریہ ادا کرنے میں نے بارِ دگر مولانا کی خدمت میں حاضری دی۔

مولانا صلاحی صاحب کے ساتھ اس 'تجدیدِ ملاقات' کی مناسبت سے اس شمارے میں اولاً مولانا کی وہ گرانمایہ تحریر شائع کی جا رہی ہے جو جون ۱۹۵۹ء کے 'میثاق' میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے زیرِ عنوان شائع ہوئی تھی جس میں 'میثاقِ الست' اور 'میثاقِ شریعت' کے ذکر سے ان مقاصد کی وضاحت کی گئی تھی جن کے پیشِ نظر 'میثاق' کا اجرا عمل میں آیا تھا۔ ثانیاً ان کی وہ تاریخی تحریر بھی شائع کی جا رہی ہے جو انہوں نے ۱۹۶۶ء میں 'میثاق' کو راقم الحروف کے حوالے کرتے ہوئے راقم پر اعتماد کے اظہار کے لیے سپردِ قلم فرمائی تھی اور جون ۱۹۶۶ء کے پرچے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میری وہ مختصر تحریر بھی شامل ہے جو اس بھاری ذمہ داری کو سنبھالتے وقت میں نے لکھی تھی۔

راقم الحروف کو اس کا تو برملا اعتراف ہے کہ وہ پرچے کے اس علمی معیار کو ہرگز قائم نہیں رکھ سکا جو مولانا کی ادارت کے دوران قائم ہوا تھا ——— اور ظاہر ہے کہ اس کی مجھ ایسے کم علم شخص سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی ——— البتہ مجھے اس امر کا پورا اطمینان ہے کہ 'میثاق' ان بیس سالوں کے دوران مقدور بھر کوشاں ان ہی مقاصد کے لیے رہا ہے جو مولانا نے اپنی تحریر میں معین کیے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تادمِ واپسیں ان ہی مقاصد کے لیے جد و جہد کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

[لہ] واضح رہے کہ اگرچہ یہ روایت بالمعنیٰ ہے نہ کہ باللفظ تاہم ان شاء اللہ اس میں لفظی فرق بھی کوئی نہ ہوا ہوگا۔ سوائے اس کے کہ مولانا نے 'رجوع' کی جگہ بہت موزوں لفظ استعمال کیا تھا جسے نقل کرنا سوءِ ادب ہے۔ [ٹہ] یادش بخیر! آج سے لگ بھگ ... سال قبل ۱۳ جنوری ۷۶ء کو مولانا برادرم نعمان علی صاحب ہی کی معیت میں قرآن اکیڈمی کی تعمیر کے آغاز کے موقع پر تقریبِ دعا میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔

۱۹

قندِ مکرر

"میثاق"

(تحریر: ــــــ مولانا امین احسن اصلاحی)

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق جون ۵۹ء)

اس رسالے کا نام "میثاق" محض اتفاق سے نہیں رکھ لیا گیا ہے۔ بلکہ یہ نام سوچ سمجھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ نام بہت بڑی حد تک اس مقصد کو تعبیر کرتا ہے جو اس کے نکالنے سے پیش نظر ہے۔

لغت میں میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہوا کرتا ہے جو شعور اور ارادے کے ساتھ پورا کرنے کیلئے باندھا جائے۔ قرآن و حدیث میں اس کا مفہوم اس سے بہت بلند ہے اور چونکہ وہی مفہوم اس نام میں ہمارے پیش نظر ہے اس وجہ سے اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں اس سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے قرآن نے اس قسم کے دو میثاقوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو وہ میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے ان کی عقل و فطرت سے لیا ہے۔ اس میثاق کا ذکر سورہ اعراف میں اس طرح فرمایا ہے۔

واذ اخذ ربك من بني آدم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا ان تقولوا يوم القيامة انا كنا عن هذا غافلين

۱۷۲ "اعراف"

اور یاد کرو جبکہ نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے یعنی انکی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو اور انکو خود انکے اوپر گواہ بنایا، پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے اقرار کیا کہ ہم گواہ ہیں کہ تو ہمارا رب ہے۔ یہ اس لئے کیا تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس چیز سے بالکل بے خبر رہے۔

یہ خدا کی ربوبیت اور اس کی توحید کا میثاق ہے جو ہر انسان کی فطرت سے لیا گیا ہے اور اس پر ہماری عقل و فطرت گواہ ہے۔

دوسرا عہد و میثاق وہ ہے ——— جو اسی میثاق فطرت کی بنیاد اور درحقیقت اسی کے تقاضوں اور مطالبات کو بروئے کار لانے کے لئے ہمارے رب نے اپنے نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے ہم سے لیا ہے۔ یہ میثاق حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک جتنے پیغمبر اور رسول آئے ہیں سب نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی اپنی امتوں سے لیا ہے۔ یہ میثاق اپنی فطرت کے لحاظ سے ہے ایک ہی میثاق لیکن چونکہ اس کی تجدید بار بار اور مختلف زمانوں میں ہوئی ہے اس وجہ سے ظاہر میں اس کے اندر تعدد پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن مجید نے ان تمام میثاقوں کا حوالہ دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ یہ میثاق اب امت محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے لیا جا رہا ہے تو اس امت کے لوگوں کا فرض ہے کہ اس میثاق پر خود بھی قائم رہیں اور دوسروں کو بھی اس کے اندر شامل کرنے اور ان کو اس پر قائم رکھنے کے لئے برابر اس کی شہادت دیتے رہیں۔ قرآن جو اس میثاق کی آخری اور مکمل دستاویز ہے، اس حقیقت کی یاد دہانی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم ومیثاقہ الذی واثقکم بہ، اذ قلتم سمعنا واطعنا واتقوا اللہ ان اللہ علیم بذات الصدور ○ (۷ - مائدہ)	اور تم اس فضل کو یاد رکھو جو اللہ نے تم پر فرمایا اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور قبول کیا اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔

ایک جگہ فرمایا ہے۔

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (۸ - حدید)	اور اللہ نے تم سے میثاق لیا ہے اگر تم مومن ہو۔

یہی میثاق ہے جو ان تمام حقوق و فرائض کو متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہم نے تسلیم کئے ہیں۔ یہی میثاق ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ہمارے حدود کار کیا ہیں اور اگر ہم ان کے پابند رہیں تو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا اور اگر ہم ان کی خلاف ورزی کریں تو اس جرم کی سزا کیا دے گا۔ یہ عہد و میثاق یکطرفہ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہر عہد و میثاق کی فطرت ہوتی ہے

ی روا رکھ ہے۔ اگرچہ تمام کائنات کے خالق و مالک کی شان اس سے ارفع ہے کہ وہ اپنے بندوں اور غلاموں پر اگر کچھ حقوق و فرائض عاید کرے تو اس کے جواب میں خود اپنے اوپر بھی ان کے حقوق عاید کرے اور اس چیز کو ایک معاہدہ اور میثاق کا درجہ دے دے لیکن چونکہ اس نے ہمیں اختیار کی نعمت عطا فرمائی ہے اس وجہ سے اس نے اس عہد و میثاق کو ہمارے اوپر یک طرفہ واجب نہیں کیا ہے بلکہ اپنے فضل و رحمت سے خود اپنے اوپر بھی اس میثاق کی ذمہ داری لی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔

اوفوا بعہدی اوف بعہدکم وایای فارھبون۔ (۴۰۔ بقرہ)

تم اس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہے میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے تو تم مجھ ہی سے ڈرو۔

اسی میثاق پر ہمارے رب کے ساتھ ہمارے تمام تعلقات قائم ہیں۔ اگر ہم اس پر قائم رہیں تو ہم اپنے رب کی وفادار رعیت اور اس کے اطاعت شعار غلام ہیں اور اس کی طرف سے ہمارے لئے فوز و فلاح اور غلبہ و نصرت کا وعدہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

ومن اوفی بما عاھد علیہ اللّٰہ فسیوتیہ اجرا عظیما (۱۰۔ الفتح)

اور جو ان باتوں کو پورا کرے گا جن کے لئے اس نے اللہ سے عہد کیا ہے تو اللہ اس کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

اور اگر ہم اس عہد کو توڑ دیں تو ہم اس کے نافرمان اور باغی ہیں اور اس جرم کی پاداش میں اس کی طرف سے ہمارے لئے لعنت اور دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی ہے، ارشاد ہے۔

والذین ینقضون عہد اللّٰہ من بعد میثاقہ ویقطعون ما امر اللّٰہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض اولئک لھم اللعنۃ ولھم سوء الدار۔ (۲۵۔ الرعد)

اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوطی کے ساتھ باندھ چکنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کیلئے لعنت اور برا ٹھکانا ہے۔

یہود کے بارے میں فرمایا ہے۔

فبما نقضھم میثاقھم لعنٰھم وجعلنا قلوبھم قاسیۃ (۱۳ - مائدہ)	بوجہ اس کہ انہوں نے میثاق کو توڑا ہم نے ان کے اوپر لعنت کر دی اور ان کے دل سخت کر دیئے

نصاریٰ کے بارے میں فرمایا ہے۔

ومن الذین قالوا انا نصاریٰ اخذنا میثاقھم فنسوا حظا مما ذکروا بہ فاغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیٰمۃ (۱۴ - مائدہ)	ان لوگوں سے جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان کا میثاق لیا تو جس چیز کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے تو ہم نے ان کے اندر اس کی پاداش میں قیامت تک کے لئے دشمنی اور نفرت کی آگ بھڑکا دی۔

یہ رسالہ اسی میثاق کی تذکیر و یاد دہانی کے لئے جاری کیا گیا ہے، اور اسی نسبت سے اس کا نام میثاق رکھا گیا ہے۔ جس طرح ہر باوفا اور ہر صداقت شعار کے لئے اس میثاق پر ہر طرح کے حالات کے اندر قائم رہنا ضروری ہے اسی طرح ہر صاحب علم اور ہر صاحب شعور کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو اس عہد و پیمان کی یاد دہانی بھی کرتا رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے اس میثاق پر قائم رہنے کا بھی عہد لیا ہے اور ساتھ ہی دوسروں کو اس سے آگاہ کرنے اور ان پر اس کی حجت تمام کرنے کا بھی عہد لیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے

واذ اخذنا من النبیین میثاقھم ومنک ومن نوح وابراھیم وموسیٰ وعیسی بن مریم واخذنا منھم میثاقا غلیظا۔ (۷ - احزاب)	اور یاد کرو جبکہ ہم نے نبیوں سے میثاق لیا، اور تم سے اور نوح سے، ابراہیم سے، موسیٰ سے اور عیسیٰ ابن مریم سے سب سے میثاق لیا اور لیا ہم نے ان سے مضبوط میثاق۔

اسی طرح اہل کتاب کے علماء اور پیشواؤں سے یہ عہد لیا گیا کہ جس کتاب اور شریعت کی پابندی کا انہوں نے اقرار کیا ہے اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ خود بھی قائم رہیں اور اس کی دعوت اور اس کے مضمرات دوسروں پر بھی آشکارا کرتے رہیں۔ فرمایا ہے۔

اذاخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب لتبیننہ للناس (۱۸۷، آل عمران)

اور یاد کرو جبکہ اللہ نے اہل کتاب سے اس بات کا میثاق لیا کہ تم اس کو اچھی طرح لوگوں کے لئے واضح کرتے رہو گے۔

یہ رسالہ اس فرض عظیم کو بلا امتیاز مذہب عام انسانوں کے اندر بھی ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور
..ر صور پر مسلمانوں کے اندر بھی اس کو ادا کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں دائروں کے اندر ان کے فطری تقاضوں
..ے سے اس کا طریق تذکیر و دعوت کسی قدر الگ الگ ہوگا۔

عام بنی نوع انسان کو یہ خدا کے میثاق ربوبیت کی بنیاد پر دعوت دیگا۔ اس میثاق کے اوپر گواہ
.. نے شارہ کیا ہے انسان کی عقل و فطرت ہے اس وجہ سے عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے اندر اس کی جو شہادتیں موجود ہیں
..بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائیگی اور پھر زندگی کے اندر اس کے جو تقاضے ابھرنے چاہئیں ان کی
نشان دہی کی جائے گی۔ جدید فلسفہ نے فکر و تحقیق کے ہر گوشے میں اگر ایک طرف حقیقت کو گم کر دینے والی
..سی مزخرفات کا انبار لگا رکھا ہے تو دوسری طرف اس میں ایسے نشانات راہ بھی پائے جاتے ہیں جن کی
..ت اس کی پیدا کی ہوئی بہت سی الجھنوں کو دور بھی کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کو اچھی طرح اجاگر کیا جا سکے
.. ذ علت کی کسوٹی پر ان کو پرکھا جا سکے۔ اس مقصد کے تحت اس رسالے میں جو مضامین شائع ہونگے
.. وہ ان ذہنوں کے لئے تریاق کا کام دیں گے جو جدید فکر و فلسفہ سے متاثر یا مسموم ہیں اور جو
..ت کو صرف عقل کی میزان میں تولنا چاہتے ہیں۔

خاص مسلمانوں کے لئے اس رسالے کی دعوت یاایہا الذین امنوا اوفوا بالعقود (۱- مائدہ)
.. دعوت ہے یعنی اللہ تعالےٰ کے آخری رسول کے واسطہ سے ہم نے اس کی جس آخری شریعت کی اطاعت
.. پابندی کا عہد کیا ہے ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ پوری وفاداری کے ساتھ اس شریعت کی
پابندی کرے۔ یہ شریعت ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان ایک میثاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم
سمعنا و اطعنا کہہ کر اس میثاق میں شامل ہوئے ہیں اور ہماری بندگی اور وفاشعاری کا تقاضا یہ ہے

۔۔۔۔ کہ اس میثاق کے مطالبات پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کریں۔ یہی میثاق درحقیقت وہ رشتہ ہے جو ہمیں خدا کے ساتھ جوڑتی اور ہمیں دنیا و آخرت میں ان نعمتوں کا حقدار بناتی ہے جن کا خدا کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ حبل اللہ ٹوٹ جائے تو پھر خدا سے ہمارا تعلق ہی سرے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ہمیں قومی اور اجتماعی حیثیت سے جینے کی کوئی مہلت ملتی ہے تو اس کی حیثیت بس ایک مہلت کی ہے۔ یہ مہلت اس لئے نہیں ملتی کہ ہم عزت کے ساتھ جینے کے حقدار ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کے تحت محض اس لئے ملتی ہے کہ ڈوبنے کے لئے ہماری کشتی اچھی طرح بھر جائے۔ اس مہلت کے دوران میں اگر زندگی کے کسی گوشے میں چمک دمک کے کچھ آثار بھی نظر آئیں تو اس سے بھی کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس کی مثال مریض کے اس سنبھالے کی سی ہے جو وہ دم توڑنے سے پہلے لیا کرتا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو ۔۔۔ کہ سمعنا و اطعنا کا اقرار کر کے خدا سے کوئی عہد و میثاق باندھا ہے تو ان لوگوں نے باندھا ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے۔ اس عہد و میثاق کی ذمہ داری ان لوگوں پر کس طرح عاید ہوتی ہے جو بعد کے زمانوں میں پیدا ہوئے۔ اس وسوسے سے اپنے ذہن کو پاک رکھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جب تک ہم اللہ کو اپنا رب، قرآن مجید کو اس کا صحیفۂ آسمانی، محمد رسول اللہ ؐ کو اپنا واجب الاطاعت ہادی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس امت کا ہراول دستہ مانتے ہیں اس وقت تک ہم اس سمعنا و اطعنا کی ذمہ داری سے انکار کرنے کا حق نہیں رکھتے جس کا اقرار صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔ اس اقرار کی ذمہ داری صحابہؓ نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کی اور پھر ان سے یہ ذمہ داری درجہ بدرجہ بعد کی نسلوں کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ ہر عہد کے اخیار و صالحین نے اس ذمہ داری کو اپنے اسلاف کا سب سے زیادہ مقدس ورثہ سمجھا اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے جو اقرار صالح اگلوں نے کیا تھا پچھلوں نے بھی اس کو اپنا اقرار تسلیم کیا۔ اس لئے کہ اس اقرار کا انکار یا اس سے گریز و فرار ان کے لئے اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ اپنے ان اسلاف سے خدانخواستہ برأت کا اور اسلام سے اپنے قطع تعلق کا اعلان نہ کر دیں۔

ہم اگر ان مقدس اسلاف ہی کے خلف ہیں اور اپنے اس ماضی سے بیزار نہیں ہو گئے ہیں۔ تو

...عت کا جو اقرار ہمارے اسلاف نے کیا ہے وہ خود ہمارا بھی اقرار ہے اور ہم اپنی ناخلفی کا ... ئے بغیر اس اقرار کی ذمہ داریوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے ... وئی مسلمان جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل حقیقتوں سے بھی کوئی ...ب نظر انکار نہیں کر سکتا۔

ہم میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو سرے سے اس بات سے واقف ہی نہیں ہیں کہ ہمارے رب کے ... تعلق کسی میثاق کے تحت ہے اور اس میثاق کی ہر چیز لکھی ہوئی اور متعین ہے اور ہم نے سمعنا ... نے اقرار کے ساتھ اس کی تصدیق کی ہے۔ ان لوگوں کا تعلق خدا کے ساتھ محض رسمی اور رواجی ہے ... وہ کسی حد تک اس کو نباہتے ہیں تو اسی حیثیت سے اس کو نباہتے ہیں نہ اس کے اندر کوئی زندگی ہے ... وئی حرارت۔

ہم میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس معاہدے کی بہت سی دفعات سے متعلق مختلف قسم کے ... شبہات میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے شبہات و شکوک کو برملا ظاہر بھی کرتے ہیں۔ بعض ان کو ظاہر تو نہیں کرتے لیکن ان کو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں جس کے سبب سے وہ ... و بے یقینی کے مریض بن کر رہ گئے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس میثاق کی دفعات میں سے صرف انہی دفعات کو ماننا چاہتے ... جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہیں۔ ان دفعات کو یہ نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں جو ان کی خواہشات ... میں۔ یہ ترک و اختیار وہ من مانے طور پر یک طرفہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو ... ن کے رب کے درمیان ہوا ہے جس میں کوئی ادنیٰ تغیر و تبدل بھی وہ خدا کی مرضی کے بغیر ... نے مجاز نہیں ہیں۔ انہوں نے اس رد و قبول کے لیے کسوٹی تہذیب حاضر کو قرار دیا ہے جو ... کسوٹی پر پوری اتر جائے وہ سر آنکھوں پر اور جو چیز اس پر پوری نہ اتر سکے وہ ناقابل التفات۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو مختلف قسم کی طفلانہ تاویلوں سے اس پورے میثاق کو ایک ...بچۂ اطفال بنائے ہوئے رہے ہیں اور اس کی ہر دفعہ کی ایسی ایسی تاویلیں کر رہے ہیں جن سے صاف ... معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر مقصد تو درحقیقت پورے میثاق کا انکار ہے لیکن کھلم کھلا

—— کہ اس میثاق کے مطالبات پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کریں۔ یہی میثاق درحقیقت وہ رشتہ ہے جو ہمیں خدا کے ساتھ جوڑتی اور ہمیں دنیا و آخرت میں ان نعمتوں کا حقدار بناتی ہے جن کا خدا کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ حبل اللہ ٹوٹ جائے تو پھر خدا سے ہمارا تعلق ہی سرے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ہمیں قومی اور اجتماعی حیثیت سے جینے کی کوئی مہلت ملتی ہے تو اس کی حیثیت بس ایک مہلت کی ہے۔ یہ مہلت اس لئے نہیں ملتی کہ ہم عزت کے ساتھ جینے کے حقدار ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کے تحت محض اس لئے ملتی ہے کہ ڈوبنے کے لئے ہماری کشتی اچھی طرح بھر جائے۔ اس مہلت کے دوران میں اگر زندگی کے کسی گوشے میں چمک دمک کے کچھ آثار بھی نظر آئیں تو اس سے بھی کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس کی مثال مریض کے اس سنبھالے کی سی ہے جو وہ دم توڑنے سے پہلے لیا کرتا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو —— کہ سمعنا و اطعنا کا اقرار کرکے خدا سے جو عہد و میثاق باندھا ہے تو ان لوگوں نے باندھا ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے۔ اس عہد و میثاق کی ذمہ داری ان لوگوں پر کس طرح عاید ہوتی ہے جو بعد کے زمانوں میں پیدا ہوئے۔ اس وسوسے سے اپنے ذہن کو پاک رکھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جب تک ہم اللہ کو رب، قرآن مجید کو اس کا صحیفۂ آسمانی، محمد رسول اللہؐ کو اپنا واجب الاطاعت ہادی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس امت کا ہراول دستہ مانتے ہیں اس وقت تک ہم اس سمعنا و اطعنا کی ذمہ داری سے انکار کرنے کا حق نہیں رکھتے جس کا اقرار صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔ اس اقرار کی ذمہ داری صحابہؓ نے بعد آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کی اور پھر ان سے یہ ذمہ داری درجہ بدرجہ بعد کی نسلوں کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ ہر عہد کے اخیار و صالحین نے اس ذمہ داری کو اپنے اسلاف کا سب سے زیادہ مقدس ورثہ سمجھا اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے جو اقرار صالح اگلوں نے کیا تھا پچھلوں نے بھی اس کو اپنا اقرار تسلیم کیا۔ اس لئے کہ اس اقرار کا انکار یا اس سے گریز و فرار ان کے لئے اس وقت تک ممکن ہی نہ تھا جب تک وہ اپنے ان اسلاف سے خدانخواستہ برأت کا اور اسلام سے اپنے قطع تعلق کا اعلان نہ کر دیں۔

ہم اگر ان مقدس اسلاف ہی کے خلف ہیں اور اپنے اس ماضی سے بیزار نہیں ہوگئے ہیں۔ تو

...ت کا جو اقرار ہمارے اسلاف نے کیا ہے وہ خود ہمارا بھی اقرار ہے اور ہم اپنی ناخلفی کا
...نے بغیر اس اقرار کی ذمہ داریوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے
...و مسلمان جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل حقیقتوں سے بھی کوئی
...ب نظر انکار نہیں کر سکتا۔

...میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو سرے سے اس بات سے واقف ہی نہیں ہیں کہ ہمارے رب کے
...تعلق کسی میثاق کے تحت ہے اور اس میثاق کی ہر چیز لکھی ہوئی اور متعین ہے اور ہم نے سمعنا
...نے اقرار کے ساتھ اس کی تصدیق کی ہے۔ ان لوگوں کا تعلق خدا کے ساتھ محض رسمی اور رواجی ہے
...وہ کسی حد تک اس کو نباہتے ہیں تو اسی حیثیت سے اس کو نباہتے ہیں نہ اس کے اندر کوئی زندگی ہے
...ول ...

...میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس معاہدے کی بہت سی دفعات سے متعلق مختلف قسم کے
...و شبہات میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے شبہات و شکوک کو برملا ظاہر بھی کرتے ہیں۔
...ن کو ظاہر تو نہیں کرتے لیکن ان کو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں جس کے سبب سے وہ
... بے یقینی کے مریض بن کر رہ گئے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس میثاق کی دفعات میں سے صرف انہی دفعات کو ماننا چاہتے
... جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہیں۔ ان دفعات کو یہ نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں جو ان کی خواہشات
...ن ہیں۔ یہ ترک و اختیار وہ من مانے طور پر یک طرفہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک معاہدہ ہے۔ جو
... ان کے رب کے درمیان ہوا ہے جس میں کوئی ادنیٰ تغیر و تبدل بھی وہ خدا کی مرضی کے بغیر
...نے مجاز نہیں ہیں۔ انہوں نے اس رد و قبول کے لیے کسوٹی تہذیب حاضر کو قرار دیا ہے جو
... کسوٹی پر پوری اتر جائے وہ سر آنکھوں پر اور جو چیز اس پر پوری نہ اتر سکے وہ ناقابل التفات۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو مختلف قسم کی طفلانہ تاویلوں سے اس پورے میثاق کو ایک
... طفال بنائے ہوئے رہے ہیں اور اس کی ہر دفعہ کی ایسی ایسی تاویلیں کر رہے ہیں جن سے صاف
...ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر مقصد تو درحقیقت پورے میثاق کا انکار ہے لیکن کھلم کھلا

انکار کے بجائے انھوں نے تاویل باطل کی راہ اختیار کی ہے۔

بعض لوگوں نے سرے سے اس ذات ہی کو مجروح کرنا شروع کر دیا ہے جو اس میثاق کا واسطہ ہے اور جس نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے ہم سے یہ میثاق لیا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اس میثاق کا وہ سارا ریکارڈ مشتبہ ہے جو اس ذات کے قول و فعل سے متعلق ہے۔

بعض لوگوں نے حکمت عملی یا عملی سیاست کے نام سے اس میثاق کی قطع و برید کے لئے اس میں ایک نئے اصول رد و قبول کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت اس میثاق کی ہر دفعہ کالعدم کی جا سکتی ہے۔

یہ رسالہ مذکورہ بالا سارے گروہوں کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے گا اور ان شاء اللہ ہر باب میں اس کا انداز بحث علمی اور تحقیقی ہوگا۔ اس میں نقل کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی وہ جگہ دی جائے گی جس کی وہ مستحق ہے تاکہ وہ لوگ بھی ان مباحث سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں جو جدید نظریات کے شعبدوں سے متاثر ہیں۔ اس طرح کے لوگ ان شاء اللہ اس رسالہ کے ہر نمبر میں پڑھنے کے لئے روح پرور اور صحت بخش غذا پائیں گے۔ ہمارے کالجوں میں بھی اور دینی مدرسوں میں بھی ایسے بہت سے ذی صلاحیت اور ذہین لوگ موجود ہیں جو خدا کی شریعت کو ان پہلوؤں سے سمجھنا چاہتے ہیں جن پہلوؤں سے موجودہ عہد میں اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن وہ اپنی اس تشنگی کو دور کرنے کا کوئی سامان نہیں پا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ رسالہ کے اس باب کے مضامین ان کے لئے اچھا نسخہ مواد فراہم کریں گے۔

اب میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں اور اس رسالہ کے تمام قارئین سے اس دعا پر آمین کہنے کی درخواست کرتا ہوں۔ اے رب! تیرے چند عاجز بندوں نے تیرے دین کی ایک حقیر سی خدمت انجام دینے کے لئے یہ کام شروع کیا ہے۔ اے رب تو اس کام کو قبول فرمانے والا، سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے رب جب تیرے ساتھ اپنے عہد کو تازہ کرنے کا عزم کرتے ہیں تو اس عزم میں ہماری مدد فرما اور اے رب ہمیں تو توفیق دے کہ ہم تیرے دوسرے بندوں کے اندر بھی اس عزم کی گرمی پیدا کر سکیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ایک طویل غیر حاضری کے بعد میثاق اپنے قدر دانوں کی خدمت میں پھر حاضر ہو رہا ہے۔ اس غیر حاضری
بے بڑی ندامت ہے لیکن اس دوران میں حالات کچھ ایسے رہے کہ میں اپنے آپ کو بالکل مجبور سمجھتا ہوں۔
... اب میں نے بہت سوچ بچار کے بعد رسالے کو کلیتہً برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے
...رد دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سلمہٗ ایک ذہین، سرگرم، اسلامی ذہن و فکر رکھنے والے نوجوان اہل قلم ہیں۔
...مید ہے کہ وہ نہ صرف رسالے کو پابندی کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے بلکہ میں ان کی محنت اور قابلیت
...ہ یہ توقع بھی رکھتا ہوں کہ وہ صوری اور معنوی دونوں ہی اعتبار سے اس کے معیار کو اونچا کریں گے۔
...یکھئے کہ میری یہ توقع پوری ہو۔

...سالے کو ڈاکٹر صاحب کے سپرد کر دینے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اب میرا کوئی تعلق اس
...ے ساتھ باقی نہیں رہیگا۔ اس کے انتظامی امور سے تو بے شک مجھے اب کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن
...ی قلمی تعاون برابر اس کو حاصل رہیگا۔ میری تفسیر —— تدبر قرآن —— کی قسطیں اس میں پابندی کے
...ہ شائع رہیں گی۔ دوسرے مذہبی، علمی اور سیاسی مسائل بھی، جن پر میں اظہار خیال ضروری سمجھوں گا میرے
...رت سے اس میں زیر بحث آتے رہیں گے۔ رسالے کا مقصد اور اس کا نصب العین بھی وہی رہے گا جو اب
...ا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ابتدا سے نہ صرف اس کے قدر دانوں میں سے ہیں بلکہ برابر اس کے معاونوں
...ں سے رہے ہیں۔ جس مقصد کے لئے یہ پرچہ نکالا گیا تھا وہ جس طرح مجھے عزیز ہے اسی طرح انہیں بھی
...یز ہے۔ اس وجہ سے مقصد کے معاملے میں بھی کسی رجعت یا انحراف کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ بلکہ توقع
...ہے کہ اس پہلو سے بھی اس میں ترقی ہوگی۔ جو رفقاء اب تک اپنے قلمی تعاون سے میرا ہاتھ بٹاتے رہے
...ہیں وہ ان شاء اللہ بدستور ڈاکٹر صاحب کا بھی ہاتھ بٹاتے رہیں گے۔

—— امین احسن اصلاحی

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ امابعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جماعت اسلامی کی پالیسی پر اپنے تنقیدی بیان کی اشاعت کے بعد میں اس بات کی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ ایک پرچہ ایسا ہونا چاہیئے جو اسی دعوت تجدید و احیائے دین کا علمبردار ہو جسے لیکر جماعت اسلامی اٹھی تھی۔ اسی غرض سے ایک ماہنامے کے ڈیکلریشن کی درخواست بھی میں نے متعلقہ حکام کو دے دی تھی جو بفضلہٖ تعالیٰ منظوری کے جملہ مراحل طے کر چکی ہے۔ لیکن عین وقت پر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے حکم دیا کہ کوئی نیا پرچہ نکالنے کے بجائے "میثاق" کو سنبھالو۔ چنانچہ مولانا کے حکم کی تعمیل میں میں قارئین میثاق کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔

"میثاق" کی ادارت کی ذمہ داری کو میں کسی نئے پرچے کے مقابلے میں بہت بھاری محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "میثاق" اپنا ایک ماضی رکھتا ہے اور اس کا ایک معیار متعین ہو چکا ہے اور مجھے اپنی کم مائگی اور ناتجربہ کاری کا شدید احساس ہے۔ میں اس ذمہ داری کو ہرگز قبول نہ کرتا اگر مجھے پختہ یقین نہ ہوتا کہ ان کا پورا تعاون "میثاق" کو حاصل رہے گا اور وہ اس کی سرپرستی حسب سابق فرماتے رہیں گے۔

جیساکہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے، مجھے "میثاق" کے حلقے میں اول روز سے شرکت کا شرف حاصل ہے اور جن مقاصد کے تحت اس پرچے کا اجراء ہوا تھا ان سے مجھے کلیتہً اتفاق ہے لہٰذا "میثاق" کے اس دورِ جدید کے افتتاح کے موقع پر اپنی جانب سے کچھ کہنے کے بجائے میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی وہی تحریر من و عن شائع کر رہا ہوں جو آج سے سات سال قبل "میثاق" کے اجراء کے موقع پر پرچے کے مقاصد اور اس کی پالیسی کے خطوط کی تعیین کے لئے مولانا نے قلمبند فرمائی تھی۔ میری زیر ادارت "میثاق" انشاءاللہ انہی مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں رہے گا۔

میں آخر میں قارئین میثاق سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ میرے دل و دماغ کو حق کی قبولیت اور زبان و قلم کو حق کے اظہار کی توفیق اور صلاحیت عطا فرمائے۔ آمین

خاکسار

اسرار احمد

متحدہ شریعت محاذ اور تنظیمِ اسلامی

اسرار احمد

بہ سرحد سے سینیٹ کے دو معزز اراکین، مولانا سمیع الحق اور قاضی عبداللطیف
ب سے پیش کردہ شریعت بل نہ صرف موجودہ اربابِ اقتدار بلکہ تمام مسلمانانِ
تان کے لیے ایک شدید آزمائش کی صورت اختیار کر گیا ہے — اس
صوبۂ سرحد یہ اعزاز بھی حاصل کر چکا ہے کہ اُس کی صوبائی اسمبلی نے شریعت
کے حق میں باضابطہ قرارداد منظور کی — اس پر بلاشبہ سرحد کے
ان کے نمائندگان جملہ اسلامیانِ برِّعظیم پاک و ہند کی جانب سے ہدیۂ تبریک
ہیں۔ اس لیے کہ پاکستان کے قیام میں اصل فیصلہ کن مساعی اُن علاقوں
مسلمانوں ہی کی تھیں جو اب بھارت میں شامل ہیں اور ان جملہ مساعی کی اصل غرض و
اللہ کے دین کی سربلندی اور اسلامی طرزِ زندگی کے احیاء کے سوا اور کچھ نہ تھا!
پاکستان کی موجودہ مرکزی حکومت، اس سے قطع نظر کہ اسے خود اپنے
لیے دستوری اور اخلاقی جواز کس حد تک حاصل ہے، اس معاملے میں
جائے ماندن، نہ پائے رفتن، کی سی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ خود اُس
پیش قدمی، کر کے دستور میں نویں ترمیم کا جو بل سینیٹ سے منظور کروایا تھا،
ابھی سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن کر رہ گیا ہے — چنانچہ اسے بھی نیشنل اسمبلی
میں لایا گیا — اور سابق سپیکر جناب فخر امام کا بیان ریکارڈ پر آ چکا ہے
دن سے زائد عرصہ گزر جانے کے باعث اُس کی سینیٹ کی منظوری بھی
کالعدم ہو چکی ہے — واللہ اعلم! — اب وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو نے
اختیار کیا ہے کہ حکومت خود اپنی جانب سے 'شریعت بل' پیش کرے
ہے یہ سوالات کہ اس کی نوبت کب آئے گی؟ اور اُس بل کی نوعیت کیا

ہو گی؟ تو ظاہر ہے کہ ان کے جوابات تاحال پردۂ غیب میں ہیں۔ اگرچہ قرائن سے
یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی گول مول اور غیر مؤثر چیز ہو گی جو تہذیب
کے دلدادگان اور حاکمیتِ عوام کے علمبرداروں کے ہاتھوں نازک نہ ہو سکے!

مولانا سمیع الحق اور قاضی عبد اللطیف کے پیش کردہ بل کی بعض خامیوں کی
جانب اسلامی نظریاتی کونسل نے توجہ مبذول کرائی — اور بعض پہلوؤں پر
کرام کے مختلف حلقوں نے قابلِ اصلاح قرار دیا — چنانچہ حال ہی
تمام مکاتبِ فکر کے علماءِ کرام کی ایک کمیٹی نے اس بل کا تجزیہ کر کے بعض
میں ترامیم کر دی ہیں اور اس کو تمام مکاتبِ فکر کا مشترکہ شریعت بل قرار
ہے۔ اور اسے منظور کرانے کی جدوجہد کے لیے ایک "متحدہ شریعت محاذ"
وجود میں آ گیا ہے!

اس متحدہ شریعت محاذ میں وہ تمام اہم مذہبی عناصر جمع ہیں جنہوں نے
صدر ضیاء الحق کی سابقہ خاص مارشل لائی حکومت کے دوران حکومت اور ایم آر ڈی
کے بین بین روش اختیار کی تھی اور پھر صدر صاحب کے ترمیم کردہ دستور
تحت منعقد ہونے والے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ بھی لیا تھا، جیسے جماعت
اسلامی بحیثیتِ مجموعی، جمعیت علماءِ اسلام کا مولانا درخواستی گروپ جمعیت
اہلحدیث کا میاں فضل حق گروپ اور بریلوی مکتبِ فکر کے بعض معتقد
مستقل حیثیت کے حامل علماءِ کرام ان اہم جماعتوں کے ساتھ ساتھ بعض دوسری
چھوٹی دینی تنظیمیں اور انجمنیں بھی اس متحدہ محاذ میں شامل ہو گئی ہیں جن میں
ایک تنظیمِ اسلامی بھی ہے!

اس کے بالمقابل بعض دوسرے دینی حلقے اس شریعت بل اور متحدہ شریعت محاذ
مخالفت ڈنکے کی چوٹ کر رہے ہیں۔ ان میں سے جمعیت علماءِ اسلام کا مولانا فضل
گروپ تو ایم آر ڈی کا فعال اور موثر جزو ہے، جمعیت اہلحدیث کے علامہ احسان
گروپ کو بھی ایک نسبت ایم آر ڈی سے حاصل رہی ہے اس لیے کہ علامہ صاحب موصوف
تحریکِ استقلال کے ناطے ایم آر ڈی میں شامل رہے ہیں، رہی جمعیت علماءِ پاکستان

...ن کے قائدِ اعلیٰ مولانا نورانی میاں ہیں تو وہ اگرچہ ایم آر ڈی میں تو کبھی شامل نہیں ہوئی، ...ہم اُس کا سیاسی مُوقف وہی ہے جو ایم آر ڈی کا ہے ۔

اِس معاملے میں راقم الحروف اور تنظیمِ اسلامی کا مُوقف بعض حضرات کے لیے ...ن کا باعث ہُوا ہے لہٰذا اس کی قدرے وضاحت لازمی ہے :

سیاسی معاملات میں راقم کا مُوقف بالکل وہی ہے جو ایم آر ڈی کا یا مولانا ...ورانی میاں کا یا علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب کا ہے ۔ چنانچہ راقم کے نزدیک اوّلاً وہ ...ریفرنڈم جس کی اساس پر ضیاء الحق صاحب صدر بنے ہوئے ہیں، پاکستان کی ...چالیس سالہ دستوری تاریخ کا سب سے بڑا فراڈ تھا، ـــــ ثانیاً ضیاء الحق صاحب ...کو کوئی حق حاصل نہ تھا کہ ۷۳ء کے متفق علیہ دستور میں من مانی ترامیم کر دیں، ثالثاً ...اس ترمیم شدہ دستور کے تحت منعقد ہونے والے غیر جماعتی انتخابات اور اُن کے ...نتیجے میں قائم ہونے والی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو کوئی دستوری اور اخلاقی جواز ...نہیں ہے ـــــ اور رابعاً ملک کی سلامتی اور سالمیت کا تقاضا یہی ہے کہ جلد از ...جلد ایسے عام انتخابات جماعتی بنیادوں پر منعقد کیے جائیں جن میں کسی پارٹی کے ...حصہ لینے پر کوئی پابندی نہ ہو ـــــ

لیکن دوسری جانب راقم الحروف اور تنظیمِ اسلامی کے نزدیک شریعت کی ...بالادستی کا مسئلہ ہر شئے سے بالاتر ہے اور اس معاملے میں عمل کلیتۃً اس اصول ...پر ہونا چاہیے کہ "لاتنظروا الیٰ من قال ولکن انظروا الیٰ ما قال" ...یعنی یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کہہ کیا رہا ہے !" لہٰذا ...شریعتِ اسلامی کی بالادستی کے مسئلے پر جملہ مسلمانانِ پاکستان کو بلا لحاظِ مسلک و ...مذہب سیاسی مسائل کے ضمن میں اپنے اختلافِ رائے کو برقرار رکھتے ہوئے ایک ...میثاق ...م پر جمع ہو جانا چاہیے ـــــ بالکل ایسے جیسے ایم آر ڈی میں شامل جماعتیں ...شدید ...اختلافات کے باوجود چند نکات پر مجتمع ہو گئی تھیں ! ـــــ چنانچہ خود ...راقم الحروف نے اب سے لگ بھگ چھ ماہ قبل ایک "متحدہ مذہبی محاذ" یا "تحفظ ...شریعت ...ہوا ... کی تجویز ... جس کی تفصیلی وضاحت اپریل ۸۶ء

کے 'میثاق' میں شائع ہوئی تھی ۔ موجودہ "متحدہ شریعت محاذ" چونکہ ر
کے قبیل ہی کی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے کی بات ہے ۔ لہٰذا راقم اپنے جمی
رفقاء کار سمیت اس میں شرکت کو اپنے حق میں موجب سعادت سمجھتے
اور اُن بزرگ علماء و زعماء کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے راقم الحروف اور تنظ
اسلامی کو اس مبارک کام میں شرکت کا اہل سمجھا اور اس کی دعوت دی ۔

ساتھ ہی ہم مولانا سید حامد میاں مدظلہ' اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب
مولانا نورانی میاں بالقابہ اور مولانا عبدالستار خان نیازی، اور علامہ احسان
اور ان کے رفقاء و احباب سے بھی پُر زور استدعا کرتے ہیں کہ وہ بھی اپنے
مؤقف کو برقرار رکھتے ہوئے شریعتِ اسلامی کی بالادستی کی اِس اہم
جدوجہد میں شریک ہوں اور یہ ثابت کر دیں کہ جملہ اسلامیانِ پاکستان د
حق کی اِقامت اور شریعتِ اسلامی کے نفاذ کے معاملے میں متفق و متحد ہ
ان شاء اللہ العزیز وہ اس ایثار اور قربانی پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجرِ عظیم
کے مستحق ہوں گے!

زیرِ بحث شریعت بل اور شریعت محاذ کے بارے میں بہت سے سیا
معاملات کی سُوجھ بُوجھ رکھنے والے حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ سب صدر ضیاء کے
صاحب کا سیاسی کھیل ہے ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بعض آثار و قرائن سے اس
تائید بھی ہوتی ہے لیکن راقم کے نزدیک اوّلاً تو ایسی تمام باتیں ظن و تخمین کے د
میں آتی ہیں جبکہ نفاذِ شریعت کا معاملہ حتمی اور یقینی طور پر ہم سب کا فر
ہے ــــ ثانیاً افراد، خواہ کسی وقت وہ کتنے ہی بڑے نظر آتے ہوں، حقیقت
میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے ــــ اصل اہمیت کا حامل مسئلہ ملک و ملت کا ت
اشخاص کا معاملہ تو یہ ہے کہ "جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے
حرفِ محرمانہ!" ــــ البتہ دین اور شریعت کی جانب اُٹھا ہُوا، ہر قدم ــ
اور اُس کے ضمن میں کی جانے والی ہر کوشش اَمر ہو جائے گی! چنانچہ نفاذِ شریعت

علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں تو اگر ہمیں آنکھوں دیکھتے مکھی نگلنی پڑے
ہمیں اس کے لیے بھی تیار رہنا چاہیئے!

اس ضمن میں صدر ضیاء الحق صاحب کی مرحوم مجلسِ شوریٰ کے ایک معزز
رکن جسٹس (ریٹائرڈ) بشیر الدین خاں کی ایک نہایت دلچسپ تحریر روزنامہ
"نوائے وقت" میں شائع ہوئی ہے جس کا عکس قارئینِ "میثاق" کی ضیافتِ طبع
کے لیے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

شریعت بل ــــ نیا خدشہ

(بشیر الدین خاں (ریٹائرڈ) جج ہائی کورٹ)

---------------- ان امور کا تعلق فقہ سے
ہے اور اس فقہی اختلافات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ چار مختلف فقہ تو پہلے ہی موجود ہیں اور پانچواں
فقہ جعفریہ ہے۔ شریعت بل کے سلسلہ میں کشمکش ۱۹۹۰ء تک چلی جائے گی اور اس کا فائدہ جیسا
کہ ظاہر ہے موجودہ حکومت کو ہو گا۔ بالآخر آئندہ انتخابات کے نزدیک جا کر حکومت اس
شریعت بل کو خود پاس کرائے گی اور وہ اس کے نتیجہ میں نہ سیاسی جماعتیں اور نہ ہی قومی یا صوبائی
اسمبلیاں رہیں گی بلکہ ختم ہو جائیں گی۔ کیونکہ اسلام میں ان کا کوئی تصور نہیں البتہ جو صاحب
بھی اس وقت صدر ہوں گے وہ اپنے عہدہ پر برقرار رہیں گے اور امیر المومنین کہلائیں گے۔ اور
وہ اپنی مشاورت کے لئے سو ایزہ سو افراد اکٹھے کریں گے اور ان کے مشورہ کے وہ گویا پابند
نہیں ہوں گے تاہم حکومت کے کاروبار میں ان کی مشاورت شامل ہو گی۔ آئندہ یہی مشاورتی
کونسل امیر المومنین منتخب کیا کرے گی جیسا کہ خلفاء راشدین کے دور میں ہوتا آیا اور اس طرح
پاکستان میں ایک خالص اسلامی حکومت ان خطوط پر قائم ہو جائے گی اور روز مرہ کا مغربی طرز کی
جمہوریت کے لئے مطالبہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ جس کے اخراجات کا یہ ملک متحمل نہیں ہو
سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا تو مشکل ہے کہ اس تحریر کو محترم پیر پگاڑا
صاحب کی "پھلجھڑیوں" کے قبیل کی شے قرار دیں یا کسی روزنامے کے فکاہی کالم کے
مشابہ سمجھیں یا کسی "مجذوب کی بڑ" شمار کریں ــــ البتہ اس حقیقت سے انکار
ممکن نہیں ہے کہ متذکرہ بالا تینوں ہی قسم کی چیزوں میں بعض اوقات بڑی چبھتی
ہوئی باتیں موجود ہوتی ہیں جیسی کہ خود اس تحریر میں موجود ہیں ــ خود راقم الحروف کو

یہ تحریر پڑھ کر ۱۹۶۴ء میں کراچی کے نشتر پارک میں منعقدہ ایک جلسے کی خواجہ
ناظم الدین مرحوم کی تقریر یاد آگئی جس میں انہوں نے سابق صدر ایوب خاں مرحوم
کے بارے میں یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اگر یہ شخص صدارتی انتخاب جیت گیا تو
اپنی بادشاہی کا اعلان کرے گا اور پھر گوہر ایوب کو اپنا ولی عہد مقرر کرے گا۔
یاد ہوگا کہ ماضیٔ قریب میں کچھ ایسی ہی تجویزیں پوری سنجیدگی کے ساتھ ضیاء الحق
کے ضمن میں سابق وزیر دفاع جناب علی احمد تالپور پیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن
صدر ایوب خاں تو مرحوم ہو کر ماضی کا جزو بن چکے ہیں۔ اور جناب تالپور جیتے جی ایسے
ہو گئے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں! — اسی طرح زمانے کی ایک دو کروٹوں کے
بعد نہ جناب ضیاء الحق ہوں گے نہ اُن کے حامی نہ مخالف — اس لیے کہ
الفاظِ قرآنی " كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ
وَالْإِكْرَامِ ۝ " — سدا رہنے والی ذات تو صرف اللہ کی ہے۔ البتہ جو کام
اس کی رضا کے لیے کیے جائیں انہیں بھی دوام حاصل ہو جاتا ہے!

اِس ضمن میں راقم الحروف اور تنظیمِ اسلامی کے مؤقف کے سلسلے میں دو
امور کی صراحت ضروری ہے:

ایک یہ کہ ہمارے نزدیک اصل اہمیت 'قانون' کی نہیں، 'نظام' کی ہے
اور صرف قانونِ اسلامی کے نفاذ سے جملہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکیں گے
بلکہ ان کے حصول کے لیے اسلام کا کامل نظامِ عدل و قسط رائج کرنا ہوگا اور اجتماعی
زندگی کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی گوشوں میں شریعتِ حقہ کے اصل مقاصد
کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوگا — اور یہ صرف ایک کامل اسلامی انقلاب ہی
کے ذریعے ممکن ہے۔ چنانچہ ہم اپنی اصل توانائیاں تو اسی کے مقدمات و لوازم کی
تکمیل یا بالفاظِ دیگر انقلابِ اسلامی کی 'تمہید' کی کوشش میں صرف کر رہے ہیں
— تاہم اس دوران میں قرآنی اصول " تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى

ے مطابق نفاذِ شریعت کی ہر کوشش میں بھرپور تعاون کریں گے۔ اس لئے
ہمارے پیشِ نظر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک بھی ہے ، کہ
اِقامۃُ حَدٍّ من حُدُودِ اللّٰہِ خیرٌ مِن مطرِ اربعین
لیلۃً " یعنی " اللہ کی حدود میں سے ایک حد کا اجراء بھی چالیس روز کی بارش
سے زیادہ بابرکت ہے ! "

دوسرے یہ کہ یہ شریعت بل اپنی موجودہ ترمیم شدہ صورت میں بھی حرفِ آخر
نہیں ہے۔ اس میں باہمی مشورے سے مزید ترامیم بھی کی جا سکتی ہیں۔ خود راقم کی
رائے بعض معاملات میں کسی قدر مختلف ہے (جو 'میثاق' کی اشاعت بابت
ستمبر ۱۹۸۶ء میں تفصیلاً بیان ہو چکی ہے) لیکن جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا
ہے دین کے تقاضے اور ملت کے مصالح انفرادی آراء سے بالاتر ہیں۔ بقول اقبال ؎

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم ۔۔۔ کہ ہو نام اسلامیوں کا بلند !

ضرورت اِس امر کی ہے کہ کھلے دل کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں ۔۔۔ اور
باہمی تفہیم و تفہیم کی فضا میں کسر و انکسار کے اصول پر متفقہ مؤقف اختیار کیا جائے۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو خیر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ! ثم آمین !!

۔ اقتباس از 'تذکرہ و تبصرہ' 'میثاق' بابت اپریل ۱۹۸۶ء ۔۔۔

" ۔۔۔ تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک " الدِّینُ النَّصِیحۃ " پر عمل کرتے ہوئے
حسب ذیل گذارشات جملہ خادمانِ دین اور اکابر ملتِ اسلامیہ پاکستان کی خدمت میں پیش ہیں :

۔ فیڈریشن یا کنفیڈریشن یعنی مرکز اور صوبوں کے مابین ذمہ داریوں اور اختیارات کی تقسیم کا معاملہ
۔ صوبوں کی از سرِ نو تشکیل یا تقسیم کا معاملہ ۔۔۔ اسی طرح خواہ علاقائی قومیتوں کے حقوق کا مسئلہ
ہو یا علاقائی زبانوں کے تحفظ کا معاملہ ۔۔۔ یہ جملہ امور خالص سیاسی ہیں اور ان کا دین کے ساتھ
تعلق صرف بالواسطہ اور ثانوی ہے ، براہِ راست نہیں ، لہٰذا ان کی اساس پر کسی سیاسی اتحاد کی بات

توہوسکتی ہے لیکن انہیں کسی دینی اتحاد کی اساس بنانا خود دین و مذہب کی مصلحت کی رُو سے درست نہیں ہے۔

۴۔ البتہ اسلامی نظام کے قیام یا نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ اور شریعتِ اسلامی کی کُلی اور ہمہ گیر تنفیذ کو ایک دینی اتحاد کی مثبت اساس بنایا جائے تو یہ نہایت مستحسن اقدام ہوگا۔ اور اس میں کم از کم جماعتوں کی شرکت و شمولیت معقول بھی ہوگی اور مطلوب بھی جو اس مقصد کے حصول کے لئے جمہوری اور انتخابی طریق کو درست اور مناسب سمجھتی ہیں ـــــ اور اگرچہ خود راقم الحروف اور اس کی تنظیم "تنظیمِ اسلامی" کی حتمی رائے یہ ہے کہ یہ مقصد انتخابات کے راستے سے نہیں بلکہ صرف انقلاب کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے ـــــ تاہم اگر ایسا کوئی اتحاد ممکن العمل ہو تو اس کے ضمن میں ہم [illegible] ہیں گے بلکہ بالواسطہ طور پر اسے ہر ممکن طریقے سے تقویت بھی پہنچائیں گے ـــــ

ہر صاحبِ درد مسلمان تسلیم کرے گا کہ ایسے متحدہ محاذ کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں اب تک ہوا یہ ہے کہ جملہ دینی جماعتیں تو اپنے اپنے طریقِ کار کے مطابق کُل دینِ حق کی اقامت یا کامل نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ کے لئے کوشاں رہیں اور اس ضمن میں اپنے اپنے طریقِ کار پر عمل پیرا رہیں اور اپنے خیال کے مطابق آگے ہی کی جانب دیکھتی رہیں لیکن اس اثنا میں الحاد اور اباحیت نے ہمارے معاشرے میں بھرپور نقب لگا لی۔ نتیجۃً امورِ اجتماعیہ میں تو شریعت کے کلی نفاذ کے ضمن میں کوئی پیش قدمی نہ ہونی تھی نہ ہوئی، اُلٹے لینے کے دینے پڑ گئے اور الحاد و اباحیت نے انکارِ حدیث اور استخفافِ سُنّت کی راہ سے احوالِ شخصیہ تک میں اثر و نفوذ حاصل کر لیا۔ چنانچہ آج ہمارے سامنے ایک عجیب متضاد صورت ہے کہ بھارت میں تو مسلمانوں کے عائلی قوانین کے ضمن میں آج تک کسی مضبوط سے مضبوط حکومت کو بھی دخل اندازی کی جرأت نہ ہوئی اور حال ہی میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے ایک فیصلے کے خلاف مسلمانانِ بھارت کا ردِّ عمل اس شدت سے ظاہر ہوا کہ راجیو گورنمنٹ گھٹنے ٹیکتے ہی بنی اور ادھر پاکستان میں وہ عائلی قوانین جنہیں ۱۹۶۱ء میں شیعہ اور سُنّی، اہلِ حدیث و حنفی، اور دیوبندی اور بریلوی جملہ مکاتبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے خلافِ شریعت قرار دیا تھا وہ پورے پچیس برس سے باضابطہ نافذ ہیں اور سیکولر نقطۂ نظر کی حامل سیاسی جماعتوں، پرستار بے پردہ اور مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین و بیگمات اور ان کے ہم خیال اور سرپرست مفکرین و دانشور اسلام کی سماجی قدروں کو تہ و بالا کرنے پر تُلے ہوئے ہیں"

ب جمعہ

ر اسرار احمد

شہادت حضرات عمر، عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم

کا تاریخی پس منظر

فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں

تلخیص و ترتیب : مقبول الرحیم مفتی

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے بارہ ستمبر ۱۹۹۶ء کو جامع مسجد دار السلام باغ جناح میں خطاب جمعہ کے دوران "فلسفہ انقلاب" کی روشنی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلامی انقلاب کے خلاف انقلاب سے متاثر ہونے والی اندرونی اور بیرونی قوتوں کے ردِ عمل اور اُن کے نتائج کا تاریخی تجزیہ پیش کیا تھا۔ اس تقریر کے بعض اجزاء پر مبنی ایک خبر کی اشاعت پر اہلِ تشیع نے لاہور میں امیر تنظیم کے خلاف جلوس نکالا اور اُن کا پتلا بھی جلایا۔ تقریر کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ہفت روزہ "چٹان" نے ۲۱ ستمبر کی اشاعت میں اس تقریر کو کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے من و عن شائع کر دیا۔ ہم ضروری حک و اضافے کے بعد ہفت روزہ "چٹان" کے شکریے کے ساتھ اسے قارئینِ میثاق کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ البتہ فاضل مدیر "چٹان" کی توجہ کتابت کے علاوہ املا کی اُن غلطیوں کی طرف مبذول کرانا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو ہماری جدید تعلیم یافتہ نسل کی اسلام اور تاریخِ اسلام سے ناآشنائی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

(ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد

حضرات آج میرا موضوع "شہادتِ حضرت عمرؓ، شہادتِ حضرت عثمانؓ، شہا
حضرت علیؓ اور شہادتِ حضرت حسینؓ کا تاریخی پس منظر" ہے۔ ان تاریخی واقعات
کے منظر اور پس منظر کو سمجھنے کے لئے تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے مفہوم اور فرق کو ذہن نش
کرنا بہت ضروری ہے۔ تاریخ میں صرف واقعات کی تفصیلات اور ان کے نت
بیان کئے جاتے ہیں۔ اُن کے اسباب و علل اور محرکات و عوامل پر گفتگو نہیں ہوتی
جبکہ فلسفۂ تاریخ میں اُن عوامل اور محرکات سے بحث ہوتی ہے جو واقعات کے پس
ہوتے ہیں۔ یعنی یہ واقعات کیوں ظہور پذیر ہوتے کسی کو شکست کیوں اور کسی کو فت
کیوں ہوئی۔ کوئی تہذیب عروج پر کیوں پہنچی اور کوئی زوال سے کیوں دوچار ہو
اس اعتبار سے ہماری گفتگو کا تعلق تاریخ سے کم اور فلسفۂ تاریخ سے زیادہ ہے
فلسفۂ تاریخ میں بھی اُس کے دو پہلوؤں کے درمیان فرق و امتیاز کو پیشِ نظ
رکھنا لازم ہے۔ ایک شے ہے قوموں کا عروج زوال اور ایک شے ہے نظریا
اور تہذیبوں کا عروج زوال۔ ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے
تہذیب ابھری لیکن اُس کے اصل عوامل قومی تھے یعنی کسی نسلی، لسانی یا وطنی بنیا
پر کوئی قوم اُٹھی اُس نے عروج و اقتدار حاصل کیا پھر زوال سے آشنا ہو گئی۔ تو قوم
یہ عروج و زوال دو مختلف چیزیں ہیں۔

فلسفۂ انقلاب

نظریات کی بنیاد پر جو تبدیلیاں آتی ہیں اُنہیں ہم "انقلابات" کا
دیتے ہیں۔ مشہور ہندو انقلابی رہنما ایم این رائے نے اپنی کتاب
"دی ہسٹاریکل رول آف اسلام" میں اس فرق کو خوب واضح کیا ہے۔ ان کے
مطابق اسلام کا عروج و زوال دنیا کی دوسری قوموں کے عروج و زوال کے مطابق
اُن جیسا نہیں۔

قومی بنیادوں پر تاریخ میں بڑی بڑی قومیں اُٹھیں ایک زمانے میں منگولوں
نے عروج حاصل کیا، ایک دور میں ہن قوم بڑے زور شور سے اٹھی اور دنیا پر چھا
گئی، سکندر اعظم مقدونیہ سے چلا اور دریائے بیاس تک اپنی فتح کے پھریرے لہرا
چلا گیا۔ ان فاتحین نے خونریزیاں بھی کیں اور غلبہ و اقتدار بھی حاصل کیا مگر

کسی نئی تہذیب کے بانی نہ بن سکے - ان سے دُنیا کو کوئی نئی روشنی نہیں ملی - لیکن جب جب سلام کی مشعل لے کر نکلے اور انہوں نے اقتدار وحکومت پر قبضہ کیا تو انسانیت کو ایک نئی تہذیب ملی نیا تمدن ملا - علوم وفنون کے نئے افق طلوع ہوتے - بقول علامہ اقبال

مصطفےٰ اندر حرا خلوت گزیں
قوم و آئین و حکومت آفریں

محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نظریاتی تبدیلی برپا کی - اس تبدیلی کی علمبردار بھی بلاشبہ ایک قوم تھی ——— "امیین" کی قوم - قرآن کے الفاظ میں :

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۙ	وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اُس کی آیات سناتا ہے اُن کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے -

(سورۃ جمعہ آیت ۲)

یہ "امیین" یعنی بنی اسماعیلؑ امتِ مسلمہ کا قلب یا نیوکلس (NUCLEUS) تھے لیکن پھر اُمت میں نئے قبائل اور نئی قومیں شامل ہوتی چلی گئیں - اور یوں ایک نئی تہذیب کا آغاز ہوا - اس لئے آج ہمیں جن واقعات پر گفتگو کرنی ہے وہ بھی درحقیقت فلسفہ تاریخ کے اُس پہلو کے حوالے سے سمجھ میں آسکتے ہیں جو نظریات اور تہذیبوں کے عروج وزوال سے بحث کرتا ہے اور جس کے لئے زیادہ موزوں عنوان "فلسفہ انقلاب" ہے -

درحقیقت فلسفہ انقلاب کو سمجھے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا سمجھنا بھی ممکن نہیں ہے - اگر فلسفہ انقلاب پر ذہن کی گرفت مکمل نہیں ہے تو سیرتِ رسولؐ میں بھی

تضادات نظر آئیں گے۔ بظاہر یہ کتنا بڑا تضاد ہے کہ مکے میں حکم یہ ہے کہ چاہے تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے چاہے تمہارے چیتھڑے اڑا دیئے جائیں تم ہاتھ نہیں اٹھا سکتے لیکن مدینہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھی رضوان اللہ علیہم اجمعین اللہ کی راہ میں قتال کر رہے ہیں اور حکم قرآنی کے مطابق کر رہے ہیں۔

يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ — وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔

(سورۃ توبہ آیت ۱۱۱)

ایک مثال اور دیکھئے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بظاہر دب کر صلح کر رہے ہیں اور آپ کے تمام ساتھیوں کا خون کھول رہا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور حق کا یہ حق ہے کہ وہ غالب ہو کر رہے۔ لیکن حضورؐ صلح کر رہے ہیں۔ دو سال بعد مکّہ کے وہی سردار ابو سفیانؓ خوشامد کر رہے ہیں، سفارشیں کروا رہے ہیں کہ صلح کی تجدید فرما لیجئے لیکن حضورؐ تجدید نہیں کر رہے۔ یہ ظاہری تضادات تب رفع ہوتے ہیں جب فلسفۂ انقلاب سمجھ میں آتا ہے۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔ انقلاب کے چھ مراحل ہوتے ہیں۔ پہلے تین مراحل۔ دعوت، تنظیم، تربیت ــــ کے نتیجے میں انقلابی جماعت وجود میں آتی ہے۔ یہ جماعت جب تک اتنی قوی اور مضبوط نہ ہو جائے کہ نظام باطل کو للکار سکے اور اس سے ٹکرا سکے اس وقت تک PASSIVE RESISTANCE یعنی صبر محض یا عدم تشدد کا راستہ اختیار کرے گی۔ ماریں کھائیں گے جیل جائیں گے ہر طرح کا تشدد برداشت کریں گے لیکن ہاتھ نہیں اٹھائیں گے ــــ یہ چوتھا مرحلہ ہے لیکن جب یہ محسوس ہو کہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم اس نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے اقدام کر سکتے ہیں تو پھر پانچواں مرحلہ 'ACTIVE RESISTANCE' کا آتا ہے یعنی اب خود آگے بڑھ کر اقدام کیا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں چھٹا اور آخری مرحلہ مسلح تصادم (ARMED CONFLICT) کی صورت میں خود بخود سامنے آنے لگا۔ یہ فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ اگر باقاعدہ تیاری، تنظیم اور منصوبہ بندی سے اقدام کیا گیا ہے، جماعت تربیت یافتہ ہے، تعداد مناسب ہے تو پھر انقلابی قوت کامیاب ہوگی۔ سابقہ نظام کو اکھاڑ کر اپنا

نی ہ قائم کرے گی۔ لیکن اگر وقت سے پہلے اقدام کیا گیا یا تیاری مکمل نہیں کی گئی تو وہ باطل
ظام جو پہلے سے قائم ہے انقلابی جماعت کو کچل دے گا۔ جماعت ختم ہو جائے گی۔ یا تخت
تختہ۔ تیسرا کوئی امکان نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں انقلابی عمل کے چھ
مراحل میں سے پہلے چار مرحلے دعوت، تنظیم، تربیت اور صبرِ محض مکی دَور میں مکمل ہوئے اور
آخری دو مرحلے اقدام اور مسلح تصادم مدنی دَور میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ مدینہ میں ACTIVE
RESISTANCE یعنی اقدام اور مسلح تصادم کا سلسلہ چھ برس تک جاری۔ پہلا تصادم غزوۂ
بدر کی صورت میں رمضان ۲ سنہ ہجری میں ہوا اور ٹھیک چھ برس بعد رمضان ۸ سنہ ہجری
میں مکہ فتح ہو گیا۔ عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل ہو گئی۔

تکمیلِ انقلاب کے بعد توسیعِ انقلاب کا مرحلہ آتا ہے۔ ایک سچا انقلاب کسی جغرافیائی
یا قومی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ نظریے کو کسی پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔
اگر نظریے میں جان ہے قوت ہے وہ دلیل اور برہان سے مسلح ہے تو پھیلے گا۔ جہاں
وہ پھیلے گا انقلاب لے آئے گا۔ توسیعِ انقلاب کا آغاز بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ۶ سنہ ہجری میں ہی ایران و روم کے حکمرانوں اور بلادِ عرب کے شیوخ
کے نام دعوتی خطوط بھیج کر فرما دیا تھا — جس طرح آج متحدہ عرب امارات اور ان کے
ارد گرد کے علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور ان کے شیوخ ہیں، کچھ ایسی ہی کیفیت
عہدِ رسالت میں بھی ان علاقوں میں پائی جاتی تھی — ان خطوط کے جواب میں دو بالکل
متضاد ردِ عمل سامنے آئے۔ ایک کسریٰ شہنشاہِ ایران کا ردِ عمل تھا۔ اس نے حضور کا
نامۂ مبارک چاک کر دیا، سفیرِ اسلام کو قتل کی دھمکی دی اور انتہائی اہانت آمیز سلوک کیا۔ وہ
اپنے آپ کو عرب کا حکمران سمجھتا تھا — ایرانی سلطنت کے نزدیک عرب قبائل کی حیثیت
پوزیشن ایسی ہی تھی جیسے حکومت پاکستان کے لئے شمال مغربی سرحدی صوبے کے آزاد
قبائل کی ہے۔ اگرچہ ہمارے قانون اور عدالتوں کے حدودِ اختیارات وہاں تک نہیں
ہیں لیکن بہرحال وہ پاکستان کی حدود میں تو شامل ہیں — چنانچہ اس نے کہا
میری رعیت میں سے ایک شخص کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اس نے اپنا نام میرے نام سے
پہلے لکھا۔ یمن کے ایرانی گورنر باذان کو اس نے خط لکھا کہ مدینے کے کسی گستاخ شخص
(نقلِ کفر کفر نباشد) نے مجھے توہین آمیز خط لکھا ہے۔ اس کو گرفتار کر کے میرے دربار

میں پیش کر دو اور ایسا نہ ہو سکے تو مدینے کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ یہ ایک نمائندہ ردِ عمل
تھا۔ دوسرا نمائندہ ردِ عمل قیصرِ روم کا تھا۔ اس نے حضورؐ کے ایلچی کا پورا اعزاز و اکرام کیا۔
قیصر اہلِ کتاب میں سے تھا۔ اپنے مذہب کا عالم تھا۔ فوراً حضورؐ کو پہچان گیا۔ اس نے کوشش کی
کہ اس کے درباری سپہ سالار، عمائدینِ سلطنت سب اسلام قبول کر لیں۔ جس طرح تاریخ میں اس
سے پہلے ایک موقع پر پوری سلطنتِ روم نے بیک وقت (EN BLOC) عیسائیت
کو قبول کیا تھا اسی طرح اب اسلام کو اپنا لے۔ تاکہ قبولِ اسلام کیا تھا اسکی سلطنت اور حکومت
باقی رہے۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہوا۔ سلطنت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی۔ وہ ایمان کی دولت
سے محروم ہی رہا۔ یہی طرزِ عمل مقوقس شاہِ مصر کا بھی تھا۔ اس نے بھی حضورؐ کے ایلچی کا
اکرام کیا۔ تحفے تحائف بھیجے۔ لیکن ایمان سے محروم رہا۔ بہر حال یہ دو مختلف ردِ عمل
تھے جن کا اظہار اس وقت کی دو بڑی عالمی طاقتوں (SUPER POWERS) کی طرف
سے ہوا۔

انقلاب شکن قوتیں اب اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے دو فلسفۂ انقلاب
کے حوالے سے ایک اصولی بات سمجھ لیجئے۔ جب بھی کسی
ملک میں یا کسی معاشرے میں ایک انقلابی قوت آگے بڑھ رہی ہوتی ہے تو وہاں پہلے سے
قائم نظام کے چودھری اور اُن کے حامی اور مددگار انقلابی قوت کا راستہ روکنے کیلئے
اپنی ساری توانائیاں خرچ کر دیتے ہیں۔ اپنے سارے حربے آزما لیتے ہیں لیکن انقلابی
جدوجہد کے آخری مرحلے میں جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب ہم انقلاب کا راستہ نہیں
روک سکتے۔ ہم شکست کھا چکے ہیں تو ہمیشہ وہ دبک جاتے ہیں۔ بظاہر انقلاب کو
تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن منتظر رہتے ہیں کہ کوئی موقع ملے اور کوئی نازک مرحلہ آئے تو وار
کریں۔ ہر انقلاب کو اِن انقلاب شکن قوتوں اور تحریکوں (COUNTER REVOLU-
TIONARY FORCES AND MOVEMENTS) کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
یہ قوتیں اندر سے بھی اُٹھتی ہیں اور توسیعِ انقلاب کے ردِ عمل کے طور پر باہر سے بھی
نمودار ہوتی ہیں۔ دونوں سطحوں (LEVELS) پر انہیں علیحدہ علیحدہ پہچاننا چاہئے
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اور آپؐ کے بعد عہدِ خلافِ راشدہ میں
اسلامی انقلاب کو دونوں سطح پر ان قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ کہاں یہ معاملہ کہ حضورؐ

یک ایک شخص کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے کہ اے پروردگار! عمرو بن ہشام اور
ر بن خطاب میں سے کسی ایک کو تو ایمان کی توفیق دے دے کہاں یہ صورت ہے کہ
ج در فوج قبیلہ در قبیلہ لوگ آرہے ہیں۔ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اُن میں یقیناً
منین بھی تھے لیکن ایک قابلِ ذکر تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنہوں نے یہ سمجھ
ر کہ اب مزاحمت ممکن نہیں ہے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اُن کے ذہن اور فکر میں بنیادی
بدیلی نہیں آتی تھی۔ چنانچہ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی منسوب ہیں حضور صلی اللہ
علیہ وسلم سے کہ اس وقت جو لوگ دین میں داخل ہو رہے ہیں فوج در فوج یہ
ہیں گے بھی دین سے فوج در فوج۔ (یخرجون من دین اللہ افواجا) اور
س کی ابتداء بھی حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہو گئی تھی۔ جب ۸ھ ہجری میں جنگ
موتہ میں مسلمانوں کو زک اُٹھانی پڑی۔ حضرتِ زیدؓ بن حارثہ، حضرتِ جعفر طیارؓ
ور حضرت عبد اللہ ابن رواحہ انصاری جیسے جلیل القدر اصحابِ رسول شہید ہو گئے
طامع آزما لوگوں نے دیکھا کہ سلطنتِ روما سے بھی محاذ آرائی کا آغاز ہو گیا ہے تو اُنہوں
نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی قوت اتنی ناقابلِ شکست نہیں رہی۔ اب ہم سر اٹھا سکتے ہیں
نتیجہ نئے مدعیانِ نبوت حضورؐ کی زندگی میں نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ مسیلمہ کذاب
ٹھا اور ایک بڑے علاقے کے لوگ اُس کے پیرو بن گئے وہ بڑی سیاسی قوت بن
یا۔ اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھیجا کہ اگر آپؐ ملک عرب کو تقسیم کر لیں
ر آدھا ملک مجھے دے دیں تو ہم آپس میں مصالحت کر لیتے ہیں ورنہ معاملہ میدان
جنگ میں طے ہو گا۔ حضورؐ نے بایں الفاظِ قرآنی جواب بھجوا دیا کہ

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ
(سورۃ الاعراف آیت ۱۲۸)

زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اُس کا وارث بنا دیتا ہے۔

اسی طرح طلیحہ ابن اسدی اور اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ پھر ایک خاتون
سجاح نبوت کا دعویٰ لے کر کھڑی ہو گئی اور اُس نے مسیلمہ کذاب سے شادی بھی کر لی۔
ریا ایک جھوٹے نبی اور جھوٹی نبیہ نے متحدہ محاذ بنا لیا۔ ان میں سے بعض نے حضورؐ کی
حیات طیبہ میں اور بعض نے آپؐ کے انتقال کے فوراً بعد نبوت کے دعوے کئے۔ اندریں

عرب یہ پہلی انقلاب شکن قوت تھی جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے فو
بعد اپنا کام شروع کیا - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کا مرحلہ یقیناً مسلمانوں
کے لئے بہت ہی حوصلہ شکن تھا - آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت مسلمان کس
طرح صدمے سے نڈھال ہوتے ہوں گے اور کس طرح انکی ہمتیں پست ہوئی ہونگی - ا
نازک مرحلے پر دوسری انقلاب شکن قوت وہ قبائل عرب تھے جنہوں نے زکوٰۃ دینے سے
انکار کیا - انہوں نے کہا ہم مسلمان ہیں مسلمان رہیں گے نماز پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں
دیں گے - بعض روایات کے مطابق اُنہوں نے زکوٰۃ کا مطلقاً انکار نہیں کیا تھا بلکہ
یہ کہا تھا کہ ہم حکومت کو نہیں دیں گے - اپنے طور پر زکوٰۃ کا انتظام کریں گے - تیسری
قوت مرکز گریز طاقتوں کی صورت میں ظاہر ہوئی - آزادی تو عربوں کی گھٹی میں پڑی
ہوئی تھی وہ کسی مرکزی حکومت کے تصور سے ہی ناآشنا تھے - یہ تو حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کا معجزہ تھا کہ آپ نے ایک جھگڑالو قوم کو بنیانِ مرصوص بنا کر ایک مرکز کے تابع
کر دیا تھا - یہ مرکزی حکومت کا قیام بھی آزادی پسند قبائل کے مزاج کے خلاف تھا
وہ کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں مسلمان رہیں گے لیکن کسی مرکزی حکومت کو تسلیم نہیں کریں گے

مقامِ صدیق اکبرؓ

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیک
وقت ان تینوں انقلاب شکن طاقتوں اور تحریکوں
کا مقابلہ کیا اور ان پر قابو پایا - اس مرحلے پر صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام اور مرتبے
کو بھی سمجھ لیجئے - مقامِ صدیقی مقامِ نبوت سے بہت قریب ہوتا ہے - سورہ نساء میں
اللہ تعالےٰ نے اہلِ ایمان کے چار مراتب کا ذکر کرتے ہوئے انبیاء کے بعد دوسرا درجہ
صدیقین کا بیان کیا ہے -

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ج وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ (سورۃ نسآء آیت - ۶۹)

جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریگا وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے - یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین - کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں -

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ جسمانی اعتبار سے دبلے پتلے اور نحیف انسان تھے۔ طبیعت
میں شفقت و رحمت اور نرمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حضورؐ کی وفات کا صدمہ
...مت کا بارگراں اور پھر یہ تین عظیم معاملات بیک وقت سامنے آگئے۔ پھر چوتھا بلکہ
پہلا مسئلہ اُس لشکر کی روانگی کا تھا جسے حضورؐ نے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کی سرکردگی
میں تیار کروایا تھا لیکن اُس کی روانگی سے پہلے حضورؐ انتقال فرما گئے۔ یہ رومیوں کے
خلاف تیسری مہم تھی۔ پہلی بار جنگ موتہ میں مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا۔ دوسری
بار غزوۂ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے تو قیصر نے مقابلے سے
گریز کیا کیونکہ وہ آپؐ کی نبوت کو پہچان چکا تھا۔ حضورؐ کی وفات کی وجہ سے اس تیسرے
لشکر کی روانگی کے مسئلے پر مدینہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی
کہ سردست اس لشکر کو روانہ نہ کیا جائے۔ مدینے کی حفاظت کے لئے روک لیا جائے
کیونکہ عملاً مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ اور طائف کے سوا کم و بیش باقی عرب باغی ہو گیا تھا۔
اندیشہ تھا کہ کسی وقت بھی قبائلِ عرب مدینہ پر حملہ کر دیں گے۔ تمام اندیشوں اور خدشات
کو مسترد کرتے ہوئے رسولؐ کے جانشین نے لشکر کو حسبِ پروگرام روانہ کیا۔ لشکر کے
سردار حضرت اسامہؓ نوجوان ہیں اپنی سواری پر ہیں بوڑھے خلیفۃ المسلمین ابوبکر صدیقؓ
اُن کی سواری کے ساتھ دوڑتے ہوئے آخری ہدایات دے رہے ہیں، وہ اترنا چاہتے
ہیں لیکن خلیفہ کا حکم ہے کہ سواری سے مت اُترو۔ جو جھنڈا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اسے لے کر جاؤ، اور جہاد کرو —— پھر یہ
مشورہ بھی دیا گیا کہ مدعیانِ نبوت سے تو جنگ کی جائے مگر مانعین زکوٰۃ کو سردست
نہ چھیڑا جائے۔ کیونکہ انہوں نے اسلام کا انکار نہیں کیا اور مصلحت کا یہ تقاضا بھی
تھا کہ بیک وقت کئی محاذ کھولنا نقصان دہ ہوگا۔ لیکن جب ذمہ داری کا وقت
معلوم ہوا کہ اس نحیف و ناتواں جسم اور بظاہر شفیق و رقیق انسان کے اندر عزم
و ارادے کا کوہ ہمالیہ چھپا ہوا ہے۔ اور فی الحقیقت مقامِ صدیقیت کو جو قرب
حاصل ہے مقامِ نبوت سے یہ اُس کا پرتو تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس
انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تمام انقلاب شکن قوتوں اور
...زمیوں کی سرکوبی کرکے اُس انقلاب کو مستحکم و مجتمع (CONSOLIDATE) کیا۔

توسیع انقلاب کا آغاز اور اُس کے خلاف ایران ورور

توسیع انقلاب کی عالمی طاقتوں کی طرف سے اعلان جنگ تو نبی اکرم صلی ا
علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی ہو چکا تھا جبکہ جنگ موتہ اور غزوہ تبوک کی صورت
میں رُومیوں سے عملاً ٹکراؤ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اور جیشِ اسامہؓ بھی ان کے
خلاف لشکر کشی کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ کیونکہ شام کے علاقے میں قیصر کے ایک با
گزار شیخ نے حضورؐ کے ایلچی کو شہید کر دیا تھا۔ البتہ ایرانیوں کے خلاف کوئی باقاعدہ
فوج کشی حضورؐ کے زمانے میں نہیں ہوئی۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
جب اندرونی شورشوں سے نمٹنے کے بعد توسیع انقلاب کی طرف توجہ کی تو آپؓ نے
صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک لشکر تو ملک شام کی طرف روانہ کیا جو سلطنت
روم کا باج گزار علاقہ تھا اور ایک لشکر عراق کی طرف بھیجا جو ایران کا باج گزار علاقہ
تھا۔ لیکن زندگی نے آپ کو زیادہ مہلت نہ دی۔ سوا دو برس کے مختصر عہد خلافت
کے بعد جب اعزازِ خلافت حضرتِ عمرؓ کو منتقل ہوا تو تمام اندرونی فتنے ختم ہو چکے تھے
اور توسیعِ انقلاب کا بھرپور آغاز ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دس سالہ عہد خلافت
میں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے دس سالوں میں توسیع انقلاب
کا عمل بھرپور طریقے سے جاری رہا۔ اس عمل کی نوعیت و کیفیت کا احاطہ کرنے کیلئے
ملکِ عرب، جزیرہ نمائے عرب اور روم و ایران کی سلطنتوں کی وسعت اور ان کا
سیاسی و جغرافیائی خاکہ بھی ذہن میں رہنا چاہیئے۔ درحقیقت ملک عرب ایک مثلث
نما علاقہ ہے۔ اس کا بڑا حصّہ تو جزیرہ نمائے عرب کہلاتا ہے۔ جس کے نیچے جنوب
کی طرف بحیرہ عرب ہے اور مشرق میں خلیج فارس دور تک اوپر چلی گئی ہے
اسی طرح مغرب میں بحیرہ احمر ہے اور خلیج عقبہ شمال مغرب کی طرف اوپر نکل گئی ہے
یوں یہ جزیرہ نما وجود میں آیا ہے کہ اس کے تین اطراف میں سمندر اور ایک طرف
خشکی ہے۔ شمال میں خشکی کی طرف شامِ عرب، عراقِ عرب اور کردستان کا علاقہ
مل کر مثلث کا ایک ضلع بناتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کا بیشتر حصّہ تو صحراؤں اور
پہاڑوں پر مشتمل ہے اس لئے سلطنتِ روم یا سلطنتِ فارس میں سے کسی نے اسے
اپنا مطیع بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صرف یمن کا علاقہ چونکہ زرخیز تھا اس

نے وہاں ایران کا گورنر بازان موجود تھا۔ اسی طرح شام اور عراق کے علاقے
اپنی زرخیزی کی وجہ سے ہلالِ زرخیز (FERTILE CRECENT) بھی کہے
جاتے ہیں اپنی دو ہمسایہ عالمی قوتوں ایران و روم کے ساتھ وفاداری و باجگزاری
کا تعلق قائم رکھتے تھے۔ عراق کی سرحدیں چونکہ سلطنت ایران سے ملحق تھیں اس
لئے یہاں کے شیوخ اور مقامی سردار ایرانی حکومت کی سرپرستی سے قائم رہتے تھے
اور شام چونکہ سلطنتِ روما کی سرحد پہ واقع تھا اس لئے وہاں کے مقامی عرب
سردار اور شیوخ قیصرِ روم کے نامزد اور وفادار ہوتے تھے۔ روم کی بزنطینی سلطنت
کے تین بڑے حصے تھے۔ ایک شمالی افریقہ دوسرا مغربی ایشیاء یعنی شام اور ایشیائے
کوچک کا علاقہ اور تیسرا حصہ یورپی علاقے پر مشتمل تھا۔

شہادت عمرؓ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دس سالوں میں حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشنگوئیوں کے مطابق ایران فتح ہوا۔
کئی ہزار سالہ قدیم شاہی نظام نیست و نابود ہو گیا۔ سراقہؓ بن جعشم کو جنہوں نے
سفر ہجرت کے دوران قریش کے اعلان کردہ انعام کے لالچ میں حضور صلی اللہ علیہ
وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تعاقب کیا تھا، کسریٰ کے کنگن پہنائے گئے[1]
رومی سلطنت ہی سے شام اور بیت المقدس کے علاقے اسلامی قلمرو میں شامل
ہوئے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے دسویں برس ایرانی نیشنلزم
کے انتقام کا شکار ہو گئے۔ ایرانی شہنشاہیت کے خاتمے کے بعد ایرانی نیشنلزم
اور شاہ پرستی کا جذبہ بھی ایک انقلاب شکن قوت کی صورت میں سامنے آیا۔

۱۔ سراقہؓ نے ہجرتِ مدینہ کے دوران حضورؐ کا تعاقب کیا تھا لیکن دو بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی وہ
حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے قریب پہنچتا تھا اُس کے گھوڑے کی اگلی دونوں ٹانگیں ریت میں
دھنس جاتی تھیں۔ چنانچہ وہ تائب ہو کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضورؐ نے مسکرا کر
فرمایا سراقہ میں تو تمہارے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن دیکھ رہا ہوں اور یہ پیشین گوئی دورِ
حضرت عمرؓ میں پوری ہوئی جب سلطنتِ کسریٰ کی دھجیاں بکھر گئیں اور واقعۃً کسریٰ کے
کنگن سراقہ کو پہنائے گئے۔

چونکہ ایران حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں فتح ہوا۔ اس لئے ایرا
قوم پرستوں کو سب سے زیادہ دشمنی حضرت عمرؓ کی ذات سے تھی۔ دوسرے انہو
نے خیال کیا کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی جماعت اور حکومت ش
ایک ہی شخصیت کے بل پر کھڑی ہے۔ حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ اسلامی نظ
اور اسلامی حکومت ایک فرد کا معاملہ نہیں تھا۔ وہ ایک اجتماعی قوت تھی جس نے اسے
برپا کیا تھا۔ ابھی وہ نیوکلیس (NUCLEUS) اور وہ مرکزی قوت برقرار تھی
یہ وہ جماعت تھی جس کی تربیت خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی اور
کی شان قرآن میں یوں بیان کی گئی ہے کہ:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ
الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ
وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ
بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ
وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝
(سورۃ التوبۃ آیہ ۱۰۰)

وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے
پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں
سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راستبازی
کے ساتھ اُن کے پیچھے چلے، اللہ اُن
سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی
ہوئے، اللہ نے اُن کے لئے باغ مہیا
کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی
ہوں گی اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔
یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

اگر وہ جماعت مضبوط نہ ہوتی تو جزیرہ نمائے عرب میں جتنی بڑی قوتیں اٹھیں
اسلام کا تیا پانچہ کرنے میں کامیاب ہو جاتیں اور اسلامی حکومت ختم ہو جاتی۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاتل ابولولو فیروز حضرت مغیرہؓ ابن شعبہ کا ایرانی
النسل غلام تھا۔ اُس نے ایک بار حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ میرے مالک نے مجھ پر
بہت زیادہ ٹیکس عائد کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم کیا کیا فن جانتے ہو
جب اُس نے اپنے کام گنوائے تو حضرتِ عمرؓ نے کہا کہ اگر تم اتنے ماہر کاریگر ہو تو یہ
ٹیکس زیادہ نہیں ہے۔ گویا اُس کی اپیل خارج کر دی۔ ساتھ ہی حضرتِ عمرؓ نے
کہا کہ سنا ہے تم چکی بہت اچھی بناتے ہو ایک چکی ہمارے لیے بھی بنا دو۔ اُس نے جواب دیا کہ

نے تو میں ایسی چکی بناؤں گا جو قیامت تک پستی رہے گی"۔ حضرت عمرؓ نے اسی
وقت کہہ دیا کہ یہ شخص مجھے قتل کی دھمکی دے گیا ہے۔ یہاں یہ بات جان لیجئے
کہ اسلام کے نظامِ عدل میں امتناعی نظر بندی (PREVENTIVE DETENTION)
کا کوئی وجود نہیں۔ جب تک کسی نے جرم نہیں کیا آپ اُسے گرفتار نہیں کر سکتے خلیفہ
وقت خود کہہ رہا ہے یہ شخص مجھے قتل کی دھمکی دے گیا ہے۔ پھر یہ بات بھی بالکل
واضح تھی کہ اُس کا تعلق ایک ایرانی جرنیل ہرمزان سے تھا۔ اُس نے خلیفہ اسلام
پر حملہ کیا وہ قطعاً اُس کا ذاتی فعل نہیں تھا۔ درحقیقت یہ ایرانی سازش تھی۔
ایرانی نیشنلزم کا انتقام تھا۔ ۲۶ ذی الحج کو نماز فجر کے دوران ابولولو فیروز نے
زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے حضرت عمرؓ پر چھ وار کیئے۔ جب لوگوں نے اُسے پکڑنے
کی کوشش کی تو کچھ کو زخمی کر کے اُس نے اُسی خنجر سے خودکشی کر لی۔ حضرت عمرؓ
تین دن تک زخمی حالت میں زندہ رہے۔ تیسرے دن آپ کا انتقال ہوا۔ یکم محرم الحرام
۲۴ہجری کو آپ کو دفن کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت سے یہ بات بہرحال ثابت
ہو گئی کہ اسلامی انقلاب کی عمارت اتنی بودی نہیں ہے کہ ایک فرد کے ہٹنے سے ختم ہو
جائے۔

فتنہ عظیم اور یہود کا کردار

حضرت عمرؓ کی جگہ حضرتِ عثمانؓ خلیفہ ہوئے۔
توسیع انقلاب محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا
عمل پورے زور شور سے جاری رہا۔ مصر، قبرص اور شمالی افریقہ کے علاقے فتح
ہوئے۔ قیصر روم کی عیسائی سلطنت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی لیکن اُس کے دو
بہت بڑے علاقے اسلام کے زیرنگیں آ گئے۔ صرف ایشیائے کوچک یعنی ترکی کا
علاقہ اور یورپ کا علاقہ باقی رہ گیا۔ کامل دس برس تک خلافتِ عثمانی بھی اسی
شان سے قائم رہی جس شان پر حضرت عمرؓ نے اُسے پہنچایا تھا۔ حضرت عثمان رضؓ کی
خلافت کے آخری دو سالوں میں اندرونی طور پر ایک نیا فتنہ رونما ہو گیا، جس کو سب
سے بڑا فتنہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ایک مصری مصنف نے ان واقعات پر جو کتاب
لکھی ہے اُس کا نام ہی "الفتنۃ الکبریٰ" رکھا ہے۔ یہ بڑا فتنہ کیا تھا۔
بات سمجھئے۔ جس طرح توسیع انقلاب کے نتیجے میں ایرانی سلطنت کا خاتمہ ہوا تھا

اسی طرح جزیرہ نمائے عرب کے اندر انقلابی عمل کے دوران حضور صلی اللہ علیہ و
نے ایک بڑی بڑی معاشی اور مذہبی قوت یعنی یہود کو زیر کیا تھا۔ حضورؐ کی حیات
طیبہ میں مشرکین کے خاتمے کے ساتھ سب سے بڑی زک یہود کو پہنچی تھی۔ قر
میں بھی یہود کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن کہا گیا ہے۔ مدینہ میں یہود کے تین قب
آباد تھے۔ ایک ایک کر کے انہیں وہاں سے جلاوطن کیا گیا۔ بنو قریظہ کو بدعہ
پر یہ سزا دی گئی کہ اُن کے جتنے بھی مرد جنگ کے قابل تھے اُنہیں قتل کر دیا
یہ سب سے بڑی سزا تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے یہود
کو ملی۔ مدینہ سے نکل کر جب یہ خیبر میں آباد ہوئے تو وہاں سے بھی انہوں نے مسلما
کے خلاف اپنی سازشیں جاری رکھیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر
پہ حملہ کر کے وہاں سے بھی انہیں نکالنا پڑا۔ اب پہچانیئے کہ عرب میں اندر مذہبی قو
پر سب سے زیادہ زخم خوردہ قوت یہود کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں
عیسائیوں کے ساتھ تو کوئی مقابلہ ہوا ہی نہیں۔ عیسائیوں میں سے حضرت نجا
ایمان لے آئے تھے اور اُن کے جانشین کو جب اسلام کی دعوت دی گئی تھی
س نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن حضورؐ کے نامہ مبارک اور ایلچی ا
حترام و اکرام کیا۔ نجران کے عیسائیوں کا وفد بھی حضورؐ کی خدمت میں حاض
ہوا تھا۔ جو عیسائی جزیرہ نمائے عرب میں آباد تھے وہ کبھی یہودیوں کی طر
نہ مسلمانوں کے خلاف کسی سازش یا مہم میں شریک ہوئے نہ انہوں نے کسی
معاندانہ سرگرمی میں حصہ لیا۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑھ کر انتقام
کا جذبہ یہودیوں کے سینوں میں کھول رہا تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان
کے اندر ایک لاوہ پک رہا تھا۔ وہ موقع کے منتظر تھے۔ اُن
کی سازشی ذہانت کو تو آج بھی دُنیا مانتی ہے اور اُن کی سازشوں کے تانے
بانے کو سمجھنے کے لئے بھی بڑی ذہانت درکار ہوتی ہے۔ وہ بظاہر بڑی معصوم
اور بے ضرر قسم کی تنظیمیں قائم کرتے ہیں۔ یہ روٹری انٹرنیشنل ہے یہ لائنز کلب
ہے۔ بظاہر ان کے مقاصد بڑے پرکشش اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ اُن کی نشستوں
میں ہمارے معززین اُن میں شامل ہوتے ہیں۔ وہاں اُنہیں کچھ چودھراہٹیں

ی ہیں کچھ دُنیا میں گھومنے پھرنے کے مواقع میسر آتے ہیں اور پھر یہود انکے
ریعے اپنی سازشوں کے جال پھیلاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے وقت میں
طانیہ کے حوالے سے جو بات کہی تھی کہ ع "وہ فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے"
ہ آج امریکہ پر صادق آتی ہے۔ امریکہ میں حال ہی میں کانگریس کے ایک سابق
مبر نے اپنی کتاب " THEY DARE TO SPEAK OUT " میں امریکی سیاست اور
معاشرے پر یہود کی گرفت کو بے نقاب کیا ہے۔ مصنف بائیس برس تک کانگریس
ا ممبر رہا۔ اسرائیل کے خلاف ایک بیان دینے کی پاداش میں یہودیوں نے
ے الیکشن میں شکستِ فاش دلوائی۔ لاس اینجلس کی صرف ایک یہودی پارٹی
نے اُسکے خلاف تین ملین ڈالر چندہ دیا۔ اُس نے اپنی کتاب میں اُن تمام حربوں
و بے نقاب کیا ہے جن کے ذریعے یہود امریکی سیاست اور معیشت کو کنٹرول
ے ہیں۔ جو شخص اسرائیل کے خلاف بات تک کرنے کی کوشش کرتا ہے
ہ سرمائے اور اپنی سازشوں سے اُس کے سیاسی کیریئر کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔
ہ کوئی دور از کار باتیں نہیں۔ آج کی متمدن دنیا کے قائد امریکہ کا ذکر ہے۔

عبداللہ ابن سبا اور شہادتِ عثمانؓ

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کے آخری دو برسوں میں ایرانی نیشنلزم
کے ساتھ یہودی سازش کا یہ فتنہ بھی ملحق ہو گیا تھا۔ یمن کے ایک یہودی
بداللہ ابن سبا نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اِس سازش کا آغاز کیا۔ اُس
نے مدینے میں رہ کر حالات کا جائزہ لیا۔ اُسے مسلمانوں کا ایک کمزور نقطہ
ل لیا۔ قدیم قبائلی عصبیتوں کے جراثیم عرب کے مسلمان معاشرے کی سرشت میں
تنے گہرے اُترے ہوئے تھے کہ ان کے اثرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات
میں بھی ظاہر ہو جاتے تھے۔ جب کوئی منافق کسی پرانے واقعہ کی یاد تازہ کر دیتا
تھا تو اوس اور خزرج کے درمیان تلواریں نکل آتی تھیں۔ یہ تو حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کا وجودِ مبارک تھا جو فتنے کی آگ کو بھڑکنے نہیں دیتا تھا۔ آپؐ کے
انتقال کے بعد خوش قسمتی سے پہلے دونوں خلفاء کا تعلق قریش کے دو چھوٹے
چھوٹے قبیلوں یعنی بنو تمیم اور بنو عدی سے تھا۔ لیکن حضرتِ عثمان رضی اللہ

عنہ کا تعلق قریش کے بڑے اور باثر خاندان بنو امیہ سے مخاصمن کی ر
مسابقت بنو ہاشم کے ساتھ چلی آ رہی تھی ۔ یہودی ذہن نے اس رنگ
کو تاڑ لیا تھا ۔ مدینہ سے نکل کر سب سے پہلا مورچہ اُس نے بصرہ میں لگایا ۔ اپنے
لوگوں کی جمعیت پیدا کی اور اُن میں کچھ نئے عقائد پھیلانے شروع کئے ۔ مثل
اس نے کہا کہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان حضرت عیسٰی کے بارے میں تو یہ
رکھتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور دوبارہ دُنیا میں آئیں گے جبکہ اپنے پیغمبر
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ وہ فوت ہو گئے اور زیر
دفن ہیں ۔ حالانکہ وہ بھی زندہ ہیں اور دوبارہ اس دُنیا میں تشریف لائیں
اس طرح اس نے مسلمانوں کے جذبہ عشق رسول کو بھڑکا کر نہ صرف یہ کہ ا
بارے میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ یہ شخص تو حضور صلی اللہ علیہ وس
کا مداح ، عاشق اور عقیدت مند ہے بلکہ ایک باطل عقیدے کی بنیاد بھی رکھ
اسی طرح اُس نے دوسرا عقیدہ یہ پیش کیا کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے ا
وہی نبی کا جانشین ہوتا ہے ۔ اُس علاوہ کوئی دوسرا جانشین بن جائے تو اُ
حیثیت غاصب کے سوا کچھ نہیں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور جانشین
حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں ، خلافت بھی اُنہی کا حق ہے پہلے دو نوں خلفاء بھی
تھے اور سب سے بڑا غاصب تو موجودہ خلیفہ ہے ۔ یہ تو ابتدائی باتیں تھیں آخر
نے حضرت علی رضؓ کے بارے الوہیت کا یہ عقیدہ بھی پیش کیا کہ حضرت علی کو در اصل
مظہر خدا ہے ۔ اللہ اُن کے اندر حلول کر گیا ہے ۔ وہی 'GOD INCARNATE' یعنی ج
رب کا قدیم مشرکانہ عقیدہ اُس نے حضرت علی رضؓ کے بارے میں پھیلانا شروع کر دیا
ان عقائد کے ساتھ اُس نے حضرت عثمان رضؓ کے خلاف سیاسی پروپیگنڈے کی ا
باقاعدہ مہم چلائی کہ وہ کنبہ پرور ہیں ، بیت المال میں خیانت کرتے ہیں اور ا
رشتہ داروں کو نوازتے ہیں وقس علیٰ ھذا ۔ جب بصرہ کے گورنر ابن عامر نے
اُس کی سرگرمیوں کا نوٹس لیا تو وہ وہاں سے کوفہ چلا گیا ۔ لیکن اُس کے ہم خیال لو
کی ایک معقول تعداد بصرہ میں پیدا ہو چکی تھی جو اُس کے نظریات کو پھیلانے کے لئے ا
تھی ۔ کوفہ ایک نیا شہر تھا جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران کی سرحد پر فوج

ور پر آباد کیا تھا۔ یہاں پر ایرانی نیشنلزم شاہ پرستی اور یہودی سازش
ب ہوا۔ کوفہ میں عبداللہ ابن سبا کے نظریات کو خوب پذیرائی ملی۔ بہت لوگ
کے پیروکار بن گئے جب کوفہ کے گورنر سعید بن العاص نے اُس سے باز پرس
تو وہ دمشق پہنچ گیا۔ وہاں حضرت امیر معاویہؓ جیسے زیرک صحابی موجود تھے وہاں
کی دال نہیں گلی تو وہاں سے مصر چلا گیا۔ مصر میں اُس نے اپنا اڈہ بنا لیا۔
صوبے میں دوسرے صوبے کے گورنر کے خلاف پروپیگنڈہ اور افواہ سازی کا
سلسلہ اُس نے قائم کر کے لوگوں میں ایک عام بے اطمینانی کی فضا پیدا
دی۔ پروپیگنڈے کی اس شاطرانہ ترتیب کو ذہن میں رکھیے۔ اُس دور میں
ئع ابلاغ موجود نہیں، تار نہیں ٹیلیفون نہیں ڈاک کا کوئی لمبا چوڑا انتظام
یں۔ آج سائنس اور ترقی کے دور میں بھی حال یہ ہے کہ افواہوں کے بل پر بڑے
بڑے فتنے پیدا ہو جاتے ہیں اُس دور کے حالات کو قیاس کر لیجیے۔ افواہ کا ایک
فلسفہ ہوتا ہے۔ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ اچھی بات کی نسبت بری
بات کو زیادہ کان لگا کر سنتا ہے۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب منافقین
نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تو اس دور میں جبکہ اللہ کے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس مسلمانوں کے درمیان موجود تھے، بہت سے مخلص
مومنین بھی منافقوں کی اس سازش کا شکار ہو گئے۔ قصہ مختصر یہ کہ حضرت عثمان
رضی اللہ عنہ کے خلاف عبداللہ ابن سبا کی سازش کامیاب ہو گئی جو حضرات
واقعات کی تفصیل جاننا چاہتے ہیں۔ میرے کتابچے "شہید مظلوم" کا مطالعہ
کریں۔

پروپیگنڈہ کی مہم کے نتیجے میں مختلف صوبوں سے آئے ہوئے بلوائیوں نے
مدینۃ الرسول میں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو انتہائی
مظلومیت کے عالم میں شہید کر دیا۔ بلوائیوں نے پچاس روز تک آپؓ کے گھر کا
محاصرہ کئے رکھا۔ حضرت عثمانؓ کو اُس کنوئیں کے پانی سے بھی محروم کر دیا جسے
عہد رسالت میں انہوں نے خرید کر اہل مدینہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جس طرح حضرت
عمرؓ نے اپنے قاتل ابولولو فیروز کے خلاف کوئی امتناعی اقدام نہیں کیا تھا اسی

طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی بلوائیوں کے خلاف کسی قسم کے فوجی اقدام کی ممانعت کر دی۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنی جان بچانے کے لئے کسی کا خون بہانے کو تیار نہیں ہوں۔ حضرتِ عثمان رضؓ سے کوئی اختلاف کرنا چاہے تو کرے میں تو اسے اُن کی عزیمت کا بہت بڑا ثبوت سمجھتا ہوں۔ ایرانیوں کی نسل پرستانہ ذہنیت اور یہود کی منتقمانہ سازشوں نے مل کر وہ حالات پیدا کئے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر منتج ہوئے اور پھر خانہ جنگی اور فتنے کے اُس دور کا آغاز ہوا جس میں قریباً ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں کا نشانہ بنے۔

شہادت حضرت علی رضؓ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ بدقسمتی سے اُن کا پورا عہدِ خلافت باہمی خانہ جنگی میں گزر گیا۔

حضرت علی رضؓ نے مدینے سے دارالحکومت کوفے منتقل کر دیا۔ کوفہ عبداللہ ابن سبا کے پیروکاروں کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ وہاں سبائیوں نے حضرت علی رضؓ کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ جب بھی صلح کی نوبت آئی انہوں نے اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے جنگ شروع کروا دی۔ "نہج البلاغہ" میں حضرت علی رضؓ کے خطبات پڑھ لیجئے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو کس طرح لعن طعن کرتے ہیں۔ وہ حضرت علی رضؓ کا حکم مانتے ہی نہیں تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضؓ حضرت زبیر رضؓ حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ میں سے کوئی بھی خلافت کا مدعی نہیں تھا۔ سب کا مطالبہ یہی تھا کہ حضرت عثمان رضؓ کے قاتلوں سے قصاص دلوایا جائے۔ جنگِ جمل کے موقع پر حضرت علی رضؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے درمیان صلح ہو رہی تھی۔ تقریباً بات طے ہو چکی تھی۔ حضرت علی رضؓ نے اعلان کر دیا تھا کہ جو لوگ حضرتِ عثمان رضؓ کے خون میں براہِ راست ملوث ہیں وہ علیحدہ ہو جائیں۔ اُس وقت سبائیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہاں اُن کے لیڈر عبداللہ ابنِ سبا اور مالک اشتر نخعی بھی موجود تھے۔ دونوں نے سازشیں کر کے رات کی تاریکی میں حضرتِ عائشہ رضؓ کے لشکر پر حملہ کر دیا تھا اور افواہ اڑا دی تھی کہ حملہ حضرتِ عائشہ رضؓ کے لشکر کی طرف سے ہوا ہے۔ بہرحال صلح ہوتے ہوتے جنگ چھڑ گئی۔ دونوں طرف سے دس ہزار مسلمان کام آئے۔ اسی طرح ایک موقع پر ابو مسلم خولانی حضرت معاویہ

تحریری پیغامِ صلح لے کر آئے۔ حضرت معاویہ رضؓ نے لکھا کہ آپ سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں، آپ کی خلافت سے ہمیں انکار نہیں، ہم بیعت کرنے کو تیار ہیں، آپ ان قاتلینِ عثمان رضؓ کو ہمارے حوالے کردیں۔ حضرت علی رضؓ نے جب کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت معاویہ رضؓ کے سفیر کی موجودگی میں پیغامِ صلح پڑھ کر سنایا تو دس ہزار مسلح انہوں نے کھڑے ہوکر بیک زبان کہا کہ "ہم سب عثمان رضؓ کے قاتل ہیں لو ہم سے بدلہ"۔ حضرت علی رضؓ بے بس ہوگئے۔ بالآخر حضرت علی رضؓ اور حضرت معاویہ رضؓ کے درمیان صفین کے مقام پر شدید جنگ ہوئی۔ دونوں طرف سے چونسٹھ ہزار مسلمان کام آئے۔ صرف ایک جنگ میں تہِ تیغ ہونے والوں کی تعداد ہے ورنہ حضرت علی رضؓ اور حضرت معاویہ رضؓ کے درمیان جنگوں کے سلسلے میں مزید خونریزی بھی ہوئی۔ جنگِ صفین کے دوران جب حضرت علی رضؓ نے ثالثی کی تجویز قبول کرلی تو انہی سبائیوں کا ایک حصّہ باغی ہوکر حضرت علی رضؓ کے لشکر سے علیحدہ ہوگیا جو بعد میں خارجی کہلایا۔ خوب جان لیجئے! یہ خارجی کون تھے! یہ حضرت علی رضؓ کے لشکر سے نکلے ہوئے سادہ لوح لوگ تھے، سبائی پروپیگنڈے کے زیرِ اثر تھے۔ جب یہ لوگ آمادۂ فساد ہوئے تو حضرت علی رضؓ کو ان سے بھی جنگ کرنا پڑی۔ صرف نہروان کی جنگ میں چار ہزار خارجی قتل ہوئے۔ انہوں نے تحکیم قبول کرنے پر حضرت علی رضؓ حضرت معاویہ رضؓ اور حضرت عمرو بن العاص رضؓ جیسے برگزیدہ اصحابِ رسول ﷺ کو کافر، مرتد اور واجب القتل قرار دیا۔ تین خارجیوں نے ایک معاہدے اور منصوبے کے تحت رمضان کی پندرہ تاریخ کو تینوں بزرگوں پر بیک وقت قاتلانہ حملے کیے۔ اللہ کی تقدیر کا فیصلہ ہے۔ حضرت معاویہ رضؓ پر وار اوچھا پڑا۔ معمولی زخم آئے۔ چند روز میں مندمل ہوگئے۔ حضرت عمرو بن العاص رضؓ علیل تھے اس روز نماز پڑھانے مسجد میں تشریف ہی نہیں لائے۔ اُن کی جگہ جس نے امامت کی، وہ لقمۂ اجل بن گیا۔ لیکن حضرت علی رضؓ کی پیشانی پر ابنِ ملجم کے زہر میں بجھے ہوئے خنجر کا وار کاری ثابت ہُوا۔ اب دیکھیے حضرت عثمان رضؓ کے بعد حضرت علی رضؓ بھی سبائیوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ آخری وقت میں حضرت علی رضؓ سے لوگوں نے پوچھا کہ ہم حضرتِ حسن رضؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرلیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بالکل صاف اور درست جواب دیا کہ میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا

ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ اگر تم حسن رضؓ کو خلافت اور کا اہل سمجھتے ہو تو بیعت کرلو۔ لیکن صرف میرا بیٹا ہونے کی وجہ میں یہ نہیں کہتا کہ ضرور اُس کے ہاتھ بیعت کرو۔

حضرت حسنؓ کا مصالحانہ کردار اور خانہ جنگی کا اختتام

بہرحال لوگوں نے حضرت حسن رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ آپؓ چھ ماہ خلیفہ رہے۔ حضرت معاویہ رضؓ اور حضرت عمرو بن العاص نے حضرتِ علی رضؓ کے ہاتھ پر بیعت لی تھی نہ حضرت حسن رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ عالمِ اسلام متحد نہیں تھا۔ توسیع انقلاب کا عمل رک گیا۔ تلواریں اپنے ہی خون سے رنگین ہوتی رہیں۔ حضرت حسن رضؓ حضرتِ معاویہ رضؓ کے خلاف لشکر لے کر نکلے تو راستے میں افواہ اُڑ گئی کہ حضرتِ حسن رضؓ کے لشکر کے ہراول دستے کو شکست ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حضرتِ حسن رضؓ کے اپنے ساتھی اُن کی جان کے درپے ہو گئے۔ اُنہیں راستے میں مدائن میں کسریٰ کے ایک پرانے محل میں پناہ لے کر جان بچانی پڑی۔ اُن کے ساتھی وہ تھے۔ وہی سبائی وہی کوفی۔ حضرت حسن رضؓ اُن کی حقیقت کو خوب جانتے تھے۔ اُن کو تجربہ ہو گیا تھا اُن لوگوں کے کردار کا۔ ان حالات میں حضرتِ حسن رضؓ نے حضرتِ معاویہ رضؓ کی صلح کی پیش کش کو فوراً قبول کرلیا۔ حضرتِ حسن رضؓ کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی بھی موجود تھی کہ "میرے اس بیٹےؓ کے ذریعے اللہ ایک وقت میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرا دے گا۔" یہ سنہ کی بات ہے۔ حضرتِ معاویہ رضؓ نے حضرتِ حسن رضؓ کو شرائطِ صلح طے کرنے کا پورا اختیار دے دیا۔ آج کی اصطلاح میں گویا بلینک چیک (BLANK CHEQUE) دے دیا گیا۔ چنانچہ حضرت حسن رضؓ نے چار شرائط پیش کیں۔ جنہیں حضرتِ معاویہ رضؓ نے من وعن تسلیم کر لیا۔ پہلی شرط یہ تھی کہ عام معافی ہوگی۔ اب تک دونوں طرف سے جنگوں میں جو کچھ ہوا اس پر کسی سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ دوسری شرط یہ طے ہوئی کہ ایران کے صوبہ اہواز کا سالانہ خراج حضرتِ حسن رضؓ کو ملے گا۔ تیسری شرط یہ تھی کہ میرے بھائی حسین رضؓ کو سالانہ ۲۰ ہزار درہم وظیفہ دیا جائے گا۔

چوتھی اور آخری شرط یہ تھی کہ بنی ہاشم کو مسلمانوں کے دوسرے قبائل سے زیادہ وظیفہ دیا جائے گا۔ صلح کے بعد حضرت حسن رضؓ نے اعلان کر دیا کہ اگر خلافت حضرت معاویہ رضؓ کا حق تھی تو انہیں پہنچ گئی اور اگر میرا حق تھی تو میں اُن کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ اس اعلان کے بعد حضرت معاویہ رضؓ نے بیعتِ خلافت لی اور اس طرح اُس پانچ سالہ خانہ جنگی کا خاتمہ ہُوا جس میں ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں اور تلواروں سے قتل ہوئے تھے۔

حضرت معاویہ رضؓ کا عہدِ حکومت

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس صلح پر یہودیوں اور سبائیوں کی تخریبی انقلاب شکن تحریک کو کس قدر صدمہ پہنچا ہوگا۔ تاریخ کی یہ عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ سنہ ۴۱ھ سے سنہ ۶۰ھ تک حضرت معاویہ رضؓ کے بیس سالہ عہدِ حکومت میں کوئی خانہ جنگی، کوئی بغاوت، کوئی فتنہ و فساد، کوئی اختلاف رونما نہ ہُوا۔ تاریخِ اسلام میں خلافتِ راشدہ کے تیس سالہ دَور کے بعد یہ بیس سالہ دَور بھی مسلمانوں کا بہترین دور تھا۔ توسیعِ انقلاب کا جو عمل اندرونی سازشوں، خلفشار، خانہ جنگی اور فتنہ و فساد کے نتیجے میں بالکل رُک گیا تھا، پھر سے اُس کا آغاز ہُوا۔ گویا ع "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا"، مسلمان پھر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر نکل کھڑے ہوئے۔ قیصر کا دارالسلطنت قسطنطنیہ جو ابھی تک فتح نہیں ہُوا تھا، اُس پر فوج کشی کی گئی۔ جس کے بارے میں صحیح بخاری کی روایت میں یہ بشارت موجود ہے کہ اس جہاد میں شامل ہونے والے مغفور لہم "ہیں۔ اس لشکر میں حضرتِ حسین رضؓ بھی شامل تھے۔ میزبانِ رسول ؐ حضرت ابوایوب انصاری رضؓ نے اسی روایت کا مصداق بننے کے لیے ۸۰ سال کی عمر میں پالکی میں سوار ہو کر اتنا طویل سفر کیا۔ وہاں آپ رضؓ کا انتقال ہُوا۔ آپ رضؓ نے وصیت کی کہ مجھے دشمن کے علاقے میں شہر پناہ کے جتنے قریب دفن کر سکتے ہو کرنا۔ آج بھی قسطنطنیہ میں اُن کی قبر موجود ہے۔ اس لشکر کا سپہ سالار کون تھا؟ البدایہ والنہایہ میں حافظ ابن کثیر کی نقل کردہ روایت دیکھ لیجئے۔ اس لشکر کا سپہ سالار حضرت معاویہ رضؓ کا بیٹا یزید تھا۔ بہرحال حضرت معاویہ رضؓ

کا بیس سالہ عہد فتنہ پروروں اور سازشیوں کے لیے سخت نامساعد عہد تھا۔ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے جس پودے کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے سازشیں کر رہے تھے۔ وہ پھل پھول رہا تھا۔ ملک میں امن و امان تھا مملکت کی سرحدیں وسیع ہو رہی تھیں۔ اس بیس سالہ دور میں ایک اختلافی معاملہ پیش آیا یزید کی ولی عہدی کا۔ میرا خیال تھا کہ آج یہ بحث مکمل ہو جائے گی۔ لیکن اس نکتے پر اسے چھوڑتے ہیں۔ انشاء اللہ باقی گفتگو اگلے جمعہ کو ہو گی۔

اقول قولی ھٰذا و استغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

ٹیلی ویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ (درس ۱۱)

مباحث عمل صالح

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

(سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

— ۱ —
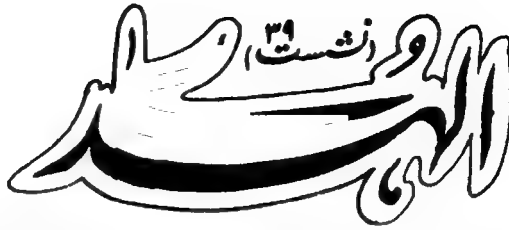
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

"بہت ہی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمان میں بُرج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور روشن چاند بنایا — اور وہی ہے کہ جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لئے جو یاد دہانی اخذ کرنا چاہے یا شکر کی روش اختیار کرنا چاہے — اور رحمان کے محبوب بندے تو وہ ہیں جو زمین پر چلتے ہیں تواضع اور نرمی کے ساتھ اور جب ان سے جاہل لوگ اُلجھتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں اور وہ جو راتیں بسر کرتے ہیں اپنے ربّ کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بستہ کھڑے رہ کر — اور وہ جو یہ کہتے ہیں — اے ربّ ہمارے! پھیر دے ہم سے جہنم کے عذاب کو۔ یقیناً اس کا عذاب چمٹ جانے والی چیز ہے۔ یقیناً وہ بہت بری جگہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی اور عارضی قیام گاہ کے اعتبار سے بھی — اور وہ

جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں نہ بخل سے ۔ بلکہ ان کی
روش اس کے بین بین ہوتی ہے اور وہ جو نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ کسی اور
معبود کو اور نہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے
ساتھ ۔ اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی بھی یہ کرے گا وہ اس کی پاداش بھگت
کر رہے گا ۔ دُگنا کر دیا جائے گا اس کے لئے عذاب کو قیامت کے دن اور وہ
اس میں رہے گا ہمیشہ ہمیش ذلیل و خوار ہو کر ۔ سوائے اس کے جو توبہ کرے
اور ایمان لائے اور اچھے عمل کرے ۔ تو ایسے لوگوں کی بُرائیوں کو اللہ تعالےٰ
بھلائیوں سے بدل دے گا ۔ اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا، رحم فرمانے والا
۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو حقیقتاً وہی ہے جو ایسی توبہ
کرتا ہے جیسے کہ توبہ کرنے کا حق ہے ۔ اور وہ جو جھوٹ پر اپنی موجودگی تک
گوارہ نہیں کرتے اور اگر کسی لغو کام کے پاس سے اُن کا اتفاقاً گزر ہو جائے تو
بھی دامن کو بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں ۔ اور وہ جنہیں جب ان کے رب کی
آیات کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں
ٹوٹ پڑتے ۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ اے رب ہمارے! ہمیں اپنی بیویوں اور
اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں اپنے نیک بندوں کے آگے
چلنے والا بنا ۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہیں بدلہ میں بالاخانے ملیں گے بعوض اس
صبر کے جو انہوں نے کیا اور وہاں ان کا استقبال ہوگا نیک دُعاؤں اور سلام
کے ساتھ ۔ وہ اُس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش ۔ اور وہ بہت ہی عمدہ جگہ ہے
مستقل جائے قرار ہونے کی حیثیت سے بھی اور عارضی قیام گاہ ہونے کے اعتبار
سے بھی ۔ اے نبی! کہہ دیجئے! میرے رب کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے
اگر نہ ہوتا تمہیں پکارنا تو تم نے جھٹلا دیا ہے تو اب یہ جھوٹ جلد تم پر لاگو ہو کر
رہے گا ۔۔۔

محترم سامعین اور معزز ناظرین! السلام علیکم ۔
ابھی آپ نے سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی آیات کی تلاوت بھی سماعت
فرمائی اور ان کی ترجمانی بھی سنی ۔ مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ

درس ...ن مجالس میں ہو رہا ہے، ان آیات پر اس کا درس بڑا مشتمل ہے — اور اگر
...مین کی ترتیب کو بھی آپ ذہن میں تازہ کر لیں تو آپ کو یاد ہو گا کہ اس منتخب نصاب کے
...ہ میں چار جامع اسباق تھے — دوسرے حصہ میں کچھ ایسے مقامات تھے جن کے ذریعہ
...ن کے ضمن میں چند مباحث ہمارے سامنے آتے تھے — تیسرے حصہ میں اعمالِ صالحہ
...ث ہے جو چل رہی ہے — اس کے پہلے سبق میں اُن اوصاف کا بیان تھا — جو
...ئے قرآن حکیم انسان کی سیرت کی تعمیر یا بقولِ علامہ اقبال مرحوم تعمیرِ خودی کے لئے
...دی لوازم ہیں، اساسات ہیں — اب آج کے درس میں جو آیات مبارکہ آپ نے
...مت فرمائیں اور اس کی جو ترجمانی آپ کے سامنے آئی اس میں آپ نے محسوس فرما لیا
...ہ کہ یہاں بھی چند اوصاف ہیں کہ جن کا ذکر ہو رہا ہے — جس طرح سُورۂ مومنون کے
...ے رکوع میں چھ مرتبہ اسمِ موصولہ "اَلَّذِیْنَ" دہرا دہرا کر آیا تھا اور سورۂ
...رج کی اُن آیات میں کہ جو سورۂ مومنون کی آیات کی ہم مضمون تھیں آٹھ مرتبہ "وَالَّذِیْنَ"
...رار ہوئی — اسی طرح آج کے درس میں بھی آپ نے دیکھا کہ "اَلَّذِیْنَ" ایک مرتبہ
...اور "وَالَّذِیْنَ" سات مرتبہ دُہرایا گیا — کہ عباد الرحمٰن یعنی ہمارے محبوب بندوں
...ں یہ اور یہ اوصاف ہوتے ہیں — ان کی یہ اور یہ کیفیت ہوتی ہے — ان کی راتیں اس میں
...ر اس کیفیت میں بسر ہوتی ہیں — وہ جب خرچ کرتے ہیں تو ان کی روش یہ ہوتی ہے"

[illegible] —

غور طلب بات یہ ہے کہ اُس ... اور اس سبق کے مابین منطقی ربط کیا ہے — آپ
...نے محسوس کر لیا ہو گا کہ اس مقام پر اُن اوصاف کا بیان ہو رہا ہے کہ جنہیں ہم چوٹی کے
...صاف کہہ سکتے ہیں — یعنی ایک پوری طرح تربیت یافتہ خودی یا ایک پوری طرح تعمیر شدہ
...ت کے یہ خد و خال ہونے چاہئیں — ایک بندۂ مومن کے جو نمایاں اوصاف اللہ
...سند ہیں، ان کا اس سبق میں نہایت جامع بیان آیا ہے — میں اسے ایک مثال سے
...ح کروں تو وہ یہ ہو گی کہ جیسے ہم ایک عمارت بناتے ہیں تو اس کا ایک STRUCTURE
...ڈھانچہ ہوتا ہے، جس میں آپ کو معلوم ہے کہ آجکل سیمنٹ، لوہا، سریا اور لکڑی وغیرہ
...استعمال ہوتی ہے — اور عمارت کی اصل مضبوطی، اس کا اصل استحکام اس کے STRUC-
TURE کی مضبوطی پر ہوتا ہے — پھر اس عمارت کی FINISHING ہے — اس کی آرائش

ہے۔ عمدہ پلاسٹر ہو، رنگ و روغن اعلیٰ ہو اور اس عمارت کے خدوخال کی خوبصورتی
پہلوؤں سے ظاہر ہو رہی ہو تو یہ اس اسٹرکچر (عمارت) کے ...SHING TOUCHES
ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ جب آپ کسی عمارت کو دیکھتے ہیں تو اس کا اسٹرکچر (...
TURE) نگاہوں کے سامنے نہیں آتا۔ وہ تو ایک مخفی شے ہے، اوجھل شے ہے...
جو چیز آئے گی وہ اس کے نمایاں خدوخال ہیں۔ اگر عمارت دل آویز ہے، خوبصورت
ہے، پلاسٹر اچھا ہوا ہے، رنگ و روغن عمدہ ہے تو وہ دید و زیب ہوگی اور آپ...
نگاہوں کو اپنی طرف کھینچے گی۔

بالکل یہی ربط و تعلق ہے ہمارے سابقہ سبق میں اور اس سبق میں۔ ...
سمجھئے کہ سیرت و شخصیت کی تعمیر کا جو اساسی پروگرام ہے وہ تو وہ ہے جس پر ...
مقامات کے حوالے سے غور کر چکے ہیں۔ لیکن ایک مکمل تعمیر شدہ انسانی شخصیت ...
کی تعبیر علامہ اقبال مرحوم نے یوں کی ہے کہ ؎

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن

یہ دل آویزی جن اوصاف سے پیدا ہوتی ہے وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس ...
پر نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ ہم اس سبق پر بھی کئی حصوں میں ...
کریں گے جیسے پہلے اسباق پر کرتے رہے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا حصہ جو دو آیات ...
مشتمل ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایمان کے ضمن میں جو بحثیں اس سے قبل اس سلسلہ ...
میں ہو چکی ہیں، ان کا نہایت جامع خلاصہ اس حصہ میں آ گیا ہے۔ فرمایا:

تَبٰرَكَ الَّذِىۡ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّجَعَلَ
فِيۡهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيۡرًا ۝

"وہ بڑی ہی بابرکت ہے وہ ہستی، وہ ذات جس نے آسمانوں میں برج بنائے
اور اس (آسمان) میں ایک چراغ روشن کیا۔ یعنی سورج۔ اور روشن
چاند بنایا۔"

وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ خِلۡفَةً۔

"اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا"
گویا وہ ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔ رات دن کا پیچھا کرتی ہوئی چلی آتی ...

دن جیسے رات کا تعاقب کرتے ہوئے نمودار ہوتا ہے۔ یہ قانونِ طبعی کی ایک بیّن حقیقت ہے اس
حقیقت آپ کو یاد ہوگا کہ اسے سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں آیاتِ الٰہیہ سے تعبیر کیا گیا
تھا: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ
لِّاُولِی الْاَلْبَابِ — اور اسی موقع پر ہم نے سورہ بقرہ کے اکیسویں رکوع کی پہلی آیت
(آیت نمبر ۱۶۴) بھی تفصیل سے پڑھی تھی کہ اس کائنات کی ہر شے ایک نشانی ہے جس کو
دیکھ کر لامحالہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کا ذہن اس کے خالق، اس کے مالک،
اس کے صانع، اس کے مصوّر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس کائنات کے مشاہدات
سے اس ذات کی صفاتِ کمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو اس کائنات کا بنانے والا ہے وہ
عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ اس کی قدرت میں کہیں کوئی کمی نہیں، اس کے علم میں
کہیں کوئی کمی نہیں، اس کی حکمت میں کہیں کوئی کمی نہیں۔ وہ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہے اور
وہ ہستی اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ہے۔

یہ درحقیقت وہی مضمون ہے جسے یہاں بھی تمہید کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ
آیاتِ آفاقیہ پر غور و تدبّر کرتے ہیں، جسے علامہ اقبال نے اس طرح تعبیر کیا کہ ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

تو وہ لوگ جو اس وسیع و عریض کائنات میں پھیلی ہوئی آیات سے اس کے خالق کی
معرفت حاصل کرتے ہیں، انہی میں تو یہ اوصاف پیدا ہوں گے کہ جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔
چنانچہ دوسری آیت کے آخر میں فرمایا:

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا ○

"یہ نشانیاں ہیں، اس کے لئے جو چاہے کہ یاددہانی حاصل کرے یا چاہے
کہ (اللہ کا) شکر گزار رہے"۔

سورہ لقمان کے دوسرے رکوع کا جو مضمون تھا وہ ان الفاظِ مبارکہ سے آپ کے ذہن میں آ گیا
ہوگا کہ کائنات کے مشاہدہ سے جہاں تذکّر حاصل ہوتا ہے، یاددہانی نصیب ہوتی ہے،
انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہاں ساتھ ہی اس کی نعمتوں کا احساس پیدا ہوتا ہے

اللہ کے احسانات کا ادراک حاصل ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کی روزی کا
کیا عظیم الشان نظام بنایا ہے! اس نے انسان کی ہر ہر ضرورت کو بہم رسانی کے
کیا اعلیٰ انتظام و انصرام فرمایا ہے! وہ انسان کے جسم و جان کے تمام تقاضوں
کس طریقہ سے پورا فرما رہا ہے۔ اس شعور و ادراک سے ایک دوسرا جذبہ
کے دل میں اُبھرتا ہے وہ جذبۂ شکر ہے۔ یاد آئی ہوگی سورۂ لقمان کے دوسرے
کی پہلی آیت: وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ
"ہم نے لقمان کو حکمت اور دانائی عطا فرمائی کہ کر شکر اللہ کا!"

تو معلوم ہوا کہ اس کائنات کے مشاہدہ سے اور آیاتِ سماوی، آیات
آیاتِ آفاقی، آیاتِ انفسی سے ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کو دو چیزیں
اخذ کرنی چاہئیں۔ ایک وہ جسے قرآن کریم تذکر سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اس کائنات
کی وسعتوں میں انسان کی نگاہیں الجھ کر نہ رہ جائیں بلکہ ان کو دیکھ کر ان پردوں
سے اس کا خالق، اس کا مالک، اس کا صانع، اس کا مصوّر، اس کا مدبّر
اور ذہن و شعور اور عقل و ادراک اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے
جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے تخیلات میں

تو دل کی آنکھ سے اس کائنات کے ذریعے اللہ تک پہنچا جائے تو اس کا نام تذکر ہے۔
دوسرے یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ادراک ہو۔ اس کے احسانات کا شعور
جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس کے دل میں تشکر کے جذبات وجود میں آئیں۔ ان
کے لئے یہاں فرمایا گیا: لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا

تو یہ ہے مضمون اس رکوع کی پہلی دو آیات کا۔ آج اسی پر اکتفا کیجئے۔ اب
نشست میں ان شاء اللہ اُن اوصاف کا سلسلہ وار بیان ہوگا جو اس
کے نتیجہ میں ایک سلیم الفطرت انسان کی شخصیت کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اب
اس گفتگو پر کوئی سوال ہو تو میں اس کے لئے حاضر ہوں۔

سوال وجواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! ان آیات کے شروع میں برجوں کا جو ذکر آیا ہے تو
س بات کی تشریح فرمائیے کہ ان بُرجوں کی نوعیت کیا ہے؟ اور آسمانوں میں یہ کس قسم کے
برج ہیں؟ -

ڈاکٹر صاحب: یہ بڑا متعلق سوال ہے — اصل میں عربی زبان میں بُرج
کہتے ہیں کسی نمایاں چیز کو — بَرَج کے معنی ہیں کوئی چیز ظاہر ہوئی، نمایاں ہوئی
س سے لفظ بُرج بنا ہے — بُرج اور خاص طور پر برجیوں کے لفظ سے ہم واقف ہیں۔
عوں کی فصیل پر جو بُرجیاں بنی تھیں ان کو برجیاں اسی لئے کہا جاتا تھا کہ وہ دور سے
نمایاں طور پر نظر آتی تھیں — اب رہا یہ سوال کہ آسمان میں وہ کون سی شے ہے جسے
ن مجید بُرج سے تعبیر کر رہا ہے! تو یہ بھی عین ممکن ہے — کہ اس سے بڑے بڑے ستارے
ر سیارے مراد ہوں لیکن اس کا حتمی تعین کرنا فی الحال مشکل ہے۔ شاید ہمارا فلکیات
علم اور آگے بڑھے تو یہ بات نمایاں ہو کر سامنے آئے کہ یہ ہے وہ حقیقت جسے
قرآن مجید نے بُرج سے تعبیر کیا ہے — لیکن تا حال مناسب یہ ہے کہ ہم اس بات کو
مجمل رکھیں اور آئندہ کے اکتشافات کے امکانات کے لئے کھلا OPEN چھوڑ
یں -

سوال: ڈاکٹر صاحب! زیرِ درس آیات میں دن اور رات کے تسلسل کا
ر آیا ہے۔ کیا آپ بیان کریں گے کہ اس تسلسل میں کیا حکمت ہے -؟

ڈاکٹر صاحب: اصل میں لفظ تسلسل آپ صحیح استعمال نہیں کر رہے -
ہاں لفظ آیا ہے: "خِلْفَۃً" - خلف کہتے ہیں پیٹھ کو اور پیچھے کو — تو اس کا مفہوم
یہ ہوگا کہ رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ جیسے کہ وہ ایک دوسرے
تعاقب کر رہے ہیں۔ رات کے بعد دن، اور دن کے بعد رات — اس میں جو حکمتیں ہیں وہ تو
ظہر من الشمس ہیں — آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے اس کرہ ارضی پر حیات کا جو نظام
ہے اس میں رات دن کے اس الٹ پھیر اور اس کے فرق و اختلاف کو بڑی بنیادی
ور اساسی اہمیت حاصل ہے — اس لئے کہ حیات کی جو ابتدائی شکل ہے — یعنی عالم
نباتات — اس کا جو تنفس (RESPIRATION) کا نظام ہے، وہ دن کو کچھ اور ہوتا ہے

اور رات کو کچھ اور ہوتا ہے دن میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے استعمال سے
PHOTOSYNTHESIS (شعاعی ترکیب) کا عمل ہے جو ان پتوں میں ہوتا
اور رات کو یہی پتے آکسیجن جذب کرتے ہیں اور کاربن ڈائی اکسائڈ خارج کرتے ہیں۔
اور آپ کو معلوم ہوگا کہ اسی پر سارا دار و مدار ہے اس حیاتِ نباتاتی کا۔ پھر حیوانات
کی حیات کا جو سلسلہ ہے وہ درحقیقت منحصر ہے اسی نباتاتی حیات پر چونکہ یہی نباتات
حیوانات کی غذا بنتے ہیں۔ اس پہلو سے غور کرنے والوں کے لئے رات اور دن کے
الٹ پھیر میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے دفتر پنہاں ہیں۔ ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورق دفتریست زمعرفتِ کردگار

تو ایک ایک پتہ اگر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دفتر ہے اور ان پتوں میں SYN-
THESIS کی جو فیکٹری لگی ہوئی ہے۔ تو اس کا سارا دار و مدار رات دن کے
الٹ پھیر اور فرق پر ہے۔

حضرات! آج ہم اپنے اس گیارہویں درس کا ایک تو بحیثیت مجموعی وہ
جائزہ لے سکیں ہیں اور ابتدائی دو آیات جن کی اس مقام پر حیثیت صرف تمہید کی
ہے۔ آج کی نشست میں صرف ان تک ہمارا مطالعہ آگے بڑھ سکا ہے۔ اب ان شاء
اللہ اگلی نشست میں ہم ان صفات کا سلسلہ وار مطالعہ کریں گے جو اللہ تعالیٰ کو
پسند ہیں اور جن کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ اس کے محبوب بندوں میں پیدا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

انٹرویو

اسد اللہ بھٹو بتاتے ہیں :

بابُ الاسلام سندھ مسائل اور اُنکا حل

تحریر و گفتگو : مقبول الرحیم مفتی

نامور دانشور اور تنظیم فکر و نظر سندھ کے صدر پروفیسر اسد اللہ بھٹو سندھ کی تاریخ اور موجودہ حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ موصوف علمی اور ادبی محاذ پر بڑی جانفشانی سے کمیونسٹ، لادین اور علیحدگی پسند قوتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خصوصی دعوت پر پروفیسر صاحب لاہور تشریف لائے تھے۔ انہوں نے قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں سندھ کی تاریخ اور موجودہ حالات پر سیر حاصل خطاب کیا۔ لیکن شدید بارش کی وجہ سے اہلِ لاہور اُن سے بھرپور انداز میں مستفید نہ ہو سکے۔ سندھ کے مسائل پر اُن کا فکر انگیز انٹرویو پیشِ خدمت ہے۔ اسد اللہ بھٹو صاحب نے صرف مسائل کی نشاندہی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُن کا حل بھی بتایا ہے۔

(ادارہ)

س : پروفیسر صاحب! سندھ میں علمی اور ادبی محاذ پر آپ دین کے حوالے سے جو قابلِ قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں ان پر کچھ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے؟

ج : اس میدان میں ہم نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۶۵ء میں جیکب آباد میں حلقہ ادب اسلامی سے کیا تھا۔ مجھے اس حلقے کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس میدان میں منظم انداز سے کام کرنے کی ضرورت تو بڑے عرصے سے محسوس ہو رہی تھی کیونکہ لادین قوتیں بڑے پیمانے پر ایک طویل عرصے سے اس میدان میں سرگرم عمل تھیں پھر ۱۹۶۹ء میں باقاعدہ طور پر ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ محمد بن قاسم سندھی مسلم سوسائٹی کے نام سے سکھر میں اس کی تشکیل ہوئی۔ میں اس کا نائب صدر منتخب ہوا۔ فکری اور نظریاتی محاذ

پر اس ادارے نے بھرپور کام کیا۔ سندھ کے حالات کا تجزیہ پیش کیا دین کے حوالے سے جس خلا کو محسوس کیا جا رہا تھا اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ اس ادارے نے یوم باب الاسلام منانے کی روایت ڈالی۔ اس روایت کو مستحکم کیا اور سندھ کے تمام بڑے بڑے شہروں قصبوں اور دیہات تک اس تحریک کو پھیلا دیا۔ وہ جو ایک تاثر دہ بٹھا رہے تھے۔ وام پرستی کا تاثر، اس کو ہم نے زائل کیا۔ اگرچہ ہماری کتابیں کم تھیں مگر بہت موثر ثابت ہوئیں اور ان کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ لادینیت کو اپنی حکمت عملی تبدیل کرنا پڑی۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ سرکاری ادارے بھی کمیونزم، لادینیت، علیحدگی پسندی کی فکر کو ہوا دے رہے تھے۔ ہمارے ادارے نے ان کا تعاقب بھی کیا ان کو [illegible] بھی کیا۔ حکومت کو بھی متوجہ کیا اور حکومت کو بتایا کہ سندھ کی خدمت تو یہ ہے کہ سندھ کی حقیقی [illegible] سامنے لائی جائے اور جو اس کی حقیقی تشخص ہے کہ اس نے تحریک پاکستان میں قیادت کی ہے [illegible] کی ہے ہر محاذ پر۔ اسے اجاگر کریں۔ اپنے اداروں کو درست کریں۔ جس کے نتیجے میں [illegible] میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ ان کی ملازمت میں بھی تبدیلی ہوئی۔ [illegible] ادارے میں تقریباً [illegible] تک [illegible] اس نے اہم کیا ہے سندھی زبان میں تیس کے قریب کتابیں شائع کیں۔ بڑے علمی اجتماعات اور خاص طور پر سیرت کانفرنسیں منعقد کیں۔ سندھ کے مذہب اسلام دیوں [illegible] کو منظم کیا۔ بڑے بڑے عام جلسے بھی لئے۔ تعلیمی میدان میں بھی نفوذ کیا اور وہ ایک طرف شریعت [illegible] تھا اس کو ختم کیا۔ پھر کچھ ایسے اسباب ہوئے کہ اس ادارے سے مجھے لاتعلق ہونا پڑا۔ پھر ۱۹۰۹ [illegible] تنظیم فکر و نظر سندھ کے نام سے ادارہ بنایا گیا تھا جس کا میں بانی صدر منتخب ہوا۔ اس ادارے نے بھی اس تحریک کو آگے بڑھایا اور ٹھیٹ بنیادوں پر [illegible] تھی۔ [illegible] پھر اس ادارے نے تیار کیا ہے۔ [illegible] زیادہ تر سندھی کتابیں ہیں۔ اور پھر بڑی بڑی ادبی اور تعلیمی کانفرنسیں کی ہیں ہم نے۔

س : سندھ میں لادینیت کی علیحدگی کی جس تحریک کا آپ مذکرہ کر رہے ہیں اس کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں آپ کی نظر میں۔

ج : یہ جو تحریک ہے لادینیت کی یہ یونہی نہیں بڑھ رہی۔ اس کے [illegible] واقعی موجود ہیں۔ دینی نقطہ نظر سے بھی مسائل کو حل نہیں کیا گیا۔ زیادتیاں سندھ کے لوگوں کے ساتھ ہوئی ہیں جنہیں بھی حق و انصاف کی بنیاد پر لوگوں کو نہیں دی گئیں۔ مگر اس میں پنجاب کے لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اصل میں ہماری بیوروکریسی جو اسلام سے بیگانہ تھی اس کے ذہن میں لادینیت تھی جو افسر شاہی سندھ میں آئی اس نے یہ نہیں سوچا کہ ہمارے رویے کا کیا اثر پڑے گا۔ خاص طور پر ملازمتوں کے حوالے سے۔ مثال کے طور پر سندھ میں ایسو فرٹیلائزر کا کارخانہ ہے مگر اس میں پچانوے فیصد غیر سندھی ہیں۔ ہمارے افسران معمولی معمولی ملازمین بھی مثلاً چوکیدار ہے چپڑاسی ہیں کلرک ہیں ڈرائیور ہیں ادھر

بی ب سے منگتے ہیں۔ حالانکہ مقامی طور پر لوگ موجود ہیں ان کو روزگار دیا جا سکتا ہے اور پھر ہمارے
وفد ملاسنے پر انہوں نے کچھ لوگوں کو ملازمتیں دیں۔ لیکن یہ کہ ایک عجیب ذہنیت ہے۔ خدا جانے
ن کا کیا مقصد ہے کہ جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہیں یا عصبیت کی وجہ سے ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ
یا ان کا ذہن صاف نہیں ہے اور حالات کو وہ سمجھ نہیں پاتے کہ ان کے رویے کے کیا
نتائج نکلیں گے۔ بہرحال اس بات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ ایک ادارہ سندھ
میں قائم ہو رہا ہے اور اس میں مقامی طور پر یہ لوگ میسر ہو سکتے ہیں اور اب تو سائنس میں
انجینئرنگ میں ڈاکٹری میں ٹیکنالوجی میں لوگوں کے پاس ڈگریاں ہیں۔ لیکن پھر بھی اداروں میں مقامی
لوگوں کا تناسب کہیں دس فیصد ہے کہیں پانچ فیصد ہے۔ اس بات کا ہمارے پاس کوئی جواب
نہیں ہم سمجھتے ہیں کہ یہ زیادتی ہے۔ اسلام میں بھی اس کا کوئی جواز نہیں۔ تو یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جن
کا حل ہونا چاہیئے۔ ورنہ یہ ISSUES ان لوگوں کو ملیں گے اور وہ ان کو اٹھائیں گے لیکن سچی
بات یہ ہے وہ لوگ حقیقت میں سندھ کے بھی خیرخواہ نہیں ہیں۔ وہ تو کمیونسٹ اور بند ولایلی کے
ایجنٹ ہیں اور ان ISSUES پر ان مسائل کی بنیاد پر وہ انتقام لے رہے ہیں پاکستان سے اور
سندھ میں سے۔ بے روزگاری نے سندھ میں بہت سنگین مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ترجیحی
بنیادوں پر اس مسئلے کو حل کیا جانا چاہیئے۔ ہزاروں لوگ بے روزگار ہیں اور اس میں مہاجر بھی شامل
ہیں۔ اس لئے کہ مہاجروں کی کوئی اور سرزمین نہیں ہے۔ ان کو سندھ میں جینا ہے سندھ میں مرنا
ہے۔ ان کے مسائل بھی حل ہونے چاہیئے۔ لیکن یہ ہے کہ اب یہ بات طے ہونی چاہیئے کہ ہم نے
ساتھ رہنا ہے اور بھائی بن کر رہنا ہے اور بنیاد جو ہے بھائی چارے کی وہ دین ہے اور وطن ہے۔
جس قدر یہ بنیاد کمزور ہوگی ملی رشتہ کمزور ہوگا اسی لحاظ سے عصبیت بڑھے گی اور کوئی بھی چین سے نہیں
رہے گا نہ سندھی چین سے رہیں گے نہ مہاجر چین سے رہیں گے۔

س : پروفیسر صاحب بات پھر وہی سیاست کی آجاتی ہے۔ کیا آپ کی دانست میں یہ بیروزگاری اور
ملازمتوں کے مسائل اور بیوروکریسی کے رویے جیسے مسائل ملک کے مجموعی اور عمومی سیاسی
مسئلے کو حل کئے بغیر ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ سندھ کا معاملہ تو خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ جیسی کچھ بھی
جمہوریت ملک میں آئی ہے اس کے باوجود سندھ کا گورنر وہی ہے جو مارشل لاء کے عہد میں تھا
اور وزیراعلیٰ بھی ایک طرح سے غیر منتخب شخص ہے کہ ان کو وزیراعلیٰ نامزد کرنے کے بعد "بلا مقابلہ"
طریقے سے صوبائی اسمبلی میں پہنچایا گیا ہے۔؟

ج : اصل میں خرابی اور بگاڑ کے دو پہلو ہیں۔ چونکہ ہمارے ملک میں جمہوری ادارے شروع سے
غیر مستحکم رہے ہیں اور پھر سیاست اور جمہوریت اسلام کے تابع بھی نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ بھی لادینی رہا

اس لیے ان معاملات کو بھی صحیح رُخ پر ڈالنے کی کافی ضرورت ہے لیکن موجودہ صورت حال میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں لوگوں نے الیکشن میں حصہ لیا ہے اور جو لوگ منتخب ہو کر آئے ہیں ان کو واقعتاً عوام نے ووٹ دیئے ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ انتخاب کا نظام ہی غلط ہے۔ اس میں دھاندلیاں ہیں۔ دولت کا ناجائز استعمال ہے اور سرمایہ تو بے دریغ ہی استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ فرق ضرور ہوا ہے کہ وزیر اعظم سندھ سے لیا گیا ہے اور وہ بہرحال ایک منتخب نمائندہ ہے۔ اسمبلیاں وجود میں آگئی ہیں یہ ایک ابتدا ہے۔ ان اداروں نے مناسب انداز سے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ ان کو کام کا موقع دیا جانا چاہیے۔ لیکن مسائل کا اتنا ڈھیر ہے کہ ان سے بھی آسانی سے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے ترجیحی اور ہنگامی بنیادوں پر کام کیا جائے۔ کوئی اعلیٰ سطحی کمیشن قائم کیا جائے جو چیف جسٹس کی سربراہی میں قائم ہو اور حقائق کی بنیاد پر پورے مسئلے کا جائزہ لے۔ جو صحیح نمائندے ہیں جنہوں نے نظریاتی سطح پر کام کیا ہے جو مسئلے کی تہہ تک گئے ہیں جو مسئلے کے مضمرات جانتے ہیں اس کی تاریخ کو جانتے ہیں تجزیہ کر سکتے ہیں ان سے رائے لی جائے۔ دنیا میں کوئی چیز انہونی نہیں ہے۔ مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ لیکن اس کی کوئی بنیاد ہونی چاہیئے۔

س: ملک میں جمہوری عمل شروع ہونے کے بعد سندھ میں گورنر اور وزیر اعلیٰ کے حوالے سے کچھ مثبت اثرات آپ محسوس کرتے ہیں!

ج: چونکہ باقی صوبوں کے گورنروں کا تعلق اپنے اپنے صوبے سے ہے اس لیے جو بات آپ کہہ رہے ہیں اس حوالے سے بھی لوگ بات تو کرتے ہیں لیکن جو ممبران اسمبلی ہیں اور جو کابینہ ہے اور وزیر ہیں ان کی آپس میں گاڑی چل رہی ہے۔ لیکن لوگ اس پہلو سے بہرحال رائے زنی کرتے ہیں۔

س: اس اعتبار سے حکومت نے خود ایک عہدہ دیا ہے ان کے ہاتھ میں۔

ج: ہاں! لیکن اتنا بڑا عہدہ بھی نہیں ہے یہ۔ اس لیے گورنر آ جائیں اور گورنر آئے گا بھی تو اصل مسئلہ حل نہیں ہوگا ایک فرد کی تبدیلی سے۔ اصل تو ذہن کی بات ہے۔ نظریے کی بات ہے۔ اگر آدمی منصف اور عادل نہیں ہے تو کسی کو لے آئیں حالات جوں کے توں برقرار رہیں گے۔ البتہ کسی سندھی کو گورنر بنانے سے یہ سنٹیمنٹ ([illegible]) کی بات ختم ہو جائے گی۔ اب وزیر اعظم لیا گیا ہے سندھ سے پھر بھی لوگ مطمئن نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ ایک بڑی چیز ہے۔ سندھ کو نمائندگی ملی ہے۔ یہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔ سندھیوں کا احساس محرومی دور کرنے کی ایک شکل ہے۔ میں وزیر اعظم کو جانتا ہوں وہ ایک شریف آدمی ہے ملک سے بھی محبت رکھنے والا ہے اسلام سے بھی محبت رکھنے والا ہے۔ پھر بھی لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ مسائل بہت زیادہ ہیں۔ اندرونی مسائل بھی ہیں اور خارجی مسائل بھی ہیں۔

س : سندھ کے حالات بگڑنے کا سلسلہ کب شروع ہوا ہے اور اس کی بنیادی وجوہات کیا ہیں؟

ج : یہ تقریباً ۱۹۵۵ء تک تو حالات کی سنگینی اور نزاکت کا احساس نہیں ہوا لیکن ۱۹۵۵ء کے بعد
ے مسائل اور ان کا احساس دونوں ہی بڑھتے چلے گئے۔ اصل میں تقسیم ہند کے بعد ابتدائی سالوں
ن نظریے کا جذبہ دین کا جذبہ غالب تھا۔ لوگوں نے خدمات کی تھیں۔ قربانیاں دی تھیں۔ ایک جذباتی
فیت قائم تھی، مقامی لوگوں نے انصار کی حیثیت میں ہجرت کر کے آنے والوں کا بھرپور خیر مقدم کیا تھا۔
یز سے نجات ملی تھی۔ ہندو سے نجات ملی تھی لیکن جب مطلع صاف ہوا تو مسائل سامنے آئے۔ بغیر
وچے سمجھے ون یونٹ کو مسلط کیا گیا تو لوگوں کو پھر یاد آ گئی وہ کیفیت انگریز کے دور کی جب سندھ
سہ نہیں تھا بلکہ بمبئی کے ساتھ شامل تھا۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے لوگوں کو لاہور آنا پڑا۔ صوبے کا
ے مقام دور ہونے کی وجہ سے غریبوں کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ مقامی طور پر چھوٹا آدمی بھی
پنے کام کے لیے کوئی نہ کوئی وسیلہ نکال لیتا ہے لیکن اتنی دور آنا اور پھر یہاں آ کر وسیلہ اور اپروچ
ڈھونڈنا عام آدمی کے لیے بہت مشکل تھا اور پھر اصل بات یہ ہے کہ دونوں طرف دینی و ملی جذبہ
نہیں تھا۔ صرف مسائل کی بات تھی۔ مسائل کی بات تو یہ ہے کہ ایک ہی باپ کے دو بیٹوں میں دو سگے
بھائیوں میں کہیں تھوڑی سی زیادتی ہو جائے تو بڑے بڑے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ یہاں تو
دین کی رو سے معاشی سطح پر انصاف ہوا، نہ ہی وسائل کو ترقی دینے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش
ہوئی اور پھر سیاسی طور پر ایسا نظام مسلط کیا گیا جس میں لوگ حقوق سے محروم تھے۔ ایسے حالات میں
عصبیتوں کا ابھرنا بالکل فطری بات تھی، مسائل اپنی جگہ تھے، مسائل کو ہوا دینے والی تحریک بھی موجود تھی جب
ہیں بہت بڑا ایشو مل گیا تو انہوں نے خوب استعمال کیا۔

س : ملک کے دیگر حصوں کی طرح سندھ میں بھی کچھ مذہبی اور دینی جماعتیں کام کر رہی ہیں موجودہ حالات
میں بحیثیت مجموعی ان کا کیا کردار ہے اور کیا اثرات ہیں ؟

ج : سندھ کی صورت حال بڑی گمبھیر ہے اور مسائل بہت پیچیدہ ہیں۔ اکثر دینی جماعتوں نے
مسائل سے اپنا دامن بچا رکھا ہے۔ مثلاً جماعت اسلامی بھی مسائل کی پیچیدگی کی وجہ سے خاصی کنارہ کش
ہے جس کی وجہ سے اس کے اثر و نفوذ میں اضافے کی بجائے پہلے کی نسبت کچھ کمی آئی ہے۔ باقی
جمعیت علماء اسلام فضل الرحمن گروپ کا بہت پرانا نظام ہے اور ان کے بہت پرانے مدارس ہیں۔
موجودہ صورت حال میں مسائل کی حد تک انہوں نے الحاد و لادینی کی تحریک کی ہمنوائی کی ہے نظریاتی
طور پر ملحدانہ افکار و نظریات کے مقابلے میں انہیں جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا۔ اس کے لیے انہوں
نے کوئی سنجیدہ اور منظم بر حکمت منصوبہ بندی کے ساتھ کوئی کام نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اگر وہ یہ
ذمہ داری پوری کرتے تو وہ بہت مؤثر ثابت ہوتے کیونکہ ان کا بڑا اثر و رسوخ ہے ان کے بے شمار

مدارس ہیں، علمائے کرام ہیں، مساجد ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے ہاں بھی مستثنیات ہیں۔ ان کے ہاں بھی اللہ کا خوف رکھنے والے اور صورتحال کا احساس رکھنے والے لوگ موجود ہیں وہ اپنی سی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ قرآن و سنت کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ایک مربوط اور مبنی برحکمت سکیم ہوتی، کوئی لٹریچر کا پروگرام ہوتا، نوجوانوں سے رابطے کا کوئی پروگرام ہوتا تو وہ صورتحال کو سنبھال لیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہ بھی ہوا ہے کہ ان میں سے کچھ علماء کی ہمدردیاں کھل کر اور عملاً اس تحریک کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے کئی لحاظ سے تقویت پہنچائی ہے اس تحریک کو۔ باقی رہی جمعیت علمائے پاکستان تو اس کا دائرہ صرف بڑے شہروں تک محدود ہے۔ سکھر، حیدرآباد، کراچی وغیرہ۔ اندرون سندھ ان کے تعلقات ہیں لیکن اثرات نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی عوام سے مسائل سے کوئی زیادہ واسطہ نہیں رکھا۔

س: یہ بات خاص طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ جس استحصالی طبقے نے یہ مسائل پیدا کئے ہیں اور ہمیشہ برسر اقتدار بھی رہتا ہے وہ تقریباً کام مسلسل کر رہا ہے جبکہ جو دینی قوتیں لادینی تحریک کا مقابلہ کر رہی ہیں ان کے پاس مسائل کو حل کرنے کی کوئی قوت نہیں ہے لیکن جب وہ دینی گروہ دین کا نام لے کر لادینی تحریک کے مقابلے پر آتی ہیں تو وہ اس استحصالی طبقے کے ساتھ بریکٹ ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ طبقہ بھی دین کا نام تو ضرور لیتا ہے جس سے لادینی اور ملحدانہ تحریک کو مزید تقویت ملتی ہے۔ اس الجھن کا کوئی حل بھی آپ نے سوچا ہے۔؟

ج: مجھے آپ کے تجزیے سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اس لئے کہ جہاں تک ہماری تنظیم کا تعلق ہے۔ تنظیم فکر و نظر سندھ کا۔ ہم نے پوری صورتحال کا جائزہ لیا ہے۔ مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔ مسئلے کی جو ہمہ گیر نوعیت ہے اس پر بحیثیت مجموعی ہم نے بہت غور و فکر کیا ہے۔ ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری یہی حیثیت ہے کہ ہم حکمرانوں کو بتائیں کہ یہ زیادتی ہو رہی ہیں۔ یہ یہ انصاف کے مطابق یوں نہیں یوں ہونا چاہئے۔ ملازمتوں کے سلسلے میں، سندھی زبان کی ترقی کے سلسلے میں، روزگار کے سلسلے میں، زرعی زمینوں کی تقسیم کے سلسلے میں۔ ہم نے باقاعدہ ان مسائل پر نہ صرف یہ کہ مشورے دیئے ہیں، تجاویز دی ہیں۔ بلکہ پریس کے ذریعے بھی ہم نے مسائل کو اٹھایا ہے۔ خطبہ استقبالیہ جو ہم نے دیئے ہیں ان میں ہم نے برسرعام بات کی ہے۔ ہمیں کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے۔ ہماری کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔ ہمارا نظریاتی تشخص قائم ہوا ہے۔ دین کے حوالے سے، قرآن و سنت کے حوالے سے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا اہم سرمایہ ہمارا ایمان ہے۔ یہ سب سے بڑی دولت ہے اگر یہ دولت ہم نوجوانوں کو دینے میں کامیاب ہو گئے تو باقی سب چیزوں کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔ لیکن ہم نے اسلام کا مرکزی نقطہ عدل ہے، ہر معاملے میں عدل۔ اس لئے ہم نے اسلام کے اس تقاضے کو پیش نظر رکھا ہے۔ بڑے جامع پیپرز ہم نے تیار کئے ہیں مسائل پر:

...صوبائی حکومت کو پیش کئے ہیں۔ مرکزی حکومت کو پیش کئے ہیں ان کو مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں ہماری کوششوں کے نتیجے میں مرکزی حکومت کو مسئلے کی سنگینی کا احساس ہوا ہے۔ کچھ اقدامات ہوئے ہیں انتخابات کے بعد مرکزی حکومت میں سندھ کو اتنی بڑی نمائندگی دی گئی ہے۔ روزگار کے معاملے میں کوششیں ہو رہی ہیں۔ ...ون سندھ کے دیہی علاقے کے نوجوانوں کے لئے کوٹہ مخصوص کیا گیا ہے کراچی یونیورسٹی میں لطیف چیئر ...ن جاری ہے مرکزی حکومت نے ہمارا یہ مطالبہ مان لیا ہے کہ تنظیم فکر و نظر کے تحت سندھ ...لمک سنٹر قائم کیا جائے۔ ان چیزوں کو ہم اپنا حق سمجھتے ہیں اور حکومت نے یہ کام کر کے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ...س کی تحسین کرتے ہیں۔ حکومت جو تعاون کر رہی ہے اس کا اعتراف کرنا ہم اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔

س : تعلیمی میدان میں سندھ کی کیا پوزیشن ہے۔ تقسیم ملک کے وقت جو حالات تھے اُن ...ے موازنہ کیا جائے تو کیا صورت بنتی ہے۔

ج : اللہ کا فضل ہے۔ تقسیم ملک کے وقت کی پوزیشن سے موجودہ حالات کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ اب تو ہر ضلع میں درجنوں اسکول اور کالج ہیں۔ یونیورسٹیاں بن گئی ہیں۔ اللہ کے فضل سے تعلیمی میدان میں تعداد کے لحاظ سے بہت ترقی ہوئی ہے۔ لیکن تعلیم کا معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ ایک صحیح نظام تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اور معاشرے کی اخلاقی پستی اور اخلاقی اقدار سے محرومی کے سبب استاد کا تقدس بڑی حد تک مجروح ہوا ہے۔ مسائل کے ہجوم نے تعلیمی ماحول میں کشیدگی اور نفرت بھر دی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ طلبا محنت سے جی چراتے ہیں۔ تعلیم کا ماحول ہی باقی نہیں رہا۔ بڑے بڑے تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں اکثر بند رہتی ہیں۔ تعلیمی اداروں کی فضا پر سیاست کا غلبہ ہے۔ نقل نے وبائی صورت اختیار کر لی ہے۔ طلبا نقل کو اپنا حق سمجھنے لگے ہیں۔ بہت ہی تشویشناک صورت حال ہے۔

س : سندھ کے وڈیروں کے ... میں متضاد باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ایک گروہ کی رائے میں وڈیرہ سندھ کے دیہی معاشرے کی ایک ضرورت ہے کچھ لوگ ... ایک استحصالی طبقہ گردانتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کا کیا تجزیہ اور مطالعہ ہے۔

ج : وڈیرہ وہی ہے جس نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ تحریک پاکستان میں اس طبقے کی بڑی خدمات ہیں۔ جمالی خاندان ہے جتوئی خاندان ہے۔ اس طرح کے اور کئی خاندان ہیں۔ خود جی ایم سید جو بعد میں منفی رُخ پہ چلے گئے تحریک پاکستان میں انہوں نے ایک مثبت کردار ادا کیا تھا۔ حاجی عبداللہ ہارون نے بہت مالی خدمت کی تحریک پاکستان کی۔ کچھ ایسی بات نہیں ہے کہ اس ساری صورت حال کے ذمہ دار یہ زمیندار اور وڈیرے ہوں۔ اس طبقے میں بھی اچھے برے دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ زمینداری نظام اپنی جگہ قائم ہے۔ اصل خرابی نظام میں ہے۔ بیوروکریسی اور زمیندار مل جل کر حکمت عملی بناتے ہیں۔ جو جتنا بڑا زمیندار ہے معاشرے پر اُس کی گرفت

اتنی ہی مضبوط ہے ۔ اندرون سندھ زمیندار کے بغیر کسی کا الیکشن میں کامیاب ہونا یا سیاست میں کوئی مقام حاصل کرنا ممکن نہیں ۔ کسی غریب آدمی کے لئے یہ بہت مشکل ہے ۔ اسلامی قوتوں کی پیش قدمی کو بھی زمیندار پسند نہیں کرتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قوتوں کو بھی سیاست کے میدان میں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ۔

س ۔ اس کے سیاسی پس منظر اور سیاسی کردار سے قطع نظر وہ معاشرے میں ایک مستحکم قوت تو ہے ۔

ج ۔ اس استحصالی کردار کے نعرے کا بھی ایک خاص پس منظر ہے ۔ اصل میں اگر زمیندار کا ذاتی کردار اچھا ہے تو وہ استحصال نہیں کرتا ۔ اب بھی بہت سے زمیندار مدارس کی خدمت کر رہے ہیں تعلیمی ادارے بنا رہے ہیں ۔ علماء کی خدمت کرتے ہیں علماء کے ساتھ تعاون کرتے ہیں ۔

س : علماء کی خدمت تو کرتا ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ کاشتکار جو اس کے لئے دن رات اپنا خون پسینہ صرف کرتا ہے ۔ اس کا حق وہ دیتا ہے یا نہیں ۔

ج : حق تو وہ دیتے ہیں ۔ ایسی صورت تو نہیں ہے کہ کاشتکار کو اس کے حصے سے محروم کر دیا جائے ۔ اب تو صورت یہ ہے کہ زمیندار ڈر رہا ہے کاشتکار سے ۔ اس لئے جو فضا بنی ہے ۔ گزشتہ پندرہ بیس برس میں اور جو زبان چلی ہے لوگوں کو اس سے تو زمیندار ڈرنے لگا ہے ۔ ایک بات ہے کہ کچھ زمینداروں کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کے سردار ہیں ۔ اگر کوئی بڑی قوم کا سردار ہے تو اس کو چیلنج کرنا بڑا مشکل ہے ۔ لیکن درمیانے درجے کے زمیندار اور چھوٹے درجے کے زمیندار کے مقابلے میں ہاری اتنے زور آور ہو گئے ہیں اور اپنے حقوق کے لئے بیدار ہو گئے ہیں کہ زمیندار خوف زدہ ہو گیا ہے ۔ لیکن ہاری اپنے مسائل کے لئے محتاج ہوتے ہیں زمینداروں کے ۔ اپنے خاندانی جھگڑوں کے لئے آپس کے تنازعات کے لئے تحصیل تھانے کے معاملات میں انہیں زمیندار کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے اور اس میں بھی زیادہ تر تعلق محبت کا ہی ہوتا ہے ۔ کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں ۔ اس لئے انکی گاڑی چل رہی ہے ۔

س : در اصل یہ جاگیردار طبقہ صدیوں سے اقتدار اور حکومت کا ایک ستون بنا ہوا ہے حکومت انگریز کی ہو یا آزادی کے بعد کسی جماعت کی ہو یا فوج کی ان کا رابطہ اقتدار کے ساتھ قائم رہتا ہے ۔ اس چیز نے انہیں ایک استحصالی طبقہ بنا دیا ہے ۔

ج : یہ بات تو صدیوں سے چلی آ رہی ہے ۔ لیکن اب اس میں ایک تبدیلی آئی ہے ۔ ماضی قریب میں کئی زمیندار حکومت کے مقابلے پر آئے ہیں ۔ زمینداروں اور پیروں نے حکومت کو چیلنج کیا ہے ۔ جلوسوں کی قیادت کی ہے ۔ جیلوں میں گئے ہیں ۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ یہ ایک نئی چیز سامنے آئی ہے ۔

یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ سندھی اپنی گوٹھ سے نہیں نکلتا، یہ ایک
رشل قوم ہے۔ اس تاثر کی حقیقت کیا ہے؟

سندھ ایک ایسا خطہ ہے جہاں روزگار کے وسائل اتنے زیادہ ہیں اور زمین
زرخیز ہے کہ ایک سندھی باہر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ البتہ ایسی بات
ہے کہ وہ نکلنے کے بالکل تیار ہی نہیں اور اس تاثر کا بھی ایک پس منظر ہے کہ سندھی
رشل ہیں یا فوج میں بھرتی نہیں ہوتے۔ وہ پس منظر یہ ہے کہ انگریز نے سندھ
زور قوت قبضہ کیا۔ بہت زبردست جنگ اور خونریز معرکے کے بعد انگریز کامیاب ہوا۔
نگریز کو خدشہ تھا کہ اگر سندھیوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا تو بازی پلٹ بھی سکتی ہے
س لیے اس نے نہ صرف یہ کہ سندھیوں کو فوج میں بھرتی نہیں کیا بلکہ
ت کو بھی عام کیا کہ جناب سندھی تو گھر سے نہیں نکلتا اور لڑنا نہیں جانتا اور فوجی
مان نہیں اختیار کر سکتا۔ یہ سب باتیں انگریز کی اس پالیسی کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ سندھیوں
۱۸۴۰ سے لے کر ۱۹۴۶ تک سیاسی جدوجہد کی۔ پیر صاحب پگاڑا نے جو عملی جہاد کیا وہ
ہی تحریک آزادی کا ایک زریں باب ہے۔ اس میں بھی انگریز کے ساتھ خونریز معرکے
ئے انگریز کو بڑی پریشانی ہوتی۔ فوجی ایکشن کے ساتھ پیر صاحب کے مکانات پر
مباری ہوئی لیکن ان لوگوں نے آخر تک ہتھیار نہیں ڈالے۔ حروں نے برطانیہ کی پارلیمنٹ
ں خطوط بھیجے کہ ہم آخر وقت تک آپ کے سامنے جھکیں گے نہیں۔ جب تک ہماری جان میں
جان ہے ہم لڑیں گے۔ یہ تو ماضی قریب کی بات ہے۔ کیا یہ ان کے مارشل مزاج کی دلیل
نہیں ہے۔ دراصل انگریز نے جان بوجھ کر سندھیوں کو پیچھے رکھا تھا۔

س: اب اس تاثر کو دور کرنے کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے۔

ج: یہ کام تو قیام پاکستان کے فوراً بعد ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اب صورت یہ ہے
سب سے پہلے تو لوگوں کا اعتماد بحال کیا جائے۔ لوگوں کی جائز شکایات دور کی جائیں۔
سندھ میں رہنے والے تمام لوگوں کی شکایات دور کی جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ
ایبٹ آباد کی طرح کسی بہتر مقام پر نئی ملٹری اکیڈمی بنائی جائے۔ فوجی چھاؤنی قائم کی جائے۔
ھیوں کو فوج میں بھرتی کرنے کے لیے مہم چلائی جائے۔ دیہاتوں میں لوگوں سے
ملاقاتیں کی جائیں۔ کچہریاں منعقد کی جائیں۔ اخبارات کے ذریعے لوگوں کو بتایا جائے۔
پریس کو ریڈیو کو ٹیلیویژن کو استعمال کیا جائے۔ زمینداروں سے ملا جائے۔ زمینداروں
کی اور فوجی افسروں اور والدین کی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ جو نوجوانوں کو ترغیب دیں
کہ فوج میں جانا جہاد کرنا، آپ کے دین کا تقاضا ہے آپ کی شاندار روایات کا حصہ
ہے، باعزت کام ہے، روزگار کے مسئلے کا حل ہے۔ اس طرح سے ایک فضا بنائی جائے

تو لوگ فوج میں ضرور آئیں گے۔

س۔ سیاسی سطح پر تو سیاسی لوگوں نے نئے اور پرانے سندھیوں کی الگ تنظیمیں بنا رکھی ہیں مختلف محاذ بنے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کشمکش کا عوام کی زندگی پر کیا اثر ہے۔ لوگوں کے جذبات ایک دوسرے کے بارے میں کیسے ہیں؟

ج: چونکہ اس ملک میں ملت اور دین کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کی تعمیر تربیت نہیں ہوئی۔ اسلامی اخوت اور بھائی چارے کو قائم نہیں کیا گیا۔ اس لیے بلاشبہ لوگ [illegible] سوچتے ہیں۔ اور بڑے بڑے ٹکراؤ اور تصادم بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً ۷۲ء کے لسانی [illegible] ہیں۔ ان لسانی فسادات نے جذبات میں بڑی شدت پیدا کی۔ کمیونسٹ عناصر نے دو طبقوں میں کشمکش کی فضا پیدا کی۔ آج تک اس کے اثرات باقی ہیں۔ ان دو تنظیموں نے بڑا نقصان پہنچایا۔ لیکن اس وقت مہاجروں اور سندھیوں میں یہ [illegible] پیدا ہوئی ہے کہ اصل زیادتی تو پنجاب کی طرف سے ہوئی ہے۔ آپ نے اخبارات میں بھی پڑھا ہوگا کہ انتہا پسند سندھیوں اور انتہا پسند مہاجروں کے کئی اجلاس ہوئے۔ وہ کیفیت جو تھی ٹکراؤ کی اس میں کمی آگئی ہے اگرچہ یہ بات دین کے حوالے سے ہوتی تو بہت خوشی ہوتی۔ اب چونکہ مادی مفادات مشترک ہو گئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دونوں کو یہیں رہنا ہے۔ مہاجر کہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کمائیں گے یہیں رہے گا۔ لیکن پنجاب کے لوگ تو یہاں سے کما کر وہاں بھیجتے ہیں۔ اسی لئے کراچی میں بڑی کشیدہ فضا ہے۔ ہاں اس پہلو سے وہ فضا تبدیل ہوئی ہے وہ کشیدگی کم ہوئی جو لسانی فسادات کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ اب مہاجر اور سندھی پنجابیوں کے خلاف آپس میں مذاکرات اور اتحاد کی باتیں کر رہے ہیں۔ زرعی زمینوں کا مسئلہ بہت بنیادی ہے۔ مہاجر کہتے ہیں کہ ہمارا تو نقصان ہے کہ ہم اپنا سب کچھ وہاں چھوڑ آئے لیکن یہ پنجاب کے لوگوں اور خاص طور پر ریٹائرڈ فوجی افسران اور سول بیوروکریسی کو جو بڑے پیمانے پہ زمینیں دی گئی ہیں۔ مثلاً یہ آغا شاہی فارم ہیں اور یہ ائر مارشل اصغر خاں کی زمینیں ہیں۔ گدو بیراج میں تو ان لوگوں کے گاؤں کے گاؤں ہیں۔ جنہیں ان لوگوں نے سرکاری وسائل سے ترقی دی ہے۔ [illegible] میں لوگوں کو نظر آتے ہیں۔ پہلے ایک عرصے تک یہ چیزیں چھپی رہیں لیکن اب تحریکوں کی وجہ سے ایک احساس ابھرا ہے لوگوں میں شعور پیدا ہوا ہے۔ محب وطن لوگ جانتے ہیں کہ یہ بڑا گمبھیر مسئلہ ہے۔ چاروں صوبوں کے محب وطن اور محب اسلام لوگوں کو جو اس ملک کی سلامتی اور حفاظت کی اہمیت اور قیمت کو سمجھتے ہیں مل بیٹھ کر ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا کوئی ایسا سمجھوتہ طے کرنا چاہیئے جو لوگوں کو مطمئن کر سکے۔ یہ بہت بڑی کامیابی

...ں ۔ لوگوں کو سوچنا چاہیئے کہ ملک کی سلامتی اور آزادی کے مقابلے میں ان زبانوں
...دران مسئلوں کی کیا اہمیت ہے ۔

س : ۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کا تجزیہ بھی آپ نے کیا ہوگا ۔ آپ کے
...ں میں یہ تحریک صرف سندھ تک کیوں محدود رہی اور دوسرے یہ ایک دم ایسی
...سین اور تشدد کی راہ پر کیسے چل نکلی ۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی اس ملک میں تحریکیں چلتی
...یں مگر وہ اتنی پر تشدد نہیں تھیں ۔

ج : اصل میں سندھ کی صورت حال پہلے عیاں نہیں تھی ۔ ایک لاوا ایک رہا تھا
...ں تحریک کافی عرصے سے چل رہی تھی مسائل بڑھتے جا رہے تھے ۔ ایسی سنگین صورتحال
...ن تینوں صوبوں میں نہیں تھی ۔
مگر سندھ میں مسائل موجود تھے لوگوں کو سڑک پر لانے کے لئے مواد موجود تھا ۔
...س لیے سندھ اُن کے لئے نرم چارہ ثابت ہوا ۔ اور وہاں تحریک نے زور پکڑا ۔
...ن ہی قوتیں سامنے آئیں ۔ حتیٰ کہ دینی رہنماؤں نے بھی اُس میں حصہ لیا ۔ لیکن جب غیر ملکی
... مداخلت اس انداز سے ہوئی کہ اُس پر اظہار خیال کیا آنجہانی اندرا گاندھی نے تو لوگ
...متنبہ ہوئے کہ ہم تو دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں ۔ جس کے نتیجے میں ایک ٹھنڈی
...پڑ گئی ۔ لیکن بظاہر سکون ہے ۔ اسباب اب بھی موجود ہیں بے چینی اب بھی موجود ہے ۔
... وہ عناصر بھی موجود ہیں ۔ اگر حسن تدبیر سے مسائل کو حل نہ کیا گیا تو وہ صورت حال
... دوبارہ بھی پیدا ہو سکتی ہے ۔ اس لئے اس وقت محب وطن اور محب اسلام لوگوں
...کو دور سے بیٹھ کر تماشا نہیں دیکھنا چاہیئے ۔ اب ہمارے سیاستدانوں اور حکمرانوں کے
...لئے بڑا امتحان ہے ۔ اگر بڑے بھائی کی زیادتی ہے تو باقی بھائی مل بیٹھ کر اُسے سمجھائیں ۔
...صورت حال کا تجزیہ کر کے باکونی حکمت عملی طے کریں ۔ اگر ارادہ صحیح ہو تو کسی مسئلے کا حل ناممکن
...نہیں ہوتا ۔

س : ۱۹۸۳ء کی تحریک کے بعد بھی سندھ اور پنجاب کے درمیان عوامی سطح پر رابطے کی ضرورت
شدت سے محسوس کی گئی تھی ۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے بھی اندرون سندھ کے دورے
کے بعد اس عوامی رابطے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ہر مہینے سندھ کا دورہ کرنے کا
اعلان کیا تھا ۔ بحیثیت مجموعی اس عوامی رابطے کی کیا صورت ہے ۔

ج : کچھ انفرادی کوشش ہوئی ہے وہ بھی صرف معلومات کی حد تک ۔ یہ مسئلہ تو بڑے
پیمانے پر رابطے کا تقاضا کرتا ہے ۔ اور پھر حالات کو سمجھنے کے بعد عمل کی ضرورت
ہے ۔ حکومت کی سطح پر بڑے اور جرأت مندانہ سیاسی فیصلوں کی ضرورت ہے
عوامی سطح پر رابطے سے تو صرف لوگوں کو مطمئن کرنے کی ایک صورت بن سکتی ہے کہ

جناب آپ کے مسائل و مشکلات میں ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ اور دوسرے یہ
کہ لوگ آئیں تو دین کے حوالے سے آئیں۔ اگر پھر کوئی مادی حوالے تلاش کیے
تو مزید الجھنیں اور فتنے کی نئی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے
دوروں اور تجزیئے کا تعلق ہے تو پہلی بار یہ چیز ہمارے سامنے آئی کہ اُن کا تجزیہ
غیر معمولی طور پر اور حیرت انگیز حد تک صحیح ہے۔ سندھ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب
کے خیالات کو لوگوں نے بڑے غور سے پڑھا ہے اور چونکہ ڈاکٹر صاحب کی حیثیت
معمولی نہیں ہے اور دین کے حوالے سے اُن کا بڑا مقام ہے اس لیے لوگ
باتوں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں لیکن یہ بالکل ابتداء ہے اس مسئلے کو آگے بڑھانے
کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو چاہیئے کہ وہ مزید دورے کریں۔ لوگوں سے
ملیں، براہِ راست معلومات حاصل کریں۔ زمینداروں سے ملیں طلبہ سے ملیں
جن لوگوں کو شکایات ہیں، اُن سے ملیں۔ اُن کی کچھ جائز شکایات ہوں گی اور
غلط فہمیاں اور شکوک بھی ہوں گے۔ مل جل کر بیٹھنے سے وہ شبہات
آئیں گے اور ان کے دور ہونے کی صورتیں بھی نکلیں گی۔ لیکن یہ تب ہوگا کہ اخلاص کے
ساتھ عمل ہو۔ اگر صرف شہرت طلبی اور سیاسی مفادات کا معاملہ ہوا یا وقتی
ہمدردی کا تاثر پیدا کیا گیا اور مسئلے کو ہاتھ لگا کر چھوڑ دیا گیا گہرائی میں نہیں گئے
مزید نقصان ہوگا لوگ سمجھیں گے کہ ہمارے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ اس طرح کے
مذاق پہلے بھی بہت ہوئے ہیں۔ کئی وفود آئے اور سرسری باتیں کر کے چلے گئے۔
پاکستان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سرکاری لوگوں اور سرمایہ داروں کے وفود جاتے تھے
بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرتے رہے۔ پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین نے جو
قادیانی تھا، اس نے اُس وقت ساری نفرت کی بنیاد رکھی تھی۔ یہاں سے سرمایہ دار
جا کر بڑے بڑے کارخانے لگا گئے اور بڑی بڑی کوٹھیاں اور بنگلے بنا گئے۔ مقامی
آبادی کے مجبوروں کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ یہاں سے جا کر لوگ غریبوں
کے ساتھ مل کر کشتیوں میں سیر کرتے رہے۔ پھر جو نتیجہ نکلا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔

س: اس عوامی رابطے کو بڑھانے کی کوئی عملی صورت بھی آپ کو نظر آتی ہے؟

ج: عملی صورت تو یہی ہے کہ ملت کا درد رکھنے والے دین کا فہم اور شعور رکھنے والے
آگے آئیں۔ دین کے حوالے سے بات کریں۔ سندھ باب الاسلام ہے۔ لوگ دین کے شیدائی
ہیں۔ اُن کا مزاج اسلامی ہے۔ جو لوگ دین کی راہ سے ہٹ گئے ہیں اُن سے بھی
بات ہو سکتی ہے۔ صورت حال کا تجزیہ کر کے اُن کو ہم سمجھا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے
لیے مخلص لوگوں کی ضرورت ہے اور اُن کی کمی ہے۔ مجھے تو یقین نہیں ہے کہ اتنے لمبے

لگ ہمیں مل سکیں گے۔ اور یہی مرحلہ ہے جہاں آدمی پریشان ہوتا ہے۔ جو لوگ سیاسی ہیں اُن کے سامنے تو سیاست کی مصروفیات ہی اس قدر رہتی ہیں کہ وہ ان کاموں کے لیے وقت نہیں نکال سکتے ہیں جبکہ یہ محرومیاں اور مسائل گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی بنیادیں پختہ تر ہوتی جا رہی ہیں اور جن چیزوں کو لوگ معمولی اور وقتی قرار دیتے ہیں وہی آگے چل کر سارے معاملے کو لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔

س: سندھ کے بھٹو قبیلے سے آپ کا تعلق ہے۔ اس کی تاریخی اور نسلی حیثیت کے بارے کچھ فرمائیے۔

ج: اس موضوع سے نہ مجھے دلچسپی ہے نہ میں نے تحقیق کی ہے۔ بس کچھ سنی سنائی باتیں ہیں۔ سندھ میں یہ خاصا بڑا قبیلہ ہے۔ کم و بیش لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تعداد ہے پورے صوبے میں۔ اس موضوع پر ایک کتاب بھی چھپی ہے اردو میں، جس میں لکھا ہے کہ یہ ایک قوم ہے جو شام سے ہجرت کر کے آئی تھی۔ زیادہ تر عوامی روایات ہیں اور بزرگوں سے جو باتیں سنی ہیں اُن کے مطابق یہ قبیلہ پنجاب سے آیا ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ مشرقی پنجاب میں "بھٹہ" نام کا ایک سٹیشن ہے اور پنجاب میں بھی کچھ لوگ "بھٹہ" کہلاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہی بھٹہ سندھ میں بھٹو بن گیا ہو۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ سندھ میں "ارائیں" اور "بھٹو" ایک ہی چیز ہے۔ زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ باغات اور سبزیوں کی کاشت کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ایک جفاکش قبیلہ ہے۔ انتہا پسندی اور کشمکش ان کے مزاج میں شامل ہے۔

س: سندھ میں تحریک اسلامی کی ایک اہم شخصیت مولانا جان محمد بھٹو مرحوم سے آپ کو خصوصی تعلق رہا۔ اُن کی شخصیت کے بارے آپ کے تاثرات کیا ہیں!

ج: مولانا جان محمد بھٹو تو اسلاف کا نمونہ تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے صرف کی۔ بہت مجاہد، بہت سادہ مزاج، اُن کی شخصیت اور کردار سے اسلام کی عظیم روایات ٹپکتی تھیں۔ پیار اور محبت میں ڈوبی ہوئی شخصیت۔ انکی نمایاں صفت درویشی تھی، عالم باعمل تھے، زاہد، مجاہد، تہجد گزار، اپنی دُھن کے پکے۔ اُن کے جانے کے بعد ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سندھ یتیم ہو گیا! بہت بڑا خلا ہے، جسے پُر کرنا بڑا مشکل ہے۔

س: اپنی ذات اور اپنے خاندان کے حوالے سے بھی کچھ فرمائیے۔ تحریکِ اسلامی نے ساتھ آپ کا تعارف اور تعلق کیسے ہوا!

ج: میری پوری زندگی کشمکش اور جدوجہد سے عبارت ہے۔ جب میں ایک برس کا تھا تو میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ بہت چھوٹی عمر میں مجھے روزگار

کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑا۔ تو دس برس کی عمر میں مجھے روزگار کی ت
کرنی پڑی۔ میں نے سکالرشپ کا امتحان دیا اور پاس ہو گیا۔ دس روپے
وظیفہ ملتا تھا۔ پھر میں نے اپنا دودھ کا کاروبار شروع کیا۔ پڑھتا بھی تھا اور
بیچتا تھا۔ پہلے گائے رکھی پھر بھینسیں رکھیں۔ جب یہ سلسلہ زیادہ بڑھا تو
نے کہا کہ یہ تو کاروبار ہو گیا ہے۔ اس پر میرے بزرگوں نے اپنے بچے بھی
پاس بھیج دیئے کہ ان کو آپ پڑھائیں۔ یہ ذمہ داری بھی سنبھالی۔ شروعات
نیک لوگوں سے ہو گیا تو اللہ کے فضل سے عادات درست ہو گئیں۔ شروع سے
نماز سے تعلق ہو گیا۔ جب یاد کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بے نماز میں کبھی نہیں
بچپن ہی سے روزہ بھی رکھنا شروع کیا۔ مولانا جان محمد بھٹو مرحوم سے چھوٹی عمر
تعلق ہو گیا تھا۔ ان کی شفقت اور راہنمائی میں بڑا سفر طے کیا۔ میری تعلیم زندگی
میں ہوئی ہے۔ میرا آبائی گھر ضلع جیکب آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں مبارک پور
میرے والد مرحوم حاجی غلام قادر بھی زمیندار تھے۔ لیکن کسی وجہ سے انہیں اپنی
بیچنا پڑی۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ وہ بہت سخی تھے۔ ہمارا گھر ایک چوراہے پر
تھا۔ وہ راستے میں بیٹھ جاتے تھے اور کوئی آدمی گزرے اس سے تعلق واقف
ہو یا نہ ہو اس کو وہ کھانا ضرور کھلاتے تھے۔ اور اسی انتظار میں کہ شاید کوئی مہمان
آجائے کھانا بہت دیر سے کھاتے۔

ایک دفعہ ایک قافلہ آیا بیل گاڑیوں پر۔ والد باہر موجود نہ تھے۔ انہوں نے
کھانا مانگا تو ملازموں نے کہہ دیا کہ اس وقت کھانا نہیں ہے وہ لوگ چلے گئے۔ تھوڑی
دیر بعد والد صاحب کو معلوم ہوا تو فوراً ملازموں کو دوڑایا کہ ان لوگوں کو بلا کر لاؤ۔
مہمان آگے جا چکے تھے۔ بہرحال ملازم بڑی منت سماجت کر کے انہیں واپس
اور پھر سب کو کھانا کھلا کر رخصت کیا۔ اور والد صاحب نے ان مہمانوں سے ملازموں
کی بدتہذیبی کی معافی بھی مانگی۔ وہ اپنی زندگی میں بہت زاہد و عابد آدمی تھے۔ والدہ
محترمہ نے مجھے بتایا کہ رات کو تہجد میں بہت روتے تھے اور بہت کم سوتے
تھے۔ میرے والد اور دادا کی موت میں بڑی عجیب مماثلت ہے۔ دونوں کی کوئی قبر
نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں نے اپنے اپنے وقت میں سفر حج سے واپسی پر بحری جہاز
ہی میں داعئ اجل کو لبیک کہا اور لوگ بتاتے ہیں کہ دونوں کی میتوں کو ایک ہی مقام پر
سمندر کے حوالے کیا گیا۔ والد کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ یہ تو تھا کچھ خاندانی پس منظر
میں نے ۱۹۶۱ء میں میٹرک کے بعد بحیثیت استاد اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ دین سے
تعلق تو بچپن ہی سے تھا۔ پھر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف کا مطالعہ

انہوں نے ہمارے ذہن کو صاف کیا۔ موجودہ دور کے تمام فتنوں یعنی اشتراکیت، قومیت، لادینیت اور مغربیت کو ہم نے سید مودودی رحمہ کے لٹریچر کی روشنی میں سمجھا۔ پھر اُن سے ذاتی تعلق بھی قائم ہوا۔ وہ آخر وقت تک رہا اور اب بھی ہے۔ اُن کی خدمات ملت کے لیے مسلمانوں کے لیے ناقابلِ فراموش ہیں۔ اُن کی زندگی میں اُن سے ملاقاتیں بھی رہیں۔ بہت مہربان تھے مجھ پر۔ ذاتی طور پر انہوں نے جن خطوط پر کام کرنے کے لیے رہنمائی کی ہم نے اُن خطوط پر چلنے کی کوشش کی۔

۱۹۶۷ء میں میں نے سندھ یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ مجھے گولڈ میڈل ملا۔ اب ۱۹۶۸ء سے میں کالج کے نوجوانوں کو اسلامیات پڑھا رہا ہوں۔

تنظیم اسلامی اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ آپ کب متعارف ہوئے؟
ڈاکٹر صاحب سے غائبانہ تعارف تو تھا۔ سکھر کی کسی مسجد میں ایک بار درسِ قرآن بھی سنا تھا۔ نومبر ۱۹۸۵ء میں ہم نے انہیں قومی سیرت کانفرنس میں خطاب کی دعوت دی۔ اُن کے خطاب سے ہم لوگ کافی متاثر ہوئے۔ پھر ہم نے مختلف شہروں میں ڈاکٹر صاحب کے خطابات کا پروگرام بنایا۔ اس طرح اُن کی ذات کے ساتھ اُن کی تنظیم سے بھی تعارف ہوا۔ اور پھر میں نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کا فارم بھی پُر کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا جو مشن ہے اُن کے سامنے جو کام ہے وہ بہت بڑا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے اس قابل بنا دے کہ میں بھی اس راستے میں کچھ خدمت کر سکوں۔

Coca

منتخب تعزیتی خطوط

بر سانحۂ ارتحال عزیزان عبداللہ طاہر سیال و محمد حمید احمد

مکتوب گرامی جناب مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل - اسلام آباد

محترم و مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زاد اللہ مجدہ و عزہ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

تسلیمات مسنونہ کے بعد عرض ہے کہ بعض دفعہ مصروفیات کی وجہ سے اخبار پڑھنے کا موقع نہیں ملتا یا سرسری دیکھ لیتا ہوں تمام خبریں پڑھنے کا موقع نہیں ہوتا۔ اس لئے میں نے مستقل خبر تو نہیں پڑھی مگر کل ۲۰ ستمبر کے اخبار جسارت کراچی میں ایک فوٹو پر نظر پڑی جس کے نیچے لکھا تھا کہ جماعت اسلامی پاکستان کے امیر میاں طفیل محمد مولانا عبدالمالک کاندھلوی اور دیگر افراد ڈاکٹر اسرار احمد کے داماد اور بھانجے کی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں" چونکہ فوٹو کے ساتھ اس قدر تفصیل نماز جنازہ کی بات لکھی گئی تھی اس لئے یقین کرنا پڑا کہ آپ کے داماد اور بھانجے کی وفات کا حادثہ پیش آیا ہے۔ پڑھ کر حسب ارشاد خداوندی انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور دعائے مغفرت کی۔ مرحوم کے ساتھ آپ کی دو نسبتیں تھیں اور دونوں نسبتوں اور جوانی میں مفارقت کی وجہ سے یقیناً طبعی اور فطری طور پر آپ کے دل کو سخت صدمہ پہنچا ہوگا۔ ایسے حوادث و مصائب کے موقع پر ارشاد نبوی من عزّیٰ مصاباً فلہٗ مثل اجرہٖ کے مطابق تعزیت و تسلیہ ضروری اور موجب اجر و ثواب ہے۔ اس لئے یہ عریضہ بطور تعزیت نامہ ارسال کر رہا ہوں۔ آپ جیسے بزرگ کی خدمت میں تسلیہ و تعزیت کے کلمات لکھنا اور رضا بالقضا کی تلقین کرنا در اصل "پند بہ لقمان و زیرہ بہ کرمان" والی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم دیا ہے اور خاص طور پر قرآن مجید کے ساتھ آپ کا گہرا تعلق ہے۔ خود آپ کو پتہ ہے کہ ایسے ابتلائی حوادث کے موقع پر صبر و استقامت والوں کے لئے کتنی عظیم بشارت ہے۔ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ اور انہی بشارتوں سے ایک مومن کا طبعی رنج و غم کم ہو سکتا ہے اور وہ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلَهٗ مَا اَعْطٰى کہہ کر صبر کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اجر و ثواب اور انعامات اخروی کا مستحق ہو سکتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس کی ابدی خوشیاں اور نعمتیں نصیب فرمائے۔ اس کی قبر انوار رحمت و مغفرت سے منور ہو اور آپ کو اور دوسرے

تمام متعلقین کو اس پر صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے ۔ فقط والسلام

شریک غم اور دعا گو احقر
سید سراج الدین کاکاخیل عفی عنہ
از دفتر انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس
اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

مکتوب گرامی جناب مولانا محمد تقی امینی ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (بھارت)

محترم و مکرم جناب ڈاکٹر صاحب ، زید مجدکم ۔
السلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہ ،

حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ملی ۔ بیحد صدمہ ہوا ۔ اللہ سے دعا ہے کہ دونوں مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین ۔ آفس پر حملہ کی بھی اطلاع ملی ۔ اور اللہ کی سنت کی یاد تازہ ہوئی ۔ راہ کی مشکلات اس لیے نہیں پیش آتی ہیں کہ اٹھا ہوا قدم رک جائے بلکہ اس لیے آتی ہیں کہ اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ قدم اٹھایا جائے ۔ جب تک اس راہ میں دماغ کے آبگینہ کو پتھر سے کچلا نہیں جاتا ہے وہ چمک پیدا ہی نہیں ہوتی جو اس کام سے مطلوب ہے ۔ پتھر سے کچلنے کی شکلیں دل و دماغ کو دیکھ کر تجویز ہوتی ہیں ۔ آپ کا معاملہ اللہ سے ہے اسی سے صلہ کی توقع رکھیے ۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی ۔۔۔ منت ازو شناس کہ بخدمت بداشتت

اللہ آپ کے ساتھ ہے وہی بہترین ساتھی اور کارساز ہے ۔ اسی پر بھروسہ رکھیے ۔ اگرچہ غم و حزن کے پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹیں کام میں فرق نہ آنے دیں ۔

خوش حوادث سے ہیں خونفشاں اشک دل ۔۔۔ جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے

اللہ سے دعا ہے کہ آپ صحت و عافیت کے ساتھ رہیں اور اللہ اپنے کام میں لگائے رہے ۔ آمین

والسلام
محمد تقی امینی

مکتوب گرامی جناب مولانا عبدالملک جامعی ۔ مدینہ منورہ

محترمی جناب ڈاکٹر صاحب ، سلام مسنون
میثاق تمام ہو چکا ۔ اور حضا کے بعد تقریباً حرف بحرف پڑھتا ہوا جب آخری صفحہ پر پہنچا

...مضمون پڑھ کر دنگ رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ مگر ڈاکٹر صاحب میری لغت میں
...ہ وہ ہوتا ہے جو جذبہ شکر سے معمور ہو، ورنہ صبر لاچاری کا نام ہے، اور عزائم و مقاصد والوں کے
...ے تو یہ حوادث اس کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے نازل ہوتے ہیں، آپ ہرگز دل گیر نہ ہوں۔
حضرت عروہؓ بن زبیر کا پاؤں کاٹا گیا، لوگ تعزیت کو آئے فرمایا کیا، اس میں غم و رنج کی بات
...ے ایک پاؤں تو گیا میرا سارا جسم صحیح سلامت ہے۔ اسی دن ایک صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ لوگ
...ے فرمایا، کیا بات ہے، کیا بات ہے، میرے لڑکے موجود ہیں۔ ہاں مجھے صاحبزادی کے غم میں ضرور
...ب ہوتا ہے، مگر تلقین میری یہی ہے کہ وہ بھی شکر اور ہزار شکر کے پہلوؤں کو تلاش کریں۔ سب
...ے بڑی بات تو اسلام و ایمان ہے، اور اس کے علاوہ بے شمار نعمتیں ہیں۔

والسلام، شریکِ غم
محمد عبد الملک ۔ مدینہ منورہ

مکتوب گرامی جناب مولانا محمد اسحٰق الصدیقی ۔ کراچی

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تازہ "میثاق" (صفر ۱۴۰۳ھ اکتوبر ۱۹۸۲ء) کل موصول ہوا۔ اس میں آپ کے خویش اور بھتیجے محمد سعید احمد صاحب مرحوم اور آپ کے بھتیجے عبد اللہ طاہر صاحب مرحوم کے ٹریفک کے ایک المناک حادثے میں انتقال ہو جانے کی خبر پڑھ کر سخت افسوس ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ مرحومین موصوفین پر اپنی مغفرت و رحمت کی بارش فرمائے اور انہیں اعلیٰ درجات جنّت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مرحومین موصوفین کے سب پسماندگان کو صبرِ جمیل اور اس صدمۂ جانکاہ کا اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

حسب فرمائے حدیث شریف دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے۔ ان دونوں نے اس قید سے رہائی پائی اور آزاد ہو کر اپنے اصل وطن ربِ غفور کے حضور پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید قریب بیقین ہے کہ بڑی راحت و آسائش میں ہوں گے۔ موت تو ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے۔ مومن کے لئے عالم برزخ اور عالم آخرت، عالم دنیا سے لاکھوں درجہ زیادہ راحت رساں، لطف و سرور افزا اور طرب انگیز ہوتا ہے۔ ہم سب کو بھی اسی عالم کی طرف جانا ہے۔ انشاء اللہ سب احبّت عزیزان کے ساتھ ملاقات ہو گی۔ یہ مفارقت عارضی اور چند روزہ ہے۔ دونوں مرحومین (جہاں تک مجھے علم ہے) دین کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات قبول فرما کر ان کے درجات

جنت میں بلند فرمائے اور ان پر رحمت کی مزید بارش فرمائے اور قوم کو ان کے بدلے میں مخلص خدام نصیب فرمائے۔ آمین۔

والسلام

محمد اسحاق صدیقی عفا اللہ عنہ۔ کراچی

مکتوب گرامی جناب محمد شفیع (م-ش) لاہور

عالی حضرت مکرم و محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

میری بیوی (ڈاکٹر خورشید) مجھ سے بار بار کہہ چکی ہے کہ میں اسے آپ کے ہاں لے چلوں تاکہ وہ آپ کے اہل خانہ سے عالم پیری ان سے اظہار تعزیت کر سکے۔ میں اسے ہاں ہوں کہتا رہا ہوں لیکن دل میں یہ سوچتا رہا ہوں کہ وہ ایک ایسے پیکر استقامت اور صبر و رضا کے اہل خانہ سے کیا تعزیت کرے گی۔ جو اپنے پیارے بچوں کے جنازے کے سامنے کھڑا ایسے نظر آتا تھا گویا کوہِ غم کا یہ پہاڑ جو ان پر ٹوٹا تھا ان کے کاندھوں کو جھکا نہیں سکتا کیونکہ اس کے سینے میں جو عشق پرورش پاتا ہے۔ وہ ازلی اور ابدی اقدار کا حامل ہے۔ میں نے آپ کو اس روزِ الم جس کیفیت سے شناسا دیکھا۔ اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ الرحمٰن الرحیم آپ کو صبر جمیل کی بےشمار نعمتوں سے مالا مال فرمائیں اور آپ کے عزیز و اقارب کے زخمی قلب و جگر پر اپنی رحمت کا پھاہا رکھیں۔ آمین۔ اللھم آمین۔ زیادہ کیا عرض کروں

والسلام

خاکسار محمد شفیع (م۔ش) لاہور

مکتوب گرامی جناب اقبال احمد صدیقی - نگران ادارہ ابلاغ علوم و افکار ملی، کراچی

واجب احترام گرامی قدر و مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدیر مسئول ماہنامہ حکمت قرآن لاہور

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آج کے اخبارات میں اس اچانک اور بڑے سانحہ کی خبر بھی نظر سے گزری کہ آپ کے داماد اور بھتیجے جناب محمد حمید احمد اور بھانجے جناب عبدالسلام سیال ضلع خانیوال میں قصبہ دنیاپور کے نزدیک ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے یعنی حادثہ ٹریفک کا اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ جان لیوا۔ حادثے کی تفصیل فی الحقیقت کراچی کے احباب اور دردمند بہی خواہوں کو دستیاب نہیں اس لئے کوئی بات

زرق سے کہی جا رہی ہے دیکھی جا رہی ہے۔ لیکن ایک بات جو فوری توجہ کی مستحق ہے وہ آپ کے لئے صبر
ر۔ شت کا یہ سنگین مرحلہ ہے۔ یہ جوان موتیں اپنے ساتھ خاندانوں کے ناقابل تلافی نقصان کے جو اثرات
۔ ہمہ لائی ہیں ان کا اندازہ ان نوجوانوں کے والدین، بہن بھائی، اہل خانہ اور سرپرست و ہمدرد ہی لگا
سکتے ہیں۔ آپ جیسے سادہ مزاج، متوکل علی اللہ، خدا پرست، اور نیکوکاری کے ابلاغ میں معروف پاکباز
شخص کے لیے اللہ جل شانہ نے امتحان کا یہ مرحلہ دشوار بھی مخصوص کر رکھا ہے۔ نہ آپ نے اس کا
شکوہ کیا ہوگا نہ کسی اور نے ـــ جس نے سنا اور پڑھا یہی کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ایک نکتہ بار بار ذہن میں آ رہا ہے کہ ایسی کڑی آزمائشیں باری تعالیٰ اپنے خاص بندوں کی جانب
بھیجا کرتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ میرا بندہ میری رضا میں کتنا راضی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گلہ مند
و ناشکری ہو گیا ہو۔" الا ماشاء اللہ آپ علم و آگہی کا روشن چراغ ہیں میں آپ سے کیا عرض معروض کروں۔
مقام صبر و استقامت کی حقیقت دین مبین میں کیا ہے آپ بخوبی واقف ہیں۔ یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ
اپنی قدرت کاملہ سے آپ کو یہ استطاعت اور توانائی قلب بھی عطا فرمائے کہ آپ صدمہ کے بشری
تقاضوں پر قابو پا سکیں۔ اور پورے خاندان اور سوگوار پسماندگان کو یہ عظیم سانحہ برداشت کرنے
کی توفیق اسی طرح حاصل ہو جائے جیسے حضرت نائلہؓ نے اپنے نامور شوہر شہید مظلوم سیدنا عثمان بن عفان
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ شہادت بچشم خود دیکھ کر برداشت کر لیا تھا۔ اور بے دریغ بہتا ہوا
بے راست باز شوہر کا سرخ سرخ لہو ان کے ایمان اور عزم حق گوئی کو متزلزل نہیں کر سکا تھا۔ اللہ تعالیٰ
مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ان کے درجات بلند فرمائے اور بے گناہوں کے اس خون کو
ہرگز ہرگز رائیگاں نہ جانے دے۔ آمین۔

براہ کرم کسی رفیق و ہمدرد کے ذمہ لگا دیں کہ مذکورہ ٹریفک حادثے کی تحقیقات پر نظر رکھیں
اور اس معاملہ کی فائل سرد خانے میں نہ جانے دے تاکہ قانون اور انصاف کے تقاضے ضرور
پورے ہو سکیں

پاکستان شریعت کونسل کے ناظم اعلیٰ جناب سید کلیم جیلانی بھی اس سانحہ پر آپ اور آپ کے خاندان
سے دلی اظہار تعزیت کرتے ہیں اور سنی کونسل کے اراکین و سرپرستوں نے اس حادثہ فاجعہ پر گہرے
حزن و ملال کے جذبات آپ تک پہنچانے کے لئے کہا ہے۔

"بندہ مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کے ہر معاملے اور ہر حال میں اس کے لئے
خیر ہی خیر ہے اگر اس کو خوشی، راحت اور آرام پہنچے تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے
اور یہ اس کے لئے خیر ہی خیر ہے، اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ
اس کو بھی اپنے حکیم و کریم رب کا فیصلہ سمجھتے ہوئے اور اس کی مشیت پر یقین کرتے

ہوتے، اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لئے سراسر خیر اور موجب برکت ہوتا ہے۔ (ارشاد نبوی بروایت حضرت صہیب۔ مسلم شریف۔ معارف الحدیث)

میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ آنجناب بندۂ مومن کے اسی معاملۂ عجیب اور قول رسول کے مصداق ہیں۔

محترم! کراچی میں آپ کی آمد کو روکنے کی تدبیر یہاں کسی کو پسند نہیں آئی۔ مدان ادب سیاست... کراچی اکیڈمی کو یہ شکایت ہے کہ یہاں کے اخبارات نے راولپنڈی کی ڈیٹ لائن سے محمد... کے قیام کی خبریں شائع کی ہیں۔ غالباً صحافی اور مضمون نگار علم و واقفیت سے معدوم ہوں گے۔ یوں کراچی میں تین چار سال سے مختار بن ثقفی کا یوم اہتمام سے منایا جانے لگا ہے اور روزناموں میں اس کے باقاعدہ اشتہارات بھی شائع ہوتے ہیں۔ اس بارے میں عموم سب بے خبر رہتے ہیں۔ یا جان کر انجان بنے رہتے ہیں۔ جب طوفان آجاتا ہے تو فرقوں اور انتظامی سربراہوں کے غم و غصہ کی طنابیں کھینچی جاتی ہیں۔ آپ بعض الفاظ اور تاریخی حوالوں کی تعبیر و تصریحات کرنے کے ... گردہ تصور میں بڑی ساری تنقید و تشنیع کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف عامۃ الناس کی بے خبری اور ... یوں اٹھایا جا رہا ہے کہ پہلے اس کی کوئی نظیر موجود ہے نہ روایت ہے

موجیت ہوں کہ دنیا کیسے کیا ہو رہی ہے

آپ کا ایک شریک غم اقبال احمد صدیقی

نگران ادارہ جامع علوم و فنون ... کراچی

مکتوب گرامی جناب پروفیسر احمد الدین مارہروی۔ کراچی

محبی و مخدومی جناب ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم

آج کے اخبار سے اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع ملی جس میں محمد حمید اور عبداللہ دوہر کی ہلاکت کا بہت مجمل طور پر ذکر ہے۔ ہم سب کو اس خبر سے جو صدمہ ہوا اس کو بیان کرنے کے لئے الفاظ جواب دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آپ کو چونکہ خدا تعالیٰ کے اس مژدہ سے پورا یقین ہے کہ ان اللہ مع الصابرین، صبر کی تلقین کرنے کی ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی لیکن اور کیا بھی کیا جائے کہ رسم دو جہاں این است۔ بقول غالب کسی کا دل اگر مجروح ہو تو ہم اس سے کہیں کہ فریاد نہ کر وہ نہ کرے گا تو دل خود کرے گا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ہم سے فرمایا ہے کہ ہم تمہارا جان و مال دونوں ہی کے اتلاف سے امتحان لیں گے اور نیک بندے اس پر انا للہ و انا الیہ راجعون کہا کریں گے۔ چنانچہ آج ہم دونوں کی یہی کیفیت ہے مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ خود تو آپ

صبر زیں گے ہی لیکن پس ماندگان کو صبر کی تلقین بھی آپ ہی کے ذمہ ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ اس سے
بھی کماحقہ' عہدہ برآ ہوں گے

میرا اور آپ کا شاگرد شمیم الرحمن بھی آپ کے اس غم میں شریک ہے ۔

آپ کے غم میں شریک نیازمند
احمد الدین مارہروی ۔ کراچی

مکتوب گرامی جناب شنین صابر ۔ نگران اسلامی سنی سنٹر، لاہور

محبی و مشفقی السید المحترم ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم

کیا لکھوں ۔ کیسے لکھوں ! آج کا اخبار دیکھ کر سوالیہ فقرہ بن کر رہ گیا ہوں۔
جو اس حق کے نام اور دین کا پرچم بلند کرتے ہیں۔ کیا سب آزمائشیں انہی کے لئے ہیں۔ اللہ
ان کو صبر جمیل عطا فرما دے اور مزید آزمائشوں سے محفوظ رکھے ۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

اگر چارپائی سے نہ لگا ہوتا تو خود حاضر ہوتا ۔ محتاج بخشش کاملہ
شنین صابر ۔ چھبرہ لاہور

مکتوب گرامی جناب خسروی ۔ کراچی

مکرمی السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

ابھی ابھی "جنگ" میں آپ کے دونوں عزیزوں کے مہلک حادثہ کی خبر پڑھ کر صدمہ ہوا ۔ ع
ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" خداوند کریم مرحومین کی بشری لغزشوں سے صرف نظر فرما کر مقامات قرب
میں ہر لمحہ ترفیع عطا کرے اور آپ، نیز جملہ متاثرین کو صبر جمیل کا حوصلہ اور اس پر اجر جزیل عطا فرمائے ۔
بہ تخلیق سے ہی ہر نفس نفس رجعت کرنے لگتا ہے۔ اسی لئے "راجعون" کہا ہے ۔ "ترجعون" نہیں ۔ جب تک
"رجعت" کی تکمیل نہ ہو ہم سب راجعون ہی رہتے ہیں کوئی آگے بڑھ جاتا ہے کوئی پیچھے رہ جاتا ہے' اس میں
عمر کی قید نہیں منزل پر سب کو پہنچنا ہے۔ جانے والوں اور رونے والوں کو بالآخر مل ہی جانا ہے جیسے
وصل عارضی تھا ایسے ہی یہ فراق بھی عارضی ہے ۔ مگر یہ صحیح ہونے کے باوجود دل پر تو جو گزرتی ہے وہ گزرتی ہی ہے۔
تلقین صبر عقلی ہے اور غم و جدائی ۔ سہو اور نسیان کی نعمت اگر نہ ملی ہوتی تو آدمی پہلے ہی صدمہ سے مر جاتا
تمام متاثرین کو بھی میری طرف سے تعزیت پہنچا دیجئے ۔ والسلام ! دعا جو و دعا گو
خسروی ۔ ناظم آباد کراچی

بذریعہ تار و خطوط تعزیت کرنیوالے دیگر حضرات کے اسمائے گرامی

(۱) اندرونِ ملک سے

نمبر	نام	مقام
۱	عبدالواحد ہاشم صاحب	کراچی
۲	انور احمد صاحب	کراچی
۳	مولانا غلام محمد صاحب	کراچی
۴	عبدالقادر صاحب و رفقاء تنظیم	حیدرآباد
۵	امتیاز احمد صاحب	فیصل آباد
۶	ڈاکٹر تقی الدین صاحب	کراچی
۷	آنسہ بے نظیر بھٹو	کراچی
۸	محمد رفیق انور صاحب	گوجرانوالہ
۹	محمد منعم فاروقی صاحب	کراچی
۱۰	منصور احمد شیلہ صاحب	کراچی
۱۱	الطاف امرتسری صاحب ایڈووکیٹ	ملتان
۱۲	شیخ عبدالمجید الکمانی و رضوان احمد صاحب	کراچی
۱۳	رفقاء تنظیم اسلامی	کوئٹہ
۱۴	صدر اور ممبران . فارلن کلب	کراچی
۱۵	عبداللہ فاروقی صاحب	کراچی
۱۶	عبداللہ مسعود صاحب	کراچی
۱۷	حسن و قیوم شیخ صاحب	کراچی
۱۸	محمد اکرم صاحب	سوات
۱۹	عبدالباری صاحب	منگورہ
۲۰	یوسف ایچ شیرازی صاحب	کراچی
۲۱	عبدالقادر شیخ صاحب	کراچی
۲۲	قاری حبیب الرحمٰن زاہد صاحب	لاہور
۲۳	مولانا سمیع الحق صاحب	اکوڑہ خٹک
۲۴	اے کیو بریلوی صاحب	کراچی
۲۵	الطاف احمد اللہ والا صاحب	کراچی
۲۶	محمد یامین صاحب (دو خطوط)	کراچی
۲۷	ڈاکٹر عبدالغفور رحمانی صاحب	اوکاڑہ
۲۸	پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب	کراچی
۲۹	ڈاکٹر ظہور احمد صاحب	دیپالپور
۳۰	ظفر اللہ خان صاحب	کراچی
۳۱	السید یحییٰ جیلانی صاحب	کراچی
۳۲	محمد محبوب الٰہی صاحب	چونیاں
۳۳	مولانا شمس الدوران صاحب	مانسہرہ
۳۴	محمد نفیس صاحب	سرگودھا
۳۵	اکرام اللہ خان جسوال صاحب	آزاد کشمیر
۳۶	بدیع الدین نظر صاحب	کراچی
۳۷	جناب عتیق احمد صاحب	کراچی
۳۸	شیخ خوشی محمد صاحب	لاہور
۳۹	شیخ جمیل الرحمٰن صاحب	کراچی
۴۰	حکیم محمد نصیر الدین ندوی صاحب	کراچی
۴۱	ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب	لاہور
۴۲	شجاعت علی خان صاحب	ملاکنڈ

نمبر	نام	شہر
۴۳	عظیم اشرف صاحب	لاہور
۴۴	سید زرین شاہ صاحب	کراچی
۴۵	مولانا محمد متین ہاشمی صاحب	لاہور
۴۶	مولانا زاہد الراشدی صاحب	گوجرانوالہ
۴۷	ظہیر زیدی صاحب	کراچی
۴۸	نجیب صدیقی صاحب	سکھر
۴۹	محمد صالح صاحب	گوجرانوالہ
۵۰	ڈاکٹر عبدالخالق صاحب (دو خطوط)	رحیم یار خان
۵۱	محمد ناصر خان صاحب	لاہور
۵۲	جناب نواز شریف صاحب وزیر اعلیٰ پنجاب	لاہور
۵۳	سید اعجاز احمد بخاری صاحب	بہاولپور
۵۴	ڈاکٹر جمشید عالم صاحب	تھرپارکر
۵۵	مولانا عبداللطیف انور صاحب	ساہیوال
۵۶	عبدالخالق بلوچ صاحب کنہ گوٹھ	جیکب آباد
۵۷	بیگم چوہدری نثار احمد صاحبہ	لاہور
۵۸	محمد اکرم صاحب	حیدرآباد
۵۹	ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی صاحب	ملتان
۶۰	محمد مظہر خان صاحب	اسلام آباد
۶۱	زاہد علی اشرفی صاحب	کراچی
۶۲	محمد خلیل صاحب	لاہور
۶۳	ابرار احمد صاحب	کراچی
۶۴	ڈاکٹر غلام محمد صاحب	گوجرانوالہ
۶۵	سید محمد آزاد صاحب	آزاد کشمیر
۶۶	ذوالفقار نیاز صاحب	ملتان
۶۷	عبدالرشید صاحب	کراچی
۶۸	حکیم احسان علی صاحب	منڈی بہاؤالدین
۶۹	سرشار الحق صاحب	سرگودھا
۷۰	ڈاکٹر ایم اصغر خان جدون صاحب	لاہور
۷۱	شوکت مند خان صاحب	مظفر گڑھ
۷۲	مولانا ابوسعید محمد رمضان علوی صاحب	راولپنڈی
۷۳	میجر محمد اسماعیل صاحب	سکھر
۷۴	سید احمد حسن صاحب	(نامعلوم)
۷۵	محمد افضل راٹھور صاحب	لاہور
۷۶	نیاز احمد خان ایڈووکیٹ	کراچی
۷۷	محمد اسماعیل چوہدری صاحب ایڈووکیٹ	لاہور
۷۸	قاضی عبدالقادر صاحب	کراچی
۷۹	اسامہ عبدالقادر صاحب	کراچی
۸۰	محفوظ احمد مرغوب صاحب	اسلام آباد
۸۱	محمد جمیل خان صاحب	وہاڑی
۸۲	محمد صادق صاحب	ڈیرہ اسماعیل خان
۸۳	عزیز احمد صاحب	فیصل آباد
۸۴	جواد احمد صاحب	کراچی
۸۵	نثار احمد صاحب	لاہور
۸۶	ایم عبدالحمید غالب صاحب	یزمان بہاولپور
۸۷	محمد نسیم صاحب	باجوڑ
۸۸	محمد عقیل صدیقی صاحب	ملتان
۸۹	میجر عارف سعید صاحب	اوکاڑہ کینٹ
۹۰	مظہر علی ادیب صاحب	لاہور
۹۱	محمد اطہر قریشی صاحب [illegible] سندھ	کراچی
۹۲	مولانا جان محمد عباسی امیر جماعت اسلامی سندھ	کراچی
۹۳	ڈاکٹر محمد نذیر مسلم صاحب	رحیم یار خان
۹۴	حافظ محمد ادریس صاحب	منصورہ، لاہور
۹۵	قاضی معین الدین احمد صاحب	لاہور
۹۶	میجر (ریٹائرڈ) عبدالکریم صاحب	کراچی

نمبر	نام	مقام	نمبر	نام	مقام
۹۷	میاں عبدالحفیظ صاحب	رحیم یار خاں	۹۸	علامہ سید غلام شبیر بخاری صاحب	"
۹۹	ڈاکٹر خیر بہادر خان تنولی صاحب	پشاور	۱۰۰	ایم حبیب عاطر صاحب	کراچی
۱۰۱	پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب	سکھر	۱۰۲	محمد منیر احمد صاحب	"
۱۰۳	عبدالعزیز بٹ صاحب و ممبران انجمن رفاہ عوام شادباغ				"
۱۰۴	شاہ مصباح الدین شکیل صاحب	کراچی	۱۰۵	جناب مشکور حسین یاد صاحب	"
۱۰۶	میجر افتخار احمد بٹہ صاحب	بہاولپور	۱۰۷	جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب	"

(ب) بیرونِ پاکستان سے

نمبر	نام	مقام	نمبر	نام	مقام
۱	فضل الرحمٰن صاحب	[illegible]	۲	ڈاکٹر عبدالفتاح	ٹورنٹو۔ کینیڈا
۳	عبدالحکیم صاحب	دہلی۔ بھارت	۴	یونس علی صاحب	سکندریہ، مصر
۵	محمد اصغر حبیب صاحب	جدہ سعودی عرب	۶	ایم طارق بٹ صاحب	العین متحدہ عرب امارات
۷	منیر احمد ثاقب صاحب	الریاض سعودی عرب	۸	محمد فاروق صاحب	الریاض سعودی عرب
۹	محمد کریم صاحب	"	۱۰	خالد محمود صاحب	"
۱۱	ڈاکٹر ارشد احمد صاحب	"	۱۲	ریاض احمد بخاری صاحب	"
۱۳	خادم حسین ڈوگر صاحب	"	۱۴	نرگس اقبال صاحبہ	"
۱۵	غلام مصطفیٰ صاحب	"	۱۶	سید گلزار خان صاحب	"
۱۷	نزہت علی برنی صاحب	جدہ	۱۸	محمد اختر صاحب	شارجہ متحدہ عرب امارات
۱۹	محمد عبدالرشید رحمانی صاحب	"	۲۰	محمد مشتاق بیگ صاحب	[illegible]
۲۱	افتخار احمد عباسی صاحب	ابوظہبی	۲۲	عصمت جاوید صاحب	[illegible]
۲۳	مسز هذا اشتیاق صاحب	"	۲۴	یحییٰ عبدالشکور صاحب	جدہ سعودی عرب
۲۵	محمد سرفراز چیمہ صاحب	"	۲۶	محمد عطاء الرحمٰن صاحب	ریاض
۲۷	[illegible] صاحب	[illegible] سعودی عرب	۲۸	[illegible] خان صاحب	ریاض سعودی عرب
۲۹	حسن مدنی محمد صاحب	جدہ	۳۰	ڈاکٹر [illegible] محمد بخش صاحب	جدہ
۳۱	حبیب حسن عبدالغفار صاحب	لندن	۳۲	ڈاکٹر [illegible] احمد صاحب	مسقط، [illegible]
۳۳	نسیم الدین صاحب و ذوالفقار نعیم	ابوظہبی	۳۴	اشفاق احمد صاحب	[illegible]
۳۵	مولانا شوق حسین قاسمی صاحب	دہلی۔ بھارت	۳۶	عباس حسین ملک صاحب	[illegible] سعودی عرب

ٹی وی اور ریڈیو کی فرقہ پرستانہ پالیسی

[illegible]پ نے پنجاب کے شیعہ سنی تصادم پر اپنے [illegible] میں [illegible] ریڈیو اور ٹیلیویژن کی متعصبانہ پالیسی پر بھی [illegible] ہے [illegible] کہ پاکستان ریڈیو اور ٹیلیویژن کو ایک [illegible] کے قبضے میں دیا گیا ہے اگرچہ بہت پرانا ہے لیکن [illegible] چند سالوں سے [illegible] کی شدت میں اضافہ ہو گیا ہے [illegible] اور دوسرے شیعی عقائد کی تشہیر سے متعلق ذکر [illegible] سرکاری ذرائع ابلاغ کی پالیسی نہ صرف پاکستان کی مسلم اکثریت کے [illegible] کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔ نہ صرف ایک اشتعال انگیز فعل ہے بلکہ [illegible] کے آئین اور حکومت کی اس مسلمہ پالیسی کے خلاف بھی [illegible] کسی ایک فرقے کے نظریات کو اور اختلافی مسائل کو ریڈیو اور ٹیلیویژن پر پیش نہ کیا جائے۔ لیکن جب [illegible] کے پروگراموں خصوصاً محرم کے پہلے دس دنوں کے [illegible] ٹی وی پروگراموں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہمارا ریڈیو [illegible] کا [illegible] ایران کا ریڈیو اور ٹی وی [illegible] [illegible] شیعی عقائد کے ساتھ مخصوص ہیں بھرے ہوتے ہیں جیسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان ایران کی [illegible] صفوی سلطنتوں کی جانشین بن کر سرکاری طور پر ماتم کر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ان دس دنوں میں پاکستان کے مسلمانوں کی [illegible] تکلیف دہ پروگراموں کو سننے کی بجائے یا تو ریڈیو [illegible] بند کر دیتی ہے یا دوسرے ملکوں کے نشر کردہ پروگراموں کو سننے کی کوشش کرتی ہے۔

ہماری حکومت اس تاریخی حقیقت سے واقف ہے کہ مسلمانوں کا سواد اعظم ماتم، نوحے اور سینہ کوبی کو اپنے دینی عقیدے کے خلاف جانتا ہے اور یہ مراسم صرف شیعی فرقے کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان کو پہلی مرتبہ موجودہ شکل چوتھی صدی ہجری میں بنی بویہ کے حکمران معز الدولہ نے دی تھی۔ یہ وہی حکومت تھی جس نے عباسی خلافت کی عزت خاک میں ملا دی تھی جسے بعد میں سلجوقی ترکوں نے بویہیوں کا قلع قمع کر کے بحال کیا۔ معلوم نہیں یہ بدعت قیام پاکستان کے بعد کن مصلحتوں یا سازش کے تحت ہمارے ریڈیو اور ٹی وی میں داخل کر دی گئی۔ اہل سنت کی اکثریت مسلمانوں کی وسیع القلبی اور رواداری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے [illegible] کے شیعہ افسران اور فرقہ پرست شیعہ علماء اور مجتہدوں کی ہمت اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ کھل کر [illegible] پر اپنے عقائد کا پرچار کرنے لگے ہیں۔

تحریر ثروت صولت

اس مرتبہ خاص طور پر ٹی وی پر شیعہ خطیبوں اور ذاکرین نے جو نازیبا حرکتیں کیں وہ صرف محرم کے دس دن تک محدود نہیں رہیں بلکہ اس کے بعد بھی پروگرام "اپنی بات" میں ان کو دیدہ دلیری کے ساتھ تعریف کے ساتھ پیش کیا گیا اور امامت کو نعوذ باللہ تورات، انجیل اور قرآن کہا گیا۔ کیا یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت نہیں کہ ہمارا ریڈیو اور ٹی وی پوری طرح شیعہ ذاکروں کی گرفت میں آگیا ہے یا دے دیا گیا ہے۔

ایک طرف تو یہ شیعہ نوازی اور دوسری طرف مولانا مودودی کے عقائد کو پیش [illegible] کے سلسلے میں اتنی سختی کی جاتی ہے کہ [illegible] نعت پڑھی جاتی ہے تو اس میں سے [illegible] حذف کر دیا جاتا ہے جس میں شاعر نے [illegible] ہے۔

میں کرتا ہوں ایک ہی مشعل کی ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
ہم رتبہ ہیں یاران نبی کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

میثاق
لاہور

پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا؟ کیوں؟ اور کیسے
استحکامِ پاکستان (حصہ دوم)

بہ یادِ محترم

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیمِ اسلامی

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

جلد ــــ ۳۵

شمارہ ــــ ۱۲

دسمبر ۱۹۸۶ء

بمطابق

ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ

زرِ سالانہ
۴۰ روپے

فی شمارہ ۴/۱ روپے

اس شمارے کی قیمت ۵ روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

صدر آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

عرضِ احوال

اقتدار احمد

اے خاصۂ خاصانِ رسُل وقتِ دُعا ہے

برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور تنظیم اسلامی جس کی ترجمانی کے فرائض 'میثاق' ادا کرتا ہے، کا یہ مشترکہ اور متفقہ موقف بارہا ان صفحات میں شرح و بسط سے بیان ہو چکا ہے کہ ہم اگرچہ 'انتخابی سیاست' سے بالکلیہ احتراز کرتے ہیں لیکن نظری سیاست سے اغماض ہمارے نزدیک صرف ایک کوتاہی نہیں بلکہ مجرمانہ تغافل ہے۔ اللہ تعالےٰ کی وسیع و عریض زمین کا یہ قطعہ "پاکستان" جس سے ہماری اپنی اور ہماری اگلی نسلوں کی دنیاوی فلاح و بہبود وابستہ ہے اِس وقت اندیشہ ہائے قریب و بعید اور خدشاتِ واقعی و حقیقی کی چڑھتی ہوئی بھیانک اور سیاہ آندھیوں کے نرغے میں ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوذُ بِكَ مِنْ جَھْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْاَعْدَاءِ - آمین۔ کہنے سننے اور آہ وزاری کے لئے کوئی ایک مضمون نہیں کہ اُسی کو سوسو رنگ سے باندھنے کی ضرورت ہو۔ مسائل کی طویل و دمنہ ہے۔ تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم۔ لیکن ان صفحات کی تنگ دامانی اور راقم کے قلم کی عاجزی اس وقت محض دو اُمور پر مختصر اور اشاراتی گفتگو کا موقع فراہم کرتی ہے۔

مطالبۂ نفاذِ شریعت اور قومی پارلیمان پر نجی شریعت بل کی پذیرائی اور منظوری کیلئے دباؤ ڈالنے کی مہم ان دنوں دینی حلقوں کی ترجیحات میں اوّلین مقام رکھتی ہے اور تنظیم اسلامی کو بھی متحدہ شریعت محاذ اور اس کی مہم میں بساط بھر دامے، درمے، قدمے، سخنے شریک ہونے کی سعادت میسر ہوئی۔ اس سلسلے میں ہمارا نقطۂ نظر پچھلے ماہ کے 'میثاق' میں تفصیل سے آچکا ہے جس میں بعض ذہنوں میں اُٹھنے والے ان سوالات کا شافی جواب بھی موجود تھا کہ 'سیاست' سے ہمارا اعلان برأت ــــ وہ کیا ہوا؟ اور سیاسی محاذوں میں ہماری شرکت ــــ چہ معنی دارد؟ - اس وقت جس صورت

حال پر دلِ خوں کے آنسو رو رہا ہے وہ مطالبۂ نفاذِ شریعت کا ردِ عمل نہیں، مہم کی کامیابی یا ناکامی کے امکانات بھی نہیں خود شریعت پر انگشت نمائی اور دیدہ دلیری کی وہ کیفیت ہے جس سے (یہ کہتے ہوئے دل لرزتا ہے کہ) اس اسلامی جمہوریۂ پاکستان جو اللہ تعالیٰ کا عطیۂ خاص ہے، کے اربابِ حکومت، اہلِ سیاست، قبیلۂ دانشوراں، طبقاتِ مراعات یافتگان، مغرب زدہ خواتین وحضرات، مادیت والحاد کے مارے دوست نما دشمن اور ــ معاذ اللہ ــ خود علماء کے بعض حلقوں نے آسمان سر پہ اٹھا رکھا ہے گویا نفاذِ شریعت کا مضمون تو کم پھیلا تو تکار کا جوتا خوب چل گیا٭ ہمارے اخبارات وجرائد اگرچہ قولِ فیصل کو بھی طوعاً وکرہاً اپنے کالموں میں جگہ دے دیتے ہیں لیکن خوفِ خدا سے آزاد ہو کر (الا ما شاء اللہ) اس مسئلے پر ہر طرح کا رطب ویابس رنگین چوکھٹوں میں تزئین وآرائش کے ساتھ پورے ذوق وشوق سے شائع کر رہے ہیں۔ جہاں بعض اہلِ قلم توجہ طلب مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں ــ اگرچہ ان کی نیت سے بھی محض اللہ تعالیٰ آگاہ ہے، مقصود وضاحت طلبی ہوتی ہے یا مغالطوں کا گرد وغبار اٹھانا ــــ وہاں دینِ حنیف اور شریعتِ حقہ پر جراتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے ایسے ایسے رکیک حملے بھی قرطاس کو آلودہ کر رہے ہیں کہ عجب نہیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے عرش کانپتا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک وملت اور اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے سب بہی خواہوں کو اس توفیق کی ارزانی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ وہ ملک الملک کی بارگاہ میں نہایت الحاح وزاری سے دعائیں کریں کہ ہماری جسارتوں کی یہ "فاقہ مستی" اُس شوخ کی جانب سے عذاب کی کسی شکل کا "رنگ" نہ لائے۔

نفاذِ شریعت کی ہر کوشش میں شرکت کو اپنا فرضِ عین جانتے ہوئے بھی ہم اس مرحلے پر عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ ہنگامہ ہاؤ ہو ہمارے موقف کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی اور تنظیم اسلامی نے ہر رنگ میں، ہر انداز سے، ہر منطق کے زور پر اور ہر دلیل کی روشنی میں روزِ اول سے یہ بات ڈنکے کی چوٹ کہی ہے کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کا خواب

٭ بقول اکبر الہ آبادی مرحوم
بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

نتخابی سیاست سے نہیں بلکہ انقلابی عمل کے ذریعے ہی شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔ احقاقِ
حق ہوا، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو رہا ہے لیکن آہ کس قیمت پر! ۔ پچھلے دنوں
میر جماعتِ اسلامی پاکستان، جناب میاں طفیل محمد صاحب مدظلہ العالی کا ایک مضمون
خبارات کی زینت بنا۔ جس میں انہوں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے بعد نفاذِ شریعت
ے مخالف حلقوں کو مخاطب کر کے افہام و تفہیم کی سعیٔ لاحاصل کی ہے۔ انہیں معلوم
ہے اور ہم بھی جانتے ہیں کہ مخاطبین کے چکنے گھڑوں پر شبنم کی یہ بوندیں کیا اثر کریں گی۔
یکن کیا اب بھی اس کام کا وقت نہیں آیا کہ اکابرین و عمائدینِ جماعت اور ان کے
لقے کے مخلصین فی الدین اپنی حکمتِ عملی پر طریقِ نبوت اور سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا
صلوٰۃ والسلام کی روشنی میں نظرِ ثانی کریں۔ ہم دست بدعا ہیں ـــــ یا الٰہ
عالمین، یا مقلب القلوب! اس قوت کو کارِ زیاں میں نہ کھپنے دے بلکہ اس
سے اپنے دین کی وہ حقیقی اور موثر خدمت لے جس کی نتیجے میں تیرا عطا کردہ ہمارا
یہ وطن۔ پاکستان۔ گمراہی و ضلالت کے اندھیاروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی انسانیت
کے لئے مینارِ نور بن جائے ؏ این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

دفاعِ پاکستان اس وقت ہمارے لئے موت و زیست کا اوّلین مسئلہ ہے۔ ہم
اپنی تاریخ کے نازک ترین موڑ پر ہیں۔ دشمن دانت تیز کر رہا ہے، پنجے رگڑ رہا ہے۔
ہمیں دو طویل محاذوں پر بڑی طاقتوں (SUPER POWERS) کا سامنا ہے۔ بھارت
بھی اب ثانوی بڑی طاقت (MINI SUPER POWER) کہاں رہا۔ وہ خود بھی
چھوٹی عفریت نہیں، روس سے معانقے کے بعد اس کے بڑی طاقت بن جانے میں کیا
شبہ رہ گیا۔ اسکے مقابلے میں ہماری کیفیت کیا ہے۔ من آنم کہ من دانم۔ دفاعی
تیاریوں کی نازک تفاصیل ہمیں معلوم ہوتی بھی نہیں چاہئیں کہ فوجی حکمت عملی کا تقاضا
ہے۔ تاہم اس حد تک تو علم ہمارا حق بنتا ہے کہ ڈھارس بندھی رہے۔ لیکن ؏
رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند۔ ہمارے ملک میں یہ ریت ہی نہیں پڑی کہ عوام
کالانعام کو اس قابل سمجھا جائے کہ جوابدہی کے احساس کے ساتھ انہیں اعتماد میں
لینے کی ضرورت ہو۔ ہمیں تو سقوطِ مشرقی پاکستان سے متصلاً قبل ساتویں بیڑے
کی نوید سے لوریاں دی گئیں تا آنکہ ؏ بیڑے یاروں کے دیکھا کئے سامنے ـــــ
ہمارا بیڑہ غرق ہو گیا اور تاریخ اسلام کی بدترین شکست ہمارا مقدر ہوئی۔

مترِ دلبروں در حدیثِ دیگراں کا انداز مستعار لے کر ایک واردات کا ذکر کر رہا ہے جس سے برادر مسلم ملک مصر دوچار ہوا تھا۔ اور جس میں بحیثیتِ قوم ہمارے لئے بڑی سبق آموزی ہے۔ کلاً انھا تذکرہ۔ اور اس روایت کی ثقاہت کا راقم بذاتِ خود ذمہ دار ہے۔ جناب جنرل (ریٹائرڈ) فتحی رزق (تا حال قاہرہ میں سکونت پذیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے) نے خود راقم کو یہ پوری روداد سنائی کہ چونکہ وہ بھی بلاواسطہ یا بالواسطہ جنرل نجیب اور کرنل ناصر مرحومین کے ساتھی تھے لہٰذا انقلاب کے بعد انہیں کوارٹر ماسٹر جنرل (Q.M.G) کے عہدے پر ترقی دی گئی یا برقرار رکھا گیا۔ جس کے فرائض میں فوج کی جملہ رسد مع اسلحہ و گولہ بارود کی فراہمی اور انتظام و انصرام شامل ہوتا ہے۔ کرنل ناصر نے جنرل نجیب سے اختیارات کلی حاصل کرنے کے بعد جب اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے مزید جدید تر اسلحے کی ضرورت محسوس کی تو اُن کا رجحان طبعاً روس کی طرف تھا لیکن جنرل رزق کے اس اصرار پر کہ مغرب سے ہمیں بہتر مال ملے گا اُنہیں ہار ماننی پڑی۔ جنرل صاحب موصوف ایک وفد لے کر مغربِ یورپ حتیٰ کہ امریکہ تک کی خاک چھان آئے لیکن وہ شاطر نقال کرنل ناصر کے تیور بھانپ چکے تھے، صاف ٹکر گئے۔ یہ لوگ خالی ہاتھ آئے تو کرنل ناصر چاہتے یہی تھے۔ انہوں نے روس کا رُخ کیا اور جنرل رزق اور ہم خیال گروپ کی اس درخواست کو خاطر میں نہ لائے کہ ہمیں مغرب کو قائل کرنے کا ایک موقع اور دیا جائے۔ نتیجہ سب کو معلوم ہے، مصر روس کا لے پالک بنا۔ روسی اسلحہ خانوں کے کوڑے کرکٹ اور روسی مشیروں کی فوج ظفر موج کی ریل پیل ہوئی ملی۔ اور پھر جون ۱۹۶۷ء میں جو ہوا وہ کسے یاد نہیں ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب ۔۔۔۔۔۔ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

صدر ناصر مغرب کے ساتھ بگاڑ میں اس سُرعت کے ساتھ پیشقدمی نہ کرتے نہ روس سے اس حد تک پینگیں نہ بڑھاتے تو بظاہر آج حالات مختلف ہوتے۔ گو یہ تقدیر الٰہی تھی تاہم تدبیر سے ہمارے رب نے منع تو نہیں فرمایا۔

لہ جنرل فتحی رزق سے گلو خلاصی کے لئے صدر ناصر نے انہیں وزیر پیداوار (MINISTER OF PRODUCTION) کے عہدہ پر "ترقی" دے دی تاکہ اس بہانے فوج سے انہیں فارغ کیا جا سکے اور پھر کچھ ہی دنوں بعد "سب اچھا" کر کے وہاں سے بھی چلتا کیا۔

موضوعِ زیرِ گفتگو اس درجہ نازک اور حساس ہے کہ سوائے یہ ایک آئینہ دکھانے
لے ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اربابِ اختیار کو راہِ عدل و قسط پر مستقیم
زمائے۔ قوم پُلِ صراط عبور کر رہی ہے۔ صلاحیتِ حرب و ضرب کا حصول اور ایز اد اپنی
جگہ نہ صرف بہت اہم بلکہ ہمارے رب کا حکم بھی ہے لیکن سب اہلِ دانش و بینش کا
س امر پر بھی اتفاق ہے کہ اندرونِ ملک ملّت میں اطمینان، اتفاق اور یک جہتی اور
بیرونِ ملک ہوش مندانہ طرزِ عمل اس موقع پر شاید اوّل الذکر سے بھی زیادہ ضروری
ہے۔ اس کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے — نظر تو کچھ آتا نہیں۔ اللہ تعالیٰ خیر کرے۔
تاہم مصورِ پاکستان بہت پہلے کہہ گئے ہیں کہ ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔
یہ ایک اصول (RULE) ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو اگر اپنی کسی وسیع تر حکمت کے
تحت اس ملک کا بقا مطلوب ہے تو وہ حسبِ سابق اسے اِستثنار (EXCEPTION)
بنانے پر قادر ہے۔

"میثاق" ایک طویل عرصے سے جیسا کچھ مقدور ہوا، دین کی خدمت کئے چلا آ
رہا ہے۔ ادارے کی کوتاہیوں کے باوجود اس کی اشاعت اکثر دینی جرائد سے کہیں زیادہ
ہے۔ فللہ الحمد۔ اب اسکی اشاعت میں باقاعدگی پیدا کرنے، کتابت و طباعت
کا معیار بڑھانے اور بہتر کاغذ استعمال کرنے کی کوشش بھی مؤقر قارئین کے سامنے ہے۔
تاہم اشتہارات کی کمیابی (کہ یہ پرچہ کمرشل تو کبھی بھی نہ تھا) عام گرانی اور بالخصوص
کاغذ کی روز افزوں قیمتوں نے ادارے کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ اس بوجھ کو کم کرنے
کے کارِ خیر میں آپ کے درجِ ذیل صورتوں میں تعاون مطلوب ہے۔ وجزاکم
اللہ احسن الجزاء۔

۱۔ اس کی فی پرچہ قیمت پانچ روپے اور زرِ سالانہ پچاس روپے از جنوری ۱۹۸۸ء
خوشدلی سے قبول فرمائیے۔

۲۔ اس کی توسیعِ اشاعت میں دل و جان سے کوشش فرمائیے۔ بالخصوص سالانہ
خریدار زیادہ سے زیادہ پیدا کیجئے کہ یہ پرچے کے لئے بمنزلۂ ریڑھ کی ہڈی ہیں۔

۳۔ اپنے حلقۂ اثر میں سے اس کیلئے سنجیدہ و متین اور بلا تصویر (جاندار) اشتہارات
حاصل کیجئے — نرخنامہ اشتہارات دفتر سے حسبِ ضرورت طلب کیا جا سکتا ہے۔

بارِ خاطر نہ ہو تو آخر میں چند کلمات راقم اپنے بارے میں بھی عرض کر کے قارئین سے دُعاؤں کا طالب ہے۔ برادرِ بزرگ جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی عدم موجودگی[1] میں یہ چند صفحات گھسیٹنے کی ذمّہ داری مجھ پر آن پڑی۔ ربع صدی قبل لکھنے پڑھنے کا کچھ تھوڑا بہت شغل کیا تھا، پھر جو قلم ہاتھ سے رکھا تو وہ اب بار گز قرطاس پر سجدہ ریز ہوا ہے۔ یہ بھی کسی مالی منفعت یا شوق پورا کرنے کی غرض سے نہیں۔ ولولے اور ارمان بہت پورے ہو چکے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ بس ایک فرض کی ادائیگی مقصود ہے۔ دُعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ میرے قلم کو روانی عطا کرے اور اسے اپنے دین کی خدمت میں قبول فرمائے۔ رَبِّ وَفِّقْنِیْ لِمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰی۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم و تب علینا انک انت التواب الرحیم۔

'میثاق' کے موقر قارئین رفیق محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے اندازِ نگارش اور عزیزی حافظ عاکف سعید کی تحریروں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ میں ان کی بات تو پیدا نہیں کر سکتا بالخصوص اس حال میں کہ ایک بڑے صدمے کے اثرات دل و دماغ پر ابھی تازہ ہیں[2]۔ تاہم اپنی سی کوشش کی ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔ قارئین کرام میرے قلم کی فرو گذاشتوں اور ناپختگی سے صرفِ نظر فرمائیں تو احسان ہوگا۔

❋

---

[1] ڈاکٹر صاحب موصوف سعودی عرب میں مقیم ہیں اور اپنی کتاب "استحکامِ پاکستان" کے تتمّے "پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا، کیوں اور کیسے!!!" کا خاکہ تیار کر رہے ہیں۔ یاد ہوگا کہ خود "استحکامِ پاکستان" کا نقشہ بھی انہوں نے سال گزشتہ اسی ارضِ مقدس میں بیٹھ کر بنایا تھا۔ نئی کتاب ان شاء اللہ جلد آپ تک پہنچ جائے گی۔ موصوف کی صحت اور یکسوئی کے لئے خصوصی دُعا کی درخواست ہے۔

[2] ۲۰ ستمبر ۸۶ء کو ٹریفک کے جانکاہ حادثے میں عزیزان عبداللہ طاہر سیال اور محمد حمید احمد کی جواں مرگی کا صدمہ، جس کا تفصیلی ذکر اکتوبر کے عرضِ احوال میں برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے قلم سے آ چکا ہے۔

استحکامِ پاکستان حصہ دوم

پاکستان میں اسلامی انقلاب

کب ——— ؟
کیوں ——— ؟
اور
کیسے ——— ؟

اسرار احمد

مکہ مکرمہ، ۹ نومبر ۱۹۸۷ء

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی!
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
مصافِ زندگی میں صورتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) تقدیم

'استحکامِ پاکستان' کی تحریر و تسوید کا آغاز اکتوبر ۸۵ء (صفر المظفر ۱۴۰۶ھ) میں بمقام
...ت ہوا تھا اور اس کی آخری سطریں ۱۷ فروری ۸۶ء کو بمقام لاہور سپردِ قلم ہوئی تھیں۔
اس وقت صرف 'خیال' ہی نہیں پختہ ارادہ تھا کہ اس کے دوسرے حصے کی تالیف بھی
...راً ہی شروع کر دی جائے گی۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں اس کا وعدہ بھی کر لیا گیا تھا، لیکن
...تلف النوع مستقل مصروفیات پر مستزاد بعض اچانک اور غیر متوقع حادثات کے باعث اس
...ں تاخیر ہوتی چلی گئی۔

اُدھر اوّل تو روزنامہ 'جنگ' کے جملہ ایڈیشنوں میں اشاعت کی بنا پر اس کے مضامین
...پہلے ہی بہت وسیع حلقے میں پھیل چکے تھے۔ پھر کتاب بھی نہایت قلیل مدت میں کثیر التعداد
...وگوں تک پہنچ گئی۔ لہٰذا فطری طور پر موعودہ حصۂ دوم کے لیے تقاضا شدید ہو گیا، خصوصاً
...س بنا پر کہ خود راقم نے کتاب کا اختتام ان الفاظ پر کیا تھا:

"ہماری اب تک کی کل گزارشات کا لبِّ لباب اور حاصلِ کلام صرف یہ ایک جملہ ہے کہ:
'پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے' اور اسی پر ہم
اس کتاب کو ختم کر رہے ہیں۔
اس مرحلے پر ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ 'اسلامی
انقلاب' کیسے آئے گا؟ اس کے اساسی لوازم کیا ہیں؟ بنیادی طریقِ کار کیا ہے؟ اور
عملی اقدامات کیا ہوں گے؟ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان امور کی بھی تفصیلی وضاحت
کی ضرورت ہے کہ اسلامی انقلاب سے مراد کیا ہے؟ اور اس کے نتیجے میں جو 'سماجی،
معاشی اور سیاسی نظام' وجود میں آئے گا اس کے اہم خدوخال کیا ہوں گے؟"

اِن حالات میں ایک ہی صورت ممکن العمل نظر آئی اور وہ یہ کہ دوبارہ ارضِ مقدس ہی کا قصد کیا جائے اور وہیں "البلد الامین" کے کسی گوشے میں بیٹھ کر تحریر کا آغاز کر دیا جائے ——— پھر تکمیل ان شاء اللہ حسب سابق پاکستان میں بھی ہو جائے۔
اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے کمال فضل و کرم سے یہ ارادہ پورا کرا دیا اور حضرت اکبرؔ کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

منتشر رہتا ہے مکروہاتِ دنیا سے بہت
اس دلِ مضطر کو یا اللہ اطمینان دے!

کتاب کی تحریر و تسوید کے لیے جس امن و سکون کی ضرورت تھی وہ حرمِ مکی میں میسر آ گیا۔ بقول اقبالؔ ؎

مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی

چنانچہ ——— آج بروز شنبہ بتاریخ ۹ نومبر ۸۶ء (سعودی عرب کے حساب سے ۶ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ) بمقام مکہ مکرمہ محض اللہ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر قلم ہاتھ میں لے لیا ہے ——— اس دعا کے ساتھ کہ 'پروردگار! مجھے شرحِ صدر کی دولت عطا فرما، میرے کام کو میرے لیے آسان فرما دے اور میری زبان (اور قلم) کی گرہ کھول دے تاکہ (میرے ہم وطن اور ہم مذہب) لوگ میری بات کو سمجھ سکیں' گویا بقول اقبالؔ ؎

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خذف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر۔

سب جانتے ہیں کہ راقم الحروف نہ مصنف و مؤلف ہونے کا مدعی ہے، نہ ادیب و انشا پرداز ہونے کا دعویدار۔ بنا بریں اصحابِ نظر سے توقع ہے کہ وہ لغت و ادب کی غلطیوں اور انشاء اور اسلوب کی خامیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے توجہ کو بالکلیہ مقصود و مدعا ہی پر مرکوز رکھیں گے۔ مبادا مجھے بھی اپنے بزرگوں اور عزیزوں سے علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں شکوہ کرنا پڑے کہ ؎ "مرا یاراں غزلخوانے شمردند!"

وَمَا تَوفِیقِی اِلَّا بِاللہِ العَلِیِّ العَظِیم!

فرمانِ نبوی مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ کے مطابق مجھ پر شکریہ واجب
ے جناب یحییٰ عبدالشکور منشی صاحب کا جنہوں نے جدہ میں قیام کی اعلیٰ ترین سہولتیں
بیا کیں اور مدینہ منورہ کے سفر میں ہمرکابی بھی اختیار کی اور میسرز شہباز نذیر سعودیہ لمیٹڈ
جنہوں نے مکہ مکرمہ میں قیام کی سہولت کے علاوہ حرم کی حاضری کے لیے ہر وقت کار بھی
ہم کیے رکھی۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔

---

(۲) پاکستان کے عدمِ استحکام کی نئی جہتیں

اُس کتاب کے پہلے حصے میں تفصیل کے ساتھ واضح کیا جا چکا ہے کہ پاکستان کا عدمِ
ستحکام کا "یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی" کے مصداق وہمی اور خیالی نہیں بلکہ حقیقی اور
عی ہے اور اس میں اغیار اور اعداء کی ریشہ دوانیوں سے کہیں زیادہ دخل ہماری اپنی
تاہیوں اور نااہلیوں کو ہے جن کی اصل جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ ہم نے پاکستان جس مقصد
ے لیے حاصل کیا تھا اُس کی جانب کوئی حقیقی اور واقعی' اور مؤثر اور نتیجہ خیز پیشقدمی
ہیں کی (یعنی اسلام کی جانب کوئی قدم اٹھایا بھی تو محض علامتی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ
نوعیت کا)، بلکہ ہم ہمہ تن آزادی کی مادی برکات سے بہرہ اندوز ہونے میں منہمک ہو
ئے۔ اور اس کے ضمن میں مقابلہ و مسابقت اور تنافس و تکاثر نے بالکل 'آپا دھاپی' اور
ا تفری (FREE FOR ALL) کی کیفیت پیدا کر دی — نتیجۃً ہماری وحدتِ
پارہ پارہ ہو گئی اور اس کی جگہ گروہی و طبقاتی، صوبائی و علاقائی اور نسلی و لسانی عصبیتوں
دور دورہ ہو گیا۔

ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے اور ہر قلبِ حساس مضطرب ہے کہ گذشتہ ایک
ل کے دوران یہ کیفیت دو جمع دو چار نہیں بلکہ چار ضرب چار سولہ کے حساب سے
جی ہے۔ گویا بقول شعری ع "ترقی پہ ہے اضطرابِ محبت!"

چنانچہ وطن عزیز کے مختلف حصوں میں گذشتہ ایک سال کے دوران بالعموم اور پچھلے تین ماہ کے دوران بالخصوص جو حالات و واقعات رُونما ہوتے ہیں انہوں نے واقفانِ حال اور صاحبانِ احساس کی تشویش میں تو حد درجہ اضافہ کیا ہی ہے اب تو "قلندرانِ حال مست" اور بے پروایانِ مال مست" کو بھی پریشان کر دیا ہے ——— اس وقت ہر پاکستانی مسلمان خواہ امیر ہو یا غریب پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ اور بڑا ہو یا چھوٹا ملک و ملت کے بارے میں شدید اندیشہ محسوس کر رہا ہے ——— یہاں تک کہ "نفسِ مطمئنہ" اور بقولِ خود "معتمدِ اعلیٰ" بھی جو سرکاری تقریبات میں مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتا اور لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا ——— گویا نیرو کے مانند بنسی بجاتا نظر آتا ہے ——— اور اس طرح ہر ممکن طریقے سے "سب اچھا ہے!" کا تاثر دیتا ہے پہلی بار یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ "حالات واقعۃً تشویشناک ہیں"! اگرچہ اس فوری اضافے کے ساتھ کہ "مگر ان کا علاج تازہ الیکشن ہرگز نہیں ہے"! گویا اطمینان کی اصل اساس وہی ہے کہ ع "ہنوز دلی دُور است"! اور اسی بنا پر ع "ایں دفترِ بے معنیٰ غرقِ مے ناب اولیٰ" کی روش پر اصرار ہے!

تو آیئے کہ ذرا پاکستان کے حالات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر جائزہ لیں کہ پاکستان کے چاروں صوبے کس حال میں ہیں اور پاکستان کی سالمیت کی فصیل میں کہاں کہاں دراڑیں پڑ رہی ہیں:

سرحد

پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر رُوس اور اُس کی کٹھ پتلی افغان حکومت کی جانب سے فضائی خلاف ورزیوں کا سلسلہ تو کئی سال سے جاری ہے' اس سال کے دوران براہِ راست بمباری کے بھی متعدد واقعات ہوئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "جوابِ آں غزل" کا عمل بالفعل شروع ہو گیا جس کی دھمکی کئی سال سے دی جا رہی تھی۔ چنانچہ ایک طرف پاکستان کے قبائلی علاقے میں روسی عمل دخل اور اثر و نفوذ کا سلسلہ پوری شدت کے ساتھ

شروع ہوگیا اور روسی ہتھیاروں اور اسلحہ کی بھرمار ہوگئی اور دوسری جانب ایک قبائلی
سردار اور اس کے حواریوں کے ذریعے سوانگی ہجرت' کا ڈرامہ بھی رچالیا گیا، خواہ وہ محض
ایک 'علامت' (SYMBOL) کے درجے ہی کی تھی۔

اس پر مستزاد یہ کہ بموں کے دھماکے اور دوسری تخریبی سرگرمیاں اب پشاور اور اس
کے گرد و نواح کے علاقے کا معمول بن گئی ہیں اور اس علاقے کی صورتِ حال کی بالکل صحیح
تعبیر ہے جو ایک حال ہی میں فوت ہونے والے سیاسی کارکن سے منسوب اِن الفاظ میں
سامنے آئی ہے کہ "پشاور کا علاقہ بیروت نہیں بارود بن رہا ہے!" ——— اسی طرح
افغان تخریب کاروں اور دہشت گردوں کی گرفتاری اور مہلک اسلحہ اور تباہ کن ساز و
سامان کی برآمدگی کی خبریں اب جس تسلسل سے آرہی ہیں اُس کے پیش نظر یہ سوال ذہن میں
بار بار اُبھرتا ہے کہ "اگر یہ سارا سامان استعمال ہو جاتا تو کیا ہوتا؟" ——— اور اس کے
ساتھ ہی تحت الشعور میں یہ اندیشہ بھی سر اٹھاتا ہے کہ "یہ برآمدگیاں برف کے سمندری تودے
(ICEBER...) کی صرف سطح سمندر سے اُوپر نظر آنے والی چوٹی (TIP) کی حیثیت رکھتی
ہیں: گویا کہ "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!"

اس پوری صورتِ حال پر تو یہ کہہ کر صبر کیا جا سکتا تھا کہ یہ سب کچھ افغان مہاجرین کو
پناہ دینے اور مجاہدینِ افغانستان کے لیے کم از کم بیرونی امداد کے راستوں کو کھلا رکھنے
کی قیمت ہے جو ہمیں بہر صورت ادا کرنی ہوگی۔ اس لئے کہ مسلمان مہاجرین کو پناہ دینا
ہمارا دینی اور اخلاقی فرض ہے ——— اور افغان مجاہدین صرف اپنے ملک کی
آزادی ہی کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ مارکسی اِلحاد اور رُوسی استبداد کے سیلاب کی
راہ کا کوہِ گراں بن کر خود پاکستان کے دفاع کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ لہٰذا بات
اگر صرف اس حد تک ہوتی تو ہرگز تشویشناک نہ ہوتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب یہ
بھی نظر آتا ہے کہ خان عبد الولی خاں کابل اور روس میں بیٹھ کر پوری بے باکی کے ساتھ
نہ صرف یہ کہ پاکستان کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں بلکہ کھلم کھلا الزام عاید کرتے ہیں کہ
پاکستان بھارت کے سکھ دہشت گردوں کی مدد کر رہا ہے ——— اور اس سب کے

بعد پورے اطمینان اور نہایت آن بان کے ساتھ میلوں لمبے استقبالی جلوس کے جلو میں پاکستان واپس تشریف لے آتے ہیں اور انہیں کوئی اندیشہ نہیں ہوتا کہ ملک میں اُن سے کوئی باز پُرس ہوسکتی ہے ــــــ تو لازماً تشویش ہوتی ہے کہ ہماری حکومت نے افغانی اور سرحدی خلاف ورزیوں کے معاملے میں تو اُس روایتی بنیے کا کردار جو ہر مرتبہ مار کھانے کے بعد یہی کہا کرتا تھا کہ "اب کے مار کے دیکھ!" اس لیے اختیار کیے رکھا کہ روس ایسی سُپر پاور سے براہِ راست تصادم سے امکانی حد تک گریز کرنا چاہیے لیکن کیا وہ اس درجہ لاچار اور بے بس ہوچکی ہے کہ خود اپنے شہریوں سے باز پُرس نہیں کرسکتی! مزید برآں کیا عوامی سطح پر ہمارا جسدِ ملی اتنا بے جان ہوچکا ہے کہ اس کے خلاف صریح جارحیت پر بھی کسی عوامی ردِ عمل کا اندیشہ نہیں ہوتا! ــــــ اسی طرح جب وہ صاحب بھی جو جناب ضیاء الحق کے جاری کردہ "نیم سیاسی" عمل کے ذریعے صوبہ سرحد کی وزارتِ علیا کے عہدے پر فائز ہوئے ہیں نہ صرف یہ کہ مجوزہ کالا باغ ڈیم کے بارے میں بالکل وہی بات کہتے ہیں جو جناب سرحدی گاندھی اور اُن کے فرزندِ ارجمند اور جناب جی ایم سید اور اُن کے حواری کہتے ہیں بلکہ صوبائی حقوق و اختیارات کے ضمن میں کنفیڈریشن کا نعرہ لگانے والوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتے ہیں تو لازماً خوف لاحق ہوتا ہے کہ کیا واقعتہً سرحد کا وہ غیور پٹھان جس نے چالیس سال قبل ریفرنڈم میں انڈین نیشنلزم کے علمبرداروں کو عبرتناک شکست دی تھی کسی ردِ عمل کا شکار ہوکر علاقائیت اور صوبائیت کے خول میں بند ہوچکا ہے!!

پنجاب

آبادی کے لحاظ سے پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے ــــــ اور غالباً یہ اسی 'بڑے پن' کے احساس کا نتیجہ ہے کہ وہاں کے لوگ اکثر و بیشتر اپنے آپ ہی میں مگن رہتے ہیں اور "اندیشہ ہائے دُور و دراز" میں بآسانی مبتلا نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں بجا بدگمانی ہے جبث میری غرشی سے تہیں" کے مصداق چھوٹے صوبوں کے لوگوں کو کچھ بدگمانیاں فطری

مور پر احق ہوتی ہیں جنہیں ملک و ملت کے دشمن سے "کچھ تو ہوتے بھی ہیں الفت میں جنوں کے ۔۔۔ اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا لیتے ہیں" کے مطابق بڑھا چڑھا اور نمک مرچ لگا کر اپنے مذموم مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ چھوٹے صوبوں میں یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ چونکہ پنجاب بہت خوشحال ہے اور اس خوشحالی میں اس کے اپنے داخلی وسائل و ذرائع اور اس میں بسنے والوں کی محنت و مشقت یا اہلیت و لیاقت سے زیادہ حصہ دوسرے صوبوں کے 'استحصال' کا ہے لہٰذا وہاں ـــ "سب اچھا" کا سماں بندھا رہتا ہے ـــ حالانکہ واقعہ یہ ہے پاکستان کی صنعتی اور تجارتی دولت کا سب سے بڑا ارتکاز کراچی میں ہے' اور ہر قسم کے پیسے کی سب سے زیادہ ریل پیل صوبہ سرحد میں ہے' پھر استحصالی طبقات جیسے کچھ اور جتنے کچھ پاکستان کے دوسرے صوبوں میں موجود ہیں ویسے اور اتنے ہی پنجاب میں بھی ہیں اور محنت کش عوام' خواہ وہ ادنیٰ اور متوسط طبقے کے ملازمت پیشہ لوگ ہوں خواہ مزدوروں اور کاشتکاروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں جیسے اور جتنے دوسرے صوبوں میں ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں ویسے ہی اور اتنے ہی پنجاب میں بھی پس رہے ہیں۔ اور اگرچہ اس امکان کی نفی نہیں کی جا سکتی کہ سب سے بڑا صوبہ ہونے کے ناطے پنجاب کے استحصالی طبقات نے خود اپنے صوبے کے پسماندہ عوام کے استحصال کے ساتھ ساتھ دوسرے صوبوں کا بھی استحصال کیا ہو تاہم پوری پنجابی قوم کو استحصالی قرار دے دینا یقیناً زیادتی ہے جبکہ عمومی سکوت و سکون اور سیاسی جمود و تعطل پنجاب کا مجموعی وصف ہے!

پنجاب کے اس عمومی اور مجموعی وصف کے اصل اسباب کا سراغ لگانے کے لیے تو پنجاب کے طویل تاریخی پس منظر میں جھانکنا ہوگا۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی تناظر میں البتہ پنجاب کی "بے حسی" کا سبب اولاً تو "بڑائی" کا وہ احساس ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور جو فی نفسہٖ بہت سرور انگیز اور نشہ آور ہے اور ثانیاً یہ کہ آخر وہ ایجی ٹیشن کریں تو کس کے خلاف؟ دہائی دیں تو کس کی؟ اور علیحدگی چاہیں تو کس سے؟ اس لیے کہ یہاں تو معاملہ وہ ہے کہ "اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!" اور

"دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی!"

اور یہ "دوست" کون ہیں؟ اولاً پاکستان کی مرکزی سول بیوروکریسی، جس میں اندرون ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آنے والے (مہاجرین) اور پنجاب سے تعلق رکھنے والے تقریباً برابر کے شریک تھے اور صوبۂ سرحد کا حصّہ بھی بقدرِ جثّہ موجود تھا جبکہ باقی دو صوبوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذرا مہاجرین کا تناسب کم ہوتا چلا گیا اور مرکزی بیوروکریسی میں غالب اور فیصلہ کن اکثریت اہلِ پنجاب ہی کی ہوتی چلی گئی! اور ثانیاً پاکستان کی افواج ——— جن کے "جوان" تو تقریباً کُل کے کُل پنجاب بلکہ اُس کے بھی صرف دو "ڈویژنوں" سے تھے، رہے "آفیسرز" تو اُن کی بھی غالب اکثریت پنجاب سے تھی اس کے بعد سرحد سے اور کسی قدر مہاجرین میں سے۔ گویا سندھ اور بلوچستان دونوں صوبوں کی پاکستانی افواج میں کوئی نمائندگی نہ تھی۔

واضح رہے کہ یہاں نہ کسی کے معائب و محاسن کا میزانیہ (BALANCE SHEET) مرتب کرنا مقصود ہے، نہ کسی طبقے کو مطعون (CHARGE SHEET) کرنا مطلوب ہے بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ پاکستان کے موجودہ سیاسی و انتظامی انتشار (CHAOS) اور ملّی و ملکی اضمحلال و تزلزل (SHAKINESS) میں کون کون سے طبقات کے کس رویّے کے منفی اثرات کو دخل حاصل ہے، لہٰذا پاکستان کی مرکزی حکومت کے اعلیٰ سطح کے ملازمین اور پاکستان کی افواج کے جوانوں اور افسروں کی خدمات اور اُن کی شاندار کارکردگی کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے ورنہ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک نوزائیدہ مملکت جو انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں قائم ہوئی تھی اس کو ابتداءً مستحکم کرنے اور داخلی فتنوں اور خارجی حملوں سے بچا کر اپنے پاؤں پر کھڑا کر دینے میں ان دو طبقات کی محنت و مشقت اور لیاقت و قابلیت کو فیصلہ کُن دخل حاصل ہے۔

موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے جس حقیقت کی جانب توجہ دلانی مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کی اوّلین مرکزی بیوروکریسی نے چونکہ نوآبادیاتی نظام میں افسری کی تربیت پائی تھی لہٰذا چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر اس میں رعونت ہی نہیں فرعونیت بھی تھی اور حاکمانہ ہی نہیں تحکمانہ ذہنیت بھی! جس کا شدید ردِّعمل پیدا ہوا اوّلاً مشرقی پاکستان میں اور ثانیاً

بخصوص وَن یونٹ کے دَور میں مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں بالخصوص سندھ میں!
نتیجۃً اولاً مشرقی پاکستان کے ہندوؤں اور ان کے نام نہاد مسلمان ایجنٹوں کو پورے
مغربی پاکستان کے خلاف جذبات بھڑکانے کا موقع ملا اور بنگلہ دیش کے قیام کی راہ ہموار
ہوگئی اس لیے کہ اس وقت تک سنٹرل سول سروس میں پنجابیوں کے ساتھ ساتھ مہاجروں
کی بھی معتد بہ تعداد موجود تھی —— اور بعد ازاں یہی صورت مغربی پاکستان میں
پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں سندھی اور بلوچ عوام میں پنجابیوں کے خلاف شدید نفرت کا
جذبہ پیدا ہوگیا اس لیے کہ اب سنٹرل سروسز میں پنجابیوں کو فیصلہ کن اکثریت حاصل ہو
گئی تھی! پنجاب کے خلاف یہ عمومی ردّعمل اگرچہ کسی درجہ میں سرحد میں بھی پیدا ہوا - اور اس
سے کسی قدر زائد بلوچستان میں بھی (یاد ہوگا کہ ۷۰ء کے انتخابات کے بعد نیشنل عوامی پارٹی
و جمعیت العلماء کی جو کولیشن حکومت بلوچستان میں بنی تھی اس نے تمام پنجابی افسروں کو یکدم
پنجاب واپس جانے کا حکم صادر کر دیا تھا) لیکن اس نفرت کا سب سے بڑا گڑھ سندھ بنا!
اور اس میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ نفرت کی اس جلتی آگ پر تیل
ہی نہیں پٹرول کا کام کیا بار بار لگنے والے مارشل لاء نے' اور اس کیفیت (PHENOMENON)
کو منطقی انتہا تک پہنچا دیا جنرل ضیاء الحق کی طویل ترین فوجی حکومت نے جس سے پاکستان
تاحال بھی کُلّی طور پر رُستگاری حاصل نہیں کر سکا ہے! نتیجۃً آج 'پنجابی' کا لفظ پاکستان کے
تینوں چھوٹے صوبوں میں بالعموم اور سندھ میں بالخصوص 'گالی' کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور
پاکستان بالفعل اُس خوفناک تباہی کے دہانے تک پہنچ گیا ہے جس کا اندیشہ راقم الحروف نے
اپنے اُس خط میں ظاہر کیا تھا جو اُس نے اب سے ٹھیک چار سال قبل (دسمبر ۸۲ء میں)
جنرل ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور جو بعد ازاں روزنامہ 'جنگ' میں بھی
کسی قدر قطع وبرید کے ساتھ شائع ہوگیا تھا اور ماہنامہ 'میثاق' میں بھی!

اپنے اُس خط میں راقم نے اپنا یہ مشاہدہ بھی بیان کیا تھا کہ:

"میرے اندازے میں سندھ میں 'سندھو دیش' کے لیے میدان پورے طور پر بالکل اسی طرح تیار
ہو چکا ہے جس طرح مشرقی پاکستان میں 'بنگلہ دیش' کے لیے ہوا تھا۔ اور اب فرق صرف آنا

ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دُور اور علیحدہ تھا اس لیے مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول
ذکر سکی اور سندھ چونکہ زمینی طور پر ملحق ہے لہٰذا یہاں ایسی کسی تحریک کو کچلا جا سکتا ہے۔
لیکن میرے نزدیک اس عامل (FACTOR) پر انحصار سخت عاقبت نااندیشی ہے!"

اور اس کے ساتھ پوری وضاحت سے متنبہ کیا تھا کہ "مارشل لاء کی طوالت اور سیاسی عمل کے مسلسل تعطل سے قومی و ملی زندگی میں جو خلاء (VACUUM) پیدا ہوا ہے وہ پاکستان کے حق میں خودکشی کے مترادف (SUICIDAL) ہے، دوسری طرف 'اسلام' جس کے نام پر آپ ملک کی سیاسی گاڑی کو روکے کھڑے ہیں، اُس کے ضمن میں نہ صرف یہ کہ آپ نے ساڑھے پانچ سال کے عرصے میں کوئی مثبت اور نتیجہ خیز پیشقدمی نہیں کی بلکہ آپ کے بعض نیم دلانہ اقدامات نے اسلام کے CAUSE کو الٹا نقصان پہنچایا ہے۔ بنابریں جلد از جلد مارشل لاء کی بساط لپیٹیے اور ملک کی سیاسی گاڑی کو جمہوری خطوط پر آگے بڑھنے کا موقع دیجئے ——— اس ضمن میں راقم نے بمصداق "نوا را تلخ ترمی زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی!" کے مطابق یہاں تک عرض کر دیا تھا کہ:

> "مجھے شدید اندیشہ ہے کہ کہیں مستقبل کا مؤرخ یہ نہ لکھے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے عہدِ حاضر کی جو سب سے بڑی مسلمان مملکت قائم ہوئی تھی اسے اوّلاً ۱۹۷۱ء میں دولخت کیا ایک شرابی اور زانی نے اور بعد ازاں اس کے مزید حصے بخرے ہونے (یعنی (BALKANISATION) کا عمل صادر ہوا ایک ایسے شخص کے ہاتھوں جو نمازی اور پرہیزگار تھا!"

قصہ مختصر یہ کہ پنجاب کے حصے میں جو بدنامی آئی وہ اصلاً تو بیوروکریسی کے غلط رویے اور مارشل لاء کے تسلسل اور طوالت کی پیداوار ہے، اگرچہ اس سے قطع نظر کہ صحیح حقائق و واقعات تو اللہ ہی کے علم میں ہیں، بہرحال نظری طور پر اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ پنجابی افسر شاہی اور مارشل لاء حکام کی بدعنوانیوں کے طفیل پنجاب کے کچھ لوگوں یا چند خاندانوں نے ناجائز فائدے بھی حاصل کیے ہوں لیکن پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے جو چیز نہایت تشویشناک ہے وہ یہ کہ پاکستان کے اندرونی معاملے اور بین الصوبائی مقدمے میں ملک کا سب سے بڑا صوبہ 'مدعاعلیہ' کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں

پنجاب کی عوامی نفسیات پر "مدافعانہ" رنگ غالب آگیا ہے اور حرکت و اقدام سے گریز پنجاب کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ چنانچہ وہاں جو حرکت بالعموم نظر آتی ہے وہ "نئے چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام۔ یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات!" کے مصداق اکثر و بیشتر صرف "شغل میلہ" کی نوعیت کی ہوتی ہے۔ ورنہ کسی سنجیدہ سماجی یا سیاسی تحریک میں پنجاب صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جب کوئی دوسرے لوگ اُسے شروع کر کے نقطۂ عروج کے قریب تک پہنچا دیں۔

یہی وجہ ہے کہ ۸۳ء کی ایم آر ڈی کی تحریک پنجاب میں بالکل ناکام ہو گئی تھی نتیجۃً اس نے صرف سندھ اور اس کے بھی دیہی علاقے کی شورش کی صورت اختیار کر لی۔ پھر "مس بے نظیر بھٹو کی آمد پر پنجاب میں استقبال کا "شغل میلہ" تو بھرپور انداز میں ہوا لیکن ۱۴ اگست ۸۶ء کو مختصر سی ہل چل کے سوا پنجاب میں کوئی عوامی تحریک نہیں چلی اور ایک مرتبہ پھر سندھ کے بعض دیہی علاقے ہی کل ہنگامے کا مرکز بن کر رہ گئے۔ اور اگرچہ اس حالیہ ناکامی کے بعد مس بھٹو نے بہت ٹھنڈے اور حقیقت پسندانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ پوری سنجیدگی اور تندہی کے ساتھ خاص طور پر پنجاب میں اپنی تنظیم کی صفوں (CADRES) کو درست اور منظم کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں۔ تاہم ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل قریب میں پنجاب کو جمہوریت کی کلی و کامل بحالی کے لیے کسی مؤثر سیاسی تحریک کے لیے آمادہ کیا جا سکے گا یا نہیں! اور جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے پنجاب کا یہ سیاسی جمود اور قوم و وطن کے عظیم تر معاملات کے ضمن میں بے حسی اور لاتعلقی (INDIFFERENCE) کی روش پاکستان کے مستقبل کے لیے فی نفسہٖ بھی مُضر اور خطرناک ہے۔ اس لیے کہ چھوٹے صوبوں کے عوام میں اس کی بنا پر پنجاب سے عمومی مایوسی اور بدظنی پیدا ہو رہی ہے اور خصوصاً سندھ میں تو اس کا ردِّعمل بہت شدید ہے ——— مزید برآں اس کا بھی شدید خطرہ موجود ہے کہ اگر پنجاب کسی طرح حرکت میں نہ آیا تو مس بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی کا سندھی حصّہ بھی قومی سیاست کے میدان سے پسپائی اختیار کر لیں اور صوبائیت کے خول میں بند ہو کر سندھی نیشنلزم کے تیز

دھارے میں نہ بہہ جائیں۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوگیا تو اس کے نتائج پاکستان کے حق میں بہت خوفناک ہوں گے!

پنجاب کے اِس روایتی سکوت و سکون کے پس منظر میں وہ دو واقعات بہت نمایاں ہوکر سامنے آئے ہیں جو گذشتہ دو تین ماہ کے دَوران رونما ہوئے اور جن سے ملک و ملت کے مستقبل کے ضمن میں نئے شکوک و شبہات نے جنم لیا ہے:

ایک پنجاب کے موجودہ برسرِ اقتدار لوگوں کی باہمی رسّہ کشی ہی نہیں باضابطہ چھینا جھپٹی جس نے چالیس سال قبل کی اس دولتانہ ممدوٹ کشمکش کی یاد تازہ کردی ہے جس کے نتیجے میں پاکستانی سیاست کی گاڑی پہلی بار دستوری و قانونی پٹڑی سے اُتری تھی اور حکومت پر بیوروکریسی کے فیصلہ کُن غلبے کی راہ ہموار ہوئی تھی ——— اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب کے 'چودھریوں' کو تاحال ملک و ملت کو درپیش عظیم تر مسائل کا کوئی شعور و ادراک حاصل نہیں ہوا اور اُن کی عظیم اکثریت کی سوچ زیادہ تر خالص ذاتی اور اس سے آگے صرف خاندانی، گروہی اور طبقاتی مفادات اور مصلحتوں کے گرد گھومتی ہے ——— اور ظاہر ہے کہ ملک کے سب سے بڑے صوبے کے حکمران طبقے (RULING ELITE) کی یہ کیفیت ملکی استحکام کے نقطۂ نظر سے ہرگز قابلِ اطمینان نہیں ہے!

دوسرا اور فوری اعتبار سے کہیں اہم تر معاملہ اُن شیعہ سُنّی فسادات کا ہے جو محرم الحرام اور صفر المظفر کے دو مہینوں کے دَوران میں لاہور سمیت پنجاب کے متعدد شہروں اور قصبوں حتیٰ کہ دیہات تک میں ہوئے اور جن سے بلاشبہ پاکستان کے عدمِ استحکام کی داستان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ محرم کے جلوسوں کے ضمن میں معمولی نوعیت کی تلخیاں تو ہمیشہ کا معمول رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی ماہ محرم قریب آتا ہے، امن کمیٹیاں بھی جنم لینی شروع ہوجاتی ہیں اور وحدت و اتحاد کے درس بھی نشر ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس سال پورے پنجاب میں بالعموم اور صوبائی دارالحکومت لاہور میں بالخصوص جو کچھ ہوا اُسے کسی فوری یا وقتی اشتعال کا مظہر قرار دینا یا حد درجہ

سودہ لوحی کا نتیجہ ہو سکتا ہے یا خالص مصلحت پرستانہ خود فریبی کا شاخسانہ۔ اس لیے کہ یہ فسادات بدیہی طور پر ایک گہری سازش کا نتیجہ تھے اور بظاہر احوال تو یہی نظر آتا ہے وہ سازش بھی کلیتہً 'ساختہ پاکستان' نہیں تھی بلکہ باہر سے درآمد شدہ تھی۔ واللہ اعلم!

بہر حال اسباب وعلل اور نتائج وعواقب کی تفصیلی بحث سے قطع نظر، یہ امر بالکل واضح ہے کہ ماضیٔ قریب میں اولاً کراچی، پھر کوئٹہ اور گذشتہ دو ماہ کے دوران پاکستان کے سب سے بڑے ... بے کو وسیع ترین پیمانے پر لپیٹ میں لینے والی اس فرقہ وارانہ کشیدگی سے پاکستان کے عدم استحکام میں ایک بالکل نئی جہت (DIMENSION) کا اضافہ ہو گیا ہے

العیاذ باللہ

بلوچستان

پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ کے دوران بلوچستان میں متعدد بار سیاسی بے چینی پیدا ہوئی۔ اور کم از کم دو مرتبہ وہاں بغاوت کی سی صورت بھی پیدا ہوئی اور قبائلی شورش کو دبانے کے لیے قوت کا استعمال کرنا پڑا۔ اور نہ صرف فوجی کارروائی بلکہ بعض مواقع پر بمباری تک کی نوبت آئی ——— لیکن اِدھر چند سال سے بلوچستان میں بھی خاموشی تھی، اور ماسوائے اس کے کہ اُس کی دو اہم سیاسی شخصیتیں یعنی سردار خیر بخش مری اور سردار عطاء اللہ مینگل خود اختیار کردہ جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں اور کبھی کبھی یہ خبریں سننے میں آجاتی ہیں کہ افغانستان میں کئی ہزار تربیت یافتہ بلوچ گوریلے پاکستان کی طرف مارچ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں' اس عرصے کے دوران اندرونِ بلوچستان نہ کوئی سیاسی ہلچل پیدا ہوئی نہ کوئی قبائلی یا عوامی شورش! ——— اور شاید یہ بھی پنجاب ہی کے مانند کسی نمایاں سیاسی حرکت کے فقدان کا نتیجہ تھا کہ بلوچستان میں بھی کچھ عرصہ قبل ملک وملت کے دشمنوں نے مذہبی فساد یعنی شیعہ سنی تصادم کا مکروہ ترین راستہ اختیار کیا تھا جس کے نتیجے میں کوئٹہ کی سرزمین انسانی خون سے لالہ رنگ ہو گئی تھی۔

لیکن حال ہی میں کوئٹہ میں دو نسلی قومیتوں (ETHNIC GROUPS) یعنی پٹھانوں اور بلوچوں کے مابین جس خونریز تصادم کی صورت پیدا ہوئی جس کے باعث طویل عرصہ تک کرفیو نافذ رہا اُس نے بھی اسلام کے نام پر بننے والی دولتِ خداداد پاکستان کے مستقبل کے بارے میں شدید اندیشے پیدا کر دیئے ہیں اور گویا خطرے کی گھنٹی بجا دی ہے کہ پاکستان کی اصل اساس اور اُس کے قیام کی واحد وجہِ جواز یعنی 'اسلام' کے جانب کوئی حقیقی اور واقعی پیشقدمی نہ ہونے کے باعث ع "خانۂ خالی را دیو می گیرد" کے مصداق نسلی، لسانی اور صوبائی و علاقائی عصبیتوں کے جو بیج بوئے گئے تھے اب اُن کی فصل پک کر تیار ہو گئی ہے۔ اور اگر اس صورتِ حال میں کوئی فوری اور انقلابی قسم کی تبدیلی نہ آئی اور اسلام کے جانب فیصلہ کُن پیشقدمی نہ ہوئی تو کیا عجب کہ بمصداقِ الفاظِ قرآنی: وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ۝ (سورۂ شوریٰ آیت ۱۷، ترجمہ: اور تمہیں کیا معلوم شاید کہ وہ معیّن گھڑی قریب ہی آ چکی ہو!) اسلام سے روگردانی اور اللہ سے کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کی آخری سزا کا وقت آن ہی پہنچا ہو! فاعتبروا یا اولی الابصار!

سندھ

رہا صوبۂ سندھ تو اُس کا معاملہ راقم کے نزدیک دوسرے تمام صوبوں سے علیحدہ اور منفرد نوعیت کا حامل بھی ہے ——— اور اس کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ نازک اور پیچیدہ بھی ہے اور پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر اہم اور فیصلہ کُن بھی! ——— چنانچہ راقم کے اندازے کے مطابق آئندہ چند سال کے دوران میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کی قسمت اور اس کے ضمن میں "TO BE OR NOT TO BE!" کا فیصلہ سرزمینِ سندھ میں ہوگا بلکہ خود سندھ کی سعادت و شقاوت کا آخری فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ آیا برعظیم پاک و ہند کا یہ اوّلین 'باب الاسلام' جو پہلی صدی ہجری کے اواخر میں صنم خانۂ ہند میں توحیدِ ربّانی اور حریّت و اخوّت و مساواتِ انسانی

انقلاب آفرین پیغام کا 'مُدخل' (یعنی داخل ہونے کی جگہ) بنا تھا، پندھرویں صدی
ہجری کے آغاز میں اسلام کا 'مخرج' (نکلنے کی جگہ یعنی 'EXIT') بلکہ 'مدفن' بنتا ہے اور
اس طرح چودہ سو سال بعد راجہ داہر کی صلبی و معنوی اولاد ابو القاسم محمد رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحانی ذرّیت اور محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا نام
ادب واحترام اور فخر و امتنان کے ساتھ لینے والوں سے بھرپور انتقام لینے میں کامیاب
ہو جاتی ہے یا یہ قطعۂ ارضی جس کی آغوش میں نہ صرف یہ کہ بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ
عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ محوِ استراحت ہیں بلکہ عصرِ حاضر کے عظیم محقق و سکالر ڈاکٹر
حمید اللہ بالقابہ کی تحقیق کے مطابق جسے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدمبوسی کا شرف
حاصل ہوا تھا، اوّلاً پاکستان، پھر برِعظیم پاک و ہند اور بالآخر پورے عالم انسانی میں اسلام
کی نشاۃ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے نقطۂ آغاز کی صورت اختیار کرتا ہے! بفحوائے الفاظ
قرآنی: فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ (سورۃ قلم آیت ۵، ۶)
(ترجمہ: عنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون بھٹک گیا تھا)

بقول اقبال ؎

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا — گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا!

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اس وقت سندھ بحیثیت مجموعی نہایت
مایوس کن منظر پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ اندرونِ سندھ کی حد تک میرے وہ الفاظ جو میں نے
چار سال قبل ضیاء الحق صاحب کے نام خط میں تحریر کیے تھے کہ: "میرے اندازے میں
سندھ میں 'سندھو دیش' کے لیے میدان پورے طور پر بالکل اُسی طرح تیار ہو چکا ہے
جس طرح مشرقی پاکستان میں 'بنگلہ دیش' کے لیے ہوا تھا!" جنہیں اُس وقت مخالفوں
نے خللِ دماغی کا نتیجہ قرار دیا تھا اور دوستوں نے شدتِ احساس کا مظہر، آج ایک نوشتۂ
دیوار کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اس لیے کہ اِن چار سالوں کے دوران انگریزی زبان
کے محاورے کے مطابق بہت سا پانی دریائے سندھ میں بہہ چکا ہے، اور سندھی نیشنلزم

کا ننھا مُنا پودا ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا ہے! ——— اور بنگلہ دیش کے مقابلے میں اس سندھی نیشنلزم کا زیادہ تکلیف دہ اور اذیت بخش پہلو یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے زمینی اعتبار سے منقطع بلکہ منفصل تھا اور اس کی علیحدگی نسبتاً آسان تھی۔ لہٰذا وہاں صرف 'حقوق' کا نعرہ کافی تھا اور دین و مذہب کی جڑوں پر تیشہ چلانے کی زیادہ ضرورت نہ تھی لہٰذا وہاں کی علیحدگی کی تحریک میں الحاد وارتداد کا اثر و نفوذ اتنا نہ تھا جتنا موجودہ سندھی نیشلسٹ تحریک میں ہے۔ اور جی ایم سید اور اُن کے حواریوں کی ذہانت کو داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ابتداء ہی میں اندازہ کر لیا تھا کہ سندھ میں محض حقوق کا نعرہ مطلب براری کے لیے کافی نہ ہوگا اور پاکستان کو توڑنے اور سندھ کو "آزاد" کرانے کے لیے دین و مذہب کی جڑ کاٹنی ضروری ہے ——— اور آج اُن کی رُبع صدی سے زیادہ کی محنت و کوشش کا یہ نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ قدیم سندھیوں کی نوجوان نسل کا بہت بڑا حصہ نہ صرف یہ کہ مذہب سے برگشتہ ہو کر الحاد و مادیت کی گود میں چلا گیا ہے بلکہ سندھی نیشنلزم اور مارکس کے ڈایالیکٹیکل میٹیریلزم (DIALECTICAL MATERIALISM) کا علمبردار بن کر میدان عمل میں آگیا ہے! اور نوبت بایں جارسید کہ اب اندرونِ سندھ نوجوانوں کی محفلوں اور مجلسوں میں پاکستان یا اسلام کا نام لینا بھی 'لانا ہے جوئے شیر کا!' کا مصداق بن چکا ہے! چنانچہ ۹ نومبر ۸۶ء کے اخبارات میں آنسہ بے نظیر بھٹو کے انٹرویو پر جو شہ سُرخی لگی ہے' یعنی "احساس محرومی کی وجہ سے سندھ علیحدگی پسندوں کے ہاتھوں کھلونا بن گیا ہے!" اور پھر متن میں جو الفاظ نقل ہوتے ہیں یعنی: "سندھ کی صورتِ حال انتہائی سنگین ہے!" اور "اب جو بھی فیڈریشن کی بات کرتا ہے اسے پنجابی ایجنٹ کہا جاتا ہے!" اُن سے سندھ کی صورتِ حال کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے (واضح رہے کہ مس بھٹو خود سیکولر سیاست کی علمبردار ہیں لہٰذا اُن کی ساری سوچ 'احساسِ محرومی' اور 'فیڈریشن' ہی کے گرد گھومتی ہے اور مذہب سے بُعد اور دین سے انحراف کے ضمن میں کسی فکر یا تشویش کی اُن سے توقع نہیں کی جا سکتی!)

اندرونِ سندھ کی اِس کیفیت کا چونکہ راقم الحروف کو کئی سال سے پوری شدت

ے ساتھ ادراک و شعور حاصل تھا لہٰذا ع "رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج" کے
ہ ق اس کا صدمہ راقم کے وجود کی رگ و پے میں سرایت کیے ہونے کے باوجود شعور
ہے پر نمایاں نہ رہا تھا ——— کہ تشدّ دم لیا تھا قیامت نے ہنوز۔ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا!
ے مصداق راقم کے قلب و ذہن اور احساس و شعور پر ایک بم گرنے کی سی کیفیت پیدا
ں کراچی اور حیدر آباد میں واقع ہونے والے پٹھان مہاجر تصادم سے جس میں وحشت
یت اور سفاکی و سنگدلی کی ایسی ایسی مثالیں سامنے آئیں کہ نہ صرف پندرہ سال قبل
ے شرقی پاکستان کے زخم ہرے ہو گئے بلکہ ع ۱۹۴۷ء کی یادیں تازہ ہو گئیں! چنانچہ راقم
تعی احساس یہ ہے کہ بالکل ایسے جیسے سقوطِ مشرقی پاکستان کے حادثۂ فاجعہ کے
بھارتی اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ: "ہم نے دو قومی نظریے کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا
ے اسی طرح اگر پاکستان کا کوئی دشمن اور بدخواہ اُن واقعات کو جو عروس البلاد کراچی میں
نومبر ۸۶ء کے آخری اور نومبر کے ابتدائی ایام میں پیش آئے 'نظریۂ پاکستان' کے کفن کی
ری میخ' سے تعبیر کرے تو 'خاکم بدہن'، ع "آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!" کے
صداق اُسے اس کا حق حاصل ہوگا۔ اس لیے کہ اس سے قطع نظر کہ یہاں بھی تصادم ایک
سی ور ایک لسانی قومیت کے مابین ہوا اور نسلی اور لسانی عصبیتیں اصلاً وحدتِ ملی کے
نی اور نظریۂ پاکستان کی ضد ہیں، اس معاملے کا انتہائی اذیت بخش اور تکلیف دہ اور حد
یہ مایوس کن پہلو جس کی بنا پر اسے 'نظریۂ پاکستان' کے کفن کی آخری میخ قرار دیا جا سکتا
نہ یہ ہے کہ یہاں وہ لوگ ایک 'لسانی قومیت' کی شکل میں سامنے آئے، یا لائے گئے،
و حبّ ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی؛ پر عمل پیرا ہو کر محض اسلام کے نام پر ہندوستان کے
انے کونے سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ اور جنہوں نے رنگ و نسل، شکل و صورت،
نسبِ وطن اور تہذیب و ثقافت کے جملہ امتیازات کو نظر انداز کر کے اُس ملک کا رُخ کیا
تھا جو اسلام کے نام پر وجود میں آ رہا تھا! اور اُن علاقوں کو خیر باد کہہ دیا تھا جن میں وہ
پشت ہا پشت سے آباد تھے، جہاں اُن کے جدی و پشتی مکان اور آباؤ اجداد کی قبریں
تھیں اور جہاں کی گلی کوچوں سے اُن کے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں! ———

غور کا مقام ہے کہ اگر یہ لوگ بھی قیامِ پاکستان کے چالیس سال بعد حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا کسی ردِ عمل کا شکار ہو کر یہ مطالبہ کرنے لگیں کہ اُن کے جداگانہ تشخص کو تسلیم کر کے انہیں پاکستان کی پانچویں قومیت کا درجہ دے دیا جائے تو کیا یہ مریض کی آخری ہچکی کے مترادف نہیں ہے؟ اور کیا ' نظریہ پاکستان ' کی نفی کی کوئی اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور مایوس کن صورت ممکن ہے! ——— بقول غالب ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے! کیا خوب قیامت کا بھی ہو گا کوئی دن اور!

الغرض! پاکستان کے چاروں صوبوں کے حالات اس وقت سخت ناگفتہ بہ ہیں۔ بظاہر احوال " کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کوئی امید بر نہیں آتی! " کے مصداق بچاؤ کی کوئی صورت اور امید کی کوئی کرن کسی جانب سے نظر نہیں آتی اور جسے کبھی " ملتِ اسلامیہ پاکستان " کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا آج ع " یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری " کی تصویر نظر آ رہی ہے۔ اس تناظر میں کشمیر اور راجستھان میں بھارتی افواج کی نقل و حرکت اُن مردار خور پرندوں کا نقشہ پیش کر رہی ہے جو کسی قریب المرگ حیوان یا انسان کے آس پاس اُس کی موت کے انتظار میں منڈلانا شروع کر دیتے ہیں!

لیکن ——— بفحوائے الفاظِ قرآنی: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (سورۂ زمر آیت ۵۳ ترجمہ: اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو!) اور " وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ " (سورۂ حجر آیت ۵۶ ترجمہ: اور اپنے رب کی رحمت سے سوائے گمراہ لوگوں کے اور کون مایوس ہو سکتا ہے!) اور " وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ " (سورۂ یوسف آیت ۸۷ ترجمہ: اللہ کے لطف و کرم سے ناامید نہ ہو اس لیے کہ اللہ کے لطف و کرم سے سوائے کافروں کے کوئی اور ناامید نہیں ہوتا!) ——— اور بقول اقبال ؎

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں!

ہمیں یہی ہدایت ہوتی ہے کہ مایوس اور ناامید نہ ہوں۔ اور حالات خواہ بظاہر کتنے

ہی نامساعد و ناموافق نظر آئیں اور خواہ مایوسی کے اندھیارے ہر سُو چھا گئے ہوں اور
مید کی کوئی کرن کسی جانب دکھائی نہ دے رہی ہو اور بچ نکلنے کی کوئی راہ کسی طرف
ظر نہ آ رہی ہو، ہمیں حکم یہی ہے کہ مایوس اور بددل ہو کر سعی و جہد سے کنارہ کش نہ ہوں
بلکہ اللہ کے فضل و کرم کی امید ــــــ اور اُس کی تائید و توفیق کے بھروسے پر زندگی کے
خری سانس تک اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اُس کے دین کی اقامت کے لیے تن من
دھن لگاتے چلے جائیں خواہ یہ انگریزی محاورے کے مطابق "HOPING AGAINST
HOPE" ہی قرار پائے۔ گویا بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں مجھے ہے حکم اذاں، لا الٰہ الا اللہ!

تاکہ اگر ان مساعی کا کوئی ظاہری نتیجہ برآمد نہ ہو تب بھی کم از کم "معذرۃ الیٰ ربکم"
کی صورت تو بن ہی جائے ــــــ اور کیا عجب کہ کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو ہی جائے
اور "ولعلھم یتقون" کی کوئی صورت بھی بن ہی جائے! (سورۃ اعراف آیت
۱۶۴ ترجمہ: "اور یاد کرو جب اُن کی قوم کے ایک گروہ نے کہا تھا کہ ایسی قوم کو وعظ و نصیحت
میں وقت و قوت ضائع کیوں کر رہے ہو جسے اللہ تعالیٰ (قطعی طور پر) ہلاک کرنے رہے
یا کوئی شدید عذاب دینے والا ہے؟" تو انہوں نے جواب دیا تھا: "تاکہ ہم رب کے
حضور میں عذر تو پیش کر سکیں! ــــــ اور کیا عجب کہ یہ لوگ تقویٰ کی روش اختیار
کر ہی لیں!")

اور اگرچہ ان سطور کے راقم کو اس سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ ارضِ پاکستان سے
اُس کی دلچسپی دنیوی اور مادی بنیاد پر بھی ہے، اس لیے کہ گو اس ملک کے پورے طول و
عرض میں صرف ایک مکان کے سوا اس کی نہ کوئی زمین ہے نہ جائداد، اور نہ کوئی سرمایہ ہے
نہ کاروبار، تاہم اس کے اہل و عیال بھی یہیں ہیں اور اعزہ و اقارب بھی ــــــ لیکن اس
ارضِ پاک سے اُس کی اصل دلچسپی اس اعتبار سے ہے کہ یہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ اور
دینِ حق کی عالمی سربلندی کا نقطۂ آغاز بنے بقول جناب نعیم صدیقی ؎ "اے اندھیرو سنبھل کے
چلو، اس دیار میں سا امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم!" اور خدا گواہ ہے کہ تیرہ چودہ برس

کی عمر سے جب اُس نے نیم شعوری دَور میں تحریک پاکستان میں حصّہ لیا تھا، ۶۵ برس کی عمر تک اس کی زندگی کے چالیس سالوں کے دوران بحمد للہ اس کا سینہ "آرزو" سے آباد رہا ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں — اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

اور آج بھی اگرچہ خارجی حالات "HOPING AGAINST HOPE" کا نقشہ پیش کر رہے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ اس کے نہاں خانۂ قلب کی کیفیت یہی ہے کہ ؎

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار — ہر زماں پیش نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار!

لہٰذا —— پاکستان کے 'عدم استحکام' کی تکرار اور پاکستان کے موجودہ حالات کی بھیانک تصویر کشی کا مقصد سنسنی خیزی ہے نہ یاس و نومیدی کی تخم ریزی' بلکہ مقصود یہ ہے کہ ملک و وطن اور دین و مذہب کے مخلصوں اور بہی خواہوں کی غیرت اور حمیت کو جگایا جائے اور انہیں بہ "معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ حرم خیز!" کے انداز میں از سرِ نو کمر ہمت کس کر ملک و ملت کی تعمیر نو کی جدوجہد پر آمادہ کیا جائے —— اور اس کے لیے لازم ہے کہ صورت حال کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے، حقائق کا ہمت کے ساتھ مواجہہ کیا جائے اور پھر مرض کی ظاہری علامات اور ثانوی پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہونے اور بعض فوری تکالیف اور شکایات کو رفع کرنے کے ساتھ ساتھ اصل توجہ کو بنیادی خرابی کی تشخیص اور اصل مرض کے ازالے پر مرکوز کر دیا جائے۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللہ

ٹیلی ویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ (درس ۱۱)

مباحث عمل صالح

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

(سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

(۲)

السلام علیکم ۔ نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم ۔ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝

صدق اللہ العظیم

- اور رحمان کے محبوب بندے تو وہ ہیں جو زمین پر تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے الجھنا چاہتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر ان سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

اور جو راتیں بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بستہ کھڑے رہ کر۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ اے رب ہمارے، ہم سے جہنم کے عذاب کو پھیر دے۔ یقیناً اس کا عذاب چمٹ جانے والی چیز ہے۔ یقیناً وہ (جہنم) بہت ہی بُری جگہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی اور عارضی قیام گاہ ہونے کے اعتبار سے بھی۔ اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں نہ بُخل سے۔ اور ہے (ان کے لیے) اس کے درمیان ایک سیدھا راستہ، معتدل راستہ۔"

محترم ناظرین و معزز سامعین! ابھی میں نے سورہ فرقان کے آخری رکوع کی پہلی آیات (از نمبر ۶۳ تا ۶۷) تلاوت کیں اور ان کا ایک رواں ترجمہ بھی آپ کے سامنے ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کے اوصاف بیان فرما رہا ہے جو اُسے بہت پسند اور محبوب ہیں۔ چنانچہ گفتگو کی جو ابتداء ہوئی ہے وہ عِبَادُ الرَّحمٰن کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے 'الرحمٰن' نہایت پیارا نام ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ رحمت سے مشتق ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ بندوں کو جس چیز کی زیادہ احتیاج ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اگرچہ رحمت سے اللہ تعالیٰ کا ایک نام اور بھی بنتا ہے اور وہ ہے الرحیم۔ لیکن 'الرحیم' میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی شان ایک مستقل اور دائم حقیقت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ جبکہ 'الرحمٰن' میں اللہ تعالیٰ کی جو شان سامنے آتی ہے وہ ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے، جس میں جوش و خروش ہو، جس میں ہیجان ہو۔ یہ لفظ ہیجان بھی فعلان کے وزن پر عربی ہی کا لفظ ہے۔ اسی وزن پر عربی زبان میں متعدد الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً عطشان، انتہائی پیاسا جس کی پیاس سے جان نکلی جا رہی ہو۔ جُوعان، نہایت بھوکا جو بھوک سے مر رہا ہو۔ غضبان، نہایت غضبناک۔ طغیان، حد سے باہر نکل جانے والا۔ چنانچہ جب دریاؤں کا پانی سیلاب کی وجہ سے حدود سے تجاوز کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ طغیانی آگئی۔ تو اللہ تعالیٰ کا یہ نام نامی، یہ اسم گرامی 'الرحمٰن' بہت ہی پیارا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح سامنے آتی ہے۔

پھر "عباد الرحمٰن" کے فرمانے میں بھی ایک محبت کا انداز، شفقت و عنایت
[illegible] انداز ہے یعنی اللہ کے محبوب بندے، اللہ کے پسندیدہ بندے وہ ہیں جن میں وہ اوصاف
[illegible] پائے جاتے ہوں جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔
ان اوصاف میں سے پہلا وصف آیا: اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ
[illegible] "وہ لوگ جو زمین پر چلتے ہیں آہستگی سے نرمی سے"۔ ان کی چال سے تواضع
[illegible] ہوتی ہے۔ یہ بات جان لیجئے کہ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ Face is the Index of the [illegible] آپ کسی انسان کے چہرے کو دیکھ کر اس کے باطنی احساسات و
[illegible] جذبات کا اندازہ کر سکتے ہیں ـــ اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ انسان کی چال سے ظاہر ہوتا
[illegible] ہے کہ اس میں غرور ہے، یہ کسی فخر میں مبتلا ہے، یہ گھمنڈی ہے۔ اکڑ کر چلے گا، اس کی
[illegible] چال بتائے گی کہ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے! یا پھر اس کی چال سے یہ ظاہر ہوگا کہ اس
[illegible] میں عجز ہے، تواضع ہے، فروتنی ہے، انکساری اور خاکساری ہے ـــ تو یہ ہے پہلا
[illegible] وصف ـــ اس لئے کہ بندہ اگر اس حقیقت کو پہچان لے کہ میں بندہ ہوں، آقا نہیں
[illegible] ہوں۔ آقا تو صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے ـــ باقی بڑے سے بڑا انسان بھی بندہ ہے
[illegible] عبدیت ہی درحقیقت ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ آپ نوٹ کریں گے کہ قرآن مجید
[illegible] میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی عنایت کے ساتھ خطاب
[illegible] فرمایا ہے یا آپؐ کا ذکر فرمایا ہے۔ جہاں خصوصی محبت و شفقت اور التفات کا اظہار
[illegible] ہوتا ہے، وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت کو نمایاں کیا جاتا ہے ـــ جیسے:
سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ
[illegible] الْاَقْصَا ـ اور جیسے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ ـ
[illegible] اور جیسے: تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ
[illegible] نَذِیْرًا ۝ دیکھئے کس قدر لطیف ربط ہمارے سامنے آیا۔ یہ پہلی آیت ہے اس سورہ
مبارکہ کی جس کے آخری رکوع کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سورہ مبارکہ کے
[illegible] رکوع کا تَبَارَكَ الَّذِیْ کے الفاظ سے آغاز ہوتا ہے۔ آغاز میں فرمایا:
تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ "بڑی بابرکت بلند مرتبت ہے
[illegible] وہ ذات جس نے اپنے بندے (صلی اللہ علیہ وسلم) پر الفرقان یعنی قرآن مجید نازل فرمایا۔"

تو یہ عبدیت درحقیقت معراجِ انسانیت ہے لہٰذا یہاں عِبادُ الرحمٰن کے لفظ میں بڑی شفقت، محبت، عنایت اور التفات کے پہلو مضمر ہیں۔ مراد ہے وہ لوگ جو واقعی اللہ کے بندے ہیں اُن کی چال ڈھال سے نمایاں ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بندہ ہی سمجھتے ہیں آقا نہیں سمجھتے۔ یہ اپنے آپ کو مملوک سمجھتے ہیں اور اپنے مالک اپنے آقا کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ ان کی چال گواہی دیتی ہے کہ فخر و غرور کے بجائے ان میں عجز و فروتنی کے احساسات و جذبات جاگزیں ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے اس منتخب نصاب کا جو تیسرا درس سورہ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل تھا، اس کے بھی آخر میں اسی وصف پر زور دیا گیا تھا: وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۔ حضرت لقمان اپنے بچے کو نصیحت کرتے ہیں کہ اے میرے بچے! اپنے گال لوگوں کے لیے پھلا کر نہ رکھ اور زمین پر اکڑ کر مت چل۔ بے شک اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں شیخی خورے اور اترانے اور غرور و گھمنڈ سے کام لینے والے۔ تو یہاں نقطۂ آغاز وہ وصف ہے جہاں سورہ لقمان کے درس کے مضامین کی تقریباً انتہا ہوئی تھی۔

اس آیت میں دوسرا وصف بیان ہوا ہے: وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۔ یہ بھی درحقیقت انسان کی شخصیت کی پختگی اور MATURITY کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔ بعض لوگ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر لوگوں سے بیکار کی بحث و تمحیص میں الجھ جاتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی بحث و مباحثہ کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ایک MATURE انسان کا لازمی وصف یہ ہوگا کہ وہ اندازہ کرے کہ اس کا مخاطب اس وقت بات سمجھنے کی موڈ (MOOD) میں ہے یا محض بحث و نزاع پر تُلا ہوا ہے اور اگر وہ یہ محسوس کرے کہ یہ شخص اس وقت افہام و تفہیم کی موڈ میں نہیں ہے، یہ میری بات کو سنجیدگی سے نہیں سن رہا۔ یہ ضد اور عناد میں مبتلا ہو چکا ہے اس وقت ہٹ دھرمی اس پر مسلط ہو چکی ہے، یہ خواہ مخواہ مجھ سے الجھ رہا ہے بات کو سمجھنا اس کے پیشِ نظر سرے سے ہے ہی نہیں۔ تو بڑی خوبصورتی سے سلام کر کے اس سے علیحدہ ہو جائے۔ بعض جوشیلے قسم کے مبلغین ایسے موقع پر تلخی پر اتر آتے

ہیں تلخ کلامی اختیار کر لیتے ہیں یا علیحدہ بھی ہوتے ہیں تو اس طور سے گویا لٹھ مار کر علیحدہ ہو رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر دوبارہ گفتگو کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اگر آپ خوبصورتی کے ساتھ علیحدگی اختیار کریں تو موقع رہے گا کہ آپ آئندہ کسی مناسب وقت پر جب یہ محسوس کریں کہ یہ شخص سمجھنے سمجھانے کے موڈ میں ہے تو اس کے سامنے آپ دوبارہ اپنی بات رکھنے کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں۔ آپ نے نوٹ فرمایا ہوگا یہ دونوں چیزیں بڑی ہی پختہ اور MATURE شخصیت کے نمایاں اوصاف میں سے ہیں۔ جن سے یہاں گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ اب یہاں ایک فوری تقابل اور ضد SIMULTANEOUS CONTRAST آپ کے سامنے رہے۔ ہمارے سابقہ درس میں نماز کا ذکر آیا اور بار بار آیا: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ اور پھر ان اوصاف کا اختتام ہوا ان الفاظ مبارکہ پر: وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ابتدا بھی صلوٰۃ کے ذکر سے اور اختتام بھی صلوٰۃ کے ذکر پر۔ پہلے صلوٰۃ میں خشوع کا ذکر ہے جو اس کی باطنی روح ہے اور آخر میں صلوٰۃ کی محافظت، صلوٰۃ کی مداومت کا ذکر ہے۔ لیکن نوٹ کیجئے کہ یہاں رات کی نماز کا ذکر ہے۔ یہ نماز تہجد ہے۔ اس لیے کہ ایک مسلمان میں جو بنیادی اوصاف درکار ہیں کہ جن سے تعمیر سیرت کا وہ پروگرام وجود میں آتا ہے جو قرآن مجید دیتا ہے۔ اس کی ابتدا و انتہا ہے اقامت الصلوٰۃ، نماز پنجگانہ جو فرض ہے اس کو قائم کرنا، اس کی پابندی کرنا، اس کے تمام آداب اور جملہ شرائط کے ساتھ اس کی ادائیگی کا اہتمام کرنا۔ لیکن یہاں بات بالکل دوسری ہے یہاں تو اس سطح کی گفتگو ہو رہی ہے کہ جہاں ایک انسان اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام اور درجہ حاصل کر لے۔ یہاں جس نماز کا ذکر ہے، وہ رات کی تنہائی کی نماز ہے: وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا یعنی ان کی راتوں کا نقشہ ان لوگوں کی راتوں کی کیفیت سے بالکل مختلف ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں جو پوری رات پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ ان کو اس غفلت کا احساس تک نہ ہوگا، چونکہ ان کے دل میں کوئی لگن نہیں ہے۔ ان کے دل میں اللہ کی محبت کا جذبہ نہیں ہے۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں اللہ

تعالیٰ کی محبت گھر کر چکی ہو ان کو ان کا وہ جذبہ محبت رات کے وقت سونے نہیں دیتا۔ وہ رات کو بار بار اٹھتے ہیں، اپنے رب کے حضور دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں، اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کی کیفیات کے متعلق ہمیں روایات میں یہ نقشہ ملتا ہے کہ آپؐ راتوں کو بار بار اٹھتے، چونکہ چونک کر اٹھتے تھے اور آپؐ اپنے رب کے سامنے نماز میں دست بستہ کھڑے ہوتے تھے، سجدہ ریز ہوتے تھے۔ درحقیقت جو کمیل اوصاف ہیں، ان میں یہ رات کی نماز تہجد، قیام اللیل عظیم ترین اہمیت کی حامل ہے — اور جو اساسی و بنیادی اوصاف تھے، اس میں سب سے زیادہ اہم وصف ہے اقامت الصلوٰۃ، پنج وقتہ فرض نماز کی پابندی — ظاہر بات ہے کہ جو لوگ رات کے وقت کی اس نماز کی پابندی کر رہے ہوں، کیسے ممکن ہے کہ فرض نمازوں کا جو نظام ہے اس میں وہ کسی درجے میں بھی کوتاہی یا غفلت سے کام لیں — !!

اس کے بعد فرمایا کہ اپنے رب کے سامنے اس قیام اللیل کے نتیجہ میں جو دعا ان کے دل سے نکل کر زبان پر آتی ہے وہ یہ ہے کہ "اے رب ہمارے! ہمیں جہنم کی سزا سے بچا، اس کو ہم سے دور کر دے" اس میں درحقیقت اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جہاں مخلوق کے سامنے ان کی روش تواضع اور فروتنی کی ہوتی ہے، وہاں وہ اپنے رب کے سامنے بھی نہایت عاجزی کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ انہیں اپنی نیکی پر کوئی فخر یا غرور نہیں ہوتا۔ وہ کسی زعم یا گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ ان کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ نہ معلوم ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو رہے ہیں یا نہیں ہو رہے ہیں! لہٰذا ان پر ایک لرزہ طاری رہتا ہے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورہ نور کے پانچویں رکوع کی آیات میں آ چکا ہے کہ وہ لوگ لرزاں و ترساں رہتے ہیں، خائف رہتے ہیں اپنے رب کے عذاب سے — چنانچہ ہم کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں یہ پڑھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک عجیب کیفیت کے عالم میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش! میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا جو جلا دیا جاتا ہے اور اس سے کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا کاش! میں درختوں پر چہچہانے والی ایک چڑیا ہوتا جو چہچہاتی ہے پھر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے کوئی محاسبہ نہیں ہوتا — حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے

میں آتا ہے کہ ویسے آپؓ کا جسم بہت گٹھا ہوا اور بڑا مضبوط تھا لیکن جب آپ رضؓ
نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو جسم خشیتِ الٰہی سے نہایت نرم پڑ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ
آپؓ کے جسم میں ایک تیر پیوستہ ہوگیا جو نکالے نکل نہیں رہا تھا۔ آپ رضؓ نے فرمایا
مجھے نماز کی نیت باندھ لینے دو، اس حالت میں تیر نکال لینا۔ یہ ہے وہ کیفیت؛
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ
عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ہ یہ جہنم کا عذاب تو چمٹ جانے والی چیز ہے، یہ
عذاب تو جان کو لاگو ہو جانے والا ہے، اس سے انسان کو چھٹکارا نہیں ملے گا۔ آگے
جہنم کے بارے میں الفاظ آئے ہیں، " وہ مستقر بھی بہت بُرا ہے اور مقام بھی۔"
عربی زبان میں مستقر کہتے ہیں جائے قرار کو۔ جہاں انسان کا مستقل ٹھکانا ہو۔
اردو میں بھی مستقر اسی معنی میں مستعمل ہے۔ اور مقام کے معنی ہیں قیام کی جگہ۔
جہاں بھی تھوڑی دیر کے لئے انسان رکتا ہے وہ اس کا مقام ہے۔ تو ان الفاظ کے ذریعہ سے
تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ جہنم اتنی بُری جگہ ہے کہ اگر کسی کی مستقل جائے قرار بن جائے تو
اس کی بربادی، رسوائی، ہلاکت کا ذکر ہی کیا ہے! یہ تو اتنی بُری جگہ ہے کہ اس میں اگر
تھوڑی دیر کے لیے بھی قیام ہو تو یہ اپنی تمام ہولناکیاں اور سختیاں پورے طور پر ظاہر
کر دے گی۔ عام طور پر ہمارا یہ تصور ہے کہ کسی اچھی سے اچھی جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا
پڑے تو اس میں دلچسپی نہ رہے گی، رعنائی نہ رہے گی۔ انسان اُکتا جائے گا۔ اور بُری
سی بُری جگہ بھی انسان اگر تھوڑی دیر کے لیے جائے تو یہ تبدیلی اس کیلئے تفریح کا ذریعہ
بن جائے گی۔ لیکن یہاں آپ الفاظ دیکھیں گے۔ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ
مُقَامًا ہ۔ اور اسی رکوع کے آخر میں آپ دیکھیں گے کہ جنت کے بارے میں آئے
گا، حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ہ یہ بھی ایک فوری تقابل کے لیے ہے کہ جنت
اتنی اچھی جگہ ہے کہ انسان اس میں ہمیشہ کے لیے رہے گا تب بھی اس جنت کی
رعنائیوں، دلآویزیوں، لطافتوں، دلچسپیوں میں اُسے کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی، انسان
اُکتائے گا نہیں اور جہنم اتنی بُری جگہ ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اگر کسی کو اس میں
داخل کر دیا جائے تو وہ اپنی ساری شدتیں، اپنی ساری غلظتیں، اپنی ساری کلفتیں
آنِ واحد میں ظاہر کر دے گی۔

اِس کے بعد فرمایا: وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو میانہ روی اختیار کرتے ہیں۔ یہ بھی شخصیت کی پختگی اور بالغ نظری کی علامت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اگر ایک وقت ہاتھ کشادہ ہے تو اللوں تللوں میں انسان پیسہ اُڑا دے۔ اور اگر کسی وقت تنگی ہوگئی ہو تو انسان بالکل بجھ کر رہ جائے۔ اور نہ ایسا ہو کہ جہاں خرچ کرنا لازمی و ضروری ہو وہاں وہ رُک جائے، یہ بخیلی ہے۔ ان تین رویوں کے بجائے ایک بین بین اور معتدل روش اختیار کرنا ایک اعلیٰ و ارفع وصف ہے۔ لہٰذا فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا "وہ لوگ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں" وَلَمْ يَقْتُرُوْا "اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں" بلکہ: وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا "اُن کا طرزِ عمل ان کا موقف اس کے بین بین ہوتا ہے۔"

یہ بات بھی سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے آخر میں آئی تھی: وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ "اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو" یہاں چال ڈھال میں بھی اعتدال ہے اور خرچ میں بھی۔ یہ وہی وصف ہے جو یہاں ایک دوسرے اسلوب سے بیان ہوا۔

آج کی نشست میں اسی پر اکتفا کیجئے۔ اب اس موضوع پر جو کچھ آج بیان ہوا ہے، اس کے ضمن میں کوئی سوال ہو یا کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! قیامت میں جہنم کی سزا کی حقیقت کو جان لینے کے باوجود مسلمان برائیوں کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟

جواب: بہت عمدہ سوال ہے۔ اصل میں جہنم اور جنت دونوں کا تعلق عالمِ غیب سے ہے۔ اگر یہ ہماری ان ظاہری نگاہوں کے سامنے ہوتیں تو کوئی انسان بھی کوئی بُرا کام نہ کرتا اور تمام لوگ نہایت متقی ہو جاتے۔ لیکن چونکہ یہ عالمِ غیب کی حقیقت ہے جو ہمیں پیغمبروں کے ذریعے سے معلوم ہوئی ہے تو اصل مسئلہ ان پر یقین کا ہے۔ اگر جنت اور دوزخ کی حقیقت پر دلی یقین والا ایمان حاصل اور راسخ ہو جائے تو یقیناً انسان بُرائیوں سے اجتناب کرے گا اور بھلائیاں اختیار کرے گا۔ ہمارا اصل مرض یہ ہے کہ ہم عقیدے کے طور پر اپنے والدین سے وراثتاً جو چیزیں ہم تک منتقل ہوگئی

...نہیں ہم ماننے کی حد تک تو مانتے ہیں لیکن اس دور کے جو اثرات ہیں، غلط
...یم کے جو نتائج ہیں، غلط اور ملحدانہ نظریات کا ذہنوں پر جو شعوری یا غیر شعوری طور
...سلط ہے، ان وجوہ سے دلی یقین والی جو کیفیت ہے وہ ہمیں میسر نہیں۔
...ماشاء اللہ۔ علامہ اقبال مرحوم نے اسی لیے کہا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو دلی یقین والا ایمان عطا فرمائے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا یہ ممکن ہے کہ ہم طبعی اسباب و علل کی اس دنیا میں رہتے ہوئے دوزخ اور جنت کے تصور کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

جواب: جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ عالم غیب کے حقائق ہیں لہٰذا ہم اس ...نیا کی چیزوں کو جس طور پر دیکھ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں، اس طور سے ہم اُس عالم کی ...باتوں کو نہیں دیکھ اور سمجھ سکتے۔ البتہ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دی ہوئی علامات اور خبروں کی بنیاد پر ایک اجمالی علم اور یقین ہمیں بھی حاصل ہو سکتا ہے اور یہ یقین صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بتمام و کمال پیدا ہوا، اسی لیے ان کی زندگیوں میں عظیم انقلاب آگیا۔ ویسے قرآن مجید اور احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں عالم آخرت کے احوال سے متعلق جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ محض تصوراتی باتیں نہیں ہیں بلکہ پردۂ غیب میں مستور حقائق ہیں۔ اگر قرآن مجید اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر دلی یقین والا ایمان حاصل ہو جائے تو عالم غیب کے احوال ایک بندۂ مومن کے لیے بھی تصور نہیں بلکہ حقیقت بن جاتے ہیں۔ سورۃ قیامہ کے درس کے دوران میں قدرے تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ جزا و سزائے اُخروی کا تقاضا خود انسان کی فطرت میں مضمر ہے۔ اس پر غلط ماحول، غلط تعلیم و تربیت سے غفلت کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ نبی اور رسول تشریف لا کر اللہ تعالیٰ کے کلام اور اپنی تعلیمات سے غفلت کے ان پردوں کو چاک کرتے ہیں اور بدیہیاتِ فطرت کو اجاگر فرما دیتے ہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! اس دور میں لوگ اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے بہت زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ اس بارے میں قرآن مجید کی تعلیم کیا ہے؟

جواب : قرآن مجید ضرورت سے زائد خرچ کرنے کو اسراف سے تعبیر کرتا ہے۔
ایک بیماری اس سے آگے کی بھی ہے۔ وہ ہے نمائش اور نام و نمود کے لیے خرچ۔
اس کو قرآن مجید "تبذیر" کہتا ہے۔ اس کا ذکر ہمارے آئندہ کے ایک درس میں آ
والا ہے۔ جہاں فرمایا گیا : اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ
وہ لوگ جو نمائش اور نام و نمود کے لیے الٹوں تلکوں میں دولت کو اڑانے والے ہیں
وہ شیطان کے بھائی ہیں ـــ قرآن مجید ان کی اتنی شدید مذمت کرتا ہے کہ انہیں
شیطانوں کا بھائی قرار دیتا ہے۔ اس سے تبذیر کی شناعت اور اس کے
بدترین گناہ ہونے کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرات! آج کی اس نشست میں ہم نے چند ایسے اوصاف کا مطالعہ کیا جو
رحمان کو جو ہمارا رب، ہمارا پروردگار، ہمارا پالن ہار ہے، نہایت پسند ہیں۔ ہماری
دعا اور شعوری کوشش ہونی چاہیے کہ یہ اوصاف ہمارے اندر پیدا ہوں۔ ہمیں
قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا اور سننا اور سنانا اس نیت کے ساتھ کرنا چاہیے کہ قرآن
مجید جن بھلائیوں کی ترغیب دلاتا ہے ہم اپنی امکانی سعی کریں کہ وہ بھلائیاں ہمارے اندر
پیدا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

تذکرہ مکرّر

کَلَّا اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ

[۱۹۶۲ء میں انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام منعقدہ تربیت گاہ کے موقع پر مولانا امین احسن اصلاحی کا نہایت مؤثر افتتاحی خطاب]

خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا:

بھائیو! میں سب سے پہلے اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس اجتماع میں برکت دینے کے لیے نہیں لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میری حاضری کا ایک مقصد یہ ہے کہ میں اپنے مخدوم اور محترم دوست مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے درس سے کچھ برکت حاصل کروں۔ 'برکت حاصل کرنا' میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ میں اب استفادہ کے قابل تو رہا نہیں صرف برکت ہی حاصل کر سکتا ہوں۔ مولانا سے مجھے صرف محبت ہی نہیں ہے بلکہ بلا شائبہ تکلف عرض کرتا ہوں کہ مجھے ان سے عقیدت بھی ہے۔ درآنحالیکہ عقیدت کے معاملے میں مَیں بہت فیاض آدمی نہیں ہوں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مجھے ان سے محبت ہی نہیں بلکہ عقیدت بھی ہے اور میں آپ لوگوں کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان کے درس سے اور ان کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

میری حاضری کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ آپ کی صحبت اور آپ کی معیت کا تھوڑا بہت ثواب میں بھی حاصل کر لوں۔ اس زمانہ میں ایسے انسانوں کی تو کمی نہیں ہے جو ارسطو کی تعریف کے مطابق 'انسان' ہیں اس لیے کہ بہرحال وہ 'حیوانِ ناطق' ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بس حیوانِ ناطق ہی ہیں۔ قرآن کی تعریف کے مطابق وہ انسان نہیں ہیں اس لیے کہ وہ بصیرت اور بصارت دونوں سے محروم ہیں۔ فی زمانہ ایسے انسان بہت ہی تھوڑے ہیں جو اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے جدوجہد کریں۔ اس کے لیے گھر سے نکلیں' اس کے لیے تکلیفیں اٹھائیں' اس کے لیے ان کے اندر ذوق شوق ہو۔ میں آپ لوگوں کو انہی میں

شمار کرتا ہوں جو ایک نہایت ہی محبوب اور عظیم مقصد کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ارادے میں خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ کو زیادہ سے زیادہ مستفید و مستفیض ہونے کا موقع دے۔

حضرات! میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں شرکت کے ذریعے برکت حاصل کروں۔ لیکن میرے عزیز بھائی شیخ سلطان احمد صاحب اور برادر عزیز ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مجھے یہ خواہش بھی معلوم ہوئی کہ میں آپ کے سامنے تقریر بھی کروں، تو میں نے ان کی خواہش کی تعمیل ضروری سمجھی، لیکن میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی نوعیت ہرگز تقریر کی نہیں ہو گی بلکہ چند نہایت ہی واضح اور بدیہی حقیقتوں کی "تذکیر" ہی کی ہو گی یعنی صرف یاد دہانی۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض حقیقتیں اپنی جگہ انتہائی واضح ہوتی ہیں لیکن شاید اپنی شدت وضاحت ہی کی وجہ سے بہت مجہول ہو جاتی ہیں لہٰذا ان کی وقتاً فوقتاً تذکیر ہوتی رہنی چاہیے۔ میری اپنی زندگی کی رہنمائی میں ان حقائق نے بہت مدد دی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ کو بھی ان کی یاد دہانی کرادوں تاکہ آپ حضرات بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا ہے اور ضرور ہے اور خدا کے ماننے پر ہر انسان مجبور ہے۔ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ میں اس معاملہ میں اپنا یہ ذاتی احساس عرض کر دیتا ہوں کہ جب اوّل اوّل مجھے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ خدا ہے اور ضرور ہے نیز یہ کہ انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اس سے مفر نہیں ہے تو اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ اس "ماننے" سے بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی میں ان ذمہ داریوں کے متعلق سوچتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا بوجھ میری کمر توڑ دے گا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کچھ فلسفی ایسے بھی ہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی چیزوں کا بھی مطالعہ کروں اور صاف طور پر عرض کیے دیتا ہوں کہ بغیر کسی تعصب کے میں نے ان چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر یہ چھپی ہوئی خواہش بھی موجود تھی کہ اگر یہ فلسفی یہ ثابت کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا اس لیے کہ اس طرح بہت

ہے بوجھ سے نجات مل جائے گی۔ یہ ایک مخفی راز ہے جو میں آپ پر ظاہر کر رہا ہوں۔
ہے بحمدللہ مجھ پر الحاد کا کوئی دور نہیں گزرا ہے۔ لیکن مجھ پر ایک ایسا دور ضرور گزرا ہے
جب میرے اندر یہ خواہش تھی کہ اگر یہ فلسفی حضرات خدا کا انکار ثابت کر دیں اور مجھے
من کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو بہرحال ایک اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے گا اور ایک
ی بوجھ اتر جائے گا۔ اس خواہش کے تحت میں نے متکلمین کی، دہریوں کی، منکرین
ڈاروِن کی، مارکس کی، فرائڈ کی، غرض کہ ان سب لوگوں کی کتابیں بڑی دلچسپی سے
میں اور بغیر کسی تعصب کے پڑھیں لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ ساری چیزیں
ھنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ۔۔۔ یہ سب خرافات ہیں۔ ایک بدیہی حقیقت
ے انکار کی خواہش ان سے یہ کام کرا رہی ہے باقی رہ گیا یہ کہ خدا کے انکار کے لیے ان
ں کے پاس واقعی کوئی دلیل ہے تو اس کی سرے سے گنجائش ہی نہیں۔ جو بات یہ پیش
تے ہیں اس سے ہزار گنا مضبوط اور بدیہی بات وہ ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کہ ایک
کو، ایک رب کو، ایک رحمان کو، ایک رحیم کو، ایک علیم کو، ایک خبیر کو، ایک سمیع کو او
ت بصیر کو مانو۔ اس بات پر عقل بھی گواہی دیتی ہے اور فطرت بھی گواہی دیتی ہے۔ ظاہر
ی گواہی دیتا ہے اور باطن بھی گواہی دیتا ہے۔ آفاق بھی گواہی دیتے ہیں اور انفس بھی
ہی دیتے ہیں۔ غرض کہ ایک ایک چیز گواہی دیتی ہے۔ ہمارے متکلم اور ہمارے فلسفی
۔ خدا کے وجود پر اگر کوئی دلیل قائم کر نہیں پاتے تو جانتے ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟
ی وجہ یہ ہے کہ دلیل وہاں کام دیتی ہے جہاں دلیل دعویٰ سے زیادہ واضح ہو لیکن
دعویٰ دلیل سے زیادہ واضح ہو تو وہاں دلیل بےکار ہے۔ وہاں دلیل کیا کام کرے گی؟
ں ارسطو کی منطق کیا کام کر سکتی ہے؟ وہاں متکلمین کا علم کلام کیا کام کر سکتا ہے؟ سورج
وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ چاند کے لیے آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ اسی طرح
مان اور زمین کے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں۔ ان چیزوں پر دلیل لانے کی کوشش
نا درحقیقت حماقت ہے۔ یہ بدیہیات ہیں۔ فطرت کی، آفاق کی، انفس کی،
ن کی سب کی بدیہیات! اس مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے

ہیں، وہ محض انکار کرنے کی خواہش کے زیرِ اثر اندھے اور بہرے ہوگئے ہیں۔ ہن
کہ وہ جس علت العلل کو، جس محرکِ اول کو، جس مادہ کو، جس خلیہ کو، اس عظیم کائنا
کا سبب قرار دیتے ہیں، اس شے زیادہ اور اس سے اکمل درجہ آسان اور عقل اور د
کے لیے قابلِ قبول بات وہ ہے جو قرآن کہتا ہے۔ میں اس کائنات کو کسی محرک
کی حرکت کا نتیجہ مان لوں۔ اس حماقت میں مبتلا ہونے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ میں
مان لوں کہ بے شک خدا ہے اور ان ہی صفات کے ساتھ ہے جو قرآن کہتا ہے۔

تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ درحقیقت خدا کو مان
کی جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں ان سے فرار اختیار کرنا چاہتے
اس کے سوا کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ اور اس میں واقعتہً کوئی شک نہیں ہے کہ خدا
ماننے کے بعد جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں۔ وہ بڑی اہم ہیں۔ بڑ
مشکل ہیں۔ بڑی کٹھن ہیں اور بڑی دشوار ہیں۔ اس راہ میں آگے بڑھنا صرف اسی وق
ممکن ہو سکتا ہے جب کہ آدمی سر ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے۔ اس میں حضرت یحییٰؑ کی طر
سر کٹوانا پڑتا ہے۔ حضرت مسیحؑ کی طرح سولی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی طر
آگ میں کودنے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے اور ان تمام مراحل اور مقامات سے گز
پڑتا ہے جن مراحل اور مقامات سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحا
کرامؓ گزرے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہر شخص ہمت نہیں رکھ
اور اسی لیے لوگ گریز اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ . . . . لہٰذا وہ صاف صاف انکار کرتے
ہیں کہ ہم ان جھگڑوں ہی میں نہیں پڑتے۔ وہ ان بدیہی حقیقتوں کو "موہوم" کہہ کر گویا ذمہ
داریوں سے بچنے کا آسان راستہ نکال لیتے ہیں اور جو لوگ مانتے ہیں جیسے کہ ہم اور آپ
ہماری قوم۔ وہ درحقیقت اقرار مع انکار کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں لیکن
خدا کو ماننے کے جو تقاضے ہیں، ان میں سے کسی تقاضا کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں
ہوتے۔ پھر اس کے بعد تقاضوں سے فرار کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے
اختیار کر لیتے ہیں۔ بڑے فخر اور تعلّی کے ساتھ خدا کا اقرار بھی کرتے ہیں لیکن زندگی کے

سی مرحلہ میں خدا کے اقرار کے تقاضوں کو پورا کرنے اور خدا کے احکام پر بے چون و
عمل کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر دوسرے صریح
کامل انکار میں مبتلا ہیں تو یقیناً ہم بھی اقرار مع الانکار میں مبتلا ہیں۔ اور ہماری پوری
ر مبتلا ہے۔

اصل چیز یہ ہے کہ خدا کو مانیے تو خدا کو ماننے کے جو مطالبے ہیں جو تقاضے ہیں جو
منات ہیں، جو مضمرات ہیں، جو لوازمات ہیں، جو نتائج ہیں، ان کا مواجہہ کرنے
ے لیے تیار رہیے۔ حقیقت سے گریز کی پالیسی، نہایت بزدلانہ بلکہ منافقانہ ہے۔
قرآن کے مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ مآل کے لحاظ سے کفر اور
فاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے مابین فرق صرف ظاہر کا فرق ہے۔ نتیجہ کے
ظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا انجام ایک ہے۔ تو جو لوگ انکار میں مبتلا ہیں
تو انکار میں مبتلا ہیں ہی لیکن جو لوگ اقرار والے انکار میں مبتلا ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ
صریح نفاق میں مبتلا ہیں۔ اب اس [illegible] نفاق کو اپنے اندر سے نکالنا ایک بڑا
معرکہ ہے اور دوسروں کے اندر سے نکالنا اس سے بھی بڑا معرکہ ہے۔ اللہ جن کو ہدایت
بخشتا ہے وہ نفاق کو اپنے اندر سے نکال سکتے ہیں اور جن کی ہدایت میں جن کی توفیق
ں زیادتی فرماتا ہے وہ دوسروں سے اس کو دور کرنے کی سعی و جہد کرتے ہیں لیکن
ن کے لیے بڑی سخت بازی کھیلنی پڑتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ حقیقت سے گریز
پالیسی بالکل غلط ہے۔ حقیقت کا مواجہہ کیجیے۔ اور پوری جرأت کے ساتھ مواجہہ کیجیے۔
وہی بندے مبارک بندے ہیں جو یہ کام کریں۔ اللہ تعالیٰ کو بہت ساری بھیڑ مطلوب
ہیں، وہ تو کھن چاہتا ہے۔ ایسے تو وہ بندے لے۔ ہیں جو اس کو اس طرح مانیں جیسے
س کو ماننے کا حق ہے۔ مولویوں کی زبان میں سننا چاہیں تو سنیئے کہ "مانیں ماننا کر"
مرنے کے لیے تیار ہو کر مانیں۔ یوحنا و مسیح کی طرح مانیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور
آپ کے صحابہ رضی کے طریقہ سے مانیں۔ باقی اس کے سوا دوسرا طرز عمل مہمل اور خرافات ہے
بس حق کو جانیے، حق کو سمجھیے، حق کا علم حاصل کیجیے۔ حق کی معرفت حاصل کیجیے

اور پھر اس حق کو اپنے اوپر قائم کرنے کے لیے اور دوسروں پر قائم کرنے کے لیے اپنے
اندر صبر اور عزیمت پیدا کیجیے۔ اسی حق اور اسی صبر پر حقیقت میں صحیح زندگی قائم ہوتی ہے
جہاں تک حصول علم و معرفت کا تعلق ہے تو یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ نبیوں کی تعلیم ہو
کے صحیفے، اللہ کا شکر ہے، موجود ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن تمام و کمال موجود ہے۔
نبیؐ کی سنت موجود ہے۔ صحابہؓ کی زندگی موجود ہے۔ اگر آپ جاننا چاہیں اور آپ میں
کا شوق اور طلب ہو۔ جس طرح زندگی کی اور طلبیں ہیں، تو یہ کام بہت مشکل نہیں ہے۔
صبر کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ یہ میری زندگی کا تجربہ ہے کہ صبر کا معاملہ واقعی بہت
عزیمت کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ میں اس صبر کے متعلق عرض نہیں کر رہا ہوں جس کے
وعظ ہمارے منبروں سے ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ صبر حقیقی، عزیمت، استقامت سے میری
یہ ہے کہ اللہ کو ماننے اور حق کو تسلیم کرنے کے جو حقیقی تقاضے ہیں ان کو پورا کیا جائے۔
حق کو قبول کیا جائے اس کی اپنے قول و عمل سے شہادت بھی دی جائے۔ یہ ہر مومن کا
ہے۔ اولین فرض ہے۔

جس شخص میں حق کی طلب نہ ہو۔ حق کا علم حاصل کرنے کا شوق نہ ہو۔ اُسے آپ
کی تعریف کے مطابق انسان کہہ دیجیے لیکن میں تو اسے دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور ہی سمجھ
ہوں۔[1] میرے نزدیک وہ حقیقت میں انسان نہیں ہے۔ جس میں حق کی طلب ہو جس کا
داعیہ انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ جس کے اندر یہ داعیہ نہیں ہے وہ مردہ ہے۔
وہ آدمی نہیں ہے بلید ہے اور جانور سے بھی زیادہ بلید ہے۔[2] لہٰذا اس حق کو قائم کرنا بہت بڑی
سعادت ہے۔ پہلے تو اس حق کو اپنے اوپر قائم کیجیے اس لیے کہ جس نے اپنے اوپر اس
کو قائم نہیں کیا۔ اس کا حق کی شہادت دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہونا فضول کام ہے۔
ایسے کھوکھلے سینوں کی شہادت کچھ کارگر نہیں ہوتی بالکل بے کار ہوتی ہے۔ صرف ان
لوگوں کو حق کی شہادت پیش کرنے کا حق ہے جو حق کو پہلے اپنے اوپر قائم کرلیں اور

---

[1] اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ [2] بَلْ ھُمْ اَضَلُّ

جان لیجئے کہ حق کی شہادت دینا بھی فرض ہے۔ حق کو جاننے والے اور علم صحیح رکھنے والے کے لیے میں دین میں، اور قرآن کے تیس پاروں میں، کہیں کوئی گنجائش نہیں پاتا کہ اسے حق کی شہادت دینے سے مفر ہو۔ شہادت حق اس پر واجب ہے۔ لازم ہے، فرض ہے۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے، جس حد تک ممکن ہو حق کی شہادت دیجئے۔

لیکن جب شہادت کا مرحلہ آتا ہے تو بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اس کے لیے لمبا اوقات ایسے لوگوں کے کانوں میں حق کی اذان دینی پڑتی ہے جن کے کانوں میں یہ اذان دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے عزیز تعلقات اس کے لیے منقطع ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے عزیز رشتے اس کے لیے کٹ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محبوبوں کی دوستی اس کیلئے قربان کرنی پڑتی ہے اور لمبا اوقات سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آخری چیز جان ہے۔ اس کی بھی نذر گزارنی پڑتی ہے اور صاف سن لیجئے کہ اگر آپ جان کو عزیز رکھتے ہوں تو اس راستہ میں بالکل قدم نہ رکھیے۔ یہ وہ راستہ نہیں جس میں آسانیاں ہوں۔ اس راستہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں ان تمام مشکلات کو بیان کروں۔ آپ قرآن کریم کا جو درس حاصل کریں گے ان سے یہ مشکلات معلوم ہو جائیں گی۔

لیکن میرے عزیز دوستو! ایک بات میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں، اور کاش میں اسے اچھی طرح آپ کو سمجھا بھی سکوں۔ وہ بات یہ ہے کہ صبر کہنے کے لیے بہت آسان ہے لیکن کرنے کے لیے بہت مشکل ہے۔ اور پھر یہی وہ چیز ہے جس پر صحیح زندگی استوار ہوتی ہے۔ جہاں تک اہلِ حق کا تعلق ہے۔ شہادت حق دینے والے لوگوں کا تعلق ہے۔ ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صبر کی بنیاد ایک علمی حقیقت پر ہے۔ ایک حکمت پر ہے جب تک وہ حقیقت و حکمت پوری طرح سے واضح نہ ہو، اس پر علم الیقین اور حق الیقین نہ ہو تو اس وقت تک صبر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت و حکمت یہ ہے کہ آپ کے راستہ میں جو کچھ پیش آئے گا وہ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے تحت پیش آئے گا۔ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے سوا اس دنیا میں اور کوئی ارادہ اور مشیت کارفرما نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر ارادہ میں خیر مضمر ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں

اس کا خیر معلوم نہ ہو۔ اسی حقیقت کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضرؑ کی تلاش میں نکلنے کا حکم ہوا۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک آپ اس حقیقت کو مستحضر نہیں رکھیں گے آپ کی اندرونی زندگی میں اور آپ کی خارجی زندگی میں ایسے ایسے فتنے پیش آئیں گے کہ شیطان آپ کو لوٹا دے گا، آپ کے قدم متزلزل ہو جائیں گے لیکن اگر اس حقیقت پر آپ کا مضبوط یقین ہے کہ جو ہوگا خدا کے ارادہ سے ہوگا اور خدا کا ارادہ ہمیشہ خیر اور حکمت ہی پر مبنی ہوتا ہے تو آپ یقین کریں کہ آپ بڑے سے بڑے مشکل مرحلے میں بھی ثابت قدم رہیں گے۔ رہی یہ بات کہ خدا کا ہر ارادہ خیر پر مبنی ہے اور خدا کے ارادہ کے سوا کوئی دوسرا ارادہ اس کائنات میں کار فرما نہیں ہے تو یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ جو اس کو نہیں مانتا وہ مومن نہیں۔ اس کو سمجھنے کی دو شکلیں ہیں یا یہ کہ ہر کام کی حکمت ہمارے اوپر عیاں اور واضح ہو جائے۔ جس کا کوئی امکان نہیں۔ اس لیے کہ ہم خدا تو نہیں بن سکتے۔ ہم بندے ہیں، ہمارا علم محدود ہے۔ یا پھر یہ کہ ہم اس بات پر یقین رکھیں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس میں خدا کی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ کچھ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے اور کچھ کی حکمت اپنے محدود علم کی وجہ سے ہم سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ ہر کام میں خیر و حکمت پوشیدہ ہوتی ہے تو اس پر پورا پورا ایمان اور یقین رکھیں۔ خدا چاہے گا تو وہ آپ پر حکمت بھی واضح کر دے گا۔ لیکن حکمت جاننے کے لیے ہم کو بے صبر نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ ظالموں کی گرتی ہوئی دیوار، باغیوں اور طاغیوں کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھالا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی خدا کی حکمت ہی کار فرما ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ اہل حق مظلوم ہیں، مقہور ہیں۔ ان کو ستایا جا رہا ہے، ان کو دکھ دیا جا رہا ہے۔ وہ فاقے کر رہے ہیں۔ یہ باتیں بھی آپ دیکھیں اور اس پر یہی یقین رکھیں کہ اس میں بھی خدا کی کوئی حکمت ہوگی۔ یہاں مسکینوں کی کشتی میں سوراخ کرا دیا جاتا ہے تو اس کے اندر بھی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ ظالموں اور باغیوں کی دیوار اونچی کرا دی جاتی ہے تو بہر حال اس دیوار کے نیچے، غریبوں اور یتیموں کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ ظالموں اور طاغیوں کو جو

بت دی جاتی ہے، اس کے اندر کیا کیا حکمتیں ہیں تو ان میں سے کچھ کا اندازہ آپ
کو قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوگا اور اصل حقیقت تو قیامت کے دن ہمارے سامنے آئیگی۔
بہرحال ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ اگر حق کی راہ میں کسی پر ظلم ہوتا
ہے تو اسی کے اندر حکمت ہے۔ اسی کے اندر بہتری ہے، اسی کے اندر خیر ہے، اسی
کے اندر فلاح ہے اور اسی کے اندر کامیابی ہے۔ اور اگر ظالموں کو، طاغیوں کو، سرکشوں
کو، نافرمانوں کو، باغیوں کو، غافلوں کو اور بے پرواؤں کو خدا کی طرف سے ڈھیل دی جاتی ہے
تو اس کے اندر بھی حکمت ہے، اس پر بھی پورا یقین رکھیے۔ اگر آپ اس بنیادی حقیقت کو
پیش نظر رکھیں گے تو یہ چیز ہمیشہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کو پناہ میں رکھے گی۔ آپ
ثابت قدم رہ سکیں گے۔ اور اگر اس سے غفلت ہوگئی تو شیطان آپ کو ٹھوکر کھلائے
گا اور آپ کو دھوکہ دے گا۔ لہٰذا یہ بڑی بنیادی چیز ہے جو آپ کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔

دوسری ایک اور بات بھی میں آپ کے سامنے واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ
ہم کو اور آپ کو اس دنیا میں اپنا موقف اور مقام بھی طے کر لینا چاہیے کہ ہم اس دنیا میں
کیا ہیں؟ خالق ہیں؟ ظاہر ہے کہ خالق نہیں ہیں، مخلوق ہیں۔ مالک ہیں؟ ظاہر ہے کہ
مالک نہیں ہیں، مملوک ہیں۔ ہمارا صحیح موقف اور صحیح مقام جو قرآن مجید میں سورۂ حدید
میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مُسْتَخْلَفْ ہیں۔ مُسْتَخْلِفْ نہیں ہیں۔ مُسْتَخْلَفْ
کا مفہوم اگر آپ اردو میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیجیے کہ ہم امین ہیں۔ ہمیں جتنی قوتیں،
صلاحیتیں، اور ذہنی و دماغی قابلیتیں اور جسمانی توانائیاں ملی ہیں، جو مال، دولت، اسباب،
سامان، ذرائع اور وسائل ملے ہیں ہم ان سب کے امین ہیں، مالک نہیں۔ اور جب ہم امین
ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ہمیں ہر امانت کے لیے جواب دہی کرنی ہے۔ ایک ایک چیز
کے متعلق حساب دینا ہے۔ امانت دینے والے نے جس حد تک اختیار دیا ہے بے شک
اس اختیار کے دائرہ کے اندر ہم اختیار استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں لیکن اس کے
باہر رتی برابر بھی ہٹے تو اس کا حساب دینا ہوگا، جواب دہی کرنی ہوگی اور نتیجہ بھگتنا ہوگا۔
اور کسی ایسے ویسے سے نہیں بلکہ اس ہستی سے بھگتنا ہوگا جو ذرہ ذرہ کا علم رکھتی ہے پھر

یا تو اس بات کا انکار کر دیجئے کہ آپ مستخلف نہیں ہیں بلکہ مالک ہیں۔ ورنہ اپنے سمع
اپنے فواد پر، اپنے بصر پر، اپنی ایک ایک چیز پر پہرہ بٹھائیے۔ اپنی زبان پر بھی پہ
بٹھائیے۔ یہ آپ کی زبان کس کی ترجمان ہے؟ یہ آپ کی عقل کی ترجمان ہے۔ یا آ
کے بطن اور فرج کی ترجمان ہے! ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عقل کی ترجمان۔
ہم نے اس کو بطن اور فرج کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر موقع ہوتا تو میں تفصیل سے
آپ کو بتاتا کہ ہماری شاعری، ہمارا ادب اور ہمارا لٹریچر بالکل ۔ ۔ ۔ مہمل گندی، ناپاک
اور لغو چیز بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شمشیر جوہر دار جو اللہ تعالیٰ نے
عطا فرمائی تھی، اس تلوار سے ہم نے گھاس کاٹنے کی درانتی کا کام لینا شروع کر دیا ہے
بہر حال اس بات کو ملحوظ رکھیئے کہ ایک ایک چیز کے آپ مسئول ہیں۔ جو شخص اس
نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے قدم جادۂ حق پر استوار رہتے ہیں او
جہاں اس حقیقت سے غفلت ہوئی وہیں وہ فوراً مار کھا جاتا ہے۔ تو اس حقیقت کو ہمیشہ پیش
رکھیے۔ اس موقف کو، اپنے مقام کو، اپنے درجہ کو، اپنے مرتبہ کو کبھی بھی فراموش نہ کیجئے
اور اگر اس کے انکار کی آپ میں ہمت ہے تو میں کسی ایسے دوست کا خیر مقدم کروں گا
جو مجھ پر ثابت کر دے کہ اس کے انکار کی عقلی دلیل موجود ہے اور اس کی گنجائش ہے
کم از کم قرآن مجید میں، جس پر آپ کا ایمان ہے، اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر یہ
قرآن قبروں کے اوپر پڑھ کر صرف ایصال ثواب کے لیے ہے، تب تو میں کچھ نہیں کہتا
ان لوگوں کی قبروں پر بھی پڑھ کر اس کے ذریعہ ایصال ثواب کیجئے کہ جنہوں نے ساری
عمر کبھی قرآن کو ہاتھ تک نہ لگایا ہو۔ لیکن اگر قرآن زندگی کی ہدایت اور رہنمائی کے
لیے ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، حق بتانے کے لیے ہے، صراط مستقیم پر گامزن
رکھنے کے لیے ہے۔ مآل کار کا شعور دینے کے لیے ہے۔ تب میں یہ کہتا ہوں کہ
آپ کا مستقر، آپ کا مقام اور آپ کا موقف اس قرآن میں یہی بیان کیا گیا ہے جو میں
نے عرض کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کے برعکس مجھے کوئی بات سمجھا سکیں تو میں ان کا
خیر مقدم کروں گا۔ یہ بات بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت تھی لیکن میں نے مختصراً

فی کیا ہے، چونکہ مجھ میں زیادہ بولنے کی طاقت نہیں ہے۔
عزیزو! اب ایک حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کو آپ
ہمیشہ پیش نظر رکھیے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ابنِ آدم اور بنتِ حوا اس دنیا میں محاذِ
جنگ پر ہے، اور بڑے شاطر دشمن کے مقابلہ میں محاذِ جنگ پر ہے۔ بڑے کائیاں دشمن
کے مقابلہ میں جس نے خدا کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ "اگر تو مجھے مہلت دے تو میں اس
انسان کے داہنے سے، بائیں سے، آگے سے، پیچھے سے اسکے آرٹ سے، ادب سے، لٹریچر
سے ثقافت سے، کلچر سے، غرض کہ ہر پہلو سے، اس کے اوپر تاخت کروں گا۔ اور اسے
تیری صراطِ مستقیم سے ہٹا کر چھوڑوں گا۔ اس کو گمراہ کر کے رہوں گا اور ثابت کر دوں گا کہ
اس کو میرے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے۔" اللہ تعالےٰ نے اس شان کے ساتھ جو اسی کو
زیبا ہے، جواب میں فرمایا کہ "جا تجھے مہلت دی گئی جس کو تو بہکا سکتا ہے۔ بہکا لے جو
تیرے پیچھے لگ جائیں گے، میں ان سے اور تجھ سے، تیری ذرّیت سے، تیرے اولیا
سے جہنم کو بھر دوں گا۔" یہ قرآن مجید کی ایک واضح حقیقت ہے، قرآن حکیم میں قصۂ آدم و
ابلیس صرف حکایت سنانے کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت بیان کرنے کے لیے ہے
اس کی بے شمار حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ آپ اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ آپ
اس دنیا میں ایک بڑے شاطر اور کائیاں دشمن کے مقابلہ میں محاذِ جنگ پر ہیں اور دشمن
چالاک و مکار ہونے کے ساتھ طاقتور بھی ہے۔ اس نے جس وقت انسان کو گمراہ کرنے کا
چیلنج کیا تھا اور مہلت مانگی تھی تو اس کے چیلے چانٹے گنتی کے ہوں گے لیکن آج تو
اس کی فوج بے شمار ہے۔ پھر اس کی فوج میں ایسے ایسے کائیاں لوگ پیدا ہو گئے ہیں
کہ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ وہ آج خود ابلیس کے کان کتر سکتے ہیں۔ ابلیس کو بھی فلسفہ
پڑھا سکتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کائیاں ہیں۔ اب ابلیس کو خود کچھ کرنے کی خاص ضرورت
نہیں ہے۔ اس سے زیادہ شاطر اس کے شاگرد ہیں۔ اگر تفصیل کا موقع ہوتا تو میں ان شاگردوں
کے کرتوتوں کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے رکھتا اور آپ کو اپنی بات پوری طرح سمجھا
دیتا۔ اجمالاً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ شاگرد آج آرٹ کے نام سے، ادب کے نام سے، لٹریچر کے

نام سے، ثقافت کے نام سے، کلچر کے نام سے، فیشن کے نام سے، تہذیب کے نام سے، سٹیٹ کے نام سے، سیکس[1] کے نام سے، جمہوریت کے نام سے، عوام کے نام سے، خود سر کے نام سے اور نہ جانے کس کس نام سے خدا کی خلق کو گمراہ کر رہے ہیں اور ابلیس کے کان کتر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابلیس بھی شاید قیامت کے دن چیخ اٹھے گا کہ بے شک تم نے مجھے بھی مات دے دی۔ میں بھی تم سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا پس اسے بچائیو! ایسے بڑے دشمن اور اس کے ایسے لاؤ لشکر کے مقابلہ میں آپ محاذِ جنگ پر ہیں۔ جو سپاہی محاذِ جنگ پر ہو وہ واقعہ یہ ہے کہ بدبخت ہے، بدقسمت ہے، نالائق ہے اگر وہ اتنا غافل ہو کر اور گھوڑے بیچ کر سو جائے۔ گھوڑے بیچ کر سونے کا کیا موقعہ ہے؟ جن لوگوں کی صفت یہ تھی کہ وہ دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر باطل سے پنجہ آزمائی کرتے تھے اور اللہ کی کبریائی کی شہادت دینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے تھے اور پھر رات کو مصلیٰ پر اپنے آقا کے حضور کھڑے ہوتے تھے۔ اس سے مناجات کیا کرتے تھے۔ وہ آخر کاہے کو جاگتے تھے؟ ان کو آخر کون سا غم تھا؟ بس ان کو اگر فکر تھی تو یہی کہ بڑے کائیاں دشمن سے مقابلہ ہے۔ بڑے شاطر دشمن سے سابقہ ہے جس کے ایجنٹ شیطانوں میں بھی ہیں، جنوں میں بھی ہیں اور خود انسانوں میں بھی ہیں اور جیسا کہ میں عرض کر چکا آپ کو تو بڑے خطرہ کا سامنا ہے۔ اس زمانہ میں تو ابلیس کے بڑے ہوشیار، چالاک ایجنٹوں کا پورا کا پورا لاؤ لشکر آپ کے داہنے، باہنے، آگے اور پیچھے موجود ہے لہٰذا آپ کے لیے تو از حد ضروری ہے کہ آپ کسی وقت غافل نہ ہوں۔ ہر وقت جاگتے رہیں، ہر وقت ہوشیار رہیں، چوکس اور چوکنے رہیں، محاذِ جنگ پر جس طرح سپاہی سوتا ہے، اسی طرح سوئیں۔ جس طریقہ سے جاگتا ہے۔ اسی طریقہ سے جاگیں۔ یہ اللہ کو معلوم ہے کہ اس مقابلہ میں بالآخر جیتے گا کون اور ہارے گا کون؟ لیکن آدم کی ناخلف اولاد ہوگا وہ جو اس حقیقت سے غافل ہو۔ یاد رکھیے کہ اس کی یہ غفلت اس کو شیطان کے مقابلہ میں چاروں خانے چت کر دے گی۔

بس، میرے عزیزو! جاگتے رہو۔ آگاہ رہو۔ رات کو بھی، دن کو بھی، سوتے وقت بھی

---

[1] Sex

یے وقت بھی ہر وقت ہوشیار رہو۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر سمت اور ہر طرف سے
نے رہو۔ اگر آپ اس حقیقت کو یاد رکھیں گے تو آپ صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں گے
یاد رکھیے کہ محاذِ جنگ پر ہر سپاہی کو ہتھیار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور آپ کو بھی
یار درکار ہے۔ یہ ہتھیار کیا ہے؟ تو جان لیجئے کہ اللہ تعالےٰ نے شیطان کے چیلنج
جواب میں جو بات ارشاد فرمائی تھی، وہی ارشاد آپ کے لیے ہتھیار اور وہی چیز آپ
یے نسخۂ علاج ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ "جا میں انسانوں کی رہنمائی اور مدد
یے اپنی ہدایت اور اپنی کتاب نبیوں اور رسولوں کے واسطے سے نازل کروں گا۔ جو
میری کتاب اور میرے انبیاء و رسل کی سنّت کو مضبوطی سے پکڑے رہیں، اُن کو تو ہرگز
نہیں کر سکے گا ہاں جو میری ہدایت کو چھوڑ دیں گے تو اُن پر تیرا جادو بے شک چل جائے گا۔"
پس شکر کیجیے کہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کے پاس اللہ کی آخری کتاب بتمام و کمال
جود ہے اس کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیجئے۔ اس کو ایصالِ ثواب کا نسخہ نہ سمجھ لیجئے
مر اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس کے اوامر و نواہی کو معلوم کیجئے۔
ں کے احکام اور ان کی حکمتوں کو جاننے کی سعی کیجئے۔ اس کی دعوت کا شعور حاصل کیجئے۔
رے اعمال، نافرمانی، سرکشی، طغیان و بغاوت کے ہولناک انجام سے آگاہی حاصل کیجئے۔
ر ساتھ ہی ساتھ جو کچھ علم حاصل ہوتا رہے اس پر عمل کی جدوجہد شروع کیجئے اور دوسروں
ک قرآن کی دعوت کو نہایت دلسوزی کے ساتھ پہنچانے کی فکر کیجئے۔ اس کے تقاضوں
و پورا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیجئے۔ اس کا حق اسی طرح ادا ہوگا۔ اس کو
مضبوطی سے تھام لینے کا یہی مطلب اور مفہوم ہے۔ اس کے برعکس طرزِ عمل اللہ کی کتاب کے
ساتھ مذاق ہے۔ اس کی محبت کا دعوےٰ لاف زنی ہے، بے وزن ہے، بے حقیقت ہے
جس کا پتہ آخر کار روزِ حساب چل جائے گا۔

عزیزو! اب صرف ایک حقیقت کی اور یاد دلانا چاہتا ہوں اور وہ محض میرا تاثر نہیں
ہے بلکہ میرے نزدیک ایک زندہ حقیقت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری قوم کے اوپر اس
وقت اُس قسم کے حالات پیش آ رہے ہیں جس قسم کے منذرات، تنبیہات اور جس قسم کے

تازیانے بنی اسرائیل پر ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں دعوت
کی وراثت بنی اسرائیل سے چھین کر آپ کو دی گئی تھی۔ سورۃ مائدہ آپ نے پڑھی ہوگی
پڑھ لیجئے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرمادیا ہے کہ "میں نبی اسرائیل سے
ان کی نافرمانی، کج روی اور خیانت کی وجہ سے یہ امانت چھین کر اب تمہارے حوالے کر
ہوں لیکن اگر تم نے مجھ سے نقضِ عہد کیا، میری کتاب کو چھوڑا۔ میرے نبی سے منہ موڑا
میری شریعت کے ساتھ بغاوت کی، میرے ساتھ مکاری اور چالاکی کی تو تمہارے ساتھ
بھی وہی معاملہ ہوگا جو بنی اسرائیل کے ساتھ کیا گیا ہے" میرا تاریخ کا جو مطالعہ ہے اور
تاریخ سے میری مراد وہ تاریخ ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے اور کسی تاریخ کا میں
نہیں ہوں۔ اس مطالعہ کی روشنی میں میں کہہ سکتا ہوں کہ اس قوم پر اسی طرح کے حالات
پیش آرہے ہیں جس قسم کے حالات بنی اسرائیل کو پیش آئے تھے۔ یہ بڑا نازک وقت ہے
میرے عزیزو! کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو۔ اس طرح کے واقعات، حالات اور حادثات چند
خاص اشخاص و افراد کی غلطیوں کا نتیجہ نہیں ہوتے اور نہ ہی چند خاص اشخاص و افراد
غلطیوں کے ایسے بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔ بلکہ یہ صورتِ حال پوری کی پوری قوم کے
شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بڑے ہی نادان ہیں، وہ لوگ جو چند اشخاص و افراد کو مورد
الزام گردان کر سارا زور بس ان کو مجرم ثابت کرنے پر لگا رہے ہیں۔ گویا باقی سب خیر سے
ہے۔ حالانکہ یہ منذرات، یہ تنبیہات، یہ حادثات، یہ واقعات پوری قوم کی نافرمانی، سرکشی
اور کرتوت کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں۔ ذرا غور تو کرو کہ ایک ہزار سال بعد ہم نے ہندو
قوم کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے وہ بھی ایک عورت کے آگے۔ تقریباً ایک لاکھ اپنے لوگ
بطور قیدی پکڑوا دیئے۔ آدھے سے زیادہ ہمارا ملک ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ معمولی واقعات نہیں
ہیں۔ بھائیوں کے ہاتھوں جس طریقے سے بھائیوں کا خون خچر ہوا ہے۔ عزتیں پامال ہوئی
ہیں۔ اعوذ باللہ میں سچ کہتا ہوں کہ جو بھیانک واقعات اخبارات میں آتے ہیں
ان کا پانچ فیصد بھی صحیح ہے تو کلیجہ شق کردینے کو کافی ہے لیکن ذرا غور کرو کہ ان کا کتنا
تاثر ہماری قوم نے لیا ہے۔ اس وقت اس بچے کھچے ملک کے حصہ میں جو کچھ ہو رہا ہے

وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ اکبر۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ زبان کی بنیاد پر،
نسل کی بنیاد پر، کلچر کی بنیاد پر، علاقہ کی بنیاد پر جو امت محمدؐ، کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر
جمع کی گئی تھی۔ جس کا کلمہ ایک، کتاب ایک، رسول ایک، قبلہ ایک، آج وہ کس طرح شیطان
کے نرغہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ بھائیو! میں پھر کہتا ہوں کہ یہ بڑا نازک وقت ہے، یہ اصلاح
حال کا وقت ہے، یہ جوڑنے اور ملانے کا وقت ہے، یہ نفرت دلانے اور ایک دوسرے
پر الزام لگانے کا وقت نہیں۔ اس سے آخر قوم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ ہم کسی ایک
طبقے یا گروہ کو ملزم قرار دیں اور ان کو مجرم ثابت کریں کہ ساری خرابیوں کا باعث تم ہو اور
وہ ہم پر الزام لگائیں اور ہمیں مجرم ثابت کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سب کے سب مجرم ہیں،
پوری کی پوری قوم مجرم ہے۔ ہم سب اللہ کے نافرمان ہیں پس ہم سب کو اللہ کی طرف
رجوع کرنا چاہیے، اس سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنی چاہیے۔ اس کی جناب
میں ہم سب کو توبہ اور استغفار کرنا چاہیے۔ ہم سب کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے
اگر ایسا نہ کیا گیا اور جس کے دور دور بھی آثار نہیں ہیں تو جان لینا چاہیے کہ حقیقت یہ ہے کہ
قوم کی کشتی بالکل بھنور میں ہے، گرداب میں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ڈوبی، تب
ڈوبی، معلوم نہیں کہ آپ لوگوں کو بھی یہ حقیقت نظر آتی ہے یا نہیں، مجھے تو رات کے اندھیارے
اور دن کے اجالے میں بصارت سے بھی اور بصیرت سے بھی یہی حقیقت نظر آتی ہے۔
عزیزو! آج وقت ہے کہ یوحنا مسیح کی طرح سے آپ کے اندر سے وہ لوگ اٹھیں جو پوری
قوم میں توبہ کی منادی کریں، استغفار کی منادی کریں، اللہ سے اپنے تعلق کو استوار کرنے کی
منادی کریں، نبی سے اپنی نسبت کے حقیقی تعلق جوڑنے کی منادی کریں، خلاف دین، خلاف
اسلام کاموں سے اجتناب کی منادی کریں، سرکشی و نافرمانی سے بچنے کی منادی کریں، حلال و
حرام کی تمیز کی منادی کریں، اس وقت ان کاموں کے سوا دوسرے کام بالکل فضول ہیں شاطر
اسی طرح لڑتے رہیں گے اور ایک سے ایک بڑا عذاب مختلف شکلوں میں آتا رہے گا۔ ایسے
بگڑے ہوئے معاشرہ میں جو شخص وافراد مسلط ہوں گے وہ بھی اللہ کے قہر کی نشانیاں ہوں
گے کسی کے اندر خیر نہیں ہے۔ ایک پارٹی اگر جائے گی تو جس طریقہ سے شر، فساد کے

ساتھ آئی ہے۔ کوئی دوسری پارٹی بھی اسی طرح کے شر اور فساد کے ساتھ ممکن ہے مسلط ہو جائے۔ لیکن اس وقت محض ہاتھوں کے بدلنے میں بھلائی نہیں ہے۔ ملک کے لیے کوئی خیر نہیں ہے، ملک کی بھلائی اگر ہوگی تو ان ہی بے غرض لوگوں کے ہاتھوں ہوگی جو آج یوحنا و مسیح کی طرح توبہ کی منادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ جو صاف صاف، بالفاظ حق، واضح طور پر بڑوں کے سامنے، چھوٹوں کے سامنے، پوری قوم کے سامنے وہی بات پیش کریں جو حق ہے۔ جو دین کا تقاضا ہے، جو ایمان کا تقاضا ہے، لیکن جان رکھو کہ یہ راستہ آسان نہیں ہے، بہت کٹھن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس راہ میں تمہارے سر کاٹ کر ظالم لوگ اپنی معشوقاؤں کے سامنے تحفہ کے طور پر پیش کریں۔ ہوسکتا ہے کہ اس راہ میں تمہیں سُولی پر چڑھنا پڑے۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے وطن سے نکال دیئے جاؤ۔ معلوم نہیں کہ اس راہ میں کیا کیا پیش آئے گا۔ بدر و اُحد۔ خندق و حنین، اس راہ کی لازمی منازل ہیں۔ مستقبل کا علم صرف اللہ کو ہے لیکن جو کچھ ہوگا اسی کے اندر تمہارے لیے خیر اور اسی کے اندر فوز و فلاح ہے۔ اس بات پر یقین رکھو۔ قرآن کی دعوت اور توبہ کی منادی کا کام لے کر اُٹھ کھڑے ہو جاؤ۔ شاید اللہ تعالیٰ تمہاری اس سرفروشانہ ادا کو پسند فرمالے اور تمہاری قوم کو بچالے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ قوم کی کشتی بھنور میں ہے۔

آخر میں، میں اپنے لیے اور آپ کے لیے، دونوں کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو حق کی معرفت عطا فرمائے اور حق پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

ڈاکٹر اسرار احمد

(۲)

یزید کی ولی عہدی اور سانحۂ کربلا کا تاریخی پس منظر

فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں

تلخیص و ترتیب : مقبول الرحیم مفتی

> جمعہ ۱۹ ستمبر کا زیرِ نظر خطاب دراصل گزشتہ جمعہ کے خطاب کا تتمہ تھا جسے ہم ماہِ نومبر کے میثاق میں "شہادتِ حضرات عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے نذرِ قارئین کر چکے ہیں۔ اس خطاب کی اشاعت کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو مکمل ہو رہی ہے۔
>
> (ادارہ)

یزید کی ولیعہدی

سنہ ۴۱ھ سے سنہ ۵۱ھ ہجری تک کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ تمام امت ایک جھنڈے تلے جمع تھی اور باہمی اتحاد کی کیفیت مثالی تھی۔ حضرت معاویہؓ کے تعلقات حضرت علیؓ کے دونوں صاحبزادوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے ساتھ انتہائی خوشگوار تھے۔ یہ دونوں حضرات دمشق جاتے تھے اور حضرت معاویہؓ ان کا اکرام کرتے تھے، بڑے بڑے ہدایا پیش کرتے تھے۔ ایک بہت اہم بات ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ وہ درحقیقت کسی موروثی اور خاندانی بادشاہت کی بنیاد رکھنے کے خواہش مند نہیں تھے۔ لیکن حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد پھر سوال پیدا ہوا کہ آیا امت کی قیادت کا مسئلہ حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے یا اس مسئلے کو طے کر دیا جائے۔ اس موقع پر کچھ حضرات نے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ وہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیں۔ تجویز پیش کرنے والوں میں ایک جلیل القدر

شمار کرتا ہوں جو ایک نہایت ہی محبوب اور عظیم مقصد کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ لہٰذا
آپ کے اس ارادے میں خیر و برکت عطا فرمائیے اور آپ کو زیادہ سے زیادہ مستفید
مستفیض ہونے کا موقع دے۔

حضرات! میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں شرکت کے ذریعے برکت حاصل کروں۔ لیکن
میرے عزیز بھائی شیخ سلطان احمد صاحب اور برادر عزیز ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی
یہ خواہش بھی معلوم ہوئی کہ میں آپ کے سامنے تقریر بھی کروں، تو میں نے ان کی خواہش
کی تعمیل ضروری سمجھی، لیکن میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی نوعیت ہرگز تقریر کی نہیں
گی بلکہ چند نہایت ہی واضح اور بدیہی حقیقتوں کی "تذکیر" ہی کی ہوگی یعنی صرف یاد دہانی۔
حقیقت یہ ہے کہ بعض حقیقتیں اپنی جگہ انتہائی واضح ہوتی ہیں لیکن شاید اپنی شدت
وضاحت ہی کی وجہ سے بہت مجہول ہو جاتی ہیں لہٰذا ان کی وقتاً فوقتاً تذکیر ہوتی رہنی
میری اپنی زندگی کی رہنمائی میں ان حقائق نے بہت مدد دی ہے۔ اس لیے میں چاہتا
کہ اس موقع پر آپ کو بھی ان کی یاد دہانی کرا دوں تاکہ آپ حضرات بھی ان سے فائدہ

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا ہے اور ضرور ہے اور خدا کے ماننے پر انسان
مجبور ہے۔ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ میں
معاملہ میں اپنا یہ ذاتی احساس عرض کر دیتا ہوں کہ جب اوّل اوّل مجھے اس حقیقت کا شعور
ہوا کہ خدا ہے اور ضرور ہے، نیز یہ کہ انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اس سے مفر نہیں
تو اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ اس ماننے سے بہت بھاری ذمہ دار
انسان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی میں ان ذمہ داریوں کے متعلق سوچتا تو ایسا معلوم ہوتا
اس کا بوجھ میری کمر توڑ دے گا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کچھ فلسفی ایسے بھی ہیں جو خدا
انکار کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی چیزوں کا بھی مطالعہ
کروں اور صاف طور پر عرض کیے دیتا ہوں کہ بغیر کسی تعصب کے میں نے ان چیزوں کا
مطالعہ کرنا چاہا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر یہ چھپی ہوئی خواہش بھی موجود تھی کہ اگر فلسفی
یہ ثابت کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا اس لیے کہ اس طرح بہ

ے بوجھ سے نجات مل جائے گی۔ یہ ایک مخفی راز ہے جو میں آپ پر ظاہر کر رہا ہوں۔
ے بحمد للہ مجھ پر الحاد کا کوئی دور نہیں گزرا ہے۔ لیکن مجھ پر ایک ایسا دور ضرور گزرا ہے
ب میرے اندر یہ خواہش تھی کہ اگر یہ فلسفی حضرات خدا کا انکار ثابت کر دیں اور مجھے
ن کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو بہر حال ایک اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے گا اور ایک
ری بوجھ اتر جائے گا۔ اس خواہش کے تحت میں نے متکلمین کی، دہریوں کی، منکرین
ڈارون کی، مارکس کی، فرائڈ کی، غرض کہ ان سب لوگوں کی کتابیں بڑی دلچسپی سے
میں اور بغیر کسی تعصب کے پڑھیں، لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ ساری چیزیں
ھنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ۔۔ یہ سب خرافات ہیں۔ ایک بدیہی حقیقت
ے انکار کی خواہش ان سے یہ کام کرا رہی ہے، باقی رہ گیا یہ کہ خدا کے انکار کے لیے ان
وں کے پاس واقعی کوئی دلیل ہے تو اس کی سرے سے گنجائش ہی نہیں۔ جو بات یہ پیش
تے ہیں اس سے ہزار گنا مضبوط اور بدیہی بات وہ ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کہ ایک
ا کو، ایک رب کو، ایک رحمان کو، ایک رحیم کو، ایک علیم کو، ایک خبیر کو، ایک سمیع کو اور
ک بصیر کو مانو۔ اس بات پر عقل بھی گواہی دیتی ہے اور فطرت بھی گواہی دیتی ہے۔ ظاہر
ھی گواہی دیتا ہے اور باطن بھی گواہی دیتا ہے۔ آفاق بھی گواہی دیتے ہیں اور انفس بھی
ہی دیتے ہیں۔ غرض کہ ایک ایک چیز گواہی دیتی ہے۔ ہمارے متکلم اور ہمارے فلسفی
ن خدا کے وجود پر اگر کوئی دلیل قائم کر نہیں پاتے تو جانتے ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟
س کی وجہ یہ ہے کہ دلیل وہاں کام دیتی ہے جہاں دلیل دعویٰ سے زیادہ واضح ہو لیکن
دعویٰ دلیل سے زیادہ واضح ہو تو وہاں دلیل بے کار ہے۔ وہاں دلیل کیا کام کرے گی؟
ں ارسطو کی منطق کیا کام کر سکتی ہے؟ وہاں متکلمین کا علم کلام کیا کام کر سکتا ہے؟ سورج
ے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ چاند کے لیے آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ اسی طرح
سمان اور زمین کے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں۔ ان چیزوں پر دلیل لانے کی کوشش
در حقیقت حماقت ہے۔ یہ بدیہیات ہیں۔ فطرت کی، آفاق کی، انفس کی،
قل کی سب کی بدیہیات! اس مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے

ہیں، وہ محض انکار کرنے کی خواہش کے زیر اثر اندھے اور بہرے ہوگئے ہیں۔ بتا
کہ وہ جس علت العلل کو، جس محرک اول کو، جس مادہ کو، جس خلیہ کو، اس عظیم کائنا
کا سبب قرار دیتے ہیں، اس شے زیادہ اور اس سے اکہ درجہ آسان اور عقل اور د
کے لیے قابل قبول بات وہ ہے جو قرآن کہتا ہے۔ میں اس کائنات کو کسی محرک
کی حرکت کا نتیجہ مان لوں۔ اس حماقت میں مبتلا ہونے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ میں
مان لوں کہ بے شک خدا ہے اور ان ہی صفات کے ساتھ ہے جو قرآن کہتا ہے۔
تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ در حقیقت خدا کو ما
کی جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں ان سے فرار اختیار کرنا چاہتے
اس کے سوا کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ اور اس میں واقعتہً کوئی شک نہیں ہے کہ خدا
ماننے کے بعد جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں۔ وہ بڑی اہم ہیں۔ بڑ
مشکل ہیں۔ بڑی کٹھن ہیں اور بڑی دشوار ہیں۔ اس راہ میں آگے بڑھنا صرف اسی
ممکن ہو سکتا ہے جب کہ آدمی سر ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے۔ اس میں حضرت یحییٰؑ کی طر
سر کٹوانا پڑتا ہے۔ حضرت مسیحؑ کی طرح سُولی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی طر
آگ میں کودنے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے اور ان تمام مراحل اور مقامات سے گز
پڑتا ہے جن مراحل اور مقامات سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحا
کرامؓ گزرے یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہر شخص ہمت نہیں رکھ
اور اسی لیے لوگ گریز اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ . . . . لہٰذا وہ صاف صاف انکار کرتے
ہیں کہ ہم ان جھگڑوں ہی میں نہیں پڑتے۔ وہ ان بدیہی حقیقتوں کو "موہوم" کہہ کر گویا ذمہ
داریوں سے بچنے کا آسان راستہ نکال لیتے ہیں اور جو لوگ مانتے ہیں جیسے کہ ہم اور آپ
ہماری قوم۔ وہ در حقیقت اقرار مع انکار کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں لیکن
خدا کو ماننے کے جو تقاضے ہیں، ان میں سے کسی تقاضا کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں
ہوتے۔ پھر اس کے بعد تقاضوں سے فرار کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے
اختیار کر لیتے ہیں۔ بڑے فخر اور تعلّی کے ساتھ خدا کا اقرار بھی کرتے ہیں لیکن زندگی کے

سی مرحلہ میں خدا کے اقرار کے تقاضوں کو پورا کرنے اور خدا کے احکام پر بے چون و
چرا عمل کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر دوسرے صریح
در کامل انکار میں مبتلا ہیں تو یقیناً ہم بھی اقرار مع الانکار میں مبتلا ہیں۔ اور ہماری پوری
قوم مبتلا ہے۔

اصل چیز یہ ہے کہ خدا کو مانیے تو خدا کو ماننے کے جو مطالبے ہیں، جو تقاضے ہیں جو
مضمرات ہیں، جو مضمرات ہیں، جو لوازمات ہیں، جو نتائج ہیں، ان کا مواجہہ کرنے
کے لیے تیار رہیے۔ حقیقت سے گریز کی پالیسی، نہایت بزدلانہ بلکہ منافقانہ ہے۔
قرآن کے مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ مآل کے لحاظ سے کفر اور
نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے مابین فرق صرف ظاہر کا فرق ہے۔ نتیجہ کے
لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا انجام ایک ہے۔ تو جو لوگ انکار میں مبتلا ہیں
تو انکار میں مبتلا ہیں ہی لیکن جو لوگ اقرار والے انکار میں مبتلا ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ
وہ صریح نفاق میں مبتلا ہیں۔ اب اس [illegible] نفاق کو اپنے اندر سے نکالنا ایک بڑا
معرکہ ہے اور دوسروں کے اندر سے نکالنا اس سے بھی بڑا معرکہ ہے۔ اللہ جن کو ہدایت
بخشتا ہے وہ نفاق کو اپنے اندر سے نکال سکتے ہیں اور جن کی ہدایت میں، جن کی توفیق
میں زیادتی فرماتا ہے وہ دوسروں سے اس کو دور کرنے کی سعی و جہد کرتے ہیں لیکن
اس کے لیے بڑی سخت بازی کھیلنی پڑتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ حقیقت سے گریز
کی پالیسی بالکل غلط ہے۔ حقیقت کا مواجہہ کیجیے۔ اور پوری جرأت کے ساتھ مواجہہ کیجیے۔
وہی بندے مبارک بندے ہیں جو یہ کام کریں۔ اللہ تعالیٰ کو بہت ساری بھیڑ مطلوب
نہیں وہ تو کھرے چاہتا ہے۔ اسے تو وہ بندے لینے ہیں جو اس کو اس طرح مانیں جیسے
اس کو ماننے کا حق ہے۔ مولویوں کی زبان میں سننا چاہیں تو سنیئے کہ "مانیں ماننا کر"
مرد دینے کے لیے تیار ہو کر مانیں۔ یوحنا و مسیح کی طرح مانیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور
آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ سے مانیں۔ باقی اس کے سوا دوسرا طرز عمل مہمل اور خرافات ہے،
پس حق کو جانیے، حق کو سمجھیے، حق کا علم حاصل کیجیے۔ حق کی معرفت حاصل کیجیے

اور پھر اس حق کو اپنے اوپر قائم کرنے کے لیے اور دوسروں پر قائم کرنے کے لیے ا
اندر صبر اور عزیمت پیدا کیجیے۔ اسی حق اور اسی صبر پر حقیقت میں صحیح زندگی قائم ہوتی ہے
جہاں تک حصول علم و معرفت کا تعلق ہے تو یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ نبیوں کی تعلیم
کے صحیفے، اللہ کا شکر ہے، موجود ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن تمام و کمال موجود ہے۔ ن
نبیؐ کی سنت موجود ہے۔ صحابہؓ کی زندگی موجود ہے۔ اگر آپ جاننا چاہیں اور آپ میں جا
کا شوق اور طلب ہو جس طرح زندگی کی اور طلبیں ہیں، تو یہ کام بہت مشکل نہیں ہے۔ ل
صبر کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ یہ میری زندگی کا تجربہ ہے کہ صبر کا معاملہ واقعی بہت مشو
عزیمت کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ میں اس صبر کے متعلق عرض نہیں کر رہا ہوں جس کے کھو
وعظ ہمارے منبروں سے ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ صبر حقیقی، عزیمت، استقامت سے میری م
یہ ہے کہ اللہ کو ماننے اور حق کو تسلیم کرنے کے جو حقیقی تقاضے ہیں ان کو پورا کیا جائے۔ ج
حق کو قبول کیا جائے اس کی اپنے قول و عمل سے شہادت بھی دی جائے۔ یہ ہر مومن کا ذ
ہے۔ اولین فرض ہے۔

جس شخص میں حق کی طلب نہ ہو۔ حق کا علم حاصل کرنے کا شوق نہ ہو۔ اُسے آپ
کی تعریف کے مطابق انسان کہہ دیجیے لیکن میں تو اسے دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور ہی سمجھ
ہوں[1]۔ میرے نزدیک وہ حقیقت میں انسان نہیں ہے۔ جس میں حق کی طلب ہو جس کا غ
داعیہ انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ جس کے اندر یہ داعیہ نہیں ہے وہ مردہ ہے
وہ آدمی نہیں ہے بلید ہے اور جانور سے بھی زیادہ بلید ہے[2]۔ لہٰذا اس حق کو قائم کرنا بہت بڑی
سعادت ہے۔ پہلے تو اس حق کو اپنے اوپر قائم کیجیے اس لیے کہ جس نے اپنے اوپر اس
کو قائم نہیں کیا۔ اس کا حق کی شہادت دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونا فضول کام ہے
ایسے کھوکھلے سینوں کی شہادت کچھ کارگر نہیں ہوتی بالکل بے کار ہوتی ہے۔ صرف ان
لوگوں کو حق کی شہادت پیش کرنے کا حق ہے جو حق کو پہلے اپنے اوپر قائم کرلیں اور اچھی

---

[1] اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ [2] بَلْ هُمْ اَضَلُّ

جان لیجئے کہ حق کی شہادت دینا بھی فرض ہے۔ حق کو جاننے والے اور علم صحیح رکھنے والے
کے لیے میں دین میں، اور قرآن کے تیس پاروں میں، کہیں کوئی گنجائش نہیں پاتا کہ اسے حق
کی شہادت دینے سے مفر ہو۔ شہادتِ حق اس پر واجب ہے۔ لازم ہے، فرض ہے۔
دائیں بائیں، آگے پیچھے، جس حد تک ممکن ہو حق کی شہادت دیجئے۔

لیکن جب شہادت کا مرحلہ آتا ہے تو بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اس کے لیے لبسا اوقات
بیسے ایسے لوگوں کے کانوں میں حق کی اذان دینی پڑتی ہے جن کے کانوں میں یہ اذان دینا
کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ بڑے عزیز تعلقات اس کے لیے منقطع ہوتے ہیں۔ بڑے
بڑے عزیز رشتے اس کے لیے کٹ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محبوبوں کی دوستی اس کیلئے
قربان کرنی پڑتی ہے اور لبسا اوقات سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آخری چیز جان ہے۔
اس کی بھی نذر گزارنی پڑتی ہے اور صاف سن لیجئے کہ اگر آپ جان کو عزیز رکھتے ہوں تو اس
راستہ میں بالکل قدم نہ رکھیے۔ یہ وہ راستہ نہیں جس میں آسانیاں ہوں۔ اس راستہ میں بڑی
مشکلات ہیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں ان تمام مشکلات کو بیان کروں۔ آپ
قرآنِ کریم کا جو درس حاصل کریں گے ان سے یہ مشکلات معلوم ہو جائیں گی۔

لیکن میرے عزیز دوستو! ایک بات میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں، اور کاش
میں اسے اچھی طرح آپ کو سمجھا بھی سکوں۔ وہ بات یہ ہے کہ صبر کہنے کے لیے بہت
آسان ہے لیکن کرنے کے لیے بہت مشکل ہے۔ اور پھر یہی وہ چیز ہے جس پر صحیح زندگی
استوار ہوتی ہے۔ جہاں تک اہلِ حق کا تعلق ہے۔ شہادتِ حق دینے والے لوگوں کا تعلق
ہے۔ ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صبر کی بنیاد ایک علمی حقیقت پر ہے، ایک حکمت پر ہے
جب تک وہ حقیقت و حکمت پوری طرح سے واضح نہ ہو، اس پر علم الیقین اور حق الیقین
نہ ہو تو اس وقت تک صبر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت و حکمت یہ ہے کہ آپ کے
راستہ میں جو کچھ پیش آئے گا وہ اللہ کے ارادہ اور مشیت کے تحت پیش آئے گا۔ اللہ کے
ارادہ اور مشیت کے سوا اس دنیا میں اور کوئی ارادہ اور مشیت کارفرما نہیں ہے۔ اسی کے
ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر ارادہ میں خیر مضمر ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں

اس کا خیر معلوم نہ ہو۔ اسی حقیقت کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر
کی تلاش میں نکلنے کا حکم ہوا۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک آپ اس حقیقت
کو مستحضر نہیں رکھیں گے آپ کی اندرونی زندگی میں اور آپ کی خارجی زندگی میں ایسے
ایسے فتنے پیش آئیں گے کہ شیطان آپ کو لوٹا دے گا، آپ کے قدم متزلزل ہو جائیں
گے لیکن اگر اس حقیقت پر آپ کا مضبوط یقین ہے کہ جو ہو گا خدا کے ارادہ سے ہو گا
اور خدا کا ارادہ ہمیشہ خیر اور حکمت ہی پر مبنی ہوتا ہے تو آپ یقین کریں کہ آپ بڑے
سے بڑے مشکل مرحلہ میں بھی ثابت قدم رہیں گے۔ رہی یہ بات کہ خدا کا ہر ارادہ خیر پر مبنی
ہے اور خدا کے ارادہ کے سوا کوئی دوسرا ارادہ اس کائنات میں کارفرما نہیں ہے تو یہ
ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ جو اس کو نہیں مانتا وہ مومن نہیں۔ اس کو سمجھنے کی دو شکلیں
ہیں یا یہ کہ ہر کام کی حکمت ہمارے اوپر عیاں اور واضح ہو جائے۔ جس کا کوئی امکان نہیں۔
اس لیے کہ ہم خدا تو نہیں بن سکتے۔ ہم بندے ہیں، ہمارا علم محدود ہے۔ یا پھر یہ کہ ہم اس بات
پر یقین رکھیں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس میں خدا کی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ کچھ کی حکمت ہماری
سمجھ میں آجاتی ہے اور کچھ کی حکمت اپنے محدود علم کی وجہ سے ہم سمجھنے سے قاصر رہتے
ہیں لیکن یہ بات کہ ہر کام میں خیر و حکمت پوشیدہ ہوتی ہے تو اس پر پورا پورا ایمان اور
یقین رکھیں۔ خدا چاہے گا تو وہ آپ پر حکمت بھی واضح کر دے گا۔ لیکن حکمت جاننے
کے لیے ہم کو بے صبر نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ ظالموں
کی گرتی ہوئی دیوار، باغیوں اور طاغیوں کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھالا دیا جاتا ہے۔
ظاہر ہے کہ اس میں بھی خدا کی حکمت ہی کارفرما ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ
دیکھیں کہ اہل حق مظلوم ہیں، مقہور ہیں۔ ان کو ستایا جا رہا ہے، ان کو دکھ دیا جا رہا ہے،
وہ فاقے کر رہے ہیں۔ یہ باتیں بھی آپ دیکھیں اور اس پر یہی یقین رکھیں کہ اس میں بھی
خدا کی کوئی حکمت ہو گی۔ یہاں مسکینوں کی کشتی میں سوراخ کرا دیا جاتا ہے تو اس کے اندر
بھی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ ظالموں اور باغیوں کی دیوار اونچی کرا دی جاتی ہے تو بہر حال اس
دیوار کے نیچے، غریبوں اور یتیموں کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ ظالموں اور طاغیوں کو جو

بہت دی جاتی ہے، اس کے اندر کیا کیا حکمتیں ہیں تو ان میں سے کچھ کا اندازہ آپ قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوگا اور اصل حقیقت تو قیامت کے دن ہمارے سامنے آئیگی۔

بہر حال ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ اگر حق کی راہ میں کسی پر ظلم ہوتا ہے تو اسی کے اندر حکمت ہے۔ اسی کے اندر بہتری ہے، اسی کے اندر خیر ہے، اسی کے اندر فلاح ہے اور اسی کے اندر کامیابی ہے۔ اور اگر ظالموں کو، طاغیوں کو، سرکشوں کو، نافرمانوں کو، باغیوں کو، غافلوں کو اور بے پرواؤں کو خدا کی طرف سے ڈھیل دی جاتی ہے تو اس کے اندر بھی حکمت ہے، اس پر بھی پورا الیقین رکھیے۔ اگر آپ اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھیں گے تو یہ چیز ہمیشہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کو پناہ میں رکھے گی۔ آپ ثابت قدم رہ سکیں گے۔ اور اگر اس سے غفلت ہوگئی تو شیطان آپ کو ٹھوکر کھلائے گا اور آپ کو دھوکہ دے گا۔ لہٰذا یہ بڑی بنیادی چیز ہے جو آپ کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔

دوسری ایک اور بات بھی میں آپ کے سامنے واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم کو اور آپ کو اس دنیا میں اپنا موقف اور مقام بھی طے کر لینا چاہیے کہ ہم اس دنیا میں کیا ہیں؟ خالق ہیں؟ ظاہر ہے کہ خالق نہیں ہیں، مخلوق ہیں۔ مالک ہیں؟ ظاہر ہے کہ مالک نہیں ہیں، مملوک ہیں۔ ہمارا صحیح موقف اور صحیح مقام جو قرآن مجید میں سورۂ حدید میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مُسْتَخْلَفْ ہیں۔ مُسْتَخْلِفْ نہیں ہیں۔ مُسْتَخْلَفْ کا مفہوم اگر آپ اردو میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیجیے کہ ہم امین ہیں۔ ہمیں جتنی قوتیں، صلاحیتیں، اور ذہنی و دماغی قابلیتیں اور جسمانی توانائیاں ملی ہیں، جو مال، دولت، اسباب، سامان، ذرائع اور وسائل ملے ہیں ہم ان سب کے امین ہیں، مالک نہیں۔ اور جب ہم امین ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ہمیں ہر امانت کے لیے جواب دہی کرنی ہے۔ ایک ایک چیز کے متعلق حساب دینا ہے۔ امانت دینے والے نے جس حد تک اختیار دیا ہے بے شک اس اختیار کے دائرہ کے اندر ہم اختیار استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں، لیکن اس کے باہر رتی برابر بھی ہٹے تو اس کا حساب دینا ہوگا، جواب دہی کرنی ہوگی اور نتیجہ بھگتنا ہوگا۔ اور کسی ایسے ویسے سے نہیں بلکہ اس ہستی سے بھگتنا ہوگا جو ذرہ ذرہ کا علم رکھتی ہے۔ پھر

یا تو اس بات کا انکار کر دیجئے کہ آپ مستخلف نہیں ہیں بلکہ مالک ہیں۔ ورنہ اپنے سمع پر، اپنے فواد پر، اپنے بصر پر، اپنی ایک ایک چیز پر پہرہ بٹھائیے۔ اپنی زبان پر بھی پہرہ بٹھائیے۔ یہ آپ کی زبان کس کی ترجمان ہے؟ یہ آپ کی عقل کی ترجمان ہے۔ یا آپ کے بطن اور فرج کی ترجمان ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عقل کی ترجمان ہے ہم نے اس کو بطن اور فرج کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر موقع ہوتا تو میں تفصیل سے آپ کو بتاتا کہ ہماری شاعری، ہمارا ادب اور ہمارا لٹریچر بالکل۔۔۔ مہمل گندی، ناپاک اور لغو چیز بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شمشیر جوہر دار جو اللہ تعالیٰ سے ہمیں عطا فرمائی تھی، اس تلوار سے ہم نے گھاس کاٹنے کی درانتی کا کام لینا شروع کر دیا ہے۔

بہر حال اس بات کو ملحوظ رکھیئے کہ ایک ایک چیز کے آپ مسئول ہیں۔ جو شخص اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے قدم جادۂ حق پر استوار رہتے ہیں اور جہاں اس حقیقت سے غفلت ہوئی وہیں وہ فوراً مار کھا جاتا ہے۔ تو اس حقیقت کو ہمیشہ مدِ نظر رکھیے۔ اس موقف کو، اپنے مقام کو، اپنے درجہ کو، اپنے مرتبہ کو کبھی بھی فراموش نہ کیجئے اور اگر اس کے انکار کی آپ میں ہمت ہے تو میں کسی ایسے دوست کا خیر مقدم کروں گا جو مجھ پر ثابت کر دے کہ اس کے انکار کی عقلی دلیل موجود ہے اور اس کی گنجائش ہے کم از کم قرآن مجید میں، جس پر آپ کا ایمان ہے، اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر یہ قرآن قبروں کے اوپر پڑھ کر صرف ایصال ثواب کے لیے ہے تب تو میں کچھ نہیں کہتا۔ ان لوگوں کی قبروں پر بھی پڑھ کر اس کے ذریعہ ایصال ثواب کیجئے کہ جنہوں نے ساری عمر کبھی قرآن کو ہاتھ تک نہ لگایا ہو۔ لیکن اگر قرآن زندگی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، حق بتانے کے لیے ہے، صراط مستقیم پر گامزن رکھنے کے لیے ہے۔ مآل کار کا شعور دینے کے لیے ہے۔ تب میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کا مستقر، آپ کا مقام اور آپ کا موقف اس قرآن میں یہی بیان کیا گیا ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کے برعکس مجھے کوئی بات سمجھا سکیں تو میں ان کا خیر مقدم کروں گا۔ یہ بات بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت تھی لیکن میں نے مختصر

...ا گیا ہے چونکہ مجھ میں زیادہ بولنے کی طاقت نہیں ہے۔
عزیزو! اب ایک حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کو آپ
...ہ پیش نظر رکھیے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ابنِ آدم اور بنت حوا اس دنیا میں محاذِ
...پر ہے، اور بڑے شاطر دشمن کے مقابلہ میں محاذِ جنگ پر ہے۔ بڑے کائیاں دشمن
...مقابلہ میں جس نے خدا کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ "اگر تو مجھے مہلت دے تو میں اس
...ان کے داہنے سے، بائیں سے، آگے سے پیچھے سے اسکے آرٹ سے، ادب سے، لٹریچر
...ثقافت سے، کلچر سے، غرض کہ ہر پہلو سے، اس کے اوپر تاخت کروں گا۔ اور اسے
...ی صراطِ مستقیم سے ہٹا کر چھوڑوں گا۔ اس کو گمراہ کر کے رہوں گا اور ثابت کر دوں گا کہ
...ں کو میرے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے: اللہ تعالیٰ نے اس شان کے ساتھ جو اسی کو
...یا ہے، جواب میں فرمایا کہ "جا تجھے مہلت دی گئی جس کو تو بہکا سکتا ہے۔ بہکا لے جو
...ے پیچھے لگ جائیں گے، میں ان سے اور تجھ سے، تیری ذریت سے، تیرے اولیا
...ے جہنم کو بھر دوں گا"۔ یہ قرآن مجید کی ایک واضح حقیقت ہے، قرآن حکیم میں قصہ آدمؑ و
...میں صرف حکایت سنانے کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت بیان کرنے کے لیے ہے
...ن کی بے شمار حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ آپ اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ آپ
...س دنیا میں ایک بڑے شاطر اور کائیاں دشمن کے مقابلہ میں محاذِ جنگ پر ہیں اور دشمن
...چالاک و مکار ہونے کے ساتھ طاقتور بھی ہے۔ اس نے جس وقت انسان کو گمراہ کرنے کا
...چیلنج کیا تھا اور مہلت مانگی تھی تو اس کے چیلے چانٹے گنتی کے ہوں گے، لیکن آج تو
...س کی فوج بے شمار ہے۔ پھر اس کی فوج میں ایسے ایسے کائیاں لوگ پیدا ہو گئے ہیں
...کہ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ وہ آج خود ابلیس کے کان کتر سکتے ہیں۔ ابلیس کو بھی فلسفہ
...پڑھا سکتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کائیاں ہیں۔ اب ابلیس کو خود کچھ کرنے کی خاص ضرورت
...نہیں ہے۔ اس سے زیادہ شاطر اس کے شاگرد ہیں۔ اگر تفصیل کا موقع ہوتا تو میں ان شاگردوں
...کے کرتوتوں کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے رکھتا اور آپ کو اپنی بات پوری طرح سمجھا
دیتا۔ اجمالاً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ شاگرد آج آرٹ کے نام سے، ادب کے نام سے، لٹریچر کے

نام سے، ثقافت کے نام سے، کلچر کے نام سے، فیشن کے نام سے، تہذیب کے نا
پیٹ کے نام سے، سیکس[1] کے نام سے، جمہوریت کے نام سے، عوام کے نام سے، خود
کے نام سے اور نہ جانے کس کس نام سے خدا کی خلق کو گمراہ کر رہے ہیں اور ابلیس کے کا
رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابلیس بھی شاید قیامت کے دن چیخ اٹھے گا کہ بے ٹھیک تم
مجھے بھی مات دے دی۔ میں بھی تم سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا۔ پس اسے بھائیو! ایسے
دشمن اور اس کے ایسے لاؤ لشکر کے مقابلہ میں آپ محاذِ جنگ پر ہیں۔ جو سپاہی محاذِ جنگ
پر ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ بدبخت ہے، بدقسمت ہے، نالائق ہے اگر وہ اتنا غافل ہو کر اور گھ
بیچ کر سو جائے۔ گھوڑے بیچ کر سونے کا کیا موقعہ ہے؟ جن لوگوں کی صفت یہ تھی کہ وہ د
کو گھوڑے کی پیٹھ پر باطل سے پنجہ آزمائی کرتے تھے اور اللہ کی کبریائی کی شہادت دیے
کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے تھے اور پھر رات کو مصلیٰ پر اپنے آقا کے حضور کھڑے ہو
تھے۔ اس سے مناجات کیا کرتے تھے۔ وہ آخر کاہے کو جاگتے تھے؟ ان کو آخر کون
غم تھا؟ بس ان کو اگر فکر تھی تو یہی کہ بڑے کائیاں دشمن سے مقابلہ ہے۔ بڑے شاطر د
سے سابقہ ہے جس کے ایجنٹ شیطانوں میں بھی ہیں، جنوں میں بھی ہیں اور خود انسانوں م
بھی ہیں اور جیسا کہ میں عرض کر چکا آپ کو تو بڑے خطرہ کا سامنا ہے۔ اس زمانہ میں تو ابلیس
کے بڑے ہوشیار، چالاک ایجنٹوں کا پورا کا پورا لاؤ لشکر آپ کے داہنے، باہنے، آگے اور پ
موجود ہے لہٰذا آپ کے لیے تو ازحد ضروری ہے کہ آپ کسی وقت غافل نہ ہوں۔ ہر وقت
جاگتے رہیں، ہر وقت ہوشیار رہیں، چوکس اور چوکنے رہیں، محاذِ جنگ پر جس طرح سپاہی ر
ہے، اسی طرح سوئیں جس طریقہ سے جاگتا ہے۔ اسی طریقہ سے جاگیں۔ یہ اللہ کو معلوم ہ
کہ اس مقابلہ میں بالآخر جیتے گا کون اور ہارے گا کون؟ لیکن آدم کی ناخلف اولاد ہوگا،
جو اس حقیقت سے غافل ہو۔ یاد رکھیے کہ اس کی یہ غفلت اس کو شیطان کے مقابلہ میں
چاروں خانے چت کر دے گی۔

پس، میرے عزیزو! جاگتے رہو۔ آگاہ رہو۔ رات کو بھی، دن کو بھی، سوتے وقت بھی

---
[1] SEX

ئے وقت بھی ہر وقت ہوشیار رہو۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر سمت اور ہر طرف سے
بئے رہو۔ اگر آپ اس حقیقت کو یاد رکھیں گے تو آپ صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں گے
ی یاد رکھیے کہ محاذِ جنگ پر ہر سپاہی کو ہتھیار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور آپ کو بھی
ہتھیار درکار ہے۔ یہ ہتھیار کیا ہے؟ تو جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے چیلنج
ے جواب میں جو بات ارشاد فرمائی تھی وہی ارشاد آپ کے لیے ہتھیار اور وہی چیز آپ
ے لیے نسخۂ علاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں انسانوں کی رہنمائی اور مدد
ے لیے اپنی ہدایت اور اپنی کتاب نبیوں اور رسولوں کے واسطے سے نازل کروں گا۔ جو
ن میری کتاب اور میرے انبیاء و رسل کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے رہیں اُن کو تو ہرگز
ہ نہیں کرسکے گا ہاں جو میری ہدایت کو چھوڑ دیں گے تو اُن پر تیرا جادو بے شک چل جائے گا۔"

پس شکر کیجیے کہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کے پاس اللہ کی آخری کتاب بتمام و کمال
وجود ہے اس کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیے۔ اس کو ایصالِ ثواب کا نسخہ نہ سمجھ لیجیے
ہر اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کیجیے، اس کے اوامر و نواہی کو معلوم کیجیے۔
س کے احکام اور ان کی حکمتوں کو جاننے کی سعی کیجیے۔ اس کی دعوت کا شعور حاصل کیجیے۔
رے اعمال، نافرمانی، سرکشی، طغیان و بغاوت کے ہولناک انجام سے آگاہی حاصل کیجیے۔
ر ساتھ ہی ساتھ جو کچھ علم حاصل ہوتا رہے اس پر عمل کی جدوجہد شروع کیجیے اور دوسروں
ک قرآن کی دعوت کو نہایت دلسوزی کے ساتھ پہنچانے کی فکر کیجیے، اس کے تقاضوں
و پورا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیجیے۔ اس کا حق اسی طرح ادا ہوگا۔ اس کو
مضبوطی سے تھام لینے کا یہی مطلب اور مفہوم ہے۔ اس کے برعکس طرزِ عمل اللہ کی کتاب کے
ے تھ مذاق ہے۔ اس کی محبت کا دعوئے لاف زنی ہے، بے وزن ہے، بے حقیقت ہے
جس کا پتہ آخر کار روزِ حساب چل جائے گا۔

عزیزو! اب صرف ایک حقیقت کی اور یاد دلانا چاہتا ہوں اور وہ محض میرا تاثر نہیں
ہے بلکہ میرے نزدیک ایک زندہ حقیقت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری قوم کے اوپر اس
وقت اُس قسم کے حالات پیش آرہے ہیں جس قسم کے منذرات، تنبیہات اور جس قسم کے

تازیانے بنی اسرائیل پر ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں دعوت دین
کی وراثت بنی اسرائیل سے چھین کر آپ کو دی گئی تھی۔ سورۂ مائدہ آپ نے پڑھی ہوگی
پڑھ لیجیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ میں نبی اسرائیل سے
ان کی نافرمانی، کج روی اور خیانت کی وجہ سے یہ امانت چھین کر اب تمہارے حوالے کر
ہوں لیکن اگر تم نے مجھ سے نقضِ عہد کیا، میری کتاب کو چھوڑا، میرے نبی سے منہ موڑا،
میری شریعت کے ساتھ بغاوت کی، میرے ساتھ مکاری اور چالاکی کی تو تمہارے ساتھ
بھی وہی معاملہ ہوگا جو بنی اسرائیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ میرا تاریخ کا جو مطالعہ ہے وہ
تاریخ سے میری مراد وہ تاریخ ہے جو قرآن میں بیان ہوتی ہے اور کسی تاریخ کا میں قائل
نہیں ہوں۔ اس مطالعہ کی روشنی میں میں کہہ سکتا ہوں کہ اس قوم پر اسی طرح کے حالات
پیش آ رہے ہیں جس قسم کے حالات بنی اسرائیل کو پیش آئے تھے۔ یہ بڑا نازک وقت ہے
میرے عزیزو! کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو۔ اس طرح کے واقعات، حالات اور حادثات چند
خاص اشخاص و افراد کی غلطیوں کا نتیجہ نہیں ہوتے اور نہ ہی چند خاص اشخاص و افراد کی
غلطیوں کے ایسے بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔ بلکہ یہ صورتِ حال پوری کی پوری قوم کے
شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بڑے ہی نادان ہیں، وہ لوگ جو چند اشخاص و افراد کو موردِ
الزام گردان کر سارا زور بس ان کو مجرم ثابت کرنے پر لگا رہے ہیں۔ گویا باقی سب بے خبر
ہے۔ حالانکہ یہ منذرات، یہ تنبیہات، یہ حادثات، یہ واقعات پوری قوم کی نافرمانی، سرکشی
اور کرتوت کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں۔ ذرا غور تو کرو کہ ایک ہزار سال بعد ہم نے ہندو
قوم کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے وہ بھی ایک عورت کے آگے۔ تقریباً ایک لاکھ اپنے لوگ
بطورِ قیدی پکڑوا دیئے۔ آدھے سے زیادہ ہمارا ملک ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ معمولی واقعات نہیں
ہیں۔ بھائیوں کے ہاتھوں جس طریقہ سے بھائیوں کا خون خچر ہوا ہے۔ عزتیں پامال ہوئی
ہیں۔ اعوذ باللہ میں سچ کہتا ہوں کہ جو بھیانک واقعات اخبارات میں آتے ہیں اگر
ان کا پانچ فیصد بھی صحیح ہے تو کلیجہ شق کر دینے کو کافی ہے لیکن ذرا غور کرو کہ ان کا کتنا
تاثر ہماری قوم نے لیا ہے۔ اس وقت اس بچے کھچے ملک کے حصہ میں جو کچھ ہو رہا ہے

دو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ اکبر۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ زبان کی بنیاد پر، نسل کی بنیاد پر، کلچر کی بنیاد پر، علاقہ کی بنیاد پر جو امت محمدؐ، کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر جمع کی گئی تھی۔ جس کا کلمہ ایک، کتاب ایک، رسول ایک، قبلہ ایک، آج وہ کس طرح شیطان کے زنغہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ بھائیو! میں پھر کہتا ہوں کہ یہ بڑا نازک وقت ہے، یہ اصلاح حال کا وقت ہے، یہ جوڑنے اور ملانے کا وقت ہے، یہ نفرت دلانے اور ایک دوسرے پر الزام لگانے کا وقت نہیں۔ اس سے آخر قوم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ ہم کسی ایک جتھے یا گروہ کو ملزم قرار دیں اور ان کو مجرم ثابت کریں کہ ساری خرابیوں کا باعث تم ہو اور وہ ہم پر الزام لگائیں اور ہمیں مجرم ثابت کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سب کے سب مجرم ہیں، بلکہ پوری کی پوری قوم مجرم ہے۔ ہم سب اللہ کے نافرمان ہیں۔ پس ہم سب کو اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اس سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنی چاہیے۔ اس کی جناب میں ہم سب کو توبہ اور استغفار کرنا چاہیے۔ ہم سب کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے اگر ایسا نہ کیا گیا اور جس کے دُور دُور بھی آثار نہیں ہیں تو جان لینا چاہیے کہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی کشتی بالکل بھنور میں ہے، گرداب میں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ڈوبی، تب ڈوبی، معلوم نہیں کہ آپ لوگوں کو بھی یہ حقیقت نظر آتی ہے یا نہیں، مجھے تو رات کے اندھیارے اور دن کے اُجالے میں بصارت سے بھی اور بصیرت سے بھی یہی حقیقت نظر آتی ہے۔

عزیزو! آج وقت ہے کہ یوحنا و مسیح کی طرح سے آپ کے اندر سے وہ لوگ اٹھیں جو پوری قوم میں توبہ کی منادی کریں، استغفار کی منادی کریں، اللہ سے اپنے تعلق کو استوار کرنے کی منادی کریں، نبی سے اپنی نسبت کے حقیقی تعلق جوڑنے کی منادی کریں، خلاف دین، خلاف اسلام کاموں سے اجتناب کی منادی کریں، سرکشی و نافرمانی سے بچنے کی منادی کریں، حلال و حرام کی تمیز کی منادی کریں، اس وقت ان کاموں کے سوا دوسرے کام بالکل فضول ہیں۔ اگر اسی طرح لڑتے رہیں گے اور ایک سے ایک بڑا عذاب مختلف شکلوں میں آ رہا ہے گا۔ ایسے بگڑے ہوئے معاشرہ میں جو شخص و افراد مسلط ہوں گے وہ بھی اللہ کے قہر کی نشانیاں ہوں گے کسی کے اندر خیر نہیں ہے۔ ایک پارٹی اگر جائے گی تو جس طریقہ سے شر، فساد کے

ساتھ آئی ہے۔ کوئی دوسری پارٹی بھی اسی طرح کے شر اور فساد کے ساتھ ممکن ہے مسلط ہو جائے۔ لیکن اس وقت محض ہاتھوں کے بدلنے میں بھلائی نہیں ہے۔ ملک کے لیے کوئی خیر نہیں ہے۔ ملک کی بھلائی اگر ہو گی تو ان ہی بے غرض لوگوں کے ہاتھوں ہو گی جو آج یوحنا و مسیح کی طرح توبہ کی منادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ جو صاف صاف، برملا حق، واضح طور پر بڑوں کے سامنے، چھوٹوں کے سامنے، پوری قوم کے سامنے وہی بات پیش کریں جو حق ہے۔ جو دین کا تقاضا ہے، جو ایمان کا تقاضا ہے، لیکن جان رکھو کہ یہ راستہ آسان نہیں ہے، بہت کٹھن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس راہ میں تمہارے سر کاٹ کر ظالم لوگ اپنی معشوقاؤں کے سامنے تحفہ کے طور پر پیش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس راہ میں تمہیں سُولی پر چڑھنا پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے وطن سے نکال دیئے جاؤ۔ معلوم نہیں کہ اس راہ میں کیا کیا پیش آئے گا۔ بدر و اُحد۔ خندق و حنین، اس راہ کی لازمی منازل ہیں۔ مستقبل کا علم صرف اللہ کو ہے لیکن جو کچھ ہو گا اسی کے اندر تمہارے لیے خیر اور اسی کے اندر فوز و فلاح ہے۔ اس بات پر یقین رکھو۔ قرآن کی دعوت اور توبہ کی منادی کا کام لے کر اُٹھ کھڑے ہو جاؤ۔ شاید اللہ تعالیٰ تمہاری اس سرفروشانہ ادا کو پسند فرما لے اور تمہاری قوم کو بچا لے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ قوم کی کشتی بھنور میں ہے۔

آخر میں، میں اپنے لیے اور آپ کے لیے، دونوں کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو حق کی معرفت عطا فرمائے اور حق پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن!

خطابِ جمعہ
ڈاکٹر اسرار احمد

(۲)

یزید کی ولی عہدی اور سانحۂ کربلا کا تاریخی پس منظر

فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں

تلخیص و ترتیب: مقبول الرحیم مفتی

جمعہ ۱۹ ستمبر کا زیرِ نظر خطاب دراصل گزشتہ جمعہ کے خطاب کا تتمہ تھا جسے ہم ماہِ نومبر کے میثاق میں "شہادتِ حضراتِ عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے نذرِ قارئین کر چکے ہیں۔ اس خطاب کی اشاعت کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو مکمل ہو رہی ہے۔
(ادارہ)

یزید کی ولیعہدی

۴۱ھ سے ۵۱ھ ہجری تک کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ تمام امت ایک جھنڈے تلے جمع تھی اور باہمی اتحاد کی کیفیت مثالی تھی۔ حضرت معاویہؓ کے تعلقات حضرت علیؓ کے دونوں صاحبزادوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے ساتھ انتہائی خوشگوار تھے۔ یہ دونوں حضرات دمشق جاتے تھے اور حضرت معاویہؓ ان کا اکرام فرماتے تھے، بڑے بڑے ہدایا پیش کرتے تھے۔ ایک بہت اہم بات ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ وہ قطعاً کسی موروثی اور خاندانی بادشاہت کی بنیاد رکھنے کے خواہشمند نہیں تھے۔ لیکن حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد پھر سوال پیدا ہوا کہ آیا امت کی قیادت کا مسئلہ حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے یا اس مسئلے کو طے کر دیا جائے۔ اس موقع پر کچھ حضرات نے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیں۔ تجویز پیش کرنے والوں میں ایک جلیل القدر

صحابی حضرت مغیرہؓ ابن شعبہؓ بھی شامل ہیں۔ ان کا تعلق نہ بنو ہاشم سے ہے نہ بنو امیہ سے۔ ...ور
کے رہنے والے ثقفی ہیں۔ ان کے شرفِ صحابیت کا اندازہ بھی اس بات سے کر لیجئے کہ یہ ...
رضوان میں شامل تھے۔ بیعتِ رضوان سنہ ہجری میں ہوئی اور اس وقت گفتگو ہو رہی ہے ...
کی۔ ان کا ۵۴ برس کا کردار سامنے ہے اور ہر چیز سے بڑھ کر اصحاب بیعتِ رضوان کے ...
کی گواہی قرآن حکیم میں ثبت ہے کہ:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ
إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ
فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ
السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ
فَتْحًا قَرِيْبًا ۝

(سورۃ الفتح آیت ۔ ۱۸)

(اے پیغمبر) اللہ مومنوں سے راضی
ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے
بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا
حال اس کو معلوم تھا۔ اس لئے اس نے
ان پر سکینت نازل فرمائی اور انعام میں
قریبی فتح عطا کی۔

پورے دورِ خلافت راشدہ میں حضرت مغیرہؓ ابن شعبہؓ کے پاس اہم عہدے رہے
یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہؓ (نعوذ باللہ) عہدوں اور مناصب کے بھوکے تھے۔ اس وقت
ان کی عمر بھی لگ بھگ ستر برس تھی۔ انتہائی مدبر اور معاملہ فہم شخصیت کے مالک تھے۔ حضرت
علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلافات میں انہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا۔ آج کچھ لوگ
کہتے ہیں کہ حضرت مغیرہؓ ابن شعبہ نے اپنی گورنری بچانے کے لئے یہ مشورہ دیا تھا۔ کہنے والے
بھی نہیں سوچتے کہ کیسے اذ اصحاب بیعتِ رضوان کے بارے میں وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم
تو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت مغیرہؓ ابن شعبہ
کے مشورے کے باوجود حضرت معاویہؓ متردد رہے۔ اس کے بعد مملکتِ اسلامیہ کے مختلف
علاقوں سے وفود آنے لگے جنہوں نے یہی مشورہ دیا۔ یہاں تک کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو
اپنا جانشین نامزد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ فیصلہ اجتہاد
پر مبنی ہے۔ وہ حضورؐ کے صحابی ہیں۔ ارشادِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم "الصحابۃ کلھم
عدول" کی روشنی میں کسی صحابی کی نیت پر ہم شک کریں گے تو ہمارا ایمان محفوظ نہیں۔ ہاں اجتہاد تو
غلط ہو سکتی ہے لیکن خطائے اجتہادی پر بھی مجتہد کو اکہرا ثواب ملتا ہے اور اگر اجتہاد درست
ہو تو دوہرا ثواب ملتا ہے۔ اس اجتہاد کے حق میں جو دلائل ہیں ان پر تفصیلی گفتگو میں "سانحہ کربلا"

تجزیہ میں کر چکا ہوں۔ جس شخصیت نے ۲۰ برس تک بلخ و بخارا سے لے کر بحر اوقیانوس تک
دریں سے لے کر ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تاریخ کی عظیم ترین سلطنت پر حکومت کی ہو، کیا
وہ سیاست و تدبر سے، معاملہ فہمی سے اور دور اندیشی سے تہی دست ہو سکتی ہے! حضرت معاویہؓ
نے دیکھا کہ کبار صحابہ کی پہلی نسل بالعموم اس دنیا سے جا چکی، اب ان کی اگلی نسل کے کچھ بزرگ موجود
ہیں۔ مثلاً حضرت علیؓ جا چکے ان کے بیٹے حضرت حسینؓ موجود ہیں، حضرت زبیرؓ جا چکے، عبداللہ ابنِ
زبیر موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ اللہ کے پاس جا چکے ان کے صاحبزادے عبداللہؓ موجود ہیں۔ دوسری
طرف عالمِ اسلام بہت وسیع ہو چکا۔ اس کی عظیم اکثریت نو مسلموں پر مشتمل ہے۔ اس لئے حکومت
کی وہ آئیڈیل صورت جو عہدِ خلافت راشدہ میں پائی جاتی تھی اب برقرار نہیں رہ سکتی جب تک
اس کی پشت پر کسی طاقتور قبیلے کی حمایت موجود نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ تھیں وہ وجوہات جن
کی بنا پر حضرتِ معاویہؓ نے یہ اجتہاد کیا۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ ان سے غلطی ہو گئی تھی تو میں اس
سے لڑوں گا نہیں۔ اگر غلطی تھی بھی تو اجتہادی غلطی تھی۔ حضرتِ معاویہؓ کے اس فیصلے سے
صرف پانچ اصحابؓ نے اختلاف کیا۔ انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت نہیں کی۔ ان
میں حضرت صدیق اکبرؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ، حضرت عمرؓ کے فرزند حضرت عبداللہؓ،
حضرت عباسؓ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ، حضرت زبیرؓ کے لختِ جگر حضرت عبداللہؓ اور حضرت
علیؓ کے نورِ نظر حضرت حسینؓ شامل تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ کا یہ تبصرہ بھی روایات میں
موجود ہے کہ "یہ قیصر و کسریٰ کی سنت کو جاری کیا جا رہا ہے۔"

یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے بعد حضرت معاویہؓ دس برس زندہ رہے لیکن انتہائی تدبر اور
دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے اس معاملے میں کسی پر کوئی سختی یا تشدد نہیں کیا
اور نہ ہی حضرت حسینؓ یا بیعت نہ کرنے والے دیگر اصحاب میں سے کسی نے اس فیصلے کے خلاف
کوئی احتجاج یا ہنگامہ کرنے کی کوشش کی

حکومتِ یزید اور اختلافِ صحابہؓ

جب حضرت معاویہؓ کا انتقال ہوا تو ایک حقیقی صورتحال نمودار ہوئی۔ پھر اجتہاد کا مرحلہ آیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ
بن ابی بکرؓ کا انتقال ہو چکا تھا۔ باقی چاروں حضرات نے جو اجتہادی رائے قائم کی اسے بھی سمجھ
لیجئے۔ حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ دونوں کی رائے یہ ہوئی کہ اگرچہ
فیصلہ غلط ہوا ہے لیکن کوئی کفر بھی نہیں ہوا۔ اتنا غلط بھی نہیں ہوا کہ ہم بغاوت کر دیں اور

ملتِ اسلامیہ کے اندر کوئی اختلاف وافتراق اور ہنگامہ کھڑا کردیں۔ ان دونوں اصحاب کے علم وفضل اور مقام ومرتبے کو بھی دیکھ لیجئے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس "حبر الامت[1]" کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ہماری تفسیری روایات کے سب سے بڑے راوی ہیں۔ آپ کے بارے میں حضورؐ کی دعا کتبِ احادیث میں موجود ہے کہ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ (اے اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا کردے اور علم تاویل[2] سکھا دے) کیا رسولؐ کی دعا قبول نہ ہوئی ہوگی! خاندانی قرابت بھی دیکھ لیجئے۔ والدؓ کی طرف سے حضرت حسینؓ کے چچا ہیں اس لئے کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ دونوں چچا زاد بھائی ہیں۔ والدہؓ کی طرف سے حضرت حسینؓ کے نانا ہیں اس لئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی چچا زاد بھائی ہیں۔ یہ ہیں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ــ حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ حدیث کے مستند ترین مختصر ترین اور مشہور سلسلہ روایت ــ سلسلة الذهب (سنہری زنجیر) کی پہلی کڑی ہیں (امام مالکؒ عن نافعؒ عن عبداللہؓ ابن عمرؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

اس کے برعکس حضرت عبداللہؓ ابن زبیرؓ اور حضرت حسینؓ ابن علیؓ کی رائے یہ تھی کہ اس غلط فیصلے کے خلاف ہمیں کھڑے ہو جانا چاہئے۔ چاروں حضرات نے اپنی اپنی اجتہادی رائے قائم کی۔ غلط کون تھا اور صحیح کون! اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ یہ فیصلہ تو اللہ کے ہاں ہوگا۔ ان کی اجتہادی رائے سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔ لیکن ان کی نیت پر حملہ کرنا ہمارے ایمان کے لئے خطرہ ہے۔ یہ اصحابِ رسولؐ ہیں۔ ان کی تربیت، ان کا تزکیۂ اور تجبیۂ روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ان کی نیت پر حملہ حضورؐ پر حملہ ہے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی شخصیت و مقام کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انکے والد حضرت زبیرؓ بن عوام جلیل القدر

---

[1] عربی زبان میں حبر کے لغوی معنی "دوات کی روشنائی" ہے۔ قدیم زمانے میں یہ لفظ استعارۃً ان بڑے علماء کے لئے استعمال ہوتا تھا جو تصنیف و تالیف کے کام میں روشنائی استعمال کرتے تھے۔ اردو میں [illegible]

[2] علوم قرآن میں "تاویل" کا لفظ عام طور پر تفسیر کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ تفسیر سے مراد آیات قرآنی کی ایسی تشریح و توضیح ہے جو قطعی اور یقینی ہو اور تاویل سے مراد ایسی ظنی تشریح و توضیح ہے جس کی بنیاد دلائل پر ہو مگر وہ مسلمات شرعیہ و لغویہ سے متناقض نہ ہو۔ امام ابن تیمیہؒ تاویل سے آیات کے معنی و تحقیق خارجیہ مراد لیتے ہیں۔

صحابیؓ ان کی والدہ جلیل القدر صحابیہ حضرت اسماءؓ خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بڑی صاحبزادی اور زوجۂ رسولؐ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن ۔ ایک نواسۂ رسولؐ ہیں حضرت حسینؓ دوسرے ایک نواسۂ صدیقِ اکبرؓ ہیں حضرت عبداللہؓ ابن زبیرؓ۔ ان دونوں کا فیصلہ تھا کہ ہمیں یزید کی خلافت قبول نہیں۔ اب وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ نواسۂ صدیقِ اکبرؓ نے نواسۂ رسولؐ کو پیش کش کی کہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ آپ یہیں پر قیام کیجیے۔ حجاز کی مقدس سرزمین کو اپنا مرکز بنائیے۔ یہاں بزرگ صحابہ کرام موجود ہیں۔ یہاں حرمین شریفین ہیں۔ ہمیں جو مزاحمتی تحریک چلانی ہے یہاں سے چلائیں گے۔

سانحۂ کربلا میں اہلِ کوفہ کا کردار

حضرت حسینؓ کا اپنا اجتہاد تھا انہوں نے سبائیوں کے مرکز کوفہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ کوفہ کیا تھا ایرانی نیشنلزم کے انتقام اور یہودی سازش کا مقامِ اتصال۔ ایرانیوں کی شاہ پرستی کا عالم آج بھی دیکھ لیجیے آج کے ایران میں شاہ کا بیٹا ایرانی ٹیلیویژن پر ظاہر ہوگیا۔ اسی سے چودہ سو برس پہلے کے جذبات کا اندازہ کرلیجیے۔ حضرتِ معاویہؓ کے بیس سالہ عہدِ حکومت میں انہیں اپنی ریشہ دوانیوں کا کوئی موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ ان کی وفات پر انہوں نے فوراً خطوط کا ایک سلسلہ قائم کردیا حضرت حسینؓ کے نام کہ آپ جلد از جلد تشریف لائیے۔ ہم نے کسی کی بیعت نہیں کی۔ ہم بسر و چشم آپ کی بیعت کریں گے۔ حالات کی تفتیش کے لئے حضرتِ حسینؓ نے حضرت مسلم بن عقیل کو بھیجا۔ ان کے ہاتھ پر ہزاروں لوگوں نے بیعت کرلی۔ انہوں نے فوراً حضرت حسینؓ کو پیغام بھیج دیا لیکن جونہی یزید نے عبیداللہ ابن زیاد کو گورنر بنا کر بھیجا ان کی وفاداریوں کا ملمع اتر گیا۔ نئے گورنر نے کسی کو قتل نہیں کیا قید نہیں کیا محض ایک دھمکی دی اور سب کے سب حضرت حسینؓ کی بیعت سے دستبردار ہوگئے۔ حضرتِ مسلم بن عقیل کو پناہ دینے والا کوئی نہ رہا۔ انتہائی کس مپرسی کے عالم میں انہیں شہید کردیا گیا۔ جب انہیں ابن زیاد کے پاس لے جایا جارہا تھا تو ایک کوفی نے انہیں روتا دیکھ کر پھبتی کسی کہ کیوں تم جیسے حوصلہ مند لوگ روتے ہیں؟ ... کے طلبگار رو دیا نہیں کرتے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا بدبخت میں اپنے لیے نہیں رو رہا میں حسینؓ کے لیے رو رہا ہوں۔ میں انہیں پیغام بھیج چکا ہوں۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ روانہ ہو چکے ہوں گے۔ اب خود اندازہ کیجیے سازشی کون تھا! جبکہ اس کے مقابلے میں مکہ میں حضرت عبداللہؓ ابن زبیرؓ کی حکومت بارہ برس تک قائم رہی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پورے حجاز اور عرب کے بعض دوسرے علاقوں کے مسلمانوں نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ نواسۂ صدیق اکبرؓ نے

نواسے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے بھی اگر میدان میں موجود رہتے تو یہ کتنی بڑی قوت بن جاتی۔ شاید کہ ملوکیت کا سلسلہ اسی وقت ختم ہو جاتا اور کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ حضرت حسینؓ کا ساتھ دیتے تو کربلا کا سانحہ پیش نہ آتا لیکن یہ فیصلہ کہیں اور ہوتا ہے۔ کوئی چیز ہونی ہوتی ہے تو وہ ہو جاتی ہے۔ یہ تقدیر کی باتیں ہیں۔

سانحۂ کربلا کی شخصیتوں کو پہچانئے۔ پہلی شخصیت ہے کوفے کا گورنر ابن زیاد یعنی زیاد کا بیٹا۔ دوسری شخصیت جسے لشکر دے کر حضرت حسینؓ کا مقابلہ کرنے بھیجا گیا ابن سعد یعنی سعد کا بیٹا۔ سعد کون؟ سعد بن ابی وقاص۔ صحابیٔ رسولؐ فاتح ایران۔ پھر ایک نام آتا ہے شمر کا۔ پھر ایک نام آتا ہے حُر کا۔ یہ چاروں نام اس سانحہ میں بہت اہمیت کے حامل ہیں لہٰذا اس وقت ہم انہی چاروں کا تعارف حاصل کرتے ہیں۔

ابنِ زیاد کا کردار

عبیداللہ ابنِ زیاد یعنی زیاد کا بیٹا عبیداللہ۔ پہلے باپ کو پہچانئے! پھر بیٹے کو۔ زیاد کا نام ابتدا میں زیاد ابنِ سمیہ یا زیاد ابن اب تھا۔ اس لئے کہ وہ مجہول النسب تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ باپ کون ہے۔ اس ضمن میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ دورِ جاہلیت میں ابوسفیان کہیں مہمان گئے۔ وہاں عرب کے رواج کے مطابق رات کو انہیں سمیہ نامی لونڈی پیش کی گئی۔ وہ ابوسفیان سے حاملہ ہوئی اور جو لڑکا پیدا ہوا اس کا نام تھا زیاد۔ کنیز چونکہ کسی اور کی تھی اسے بھی یہ معلوم تھا کہ یہ لڑکا میری صلب سے نہیں ہے اس لئے لڑکے کا نسب رواج کے مطابق باپ کی بجائے ماں سے منسوب کیا گیا۔ یا یہ کہا گیا کہ زیاد ابنِ اب یعنی زیاد اپنے باپ کا بیٹا۔ حضرت ابوسفیانؓ بھی اس حقیقت سے باخبر تھے اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کو بھی بتا دیا تھا کہ یہ شخص میری صُلب سے ہے۔ میرا بیٹا ہے۔ یہ شخص بہت ذہین، معاملہ فہم اور ذکی تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں کئی مناصب پر فائز رہا۔ پھر حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بصرے کا گورنر تھا۔

اس ضمن میں ایک اہم اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے جھگڑے میں اس نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا۔ حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کی صلح کے بعد بھی ایک عرصے تک اس نے حضرت معاویہؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ ترکستان کے علاقے میں اپنا مرکز بنا کر باغیانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ آخر کار حضرت مغیرہ ابن شعبہ کی کوششوں سے یہ دمشق میں حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے والد کی وصیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسے اپنا بھائی تسلیم کیا اور یوں اس صلح کے نتیجے میں اسے زیاد بن ابی سفیانؓ کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ ۵۳ھ میں

ال ہوا۔ اس کا بیٹا ہے عبید اللہ ابن زیاد گورنر کوفہ ـــ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شخص یقیناً
سازش کے اندر شریک ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یزید نے سانحۂ کربلا کے بعد اس شخص کا ذکر
ذ میں کیا ہے اللہ سمیہ کی نسل پر لعنت کرے ۔ اس نے وہ کچھ کیا جس سے کم پر میں راضی ہو سکتا
لیکن نوٹ کیجئے کہ یزید دمشق میں ہے اور یہ معاملہ ہوا کوفے کے قریب کربلا میں۔ سینکڑوں
کا فاصلہ ہے۔ آج کل کی طرح مرکز سے ہر وقت رابطہ ممکن نہیں۔ ایک حکم ملا ہوا ہے کہ حضرت
ے بیعت لینی ہے۔ اس حکم کی آڑ میں اس نے ساری من مانی کی۔ اس نے پہلا لشکر
مرو بن سعدؓ بن ابی وقاص کی قیادت میں۔ یہ لشکر رَے پر حملے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ابن زیاد
ے کربلا کی طرف روانہ کر دیا۔ عمرو بن سعدؓ نے کوشش کی کہ حضرت حسینؓ سے مصالحت ہو جائے
شکر کے ہراول دستے کے طور پر حُر آئے تھے۔ ان کے والد کا نام بھی یزید تھا جسے آج گالی
یا ہے ـــ حُر بن یزید تمیمی ـــ حضرت حُر نے حضرت حسینؓ کی تقریریں سنیں اور حضرت
کے لشکر میں شامل ہو کر جام شہادت نوش کیا۔ آئے تو وہ بھی تھے ابن زیاد کے بھیجے ہوئے
ے ساتھ لیکن لشکر میں لوگ ملے جلے ہوتے ہیں۔ ان میں سازشی بھی ہوتے ہیں۔ لشکر میں ایسے
ہوتے ہیں جنہیں معلوم ہی نہیں کہ ہو کیا رہا ہے۔ انہیں تو یہی بتایا گیا ہے کہ کوئی
ت ہے اسے فرو کرنا ہے۔ آج بھی ہر سپاہی کو تو ملٹری آپریشن کا مقصد نہیں بتایا جاتا۔
سعدؓ نے جب لیت و لعل کی پالیسی اختیار کی تو ابن زیاد نے غصے سے بھرا ہوا خط لکھا کہ اگر
اقدام نہیں کر سکتے تو قیادت شمر ذی الجوشن کے حوالے کر دو۔ اس وقت عمرو بن سعدؓ حضرت
راستہ بھی اختیار کر سکتے تھے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ ان کا منصب ان کے پاؤں کی
ن گیا۔

حضرت حسینؓ کی شرائط اور سبائیوں کا ردِ عمل

اب آئیے معاملے کی اصل حقیقت کی طرف۔ حضرت حسینؓ نے کوفیوں کے لشکر
تقریریں کیں۔ ایک ایک کوفی کا نام لے کر کہا کہ اے فلاں ابن فلاں کیا تم نے مجھے خط نہیں لکھے
یہ تمہارے خطوط میرے پاس موجود ہیں۔ انہوں نے کہا نہیں نہیں تم جھوٹ بولتے ہو ہم نے
خط نہیں لکھا۔ درحقیقت حضرت حسینؓ کی پیشکردہ تینوں شرائط میں سے کسی ایک کی منظوری
صورت میں ان سبائی کوفیوں کو اپنی سازش کا بھانڈہ پھوٹتا نظر آ رہا تھا۔ حضرتِ حسینؓ نے تو
شش کی تھی کہ مجھے واپس لوٹ جانے دو وہاں جہاں سے میں آیا ہوں یا مجھے دمشق جانے

دو میں یزید سے خود معاملہ طے کرلوں۔ بعض روایات میں تو یہاں تک الفاظ آتے ہیں
اسی طرح اُس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں جس طرح میرے بھائی نے اس کے ہاتھ
میں ہاتھ دیا تھا اور اگر یہ بھی قبول نہیں تو مجھے جہاد کے لئے سرحدوں پہ جانے دو تاکہ تو سیع
محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اپنی زندگی کھپادوں اور اندر کے ان خرخشوں سے میرا دامن صاف
ہوجائے۔ وہ سازشی گروہ جنہیں صلح کی صورت میں اپنا بھانڈا پھوٹتا نظر آتا تھا انہوں
جلدی مچائی، صلح نہیں ہونے دی۔ انہوں نے حضرت حسینؓ اور ان کے قافلے کو شہید
یہ سب عبد اللہ ابن سبا کے پیروکار تھے۔ یہ مسلمانوں کی خانہ جنگی نہیں تھی بلکہ سبائیوں کی بہت
سازش تھی۔

مماثلتِ معاویہؓ و حسینؓ ایک اہم نکتہ جو سانحۂ کربلا میں بیان نہیں ہوتا یہ کہ حضرت حسینؓ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہتھیار ڈال کر دو۔ SURRENDER کردو۔ یہ بات صرف ان کی شجاعت اور حمیت کے منافی ہی نہ
بلکہ حضرت حسینؓ کو صاف نظر آرہا تھا کہ اپنے آپ کو ان لوگوں کے حوالے کر دینے کے بعد
یزید تک نہیں جانے دیا جائے گا بلکہ یہیں ان کی گردن اڑا دی جائے گی۔ لہٰذا حضرت
نے فیصلہ کیا کہ اگر مرنا ہی ہے تو اس طرح نہیں مرنا بلکہ بقول شاعر ؎

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا آلودہ خوں سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

حضرت حسینؓ کو اس طرح لاچار ہو کر مرنا پسند نہیں تھا۔ اگر حضرت حسینؓ ان کے
ہتھیار ڈال دیتے تو کوئی انہیں اپنے خلاف دستاویزی ثبوت لے کر دمشق کے دربار تک
جانے نہ دیتے فوراً ان کی گردن اڑا دیتے۔ لہٰذا حضرت حسینؓ نے شجاعت کے ساتھ لڑتے
ہوئے اپنی جان اور اپنی آن کی مدافعت کرتے ہوئے عزت کے ساتھ شہادت کی موت کو
کیا۔ حضرت علیؓ کے مقابلے میں حضرت معاویہؓ کی کیفیت بھی کچھ یہی تھی۔ حضرت معاویہؓ کو نظر
کہ حضرت علیؓ کو سبائی سازشیوں نے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ یہ سبائی ہی تھے جو ہر موقعے پر صلح
راستے میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔ ورنہ جنگِ جمل کے موقع پر بھی صلح ہو رہی تھی۔ جنگِ صفین کے موقع
بھی صلح ہو رہی تھی۔ حضرت معاویہؓ سمجھتے تھے کہ اگر میں ہتھیار ڈالتا ہوں تو مجھے حضرت علیؓ تک

نہیں دیا جائے گا ۔ فوراً میری گردن اڑا دی جائے گی ۔ ورنہ حضرت معاویہؓ نے کبھی یہ نہیں کہا
کہ مجھے علیؓ کی خلافت منظور نہیں اور نہ ہی انہوں نے کبھی خلافت کی بیعت لی ۔ ان کا مطالبہ صرف یہ
تھا کہ پہلے ان سازشیوں سے اپنے آپ کو علیحدہ کیجئے ۔ جن کے ہاتھ عثمانؓ کے خون سے رنگین ہیں
انہیں اپنے ارد گرد سے ہٹائیے ۔ حضرت علیؓ یہ فرماتے تھے کہ میرے پاس طاقت نہیں ۔ آپ میرا
ساتھ دیں تو میں انہیں ہٹاؤں ۔ یہ عقدہ لاینحل تھا جو حل نہ ہو سکا ۔ یہ الجھن تھی جس پر قابو نہ
پایا جا سکا ۔ حضرت حسینؓ اور حضرت معاویہؓ کے حالات میں فرق صرف یہ تھا کہ کربلا میں حضرت حسینؓ
کے ان ساتھیوں نے جنہوں نے خط لکھ لکھ کر انہیں بلایا تھا ان سے بے وفائی کی جبکہ جو لوگ حضرت
علیؓ کے مقابلے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھی تھے وہ آخر وقت تک ان کے وفادار رہے ۔ ورنہ
صورتحال وہاں بھی یہی ہوتی ۔ حضرت معاویہؓ بھی اسی طرح شہید کر دیئے جاتے جس طرح حضرت
حسینؓ شہید کر دیئے گئے اور اگر ان کے پاس بھی طاقت نہ ہوتی تو وہ کبھی ہتھیار نہ ڈالتے ، سرنڈر
نہ کرتے ۔ ان حقائق کو سمجھئے اور اگر کہیں اختلاف ہو تو دلیل کا جواب دلیل سے دیجئے ۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں بہت سے دوستوں کے ذہن میں ابھرنے والی ایک الجھن کو رفع کرنا بھی ضروری ہے ۔ سوال پیدا ہوتا
ہے کہ ان حقائق کا بیان کرنا کیوں ضروری ہے ! اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر
لیجئے کہ غلبہ دین کی جدوجہد اور اسلامی انقلاب کی تیاری کے لئے لازم ہے کہ ہم اللہ
کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین
کے کردار پر جو بھی حملے کئے جاتے ہیں ان کا دفاع کریں ۔ کیونکہ ان کا طرز عمل ، ان کا
کردار ہماری ساری جدوجہد کے لئے دلیل و برہان اور نمونے کا درجہ رکھتا ہے ۔

بالفاظِ قرآن :-

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ	محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ
مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ	ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت
رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ	اور آپس میں رحیم ہیں ۔ تم جب
رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ	دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور
فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا	اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی
سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ	کی طلب میں مشغول پاؤ گے سجود

مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط (سورۃ الفتح آیت ۲۹) کے اثرات اُن کے چہروں پر موجود ہیں۔ جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔

جب تک یہ تاریکیاں چھانٹ نہ دی جائیں گی جب تک یہ مغالطے رفع نہ ہو جائیں گے اُس وقت تک لوگ دین کی جدوجہد کے لئے کھڑے نہیں ہوں گے۔ ان کے سامنے تو یہ تصویر بھی پیش کی جا رہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جماعت تیار کی تھی اُس میں چند گنے چنے صاحب ایمان تھے۔ اکثر منافق تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو نہ منافق تھے نہ مومن۔ اللہ کے آخری رسولؐ کو تیئیس برس کی محنت کا یہ نتیجہ بتایا جا رہا ہے۔ اُن کے تین خلفاء کو غاصب کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک دن کے لئے بھی صحیح اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی اور جب اُس وقت نہیں ہوئی تو اب کہاں سے ہو جائے گی! معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ ان باتوں کو سن کر کسی کے دل میں یہ جذبہ ابھر سکتا ہے کہ یہ کام دوبارہ ہو سکتا ہے۔ خدا کے رسولؐ کے کام کا جب یہ حشر ہوا تو آج کوئی کیا کر سکتا ہے۔ جب تک ان حقائق کو سامنے نہیں لایا جائے گا لوگوں کی غلط فہمیاں کیسے دور ہوں گی۔

موجودہ حالات میں ہمارا طریق کار

ہمارا یقین اور ایمان ہے کہ ایک دن اللہ کا دین پھر دنیا پر غالب ہو کر رہے گا اور وہ وقت اب دور نہیں ہے لیکن اس کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی وہ طریق کار سیکھنا پڑے گا اور اختیار کرنا پڑے گا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے اختیار کیا۔ امام مالکؒ کا قول میں آپ کو بارہا سنا چکا ہوں کہ "اس اُمت کے آخری حصے کی اصلاح بھی اُسی طرح ہوگی جس طرح اس کے پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی" ایک ادنیٰ اُمتی کی حیثیت سے میں نے بھی اُسی کا آغاز کیا ہے۔ فَبِذٰلِكَ فَاَدْعُ میں بھی اُسی دین کی طرف بلا رہا ہوں۔ میری قوم میں فرقہ واریت کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔ میں نے کسی مسئلے کو ISSUE نہیں بنایا۔ آج تک نور و بشر کا مسئلہ نہیں چھیڑا۔ علم غیب کے مسئلے میں میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ بات دونوں طرف کی صحیح ہے صرف تعبیر کا فرق ہے۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ

ہر اشخص صرف مسلمان کی حیثیت سے نمایاں ہو۔ کیوں کہ مجھے دعوت پیش کرنی ہے
اقامتِ دین کی غلبۂ اسلام کی اور انقلابِ اسلامی کی۔ جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے کہ

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ (سورۃ الشوریٰ آیت ۔ ۱۵)

پس (اے نبی) اسی (دین) کی طرف بلاؤ اور جس طرح کا بھی حکم دیا گیا ہے اُس پر مضبوطی سے قائم رہو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا۔

ہم کسی کے دباؤ میں آکر کسی کی خواہشات کی پیروی نہیں کریں گے۔ دلیل سے ہماری بات بدلی جا سکتی ہے۔ میں کبھی یہ نہیں کہتا کہ میری رائے میں غلطی کا امکان نہیں۔ کوئی دلیل سے میری غلطی واضح کردے سر تسلیم خم کروں گا۔ لیکن طاقت کی دلیل سے یہ گردن نہیں جھکے گی۔ یہ گردن کٹ سکتی ہے۔ طاقت کی دلیل سے جھک نہیں سکتی۔

اے اہلِ لاہور! میں آج آپ سے پوچھتا ہوں کیا میں تیس برس سے آپکے سامنے کتاب اللہ کا پیغام پیش نہیں کر رہا ہوں۔ میرا سارا کام میری ساری دعوت قرآن کے حوالے سے ہے۔ میں حدیث رسول کا منکر نہیں ہوں نہ اسکی اہمیت کو کم سمجھتا ہوں لیکن میں نے اپنا اصل موضوع اُسے نہیں بنایا۔ اصل موضوع اللہ کی کتاب کو بنایا ہے۔
اس کتاب پر ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم عدل کریں۔ جو بات کہیں اُس میں عدل ہو۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۔ (سورۃ الشوریٰ آیت ۔ ۱۵)

اور ان سے کہہ دو کہ " اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔

ہمیں عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر زیادتی کی گئی ہے تو اُس زیادتی کو زیادتی کہا جائے۔ چاہے وہ آج کا کوئی فرعون کر رہا ہو یا آج کا کوئی ہامان کر رہا ہو۔ خواہ مذہبی فرقوں کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہو یا سیاسی جماعتوں کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہو تو ہم سچ کو سچ کہیں گے اور جھوٹ کو جھوٹ۔ میں بھی آج اُسی عزت گذارش کر رہا ہوں

جیسے امام احمدؒ ابن حنبل نے فرمایا تھا "ایتونی بشیء من کتاب اللہ وسنۃ رسولہ حتیٰ اقول" لاؤ میرے پاس کوئی دلیل اللہ کی کتاب سے یا اُس کے رسول کی سنت سے میں مان لوں گا۔ لیکن کتاب وسنت کی دلیل کے بغیر احمدؒ ابن حنبل ہرگز نہیں مانے گا اس کی چمڑی ادھڑ جائے چاہے اُس کے جسم کے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں۔ ہم بہت کمزور ہیں لیکن دل میں اُنہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی آرزو ہے۔ اُنہی کے راستے کو ہم نے راستہ سمجھا ہے۔ یہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا راستہ ہے۔ صحابہؓ کرام کا راستہ ہے آئمہ اور محدثین کا راستہ ہے۔ ہمارے صلحاء اور صوفیاء کا راستہ ہے۔ کیا امام ابوحنیفہؒ جیل میں نہیں ڈالے گئے! کیا امام مالکؒ کے کندھے نہیں اکھڑوا دیئے گئے! کیا احمد سرہندی کو قید نہیں کیا گیا! کیا احمد ابن حنبل کو کوڑے نہیں پڑے! یہ سب کچھ ہوتا رہا یہ تو اس باغ کے پھول ہیں۔ یہ اس راہ کے سنگِ میل ہیں۔ یہ تو ہماری ہمتوں کو بڑھانے اور ہمارے ارادوں کو بلند کرنے والی مثالیں ہیں۔

آخری گذارش یہ ہے کہ گذشتہ دنوں میں مجھے بے حساب گالیاں دی گئیں۔ میرے بزرگوں کو گالیاں دی گئیں۔ میں واقعتہً آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری طرف سے کوئی جواب دیجئے۔ اس طرح تو آپ میرے اجر و ثواب کو کم کر دیں گے۔ ان گالیوں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں معلوم میری اور میرے بزرگوں کی کتنی خطاؤں کا کفارہ ہو گیا ہے۔ البتہ ہر وقت دلیل سے سمجھنے سمجھانے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ قطعاً کسی سے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ امن و امان بہرصورت برقرار رکھیں۔ کہیں کوئی غلط اقدام نہ کیجیے۔ ہم تو اُس راستے پر چلنے کا عزم رکھتے ہیں جس پر چلتے ہوئے بارہ برس تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کو حکم تھا کہ تمہارے ساتھ کچھ بھی کیا جائے تم ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ ہم حضرت عثمانؓ کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ ہم حضرت ہابیل کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ حضرت حسینؓ کا اسوہ بھی ہمارے لئے اسوہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اور ہو گا کہ ہمیں اپنے دفاع میں ہاتھ اٹھانا پڑے۔ لیکن موجودہ حالات کے حوالے سے میں قرآنی الفاظ میں اعلان کر رہا ہوں کہ ان جھگڑوں کا فیصلہ تو اس احکم الحاکمین کی عدالت میں ہوگا آپ بہرصورت اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں:

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا اَعْمَالُنَا	اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب
وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا	بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور

وَبَيْنَكُمْ ۚ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝	تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ایک
(سورۃ الشوریٰ آیت : ۱۵)	روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔

مجھے قتل کی جتنی دھمکیاں ملی ہیں اور میرے قتل کی جتنی افواہیں اڑی ہیں وہ آپ کے علم میں ہیں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا کہ اگر ایسا ہو جائے تو اس سے بڑی سعادت کیا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دو ر سازشی میری ساری خطاؤں کا ذمہ لیتا ہے تو میرے لئے یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ اگر کسی دل درجے میں بھی آخرت کا یقین ہے تو اس سے زیادہ نفع کا سودا اور کوئی نہیں۔ میں اس کے لئے تیار رہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے لیکن پھر میری یہ گذارش ہے کہ اس پر کسی درجے میں کوئی اشتعال نہیں ہونا چاہیئے۔ زبان تک استعمال نہ کیجئے۔ جو ہوگا میرے ساتھ ہوگا۔ میرے لئے بڑی سعادت ہوگی۔ قرآن کو فرمان شہداء کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ :

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۚ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝	اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو۔ ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔
(سورۃ البقرہ ، آیت : ۱۵۴)	

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزوئے شہادت کتنی اثر انگیز ہے

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنِّيْ اُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيَا ، ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ، ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ	قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ میری انتہائی آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔
(صحیح بخاری، کتاب الجہاد : باب ۷ تمنی الشہادۃ)	

حضرت عمرؓ کی دعا کیا تھی۔ یہ بھی صحیح بخاری میں ہے۔ کتاب فضائل مدینہ (باب ۱۲) ابن حضرت زیدؓ اور ام المومنین حضرت حفصہؓ کی روایت وسیع ہے کہ خلیفہ ثانی امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے رب سے عرض کیا کرتے تھے

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَہَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ، وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ
رَسُوْلِکَ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلّم (اے اللہ مجھے اپنے دین کی راہ میں شہادت عطا کر ا
میری موت تیرے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے شہر میں ہو)

عمر فاروقؓ کی دعا کے آخری حصے کا پس منظر بھی سمجھ لیجیے۔ ایک مرحلے پر ایران کے جہا
کو شکست ہوئی تو حضرت عمرؓ نے خود محاذِ جنگ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر حضر
نے انہیں روکا۔ اس وقت حضرت عمرؓ کے دستِ راست حضرت علیؓ ہی تھے۔ حکومتی
نظام پورا بیکر زریت حضرت علیؓ کے حوالے تھا۔ حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے کہ لَوْلَا عَ
عُمَرُ: اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو گیا ہوتا۔ کیوں فرمائی حضرت عمرؓ نے یہ بات۔ حضر
کے عہدِ خلافت میں حکومتِ اسلامیہ کی حدود اس تیزی سے پھیل رہی تھیں کہ اگر اس
پشت پر وہ انتظامات نہ ہوتے جو حضرت علیؓ نے کئے تو تباہی ہو جاتی۔ حضرت علیؓ بہت
تھے حضرت عمرؓ کی حکومت کے۔ حضرت عمرؓ کے سفرِ ایران کے ارادے پر حضرت علیؓ نے ف
کہ چکی اسی وقت تک چلتی ہے جب تک اس کا دھرا اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ آپ کی حیثیت
وقت اس امت کے اور عالمِ اسلام کے دھرے کی سی ہے۔ آپ اپنی جگہ سے ہل گئے تو عالمِ ا
کی چکی چلے گی کیسے! اس پس منظر میں دیکھیے کہ حضرت عمرؓ شہادت بھی مانگ رہے ہیں لیکن مد
میں مانگ رہے ہیں۔ اور اللہ نے شہادت دے دی۔ تو کیا اس میں حضرت عمرؓ کا کوئی گھا
نہیں تو زندگی کی تمنا ہی نہیں تھی۔ جس کا ایمان آخرت پر ہو وہ زندگی کی تمنا کبھی کر ہی
سکتا۔ قرآن یہود سے یہی تو کہتا ہے اگر تمہیں خیال ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور آخرت کا
تمہارے لئے محفوظ ہے تو موت کی تمنا کرو۔

قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ	ان سے کہو اگر واقعی اللہ کے نزدیک
الْاٰخِرَۃُ عِنْدَ اللّٰہِ خَالِصَۃً	آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر
مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا	صرف تمہارے لئے مخصوص ہے۔ تب
الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝	تو تمہیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو
(سورۃ البقرہ آیت: ۹۴)	اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔

لہٰذا میرے لئے تو ان دھمکیوں میں نوید جانفزا ہے۔ لیکن ایک بات میں سمجھا دینا چاہتا
ہر شخص کو ہر سازشی کو خواہ وہ کسی کا آلۂ کار ہو کسی اندرونی طاقت کا یا بیرونی قوت کا۔ سن
جان لے کہ ڈاکٹر اسرار اب کسی فرد کا نام نہیں ہے، ایک فکر کا عنوان بن چکا ہے، ایک تحریک

ـت بن چکا ہے۔ وہ تحریک اقامتِ دین کی تحریک ہے، کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے۔ اسی
... مثال دیکھ لیجئے، شاہ ایران نے ڈاکٹر علی شریعتی کو قتل کروا دیا تو کیا ان کی فکر بھی ختم ہو گئی
ں۔ انقلاب ایران کو عظیم قیادت تو بہرحال خمینی صاحب کی صورت میں ملی۔ لیکن اس کی پشت
جو فکر تھا وہ ڈاکٹر علی شریعتی کا تھا۔ وہ ان کی کتابیں تھیں اور ان کا فکر تھا جس نے لوگوں کے
... آگ بھر دی تھی۔

فکر کبھی نہیں مرتا جو انقلابی فکر کتاب اللہ کے حوالے سے اس پاکستان میں گزشتہ تیس
...ں سے پھیل رہا ہے اور آج لاکھوں کیسٹوں کی صورت میں ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے وہ
شاء اللہ اپنے نتائج ظاہر کرے گا۔ وہ میرا فکر نہیں ہے وہ اللہ کی کتاب کا پیغام ہے۔ اللہ کے
...ول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ہے۔ آپ سے صرف اتنی گذارش ہے کہ ہر شخص اپنے فرض کو پہچانے
...، فکر کو پھیلائیے۔ اقامتِ دین کی تیاری کرے۔ اپنی قوتوں کو دوسری باتوں میں ضائع
...رنے کی بجائے ہمیں اپنا پورا وقت اور پوری صلاحیتیں قرآن کی اس دعوت کو پھیلانے پر صرف
...رنی ہیں اور ایک ایسی جمعیت تیار کرنی ہے جو اس قرآن کے انقلاب کے لئے تن من دھن
...انے کے لئے تیار ہو۔ ہمیں اپنے اسی مثبت کام سے کام رکھنا ہے۔ ان وقتی خرخشوں اور جھگڑوں
...طرف متوجہ ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے اغیار کی سازشوں کو خود برگ و بار لانے کا موقع
...ے دیا ہے۔ اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المومنین والمومنات

نجوم ہدایت

اُمِّ حکیم بنت الحارث

رضی اللہ عنہا

تحریر: عائدہ مہاجر ○ ترجمہ: ابو عبدالرحمٰن شبیر احمد بن نور احمد

ام حکیم رضی اللہ عنہا کا مثالی کردار اس بات کی واضح شہادت ہے کہ اسلام نے اہل ایمان کے اندر ایک حقیقی تبدیلی کی طرح ڈالی ہے خواہ اسلام قبول کرنے والے مرد ہوں یا عورتیں۔

ام حکیم بنت الحارث بن ہشام المخزومی کے حالات کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل حقائق ...رے سامنے آتے ہیں:

والد کا نام الحارث بن ہشام بن المغیرۃ المخزومی ہے۔ قریش کے سردار اور سیاسی لیڈر ...بی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قبول اسلام کے بھی اسی قدر خواہش مند تھے جس طرح آپ کی خواہش تھی... ان کا بھائی الحکم بن ہشام (ابو جہل) اسلام قبول کرے۔ اللہ تعالیٰ نے الحارث بن ہشام کو ...م توفیق بخشی کیونکہ وہ نیک طینت اور سلیم الفطرت تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ...ی ہے:

"الحارث خود بھی سردار ہے اور ان کا والد بھی سردار قوم تھا۔ میری دلی خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اسلام قبول کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔"

ام حکیم کی والدہ کا نام فاطمہ بنت الولید بن المغیرہ ہے۔ یہ حضرت خالد بن الولید کی ہمشیرہ ...یں (واضح رہے کہ حضرت خالد بن الولید کا لقب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیف اللہ ...مسلول تجویز فرمایا تھا)۔ ام حکیم اپنے خاوند حضرت عکرمہ بن ابی جہل کے ساتھ ہی فتح مکہ کے موقع پہ ...یمان لائی تھیں

ام حکیم کے خاوند کا نام عکرمہ بن ابی جہل ہے۔ یہ قریش کے سرکردہ لیڈروں میں سے تھا ...فتح مکہ کے دن یمن کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ ام حکیم کی خواہش تھی کہ وہ اسلام کی نعمت سے محروم ...ہ رہے۔ لہٰذا اس نے اپنے خاوند کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کی۔ ...پ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام حکیم کی سفارش قبول فرمائی۔ چنانچہ وہ دوڑی دوڑی ساحل جدہ پہ

اپنے خاوند کے پاس گئی اور اسلام کے بارے میں مطمئن کیا۔ تب عکرمہ واپس مکہ آئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عکرمہ کا ان الفاظ سے استقبال کیا۔

"چھوڑ کر جانے والے کو خوش آمدید"

اس پُرخلوص جملے نے عکرمہ کا دل مطمئن کر دیا اور وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔ ... کو شدید احساس لاحق ہوا کہ وہ نیکی اور بھلائی میں دوسروں سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پختہ عزم کر لیا کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے اس کی تلافی کریں گے۔ یہ سارے ... حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں حدود شام پر جہاد میں پیش پیش رہے

ـــــــ ایک ایک فرد نے اپنی ندامت کا اظہار کیا کیونکہ وہ اسلام قبول کرنے میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے تھے۔ الحارث بن ہشام نے ان الفاظ میں اپنی حسرت کا اظہار کیا:

"یہ جہاد کے لئے نکلنا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سفر کرنا ہے۔ میں تمہارے مقابلے میں کسی دوسرے کو ترجیح نہیں دوں گا۔ یہ جہاد کا کام تو ایک وقت سے جاری ہے قریش کے دیگر نوجوان تو عرصے سے اس میں شریک ہیں۔ قسم بخدا اگر مکے کے پہاڑ سونا ہو جائیں اور ہم انہیں راہِ خدا میں خرچ کر ڈالیں، تب بھی ہم ان کے ایک دن کی نیکیوں کو نہیں پہنچ سکتے۔ اگر یہ لوگ دنیا میں پہل کر کے آگے نکل گئے ہیں تو ہماری انتہائی کوشش ہوگی کہ آخرت میں نیکیوں کے اعتبار سے ان کے قریب پہنچ جائیں۔"

حضرت ام حکیم رضی اللہ عنہا کے خاوند حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ نے اپنے ایمان کی سچائی اور گذشتہ زندگی میں ہونے والی کوتاہی پر اظہار افسوس و شرمندگی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان الفاظ سے کیا۔

"اللہ کی قسم! جس قدر دولت میں اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنے کے لئے خرچ کرتا تھا اب میں اس سے دوگنا اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا۔ اور جس قدر میں باطل کی خاطر لڑا تھا اس سے دوگنا اللہ کی راہ میں لڑوں گا اور اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کی ذاتِ گرامی کو اس عہد پر گواہ بنا رہا ہوں۔"

غزوۂ یرموک کے موقع پر ام حکیم کے والد حضرت الحارث بن ہشام اور خاوند حضرت عکرمہ بن ابی جہل حضرت خالد بن الولید کی سرکردگی میں لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔ اور ان دونوں

اور وہ اس جنگ میں ایسا مثالی تھا جو ہر مسلمان کے لئے آج تک مشعلِ راہ ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

حضرات حارث، عکرمہ اور سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہم شدید زخمی ہو گئے۔ پانی لایا گیا جبکہ یہ حضرات موت کے منہ تک پہنچ چکے ہیں۔ ہر ایک نے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرے کی طرف بھیجا اور جس کے پاس بھی پانی پہنچا اس نے دوسرے کو پلانے کی سفارش کی۔ اس ایثار و قربانی کے عالم میں وہ اپنے رب کے ہاں پہنچ گئے اور کوئی بھی پانی نہ پی سکا۔

والد اور خاوند کی شہادت کے بعد بھی ام حکیم رضی اللہ عنہا پر کوئی مایوسی طاری نہیں ہوئی بلکہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ جہاد میں شریک رہیں۔ اتنے بڑے اندوہناک سانحہ پر بھی صبر کا مظاہرہ کیا۔ اللہ کی رضا کی خاطر قطعاً جزع فزع نہیں کی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ حضرت ام حکیم کو اس طرح بے خاوند چھوڑ دیں خاص طور پر جب کہ کوئی محرم رشتہ دار بھی ہمراہ نہیں ہے۔ کئی ایک صحابہ نے پیغام نکاح بھیجا جن میں سے یزید بن ابی سفیان اور خالد بن سعید بن العاص خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ام حکیم نے خالد بن سعید سے رشتہ داری قبول کر لی۔ حضرت خالد بن سعید ابتدائی دور میں اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد اسلام لائے۔ عدت مکمل ہونے کے بعد حضرت خالد نے نکاح کر لیا۔ اس وقت اسلامی لشکر "مرج الصفر" کے مقام تک پہنچ چکا تھا۔ حضرت خالد نے جلد رخصتی کا اظہار کیا۔ حضرت ام حکیم نے کہا، اس لشکر کے ہٹ جانے کے بعد ایسا کر لیں۔ حضرت خالد نے کہا میرا دل کہتا ہے کہ میں اس جگہ شہید ہو جاؤں گا۔ تو حضرت ام حکیم نے کہا تو پھر ٹھیک ہے۔ حضرت خالد نے صفر والے پل کے پاس شب زفاف منائی اور یہیں ولیمہ کیا۔ اس مناسبت سے اس جگہ کا نام "ام حکیم پل" رکھ دیا گیا۔

شادی کی یہ ایک نرالی شکل ہے۔ لیکن سلف صالحین کے نکاح اسی طرح سادگی سے ہوا کرتے تھے۔ اگر آج کے دور میں کوئی مسلمان خاتون ایسا کرے تو اسے "بے وفائی" کا نام دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے تو انداز فکر ہی بدل دیا ہے۔ مادہ پرستی نے ذہنوں کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ دل و دماغ کا معیار سوچ بدل کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں

اپنے رواجات کے مطابق اسلام کو نہیں ناپنا اور دیکھنا چاہیئے۔

——— صبح ہوتے ہی رومیوں نے اپنی صفیں سیدھی کرلیں اور دور دور تک [illegible] موجیں مار رہی تھیں، حضرت خالد بن سعیدؓ ام حکیم کے دوسرے اور نئے خاوند [illegible] لئے نکلے، لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔ دوران جنگ اس المناک حادثے سے بھی [illegible] بالکل نہیں گھبرائیں، اپنے خاوند کی شہادت کے غم کے بدلے اللہ سے اجر کی امید نے اور جری اور بہادر کردیا، اپنے کپڑوں کو اچھی طرح کس کے خود جنگ میں کود پڑیں [illegible] شادی کی زینت بھی ابھی باقی تھی اسے اتارنے کا انہیں موقع بھی نہ مل سکا۔ جو خیمہ [illegible] ایک رات کے لئے قائم ہوا تھا۔ ام حکیم نے اپنے خیمے کا کھونٹا ہاتھ میں لے کر اس قدر [illegible] غدا سے جنگ کی کہ سات رومیوں کو جہنم کے گھاٹ اتار دیا۔ اس طرح انہوں نے [illegible] بات کا مثالی نمونہ پیش کیا کہ ذاتی محبت کے مقابلے میں اللہ کی رضا مومن کے دل پر [illegible] غالب رہتی ہے۔

ام حکیم نے اپنے کردار سے یہ بات بھی واضح کردی کہ حقیقی خوشی اسی دن [illegible] جس دن اسلام غالب ہوجائے اور حقیقی غم اس دن ہوتا ہے جس دن اسلام کا جھنڈا [illegible] ہوجائے، ذاتی حالات کا اثر لئے بغیر جوش ایمان اس وقت تک ٹھنڈا نہیں ہوتا [illegible] تک اسلام کے جھنڈے کو لہلہاتے نہ دیکھ لیا جائے۔ اہل ایمان کو سچی خوشی تو اللہ [illegible] بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ ہمارے دور کی عورتیں اپنے جذبات پر اس قدر قابو رکھ سکتی ہیں یا نہیں؟ جیسا کہ ام حکیم نے عملاً کر دکھایا۔ رضی اللہ عنہا وعن جمیع الصحابیۃ —

(ماخوذ از مجلہ "الجہاد" پشاور شمارہ ۳ ۱۹۸۶ء)

برائے انتخاب

فریاد ہے فریاد

ارتضیٰ حیدر

ارتضیٰ حیدر صاحب قومیائے گئے بنکوں میں سے ایک کے ترقیاتی شعبے سے منسلک ہیں۔ درمیانی عمر کے تعلیم یافتہ جوان ہیں اور معروف معنوں میں اہلِ قلم شمار نہیں ہوتے بلکہ انہیں خود بھی دانشوروں کی صف میں کھڑا ہونے کا شوق لاحق نہیں۔ اُن کی غیر روایتی تقطیع لیکن خوبصورت کتابت میں عمدہ کاغذ پر شائع شدہ یہ پمفلٹ نما کتاب فی الاصل ایک حساس در حبِ وطن سے سرشار پاکستانی کے ذہنی و قلبی اضطراب کی لہروں سے اُبھرنے والی فریاد ہے جس میں وہ گرد و پیش کے ماحول کی خوفناک حد تک آلودگی پر واویلا کر کے بساط بھر یہ کوشش بھی کرتا ہے کہ لوگ تطہیر کی کوششوں کی طرف مائل ہوں۔ اُن کی طرح کے سب ہی لوگ کم و بیش ایسی ہی باتیں سوچ رہے ہیں۔ لیکن اس سوچ میں نکھار اور تجویز میں پختگی تبھی پیدا ہو سکتی ہے جب محرکاتِ قیامِ پاکستان، تقسیم کے بعد کی صورتِ حال اور نقضِ عہد کے باعث پیدا شدہ بے مقصدیت و ابتری کا صحیح تناظر میں تجزیہ کیا جائے۔ بے جا نہ ہوگا اگر اس سیاق و سباق میں ہم امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی حالیہ تصنیف "استحکامِ پاکستان" کا ذکر کریں۔ اس میں بھی کہا گیا ہے کہ:

"چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ ہم قومی و ملی سطح پر اخلاق کا دیوالہ نکل جانے کی کیفیت (MORAL CRISIS) سے دوچار ہیں۔ آج ملک کی حیثیت عامہ افراد کو علیحدہ رکھتے ہوئے واقعہ یہ ہے کہ قومی اور اجتماعی سطح پر صداقت و امانت اور شرافت و مروت کا جنازہ نکل چکا ہے اور ایفائے عہد و پاسِ عہد کا دُور دُور تک نشان نہیں ملتا۔ انفرادی اعتبار سے خالص خود غرضی اور

عریاں مفاد پرستی کا دور دورہ ہے۔ اور قومی مصالح اور ملی مفاد سے
سے کسی کو کوئی غرض نہیں رہی۔ معاملات میں بدعہدی اور
بددیانتی بلکہ باضابطہ ٹھگی اور چالبازی کی گرم بازاری ہے۔ رنج یہ
اور لین دین میں دھوکے اور فریب سے بھی بڑھ کر کھانے پینے کی
چیزوں حتیٰ کہ ادویات تک میں ملاوٹ گویا معمول بات بن کر رہ گئی
ہے۔ سرکاری محکموں اور دفتروں میں رشوت ستانی کا بازار تو گرم ہے
ہی، باضابطہ اذیت رسانی اور لوگوں کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا تفریح
اور مشغلہ کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور معاشرتی اور سماجی سطح پر سنگدلی
اور سفاکی نے ڈیرے جما لیے ہیں تو سیاسی و حکومتی سطح پر بھی جھوٹ
اور وعدہ خلافی نے 'ORDER OF THE DAY' کی صورت اختیار کر لی
ہے اور ہر سوچنے سمجھنے والا اور حساس شخص حیران و پریشان ہے کہ

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!"

ڈاکٹر صاحب موصوف کی فریاد کی لے بھی ارتضیٰ حیدر صاحب کی فریاد
سے ملتی ہوئی اٹھتی ہے۔ فرق بہرحال یہ ہے کہ "استحکام پاکستان"
اس فریاد کا پاکستان کی اساس اور ہمارے دین کے فلسفہ عروج و زوال
کے پس منظر میں منطقی تجزیہ کر کے تلافی کی تجویز بھی نہایت محکم
انداز میں دینِ مبین کے مہیا کردہ خطوط پر کرتی ہے جس کا نسخۂ شافی
مع پرچۂ ترکیب استعمال ڈاکٹر صاحب کی آئندہ کتاب "پاکستان میں
اسلامی انقلاب: کیا، کیوں اور کیسے!" میں آ رہا ہے۔ جبکہ ارتضیٰ حیدر
صاحب کا فکر تاحال اتنا پختہ نہیں ہے

نالۂ بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی — اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

تاہم مصنف کی فریاد ہمارے دل کو ایسی لگی کہ ان کی اجازت سے
من و عن بالاقساط 'میثاق' میں شائع کرنے کا ارادہ ہے

گر تن نہیں زباں سہی آزاد کچھ تو ہو — دشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو

ہماری خواہش ہے کہ میثاق کی تنگیٔ داماں اس خواہش میں حائل
نہ ہو۔ فریاد کے مشمولات کے بارے میں صرف ایک بات کا ذکر ہم
ضروری سمجھتے ہیں۔ مصنف نے پورے خلوص سے جہاں ملک و ملت
کی تعمیر میں خواتین کے حصے کی بات کی ہے وہاں اُن کا قلم ہمارے
نقطۂ نظر سے ذرا بہک گیا ہے۔ ہم اُن سے اس حد تک تو متفق ہیں کہ
قوم کی کم و بیش نصف آبادی کو ترقی کے لیے تگ و دو سے علیحدہ نہیں
رکھا جانا چاہیئے۔ لیکن یہ وضاحت ضرور کریں گے کہ طبقۂ نسواں اپنی کارکردگی
دین کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے بھی پوری طرح دکھا سکتا
ہے اور کہ اس کا اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے اپنے
مردوں کو گھروں میں ویسا سکون اور اطمینان مہیا کرے جو قوموں کی
تعمیر میں مطلوب و مضبوط اساس کا کام دیتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر
یہ کہ اگلی نسل کی تعلیم و تربیت پر اس دینی نقطۂ نظر سے توجہ دے کہ مستقبل
پائدار اور بہ واقعتہً تابناک ہو۔

(اقتدار احمد)

اقتصادی کردار

یہ سب وطنِ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے یقین
ب... سے معلوم ہوگا کہ
پاکستان ۱۰ بلین ڈالر کا مقروض ہے۔
گذشتہ ۳۸ سالوں میں سے ۳۶ سال غیرملکی تجارت
میں خسارہ ہوا اور صرف دو سال منافع ہوا۔ ایک بار
(۱۹۵۰-۵۱) کوریا کی جنگ کی وجہ سے اور دوسری
بار (۱۹۷۲-۷۳) کرنسی کی قیمت ۱۳۰ فیصد گرا کر
کی وجہ سے غیرملکی تجارت میں یہ خسارہ سال
بہ سال بڑھتا جا رہا ہے جو اب ۳۳ ارب روپے ہے
یہ خسارہ غیرملکی قرضہ جات اور سود کی ادائیگی کے لیے
ہمیں مزید قرض لینا پڑتا ہے یہاں ہر سال قرض تیزی
سے بڑھ رہا ہے اور آنے والی نسلوں کو ہم ایک مقروض و
بھکاری قوم کی حیثیت سے تیار کر رہے ہیں۔

۴. بے روزگاری کی شرح روز بروز بڑھ رہی ہے اور اب
تو تعلیم یافتہ لوگ بھی روزگار کی تلاش میں مارے مارے
پھر رہے ہیں۔

۵. ملکی معیشت کا استحکام اور کامیاب اقتصادی پالیسیوں
کا دارومدار کرنسی پر ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے گذشتہ ۱۵ سال
سے ہماری کرنسی کی قیمت تیزی سے کم ہو رہی ہے
گذشتہ برس ۱۰.۲۰ روپے کے مقابلے میں آج ڈالر
۱۷.۴۰ روپے کے برابر ہے۔

ایک سچے، باشعور اور محبِ وطن پاکستانی کے لیے
یہ حقائق باعثِ تشویش اور کرب و اذیت کا سبب ہیں۔ ان

...ب ہر غیر ملکی ہیں۔

...یک انجینئر دوست کے گھر جانے کا اتفاق ہوا انکی Lawn کا
...جب بہت پسندیدہ تعریف کر دی تو وہ بولنے لگے:
...صاحب! اس گھر کو اندر سے دیکھو تمہاری عقل دنگ رہ
جائے گی۔ ہر چیز باہر سے منگوا کر آیا ہوں۔ فرنیچر تک
بیرونی ہے۔

اگر آپ اپنے ارد گرد کے ماحول کا بغور مطالعہ کریں
...شادی میں بھی کپڑے سے لے کر جیولری تک تمام کی
...تمام اشیا باہر سے منگوائی جاتی ہیں اور جس جہیز میں پاکستانی
...چیزیں ہوں اس جہیز کو شایان شان نہیں کہا جاتا۔

یہ تو سامان تعیش ہے دوسری طرف ہمیں صنعتی ترقی
کے لیے مشینری و خام مال کی ضرورت ہے۔ غیر ملکی ترقی
یافتہ ٹیکنالوجی بھی ہمیں چاہیے جس سے صنعتی ترقی میں مدد
ملتی ہے۔ اس میں بسا اوقات وہ مشینری بھی بیرون
ملک سے منگوائی جاتی ہے جو پاکستان میں بن رہی ہوتی
ہے یا یقیناً غیر ملکی مشینری سے بہتر ہوتی ہے۔ اس
صورت میں غیر ملکی مشینری کی درآمد بھی سامان تعیش میں
شامل ہوگی۔

اس کے علاوہ جب ہم بین الاقوامی فنڈ اور دوسرے
مالیاتی اداروں سے قرضہ لیتے ہیں اس میں آزاد معیشت
...درآمدی تجارت پر کم سے کم پابندی لگانے پر

غیر ملکی مصنوعات و اشیاء کا استعمال

غیر ممالک سے محبت اور ان کی

معاشی ترقی میں حصہ لینا ہے

زور دیا جاتا ہے۔ ہم ایسی شرائط کو کسی دلیل و حجت کے بغیر
مان لیتے ہیں اس طرح ہمیں قرضے آسانی سے مل جاتے
ہیں اور عالمی سطح اور حکام بالا ان قرضوں کو بہتر معاشی
کارکردگی اور مالیاتی منڈیوں میں بہتر ساکھ اور اپنے مالیاتی
استحکام کی کامیابی تصور کرتے ہیں۔ آزاد تجارت کے علاوہ
دوسری شرائط بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً لوادے کے تجویز کنندہ
ممالک سے مشینری و خام مال درآمد کریں گے۔ یہ مشینری و خام
مال کھلی مارکیٹ کے مقابلے میں گراں قیمت و کم معیار کا
ہوتا ہے۔ پھر ان ممالک کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ممبر ممالک
سے ماہرین بھی منگوائیں۔ یہ ماہرین با صلاحیت نہیں ہوتے
اور اکثر و بیشتر اپنے ممالک میں بے روزگار یا بہت کم تنخواہ
پر ملازم ہوتے ہیں اور یہاں یہ گراں قدر مراعات پر آتے
ہیں۔ سوڈان اور بھارت نے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے

بیرونی ممالک میں سرمایہ رکھنے والے

اور وہاں اثاثے خریدنے والے پاکستان

کے غدار اور قوم کے سب سے بڑے دشمن ہیں

قرض محض اس لیے نہیں لیا کہ انہیں مالیاتی فنڈ کی شرائط
منظور نہیں تھیں۔ بھارت کو ورلڈ بینک کا قرضہ منظور ہوا مگر
بھارتی حکمرانوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ نام نہاد مہذب اور ترقی یافتہ ممالک ان مالیاتی اداروں
کے ذریعے مختلف حیلوں بہانوں سے ہماری صنعت کو پنپنے
پھلنے سے روکتے ہیں۔ یہی ممالک تیسری دنیا کے غریب
ممالک کی غربت و معاشی بدحالی کے ذمہ دار ہیں۔ بین الاقوامی
مالیاتی اداروں پر انہی کا کنٹرول ہے۔ ان اداروں کی پالیسیاں
بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود یا تیسری دنیا کے غریب ممالک
کی ترقی کے لیے نہیں بلکہ ان ترقی یافتہ ممالک کو لوٹ کھسوٹ
میں آسانیاں فراہم کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ یہ ترقی
یافتہ مہذب ملک بعض اوقات براہ راست بھی ہماری
صنعتی ترقی میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔

[illegible] کی ایک رپورٹ کے مطابق

بیرونی منڈیوں نے تیسری دنیا کے ممالک سے روئی کی مصنوعات
کی مخصوص مقدار مقرر کی ہوئی ہے۔ تجارت میں صرف
... اشیاء درآمد ہوتی ہیں مگر پاکستان ۲۰۰ اشیاء قانونی طور
پر درآمد کرتا ہے اور باقی ان گنت سمگل ہو کر آتی ہیں۔
پاکستان اس وقت جن اقتصادی مشکلات میں گھرا
ہوا ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کی ایک ہی صورت ہے
اور وہ یہ کہ ہر شخص تہیہ کرے کہ وہ پاکستانی مصنوعات استعمال
کرے گا اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی مصنوعات کم
معیار اور بلند قیمت ہیں مگر پاکستان کی ترقی و خوشحالی کے
لیے یہ قربانی دینی ہوگی۔ اگر ہم سب پاکستانی انفرادی طور پر
غیر ملکی اشیاء کا استعمال چھوڑ دیں تو درآمد شدہ اور سمگل شدہ
[illegible] کا صفایا ہو جائے گا۔ ہمیں ان لوگوں کو پاکستان کی
اقتصادی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرانا ہوگا جو غیر ملکی اشیاء کا استعمال
کرتے ہیں۔ آپ ان کو ملک دشمن اور عوام دشمن سمجھیں اور
ان کو مجبور کریں کہ وہ پاکستانی مصنوعات استعمال کریں۔ اسی
طرح وہ لوگ جنہوں نے بیرون ملک بنکوں میں اپنا سرمایہ
اور دوسرے ممالک میں اثاثے خرید رکھیں وہ پاکستان منتقل
کر کے پاکستان کو اقتصادی مشکلات سے نکالیں اور
پاکستان کو ایک خوشحال ملک بنائیں۔

سرمایہ کاری

صنعتی سرمایہ کاری ایک ایسا عمل ہے جس سے پیداوار
میں اضافہ اور روزگار کے مواقع بڑھتے ہیں۔ پیداوار میں
اضافے سے اشیاء کا معیار بلند اور قیمتیں آہستہ آہستہ
کم واقع ہو جاتی ہے۔ یہ اضافہ غیر ملکی اشیاء کی ضرورت کو
ختم نہیں تو کم ضرور کر دیتا ہے یہ پیداوار تجارتی خسارے
کی بجائے تجارتی منافع ہونے لگتا ہے۔ ملکی ضروریات پوری
ہونے کی وجہ سے یہ اشیاء بیرونی منڈیوں میں فروخت ہو
جاتی ہیں۔ بیرونی منڈیوں میں یہ اشیاء اس وقت بکتی ہیں
جب ان کا معیار بہت اعلیٰ اور قیمت کم ہو جو کہ زیادہ
پیداوار کا ایک قدرتی عمل ہے۔ بیرونی منڈیوں میں اشیاء
بیچنے سے زرِمبادلہ کے حصول و بیرونی تجارت میں مزید منافع
کے باعث بیرونی قرضوں سے نجات ملتی ہے۔ جب
غیر ملکی منڈیوں میں اپنے ملک کے مال کی ساکھ بن جانے
تو صنعتی سرمایہ کاری میں تیزی آجاتی ہے۔ جس سے ملک
میں روزگار کے مزید مواقع بڑھتے ہیں اور ملک سے بیروزگاری
آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ روزگار کے مواقع بڑھنے سے
لوگوں میں خوشحالی بڑھتی ہے اور اس خوشحالی کے دوران
صنعت کار اور ملازم پیشہ لوگ زیادہ ٹیکس ادا کرتے ہیں
جس سے حکومت کے ذرائع و وسائل میں اضافہ ہوتا
ہے۔ جو عوام کو بنیادی ضروریات و سہولتیں فراہم کرنے
کا سبب بنتا ہے جیسے سکول و کالج، ہسپتال وغیرہ جن جو
حکومت کی طرف سے تعلیم و علاج معالجے کی سہولتیں بڑھیں
گی۔ لوگ تعلیم یافتہ اور صحت مند ہو کر ملک و قوم کی ترقی
میں زیادہ حصہ لیں گے۔ یہ تعلیم یافتہ دولت اور ذرائع و وسائل
اضافہ سائنسی اور صنعتی تحقیق و ترقی میں اضافہ کر کے ملک
کی معیشت کو مضبوط ستون فراہم کرتا ہے۔ بیرونی تجارت
کے خسارے اور بیرونی قرضہ جات کے ختم ہونے سے
لوگوں کے پاس بے جا تنقید، منفی عوامل اور تخریبی کارروائی
کے لیے وقت کم اور شعور زیادہ ہو جاتا ہے۔ جب [illegible]
کے استعمال کا موقع ملتا ہے تو تعلیم یافتہ باشعور اور خوشحال
ہونے کے باعث وہ ووٹ فرقہ پرستی، ذات برادری
صوبائی تعصب، علاقائی دشمنیوں سے بالاتر ہو کر اپنے
نمائندے ... صحیح نمائندے چنتے ہیں یہ صحیح نمائندے ملک
[illegible] سنبھال کر ایسی ایسی مخصوص پالیسیاں عمل میں
لاتے ہیں کہ ملک کی ترقی کی رفتار دوگنی ہو جاتی ہے جو کہ
[illegible] ضمانت بنا دیتی ہے۔ جاپان کی مثال آپ کے سامنے
ہے۔ جاپان تو معاشی دولت سے مالا مال ہے۔

ہی زراعت کے میدان میں کسی اہمیت کا مالک ہے۔
جاپان کی ترقی کا راز وہاں کے لوگوں کی محنت اور ملک و قوم
کی خدمت ہے۔

تسکین و مسرت افزائی زیادہ صنعتوں کے
ہونے اور زیادہ مزدوروں کو ملازم
رکھنے میں ڈھونڈنی چاہیے

یہ وہ جاپان ہے جو دوسری جنگ عظیم میں بالکل تباہ
ہو گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد وہاں
کے لوگوں نے نئے سرے سے ملک کی تعمیر شروع کی اور
اس قدر محنت کی کہ ملک میں خام مال، معدنیات اور زرعی
پیداوار کی کمی کو پورا کر لیا۔ اب بھی جاپانی تمام خام مال، پٹرول،
اجناس دوسرے ممالک سے منگواتے ہیں مگر جاپان کا بنا
ہوا مال آج پوری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ جاپان والوں کی
سائنسی و صنعتی ترقی نے پوری دنیا کو زیر کر دیا۔ اس طرح اب
دنیا کی اقتصادی دوڑ میں انہیں کو سبقت حاصل ہے۔ تائیوان
اور سنگاپور بھی بہت آگے نکل چکے ہیں اور اب ترقی یافتہ
ممالک میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان تمام ممالک کی ترقی کا راز
وہاں کے لوگوں کا صنعتی سرمایہ کاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے۔
آج ہم معاشی، سیاسی اور دفاعی طور پر اتنا اس لیے
کمزور ہیں کہ بحیثیت قوم ہم لوگ سرمایہ کاری کی طرف توجہ
نہیں دیتے۔
ہماری تسکین اور مسرت افزائی اپنی ذاتی کاروں اور محل نما

ہماری اقتصادی کمزوریوں کی
وجہ سرمایہ کاری میں کمی ہے

گھروں، رسمی نمائشی شادیوں اور ہیرے جواہرات میں پوشیدہ
ہیں۔ ہمارا سکون دوسروں سے آگے نکلنے میں ہے

جس سے ملک کی جڑیں بہت مضبوط ہوتی ہیں۔
ہماری ضروریات کو پورا کرنے والی صنعتی سرمایہ کاری کے
لیے بہت کم ہے۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے
بیرونی قرضہ جات کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ قرض دینے والے
ممالک ایسی شرائط لاگو کرتے ہیں جس سے ہم مزید معاشی
مشکلات میں پھنس چکے ہیں۔ ان معاشی مشکلات نے
آج ملک کو ہر شعبے میں غیر ممالک سے مدد مانگنے پر مجبور کر
دیا ہے جس سے حقیقی طور پر ہم ہر لحاظ سے دوسروں پر انحصار
کر رہے ہیں۔
آج ملک جن مشکلات میں جکڑا گیا ہے ان سے نکلنے
کی یہی صورت ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ صنعتی سرمایہ کاری
کریں اس کے لیے ہمیں اپنے بے جا اخراجات پر قابو پا
کر انتہائی سادہ زندگی بسر کرنی ہوگی۔ ہمیں اپنی بچت میں اضافہ

آپ کی سرمایہ کاری عوام
کو بیروزگاری سے نجات دلوائیگی

کر کے صنعتی سرمایہ کاری کی طرف توجہ کرنی ہوگی۔ ہمیں بڑی
صنعتوں کے مالک ہونے اور زیادہ مزدوروں کو ملازم رکھنے
میں تسکین و مسرت افزائی ڈھونڈنی چاہیے۔ ہمیں فخر اس بات
پر ہونا چاہیے کہ ہم نے پاکستان سے سب سے زیادہ مال
برآمد کیا یا پاکستان کے لیے سب سے زیادہ زرمبادلہ کمایا۔
ہمیں لمبی لمبی بڑی موٹر کاروں، بڑے بڑے گھروں اور ہیرے
جواہرات کی بجائے نئی نئی صنعتوں کے لگانے میں فخر محسوس
کرنا چاہیے۔ یہ وہ سمت ہے جس سے آپ ملک کی خدمت
کے علاوہ انسانیت کی خدمت بھی کریں گے اور پاکستان کو
ایک معاشی اور فوجی طاقت بنانے میں مثبت کردار ادا
کریں گے۔

وہ قابل تعظیم ہیں جو پاکستان
کے لیے زرمبادلہ کماتے ہیں

قیمتوں میں اضافہ

قیمتوں میں اضافے کا باعث جہاں بے جا اسراف
نے والے ہیں وہاں کاروباری لوگ بھی اس جرم میں
بر کے شریک ہیں۔ کاروباری طبقہ منافع کے نام پر من
قیمتیں لگاتا ہے۔ بدقسمتی سے منافع کا نہ تو کوئی
روباری اصول ہے اور نہ ہی معاشیات کی طرف سے اس
رنی پابندی ہے۔ اخلاق و مذہب تو صرف مسجدوں و
زوں تک محدود کر دیا گیا ہے۔ قانون جہاں زندگی کے دوسرے
لبوں میں بے اثر ہے اسی طرح قیمتوں پر بھی اس کا
ئی کنٹرول نہیں ہے جس طرح ملازم پیشہ لوگ [illegible]
ے سے بڑے عہدوں پر پہنچنے کے لیے ہر حربہ استعمال
رتے ہیں بالکل اسی طرح کاروباری طبقہ دولت کشی کرنے
ں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ رمضان کا بابرکت مہینہ ہو یا
یلاب ومصیبت زدہ لوگ عوام کا استحصال ہو رہا ہو یا
ت کی تباہی چھوٹے سے چھوٹا کاروباری ہو یا بڑے
ے بڑا سرمایہ دار قیمتوں میں اضافے تک کوئی رکاوٹ
ہیں۔ قیمتوں نے بڑھنا ہے۔ حکومت کسی قسم کا ٹیکس
لگا دے، پٹرول کا نرخ بڑھا دے، ریلوے کرایہ میں اضافہ
ر دے، فیکٹری بند ہو جائے، مزدور ہڑتال کر دیں وغیرہ
ن تمام نقصانات کی ادائیگی عوام قیمتوں کی شکل میں ادا
ریں گے۔

جب کاروباری طبقہ قیمتوں میں اضافہ کرتا ہے تو مزدور
نی ضروریات پوری کرنے کے لیے تنخواہوں میں اضافہ
چاہتے ہیں جب تنخواہیں بڑھتی ہیں تو قیمتوں میں بھی اضافہ
ہو جاتا ہے۔ اس طرح کبھی قیمتیں اور کبھی مزدوروں کی
تنخواہوں کا بڑھنا ایک مستقل عمل ہے۔ مزدوروں کی تنخواہوں
کی زیادتی نے پاکستانی مصنوعات کو دوسرے ممالک کے
مقابلے میں بہت مہنگا کر دیا ہے جس سے پاکستانی مصنوعات
بیرون ملک نہیں بک سکتیں۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ سے پاکستانی
مزدوروں کی جگہ فلپائن، برما، کوریا اور بھارت کے مزدوروں
کو رکھا جا رہا ہے جو بہت کم تنخواہوں پر کام کرتے ہیں لیکن
ان ممالک میں قیمتوں میں اضافہ اتنی تیزی سے نہیں ہو رہا
ہے جس تیزی سے پاکستان میں ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک
میں کاروباری طبقے نے جس طرح لوٹ مچائی ہے اس
قدر لوٹ پوری دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ قیمتوں
کے اس اضافے نے ملک میں دولت اکٹھا کرنے کی
دوڑ لگا دی جس سے بے شمار نئے سماجی معاشرتی و
معاشی سیاسی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

کاروباری طبقے سے گذارش ہے کہ وہ قیمتیں اعتدال
میں رکھیں۔ منافع ان کا حق ہے مگر عوام کی مجبوریوں اور
ملکی مسائل کی حدود کو پار نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے لاکھوں
کروڑوں کمانے کے شوق میں ملک و قوم میں مسائل نہ
پیدا کریں۔ ذاتی مفادات اور کنبہ پروری کی ہوس میں ملک
قوم کو تباہ نہ کریں۔

منافع کے نام پر غریب عوام کا استحصال بند کر دو!

خواتین

پاکستان کی آبادی میں ۵۵ فی صد خواتین اور ۴۵ فی صد
مرد ہیں۔ خواتین میں کام کرنے کی تعداد نہ ہونے کے برابر
ہے اور مردوں میں بچے، طالب علم اور بوڑھے کام نہیں
کرتے۔ اگر تمام آبادی سے ان عورتوں، بچوں، طالب علموں
اور بوڑھوں کو نکال دیا جائے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ
پاکستان کی تعمیر و ترقی میں براہ راست حصہ لینے والے لوگ
کتنے ہیں۔ اس کے علاوہ اعداد و شمار دیکھنے یا سننے کا موقع

تو نہیں ملا مگر ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ لوگ ۳۰
فیصد سے شاید زائد نہ ہوں۔ اب اسی تناسب سے یہ کہا
جا سکتا ہے کہ ۳۰ فیصد آبادی بے کار ہے جو ملک کے
محدود وسائل پر بوجھ ہے یقیناً یہاں طالب علموں اور بچوں
کو ہم بوجھ نہیں کہیں گے۔ یہ لوگ قوم کا سرمایہ ہیں مگر وہ
خواتین جو کام کرنے کی اہل ہیں انہیں ملک کی خدمت سے
مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا اور کام نہ کرنے والوں میں وہ خواتین
بھی شامل ہیں جنہوں نے ملک کے ذرائع و وسائل کو استعمال
کر کے تعلیم حاصل کی مگر اس کے بعد گھر کی چار دیواری میں بند
ہو گئیں اور جو ملازمت اختیار کرتی ہیں۔ وہ شادی کے
فوراً بعد گھر بیٹھ جاتی ہیں۔ ان عورتوں نے ایک طرف تو ملکی
وسائل و ذرائع کو ضائع کیا اور دوسری طرف وہ ملک کے
محدود وسائل پر بوجھ بھی بن گئیں۔ ایسی خواتین میں ڈاکٹر،
لیکچرر وغیرہ کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔

تعلیم حاصل کر کے گھر بیٹھ جانا
ملکی وسائل کا ضیاع ہے

اگر تمام خواتین کی قوتوں کو بروئے کار لایا جائے تو ملک
میں کام کرنے والے افراد کی تعداد دگنی ہو جائے گی۔ ہم نے
مختلف بابوں میں ملکی اشیاء کے استعمال کو فروغ دے کر
صنعتوں میں اضافہ، بہت بڑھا کر سرمایہ کاری کرنے، کمپیوٹر
اور خودکار مشینوں کا استعمال بند کرنے کی تجاویز اسی لیے پیش
کیں تاکہ لوگوں کے کام کرنے کی صلاحیت کو استعمال کیا جائے
اور بیروزگاری ختم کی جائے۔ ہمارے ملک میں تو مرد بیٹھے
ہیں۔ خواتین کے لیے مشکلات تو اس سے بھی زیادہ ہیں،
لیکن وہ خواتین جنہیں ملازمت آسانی سے مل سکتی ہے
انہیں ملک و قوم کے وسیع تر مفاد کی خاطر گھر کی چار دیواری
سے نکل کر ملک و قوم کی تعمیر میں حصہ ضرور لینا چاہیے۔ اس
کے علاوہ وہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ خواتین جن کو ملازمت

نہیں مل سکتی وہ گھر میں ایسے کام کر سکتی ہیں جس سے ملک
کی تعمیر و ترقی میں کچھ نہ کچھ کردار ادا ہو جائے گا مثلاً سلائی،
کڑھائی، بنائی، دستکاری کی چھوٹی چھوٹی اشیاء بنا کر بازار میں
دینا، گھروں میں ٹیوشن سنٹر چلانا، نرسری ہوم کا بندوبست
گھروں میں کھانے پینے کی اشیا بنا کر بیکریوں میں دینا وغیرہ
آپ مالی طور پر کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، آپ کے والدین
یا خاوند کتنے ہی دولت مند کیوں نہ ہوں آپ کو اپنی توانائی
اور وقت کا صحیح استعمال کر کے ملک و قوم کی خدمت کرنے
کے لیے کچھ نہ کچھ کام ضرور کرنا ہے۔

دوسری طرف آپ خواتین، ماں اور بیوی کی حیثیت
سے گھریلو اخراجات میں مداخلت بہت زیادہ ہوتی ہے
اگر یہ کہا جائے کہ گھریلو اخراجات آپ خواتین ہی کرتی ہیں
تو بے جا نہ ہوگا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ بچت کی جائے
یا اخراجات بڑھائے جائیں۔ عورتیں جہاں بھی اکٹھی ہوں
گی اکثر و بیشتر لباس، فیشن کی باتیں کر رہی ہوں گی۔ کپڑا، زیورات
آسائش و آرائش اور زیبائش کا سامان ان کے مقبول ترین
موضوعات ہیں۔ محفلوں، شادیوں اور دوسرے اجتماعات
میں عورتیں ایک دوسرے سے مقابلہ بھی کرتی ہیں۔ یہ

عورت ایک اچھی ماں بن کر
قوم کی تاریخ بدل سکتی ہے

مقابلہ نئی و قیمتی ترین اشیاء کے استعمال میں ہوتا ہے۔
دوسری خواتین کو زیر کرنے اور اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے
کے لیے عورتیں خاوندوں کو مزید دولت کمانے کے لیے
زور دیتی ہیں جس سے اہل خانہ مردوں کو دولت کمانے
کی دوڑ میں شریک کر کے ان کو رشوت اور ناجائز ذرائع
سے دولت کمانے کے غلط راستوں پر لے جاتی ہیں۔ اکثر
مرد حضرات اہل خانہ خواتین اور بچوں کی غیر ضروری اور
نمود و نمائش کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بھٹک جاتے

ہیں۔ درکنبہ پروری کے لیے ملک وقوم کو نقصان پہنچاتے
ہیں۔ آپ صرف جہیز کی مثال لیجیے بچپن سے سنتے آ
رہے ہیں کہ صاحب یہ بہت بڑی لعنت ہے جس نے
ملک کو لوٹ لیا اور عوام کا سکون چھین لیا۔ آج ہزاروں
بہنیں اور بیٹیاں بیچاری جہیز کے زیادہ نہ ہونے کی وجہ
سے کنواری بیٹھی اپنی جوانی تباہ کر دیتی ہیں مگر اس کا قصوروار
کون ہے، تجزیہ یہ بتلاتا ہے کہ یہ لڑکے کی ماں، بہن اور

خواتین سادگی اختیار کر کے اہل خانہ

مردوں کو رشوت و ناجائز ذرائع کے

ذریعے دولت کمانے سے روک سکتی ہے

دیگر رشتہ دار عورتیں ہی تو ہیں جو معاشرے میں عزت، لڑکی کی اپنی
ضرورت، لڑکے کے ماں باپ کی خوشی وغیرہ کے نام پر لڑکی
والوں سے جہیز وصول کر لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ شادی
بیاہ کی تمام رسومات پر اخراجات بھی انہی عورتوں کے
ذریعے ہوتے ہیں۔ یہ عورتیں ہی ہیں جو نئی نئی رسومات کی بنیاد
اور پرانی رسموں کو برقرار رکھتی ہیں۔ کچھ لوگ لڑکے کی لالچ اور
خودغرضی کو بھی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے
تو لڑکے کی والدہ، بہن اور بھابی صاحبہ کیا لڑکے کو مجبور نہیں کر
سکتیں کہ وہ لالچ نہ کرے۔ اگر عورتیں چاہیں تو جہیز کی
لعنت آج ہی ختم ہو سکتی ہے۔ یہ عورتیں ہی اتنے بڑے
سنگین مسئلے کو حل کر سکتی ہیں جب تک عورتیں اپنی عزت
سمجھ کر زیادہ جہیز اور رسومات کے اخراجات میں مقابلہ کریں
گی، تب تک ملک میں سماجی مسائل بڑھتے رہیں گے۔ دوسری
طرف اگر عورتیں چاہیں تو ایک ماں کا دل رکھتے ہوئے یتیم
بچوں، بہنوں اور بیٹیوں کی پرورش، ہسپتال میں دکھی بیماروں
کی تیمارداری، بوڑھوں کا سہارا بننے میں اپنا سکون
تلاش کریں تو وہ نہ صرف ملک کی بہت بڑی خدمت کریں

گی بلکہ انسانیت پر احسان بھی ہوگا۔ اسی طرح جہیز کی لعنت
آپ خواتین کی خصوصی توجہ کی طلب گار ہے۔ آپ اس
لعنت کو ختم کر کے ملک میں رشوت و ناجائز ذرائع سے
دولت کمانے میں کمی کریں گی۔ دوسری طرف ہزاروں بچیاں
جو جہیز نہ ہونے سے کنواری بیٹھی ہیں ان کی شادی میں
آسانی پیدا ہوگی جس سے عوام کو بہت ذہنی سکون ملے گا۔

لڑکی والوں سے کسی بھی وجہ سے جہیز

قبول کرنا بے حسی، خودغرضی، دولت کی

لالچ اور لاکھوں بہنوں بیٹیوں سے دشمنی کرنا ہے

اس طرح زندگی میں اپنے آپ کو سادہ ترین بنا کر ملک سے
دولت اکٹھا کرنے اور اس کو خرچ کرنے کی دوڑ کو ختم کریں۔
دوسری عورتوں سے مقابلہ سماجی خدمات میں حصہ لے کر
کریں۔ فخر و تسکین یتیم لڑکوں کو پالنے، یتیم بچیوں کی شادی
اور غریب پروری میں ڈھونڈیں۔

ماں کی گود تعلیم کا سب سے بڑا گہوارہ ہے۔ بچوں کی
شخصیت اسی جگہ سے بنتی و بگڑتی ہے۔ بچے اپنے بڑوں
اور خاص طور پر ماں اور اس کے بعد باپ کی عملی زندگی کو اپناتے
ہیں۔ اب جو کچھ بھی عمل طور پر ان کے سامنے کریں گے بچے
اکثر و بیشتر آپ کے نقش قدم پر چلیں گے۔ آپ اپنے بچوں
میں اپنے جیسی عادات و اطوار، خیالات و نظریات پائیں
گے۔ ان میں یقیناً کچھ کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن بنیادی طور
آپ کے بچوں کی شخصیت آپ کی شخصیت کا ایک نمونہ
ہوگی۔

ملکی و قومی مشکلات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ماں
باپ بچوں کے سامنے ملک و قوم کی خدمت کا عملی نمونہ
پیش نہیں کرتے جس سے ہماری موجودہ نسل اور آنے والی
نسل ملک و قوم کی خدمت سے بالکل آشنا نہیں ہے۔

آپ خواتین نہ صرف اپنے گھر بلکہ بحیثیت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی ہونے کے ناطے اہلِ خانہ مردوں کو راہِ راست پہ لا کر ملک و قوم کی خدمت کی طرف مائل کر سکتی ہیں۔ اسی مشن کی تکمیل کے لیے آپ مندرجہ ذیل باتوں کو مدِ نظر رکھیں اور عملی جامہ پہنائیں۔

جہیز لے کر آنے والی لڑکی ان جرائم میں برابر کی شریک ہے

اپنی زندگی کو نمود و نمائش سے پاک کر کے سادگی اختیار کریں اور اسی کا پرچار بھی کریں۔

۲. راحت و تسکین، آسائش و زیبائش کی انتہا میں نہیں بلکہ بہن بھائیوں، یتیموں، بے سہارا کی مدد اور سماجی کاموں میں تلاش کریں۔

۳. جہیز کی لعنت کی ذمہ داری زیادہ تر خواتین پر آتی ہے

آپ بحیثیت ماں، بہن اور بھابی کے ناطے معاشرے کو اس لعنت سے پاک کرنے کے لیے اپنے بیٹوں، بھائیوں اور دوسرے عزیزوں کی شادیوں میں جہیز کا رواج ختم کریں۔

۴. تعلیم حاصل کر کے ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے مردوں کا ساتھ دیں اور ملک کے لیے کام کرنے والی قوت کو دوگنا کریں۔

۵. اپنے بھائی، خاوند اور بیٹوں کو رشوت، سفارش، بعض سے پاک رہنے کی جدوجہد کریں۔

۶. بچوں کو خود غرضی، ذاتی مفادات سے پاک رہنے اور ان میں ملک و قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ان کے سامنے عملی نمونہ پیش کریں۔

آج ملک و قوم کو آپ کے مثبت کردار کی اشد ضرورت ہے

قارئینِ میثاق کے لیے اطلاع

کاغذ کی قیمت میں اچانک اضافہ کے باعث ہم یہ ناخوشگوار فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں کہ جنوری ۸۷ء سے ماہنامہ 'میثاق' کا اندرونِ پاکستان سالانہ زرِ تعاون ۵۰/- روپے اور ہدیہ فی شمارہ ۵/- روپے ہوگا۔ تاہم بیرونِ ممالک کے لیے زرِ تعاون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

نوٹ: منی آرڈر کی صورت میں زرِ تعاون مینیجر ماہنامہ میثاق، لاہور کے نام ارسال کریں اور ڈرافٹ بھجوانے کی صورت میں ماہنامہ میثاق لاہور کے نام کا ڈرافٹ بنوائیں یا اکاؤنٹ نمبر ۵۹۷ C یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ لاہور تحریر فرمائیں۔

ادارہ

فتارِ کار

تب : چودھری غلام محمد

لاہور میں توسیعِ دعوت کا پروگرام

نظیم اسلامی کی انقلابی دعوت کا منبع و سرچشمہ قرآن حکیم ہے اور انقلاب اسلامی کے لئے پیش رفت کے
۔۔ نہ مراحل کا تعین سیرت طیبہ کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے ۔ الحمد للہ تنظیم اسلامی کے رفقاء و احباب کی تربیت
ے لئے ان کی تعلیم و تدریس اور تفہیم کا اہتمام تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام مرکزی اور علاقائی تربیت گاہوں میں
خوبی ہوتا رہتا ہے ۔ تاہم اس ضرورت کا احساس موجود تھا کہ ماحول کے اثرات بہت قوی اور ذاتی مسائل اور
ریشانیوں کے تقاضے بہت شدید ہیں ۔ اس لئے مطالباتِ دین کا صرف علمی شعور شاید ان تقاضوں کی دستبرد سے
سوو نہ رکھ سکے اور رفقاء اپنی زندگی کے نقشہ میں وہ تبدیلی پیدا نہ کر سکیں جو ایک اسلامی انقلابی جماعت کے
ن کی ابتدائی ضرورت ہے ۔ لہٰذا میاں محمد نعیم قیم تنظیم اسلامی نے رفقاء کے مشورہ سے طے کیا کہ اب جو لائحۂ عمل
ارے پیش نظر ہونا چاہیئے اس میں تنظیم اسلامی کے فکر و دعوت کی تعلیم و تدریس کے پورے اہتمام کے ساتھ ساتھ
یسے پروگرام مرتب ہونے چاہئیں جن میں رفقاء متحرک ہوں ۔ وہ مختلف اور مناسب انداز میں اپنے ماحول اور
فراد سے توسیع دعوت کی کوشش کے لئے نکلیں ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے گذشتہ چند ماہ سے اس
خ پر کچھ محنت ہوئی ہے اور اس کے بہت مفید نتائج ہمارے سامنے آ رہے ہیں ۔ ابتداءً اس رُخ پر کام کرنے
کے لئے ضروری ہدایات پر مشتمل ایک خاکہ مرتب کیا گیا تھا اور تفصیلی عملی اقدامات کے لئے مختلف مقامات پر
رفقاء کو مقامی حالات کی مناسبت سے کام کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا تھا ۔

لاہور میں اس نہج پر کام کرنے کے لئے رفقاء کو اپنی مصروفیات سے کچھ وقت بچا کر دین کے لئے فارغ
کرنے کی ترغیب و تشویق دی گئی ۔ ایک سوالنامہ کے ذریعے رفقاء کی صلاحیتوں اور فارغ اوقات کا اندازہ
لگایا گیا ۔ البتہ اس سلسلہ میں پیش قدمی رفقاء کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ۔ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان
ہے کہ گوناگوں مشکلات کے باوجود رفقاء کی ایک اچھی خاصی تعداد نے خود پیش قدمی کی ۔ قریباً ۸ رفقاء
نے اندرونِ شہر کام کرنے کے لئے مہینے میں دو دن فارغ کئے اور ۲۳ رفقاء نے بیرون لاہور کام کرنے کے
لئے مہینے میں تین دن فارغ کئے ۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے رفقاء کے ان اوقات کا بھرپور استعمال کیا گیا اور رفقاء
کو گروپ بنا کر مختلف اوقات میں اندرون و بیرون لاہور کام کے لئے بھیجا گیا ۔ سب سے پہلے رفقائے تنظیم
نے گوجرانوالہ، وزیر آباد اور گجرات کے نواح میں بہت مفید دعوتی کام سر انجام دیا ۔ ان کے سہ روزہ دورہ کے

دوران کافی لوگ تنظیم اسلامی کی دعوت سے متعارف ہوئے۔ رفقاء بھی نظم کے خوگر ہوئے۔ باہم تفصیلی تعارف کے مواقع میسر آئے۔ اس سہ روزہ دورہ کے دعوتی اثرات کا رفیق محترم جناب شمس الحق اعوان صاحب کامیاب تعاقب کیا۔ اللہ تعالےٰ نے ان کی محنت کو شرفِ قبولیت عطا کیا اور انہیں اسی حلقۂ تعارف سے بہت سرگرم اور معدودے چند رفقاء کار مل گئے۔ جناب شمس الحق صاحب نے ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں میں دین کی محبت اور اس کی سربلندی کے لئے تڑپ مزید دو چند کر دی اور ان رفقاء کی مشترکہ سعی بارگاہ الٰہی میں اس طرح مقبول ہوئی کہ آج ان کے ساتھ پچاس رفقاء کا ایک قافلہ خدمتِ دعوتِ دین میں سرگرم عمل ہے۔

اندرونِ لاہور کا دعوتی پروگرام والٹن، شاہدرہ، فیروز والا، ٹاؤن شپ اور گرین ٹاؤن کی بستیوں میں وقتاً فوقتاً رفقاء کے مختلف گروپس کے دو روزہ قیام اور مختلف النوع دعوتی و تربیتی امور کی انجام دہی پر مشتمل تھا۔ تعارف و توسیعِ دعوت کے پروگرام میں لوگوں سے ملاقاتیں، گفتگو، تقسیم لٹریچر، تعارفی پمفلٹ اور رابطہ کے لئے تیار کردہ خصوصی ہینڈ بلز وغیرہ کی تقسیم اور خطاباتِ عام شامل تھے اور ذاتی تربیت کا پروگرام نوافل، اذکارِ مسنونہ، تزکیہ نفس اور انقلابی تحریکوں کے متعلق مضامین کے مطالعہ و مذاکرہ پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ رفقاء کو باہم تفصیلی تعارف اور ربط و تعلق کے قیمتی مواقع میسر آئے۔ شروع میں اگرچہ مساجد ہی کو مستقر بنایا گیا تھا لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ ذاتی تربیت کے لئے بے شک مساجد میں قیام مفید ہے لیکن دعوتی مقاصد کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں۔ چنانچہ بعد کے پروگراموں میں کسی مناسب عوامی جگہ کو مرکز بنایا گیا۔ پروگرام کے اختتام پر دس پندرہ لوگوں کو جمع کر کے خطابِ عام کی صورت میں تنظیم اسلامی کی دعوت پیش کی گئی۔ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے ان پروگراموں کے دوران رفقاء نے دل جمعی اور انبساطِ قلب کے ساتھ اور امکانی حد تک بھرپور دعوتی کام کیا اور مختلف تجربات سے دو چار ہوتے ہوئے خوب سے خوب تر کی طرف قدم بڑھاتے رہے۔ دعوتی پروگرام کے سلسلہ میں متعلقہ علاقہ کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حصہ کے لئے چار یا پانچ رفقاء پر مشتمل ایک گروپ تشکیل دیا گیا جس کا باقاعدہ امیر نامزد کیا گیا اور مقامی رفیق کو رہبر یا معاون کی حیثیت سے ساتھ کر دیا گیا۔ دعوت کی بنیاد تنظیم اسلامی کا چہار ورقہ "اسلام کا انقلابی منشور اور تنظیم اسلامی کا تعارف" کو بنایا گیا۔ اس کو پیش کرنے کے لئے ایک ہینڈ بل بھی تیار کیا گیا تھا جس میں مختلف سطحوں پر اسلام کی برکات کے تذکرہ کے بعد انفرادی اور اجتماعی سطح پر زبوں حالی کے واحد علاج کے طور پر روحِ جہاد کو زندہ کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ ہر گروپ کے امیر نے دکانوں، راستوں اور بازاروں میں لوگوں سے گفتگو کی اور اسلام کا پیغام پہنچایا۔ پروگرام کے اختتام پر رفقاء کچھ دیر کے لئے باہم مل کر اپنی کارکردگی پر نگاہِ بازگشت بھی ڈال لیتے ہیں۔ اس طرح اپنی کوتاہیوں اور پیش آمدہ رکاوٹوں کا اندازہ بھی ہوتا رہا اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں آئندہ پروگراموں کی تشکیل

ے بھی متعین ہوئے۔

۔۔۔الیٰ کے فضل و احسان اور توفیق خصوصی سے لاہور اور اس کے گرد و نواح میں توسیع
۔۔۔ کے لیے جو محنت اور کوشش شروع کی گئی تھی۔ اس کے بہت قابل قدر ثمرات محسوس کئے گئے
۔۔۔ ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت خصوصی سے ہمارے لیے وہ راستہ آسان کر دے
۔۔۔ درجہ ذیل مقاصد حاصل ہو سکیں۔

۔۔۔ قرآن مجید اور سیرت مطہرہ کی روشنی میں ایک بندہ مومن کی ضروریات کا فہم اور اس کے اظہار و
۔۔۔علان کی طبعاً جرأت۔

۔۔ ۔۔۔ سیرت و کردار کے محاسبہ اور دعوت و تذکیر کے بعد عمل کی کوتاہیوں پر غور و فکر اور مل جل کر اصلاح
۔۔۔ کوشش۔

۔۔ ۔۔۔ پوری جائزہ کے بعد کوتاہیوں پر استغفار اور صحیح عمل کی توفیق پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا۔
۔۔۔ اور آئندہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعائیں اور اظہار عجز و نیاز

۔۔ ۔۔۔ اپنے گھر اور ماحول کی سہولتوں کو چھوڑ کر سخت کوشی اور محرومیوں کا خوگر ہونا اور اس بیرونی فضا
۔۔۔ ضرورتوں کے حوالے سے باہم مشورہ کے آداب سے آگاہی، نظم و ضبط کی تربیت۔ باہمی
محبت، ہمدردی، تعاون اور اخوت کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا۔

۔۔ ۔۔۔ دعوت و تذکیر کے مناسب انداز کی تربیت۔

۔۔ دعوت کے نتیجہ میں طنز و استہزا، کشمکش اور رکاوٹوں پر صبر و استقامت اور ناسازگار حالات
میں اللہ تعالیٰ پر توکل و اعتماد اور تسلیم و رضا کی روش اختیار کرنا۔

مذکورہ بالا مقاصد کے علمی شعور کے باوجود اپنی کوتاہ ہمتی کے سبب ہم ان تک رسائی کی عملی
۔۔۔ کوشش نہیں کر پا رہے تھے۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جب ہمارے کچھ رفقاء نے ہمت
۔۔۔ بہت تھوڑے سے وقت کے لیے اپنے گھر اور ماحول کی مصروفیات اور آرام کو اللہ کے
۔۔۔ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت نے ان کی دستگیری فرمائی اور وہ ذہنی، قلبی اور روحانی برکات کو
۔۔۔ سمیٹتے ہوئے گھروں کو لوٹے۔

دوسرے مقامات پر بھی بفضلہ تعالیٰ تنظیم اسلامی کی پیش رفت کے ضمن میں صورت حال حوصلہ افزا
۔۔۔ کراچی میں تنظیم اسلامی کی تنظیم نو کی گئی۔ رفقاء کی تعداد ۱۵۰ سے متجاوز ہے۔ بہتر کارکردگی
۔۔۔ لیے اس کو چھوٹے چھوٹے اسرہ جات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پروگراموں کو نئے انداز اور نئی ترتیب
۔۔۔ اس طرح جاری کیا گیا کہ بعض کمزوریوں کا ازالہ اور کچھ مفید پہلوؤں کا اضافہ ہو سکے۔ نقیب حضرات
۔۔۔ ہمیں اسرہ جات کی تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام ایک اکیس روزہ

تربیت گاہ کا اہتمام ہوا جس کے لئے ہمارے رفقاء نے خوب محنت کی اور بھرپور استفادہ کیا۔ جناب
مختار حسین فاروقی صاحب نے رفقاء کو متحرک کرنے کے لئے تدابیر اختیار کیں۔ باہم رابطہ اور رفقاء کے
مسائل سے آگاہی کی خاطر رفقاء سے انفرادی ملاقاتوں کا سلسلہ پورے اہتمام کے ساتھ جاری رکھا۔
الحمدللہ اب رفقاء سے رابطہ اور رفقاء کے باہم ربط و ضبط کی کیفیت بہت حوصلہ افزا ہے۔ رفقاء
کو گھر اور ماحول سے نکال کر متحرک کرنے کے باقاعدہ پروگرام ابھی نہیں بن سکے۔ تاہم اس ضمن میں بھی
پیش رفت ہوئی ہے۔ چھ چھ رفقاء کے دو گروپوں نے حیدرآباد، ٹنڈو الہیار اور بدین کے دورے
کئے اور ان کے مفید اثرات محسوس ہوئے۔ مزید پروگراموں کی تشکیل کے لئے حیدرآباد اور سکھر تنظیم
کے امراء سے مشورہ جاری ہے۔

کوئٹہ میں تنظیم اسلامی کے دعوتی، تنظیمی اور تعلیمی پروگرام حسب معمول جاری رہے۔ مختلف مواقع پر
رفقاء نے خصوصی رابطہ مہم کے لئے محنت کی۔ شہری علاقہ کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے رفقاء گروپس
میں نکلے اور تنظیم اسلامی کے تعارفی کتابچہ کو کافی تعداد میں تقسیم کیا۔ دوسرے مقامات پر بھی اسی طور
کچھ مفید کام ہوا۔ لیکن اس کی تفصیلات تاحال مرکز میں نہیں پہنچیں۔

مذکورہ بالا پروگراموں کے علاوہ تنظیم اسلامی کی مرکزی تربیت گاہ میں گذشتہ دو ماہ کے دوران
مسلسل تربیتی پروگرام جاری رہے۔ تنظیم اسلامی لاہور کے تمام اسرہ جات کا ایک ہفت روزہ نظام بنایا
گیا جس کے مطابق روزانہ چند اسرہ جات کے رفقاء قرآن اکیڈمی لاہور میں شب بسری کرتے رہے۔ اس
دوران ان کے لئے باہم ربط و ضبط، ایک دوسرے کے مسائل و مشکلات سے آگاہی، جناب امیر تنظیم
سے انفرادی ملاقات اور وعظ و تلقین کے مواقع میسر رہے۔ کافی عرصہ سے جناب امیر تنظیم اسلامی کی رفقاء
انفرادی ملاقاتوں کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ لیکن جناب امیر تنظیم اسلامی کی شدید مصروفیات کی
سے اس کا موقع میسر نہیں آ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا کہ لاہور اور بیرون لاہور سے آئے ہوئے رفقاء
کی جناب امیر محترم سے تفصیلی ملاقاتوں کا اہتمام ہوا اور انہیں رفقاء کے ذاتی مسائل سے واقفیت
اسی طرح انہی مقاصد کی خاطر بیرون لاہور کے رفقاء کے لئے مسلسل ہفت روزہ تربیتی پروگراموں کا
اجراء کیا گیا۔ مختلف مقامات سے رفقاء اپنی فرصت و سہولت کے مطابق کسی ہفت روزہ میں بھی شریک
ہو سکتے تھے۔ ابتداءً اس کا نتیجہ بھی حوصلہ افزا رہا۔ لیکن بعض دشواریوں کی وجہ سے یہ سلسلہ زیادہ
دیر تک جاری نہیں رکھا جا سکا اور جناب امیر تنظیم اسلامی کے عازم بیرون ملک ہونے کی وجہ سے
اس سلسلہ کو منقطع کرنا پڑا۔

مختلف قومی تقریبات اور دینی اجتماعات کے مواقع پر بھی تنظیم اسلامی کے رفقاء نے توسیع
دعوت اور تربیتی مقاصد کی خاطر بھرپور کام کیا ہے۔ تبلیغی جماعت کے حالیہ منعقدہ سالانہ اجتماع میں

(باقی صفحہ ۹ پر)

احوالِ وطن: ایران سے چند تاثرات

بریگیڈیئر عبدالرحمن صدیقی

ایران سے متعلق کوئی بھی بات کہتے ہوئے ایک بنیادی نکتہ ضرور ذہن نشین کر لینا چاہیے
وہ یہ کہ انقلاب روس اور چین کے بعد ایران زمانہ میں ایسا ملک ہے جو بیک وقت جنگ اور انقلاب
دو بڑے بحران سے گزر رہا ہے ——— یہ دونوں بحران نہ صرف شدت
طوالت کے لحاظ سے بھی انتہائی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں چنانچہ اہلِ ایران اس وقت
جس کیفیت سے دوچار ہیں اسے کسی طرح بھی نارمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی انوکھی
غیر معمولی کیفیت ہوتی ہے جس میں عقل، جذبے اور جذبہ عقل سے متصادم ہوتا ہے اور کم از
کم جیسے ایک غیر ملکی مبصر کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کہ کون کس پر حاوی ہے تاہم
بحیثیت مجموعی عقل پر جذبے کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اور معقول اور مدلل بحث کی یا تو زیادہ
گنجائش نہیں رہتی یا پھر دلیل کا دارومدار اکثر پہلے سے طے شدہ نظریات اور نتائج پر ہوتا ہے
عملاً یہ ناممکن ہوتا ہے کہ استدلال کو اس حد تک بڑھا دیا جائے جہاں وہ تعصب سے
آزاد ہو کر صرف منطق کے تابع ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ موت یا زیست کی جس اجتماعی
کشمکش سے اہلِ ایران گزر رہے ہیں۔ اس میں منطق سے بیزاری کے علاوہ عام روابط اور
معاملات میں بھی عدم برداشت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور وہ اپنے معاملات پر کسی قسم کی بھی
دلیل اور مدلل بحث کو یا تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتے ہیں اور یا دخل در معقولات سمجھ کر
اس کے اظہار میں تامل نہیں کرتے ان کا ایک ہی موقف ہے اور وہ ہے یہ کہ اگر تم ہمارے ساتھ
نہیں ہو تو پھر ہمارے خلاف ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ایران اس وقت بالکل کٹ کر رہ گیا ہے۔ عراق سے تو خیر اس کی
باقاعدہ جنگ ہے مگر باقی دنیا سے بھی اس کے روابط ہرگز معمول کے مطابق نہیں۔ امریکہ
روس، اسرائیل اور مغربی دنیا کے بیشتر ممالک سے اسے نہ صرف گلہ بلکہ سخت نفرت ہے
جس کا اظہار برملا کیا جاتا ہے۔ خاص کر امریکہ اور روس کا ذکر تو بجز لعنت ملامت اور
بد دعا کے کچھ اور نہیں ہوتا۔ چپے چپے پر مرگ بر امریکہ اور مرگ بر روس کے نعرے نظر آتے
ہیں۔ ایران نے اپنے اوپر مظلومیت اور عالم بیزاری کا ایک ایسا احساس طاری کر لیا ہے کہ
اسے اپنے چاروں طرف عالم ہی ظالم اور دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں۔ جن سے وہ تنہا نبرد آزما ہے۔
ایران اپنی اس جنگ کو حق و انصاف کی جنگ سمجھتا ہے جس میں اس کا کوئی ساتھی اور حمایتی نہیں۔

یہ جنگ وہ تنہا لڑ رہا ہے اور آئندہ بھی اسے ایسا ہی کرنا ہوگا۔ وہ نہ صرف اپنے آپ کو و...
موقف کو حق و انصاف پر مبنی سمجھتا ہے بلکہ یہ بھی کہتا ہے جو دوست ملک دوستی کا د...
کے ساتھ ساتھ کھل کر اس کے موقف کی حمایت نہ کرے وہ در اصل ظلم او...
دے رہا ہے۔

لہٰذا ایران کے متعلق کوئی بھی رائے قائم کرتے وقت اور اس سے کوئی بھی ...
کرنے سے پہلے اگر یہ چند معروضات ذہن نشین کر لی جائیں تو اکثر غلط فہمیوں کا ...
ہو جائے گا۔ ضروری نہیں کہ اگر پاکستان جیسے دوست ممالک کے بارے میں ...
یا قائدین کوئی کڑوی بات کہیں تو اس میں واقعی عداوت اور مخالفت کا کوئی ...
کار فرما ہو کیونکہ تند و تیز طرز کلام اور درشت لب و لہجہ اب ان کی غیر معمولی نفسیات
حصہ بن چکا ہے اور اس کا اطلاق نہ صرف غیروں پہ بلکہ اکثر خود اپنوں پر بھی ہوتا ہے

جس روز (۱۶ ستمبر) میں تہران پہنچا اسی روز لاہور اور پنجاب کے چند دوسرے ...
میں شیعہ، سنی تصادم کی خبریں آئی تھیں۔ ہر چند کہ یہ تصادم انتہائی افسوسناک تھا ...
پاکستانی اس پر بے چینی اور تاسف کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا مگر اس بارے م...
انداز کا اظہار میرے ایرانی دوستوں نے کیا وہ میرے لئے نہ صرف غیر معمولی بلکہ ایک ...
پریشان کن بھی تھا۔ بھلا یہ کہاں تک جائز اور مناسب ہے کہ ایک ایسا ملک جو خود ...
اسلامی ملک ہے برسر پیکار ہو ایک عام شہری تصادم کے متعلق صرف اس لئے مضطرب ...
وہ ایک ہی ملک کے دو فرقوں کے چند افراد کے مابین ہوا ہو۔ پاکستان میں فساد یا انتشا...
بھی خبر پر ایران جیسے دوست ممالک کا اظہار اضطراب تو یقیناً جائز اور مستحسن قرار د...
سکتا ہے مگر ایک فرقے کے مقابلے میں دوسرے فرقے کی حمایت اگر پاکستان کے اند...
معاملات میں مداخلت سے ملتی جلتی کوئی چیز نہیں تو اسے ان امور میں حد سے بڑھی ہوئی
بالکل غیر ضروری) دلچسپی ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس خبر کو ایرانی ذرائع ابلاغ ...
ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے خاصا اچھالا۔ نیز امام کاشانی نے نماز جمعہ کے موقع پر
خطبہ میں بھی اس کا ذکر کیا تفصیلی رپورٹ بھی پیش کی۔ یہ رپورٹ لگ بھگ دس منٹ
وی پر دکھائی گئی۔ مختلف مناظر میں ہجوم اور پولیس کے درمیان فائرنگ کی تصویر
اور ایک مقام پہ پاکستان پیپلز پارٹی کے جھنڈے کو بھی بہت نمایاں کر کے دکھایا گیا
جہاں اہل تشیع کے بارے میں ایران کی دلچسپی ایک قدرتی امر ہے وہاں اس سے بھی
نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے جان و مال کا تحفظ خود اس ملک کی گورنمنٹ، انتظامیہ ا...
دفاعی کی ذمہ داری ہے جہاں وہ آباد ہیں اور کوئی بھی دوسرا ملک محض اسی بنا...
میں ان کی سب سے بڑی اکثریت وہاں آباد ہے ان کی حمایت کا ٹھیکیدار نہیں بن سکتا۔
ہے کہ ایران کے پڑوسی ملک اکثر "صدور انقلاب" یعنی انقلاب ایران کے فرقہ وارانہ

کی برآمد کے بارے میں اکثر خدشات کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ خود ایران اور اس کے اسلامی انقلاب کے حق میں ہوگا کہ وہ جہاں تک بھی ممکن ہو شیعہ سنی معاملات میں اس قسم کی دلچسپی کے اظہار سے احتراز کرے جس میں کسی اسلامی ملک کے اندرونی امور میں مداخلت کا ذرا سا بھی شائبہ ہو۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور خاص کر مس بے نظیر بھٹو کے مستقبل میں میرے ایرانی میزبانوں کی دلچسپی ضرور [illegible] سے کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ ایک خالص سیاسی مسئلہ ہے مگر اس میں بھی فرقہ وارانہ عصبیت کا پہلو نمایاں تھا۔

پاکستان میں جمہوری عمل کی بحالی کے بارے میں اہل ایران کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آتے اور انہیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ مارشل لاء اٹھائے جانے کے باوجود پاکستان میں ہنوز سول نظام نے جڑ نہیں پکڑی۔ اس ضمن میں وہ بہت فخر سے اپنے پارلیمانی اور صدارتی انتخابات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں یہ انتخابات عین پروگرام کے مطابق ہوئے مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ وہ عام انتخابات کے اس معیار پر مکمل طور پر پورے نہیں اترے جو ایک مستحکم اور مربوط جمہوری عمل کا مظہر ہوتے ہیں۔ جن حالات میں اور جن پابندیوں کے ہوتے ہوئے ایران میں عام انتخاب ہوئے انہیں اگر الیکشن سے زیادہ سلیکشن کہا جائے تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ ایران کے بزرگ اور محترم حزب اختلاف کے لیڈر اور نہضت آزادی ایران کے سربراہ آقائے مہدی بازرگان کو گذشتہ سال کے صدارتی انتخابات میں حصہ لینے سے روک دیا گیا تھا اور صدر خامنہ ای کا انتخاب عملاً ایک واحد امیدوار کی حیثیت سے ہوا۔ اتنا ضرور ہے کہ بازرگان کی پارٹی پر قانونی طور پر کوئی پابندی نہیں۔ شہر کی بارونق شاہراہ پر اس کا دفتر ہے مگر بظاہر اسے جلسے جلوس کی وہ آزادی نہیں جو ایک جمہوری نظام کی جان ہوتی ہے۔ قیام ایران اور اکثر ایرانی دوستوں سے گفتگو کے دوران سب سے زیادہ تکلیف ایک پاکستانی کو ہوتی ہے وہ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح اور پاکستان کے حال اور مستقبل کے بارے میں ان کی منفی اور مایوس کن آراء ہیں ہر چند کہ قائد مرحوم و مغفور کا تعلق خود اثنا عشری فرقے سے تھا تاہم اہل ایران (میری مراد صرف ان گنے چنے افراد سے ہے جن سے مجھے شرف ملاقات ہوا) ان کے مذہبی عقائد اور شعائر کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ وہ ان کی فراست اور قیادت کے قائل ہیں مگر ان کی ذات سے نہ صرف متاثر نہیں بلکہ ان کی عجیب اشیائے خورد و نوش کے حوالے سے اسلام سے ان کی عدم وابستگی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پاکستان کے بارے میں بھی ان کے عجیب عجیب نظریات ہیں۔ اس ضمن میں یہاں ایک انتہائی تکلیف دہ تجربہ تو یہ رہا کہ ٹوپی بغیر وہ ہمیں ہندی ہی کہتے ہیں۔ مانا کہ متعدد ہندیوں اور پاکستانیوں کی

شکلیں لباس اور زبان بڑی حد تک ایک ہیں اور اکثر ان میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صرف پاکستانی ہی کو ہندی کیوں سمجھا جاتا ہے ہندو یا ہندوستانی کو پاکستانی کیوں نہیں۔

رہا پاکستان کے مستقبل کا تو اسکے بارے میں ان کی بہت خوش آئند رائے نہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد جن نامساعد حالات سے دوچار چلا آ رہا ہے ان کے حوالے سے اہل ایران اکثر اس کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔ سندھ کے حالات کے متعلق بھی ان کی رائے ایک خاص قسم کی نوعیت کی حامل ہے وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اگر وہاں کے حالات جلد نہ سنبھلے تو بگڑتے ہی چلے جائیں گے۔ جس طرح احوال وطن مجھے ایران سے نظر آئے انہیں کسی طرح بھی اطمینان بخش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پاکستان سے متعلق جو بھی خبر تہران کے انگریزی روزناموں میں چھپیں ان کا تعلق صرف فرقہ وارانہ تصادم، ملک میں بے چینی اور افراتفری سے تھا۔ (بشکریہ: روزنامہ جنگ لاہور)

بقیہ: رفتارِ کار

ہمارے رفقاء نے اسلام کے انقلابی منشور اور تنظیم اسلامی کے تعارف پر مشتمل تعارفی کتابچہ کی پچیس ہزار اور "قرآن کیا چاہتا ہے" کی دو ہزار کاپیاں تقسیم کیں اور اس اجتماع کے دوران طہارت یقین کی باتیں سن کر اپنے قلوب و اذہان کو منور کیا۔ امیر تنظیم کے فیصلے کے مطابق مختلف مکاتب فکر متحدہ شریعت محاذ میں تنظیم اسلامی بھی شامل ہے۔ ۸ نومبر کو جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور میں متحدہ شریعت محاذ کنونشن میں امیر تنظیم اسلامی نے مختصر خطاب فرمایا اور رفقائے تنظیم اسلامی نے بھی نمایاں طور بھرپور شرکت کی۔ اس مقصد کے لیے مختلف اور موزوں الفاظ میں کتبے تیار کروا لئے گئے تھے۔ کوئی رفقاء کتبوں کو اٹھا کر تقریباً ۳ گھنٹے مسلسل کنونشن کے باہر کھڑے رہے اور علماء اور کنونشن میں آنے والوں کو خوش آمدید کہتے رہے۔ ۱۵ نومبر کو اسلام آباد میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے متحدہ شریعت محاذ کے زیر اہتمام مظاہرہ میں بھی تنظیم اسلامی کے رفقاء نے بھرپور شرکت کی۔ جناب امیر تنظیم اسلامی کی غیر موجودگی کی بنا پر جناب میاں محمد نعیم صاحب قیم تنظیم اسلامی پاکستان نے جو کہ متحدہ شریعت محاذ شہر لاہور کے نائب صدر بھی ہیں تنظیم اسلامی کے نمائندہ کی حیثیت سے اس اجتماع سے مختصر خطاب کیا۔ تنظیم اسلامی لاہور کے تقریباً ڈیڑھ سو رفقاء نے اس مظاہرہ میں شرکت کی۔ علاوہ ازیں پشاور، گجرات، وزیر آباد راولپنڈی اور اسلام آباد کے اکثر رفقاء نے بھی اس میں حصہ لیا۔ اسلام آباد اور راولپنڈی کے رفقاء نے پلے کارڈز اور بینرز کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ تنظیم اسلامی لاہور کے رفقاء کو گذشتہ ہفتہ ایک روزہ تربیتی پروگرام دیا گیا تھا۔ ہمیں توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز اس سے بہت مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنا پسندیدہ بندہ بنا لے اور اقامت دین کی جدوجہد میں اپنے جسم کی صلاحیتیں اور اپنے مال و منال کو صرف کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔